

وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ

آيَاتِ بَيِّنَاتٍ

نواب محسن الملک سید محمد ہمدی علی خان



تردید مذہب شیعہ میں وہ مشہور اور عظیم کتاب جس کا صحیح جواب آج تک علماء شیعہ نہ دے سکے جس میں خود شیعہ مذہب کی کتب اور ان کے علماء کے اقوال سے صحابہؓ کے فضائل اور خلافتِ راشدہ کو ثابت کیا ہے اور مسئلہ نکاح ام کلثومؓ و مسئلہ فدک پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔



تم إعداد هذا الكتاب بالتعاون مع:

موقع البرهان: www.alburhan.com

موقع العقيدة: www.aqeedeh.com

مُحْفَوظَةٌ
جَمِيعُ حَقُوقِ

لا يسمح بالنشر الالكتروني أو المطبوع إلا بعد الرجوع والإستئذان من أحد الموقعين

فہرست مضامین

حصہ اوّل

- 10 - کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں مولانا علی میاں ندویؒ کی رائے عالی - - *
- 12 - - - - - گفتنی *
- 19 - - - - - حالاتِ مصنف *
- 29 - - - - - تمہید از مصنف *
- 31 - - - - - تمہید *
- دلائل عقلی صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت میں
- 32 - - - - - پہلی دلیل *
- 33 - - - - - دوسری دلیل *
- 37 - - - - - تیسری دلیل *
- 39 - - - - - چوتھی دلیل *
- 41 - - - - - پانچویں دلیل *
- شواہد نقلی صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت میں
- 43 - - - - - توریت و انجیل کی شہادت صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت میں *
- 44 - - - - - پہلی شہادت توریت کی *
- 44 - - - - - پہلی روایت کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ کے قتل کا ارادہ کیا *
- 46 - - - - - دوسری روایت کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے رشتہ داروں کے قتل کا مشورہ دیا - *
- 46 - - - - - دوسری شہادت انجیل کی *

قرآن مجید کی شہادتیں صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت میں

- 48 ----- پہلی آیت *
 53 ----- دوسری آیت *
 55 ----- تیسری آیت *
 60 ----- چوتھی آیت *
 75 ----- پانچویں آیت *
 79 ----- چھٹی آیت *
 86 ----- ساتویں آیت *
 88 ----- صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے فضائل *

شیعیان عبداللہ بن سبا کے اعتراضات کا بیان

- 92 ----- پہلا اعتراض پہلی فضیلت پر *
 106 ----- دوسرا اعتراض دوسری فضیلت پر *
 108 ----- تیسرا اعتراض تیسری فضیلت پر *
 110 ----- امر چہارم کے ثبوت میں *
 111 ----- امر پنجم کے ثبوت میں *
 111 ----- امر ششم کے ثبوت میں *
 113 ----- ساتواں اعتراض ساتویں فضیلت پر *
 119 ----- آٹھواں اعتراض آٹھویں فضیلت پر *
 138 ----- نواں اعتراض نویں فضیلت پر *

ائمہ کرام کی شہادتیں صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت میں

- 138 ----- پہلی حدیث *
 138 ----- دلیل اول *
 152 ----- دوسری دلیل *
 153 ----- تیسری دلیل *
 152 ----- پہلی دلیل *
 164 ----- دوسری دلیل *
 165 ----- تیسری دلیل *
 165 ----- چوتھی دلیل *
 170 ----- دوسری شہادت *
 173 ----- امر اول: امام کا اصحاب رضی اللہ عنہم کے حق میں دعائے خیر کرنا *
 175 ----- امر دوم: پیغمبر خدا کے یاروں کے ایمان کے سبب مصیبت پانا *
 184 ----- سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کا حال *
 197 ----- سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کا بیان *
 205 ----- اشعار حملہ حیدریہ - در کیفیت ایمان آوردن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ *

صحابہ رضی اللہ عنہم کے تابعین کی فضیلتیں اور ان کی نشانیاں

- 232 ----- تیسری شہادت *
 233 ----- چوتھی شہادت *
 239 ----- پانچویں شہادت *
 247 ----- چھٹی شہادت *
 256 ----- ساتویں شہادت *

- 274 ----- آٹھویں شہادت *
 300 ----- نویں شہادت: سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے سیدہ اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کا بیان -- *
 306 ----- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے نکاح کا اثبات دلائل سے - *
 329 ----- مومنہ کا نکاح، ناصبی کے ساتھ جائز نہ ہونا ----- *
 379 ----- ضمیمہ: نکاح اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا ----- *

حصہ دوم

- 393 ----- تمہید *
 403 ----- آیاتِ فضیلت صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں شیعوں کا جواب *
 463 ----- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے منافق نہ ہونے کا ثبوت ----- *
 463 ----- دلیل اول و دوم ----- *
 473 ----- دلیل سوم ----- *
 476 ----- دلیل چہارم ----- *
 511 ----- صحابہ رضی اللہ عنہم کے منافق نہ ہونے کی پانچویں دلیل ----- *
 511 ----- پہلی آیت ----- *
 513 ----- دوسری آیت ----- *
 513 ----- تیسری آیت ----- *
 513 ----- چوتھی آیت ----- *
 516 ----- آیاتِ فضیلت صحابہ رضی اللہ عنہم سے شیعوں کا دوسرا جواب ----- *
 536 ----- شیعوں کا تیسرا جواب ----- *
 568 ----- خاتمہ کتاب ----- *

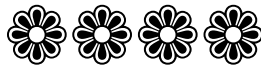
حصہ سوم

- 572 ----- تمہید فدک ❀
- 573 ----- پہلا مقدمہ ❀
- 576 ----- دوسرا مقدمہ ❀
- 583 ----- فضیلت صحابہؓ بہ شہادت سرولیم میور مورخ نصرانی
- 585 ----- فضیلت صحابہؓ بہ شہادت گاؤ فری پینگس مورخ نصرانی
- 585 ----- مورخ گبن کا بیان
- 587 ----- بیان تحریری سرولیم میور
- 601 ----- تیسرا مقدمہ ❀
- 680 ----- چوتھا مقدمہ ❀
- 738 ----- پانچواں مقدمہ ❀
- 779 ----- ضمیمہ ❀

حصہ چہارم

- 812 ----- فدک کی حقیقت، اس کے حدود اور اس کی آمدنی ❀
- 816 ----- فدک کیوں کر آنحضرت ﷺ کے قبضے میں آیا؟ ❀
- 821 ----- فے کے معنی اور اس کا مصرف ❀
- 837 ----- بحث متعلق ہبہ فدک ❀
- 846 ----- فدک آنحضرت ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کیا تھا یا نہیں؟ ❀
- تناقض اور اختلاف شیعوں کی ان احادیث و اخبار میں جو اس باب میں بیان کی
- 895 ----- گئی ہیں کہ پیغمبر خدا ﷺ نے فدک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دیا تھا ❀

- ✽ آیت ﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ﴾ کے موقع نزول اور طرزِ بیان پر غور کرنے سے
- 907 ----- ہبہ فدک کا ثابت نہ ہونا
- ✽ کیا یہ بات قیاس میں آسکتی ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے فدک جس کی آمدنی
- 925 ----- چوبیس ہزار کہی جاتی ہے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ دے دیا ہو؟
- 944 ----- کیا فدک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے قبضہ میں تھا؟
- ✽ آیا فدک کے ہبہ کا دعویٰ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے
- 948 ----- سامنے کیا یا نہیں؟
- ✽ اب ہم ان روایتوں اور اقوال سے بحث کرتے ہیں جو اوپر بیان کیے گئے ہیں - 978
- ✽ تناقض اور اختلاف جو شیعوں کی ان روایتوں میں ہے جس میں ہبہ فدک کے
- 998 ----- دعوے کا ذکر کیا گیا ہے
- ✽ یادداشت ----- 1052



فہرست مشاہیر جن کے مختصر حالات حواشی میں درج ہیں

44	-----	علامہ حلی	✽
65	-----	سید محمد قلی کنتوری	✽
65	-----	قاضی نور اللہ شوستری	✽
99	-----	مولوی حیدر علی فیض آبادی	✽
115	-----	مولوی سید دلدار علی نصیر آبادی	✽
146	-----	شیخ صدوق	✽
162	-----	ملا باقر مجلسی	✽
201	-----	شیخ مفید	✽
243	-----	میرن صاحب	✽
257	-----	شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی	✽
262	-----	ابن میثم بحرانی	✽
274	-----	علی بن عیسیٰ اردبیلی	✽
278	-----	سلطان العلماء سید محمد لکھنوی	✽
280	-----	میر حامد حسین	✽
299	-----	ابو علی الفضل بن الحسن طبرسی	✽
321	-----	احمد بن علی طبرسی	✽
حصہ دوم			
396	-----	ابن ابی الحدید معتزلی	✽
508	-----	علی بن ابراہیم قمی	✽
508	-----	محمد بن یعقوب کلینی	✽
حصہ چہارم			
837	-----	شریف مرتضیٰ	✽



کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسینی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی

نواب محسن الدولہ محسن الملک منیر نواز جنگ سید مہدی علی ابن سید ضامن علی حسینی (۱۲۵۳ھ تا ۱۳۲۵ھ) اس دور کے ممتاز ترین فضلاء، عالی دماغ اور ہندوستان کی جدید تعلیم یافتہ نسل کے محسنوں اور معماروں میں سے تھے۔ اپنے مطالعہ اور فطری سلامت طبع اور غور و فکر کی صلاحیت کی بنا پر سنی مذہب اختیار کیا۔ نواب مختار الملک کی دعوت پر ۱۲۹۱ھ میں حیدرآباد گئے اور اعلیٰ عہدے پر سرفراز ہوئے، ریاست میں بڑی دُور رس اصلاحات کیں اور اپنی ذہنی و انتظامی صلاحیت کا ثبوت دیا۔ ۱۳۰۵ھ میں انگلستان کا سفر کیا، وہاں کے تعلیمی مرکزوں کو دیکھا، سرسید کی زندگی میں ان کے دست راست رہے۔ ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷ء) میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ (M.A.O College) اور مجڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔ جس پر چین حیات فائز رہے، ان کے زمانے میں کالج نے ہر حیثیت سے ترقی کی۔

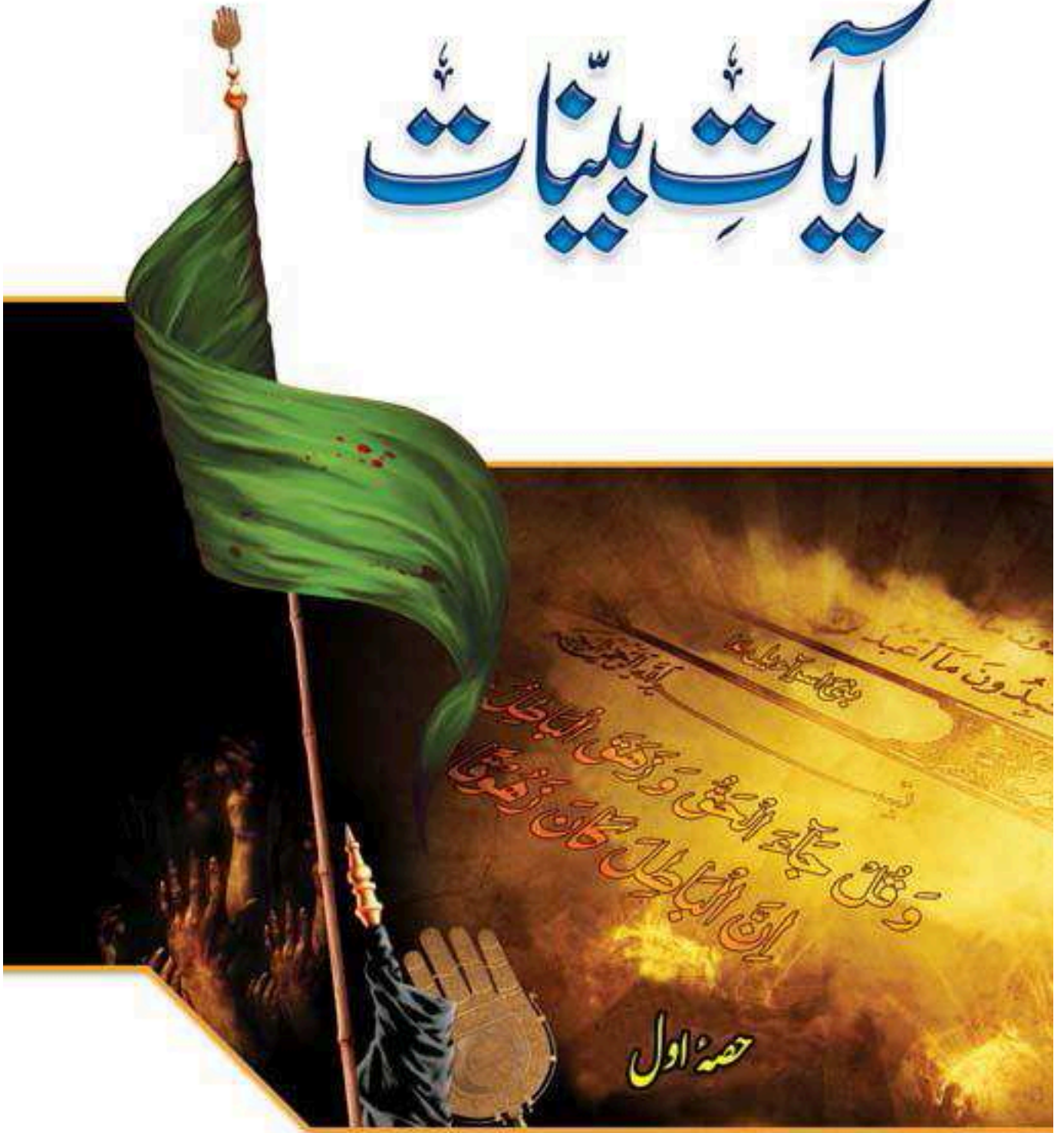
نواب محسن الملک بڑی طاقت ور شخصیت کے مالک تھے۔ سحر بیان مقرر اور پر زور لکھنے والے تھے۔ ان کی کتاب ”آیاتِ بینات“ اپنے موضوع پر ایک معرکہ الآراء کتاب ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں شیعہ فرقہ کے عقیدے اور رویے کو دیکھ کر نواب محسن الملک (مولوی سید محمد مہدی علی صاحب) نے ”آیاتِ بینات“ میں جو کچھ لکھا ہے اس پر اضافہ اور اس سے بہتر طریقے پر اس نفسیاتی و ذہنی ردِ عمل کا اظہار آسان نہیں، جو ایک سلیم الطبع انسان پر اس سے واقف ہونے کے بعد ہوتا ہے۔

(ماخوذ از ”دین اسلام اور اوّلین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں“، ص: ۶۰، ۶۱)



وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاقُونَ

آيَاتِ بَيِّنَاتٍ



نواب محسن الملک سید محمد ہمدی علی خان

گفتنی

”آیاتِ بینات“ کی اشاعت میری ایک دیرینہ تمنا کی تکمیل ہے، کیونکہ یہی وہ میری محسن کتاب ہے جس نے مجھے گمراہی کے اندھیرے، غار میں گرنے سے بچا لیا۔ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے اوائل میں میرے دل و دماغ پر شیعہ افکار و نظریات چھائے ہوئے تھے۔ بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ ان دنوں میں بظاہر تو اہل سنت مگر بہ باطن شیعہ تھا۔ شیعیت کی طرف مائل ہونے کے میرے لیے یوں تو کئی سبب تھے مگر ان میں دو سبب بہت اہم تھے، ایک تو میرا گھریلو ماحول، اور دوسرا میرے شیعہ دوست۔

میرے خاندانی بزرگ کچھ عابد و زاہد مگر کم علم صوفیوں کی محبت میں اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے جانے انجانے میں تفضیلت زدہ تسنن کے شکار تھے۔ اودھ کے اکثر گھرانوں کی طرح میرے گھر میں بھی شہادت نامہ پڑھنے اور تعزیہ داری کا رواج تھا، اسی ماحول میں میری بھی پرورش ہوئی اور میں بذات خود سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی دردناک شہادت سے جو کہ مسلمانوں ہی کے ایک گروہ کے ہاتھوں ہوئی تھی، بے حد متاثر تھا اور آج بھی ہوں۔

اللہ مجھے معاف کرے، ان دنوں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں میرے خیالات بہت جارحانہ تھے، اور ان کے بارے میں اکثر میری زبان سے نازیبا کلمات نکل جاتے تھے۔ میری اسی روش سے شیعہ دوستوں کو حوصلہ ملا اور انہوں نے زمین ہموار دیکھی تو دانہ ڈال کر آب پاشی شروع کر دی۔ ان دنوں لکھنؤ میں قصبہ جروں ضلع بہرائچ کے ایک وکیل صاحب جو کہ ”خطیب الایمان“ کے لقب سے مشہور تھے، ردِ اہل سنت کرنے اور اپنی شعلہ بیانی کی وجہ سے شیعوں کے ایک خاص طبقہ میں کافی مقبول تھے، میرے شیعہ دوست ایک طرف تو مجھے ان کی مجالس میں لے جانے لگے اور دوسری طرف خورشید خاور، شب ہائے پیشہ اور جیسی بیسیوں

مناظرانہ طرز کی کتابیں مطالعہ کے لیے دینے لگے۔ چونکہ مجھے شیعہ سنی بنیادی اختلافی مسائل جیسے امامت، تحریف قرآن اور سب صحابہؓ جیسے اصول مسائل کا صحیح علم نہیں تھا، اس لیے شیعہ خطیبوں کی لفظی بھول بھلیوں اور واقعہ کربلا کے حوالے سے ان کی فلسفیانہ موشگافیوں، نیز منطقی دلائل سے متاثر ہو کر ”حبّ اہل بیت“ کے جذباتی نظریہ کی رو میں بہتا چلا گیا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں نے اپنی ”شیعیت“ کے اعلان کے لیے راہ ہموار کرنا شروع کر دی، مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا اور ایک صوفی بزرگ کے ذریعے میری اصلاح مقدر تھی۔

قصہ یوں ہوا کہ ان دنوں میرے گھر والوں پر قبضہ سندیلہ ضلع ہردوئی کے ایک صوفی بزرگ جن کا نام سید محمد نور الحسن شاہ عرف اچھومیاں تھا، کا کافی اثر تھا جنہیں ہم لوگ دادا میاں کہتے تھے اور میرے گھر والے اپنے اہم معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ ایک دن جب وہ میرے گھر تشریف لائے تو میں نے ڈرتے ڈرتے تنہائی میں اپنے اس ارادے کا اظہار کر دیا۔ کافی دیر تک تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ انہوں نے بڑے غور سے میری باتوں کو سننے کے بعد فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ تم نے اب تک شیعہ حضرات کی مجلسوں اور ان کی مناظرانہ طرز کی کتابوں کا ہی مطالعہ کیا ہے جن کا تمہارے دل و دماغ پر گہرا اثر ہے، مذہب بدلنا کوئی معمولی بات نہیں، اتنا بڑا قدم اٹھانے سے پہلے اہل سنت کی مناظرانہ طرز کی کتابوں کا بھی مطالعہ کرو اور پھر دونوں مذاہب پر غور و فکر کرنے کے بعد جس نتیجے پر پہنچو اس کے مطابق فیصلہ کرو۔ میں نے عرض کیا کہ شاید اہل سنت میں مناظرانہ طرز کی کتابیں کمیاب ہیں، کیونکہ اب تک میری نظر سے جو کتابیں گزریں وہ سیرت رسول ﷺ، اولیائے کرام کے تذکروں یا پھر مسئلہ و مسائل پر مشتمل تھیں۔ میری اس بات پر انہوں نے میری طرف بہت حیرت سے دیکھا اور فرمایا کہ تمہیں دستیاب نہیں ہوئیں یا تم نے کوشش ہی نہیں کی۔ لکھنؤ میں رہنے کے باوجود تمہارا یہ کہنا بڑا تعجب خیز ہے، لکھنؤ تو شیعہ سنی مباحث کا گڑھ ہے، یہاں پر مولوی عبدالشکور کا کوروی نے شیعہ سنی مباحث پر قابل قدر کام کیا ہے، خصوصاً شیعوں کے ”عقیدہ تحریف قرآن“ پر تو بڑی معرکہ الآراء کتابیں تحریر کی ہیں۔ اگر تم کوشش کرتے تو ان کی

کتابیں تمہیں ضرور دستیاب ہو جائیں..... میں نے عرض کیا کہ حضرت وہ تو ایک وہابی دیوبندی نظریات کے عالم ہیں، ہم ان کی کتابیں کیوں کر پڑھیں۔ اس پر فرمایا کہ شیعہ سنی اختلافات میں دیوبندی بریلوی کا کیا سوال اٹھتا ہے، دونوں خلفائے راشدین کو خلیفہ برحق مانتے ہیں، دونوں اصحاب رسول اللہ ﷺ کی تعظیم کرتے ہیں..... اس لیے اس معاملہ میں شیعوں کی طرف سے اٹھنے والے سوالوں کے دونوں جواب دہ ہیں۔ میں نے خود مولوی عبدالشکور کی کئی کتابیں پڑھی ہیں۔ سندیلہ میں میرے والد کے ایک مرید شبومیاں ہیں جنہیں شیعہ سنی مباحث سے بڑا گہرا شغف ہے، ان کے پاس اس طرح کی کتابوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ ہے۔ میں آٹھ دس دن میں سندیلہ پہنچ کر ان سے تمہارا ذکر کروں گا اور کوئی آتا ہوگا تو اس کے ہاتھ تمہیں کچھ کتابیں بھجوادوں گا، جب ان کتابوں کا مطالعہ کر لو تو سندیلہ آنا، میں ان سے تمہاری گفتگو بھی کرادوں گا۔

اس گفتگو کے پندرہ بیس دنوں کے بعد میرے ایک عزیز کتابوں کا ایک بنڈل اور ایک خط لے کر آئے جس کا مضمون کچھ اس طرح تھا:

”میں تمہیں آیاتِ بینات، نصیحتہ الشیعہ، تنبیہ الحائرین، ابو الائمہ کی تعلیم، قصہ قرطاس کا کفر شکن فیصلہ، قاتلان حسینؑ کا خانہ تلاشی اور مناظرہ امر وہہ، کل سات کتابیں بھیج رہا ہوں۔ میں نے جس ترتیب سے نام لکھے ہیں اسی ترتیب سے کتابیں پڑھنا۔ آیاتِ بینات کو خصوصاً بڑی توجہ اور غور سے پڑھنا کیونکہ یہ ایک ایسے عالم کی لکھی ہوئی ہے جو خود پہلے شیعہ تھے، پھر دونوں مذاہب کے اصول و فروع پر غور و فکر کے بعد اہل سنت ہو گئے تھے..... اگر ان کتابوں کو پڑھنے کے بعد بھی ذہن مطمئن نہ ہو تو دل چاہے تو لکھنؤ میں مولوی عبدالشکور صاحب سے رجوع کرنا یا پھر میرے پاس آنا، میں شبومیاں سے تمہاری ملاقات و گفتگو کرادوں گا۔“

میں نے آیاتِ بینات کا مطالعہ شروع کیا، جوں جوں کتاب پڑھتا گیا ذہن کے درتپے

روشن ہوتے گئے، ایسا محسوس ہوا گویا کہ میں اب تک سخت ترین تاریکی میں تھا..... اس کے بعد نصیحة الشیعة اور دیگر کتابوں کا بھی مطالعہ کیا..... میری بڑی بدقسمتی رہی، جن دنوں میں ان کتابوں کا مطالعہ کر رہا تھا اسی درمیان حضرت مولانا عبدالشکور صاحب نور اللہ مرقدہ کا وصال ہو گیا اور ان سے ملاقات کی تمنا دل ہی میں رہ گئی، مگر اس کے بعد جانشین امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالسلام صاحب فاروقی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا عبدالاول صاحب فاروقی کی صحبت نصیب ہوئی اور ان حضرات سے رہنمائی حاصل کرتا رہا۔

انہی دنوں مجھے خیال آیا کہ جس طرح میں ”شیعیت“ کا شکار ہوا جا رہا تھا اسی طرح بہت سے اللہ کے بندے جو شیعہ حضرات کی صحبت میں رہتے ہوں گے اس مذہب سے ناواقفیت کے سبب شیعہ یا نیم شیعہ ضرور بن جاتے ہوں گے، اس لیے آیاتِ بینات اور نصیحة الشیعة جیسی کتابوں کی اشاعت برابر ہوتی رہنا چاہیے۔ پھر جب میں نے حضرت مولانا عبدالاول صاحب سے اس بات کا ذکر کیا کہ آیاتِ بینات ہندوستان میں ۱۹۳۲ء کے بعد سے (جس کو ایک بڑا عرصہ ہو گیا) اب تک نہیں چھپی ہے اور میں اس کی اشاعت کرانا چاہتا ہوں تو بہت خوش ہوئے اور انہوں نے ہی مجھے اس کی فارسی عبارتوں کے ترجمہ کی طرف متوجہ کیا۔ ساتھ ہی خود ترجمہ کر دینے کی خواہش کا بھی اظہار فرمایا..... مگر بدقسمتی سے میں ان دنوں کاروباری الجھنوں میں ایسا پھنسا کہ مولانا کی طرف سے بار بار اصرار کے باوجود اس کام کو انجام نہ دے سکا۔ وقت گزرتا گیا اس درمیان دنوں مولانا حضرات بھی مالک حقیقی سے جا ملے۔ اور میں قطعی ناامید ہو چکا تھا کہ شاید اب کبھی اس کام کو انجام نہ دے سکوں گا مگر اللہ تعالیٰ کو یہ کام مجھ کنہگار سے لینا منظور تھا، ابھی دو سال قبل میرے دوستوں میں ڈاکٹر حبیب فکری صاحب سابق لیکچرر عرب کلچر لکھنؤ یونیورسٹی و محمد یعقوب منٹو نے کچھ اس انداز سے ہمت بندھائی کہ میں بالکل بے سروسامانی کے عالم میں بھی اس کام کے لیے کھڑا ہو گیا، تب مجھے ترجمہ کا دھیان آیا، اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت مولانا عبدالسمیع قاسمی صاحب استاذ دارالمبطلین لکھنؤ کے نصیب میں لکھی تھی، اللہ انہیں جزائے خیر دے، انہوں نے اس کام کو

بہ حسن و خوبی بلا معاوضہ انجام دیا۔

کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں جانشین امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالعلیم فاروقی صاحب دام ظلہ العالی سے برابر مشاورت رہی، حضرت مولانا پورے خلوص کے ساتھ اپنے مفید مشوروں سے مستفید فرماتے رہے اور میرے بازوئے ہمت کو سہارا دیتے رہے، اس سلسلہ میں دامے، درمے، سخیے جس طرح بھی مدد درکار ہوئی مولانا دامت برکاتہم نے اس میں کوئی دریغ نہیں فرمایا۔

بات مختصر کرتے کرتے بھی کافی طویل ہو گئی مگر اس کتاب کے قارئین کی معلومات کے لیے چند باتوں کا بیان بہت ضروری ہے..... حضرت مولانا محمد منظور نعمانی نے شیعہ مذہب کے تعارف اور امام خمینی کے عقائد و نظریات کے متعلق ایک کتاب ”ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت“ لکھی تھی جس کے صفحہ ۱۹۸ پر ”فاروقِ اعظمؑ کا یوم شہادت، سب سے بڑی عید، رسول خدا ﷺ پر افتراء کی بدترین مثال“ کا عنوان قائم کر کے مجلسی کی زاد المعاد سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں ۹ ربیع الاول کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل کا دن قرار دیتے ہوئے اس تاریخ کی حیرت انگیز فضیلتیں بیان کی گئی ہیں، اور روزِ قتل عمر رضی اللہ عنہ کو شیعوں کی سب سے بڑی عید قرار دیا ہے..... کشمیر کے ایک شیعہ مجتہد سید محمد ہمدانی نے ”آئینہ ہدایت“ کے نام سے نعمانی صاحب کی کتاب کا جواب لکھا ہے۔ یہ جواب کس پائے کا ہے اس پر تبصرے کا تو یہ موقع نہیں، البتہ ان کی ایک غلط بیانی کی نشاندہی بہت ضروری ہے۔

موصوف نے کتاب کے صفحہ ۳۹۶ پر اس روایت کا جواب لکھنے میں بڑے مکر و فریب سے کام لیا ہے اور مجلسی کی کتاب میں اس روایت کے موجود ہونے نہ ہونے پر تو کوئی بحث نہیں کی ہاں ایک ایسا سفید جھوٹ ضرور بولا ہے جو شیعوں کے تقیہ باز بزرگوں کو ہی زیب دیتا ہے..... ہمدانی صاحب مولانا نعمانی کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں:

”موصوف یہ جان لیں کہ شیعہ اس روز (۹ ربیع الاول کو) جشن ولادت حضرت

محمد ﷺ مناتے ہیں.....“

شیعہ حضرات اب خود فیصلہ کریں کہ وہ ۹ ربیع الاول کو جشن ولادت حضرت محمد ﷺ مناتے ہیں یا عید زہرا؟ ہمدانی صاحب کو اس ضعیف العمری میں بھی اتنا بڑا جھوٹ بولتے ہوئے بالکل شرم نہیں آئی.....

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

قارئین کی آگاہی کے لیے عرض کر دوں کہ شیعہ حضرات آج بھی اپنی پرانی عادت کے مطابق کتابوں میں خیانت کر رہے ہیں۔ ابھی پاکستان میں قاضی نور اللہ شوستری کی مجالس المؤمنین کا ترجمہ محمد حسن جعفری نے کیا ہے جسے ”اکبر حسین جیوانی ٹرسٹ“ نے چھاپا ہے۔ اس میں ان تمام عبارتوں کا ترجمہ غائب کر دیا ہے جن میں قاضی صاحب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا کے نکاح کا اقرار کیا ہے..... اسی طرح کتاب سلیم بن قیس ہلالی کے اردو ترجمہ میں وہ عبارت اڑا دی گئی ہے جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا اقرار ہے۔

یہ دو تین مثالیں مجھ جیسے کم علم آدمی کو شیعوں کی کتابوں پر سرسری نظر میں مل گئیں، اگر علماء کرام اس طرف توجہ فرمائیں تو بیسیوں مثالیں اسی قسم کی مل سکتی ہیں۔

پہلی بار یہ کتاب ۱۸۷۰ء مطابق ۱۲۸۶ء ہجری میں مرزا پور سے اس وقت شائع ہوئی جب مصنف علام کا سن ۳۳ سال تھا۔

دوسری بار فضائل صحابہ کا پہلا جز ۱۸۸۴ء مطابق ۱۳۰۱ھ میں مطبع مصطفائی لکھنؤ سے

شائع ہوا جس کا قطعہ تاریخ مولوی مجیب اللہ مرحوم نے یہ لکھا تھا۔ قطعہ

از فیض طبع مہدی دین المعنی عصر

مطبوع شد رسالہ بے مثل و لا جواب

نام کتاب و نیز سن طبع اے مجیب

آیاتِ بینات رقم ساز با کتاب

اس کے بعد فضائل صحابہؓ کا دوسرا جز ۱۸۸۷ء مطابق ۱۳۰۴ھ میں اور دوسرا حصہ بحث فدک والا بھی ۱۸۹۸ء ۱۳۱۵ھ میں مطبع مصطفائی سے شائع ہوا۔

تیسری بار فضائل صحابہؓ کا پہلا جز جنوری ۱۹۳۲ء مطابق ۱۳۵۳ھ میں حسب فرمائش حافظ معصوم علی صاحب مرحوم یونائیٹڈ پریس لکھنؤ سے بقائے نام مصنف کے خیال سے طبع کر کے شائع کیا گیا۔

پاکستان بننے کے بعد وہاں سے بھی اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے مگر ہندوستان میں عرصہ دراز سے اس کتاب کی اشاعت نہیں ہوئی تھی۔ اب ۷۲ سال بعد ”ادارہ اشاعت حق“ اس کو شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

میں کتاب کی اشاعت کے سلسلہ میں ان تمام حضرات کا ممنون ہوں جنہوں نے کسی طرح اور کسی بھی سطح پر تعاون فرمایا ہے خصوصاً مولانا انوار الحق قاسمی صاحب استاذ داراللمبلغین لکھنؤ کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنہوں نے شیعہ کتابوں کے حوالہ جات کی تلاش و تحقیق میں بھر پور راہنمائی فرمائی..... اللہ تعالیٰ ان تمام مخلصین و محبین کو جزائے خیر عطا فرمائے، اور اس کتاب کو بھٹکے ہوئے لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنائے۔ آمین!

خاک پائے اہل بیت و صحابہ رضی اللہ عنہم

شیخ محمد فراست

۷۔ دسمبر ۲۰۰۶ء



دیباچہ و حالات مصنف

نواب محسن الملک کو سرسید کے رفقاء کار میں ایک امتیازی درجہ حاصل ہے۔ سرسید کے انتقال کے بعد وہی ان کے جانشین ہوئے اور انہوں نے ہی اس تحریک کو پروان چڑھایا جس کی ابتدا سرسید کے ہاتھوں ہوئی تھی۔

ان کا اصلی نام مہدی علی تھا، سلسلہ نسب سادات بارہہ کے مشہور خاندان سے ملتا ہے، اس خانوادے کی ایک شاخ اٹاواہ میں جا کر مقیم ہو گئی تھی۔ مہدی علی کے والد میر ضامن علی سیدوں کے اسی خاندان کے ایک فرد تھے، اگرچہ وہ دولت دنیا سے محروم تھے، تاہم ان کا شمار شہر کے ذی عزت لوگوں میں ہوتا تھا۔ مہدی علی کی والدہ کا تعلق بھی سادات کے ایک ایسے خاندان سے تھا جس میں علم کی دولت کئی پشتوں سے بطور میراث چلی آتی تھی۔ چنانچہ محسن الملک کے نانا، مولوی محمود علی ایک تبحر عالم تھے، پہلے وہ صدر الصدوری کے عہدے پر فائز رہے، پھر ریاست ٹونک میں منصب وزارت عطا ہوا۔

اسی غریب مگر علمی خاندان میں نواب محسن الملک سید مہدی علی پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت ۱۸۳۷ء تا ۱۲۵۳ھ کو بمقام اٹاواہ ہوئی۔ جب کچھ بڑے ہوئے تو پڑھنے کے لیے مکتب میں بٹھا دیے گئے، شروع میں دینی تعلیم حاصل کی لیکن اپنی غیر معمولی ذہانت، محنت اور توجہ سے بہت جلد اس قدر استعداد بہم پہنچالی کہ بڑے بڑے علماء و فضلاء کے حلقہٴ درس میں شریک ہونے لگے، اور سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں علوم متداولہ کی تکمیل کر لی۔ ایک طرف فارسی زبان اور ادب میں درجہٴ امتیاز حاصل کیا دوسری جانب عربی، ادب، حدیث اور تفسیر میں سند فراغ حاصل کر لی۔ انگریزی کی تعلیم باقاعدہ نہیں ہوئی لیکن اپنی توجہ اور مشق و مزاوت سے اتنی سیکھ لی کہ پانیر اخبار خود سمجھنے لگے۔

ابھی ان کی عمر بمشکل اٹھارہ سال کی ہوگی کہ حصولِ معاش میں باپ کا ہاتھ بٹانے کے لیے سرکاری ملازمت اختیار کر لی، دس روپے ماہوار پر ایک دفتر میں کلرک ہو گئے۔ لیکن اپنی محنت، قابلیت اور سوجھ بوجھ کی بنا پر تھوڑے ہی عرصے میں اہلمدی، سررشتہ داری اور تحصیل داری کے مدارج طے کرتے ہوئے ڈپٹی کلکٹری کے معزز عہدے پر فائز ہو گئے اور اپنے فرائض کو اس خوبی و خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ حکومت کے اعلیٰ عہدیداران اور افسران بھی عزت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ یہی نہیں بلکہ حکومت کی جانب سے خلعت عطا ہوا اور کلکٹر نے ان کی تعریف میں یہ الفاظ لکھے:

”میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ مہدی علی سے زیادہ ذہین، مستعد اور ایمان دار

صوبہ ممالک مغربی و شمالی (یوپی) میں کوئی نہیں ہے۔“

ان کی اعلیٰ کارکردگی اور قابلیت کی شہرت اس قدر ہوئی کہ سر سالار جنگ نے ان کو اپنے یہاں ایک اعلیٰ عہدہ پیش کیا، چنانچہ وہ ۱۸۷۴ء میں بارہ سو روپے ماہانہ کے مشاہرہ پر حیدرآباد دکن چلے گئے، وہاں انہوں نے مال اور محاسبی میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ بندوبست مال گزاری کے متعلق مشہور ہے:

”مہدی علی نے دکن میں وہ کام کیا جو شہنشاہِ اکبر کے عہد میں ہندوستان کے

اندر ٹوڈرل نے اور ممالک مغربی و شمالی میں لیفٹیننٹ گورنر مسٹر ٹامسن نے کیا تھا،

ان کے حسن انتظام سے ایک طرف حکومت مالا مال ہو گئی دوسری طرف رعایا

خوشحال اور مطمئن دکھائی دینے لگی۔“

ان کی خدمات کا اعتراف اس طرح کیا گیا کہ ۱۸۷۶ء میں وہ ریونیو سیکرٹری اور ۱۸۸۴ء میں فنانشل و پبلیک سیکرٹری بنا دیے گئے اور سرکار نظام سے انہیں محسن الدولہ، محسن الملک، منیر نواز جنگ کے خطابات عطا ہوئے۔ تین ہزار روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ اسی زمانہ میں انگلستان کا سفر کیا اور وزیراعظم گلڈمسٹن سے ملاقات کی۔ ۱۸۹۳ء میں ان کے خلاف سازشیں ہوئیں جس کی وجہ سے کبیدہ خاطر ہو کر وہ اپنے عہدے سے علیحدہ ہو گئے اور آٹھ سو روپیہ

ماہوار پنشن لے کر علی گڑھ چلے آئے، وہاں سرسید مرحوم سے مل کر قومی خدمت اور کالج کے انتظام میں لگ گئے، ۱۸۹۸ء میں سرسید کا انتقال ہو گیا اور کالج کے سیکرٹری بنا دیے گئے۔ اس منصب پر رہ کر انہوں نے نہایت تندہی اور جان فشانی سے کام کیا اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے برابر کوشاں رہے۔ ان کے دور میں اردو، ہندی کے جھگڑے نے بھی شدت اختیار کر لی، انہوں نے کھل کر اردو کی حمایت کی۔ ان ہی کے زمانہ میں ہنرمیجسٹی امیر حبیب اللہ ۱۹۰۶ء میں ہندوستان آئے، علی گڑھ کالج میں ان کا شاندار استقبال ہوا، امیر یہاں کے انتظامات سے بے حد متاثر ہوئے، بیس ہزار روپے کا عطیہ کالج کو مرحمت فرمایا اور کچھ سالانہ امداد بھی مقرر کر دی۔

غرض محسن الملک مرحوم کے زمانہ میں ایم، اے، او کالج کو مالی استحکام نصیب ہوا اور اس کی مرکزیت اور وقعت و عظمت قائم ہو گئی، مسلمانوں کو سیاسی حقوق ملے اور ان کی پولیٹیکل حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا۔

لیکن قوم کو اس منزل تک پہنچانے میں محسن الملک کو جو محنت اور جدوجہد کرنا پڑی اس نے ان کی صحت کو بری طرح متاثر اور کھوکھلا کر دیا۔ وہ مختلف امراض میں مبتلا ہو گئے، ذیابیطس کی شکایت بہت بڑھ گئی، اسی حالت میں شملہ گئے اور وہاں مسلمانوں کے حقوق کی توسیع کے لیے کوششیں کرنے لگے۔ وائسرائے اور دیگر حکام سے ملاقاتیں کیں، ستمبر ۱۹۰۷ء میں شملہ گئے تھے کہ اکتوبر میں مرض کا شدید حملہ ہوا اور وائسرائے نے اپنے خاص معالج کو علاج کے لیے مامور کیا لیکن مرض الموت کا علاج کس سے ہوا، آخر ساعت موعود آ پہنچی اور ۸ رمضان المبارک ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو مالک حقیقی سے جا ملے۔ کئی لوگوں نے تاریخ وفات کے مادے نکالے، یہ قطعہ تاریخ بہت پسند کیا گیا:

محسن الملک آہ ز دنیا برفت
خلق شد از رحلتش اندوہ گیں

سال وفاتش شدہ ملہم زغیب
انجمن آرائے بہشت بریں

۱۳۲۵ھ

محسن الملک مرحوم نے ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی تھی، اسی لیے نہایت کم عمری میں ملازمت کرنے پر مجبور ہو گئے، لیکن قدرت نے ان کو جو ذہانت اور فطانت کی دولت عطا فرمائی تھی اس کی بدولت انہوں نے بہت جلد ایک مقام حاصل کر لیا، اللہ تعالیٰ نے انہیں توقع سے زیادہ دولت دی، مسند عزت پر بٹھایا، خطابات سے نوازا اور لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت جاگزیں کی۔ وہ نیکی، محبت اور انسانی ہمدردی کا ایک پیکر تھے، قومی خدمت کو انہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے لیا تھا، ان میں غرور اور بڑائی نام کی کوئی چیز عمر بھر پیدا نہیں ہوئی۔ ویسے تو ہر شخص سے ہی ان کا سلوک ہمدردانہ اور مخلصانہ تھا لیکن اپنے ہم وطنوں کے ساتھ وہ خصوصیت سے نہایت بے تکلفی، اخلاص اور محبت کا برتاؤ کرتے تھے اور ان کی مدد کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ان کی آمدنی کا بیشتر حصہ غریبوں، مسکینوں، یتیموں اور بیواؤں کی امداد میں صرف ہوتا تھا۔ انہوں نے بہت سے لوگوں کے وظیفے مقرر کر رکھے تھے لیکن یہ وظیفے اس طرح دیے جاتے تھے کہ دینے اور لینے والے کے سوا کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی، چنانچہ جب تک ان کا قیام حیدرآباد میں رہا اس وقت تک کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکا کہ ان کے یہاں مستحقین کی امداد کی بھی کوئی مد ہے لیکن جب ملازمت سے سبکدوش ہو کر وہاں سے رخصت ہونے لگے اور امداد پانے والوں میں شور و ماتم برپا ہوا تو پتہ چلا کہ ان کے خوان کرم سے کتنے لوگ فیض یاب ہو رہے تھے۔

جب انہوں نے مستقلاً علی گڑھ میں سکونت اختیار کر لی تو ان کی آمدنی بہت تھوڑی رہ گئی، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے ہاتھ کو سیڑا نہیں بلکہ داد و دہش کا سلسلہ اس وقت بھی جاری رہا اور ان کے انتقال کے بعد ہی منقطع ہوا۔

جن لوگوں سے ان کا واسطہ رہا وہ سب ہی ان کے اوصافِ حمیدہ اور خصائلِ پسندیدہ

کے مداح و معترف تھے، جو ان سے جتنا زیادہ قریب تھا اتنا ہی زیادہ اس کو ان کی خوبیوں کا اعتراف تھا، ان کے شمائل و خصائل کا آئینہ اس قدر شفاف تھا کہ اس پر ان کے مخالفین تک کو بھی کوئی داغ دھبہ نظر نہ آتا تھا، چنانچہ حیدرآباد کے قیام کے دوران نواب سرور جنگ نے ان کی کھل کر مخالفت کی لیکن انہوں نے بھی اپنی تصنیف ”مائی لائف“ میں ان کے لیے یہ الفاظ تحریر کیے ہیں:

”وہ مہربان تھے، ان میں خود اعتمادی تھی، ان کی زبان شیریں اور بااثر تھی، وہ ہر ایک کے ساتھ نیکی کرنے کو آمادہ تھے، ان کے ماتحت ان کی وفات تک ان کے وفادار رہے۔“

اردو شاعروں کے متعلق مشہور ہے اور اس بات میں بڑی حد تک صداقت ہے کہ وہ انعام و اکرام کی لالچ میں امراء اور فرمانرواؤں کی تعریف کرتے ہیں لیکن اس میں کہیں کہیں استثناء بھی ہے۔ داغ دہلوی کو حیدرآباد میں ہر طرح کا اعزاز نصیب تھا اور نواب محسن الملک مرحوم سے ان کی کوئی غرض وابستہ نہیں تھی لیکن ان کے اوصاف حمیدہ نے ان کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا:

مہدی کو اگر خیر زماں کہتے ہیں
یا محسن ملک ان کو یہاں کہتے ہیں
زیبا ہے کہیں محسن عالم اے داغ
جو چاہیے کہنا وہ کہاں کہتے ہیں

ایک اور قطعہ کا مضمون ہے:

اس خیر کا انساں کوئی ہو تو سہی
ذی مرتبہ ذی شاں کوئی ہو تو سہی
ہر شخص کی ملحوظ ہے خاطر داری
یوں دل کا نگہباں کوئی ہو تو سہی

اس تعریف کو بے لوث ہی کہا جائے گا اور ان الفاظ کو شاعر کے دلی جذبات کا اظہار ہی خیال فرمائیں گے۔

محسن الملک کی قومی خدمات بھی بے غرض و بے ریا تھیں، وہ قومی ترقی کے لیے بے چین رہتے تھے اور انہوں نے اپنی حیات مستعار کا بیشتر حصہ قوم کو ترقی دینے میں صرف کیا، چنانچہ شملہ میں جب آپ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو اس وقت بھی وہ قوم کو صلاح و فلاح ہی کے کام میں لگے ہوئے تھے، وہ مسلمانوں کے حقوق کی توسیع کی کوششیں کر رہے تھے، اس سلسلہ میں وائسرائے اور دیگر اعلیٰ احکام سے ملاقاتیں کیں، ان کے دل میں قوم کے سوز و بہبود کی جو لگن تھی وہ دوسروں کو بھی متاثر کیے بغیر نہ رہی۔

تعلیم ملی کا بھی انہیں پورا خیال تھا، خود انہوں نے بنیادی طور پر قدیم تعلیم حاصل کی تھی، دینی اور مذہبی تعلیم سے ان کی تعلیمی زندگی کا آغاز ہوا تھا، لہذا وہ قوم کے تمام نونہالوں کے لیے بھی ضروری سمجھتے تھے کہ ان کو دینی تعلیم بچپن ہی میں دینی چاہیے کیونکہ اس وقت دل و دماغ پر جو اثرات مرتب ہو جاتے ہیں وہ پوری زندگی قائم رہتے ہیں، وہ آج کل کے روشن خیالوں کی طرح اس کو تضحیح اوقات نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کا خیال تھا کہ زندگی کو صحیح خطوط پر چلانے اور اس میں توازن قائم رکھنے کے لیے یہی بہترین طریقہ کار ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ جدید علوم کو بے کار اور غیر ضروری سمجھتے تھے، ان کی زندگی کا بیشتر حصہ ایم، اے، او کالج کے انتظامات میں صرف ہوا جہاں بنیادی طور پر جدید علوم ہی کی تعلیم ہوتی تھی اور جس سے فارغ ہونے کے بعد مسلمان نوجوان کا رزاق حیات میں داخل ہوتے تھے۔

اگرچہ نواب محسن الملک نے علوم متداولہ کی تکمیل کے فوراً بعد ہی ایک دفتر میں ملازمت کر لی اور نو عمری میں ہی فکر معاش میں لگ گئے لیکن علم سے انہوں نے خود کو اس وقت بھی وابستہ رکھا۔ کتب بینی کا جو چسکا انہیں اوائل عمر میں پڑ گیا تھا، وہ مرتے دم تک قائم رہا، انہوں نے اس قدر مطالعہ کیا کہ اپنے معاصرین میں ان کا علمی تفوق تسلیم کر لیا گیا، ان کی تحریریں ان کی وسیع معلومات پر دلالت کرتی ہیں۔ انہوں نے ”تہذیب الاخلاق“ کے لیے جو مضامین

لکھے ان کے مواد اور طرز استدلال سے ان کے علمی تبحر کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہیں دینی علوم سے خاص شغف رہا اور اس دائرہ میں بھی انہوں نے اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے مذہب کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کا بھی نہایت گہرا مطالعہ کیا، چنانچہ شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

”یہ صفت مولوی مہدی علی میں تھی کہ وہ حقیقت میں مذہبی عالم تھا، وہ فقط مسلمانوں کے شیعہ اور سنی وغیرہ فرقوں کے مذہب ہی سے خوب واقف نہ تھا بلکہ وہ دنیا کے تمام مذاہب کے حقائق سے آگاہ تھا، اس نے دنیا کے مذاہب کا علم حاصل کرنے کے لیے اپنا بہت سا وقت انگریزی کتابوں کے مطالعہ میں خرچ کیا تھا اور بعض کتابوں کے ترجمے کرانے میں اپنا روپیہ بھی صرف کیا تھا، دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اس کے ذہن میں ایسی موجود تھی جیسی کہ اپنے مذہب کی، وہ اور مذاہب کو جان کر اسلام کی برتری ان پر ثابت کرتا تھا، وہ مسلمانوں کے تمام تعصبات اور توہمات کو قرآن اور حدیث اور علماء کے اقوال سے استدلال کر کے دور کرنے کی کوشش کرتا تھا۔“

مختلف مذاہب کے اسی گہرے مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے بائیس سال کی عمر میں شیعہ مذہب ترک کر دیا اور ایک راسخ العقیدہ سنی مسلمان ہو گئے، آیاتِ بینات کے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں:

”..... میں اپنے خدائے بزرگ و برتر کا ہزار ہزار شکر کرتا ہوں کہ میں ان چند آدمیوں میں سے ہوں جنہوں نے اپنی نجات کی امید پر دونوں مذاہب کے اصول پر انصاف سے غور کیا اور مذہب اہل سنت کو مطابق کلام الہی کے پا کر اور مذہب امامیہ کو اس کے مخالف دیکھ کر اپنے آبائی دین کو چھوڑنے اور تمام کنبے قبیلے سے جدا ہونے میں کچھ کسی کا لحاظ و خیال نہیں کیا اور امامیہ مذہب کو جو مصرع ”برعکس نہند نام زنگی کا فور“ کے مخالف عقائد ائمہ کرام کے ہے چھوڑ کر سچا

مذہب اہل سنت و جماعت اختیار کیا۔“

نواب محسن الملک نے تصنیفی کام کی ابتدا بھی شروع ملازمت کے وقت کر دی تھی، آپ کی پہلی تصنیف رسالہ ”میلا د شریف“ ہے جو ۱۸۶۰ء میں چھپا تھا۔ تحصیل داری کے زمانہ میں قانون سے متعلق دو کتابیں لکھیں ایک ”قانون مال“ اور دوسری ”قانون فوج داری“۔

حیدرآباد کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد انہوں نے سرسید کے رسالہ ”تہذیب الاخلاق“ میں مستقل مضمون نگار کی حیثیت سے لکھنا شروع کیا، اس رسالہ میں ان کے جو مضامین شائع ہوئے، وہ مذہبی اور تاریخی حیثیت کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی وسیع النظری اور تبحر علمی پر دلالت کرتے ہیں۔ رام بابو سکسینہ ان مضامین کے بارے میں رقم طراز ہیں:

”تہذیب الاخلاق میں اکثر بیش بہا مضامین انہی کے قلم سے ہیں جو ایک مذہبی اور تاریخی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی غرض اصلی صرف یہ ہے کہ زمانہ حال کے مسلمان جو نکبت و ہلاکت کے گڑھے میں پڑے ہوئے ہیں اپنے بزرگانِ سلف کے قدم بہ قدم اور اپنے آپ کو ہر حیثیت میں، یعنی تعلیم و اخلاق و سیاست کے اعتبار سے کامیاب بنائیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تمام مضامین ان کے تبحر علمی، وسیع النظری اور انصاف پسندی کے شاہد عدل ہیں۔“

ان مضامین کے علاوہ ان کی مستقل تصانیف آیاتِ بینات، کتاب المحیط والسوق، تقلید اور عمل بالحدیث اور مجموعہ تقاریر شائع ہوئیں۔ ان سب میں آیاتِ بینات کو فوقیت حاصل ہے، بلکہ سچ پوچھئے تو مصنف کی حیثیت سے وہ اسی کی وجہ سے زیادہ مشہور ہوئے، آیاتِ بینات کی تصنیف کی ضرورت کیوں پیش آئی! اس کی داستان خود مصنف کی زبانِ قلم سے سنیے وہ لکھتے ہیں:

”چونکہ میرے عزیز و قریب اور بھائی بھتیجے اکثر اپنے قدیم مذہب (شیعہ) پر ہیں اور مجھے گمراہ جانتے ہیں، اس لیے میں ان پر ان دلائل عقلیہ کو ظاہر کرتا

ہوں جنہوں نے میرے دل کو ان کے مذہب سے متنفر کیا، اور ان شواہد نقلی کو بیان کرتا ہوں جن کے سبب سے میں نے مذہب اہل سنت و جماعت کو اچھا جان کر اختیار کیا۔ اسی واسطے میں یہ رسالہ اہل سنت و جماعت کی خوبیوں میں لکھتا ہوں، خدا کرے کہ میرے اور بھائی اس کو نظر انصاف سے دیکھیں اور اپنے باطل عقیدوں کو چھوڑیں، اللہم آمین۔“

سنائے کہ نواب محسن الملک مرحوم نے جب اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر مذہب اہل سنت و الجماعت اختیار کر لیا تو لوگوں میں بڑی چہ میگوئیاں ہوئیں۔ بعض حضرات نے ان کے اعزاء سے تبدیلی عقائد کا سبب دریافت کیا جس کے جواب میں ان کو بتایا گیا:

”خود مہدی علی کی مذہبی معلومات محدود اور ناقص تھیں، اس لیے ان کے بعض

ملنے والوں نے بہکا سکھا کر انہیں اپنی راہ پر لگا لیا۔“

یہ بات محسن الملک مرحوم کو بھی معلوم ہوئی، انہیں اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے یہ کتاب لکھنی پڑی، اس میں انہوں نے پوری طرح بتا دیا کہ ”میں نے ناقص معلومات کی بنا پر مذہب تبدیل نہیں کیا بلکہ مذاہب کے گہرے مطالعہ نے مجھے اس اقدام پر مجبور کیا ہے۔“

آیاتِ بینات کا منظر عام پر آنا تھا کہ ایک شورش برپا ہو گئی، چونکہ اس میں انہوں نے بہت سے شکوک و شبہات کا اظہار کیا تھا اور شیعہ مذہب پر بہت سے اعتراضات کیے تھے، اس لیے فریق مخالف کی جانب سے جواب دیا جانا ضروری سمجھا گیا، ان کے ایک عزیز نے جواب میں ایک کتاب لکھی جو دو ضخیم جلدوں پر مشتمل تھی، آیاتِ بینات کے وزن پر اس کا نام آیاتِ محکمات رکھا گیا۔ لیکن سچ پوچھئے تو اس کتاب کی ضخامت کو غیر ضروری تفصیلات اور ضرورت سے زیادہ جلی خط سے بڑھایا گیا تھا، ایک صفحہ پر قال کے عنوان سے اعتراض ہے اور دوسرے صفحہ پر اس کا جواب، پھر جواب کے طور پر وہی گھسی پٹی روایات دہرا دی گئی ہیں جن کو رد کیا جا چکا تھا، دونوں کتابوں کے طرز بیان اور طریقہ استدلال کو ملا کر دیکھ لیا جائے تو ایسا معلوم ہوگا کہ ”آیاتِ محکمات“ کو لکھ کر اس کے مصنف نے گویا منہ چڑایا ہے۔

جہاں تک آیاتِ بینات کا تعلق ہے تحفہ اثنا عشریہ کے بعد اپنی نوعیت اور شان کی یہ ایک منفرد تصنیف ہے، تحفہ میں فرقہ اثنا عشریہ اور دیگر شیعہ فرقوں کے بارے میں کثیر معلومات یکجا کر دی گئی ہیں جو یقیناً قیمتی ہیں، لیکن اس کتاب کا انداز بیان یہ ہے، اس کے مقابلہ میں ”آیاتِ بینات“ کا انداز مناظرانہ ہے۔ یہ نقش ایک ایسی ہستی کے موقلم نے تیار کیا ہے جو تمام جزئیات و تفصیلات اور باریکیوں سے واقف تھی اور جس نے دونوں مذاہب کا عمیق مطالعہ کر کے شیعہ مذہب کی خامیوں اور کوتاہیوں کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ اس کتاب میں بعض وہ معلومات فراہم کی گئی ہیں جن سے عام طور پر لوگوں کو واقفیت نہیں تھی، مثلاً: ”طینت“ کا مسئلہ۔ کافی پڑھے لکھے لوگ بھی اس عقیدہ کا تصور نہیں کر سکتے تھے جو اس مسئلہ سے وابستہ ہے۔ محسن الملک نے عام آدمیوں کو نہ صرف اس سے روشناس کرایا بلکہ اس کے علاوہ اور بھی متعدد عجائبات و طلسمات ہیں جن کو اس کتاب نے بے نقاب کیا ہے۔

کتاب کا اندازِ بیان نہایت دل کش ہے، اس میں سنجیدگی، وقار اور اثر و تاثیر ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔ ہر بات کی تائید یا تردید میں کئی کئی دلیلیں پیش کی گئی ہیں اور وہ سب ہی قوی ہیں۔ کتاب کا موضوع اگرچہ مذہبی مسائل ہے لیکن لہجہ یا عبارت میں کہیں بھی بیہوشی کی جھلک دکھائی نہیں دیتی بلکہ بعض جگہ مصنف نے مزاحیہ اور ظریفانہ انداز اختیار کر کے زبان کے حسن کو اور بھی نکھار دیا ہے۔

یہ کتاب مناظرہ کرنے والوں کے لیے تو ایک قیمتی تحفہ ہے ہی، ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے بھی ایک قابل مطالعہ کتاب ہے۔ ہر شخص کے واسطے ضروری ہے کہ وہ اپنے ایمان کو تازہ اور عقائد کو مضبوط کرنے کے لیے یہ کتاب نہایت توجہ سے پڑھے۔ اگر ایسا کیا گیا تو یقین ہے کہ راہِ راست سے بھٹکنے کے امکانات بہت کم ہو جائیں گے۔

بشکر یہ

جناب ثناء اللہ صدیقی - کراچی



دیباچہ از مصنف

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى نَبِيِّهِ وَحَبِيبِهِ سَيِّدِ الْمُرْسَلِينَ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَأَزْوَاجِهِ وَأُمَّتِهِ أَجْمَعِينَ .

بعد حمد و صلوة کے جاننا چاہیے کہ خدائے عزوجل نے ہماری ہدایت کے واسطے اپنا محبوب پیغمبر بھیجا اور اپنا خاص کلام اس پر نازل کیا اور رہنمائی کا چراغ اس کے ہاتھ میں دیا اور اپنی کمال مہربانی سے شرک اور کفر کی تاریکی سے نکال کر ہمارے دلوں کو نورِ ایمان سے روشن کیا۔ پس ایمان اور اسلام اس کی ایک ایسی نعمت ہیں کہ ہم اس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے، لیکن شیطان نے ایمان کے بعد اکثر مسلمانوں کو بہکایا اور ان کے دلوں کو باطل عقیدوں سے پھر تاریک کر دیا اور مسلمانوں میں ایسا تفرقہ ڈال دیا کہ بہتر فرقے گمراہ ہو گئے جن کی نسبت ہمارے رسول ﷺ نے پہلے ہی سے خبر دی تھی۔ پس ہم لوگوں کو فقط اسلام کے نام پر خوش ہونا اور صرف توحید و نبوت کے اقرار پر اپنے آپ کو ناجی سمجھنا نہ چاہیے بلکہ ہر عقیدے کی تحقیق کرنا اور ہر اعتقادی مسئلے کو کتاب اللہ اور کتاب الرسول سے تطبیق دینا ضروری ہے، اور یہ ممکن نہیں ہے کہ جو شخص اپنے سچے اور صاف دل سے صرف اپنی نجات کی امید پر خدا کی کتاب کو دیکھے اور تعصب اور عناد کو دخل نہ دے وہ حق اور باطل میں تمیز نہ کر سکے اور ایسے حق کے طالب کو خدا گمراہی میں پڑا رکھے، ہاں جو کوئی پہلے ہی سے سچائی کا طالب نہ ہو اور مذہبی تعصب میں گرفتار ہو اور سوائے مجادلے اور مکابرے کے اسے اور کچھ منظور نہ ہو اور اپنے آبائی دین و مذہب کو تقلیداً سچ جانتا اور ﴿إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّقْتَدُونَ﴾ کہتا ہو بے شک اپنی گمراہی میں پڑا رہے گا اور اپنے دل کو باطل عقیدوں سے کبھی پاک و صاف نہ کر سکے گا۔

بعد اس تمہید کے بندہ گنہگار مہدی علی بن سید ضامن علی غفر اللہ ذنوبہ اپنے بھائیوں کی خدمت میں التماس کرتا ہے کہ منجملہ مذاہب مختلفہ مسلمانوں کے دو مذاہب زیادہ جاری ہیں، ایک اہل سنت و الجماعت دوسرا امامیہ۔ دونوں اپنے مذہب کو حق اور دوسرے مذہب کو باطل کہتے ہیں اور اپنے آپ کو ناجی اور دوسرے کو ناری سمجھتے ہیں۔ ہزاروں کتابیں تالیف ہو گئیں اور صد ہا رسالے تحریر ہوئے مگر یہ جھگڑا اب تک طے نہ ہوا، جس کا جو عقیدہ تھا وہ اس پر قائم رہا۔ بہت کم ایسے ہیں جنہوں نے حق پر نظر کر کے اپنے آبائی دین کو چھوڑا ہو، دوسرے مذہب کو صرف اپنی نجات کے لیے اختیار کیا ہو لیکن میں اپنے خدائے عزوجل کا ہزار ہا شکر کرتا ہوں کہ میں ان چند آدمیوں میں سے ہوں جنہوں نے اپنی نجات کی امید پر دونوں مذہب کے اصول پر انصاف سے غور کیا اور مذہب اہل سنت کو کلام الہی کے مطابق پا کر اور مذہب امامیہ کو اس کے مخالف دیکھ کر اپنے آبائی دین کو چھوڑنے میں تمام کنبے قبیلے سے جدا ہونے میں کچھ کسی کا خیال و لحاظ نہیں کیا اور امامیہ مذہب کو جو فحوائے مصرع:

برعکس نام نہند زنگی کافور

کے مخالف عقائد ائمہ کرام کے ہے چھوڑ کر سچا مذہب اہل سنت و جماعت کا اختیار کیا، چونکہ میرے عزیز واقارب اور بھائی بھتیجے اکثر اپنے قدیم مذہب پر ہیں اور مجھے گمراہ جانتے ہیں اس لیے میں ان پر ان دلائل عقلیہ کو ظاہر کرتا ہوں جنہوں نے میرے دل کو ان کے مذہب سے متنفر کیا اور ان شواہد نقلیہ کو بیان کرتا ہوں جن کے سبب سے میں نے مذہب اہل سنت و جماعت کو اچھا جان کر اختیار کیا، اسی واسطے میں یہ رسالہ اہل سنت و الجماعت کے مذہب کی خوبیوں میں لکھتا ہوں، خدا کرے کہ میرے اور بھائی اس کو نظر انصاف سے دیکھیں اور اپنے باطل عقیدوں کو چھوڑ دیں۔ اَللّٰهُمَّ اٰمِیْن .



تمہید

یہ سب پر ظاہر ہے کہ دونوں مذاہب کا اصل اختلافی مسئلہ معاملہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمعین کا ہے۔ اہل سنت ان کو اچھا جانتے ہیں اور شیعہ ان کو برا سمجھتے ہیں، بلکہ جس طرح پر اہل سنت ان کو تمام امت سے مرتبہ میں اعلیٰ و افضل اور ایمان اور اسلام میں سب سے بہتر اور کامل جانتے ہیں اسی طرح پر شیعہ ان کو سب سے زیادہ تر برا اور خراب حتیٰ کہ مرتد اور کافر کہتے ہیں۔ پس درحقیقت یہی ایک مسئلہ ایسا ہے جس پر ان دونوں مذاہب کی حقیقت اور بطلان کا مدار ہے۔ یعنی اگر موافق اصول مذہب اہل سنت کے صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایمان اور اسلام میں کامل ہونا اور مرتے دم تک ان کا اس پر ثابت قدم رہنا ثابت ہو گیا تو بلاشبہ سنیوں کا مذہب حق اور شیعوں کا مذہب باطل، اور اگر برخلاف اس کے ان کا کافر اور مرتد ہونا (نعوذ باللہ من ذالک) معلوم ہوا تو شیعوں کا مذہب سچا اور سنیوں کا مذہب جھوٹا ہے..... اس واسطے ہم اوّل صحابہ رضی اللہ عنہم کے فضائل بیان کرتے ہیں، پھر خلافت راشدہ کو ثابت کریں گے، پھر مطاعن کا جواب جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی نسبت امامیہ کرتے ہیں، دیں گے۔



دلائل عقلی صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت میں

پہلی دلیل:

یہ بات سب جانتے ہیں کہ جب پیغمبر خدا ﷺ کو خدا نے عرب میں مبعوث کیا اور مکہ معظمہ میں اوّل اوّل حضرت کو اظہارِ نبوت کا حکم دیا تو اس وقت میں سب لوگ کافر اور مشرک تھے، اور آپ کے عزیز وقارب، رشتہ دار اور بھائی بند اس خبر کو سنتے ہی آپ ﷺ کے دشمن ہو گئے تھے اور آپ کی تکذیب کرتے تھے۔ کوئی مجنون کہتا تھا تو کوئی دیوانہ بتلاتا تھا۔ (نعوذ باللہ من ذالک) اور چھ برس تک باوجود دعوت اور اظہارِ معجزات کے صرف چند آدمی جو چالیس سے کم تھے مسلمان ہوئے، مگر چھ برس کے بعد کسی قدر مسلمانوں کی جماعت ہو گئی اور اسلام کی دعوت عام اعلانیہ ہونے لگی اور ارکانِ دین کو حضرت نے علی رؤس الاشهاد ظاہر کرنا شروع کیا، تب اہل مکہ نے یہاں تک تکلیف اور ایذا دینی شروع کی کہ آخر مکہ چھوڑنا اور مدینہ کو ہجرت کرنا پڑا اور اس کے بعد آہستہ آہستہ دین اسلام کی ترقی شروع ہوئی اور پھر اس قدر جلد اسلام پھیلا کہ چند سال کے عرصہ میں سیکڑوں سے ہزاروں کی اور ہزاروں سے لاکھوں کی نوبت آ گئی، اور جماعت کی جماعت اور فوج کی فوج خدا کے دین میں داخل ہو گئی۔

پس غور کرنے کا مقام ہے کہ جن لوگوں نے ابتدائے دعوت میں اسلام قبول کیا اور سب سے پہلے پیغمبر ﷺ کے کہنے کو سچ جانا اور اوّل ہی اوّل آپ کی نبوت کی تصدیق اور بلا توقف، بلا تامل کلمہ شہادت پڑھا اور بغیر صلاح اور مشورے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے اپنے قدیمی دین کو چھوڑ دیا اور اپنے بھائی بندوں سے علیحدہ ہو کر اوّل ہی اوّل آپ ﷺ کا دامن رحمت پکڑا اور اپنے دوست آشناؤں سے مخالفت کر کے اطاعت نبوی ﷺ کا بوجھ اپنی گردن پر رکھا تو ایسے لوگوں کے اسلام کا جو ایسے نازک وقت میں اپنے باپ دادا کے دین

کو چھوڑ کر نئے دین میں آئے کوئی نہایت قوی سبب ہوگا۔ ورنہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ اپنے قدیمی دین کو چھوڑنا اور نیا دین اختیار کرنا نہایت ہی مشکل ہوتا ہے اور اپنے عیش و آرام کا ترک کرنا اور مصیبت و ایذا میں پڑنا اور تکلیفیں اٹھانا بلا کسی خاص سبب کے کسی کو گوارہ نہیں ہوتا۔ پس اگر ہم ان اسباب کو سوچیں جن سے اوّل اوّل صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسلام قبول کیا تو صرف دو سبب معلوم ہوتے ہیں، یا دین کی خواہش اور نجات کی امید، یا دنیا کی طمع اور مال و دولت کی لالچ۔ اگر پہلے سبب کو ہم تسلیم کریں اور اس امر کو مانیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی نجات کی امید پر دین اسلام قبول کیا تھا اور صرف خدا کی رضا مندی کے لیے اپنے گھر بار کو چھوڑا تھا تو ہمارے وہم میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ پھر ایسے لوگ کسی وقت میں اس دین سے پھر گئے ہوں گے اور کبھی انہوں نے اس محبت کو جو ان کو ایمان اور اسلام کے ساتھ تھی دل سے نکال دیا ہو بلکہ ہم یقین کر سکتے ہیں کہ جن لوگوں نے صرف خدا کی رضا حاصل کرنے کے لیے اسلام کو مصیبت اور تکلیف کے وقت میں اختیار کیا ہوگا اور برسوں اس کے پیچھے رنج اور دکھ اٹھائے ہوں گے وہ کبھی اس دین سے نہ پھرے ہوں گے۔ اور اگر ہم دوسرے سبب پر نظر کریں کہ وہ لوگ دنیا کی طمع اور مال و دولت کے لالچ سے مسلمان ہوئے ہوں، تو یہ ایسی بات ہے کہ جس کی نسبت ہم فرضی خیال بھی نہیں کر سکتے اور نہ کوئی شخص جس کو ذرا ایمان اور عقل اور شرم کا پاس ہوگا اس امر کو خیال کر سکتا ہے..... اس لیے کہ ابتدائے اسلام میں جو کچھ دنیا کی طمع تھی وہ ظاہر، جو کچھ مال اور دولت کی حرص تھی وہ معلوم ہے۔ پس ثابت ہوا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایمان لانا اور مسلمان ہونا صرف نجاتِ آخرت کی امید پر تھا، اور جب اس امید پر ان کا ایمان لانا ثابت ہوا تو پھر اس سے ان کا پھرنا غیر ممکن تھا۔

دوسری دلیل:

جب ہم خلفائے راشدین اور مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم جمعین کی حالت پر نظر کرتے ہیں اور ان کے چال چلن پر خیال کرتے ہیں تو اس سے ہم کو یقین کامل ہوتا ہے کہ وہ قدم بہ قدم اپنے پیغمبر ﷺ کے چلتے تھے اور حرص و ہوا کو کسی کام میں دخل نہ دیتے تھے اور شب و روز

خدا اور اس کے رسول ﷺ کی رضا کے طالب رہا کرتے تھے۔ ان کے دشمن بھی اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ انہوں نے حضرت ﷺ کی رفاقت کا حق نہایت خوبی سے ادا کیا اور اپنی جانوں اور مالوں کو نہایت خوشی سے حضرت ﷺ پر فدا کیا، کون سی مصیبت رہ گئی کہ جو کفار نے ان کو نہیں دی، کون سی تکلیف باقی رہ گئی کہ مشرکین نے ان کو نہیں پہنچائی! جب کفار نے پیغمبر خدا ﷺ کو ستانا اور ایذا دینا شروع کیا اس وقت اصحاب نبی نے کیسی حمایت اور رفاقت کی اور دعوت اسلام میں کیسی سعی بلیغ فرمائی۔ جب عرب عامۃً اور قریش خاصۃً حضرت ﷺ کی ایذا دہی پر مستعد ہوئے تو اس وقت ”یارانِ وے خود را سپردے ساختے از مشرب عشق چہ باد ہا کہ نہ خوردند و چہ مستیہا کہ نکردند، و ہر گاہ کہ آنجناب بہ ہجرت و جہاد مامور شد اصحاب وے در مقابلہ کفار چہ رنجما کہ نہ کشیدند و چہ غمہا کہ نہ چشیدند“^۱ پس اگر خدا اور اس کے رسول ﷺ کی محبت ان لوگوں کو نہ تھی تو کیوں اپنی جانوں اور مالوں کو تلف کرتے تھے اور کیوں سختیاں اور مصیبتیں اپنے اوپر اٹھاتے تھے۔ سوچنا چاہیے کہ مہاجرین کو کس کے عشق نے گھروں سے نکالا اور انصار کو کس کی محبت نے دیوانہ کیا، آخر۔ شعر.....

رنگیں کہ کرد مرگا نم این چنیں

لعل و گہر کہ ریخت بدا مانم این چنیں

”میری آنکھوں کو اس طرح کون رنگین کر گیا اور میرے دامن میں لعل و گہر کس

نے بکھیر دیے۔“

میں حضرات شیعہ سے پوچھتا ہوں کہ صحابہ کبار اور مہاجرین و انصار رنج و مصیبت کے وقت میں نبی ﷺ کے ساتھ شریک ہوئے کہ نہیں اور مال و جان و عزت و آبرو کو آپ ﷺ پر نثار کیا یا نہیں، حضرت ﷺ کے پیچھے انہوں نے اپنے عزیزوں اور قریبوں کو چھوڑا یا نہیں، اسلام کے پھیلانے میں انہوں نے تکلیف اور ایذا پائی یا نہیں؟ پس یا ایسی بدیہیات سے

۱ ان کے دوستوں نے اپنے آپ کو ان کے لیے ڈھال بنایا اور میخانہ عشق و مستی کے کتنے جام لٹا دئے اور آنحضرت ﷺ

کو جہاد اور ہجرت کا حکم ہوا تو آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم نے کفار کے مقابلہ میں کیا کیا رنج نہ جھیلے۔

انکار کیجیے یا اقرار، چونکہ انکار کر ہی نہیں سکتے، اس لیے لازم آیا کہ اقرار کریں۔ اور اگر ان کی محنتوں اور کوششوں کا انکار کریں تو پھر ذرا انصاف بھی کریں کہ جس کے پیچھے انہوں نے یہ تکلیفیں گوارا کی ہوں گی ان کی نگاہ میں کیا کچھ بھی ان کی قدر و منزلت نہ ہوگی۔

اے یارو! تم کو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہی کی قسم ہے اگر مصیبت کے وقت میں تمہارا کوئی شریک ہو اور دکھ درد کی حالت میں کوئی تمہارا ساتھ دے اور اپنے بھائی بندوں کو چھوڑ کر تمہارے ہمراہ ہووے اور اپنی جان و مال کو تمہارے پیچھے ضائع کر دے تو تمہاری نگاہ میں اس کی کچھ بھی عزت اور تمہارے دل میں اس کی کچھ محبت ہوگی یا نہیں؟ اگر ہووے تو وہی مہاجرین و انصار کی نسبت حضرت ﷺ کی طرف سے سمجھو اور انصاف کرو کہ جس وقت لوگ چاروں طرف سے یا ساحر یا مجنون کہہ کر آپؐ کا دل دکھاتے ہوں گے اس وقت جو لوگ یا رسول اللہ اور حبیب اللہ! کہہ کر آپؐ کو پکارتے ہوں گے اور جب کہ خویش و اقارب آپ کے آپ کو ستاتے اور تکلیفیں دیتے ہوں گے اس وقت جو لوگ اپنا سینہ سپر کر دیتے اور حضرت ﷺ کو بچاتے ہوں گے، ان کی اس اعانت کی کیا کیا کچھ قدر و منزلت آپ ﷺ کے نزدیک ہوتی ہوگی!..... اے یارو! اگر انصاف کی آنکھ بند نہ کرو تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مرتبوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ کون شخص اس دنیا میں ایسا ہے کہ ان کے مرتبے پر پہنچے اور ان کا سادرجہ پاسکے۔ کہاں ہیں اب وہ رسول خدا کہ وہ دعوت کریں اور ان کے قبیلے کے لوگ ان کو جھٹلا دیں اور ہم میں سے کوئی سامنے آ کر صدقت یا رسول اللہ کہہ کر آپ ﷺ کے دل کو خوش کرے، کہاں ہے وہ وقت کہ پیغمبر خدا ﷺ ہجرت کریں اور غار میں جا کر چھپیں اور کوئی ہم میں سے اس وقت ساتھ ہووے ”اور یار غار“ کہلائے، کہاں ہے وہ زمانہ کہ فقراء مہاجرین کو لے کر حضرت مدینے میں پہنچیں اور مدینے والے اپنے اوپر مصیبت گوارا کر کے ان کو اپنے گھروں میں ٹھہرائیں اور ”انصار“ کہلائیں، کیا اب وہ دن پھر مل سکتے ہیں کہ پیغمبر خدا ﷺ بدر کی لڑائی پر جائیں اور ہم لوگ حضرت کے ساتھ ہوں اور ہماری مدد کے لیے خدا ملائکہ کو بھیجے اور لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ کہہ کر اپنی رضا مندی ظاہر فرمائے۔

اے بھائیو! وہ زمانہ گزر گیا، وہ وقت باقی نہیں رہا، جن کو وہ نعمت ملنے والی تھی مل گئی، جن کو یہ دولت حاصل ہونے والی تھی ان کو حاصل ہو چکی، جو لوگ مہاجرین میں داخل ہونے والے تھے وہ مہاجرین میں شامل ہو گئے اور جو انصار میں داخل ہونے والے تھے وہ انصار میں داخل ہو چکے، اب ہزار جان و مال کو کوئی نثار کرے مگر ﴿وَالسَّابِقُونَ الْأُولُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ﴾ کی فضیلت پا نہیں سکتا، تمام جہان کی کوئی دولت لٹا دے مگر اصحاب بدر یا یارانِ بیعت رضوان میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ان دولتوں کو لینے والے لے گئے، ان نعمتوں کو لوٹنے والے لوٹ لے گئے۔ شعر

حریفان بادھا خور دندورفتند

تھی خمخانہا کردندورفتند

”مقابل لوگ باوجود خوری کر کے میکدہ خالی چھوڑ کر جا چکے۔“

اے یارو! جن لوگوں نے بلا واسطہ پیغمبر خدا سے تعلیم پائی اور جن شخصوں نے خود صاحب شریعت سے ہدایت حاصل کی کیوں کر تمہارے دل میں ان کی محبت اور تمہاری نظروں میں ان کی قدر و منزلت نہیں ہے۔ کیا تمہاری عقل اس کو قبول کرتی ہے کہ ان ہزاروں، لاکھوں آدمیوں میں جو برسوں پیغمبر ﷺ کی صحبت اور رفاقت میں رہے کسی کے دل پر ایمان کامل کا اثر نہ ہو اور ان بے شمار آدمیوں میں جو نمازوں اور جہادوں میں حضرت ﷺ کے شریک رہے کوئی اسلام پر ثابت قدم نہ رہا، باوجودیکہ سفر اور حضر میں آپ ﷺ کے ہمراہ رہے، شب و روز اپنے کانوں سے وعظ و نصیحت سنتے رہے، اپنی آنکھوں سے جبرئیل علیہ السلام کا آنا، وحی کا لانا دیکھتے رہے لیکن اپنے نفاق اور کفر سے (والعیاذ باللہ منہ) باز نہ آئے، گو کہ حضرت نے طرح طرح کے معجزات ان کو دکھلائے، انواع انواع کی دعائیں ان کے حق میں فرمائیں، لیکن نہ کسی معجزے کا ان پر اثر ہوا، نہ کوئی دعا ان کے حق میں مقبول ہوئی..... بھلا انصاف کرو کہ کوئی مسلمان ایسا عقیدہ رکھے گا اور اپنے پیغمبر کی شان کو داغ لگائے گا اور اس کے تمام شاگردوں اور کل مریدوں کو کافر اور مرتد کہے گا..... ذرا سوچو تو سہی کہ اگر کسی عالم

کے تمام شاگرد جاہل رہیں اور کسی امیر کے مصاحب سب کے سب بدچلن ہوں اور کسی ولی کے مرید کلہم اجمعین فاسق و فاجر ہوں تو کیا اس سے کچھ بدظنی اس عالم اور اس امیر اور اس ولی کی نسبت لوگوں کو نہ ہوگی، بے شک ضرور ہوگی..... پس اسی طرح پر تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کے کفر و ارتداد پر اعتقاد رکھنا در پردہ حضرت ﷺ کی نبوت میں داغ لگانا ہے۔ (ونعود باللہ من ذالک).

تیسری دلیل:

اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ پیغمبر خدا ﷺ ایسے وقت میں مبعوث ہوئے کہ لوگ توحید سے منکر ہو گئے تھے، دین ابراہیمیٰ میں تحریفیں کرنے لگے تھے، جانوروں کی طرح آپس میں لڑتے اور وحشیوں کی مانند باہم جھگڑتے تھے، علم اور حکمت سے بے بہرہ ہو گئے تھے، اخلاق حسنہ کو چھوڑ کر جاہلانہ رسموں کے پابند ہو گئے تھے۔ چنانچہ اللہ جل شانہ، نے توحید کے بتلانے، شرک کے چھڑانے، عبادت کے طریقے سکھانے، دین ابراہیمیٰ کے جاری کرنے، اخلاق حسنہ کی تعلیم دینے کے لیے حضرت محمد ﷺ کو نبوت اور رسالت کا مرتبہ دیا اور تمام بنی آدم کی ہدایت کا بار آپ کے اوپر رکھا اور چونکہ حضرت ﷺ کے بعد خدا کو دوسرا نبی بھیجنا منظور نہ تھا اور سلسلہ نبوت آپ ﷺ کی ذات پر ختم کرنا منظور تھا، اس لیے جو فضائل اور کمالات اور معجزات جدا جدا اور انبیاء علیہم السلام کو دیے گئے اور جو طریقے ہدایت اور تعلیم کے علیحدہ علیحدہ اور پیغمبروں کو سکھلائے گئے تھے وہ سب حضرت کو سکھائے گئے بلکہ اس نظر سے کہ کوئی فرقہ، کوئی گروہ آپ کے فیضان نبوت سے محروم نہ رہے اور آپ کی ہدایت اور تعلیم سے مثل اور بعض نبیوں کے بے اثر نہ ہو جائے اور کسی کو کوئی عذر ایمان اور اسلام لانے پر باقی نہ رہے اور کسی کو آپ کی نبوت کے انکار کرنے کا موقع نہ ملے وہ معجزات حضرت ﷺ کو دیے گئے جو کسی نبی کو نہیں دیے گئے اور ان باتوں کی اجازت آپ کو دی گئی کہ اور کسی پیغمبر کو نہیں دی گئی۔ اس واسطے آپ کی ہدایت کا اثر جلد اور کامل ہوا اور کچھ ایک ہی ذریعہ سے نہیں بلکہ مختلف ذریعوں سے لوگوں نے ایمان کو قبول کیا۔ جو فصحاء اور بلغاء مشہور تھے وہ

قرآن مجید کی فصاحت دیکھ کر قائل ہو گئے اور جو لوگ علم و حکمت کا دعویٰ کرتے تھے وہ آپ کی حکیمانہ تعلیم دیکھ کر معتقد ہو گئے، جو اشخاص معجزے کے طالب تھے وہ معجزات دیکھ کر ایمان لائے، جو لوگ شجاعت اور مردانگی میں مشہور تھے وہ میدان جنگ میں تابِ مقابلہ نہ لا سکے آخر مغلوب ہو کر مطیع بن گئے اور جو غرض اللہ جل شانہ کی آپ کی نبوت سے تھی کہ دین اسلام تمام دنیا میں پھیل جائے اور باطل دینوں پر غالب ہو جائے، وہ حاصل ہو گئی۔ لیکن یہ فائدہ جو بعثت نبوی ﷺ سے ہوا صرف اہل سنت کے اصول کے مطابق ثابت ہوتا ہے اور موافق اصول مذہب شیعہ کے ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ جو لوگ حضرت کے سامنے ایمان لائے جب ان کی نسبت یہ اعتقاد کیا جائے کہ ایمان اور اسلام میں کامل تھے اور دل سے حضرت ﷺ کی نبوت کے معتقد تھے اور مرتے دم تک اس پر ثابت قدم رہے تو یہ امر البتہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ حضرت ﷺ کی ہدایت سے جو غرض تھی حاصل ہو گئی، مگر جب ان کی نسبت یہ خیال کیا جائے کہ وہ ظاہر میں مسلمان تھے اور باطن میں (عیاذ باللہ) کافریا حضرت کی وفات کے بعد ہی مرتد ہو گئے تو کس کے منہ سے یہ بات نکل سکتی ہے کہ حضرت کی ہدایت سے کچھ فائدہ ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ جو اعتقاد شیعوں کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نسبت ہے اس سے آپ ﷺ کی نبوت پر الزام آتا ہے اور سننے والے کو مذہب اسلام پر شبہ ہوتا ہے، اس لیے کہ جب کوئی اس امر پر یقین کرے کہ جو لوگ حضرت پر ایمان لائے ان کے دلوں پر کچھ اثر ایمان اور اسلام کا نہ تھا اور وہ صرف ظاہر میں مسلمان اور (عیاذ باللہ) باطن میں کافر تھے یا حضرت کے انتقال کرتے ہی وہ اس سے پھر گئے، وہ حضرت کی نبوت کی تصدیق کر نہیں سکتا اور کہہ سکتا ہے کہ اگر حضرت سچے نبی ہوتے تو کچھ نہ کچھ ان کی ہدایت میں تاثیر ہوتی اور کوئی نہ کوئی دل سے ان پر ایمان لایا ہوتا اور منجملہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے جو ان پر ایمان لائے سو دو سو آدمی تو ایمان پر ثابت قدم رہتے۔ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تمہارے عقائد باطلہ کے موافق اسلام اور ایمان میں کامل نہ تھے تو پھر وہ لوگ کون سے ہیں جن پر حضرت ﷺ

کی ہدایت کا اثر ہوا، اور وہ کتنے ہیں جن کو حضرت ﷺ کی نبوت سے فائدہ ہوا۔ اگر اصحاب رسول ﷺ معدودے چند کے سوا بقول تمہارے سب کے سب (عیاذاً باللہ) منافق اور مرتد تھے تو دین اسلام کو کس نے قبول کیا اور پیغمبر ﷺ کی تعلیم و تلقین سے کس کو نفع پہنچا، کن لوگوں نے حضرت ﷺ کے کہنے سے شرک چھوڑ کر توحید پر اعتقاد کیا، کن شخصوں نے عبادت کے طریقوں کو سیکھا، کس گروہ نے دین محمدی ﷺ کو جاری کیا، کس فرقے نے ایمان کو پھیلایا؟

اے یارو! تم کو تو اس کا نام لینا اور پیغمبر صاحب ﷺ کی نبوت کا اقرار ظاہری بھی نہ کرنا چاہیے۔ اگر پیغمبر ﷺ پر ایمان لانے والوں میں سو دوسو، ہزار دو ہزار کو تم کافر کہتے یا ان لوگوں کو جو بعد غلبہ اسلام کے مسلمان ہوئے، تم منافق جانتے تو صبر آتا مگر افسوس تو اسی بات پر آتا ہے کہ تم انہی لوگوں پر اعتراض کرتے ہو جو سب سے پہلے اسلام لائے اور انہی کو منافق بتلاتے ہو جنہوں نے خدا کے دین کو جاری کیا اور ان ہزاروں لاکھوں آدمیوں میں سے جو حضرت ﷺ پر ایمان لائے تھے سوائے چار چھ شخصوں کے کسی کو اچھا نہیں کہتے ہو، بھلا کیوں کر ایسے عقیدے پر تعجب نہ آئے اور کیوں کر تمہاری اس گمراہی پر افسوس نہ ہو۔

چوتھی دلیل:

ہم لوگ کیا شیعہ اور کیا سنی پیغمبر ﷺ کی زیارت کو افضل ترین سعادت اور بہترین قربات سے سمجھتے ہیں اور چونکہ اب زمانہ آپ ﷺ کی حیات کا نہیں ہے، اس لیے آپ ﷺ کی قبر مبارک دیکھ لینے کو اور آپ ﷺ کے روضہ انور کی خاک آنکھوں میں لگانے کو غنیمت جانتے ہیں اور اسی کو بہترین سعادت سمجھتے ہیں اور اگر کوئی شخص خواب میں آپ ﷺ کی زیارت سے مشرف ہو جاتا ہے تو وہ بڑے بزرگوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور حقیقت میں جب تک کوئی شخص نہایت ہی نیک اور مخلص اور پرہیزگار نہیں ہوتا وہ خواب میں بھی سعادتِ زیارت سے مشرف نہیں ہو سکتا، پس نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ہم ان لوگوں کی بزرگی اور فضیلت کا کچھ بھی اعتقاد نہ کریں جو برسوں حضرت ﷺ کی زیارت کرتے

رہے اور رات دن آپ ﷺ کی صحبت میں حاضر رہے اور ہر لمحہ اور ہر ساعت آپ ﷺ کے دیدار سے مشرف ہوئے اور ہمیشہ آپ سے ہم کلام رہے اور نہ صرف زیارت اور صحبت کی سعادت پائی بلکہ حضرت ﷺ کے غم اور خوشی میں شریک رہے اور آپ ﷺ کی یاری اور مددگاری اعلاء کلمۃ اللہ میں کرتے رہے۔ ایات:

از وطنہا مہاجرت کردند
برالم ہا مصابرت کردند
در سفر ہمرکاب او بودند
در حضر ہم خطاب او بودند
ہمہ آثارِ وحی دیدہ ازو
ہمہ اسرارِ دین شنیدہ ازو
بانبی در شدائدو احوال
بذل ارواح کردہ و اموال
پایہ دین بلند ازین شاں شد
کارِ شرع ارجمند ازیشاں شد
رضی اللہ عنہم از سوی حق
بہر ایشاں بشارتِ مطلق ❶

غرض کہ صرف زیارت اور صحبت ہی حضرت سید الانبیاء علیہ التحیۃ و الثناء کی ایسی فضیلت

❶ اپنے وطنوں سے ہجرت کی اور مصیبتوں پر صبر کیا۔

سفر میں آپ کے ہمراہ رہے اور حضر میں بھی آپ کے مخاطب رہے۔

ان (حضور ﷺ) سے وحی کی تمام علامتیں اور نشانیاں دیکھیں اور دین کے تمام رموز آپ ﷺ سے سنے۔

مصائب اور پریشانیوں میں اپنے جان و مال کو نبی ﷺ پر قربان کیا۔

دین کا پایہ ان حضرات سے بلند ہوا اور شریعت (محمدی ﷺ) کو ان سے عزت ملی۔

اور بلا قید و شرط ان کو اللہ کی طرف سے رضی اللہ عنہم (اللہ ان سے راضی ہو گیا) کی خوشخبری ملی۔

ہے کہ کوئی بزرگی اس کو نہیں پاتی نہ کہ جب اس کے ساتھ اور بھی فضائل ذاتی صحابہ رضی اللہ عنہم میں موجود ہوں تو پھر ان کے مدارج اور مراتب کی کیا انتہا ہے۔

پانچویں دلیل:

اس امر کو سب مسلمان تسلیم کرتے ہیں کہ مکہ اور مدینہ اسلام کی ابتدا اور ترقی کے مقام ہیں اور انہیں دو جگہوں کی سب دنیا سے بڑھ کر عزت ہے۔

ایک خدا کا گھر اور رسول ﷺ کا مولد ہے دوسرا حضرت کا شہر اور مدفن ہے۔ مکہ معظمہ میں اسلام کی بنیاد قائم ہوئی اور مدینہ منورہ میں اس کی ترقی ہوئی اور ان دونوں جگہوں کی ایسی بزرگی ہے کہ کبھی کوئی باطل مذہب ان میں پھر جاری نہ ہوگا اور دجال ملعون کا بھی گزر ان میں نہ ہوگا۔ پس ہم کو غور کرنا چاہیے کہ ان دونوں شہروں کے رہنے والے اب تک صحابہ رضی اللہ عنہم کی نسبت کیسا اعتقاد رکھتے ہیں، جو کچھ ان کا اعتقاد ہو اسی کو اصل ایمان سمجھنا چاہیے..... پس خدا کے فضل سے ان دونوں شہروں کے رہنے والے بلکہ تمام عرب کے باشندوں کا جو اعتقاد صحابہ رضی اللہ عنہم کی نسبت ہے وہ ظاہر ہے۔ اگر ہم شیعوں کے موافق یہ کہیں کہ وہ سب کے سب گمراہ ہیں اور باطل اعتقاد پر اب تک قائم ہیں تو اس سے اصل مذہب اسلام پر بڑا الزام آتا ہے کیونکہ خداوندِ عالم نے جہاں اپنے نبی ﷺ کو پیدا کیا اور جہاں اپنے پیغمبر ﷺ کا مدفن بنایا اور جن جگہوں کو عرش و کرسی کے برابر رتبہ دیا اور جہاں سے اسلام اور ایمان جاری کیا انہیں جگہوں کے رہنے والوں کو خدا نے اب تک باطل اعتقاد پر قائم رکھا اور ان لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو جو تیرہ سو برس کے عرصہ میں وہاں پیدا ہوئے اور وہاں رہے گمراہ رکھا، اور گمراہی پر ان کا خاتمہ کیا اور ایک مومن کا گزر بھی وہاں نہ ہونے دیا اور اب تک خدائے عز و جل کو وہی اصرار ہے کہ انہی بد اعتقادوں سے مکہ اور مدینہ بھرا ہوا ہے اور وہی گمراہی اور ضلالت اب تک تمام عرب میں پھیلی ہوئی ہے اور باوجود گزر جانے اس قدر عرصہ دراز کے اب بھی کوئی مومن پاک بغیر تقیہ کے وہاں جانے نہیں پاتا اور اپنے ایمان و اعتقاد کو بخوف اپنی عزت اور جان کے ظاہر نہیں کر سکتا۔ قیامت تو قریب آگئی، اس دنیا کے دن ختم

ہونے کے نزدیک ہو گئے لیکن خدا ان ظالموں اور بد اعتقادوں سے اپنے گھر، اپنے رسول ﷺ کے گھر کو پاک نہیں کرتا اور مومنین سے ان شہروں کو آباد نہیں فرماتا اور گمراہوں کو ایسی پاک جگہ سے نہیں نکالتا، اگرچہ جس قدر زمانہ نبوت کا دور ہوتا گیا اور اسلام میں ضعف آتا گیا شیعوں کا مذہب ترقی پاتا گیا اور ان کے عقائد باطلہ کو رواج ہوتا گیا اور اکثر شہروں، اور ملکوں میں ان کی حکومت ہو گئی اور بادشاہت اور سلطنت بھی نصیب ہوئی لیکن بایں ہمہ مکہ مدینہ اور عرب میں جو دین پیغمبر خدا ﷺ کے وقت میں تھا وہی جاری ہے اور جو مذہب رسول مقبول ﷺ کے سامنے تھا وہی اب بھی ہے: شعر.....

ہست محفل براں قرار کہ بود

ہست مطرب براں ترانہ کہ بود ❶

ہم حیران ہیں کہ جب مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں اس تیرہ سو برس کے عرصہ میں ایک مسلمان پاک اعتقاد نہ ہو اور ایسی پاک جگہ میں کسی مومن پاک کا گزرنہ ہوا تو پھر وہ کون سا مقام ہوگا جہاں کے رہنے والے مومن اور مسلمان ہوں گے اور خدا کے گھر اور رسول ﷺ کے گھر کو چھوڑ کر کس کے گھر میں ایمان والے رہتے ہوں گے.....؟ اے بھائیو! بغیر اس کے کہ یہ امر قبول کیا جائے کہ اصل دین و مذہب وہی ہے جو مکہ اور مدینہ کے رہنے والوں کا ہے، کوئی دوسرا علاج نہیں ہے۔



شواہدِ نقلی صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت میں

ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل کے ثبوت میں تین قسم کی نقلی شہادتیں بیان کرتے ہیں:

۱- وہ شہادتیں جو تورات و انجیل میں مذکور ہیں۔

۲- وہ شہادتیں جو قرآن مجید میں مذکور ہیں۔

۳- وہ شہادتیں جو ائمہ کرام علیہم السلام سے کتب امامیہ میں مذکور ہیں۔

توریت و انجیل کی شہادتیں صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت میں:

اتنی بات تو امامیہ مذہب والے بھی جانتے ہیں کہ جس طرح اللہ جل شانہ، نے کتب سماویہ میں پیغمبر خدا ﷺ کا ذکر بطور پیش گوئی کے کیا ہے اور اس سے انکار اس لیے نہیں کرتے کہ خدا نے خود فرمایا ہے:

﴿مُحَمَّدًا رَسُولَ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ
تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا سِيِّئَاتِهِمْ فِي
وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ
كَزَّرَعٍ أَخْرَجَ شَطْعَهُ فَازْرَعَهُ فَاثْرَقَتْ فَأَنْغَلَظَتْ فَاسْتَوَى عَلَى سُوقِهِ يُعْجِبُ
الزَّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ (سورة الفتح: ۲۹)

”محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں سخت ہیں اوپر کفار کے، رحم دل ہیں آپس میں، دیکھتا ہے تو ان کو رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، چاہتے ہیں فضل خدا کا اور رضا مندی اس کی، نشانی ان کی ان کے چہرے پر ہے اثر سے سجدے کے۔ یہ ہے صفت ان کی بیچ انجیل کے اور بیچ توریت کے، جیسے کھیتی اپنا اکھوا نکالے پس قوی کرے اس کو، پس موٹے ہو

جائیں پس کھڑے ہو جائیں اپنی چھٹری کے اوپر، اچھی لگتی ہے کھیتی کرنے والے کو تا کہ غصہ میں لاوے اللہ بہ سبب ان مسلمانوں کے کافروں کو۔“
اب ہم ان مثالوں کو جو توریت و انجیل میں مذکور ہیں اور جن کی خبر خدائے جل شانہ نے اس آیت میں دی ہے بیان کرتے ہیں۔

پہلی شہادت توریت کی:

توریت کی کتاب استثناء کے تیرہویں باب کے چھٹے درس میں لکھا ہے کہ ”اگر تیرا بھائی یا بیٹا یا بیوی یا دوست کوئی تجھے پھسلا دے اور کہے کہ آؤ غیر معبودوں کی بندگی کرو، تو اس کے موافق نہ ہونا اور اس کی بات نہ سننا اور اس پر رحم کی نگاہ نہ رکھنا اور اس کی رعایت نہ کرنا اور اسے پوشیدہ نہ رکھنا بلکہ اس کو ضرور قتل کر ڈالنا، اس کے قتل پر پہلے تیرا ہاتھ پڑے۔“

پس غور کرنا چاہیے کہ جو کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمعین نے اس کو کر دکھایا اور جیسی کچھ شدت اور سختی کافروں پر چاہیے اس کا ظہور صرف پیغمبر ﷺ کے یاروں کے ہاتھ سے ہوا۔ اسی واسطے خدا نے ان کی شان میں ﴿أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ فرمایا۔ اگرچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمعین کی شدت اور صلابت کا جو دین میں تھی امامیہ انکار نہیں کر سکتے، مگر ہم ان کے اطمینان کے لیے حضرات شیخین کے حالات کو جو شیعوں کے بڑے دشمن ہیں اور ضمنی قریش کر کے ان میں مشہور ہیں، بیان کرتے ہیں اور زیادہ تو نہیں کہہ سکتے ہیں اتنا عرض کرتے ہیں کہ اپنی ہی کتابوں کی روایتوں کو سنیں اور پھر اس کو توریت کے مضمون سے اور قرآن شریف کی آیت سے ملائیں پھر خود ہی انصاف کریں اور اگر حیا و شرم مانع نہ ہو تو تعصب اور عناد کو چھوڑ کر ان کی فضیلت کا اقرار کریں اور اپنے باطل عقیدوں کو چھوڑ کر جماعت میں داخل ہو جائیں۔“

پہلی روایت کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ کے قتل کا ارادہ کیا:

شیعوں کے امام اعظم حضرت شیخ حلیؒ ۱ ”تذکرہ الفقہاء“ کی چھٹی فصل میں لکھتے ہیں کہ

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اُحد کے دن اپنے باپ کے قتل کرنے کا ارادہ کیا مگر حضرت ﷺ نے منع کر دیا اور فرمایا کہ تو جانے دے اور کوئی یہ کام کر لے گا۔ پس اے بھائیو خدا کے واسطے ذرا اپنے امام اعظمؓ کی تصدیق کو دیکھو کہ وہ صدیقیتِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی کیسی تصدیق کرتے ہیں اور جو کچھ توریت میں کفار پر شدت کرنے کا ذکر ہے اس کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی شان میں کیسا تسلیم کرتے ہیں..... کیوں یارو، اَشِدَّاءُ عَلَي الْكُفَّارِ کا مصداق کیا، سوائے اس کے کوئی دوسرا ہوگا جو اپنے باپ کے قتل پر آمادہ ہو اور توریت کے اس مضمون کا کہ (غیر معبودوں کے بندگی پر پھسلانے والے کو اگرچہ بھائی یا بیٹا یا بیوی یا دوست ہو تو قتل کر ڈالنا اور پہلے اپنا ہاتھ اس کے قتل پر اٹھانا) اطلاق کسی اور پر ہوگا۔ تعجب ہے شیعوں سے اور ان کے امام اعظم سے کہ ایسی روایت کو تصدیق بھی کریں اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی مستعدی کو باپ کے قتل پر قبول بھی کریں اور پھر ان کی صدیقیت سے انکار بھی فرمادیں۔

◀◀◀ کوحلہ نامی شہر میں پیدا ہوئے۔ اصول و ادب، فقہ، علم کلام کی تعلیم شیخ نجم الدین ابوالقاسم جعفر بن سعید حلی اور اپنے والد یوسف بن علی بن مطہر حلی سے اور فلسفہ و حکمت کی تعلیم خواجہ نصیر الدین طوسی سے حاصل کی، ان کے علاوہ علی بن عمر کا تہی قزوینی شافعی اور ملا قطب الدین علامہ شیرازی کے بھانجے محمد بن احمد کیشی اور دیگر علماء شیعہ و سنی سے اکتساب فیض کیا۔ یافعی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ ابن مطہر حلی اسی (۸۰) سے زیادہ کتابوں کے مصنف تھے۔ ابن مطہر حلی نے اثبات شیعیت و اہل سنت کی رد میں ”منہاج الکرامۃ فی معرفۃ الامامۃ“ کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی تھی جس میں ائمہ اثنا عشر کے فضائل اور ان کی امامت و عصمت کو آیات و نصوص قرآنی اور احادیث و روایات سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اسی طرح خلفائے ثلاثہ و صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مطاعن کو آیات و احادیث اور تاریخ و سیر سے ثابت کیا گیا تھا۔ شیخ الاسلام احمد تقی الدین حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس کے جواب میں ”منہاج السنۃ النبویۃ فی نقض کلام الشیعۃ و القدریۃ“ کے نام سے ایک بہت مدلل اور لا جواب کتاب لکھی جس میں ”منہاج الکرامۃ“ کے ایک ایک تار و پود کو بکھیر کر اس کے مصنف کی کارستانیوں کی قلعی کھولی ہے۔ بقول حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی نور اللہ مرقدہ کے کہ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے یہ کتاب لکھ کر مطاعن صحابہ رضی اللہ عنہم کے باب میں امت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر دیا ہے۔ ۲۱ محرم ۷۲۶ھ کوحلہ میں ابن المطہر حلی کی وفات ہوئی۔ (شیخ محمد فراست)

دوسری روایت کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے رشتہ داروں کے قتل کا مشورہ دیا:

تفسیر مجمع البیان اور منہج الصادقین اور خلاصہ تفسیر جرجانی میں امامیہ مذہب کے مفسرین نے لکھا ہے کہ جب بدر کی لڑائی فتح ہوئی اور بہت سے لوگ مکے کے قید ہوئے جن میں اکثر مہاجرین کے عزیز اور قریب تھے اور حضرت ﷺ نے ان کے معاملہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”جو کوئی جس کا رشتہ دار ہے وہ اس کے حوالہ کیا جائے تاکہ وہ اپنے ہاتھ سے اپنے کافر رشتہ دار کو قتل کرے اور خدا کی محبت کے سامنے رشتہ اور قرابت کا خیال نہ کرے، پس عقیلؓ علیؓ کو اور نوفل مجھے اور فلاں فلاں کے حوالے کیا جائے واسطے قتل کے۔“

اے شیعانِ پاک ذرا اس روایت کو اپنی تفسیروں میں دیکھو اور انصاف کرو کہ ﴿أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ کا مضمون حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر صادق آتا ہے یا نہیں؟ اور اگر اس پر بھی نہ سمجھو تو خدا تم سے سمجھے۔

دوسری شہادت انجیل کی:

متیٰ کی انجیل کے باب ۱۳ کے درس ۳۱ و ۳۲ میں لکھا ہے کہ ”آسمان کی بادشاہت رائی کے دانے کے مانند ہے جسے ایک شخص نے لے کر اپنے کھیت میں بویا اور وہ سب بیجوں سے چھوٹا ہے، پر جب اگتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا ہوتا ہے اور ایسا درخت ہوتا ہے کہ ہوا کے پرندے اس کی ڈالیوں پر بسیرا کرتے ہیں۔“ اس پیشین گوئی کو اس آیت سے ملانا چاہیے جو ابھی مذکور ہوئی ہے کہ ﴿مَثَلُهُمْ فِي الْإِنجِيلِ كَذَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ﴾ (الفتح: ۲۹) یعنی خداوند تعالیٰ فرماتا ہے پیغمبر ﷺ کے یاروں کی مثال انجیل میں اس طرح ہے جس طرح ایک چھوٹا سا دانہ کہ اس میں اول پتی نکلتی ہے، پھر وہ بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ بڑا درخت ہوتا ہے اور دیکھنے والے کو تعجب آتا ہے..... پس اس آیت کے مضمون کی اس عبارت سے انجیل کی جو ہم نے اوپر بیان کی کیسی تصدیق ہوتی ہے اور اس سے بہ شہادت انجیل صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت بخوبی ثابت ہوتی ہے۔ اور درحقیقت

یہ مثال بالکل صحابہ رضی اللہ عنہم کے حال کے مطابق ہے۔ اس لیے کہ وہ اوّل تھوڑے تھے، پھر آہستہ آہستہ بڑھتے گئے اور ایک بڑا لشکر ان کا ہو گیا جس کی جماعت اور کثرت کو دیکھ کر کفار تعجب کرتے تھے اور ان کی قوت کو دیکھ کر جلتے مرتے تھے، پس جو کوئی ان کی بزرگی کا قائل اور ان کی فضیلت کا معتقد نہ ہو، درحقیقت قرآن اور انجیل اور تمام کتب سماوی کا منکر ہے۔

اے صاحبو! اگر تم صحابہ رسول ﷺ کے ایمان اور اسلام کے قائل نہیں ہو تو مہربانی کر کے ذرا ارشاد فرمایا کہ وَالَّذِينَ مَعَهُ سے کیا مراد ہے، یعنی وہ کون لوگ ہیں جو حضرت کے ساتھ تھے جن کی صفت اللہ جل شانہ، اس آیت میں فرماتا ہے اور اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ کا مصداق بتلاؤ کہ وہ کون حضرات تھے جو کفار پر سختیاں کرتے تھے، اگر صحابہ کبار رضی اللہ عنہم سوائے چار چھ کے سب کے سب منافق اور کافر تھے۔ (نعوذ باللہ من ذالك .) تو وہ کون لوگ تھے جن کے سبب سے اسلام ایک دانے سے بڑا درخت ہو گیا، اور وہ کتنے شخص تھے جن کو دیکھ کر کفار غیظ میں آتے تھے کیا کسی کے قیاس میں آسکتا ہے کہ چار چھ شخصوں کو دیکھ کر کافر جلتے ہوں۔ اور معدودے چند کے ایمان لانے پر تعجب کرتے ہوں۔ اگر ہزاروں آدمی مسلمان نہیں ہو گئے تھے اور وہ سب کے سب ایمان میں کامل نہ تھے تو اللہ جل شانہ ﴿فَاسْتَخَلَّظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ﴾ (الفتح: ۲۹) کیوں فرماتا اور اگر ہزاروں شخص اسلام نہیں لائے تھے تو کن کو دیکھ کر کفار کو غصہ آتا تھا۔ پس جب تک کوئی صحابہؓ کی فضیلت اور ان کی کثرت کو نہ مانے وہ ان آیتوں کی بھی تصدیق نہیں کر سکتا۔

اے یارو! خدا کی قسم سچ جاننا اور یقین کر کے ماننا کہ ہم کو نہایت ہی تعجب آتا ہے کہ جو لوگ ایسی آیتوں کی تصدیق کرتے ہوں اور جو مثال انجیل میں مذکور ہے اس کو پیغمبر خدا ﷺ کی نسبت پیشین گوئی پر محمول کرتے ہیں اور پھر صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کی فضیلت اور کثرت سے انکار کرتے ہیں اور ایسی آیتوں اور پیشین گوئیوں کو صرف چار چھ شخصوں پر ختم کرتے ہیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے عداوت رکھ کر لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارُ کی تہدید سے ذرا بھی نہیں ڈرتے۔



قرآن مجید کی شہادتیں

صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت میں

پہلی آیت:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَكَوْا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ مِنْهُمْ الْيَوْمِئِذِينَ وَكَثُرَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ (سورہ آل عمران: ۱۱۰)

”تم بہترین امت ہو چن لیے گئے ہو آدمیوں کے لیے، حکم کرتے ہو نیک باتوں کا اور روکتے ہو بری باتوں سے اور ایمان رکھتے ہو خدا پر، اور اگر ایمان لاتے اہل کتاب تو بہتر ہوتا ان کے حق میں، بعض ان میں سے مومن ہیں اور اکثر فاسق۔“

اس آیت میں اللہ جل شانہ، صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلتوں کو اور ان کی بزرگیوں کو خود ان سے بیان فرماتا ہے اور ان سے مخاطب ہو کر ارشاد کرتا ہے کہ تم بہترین امت سے ہو اور تم کو میں نے اور مخلوق سے منتخب کر لیا ہے تاکہ لوگوں کو ہدایت کرو، چنانچہ تم جس کام کے لیے مقرر ہوئے وہ کرتے رہو اور جو خدمت تمہارے سپرد ہوئی اس کو ادا کرتے رہو ﴿تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ کہ لوگوں کو نیک کام سکھلاتے ہو اور بری باتوں سے بچاتے ہو۔ جو شخص ذرا غور اور انصاف سے دیکھے تو یہی ایک آیت عقائد شیعان عبد اللہ بن سبا کے بطلان پر کافی ہے کہ خداوند کریم جبکہ اصحاب رضی اللہ عنہم کی نسبت فرمادے کہ وہ بہترین امت سے ہیں اور بنی آدم کی ہدایت کے واسطے پیدا کیے گئے ہیں اور ان کے افعال حسنہ کی تصدیق کرے کہ

وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں اور باوجود اس کے حضرات شیعہ ان کو بدترین امت سے جانیں اور ان کی بزرگی اور فضیلت سے انکار کریں۔ ہم نہایت تعجب کرتے ہیں کہ ایسی صریح آیتوں اور ایسی صاف شہادتوں پر بھی وہ اپنے عقیدوں کے فساد پر خیال نہیں کرتے اور ذرا بھی قرآن مجید کے لفظوں کو نہیں دیکھتے..... اگر صحابہ کبار رضی اللہ عنہم بہترین امت سے نہیں تھے تو خدا کا یہ خطاب کہ **كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ** یعنی تم بہترین امت سے ہو، کس سے ہے؟ اور اگر ان کے اعمال نیک نہ تھے تو اللہ جل شانہ، کا یہ ارشاد کہ **تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ** تم نیک کام اوروں کو بتلاتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو، کس کی طرف ہے..... اگر وہ سچے دل سے ایمان نہیں لائے تھے تو خدا کی اس تصدیق کہ **تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ** تم خدا پر سچے دل سے ایمان رکھتے ہو کے کیا معنی ہیں؟..... آیتیں تو ایسی صاف ہیں کہ ان میں کوئی تاویل اور کوئی بناوٹ ہو ہی نہیں سکتی، سیدھے سیدھے لفظوں میں اللہ جل شانہ، صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایمان اور اعمال کو بیان کر رہا ہے اور کمالِ عنایت سے انہی سے مخاطب ہو کر خود ان کی تعریفیں کر رہا ہے، لیکن ہم کو سخت حیرت ہے کہ شیعیاں پاک کے نزدیک اس آیت کے الفاظ کیا مہمل ہیں جن کے کچھ معنی نہ ہوں، یا یہ کوئی لغز (معمہ) اور پہیلی ہو جو اس کا مطلب ان کو سمجھ میں نہ آئے، یا کوئی دقیق معمہ ہے کہ وہ ان سے حل نہ ہو سکے، یا ان کے عقیدے میں یہ الفاظ قرآن کے نہیں ہیں اور جامع قرآن نے اپنی اور اپنے بھائیوں کی بزرگی ظاہر کرنے کے لیے بڑھا دیے ہیں کہ اس پر ایمان نہ ہو..... آخر ان باتوں میں سے کوئی بات اگر نہیں ہے تو یہ کیا بات ہے کہ اس کا اقرار کرتے جاتے ہیں، یہ آیتیں خدا کی کتاب کی ہیں اس کو تصدیق کرتے جاتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان میں نازل ہوئی ہیں اور پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت پر اعتقاد رکھنے کا کیا ذکر ان کے ایمان اور اسلام کی بھی تصدیق نہیں کرتے اور جن کو خداوند کریم **خَيْرَ أُمَّةٍ** فرمائے **شَرَّ أُمَّةٍ** سمجھتے ہیں اور جن کی نسبت خدا **تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ** کہے ان کے حق میں **تَأْمُرُونَ بِالْمُنْكَرِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ** کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اگرچہ آیاتِ بینات قرآن مجید کی ایسی صریح

اور صاف ہیں کہ تفسیر دیکھنے کی حاجت نہیں ہے لیکن ہم حضرات شیعہ کے اطمینان خاطر کے لیے انہیں کی معتبر تفسیروں کی سند لاتے ہیں۔

اے بھائیو! سنو، تفسیر مجمع البیان طبری میں (جو کہ تفسیروں میں سے تمہاری بہترین تفسیر ہے اور ۱۲۷۵ء میں بمقام تہران دارالسلطنت ایران میں چھپی ہے) اس کے صفحہ ۳۰۰ میں لکھا ہے کہ ”پہلے ❶ خداوند تعالیٰ نے امر و نہی کا ذکر کیا پیچھے اس کے ان لوگوں کا ذکر کیا جو کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں اور ان کے واسطے ان لوگوں کی تعریف کی تاکہ اور لوگ ان کی پیروی کریں اور اس واسطے انہیں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم بہترین امت سے ہو۔“ اور اس واسطے کہ کسی کو شبہ نہ رہے کہ یہ خطاب ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ﴾ کا کس سے ہے۔ اسی تفسیر میں بعضوں ❷ نے لکھا ہے کہ مراد اس سے خاص مہاجرین ہیں اور بعضوں نے لکھا ہے کہ یہ خطاب صحابہ رضی اللہ عنہم سے ہے لیکن اور امت بھی شامل ہے۔

اے یارو! اس تفسیر کو دیکھو اور اپنے مفسر کی تصدیق پر غور کرو کہ وہ خود اقرار کرتا ہے، خدا نے ان آیتوں میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذکر اس لیے کیا کہ اور لوگ ان کی پیروی کریں۔ تو کیا پیروی اسی کا نام ہے جو تم کرتے ہو، اگر بیزاری تمہاری اصطلاح میں بمعنی پیروی ہے تو بے شک تم کلام کی تصدیق کرتے ہو ورنہ صریح تکذیب..... اس مقام پر جاہلوں کو کُنْتُمْ کی لفظ پر ایک شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ خدا نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا ہے کہ ”تم بہترین امت سے تھے“ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اخیر تک ویسے ہی رہے ہوں، شاید بعدہ بدترین امت سے ہو گئے ہوں، لیکن انہی کے علامہ طبری نے اس کا جواب دے دیا۔ چنانچہ اپنی تفسیر میں علامہ موصوف لکھتے ہیں کہ کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ ❸ اللہ جل شانہ نے تاکید کے واسطے فرمایا کہ ضرور ایسا ہی ہوگا

❶ لما تقدم ذكر الامر والنهي عقبه تعالى بذكر من تصدى للقيام بذلك مدحهم ترغيباً في الاقتداء بهم فقال كنتم خير امة اخرجت للناس، قيل فيه اقوال احدها ان معناها انتم خير امة۔ ۱۲ مجمع البيان۔
❷ واختلف في المعنى بالخطاب فقيل هم المهاجرون خاصة وقيل هو خطاب للصحابة ولكنه يعم سائر الامة ۱۲ مجمع البيان۔

❸ ورابعها ان كان مزيدة دخولها كخرو جها الا انها تأكيداً لوقوع الامر لا محالة لانه بمنزلة ما قد كان في الحقيقة فهى بمنزلة قوله تعالى واذ كر واذ انتم قليل و في موضع آخر اذ كنتم قليلاً فكثرتكم و نظيره قوله تعالى و كان الله غفوراً رحيماً لان مغفرة المستانفة كما لما ضيه تحقيق الوقوع ۱۲ مجمع البيان۔

اور اس کے وقوع میں کچھ شک نہ ہوگا اور صحابہ رضی اللہ عنہم جیسے بہترین ہیں ویسے ہی رہیں گے اور اس کی مثال یہ ہے کہ خدا نے اپنی نسبت فرمایا ہے کہ **وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا** تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا بخشنے والا مہربان تھا اور اب نہیں ہے یا آئندہ نہ رہے گا..... غرض کہ جب ان آیتوں اور تفسیروں سے صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت ثابت ہوگئی اور کوئی موقع ان کی بزرگی کے انکار کا نہ رہا تب بعض حضرات نے اپنا قدم دوسری راہ پر اٹھایا اور قرآن مجید کی تحریف کا اقرار کیا، چنانچہ بعض نے فرمایا ہے کہ بجائے **خَيْرَ أُمَّةٍ** کے **خَيْرَ أَيْمَّةٍ** تھا اور یہ خطاب خدا نے اماموں سے کیا تھا کہ **كُنْتُمْ خَيْرَ أَيْمَّةٍ** یعنی تم سب اماموں سے بہتر ہو۔ مگر جامعان قرآن نے بجائے **أَيْمَّةٍ** کے لفظ **أُمَّةٍ** بنا دیا..... اگرچہ اور علمائے شیعہ کو حیا نے کسی قدر منع کیا ہے اور انہوں نے اس جواب کو پسند نہیں کیا، مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ اس کا اثر اب تک باقی ہے۔ چنانچہ جناب میرن صاحب قبلہ بھی اپنے حدیقہ سلطانیہ کے باب سوم میں اس کا ذکر کرتے ہیں:

((تغیر و نقصان در قرآن منحصر در چہار چیز است یکے تبدیل لفظی بلفظ آخر مثلاً اینکہ گفته شود بجائے **كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ خَيْرَ أَيْمَّةٍ** بودہ لیکن بعضے از اعدائے اہل بیت آن را تبدیل نمودہ اند.))

”قرآن میں کمی و تغیر کا انحصار چار چیزوں پر ہے ایک لفظی تبدیلی دوسرے لفظ کے ساتھ جیسے **كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ** (تم بہترین امت ہو) کے بجائے **خَيْرَ أَيْمَّةٍ** (بہترین ائمہ) تھا لیکن بعض دشمنان اہل بیت نے اسے بدل دیا۔“

اور پھر اخیر میں خود ہی فرما دیا ہے کہ ”وجہ اوّل بعید است“۔ ہمارے نزدیک بجائے اس کے کہ **خَيْرَ أُمَّةٍ** کی تصدیق کر کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے خیر امت ہونے سے انکار کریں شیعیان پاک کے حق میں یہی بہتر ہے کہ بجائے **خَيْرَ أُمَّةٍ** کے **خَيْرَ أَيْمَّةٍ** کا اقرار کریں اور تحریف قرآنی کے عذر سے اپنے آپ کو صریح منکر آیات بینات کا نہ بنا دیں۔ افسوس کہ جناب میرن

صاحب قبلہ اور ان کے والد ماجد انتقال فرما گئے ورنہ میں اس حدیقہ سلطانیہ اور صوارم کو لیے ہوئے ان حضرات کی خدمت میں حاضر ہوتا اور پوچھتا کہ کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ جَامِعِينَ قرآن کی تحریف ہے تو بندہ عرض کرتا کہ اس وقت اور ائمہ کرام سوائے علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے کون تھا اور کس نے اَمْرٍ بِالْمَعْرُوفِ اور نَهْيٍ عَنِ الْمُنْكَرِ کیا تھا جن سے خدایہ خطاب کرتا اور جن کی یہ فضیلتیں بیان کرتا ہے..... اور اگر فرماتے کہ نہیں خَيْرَ أُمَّةٍ صَحِيحٍ ہے تو کمترین التماس کرتا کہ پھر اس گروہ سے جس کو خدایہ خَيْرَ أُمَّةٍ فرماتا ہے اور جس کی آپ بھی تصدیق فرماتے ہیں، بیزاری کفر ہے یا نہیں، اور ان کے آگے انہی کی کتاب کھول کر اس کے صفحہ ۱۸۶ کی یہ عبارت نکال کر پوچھتا کہ حضرت اس کا کیا مطلب ہے و ہو ہذہ:

((ازاں جملہ است آنچه از حضرت صادق عَلَیْہِ السَّلَامُ ماثور است کہ فرمود آں ہذا القرآن فیہ منار الہدی و مصابیح الدجی یعنی دریں قرآن انوار ہدایت و چراغہائے دور کنندہ تاریکی ضلالت و غوایت روشن است.))

”مجملہ اس کے حضرت صادق عَلَیْہِ السَّلَامُ کی زبانی یہ منقول ہے کہ اس قرآن میں انوار ہدایت اور گمراہی و تاریکی کو دور کرنے والے چراغ موجود ہیں۔“

اور قسم دے کر پوچھتا کہ تم کو اپنے اجتہاد ہی کی قسم ہے کہ جس قرآن کو امام صاحب فرماتے ہیں کہ اس میں انوار ہدایت اور روشن چراغ ہیں اس میں صحابہ رَضِیَ اللہُ عَنْہُمْ کی نسبت کیا لکھا ہوا ہے اگر کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ لکھا ہے تو پھر آپ کیوں انکار کرتے ہیں اور کیوں روشنی چھوڑ کر تاریکی میں پڑتے ہیں، اور پھر اسی کتاب کی یہ عبارت نکالتا:

((از حضرت امام باقر عَلَیْہِ السَّلَامُ منقول است کہ در ہنگامے کہ

فتنہا بر شما ملتبس شود و مانند پارہ شب تاریک رجوع آرید بقرآن کی شفاعت کنندہ و مقبول الشفاعت ست ہر

کسی کہ آن را پیش نهد اللہ اورا براہ جنت می برد.))

”امام باقر سے منقول ہے کہ جس وقت تم پر فتنہ و فساد روشن نہ ہوں اور رات کی تاریکیاں محیط ہوں تو قرآن کی طرف رجوع کرو کیونکہ یہ شفاعت کرنے والا ہے اور اس کی شفاعت مقبول و منظور ہے۔“

اور یہ کہتا کہ قبلہ و کعبہ سنیے آج کل کوئی فتنہ اس سے بڑھ کر نہیں ہے کہ ہم صحابہ رضی اللہ عنہم کو بہترین امت جانتے ہیں اور آپ بدترین امت سے۔ اور نہ آپ ہماری مانتے ہیں نہ ہم آپ کی۔ اب آپ آئیے امام علیہ السلام کے قول پر عمل کیجیے اور قرآن سے رجوع کیجیے، اگر اس میں کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ صحابہ رضی اللہ عنہم کی نسبت لکھا ہو تو بس جنت کی راہ اختیار کیجیے اور اپنا مذہب چھوڑیے اور اگر اس میں کُنْتُمْ شَرَّ أُمَّةٍ ان کی نسبت ہو تو ہم کو اپنے مذہب میں لیجیے اور تاریکی سے نکالیے۔ معلوم نہیں کہ اگر یہ حضرات موصوف زندہ ہوتے تو کیا جواب دیتے اور خبر نہیں کہ اب ان کے جانشین کیا جواب دیں گے۔

دوسری آیت:

﴿فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقَاتِلُوا أَلَا كَفَرًا عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَا دُخْلَنَّهُمْ جَنَّتِ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝﴾

(سورہ آل عمران: ۱۹۵)

اس آیت میں اللہ جل شانہ، مہاجرین کی تعریف کرتا ہے اور ان کے جنتی ہونے کی بشارت دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ جن لوگوں نے میرے پیچھے اپنے وطن، گھر اور کنبے قبیلے کو چھوڑا اور جن کے اوپر ایمان لانے سے تکلیفیں پہنچیں اور جن کو میری راہ میں ایذائیں دی گئیں تو میں بھی اپنے ایسے سچے ایمان لانے والوں اور بچے مسلمانوں سے بڑی مہربانی سے پیش آؤں گا اور ان کی محنتوں، مصیبتوں اور جاں فشانیوں کا ان کو اچھا بدلہ دوں گا، ان کے گناہوں سے درگزر کروں گا، ان کی بھول چوک کو نہ دیکھوں گا بلکہ ان کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دوں گا اور بن پوچھے بتلائے ان کو ایسی جنتوں میں جگہ دوں گا جن کے نیچے نہریں

بہتی ہیں، جہاں نہ ان کو کچھ غم رہے گا نہ رنج نہ کوئی فکر ان کو رہے گی نہ کھٹکا۔ اور یہ ثواب ان کو اپنی طرف سے دوں گا اور اپنے فضل و مہربانی سے ان کے اعمال سے بہت بڑھ کر ان کو درجہ عطا کروں گا۔

اب ان آیتوں کو دیکھ کر مہاجرین کی فضیلت اور بزرگی پر خیال کرنا چاہیے کہ کس محبت اور پیار سے خدائے عزوجل ان کا ذکر کرتا ہے اور ان کے مدارج اور مراتب کا کس خوبی سے اظہار فرماتا ہے اور ان کے قطعی جنتی ہونے کا اقرار کرتا ہے اور ان کے گناہوں اور سیئات سے درگزر کرنے کا اور نیکیوں سے بدل دینے کا وعدہ کرتا ہے اور ان کے اعمال کی جزا میں جو کچھ دے گا وہ تو ایک طرف، اپنی طرف سے براہِ تفضلات ثواب دینے کا بیان کس مہربانی سے فرماتا ہے..... پس اب ان آیتوں کے دیکھنے والوں سے ہم عرض کرتے ہیں کہ جن مہاجرین کی نسبت خدانے یہ وعدے کیے ہیں اور جن کے بہشتی ہونے کا ذکر فرمایا ہے وہ کون تھے، کیا وہ لوگ مہاجرین نہ تھے جن کا نام ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ ہے، اور کیا گھر بار چھوڑنے والوں میں وہ اشخاص نہ تھے جن کو شیعہ بُرا جانتے ہیں اور کیا یہ لوگ اس آیت سے مستثنیٰ کر دیے گئے ہیں اور کیا یہ اشخاص لَا كَفْرَانَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ کے وعدے سے خارج کر دیے گئے ہیں۔

اے بھائیو! اس آیت کو پڑھ کر اب تم مہاجرین کے گناہوں کے ڈھونڈنے میں اوقات ضائع نہ کرو اور ان کی برائیوں کی تلاش میں اپنی عمر نہ گنواؤ..... اگر دو چار عیب تم نے ان کے ڈھونڈھ بھی لیے تو بھی جب تک تم مہاجرین میں ہونے سے انکار نہ کرو گے اور جب تک تم ان کی ہجرت کا اقرار کرتے رہو گے تمہاری عیب جوئی اور نکتہ چینی کچھ کام نہ آئے گی اور اس سے ان کے یقینی جنتی اور قطعی بہشتی ہونے میں کچھ ضرر نہ ہوگا، اس لیے کہ وہ خود فرما چکا ہے کہ لَا كَفْرَانَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ (کہ میں ان کے گناہوں سے درگزر کروں گا اور ضرور ضرور ان کو جنت میں داخل کروں گا، اس لیے کہ وہ میرے پیچھے گھروں سے نکالے گئے، میری بدولت رنجوں اور مصیبتوں میں گرفتار ہوئے، اپنے دوستوں کو چھوڑ کر میرے دوست کے

ساتھ ہوئے، اپنے محبوبوں سے جدا ہو کر میرے محبوب کے شریک ہوئے، پس ان کا ہجرت ہی کرنا ایک ایسا عمل ہے کہ ہزار اعمال اور لاکھ عبادات اور کروڑ نیکیوں سے بہتر ہے۔

تیسری آیت:

﴿وَالسُّبْقُونَ الْأَوْلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ
بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي
تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾ (سورة توبه: ۱۰۰)

اس آیت میں اللہ جل شانہ، مہاجرین اور انصار کی نسبت اپنی رضا مندی ظاہر فرماتا ہے اور ان کو اور ان کی پیروی کرنے والوں کو جنت کی خوشخبری پہنچاتا ہے..... ہمارے نزدیک اگر کوئی شخص اس آیت پر ذرا بھی غور کرے اور اس کے مطلب کو سوچے تو وہ ہرگز صحابہ کبار اور مہاجرین و انصار کی نسبت سوائے فضیلت اور بزرگی کے دوسرا اعتقاد نہ رکھے، اس لیے کہ جب ان کی شان میں خدائے جل شانہ، فرمادے کہ ”رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ“ کہ میں ان سے راضی اور وہ مجھ سے راضی اور ان کے حق میں اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد کرے کہ أَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ اور آراستہ کر دی گئی ہیں ان کے واسطے بہشتیں..... تو پھر کون ہے کہ ان کی فضیلت کا قائل نہ ہو..... پس شیعیانِ پاک کو صرف اس قدر غور کرنا چاہیے کہ مہاجرین و انصار میں صحابہ کبار رضی اللہ عنہم جن سے وہ عداوت رکھتے ہیں داخل ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو پھر ان کے جنتی ہونے میں کیا شک ہے اور اگر نہیں ہیں تو خدا کا یہ خطاب کس سے ہے۔

اے بھائیو! ذرا سوچو کہ قرآن مجید پر ایمان اسی کا نام ہے کہ جن کے حق میں اللہ اپنی رضا مندی ظاہر کرے ان سے تم ناراض ہو اور جن کے جنتی ہونے کی خبر خدا دے ان کو تم مسلمان بھی نہ سمجھو..... اور اگر اس آیت پر بھی کوئی ایمان نہ لاوے اور یہ شبہ کرے کہ اس میں خلفائے ثلاثہ کے نام تو مذکور نہیں ہیں اس لیے ان کی فضیلت کا انکار مستلزم انکارِ آیت نہیں ہے تو اس کے شبہ کو دور کرنے کے لیے ہم امام باقر علیہ السلام کی شہادت پیش کرتے ہیں اور جس طرح پر انہوں نے خلفائے ثلاثہ کو اس آیت کے حکم میں داخل بیان کیا ہے اس کو ہم بیان

کرتے ہیں، اس کو ذرا دل سے سنو اور اپنے ہی مذہب کی کتاب سے اس کی سند لو، وہو ہذا۔^① صاحب الفصول نے امام باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ ”ایک روز حضرت امام باقر علیہ السلام کا گزر ایک جماعت پر ہوا جو کہ خلفائے ثلاثہ کی عیب جوئی کر رہے تھے، آپ ﷺ نے پوچھا کہ مجھے بتلاؤ کہ تم ان مہاجرین میں سے ہو جو خدا کے گھر سے نکالے گئے اور خدا کے لیے ان کا مال لوٹا گیا اور جنہوں نے خدا اور رسولؐ کی مدد کی، انہوں نے کہا کہ نہیں ہم ان میں سے نہیں، تب آپ نے پوچھا کہ پھر کیا تم ان لوگوں میں سے ہو جنہوں نے دارِ ہجرت میں اور دارِ ایمان میں گھر بنایا تھا اور مہاجرین کو آرام دیا تھا، انہوں نے کہا کہ نہیں، تب آپ ﷺ نے کہا کہ خود تم بیزار ہوئے اور نہیں چاہتے کہ دونوں فریقوں میں سے ہو اور میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ تم ان میں سے بھی نہیں ہو جن کی نسبت خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ ان مہاجرین و انصار کے بعد آئیں گے وہ ایسے مومن ہوں گے کہ یہ دعا کیا کریں گے کہ الہی ہماری اور ہمارے اگلے بھائیوں کی جو ہم سے ایمان میں سبقت لے گئے ہیں مغفرت کر اور ہمارے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ مت رکھ، بے شک تو نرمی کرنے والا مہربان ہے۔

اے بھائیو! تم اپنے آپ کو امامیہ کہتے ہو اور ائمہ کرام کے اقوال کو کم از آیات نہیں سمجھتے، مگر معلوم نہیں کہ ان اقوال کو جو صحابہ رضی اللہ عنہم کے فضائل میں ہیں کیوں نہیں مانتے اور کیوں اپنے اماموں کی پیروی نہیں کرتے اور کیوں ان کو صحابہ رضی اللہ عنہم کے فضائل بیان کرنے میں جھوٹا جانتے ہو.....!

① انہ قال لجماعة خاضو فی ابی بکر و عمر و عثمان الاتخبرونی انتم من المهاجرین الذین اخرجوا من دیا رهم و اموالهم یتبعون فضلا من الله و رضوانا و ینصرون الله و رسوله قالوا لا، قال فانتم من الذین تبوء الدار و الایمان من قبلهم یحبون من هاجر الیهم قالوا لا، قال امانتم فقد برئتم ان تكونوا احد هذین الفریقین و انا شهد انکم لستم من الذین قال الله تعالیٰ: ﴿وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ﴾ - ۱۲ -

غرض کہ امام باقر علیہ السلام کی اس حدیث سے ثابت ہوا کہ ان کے نزدیک خلفائے ثلاثہ اس آیت کے حکم میں داخل ہیں اور جو وعدے جنت وغیرہ کے خدا نے مہاجرین اور انصار سے کیے ہیں، ان میں وہ شریک ہیں اور یہ بھی ظاہر ہوا کہ جو لوگ ان کی عیب جوئی کرتے تھے ان سے حضرت امام موصوف بیزار تھے اور ان کو اسلام اور ایمان سے خارج سمجھتے تھے..... پس سوائے تقیہ کے اور تو دوسرا کوئی جواب ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن معلوم نہیں کہ کہاں تک تقیہ کا عذر کیا کریں گے اور کب تک تقیہ کو ڈھال بنائے رہیں گے..... افسوس ہے کہ جب خدا صاف صاف مہاجرین اور انصار کی تعریف کرے اور ائمہ علیہم السلام خلفائے ثلاثہ کی صاف فضیلت بیان کریں اور پھر بھی حضرات شیعہ قائل نہ ہوں، اب معلوم نہیں کہ مہاجرین اور انصار کی فضیلت کے لیے کیسی دلیل چاہتے ہیں۔

حضرات شیعہ بعض دفعہ یہ شبہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ جل شانہ نے ان مہاجرین اور انصار کی تعریف بیان کی ہے جنہوں نے خاص خدا کے لیے ہجرت اور نصرت کی تھی نہ کہ ان کی جنہوں نے دنیا کی طمع سے ہجرت اور نصرت کی تھی..... اس شبہ کو ہم تین طرح سے رد کرتے ہیں۔

۱۔ یہ کہ جب مہاجرین نے ہجرت کی اور انصار نے نصرت، اس وقت دنیا اور دولت کہاں تھی جس کی طمع ہوئی ہو..... جب مہاجرین نے مکہ سے ہجرت کی تب کیا مدینے میں کسی خزانے کے نکلنے کی خبر ان کو ملی تھی جس کے لوٹنے کے لیے گئے ہوں، یا جب انصار نے مہاجرین کی خاطر کی اور ان کو اپنے گھر ٹھہرایا تو کیا مہاجرین کچھ بہت سامان اپنے ہمراہ لے گئے تھے جس کے چھین لینے اور لوٹ لینے کی نیت سے انہوں نے ان کی مدد کی ہو۔ اگر مہاجرین نے خدا کے لیے ہجرت اور انصار نے اللہ کے واسطے نصرت نہیں کی تو پھر ان کی ہجرت اور نصرت کا کیا سبب تھا۔

۲۔ اگر تمام مہاجرین اور انصار نے ہجرت اور نصرت دنیا کی طمع پر کی تھی تو خدا کا مہاجرین اور انصار کی تعریف کرنا (معاذ اللہ) فضول اور مہمل ہوا جاتا ہے۔ اس لیے کہ جب کسی

نے خدا کے لیے ہجرت اور نصرت نہیں کی تو خدا کس کی شان میں ﴿وَالسَّابِقُونَ
الْأُولُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ﴾ فرماتا ہے اور جب سب کے سب منافق
تھے تو کن کی نسبت لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ارشاد کرتا ہے۔ اور اگر
بعضوں کی ہجرت اور نصرت خدا کے لیے اور بعضوں کی دنیا کے لیے تھی تو ان کا نشان
دیجیے کہ وہ کتنے صاحب تھے جنہوں نے خدا کے لیے ہجرت اور نصرت کی، جب نام
لینا اور نشان دینا شروع کرو گے تو سوائے تین چار کے اور کوئی نہ نکلے گا اور تین چار کی
ہجرت اور نصرت کے ثبوت سے کچھ فائدہ حاصل نہ ہوگا۔

۳۔ اللہ جل شانہ نے خود اپنی کتاب پاک میں اس شبہ کو دور کر دیا اور اپنے مہاجرین و
انصار کی طرف سے جواب دے دیا۔ چنانچہ اور دو آیتوں میں اللہ جل شانہ نے اس امر
کو تصدیق کر دیا کہ مہاجرین اور انصار نے جو کچھ کیا وہ میرے ہی واسطے کیا ہے۔
چنانچہ ہم دو آیتوں کو ایک مہاجرین کی نسبت اور دوسری انصار کی نسبت بیان کرتے
ہیں۔

ایک اور آیت.....

اللہ جل شانہ مہاجرین کی نسبت فرماتا ہے:

﴿الَّذِينَ أَخْرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ﴾

(سورة الحج: ٤٠)

”جو لوگ نکالے گئے اپنے گھروں سے ان سے کوئی قصور نہیں ہوا تھا سوائے اس

کے کہ وہ اللہ کو اپنا پروردگار کہتے تھے اور گھر کو چھوڑ کر مسلمان ہو گئے تھے۔“

پس اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مہاجرین کی ہجرت کا باعث سوائے اس کے
دوسرا نہ تھا کہ کفار ان کے اسلام لانے سے خفا ہو گئے تھے اور ان کے خدا کو رب کہنے سے
ناراض ہو گئے تھے کہ اسی قصور میں انہوں نے ایذا دینی شروع کی اور بہ مجبوری ان کو گھر بار
چھوڑنا پڑا۔

اب اگر اس آیت کو بھی سن کر حضرات شیعہ یہ کہیں کہ مہاجرین نے بہ طمع دنیا کے ہجرت کی تھی تو ان کو زیبا ہے، ہمارے تو منہ سے ایسی بات نکل بھی نہیں سکتی.....!

ایک مزید آیت:

اللہ جل شانہ، انصار کی شان میں فرماتا ہے:

﴿وَالَّذِينَ تَبَوَّؤُا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ
وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ
وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُوقِ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ
الْمُفْلِحُونَ﴾ (سورة الحشر: ۹)

”جو لوگ مہاجرین سے پہلے مدینہ میں رہتے تھے وہ چاہتے ہیں ان لوگوں کو جو ہجرت کر کے آئیں ان کے پاس، اور جو کچھ مہاجرین کو دیا جاتا ہے اس کا کچھ خیال نہیں کرتے اور اس سے رنجیدہ نہیں ہوتے اگرچہ وہ خود بھی محتاج ہیں اور اپنی جانوں سے زیادہ مہاجرین کو چاہتے ہیں اور کچھ بھی حرص و طمع نہیں رکھتے اور جو ایسے ہیں وہ فلاح پائیں گے۔“

پس دیکھنا چاہیے کہ خدا انصار کی نصرت کی ایسی تعریف کرتا ہے اور اس امر کی کہ ان کی نصرت صرف خدا کے واسطے ہے کیسی تصدیق فرماتا ہے، پس اب ہم حیران ہیں کہ جب اللہ جل شانہ، مہاجرین کی ہجرت کو صرف اپنے واسطے فرمادے اور انصار کی نصرت کو فقط اپنے لیے تصدیق کرے اور پھر شیعوں کے منہ سے یہ بات نکلے کہ ان کی ہجرت اور نصرت دنیا کے واسطے تھی۔

اے یارو: ذرا سوچو کہ تم خدا کے کلام کی تصدیق کرتے ہو یا تکذیب، اللہ کے حکم کو مانتے ہو یا اس سے مقابلہ کرتے ہو..... خدا تو فرمائے کہ مہاجرین اور انصار اچھے؛ تم کہو کہ نہیں وہ برے سے برے، وہ کہے کہ میں ان سے راضی وہ مجھ سے راضی، تم کہو کہ نہیں بالکل غلط، نہ خدا ان سے راضی نہ وہ خدا سے راضی، اللہ فرماوے کہ انہوں نے ہجرت میرے لیے کی اور نصرت میرے واسطے کی اور تم کہو کہ نہیں وہ دنیا کی طمع سے نکلے، حرص و دولت کے پیچھے

پیغمبر ﷺ کی نصرت میں شریک ہوئے..... آخر ذرا تو غور کرو کہ کیا کہتے ہو اور کیا کرتے ہو..... اے بھائیو! ایک آیت ہو، دو آیت ہوں، اس کی تاویل ہو سکتی ہے اس کے معنی بن سکتے ہیں، جب سارا قرآن مجید مہاجرین اور انصار کے ذکر سے بھرا ہوا ہے تو کہاں کہاں تاویل کرو گے، کس کس آیت کی تحریف معنوی فرماؤ گے (تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہی) حقیقت تو یہی ہے کہ مذہب تو عبد اللہ بن سبا کا اختیار کر لیا مگر اب کوئی بات بن نہیں پڑتی، نہ قرآن مجید سے انکار ہو سکتا ہے نہ اس کی تصدیق کی جاتی ہے، شعر.....

عشق چہ آساں نمود آہ چہ دشوار بود

ہجر چہ دشوار بود یار چہ آساں گرفت ❶

چوتھی آیت:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ۝ وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝ وَعَدَّكُمْ اللَّهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُونَهَا فَعَجَلَ لَكُمْ هَذِهِ وَكَفَّ أَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ وَلِتَكُونَ آيَةً لِلْمُؤْمِنِينَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ۝ وَأُخْرَى لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا﴾

(سورة الفتح: ۱۸ تا ۲۱)

اس آیت کا سبب نزول یہ ہے کہ حضرت ﷺ نے ارادہ کیا کہ عمرہ ادا کریں، پس اعراب اور باد یہ نشینوں کو اس سفر میں ہمراہی کے لیے دعوت دی۔ اس لیے کہ اندیشہ تھا کہ کفار مکے میں لڑائی کریں اور مکے کے اندر نہ جانے دیں، لیکن اکثر اعراب نے حضرت ﷺ کی دعوت کو نہ سنا اور اس سفر میں آپ ﷺ کے ہمراہ نہ ہوئے مگر وہی خالص مخلص کہ جو سراپا ایمان سے بھرے ہوئے تھے حضوری میں چلے، جب مکے کے قریب

❶ عشق کتنا آسان دکھائی دیا مگر کتنا سخت تھا اور ہجر (دوری) کتنی دشوار تھی مگر یار نے کتنا آسان سمجھا۔

پہنچے قریش مانع ہوئے تب حضرت نے حراش کو اہل مکہ کے پاس بھیجا مگر لوگ اس کے قتل کے درپے ہوئے، وہ لوٹ آیا، تب حضرت ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجا، اہل مکہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قید کر لیا اور ان کے قتل کی خبر مشہور ہوئی تب حضرت ﷺ نے اپنے یاروں کو جو آپ ﷺ کے ساتھ تھے جمع کیا جن کی تعداد باختلاف روایات چار سو سے لے کر دو ہزار تین سو تک تھی اور حضرت نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر سب سے بیعت لی کہ قریش سے لڑیں اور کسی طرح پر منہ نہ پھیریں، چنانچہ ان سب نے خوشی سے بیعت کی اور سوائے قید بن قیس منافق کے کسی نے اس بیعت سے تخلف نہ کیا۔ چونکہ اس سفر ۱ میں منافقوں کا نفاق اور مخلصوں کا اخلاص ظاہر ہوا اور بیعت میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی مضبوطی اور ایمان کا حال کھل گیا اس لیے اس بیعت کا نام ”بیعت الرضوان“ ہوا۔ اور انہی بیعت کرنے والوں کی شان میں خدا نے فرمایا ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَايَعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ کہ خدا راضی ہوا ان ایمان والوں سے کہ جنہوں نے درخت کے نیچے تجھ سے بیعت کی، فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ اور ان کے دلوں کا اخلاص اس سے ظاہر ہو گیا، اگر وہ منافق ہوتے تو اس سفر میں ساتھ نہ آتے اور کبھی ایسے وقت پر بیعت نہ کرتے، فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ اور ان کے دلوں کو طمانیت اور تسکین دے دی حتیٰ کہ بلا خوف و خطر لڑائی پر مستعد ہوئے اور مرنے مارنے پر تیرے ہاتھ پر بیعت کی، وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا اور ان کی شکستگی دور کرنے کے لیے ان کو بہت ہی جلد بہت سی غنیمتیں دیں اور بڑی بڑی فتوحات اور غنائم کا مثل روم اور فارس کے وعدہ کیا۔

پس ان آیتوں سے ان سب اصحاب رضی اللہ عنہم کی جنہوں نے حضرت ﷺ کے ساتھ درخت کے نیچے بیعت کی، بزرگی ثابت ہوتی ہے اور ان کا اخلاص اور ایمان میں کامل ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ کوئی لفظ کوئی حرف بھی خدا نے ان آیتوں میں ایسا ذکر نہ کیا جس سے کوئی

۱ یہ روایت موافق روایت شیعوں کے ہے جس کا ثبوت ہم نے آئندہ کیا ہے اور ترجمہ کشف الغمہ سے اسی روایت کو نقل کیا ہے۔

موقع کوئی محل انکار کا ہو بلکہ اپنی رضا مندی کا اظہار اس طور سے کیا کہ جس کا کبھی زوال نہ ہو اور ان فتوحات کا وعدہ کیا جن کا ظہور انہی صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہاتھ پر ہوا۔

اب ہم شیعیاں علیؑ سے پوچھتے ہیں کہ وہ اوّل یہ فرمائیں کہ یہ آیت قرآن مجید کی ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو یہ انہی لوگوں کی شان میں ہے جنہوں نے پیغمبر خدا ﷺ کی بیعت درخت کے نیچے کی تھی یا نہیں، اگر انہی کی شان میں ہے تو ان میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم داخل تھے یا نہیں، اگر تھے تو جو کچھ خدا ان بیعت کرنے والوں کے حق میں فرماتا ہے کہ ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ﴾ کہ میں ان سے راضی ہوا تو اس رضا میں وہ لوگ بھی آگئے یا نہیں؟ اگر نہیں آئے تو ان کے مستثنیٰ ہونے پر کیا دلیل ہے اور اگر وہ بھی آگئے تو جن سے خدا راضی ہو اور جن کی شان میں خود لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ فرمادے ان سے ناراض ہونا اور ان کو برا جاننا آیت قرآنی سے انکار ہے یا نہیں؟ اگر یہ کہو کہ وہ منافق تھے تو اس کا رد بھی خدا نے خود فرمادیا کہ ﴿فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ﴾ کہ میں نے ان کے دلوں کا امتحان کر لیا اور سمجھ لیا کہ یہ بڑے پکے مسلمان اور سچے ایمان والے ہیں، اسی لیے میں نے نازل کی ان پر تسلی اور دی ان کو فتح، اور اگر وہ لوگ منافق ہوتے تو کیوں خدا ان کے ایمان پر شہادت دیتا اور کیوں ان کو فتح اور غلبہ عنایت کرتا۔

ان آیتوں کو دیکھ کر اگر کسی شیعہ کو خطرہ پیدا ہو کہ جب ایسی صریح آیت صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت میں خدا کی کتاب میں موجود ہے تو پھر کیا سبب ہے کہ ہمارے مذہب کے علماء نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت سے انکار کیا ضرور کوئی نہ کوئی سبب ہو گا ورنہ کیا سبب عالم سب مولوی، سب فاضل، سب مجتہد ہمارے مذہب کے نادان تھے کہ ایسی آیت سے ایسا صریح انکار کیا اور اس کے باوجود بھی صحابہ کو برا جاننا..... اس لیے ہم انہی کے مذہب کی معتبر تفسیروں سے اپنے دعوے کو ثابت کرتے ہیں اور یہ امر کہ ان کے مولوی اور عالم نادان تھے یا دانا، ایمان والے تھے یا بے ایمان، منصف تھے یا متعصب، انہی کی عقل پر چھوڑتے ہیں، ان کی تفسیروں کو دیکھ کر جو کچھ وہ انصاف سے مناسب جانیں ویسا سمجھیں۔

اے بھائیو! سنو کہ تمہارے یہاں کے مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں کیا لکھا ہے۔
کاشانی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

((آنحضرت فرمودند بدوزخ نہ رودیک کس از مومناں کہ
درزیر شجرہ بیعت کردند و این را بیعت الرضوان نام نہادہ
اند بجهت آن کہ حق تعالیٰ در حق ایشان فرمود کہ لَقَدْ رَضِيَ
اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَايَعُواكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ.))
”آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے جن مسلمانوں نے درخت کے نیچے بیعت کی ہے
ان میں سے کوئی دوزخ میں نہیں جائے گا اور اس بیعت کو ”بیعت الرضوان“
کہتے ہیں کیونکہ اللہ نے ان بیعت والوں کی شان میں فرمایا ہے کہ اللہ ان
مسلمانوں سے راضی ہوا جنہوں نے آپ ﷺ سے درخت کے نیچے بیعت کی
ہے۔“

اگر اس روایت پر اطمینان نہ ہو اور حضرات شیعہ کو اپنے متکلمین اور متعصبین کے جواب
سننے کا اشتیاق ہو تو اس کو بھی سنیں کہ ان کے علماء نے اس آیت کو دو طرح پر رد کیا ہے.....
بعضوں¹ نے یہ فرمایا ہے کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ اس فعل خاص سے،
یعنی بیعت سے راضی ہوا ہو اور آئندہ بھی راضی رہے..... اور بعض² کا یہ قول ہے کہ اس

¹ قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المؤمنین میں لکھا ہے کہ مدلول آیت عند التحقیق رضائے حق تعالیٰ است
از فعل خاص کہ بیعت است و کسے منکر این نیست کہ بعضے از افعال حسنہ مرضیہ از ایشان واقع
سخن درین ست کہ بعضے افعال قبیحہ از ایشان بوجود آمدہ کہ مخالف آن عہد و بیعت است
چنانکہ در امر خلافت۔ ۱۲

² صاحب ”تقلیب الکائد“ نے بجواب ”کید نودویکم تحفہ اثنا عشریہ“ کے لکھا ہے کہ ”اما بودن ابو بکر
و عمر در اہل بیعت رضوان پس فائدہ بحال شان نمیر ساند زیرا کہ حق سبحانہ و تعالیٰ میفرماید اِنَّ
الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ الْخِيسِ كَلَامِ مَعْجَزِ نِظَامِ دِلَالَتِ مِیْکَنْدِ بَرَايْنِکَ بَعْضُ اَهْلِ بَيْعَتِ رِضْوَانِ نِکْتِ بَيْعَتِ
خَوَاهَنْدِ کَرْدِ چنانچہ از ابو بکر و عمر و دیگران بظہور رسید بیانہ آنکہ بیعت باین شرط بودہ است
کہ فرار ہزیمت نہ کنند در حرب ثابت بمانند یا کشتہ شوند بعد ازین بیعت در ہمان سال جنگِ خیبر
پیش آمد ابو بکر و عمر فرار کردند و ہزیمت خوردند۔ ۱۲ .

بیعت کے بعد صحابہ کبار نے وہ کام کیے جو اس بیعت کے مخالف تھے یعنی لڑائیوں میں بھاگ گئے، خلیفہ برحق کی خلافت غصب کر لی..... پس وہ اس آیت کے وعدے سے خارج ہو گئے۔

پس بہ نسبت اوّل امر کے ہم یہ جواب دیتے ہیں کہ خدا کی نسبت یہ خیال کرنا کہ وہ صحابہ کے اور کاموں سے راضی نہ تھا صرف ایک فعل خاص بیعت سے راضی ہوا، اس لیے ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (الفتح: ۱۸) فرمایا، یہ ایسی تہمت ہے کہ کوئی مسلمان اپنے دل میں اس کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اگر خدائے عزوجل ان بیعت کرنے والوں سے ہر طرح سے راضی نہ ہوتا تو وہ ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (الفتح: ۱۸) صرف ان کے دل خوش کرنے کو براہِ تدریس فرماتا اور ان کی جن باتوں سے ناراض تھا ان کو تقیہ ظاہر نہ کرتا..... اور یہ امر بھی غور کرنے کے لائق ہے کہ حضرات شیعہ کو کس طرح سے معلوم ہوا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اور کاموں سے خدا ناراض تھا، آخر کیوں کر ان کو اس کی ناراضی مندی کا حال معلوم ہوا۔

نہایت تعجب کا مقام ہے کہ خدا ان کے اس فعل کو جس سے راضی ہوا لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ کہہ کر ظاہر کرے اور ان کے ان کاموں کو جن سے ناراض ہوا سوائے شیعیانِ عبد اللہ بن سبا کے کسی پر اظہار نہ فرمائے..... شاید شیعیانِ پاک یہ جواب دیں کہ اس قرآن میں جو امام مہدی کے پاس ہے اصحاب کی برائیاں لکھی ہوئی ہیں، مگر ہم جب تک اس کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لیں اور امام صاحب سے اس کی تصدیق نہ کر لیں اس کو قبول نہیں کر سکتے۔ لیکن افسوس تو یہی ہے کہ نہ امام صاحب کا کچھ نشان ملتا ہے نہ اس قرآن کا کچھ پتہ چلتا ہے۔ ہزار برس تو گزر گئے اور ہنوز معلوم نہیں کہ ابھی اور کتنے دن امام کے ظہور میں باقی ہیں۔ شعر:

صد شب ہجر گزشت و مہ من پیدانیست

طرفہ عمرے کہ بصد سال ندیم یک ماہ

”فراق کی سیکڑوں راتیں گزر گئیں اور میرا چاند (محبوب) نہ نکلا اور عمر کا تماشا یہ

ہے کہ سو سال سے میں نے ایک چاند نہ دیکھا۔“

اور بہ نسبت امر دوم کے کہ صحابہ کبار اس آیت کے وعدے سے بہ سبب نکث بیعت کے خارج ہیں، اس کا جواب ہم اس طرح دیتے ہیں کہ اس اعتراض سے بھی اتنا ثابت ہوتا ہے کہ بیعت رضوان کے وقت تک صحابہ کبار اور مہاجرین و انصار سچے مسلمان اور پکے مومن تھے، نہ منافق تھے نہ کافر اور ان کی بیعت صادق تھی نہ کہ منافقانہ..... چنانچہ یہ فقرہ صاحب ”تقلیب المکائد“ ❶ کا کہ ”اس کلام معجز نظام دلالت می کند برینکہ بعضے از اہل بیعت رضوان نکث بیعت خواہند کرد“ (یہ معجزانہ کلام اس پر دلالت کرتا ہے کہ کچھ بیعت رضوان والے بیعت کو توڑ دیں گے) اس پر دلیل ہے کہ جب بیعت کی تھی اس وقت تک نہ منافق تھے نہ کافر بلکہ ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ میں داخل تھے..... اور شہید ثالث نور اللہ شوستری ❷ کا یہ کلمہ کہ

❶ صاحب تَقْلِيْبُ الْمَكَائِدِ کا نام سید محمد قلی بن سید محمد حسین ہے۔ ان کے ایک خاندانی بزرگ سید شرف الدین ہلاکو خاں کے حملے کے وقت خراسان سے ہندوستان آ کر ضلع بارہ بنکی کے کتور نامی قصبے میں مقیم ہو گئے تھے۔ سید محمد قلی اسی قصبہ میں بروز دو شنبہ بتاریخ ۵ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ مطابق ۱۷۷۲ء کو پیدا ہوئے، اسی سال اور مہینے میں نواب شجاع الدولہ نے رحلت کی، تذکرۃ العلماء کے مؤلف نے مولوی دلدار علی نصیر آبادی ملقب بہ غفران مآب کے اکابر تلامذہ کے تذکرہ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ موصوف مدتوں میرٹھ میں منصب عدالت پر متمکن اور وہاں مفتی رہے پھر ملازمت ترک کر کے لکھنؤ آ کر مقیم ہو گئے اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ ان دنوں تحفہ اثنا عشریہ کا بڑا چرچا تھا اس کے اثرات کو ختم کرنے کی غرض سے یہ بھی اپنے استاد اور دوسرے شیعہ علماء کی طرح اس کی تردید پر کمر بستہ ہوئے اور انہوں نے تحفہ کے باب ہشتم کا جواب تشیئد المطاعن و کشف الضغائن میں، باب اوّل کا سیف ناصری میں باب دوم کا تَقْلِيْبُ الْمَكَائِدِ باب ہفتم کا، برہان سعادت میں باب یازدہم کا مصارع الافہام میں دیا۔ ۹ محرم ۱۲۶۰ء مطابق ۱۸۴۲ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا اور امام بارگاہ غفران مآب میں دفن ہوئے۔ (شیخ محمد فراست)

❷ نام نور اللہ بن سید شریف بن نور اللہ، شیعوں میں شہید ثالث کے لقب سے مشہور ہیں۔ ”شوستر“ میں جو کہ ایران کے خوزستان صوبے کا ایک شہر ہے ۱۵۴۹ء بمطابق ۹۵۶ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے اجداد کا تعلق تہرستان کے دار الحکومت آمل یا مازندران سے تھا۔ قاضی نور اللہ شوستری نے علوم دین اور معقولات کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، دوسرے علوم کی تعلیم میر سیف الدین محمد اور میر جلال الدین سے حاصل کی۔ ۱۵۷۱ء میں قاضی صاحب مشہد کی سیاسی ہلچل کے سبب ہندوستان ہجرت کر آئے اور فتح پور سیکری میں حکیم ابوالفتح گیلانی کے مہمان ہوئے۔ حکیم ابوالفتح گیلانی نے اکبر (۱۵۵۶ء-۱۶۰۵ء) سے متعارف کرایا، چونکہ قاضی صاحب میں علمیت، منصف مزاجی اور مستعدی اعلیٰ درجہ کی تھی، اس لیے اکبر نے ۱۵۸۶ء میں لاہور کا قاضی مقرر کیا۔ یہ ہندوستان کی تاریخ میں پہلا موقع تھا جب کسی شیعہ کو قاضی کا عہدہ دیا گیا اور ۱۵۹۱ء میں قاضی نور اللہ اور قاضی علی کو اکبر نے کشمیر کی بد انتظامیوں سے

”مدلولِ آیتِ عندا تحقیق رضائے حق تعالیٰ است ازاں فعل خاص کہ بیعت است و کسی منکر اس نیست کہ بعضے از افعال حسنہ مرضیہ ازیں شاں واقع است“ (آیت کا مفہوم اس فعل خاص یعنی بیعت سے رضا مندی ہے اور اس کا تو کوئی منکر نہیں ہے کہ کچھ اچھے پسندیدہ کام ان سے ہوئے ہیں) اس پر شاہد ہے کہ ان کا بیعت کرنا فعل حسنہ تھا، بس اسی سے یہ اعتقاد کہ ”صحابہ کبار اوّل سے منافق تھے“ باطل ہوا۔ اور جب تک یہ آیت جس میں خدا نے اپنی رضا مندی ظاہر کی نازل ہوئی ان کا مسلمان اور با ایمان ہونا ثابت ہوا۔

خیر اب آگے چلیے اور اس بیعت کے بعد ان کے حال پر نظر کیجیے کہ کیا کام ان سے ایسے ہوئے جن سے ان کی نکث بیعت کرنا ثابت ہوا اور وہ کام کس وقت ہوئے، پیغمبر ﷺ کے جیتے جی یا ان کی وفات کے بعد۔ چنانچہ اس کی نسبت شہید ثالث اور صاحب تَقْلِيبُ الْمَكَايِدِ نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بیعت کے بعد پیغمبر ﷺ کے سامنے ان سے نکث بیعت ہوا، یعنی وہ جنگ خیبر میں ثابت قدم نہ رہے بلکہ بھاگ گئے.....

◀◀◀ اور مالی خرد برد کی تحقیقات کے لیے کشمیر بھیجا۔ ۱۵۹۹ء میں قاضی صاحب کو آگرہ کی فوج کا قاضی مقرر کیا گیا۔ ۱۶۰۳ء میں انہوں نے ایران واپس ہونے کا فیصلہ کر لیا مگر اکبر نے انہیں اجازت نہیں دی۔ ہندوستان آنے سے قبل بھی انہوں نے کچھ کتابیں لکھی تھیں یہاں آکر انہوں نے متعدد علوم پر بہت کچھ لکھا۔ تفسیر، حدیث، ریاضی، منطق، فلسفہ، تاریخ، صرف و نحو اور دیگر مضامین پر وہ برابر لکھتے رہے۔ قاضی صاحب نے کم و بیش ۱۰۴ کتابیں تصنیف کیں، مجالس المومنین، احقاق الحق اور مصائب النواصب، ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ احقاق الحق علامہ روز بہا کی ابطال الباطل کے جواب میں لکھی جسے علامہ روز بہا نے علامہ حلی کی کشف حق کے جواب میں لکھا تھا۔

جہانگیر کے عہد حکومت (۱۶۰۵-۲۷) میں بروز جمعہ ۱۸ جمادی الثانی ۱۰۱۹ء مطابق ۷ ستمبر ۱۶۱۰ء کو انہیں بمقام آگرہ قتل کر دیا گیا۔ اسباب قتل کے بارے میں مصنف صحیفہ نور سید صغیر حسین زیدی نے لکھا ہے کہ جہانگیر کو سب سے زیادہ طیش اس بات پر آیا کہ قاضی صاحب نے حضرت خواجہ جمیریؒ کی نسبت (جن کے اکبر اور جہانگیر بڑے معتقد تھے) درشت الفاظ کہے اور ان سے ایک رسالہ بھی منسوب کیا گیا ہے جس میں شیخ سلیم کی نسبت (جن کے نام پر بادشاہ کا نام سلیم رکھا گیا تھا) قلم ساقی پدنا تحقیق لکھا تھا۔ غرض بزرگوں کی شان میں گستاخی کے سبب قتل کر دیے گئے۔ قبر آگرہ میں دیال باغ کے علاقہ میں ہے، جس پر ۱۷۷۷ء میں قاضی صاحب کے قتل کے ایک سو چونسٹھ سال بعد سید محمد منصور حسینی نیشاپوری نے ایک مقبرہ بنوایا۔

اس کی نسبت ہم یہ جواب دیتے ہیں کہ اگرچہ قلعہ خیبر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے فتح نہیں ہوا لیکن فتح نہ ہونا مستلزم فرار نہیں ہے۔ جنگ خیبر سے بھاگنا حضرات شیعہ نے کہاں سے ثابت کیا اور بالفرض اگر وہ جنگ خیبر سے بھاگے اور انہوں نے نکث بیعت کیا تو جس طرح پر ہم نے ان کی بیعت کو خدا کے کلام سے ثابت کیا اور خدا کی رضا مندی کا لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ كِي آیت پیش کر کے ثبوت دیا، اسی طرح پر حضرات شیعہ کے ذمہ ہے کہ بمقابلہ اس آیت کے جنگ خیبر سے ان کا بھاگنا اور نکث بیعت کرنا اور خدا کا ان سے ناراض ہونا کسی آیت سے ثابت کر دیں (وَإِذْ لَيْسَ فَلَيسَ)..... اور ہم خوب یقین کرتے ہیں کہ اگر صحابہ کبار سے کوئی فعل بد اس بیعت کے بعد خدا کی نارضا مندی کا ہوتا تو ضرور وہ اس کی بھی خبر دیتا اور جس طرح پر ان کی بیعت سے راضی ہو کر لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ فَرَمَا دیا، اسی طرح پر ان کے فرار اور نکث بیعت سے ناراض ہو کر لَقَدْ غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِم ارشاد فرماتا۔ اس لیے کہ لڑائی سے بھاگنا اور بیعت کا توڑنا آخر پیغمبر ﷺ ہی کے سامنے ہوا، اس وقت تک وحی کا سلسلہ جاری تھا، جبرئیل علیہ السلام کا آنا بند نہ ہوا تھا۔ پھر کیا سبب ہے کہ خدا ان کے اچھے کاموں کو ظاہر کرے اور بُرے کاموں کی خبر تک نہ دے، ان کے اعمالِ حسنہ کی تو شہرت دے دے اور ان کے افعالِ بد کی پردہ پوشی کرے..... پس یا تو خدا ان سے ڈرتا تھا کہ ان کی برائی بیان نہ کر سکتا تھا یا درحقیقت ان سے کوئی برائی نہ ہوتی تھی جس کو ظاہر کرتا۔ اگر کوئی لغزش ہو جاتی تھی تو اس کو معاف کر دیتا تھا اور ان کے نیک کاموں کو خیال کر کے اس کو براہ ستاری چھپا دیتا تھا..... اور اگر یہ کہا جائے کہ بعد وفات پیغمبر خدا ﷺ کے صحابہ کبار نے ایسے فعل کیے کہ جن سے خدا ناراض ہو مثل خلافت غصب کرنے کے..... ان کی نسبت ہم کہتے ہیں کہ اگر ان سے پیغمبر خدا کی وفات کے بعد کوئی کام ایسا ہونے والا تھا کہ جس سے خدا ناراض ہوتا تو ضرور اس کی خبر دیتا اور کبھی ان کے حق میں ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ﴾ نہ فرماتا اور جب کہ خدا نے اس آیت میں یہ فرما دیا ﴿فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ﴾ کہ میں ان کے دلوں کی بات جانتا ہوں اور فرمایا کہ ﴿فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ﴾ کہ میں نے نازل کی

ان پر تسلی تو کیوں کر قیاس میں آسکتا ہے کہ ایسے لوگ کبھی جادۂ حق سے منحرف ہوئے ہوں..... لیکن ہم حضرات شیعہ سے عرض کرتے ہیں کہ وہ کیوں سوال و جواب میں اپنے اوقات ضائع کرتے ہیں اور کیوں علامہ کاشانیؒ کی تفسیر کے ان لفظوں کو نہیں دیکھتے ہیں کہ ”آنحضرت فرمود بدوزخ نہ رود یک کس از مومناں کہ در زیر شجرہ بیعت کردند“ اس مفسر نے تو کچھ قصہ جھگڑا باقی ہی نہیں رکھا، عام بشارت جنت کی ان لوگوں کے حق میں جو اس بیعت میں شریک تھے پیغمبر ﷺ کی زبان سے تصدیق کر دی..... لیکن اگر اس ایک روایت پر اطمینان نہیں ہوتا تو اس کی تائید میں دوسری روایت سنیں کہ ترجمہ ”کشف الغمہ“ میں لکھا ہے:

((از جابر بن عبداللہ انصاریؓ روایت است کہ مادراں روز ہزار و چہار صد کس بودیم، دراں روز من از حضرت پیغمبر خدا ﷺ شنیدم کہ آنحضرت خطاب بہ حاضران نمود و فرمود کہ شما بہترین اہل رُوئے زمیں اید، و ماہمہ دراں روز بیعت کردیم و کسے از اہل نکث نمود مگر قید بن قیس کہ آن منافق بیعت خود را شکست.))

”جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ اس (بیعت رضوان) کے دن چودہ سو افراد تھے، اس دن میں نے پیغمبر خدا ﷺ سے سنا کہ حاضرین کو آپؐ خطاب کر رہے تھے کہ تم لوگ رُوئے زمین میں سب سے بہتر ہو اور ہم لوگوں نے اسی دن بیعت کی تھی، بیعت کرنے والوں میں سے کسی نے سوائے قید بن قیس کے بیعت نہیں توڑی، وہ منافق تھا اس نے بیعت توڑ دی۔“

اس روایت سے چند فائدے حاصل ہوئے:

۱۔ یہ ثابت ہوا کہ بیعت کے وقت چودہ سو صحابی موجود تھے جن کے ایمان اور اسلام کی خبر خدا دیتا ہے کہ **فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ** اور ان کی شان میں فرماتا ہے **لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ**.

۲۔ پیغمبر خدا ﷺ نے ان کی نسبت فرمایا کہ تم بہترین امت سے ہو۔
 ۳۔ ثابت ہوا کہ سوائے ایک منافق کے اور کسی نے بیعت کو نہیں توڑا، پس اے شیعیاں پاک! اب تم انصاف سے ان روایتوں کو دیکھو اور اپنے شہید ثالث اور صاحب ”تقلیب المکائد“ کے ایمان اور انصاف پر خیال کرو کہ وہ محبت اہل بیت کے پردے میں کیسی خدا کی آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں اور کس طرح ایسے صریح نصوص سے انکار فرماتے ہیں۔ لیکن اگر ہم صحابہ رضی اللہ عنہم کی برائیوں کو تسلیم بھی کر لیں تب بھی شہید ثالث کی تقریر کا کچھ فائدہ نظر نہیں آتا، اس لیے کہ جو علامہ کاشانی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ ”آنحضرت فرمود بدوزخ نہ رود یک کس ازاں مومناں کہ در زیر شجرہ بیعت کردند“ اس کا کیا جواب ہے بغیر اس کے کہ یہ کہا جائے کہ حضرت نے تقیہ سے کہہ دیا ہوگا۔

اس مقام پر یہ امر بھی لکھنے کے قابل ہے کہ اگر کوئی شبہ کرے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس بیعت میں شریک نہ تھے، اس لیے وہ بیعت رضوان سے خارج ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ایسی محبت تھی کہ بیعت میں ان کے موجود نہ ہونے کے باوجود ان کو شریک کر لیا اور کیسا شریک کیا کہ اپنے ہاتھ کو ان کا ہاتھ بنا دیا۔^① چنانچہ اس مقام پر مولانا و بالفضل مولانا مولوی علی بخش خان صاحب نے اپنے ایک رسالہ میں لکھا ہے: اسی کو ہم بجنسہ نقل کرتے ہیں، و ہو ہذہ۔ (اور واسطے حصول شرف بیعت الرضوان کے رسول ﷺ نے عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی طرف سے بھی اپنے دونوں ہاتھوں سے وہ معاملہ فرمایا کہ دست حق پرست اپنے کو عثمان کا ہاتھ قرار دیا۔ روضہ کلینی میں حدیث وارد ہے کہ بیعت لی

① فلما انطلق عثمان لقی ابان بن سعید فتأخر عن السرج فحمل عثمان بين يديه ودخل عثمان فاعلمهم و كانت الناوشته فجلس سهل بن عمر و عند رسول الله ﷺ و جلس عثمان في عسكر المشركين و بايع رسول الله المسلمين و ضرب صلعم باحدى يديه على الاخرى لعثمان، قيل طوبى لعثمان قد طاف بالبيت و سعى بين الصفا و المروة و احل، فقال رسول الله ما كان يفعل فلما جاء عثمان قال رسول الله اطفت بالبيت فقال ما كنت لاطوف بالبيت و رسول الله لم يطيف به، ثم ذكر القصة و ما كان فيها الحديث ١٢ - (كتاب الروضة)

پیغمبر خدا ﷺ نے مسلمانوں سے اور ایک ہاتھ کو اپنے دوسرے ہاتھ پر مارا واسطے عثمان رضی اللہ عنہ کے کہ وہ لشکر میں مشرکوں کے تھے) اس حدیث سے علاوہ قطعیت مغفرت و رضوان الہی کے ایک عمدہ لطیفہ ہاتھ آیا کہ دست نبی ﷺ دست عثمان رضی اللہ عنہ قرار پایا، اور دست نبی وہ ہے کہ مجازاً دست خدا ہے يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ .

اب دیکھئے عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو ”يَدُ اللَّهِ“ یا ”يَدُ النَّبِيِّ“ (اللہ کا ہاتھ یا نبی کا ہاتھ) کا خطاب منصف مزاج عطا کرتے ہیں یا اس لقب کو پھر بھی مخصوص علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے کہے جاتے ہیں، انتہی بلفظہ۔ (واللہ درہ و علی اللہ اجرہ) اور اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ کو اپنے یاروں کی یاری پر نہایت بھروسا تھا اور ان کے استقلال پر یقین کامل تھا۔ اس لیے کہ جب لوگوں نے کہا کہ خوشحال عثمان رضی اللہ عنہ کا کہ ان کو خانہ کعبہ کا طواف نصیب ہو گیا تو حضرتؐ نے فرمایا یہ ممکن نہیں ہے کہ عثمانؓ بغیر ہمارے طواف کرے، آخر ویسا ہی ہوا کہ بغیر حضرتؐ کے عثمانؓ نے طواف نہ کیا۔ چنانچہ اسی حدیث کے مضمون کو ”حملہ حیدری“ کے مؤلف نے بھی نظم کیا ہے، کما قال: نظم

طلب ❶ کرد پس اشرف انبیاءؑ

ز اصحاب عثمانؓ صاحب حیا

اشرف الانبیاء (محمد ﷺ) نے اپنے اصحاب میں سے حیا دار عثمانؓ سے کہا (کہ تم مکہ جاؤ اور حالات کا جائزہ لو)

با وہم ہماں گفت خیر البشرؑ

کز اں پیشتر گفته بد با عمر رضی اللہ عنہ

ان (عثمان) سے بھی خیر البشر ﷺ نے وہی کہا جو کہ اس سے پہلے عمر رضی اللہ عنہ سے آپ کہہ چکے تھے:

بو سید عثمانؓ زمیں در زمان

بمقصد رواں شد چوں تیر از کماں

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسی وقت زمین خدمت کو بوسہ دیا اور جیسے تیر کمان سے نکلتا ہے

مقصد کے لیے چل پڑے۔

چو اور فت از اصحاب روز دگر

بگفتند چندی بہ خیرا البشر

خوشا حال عثمان با احترام

کہ شد قسمتش حج بیت الحرام

رسولِ خدا چوں شنیدایں سخن

پاسخ چنیں گفت با انجمن

بہ عثمان نداریم ما این گماں

کہ تنہا کند طوف آں آستان

”جب وہ چلے گئے تو صحابہؓ نے دوسرے دن خیر البشر ﷺ سے یہ بات کہی کہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا حال کتنا اچھا ہے کہ بیت الحرام کا حج ان کو نصیب ہو گیا،

رسول خدا ﷺ نے جب یہ بات سنی فوراً پورے مجمع سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ

حضرت عثمانؓ کے بارے میں ہم یہ گمان نہیں کرتے کہ وہ تنہا اس آستانہ (بیت

اللہ) کا طواف کر لیں گے۔“

اس کے بعد یہی مؤلف لکھتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکے میں پہنچے اور ابوسفیان سے کہا

کہ پیغمبر خدا ﷺ طواف کے لیے آنا چاہتے ہیں اس نے کہا کہ یہ ممکن نہیں ہے مگر تمہارا دل

چاہے تو طواف کر لو تب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انکار کیا اور اس پر ابوسفیان نے ان کو قید کر

لیا۔ کما قال:

نجوشیدش آنگہ بدل مہر خون

به عثمان^{رض} چنیس گفت آن سرنگون
 کہ گر میل داری تو طوف حرم
 بکن مانعت نیست کس زین حشم
 و لیکن محال ست آن بے گزاف
 کہ آید محمد^ص برائے طواف
 چوبشنید عثمان^{رض} ازو ایس سخن
 چنیس داد پاسخ بآن اهر من
 کہ طوف حرم بے رسول خدا
 نباشد بر پیروانش روا
 ازین گفته سفیان بر آشفت بیش
 بگرد انداز سوی او روی خویش
 بہ فرمود پس باد گر مشرکان
 کہ عثمان^{رض} و آن ده کس از پیروان
 نیابند رفتن بہ نزد رسول^ص
 اگر شاد باشند ازین گر ملول
 چون عثمان^{رض} ازو ایس حکایت شنید
 علاجے بہ جز صبر کردن ندید
 مقید نمودندش اعدائے دیں

بیان نجاتش کنم بعد ازین ❶

”محبت کے خون نے اس وقت جوش مارا تو ابوسفیان نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے

کہا کہ اگر آپؐ طوافِ حرم کرنا چاہیں تو کر لیں، اس شرف سے تمہارے لیے کوئی رکاوٹ نہیں لیکن یہ بات تو بالکل محال ہے کہ محمد ﷺ طواف کے لیے آئیں۔ جب عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کی یہ بات سنی تو اس کو برجستہ یہ جواب دیا کہ بغیر رسول ﷺ کے حرم کا طواف آپ کے پیروکاروں کے لیے جائز نہیں۔ اس بات سے ابوسفیان آگ بگولہ ہو گیا اور ان کی طرف سے اپنا چہرہ پھیر لیا، دوبارہ مشرکوں سے کہا کہ عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے دسوں ساتھی اب رسول کے پاس جانے نہ پائیں، چاہے اس سے خوش ہوں یا ناخوش۔ جب عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کی یہ بات سنی سوائے صبر کے کوئی چارہ نہ دیکھا (چنانچہ) دشمنانِ دین نے ان کو قید کر لیا اس کے بعد ان کے چھوٹے کا قصہ ہم بیان کرتے ہیں۔“

غرض کہ ہم شیعہ حضرات سے التماس کرتے ہیں کہ وہ ذرا انصاف فرمائیں کہ ان کے مفسرین اور محدثین اور مؤرخین صحابہ رضی اللہ عنہم کی نسبت کیا لکھتے ہیں اور ان کے استقلال اور صبر اور ایمان اور اسلام کو کیسا تسلیم کرتے ہیں اور پھر بایں ہمہ ان سے عداوت رکھتے ہیں اور ایسے لوگوں کو جن کے ایمان اور اسلام پر پیغمبر ﷺ کو اطمینان ہو اور جن کی لغزش کرنے کا شبہ تک حضرت کے دل پر نہ گزرے اور جو باوجود مصیبتوں اور محنتوں کے سر مواطاعتِ نبویؐ سے باہر نہ ہوں اور جن کے استقلال اور صبر کی خدا تعالیٰ کی تعریفیں کرے منافق اور مرتد کہتے ہیں (نعوذ باللہ من ذالک) ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ حضراتِ شیعہ کس طرح ایسے سچے مسلمانوں اور پکے ایمان والوں کو منافق کہتے ہیں اور کیوں کر ایسی صریح آیات اور سچی روایات سے انکار کرتے ہیں۔ اس لیے کہ جب کوئی شخص ان آیتوں اور حدیثوں اور روایتوں کو دیکھے تو بھلا ممکن ہے کہ وہ صحابہ کرامؓ کے فضائل میں شبہ کر سکے، یا ان کی نسبت نفاق اور ارتداد کا خطرہ بھی اس کے دل میں گزر سکے۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ خدا نے ان کے حالات بیان کرنے میں فقط کنائے اور اشارے پر قناعت نہ فرمائی بلکہ صاف صاف تصریح کر دی اور ٹھیک ٹھیک پتہ اور نشان ان کا بتلا دیا اور

ایسی صریح آیتوں کو نازل کر کے منکرین کے شبہات کو دور کر دیا۔ اگر پیغمبر صاحب ﷺ کے اوپر ایمان لانے والوں کی فقط خدا تعریف اجمالی کرتا تو منکرین کو تاویل اور شبہے کا موقع تھا مگر جب صاف کہہ دیا کہ میں ان مسلمانوں سے راضی ہوں جنہوں نے پیغمبر ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی اور جگہ بھی بیعت کرنے کی بتلا دی کہ درخت کے نیچے اور یہ بھی کہہ دیا کہ یہ لوگ پیغمبر کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرتے ہیں بلکہ میرے ہاتھ پر، تو اب کون شخص ہے جو ایسی بیعت کرنے والوں کے ایمان اور اخلاق پر شبہ کر سکے، ہاں یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید بیعت کرنے والے وہی معدودے چند ہوں جو موافق اعتقاد شیعوں کے مرتد نہیں ہوئے، لیکن جب کہ علمائے شیعہ نے اس امر کو تسلیم کر لیا کہ صحابہ کبارؓ چودہ (۱۴) سو اس بیعت میں شریک تھے اور یہ بھی قبول فرما لیا کہ انہی کی شان میں خدا نے اس آیت کو نازل کیا اور اس کا بھی اقرار کیا کہ سوائے ایک منافق کے اور کسی نے بیعت کو نہیں توڑا تو ہم کو نہایت ہی تعجب آتا ہے کہ کیوں کر ایسی بیعت کرنے والوں کے حق میں ایسا فاسد اعتقاد رکھتے ہیں! لیکن یہ خیال کر کے کہ حضرات شیعہ کو نہ خدا کے کلام پر یقین ہے نہ پیغمبر ﷺ کی حدیثوں پر نہ اماموں کے قول پر تو کچھ تعجب نہیں ہوتا اگر ان میں سے کسی پر عمل ہوتا تو کبھی ایسا عقیدہ نہ رکھتے۔

اے بھائیو! تمہارے حق میں ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ جل شانہ، تم کو ایک ذرہ بھرا ایمان عطا کر دے تاکہ تم لوگ اپنے عقیدوں کی برائیوں پر خود ہی اقرار کرنے لگو اور جو ہم تم کو سمجھاتے ہیں وہ تم خود ہی سمجھنے لگو۔ اے یارو! ذرا ایسے عقیدوں پر غور کرو اور سوچو کہ ان میں کچھ بھی اثر ایمان اور اسلام کا ہے، اگر ہے تو دکھاؤ..... شعر

نالہ حزنیت کو آہ آتشیت کو

لاف عشق بازی چند عشق رانشا نیہاست

”تیرے حزن و ملال اور آہ آتش کون سنتا ہے، عشق کی نشانی عشق بازی کی چند

ڈینگیں ہیں۔“

پانچویں آیت:

﴿لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌۭ﴾

(الانفال: ۶۸)

”اگر نہ ہوتی ایک بات جس کو لکھ چکا اللہ پہلے سے تو تم کو پہنچتا، اس لینے میں بڑا عذاب۔“

شان نزول اس آیت کا یہ ہے کہ جب لڑائی بدر کی فتح ہوئی اور مشرکین قید میں آئے تب پیغمبر خدا ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا کہ ان قیدیوں کو کیا کرنا چاہیے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ فدیہ لے کر چھوڑ دینا چاہیے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ان کی گردنیں مار دینا چاہیے بلکہ جو جس کا رشتہ دار ہو وہی اپنے ہاتھ سے اس کو قتل کرے اور خدا کی محبت کے سامنے دوسرے کی محبت کا خیال نہ کرے۔ لیکن حضرت نے موافق مشورے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے فدیہ لے کر چھوڑ دیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور اس روایت کو علماء اور مفسرین امامیہ بھی تصدیق کرتے ہیں۔ چنانچہ تفسیر خلاصۃ المنج کا شانی ۱ میں لکھا ہے کہ بدر کی لڑائی میں ستر (۷۰) آدمی قید ہوئے منجملہ ان کے عباسؓ اور عقیلؓ بھی تھے حضرت نے ان کے باب میں اپنے یاروں سے مشورہ کیا، ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہ وہ بھی مہاجرین میں سے تھے کہا کہ یا رسول اللہ! یہ سب چھوٹے بڑے آپ کی قوم اور قبیلے کے ہیں، اگر ہر ایک بقدر طاقت و استطاعت اپنی کے کچھ فدیہ دے تو امید ہے کہ ایک دن دولت اسلام پر پہنچیں۔

مجمع البیان طبرسی میں لکھا ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے بدر کے دن قیدیوں کے باب میں اپنے یاروں سے کہا کہ اگر تم چاہو ان کو مار ڈالو اور چاہو جانے دو۔ تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا

۱ روز بدر ہفتاد تن اسیر شدند و از جمله ایشان عباس و عقیل بودند حضرت درباب ایشان با اصحاب مشاورہ کرد ابو بکر کہ از مہاجرین بود گفت یا رسول اللہ اکابر و اصغر این قوم اقارب و عشائر تو اند اگر ہر یک بقدر طاق و استطاعت فدائے بدهد باشد کہ روزے بدولت اسلام برسند.....

یا رسول اللہ! انہوں نے آپ کو جھیلایا اور آپ کو نکالا، اس لیے ان کی گردنیں مارنا چاہیے، عقیل کو علی رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمائیے کہ وہ ان کو ماریں اور فلاں شخص میرے سپرد کیجیے کہ میں اس کو قتل کروں اور یہ سب سردارانِ کفار سے ہیں۔ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ! یہ آپ کی قوم اور رشتے کے لوگ ہیں، فدیہ لے کر چھوڑ دینا چاہیے۔ چنانچہ اسی طرح پر حضرت نے کیا، تب یہ آیت نازل ہوئی اور پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا کہ اگر عذاب نازل ہوتا آسمان سے تو سوائے عمرؓ اور سعد بن معاذؓ کے کوئی نجات نہ پاتا۔

ان روایتوں سے باقرار علمائے امامیہ چند فائدے حاصل ہوئے:

- ۱۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مہاجرین اور اہل بدر سے ہونا۔
- ۲۔ پیغمبر خدا ﷺ کا ان سے مشورہ کرنا۔
- ۳۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کافروں پر سخت ہونا اور خدا کی راہ میں قربت اور برادری کا کچھ خیال نہ کرنا..... اور جو کچھ ان فائدوں سے فائدے حاصل ہوتے ہیں ان کو ہم بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مہاجرین میں سے ہونا ثابت ہوا تو جو فضیلتیں اللہ جل شانہ نے مہاجرین کی بیان کی ہیں اور جن کو اوپر ہم نقل کر چکے ہیں وہ سب ان کے حق میں ثابت ہوئیں..... دوسرے جو بعض علمائے امامیہ نے انکار کیا ہے کہ اصحابِ ثلاثہ مہاجرین میں سے نہ تھے، وہ قولِ باطل ہوا، چنانچہ ”تقلیب المکائد“ کے مؤلف نے مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبِ قدس اللہ سرہ کے تحفہ کے بابِ مکائدِ شیعان کے کید نو دو حکیم کے جواب میں کہ..... ”اصحابِ ثلاثہ از مہاجرین اولین نبودند“ (یعنی ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ عثمان رضی اللہ عنہ) مہاجرین اولین میں سے نہیں تھے) تیسرے امامیہ کا یہ گمان کہ معاذ اللہ! حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ابتدا ہی سے منافق تھے اور کبھی دل سے ایمان نہ لائے تھے اور ان کی نیت نیک نہ تھی، فاسد ٹھہرا، جیسا کہ جناب میرن صاحب قبلہ حَدِيقَه سُلْطَانِيَه کے بابِ سوم میں لکھتے ہیں:

((سیرت شیخین دلالت بر خبت سریرت آنها دارد که در وقت کتمان از حضرت نبوی در خواست اظهار دعوت نموده و در فکر اضرار آنحضرت برمی آمدند و در وقت اعلان از نصرت دست می کشیدند فاعتبر وایا اولی الابصار.....)) انتھی بلفظہ .

”شیخین کی سیرت ان کی بد باطنی پر دلالت کرتی ہے کہ چھپانے کے وقت میں آنحضرت ﷺ سے تبلیغ اسلام کی خواہش کی اور رسول اللہ ﷺ کی تکلیف کے درپے رہتے تھے اور اعلانِ دعوت کے وقت آپ کی حمایت و اعانت سے باز رہے۔“

اگر میرن صاحب قبلہ زندہ ہوتے تو میں پوچھتا کہ حضرت اگر شیخین رضی اللہ عنہما کی نیت نیک نہ ہوتی اور وہ اعلان کے وقت نصرت سے ہاتھ کھینچتے ہوتے تو بدر کی لڑائی میں کیوں شریک ہوتے اور کیوں خدا ان کے ہاتھ پر فتح دیتا اور کیوں پیغمبر خدا ﷺ ان سے مشورہ کرتے اور کیوں آپ کے جد امجد کا شانی اور طبری مہاجرین اور اہل شوریٰ میں ان کا ہونا قبول کرتے..... اے مسلمانو! شیعوں کے ایمان اور عقل و حیا پر غور کرو کہ وہ شیخین رضی اللہ عنہما کی نسبت جو کہ اپنی تمام جان سے پیغمبر ﷺ کے عاشق تھے اور اپنا تمام مال حضرت پر فدا کر چکے تھے اور جو شب و روز اظہار دعوت کے لیے اصرار کیا کرتے تھے، یہ گمان کرتے ہیں کہ ان کی نیت اس اصرار سے یہ تھی کہ پیغمبر خدا ﷺ اظہار دعوت کریں اور لوگ ان کو ستاویں اور ہلاک کر ڈالیں..... افسوس ایسے عقیدے پر..... خیر میرن صاحب قبلہ جو چاہیں فرمائیں اور ان کے پدر بزرگوار جو دل میں آئے ارشاد کریں لیکن اس امر کو کہ شیخین رضی اللہ عنہما مہاجرین اور اصحاب بدر میں سے تھے جھٹلا نہیں سکتے اور ہمارا مطلب اتنی ہی بات سے حاصل ہوا جاتا ہے اس لیے کہ جب وہ مہاجرین میں سے تھے تو ان فضیلتوں کے مستحق ہیں جو خدا نے جا بجا قرآن مجید میں ہجرت کرنے والوں کی بیان کی ہیں اور جب کہ وہ اہل بدر سے تھے تو وہ اس مغفرت کے

وعدے میں شریک ہیں جو اللہ جل شانہ نے اہل بدر سے کیا ہے کہ میں نے ان کو مرفوع القلم کر دیا ہے، چنانچہ اس امر کو علمائے امامیہ بھی قبول کرتے ہیں۔ علامہ کاشانی خُلاصۃُ الْمَنْهَج میں تفسیر کریمہ ﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَى﴾ کی بایں الفاظ کرتے ہیں:

((اگر نہ حکمی و فرمانے می بود از خدا تعالیٰ کہ پیشی گرفته شدہ اثبات آن در لوح محفوظ کہ بے نہی صریح عقوبت نہ فرماید، یا اصحاب بدر را عذاب نکند.))
 ”اگر خدا تعالیٰ کا حکم و فرمان پہلے ہی سے لوح محفوظ میں ثابت نہ ہوتا کہ صریح ممانعت کے بغیر سزا نہ دے گا یا اصحاب بدر کو سزا نہ دے گا۔“

اور اسی طرح پر تفسیر مجمع البیان طبرسی میں لکھا ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا ہے:

((لَعَلَّ اللَّهُ أَطَّلَعَ عَلَى أَهْلِ بَدْرٍ نَغْفَرَ لَهُمْ فَقَالَ اِعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ.))

”ہ خدا نے اہل بدر کی شان میں فرما دیا ہے کہ جو چاہو سو کرو میں تم کو بخش چکا ہوں۔“

اور تفسیر خُلاصۃُ الْمَنْهَج میں لکھا ہے:

((خدائے تعالیٰ بدریاں را وعدہ مغفرت دادہ و ایشان را بخطاب مستطاب اعملوا ما شئتم فقد غفرت لكم نوازش فرمودہ.))

”پس جب پیغمبر خدا ﷺ کی زبان مبارک سے تمام اہل بدر کا قطعی جنتی ہونا اور خدا کا ان کی نسبت اِعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ کہنا ثابت ہوا تو پھر اب صحابہ کبار علی الخصوص اصحاب ثلاثہ کے قطعی جنتی ہونے میں کون سا شبہ رہا۔“

اے یارو! ہم اب تک نہیں سمجھے کہ حضراتِ شیعہ کے مذہب کا مدار کس پر ہے، اگر خدا کے کلام پر ہے تو وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلتوں سے بھرا ہوا ہے، اگر پیغمبر خدا ﷺ کی حدیثوں پر ہے تو ان میں بھی انہیں کی صفات کا تذکرہ ہے، اگر ائمہ علیہم السلام کی روایتوں پر ہے تو ان میں بھی ان کی خوبیوں کا بیان ہے، اگر اپنی ہی تفسیروں اور کتابوں پر ہے تو ان سے بھی ان کے فضائل کا ثبوت ہوتا ہے..... پس اب اور کیسی سند یہ حضرات چاہتے ہیں جو صحابہ رضی اللہ عنہم کے فضائل پر ہم پیش کریں اور کیسی دلیل چاہتے ہیں جو ان کی بزرگی کے ثبوت میں بیان کریں۔ اصل یہ ہے کہ اگر ایمان اور انصاف ہو تو خدا کے کلام اور رسول ﷺ کی احادیث اور ائمہ کے اقوال کو مانیں۔ جب ایمان اور انصاف ہی نہیں ہے اور عبداللہ بن سبا کی پیروی کرنی منظور ہے تو پھر کیوں کر اپنے پیرومرشد کے سکھائے ہوئے عقیدوں کو چھوڑیں..... افسوس ہزار افسوس کہ بارہ سو برس گزر گئے اور اس ملعون یہودی کی ہڈیاں خاکستر تک ہو گئیں مگر جو کچھ وہ اپنے شیعوں کو سکھلا گیا اس کو وہ نہیں بھولتے اور جس راہ پر وہ اپنے یاروں کو چلا گیا اس سے نہیں ہٹتے۔ ہزار ہزار کوئی سمجھائے، لاکھ آیتیں اور حدیثیں دکھلائے مگر اپنے پیرومرشد کے قول کے روبرو ایک پر بھی نظر نہیں کرتے۔ کلام اللہ کی تاویل کر دیں، حدیثوں کو بنا ڈالیں، اماموں کے قولوں کو رد کر دیں مگر اپنے جدا مجد کی بات کو نہیں بھولتے۔ جس عقیدے کو خیال کیجیے اس میں اسی ملعون کی تعلیم کا اب تک اثر ہے، جس مسئلہ پر غور کیجیے اب تک اسی کمبخت کے قول پر عمل ہے، ولنعم ما قیل: شعر.....

بلب زدود دل آہی کہ داشتم دارم
نشستی بر راہی کہ داشتم دارم

چھٹی آیت:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوْا
وَنَصَرُوا أُولَئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ﴾

(سورة الانفال: ۷۴)

”جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور خدا کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے جگہ دی اور مدد کی وہی سچے ایمان والے ہیں۔ ان کے لیے مغفرت اور رزق باکرامت ہے۔“

اس آیت پر ایمان لانے والے مہاجرین اور انصار کے ایمان اور اسلام پر کچھ شبہ نہیں کر سکتے اور ان کی مغفرت اور جنتی ہونے میں کچھ شک نہیں لاسکتے ہیں، اس لیے کہ جب اللہ جل شانہ خود تصدیق فرماتا ہے کہ جن لوگوں نے ہجرت کی اور اپنے گھر بار کو چھوڑا اور جنہوں نے پیغمبر ﷺ کو اور ہجرت کرنے والوں کو اپنے گھروں میں جگہ دی اور ان کی مدد کی وہ سچے مسلمان اور پکے ایمان لانے والے ہیں، مغفرت اور رزق کریم ان کے حصہ میں ہے..... پس خدا کی ایسی شہادت کو سن کر کون شخص ہوگا کہ مہاجرین اور انصار کے ایمان میں شبہ کرے اور ان کی مغفرت میں کلام کرے۔ شیعیان عبداللہ بن سبا کو ذرا سوچنا چاہیے کہ جب اللہ جل شانہ مہاجرین اور انصار کے ایمان کی تصدیق کرتا ہے اور ان کے حق میں ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ کی شہادت دیتا ہے اور ان کی شان میں ﴿لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ﴾ فرماتا ہے پھر کیوں کر ان کے دل میں ایسے پاک لوگوں کی طرف سے شبہ ہوتا ہے اور کس طرح ان کی زبان سے ایسے شخصوں کی نسبت کفر و نفاق کا کلمہ نکلتا ہے، ﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ﴾ (بڑی بات ان کے منہ سے نکل رہی ہے) اگر کسی کو شک ہو کہ یہ آیت ان مہاجرین و انصار کی شان میں نہیں ہے جن کی نسبت حضرات شیعہ نیک اعتقاد نہیں رکھتے، اس لیے ہم تفسیر مجمع البیان سے جو امامیہ کی معتبر تفاسیر میں سے ہے، اس آیت کی تفسیر لکھتے ہیں جس کو شک ہو وہ صفحہ ۲۵۲ تفسیر مذکورہ مطبوعہ طہران ۱۳۷۵ھ کو دیکھ لے، مفسر موصوف لکھتا ہے کہ ”خدا نے پھر ان آیتوں میں مہاجرین اور انصار کا ذکر کیا اور ان کی ثنا و صفت بیان کی، پس خدا کے اس قول کا کہ ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ تصدیق کی انہوں نے خدا کی اور اس کے رسول ﷺ کی اور ہجرت کی اپنے گھروں اور وطن سے، یعنی مکے سے مدینے کو اور جہاد کیا انہوں نے خدا کے

دین کی ترقی کے لیے اور ﴿وَالَّذِينَ آوَوْا وَنَصَرُوا﴾ کے یہ معنی ہیں کہ جگہ دی مہاجرین کو اپنے گھروں میں اور مدد کی پیغمبر ﷺ کی، اور ﴿أُولَئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ کا یہ مطلب ہے کہ وہی لوگ سچے مسلمان ہیں، اس لیے کہ انہوں نے اپنے ایمان کو ہجرت کر کے اور مدد دے کر ثابت کر دیا۔^❶

اس تفسیر کو دیکھ کر اگر حضرات شیعہ مہاجرین و انصار کی فضیلت کا اقرار نہ کریں تو سوائے تعصب اور ضلالت کے کیا تصور کیا جائے۔ کاش! حضرات شیعہ بمقابلے ایسی صریح آیتوں اور ایسی صاف بشارتوں، کے ایک دو آیت بھی قرآن سے نکال کر ہم کو دکھلا دیتے اور جس طرح پر ہم نے ان کے فضائل اور درجات کو کلام اللہ سے ثابت کیا، وہ قرآن ہی کی سند سے ان کی ایک ہی برائی کا ثبوت پہنچاتے تو ہم ان کو کسی قدر معذور بھی جانتے..... لیکن افسوس تو ہم کو اسی بات کا ہے کہ ہم تو مہاجرین اور انصار کے فضائل میں قرآن کی آیتوں کو پیش کرتے ہیں، رسول ﷺ کی حدیثوں کو بیان کرتے ہیں، اماموں کے قولوں کو انہیں کی کتابوں سے نکال کر دکھلاتے ہیں اور وہ ان سب کو چھوڑ کر چند مفتری، کذابوں کی جھوٹی باتوں کو پیش کرتے ہیں، اور ان لوگوں کے قولوں پر عمل کرتے ہیں جن کو اماموں نے نکال دیا، جن پر اپنی زبان سے لعنت کی اور جن کو جھوٹا اور فریبی کا خطاب دیا جس کا ثبوت ہم آئندہ پیش کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ پس انصاف کرنے والے انصاف کر سکتے ہیں کہ خدا کے کلام پر ہم ایمان رکھتے ہیں یا حضرات شیعہ، اور قرآن کی آیات کی ہم تصدیق کرتے ہیں یا شیعیان عبداللہ بن سبا۔ اے یارو! اگر فرض کیا جائے کہ جو ہمارا اعتقاد صحابہ رضی اللہ عنہم کی نسبت ہے وہ معاذ اللہ! باطل ہو اور جو اعتقاد شیعوں کا بہ نسبت ان کے ہے وہی صحیح ہو اور قیامت کے دن اللہ جل شانہ

❶ ثم عاد سبحانه الى ذكر المهاجرين والانصار ومدحهم والثناء عليهم فقال والذين آمنوا وهاجروا وجاهدوا في سبيل الله اء صدقوا الله ورسوله وهاجروا امن ديارهم و او طانهم يعني من مكة الى المدينة وجاهدوا مع ذلك في اعلاء دين الله والذين آو و انصروا اء ضموا اليهم ونصرو النبي اولئك هم المؤمنون حقا اي اولئك الذين حققوا ايمانهم بالهجرة والنصرة- ١٢ (مجمع البيان-).

عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر ہمارے اعتقاد باطل پر ہم سے جواب چاہے تو ہم اسی کی کتاب کو اس کے سامنے کر دیں گے اور نہایت ادب سے عرض کریں گے کہ الہ العالمین تو عادل ہے اور شیعوں کے مذہب کے موافق تیرا عدل اصول ایمان سے ہے تو اب تو ہی انصاف کر کہ یہ کتاب تیری ہے جس کو ہماری ہدایت کے واسطے تو نے اپنے پیغمبر ﷺ کی معرفت نازل کیا اور اس کا نام کتابِ مبین رکھا اور اس کی عبارت اور مضمون میں اغلاق اور تصنع کو دخل نہ دیا، ہر چیز کو صاف صاف بیان کر دیا اور خود اس کا حافظ رہ کر اس کو تحریف سے محفوظ رکھا..... پس خداوند اہم نے تیری ہی کتاب کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھ لیا اور جو کچھ اس میں تو نے کہہ دیا اور فرما دیا اسی پر ہم نے یقین کر لیا، مہاجرین اور انصار کی اس قدر بزرگیاں اور فضیلتیں تو نے بیان کیں کہ ہم ان کی نسبت نیک اعتقاد رکھنے پر مجبور ہو گئے اور تیری ہی شہادت سے ان کے ایمان اور اسلام پر بلکہ ان کے فضائل اور درجات پر معتقد ہو گئے، کہیں تو نے ان کے حق میں فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ أَكْبَرُ دَرَجَةً عِنْدَ اللَّهِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ۝﴾

(سورة التوبة: ۲۰)

”یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور مالوں سے جہاد کیا، وہ اللہ کے یہاں بڑے درجہ والے ہیں اور وہی لوگ کامیاب ہیں۔“

کسی مقام پر تو نے ان کی نسبت ارشاد کیا:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوْا وَنَصَرُوا أُولَئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ (سورة الانفال: ۷۴)

”یعنی جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنہوں نے جگہ دی اور مدد کی وہی لوگ سچے مومن ہیں۔“

کسی جگہ ان کی شان میں تو نے فرمایا:

﴿لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ﴾ (سورہ انفال: ۷۴)

”کہ ان کے لیے مغفرت اور رزق باکرامت ہے۔“

کسی مقام پر ان کی صفت میں تو نے کہا:

﴿لَيَرْزُقْنَهُمُ اللَّهُ رِزْقًا حَسَنًا﴾ (سورہ الحج: ۵۸)

”یعنی اللہ ان کو یقیناً عمدہ رزق دے گا۔“

غرض کہ خدایا جب ہم نے تیری کتاب کو کھولا تو کوئی ورق اور کوئی صفحہ اس کا مہاجرین اور انصار کا ذکر سے خالی نہ پایا۔ کسی آیت سے ان کی برائی کا ثبوت کیسا ان کی فضیلت پر شبہ تک نہ ہوا۔ جب تیری کتاب سے ان کی نسبت شہادت چاہی تو یہی معلوم ہوا: ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ﴾ جب قرآن سے ان کے واسطے فال کھولی تو یہی نکلا کہ: ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَآئِزُونَ﴾ پس جب تو نے بے نیازی ان کی صفات اور فضائل سے اپنی کتاب کو بھر دیا اور ان کی شان میں بار بار ﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾ فرمایا اور ہم کو ان کی اقتدا اور پیروی کی تاکید کی اور ان سے محبت رکھنے کی تحریص اور عداوت و کینہ رکھنے پر تہدید فرمائی تو ہم ان سے اگر محبت نہ رکھتے اور ان کو اچھا نہ جانتے اور ان کی اقتدا نہ کرتے تو کیا کرتے..... الہ العالمین تو نے ہم کو ان لوگوں میں تو پیدا نہیں کیا جن کی نسبت تو نے فرمایا:

﴿الَّذِينَ أَخْرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يُبْتَغُونَ فِضْلًا مِّنَ اللَّهِ

وَرَضُوا﴾ (سورہ الحشر: ۸)

’یعنی جو لوگ اپنے گھروں اور مالوں سے نکالے گئے وہ صرف اللہ کے فضل اور

رضا مندی کے طالب ہیں۔“

اس گروہ میں تو نے ہم کو شامل ہی نہ کیا تھا جس کی صفت میں تو نے ارشاد کیا ہے:

﴿وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْآيْمَانَ مِن قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَن هَاجَرَ إِلَيْهِمْ﴾ (الحشر: ۹)

(یعنی جو لوگ دار اور ایمان (مدینہ) کو ٹھکانہ بنائے ہوئے تھے، ان سے پہلے اور جو ان کی

طرف ہجرت کر کے آئے ان سے محبت کرتے ہیں)..... ہم کو تو ان سب کے پیچھے مخلوق کیا اور ہم لوگوں کی نسبت پہلے ہی سے تو نے یہ لکھ دیا: ﴿وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا﴾ (الحشر: ۱۰) (یعنی جو لوگ ان کے بعد آئے وہ کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! ہم کو اور ہمارے ان بھائیوں کا جو ہم سے پہلے ایمان لائے بخش دے اور ہمارے دل میں ایمان والوں کے لیے کھوٹ نہ رکھ) تو کیوں کر ہم ان پیشواؤں سے محبت نہ رکھتے اور کس طرح ان سے کینہ اور عداوت رکھتے..... یہ کتاب تیری موجود ہے جس کی نسبت تو نے فرما دیا تھا: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (الحجر: ۹) (کہ ہم نے ذکر (قرآن) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) اور اسی وعدے پر ہم اس کو برابر غیر محرف سمجھتے رہے اور اس پر ایمان رکھتے آئے۔ اگر یہ آیتیں جو مہاجرین اور انصار کی نسبت ہم نے بیان کیں تیری کتاب میں موجود ہیں تو پھر خدایا ہمارا کیا قصور اور کیا گناہ ہے، جن کو تو نے اچھا کہا ہم نے اچھا جانا، جن کی تو نے تعریفیں کیں ان سے ہم نے محبت رکھی..... ہاں، ان لفظوں کے تو نے اگر اور کچھ معنی رکھے ہوں اور اس عبارت کا مطلب اور کچھ ہو تو ہم نہیں جانتے، تیرے ارشاد کے موافق تیری کتاب کو کھلی اور روشن کتاب سمجھتے تھے اور اس کو معمر اور پہیلیوں کا مجموعہ نہ جانتے تھے..... غرض کہ ہم نہیں جانتے کہ جب ہم یہ جواب دیں گے تو خداوند عادل کس جرم میں ہم کو سزا دے گا اور کس طرح ہم کو اپنی کتاب کا تصدیق کرنے والا نہ سمجھے گا۔ ہم کو تو یقین ہے کہ ضرور ایسے عقیدے سے خدا ہماری نجات کرے گا اور ہم کو اپنے رزق کریم میں سے حصہ عطا کرے گا۔

اے یارو! ہمارا جواب تو سن لیا اب کچھ اپنی جواب دہی کی فکر کرو کہ اگر تمہارا عقیدہ جو صحابہؓ کی نسبت ہے باطل ٹھہرا اور قیامت کے دن خدا نے تم سے مواخذہ کیا تو تم کیا جواب دو گے، ہمارے نزدیک تو سوائے اس کے دوسرا جواب نہیں ہو سکتا کہ خداوند ہم نے تیری کتاب کو اس لیے پس پشت ڈال دیا تھا کہ اس میں اصحابِ رسولؐ نے تحریف کر دی تھی اور اس کو کم و

بیش کر دیا تھا۔ جیسا تو نے نازل کیا ویسا نہ رکھا تھا اور اصلی مصحف امام صاحب کے پاس تھا، وہاں ہمارا گزر بھی نہ ہو سکتا تھا، کچھ نشان اور پتہ بھی امام صاحب کا ملتا نہ تھا..... پس ہم کیوں کر مصحف عثمانی پر عمل کرتے اور کیوں کر محرف قرآن کی تصدیق کرتے، ہم تو کبھی اس کو دیکھتے بھی نہ تھے، حفظ یاد کرنے کا ذکر کیا ہے کبھی اس کو پڑھتے بھی نہ تھے، بلکہ ہمیشہ امام صاحب کے خروج کی دعا کیا کرتے تھے اور ان کے ساتھ جو اصلی قرآن تھا اس کے دیکھنے پر جان دیتے تھے مگر خداوند ہمارا کیا قصور ہے، اس لیے کہ تو نے ایسا ان کو چھپایا کہ کہیں ان کا سایہ بھی دکھلائی نہ دیا، ہزاروں عرضیاں بھیجیں ایک کا بھی امام نے جواب نہ دیا، صد ہا درخواستیں خضر و الیاس کے ذریعے سے براہ دریا ارسال کیں کسی پر کچھ حکم نہ آیا، بڑے بڑے مجتہدوں سے پوچھا انہوں نے یہی فرمایا کہ ابھی انتظار میں رہو اور خروج و ظہور کی دعا کیا کرو، ہنوز وقت نہیں آیا لیکن ہم نے بہت انتظار کیا مگر ہمارے جیتے جی ظہور کس کا خروج کیسا، کچھ خبر تک امام کی نہ آئی: شعر

شام تک تو آمد جاناں کا کھینچا انتظار

وہ نہ آیا وعدہ اپنا یاں برابر ہو گیا

ہند سے امام کی غیبت سری تک ہم نے ہجرت کی لیکن دیکھنا کس کا ملنا کیسا، صورت تو امام کی نظر ہی نہ پڑی، بس بغیر امام کے ہم کیا کرتے اور کیوں کر راہِ حق پر چلتے، ہاں امام کے دیکھنے والوں نے جو کچھ ہم سے کہہ دیا اس پر ہم ایمان لے آئے اور اسی کو حق جانتے رہے اور کبھی اس سے نہیں پھرے۔ پس اگر خدا یہ جواب سن کر فرما دے اے کم بختو! جب کہ میں اپنے کلام کا حافظ تھا اور خود کہہ چکا تھا کہ ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ تو کس کی مجال تھی کہ وہ تحریف کرتا اور کون تھا کہ اس کو بدل دیتا۔ کس نے تم سے کہا کہ میری کتاب میں تحریف ہوئی تھی؟ تب تم شاید یہی جواب دو گے کہ ہم نے زرارہ سے سنا تھا، ہم سے شیطان الطاق نے کہہ دیا تھا..... تب اگر خدا یہ فرما دے کہ اے بد بختو میں سچا تھا یا زرارہ، میرا رسول صادق تھا یا شیطان الطاق، تو معلوم نہیں کیا جواب دو گے۔ ہمارے نزدیک تو تم سوائے اقرار جرم کے اور کچھ جواب نہ دے سکو گے اور اس وقت سوائے اس کے کہ

﴿فَاعْتَرَفُوا بِذَنبِهِمْ فَسُحْقًا لِأَصْحَابِ السَّعِيرِ﴾ یعنی وہ اپنے گناہوں کا اقرار کر لیں گے.....، پس جنہوں کے لیے ہلاکت ہے (اور کچھ حکم نہ ہوگا۔

ساتویں آیت:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمْ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ أَرْضَيْتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ۚ إِلَّا تَنْفِرُوا يُعَذِّبُكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبَدِلُ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْعًا وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۚ إِلَّا تَنْصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيًا إِثْنَيْنِ إِذْ هَمَّا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ (سورة التوبة : ۳۸ تا ۴۰)

جو آیتیں اب تک ہم نے لکھیں ان سے عام مہاجرین اور انصار کی فضیلتیں ثابت ہوئیں اب ہم اس آیت کو لکھ کر خاص حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی فضیلت ثابت کرتے ہیں۔

جاننا چاہیے کہ جب پیغمبر خدا ﷺ نے طائف اور حنین سے مراجعت فرمائی اور تھوڑے دن مدینے میں قیام فرما کر قصد جہادِ روم کا کیا تو بعض لوگوں پر نہایت گراں گزرا، اس لیے کہ گرمی کے دن تھے، سفر دور دراز تھا، خرموں کے پکنے کی فصل تھی اور روم کا خوف بھی غالب تھا، تب اللہ جل شانہ نے واسطے ترغیب جہاد کے ان آیتوں کو نازل کیا اور کئی طرح سے لوگوں کو سمجھایا، چنانچہ اوّل آیت میں فرماتا ہے کہ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمْ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ﴾ اے ﴿مومنو! تمہیں کیا ہو گیا ہے

① یہ خطاب انہیں بعض سے ہے جو کہ جہاد پر جانے سے تسانل کرتے تھے نہ کہ کل مہاجرین و انصار سے اور خطاب کل سے کرنا اور بعض مراد ہونا کلام عرب میں جاری ہے ورنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بنی ہاشم بھی اس خطاب میں شامل ہو جائیں گے۔ ۱۲ منہ

کہ جب تم سے جہاد کے لیے کہا جائے تب تم اپنے گھروں سے نکلنا نہیں چاہتے، کیا تم دنیا کی زندگی کو بمقابلے آخرت کے اچھا سمجھ کر اس پر راضی ہو حالانکہ دنیا کا فائدہ آخرت میں بہت ہی تھوڑا ہے..... اس آیت میں اللہ جل شانہ نے دنیا کی حقارت بیان کر کے جہاد پر ترغیب دی، بعدہ دوسری آیت: ﴿إِلَّا تَنْفَرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلَ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْعًا وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ میں فرمایا کہ اگر تم سستی کرو گے اور جہاد پر مستعد نہ ہو گے تو خدا تم کو دنیا و آخرت میں عذاب دے گا اور تمہارے بدلے اور قوم کو پیدا کرے گا اور تمہارے مدد نہ کرنے سے خدا یا رسولؐ کا کچھ نقصان نہیں ہے، اس لیے کہ خدا کو کچھ پروا نہیں ہے اور رسولؐ کا وہ خود حافظ ہے، چنانچہ اپنی بے نیازی اور اپنے رسولؐ کی بے پروائی کو ان لفظوں سے بیان کیا ﴿إِلَّا تَنْصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ﴾ اگر تم لوگ پیغمبر ﷺ کی مدد نہ کرو گے تو اس کو تمہاری مدد کی حاجت نہیں ہے، اس لیے کہ خدا اس کا مددگار ہے اور اپنی مددگاری کو اللہ جل شانہ اس طرح سے ثابت کرتا ہے کہ ﴿إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيًا إِثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ﴾ کہ جب کفار نے پیغمبر ﷺ کو مکے سے نکالا اس وقت کس نے اس کی مدد کی اور اس وقت کون سا لشکر اور گروہ اس کا مددگار ہوا اور سوائے ایک یار کے دوسرا کون اس کے ساتھ غار میں گیا اور جب کفار در غار پر آ پہنچے اور پیغمبر ﷺ اور ان کے درمیان کچھ فاصلہ نہ رہا اس وقت اس کا یار غار بھی گھبرا گیا اور یہ خیال کر کے کہ ایسا نہ ہو کہ کفار غار میں چھپے ہونے سے آگاہ ہو جائیں اور مبادا پیغمبر ﷺ کو کچھ صدمہ پہنچائیں، وہ غم کرنے لگا۔ اس اضطراب اور اضطراب کے حال میں بھی کہ بڑے بڑے شجاع اور جوانمرد گھبرا جاتے ہیں، میرے پیغمبر ﷺ کو کچھ اضطراب نہ ہوا اور اپنے یار کو ﴿لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ کہہ کر مطمئن کیا اور میں نے اپنے پیغمبر ﷺ کے کہنے سے اس یار پر تسلی نازل کی کہ اس کا خوف جو پیغمبر ﷺ پر صدمہ پہنچنے کے خیال سے تھا جاتا رہا ﴿فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ﴾ اور بعد گزر جانے اس مصیبت کے وقت کے جب بدر کی لڑائی ہوئی تب میں نے ایسے لشکر سے مدد کی کہ جس کو تم دیکھ نہیں سکتے تھے ﴿وَآيِدًا بِجُنُودٍ

لَمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ﴿١﴾ تمام مفسرین کیا شیعہ اور کیا سنی اس پر متفق ہیں کہ ﴿إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ میں جس زمانہ کا ذکر ہے اس سے ہجرت کا وقت مراد ہے اور ﴿إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ﴾ میں جو ”صاحب“ کا لفظ مذکور ہے اس سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مراد ہیں، اور اس کے بھی سب قائل ہیں کہ ہجرت کا وقت بڑا نازک اور نہایت مصیبت، تنہائی اور رنج کا تھا، جو اس وقت صدق دل سے شریک ہوا اس کا رتبہ بھی سب سے بڑا ہے اور اس سے بھی کسی کو انکار نہیں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس وقت سے کہ جب سے پیغمبر ﷺ اپنے گھر سے برآمد ہوئے اور جب تک غار میں رہے اور جب تک مدینے میں پہنچے برابر ہمراہ رہے، لیکن تاہم ہمارے اور شیعوں کے مابین یہ اختلاف ہے کہ ہم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رفاقت کو ان کے اخلاص اور نیک نیتی پر محمول کر کے ان کو افضل مہاجرین جانتے ہیں اور حضرات شیعہ ان کی ہمراہی کو بد نیتی پر (نعوذ باللہ من ذلك) محمول کر کے ان کو منافقین میں سے سمجھتے ہیں، اس لیے ہم اسی آیت سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے فضائل ثابت کرتے ہیں اور حضرات شیعہ کے شبہات بیان کر کے ان کا رد کرتے ہیں۔

صدق اکبر رضی اللہ عنہ کے فضائل کا بیان جو اس آیت سے ثابت ہوتے ہیں:

اس آیت سے بہت سی فضیلتیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ثابت ہوتی ہیں:

۱۔ یہ کہ جب پیغمبر خدا ﷺ کے قتل پر کفار مکہ نے اتفاق کیا اور اللہ جل شانہ، نے ان کے ارادے سے حضرت کو آگاہ فرمایا اور ہجرت کی اجازت دی تب پیغمبر خدا ﷺ نے بحکم الہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنے ہمراہ لیا..... پس اگر خدائے جل شانہ کے نزدیک ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایمان میں سچے اور اسلام میں پکے نہ ہوتے اور پیغمبر ﷺ پر جان و دل سے عاشق نہ ہوتے تو ہرگز وہ ایسے وقت میں ان کو ساتھ لینے کی اجازت نہ دیتا اور خود پیغمبر ﷺ کو اگر ان کی محبت اور عشق پر یقین کامل نہ ہوتا تو کبھی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اس سفر میں اپنے ہمراہ نہ لیتے۔

۲۔ اگر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے جان و مال کو حضرت پر شہار کرنے سے راضی نہ ہوتے تو وہ ایسی مصیبت کے وقت میں خود شریک نہ ہوتے اور اپنے آپ کو معرضِ ہلاکت میں نہ ڈالتے بلکہ حیلہ حوالہ کر کے اپنے آپ کو ایسی مصیبت کے وقت میں شریک ہونے سے بچا لیتے۔

۳۔ گھر سے نکلنے کے وقت سے مدینہ منورہ میں پہنچنے تک جو باتیں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کیں اور جس طرح پر پیغمبر خدا ﷺ کی حفاظت اور جس طور پر رفاقت کا حق ادا کیا ان سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پیغمبر خدا ﷺ کے ساتھ عشق کا مرتبہ تھا اور پیغمبر صاحب ﷺ کے بچانے کے لیے اپنی جان اور آبرو کا کچھ خیال نہ تھا۔

۴۔ جتنے اور اصحاب پیغمبر خدا ﷺ کے تھے ان میں سے کوئی اس رتبہ کا نہ تھا کہ جس کو پیغمبر خدا ﷺ اپنے ہمراہ لیتے اور جس کو اپنا یارِ غار بناتے، سوائے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کہ انہیں کو ایسے وقت میں اپنا رفیق بنایا، اس سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی افضلیت دیگر اصحاب پر ثابت ہوتی ہے۔

۵۔ اللہ جل شانہ کو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی یہ خدمت ایسی پسند آئی کہ ان کی صدیقت اور رفاقت کو اور لوگوں کی تحریص اور ترغیب کے واسطے اس آیت میں بیان کیا تا کہ اس کو سن کر لوگوں کو غیرت آئے اور پیغمبر ﷺ کی رفاقت پر مستعد ہو جائیں..... پس اگر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صدیقیت خدا کے نزدیک مقبول نہ ہوتی اور ان کی خدمت اور رفاقت اعلیٰ درجے کی نہ ہوتی تو ان کی مثال کیوں دی جاتی اور ان کی یاری اور مددگاری اوروں کے دل بڑھانے کے لیے کس لیے بیان کی جاتی۔

۶۔ اللہ جل شانہ نے ثانی اثنین کا لفظ فرما کر ظاہر کیا کہ بعد پیغمبر خدا ﷺ کے دوسرا شخص ادائے مناصب دینی کے واسطے ابوبکر رضی اللہ عنہ ہے۔

۷۔ اللہ جل شانہ نے صاحبہ کا لفظ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نسبت فرما کر ان کی صحابیت کو

ثابت کیا کہ یہ رتبہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا۔ اس لیے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صحابیت کا انکار درحقیقت نص قرآنی کا انکار ہے۔

۸۔ اس آیت میں الفاظ ﴿لَا تَخْزَنَنَّ اللّٰهُ مَعَنَا﴾ سے ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو تسلی دی اور خدا کی حفاظت و نصرت کا حافظ و ناصر تھا اسی طرح اپنے پیغمبر ﷺ کے یارِ غار کا حامی اور مددگار تھا اور جب کہ اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ اللہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا تو اسی سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کا متقی اور محسن ہونا ثابت ہوا، اس لیے کہ دوسری آیت میں اللہ جل شانہ نے فرمایا کہ ﴿إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ﴾ کہ خدا ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو کہ متقی اور نیک ہوتے ہیں۔

۹۔ اللہ جل شانہ نے اپنی تسلی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر نازل کی اور خدا اپنی تسلی نازل نہیں فرماتا ہے مگر انہی لوگوں پر جو کہ ایمان میں پکے اور اسلام میں مضبوط ہوتے ہیں اور جن پر خدا اپنا فضل کرتا ہے اور تسلی نازل کرنے کا ثبوت ﴿فَأَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ﴾ سے معلوم ہوتا ہے۔

۱۰۔ ان آیتوں پر غور کرنے سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بڑی فضیلت ثابت ہوتی ہے، اس لیے کہ یہ آیتیں صرف ان لوگوں کی ترغیب و تہدید کے واسطے نازل ہوئی ہیں جو کہ جہاد پر جانے سے سستی کرتے تھے اور ان آیتوں میں خدا نے ان سستی کرنے والوں کو سمجھایا اور ڈرایا اور اپنی بے نیازی کو ظاہر کیا، چنانچہ پہلے دنیا کی حقارت بیان کر کے ان کو سمجھایا، پھر ان کو عذاب نازل کرنے سے اور ان کے بدلے دوسری قوم کو پیدا کرنے سے ڈرایا، آخر کار اپنی بے نیازی اور اپنے رسول کی بے پروائی کو بیان فرمایا اور پھر اس بے نیازی اور بے پروائی کے بیان میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تمثیل دی اور ان کی رفاقت و محبت کا تذکرہ کیا..... پس اسی سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صدیقیت اور ان کی صاحبیت کے مرتبہ کو قیاس کرنا چاہیے کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے نزدیک ان

کی نصرت و یاری کی کیسی کچھ وقعت تھی کہ منجملہ اور امور ترغیب و تہدید کے ان کی نصرت و رفاقت کو بھی بیان کیا..... غرض کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فضائل جو ان آیتوں سے ثابت ہوتے ہیں، اجمالاً ہم بیان کر چکے، اب ان شبہات کو جو حضراتِ شیعہ کرتے ہیں، بیان کر کے ان کا رد کرتے ہیں۔ اور چونکہ ان کے شبہات ایسے پوچ اور رکیک ہیں کہ ان کی تردید کرنا ایسا ہے جیسا کہ روز روشن میں آفتاب کے طلوع سے انکار کرنے والے کے مقابلے میں دلائل اور براہین بیان کرنا، لیکن بہ مجبوری موافق قول خاتم المحدثین کے:

((چوں بنائے کلام بر اصول گروہے نہادہ است نا چارزمام
اختیار بدست آنہا دادہ ہر جا کہ کشیدہ برند میر و دو بہر
رنگ کہ رنگیں کنندمی شود.))

”چونکہ کلام کی بنیاد ایک گروہ کے اصول پر رکھی گئی ہے، اسی لیے اختیار کی لگام ان کے ہاتھ میں ہے کہ جدھر چاہیں کھینچ کر لے جائیں اور جس رنگ میں چاہیں رنگ دیں۔“

مگر منصف مزاجوں سے امید ہے کہ ان اعتراضوں کو ذرا انصاف سے دیکھیں اور علماء و مجتہدین امامیہ کے تعصب اور عناد پر خیال کریں کہ عداوت نے ان کے دلوں پر کیسا پردہ اور دشمنی نے ان کی عقلوں پر کیسا حجاب ڈال دیا ہے کہ ایسی صریح نص سے انکار کرتے ہیں اور افضل الصحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت کے انکار کے لیے کیسی پوچ تاویلیں کرتے ہیں۔ (دَهَا اَنَا
أَشْرَعُ فِي بَيَانِ هَفْوَاتِهِمْ)



شیعیان عبداللہ بن سبا کے اعتراضات کا بیان

ہم اعتراضوں کو اسی ترتیب سے بیان کرتے ہیں جس ترتیب سے ہم نے فضیلتیں بیان کی ہیں تاکہ دیکھنے والوں کو ہر فضیلت کے مقابلے میں اعتراضات اور شیعوں کے شبہات معلوم ہو جائیں۔

پہلا اعتراض پہلی فضیلت پر:

چونکہ ہم نے پہلی فضیلت میں بیان کیا ہے کہ اللہ جل شانہ کے حکم سے پیغمبر خدا ﷺ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اپنے ہمراہ لیا۔ اس کو امامیہ اس طرح پر رد کرتے ہیں کہ نہ خدا نے پیغمبر خدا ﷺ کو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ لینے کی اجازت دی، نہ پیغمبر ﷺ نے اپنی خوشی سے ان کو اپنے ساتھ لیا بلکہ بلا مرضی اور بغیر اجازت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت ﷺ کے ہمراہ ہو گئے..... چنانچہ اس باب میں جو کچھ علمائے شیعہ نے لکھا ہے، اس کو ہم بیان کرتے ہیں..... بڑے مجتہد صاحب، یعنی شیعوں کے قبلہ و کعبہ ذوالفقار میں لکھتے ہیں:

((احتجاج بایں آیت موقوف است کہ بہ ثبوت رسد کہ ہجرت ابوبکر با جازت حضرت نبویّ واقع شدہ و شیعہ ایں را قبول نکنند.))

(ذوالفقار مطبوعہ لدھیانہ ۱۲۷۱ء صفحہ ۵۷ سطر ۹)

”اس آیت کو دلیل بنانا اس پر موقوف ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ہجرت حضور ﷺ کی اجازت سے ہوئی ہو اور شیعہ اس کو قبول نہیں کرتے۔“

اور قاضی نور اللہ شوستری نے ”مجالس المؤمنین“ میں اور اپنے دیگر رسالوں میں بھی یہی

لکھا ہے، کَمَا ذَكَرَهُ فِي مُنْتَهَى الْكَلَامِ:

((قاضی نور اللہ شوستری در مجالس المومنین و بعضے از رسائل دیگر ذکر می کنند کہ ابوبکر از منافقین بود و بر خلاف امر اقدس نبوی ﷺ در اثناء راه ایستاد و حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بعد زجر شدید اُوراً ہمراہ گرفت تا کفار را دلالت نکند۔“

قاضی نور اللہ شوستری ”مجالس المومنین“ میں اور دوسرے رسائل میں ذکر کرتے ہیں کہ ابوبکرؓ منافقین میں سے تھے اور حکم نبوی ﷺ کے بغیر بیچ راہ میں کھڑے ہوئے گئے تھے۔ حضور ﷺ نے کافی پھٹکار کے بعد ان کو اپنے ساتھ لے لیا تا کہ یہ کفار کو نہ بتادیں۔“

ایک دوسرے رسالہ میں جو منسوب بہ حسینیہ ہے ایک بڑے میر صاحب اس طرح پر لکھتے ہیں:

((چوں پارہٴ راہ برفت دید کہ شخصے برابر آنحضرت می آید حضرت توقف نمودہ چوں نزدیک رسید بشناخت کہ ابوبکر است، فرمود کہ اے ابوبکر کہ نہ من امر خدا بشمار ساندم و گفتم کہ از خانہ خود ہا بیروں می آید تو چرا مخالفت امر الہی کر دی؟ گفت یارسول اللہ کہ دل از بھر تو خائف بود و ہراساں بودم نحواستم کہ در خانہ قرار گیرم، پیغمبر ﷺ متحیر ماند بواسطہ آنکہ امر الہی نبود کہ کسی در ہمراہی خود برد، در ساعت حضرت جبرئیل باز رسید و گفت یارسول اللہ بخدا سوگند کہ اگر این را می گزارى و ہمراہ نہ گیری کفار را .))

”جب کچھ راستہ آپ ﷺ طے کر چکے تو آپ ﷺ نے محسوس کیا کہ کوئی

برابر آپ کے آرہا ہے تو آپ ﷺ ٹھہر گئے، جب وہ قریب پہنچا تو آپ ﷺ پہچان گئے کہ ابوبکر ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے ابوبکر! کیا میں نے تم کو حکم الہی سے آگاہ نہیں کر دیا تھا اور کہا تھا کہ اپنے گھر سے باہر نہ نکلتا، تم نے حکم الہی کی مخالفت کیوں کی؟ ابوبکر نے کہا کہ دل آپ کی طرف سے پریشان تھا، میں نے گھر میں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا۔ پیغمبر ﷺ پریشان ہو گئے، اس لیے کہ امر الہی نہ تھا کہ وہ اپنے ساتھ کسی کو لے جائیں، اسی وقت جبرئیل نے آکر کہا کہ اے رسول اللہ! بخدا، اگر آپ ان کو چھوڑ دیں گے اور ساتھ نہ لے جائیں گے تو یہ پیچھے سے کفار کے ساتھ آکر آپ ﷺ کو قتل کر دیں گے، اس وقت رسول اللہ ﷺ بہ ضرورت آپ کو لے کر غار میں چلے گئے۔“

غرض کہ اس اعتراض سے ثابت ہوا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پیغمبر ﷺ کے گرفتار کرانے کے ارادے سے گھر نکلے اور راہ روک کر کھڑے ہو گئے اور باوجود کہ حضرت ﷺ نے گھر سے نکلنے کو منع کر دیا تھا وہ عدول حکمی کر کے بہ ارادہ ایزدِ سانی پیغمبر ﷺ کے سدراہ ہوئے، آخر کار پیغمبر ﷺ مجبور ہوئے اور بہ صلاح جبرئیل علیہ السلام ان کو اپنے ساتھ لے لیا، اگر ہمراہ نہ لیتے تو ضرور ابوبکر رضی اللہ عنہ کفار کو لے آتے اور پیغمبر ﷺ کو گرفتار کراتے..... اگرچہ اہل انصاف غور کر سکتے ہیں، تو بہ توبہ۔ ایسے بدیہی امر میں غور کی کیا حاجت ہے ویسے ہی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ اعتراض بالکل پوچ اور واہی ہے اور اس کی رکاکت اس کے الفاظ و معانی سے ظاہر ہے، لیکن ہم اس اعتراض کے بطلان پر چند باتیں لکھتے ہیں اور اس دعویٰ کی سفاہت کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بقصد گرفتاری و ایذا پیغمبر ﷺ کے نکلے تھے، ثابت کرتے ہیں۔

۱۔ سوچنا چاہیے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس وقت پیغمبر ﷺ کے دوست تھے یا دشمن!..... اگر دوست تھے تو قصد گرفتاری اور نیت ایذا ہی کے کیا معنی؟ اگر دشمن تھے تو جس طرح پر ابوجہل وغیرہ اور حضرت ﷺ کے دوسرے دشمن حضرت ﷺ کے قتل کی نیت سے آپ ﷺ کے گھر پر گئے تھے اسی طرح پر ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ کیوں نہ گئے،

ان سے علیحدہ کیوں ہوئے؟

۲۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حال ہجرت کا اور وقت دولت سرا سے برآمد ہونے کا اور غار میں تشریف لے جانے کا پیغمبر ﷺ نے بتلایا تھا یا نہیں، اگر نہیں بتلایا تو ٹھیک وقت پر عین اسی راہ پر جس طرف سے حضرت جاتے تھے ابوبکر رضی اللہ عنہ کس طرح راہ روک کر کھڑے ہو گئے؟ اگر پیغمبر ﷺ نے پہلے سے بتلایا تھا تو حضرت کو ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہمراہ لے جانا منظور تھا یا نہیں، اگر منظور نہ تھا تو راز فاش کرنے سے کیا حاصل تھا اور ایسی پوشیدہ بات کو دشمن پر ظاہر کرنے سے سوائے اندیشہ ضرر کے کیا فائدہ تھا اور اگر ساتھ لے جانا منظور تھا تو پھر اعتراض بھی باطل ہوا۔

۳۔ اگر فرض بھی کیا جائے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بہ نیت قتل پیغمبر خدا ﷺ کے راہ روک کر کھڑے ہو گئے اور اپنی بدنیتی میں ایسے مضبوط تھے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ان کی نیت سے خوف کر کے فوراً ہی سدرہ سے اترے اور پیغمبر ﷺ سے کہنے لگے کہ اگر ((این رامی گزاری و ہمراہ نگیری کفار را از عقب تو گرفته بیاید و ترا بقتل رساند)) (یعنی اگر آپ ان کو چھوڑ دیں گے اور اپنے ساتھ نہ لیں گے تو کفار کو پیچھے سے لا کر آپ کو قتل کر دیں گے) لیکن یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ اس وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ تنہا تھے یا اور کوئی کافر بھی ان کے ساتھ تھا اور ہتھیار بند تھے یا خالی ہاتھ، اگر یہ کہا جائے کہ اور کافر بھی موجود تھے تو کوئی شیعہ اس کا قائل نہیں، اور اگر کوئی اور کافر ہمراہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نہ تھا تو تعجب آتا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ باوجود جانے شجاعت اور قوت پیغمبر ﷺ کے تنہا حضرت کی گرفتاری اور قتل کو بغیر ہتھیار کے چل دیے اور دو چار رفیقوں کو بھی اپنے ہمراہ نہ لیا، اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ فقط خبر لینے کے لیے کھڑے ہو گئے تھے، چنانچہ جبرئیل علیہ السلام کے اس ارشاد سے کہ (کفار را از عقب تو گرفته بیاید) ”یعنی کفار کو پیچھے سے لے آئیں گے“ ثابت ہوتا ہے تو یہ امر معلوم نہیں ہوتا کہ کفار اس جگہ سے جہاں حضرت ﷺ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ملے ایسے نزدیک

تھے کہ آواز پہنچ سکتی تھی یا اتنے دور تھے کہ ان کے بلانے کے لیے جانا پڑتا، اگر نزدیک تھے تو تعجب ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان کو آواز دے کر کیوں نہ بلا لیا اور چپ چاپ کیوں کھڑے رہے، اور اگر دور تھے تو معلوم نہیں کہ کیوں پیغمبر خدا ﷺ کو دیکھتے ہی ابو جہل وغیرہ سے خبر کرنے کو نہ دوڑے، کس چیز کے انتظار میں کھڑے رہے اور تعجب تو اس امر پر ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے یہ صلاح تو پیغمبر ﷺ کو دی کہ اس دشمن کو اپنے ساتھ لے لو اور یہ مشورہ نہ دیا کہ ذرا ٹھہرو جب یہ تمہارے دشمن کو خبر کرنے یا بلانے جائے تب چل دینا اور جب تک وہ لوٹے تب تک جائے مقصود پر پہنچ جانا۔ خدا جانے جبرئیل علیہ السلام کو معاذ اللہ کیا ہو گیا تھا کہ ایسے اضطرار کے وقت میں پیغمبر ﷺ کو ایسے دشمن کے ہمراہ لینے کی صلاح تو دی اور جو حکمت اس سے بچنے کی تھی وہ نہ بتلائی۔

۴۔ تعجب ہے کہ جب ابو بکر رضی اللہ عنہ کو پیغمبر ﷺ کا گرفتار کرانا ہی منظور تھا تو وہ پیغمبر صاحب کے ساتھ کیوں چل دیے اور کیوں غار میں جا کر حضرت کے ساتھ چپ چاپ بیٹھے رہے اور کس لیے کوئی تدبیر گرفتار کرانے کی نہ کی..... اہل انصاف غور کریں کہ جس طرح پر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت ﷺ کو راہ میں پایا تھا اور ان کا قصد قتل کا تھا اگر اس طرح پر ابو جہل یا اور کوئی کافر قریشی حضرت ﷺ کو دیکھ لیتا تو وہ کیا کرتا اور حضرت ﷺ اس سے کیا کرتے..... اگر کسی کے ذہن میں یہ بات آئے کہ وہ حضرت کو چھوڑ دیتا یا حضرت اس کو اپنے ہمراہ لے لیتے تو ہم ابو بکر رضی اللہ عنہ کی نسبت بھی شیعوں کے خیال کو درست مان سکتے ہیں۔ ہم نہایت تعجب کرتے ہیں کہ شیعوں کی عقل پر کیسا پردہ پڑ گیا ہے کہ اتنا نہیں سمجھتے کہ ہجرت کا وقت وہ تھا کہ مکے کے تمام کفار پیغمبر ﷺ کے قتل کے درپے تھے اور در دولت پر مجمع کر کے اپنے ارادے کے پورا کرنے کے لیے پہنچ گئے تھے اور کسی کو خبر تک نہ تھی کہ پیغمبر ﷺ اس گھر سے نکل گئے ہیں، بلکہ سب جانتے تھے کہ اپنی جگہ پر آرام کر رہے ہیں..... اس وقت میں جو حضرت کا رفیق ہوا اس کی نسبت دشمنی کا گمان کرتے ہیں۔ اگر وہ رفیق بحکم اور بہ مرضی

پیغمبر ﷺ کی رفاقت کے لیے آمادہ نہ ہوتا تو وہ اس گروہ میں شامل ہوتا جو در دولت پر قتل کے واسطے گیا تھا یا بلا اطلاع بلا خبر راہ روک کر کھڑا ہو جاتا۔

جو کچھ ہم نے اب تک لکھا یہ بہ تسلیم روایات شیعہ کے لکھا اور اس سے بھی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی صدیقیت کو ثابت کیا لیکن اب ہم اپنے دعوے کو عقلی دلائل سے قطع نظر کر کے نقلی دلائل سے ثابت کرتے ہیں اور حضرات امامیہ کی معتبر کتابوں سے ان کے اعتراض کو رد کرتے ہیں اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ساتھ ہونا بوجی الہی و بہ مرضی رسالت پناہی ثابت کرتے ہیں۔

مفسر کا شانی جو علمائے اعلام شیعہ سے ہیں تفسیر ”خُلَاصَةُ الْمَنْهَجِ“ میں تحریر فرماتے

ہیں:

((امیر المومنین رابر جائے خود خوابانید و خود از خانہ ابوبکر بر رفاقت او در ہماں شب بیرون آمدہ باین غار متوجہ شد .))

”یعنی امیر المومنینؑ کو تو اپنی جگہ بستر پر سلا دیا اور ابوبکرؓ کی رفاقت میں ان کے گھر سے نکل کر اسی رات غار کی طرف متوجہ ہوئے۔“

پس حضرات امامیہ اس مفسر کی تفسیر کے لفظوں کو کہ ((خود از خانہ ابوبکر بر رفاقت او در ہماں شب بیرون آمدہ)) ملا شو ستری کے اس مضمون سے کہ ((ابوبکر از منافقین بود و بر خلاف امر مقدس نبوی ﷺ در اثنائے راہ ایستاد و حضرت ﷺ بعد زجر شدید اور اہمراہ گرفت)) (یعنی ابوبکر منافق تھے جو رسول اللہ ﷺ کے حکم کے خلاف درمیان راہ کھڑے ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ نے سخت تہدید کے بعد ان کو ہمراہ لے لیا) ملائیں اور خود ہی تصفیہ کریں کہ ان میں کون سچا ہے اگر ایک روایت پر حضرات امامیہ کی خاطر جمع نہ ہو اور اس کو قبول نہ کریں تو دوسری روایت سنیں اور کسی عالم اور مجتہد کی نہ سنیں بلکہ خاص امام کی، وھو ہذا۔

تفسیر امام حسن عسکری علیہ السلام میں سورۃ بقرہ میں لکھا ہے کہ ﴿ جبرئیل علیہ السلام نے پیغمبر خدا ﷺ سے آکر کہا کہ اللہ جل شانہ، آپ کو سلام کہتا ہے اور یہ فرماتا ہے کہ قریش خصوصاً ابو جہل نے آپ کے قتل کی تدبیر مصمم کی ہے اس لیے آپ کو چاہیے کہ علی رضی اللہ عنہ کو اپنی جگہ پر چھوڑیے کہ وہ مثل اسمعیل کے جاں نثار کرے گا اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اپنا رفیق کیجیے کہ اگر وہ موافقت کرے اور اپنے عہد پر قائم رہے تو جنت میں بلکہ اعلیٰ علیین میں آپ کا رفیق ہوگا۔ تب پیغمبر خدا ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ حال کہا، حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے مارے جانے پر راضی ہوئے، بعدہ حضرت ﷺ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ اے ابو بکرؓ تو راضی ہے کہ اس سفر میں میرے ہمراہ ہو اور کفار قریش جس طرح پر مجھے قتل کے لیے تلاش کریں اسی طرح تیرے قتل کے درپے ہوں اور یہ بھی مشہور ہو کہ تو نے مجھے اس کام پر آمادہ کیا اور میری رفاقت کے سبب سے تجھ پر طرح طرح کے عذاب پہنچیں۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! میں تو وہ شخص ہوں کہ اگر تیری محبت میں سخت ترین بلاؤں میں گرفتار ہوں اور قیامت تک ان میں پڑا ہوں تو بھی میرے نزدیک اس سے بہتر ہے کہ تجھ کو چھوڑ کر دنیا

﴿ اگر ہم اصل عبارت اس تفسیر کی نہ لکھیں تو کبھی کسی کو یقین نہ ہووے کہ امام حسن عسکری علیہ السلام کی تفسیر میں جو موافق روایات شیعہ کے ہے ایسی روایات لکھی ہوگی، اس لیے بحسنہ اس کی عبارت کو انتہی الکلام سے نقل کرتے ہیں: ان اللہ تعالیٰ اوحی الیہ یا محمد ان العلی الا علی یقرء علیک السلام یقول لک ان ابا جہل والملام من قریش قد بروا علیک قتلك الی ان قال وامرک ان تصتحب ابا بکر فانه ان انسک و ساعدک و ارزک و ثبت علی تعاهدک و تعافدک و تعافدک کان فی الجنة من رفقاءک و فی عرفاتھا من خلصائک الی ان قال قال رسول اللہ صلی اللہ ابی بکر ارضیت ان تكون معی یا ابا بکر تطلب کما اطلب و تعرف بانک انت الذی تحلمنی علی ما ادعیہ فتحمل علی انواع العذاب قال ابو بکر یا رسول اللہ اما انا لو عشت عمر الدنيا او عذب جمیعاً اشد عذاب لا ینزل علی موت مریح ولا فرح و کان ذالک فی مجبتک لکان ذالک اشنعم فیھا وانا مالک لجمیع ممالیک ملو کھا فی مخالفتک و هل انا و مالی و ولدی الا فدائک فقال رسول اللہ صلی اللہ لاجرم ان اطلع اللہ علی قلبک و وجد ما فیہ موافقا لما جرى علی لسانک، جعلک بمنزلة السمع والبصر والرأس من الجسد و بمنزلة الروح من البدن کعلی الذی هو منی کذا لک و علی فوق ذلک لزیادة فضائله و شرف خصاله، یا ابا بکر ان من عاهد اللہ ثم لم ینکث ولم یغیر ولم یحسد من فد ابانہ اللہ علی التفصیل وهو معنای الرفیق الاعلیٰ ۱۲۔

کی سلطنت قبول کروں، میری جان، میرا مال، میرے اہل و عیال لڑ کے بالے سب آپ پر قربان ہیں، آپ کو چھوڑ کر کہاں رہوں گا۔ شعر

کف پا بہر زمینے کہ رسد تو نازیں را
بلب خیال بوسم ہمہ عمر آں زمیں را

”یعنی تجھ جیسے محبوب کے قدم جس زمین پر پڑ جائیں تو ساری عمر اس زمین کو ہونٹ سمجھ کر چومتا رہوں۔“

یہ سن کر پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا کہ اگر تیری زبان تیرے دل کے موافق ہے تو بالیقین خدائے تعالیٰ تجھ کو میرے سمع و بصر (کان، آنکھ) کے درجے میں کرے گا اور تجھ کو میرے ساتھ وہ نسبت ہوگی جو کہ سر کو جسم سے اور روح کو بدن سے ہے۔

اس روایت کو دیکھ کر ہم نہیں جانتے کہ پھر کیوں کر شیعوں کی زبان سے یہ بات نکلے گی کہ بلا اجازت پیغمبر خدا کے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ راہ روک کر کھڑے ہو گئے تھے، اس لیے کہ خود امام حسن عسکری علیہ السلام تصدیق کرتے ہیں کہ پیغمبر خدا نے بحکم اور بوجی الہی ابوبکرؓ کو اپنے ساتھ لیا تھا اور جو کچھ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پیغمبر خدا ﷺ سے کہا اور جو کچھ حضرت نے ان کی نسبت فرمایا اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پیغمبر خدا ﷺ سے کیسی محبت تھی اور پیغمبر خدا کو بھی ان پر کیسی شفقت تھی کہ ان کو اپنی سمع و بصر (کان، آنکھ) جان اور دل سے تشبیہ دیتے تھے..... جاننا چاہیے کہ اس حدیث کو جب تفسیر امام حسن عسکری سے نکال کر مولوی حیدر علی صاحب^۱ نے جواب میں سبحان علی خان صاحب کے لکھا تھا تو

^۱ مولوی حافظ حیدر علی فیض آبادی بن محمد حسن فیض آباد (یوپی) میں پیدا ہوئے اور وہیں کے بعض علماء شیعہ، مثلاً مولوی نجف علی، مزارفخ علی، اور حکیم میرنواب سے تحصیل علم کی، بعدہ دہلی تشریف لے گئے اور وہاں شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی، شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی، اور مولانا رشید الدین خان صاحب دہلوی سے فیض حاصل کیا۔ علم مناظرہ اور علم کلام میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز مقام رکھتے تھے، کتب شیعہ پر گہری نظر تھی۔ آپ کے زمانے میں علامہ حکیم سبحان علی خان (م ۱۲۶۸ء) شیعہ رکن سلطنت نے ایک نہایت سخت تبرائی کتاب فارسی میں لکھی تھی جس کے جواب میں مولانا نے ایک نہایت مدلل اور معرکہ آراء کتاب ”منتہی الکلام“ کے نام سے

خان صاحب کے ہوش و حواس جاتے رہے اور مضطر ہو گئے۔ اور حقیقت میں ہوش و حواس جانے کا مقام تھا، اس لیے کہ جب امام کے قول سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بوجی الہی حضرت کے ساتھ ہجرت کرنا اور پیغمبر خدا ﷺ کا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سمع و بصر سے تشبیہ دینا ثابت ہوا تو پھر بطلان عقائد امامیہ میں کون سا شبہ باقی رہا اور منشی سبحان علی خان صاحب نے اس روایت کو دیکھ کر جو خط مولوی نور الدین صاحب شہید ثالث کے نور العین کے نام لکھا ہے اور ”رسالة المکاتیب“ نے ”روایۃ الثعالیب والغرائب“ مطبوعہ ۱۲۶۸ء کے صفحہ ۱۸۹، سطر ۱۹ میں بلفظ نقل کیا ہے، ملاحظہ کے قابل ہے، ہم بھی شائقین کے دیکھنے کے لیے اس عبارت کو بلفظ نقل کرتے ہیں، وھو ھذہ۔

((لکن اشکال ہمیں ست کہ ناصب احادیث طریقہ امامیہ را التقاط کردہ بالفعل پنج جزو بغلط از کتاب ابرام بصارت العین باچہ نام دارد فرستادہ در ان حدیثی مبسوط از تفسیر منسوب بہ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام بقصہ ہجرت در مدح ابوبکر نقل کردہ، پس اگر تالیف و تالیف بندہ بدست کسی از متمذہبین بمذہبے غیر اسلام افتد واحسرتا و واسفاه، یعنی معاذ اللہ حکم یتعارض و تسا قطاقند، مدبر عالم جلت قدرتہ، زمان ظهور صاحب

⇐⇐⇐ سے لکھی جس نے مخالفین علماء کے جسم میں لرزہ ڈال دیا اور ہندوستان سے ایران تک تمام مجتہدین اس کتاب کے جواب سے عاجز رہے۔ آخر میں مولوی حامد حسین لکھنوی مجتہد شیعہ (م ۱۲۰۶ء) نے بزعم خود مُنتھی الکلام کے جواب میں ایک ضخیم کتاب لکھ ڈالی جس کا نام ”استقصاء الافہام“ رکھا مگر حقیقت یہ ہے کہ مُنتھی الکلام کے درمیانی چونتیس صفحات ہی کا یہ جواب ہے بقیہ شروع کے پانچ سو صفحات اور آخر کے کسی سو صفحات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مولانا حیدر علی فیض آبادی نے رد شیعہ میں اور بھی کئی معرکے آلا راء کتابیں لکھیں جن میں ازالۃ الغین عن بصارة العین (سہ جلد) نکاح ام کلثوم..... عن اخراج اهل بیت الفاطمة وغیرہ زیادہ مشہور ہوئیں ۱۸۸۱ء میں آپ کی حیدرآباد میں وفات ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے۔ (شیخ محمد فراست)

الامر والزمان زود برساند تا این اختلاف از میاں برخیزد.))
 ”لیکن ایک مشکل یہ ہے کہ ایک ناصبی نے طریق امامیہ سے حدیث حاصل کر کے پانچ جز کی ایک کتاب موسوم ”ابرام بصارت العین“ مرتب کر کے ہمیں روانہ کی ہے اور اس میں ایک لمبی حدیث امام حسن عسکری علیہ السلام کی تفسیر سے منسوب کر کے نقل کی ہے جو ہجرت کے واقعہ میں ابو بکرؓ کی مدح و تعریف کی بابت ہے۔ پس اگر ان کی کتاب اور بندہ کی تالیف کسی غیر مسلم کے ہاتھ لگ جائے تو ہائے حسرت اور ہائے افسوس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس پر تعارضاً تساقطاً کا حکم لگا دے گا (دو باتوں میں جب تعارض ہو جائے تو دونوں ساقط الاعتبار ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ امام کو جلد ظاہر کر دے تاکہ یہ باہمی اختلاف دور ہو سکے)۔“

غرض کہ منشی صاحب ہزار و احسرتاہ اور واویلاہ مچائیں اور ہر چند امام صاحب الامر کے ظہور کی دعا کریں مگر امام حسن عسکری علیہ السلام کی تکذیب نہیں کر سکتے اور جو فضائل ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے امام کے قول سے ثابت ہوئے ان کو باطل نہیں کر سکتے۔

اے بھائیو! ذرا سوچو کہ جب امام صاحبؑ یہ فرمائیں کہ بوجی الہی ابو بکر رضی اللہ عنہ کو پیغمبر خدا ﷺ نے اپنے ہمراہ لیا اور پھر ملا نور اللہ شوستری وغیرہ معاندین یہ کہیں کہ ابو بکرؓ راہ روک کر کھڑے ہو گئے تھے تو اب ہم امام کے قول کی تصدیق کریں یا ملا نور اللہ شوستری کی بات سنیں..... حقیقت تو یہ ہے ملا شوستری نے ظاہر میں دعویٰ تو محبت ائمہ کا کیا لیکن باطن میں ان کو جھوٹا بنایا اور تشیع کے پردے میں ایمان اور اسلام کو داغ لگایا۔ شعر

دامن فشاں گزشت و او را بہانہ ساخت

خاکم بباد داد و صبا را بہانہ ساخت

”دامن جھاڑ کر نکل گئے اور اس کو بہانہ بنا دیا، خاک خود اڑائی اور صبا (ہوا) پر

الزام رکھ دیا۔“

اس تفسیر کی روایت سے اگر سیری نہ ہو اور فارسی اردو پڑھنے والے کو اس تفسیر کا ملنا دشوار ہو تو ایسی کتاب کی روایت سنیں جو ہر جگہ مل سکتی ہے اور جس کا مؤلف بڑا عالی مشہور شیعہ ہے اسی کو دیکھ کر ذرا غیرت پکڑیں اور تعجب کریں کہ پیغمبر ﷺ کے یارِ غار کی صدیقیت باوجود ایسے تعصب و عناد کے انہیں کے مجتہدین و علماء کے اقرار سے ثابت ہوتی ہے اور ان کے بغض کی بیماری کی دوا انہیں کے نسخوں سے نکل آتی ہے اس پر بھی اگر دوا نہ کریں اور خود ہلاک ہونا چاہیں تو اختیار ہے..... اب اس روایت کو سننا چاہیے جو حملہ حیدریہ میں مذکور ہے۔ نظم

چنیں ۱ گفت راوی کہ سالار دین
 چو سالم بحفظ جہاں آفرین
 ز نزدیک آن قوم پُر مکر رفت
 بسوئے سرائے ابوبکر رفت
 پے ہجرت او نیز آمادہ بود
 کہ سابق رسولش خبر دادہ بود
 نبی بردرخانہ اش چون رسید
 بگوشش ندائے سفردر کشید
 چوں بوبکرزاں حال آگاہ شد
 زخانہ بروں رفت و ہمراہ شد
 گرفتند پس راہ یثرب بہ پیش
 نبیؐ کند نعلین از پائے خویش
 بسر پنجه آن راہ رفتن گرفت
 پئے خودز دشمن نہفتن گرفت

برفتند چندی ز دامانِ دشت
 قدوم فلكِ سايِ مجروحِ گشت
 ابوبکرؓ آنگه بدوشش گرفت
 ولے زین حدیث ست جائے شگفت
 کہ در کس چنان قوت آید پدید
 کہ بارِ نبوت تو اندکشید
 برفتند القصہ چندے دگر
 چون گردید پیدا نشانِ سحر
 بجستند جائیکہ باشد پناہ
 ز چشم کسان دور یکسوز راه
 بدیدند غارے دران تیرہ شب
 کہ خواندی عرب غارِ ثور ش لقب
 گرفتند در جوفِ آن غار جائے
 ولے پیش بنهاد بوبکر پائے
 بھر جا کہ سوراخ یارِ خنہ دید
 قبارا بدیدو آن رابچید
 بدیں گونه تا شد تمام آن قبا
 یکے رخنہ نگرفته ماند از قضا
 بران رخنہ گویند آن یارِ غار
 کف پائے خود را نمود استوار
 نیا مد جز او ایس شگرف از کسے
 کہ دور از خردمی نماید بسے

بغار اندرون در شب تیرہ فام
چنان دید سوراخہارا تمام
دراں تیرہ شب یک بیک چون شمرد
یکے کامدافزون بروپا فشرد
نیامدچنیں کارے از غیر او
بدینساں چون پر داخت از رفت ورو
در آمد رسول خدا ہم بغار
نشستند یکجا بہم ہر دو یار

”راوی اس طرح کہتا ہے کہ سرورِ دین ﷺ خدا کی حفاظت میں جب صبح و سالم اس مکار اور فریبی قوم کے پاس سے ہو کر ابو بکر رضی اللہ عنہ کے گھر کی طرف گئے تو ہجرت کے لیے وہ بھی تیار ہی تھے، کیونکہ رسول ﷺ نے ان کو پہلے ہی اطلاع کر دی تھی۔ نبی ﷺ جب ان کے گھر پہنچے تو ان کو سفر کے لیے چپکے سے بتایا ابو بکر رضی اللہ عنہ کو جب اس (حالت) سفر کا علم ہوا، گھر سے نکل کر آپ ﷺ کے ہمراہ ہو گئے اور مدینے کی طرف روانہ ہو گئے۔ نبی ﷺ نے اپنے نعلین از پائے مبارک بھی اتار دیے دشمن سے چھپنے کی خاطر پنچوں کے بل چلنا شروع کیا۔ صحرا میں اس طرح (نگلے پیر) چلنے سے آپ ﷺ کے قدم مبارک زخمی ہو گئے تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس وقت آپ کو اپنے کاندھے پر اٹھالیا لیکن یہ بات محل اعتراض ہے کہ کسی شخص میں ایسی قوت کیسے آگئی کہ وہ نبوت کا بوجھ اٹھا سکے۔ بہر حال تھوڑی دیر اور چلے جب صبح کے آثار ظاہر ہونے لگے تو ایک ایسی جگہ تلاش کی جو لوگوں کی نظروں سے دور اور راستے سے ہٹ کر جائے پناہ بن سکے۔ اس اندھیری رات میں ایک غار دکھائی دیا جس کو عرب غارِ ثور کہتے ہیں۔ اس غار کو اپنی پناہ گاہ بنا لیا لیکن ابو بکر رضی اللہ عنہ نے پہلے اس میں قدم رکھے جہاں

کوئی سوراخ دکھائی پڑا اپنی چادر کو پھاڑ کر اس کو بند کر دیا۔ اس طرح وہ پوری چادر ختم ہو گئی، البتہ ایک سوراخ باقی رہ گیا۔ کہتے ہیں کہ اس سوراخ پر یارِ غار نے اپنا پیر رکھ لیا لیکن یہ ایک عجوبہ ہے جو عقل و خرد سے بہت دور معلوم ہوتا ہے کہ غار کے اندر اندھیری رات میں سارے سوراخ کیسے دیکھ لیے اس تاریک رات میں ایک ایک (سوراخ) جب گن لیے ایک رہ گیا جس پر اپنا پیر لگا دیا یہ کام ان کے سوا کسی اور سے نہیں ہو سکتا۔ رسول خدا ﷺ بھی غار میں آگئے اور دونوں ساتھی اس میں اقامت پذیر ہوئے۔“

اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ خود حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر گئے اور ان کو ہمراہ لیا اور جو کچھ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خدمت میں کیں، یعنی پیغمبر خدا ﷺ کو دوش پر چڑھانا اور غار میں اوّل جانا اور اس کو صاف کرنا اور قبا کو چاک کر کے سوراخوں کو بند کرنا اور باقی ماندہ سوراخ کو اپنے کف پا سے مسدود کرنا وہ عشق و محبت پر دلالت کرتی ہیں نہ کہ نفاق و عداوت پر..... اگر یہ خدمتیں جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے شبِ ہجرت میں کیں نفاق کی نشانیاں ہیں تو معلوم نہیں کہ محبت اور عشق کی علامتیں کیا ہیں۔

یہ بات بھی لکھنے کے لائق ہے کہ بعض شیعوں نے جو یہ دعویٰ کیا ہے پیغمبر خدا ﷺ نے سب صحابہ رضی اللہ عنہم کو منع کیا تھا کہ اپنے گھروں سے نہ نکلنا اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نے پیغمبر خدا ﷺ کے حکم کے خلاف کیا، وہ بالکل غلط ہے، اس لیے کہ خود ان کے مورخین اقرار کرتے ہیں کہ پیغمبر خدا ﷺ نے سب صحابہ رضی اللہ عنہم کو پہلے سے روانہ کر دیا تھا اور صرف دو شخصوں کو روک لیا، یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کہ ان کو اپنی جگہ پر سلایا اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کہ ان کو اپنے ساتھ لیا..... پس کون سا صحابہ میں سے باقی رہ گیا تھا جس کو پیغمبر خدا ﷺ نے شبِ ہجرت میں باہر نکلنے سے منع کر دیا تھا اور جن کی نسبت یہ ارشاد کیا ہو:

((نه من امر خدا به شما رساندم که از خانه خودھا بیروں

میائید تو چیرا مخالفت امر الھی کر دی.))

”یعنی میں نے تم کو حکم الہی پہنچا دیا تھا کہ اپنے گھر سے باہر نہ نکلنا۔ تو نے حکم الہی کی مخالفت کیوں کی؟“

اور یہ امر کہ سب اصحاب پہلے سے ہجرت کر گئے تھے اور صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ابو بکر صدیقؓ رہ گئے تھے باقرار مورخین شیعہ ثابت ہے۔ چنانچہ ”حملہ حیدریہ“ میں لکھا ہے:

حیب خداچوں بدبداں ستم
چنیس داد فرمان ز لطف و کرم
کہ اصحاب ہجرت بہ یثرب کنند
نہاں یکیک از چشم اعدا روند
نہا دندیاراں بفرمان قدم
برفتند پنہاں بدنبال ہم بدنبال ہم
بدینگونہ رفتندیاراں تمام
علیؓ ماندو ابوبکرؓ وخیر الانام

”اللہ کے حبیب نے جب یہ ظلم و ستم دیکھا تو ازراہ لطف و کرم یہ حکم دے دیا کہ سارے صحابہؓ دشمنوں کی نظروں سے چھپ کر مدینہ ہجرت کر جائیں۔ یارانِ نبی ﷺ حکم کے مطابق چھپ چھپا کر چلے گئے اس طرح اصحاب رسول سب چلے گئے علیؓ، ابو بکر رضی اللہ عنہما اور حضور ﷺ رہ گئے۔“

ثابت ہوا کہ پیغمبر خدا ﷺ نے باجاست و بحکم الہی ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ہمراہ لیا اور ابو بکر رضی اللہ عنہ

نے حق رفاقت اچھی طرح پر ادا کیا۔

دوسرا اعتراض دوسری فضیلت پر:

دوسری فضیلت میں ہم نے بیان کیا ہے کہ اگر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پیغمبر خدا ﷺ کے عاشق نہ ہوتے اور اپنی جان و مال کو حضرتؐ پر نثار کرنے کو راضی نہ ہوتے تو ایسی مصیبت کے سفر میں کبھی شریک نہ ہوتے۔

اس پر علمائے شیعہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی نیت سفر میں اچھی نہ تھی۔ چنانچہ مجتہد صاحب ذوالفقار میں لکھتے ہیں:

((ہم چنیں باتفاق فریقین شرط ترتب ثواب برہجرت صحت نیت ست الیٰ قولہ پس مادا میکہ مارا علم بہ صحت نیت ابو بکرؓ بہ ثبوت نہ رسد دخول اور ادر مدلول این آیة متیقن نمی شود و تامتیقن نہ شود احتجاج باین آیة بر علو مرتبت اونمی تواند شد .))

”یعنی بالاتفاق فریقین ہجرت پر ثواب مرتب ہونے کی شرط نیت صحیح ہونا ہے پس جب تک ہم کو ابو بکر رضی اللہ عنہ کی نیت کی صحت کا حال نہ معلوم ہو جائے ان کا اس آیت کی فضیلت میں داخل ہونا یقینی نہیں اور جب یہ یقین نہیں تو اس آیت سے ان کی فضیلت پر دلیل نہیں دی جاسکتی۔“ اور قاضی صاحب ”إِحْقَاقُ الْحَقِّ“ میں فرماتے ہیں:

((وَقَدْ ظَهَرَ مِنْ جَزَعِهِ وَبُكَائِهِ مَا يَكُونُ مِنْ مِثْلِهِ فَسَادُ الْحَالِ فِي الْإِخْتِفَا إِلَى قَوْلِهِ فَأَفْضَلِيَّتُهُ فِي الْغَارِ يُفْتَخَرُ بِهَا لَا بِي بَكْرٍ لَوْلَا الْمُكَابَرَةُ وَاللَّدَادُ .))

”یعنی ابو بکر رضی اللہ عنہ کی جزع و بکاء سے ثابت ہوا کہ ان کا (اندرونی) حال اچھا نہ تھا اور نیت ان کی درست نہ تھی۔“

اس اعتراض کا جواب خود امام حسن عسکری علیہ السلام کی تفسیر سے اوپر مذکور ہو چکا کہ جب پیغمبر خدا ﷺ نے پوچھا:

((أَرْضِيَتْ أَنْ تَكُونَ مَعِيَ يَا أَبَا بَكْرٍ تُطَلَّبُ كَمَا أُطَلَّبُ إِلَى قَوْلِهِ قَالَ أَبُو بَكْرٍ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَمَا أَنَا لَوْ عِشْتُ عُمَرَ الدُّنْيَا أَعَذَّبُ جَمِيعًا أَشَدَّ الْعَذَابِ الخ .))

”اے ابوبکر! تم میرے ساتھ اس شرط پر چلنے کو راضی ہو کہ جیسے مجھے تلاش کیا جائے اسی طرح تم کو بھی ڈھونڈا جائے، تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ کی رفاقت میں اگر مجھے قیامت تک سخت سے سخت عذاب ہو تو بھی منظور ہے۔“

پس اس جواب سے کیا ثابت ہوتا ہے ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نیک نیت ہونا یا بدنیت ہونا؟ اور چونکہ نیت کا حال افعال اور اعمال سے ظاہر ہوتا ہے اور حرکات و جوارح سے دل کی کیفیت معلوم ہوتی ہے، پس جو کام ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے شب ہجرت کو کیے وہ ان کی نیک نیتی پر شاہد ہیں یا ان کی بدنیتی پر۔

تیسرا اعتراض تیسری فضیلت پر:

تیسری فضیلت میں ہم نے بیان کیا ہے کہ گھر سے نکلنے کے وقت سے مدینے میں پہنچنے تک جو باتیں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کیں وہ ان کے رسول خدا ﷺ کے ساتھ عشق و محبت پر دلالت کرتی ہیں..... حضراتِ شیعہ اس پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حرکتیں ان کے نفاق اور عداوت پر دلالت کرتی ہیں، اس لیے ہم ان کی ان خدمتوں کو جو شب ہجرت میں انہوں نے کیں بیان کرتے ہیں تا کہ معلوم ہو جائے کہ جو کام ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کیے وہ سوائے عاشق صادق کے کسی دوسرے سے ہو نہیں سکتے۔“

اول:..... جب پیغمبر خدا ﷺ کے ساتھ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ چلے تب راہ میں ادھر ادھر نظر کرتے جاتے تھے، حضرت نے پوچھا اے ابوبکر! کیا تیرا حال ہے؟ تب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! میرا مطلب صرف آپ کی حفاظت ہے..... چنانچہ صاحب مَتَّهِی الْكَلَامِ رِيَاضُ النَّظَرَةِ سے اس کا خلاصہ ان لفظوں میں لکھتے ہیں:

((چوں صدیق ہمراہ آنحضرتؐ بارشاد شریف متوجہ غار

شد گاھے پیش می رفت و گاھے در عقب و زمانے بہ جانب

راست توجہ می کرد و ساعتے بہ طرف چپ قطع راہ می

نمود، حضرت پُر سید کہ اے ابوبکرؓ گاھے تراچنین ندیدہ

بودم چہ افتاد کہ در رفتن راہ اختلاف می کنی ، عرض کرد کہ مقصود من نگاہبانی حضرت از شر دشمنان است مبادا کہ ازین جہات درر سند و حضرت را از راہ تا غار بردوش برد .))

”جب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے حکم سے غار (ثور) کی طرف چلے تو کبھی آگے چلتے اور کبھی پیچھے، کسی وقت داہنی جانب چلتے تو کبھی بائیں جانب مڑ جاتے، حضرت ﷺ نے پوچھا کہ اے ابو بکر! تم کو ایسا کرتے کبھی نہ دیکھا تھا، کیا ہوا کہ راستہ چلنے میں ادھر ادھر کر رہے ہو، تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میرا مقصد حضرت کی حفاظت ہے کہ کہیں دشمن ان جہتوں سے آ کر حضرت کو تکلیف پہنچائیں۔ (چنانچہ) حضرت کو غار تک اپنے کندھے پر لے گئے۔“

دوسری: جب پیغمبر خدا ﷺ کے پائے مبارک کے تھکنے پر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اطلاع ہوئی تو بغیر اس کے کہ حضرت ﷺ نے کچھ کہا ہوا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت کو اپنے دوش پر چڑھایا اور غار تک پہنچایا۔ پس زہے نصیب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے جن کے دوش پر شاہِ نبوت نے قدم رکھا، چنانچہ اس امر کو ہم اوپر ”حملہ حیدریہ“ سے ثابت کر آئے ہیں۔

تیسری: جب غار کے کنارے پر پہنچے تب پہلے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ غار میں گئے اور اسے صاف کیا اور سوراخوں کو بند کیا تب پیغمبر خدا ﷺ کو بلایا اور اپنے زانو پر سلایا۔ اس کو بھی ہم اوپر ثابت کر آئے ہیں اور قاضی نور اللہ شوستری ❶ بھی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پہلے غار میں جانے کو تصدیق کرتے ہیں۔

چوتھی: ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس پاؤں میں جو بند کرنے کے لیے سوراخ پر رکھا تھا سانپ نے کاٹا اور حضرت ﷺ نے ان کو تسلی دی۔

پانچویں: جب تک غار میں رہے تب تک ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر سے ان کا لڑکا

❶ کما قال ان قوله تعالى ثانی اثین بیان حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باعتبار دخوله فی الغار

ثانیاً و دخول ابی بکر اولاً کما نقل فی السیر ۱۲۔ احقاق الحق ۔

کھانا پہنچاتا رہا اور پیغمبر ﷺ کو کھلاتا رہا۔

چھٹی:..... دو اونٹنیاں پیغمبر خدا ﷺ نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بیٹے سے منگائیں اور اس نے حاضر کر دیں، ایک پر آپ ﷺ سوار ہوئے اور اپنے ساتھ ابو بکر رضی اللہ عنہ کو سوار کیا اور دوسرے پر عامر جو کہ شبان بیت الحرام تھا اور شتر بان، سوار ہوا، چنانچہ سب باتوں کو جس طرح پر صاحب ”حملہ حیدریہ“ نے بیان کیا ہے، اس کو ہم لکھتے ہیں۔
امر چہارم کے ثبوت میں:

چوں ❶ شد کار پردا ختہ آن چنان
 رسیدند کفار باپے براں
 در اندم کف پائے آن یار غار
 کہ بر روی سوراخ بود استوار
 رسیدش ز دندان مارے گزند
 وزاں درد افغان و شد بلند
 پیمبر با و گفت آہستہ باش
 رسیدند اعدا مکن راز فاش
 مخور غم مگرداں صدارا بلند
 کہ از زخم افعی نیابے گزند

”جب سب کام اس طرح ہو چکا تو کفار نقوشِ قدم تلاش کرتے ہوئے پہنچے اس وقت یار غار (صدیق اکبر رضی اللہ عنہ) کا جو پیر سوراخ پر تھا ایک سانپ نے اس میں ڈس لیا، اس کی درد سے آپ کی آواز بلند ہو گئی، پیغمبر ﷺ نے ان سے کہا کہ چپ رہو دشمن پہنچ چکے ہیں راز فاش نہ کرو غم نہ کرو اور آواز بلند نہ کرو کہ سانپ کے زخم سے تم کو تکلیف نہیں ہوگی۔“

امرِ پنجم کے ثبوت میں:

بغار ❶ اندروں تاسہ روز و سہ شب
 بسر برد آں شہ بفر فان رب
 شدی پور بوبکر ہنگامِ شام
 بہ بردی دراں دراں غار آب و طعام
 نمودی ہم از حال اصحاب شر
 حبیب خدای جہان را خبر
 ”اس غار میں تین دن اور تین رات آپ ﷺ بحکم الہی اقامت گزیر رہے،
 ابوبکرؓ کے بیٹے شام کے وقت اس غار میں کھانا پانی پہنچا دیتے، نیز شہر پسندوں
 (کافروں) کا حال حبیب خدا ﷺ کو بتلا دیا کرتے۔“

امرِ ششم کے ثبوت میں ❷:

نبی ❸ گفت پس پور بوبکر را
 کہ ❹ اے چوں پدر اهل صدق و صفا
 دو جمازہ باید کنوں راہ وار
 کہ مارا رساند بہ یثرب دیار
 برفت از برش پور بوبکر زود
 بدنبال کاری کہ فرمودہ بود

❶ حملہ حیدری صفحہ ۲۰ سطر ۲۰-۱۲ منہ۔

❷ چوٹی، پانچویں اور چھٹی فضیلت کے اعتراضوں کو ہم اور فضیلتوں کے اعتراضات کے ضمن میں بیان کریں گے۔

۱۲- منہ

❸ ایضاً صفحہ ۲۸ سطر ۲۳۔

❹ حضرات شیعہ کو اس مصرعہ پر غور کرنا چاہیے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صداقت اور صفائی کو کس

صفائی سے بیان فرمایا ہے۔ ۱۲- منہ

ہم از اهل دین بدیکی جملہ دار
 برو کرد رازے نبی آشکار
 بگفتش فلان روز وقت سحر
 دو جمازہ بہر پیمبر ببر
 ازو جملہ دار این سخن چون شنود
 دو جمازہ دردم مہیا نمود
 تھی شد از ان قوم آن کوه دشت
 رسولِ خدا عازمِ راہ گشت
 بصبح چہارم برآمد ز غار
 دو جمازہ آور دہ بُد جملہ دار
 نشست از بربک شتر شاہ دین
 ابوبکر را کرد با خود قرین
 برآمد بر آن دیگرے جملہ دار
 بہمراہ او گشت عامر سوار

”نبی ﷺ نے فرزند ابوبکرؓ سے کہا کہ اے باپ کی طرح سچے اور وفا شعار! اب دو اونٹوں کی سواری کے لیے ضرورت ہے، جو ہم کو مدینے تک پہنچا دیں۔ ابوبکرؓ کے فرزند اپنے کام کو پورا کرنے کی خاطر جلدی سے گئے، ایمان والوں میں ایک شتر بان تھے، ان سے نبی ﷺ کا راز بتایا اور ان سے کہا کہ فلاں صبح کے وقت حضور ﷺ کے لیے دو اونٹ لے جاؤ۔ شتر بان نے جب ان کی یہ بات سنی تو فوراً دو اونٹ تیار کر دیے۔ جب وہ علاقہ (صحرا) اس قوم سے خالی ہو گیا (راستہ صاف ہو گیا) تو رسول خدا ﷺ عازمِ راہ ہوئے، چوتھے دن صبح غار سے نکلے شتر بان دو اونٹ لا چکا تھا، ایک اونٹ پر شاہ دین (حضور ﷺ)

بیٹھے ابو بکر رضی اللہ عنہ، کو اپنے ساتھ ہی بٹھایا، دوسرے اونٹ پر شتر بان عامر سوار ہو کر ان کے ساتھ چل پڑے۔“

ساتواں اعتراض ساتویں فضیلت پر:

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ لصاحبہ کے لفظ سے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبیت ثابت ہوتی ہے اور یہ رتبہ کسی کو ان کے سوا نصیب نہیں ہوا کہ خدا نے کسی کی صحابیت کو تخصیص کر کے بیان فرمایا ہو..... اس پر علماء شیعہ چند طرح سے اعتراض کرتے ہیں:

۱۔ اس طرح پر کہ لفظ صاحب سے مراد ہمراہ کی ہے، اس سے کوئی فضیلت ثابت نہیں ہوتی ہے بلکہ اللہ جل شانہ نے اپنے کلام میں کافر کو مومن کا صاحب بیان کیا ہے، چنانچہ فرماتا ہے ﴿فَقَالَ لِرَبِّهِ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ﴾ اور دوسری جگہ فرماتا ہے حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے رفیقوں سے جو قید میں تھے اور کافر تھے فرمایا ﴿يَا صَاحِبِي السِّجْنِ﴾ پس اس صاحب کے لفظ سے فضیلت بہ یک طرف اسلام کا بھی ثبوت نہیں ہو سکتا اور صحابیت اصطلاحی کے لیے ایمان کا ہونا ضروری ہے اور وہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حاصل ہی نہ تھا۔ پس وہ فضیلت جو اس لفظ سے ظاہر ہوتی ہے ان کی نسبت ثابت نہیں ہو سکتی..... چنانچہ آیت اوّل کا جواب یہ ہے کہ بے شک آیت ﴿فَقَالَ لِرَبِّهِ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ﴾ میں اللہ جل شانہ نے کافر کو مومن کا صاحب فرمایا ہے مگر اسی وقت اس کی اہانت بھی بیان کر دی اور اس کا کفر ظاہر کر دیا اور کہہ دیا کہ ﴿أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ﴾ اور یہاں اور یہاں جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو صاحب بیان کیا تو اس کے ساتھ وہ کلمہ ہے جو محبت اور تسلی پر دلالت کرتا ہے کہ پیغمبر ﷺ کی طرف سے فرمایا ﴿لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ کہ غمگین نہ ہو خدا ہمارے ساتھ ہے۔ پس دونوں میں کیا مناسبت ہے..... اور دوسری آیت کا یہ جواب ہے کہ ﴿صَاحِبِي السِّجْنِ﴾ میں صاحب کا لفظ مضاف سجن کی طرف ہے نہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف اور اس آیت میں صاحب کا لفظ نبی ﷺ کی طرف مضاف ہے..... رہا

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ایمان لانا وہ بہ روایاتِ معتبرہ امامیہ کے ثابت ہے۔ چنانچہ مجالس المؤمنین ۱۰ میں قاضی نور اللہ شوستری نے لکھا ہے:

((خالد بن سعیدؓ از سابقین اولین بودہ اسلام او مقدم بر اسلام ابوبکرؓ، بلکہ ابوبکرؓ بہ برکت خوابے کہ او دیدہ بود مسلمان شدہ بود، بالجملہ سبب اسلام خالد آن بود کہ در خواب دیدہ بود کہ بر کنار آتشی افروختہ ایستادہ است و پدر اومی خواہد کہ اورا در آتش اندازد کہ ناگاہ رسالت پناہ گریبان او گرفتہ بجانب خود کشید و باو گفت کہ بجانب من بیاتا باتش نیفتی، خالدؓ ازین خواب خوفناک بیدار شد و قسم یاد کرد کہ ایس خواب میں صحیح ست و آنگاہ متوجہ خدمت حضرت رسالتؐ گردید، در راہ ابوبکرؓ باو ملاقات نمود و از حال او پُر سید، خالدؓ صورت واقعہ رابا و بیان نمود، ابوبکرؓ نیز باو موافقت کرد و بخدمت آنحضرتؐ آمد ندو بشرفِ اسلام فائز گردیدند.))

”یعنی خالد بن سعید رضی اللہ عنہ سابقین اولین میں سے ہیں اور ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پہلے اسلام لائے ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ خالد رضی اللہ عنہ کے خواب دیکھنے کی برکت سے ابوبکر رضی اللہ عنہ اسلام لائے۔ خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کی اسلام آوری کا قصہ یہ ہے کہ انہوں نے خود کو خواب میں جلتی ہوئی آگ کے کنارے کھڑا دیکھا اور ان کے والد انہیں آگ میں ڈالنا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اچانک ان کا گریبان پکڑ کر اپنی جانب کھینچا اور فرمایا کہ میری طرف آ جاؤ تا کہ آگ میں نہ گر پڑو، خالدؓ اس خوف ناک خواب سے بیدار ہوئے اور قسم کھا کر کہا کہ میرا

خواب سچا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جانے لگے، برسرِ راہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مل کر حالات پوچھے، خالد نے خواب کا ماجرا بیان کیا، اس پر ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی ان کے ساتھ ہو لیے اور پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر دونوں اسلام کی دولت سے سرفراز ہوئے۔“

اس روایت کے دیکھنے والے انصاف کر سکتے ہیں کہ جو شخص اسلام کی سچائی پر بالہام غیبی ایمان لایا ہو اور جس کو خدا نے رویائے صادقہ کے ذریعہ سے ایمان پر راغب کیا ہو اس کی نسبت کس کی زبان سے نکل سکتا ہے کہ وہ ایمان سے بے بہرہ تھا..... برائے خدا کوئی قاضی نور اللہ شوستری کے اس فقرہ کو کہ ”ابو بکرؓ بہ برکت خوابے کہ اودیدہ بود مسلمان شدہ بود“ (یعنی ابو بکر رضی اللہ عنہ اس خواب کی برکت سے مسلمان ہوئے جو انہوں نے دیکھا تھا) مجتہد صاحب ❶

❶ مجتہد سے مراد مولوی سید دلدار علی نصیر آبادی ہیں، والد کا نام سید محمد معین ہے، رائے بریلی کے قریب نصیر آباد (جائس) میں ۱۱۶۶ء مطابق ۱۷۵۳ء کو پیدا ہوئے، وطن میں گھریلو تعلیم حاصل کرنے کے بعد متوسطات پڑھنے رائے بریلی والہ آباد گئے۔ رائے بریلی میں مولوی باب اللہ سے، الہ آباد میں سید غلام حسین دکنی سے اور لکھنؤ کے قریب سندیلہ میں مولانا حیدر علی سندیلوی ابن ملا احمد اللہ سے منقولات و معقولات کا درس لیا۔ ہندوستان میں تکمیل و تحصیل کے بعد حکومت وقت کے خرچ پر عراق و ایران گئے اور وہاں ملا سید محمد باقر بہبہانی (متوفی ۱۲۰۸ھ) سید مہدی طباطبائی (متوفی ۱۲۱۲ھ) کے سامنے زانوئے شاگردی طے کیا۔ مولانا دلدار علی نجف و کربلا و سامرا کے ان اساتذہ سے اجازت لے کر ایران پہنچے اور یہاں سید مہدی ابن ہدایت اللہ اصفہانی کے درس میں حاضری دی، تم و مشہد بھی ہو گئے اور وہاں کے علما سے فیض حاصل کیا۔ (مطلع انوار صفحہ ۲۲۰-۲۲۱)

۱۱۹۳ء میں لکھنؤ واپس آ کر خود فرنگی محل کے علماء کی تصدیق و تقریب سے مجتہد اور شیعہ فرماں روایان وقت کے مقتدا قرار پائے۔ کتاب تذکرۃ العلماء شیعہ کے مؤلف سید مہدی بن سید نجف رضوی نے سید دلدار علی کو پہلا ”ہندوستانی“ مجتہد بتایا ہے۔

مولوی سید دلدار علی کا آبائی مذہب اہل سنت و جماعت تھا (مقدمہ وقائع دل پذیر صفحہ ۱۰۲) مولوی سید محمد مخدوم حسین مؤلف توضیح السعادت نے بھی مولوی سید دلدار علی کا قدیم الایام آبائی مذہب اہل سنت و جماعت اور انہیں جعفر کذاب کی نسل سے بتایا ہے۔

چونکہ جعفر بن علیؓ نے اپنے بھائی حسن عسکریؓ کے لاولد فوت ہونے کی گواہی دی تھی اور انشاء عشری حضرات بارہویں امام (فرضی) کی پیدائش کا عقیدہ رکھتے ہیں، اس لیے وہ انہیں کذاب کہتے ہیں، حالانکہ جعفرؓ بڑے متقی و پرہیزگار انسان تھے۔

کے اس فقرے سے کہ ”خليفة از اوّل امر از ایمان بہرہ نداشت با اتفاق من علمائے الامامیہ“ (یعنی علمائے امامیہ کا اتفاق ہے کہ ابو بکر شروع ہی سے ایمان نہیں لائے تھے) مطابق کرے اور انصاف سے نہ گزرے کہ ان لوگوں کو دشمنی اور عداوت نے کیسا اندھا کر دیا ہے کہ ایسے صدیق کے ایمان سے انکار کرتے ہیں جس کو خدا نے بذریعہ رویائے صادقہ کے حقیقت اسلام کا اقرار کیا ہے اور مجتہد صاحب نے ایمان سے انکار فرمایا ہے، اس کا جواب ہم چند طریقوں سے دیتے ہیں۔

۱۔ یہ کہ ہم کو یہ امر ثابت کرنا ہے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پیغمبر ﷺ کی نبوت کو دل سے سچ جانا اور حضرت ﷺ کی دعوت کو دل سے قبول کیا، اس کا نام مجتہد صاحب ایمان

﴿ ﴿ ﴿ مولانا محمد علی فیض آبادی اور شاہ علی اکبر مودودی الہ آبادی متوفی ۱۲۱۰ء کی تحریک پر نائب سلطنت سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں نے ۱۳ رجب ۱۲۰۰ء مطابق ۱۳ مئی ۱۸۶۷ء بروز جمعہ اپنے گھر پر نماز ظہر کی جماعت کا اہتمام کیا اور مولوی دلدار علی کی اقتدا میں نماز ظہر و عصر ادا کی گئی۔ دو ہفتہ بعد اسی مہینہ کی ۲۷ تاریخ کو مولوی دلدار علی کی اقتدا میں نماز جمعہ کی جماعت ہوئی..... شیعوں کی پہلی نماز جمعہ و جماعت کے متعلق ”نزہۃ الخواطر“ کے مؤلف، سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ مولانا حکیم عبداللہ مرحوم نے لکھا ہے کہ..... شاہ علی اکبر چشتی مودودی اور ملا محمد علی فیض آبادی کی تحریک سے نواب حسن رضا خاں نے جمعہ و جماعت قائم کر کے سب سے پہلے مولوی سید دلدار علی کی اقتداء میں ۱۳ رجب ۱۲۰۰ء کو نماز ادا کی، یہ پہلا دن ہے کہ وسط ہند میں شیعوں نے اپنا جمعہ و جماعت علیحدہ کر لیا۔ (گل رعنا صفحہ ۱۵۳-۱۵۴)

مولوی دلدار علی نے متعدد کتابیں تالیف و تصنیف کیں، صاحب مطلع انوار نے ان کی ستائیس (۲۷) کتابوں کے نام تحریر کیے ہیں جن میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی معرکہ آراء تصنیف ”تحفہ اثنا عشریہ“ کی تردید میں چھ (۶) کتابیں اور رسالے تحریر کیے۔ صوارم الالہیات، حسام الاسلام، احیاء السنۃ میں تحفہ کے ان ابواب کا جواب ہے جو بالترتیب الہیات، نبوت اور معاد و حجت کے متعلق ہیں۔ رسالہ ذوالفقار تحفہ کے باب دواز دہم کے جواب میں ہے، خاتمہ کتاب صوارم میں اثباتِ امامت کا ذکر ہے اور رسالہ غیبت میں شاہ صاحب کے اقوال دربارہ غیبت کا رد ہے۔ ان کے علاوہ اساس الاصول، عماد الاسلام ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ شمالی ہند میں مذہب شیعہ کی اشاعت و شیعوں کی مذہبی تنظیم کے لیے مولوی سید دلدار علی نے بہت خدمات انجام دیں اور آج اودھ میں شیعہ مذہب کی جو رونق نظر آتی ہے یہ انہیں کی محنتوں کا ثمرہ ہے۔ ۱۹ رجب کی شب ۱۳۳۵ء مطابق ۳ مئی ۱۸۲۰ء کو بچہ غازی الدین حیدر لکھنؤ میں رحلت کی۔ بڑے صاحبزادہ سلطان العلماء سید محمد صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی اور انہیں کے عز خانے میں سپرد لحد کیا۔ اس وقت سے مولوی دلدار علی کو ”غفران مآب“ کہا جاتا ہے۔“ (شیخ محمد فراست)

رکھیں یا اسلام۔ سو محمد اللہ قاضی نور اللہ شوسترى کے اقرار سے ثابت ہو گیا، اور اگر مجتہد صاحب نے ایمان اور اسلام کے لفظوں میں اس نظر سے فرق کیا ہو کہ ایمان سے مراد تصدیق بالجنان ہے اور اسلام سے فقط اقرار باللسان۔ اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایمان سے اس لیے انکار کیا کہ ان کو پیغمبر ﷺ کی نبوت پر تصدیق قلبی کا مرتبہ نہ تھا تو ان کی تکذیب کے لیے انہیں کے شہید ثالث کا اقرار کافی ہے، یعنی ”ابو بکر بہ برکت خوابے کہ او دیدہ بود مسلمان شدہ بود۔“

۲۔ ہم نے مانا کہ ایمان اور اسلام میں فرق ہے اور شہید ثالث کی اس روایت سے ابو بکر رضی اللہ عنہ کا اسلام ثابت ہوتا ہے نہ کہ ایمان..... لیکن ہم ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایمان بھی امیر المؤمنین علی مرتضیٰ کے اقرار سے ثابت کرتے ہیں اور مجتہد صاحب کے تارو پود کو درہم برہم کیے دیتے ہیں، مؤمنین کو چاہیے کہ اس کو ذرا دل سے سنیں اور اپنے بزرگوں کی بے خبری پر افسوس کریں کہ علامہ حلی نے شرح تجرید میں لکھا ہے:

((قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَوْمًا عَلَى الْمِنْبَرِ أَنَا الصِّدِّيقُ الْأَكْبَرُ أَنَا الْفَارُوقُ الْأَعْظَمُ أَسَلَّمْتُ قَبْلَ أَنْ أَسْلَمَ أَبُو بَكْرٍ وَ أَمَنْتُ قَبْلَ أَنْ أَمَّنَ .))

”کہ حضرت علی علیہ السلام نے ایک دن منبر پر یہ فرمایا کہ میں صدیق اکبر ہوں میں فاروق اعظم ہوں، اسلام لایا قبل اسلام ابو بکر کے اور ایمان لایا قبل ایمان لانے ابو بکر کے۔“

پس علامہ حلی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زبان سے اسلام بھی ابو بکر رضی اللہ عنہ کا اور ایمان بھی ان کا ثابت کر دیا..... اگر نور اللہ شوسترى کے قول سے مجتہد صاحب کا قول باطل نہ ہوا تھا تو اب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے قول سے ان کا یہ قول کہ ”خليفة از اوّل امر از ایمان بہرہ نداشت“ باطل ہو گیا۔ (والحمد لله على ذلك) بلکہ اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے اسلام اور ایمان کو ایسی وقعت اور عزت و شہرت تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فخر یہ بیان کیا کہ

میں ان سے بھی پہلے ایمان اور اسلام لایا..... اگر شیعوں کے قول کے موافق ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، یا طمع دنیا سے ایمان لائے ہوتے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ان سے پیشتر ایمان لانے پر افتخار کیوں کرتے۔

۳۔ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایمان اور اسلام کی نسبت جو علماء امامیہ کا قول ہے کہ وہ صرف ظاہر میں اسلام لائے تھے اور کاهنوں کے کہنے سے بہ طمع خلافت مسلمان ہو گئے تھے، وہ بالکل غلط ہے لیکن قاضی صاحب کی شہادت سے، جس میں انہوں نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سابقین اولین میں بیان کیا ہے، ان کے اگلے پچھلے جھوٹے ہو گئے اور یہ کوئی خیال نہ کرے کہ قاضی صاحب کے اس فقرے نے فقط اپنے علماء اور مجتہدین کے قولوں کو باطل کیا بلکہ اپنے حضرت صاحب الامر کے قول کو بھی رد کر دیا، یعنی شیعوں کے امام مہدی صاحب کا بھی یہی قول ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دنیا کی طمع سے ایمان لائے تھے اور یہودیوں سے پیغمبر ﷺ کی بادشاہت اور غلبے کا حال سنا کرتے تھے، پس ان کے کہنے کے موافق ظاہر میں کلمہ گو ہو گئے تھے..... چنانچہ اس کو ملا باقر مجلسی نے ”بحار الانوار“ سے ”رسالہ رجعیہ“ ۱ میں بروایت شیخ صدوق محمد بن بابویہ قمی کے لکھا ہے:

((اسلام ابوبکرؓ طوعاً نبود اما برائے طمع دنیا زیرا کہ ایشاں باکفرہ یہود مخلوط بودند (الی قولہ) چون حضرت دعویٰ رسالت فرمود ایشاں از گفتہ یہود بہ ظاہر کلمتین گفتند و در باطن کافر بودند.))

”یعنی ابوبکر رضی اللہ عنہ مجبوراً اسلام لائے تھے جس میں دنیاوی لالچ شامل تھی کیونکہ وہ کافر یہودیوں سے ملے ہوئے تھے..... جب حضور ﷺ نے اعلان رسالت فرمایا تو انہوں نے یہودیوں کے کہنے کے موافق ظاہری طور پر دو کلمے کہہ دیے اور باطنی طور پر کافر تھے۔“

الغرض! ان روایتوں سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اسلام اور ایمان بخوبی ثابت ہوا اور جب ان کا اسلام اور ایمان بخوبی ثابت ہوا تو ”لصاحبه“ کے لفظ سے یہ بھی بہ نص قرآن ثابت ہوا کہ وہ پیغمبر ﷺ کے صاحب تھے اور پیغمبر ﷺ کے اصحاب کے جو فضائل اور درجات ہیں اور جن کو علماء امامیہ بھی تسلیم کرتے ہیں، ان کے مصداق بھی ٹھہرے..... پس باوجود اس کے جو کوئی ان کی صحابیت سے انکار کرے اور ان کے فضائل کو نہ مانے وہ منکر نص قرآنی ہے۔“

آٹھواں اعتراض آٹھویں فضیلت پر:

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ ﴿لَا تَحْزَنُ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ (التوبہ: ۴۰) سے ثابت ہوتا ہے کہ جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کفار کو درغار پر آپہنچا ہوا دیکھا تو وہ بخیاں اس کے کہ حضرت کو صدمہ نہ پہنچے اوندوہ گیس ہوئے تب حضرت نے فرمایا کہ ﴿لَا تَحْزَنُ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ (التوبہ: ۴۰) کہ کچھ غم نہ کر خدا ہمارے ساتھ ہے اور مَعَنَا جس میں ضمیر جمع متکلم کی ہے اس لیے فرمایا کہ اس معیت میں خدا کی ابوبکر بھی شریک ہوویں، پس پیغمبر نے ابوبکر کو بھی اس معیت میں اپنے شامل کر لیا۔ اس پر چند طرح سے امامیہ اعتراض کرتے ہیں:

- ۱۔ اس طرح پر، کہ ابوبکر کا حزن طاعت تھا یا معصیت اگر طاعت تھا تو پیغمبر خدا ﷺ کا طاعت سے منع کرنا ثابت ہوتا ہے اور اگر معصیت تھا تو عصیانِ ابوبکر ثابت ہوا۔
- ۲۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خدا اور اس کے رسول ﷺ کے قول پر یقین نہ تھا اور بآنکہ غار میں اپنی آنکھ سے حفاظت کی بہت سی نشانیاں دیکھیں مثل کبوتروں اور عنکبوت وغیرہ کے مگر تب بھی ان کو حفاظت پر یقین نہ ہوا اور خوف کے مارے زور زور سے رونا شروع کیا اور ہر چند پیغمبر خدا ﷺ نے جھپکارا (کذا) اور زجر و توبیخ باز رکھنا چاہا مگر وہ رونے اور چلانے سے باز نہ رہے۔

① یہ روایت بھی مجملہ ان روایتوں کے ہے جن سے اکثر کتابیں شیعوں کی بھری ہوئی ہیں اور جن کی بیہودگی اور رکاکت پر ہنسی آتی ہے، ہم آئندہ جہاں حضرات شیخین کے ایمان لانے کا تفصیلی حال لکھیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ اس روایت کو پوری نقل کر کے مومنین کو خوش کریں گے۔ ۱۲ منہ عقاعنہ،

۳۔ ابوبکر کا رونے اور چلانے سے یہ مقصد تھا کہ کفار آواز سن لیں اور پیغمبر ﷺ کو گرفتار کر لیں اور اسی واسطے حضرت ان کو سمجھاتے اور رونے سے باز رکھتے تھے لیکن وہ باز نہ رہتے تھے اور اپنی بدنیتی اور فسادِ باطنی کو رونے کے پیرایہ میں ظاہر کرنا چاہتے تھے بلکہ بعض دانشمندوں نے اس قدر اور بڑھا دیا ہے کہ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ کا رونے سے کام نہ نکلا اور کافروں نے ان کی آواز نہ سنی تب انہوں نے اپنا پاؤں غار سے باہر کر دیا کہ کفار دیکھ لیں اور غار کے اندر گھس آئیں کہ اسی وقت خدا کے حکم سے سانپ نے ان کے پاؤں میں کاٹا اور بہ مجبوری انہوں نے اپنا پاؤں اندر کھینچ لیا۔

۴۔ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مطلب پاؤں کے باہر کرنے سے بھی حاصل نہ ہوا، یعنی کافروں نے آ کر حضرت کو غار میں سے نہ پکڑا تب اور طرح سے پیغمبر خدا ﷺ کو تکلیف دینا شروع کی یعنی حضرت علیؑ کی یاد کرنے لگے اور ان کی تنہائی پر اپنا رنج ظاہر کرنے لگے تب پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا کہ ﴿لَا تَحْزَنْ﴾ کہ اے ابوبکر! اپنا رنج علیؑ کی تنہائی پر ظاہر نہ کرو ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ خدا ہمارے اور علیؑ کے ساتھ ہے۔

۵۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ سے دو معنی مراد لیتے ہیں ایک یہ کہ خدا ہمارے اور علیؑ کے ساتھ ہے..... دوسرے یہ کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پیغمبر خدا ﷺ نے کہا کہ خدا ہمارے ساتھ ہے یعنی ہماری نیکی پر اور تمہاری بدی پر مطلع ہے، ہم کو ہماری نیکی کا صلہ اور تم کو بدی کا بدلہ دے گا۔“

ان تقریروں کو سن کر ہر شخص محو حیرت ہو گا اور زانوںے تھیرے سر نہ اٹھائے گا اور تعجب کرے گا کہ یہ اعتراض ہے یا مجنونوں کی بڑ ہے، جواب ہے یاد یوانوں کی جھک ہے بلکہ جو لوگ عقل و دانش رکھتے ہیں ان کو تو یقین ہی اس پر نہ ہو گا کہ یہ تقریریں کسی عالم یا مجتہد کی زبان سے نکلی ہوں گی مگر جس کسی کو شک ہو وہ ”احقاق الحق“ اور ”مجالس المؤمنین“ وغیرہ کو کھول کر دیکھے کہ انہیں تقریروں کو شہید ثالث نے کس آب و تاب کے ساتھ لکھا ہے اور حضرت ملا مشہدی نے ان تقریروں پر کیسا فخر کیا ہے اور صاحب تَقْلِيْبُ الْمَكَائِدُ نے

بجواب تقریر خاتم المحدثین کے اسی پر کیسا ناز کیا ہے بلکہ مولانا صاحب پر بڑا طعنہ کیا ہے کہ انہوں نے قاضی نور اللہ شوستر کی تقریروں کو بعینہ نقل نہیں کیا ہے اور ان لفظوں سے اپنا غصہ ظاہر کیا ہے:

((ناصبی رامی بایست کہ این عبارت جناب قاضی رانقل می کرد تراشیدن تقریرے از طرف خود، نسبت دادن بطرف شیعیان و بعد ازاں بجواب آن مشغول شدن از اعظم مکائد این ناصبی ست.))

”ناصبی (سنی) کو چاہیے تھا کہ قاضی کی پوری عبارت نقل کرتے اور پھر اس پر اعتراض کر سکتے تھے، اپنی طرف سے ایک عبارت گھڑ لینا اور اس کو شیعوں کی جانب منسوب کرنا اور پھر خود ہی اس کا جواب دینا اس سنی کا سب سے بڑا فریب ہے۔“

اب ہم ان تقریروں کا خلاصہ تو لکھ چکے اصل عبارت کو بھی لکھتے ہیں اور نہایت ادب سے خدمت میں حضراتِ شیعہ کے عرض کرتے ہیں کہ وہ ذرا انصاف فرمائیں کہ یہ تقریریں ایسی ہیں کہ ان پر کوئی ناز کرے یا ایسی ہیں کہ ان پر شرمائے۔^❶ ہمارے نزدیک اگر کسی دانشمند یا صاحب حیا و شرم کی طرف ایسی تقریروں کو کوئی منسوب کرے تو ضرور وہ اس نسبت کو اپنا عار و ننگ سمجھے گا اور ایسی پوچ و بیہودہ باتوں کے انتساب سے شرمائے گا۔ معلوم نہیں کہ قاضی صاحب اور ملاً صاحب نے ان تقریروں میں کون سے مضامین حکیمانہ درج کیے ہیں اور کیسے جو اہر بیش بہا ان میں رکھے ہیں جن پر ان کو اور ان کے مقلدین کو اس قدر ناز و افتخار ہے، ہم تو ان میں ایک بات بھی ایسی نہیں پاتے جو بیہودگی سے خالی ہو اور ایک لفظ بھی ایسا نہیں دیکھتے جو سفاہت اور رکاکت سے محفوظ ہو:

❶ وھوھذہ و کیف یتوھم حصول منقبتہ فی حضور الغار و فذ ظھر فی الغار خطاۃ ذالک لا نہ لمادخل فی حرزا الحریز و المکان المصون بجمت یا من اللہ تعالیٰ علی نبیہ مع ما یظھر لہ من الآیات من تعشیش الطائر و نسبح العنکبوت علی انہ لم یظن السلامة ولا صدق بالآیة و اظر الحزن ⇐⇐⇐

زپائے تابسرش ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

ہمارے نزدیک تو شاہ صاحب قدس اللہ سرہ نے بڑا احسان قاضی صاحب اور مُلا صاحب پر کیا تھا کہ ان کی تقریروں کو بلفظہ نقل نہ کیا اور فضیحت و رسوائی سے ان کو بچایا لیکن چونکہ حضرات امامیہ کو ان کی تشہیر ہی منظور ہے، اس لیے اب ہم نے بہ مجبوری ان کو نقل کر دیا اگرچہ ہم کو ایسی بیہودہ تقریروں کے جواب میں لکھنا اوقات کو ضائع کرنا ہے مگر تنبیہاً للسفہاء کچھ لکھتے ہیں:

بہ نسبت پہلے اعتراض کے کہ حزن ابو بکر رضی اللہ عنہ کا طاعت تھا یا معصیت، اگر طاعت تھا تو پیغمبر ﷺ نے کیوں منع کیا اور معصیت تھا تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کا گناہ گار ہونا خدا کی کتاب سے ثابت ہوا۔

جواب الزامی یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے جو خطاب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا ہے کہ ﴿لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلَىٰ﴾ (طہ: ۶۸) اور حضرت لوط علیہ السلام سے فرمایا کہ: ﴿لَا تَحْزَنْ إِنَّكَ مِنْ جُودِكَ وَأَهْلِكَ﴾ (العنکبوت: ۳۲) اور پیغمبر خدا ﷺ سے فرمایا ہے کہ ﴿لَا يَحْزُنُكَ قَوْلُهُمْ﴾ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کو خوف تھا اور پیغمبر خدا ﷺ کو کافروں کی باتوں سے رنج ہوتا تھا، خدا نے ان کے اطمینان و تسلی کے لیے ﴿لَا تَخَفْ﴾ اور ﴿لَا تَحْزَنْ﴾ فرمایا ہے۔

پس ہم شیعیانِ پاک سے پوچھتے ہیں کہ ان پیغمبروں کا خوف طاعت تھا یا معصیت؟

◀◀◀ والمخافة حتى غلبه بكاہ وتزايد قلقه دانز عاجه ويلي النبي في تلك الحال الى مقاساته ورفع الى مداراته ونهى عن الحزن وزجره ونهى النبي لا يتوجه في الحقيقة الاعلى الزجر عن القبح ولا سبيل الى صرفه الى المجاز بغير دليل لا سيما وقد ظهر من جزعه وبكائه ما يكون من مثله فساد الحال في الاخفاء فهو انما نهى عن استند نام دفع منه ولو سكن نفسه الى ما وعد الله تعالى نبیه وصدقہ فيما اجر به من نجاته لم يحزن حيث ان يكون امنه ولا انز حج قلبه في الموضوع الذي يقضى سكونه فافضليته في الغار يفخر بها لابي بكر لولا المكابرة واللداد في هذا..... انتهى.

اگر طاعت تھا تو خدا کا طاعت سے منع کرنا ثابت ہوتا ہے، اگر معصیت تھا تو انبیاءِ معصومین کا گنہگار ہونا ثابت ہوتا ہے۔ بس جو کچھ وہ اس کا جواب دیں گے وہی ہماری طرف سے سمجھیں۔

اس کے جواب میں قاضی نور اللہ شوستری نے مَجَالِسُ الْمُؤْمِنِينَ میں بہ ضمن حکایات مفیدہ شیخ مفید کے بجواب تقریر ابوالحسن خیاط رئیس معتزلہ کے لکھا ہے کہ انبیاء کی عصمت بدلیل عقلی ثابت ہے، اس لیے جو بھی ان کی نسبت ہے اس سے ظاہری معنی مراد نہیں ہو سکتے اور ابوبکرؓ کی عصمت ثابت نہیں اس لیے جو ان کی شان میں ہے اس کے ظاہری معنی مراد ہیں۔ وھذہ عبارتہ:

((مضمون آن آیات نہی ست لیکن انبیاء رازار تکاب قبیحی کہ فاعل آن مستحق ذم میشود بواسطہ دلیل عقلی کہ بر عصمت انبیاء اجتناب ایشاں از گناہان قائم گشت موجب عدول از ظاہر شدہ از ظواہر آن آیات عدول می کنم وھر گاہ اتفاق حاصل باشد در آنکہ ابوبکر معصوم نہ بود، واجب است کہ اجرای نہی کہ در شان آن واقع شدہ بہ ظاہر آنکہ فتح حال ابوبکر ست بماند.))

”آیات متذکرہ کے مضمون کا مقصد ممانعت ہے اور انبیاء کا برا فعل کرنا موجب عدول ظاہر ہے کیونکہ امرِ فبیح کا فاعل مستحق ملامت ہوتا ہے، انبیاء کے معصوم ہونے اور گناہوں سے اجتناب کرنے کے لیے دلیل عقلی موجود ہے کہ وہ معصوم تھے، اس لیے میں بھی ان آیات کے ظاہر سے عدول و انحراف کرتا ہوں اور متفق علیہ ہے کہ ابوبکرؓ معصوم نہ تھے اور ممانعت کے جو احکام جاری ہوئے وہ ابوبکرؓ کے حالات کی وضاحت کے لیے ہیں وہ اپنی جگہ باقی رہے۔“

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ خوف کو معصیت میں شمار کرنا ہی غلط ہے اور انبیاء علیہم السلام نے جو خوف کیا اور خدا نے ان کو اس سے مطمئن کیا اس نے کو بلا ضرورت ظاہر

سے عدول کرنا ہی لغو ہے۔ بلکہ خوف کو معصیت قرار دے کر عمداً انبیاء علیہم السلام پر تہمت کرنا ہے اور جو فرقہ انبیاء کی عصمت کا قائل نہیں ہے اس کو تقویت دینا ہے، حالانکہ خوف منجملہ ان امور بشریت کے ہے جن سے کسی بشر کو خواہ وہ نبی ہو، خواہ امام ہو، خواہ ولی ہو چارہ نہیں اور اس پر خدا کی طرف سے بھی مواخذہ نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو حکم ہوا کہ فرعون کو جا کر سمجھاؤ اور اس کو ایمان کی دعوت کرو تو انہوں نے خوف کیا اور کہا کہ ﴿رَبَّنَا إِنَّا نَخَافُ أَنْ يُفْرِطَ عَلَيْنَا أَوْ أَنْ يَطَّغَىٰ﴾ (طہ: ۴۵) کہ خداوند! ہم کو خوف ہوتا ہے کہ وہ کہیں ہم پر زیادتی نہ کرے، تب اللہ نے مطمئن کیا اور فرمایا کہ ﴿لَا تَخَافَا إِنِّي مَعَكُمَا﴾ (طہ: ۴۶) کہ کچھ خوف نہ کرو میں تمہارے ساتھ ہوں..... پس ذرا غور کرنے کا مقام ہے کہ جب حضرت موسیٰ اور ہارون علیہم السلام باوجود نبوت کے خوف کریں اور خدا کی طرف سے اس خوف پر ان کو عتاب نہ ہو اور ان کی نبوت پر فرق نہ آئے تو اگر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو بالاتفاق نبی نہ تھے، نہ معصوم، خوف کیا تو کیا گناہ کیا۔ بلکہ جس طرح پر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ فرما کر ابو بکر رضی اللہ عنہ کو مطمئن کر دیا، ہم کو شہید ثالث کی سمجھ پر نہایت تعجب آتا ہے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے محزون و مغموم اور خائف ہونے سے خوف کو بھی گناہوں میں داخل کر دیا اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ذمہ گناہ ثابت کرنے کے لیے تمام پیغمبروں کی نسبت معاصی کا الزام لگایا اور بلا ضرورت الفاظِ خوف کو ان کے حقیقی ظاہری معنی سے عدول کیا لیکن جب کہ جا بجا قرآن میں خوف کے الفاظ انبیاء کی نسبت وارد ہیں اور مفسرین نے اس کے ظاہری معنی مراد لیے ہیں اور کسی نے خوف کو معصیت اور گناہ اور نقص میں شمار نہیں کیا ہے تو ایک شہید ثالث کے کہنے سے کچھ نہیں ہو سکتا چنانچہ آیت ﴿فَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً﴾ (طہ: ۴۷) کی تفسیر میں علامہ طبرسی نے جو محققین شیعہ سے ہیں، لکھا ہے کہ ((فَلَمَّا امْتَنَعُوا عَنِ الْأَكْلِ خَافَ مِنْهُمْ وَظَنَّ أَنَّهُمْ يُرِيدُونَ سُوءًا فَقَالُوا أَيُّ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ لَا تَخَفْ يَا إِبْرَاهِيمُ)) (کہ جب فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ کھانا نہ کھایا تو وہ ڈرے اور گمان کیا کہ کہیں یہ لوگ بدی سے پیش نہ آئیں تب ملائکہ نے کہا کہ اے

ابراہیم علیہ السلام کچھ خوف نہ کرو اور ہم سے نہ ڈرو، ہم آدمی نہیں ہیں..... پس خوف دور کرنے کے لیے جو تسلی اور تشفی کے کلمات بہ لفظ لَا تَخَفْ يَا لَا تَحْزَنْ کلام الہی یا احادیث نبوی ﷺ میں مذکور ہیں ان کو از قبیل نہی تصور کرنا جو ارتکاب معاصی کے منع کے لیے مستعمل ہیں، بڑی غلطی ہے۔ ورنہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ جہاں لفظ ”لا“ کا جو حرف نہی کا ہے استعمال کیا جائے وہاں مراد نہی عن المعصیت ہو یا جہاں کسی شے کی نہی بیان ہو اس سے اس کا وقوع ہونا بھی ضروری سمجھا جائے تو ہزاروں اعتراض ائمہ کرام پر ایسے وارد ہوں گے کہ سوائے ان کی عصمت کے دوسرا جواب حضرات امامیہ سے بن نہ پڑے گا..... مثلاً ”علل الشرائع“ میں لکھا ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ حضرت علی علیہ السلام سے فرماتے ہیں:

((يَا عَلِيُّ لَا تَتَكَلَّمْ عِنْدَ الْجَمَاعِ وَلَا تَنْظُرْ إِلَىٰ فَرْجِ امْرَأَتِكَ

وَلَا تُجَامِعْ امْرَأَتَكَ بِشَهْوَةِ امْرَأَةٍ غَيْرِكَ .))

”اے علی! نہ کلام کرو جماع کے وقت اور نہ دیکھو اپنی عورت کی شرمگاہ کو اور نہ

صحبت کرو اپنی بی بی سے اور کسی عورت کی شہوت پر۔“

پس اگر کوئی پوچھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ کام کرتے تھے یا نہ کرتے تھے، اگر نہ کرتے تھے تو وہ قاعدہ باطل ہوا جاتا ہے کہ نہی شے وقوع شے پر دال ہے اور اگر کرتے تھے تو وہ فعل طاعت تھا یا معصیت، اگر طاعت تھا تو پیغمبر خدا ﷺ نے کیوں منع کیا، اگر معصیت تھا تو امام معصوم کا گنہگار ہونا ثابت ہوا..... اگر کوئی یہ جواب دے کہ امام معصوم ہوتے ہیں، اس لیے اس نہی کو اگرچہ نہی عن المعصیت ہے (از ظاہر آن عدول می کنیم) تو ہم بھی بہ مجبوری یہ کہیں گے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی محفوظ تھے، اس لیے ہم بھی نہی ﴿لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ کو ”از ظاہر آن عدول می کنیم“ (اس کے ظاہر سے پھرتے ہیں)۔

اے یارو! ایسی صریح اور صاف بات کو عناد اور عداوت سے کیوں معمہ اور پہیلی بنائے دیتے ہو، اور سیدھی سچی بات کو کس لیے مشکل کیے دیتے ہو، ذرا انصاف کرو کہ اگر کوئی دوست کسی دوست پر صدمہ پہنچنے سے رنج کرے اور وہ دوست اس کو مطمئن کرے اور کہے کہ

کچھ خوف نہ کر، اللہ ہمارا مددگار ہے تو یہ کہنا از روئے تشفی اور تسلی کے ہے یا از قسم زجر و توبیخ کے ہے..... اور از قسم تشفی اور تسلی کے ہو تو ﴿لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ کو بھی اس قسم سے سمجھو، خدا کی آیتوں کی تحریف لفظی نہ کرو اور یہ خیال نہ کرو کہ نہی کے حرف کا استعمال منع اور زجر و توبیخ کے واسطے ہوتا ہے بلکہ رحم اور شفقت کے واسطے بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر قرآن مجید کی لفظوں پر کوئی غور کرے تو اس کو خود معلوم ہو جائے گا کہ اکثر جگہ خدا نے پیار اور محبت میں بھی حرف نہی کا استعمال کیا ہے، چنانچہ پیغمبر ﷺ سے فرماتا ہے کہ ﴿لَا تُحْرِكُ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ﴾ (القیامہ: ۱۶) کہ بہت جلدی زبان نہ کھول دیا کرو اور میرے کلام کو پورا سن لیا کرو اور دوسرے مقام پر فرماتا ہے کہ ﴿فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسْرَتٍ﴾ (فاطر: ۸) یعنی لوگوں کے پیچھے تمہاری جان نہ جاتی رہے، تو ان کے لیے اپنی جان نہ دے۔ تو کیا ان کلمات کو بھی قاضی صاحب زجر و توبیخ کے کلمات سمجھیں گے اور تحریک لسان اور ذہاب نفس کو معصیت اور ذم تصور کر کے بلحاظ عصمت حضرت کے ظاہر سے عدول کریں گے اور اگر ان کلمات کو رحمت اور شفقت پر محمول کریں گے تو اپنے دعویٰ کی سفاہت کے قائل ہوں گے۔

دوسرا اعتراض کہ ابوبکرؓ کو خدا اور رسول پر کچھ یقین نہ تھا، اس لیے باوجود دیکھنے بہت سی نشانیوں حفاظت کے وہ رونے اور ہائے مچانے لگے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہائے مچانے کرنا اور زور زور سے چلانا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کسی طرح پر ثابت نہیں ہے، اس لیے قرآن مجید سے تو حزن کرنا ثابت ہوتا ہے اور حزن کے معنی نوحہ اور فریاد کے نہیں ہیں اگر کوئی خاص لغت کی کتاب حضرات امامیہ کی ایسی ہو کہ جو الفاظ صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کی شان میں ہوں ان کے کچھ معنی ہی علیحدہ اس میں لکھتے ہوں تو ہم نہیں جانتے ورنہ حزن کے معنی غم کے ہیں نہ ہائے مچانے اور زور زور سے چلانے کے، جس کو نور اللہ شوستری نے ”احقاق الحق“ میں لکھا ہے کہ ((حَتَّىٰ غَلَبَتْهُ بُكَائُهُ وَتَرَايَدَ قَلْقُهُ وَانزِعَ عَاجُهُ)) (یعنی رونے لگے اور ان کا قلق اور گھبراہٹ بڑھ گئی) علاوہ اس کے خود مفسرین امامیہ کی تفسیر پر خیال کرنا چاہیے کہ

انہوں نے حزن کے کیا معنی لکھے ہیں، پس مفسر کا شانی نے خُلاصۃُ الْمَنْهَجِ میں اس کا ترجمہ کیا ہے کہ ”چوں گفت پیغمبر یار خود را اندوہ مخور“ (یعنی جب پیغمبر ﷺ نے اپنے یار غار سے کہا کہ غم نہ کرو) اور علامہ طبرسی نے فرمایا ہے: لَا تَحْزَنْ اِی لَا تَخَفْ (غم نہ کرو یعنی ڈرو نہیں) پس ہم کو سراسر حیرت ہے کہ قاضی صاحب نے حزن کے معنی نوحہ و فریاد کے کہاں سے نکالے اور یہ امر کہ خوف بہ مقتضائے بشریت ہے اور انبیاء علیہم السلام اور ائمہ کو بھی ہوا ہے اور معصیت نہیں ہے ہم اوپر ثابت کر آئے ہیں اور اب پھر ثابت کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود اللہ جل شانہ سے کہا کہ ﴿أَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ﴾ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں فرعون اور اس کے لشکری مجھے قتل نہ کر دیں، تب خدا نے فرمایا کہ ﴿لَا تَخَفْ إِنَّكَ مِنَ الْأَمِينِينَ﴾ کہ ہرگز اس کا خوف نہ کرو تو آمن و امان میں رہے گا۔ ❶ بلکہ علمائے امامیہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خائف ہونے کا ایسے موقع پر اقرار کیا ہے کہ اس سے انکار نہیں کر سکتے ہیں۔ چنانچہ جو دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے افضل ہونے پر بیان کی ہے اس میں یہی تقریر کی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے مدین کو جاتے تھے تب وہ خائف اور ہراساں تھے ﴿فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ﴾ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ہجرت

❶ واضح ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک ہی مرتبہ خوف نہیں کیا بلکہ چند مرتبہ چنانچہ اوّل حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غیب سے آواز انا اللہ کی سنی تب خوفزدہ ہو گئے کہ خدا نے فرمایا ﴿لَا تَخَفْ إِنِّي لَا يَخَافُ لَدَائِيَ الْمُرْسَلُونَ﴾ جب ساحران فرعون سے مقابلہ ہوا اور جادو گروں نے اپنی رسیوں کو سانپ کی شکل پر دکھلایا تب بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام ڈر گئے، کہ خدا اس کی خبر دیتا ہے ﴿فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً﴾ آخر خدا نے خوف دور کرنے کے لیے کہا کہ ﴿لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلَى﴾ حالانکہ خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ کر لیا تھا کہ ﴿أَنْتُمْ وَمَنْ اتَّبَعَكُمْ الْغَالِبُونَ﴾ کہ تم اور تمہارے متابعین غالب ہوں گے اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے لشکر سے خوف قتل کا کر کے خدا سے کہا تھا کہ ﴿أَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ﴾ کہ میں ڈرتا ہوں کہ وہ قتل نہ کریں تب بھی خدا نے لَا تَخَفْ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا تو باوجود ایسے وعدہ ہائے الہی کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خوف اور اندیشے کا کوئی محل نہ تھا، پس اگر فقط خوف عدم رضا وعدہ الہی پر ہووے تو ہزار درجہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہو سکتا ہے اور جس قدر شیعیان علیؑ، صدیق اکبرؓ پر طعنہ کرتے ہیں اس سے زیادہ منکرین نبوت پیغمبروں پر طعنہ کر سکتے ہیں۔ (ونعود

کی رات کو بے خوف پیغمبر ﷺ کے بستر پر بفرایغِ خاطر سوتے رہے اگر کچھ بھی خوف ہوتا تو ہرگز ان کو نیند نہ آتی۔“

اور اگر اس پر حضراتِ شیعہ کی خاطر جمع نہ ہو اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر خوف و ترس کے الزام لگانے سے باز نہ آئیں تو ہم ان کے اقرار سے خود پیغمبر خدا ﷺ کا خائف ہونا ثابت کرتے ہیں۔

چنانچہ صاحبِ تَقْلِبِ الْمَكَايِدِ كِيدِ هِشْتَادِ وَهَفْتَمِ كَيْ جَوَابِ مِیْنِ فَرَمَاتِیْ هِیْنِ:
 ((اگر خوفِ قتل و قتال نہ بود پیغمبر خدا ﷺ چرا مخفی
 بیرون رفت و حال آنکہ سببِ ہجرت فرمودن رسول
 خدا ﷺ محض خوفِ قتل بود.))
 ”یعنی اگر خون ریزی کا خوف نہ ہوتا تو پیغمبر خدا ﷺ ہرگز خفیہ طور پر باہر نہ
 جاتے اور حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ہجرت کرنا صرف خوفِ قتل کے
 باعث ہوا۔“

بار خدایا! سمجھ میں نہیں آتا کہ حضراتِ شیعہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حزن و خوف کو کس
 طرح ان کے عدم یقین پر محمول کرتے ہیں جبکہ انبیاء و مرسلین کے حزن و خوف کا خود اقرار
 کرتے ہیں اور خاص سید الانبیاء علیہم السلام کی ہجرت کا سبب محض خوفِ قتل کہتے ہیں.....
 ہمارے عقیدے کے موافق ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے افضل نہ تھے کہ خائف نہ
 ہوتے..... پیغمبر خدا ﷺ سے زیادہ اطمینان ان کو نہ تھا کہ قتل و قتال سے نہ ڈرتے۔ یہ عقیدہ
 تو حضراتِ شیعہ کا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خائف بتلاویں، پیغمبر خدا ﷺ کی نسبت قتل و
 قتال کے خوف سے نسبت دینے کو عیب نہ جانیں، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت خوف کا
 خیال بھی نہ کریں اور ان کے تقیہ کو ہتک آبرو کے خوف کا سبب سمجھیں، جیسا کہ تَقْلِبِ
 الْمَكَايِدِ کا مؤلف لکھتا ہے:

((تقیہ بجہتِ خوفِ ہلاکتِ جانِ خود نبود بلکہ بجہتِ

خوفِ هتك عرض و ناموسش بودہ الیٰ قولہ کہ دانستی کہ خوفِ حضرت امیر المومنین نہ از ہلاکت جان بود بلکہ خوفِ هتك و ناموس .))

”یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی ہلاکت جان کے خوف سے تقیہ نہیں کیا، بلکہ اس لیے تقیہ کیا تا کہ رسول ﷺ کی عزت و ناموس محفوظ رہے..... جیسا کہ تمہیں معلوم ہے کہ امیر المومنین کو اپنی جان کے ہلاک ہونے کا خوف نہ تھا بلکہ عزت و ناموس کا ڈر تھا۔“

غرض کہ ان سب روایتوں کے دیکھنے سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ خوف کا الزام ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر کسی طرح عائد نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ اگر یہ کہا جائے کہ ان کو قتل و قتال کا خوف تھا تو ایسا خوف باقرار علماء شیعہ انبیاء علیہم السلام کو بھی ہوا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ ان کو قتل و قتال کا خوف نہ تھا بلکہ ہتک آبرو کا تھا تو اس کا خوف حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو بھی ہوا ہے جو باعقاد شیعہ سب نبیوں سے افضل اور سب پیغمبروں سے بہتر تھے۔“

الحاصل! قرآن مجید کی آیتیں اور ائمہ کی حدیثیں اور علمائے امامیہ کے اقوال اس پر شاہد ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پیغمبر جو خدا کے خلیل تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نبی جو خدا سے باتیں کیا کرتے تھے اور حضرت سید الانبیاء علیہ التحیۃ و الثناء سے رسول جو خدا کے خاص محبوب تھے اور حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰ سے امام جو پیغمبر کے وصی اور خدا کے شیر تھے اور سب پیغمبروں سے افضل اور بہتر تھے قتل و قتال کے خوف اور عزت و آبرو کے خوف سے ڈر سے محفوظ نہ رہے تو اگر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی خوف اور ترس سے نہ بچے ہوں تو کیا عجب ہے، لیکن ہم کو نہایت تعجب آتا ہے علمائے شیعہ سے کہ انہوں نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایک شب کے خوف پر اس قدر زبان داری کی اور ان کے خوف کو ان کے کفر و نفاق کا نتیجہ سمجھا باوجودیکہ ان کا عقیدہ ہے کہ تمام ائمہ کرام اوّل سے آخر تک پیدائش کے زمانے سے موت کے وقت تک ہر ساعت اور ہر لحظہ خوف میں رہے اور امام اوّل سے لے کر امام آخر الزمان

تک سب کے سب تقیہ کرتے رہے ایک بھی ائمہ اثنا عشر سے ایسا نہیں ہوا جس کی عمر خوف و ترس میں نہ گزری ہو، ایک لحظہ بھی خوف سے مہلت پائی ہو، آخر تقیہ جس کی بنا سراسر خوف پر ہے ایمان کا جزا عظیم قرار دیا گیا اور اَلتَّقِيَّةُ دِيْنِي وَ دِيْنُ اَبَائِي امامت کا کلمہ مقرر کیا گیا۔

پس جبکہ ائمہ کرام باوجود یکہ موت و حیات ان کے ہاتھ میں ہے کہ جب تک چاہیں زندہ رہیں، ملائکہ ان کے حکم میں ہیں کہ جو چاہیں وہ کریں نگاہ میں ان کی وہ تاثیر کہ اگر پہاڑ کی طرف دیکھیں تو وہ بھی پھٹ جائے، بازو میں ان کے وہ قوت کہ اگر ایک ہاتھ اٹھادیں اسی (۸۰) ہزار جن قتل ہو جائیں، علم کا وہ حال کہ جو کچھ ہوا اور ہوگا سب سے آگاہ، اور جو کچھ گزرا اور گزرے گا سب سے واقف، اعجاز کی یہ کیفیت کہ عصا ہاتھ سے گرا دیں اژدہا ہو جائے، کفار اور منافقین کی طرف اشارہ کریں ایک دم میں سب کو نکل جائے، اور پھر باوجود ایسی قدرت اور طاقت اور اعجاز کے تمام عمر خوف اور ترس میں رہیں اور اپنی امامت کا دعویٰ تک نہ کریں، جان و آبرو کے ڈر سے کسی سے سچ بات نہ کہیں، اگر کسی اخص خواص سے کوئی راز کی بات کہنے کو ہوں تو دروازے بند کر لیں، ڈرتے ڈرتے اپنے شاگردوں کو علوم دینی کی تعلیم دیں اور اگر ایک ناصبی سامنے آجائے تو انکار کر جائیں، اپنے مخلص احباب پر لعنت اور تبرا کرنے لگیں اور حضرات شیعہ ان کے خوف و ترس پر کچھ بھی طعنہ نہ کریں اور ان کی امامت و فضیلت پر اس سے کوئی شبہ نہ لائیں بلکہ اس خوف کو بہترین عبادت سمجھیں اور تقیہ کو ائمہ کرام کا دین کہیں اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایک شب کے خوف پر اس قدر زبان دارزی کریں اور ان کے خوف و ترس کو ان کے کفر و نفاق کی دلیل سمجھیں..... باوجود یکہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اختیار میں موت تھی نہ زندگی، نہ ملائکہ ان کے تابع فرمان تھے نہ علم مآکان وَمَا يَكُونُ ان کو حاصل تھا، نہ اسی (۸۰) ہزار جن کے قتل کر دینے کی ان کو طاقت تھی.....

معلوم نہیں حضرات شیعہ نے ائمہ کرام کے خوف میں اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خوف میں مَا بِهِ اَلْاَمْتِيَاَزِ کیا قرار دیا ہے کہ وہی خوف ائمہ کے حق میں فضیلت ہو اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں نقص و عیب۔ مصرعہ.....

بہ میں تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا
 لیکن اگر ہم شیعوں کے عقیدے کے مطابق خوف کو انبیاء علیہم السلام اور ائمہ کی نسبت بہ
 سبب معصوم ہونے ان کے ظاہر سے عدول کریں اور ان آیات کی نسبت جن سے ان کا خوف
 ظاہر ہوتا ہے ”از ظواہر آں عدول می کنیم“ کہیں تو بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا، اس لیے
 کہ علاوہ انبیاء علیہم السلام کے خدا کے کلام سے مومنین کا بھی خائف ہونا ثابت ہوتا ہے.....
 چنانچہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ
 أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ﴾

(حم السجده: ۴۱)

”جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ ہمارا پروردگار ہے اور پھر مضبوط رہتے ہیں، ان پر
 ملائکہ یہ کہتے ہوئے نازل ہوتے ہیں کہ کچھ خوف نہ کرو اور کچھ حزن نہ کرو اور
 اس جنت کی خوشخبری لو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔“
 پس اس سے ان مومنین کا جو اپنے ایمان پر نہایت مضبوط ہوتے ہیں خائف اور محزون
 ہونا ثابت ہوا۔

اور پھر ایک دوسری جگہ پر اللہ جل شانہ، مومنین سے فرماتا ہے: ﴿وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ
 الْأَعْلَوْنَ﴾ ”کہ کچھ غم نہ کرو تمہیں کو غلبہ ہوگا۔“ پس معلوم نہیں کہ ان آیتوں میں جو مومنین
 کی نسبت لفظ لَا تَحْزَنُوا کا ہے یہ بھی ڈانٹ ڈپٹ کے لیے ہے بلکہ یہی فرمائیں گے کہ تسلی
 اور تشفی کے لیے..... تو پھر ہم نہیں سمجھتے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں جو لفظ لَا تَحْزَنُوا کا
 ہے اس کو کس طرح ڈانٹ ڈپٹ کے لیے بیان کرتے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ ایک ہی کلمہ
 لَا تَحْزَنُوا ہزار جگہ تسلی اور تشفی کے لیے استعمال کیا جائے اور ایک جگہ ڈانٹ ڈپٹ کے
 واسطے..... ہاں، اگر کوئی قرینہ عتاب و خفگی کا پایا جاتا تو ہم تسلیم کرتے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ
 کی نسبت کلمہ ﴿لَا تَحْزَنُ﴾ ڈانٹ ڈپٹ کے واسطے ہے، سو وہ بھی نہیں اس لیے کہ جس طرح

مومنین کی نسبت خدا نے فرمایا کہ ﴿لَا تَحْزَنُوا﴾ اور آگے بیان کیا کہ ﴿أُبَشِّرُوا بِالْجَنَّةِ﴾ کہ کچھ غم نہ کرو تمہارے واسطے جنت موجود ہے۔ یا ارشاد کیا کہ ﴿لَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ﴾ کہ کچھ غم نہ کرو تمہیں کو غلبہ ہوگا..... اسی طرح ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بھی پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ ﴿لَا تَحْزَنَنَّ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ کچھ غم نہ کرو خدا ہمارے تمہارے ساتھ ہے۔ پس بظاہر دونوں میں کوئی فرق پایا نہیں جاتا اس لیے اگر ان آیتوں میں ﴿لَا تَحْزَنَنَّ﴾ تسلی اور تشفی کے واسطے ہے تو اس آیت میں بھی تسلی کے لیے ہے اور اگر وہاں ڈانٹ ڈپٹ کے واسطے ہے تو یہاں بھی۔ لیکن باوجود اتحادِ الفاظ اور تطابقِ قرآن کے ﴿لَا تَحْزَنُوا﴾ کو ان آیتوں میں تسلی پر اور یہاں عتاب پر محمول کرنا موجب ہزار حیرت اور باعث صد ہزار تعجب ہے۔

لیکن ہم حضرات شیعہ کو معذور سمجھتے ہیں کہ اگر الفاظ قرآنی سے ان کے حقیقی معنی مراد لیں تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی صدیقیت کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ اگر اقرار کریں تو مذہب ہاتھ سے جاتا ہے، پس بجز اس کے کہ قرآن کی تحریف معنوی کریں اور کلام اللہ کے لفظوں کے نئے نئے معنی بنائیں اور کچھ چارہ نہیں ہے۔ شعر

دست بے چارہ چوں بجاں نہ رسد

چارہ جز پیرہن دریدن نیست

”بے چارہ ہاتھ جب حلقوں تک نہیں پہنچ سکتا تو پیرہن پھاڑنے کے علاوہ کیا

چارہ رہ جاتا۔“

اگر اس پر بھی حضرات کے دلوں میں کچھ خطرہ رہ جائے اور کوئی دانشمند یہ کہنے لگے کہ ہم نے مانا کہ خوف گناہ نہیں اور ﴿لَا تَحْزَنَنَّ﴾ تسلی کا کلمہ ہے، لیکن اتنا تو ثابت ہوا ہی کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پیغمبر ﷺ کے وعدہ اور خدا کی حفاظت پر کامل یقین نہ تھا ورنہ کسی طرح ان کو خوف نہ ہوتا..... اس کا جواب یہ ہے کہ خود حضرات شیعہ کا اقرار ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ بار بار حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر خفا ہوتے تھے اور فرماتے تھے کہ چپ رہو، راز کو فاش نہ

کرو، اور وہ نہ مانتے تھے..... پس شیعوں کی طرح ہر ایک ملحد کہہ سکتا ہے کہ پیغمبر ﷺ کو اپنے خدا کے وعدے پر اور حفاظت پر یقین نہ تھا، ورنہ جو بات افشائے راز کی کرتے تھے، اس سے پیغمبر ﷺ نہ گھبراتے اور بار بار ابوبکر رضی اللہ عنہ پر راز کے فاش کرنے پر خفا نہ ہوتے، پس جو اس ملحد کو حضراتِ شیعہ جواب دیں وہی ہماری طرف سے قبول فرمائیں۔ ❶

لیکن اگر کوئی ذرا بھی غور کرے تو شیعوں کے اصول و عقائد کے موافق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نسبت حزن و خوف کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا، اس لیے کہ اگر وہ اقرار کریں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حقیقت میں خائف تھے تو ہم پوچھتے ہیں کہ ان کو اپنی جان کا اندیشہ اور اپنے اوپر تکلیف پہنچنے کا ڈر تھا یا پیغمبر ﷺ کے ایذا اور مصیبت کا خوف۔ اگر ان کو اپنی جان کا خوف تھا تو یہ قول باطل ہو جاتا ہے کہ وہ دشمنوں سے ملے ہوئے تھے اور راز فاش کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ اگر وہ کافروں سے ملے ہوئے ہوتے تو پھر ان سے ان کو کیا ڈر ہوتا اور اگر کافروں سے ملے ہوئے نہیں تھے بلکہ ان کو کافروں کی طرف سے اپنے اوپر ایذا پہنچنے کا خیال تھا تو اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں..... ایک یہ کہ کفار بہ سبب ایمان اور رفاقت پیغمبر ﷺ کے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ایسی دشمنی رکھتے تھے کہ ان کے قتل کے درپے تھے تو اس سے وہی بات ثابت ہوئی جس کا ہم دعویٰ کرتے ہیں..... دوسرے یہ کہ کبھی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ارادہ راز فاش کرنے کا نہ تھا اس لیے کہ جن لوگوں سے خود ان کو خوف تھا اور

❶ ”گوہر مراد“ میں، جس کا مؤلف بڑا عالم شیعوں کا ہے لکھا ہے کہ پانچ کافروں نے پیغمبر ﷺ سے آکر کہا کہ تا وقت ظہر ترا مہلت دادیم اگر برکشتی از سخن خود ﴿وَالَا قَتْلَنَا﴾ پس آنحضرت بمنزل خود آمدہ در بست و بغایت اندوہناک نشست، جبریل نازل شد و آوردہ کہ ﴿فَاَصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ﴾ آنحضرت گفت کہ اے جبریل چگو نہ باک ندارم با تہدیدیکہ مستہزئین بامن کردند، جبریل گفت ﴿اِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ﴾ حضرت ﷺ گفت الآن نزد من بودند جبرئیل گفت من نیز الآن کفایت ایشاں کردم۔ اس روایت کو دیکھ کر حضراتِ شیعہ انصاف فرمادیں کہ پیغمبر ﷺ کا جان کے خوف سے دروازہ بند کر کے بیٹھ رہنا اور اندوہناک ہونا اور جبرائیل کے اطمینان دینے پر بھی مطمئن نہ ہونا ثابت ہوتا ہے، پس باوجود تصدیق ایسی روایتوں کے نہایت تعجب ہے کہ پھر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے خوف پر طعنہ کریں۔

جن کے ڈر سے غار میں چھپے ہوئے تھے انہیں پر اپنا راز ظاہر کرتے اور اپنے آپ کو معرض ہلاکت میں ڈالتے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خوف پیغمبر ﷺ پر صدمہ پہنچنے کے خیال سے تھا تو یہ خوف ہزار اطمینان سے بہتر ہے اور ایسے عیب پر ہزار ہنر قربان ہیں، اور ایسے خوف کو حضرات شیعہ گناہ کیا اگر کفر بھی سمجھیں مگر ہم ثواب کیا ہزار ایمان سے بہتر سمجھیں گے اور سمجھتے ہیں اور اسی خوف سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پیغمبر ﷺ کی جان اور سلامتی پر یقین کامل تھا مگر جب انہوں نے دیکھا کہ شاہ ہر دوسرا بادشاہ دین و دنیا ایک غارتگ و تاریک میں رونق افزا ہیں اور جس طرح چاند کسی وقت ابر میں چھپ جاتا ہے اسی طرح ماہِ نبوت غار میں چھپا ہوا ہے اور جس کا مقام عرش و کرسی ہے، وہ ایک ننگ جگہ میں قیام فرما ہے تو یہی حالت پیغمبر ﷺ کی ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دل کو پارہ پارہ کرتی تھی اور ان کو بے چین کر رہی تھی..... چنانچہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اوّل خود غار میں جانا اور اس کو صاف کرنا اور سب سوراخوں کو اپنی قبا چاک کر کے بند کرنا اور پھر پیغمبر ﷺ کو بلانا اور اپنے زانووں پر سلانا اس پر شاید ہے اور پھر ایسی دردناک حالت میں جب انہوں نے کفار کو در غار پر دیکھا تو بہ خیال ایذائے پیغمبر ﷺ کے جو کچھ صدمہ ان کے دل پر ہوا ہوگا اس کو وہی جانتے ہیں یا وہ عاشق جانے جس کا معشوق اس کے سامنے کسی ایذا و تکلیف میں مبتلا ہوا ہو، اور دشمن اس پر حملہ آور ہوئے ہوں، اس وقت کوئی اس عاشق مسکین کی کیفیت دیکھے کہ اس کو اضطراب ہوتا ہے یا وہ اطمینان سے بیٹھا رہتا ہے۔ ہاں، جس کو عشق و محبت سے خبر ہی نہ ہو وہ عاشق صادق کے خوف و اضطراب پر طعنہ نہ کرے تو کیا کرے۔

اے بھائیو! ذرا پیغمبر صاحب کے ساتھ محبت پیدا کرو تب جو پیغمبر ﷺ کے جاں نثار تھے ان پر الزام لگاؤ۔ مگر جب تم کو محبت ہی نہیں ہے تو تم اس کی حقیقت کیا جانو۔ قطعہ

تو نازنین جہانے و ناز پروردہ
تراز سوز دردن نیاز ماچہ خبر

چو دل بہ مہر نگارے نہ بستہ ای مہ
 تراز حالت عشاق بے نواچہ خبر
 ”تو نازنین زمانہ نازوں کی پلی ہوئی تجھے نا آزمودہ سوز نہاں کی کیا خبر ہے۔
 اے محبوبہ! جب تو نے کسی عاشق کو دل نہیں دیا تو تجھے کسی عاشق بے نوا کی حالت
 کا کیا پتہ۔“

اے شیعیاں پاک ذرا مہربانی کر کے اپنے شہیدِ ثالث کی مویشگافیوں پر غور کرو کہ ابو بکر
 صدیق رضی اللہ عنہ کے حزن و غم کی نسبت کیا کچھ زبانِ درازی فرمائی اور ((قد ظہر من جزعہ
 وبکائہ مایکون من مثله فساد الحال)) (یعنی ان کی جزع و فزع اور رونے سے
 بدینتی ظاہر ہوتی ہے) کہہ کر ان کی شان گھٹائی مگر وہ تحریر ان کی خاک میں مل گئی اور سب
 تقریر ان کی ﴿هَبَاءٌ اَمْنُشُورًا﴾ ہو گئی۔ آخر انہی باتوں پر خیال کر کے اصلی خوف اور حزن
 سے انکار فرمایا اور اس کو تصنع اور بناوٹ پر محمول کیا۔

اہل انصاف سے امید ہے کہ ذرا دل لگا کر اس کو بھی سنیں اور جو کچھ سحر بیانی اور جادو
 زبانی حضرات امامیہ نے اس بیان میں کی ہے اس پر احسنت اور آفریں کہیں اور اس کا کچھ
 خیال نہ کریں کہ ایک دعوے کو چھوڑ کر دوسرا دعویٰ کیوں کرتے ہیں اور ایک امر کا اقرار کر کے
 اس سے منکر کیوں ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ امر اسی خاص بحث کے لیے مخصوص نہیں ہے
 بلکہ ہر کلیہ اور ہر جزئیہ میں اس شان کا ظہور ہے۔ ابھی کیا ہے جب خلافت و امامت کے
 مباحث آئیں گے تب دیکھنا کہ یہ حضرات کیسا رنگ بدلتے ہیں اور کیسے نئے نئے گل بوٹوں
 سے تقریروں کو زینت دیتے ہیں۔ شعر

شاہد دلربائی من میکند از برای من

نقش و نگار و رنگ و بوتازہ بتازہ نوبہ نو

”دلربا معشوق ہمارے لیے نئے نئے تازہ بہ تازہ رنگ و بو اور نقش و نگار بنا رہا ہے۔“

جب حضرات امامیہ نے دیکھا کہ حزن و خوف کے اثبات سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی

پیغمبر ﷺ صاحب کے ساتھ محبت ثابت ہوتی ہے تب اس دعویٰ کو چھوڑ کر یہ دعویٰ کیا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کو کچھ خوف نہ تھا بلکہ راز کو فاش کرنے کے واسطے جزع و فزع کرتے تھے، جیسا کہ ”رسالہ حسینہ“ میں لکھا ہے:

((غو غایش از جزع و فزع و فریاد برائے آن بود کہ مشرکان

را اطلاع گرداند و آنہا بدانند کہ دریں غار ست .))

”یعنی خوف کے مارے ان کا رونا چلانا، اس لیے تھا کہ مشرکوں کو خبر ہو جائے کہ

اس غار میں ہیں۔“

اور خضر مشہدی نے لکھا ہے:

((وایضاً مما اشتہر من لدغ الحیة ایاہ انما کان یمد رجلہ

یرید اظہار امرہ .))

”کہ سانپ کے کاٹنے کی بات جو مشہور ہے وہ دراصل اپنے پیر کو باہر نکال کر

راز کھولنا چاہتے تھے۔“

یعنی جب ابو بکر رضی اللہ عنہ کا کام رونے پینے سے بھی نہ نکلا تو پاؤں بڑھا دیا کہ اسی کو دیکھ کر کفار غار کے اندر چلے آئیں، تب خدا نے سانپ کو حکم دیا تو اس نے ان کے پاؤں میں کاٹا، تب بہ مجبوری پیغمبر ﷺ کا راز فاش ہونے سے بچا۔

اس کے جواب میں تو ہماری زبان سے کوئی بات بھی نہیں نکل سکتی، اور ایسی حکیمانہ تقریر کی تردید ہم سے ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر مشرق سے مغرب تک تمام انسان اور جن جمع ہوں تب بھی کسی سے یہ عقدہ حل نہیں ہوگا، فی الحقیقت جو صاحب تَقْلِیْبُ الْمَکَائِدِ نے اپنے بزرگوں کی تقریر نقل نہ کرنے پر مولانا صاحب قدس ^۱ اللہ سرہ پر غصہ کیا ہے وہ نہایت ہی بجا

^۱ صاحب تَقْلِیْبُ الْمَکَائِدِ نے خاتم المحدثین پر یہ طعن کیا ہے کہ اپنی طرف سے تقریر بنا کر اپنے طور پر جواب دینا ان کی عادت ہے، اس کا حال شہید ثالث کی عبارت دیکھنے والوں پر کھل جائے گا، لیکن ہم دعویٰ کر کے کہتے ہیں کہ اپنی طرف سے تقریر بنانا اور اس کا جواب دینا بلکہ اس جواب نا معقول کو صاحب الامر کی طرف ⇐ ⇐ ⇐

تھا، اگر وہ ان تقریروں کو نقل کر دیتے اور بلفظ ان عبارتوں کو لکھ دیتے تو امامیہ کی حقیقت میں پھر کسی کو کیا کلام رہتا اور پھر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت کو کوئی کس طرح ثابت کرتا..... اے یارو! انصاف کرو اور حضراتِ امامیہ کے مجتہدین کی غزارت (کثرت) علم پر لحاظ فرماؤ کہ جو بات ہے وہ حکیمانہ، جو قول ہے وہ محققانہ۔

﴿﴾ ﴿﴾ ﴿﴾ منسوب کرنا امامیہ کے محدثین و مجتہدین کا شعار ہے، چنانچہ اسی آیت غار کی نسبت ملا باقر مجلسی نے ”رسالہ رجعیہ“ کی حدیث ششم میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہمارے دعویٰ پر شاہد ہے و ہو ہذہ حدیث ششم شیخ صادق محمد بن بابویہ قمی از اکابر محدثین رضوان اللہ علیہم اجمعین از سعد بن عبداللہ قمی روایت کردہ اند کہ او گفت روزے مبتلا شدم بمباحثہ بدترین نواصب و بعد از مناظرات بسیار گفت وائے بر تو و اصحاب تو شما روافض مهاجران و انصار طعن میکنند و انکار محبت پیغمبر نسبت بایشان می نمائید اینکہ ابوبکر بسبب زود مسلمان شدن از ہمہ صحابہ بہتر بود و از بسکہ پیغمبر اور ادوست می داشت در شب غار اور ابا خود برد چونکہ میدانست کہ او بعد آنحضرت خلیفہ خواہد بود کہ مبادا او تلف شود حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب بر جائے خود خوابانید برائے آنکہ میدانست کہ اگر کشتہ شود ضرری با مور مسلمانان نمیرسد الیٰ قولہ کہ از جواب او ساکت شدم و دیگر برگشتم و طومارے نوشتم و این دو مسئلہ رانیز درج کردم کی بخدمت حضرت امام حسن عسکری صلوات اللہ علیہ بفریسم با احمد بن اسحاق کہ و کیل آنحضرت بود رفتم چون اور اطلب کردم گفتند متوجہ سرمن رای ست من از عقب او رواں شدم و باور رسیدم الیٰ قولہ کہ بعد ازاں صاحب الامر باعجاز فرمود کہ ای سید خصم تو میگفت کہ حضرت رسول ابوبکر برای شفقت بغار برد چونکہ میدانست کہ او خلیفہ ست مبادا کشتہ شود چرا در جواب نہ گفتی کہ شماروایت کردہ اید کہ پیغمبر فرمود کہ خلافت بعد از من سی سال خواہد بود این سی سال را بعمر چہار خلیفہ قسمت کردہ اید پس بگماں قصد شما این چہار خلیفہ برحق اند پس اگر این معنی باعث بردن بغار بود مناسب کہ ہمہ ربا خود بغار برد۔ فقط اب کوئی شخص اس مجلسی کے مقلدین سے پوچھے کہ یہ شیخ صدوق صاحب کی بناوٹ ہے یا ملا باقر مجلسی صاحب کی تہمت، اس لیے کہ کسی اہل سنت نے اب تک یہ دعویٰ نہیں کیا کہ پیغمبر ﷺ ابوبکرؓ کو ان کے مارے جانے کے خیال سے غار میں لے گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چھوڑ گئے اور اگر یہ کہا جائے کہ مراد نواصب سے خارجی دشمن اہل سنت ہیں شاید انہوں نے یہ اعتراض کیا ہو تو وہ بھی بعید از قیاس ہے، اس لیے کہ حضرت علیؓ کو خلیفہ برحق نہیں مانتے تو یہ فرمانا امام صاحب الامر کا کہ تم چاروں خلیفوں کو برحق سمجھتے ہو، ہموقع اور غلط ہوا جاتا ہے اور امام صاحب کا باوجود ہونے عالم ماکان و مایکوں کے خوارج کے عقیدے سے بے خبر ہونا ثابت ہوتا ہے پس کوئی صاحب تَقْلِبُ الْمَكَائِدُ کی اولاد اور احفاد اور مریدین سے پوچھے کہ بناوٹ اسے کہتے ہیں جو ان کے شیخ صدوق و مجلسی نے کی یا اسے کہتے ہیں جو خاتم المحدثین نے کی، افسوس! ان بے خبروں کے حال پر کہ اپنے گھر کے شوستری اور مفتری کے افتراء سے تو بے خبر ہیں اور اوروں پر طعن کرتے ہیں۔ ۱۲ منہ عفاعنہ۔

نواں اعتراض نویں فضیلت پر:

اوپر ہم نے بیان کیا ہے کہ جب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ غمگین اور محزون ہوئے اور ان کو کسی قدر اضطراب ہوا تب اللہ جل شانہ نے اپنی تسلی ان پر نازل کی جس کا بیان خدا نے ان لفظوں سے فرمایا ہے ﴿فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ﴾ (التوبہ: ۴۰) اس پر حضرات امامیہ چند طرح سے اعتراض کرتے ہیں۔

اوّل یہ کہ علیہ کی ضمیر پیغمبر خدا ﷺ کی طرف راجع ہے نہ کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف۔ اس لیے اس کے یہ معنی ہیں کہ نازل کی تسلی خدا نے اپنی اوپر پیغمبر ﷺ کے۔“

جواب اس کا یہ ہے کہ حزن اور خوف تو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو تھا نہ کہ پیغمبر خدا ﷺ کو..... پس اگر علیہ کی ضمیر پیغمبر خدا ﷺ کی طرف راجع ہو تو آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ جب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خوف اور اضطراب ہوا پیغمبر ﷺ نے ان سے کہا کہ غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے، پس خدا نے اپنی تسلی پیغمبر رضی اللہ عنہ پر نازل کی..... اس بے جوڑ اور بے ربط عبارت کو دیکھ کر کون شخص ہے جو نہ ہنسے گا اور کس کو اس پر تعجب نہ ہوگا کہ خوف اور اضطراب تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ہوا اور پیغمبر خدا رضی اللہ عنہ ان کی تشفی کریں اور خدا کی تسلی پیغمبر ﷺ پر نازل ہو۔

اگر حضرات امامیہ یہ فرمائیں کہ پیغمبر خدا ﷺ کو بھی خوف تھا، اس لیے خدا نے ان پر تسلی نازل کی۔ اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ حضرات امامیہ جب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر خوف کے سبب سے جن اور نامردی کا طعنہ کرتے ہیں تو پھر اب اسی خوف کو کس منہ سے حضرت کی طرف منسوب کرتے ہیں..... اور اگر ہم حضرت کا خائف ہونا تسلیم کر لیں اور واسطے ازالہ خوف حضرت کے تسلی کا نزول حضرت پر قبول کریں تو آیت کی عبارت لائق اصلاح معلوم ہوتی ہے، یعنی بجائے ان لفظوں کے جو خدا نے فرمائے کہ ﴿إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ﴾ (التوبہ: ۴۰) اس طرح پر الفاظ آیت کے ہونے چاہئیں تھے کہ ﴿فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ فَقَالَ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ﴾ کہ پہلے خدا نے اپنی تسلی حضرت پر نازل فرمائی اور جب حضرت کو اطمینان کامل

ہو گیا تب حضرت نے ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ کچھ غم نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے۔ ورنہ آیت کے لفظوں سے تو یہ معنی جو حضرات شیعہ کہتے ہیں نہیں بنتے..... اس لیے کہ پہلے الفاظ سے صاف یہ معنی ظاہر ہوتے ہیں کہ پیغمبر خدا ﷺ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو محزون دیکھ کر فرمایا کہ ﴿لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ کہ کیوں محزون ہوتے ہو خدا ہمارے ساتھ ہے..... پس حضرت کے اس کہنے سے خدا نے اپنی تسلی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پر نازل کی تاکہ ان کا حزن و غم جاتا رہے۔

پس اے یارو! سوچو کہ آیت کے معنی اس طرح پر بنتے ہیں جو ہم کہتے ہیں یا اس طرح پر جو تم کہتے ہو۔

دوسرا یہ کہ اللہ جل شانہ کو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر تسلی نازل کرنا اگر منظور ہوتا تو ضرور پیغمبر خدا ﷺ کا ذکر کر کے ابو بکر کا ذکر کرتا۔ اس لیے کہ خدا نے بغیر شرکت رسول کے کبھی کسی پر تسلی نازل نہیں کی۔ چنانچہ قاضی نور اللہ شوستری نے اس تقریر کو در ضمن حکایات مفیدہ شیخ مفید کے نہایت آب و تاب سے لکھا ہے، اور اس تقریر کو ”عسیر الجواب“ سمجھ کر یہ فرمایا:

((چوں این سخن را گوشِ ناصباں شنید باعثِ حیرت ایشاں

گردید و در حیلہ خلاصی ازاں جان ایشاں بلب رسیدہ .))

”جب سنتوں کے کان میں یہ باتیں پڑیں تو ان کو حیرانی ہوئی اور اس سے جان

بچانے کے لیے ان کی جان لبوں پر آگئی۔“

صاحبِ تَقْلِيبُ الْمَكَائِدُ نے اس کو اپنی کتاب میں بلفظ نقل کر کے اس پر بڑا ناز کیا

ہے، چنانچہ اس عبارت کو ہم بلفظ لکھتے ہیں اور اہل انصاف سے التماس کرتے ہیں کہ ذرا غور

کریں کہ قاضی صاحب نے اپنی صدفِ طبیعت سے کیسے جھوٹے موتی نکال کر اپنے مقلدین

کے نذر کیے ہیں اور وہ بھی ان کو گوہر گراں بہا سمجھ کر دُرَّةُ التَّاجِ بنائے ہوئے ہیں۔ کوئی

آنکھ کھول کر نہیں دیکھتا کہ ان کے موتی جھوٹے ہیں یا سچے۔ وھو ہذہ:

((آنچه کاشفِ صحت بیان مذکور تو اند بود آنست کہ

مقدمان مشائخ ما رضوان اللہ علیہم افادہ فرمودہ اند کہ خدائے تعالیٰ ہرگز در ہیچ جای کہ یکے از اہل ایمان با حضرت پیغمبر بودہ اند انزال سکینہ نہ نمود الا آنکہ نزول آن را شامل جمیع ایشان داشتہ چنانچہ در بعضے آیات فرمودہ ﴿وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبْتُمْ كَثْرَتَكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحَبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُدْبِرِينَ ثُمَّ أَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ﴾ و در آیہ دیگر گفتہ ﴿فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ﴾ (الفتح: ۲۶) و چون با آنحضرت غیر از ابوبکر در غار نبود لاجرم خدای تعالیٰ آنحضرت را در نزول سکینہ منفرد ساخت و اور با آن مخصوص گردانید و ابوبکرؓ را باو شرکت نداد و گفت ﴿فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَمْ تَرَوْهَا﴾ (التوبہ: ۴۰) پس اگر ابوبکر مومن می بود بایستے کہ خدای تعالیٰ دریں آیہ او را جاری مجری مومنان می نمود و در عموم سکینہ داخل می فومود الیٰ قولہ بنابر این نزول سکینہ مخصوص او شدہ باشد و ابوبکرؓ بواسطہ ایمان از فضیلت سکینہ محروم ماندہ باشد و ایضاً بہ نصّ قرآنی با دارد ازاں کہ در آیہ غار سکینہ بر غیر رسولؐ باشد .))

”ہمارے مذکورہ بیان کی صحت کو ظاہر کرنے والی بات یہ ہے کہ ہمارے قدیم مشائخ نے ان آیات کے لیے فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جب کوئی مسلمان ہوا تو اللہ نے آپ پر سکینت نازل نہیں فرمائی مگر یہ کہ اس کا نزول سب کو عام رہا ہے، جیسا کہ بعض آیات میں کہا کہ جنگ حنین میں جب کفار کی

کثرت سے تم حیرت میں پڑ گئے تھے تم پر زمین تنگ کر دی گئی، تم اٹے پاؤں لوٹ گئے پھر اس کے بعد اللہ نے رسول اکرم ﷺ اور مومنین پر تسلی نازل کی..... اور دوسری آیت میں کہا ہے کہ اللہ نے رسول اکرم ﷺ اور مومنین پر تسلی نازل کی، اور چونکہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غار میں ابو بکرؓ کے سوا کوئی نہ تھا، اس لیے اللہ نے رسول اکرم ﷺ پر انفرادی طور سے سیکنہ نازل فرمایا اور آپ کو خاص طور پر تسلی دی اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اس سیکنہ و سکون دہانی میں شامل نہیں کیا اور کہا کہ ”اللہ نے آپ ﷺ پر تسلی نازل کی اور آپ کی غیر مرئی لشکر کے ذریعے مدد کی۔ پس اگر ابو بکر رضی اللہ عنہ مومن ہوتے تو اللہ تعالیٰ ان کو دوسرے مسلمان کا قائم مقام بنا کر نزول سیکنہ میں عمومیت دیتا۔ خلاصہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کو تسلی خاص طور پر دی گئی اور ابو بکر رضی اللہ عنہ مومن نہ ہونے کی وجہ سے فضیلت سیکنہ و تسلی سے محروم رہے اور غیر رسول پر غار میں سیکنہ کا نزول (اترنا) احکام قرآنی کے بھی خلاف ہے۔“

اس ساری تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا نے جہاں مومنین پر تسلی نازل کی ہے تو وہاں پہلے رسول پر نازل کی ہے اور اس کے بعد مومنین پر، کسی جگہ فقط مومنین پر تسلی نازل نہیں کی، تو کیوں کر ممکن ہے کہ غار میں پیغمبر ﷺ کو چھوڑ کر فقط ابو بکر رضی اللہ عنہ پر تسلی نازل کی ہو..... پس اس آیت سے ابو بکر رضی اللہ عنہ کا عدم ایمان ثابت ہوا، اس لیے کہ اگر وہ باایمان ہوتے تو بشمول پیغمبر ﷺ کے ضرور ان پر بھی تسلی نازل کرتا۔

لیکن یہ دعویٰ قاضی صاحب کا اور ان کے مشائخ کا کہ یہ امر خلاف نص قرآنی کے ہے کہ تسلی فقط مومنین پر خدا نازل نہیں کرتا، محض غلط ہے کسی آیت سے صراحتاً کیا کنایتاً بھی تو یہ بات نہیں پائی جاتی کہ تسلی سوائے پیغمبر کے دوسرے پر تنہا نازل نہیں ہوئی اور اگر دو چار جگہ مومنین پر بشمول نبی و رسول کے تسلی نازل کرنے کا ذکر آیا ہے تو اس سے انکار نزول تسلی سے بلاشمول نبی کے مومنین پر لازم نہیں آتا۔ پس اگر فرض کیا جائے کہ کسی جگہ قرآن میں نزول

سکینہ کا ذکر فقط مومنین پر نہ ہوتا تب بھی یہ اعتراض درست نہ تھا نہ کہ خدا کے فضل سے سکینہ کا نزول فقط مومنین پر بلا شمول رسول کے ہونا قرآن مجید میں مذکور ہے، مگر حضرات امامیہ میں سلفاً عن خلف کوئی حافظ قرآن تو ہوا ہی نہیں اور شاید قاضی صاحب نے اور ان کے مشائخ کرام نے از اوّل تا آخر تمام عمر میں قرآن مجید کو ایک مرتبہ دیکھا تک نہیں ورنہ اس زور سے انکار نہ کرتے اور اس شد و مد کے ساتھ یہ نہ فرماتے:

((خدای تعالیٰ ہرگز درھیچ جائیکہ یکے از اہل ایماں با

حضرت بودہ اندر انزال سکینہ نہ نمود .))

”جب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کوئی مسلمان ہوا تو اس مقام پر اللہ نے سکینہ

نازل نہیں فرمائی۔“

چنانچہ اب ہم حضرات امامیہ کو نشان دیتے ہیں کہ نزول سکینہ تنہا مومنین پر بلا شمول پیغمبر ﷺ کے سورہ اِنَّا فَتَحْنَا فِيں دو مقام پر مذکور ہے، اگر شک ہو تو قرآن مجید میں سے اس سورت کو نکال کر دیکھ لیں کہ اللہ جل شانہ پہلے رکوع میں فرماتا ہے: ﴿هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزِدَّا دُؤَابَانَا مَعَ إِيْبَانِهِمْ﴾ (الفتح: ۴) اور پھر تیسرے رکوع میں ارشاد کرتا ہے کہ ﴿إِذْ يَبَايَعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ﴾ (الفتح: ۱۸) پس اے مومنین! ذرا غور سے ان آیتوں کو پڑھو اور دس بیس قرآنوں کو ملاؤ کہ کسی میں یہ تو نہیں لکھا ہے کہ ﴿هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ رَسُولِهِ وَقُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ يَا أَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَيْهِمْ﴾ اگر عرب سے عجم تک ہند سے ایران تک کسی قرآن میں عَلٰی رَسُولِهِ کا لفظ ہو تو تم سچے، تمہارے قاضی سچے اور اگر کسی میں یہ لفظ نہ ہو اور ایران اور کوفہ کے قرآنوں میں بھی ﴿فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ﴾ لکھا ہو تو پھر تم ہی انصاف کرو کہ تم اور تمہارے قاضی اور ان کے متقدمین و مشائخ جھوٹے ہیں یا سچے؟

اے یارو! فسوس کی بات ہے کہ صد ہا برس گزر گئے کہ یہ مباحثہ ہو رہا ہے اور آج تک

کسی نے سورۃ الفتح کو نکال کر بھی نہ دیکھا اور ﴿فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ﴾ پر خیال نہ کیا اور اب تک انہیں قاضی صاحب کے جھوٹے قول پر ناز ہے اور ان کی فضیلت و قابلیت پر افتخار ہے اور سب سے زیادہ افسوس اس پر ہے کہ حضرات امامیہ جن میں سے دو چار ہی ایسے شخص نکلے گئے جن کو قرآن کی سورتوں کے نام بھی یاد ہوں اور دو ایک ہی ایسے ہوں گے جن کو اِنَّا أَنْزَلْنَاهُ أَوْ قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ کے سوا کلام اللہ کے دو چار رکوع حفظ ہوں، ورنہ خدا کے فضل سے سب کے سب قرآن شریف سے بے خبر، کلام اللہ سے ناواقف اور بائیں ناواقفیت یہ شوخی کہ اہل سنت و جماعت کے مقابلہ میں قرآن شریف کی سند پیش کرتے ہیں جن کی زبان پر ایک ایک لفظ قرآن مجید کا اور جن کے دل میں ایک ایک حرف کلام اللہ کا لکھا ہوا ہے..... پس یہ غلطی قاضی صاحب اور ان کے مشائخ کبار سے قرآن مجید کی ناواقفیت سے ہوئی ہے، اس لیے ہم ان کو معذور سمجھتے ہیں اور ان کی غلطی سے درگزر کرتے ہیں۔

تیسرا اعتراض..... اگر علیہ کی ضمیر ﴿فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ﴾ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف راجع ہو تو تخلل فی الضمائر لازم آتا ہے، اس لیے کہ پہلی جتنی ضمیریں اَخْرَجَهُ اور لِصَاحِبِهِ وغیرہ میں ہیں وہ سب رسول کی طرف راجع ہیں اور پھر آگے جو ضمیر اَيْدَاً میں ہے وہ بھی پیغمبر ﷺ کی طرف راجع ہے تو کیوں کر ممکن ہے کہ بیچ میں عَلِيهِ کی ضمیر ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف راجع ہو؟

جواب اس کا یہ ہے کہ اوّل تو ضمیر کا عود (لوٹنا) چاہیے کہ اقرب مذکورات کی طرف ہو، سو اس مقام پر ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں، اس لیے کہ انہی کی طرف لِصَاحِبِهِ کا اشارہ ہے۔ دوسرے تخلل ضمیر جب ہو کہ اَيْدَاً عطف ہو فَاَنْزَلَ اللَّهُ پر، حالانکہ وَاَيْدَاً عطف ہے فَقَدْ نَصَرَا اللَّهُ پر، پس تخلل ضمائر بھی واقع نہ ہوا..... تیسرے تخلل ضمائر تو قرآن مجید میں اکثر جگہ ہے جیسا کہ ﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ وَإِنَّهُ عَلَىٰ ذَلِكٍ لَّشَهِيدٌ﴾ میں ہے..... پس جو اعتراض نزول سکینہ کا ابوبکر رضی اللہ عنہ پر تھا، رد ہوا اور بفضلہ تعالیٰ ابوبکر رضی اللہ عنہ پر تشفی کا نازل ہونا ثابت ہوا اور جو کچھ قاضی اور ملاً صاحب اور ان کے مشائخ و مقلدین نے لکھا پڑھا تھا وہ

سب باطل ہوا اور اس کی بیہودگی اور سفاہت کا حال بھی سب پر کھل گیا۔ اور نہ فقط ہم اہل سنت ان اعتراضات کو بیہودہ سمجھتے ہیں بلکہ بعض حضرات امامیہ بھی کبھی اس کی سفاہت کا اقرار کرنے لگتے ہیں، جیسا کہ صاحب مجمع البیان طبرسی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے:

((وَقَدْ ذَكَرَتِ الشَّيْعَةُ فِي تَخْصِيصِ النَّبِيِّ فِي هَذِهِ الْآيَةِ
بِالسَّكِينَةِ كَلَامًا رَأَيْنَا الْإِضْرَابَ عَنْ ذِكْرِهِ أُخْرَى لِنَلَّا
يَنْسِبْنَا نَائِبًا إِلَى شَيْءٍ .))

”شیعوں نے اس آیت میں تسلی کو پیغمبر صاحب کے ساتھ مخصوص ہونے پر ایسی باتیں لکھی ہیں کہ ہم ان کا نہ لکھنا ہی مناسب سمجھتے ہیں تاکہ کوئی کہنے والا ہم کو بھی کچھ نہ کہنے لگے۔“

پس اس علامہ کے ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ وہ باتیں جو شیعہ ذکر کرتے ہیں ایسی پوچ اور بیہودہ ہیں کہ ان کو بیان کرنے سے اُسے شرم آتی ہے۔

غرض کہ اب اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ ان آیتوں سے وہ فضائل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ثابت ہوتے ہیں جو اوپر ہم نے بیان کیے اور جو اعتراضات شیعوں کے ہیں وہ بالکل پوچ اور بیہودہ ہیں، اور سیاق آیت بھی اسی پر شاہد ہے۔ اس لیے کہ اگر ان آیتوں میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ذکر کرنے سے ان کی رفاقت اور نصرت کا بیان منظور نہ ہوتا تو یہ کوئی موقع ان کے نفاق کے اظہار کا نہ تھا کہ یہ بات خود حضرات امامیہ جانتے ہیں اور دل میں سمجھتے ہیں مگر صرف اپنے مذہب کے تعصب کے سبب سے ایسی صریح اور صاف آیت سے انکار کرتے ہیں اور باوجود کھل جانے امر حق کے فضیلت افضل الصحابہ رضی اللہ عنہم کا اقرار نہیں فرماتے ہیں اور اپنے آپ کو ایسی آیات کے انکار سے مستحق جہنم بناتے ہیں۔ (نَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِهِمْ وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِهِمْ).



ائمہ کرام کی شہادتیں صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت میں

پہلی حدیث:

شیعوں کی کتابوں میں بروایت ائمہ کرام علیہم السلام منقول ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے

فرمایا:

((اصحابی کالنجوم بایہم اقتدیتم اہتدیتم .))

”میرے اصحاب مثل ستاروں کے ہیں ان میں سے جس کسی کی پیروی کرو گے

ہدایت پاؤ گے۔“

نیز حضرت نے فرمایا ہے کہ ((دعوالی اصحابی)) کہ میرے صحابہ گو میرے لیے

چھوڑو۔ یعنی میرے حقوق صحبت کی ان کے حق میں رعایت کرو اور ان کی عیب جوئی نہ کرو۔“

ان دونوں حدیثوں میں سے کچھلی حدیث کی صحت لفظاً و معناً علمائے امامیہ کے نزدیک

مسلم ہے اور صاحب استقصاء الافحام نے اس کو قبول کیا ہے، لیکن پہلی حدیث کی نسبت کچھ

کلام ہے، اس لیے ہم کچھلی حدیث کی نسبت صرف یہی کہتے ہیں کہ جب اس کی صحت پر

اقرار ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس پر عمل نہیں کرتے اور جو پیغمبر ﷺ نے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم

کے حق میں فرمایا ہے اسے نہیں مانتے، حقوق صحبت پیغمبر ﷺ کی ان کے حق میں کیوں

رعایت نہیں کرتے اور کس لیے ان کی عیب جوئی سے باز نہیں آتے اور کس لیے باوجود سفارش

پیغمبر ﷺ کے ان کی دشمنی ترک نہیں کرتے..... اور پہلی حدیث ((اصحابی کالنجوم))

کی نسبت ہم ائمہ کرام کے اقوال کو امامیہ کی کتابوں سے نقل کر کے اس کی صحت ثابت کرتے

ہیں اور علمائے امامیہ نے جو تاویلات اور تحریفات لفظی و معنوی کیے ہیں ان کو ظاہر کر کے ان کا بطلان ثابت کرتے ہیں..... واضح ہو کہ عیونُ الْأَخْبَارِ میں جو معتمدین کتب امامیہ سے ہے لکھا ہے:

((حدثنا الحاكم ابى على الحسن بن احمد البيهقى قال حدثنا محمد بن يحيى الصولى قال حدثنا محمد بن موسى بن نصر الرازى قال حدثنى بى قال سئل الرضا عليه السلام عن قول النبى صلى الله عليه وآله وسلم اصحابى كالنجوم بايهم اقتديتم اهتديتم و عن قوله دعوالى اصحابى فقال هذا صحيح .))
 ”ایک شخص نے امامیہ موسیٰ رضا علیہ السلام سے پوچھا کہ پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا ہے کہ میرے اصحاب مثل ستاروں کے ہیں ان میں سے جس کسی کی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ چھوڑو میرے واسطے میرے صحابہؓ کو تو امام موصوف نے فرمایا کہ یہ صحیح ہے۔“

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حدیث ((اصحابی كالنجوم)) جن لفظوں سے کتب اہل سنت میں منقول ہے انہی لفظوں سے کتب امامیہ میں مذکور ہے اور امام موسیٰ رضا علیہ السلام کی زبان سے۔ اس کی صحت پر علمائے امامیہ کو اقرار ہے۔ اور نہ صرف اسی ایک روایت سے اس کا ثبوت ہوتا ہے بلکہ اور بھی بہت سی اس کی مؤید روایتیں کتب امامیہ میں موجود ہیں کہ ان کے ملاحظہ کے بعد کسی شیعہ کی مجال نہیں کہ اس حدیث کی صحت سے انکار کر سکے یا اس کو موضوع کہہ سکے یا اس کو خبرا حاد کہہ کر اپنا پیچھا چھڑا لے، اس لیے کہ شیخ ❶

❶ (شیخ صدوق) نام ابو جعفر محمد بن علی بن حسن بن بابویہ قمی اور لقب صدوق ہے، چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں پیدا ہوئے۔ ان کا شمار شیعوں کے اکابرین اور بڑے محدثین میں ہوتا ہے۔ ان کی کتاب ”من لایحضرہ الفقیہ“ ان چار کتابوں میں سے ایک ہے جو شیعہ حضرات کے ہاں حدیث کی اہم اور صحیح ترین کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کی متعدد تصنیفات ہیں جنہیں مصادر کی حیثیت حاصل ہے۔ شیعوں کا کہنا ہے کہ اہل قم میں سے ان کا جیسا حافظہ اور وسیع علم کسی کا نہیں ۳۸۱ھ میں وفات پائی اور بمقام ”رے“ دفن ہوئے۔ ۱۲ (شیخ محمد فراست)

صدوق نے ”معانی الاخبار“ میں اور علامہ طبرسی نے ”احتجاج“ میں اور ملا باقر مجلسی نے ”بحار الانوار“ میں اور ملا حیدر آملی اثنا عشری نے ”جامع الاسرار“ میں اس حدیث کے مضمون کی صحت پر اقرار کیا ہے۔ پس تعجب ہے علمائے متقدمین امامیہ پر کہ جب تک علمائے اہل سنت نے اس حدیث کو خود ان کی کتابوں سے نکال کر نہ دکھلایا اور اس کی صحت کو امام کے قول سے ثابت نہ کر دیا تب تک انہوں نے اس حدیث کی صحت پر کیا شور و غل مچایا اور اس کی موضوعیت اور بطلان کے اثبات میں دفتر کے دفتر سیاہ کیے یہاں تک کہ قاضی نور اللہ شوستری نے کس شدومد سے ”اتحاق الحق“ میں فرمایا ہے:

((اما مارواه من حدیث اصحابی كالنجوم ففیہ من اثار

الوضع والبطلان مما لا یخفی .))

”اس حدیث ”اصحابی کالنجوم“ کے موضوع اور باطل ہونے کے آثار

پائے جاتے ہیں جو پوشیدہ نہیں۔“

لیکن افسوس ہے کہ قاضی صاحب نے یہ خیال نہ فرمایا کہ جس حدیث کی موضوعیت کا دعویٰ اس شدومد کے ساتھ کرتے ہیں وہ خود ہماری حدیث کی کتابوں میں منقول ہے اور جس کے بطلان کا الزام اہل سنت پر لگاتے ہیں وہ بروایت ائمہ کرام ہمارے اصول کے مطابق ثابت ہے، ہاں اتنا فرق ہے کہ سنی بچاروں کے راوی ضعفاء اور مجاہیل ہیں اور خود بدولت کے یہاں راوی ائمہ کرام ہیں۔ پس اگر سنیوں کے طور پر روایت کی ہوئی حدیث کو غلط کہہ دیا یا خود سنیوں نے اپنے طور پر راویان حدیث کو ضعیف تصور کیا تو کچھ حرج نہیں، اگر قاضی صاحب نے یا کسی اور صاحب نے اس حدیث کو موضوع بتلایا اور باوجود تصدیق امام موسیٰ رضا علیہ السلام کے اس کو جھٹلایا تو اس نے اپنا دین ہی غارت کیا اور امام کی تکذیب کر کے اپنے آپ کو دائرۃ ایمان سے خارج کیا۔“

اب ہم ان تحریفات کو بیان کرتے ہیں جو علمائے امامیہ نے اس حدیث کو نسبت بیان

کی ہیں:

عُيُونِ أَخْبَارٍ سَے جو حدیث ہم نے اَصْحَابِي كَمَا لِنُجُومِ كِي نقل كِي هے اس ميں ان الفاظ كے بعد يہ عبارت بڑھائی هے: يُرِيدُ مَنْ لَمْ يُغَيِّرْ بَعْدَهُ وَلَمْ يُبَدِّلْ... الخ¹ كه مراد ان اصحاب سے جو حدیث ميں مذکور هیں وه هیں جنهوں نے كچھ تغیر و تبدیلی نهیں كی، پوچھنے والے نے امام سے پوچھا كه يا حضرت هم كیسے جانیں كه اصحاب نے كچھ تغیر و تبدیلی كی هے، تب امام نے جواب دیا كه خود پیغمبر ﷺ كی حدیث موجود هے كه حضرت ﷺ نے فرمایا كه كچھ لوگ ميرے اصحاب سے قیامت كے دن حوض كوثر سے علیحدہ كر لیے جائیں گے۔ تب ميں كهوں گا كه خدا يا يہ ميرے اصحاب هیں۔ تب اللہ جل شانہ فرمائے گا كه تو نهیں جانتا كه انهوں نے تیرے پیچھے كیا كیا اور وه دوزخ كی طرف كھینچ لیے جائیں گے، تب ميں كهوں گا دور هو، دفع هو۔

ان الفاظ كے بڑھانے سے يہ غرض هے كه بعض اصحاب به سبب ارتداد كے حدیث كے مصداق سے خارج هو جائیں..... ليكن تب بهي همارا كچھ نقصان نهیں، اس لیے كه هم خود قائل هیں كه جو لوگ پیغمبر ﷺ كے بعد مرتد هو گئے وه اس حدیث كے مصداق سے خارج هو گئے اور اصحاب مقبولين نے نه كچھ تغیر و تبدیل كیا نه اس حدیث كے مصداق سے خارج هوئے۔ اور خود حضرات اماميه كا اقرار هے كه اصحاب مقبولين حدیث حوض كے مصداق سے مستثنی هیں، جيسا كه صاحب استقصاء الافحام نے بجواب منتهی الكلام كے مسلك ثانی كے ایک مقام پر اس كا اقرار كیا هے۔ وهذه عبارت ه:

((كه هرگز حدیث حوص در حق مقبولين اصحاب كرام

جناب خير الانام ﷺ وارد نيست و هرگز اين حدیث بر آنها

منطبق نمی تواند شد.))

¹ يرید من لم یغیر بعده ولم یبدل قیل و کیف نعلم انهم قد غیروا و بدّلوا اقال لم یروو نه من انه ﷺ لیذادون رجال من اصحابی یوم القیامة عن حوضی کما تاذاد غرائب الابل عن الماء فاقول یارب اصحابی اصحابی فی قال انک لاتدری ما احد ثوا بعدک فیو خذبهم ذات شمال فاقول بعدا لهم و سحفاً افتری هذا من لم یغیر و لم یبدل..... انتھی .

”کہ حدیث حوض رسول اللہ ﷺ کے مقبول صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں نہیں ہے اور یہ حدیث قطعاً ان حضرات پر صادق نہیں آتی۔“

اس امر کو کہ خلفاء راشدینؓ اور انصار و مہاجرینؓ اصحاب مقبولین تھے، اسی حدیث کی بحث میں فصل ارتداد صحابہؓ میں ثابت کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ اور اگر مان لیں کہ بعض اصحاب مقبولین مغیرین و مبدلین میں ہوں لیکن تاہم اکثر اصحاب رضی اللہ عنہم کی نسبت اس حدیث کا مضمون صادق آتا ہے، اس لیے کہ ((افصح الفصحاء ابلغ البلغاء علیہ التحیة و الثناء)) نے ایسا لفظ تشبیہ میں صحابہ کے بیان فرمایا ہے کہ جس طرح وہ فضیلت پر دال ہے، اسی طرح پر کثرت پر یعنی لفظ نجوم۔ پس حضرت کا یہ فرمانا کہ میرے اصحاب مثل ستاروں کے ہیں، ان کے بے شمار ہونے پر دلالت کرتا ہے اور سوائے جاہل اور نادان کے کوئی ستاروں کی مثال کو محدودے چند کے حق میں وارد نہیں سمجھ سکتا و سَلَمْنَا کہ بہت ہی تھوڑے بلکہ دو تین اصحاب ہی پر جو ارتداد سے بچ گئے یہ حدیث منطبق ہو تب بھی یہ عقیدہ امامیہ کا کہ اقتدا صرف اہل بیت کی واجب ہے اور دوسرے کی ناجائز باطل ہوتا ہے اور اہتدا جو کہ مخصوص اہل بیت کے لیے ہے اس میں دو چار کا شریک ہونا ثابت ہوتا ہے و لم یقل بہ احد منهم (اور ان میں سے کوئی اس کا قائل نہیں) غرض کہ جب حضرات امامیہ نے دیکھا کہ یہ عبارت بھی بے کار ہوئی اور اس نے بھی داروگیر اہل سنت سے نہ بچایا تب اس کو چھوڑا اور دوسرے طور پر تاویل کو کام فرمایا اور یہ دعویٰ کیا کہ مراد اصحاب سے اہل بیت ہیں جیسا کہ صاحب استقصاء الألفحام نے بجواب منتهی الکلام کے فرمایا ہے:

((مراد از اصحاب در حدیث اصحابی کالنجوم بایہم

اقتدیتم اہتدیتم اہل بیت علیہم السلام اند.))

”میرے صحابہؓ مثل ستاروں کے ہیں ان میں سے جس کی پیروی کرو گے ہدایت

پا جاؤ گے (اس) حدیث میں اصحاب سے مراد اہل بیت ہیں۔“

لیکن ہم اس دعویٰ کو چند دلیلوں سے باطل کرتے ہیں:

پہلی دلیل:

اصحاب کے لفظ سے اہل بیت مراد لینا داد تحریف دینا ہے، اس لیے کہ عرفاً اصحاب کا اطلاق یار دوستوں پر اور اہل بیت کا گھر والوں پر ہوتا ہے۔ شرعاً اصحاب سے مراد پیغمبر ﷺ پر ایمان لانے والے اور رفقاء لیے جاتے ہیں اور اہل بیت سے گھر والے اور بنی فاطمہ سمجھے جاتے ہیں بلکہ احادیث نبوی اور اقوال ائمہ اطہار سے یہ ظاہر ہے کہ دونوں لفظوں کے مصداق دو فریق علیحدہ علیحدہ ہیں جہاں یارانِ پیغمبر ﷺ کی شان میں کوئی حدیث یا قول ہے وہاں لفظ اصحاب کا آیا ہے اور جہاں خاندانِ نبوی اور ائمہ اطہار کا ذکر ہے وہاں لفظ اہل بیت اور عترت کا، چنانچہ پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا ہے کہ ((اِنِّی تَارِکٌ فِیْکُمْ الثَّقَلِیْنِ کِتَابُ اللّٰهِ وَ عِیْرَتِی)) یا ((مَثَلُ اَهْلِ بَیْتِی کَسَفِیْنَةِ نُوحٍ)) یا امام زین العابدین نے اپنی دعا میں جو صحیفہ کاملہ میں مذکور ہے فرمایا ہے کہ ((اَللّٰهُمَّ وَاَصْحَابُ مُحَمَّدٍ خَاصَّةً الدِّیْنِ اَحْسَنُوا الصَّحَابَةَ الخ)) اگر لفظ اصحاب یارانِ پیغمبر ﷺ کے لیے مخصوص نہ ہوتا اور اس کا استعمال اہل بیت اور عترت کی نسبت بھی ہوتا تو کیوں ان احادیث میں لفظ اہل بیت اور عترت کی تخصیص کی جاتی اور کس لیے پیغمبر خدا ﷺ حدیث اِنِّی تَارِکٌ فِیْکُمْ الثَّقَلِیْنِ میں بجائے کِتَابُ اللّٰهِ وَ عِیْرَتِی کے کِتَابُ اللّٰهِ وَ اَصْحَابِی نہ فرماتے اور حدیث اَهْلِ بَیْتِی کَسَفِیْنَةِ نُوحٍ میں مَثَلُ اَصْحَابِی کَسَفِیْنَةِ نُوحٍ ارشاد نہ کرتے اور کس واسطے پیغمبر خدا ﷺ جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر جاتے تو سَلَامٌ عَلَیْکُمْ اَهْلَ الْبَیْتِ فرماتے اور سَلَامٌ عَلَیْکُمْ یَا اَصْحَابِی نہ کہتے۔ غرض کہ احادیث نبوی اور اقوال ائمہ اطہار سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب اور اہل بیت کے لفظ محاورے میں دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے اور دونوں کے مصداق دو فریق ہو گئے اصحاب کا اطلاق یاروں دوستوں پر اور اہل بیت کا استعمال گھر والوں پر ہوتا رہا اور اب تک خواص اور عوام دونوں فریق کے ویسا ہی استعمال کرتے ہیں، پس نہایت تعجب کی

بات ہے کہ صدہا احادیث اور ہزارہا اقوال میں تو اصحاب کا لفظ یارانِ پیغمبرؐ پر اور اہل بیت کا لفظ گھر والوں پر استعمال کیا جائے اور کسی حدیث کے قول میں کوئی اصحاب کے لفظ سے اہل بیت اور اہل بیت کے لفظ سے اصحاب مراد نہ لے اور صرف ایک حدیث **أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ** میں خلاف تبادلہ اذہان اور مخالف محاورے و عادت کے اصحاب کے معنی اہل بیت کے لیے جائیں اور پھر بھی ایسے معنی بنانے والے اپنے آپ کو **مُصَدِّقٌ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ** کا نہ سمجھیں۔

اے حضرات! ذرا انصاف کرو کہ اگر کوئی سنی بے چارہ اپنی زبان سے نکالے کہ اہل بیت میں ازواجِ مطہرات بھی داخل ہیں اور مثل **أَهْلِ بَيْتِي كَسَفِينَةِ نُوحٍ** کے مصداق میں وہ بھی شامل ہیں اور آیہ تطہیر میں جو لفظ اہل بیت مذکور ہے اس سے پیغمبر ﷺ کے ازواجِ مطہرات مراد ہیں بلکہ مراد لینا بہ یک طرف وہ بھی شامل ہیں تو دیکھو کہ تمہارے علماء کیسا شور و غل مچاتے ہیں، قیامت برپا کرتے ہیں، آسمان و زمین کو ملاتے ہیں، نوحہ و فریاد کی آواز عرش تک پہنچاتے ہیں، کہنے والے کو خارجی اور ناصبی اور دشمن اہل بیت کا بتلاتے ہیں اور بانگ اہل بیت سے ازواج مراد لینا ٹھیک محاورے کے مطابق ہے، اس پر تحریف کا الزام لگاتے ہیں اور خود جب اصحاب سے مراد اہل بیت اور یار اور رفیق کے لفظ کو بھائی اور آل و اولاد کی نسبت استعمال کرتے ہیں تو کچھ بھی نہیں شرماتے، شرمانا کیسا ایسی سمجھ پر ناز کرتے ہیں، ایسے جوابوں پر سرافتخار بلند کرتے ہیں پس ایسی سمجھ کا کیا علاج اور ایسے جواب کا کیا جواب: شعر.....

ایں سبزہ چشمہ و ایں لالہ و ایں گل

آں شرح ندارد کہ بگفتار در آید

”یہ سبزہ یہ چشمہ اور یہ لالہ و گل (پھول) ایسی شرح نہیں رکھتے جو کہ بیان ہو سکے۔“

پس ہر شخص جو ذرا بھی انصاف اور سمجھ کو دخل دے یقین کرے گا کہ اگر پیغمبر ﷺ اس حدیث کو اہل بیت کی شان میں فرماتے تو صاف لفظ اہل بیت کا ارشاد کرتے اور بجائے **أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ** کے **أَهْلِ بَيْتِي كَالنُّجُومِ** فرماتے، ہاں، شاید حضرات شیعہ یہ

جواب دیں کہ پیغمبر ﷺ نے معاذ اللہ تقیے کو دخل دیا اور اصحاب کے خوش کرنے کو لفظ اصحابی فرمایا اور جب گھر میں آئے اور اہل بیت نے شکایت کی تب آپ نے ان سے یہ فرما دیا ہو کہ مراد اصحاب سے تم ہو۔

دوسری دلیل:

اگر ہم لفظ اصحاب سے اہل بیت کے معنی مراد لینے پر کچھ دار و گیر امامیہ کی نہ کریں اور ان کی اس تحریف معنوی کو تسلیم بھی کر لیں تب بھی موافق ان کے عقیدے کے یہ حدیث شان میں اہل بیت کے صادق نہیں آتی، اس لیے کہ اہل بیت کا اطلاق دوازدہ امام پر ہوتا ہے اور اصحاب کا اطلاق صرف انہیں لوگوں پر جو حضرت کی صحبت ❶ میں رہے اور سوائے حضرت علی اور حسنین علیہم السلام کے اور نو امام پیغمبر ﷺ کے پیچھے پیدا ہوئے، پس یہ ظاہر ہے کہ نو اماموں پر لفظ اصحاب کا صادق نہ ہوگا تو حدیث اصْحَابِي كَالنُّجُومِ میں سے سوائے حضرت علی اور حسنین علیہم السلام کے اور سب ائمہ خارج ہو جائیں گے اور وہ نجوم کی تشبیہ سے مستثنیٰ کر دیے جائیے گے اور ان کی اقتدا باعث ہدایت نہ سمجھی جائے گی (و نعوذ باللہ من ذالك) کون مسلمان ہے جو اپنی ایسی بات زبان پر لائے گا اور ائمہ کرام کی نسبت ایسا خیال کرے گا، پس ثابت ہوا کہ مراد اصحاب سے اہل بیت نہیں ہیں ورنہ پیغمبر صاحب ضرور لفظ اہل بیت کا فرماتے اور بجائے اصْحَابِي كَالنُّجُومِ کے اَهْلَ بَيْتِي كَالنُّجُومِ ارشاد کرتے تاکہ کوئی امام اس کے مصداق سے خارج نہ ہوتا ہاں ممکن ہے کہ حضرات شیعہ یہ جواب دیں کہ نو امام جو پیغمبر ﷺ کے روبرو پیدا نہیں ہوئے، اگرچہ باعتبار عالم اجسام لفظ اصحاب کے مصداق سے خارج ہیں مگر بلحاظ عالم ارواح کے اصحاب میں داخل ہیں۔

❶ قاضی نور اللہ شوستری نے ”محاسن المؤمنین“ میں لکھا ہے: ”تعریف صحابی بنا بر اظہر اقوال آنست کہ ملاقات نموده باشد با پیغمبر ﷺ در حالیکہ ایمان باو آورده باشد“ (یعنی صحابی کی تعریف ظاہر قول کی بنا پر یہ ہے کہ پیغمبر ﷺ سے ایمان کی حالت میں ملاقات کی ہے)۔

تیسری دلیل:

جو عبارت مَنْ لَمْ يُغَيِّرْ بَعْدَهُ کی اس حدیث کے آگے زیادہ ہے، اس نے اس تاویل کا دروازہ بند کر دیا اور لفظ اصحاب سے اہل بیت کے معنی لینے کو منع کر دیا، اس لیے کہ حضرات نے یہ تو خیال کیا کہ اگر اور کچھ الفاظ اس حدیث کے آگے نہ بڑھائے جائیں گے اور فقط ہذا صحیح کہہ کر یہ حدیث ختم کر دی جائے گی تو سنیوں کی دار و گیر سے نجات نہ ملے گی اور حدیث اصْحَابِي كَالنُّجُومِ کی صحت سن کر وہ جان آفت میں ڈال دیں گے، اس لیے یہ الفاظ امام صاحب کی طرف سے بڑھا دیے کہ مراد اصحاب سے وہ لوگ ہیں جنہوں نے کچھ تغیر و تبدل دین میں نہیں کی اور جو مرتد نہیں ہوئے اور جو دوزخ کی طرف نہ کھینچے جائیں گے اور جن سے پیغمبر خدا ﷺ بیزاری اپنی ظاہر نہ کریں گے۔ پس ان الفاظ سے ہمارا نقصان تو کچھ نہ ہوا، اس لیے کہ ہم بھی ایسے تغیر و تبدل کرنے والوں کو اور مرتد ہو جانے والوں کو اس حدیث کے مصداق سے خارج سمجھتے ہیں اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اور انصار و مہاجرین کو گو ہزار طرح پر امامیہ مرتدین میں شامل کرنا چاہیں وہ شامل نہیں ہو سکتے کہ اس کا بیان تفصیلی بحث ارتداد اصحاب میں ہوگا ان شاء اللہ تعالیٰ، لیکن ان الفاظ سے ہم کو بہت ہی فائدہ ہوا اور حضرات امامیہ کی تحریف و تاویل کا حال اس سے کھل گیا، اس لیے کہ اگر یہ الفاظ نہ ہوتے تو خیر کسی نہ کسی طرح پر وہ اپنا دل خوش کر سکتے تھے اور اصحاب سے مراد اہل بیت لے سکتے تھے لیکن ان لفظوں نے مجبور کر دیا کہ وہ کسی طور سے اصحاب سے اہل بیت مراد نہیں لے سکتے، اس لیے کہ اگر حدیث اصْحَابِي كَالنُّجُومِ میں مراد اصحاب سے اہل بیت ہوں تو جو الفاظ (مَنْ لَمْ يُغَيِّرْ بَعْدَهُ) کے آگے بیان کیے گئے ہیں وہ بھی ان کی شان میں وارد ہوں گے تو معاذ اللہ! معنی اس کے مطابق قول شیعوں کے یہ ہوں گے کہ وہی اہل بیت مثل ستاروں کے ہیں جنہوں نے دین میں تغیر و تبدل نہیں کی ((و نقل کفر کفر نہ باشد)) جو مرتد نہیں ہوئے پس کس منہ سے اس حدیث کو شان میں اہل بیت کے کہیں گے اور کس طرح اہل بیت نبویؐ پر تہمت تغیر و ارتداد کی لگائیں گے۔ غرض کہ ان الفاظ نے امامیہ کی تحریف کو ثابت

کر دیا اور ان کی تاویل کا دروازہ بند کر دیا۔ سبحان اللہ! کیا قدرت خدا کی ہے کہ جن الفاظ سے ہم پر الزام دینا چاہتے تھے ان سے خود ہی ملزم ہو گئے اور جو عبارت ہمارے قائل کرنے کے لیے بڑھائی تھی اس سے خود قائل ہو گئے۔ شعر.....

عدو شود سبب خیر گر خدا خواهد

خمیر مایہ دوکان شیشہ گرسنگست

”اگر خدا چاہے تو دشمن خیر کا سبب ہو سکتا ہے شیشہ بنانے والے کی دکان کا اصل

سرمایہ پتھر ہوتا ہے۔“

جب علمائے امامیہ نے دیکھا کہ یہ دعویٰ بھی ثابت نہیں ہوتا اور اس حدیث میں اصحاب کے لفظ سے اہل بیت کے معنی نہیں بنتے تب مجبور ہو کر حدیثِ اصْحَابِیْ كَالنُّجُوْمِ کی صحت سے انکار کیا اور اس کی عدم صحت کا دعویٰ کر کے اپنا پیچھا چھوڑا نا چاہا مگر ہزار شکر اس پر ہے کہ الفاظ حدیث سے انکار نہیں کیا اور اس عبارت کو جو ہم نے اوپر نقل کی ہے نہیں جھٹلایا بلکہ صرف تاویل و تحریف معنوی کو کام فرمایا ہے اور فقط شبہات و احتمالات سے اس کی صحت سے انکار کیا ہے، چنانچہ صاحبِ اسْتَقْصَاءِ الْأَفْحَامِ نے جواب میں مُنْتَهَى الْكَلَامِ کے لکھا ہے کہ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ دو حدیثوں کی نسبت سائل نے سوال کیا ایک اصْحَابِیْ كَالنُّجُوْمِ کی نسبت دوسری حدیثِ دَعْوَالِیْ اصْحَابِیْ کی نسبت اور امام موسیٰ رضا علیہ السلام نے هَذَا صَحِيْحٌ اس کے جواب میں فرمایا، پس یہ جواب صرف حدیثِ اخیر کی نسبت ہے نہ حدیثِ اوّل کی نسبت کما قال:

((از ملاحظہ این حدیث شریف ظاہر ست کہ آنچه مخاطب

در ترجمہ آن گفته کہ امام رضا علیہ السلام حکم بصحت

ایں هر دو حدیث نمود غیر صحیحست زیرا کہ هرگز تصریح

به صحت هر دو حدیث درین روایت صراحة کہ مدلول

کلام اوست مذکور نیست بلکه لفظ هذا صحیح مذکورست

و جائز ست کہ آن متعلق بہر دو حدیث بنا شد بلکہ محتمل ست کہ گوسائل در سوال ازدو حدیث استفسار کردہ بود مگر آنجناب در جواب یکے ازاں کہ حدیث اخیر ست بیان فرمودہ .))

”اس حدیث کے ملاحظہ سے ظاہر ہے جو مخاطب نے اپنے ترجمہ میں لکھا ہے کہ امام موسیٰ رضا نے ان دونوں احادیث کی صحت کا حکم دیا ہے، یہ ترجمہ و مطلب غلط ہے کیونکہ مدلول کلام ان دونوں احادیث کی صحت نہیں ہوتی بلکہ آپ کا ہذا صحیح کہنا تحریر ہے اور عین ممکن ہے کہ یہ لفظ دونوں احادیث کے لیے نہ ہو بلکہ عین ممکن ہے کہ اگرچہ سائل نے دونوں احادیث کے بابت سوال کیا، مگر آپ نے اخیر سے متعلق ہذا صحیح فرمایا۔“

اس جواب باصواب میں تین خطائیں ہیں (اول) خود مجیب اس جواب کو یقیناً بیان نہیں فرماتا اور جائز ست اور محتمل ست بجائے واجب ست و یقین ست کے استعمال کرتا ہے اور احتمال اور شک سے اس حدیث کے جس کی صحت میں بقول امام کچھ شک تکذیب فرماتا ہے (دوسرے) یہ احتمال بھی فقط احتمال ہی ہے، اس لیے کہ جب سائل نے دو حدیثوں کی نسبت استفسار کیا اور امام نے ہذا صحیح کہہ کر جواب دیا تو یقیناً یہ امر ثابت ہوا کہ حضرت امام نے سائل کے قول کی تصدیق کی اور اس کا قول دو حدیث کی نسبت تھا اس سے دونوں کی صحت ثابت ہوئی، رہا یہ احتمال کہ اگر امام دونوں حدیثوں کی صحت تسلیم کرتے ہذا صحیح فرماتے، یہ قابل لحاظ کے نہیں ہے، اس لیے کہ مقصود سائل کا واحد تھا یعنی قول نسبت مدح صحابہ کے تو حرف اشارہ واحد کا مقصود واحد کی نسبت استعمال کرنا خلاف محاورہ نہیں ہے (تیسرے) سائل نے دو حدیثوں کی نسبت استفسار کیا اور امام نے فقط ہذا صحیح فرمایا، اگر ہم تسلیم بھی کریں کہ یہ جواب دوسری ہی حدیث کی نسبت ہے تو پہلی حدیث کا جواب کیا ہے؟ کیا یہ کسی کے خیال میں آتا ہے کہ سائل دو حدیثوں کی نسبت سوال

کرے اور امام ایک ہی کی نسبت جواب دیں اور دوسری کی نسبت لا وَ نَعَم (ہاں، نہیں) کچھ نہ فرمائیں اور اس کی صحت اور عدم صحت کی نسبت کچھ بھی زبان مبارک سے ارشاد نہ کریں اور ایک مجمل لفظ کہہ کر سائل کو حیرت میں ڈال دیں، شاید حضرات امامیہ یہ جواب دیں کہ ائمہ کی شان یہی ہے کہ کبھی کسی کو صحیح جواب نہ دیں اور تقیے کو کسی حالت میں نہ چھوڑیں اور ہمیشہ گول بات کے سوا زبان سے کچھ ارشاد نہ فرمائیں، خدا کے واسطے ذرا انصاف کرنا چاہیے کہ جس سائل نے امام سے سوال بہ نسبت دو حدیثوں کے کیا جب اس کے جواب میں امام نے ہذا صحیح فرمایا تو وہ کیا سمجھا ہوگا، دونوں حدیثوں کی نسبت یا ایک ہی حدیث کی نسبت؟ اگر وہ ایک ہی حدیث کی نسبت سمجھتا تو ضرور وہ دوسری حدیث کی نسبت مکرر استفسار کرتا اور اگر وہ دونوں حدیثوں کی نسبت سمجھا تو یا امام کے ان لفظوں کا مطلب یہی ہوگا یا معاذ اللہ! امام نے اس کو جان بوجھ کر مجمل لفظ کہہ کر دھوکے میں ڈالا ہوگا۔ لیکن اگر ہم اس روایت میں امام کی تصدیق کو بہ نسبت دوسری ہی حدیث کے سمجھیں تو بھی حضرات شیعہ کی جان نہیں بچتی، اس لیے کہ قطع نظر اس روایت اور اس کتاب کے اور روایتوں سے بھی صحت مضمون حدیث ”أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ“ کی ہوتی ہے۔ پس اگر علمائے امامیہ اس روایت میں اس حدیث کی تکذیب کریں تو اور احادیث کو کیا کریں گے اور کہاں تک ائمہ کرام کے قولوں کو جھٹلائیں گے، چنانچہ اب ہم اس حدیث کی صحت دوسرے طریق سے ثابت کرتے ہیں۔

مُلاً حیدر آملی اثنا عشری نے جامع الاستفسار میں لکھا ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا:

((اَنَا كَالشَّمْسِ وَ عَلِيٌّ كَالْقَمَرِ وَ أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ بِأَيِّهِمْ

اِقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ .))

”میں مثل سورج کے ہوں اور علیٰ مثل چاند کے اور میرے صحابہ مثل ستاروں

کے جن کی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے۔“

معلوم نہیں کہ اس حدیث کو دیکھ کر کیسا شعلہ جان سوز علمائے امامیہ کے سینے سے نکلے گا

اور خبر نہیں یہ شرارہ ان کے خرمن عقل و خرد کو کیسا جلانے گا۔ ہاں، اس کی بھی تاویل کریں گے

کہ مراد اصحاب سے اہل بیت ہیں اس کا جواب ہم اوپر بیان کر چکے اور اب بھی بیان کرتے ہیں..... لیکن قبل جواب دینے کے ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ جب اس حدیث کی صحت ثابت ہوگئی تو عیونِ اخبار میں جو امام موسیٰ رضا علیہ السلام کے جواب سے اس کی صحت ثابت ہوتی ہے اس کا کس منہ سے انکار کریں گے اور جو عبارت زائد ”مَنْ لَمْ يُغَيِّرْ بَعْدَهُ“ اس روایت میں ہے اس کو شان میں اہل بیت کی کیوں کر صادق سمجھیں گے۔ اب اس تاویل کو جو اس حدیث کی نسبت ہے غور سے سنیئے کہ جو تقریر اس علامہ اثنا عشری نے کی ہے وہ اس امر پر دال ہے کہ مراد اصحاب سے اہل بیت نہیں ہیں، اس لیے کہ اوپر اس حدیث کے یہ بیان ہے کہ نبوت مثال نور آفتاب کے ہے اور امامت مانند چاند کی روشنی کے اور علم علماء کا مانند چمک ستاروں کے، و ہذہ عبارتہ بلفظہ:

((وَوَرَدَ فِي اصطلاح القوم تسمية الولاية بالشمسية والقمرية والمراد بهما ولاية النبي وولاية الولي ونسبة العلماء إليهما كنسبة النجوم إلى القمر والشمس إلى قوله فكذلك لا يكون للعلماء قدرة ولا ظهور مع وجود الأوصياء وأنوارهم من حيث الولاية ويؤيد ذلك كله ما أشار إليه النبي صلى الله عليه وآله وسلم لقوله أنا كالشمس وعلي كالقمر وأصحابي كالنجوم بأيهم اقتديتم اهتديتم .))

”قوم کی اصطلاح میں ولایت کو چاند اور سورج کہا گیا ہے اور ان سے مراد نبیؐ اور علیؑ کی ولایت ہے اور ان (نبی اور علی) کی طرف علماء کی نسبت ایسی ہے جیسے کہ ستاروں کی نسبت چاند اور سورج کی طرف..... اسی طرح علماء کو کوئی قدرت اور ظہور ولایت کے اعتبار سے اوصیاء اور ان کے انوار کے وجود کے ساتھ نہیں ہو سکتا اور ان باتوں کی تائید حضور ﷺ کے فرمان سے ہوتی ہے کہ میں مثل سورج کے ہوں اور علیؑ چاند کی طرح اور میرے صحابہؓ مانند ستاروں کے ہیں، ان

میں سے جن کی اقتدا کرو گے ہدایت پاؤ گے۔“

پس ظاہر ہے کہ ائمہ کرام اوصیاء میں داخل ہیں نہ علماء میں اور تمثیل نجوم کی علماء پر صادق ہے نہ اوصیاء پر تو اس علامہ کی تقریر سے ظاہر ہوا کہ حدیث اصحابی کالنجوم میں اصحاب سے مراد اہل بیت نہیں ہیں بلکہ علماء ہیں اور اس سے ہمارے دونوں مطلب ثابت ہو گئے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور مراد لفظ اصحاب سے اہل بیت نہیں ہیں، اگر اس روایت پر سیری نہ ہو اور حضرات امامیہ کو اپنے اور بزرگوں کی تصدیق سننے کی خواہش ہو تو اور بھی سنیں اور تیسرے طریق سے اس حدیث کے مضمون کی صحت پر سند لیں۔ شیخ صدوق نے معانی الاخبار میں لکھا ہے:

((حدثنا ❶ محمد بن الحسن احمد الوليد رحمه الله قال

❶ اس حدیث کے مذکور ہونے سے کتب امامیہ میں جو صدمہ حضرات امامیہ کو ہے اس کا بیان نہیں ہو سکتا، چنانچہ جو تحریریں باہم نشی سبحان علی خان صاحب اور ان کے دینی بھائی نور الدین کے ہوئی ہیں وہ اس پر شاہد ہیں۔ ہم انتخاب اس کا رسالہ ”المکاتیب فی رویۃ الثعالیب و الغرایب“ مطبوعہ ۱۲۶۰ھ سے نقل کرتے ہیں و ہو ہذہ: انتخاب خط سبحان علی خان بنام مولوی نور الدین منقول از صفحہ ۱۰۱ رسالہ المکاتیب چنانچہ الیٰ بے پایاں از بودن سند حدیث اصحابی کالنجوم در طرق شیعہ از تحریر خدام دریافتہ برداشتہ ام برائے خدا از و ورقمے گردد کہ چگونہ و چساں سند پیدا کردہ ہر گاہ سند چنین احادیث در طرق شیعہ یافتہ شود باز سر را بکدام سنگ تو از زد..... جواب از مولوی نور الدین منقول از صفحہ ۱۴۱ ایضا حیرت و تشویش سامے از بہم رسانیدن سند حدیث نجوم کہ ناصب را اتفاق افتادہ بجائے خود است ملاذا فقیر در بعضے از مجلدات بحار دیدہ بودم کہ بعضے از ائمہ طاہرین در جواب بعضے از مسترشدین نوشتہ اند کہ حقیقت اینست کہ ایس حدیث از جد ما ماثورست و تحریف لفظی دران راہ نیافتہ آرے نواصب بتحریف معنوی مبادرت کردہ اند کہ ایس حدیث را بر اہل ردت فرود آوردند و در تیہ ضلالت حیران و سرگردان ماندند و نہ در یافتند کہ حضرت خاتم المرسلین کسانے رانجوم ہدایت فرمودہ اند و اقتداء شان را موجب اہتداء قرار دادہ اند کہ حال شان در زمان سعادت تو امان آنجناب و بعد از وفات شریف بر نہج واحد بود نہ کسانیکہ مصداق ﴿آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ اِزْدَادُوا كُفْرًا﴾ گردیدند الیٰ قولہ و بندہ راحیرتے کہ در خصوص این امرست نہ از ان حہت کہ امر باقتداء فلاں و فلاں لازم می آید بلکہ حیرت آزان ست کہ بعد از احالہ امت بدو چیز عظیم القدر یعنی قرآن و عترت ارشاد این معنی کہ اصحاب من مثل ابوذر و سلمان و حذیفہ و مقداد و ابن مسعود نجوم ہدایت اند بہر کہ اقتدا کنی در راہ دین و نجات خواہید یافت و مہتدی خواہید شد چہ محمل داشتہ باشد و مزید حیرت آنکہ ﴿﴾

((حدثنا محمد بن الحسن الصفار عن الحسن بن موسى الخشاب عن غياث بن كلوب عن اسحاق بن عمار عن جعفر بن محمد عن آباءٍ عليهم السلام قال قال رسول

ﷺ بعضه از علماء می گویند کہ مراد اهل بیت اندرین معنی به بعضے از اخبار و آثار کہ خلاف آن را شیخ ابن بابویہ غالباً در ہدایہ نقل کردہ ثبت دارند درین صورت قطع نظر ازین تخالف حدیث اوّل ہم معارض میشود والا باید کہ این بزرگان قائل شوند باینکہ معاذ اللہ حال اهل بیت ہم مانند اصحاب بود کہ جمعے براہ احداث و ردت رفتند و بعضے بر حال خویش راسخ ماندند و لم یقل بہ احد الی قولہ لهذا حیرت بندہ درین باب نسبت بہ حیرت جناب مضاعف خواهد بود، سخت حیرت تہادارم کہ کفہائے دست را باہم میسائیم ارتعاد قلب و جگر خدام بر جائے خودست بمقتضائے بشریت نمیتوان گفت عین درد دینی ست“ ۱۲ (یعنی خلاصہ یہ کہ اصحابی کالنجوم والی حدیث کی سندیں کتب شیعہ میں طریق شیعہ سے بہت ہیں جب اس طرح کی حدیث کی سند طریق امامیہ میں پائی جائے تو آخر کس پتھر سے سرکلرا کر پھوڑا جائے؟“ مولوی نور الدین کا جواب۔ حدیث نجوم کی سند کا ناصبی کے ہاتھ لگ جانا بجائے خود بڑی حیرت اور سخت تشویش کا باعث ہے، میں نے ”بجاء“ کی کسی جلد میں دیکھا ہے کہ بعض ائمہ طاہرین نے اپنے بعض مریدین کے جواب میں تحریر کیا ہے کہ درحقیقت یہ حدیث ہمارے دادا سے منقول ہے اور اس میں کوئی تحریف لفظی تو نہیں ہوئی ہاں نواصب نے تحریف معنوی، البتہ کر ڈالی ہے کہ اس حدیث کو مرتدین پر منطبق کرتے ہیں اور گمراہی کی وادی ہیں حیران و سرگرداں ہیں، انہیں نہیں معلوم کہ خاتم المرسلین ﷺ نے جن لوگوں کو نجوم ہدایت (ہدایت کے ستارے) فرمایا ہے اور ان کی پیروی کو ہدایت کا سبب قرار دیا ہے وہ لوگ ہیں جن کا حال حضور ﷺ کے زمانے میں اور آپ کی وفات شریف کے بعد یکساں رہا نہ کہ وہ لوگ جو مرتد ہو گئے اور ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کر لیا الی قولہ، بندہ کو حیرت اس امر میں نہیں ہے کہ (اس حدیث سے) فلاں فلاں کی پیروی لازم آتی ہے بلکہ حیرت کا سبب یہ ہے کہ امت کی حالت بدل جانے کے بعد دو عظیم القدر چیزوں، یعنی قرآن اور عترت کو ”اس معنی کے لحاظ سے کہ میرے اصحاب جیسے ابوذر، سلمان، حذیفہ، مقداد اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم ہدایت کے ستارے ہیں جن کی اقتدا کرو گے دین اور نجات کا راستہ پا جاؤ گے اور ہدایت یافتہ بن جاؤ گے“ کس پر محمول کریں گے نیز مزید حیرت یہ ہے کہ بعض علماء کہتے ہیں کہ اس سے مراد اہل بیت ہیں اور اس معنی میں بعض احادیث و آثار کو دلیل بناتے ہیں جن کے برعکس شیخ ابن بابویہ نے غالباً ہدایہ میں نقل کیا ہے اس صورت میں قطع نظر اس مخالفت مذکورہ کے حدیث اوّل سے بھی تعارض لازم آتا ہے ورنہ ان بزرگوں کو قائل ہونا پڑے گا کہ معاذ اللہ! اہل بیت بھی اصحاب کی طرح ہیں کہ ایک جماعت مرتد ہو گئی اور بعض اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے اور اس کا کوئی قائل نہیں الی قولہ لہذا بندہ کی حیرت اس امر میں آنجناب کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی ہے، سخت حیرت میں ہاتھ مل رہا ہوں، خدام کے قلب و جگر کی بے چینی اپنی جگہ ہے وہ بیان سے باہر ہے بہر حال یہ دینی درد ہے۔ ۱۲

اللہ ﷻ ما وجد ثم فى كتاب الله عزوجل فالعمل لكم به
لا عذر لكم فى تركه ما لم يكن فى كتاب الله عزوجل و كانت
فيه السنّة منى فلا عذر لكم فى ترك سنتى و ما لم يكن سنة
منى فما قال اصحابى فقولوا به انما مثل اصحابى فيكم كمثلى
النجوم بايها اخذاهدى باى اقاويل اصحابى اخذتم اهتديتم
و اختلاف اصحابى لكم رحمة .))

”..... یعنی امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا پیغمبر خدا ﷺ نے کہا کہ جو پاؤ
تم خدا کی کتاب میں اس پر عمل کرو، کوئی عذر تم کو اس کے ترک پر نہیں ہو سکتا اور
جو کچھ کتاب خدا میں نہ پاؤ اس میں میری سنت پر عمل کرو، کوئی عذر تم کو میری
سنت کے ترک پر نہیں ہو سکتا اور جس میں میری سنت نہ ملے اس میں عمل کرو اس
پر کہ جو کچھ میرے اصحاب نے کہا ہو کیونکہ میرے اصحاب تمہارے بیچ میں ایسے
ہیں جیسے کہ ستارے۔ جس طرح پر جس کسی ستارے کو کوئی لے لے راہ پر پہنچ جائے
گا، اسی طرح پر میرے اصحاب ہیں کہ جس کسی قول کو میرے اصحاب کے تم لے لو
گے ہدایت پاؤ گے اور میرے اصحاب کا اختلاف تمہارے واسطے رحمت ہے۔“

اس حدیث کی صحت میں کسی کو کلام نہیں اس لیے کہ علامہ طبرسی نے احتجاج ۱ میں اور ملا
باقر مجلسی نے ”بحار الانوار“ میں اس کی تصدیق کی ہے، پس یہ حدیث معنأً مطابق حدیث
سابق کے ہے بلکہ اَخْتِلَافُ اصْحَابِي لَكُمْ رَحْمَةٌ كَافَقْرَهُ اور زیادہ ہے پس انکار
حدیث سابق سے جو ”عیون اخبار“ میں مذکور ہے تکذیب امام موسیٰ رضا کی ثابت ہوتی ہے،
لیکن اگر ہم اس حدیث کو جو عیون اخبار میں مذکور ہے کَانَ لَمْ يَكُنْ سمجھیں اور اسی حدیث کو
جو ”معانی الاخبار“ سے ہم نے نقل کی صحیح جانیں تب بھی مطلب ہمارا فوت نہیں ہوتا، اس لیے
کہ جو الفاظ اس حدیث کے ہیں وہ بھی موید ہمارے قول کے ہیں، باقی رہی تاویل و تحریف

علمائے امامیہ کی اس کی نسبت بھی ہم بحث کرتے ہیں اور جو کچھ تاویلات انہوں نے کیے ہیں اس کو ظاہر کرتے ہیں۔

واضح ہو کہ شیخ صدوق نے اس حدیث کو جس طرح اوپر ہم نے نقل کیا لکھ کر یہ الفاظ اور بڑھادیے ہیں ((فَقِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَنْ أَصْحَابُكَ قَالَ أَهْلُ بَيْتِي)) کہ جب پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا کہ اصحاب میرے مثل ستاروں کے ہیں اور ان کا اختلاف رحمت ہے تب پوچھنے والے نے پوچھا کہ یا حضرت آپ کے اصحاب کون ہیں؟ حضرت نے جواب دیا میرے اہل بیت، انہیں الفاظ پر صاحب استقصاء نے اپنے جواب کو جو حدیث سابق کی نسبت ہے استدلال کیا ہے اور حدیث سابق کا ان لفظوں سے جواب دیا ہے:

((پس اگر در حدیث عیون جواب آنحضرت متعلق بھر دو حدیث باشد و معنایش آن باشد کہ ازین حدیث نجوم ہم مراد اصحاب اند مخالف و مناقضت با حدیث معانی الاخبار و امثال آن لازم می آید لهذا بالبداهت قطعاً ثابت شد کہ جواب امام رضا علیہ السلام متعلق بھر دو حدیث نیست بلکہ آنحضرت فقط حال حدیث (دَعُوَالِيْ اَصْحَابِيْ) بیان فرمودہ و تفسیر آن با صحابی کہ متغیر و متبدل نہ شدند نمودہ زنگ شبہا از خواطر اہل ایماں زدودہ .))

”اگر ”حدیث عیون“ میں آنحضرت کا جواب دونوں حدیثوں سے متعلق ہوتا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ حدیث عیون میں نجوم سے بھی صحابہؓ مراد ہوں اور یہ حدیث معانی الاخبار کے مخالف و متضاد ہے، اس لیے اتنا ثابت ہوا کہ امام موسیٰ رضا کا جواب دونوں احادیث سے متعلق نہیں ہے بلکہ آپ نے حدیث ”دَعُوَا لِيْ اَصْحَابِيْ“ کا حال بیان فرمایا اور اس سے وہ اصحاب مراد لیے جن میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ یہ بیان کر کے آپ نے مومنوں کے دل سے شبہات کے

زنگ دور فرمادیے۔“

لیکن اس جواب میں بھی چند نقص ہیں (اول) ہم اس عبارت زائد کو صحیح نہیں سمجھتے اور اس کو تحریف شیخ صدوق کی جانتے ہیں کہ حضرت نے اپنے مذہب کے موافق یہ الفاظ بڑھا دیے ہیں اور یہ صرف ہم اپنی بدظنی سے نہیں کہتے اور ہم شیخ صدوق پر تہمت نہیں لگاتے بلکہ خود انہیں کے علماء ان کی نسبت ایسا خیال کرتے ہیں اور ان کو تحریف کے فن میں استاد جانتے ہیں۔ اگر کسی کو شک ہووے تو وہ ملا باقر مجلسی کی بحار الانوار کو دیکھے کہ ملائے موصوف نے شیخ صدوق کی نسبت کیا فرمایا ہے، ایک حدیث میں جو ابی بصیر سے الفاظ شاءَ مَا شَاءَ کے معنی میں منقول ہے، صدوق صاحب نے تحریف کی اور الفاظ حدیث کو کم زیادہ کر دیا اور جن لفظوں سے کافی میں منقول تھے نقل نہ کیا۔ اس پر ملا باقر مجلسی نے یہ الفاظ شان میں حضرت کے لکھے ہیں: ((هَذَا الْخَبْرُ مَا خُوذُ مِنَ الْكَافِي وَفِيهِ تَغْيِيرَاتٌ عَجِيبَةٌ تُورِثُ سُوءَ الظَّنِّ بِالصَّدُوقِ وَإِنَّمَا فَعَلَ ذَلِكَ لِيُوَافِقَ مَذْهَبَ أَهْلِ الْعَدْلِ وَفِي الْكَافِي هُكَذَا الخ)) کہ یہ خبر کافی سے لی گئی ہے اور اس میں عجیب تغیر و تبدل کیا گیا ہے جس سے صدوق کی نسبت بدظنی ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس حدیث میں تغیر و تبدل اس لیے کیا ہے کہ اہل عدل کے مذہب کے موافق ہو جائے اور الفاظ حدیث کافی کے اس طرح پر ہیں فقط۔ اس کو لکھ کر ملا مجلسی نے الفاظ حدیث کافی کے نقل کیے ہیں، پس باقرار ❶ ملا مجلسی کے ثابت ہوا کہ حضرت شیخ صدوق ذرا ذرا بات پر الفاظ حدیث کے بدل

❶ ملا محمد باقر ابن ملا محمد تقی ابن مقصود علی مجلسی بعہد شاہ عباس اوّل ۱۰۳۷ھ میں مجلسی اصفہان کی جانب منسوب ایک قریہ میں پیدا ہوئے اور بعضوں نے کہا ہے کہ ان کے دادا مقصود علی ایک بلند مرتبہ شاعر تھے اور اپنا تخلص مجلسی کرتے تھے اس سبب سے ”مجلسی“ مشہور ہو گئے۔ شاہ سلیمان صفوی اور سلطان حسین صفوی کے ہم عصر تھے اور ان دونوں بادشاہوں کے حکم سے دارالسلطنت اصفہان کی شیخ الاسلامی اور دینی امور کی سربراہی حاصل کی تھی۔ انہوں نے عربی فارسی میں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ علمائے شیعہ کا کہنا ہے کہ علامہ حلی کے بعد ایسا کثیر التالیف و التصنیف کوئی دوسرا نہیں گزرا، ان کی تالیف و تصانیف سے ساٹھ کتابیں مشہور ہیں جن میں سب سے قابل ذکر ”بحار الانوار“ نامی انسائیکلو پیڈیا ہے جسے ملا باقر مجلسی نے ۲۵ جلدوں میں عربی زبان میں تالیف کیا ہے۔ اصول کافی کی شرح ⇨ ⇨ ⇨

دیتے تھے اور واسطے موافق کرنے ساتھ اپنے مذہب کے اماموں کی احادیث میں تغیر و تبدل کر دیا کرتے تھے۔ پس اگر اس حدیث میں جس سے صحابہ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور جس کی صحت سے کل مذہب ہی باطل ہوا جاتا ہے کچھ الفاظ زائد کر دیے ہوں تو کیا عجب ہے بلکہ یقین کرنا چاہیے کہ ضرور انہوں نے اخیر فقرہ بڑھا دیا ہے اور کیوں نہ بڑھائے اس لیے کہ اگر حدیث کو انہیں لفظوں پر ختم کر دیتے اور اصحاب کا پیغمبر ﷺ کی زبان سے مثل ستاروں کے ہونا اور ان کی اقتدا کرنا تسلیم کر لیتے تو پھر اپنے مذہب کو کس طرح بچاتے، اس لیے ہم بھی ملا باقر مجلسی صاحب کے ساتھ اتفاق کرتے ہیں اور حضرت شیخ صدوق کے حق میں اس حدیث میں الفاظ زائد کرنے کی نسبت وہی الفاظ کہتے ہیں کہ (إِنَّمَا فَعَلَ ذَلِكَ لِيُؤَافِقَ مَذْهَبَ أَهْلِ الْعَدْلِ) لیکن اگر کسی کو اس پر اطمینان نہ ہو اور باوجود اقرار ملا مجلسی کے صدوق کی تحریف و تغیر پر یقین نہ آئے تو ہم چند دلیلوں سے ثابت کرتے ہیں کہ الفاظ (فَقِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَنْ أَصْحَابُكَ فَقَالَ أَهْلُ بَيْتِي) بڑھائے ہوئے ہیں:

پہلی دلیل:

مولوی علی بخش خان صاحب بہادر اپنے ایک رسالہ میں فرماتے ہیں کہ اصحابی کا لفظ معما تھا یا چیتاں اور پہلی تھی کہ جس کے پوچھنے کی ضرورت ہوتی اور سننے والا نہ سمجھتا اور بالفاظِ مَنْ أَصْحَابُكَ استفسار کرتا، پس یہ سوال خود اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اپنی طرف سے بڑھایا ہے۔

◀◀◀ ”مرآة العقول“ اور فارسی میں ”حیات القلوب“ ”جلاء العیون“ و ”حق الیقین“ وغیرہ بہت مشہور کتابیں ہیں۔ دوسرے شیعہ علماء کی کتابوں کے مقابلے میں علامہ مجلسی کی کتابوں کو شیعہ حضرات میں زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ ایرانی انقلاب کے سربراہ آیت اللہ روح اللہ خمینی نے بھی شیعوں کو علامہ مجلسی کی فارسی تالیفات پڑھنے کا مشورہ دیا ہے۔ ان کی کتابوں میں خلفاء راشدینؑ پر نہایت گندے انداز میں طعن و تنقید کی گئی ہے اور اس معاملے میں متاخرین شیعہ علماء میں ان جیسا فحش گو کوئی نہیں بنا بر مشہور قول ۱۱۱۱ھ میں وفات ہوئی۔ (شیخ محمد فراست)

دوسری دلیل:

اس حدیث سے اختلاف اصحاب کا ثابت ہوتا ہے اور موافق اصول شیعوں کے اہل بیت باہم مختلف نہیں ہوتے، پس کیوں کہ اصحاب سے اہل بیت مراد لینا جائز ہوگا اور (اِخْتِلَافُ اَصْحَابِي لَكُمْ رَحْمَةٌ) کے فقرے کے کیا معنی ہوں گے۔ چنانچہ خود اسی حدیث میں بعد ان الفاظ کے جوہم نے نقل کیے شیخ صدوق صاحب یہ فرماتے ہیں: ((قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيٍّ مُؤَلَّفٌ هَذَا الْكِتَابِ اَنَّ اَهْلَ الْبَيْتِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ لَا يَخْتَلِفُونَ وَلَكِنْ يَفْتُونَ الشَّيْعَةَ بِمِرِّ الْحَقِّ وَاِنَّمَا افْتُواهُمْ بِالتَّقِيَّةِ فَمَا يَخْتَلِفُ مِنْ قَوْلِهِمْ فَهُوَ التَّقِيَّةُ وَالتَّقِيَّةُ رَحْمَةٌ لِلشَّيْعَةِ)) کہ مؤلف اس کتاب کا کہتا ہے کہ اہل بیت علیہم السلام تو کچھ اختلاف نہیں کرتے بلکہ اپنے شیعوں کو صحیح فتویٰ دیتے ہیں، البتہ کبھی کبھی کوئی فتویٰ تقیہ سے بھی کر دیتے ہیں، پس اختلاف سے مراد تقیہ ہے اور تقیہ شیعوں کے حق میں رحمت ہے۔ اگرچہ صدوق اور ان کے پیرو اس جواب پر ناز کریں مگر کوئی اہل عقل اس جواب کو پسند نہ کرے گا، اس لیے کہ تقیہ کے معنی ہیں سچ بات کو بہ سبب خوف کے چھپانا اور جھوٹ کو ظاہر کرنا، پس سوائے حضرات امامیہ کے دوسرا کون ہے کہ جھوٹ بولنے کو رحمت سمجھے گا اور (اِخْتِلَافُ اَصْحَابِي لَكُمْ رَحْمَةٌ) کی حدیث کو تقیہ پر محمول کرے گا۔ لیکن اگر ہم اختلاف کو تقیہ پر منحصر سمجھیں تو گویا حدیث کے معنی یہ ہوئے کہ میرے اہل بیت کے جس قول پر کوئی عمل کرے گا وہ ہدایت پائے گا اگرچہ وہ قول باہم مختلف ہوں اور ایک دوسرے سے مخالف ہوں اس لیے کہ اختلاف میرے اہل بیت کا رحمت ہے فقط۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ہزار ہا احادیث اور اقوال اماموں کے ایسے ہیں کہ جن کو اہل سنت مانتے ہیں اور حضرات امامیہ ان کو تقیہ پر محمول کرتے ہیں لیکن جب تقیہ رحمت میں شمار کیا گیا تو سنیوں کا ان اقوال پر عمل کرنا جو اماموں نے براہ تقیہ کے فرمائے عین ہدایت ٹھہرا اور نہ اگر تقیہ کے قولوں پر عمل کرنے والے خطا پر ہوں اور گمراہ ٹھہرائے جائیں تو پھر معنی ان الفاظ کے کہ ((بِأَيِّ اَقْوَامٍ اَصْحَابِي اَخَذْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ وَاِخْتِلَافُ اَصْحَابِي لَكُمْ رَحْمَةٌ)) کے کیا معنی

ہوں گے اور کوئی یہ نہ خیال کرے کہ ائمہ کرام نے جو اقوال اور احکام براہِ تقیہ کے فرمائے ہیں وہ مجمل اور مشترک المعنی نہیں ہیں بلکہ نہایت صاف اور صریح ہیں اور یہ بھی کوئی نہ سمجھے کہ انہوں نے اس وقت کہنے ان اقوال اور دینے ان احکام کے اس کا خیال نہیں کیا کہ پوچھنے والا اور سننے والا گمراہ ہوگا بلکہ جان بوجھ کر اور سوچ سمجھ کر ان اقوال کو فرمایا ہے کہ پوچھنے والا اور سننے والا اس پر یقین کرے اور کسی طرح اس کو اس قول کی صداقت میں شبہ نہ رہے جیسا علمائے امامیہ نے اس کو خود بیان کیا ہے، چنانچہ میر باقر داماد نبراس ایفیا میں فرماتے ہیں کہ جو فتوے ائمہ کرام نے موافق قاعدہ تقیہ کے دیے ہیں ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ ان سے غرض تعلیم ہے تا کہ اس کا جواز بیان کیا جائے کہ وقت ضرورت کے اس پر عمل کیا جائے اور بامید اس کے کہ مومنین کو حق بات بتلا ہی دی گئی ہے، اور ان میں سے بعض فتوے ایسے ہیں کہ جو ایسے پوچھنے والے نے پوچھے کہ اپنے باطل مذہب پر فریفتہ تھا اور اپنے دین کج پر اعلیٰ درجہ کا غلو رکھتا تھا تو ایسے شخص کو ائمہ کرام نے اسی کے دین و مذہب کے موافق فتوے دے دیے، اس لیے کہ نہ اس کی ہدایت پانے کی امید تھی نہ راہِ راست پر آنے کا یقین تھا۔ پس جب اماموں نے دیدہ و دانستہ پوچھنے والے کو فتویٰ اس کے دین و مذہب کے موافق بتلا دیا تو گو وہ فتویٰ مخالف اور روایتوں کے ہو لیکن بہ نسبت (اِخْتِلَافُ اَصْحَابِي لَكُمْ رَحْمَةً) کے پوچھنے والے کے حق میں رحمت ہو گیا اور بمقتضائے (بِأَيِّ اَقَاوِيلَ اَصْحَابِي اَخَذْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ) کے اس پر عمل کرنے والا ہدایت پانے والوں میں محسوب ہوگا۔

تیسری دلیل:

صاحب استقصاء نے حدیث ”عیونِ اخبار“ کی تکذیب پر یہ دلیل بیان کی ہے کہ اگر وہ حدیث صحیح ہو تو مخالفت دوسری حدیث سے جو ”معانی الاخبار“ میں مذکور ہے لازم آتی ہے، یہ دلیل بالکل پوچ ہے، اس لیے کہ اگر عبارت زائد پر جو شیخ صدوق نے بڑھادی ہے لحاظ نہ کیا جائے تو دونوں حدیثوں کا مضمون موافق ہوتا ہے نہ مخالف، اس لیے کہ ”عیونِ اخبار“

کی حدیث کے الفاظ ہیں ((أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ بَابِهِمْ أَقْتَدَيْتُمْ اهْتَدَيْتُمْ)) اور معانی الاخبار کی حدیث کے الفاظ یہ ہے ((إِنَّ مَثَلَ أَصْحَابِي فِيكُمْ كَمَثَلِ النُّجُومِ بِأَيِّهَا أُخِذَ أُهْتَدِيَ)) پس ہم نہیں جانتے کہ دونوں حدیثیں باعتبار معنی کے کیوں کر مخالف ہیں باقی رہی بحث عبارت زائد ((فَقِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَنْ أَصْحَابُكَ)) کی اس کو ہم تحریف شیخ صدوق کی سمجھتے ہیں اور اس کے دلائل ہم ابھی بیان کر چکے ہیں پس اگر ہم تسلیم کریں کہ جو حدیث ((أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ)) کو امام موسیٰ رضا نے موضوع اور غیر صحیح فرمایا تو جب اس کی صحت امام باقر علیہ السلام کے بیان سے ہوتی ہے تو ایک امام کے قول سے دوسرے امام کی تکذیب لازم آتی ہے۔ ہاں، اگر ”معانی الاخبار“ کی حدیث سے یہ ثابت ہوتا کہ حدیث ((أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ)) معنیٰ موضوع اور غلط ہے تو ہم صاحب استقصاء کے جواب کو ان کے اصول کے مطابق تسلیم کر لیتے لیکن جب اس سے بھی اس کی صحت ثابت ہوتی ہے تو ہم نہایت تعجب کرتے ہیں کہ مؤلف موصوف نے حدیث ”معانی الاخبار“ کے بیان کرنے میں سوائے اس کے کہ حدیث ((أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ)) کی صحت کو ایک دوسرے امام کے قول سے ثابت کر دیا کیا فائدہ اپنے واسطے تصور کیا تھا۔

علاوہ بریں غور کرنے کی بات ہے کہ اگر پوچھنے والا یہ سوال نہ کرتا کہ اصحاب سے مراد کون لوگ ہیں تو یہ کسی کو معلوم نہ ہوتا کہ اصحاب سے مراد اہل بیت ہیں، پس کیوں کر قیاس میں آئے کہ اگر پیغمبر خدا ﷺ یہ حدیث شان میں اہل بیت کے فرماتے تو وہ ایسا لفظ استعمال کرتے جس کا اطلاق عرفاً اہل بیت پر نہیں ہوتا اور کیوں کر عقل قبول کرے کہ اصحاب کے لفظ کو سائل نہ سمجھا ہوگا اور اس نے اس کے معنی حضرت ﷺ سے پوچھے ہوں گے، اس لیے کہ ہم اکثر احادیث میں دیکھتے ہیں کہ لفظ اصحاب کا آیا ہے اور پھر کسی ایک میں بھی ایسا سوال نہیں دیکھتے مثلاً حدیث (دَعُوا إِلَى أَصْحَابِي) کو دیکھنا چاہیے کہ خود صاحب استقصاء اس کو صحیح بتلاتے ہیں اور امام موسیٰ رضا کی تصدیق کو اسی پر ختم کرتے ہیں تو اس کے بعد یہ عبارت نہیں ہے ﴿فَقِيلَ

مَنْ أَصْحَابُكَ) تو کیوں کر ہم جانیں کہ کبھی کسی شخص نے اصحاب کے لفظ کو پیغمبر ﷺ سے سن کر اس کے معنی نہ پوچھے اور اس حدیث میں لفظ اصحاب ایسا مغلق اور معما ہو گیا کہ بغیر پوچھنے معنی کے سننے والا اس کے معنی نہ سمجھا اور بدون اس کی شرح دریافت کرنے کے سامع سے نہ رہا گیا۔ وھذہ ❶ (مَا يَضْحَكُ عَلَيْهِ الصَّبِيَانُ)۔

چوتھی دلیل:

اگر ہم اس عبارت زاید کو جو ”معانی الاخبار“ کی حدیث میں ہے موافق قول صدوق کے تسلیم بھی کریں اور ”عیون الاخبار“ کی حدیث کو ”معانی الاخبار“ کی حدیث سے مخالف ہونا بھی قبول کریں تب بھی صرف اس وجہ سے کہ دونوں میں مخالفت ہے یہ کیا ضرور ہے کہ ”عیون الاخبار“ کی حدیث کو غلط ٹھہرائیں اور کیوں اس حدیث کو صحیح کہہ کر ”معانی الاخبار“ کی حدیث کو غلط نہ ٹھہرائیں بلکہ غلط ٹھہرانے کی ضرورت ہی نہیں ہے فقط اخیر کا جمایا ہوا فقرہ دور کر کے دونوں حدیثوں کا اختلاف دور کر دیں۔ علاوہ بریں ہم کو صاحب استقصاء کے اس امر پر نہایت تعجب آتا ہے کہ وہ اختلاف کے سبب سے ایک حدیث کو غلط ٹھہراتے ہیں، اس لیے کہ حضرت کے محدثین اور علماء نے ایسی احادیث اور اقوال نہیں بیان کیے کہ جن کے اختلاف پر تعجب ہو، ائمہ کرام اسی کا افسوس کرتے رہے، مجتہدین متاخرین اسی غم میں مر گئے اور احادیث کا اختلاف دور نہ کر سکے، پس جب اختلاف درجہ غایت پر پہنچ گیا ہو اور باوجود مساعی جمیلہ متقدمین کے اس کا رفع ہونا محالات میں سے ٹھہر گیا ہو تو ایک دو حدیث کے اختلاف پر کیوں اس قدر افسوس ہے۔ تعجب ہے صاحب استقصاء کی ذات سے کہ حضرت نے اپنے امام اعظم طوسی کا قول ملاحظہ نہیں فرمایا کہ جس میں اقرار ہے کہ فقط کتاب تہذیب میں پانچ ہزار سے زیادہ حدیثیں ہیں جو باہم متعارض اور متناقض ہیں اور جن کا تعارض ہزار تاویل اور تحریف معنوی سے چھپانا چاہا اور نہ چھپ سکا، چنانچہ ان کے امام اعظم کی تقریر جو صاحب فوائد مدینہ

نے نقل کی ہے، یہ ہے:

((وَقَدْ ذَكَرْتُ مَاوردَ عَنْهُمْ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ مِنَ الْاَحَادِيثِ
الْمُخْتَلِفَةِ الَّتِي يَخْتَصُّ الْفِقْهَ فِي كِتَابِ الْمَعْرُوفِ
بِالِاسْتِبْصَارِ وَفِي كِتَابِ تَهْدِيْبِ الْاَحْكَامِ مَا يَزِيْدُ عَلٰى خَمْسَةِ
اَلْاَلْفِ حَدِيْثٍ وَقَدْ ذَكَرْتُ فِيْ اَكْثَرِهَا اِخْتِلَافُ الطَّائِفَةِ فِي
الْعَمَلِ بِهَا وَذَلِكَ اَشْهَرُ مِنْ اَنْ يَّخْفِيَ .))

”میں نے ذکر کر دیا ہے کہ ”استبصار“ اور کتاب ”تہذیب الاحکام“ میں (ائمہ کرام سے) فقہ سے متعلق پانچ ہزار سے زیادہ باہم مختلف اور ایک دوسرے سے متعارض احادیث آئی ہیں اور ان میں سے اکثر پر عمل کے سلسلہ میں جماعت کے اختلاف کو بھی بیان کر دیا ہے اور یہ تو مشہور بات ہے اس میں کوئی پوشیدگی نہیں ہے۔“

اور یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ اختلاف صرف راویوں کے سبب سے ہے بلکہ حضرات امامیہ اس کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ اختلاف خود ائمہ کی طرف سے ہے، چنانچہ ملا باقر مجلسی نے بحار الانوار میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے کہا کہ کوئی شے سخت زیادہ ہم پر اس سے نہیں ہے کہ ہمارے آپس میں بڑا اختلاف ہے، تب امام نے جواب دیا کہ یہ اختلاف ہماری طرف سے ہے ❶ اور اسی میں بروایت زرارہ کے لکھا ہے کہ اس نے امام باقر علیہ السلام سے ایک مسئلہ پوچھا حضرت امام نے اس کو کچھ جواب دیا اس کے بعد ایک دوسرا شخص آیا اور اس نے بھی وہی مسئلہ پوچھا، اس کو برخلاف پہلے جواب کے جواب دیا کہ پھر تیسرا شخص آیا اس کو دونوں جوابوں کے برخلاف جواب دیا۔ جب وہ دونوں آدمی چلے گئے تب میں نے کہا کہ یا ابن رسول اللہ! اس کا کیا سبب ہے کہ دو آدمی عراق سے آئے اور

❶ وھذہ عبارتہ عن محمد بن بشیر و عزیز عن ابی عبداللہ علیہ السلام قال قلت لہ، انہ لیس شئی اشد

وہ دونوں آپ کے شیعوں میں سے تھے اور آپ نے دونوں کو جواب ایک دوسرے سے خلاف دیا ہے۔ امام نے فرمایا کہ یہی ہمارے حق میں بہتر ہے اور اسی میں ہماری تمہاری خیریت ہے، اگر اس میں تم سب مختلف نہ ہو اور ایک بات پر متفق ہو جاؤ تو لوگ تم کو نہ چھوڑیں اور ہم تم زندہ نہ رہنے پاؤ اور پھر زرارہ کہتا ہے کہ جب امام جعفر صادق سے اس امر کو میں نے پوچھا تو انہوں نے بھی اپنے پدر بزرگوار کے موافق جواب دیا۔^① اور یہ کوئی نہ سمجھے کہ فقط ایک مسئلے میں دو تین ہی مختلف احکام ائمہ کرام دیا کرتے تھے بلکہ ستر (۷۰) تک نوبت پہنچتی تھی جیسا کہ بحار الانوار میں امام جعفر صادق سے منقول ہے کہ امام موصوف فرماتے ہیں کہ ”میں ایک بات میں ستر (۷۰) پہلو رکھتا ہوں جس سے چاہوں^② نکل جاؤں۔“ غرض کہ ان اختلافات کو کوئی کہاں تک بیان کرے جس کو اس باغ کی بہار دیکھنا ہو وہ (بَابُ كِتْمَانِ الدِّينِ عَنْ غَيْرِ اَهْلِهِ) کو ”بحار الانوار“ سے نکال کر ذرا سیر کرے۔

پس جب کہ اختلاف احادیث کا یہ حال ہو اور خود حضرات ائمہ ایک بات میں ستر (۷۰) بات پیدا کرتے ہوں اور ایک وقت میں ایک سوال کے جواب میں اپنے مخلصین شیعوں کو ایسے مختلف جواب دیے ہوں جن میں سے ایک کو دوسرے سے نسبت نہ ہو اور اسی میں اپنی اور اپنے شیعوں کی خیریت سمجھے ہوں تو پھر صاحب استقصاء دو حدیثوں کے اختلاف پر کیوں تعجب کرتے اور کس لیے ان کی تطبیق کی فکر فرماتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ اختلاف

① و هذه عبارته عن زرارۃ عن ابی جعفر قال قال سالتہ عن مسئلة فاجابنی قال ثم جاء رجل فسالہ عنہا فاجابہ بخلاف ما اجابنی و اجاب صاحبی فلما خرج الرجلان قلت یا ابن رسول اللہ رجلان من اهل العراق من شیعتك قدما یسلان فاجبت کل واحد منهما بغیر ما اجبت بالآخر فقال یا زرارۃ ان هذا خیر لنا و ابقی لنا و لکم لو اجمعتم علی امر واحد لقصدکم الناس و لکان اقل بقائنا و بقائکم فقلت لابی عبد اللہ شیعتکم لو حملتموہم علی الاسنة و علی النساء لمضوا و ہم یخرجون من عندکم مختلفین قال فسکت اعدت ثلاث مرات فاجابنی مثل جواب ابیہ۔ ۱۲ (اصول کافی مطبوعہ نولکشور صفحہ ۳۷۷۔ ثانی ترجمہ اردو اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۱۱۸ مطبوعہ کراچی)۔

② و هذه الفاظ عن ابی عبد اللہ قال انی لاتکلم علی سبعین وجہا لی فی کلہا المخرج ۱۲۔

ان منافقوں اور جھوٹوں نے کیا ہے جن کو ائمہ اپنے پاس آنے نہ دیتے تھے اور وہ ائمہ کو بدنام کرتے تھے اور اپنی طرف سے حدیثیں اور باتیں بنا کر ان کی طرف منسوب کرتے تھے اور ائمہ کرام ان سے بیزاری ظاہر کرتے تھے اور ان پر لعنت کرتے تھے اور ان کو کاذب و ملعون کہتے تھے۔ اور وہ اپنی جھوٹی بنائی ہوئی باتوں کو ائمہ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اور اس امر کو ہم آئندہ شیعوں کی کتابوں سے ثابت کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

دوسری شہادت:

دوسری شہادت صحیفہ کاملہ میں جس کا ایک ایک لفظ حضرات امامیہ کے نزدیک صحت اور اعتبار میں کم از الفاظ قرآنی نہیں ہے لکھا ہے کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام پیغمبر خدا ﷺ کے اصحاب اور ان کے تابعین کی نسبت ان لفظوں سے دعا کیا کرتے تھے:

((اللَّهُمَّ وَأَصْحَابِ مُحَمَّدٍ ﷺ خَاصَّةً الَّذِينَ أَحْسَنُوا الصَّحَابَةَ

وَالَّذِينَ أُبْلِئُوا الْبَلَاءَ الْحَسَنَ فِي نَصْرِهِ..... الخ)) ❶

”اے خدا وندا! رحمت نازل کر اوپر اصحاب محمد ﷺ کے خاص کر اوپر ان

اصحاب کے جنہوں نے حق صحبت نہایت خوبی سے ادا کیا اور جنہوں نے سب

طرح کی مصیبتوں۔“

❶ وکلانفوه و اسرعوا الی وفادته و سابقوا الی دعوته استجابوا له حیث اسمعهم حجة رسالاته و فار قوا لاوزاج و الاولاد فی اظهار کلمته و قاتلو الآباء و الابناء فی تثبیت نبوته و انتصر و ابه و من کانوا منظوین علی محبته یرجون تجارة لن تبور فی مودته و الذین هجرت هم العشائر اذا تعلقوا بعروته و انتفت منهم القربات اذا سکنوا فی ظل قرابته فلا تنس لهم اللهم ماتر کوا الیک و فیک و ارضهم من رضوانک و بما حاشوا الخلق علیک و کانوا مع رسولک و عاة لک الیک و اشرهم علی هجرهم فیک دیار قومهم و خروجهم من سعة المعاش الی ضيقه و من کثرت فی اغراز دینک من مظلومهم اللهم و اوصل الی التابعین لهم باحسان الذین یقولون ربنا اغفر لنا و لاخواننا الذین سبقونا بالایمان خیر جزائك الذین قصدوا اسمتهم و بحرروا و اوحیتهم و مضوا علی شاکلتهم لم ینتهم ریب فی بصیرتهم و لم نحلجهم شک فی فقا آثارهم و الا تیمام بهدایة منام رهم مکانفین موازرین لهم یدینون بدنیهم و یهتدون بهدیهم یتفقون علیهم و لا یتهمونهم فیما ادوا الیهم اللهم وصل علی التابعین من یومنا هذا الی یوم الدین و علی

اور ایذاؤں کو اس کی اعانت میں گوارہ کیا اور جنہوں نے مل کر اس کی مدد میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا اور جنہوں نے اس کی رسالت کے قبول کرنے میں بڑی جلدی کی اور اس کی دعوت کی اجابت میں سبقت کی جب ان کو پیغمبر خدا نے اپنی پیغمبری کی حجتیں بتائیں انہوں نے بلا توقف قبول کیا اور ان کے کلمے کے ظاہر کرنے میں اپنے بیوی اور بچوں کو چھوڑا اور ان کی نبوت کے ثابت کرنے میں اپنے باپ اور بیٹوں کو قتل کیا۔ جب انہوں نے پیغمبر کا دامن پکڑا تو ان کے کنبے قبیلے کے لوگوں نے ان کو چھوڑ دیا اور جب وہ پیغمبر کے قرابت کے سائے میں آئے تب ان کے رشتہ داروں نے ان سے رشتہ توڑ دیا، پس خدا یا مت بھولنا تو ان باتوں کو جو پیغمبر ﷺ کے اصحاب نے تیرے واسطے اور تیری راہ میں سب کو چھوڑا، اور راضی کر دینا تو ان کو اپنی رضامندی سے اس لیے کہ انہوں نے خلق کو تیری طرف جمع کر دیا اور تیرے پیغمبر ﷺ کے ساتھ دعوت اسلام کا حق ادا کیا۔ الہی وہ شکر کرنے کے لائق ہیں کہ انہوں نے اپنی قوم اور کنبے کے گھر اور اپنے وطن کو تیرے پیچھے چھوڑا اور عیش و آرام کو ترک کر کے ضیق معاش کو تیرے لیے اختیار کیا اور خداوندان کے تابعین کو جزائے خیر دے جو کہ دعا کیا کرتے ہیں: ”پروردگار ہماری مغفرت کر اور ہمارے ان بھائیوں کی جو ہم میں سے ایمان میں سبقت لے گئے ہیں۔“ کیسے تابعین جو ان کی راہ پر چلتے ہیں اور ان کے آثار کی پیروی کرتے ہیں اور ان کی ہدایت کی نشانیوں کی اقتدا کرتے ہیں جن کوئی کوئی شک ان کی نصرت میں نہیں ہوتا اور جن کے دل میں کوئی شبہ ان کے آثار کی پیروی میں نہیں آتا کیسے تابعین جو معاون اور مددگار اصحاب کے ہیں اور جو اپنا دین ان کے دین کے موافق رکھتے ہیں اور جو ان کی ہدایت کے مطابق ہدایت پاتے ہیں اور جو اصحاب سے اتفاق رکھتے ہیں اور جو کچھ اصحاب نے ان کو پہنچایا اس میں ان پر کچھ تہمت نہیں کرتے ہیں اور خدا یا رحمت نازل کر ان اصحاب کی تبعیت کرنے والوں پر آج کے دن سے جس میں ہم ہیں قیامت تک اور ان کی ازواج و

ذریات پر۔ فقط ❶

اے مسلمانو! اس دعا کے لفظوں پر خیال کرو اور ان کے معنی غور سے سوچو اور سمجھو کہ امام زین العابدین علیہ السلام نے دعا میں کن لفظوں سے پیغمبر ﷺ کے اصحاب کو یاد فرمایا ہے اور ان کے محامد اور اوصاف کو کس خوبی سے بیان کیا ہے اور ان کی کوششوں اور مصیبتوں کو جو راہِ خدا میں اٹھائیں کس طرح پر ظاہر کیا ہے اور ان کے حق میں کس سوز دل سے دعا فرمائی ہے، کون شخص ہے کہ جو دعویٰ ایمان اور اسلام کا رکھتا ہو وہ بعد سننے اس دعا کے پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت میں شک کرے گا اور کون آدمی ہے کہ جو ائمہ کرام کی امامت کو اصول دین سے سمجھتا ہوگا اور ان کے اقوال اور فعل پر عمل کرنے کا دعویٰ رکھتا ہوگا، وہ امام کی زبان سے ایسی تعریفیں صحابہؓ کی سن کر ان کا معتقد نہ ہوگا۔

پوشیدہ نہ رہے کہ جب ہم صحابہ کے فضائل میں احادیث اور اقوال کو اپنی کتابوں سے نقل کرتے ہیں تو حضرات امامیہ ان کو موضوع اور غلط کہہ دیتے ہیں اور جب ان کی کتابوں سے ائمہ کرام کے اقوال کی سند لاتے ہیں تو اس کو تقیہ پر محمول فرما دیتے ہیں لیکن یہ دعا صحیفہ کاملہ کی ایسی ہے کہ جس پر تقیہ کا بھی احتمال نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ یہ وہ دعا ہے جو امام زین العابدین مناجات میں بوقت خلوت حالت خاص میں خدا سے کیا کرتے تھے اور راز و نیاز کے وقت اصحاب رسول کی تعریفیں خدا کے روبرو کر کے ان پر درود بھیجا کرتے تھے اور ان کی کوششوں اور مصیبتوں کو جو خدا کی راہ میں اٹھائیں بیان کر کے خدا سے ان کے لیے طلب رحمت کیا کرتے تھے، پس اس وقت نہ کسی کا خوف تھا نہ کسی سے اندیشہ کہ جس سے ضرورت تقیہ کرنے کی ہوتی، پس اس دعا میں احتمال تقیہ کی بھی گنجائش باقی نہ رہی اور امام کی زبان سے اعلیٰ درجہ کی تعریف اصحاب رسول کی ثابت ہو گئی۔ پس حضرات امامیہ کو چاہیے کہ اوّل سے آخر تک اس دعا کو دیکھیں اور لفظ لفظ پر غور فرمائیں اور انصاف کریں کہ جب امام علیہ السلام مناجات میں ایسی ستائش اصحاب کی کریں اور ان کے تابعین کے حق میں دعائے خیر فرمائیں اور بالفاظ (وارضہم من رضوانک واشکرہم علی ہجرہم فیک) ان کے لیے رضائے الہی کے طالب ہوں اور ان کے مصائب اور تکالیف کو ذریعہ رضوان الہی کا جانیں اور

ان کو باعث ترقی دین اسلام کا فرماویں اور پھر بھی ائمہ کی اطاعت کے دعویٰ کرنے والے اور اپنے آپ کو قدم بقدم ائمہ کے طریقوں پر چلنے والے اپنے آپ کو امامیہ کہنے والے برخلاف اس کے اصحاب رسول کی برائیاں بیان کریں اور ان کی ہجو و مذمت کو شعائر دین سے ٹھہراویں اور ان کی عیب جوئی میں شب و روز صرف اوقات کریں اور ان کے محامد و اوصاف سے اغماض کر کے مطاعن کے اظہار میں مصروف رہیں اور بجائے دعائے خیر اور طلب رحمت کے ان کے حق میں بددعا کرنے کو عبادت جانیں اور ان کی پیروی کو ذریعہ ضلالت و گمراہی کا سمجھیں اور جو کوئی ان کی چال چلنا چاہے اس کو دائرہ اسلام سے خارج جانیں اور جو کوئی ان پر تہمت کرے اور ان سے دشمنی رکھے اس کو بڑا مومن پاک تصور کریں۔ معلوم نہیں کہ ان حضرات کی اصطلاح میں محبت اور ایمان کے کیا معنی ہیں اور عداوت اور کفر کا کیا مطلب ہے۔ اہل سنت جو ائمہ کرام کے اقوال و اعمال پر عمل کریں وہ خارجی اور ناصبی کہلائیں اور حضرات شیعہ جو ان کے اقوال و افعال سے مخالفت رکھیں وہ امامیہ اور دوست اہل بیت کے ٹھہریں۔“ فاعتبروا یا اولی الابصار ان هذا الشیء عجیب۔

جاننا چاہیے کہ اس دعا سے چند فائدے حاصل ہوئے (اول) امام کا اصحاب کے حق میں دعائے خیر کرنا اور ان پر درود بھیجنا اور ان کے حق میں گمان نیک رکھنا۔ (دوسرے) ان اصحاب کا سب سے افضل ہونا جو سب سے اوّل ایمان لائے اور اصحاب رسول کا خدا کی راہ میں ایذا میں اور مصیبتیں اٹھانا اور خدا کے لیے گھر بار چھوڑ کر ہجرت کرنا اور پیغمبر کے پیچھے ان کے قریبی اور رشتہ داروں کا ان سے قرابت اور رشتہ چھوڑ دینا اور خدا کے دین میں داخل ہونے کے لیے لوگوں کو دعوت اسلام کی کرنا (تیسرے) اصحاب کے تابعین کی فضیلتیں اور ان کی نشانیاں۔ اب ہر ایک امر کی نسبت ہم علیحدہ علیحدہ بحث کرتے ہیں۔

امراول: امام کا اصحاب رضی اللہ عنہم کے حق میں دعائے خیر کرنا:

اصحاب کے حق میں دعائے خیر کرنا اور ان کو نیکی سے یاد کرنا درحقیقت پیغمبر خدا ﷺ کے حکم کی اطاعت کرنا ہے، اس لیے کہ خود حضرت نے ان کے حق میں ایسا فرمایا ہے، چنانچہ

اوپر ہم ”عیون الاخبار“ سے اس حدیث کو بیان کر چکے ہیں کہ حضرت پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا: کہ (دعوالی اصحابی) کہ میرے اصحابوں کو میرے لیے چھوڑ دو اور میری صحبت کے حقوق کی ان کے حق میں رعایت کرو، اور اس کی تائید میں اور احادیث اور اقوال نقل کرتے ہیں۔

اوّل:..... ”حدیقة سلطانیہ“ کی جلد سوم بحث نبوت میں جناب میرن صاحب قبلہ فرماتے ہیں کہ جب پیغمبر ﷺ کا وقت وفات قریب آیا تو حضرت نے منبر پر جا کر اصحاب سے پوچھا کہ میں کیسا پیغمبر تھا، سبھوں نے عرض کیا کہ جو کچھ صبر آپ نے خدا کی راہ میں گوارا کیا اس کی جزائے خیر خدا آپ کو دے تب حضرت نے جواب میں فرمایا: ”خدا شمارا نیز جزائے خیر دھد“ (خدا تم کو بھی اچھا بدلہ دے) یہ روایت صفحہ ۳۲۸ حدیقة سلطانیہ میں موجود ہے، پس معلوم نہیں کہ اس وقت جب کہ ہزاروں اصحاب موجود تھے اور واسطے وداع پیغمبر خدا ﷺ کے مسجد میں جمع ہوئے تھے حضرت کا ان سے مخاطب ہو کر یہ فرمانا کہ خدا تم کو جزائے خیر دے کس امر پر محمول کیا جائے اور کیوں کر ایسے اصحاب کے حق میں گمان نیک نہ کیا جائے۔

دوم:..... تفسیر امام حسن عسکری علیہ السلام میں لکھا ہے:

((ان رجلا ممن یبغض ال محمد و اصحابه او واحدا منهم
یعذبہ اللہ عذابا لو قسم علی مثل ما خلق اللہ لا ھلکم
اجمعین .))

”اگر کوئی شخص دشمنی رکھے آل محمد ﷺ سے اور اصحاب محمد سے یا ایک سے بھی منجملہ ان کے اس پر خدا ایسا عذاب کرے گا کہ اگر وہ تقسیم کیا جائے تمام خلق پر تو وہ سب ہلاک ہو جائیں۔“

پس جس طرح پر آل محمد ﷺ کی دشمنی حرام ہے، اسی طرح پر اصحاب محمد کی عداوت حرام ہے۔

سوم:..... پیغمبر خدا ﷺ نے اپنے اصحاب کے سب و دشنام سے منع کیا ہے، چنانچہ

”جامع اخبار“ میں کہ معتمدین کتب شیعہ سے ہے منقول ہے:

((قال النبی من سبنی فاقتلوه و من سب اصحابی فاجلدوه .))

”جو کوئی مجھے برا کہے اس کو قتل کرو اور جو کوئی میرے اصحاب کو برا کہے اس کو

درّے لگاؤ۔“

چہارم:..... کتاب ”مفتاح الشریعۃ“ اور ”مفتاح الحقیقت“ میں جس کو ملّا باقر مجلسی

نے..... بحار الانوار میں اور قاضی نور اللہ شوستری وغیرہ نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی

طرف منسوب کیا ہے کہ غیبت بہت برا عیب ہے اور بہتان اور افترا اس سے بھی بڑھ کر ہے،

یہ عمل جب کہ آدمیوں کے حق میں غیبت اور بہتان گناہ کبیرہ ہے تو پھر اصحاب پیغمبر خدا ﷺ

کے حق میں کتنا بڑا گناہ ہوگا۔ پس ان کے حق میں اعتقاد نیک رکھنا ضروریات سے ہے، ان

کے فضائل بیان کرنے میں رطب اللسان رہنا چاہیے اور ان کے دشمنوں کی صحبت سے نفرت

رکھنا چاہیے کہ اس سے نفاق خفی دل میں پیدا ہوتا ہے، پس باوجود اس کے کہ یہ روایتیں خود

شیعوں کی کتابوں میں موجود ہوں اور پیغمبر خدا کا اور ائمہ کرام کا دعائے خیر کرنا اصحاب کے حق

میں ثابت ہوا اور پھر وہ اصحاب کے کینے کو افضل عبادت جانیں اور لعنت کرنے کو جو کہ خود

انہی پر لوطی ہے عمدہ ترین اطاعت جانیں اور جن پر امام زین العابدین اور دیگر ائمہ کرام درود

بھیجیں ان پر تبرا کریں اور اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے سوائے لعنت کے اپنی زبان پر دوسرا لفظ نہ

لائیں اور بجائے ”لعنتیہ“ کے اپنے فرقے کا نام ”امامیہ“ رکھیں۔

امردوم: پیغمبر خدا کے یاروں کا، ایمان کے سبب مصیبت پانا اور ایذا پانا اور جو

سب سے اوّل ایمان لائے ان کا اوروں سے افضل اور بہتر ہونا:

اس دعا سے امام علیہ السلام کے پیغمبر خدا علیہ التحیۃ والثناء کے اصحاب کرام کے جو

فضائل ثابت ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ ان کا پیغمبر خدا ﷺ کی مددگاری میں مصائب اور تکالیف

کا پانا، حضرت کی محبت میں اپنے بال بچوں اور گھر بار کو چھوڑنا اور اپنے وطن سے ہجرت کر

جانا، اثبات نبوت میں اپنے باپ بیٹوں، عزیزوں کو قتل کرنا، پیغمبر خدا ﷺ کی دعوت کو قبول

کرنا اور خلق کو خدا کی طرف جمع کر دینا۔ ان فضائل کو امام نے اس تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ کسی شیعہ کو کیسا ہی متعصب کیوں نہ ہو اس کی تکذیب و تاویل کی جرأت باقی نہیں رہی، اس لیے کہ کتاب ”صحیفہ کاملہ“ ایسی معتبر کتاب ہے کہ حضرات شیعہ اس کو ”زبور آل محمد“ کہتے ہیں اور اس کے لفظ لفظ اور حرف حرف کو صحیح جانتے ہیں اور جو کچھ اس میں لکھا ہے اس کی تصدیق کرتے ہیں، پس ان فضائل کو جو امام نے بیان کیے دیکھ دیکھ کر گودل میں جلتے ہوں اور اپنے محدثین اور علماء کو اس کی تصدیق و تصحیح پر برا بھلا کہتے ہوں، لیکن کسی طرح پر اس کی تکذیب نہیں کر سکتے باقی رہی تاویل اس کی تین صورتیں ہیں (۱) یا یہ کہ ان فضائل کا مصداق سوائے صحابہ کے اور کسی کو گردانیں جیسا کہ حدیث (أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ) وغیرہ میں گردانا، (۲) یا یہ کہ اس کو تقیہ وغیرہ پر محمول فرمائیں جیسا کہ اور احادیث ائمہ میں کیا ہے (۳) یا یہ کہ ان فضائل کو اپنے مقبولین صحابہ کے حق میں قبول کریں اور اکثر مہاجرین اور انصار کو خصوصاً خلفائے ثلاثہ (رضی اللہ عنہم) کو اس سے خارج سمجھیں، لیکن تینوں طرح سے تاویل کا دروازہ بند ہے اور سوائے اس کے کہ موافق ہمارے مذہب کے ان فضائل کو تمام مہاجرین و انصار کی نسبت خصوصاً خلفاء ثلاثہ کے حق میں تسلیم کریں اور دوسرا چارہ نہیں ہے، چنانچہ ہم تینوں تاویلوں کا بطلان ثابت کرتے ہیں۔

امر اوّل کہ مصداق ان فضائل کے صحابہ کرام نہیں ہیں اس کا خود کسی شیعہ نے دعویٰ نہیں کیا بلکہ ان فضائل کا صحابہ کی شان میں وارد ہونے کو ان کے علماء نے قبول فرمایا ہے، چنانچہ صاحب ”نزہہ اثنا عشریہ“ نے بجواب جلد چہارم تحفہ کے اس کو تسلیم فرمایا: وھذہ عبارتہ:

((کہ امامیہ جمیع اصحاب را مقدوح و مجروح نمی دانند بلکہ بسیارے از صحابہ عظام را جلیل القدر و ممدوح بلکہ از اولیاء کرام می دانند و مستحق رحمت و رضوان ملک منان می پندارند در صحیفہ کاملہ کہ فرقه حقہ آن راہ زبور آل محمد گویند دعائے کہ از حضرت سید الساجدین علیہ

السلام ماثورست شاہد عدل این دعویٰ ست .))
 ”فرقہ امامیہ کے نزدیک تمام صحابہؓ ناقابلِ شہادت، کمزور اور معیوب نہیں بلکہ
 اکثر صحابہ عظام کو جلیل القدر، مدوح اور اولیائے کبار متصور کیا جاتا ہے اور انہیں
 خدا کی رحمت و رضا مندی کا مستحق سمجھا جاتا ہے، فرقہ حقیقہ جس کو ”زبور آل محمد“
 کہتا ہے اس صحیفہ کاملہ (نامی کتاب) میں سید الساجدین علیہ السلام کی دعائے
 ماثور ہمارے اس دعویٰ کی شاہد عدل ہے۔“

رہا امر دوم کہ امام نے یہ فضائل براہِ تقیہ کے بیان کیے ہیں اس کو بھی کسی عالم نے
 علمائے شیعہ سے بیان نہیں کیا اور کیوں کر لفظ تقیہ کا اس موقع پر زبان پر لاتے، اس لیے کہ
 یہ فضائل جو امام نے بیان کیے وہ کسی ناصبی و خارجی اور دشمن اہل بیت اور دوست صحابہ کے
 سوال کے جواب میں بیان نہیں فرمائے کہ احتمال تقیہ کا ہوتا اور حضرات شیعہ یہ کہہ کر کہ امام
 نے بخوفِ جان و آبرو مسائلِ ناصبی کے ظلم سے بچنے کے لیے جھوٹی تعریفِ اصحاب کی کر دی،
 جان بچالے جانے (کذا) بلکہ یہ تعریف امام نے خدائے جل شانہ سے بوقتِ دعا کی ہے
 جس وقت سوائے ان کے اور خدا کے دوسرا نہ ہوتا تھا اور خلوت میں راز و نیاز کا دفتر پروردگار
 کے حضور میں کھولا جاتا تھا، امام داعی ہوتے تھے اور خدا مجیب ہوتا تھا، پس خیال کرنا چاہیے کہ
 اصحاب رسولؐ کی عزت اور بزرگی امام کے دل میں کس درجہ پر تھی کہ ایسے راز و نیاز کے وقت
 میں بھی ان کو نہ بھولتے تھے اور جس طرح پر اپنے اور اپنے اہل بیت کے لیے دعا کرتے تھے
 اور انبیاء و رسل کے حق میں درود بھیجتے تھے اسی طرح پر اصحاب رسول کے لیے دعا فرماتے اور
 ان پر صلوة و رحمت کی استدعا کرتے تھے۔ اگر کاش! حضرت امام (اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی
 مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ وَّأَصْحَابِ مُحَمَّدٍ) کہہ کر قناعت کرتے تو بھی کافی تھا اور دعا کے
 وقت ان کے محامد اور اوصاف کے دفتر کھولنے کی ضرورت نہ تھی مگر قربان جائیں امام سجاد علیہ السلام
 کی محبت اور انصار کے کہ انہوں نے اتنے پر قناعت نہ کی اور اپنے خدا کے سامنے اپنے دادا
 کے یاروں کے ایمان اور مصائب اور تکالیف کی تفصیل بیان کر کے ان پر رحمت نازل کرنے

کے لیے دعا کی اور نہ صرف دعا کی بلکہ مہاجرین کی محنتوں اور کوششوں و مصیبتوں کا ذکر کے ان کی شکرگزاری خدا سے چاہی، اسی واسطے حضرت نے اس دعا میں فرمایا (واشکرہم علی ہجرہم) کہ خداوند مہاجرین رضی اللہ عنہم نے جو ہجرت تیرے واسطے کی اور اپنے گھر بار کو تیرے پیچھے چھوڑا اس کی شکرگزاری کر، پس کون شخص ہے کہ ان الفاظ اور فقرات کو دیکھ کر امام کی محبت کا ساتھ صحابہ کے معتقد نہ ہوگا اور کس کی زبان سے حرفِ عداوت کا باہم صحابہ اور اہل بیت کے نکلے گا۔ لیکن آفریں ہے حضراتِ شیعہ کے ایمان اور محبت پر کہ اپنے آپ کو امامیہ کہیں اور ائمہ کرام کی خالص محبت کا دعویٰ کریں اور اپنے آپ کو پیرو امام کا جانیں اور بائیں ہمہ صحابہ کی عداوت رکھیں اور جس قدر امام ان کی تعریف کریں اس سے ہزار حصہ بڑھ کر وہ ان کی برائیاں بیان کریں اور اگر کسی سنی بے چارے کی زبان بہ تبعیتِ ائمہ کرام (اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ کے بعد وَاَصْحَابِ مُحَمَّدٍ) نکل جائے تو غیظ میں آکر اس کو غصے سے دیکھنے لگیں اور اتنی ہی بات پر اس کو خارجی اور ناصبی کہنے لگیں، سچ تو یہ ہے کہ جو امور ابطالِ اسلام و ایمان کے پردے میں محبتِ اہل بیت کے حضراتِ شیعہ نے کیے ہیں وہ دشمنوں سے بھی نہیں ہوتے، ولنعلم ما قیل، شعر:

آنچه بہ فیضی نظر دوست کرد
مشکل اگر دشمن جانے کند

”فیضی کے ساتھ جو کچھ دوست کی نظر نے کیا کوئی جانی دشمن بھی مشکل سے کرے گا۔“

باقی رہا امر سوم کہ ان فضائل کے مصداق صرف وہی اصحاب ہیں جن کو علمائے شیعہ اچھا جانتے ہیں اور اکثر مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم خصوصاً خلفائے ثلاثہ اس سے خارج ہیں، سو اس کا دعویٰ سب علمائے شیعہ نے کیا ہے اور اسی تاویل کو جواب ان فضائل کا تصور فرمایا ہے، لیکن جب اس امر کو حضراتِ شیعہ نے تسلیم کر لیا کہ وہ فضیلتیں جو امام نے اس دعا میں بیان کی ہیں وہ اصحاب کرام کی شان میں ہیں تو مابہ النزاع درمیان ہمارے اور حضراتِ شیعہ کے صرف یہ

امر رہ گیا کہ مراد اس سے تمام مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم ہیں یا نہیں بلکہ اصل تصفیہ اس امر پر منحصر رہا کہ خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم میں داخل ہیں یا نہیں..... چنانچہ ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ جو فضائل امام نے بیان کیے ہیں وہ تمام مہاجرین و انصار پر خصوصاً خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم پر صادق آتے ہیں، اس لیے کہ وہی لوگ وہ ہیں جن کے افعال و اعمال اور سیرت اور چال چلن سے ثابت ہوتا ہے:

((ابلو البلاء الحسن فے نصرہ و کانفوا واسر عوا الی وفادتہ

و فارقوا الازواج والا ولاد فی اظہار کلمتہ .))

”یعنی انہوں نے سب طرح کی بلاؤں اور مصیبتوں کو پیغمبر صاحب کی اعانت

میں گوارا کیا اور حضرت کی دعوت کو سب سے اوّل سنا اور بال بچوں، آل و اولاد،

گھر بار کو اس کلمے کے ظاہر کرنے میں چھوڑا۔“

اور اس دعوے کو بھی ہم ثابت کرتے ہیں۔

جب پیغمبر خدا ﷺ نے مکہ معظمہ میں دعویٰ نبوت کا کیا اور لوگوں کو بحکم پروردگار اسلام کی خوبیوں سے آگاہ کیا تو آہستہ آہستہ لوگوں نے اسلام قبول کیا اور کفار قریش نے ان لوگوں کو جو حضرت ﷺ پر ایمان لائے تھے ستانا اور ایذا دینا شروع کیا یہاں تک کہ برادری اور قرابت ان سے چھوڑ دی اور اپنے گروہ سے ان کو خارج کر دیا اور خرید و فروخت ان سے بند کر دی مگر ان مومنین نے اسلام کو نہ چھوڑا اور سب کو چھوڑ کر پیغمبر ﷺ کا دامن پکڑا اور یہ ظاہر ہے کہ تمام مہاجرین رضی اللہ عنہم اسی گروہ میں داخل ہیں بالخصوص خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم ان سب کے پیشوا ہیں تو سوائے ان کے یہ فضائل اور کس پر صادق ہوں گے اور اگر وہی خارج کر دیے جائیں تو وہ لوگ جنہوں نے ایمان قبول کیا اور جن کو کفار نے ستایا کون سے تھے اور کس ملک سے آئے اور کہاں رہتے تھے۔ ذرا کوئی حضرات شیعہ سے ان کے نام اور حالات کو پوچھے اور دیکھے کہ وہ سوائے انہی مہاجرین اور خلفائے راشدین کے کسی دوسرے کا نام بتلاتے ہیں یا نہیں۔ ہم نے جہاں تک شیعوں کی کتابوں کو دیکھا ہے اور جو کچھ ان کے عالموں

سے سنا تو یہی دیکھا اور سنا کہ انہی مہاجرین اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا نام وہ بھی لیتے ہیں اور انہی کو ایمان لانے والوں میں شمار کرتے ہیں مگر اتنا فرق ہے کہ ہم ان کے ایمان کو صدق دل سے تصور کرتے ہیں اور وہ اس کو نفاق پر یا طمع دنیا پر یا کاہنوں اور نجومیوں کے سننے پر محمول کرتے ہیں، لیکن اس کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ لوگ ظاہر میں ایمان لائے اور پیغمبر خدا ﷺ کی نبوت کے معتقد ہوئے، جیسا کہ ”حملہ حیدری“ کا مؤلف لکھتا ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ وعظ و نصیحت کیا کرتے اور ایک ایک دو دو آدمی ان پر ایمان لایا کرتے، کما قیل ابیات:

دگر وعظ و ارشاد بر ایس نسق
 در ابطال اصنام و اثبات حق
 نمودی حبیب خدائے جہاں
 نہ کردی ولے کار در مشرکان
 بخواندی مدام از کلام مجید
 بر آں قوم آیات وعد و وعید
 نمودی اثر گفتمہ اش گاہ گاہ
 کہ بگذاشتی یکدو کس پابراہ
 ولیکن نہ جملہ زراہ یقیں
 یکے بھر دنیا یکے بھر دیں
 بنادان رسد گر بگردد خطا
 کہ دنیا کجا بود با مصطفیٰ
 چنین ست دنیا نبود آن زمان
 ولے بود آیندہ منظور شان

خبر دادہ بود ندچوں کاهناں
 کہ دین محمد بگیرد جہاں
 ہمہ پیر وانش بہ عزت رسند
 تمام اہل انکار ذلت کشند
 یکے کرد ازیں راہ ایماں قبول
 یکی محض بہر خدائو رسول ❶

”حق کو ثابت کرنے اور اصنام (پرستی) کو مٹانے کے لیے اسی طریقے پر وعظ و ارشاد حبیب خدا ﷺ فرماتے رہے لیکن مشرکوں پر اس کا اثر نہ ہوا۔ کلام مجید اور اس کی وعدہ و وعید کی آیات اس قوم کو پڑھ کر سناتے رہے کبھی کبھار آپ کی بات کا اثر ان پر ہو جاتا کہ اکا دکا لوگ راہ راست پر آجاتے مگر سب نے یقین کے ساتھ (اسلام قبول نہیں کیا) بلکہ ایک نے دنیا کی خاطر اور ایک نے دین کے لیے لیکن یہ بات بڑی بیوقوفی کی ہوگی، اگر کوئی گرفت کرے کہ حضور ﷺ کے پاس اس وقت دنیا کہاں تھی، بات یہی ہے کہ اس وقت دنیا نہ تھی لیکن آئندہ ان کے پاس (دنیا کی دولت) آنے والی تھی، کاهنوں نے ان کو یہ خبر دے رکھی تھی کہ دین محمد ﷺ کا دنیا میں بول بالا ہوگا، ان کے تمام پیروکاروں کو عزت ملے گی اور سارے انکار کرنے والے ذلیل ہوں گے، ایک (طبقہ) نے اس (دنیا کی لالچ کی) راہ سے ایمان قبول کیا اور ایک نے محض خدا اور رسول کے لیے۔“

اور اس امر کو کہ کوئی مہاجرین رضی اللہ عنہم میں سے بہ نفاق یا بہ طمع دنیا یا باستماع خبر کاهناں ایمان نہیں لایا بلکہ صدق دل سے ہر ایک نے اسلام قبول کیا ہم آگے ثابت کریں گے لیکن اس مقام پر ہم اتنا ہی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضرات شیعہ ان لوگوں کا اسلام لانا قبول کرتے ہیں اور ان کو منکرین نبوت سے نہیں جانتے، چنانچہ یہ بات انہیں چند اشعار سے

ثابت ہوگئی اور چونکہ اور علماء کا بھی یہی قول ہے، اس لیے اور کتابوں کی سند لانا تحصیل حاصل ہے، باقی رہا ان مسلمانوں کا ایذا اور مصیبت اٹھانا اور کفار قریش کے ہاتھ سے تنگ ہونا اس کو بھی علمائے شیعہ تسلیم کرتے ہیں اور انہی مہاجرینؓ کا جن کو وہ منافق اور مرتد جانتے ہیں، (و نعوذ باللہ من ذالک) کفار قریش کے ہاتھ سے مصیبت پانے کا اقرار کرتے ہیں، چنانچہ مؤلف موصوف لکھتا ہے کہ جب پیغمبر خدا ﷺ پر بہ سبب محافظت ابو طالب کے کفار کو قدرت نہ ہوئی تو ان کے اصحابؓ کو ستاتے اور ایذا دیتے، کما قیل ابیات :

”ولے ❶ چوں ابو طالب نامور
نگہبان او بود ازیں بیشتر
بایذای او کس نمی یافت دست
رسانیدی اصحاب او را شکست
بهر کوے و هر برزن و هر ممر
که کردی ز اصحاب او کس گزر
نمودندے اعدای او از غلو
بهر گونه آزار و ایذای او
به ضرب و شتم و بمشت و لكد
بدیگر ستمھائے بیرون ز حد
فگندی زهر سو بسر خاک شان
نمودی برهنه تن پاک شان
پس آنکه نشانندی چنان بیشاب
دراں ریگ تفتنده از آفتاب

بریدی ازاں قوم آب و طعام
 زدی تازیانه زخلف وامام
 دگر ظلمہائے ہلاکت مآل
 کہ آرد بیانش بدلہا ملال
 نمودندی آن ناکسان شقے
 برآں زمرہ مومن و متقے

”لیکن جب ابو طالب جیسے نامور فرد آپ ﷺ کے پہلے ہی سے محافظ موجود تھے تو ان (محمد ﷺ) کو ستانے کی ہمت کسی میں نہ تھی، آپ کے بجائے آپ کے اصحاب کو ستانے لگے، ہر گلی کوچے اور راستے پر جہاں آپ ﷺ کے اصحاب کا گزر ہوتا ہر طرح سے آپ کے دشمن ان کو سخت تکلیف اور اذیت دیتے تھے، مار گالی گھونسے اور لات وغیرہ سے بے حد ستم ڈھاتے، ہر طرح سے ان پر مٹی ڈالتے اور ان کے جسموں کو ننگا کر دیتے، اس کے بعد برہنہ جسم ان کو دھوپ سے تپتی ہوئی ریت پر ڈال دیتے، ان لوگوں کا کھانا پانی بند کر دیتے اور آگے پیچھے سے ان پر کوڑے برساتے اور دوسرے ہلاکت خیز ظلم ان پر کرتے کہ جن کے بیان سے دل رنجیدہ ہوتا ہے (ایسے ہی ستم) وہ ناکس اور بد بخت لوگ ان مومن و متقی لوگوں کی جماعت پر کرتے۔“

اب کوئی حضرات شیعہ سے پوچھے کہ باوجود تصدیق اس امر کے اصحاب نبی ﷺ پر کفار کے ہاتھ سے اس قسم کی مصیبتیں اور تکلیفیں پہنچتی تھیں اور وہ اس پر صبر کرتے تھے اور پیغمبر خدا ﷺ سے جدا نہ ہوتے تھے اور اعلائے کلمۃ اللہ میں دن رات سعی بلیغ کرتے رہتے تھے تو اگر ان لوگوں کے حق میں وہ صفات جو امام نے بیان کیے صادق نہیں ہیں تو پھر وہ دوسرے لوگ کون ہیں جو مصداق ان صفات کے ہیں، اگر حضرات شیعہ انصاف کو دخل دیں اور تعصب اور عناد کو چھوڑ دیں اور امام کے اس کلام پر غور کریں:

((الذین ہجرتہم العشائر اذ تعلقوا العروتہ وانتفت منہم
القرابات اذسکنوا فی ظل قرابتہ .))

”جب انہوں نے پیغمبر ﷺ کا دامن پکڑا تو ان کے قبیلے والوں نے ان کو
چھوڑ دیا اور جب وہ پیغمبر ﷺ کی قرابت کے سائے میں آئے تب ان کے
رشتہ داروں نے ان سے رشتہ توڑ دیا۔“

اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات کو خود اپنی ہی کتابوں سے نکال کر دیکھیں تو تمام
مہاجرین رضی اللہ عنہم کو مصداق اس مضمون کا پائیں اور کسی ایک کو اس فضیلت سے مستثنیٰ نہ کریں،
لیکن اس پر بھی حضرات شیعہ کی خاطر جمع نہ ہو اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے ایمان اور
اسلام کی تفصیل بقید ان کے نام کے چاہیں تو اس کو بھی بغور سنیں اور اپنی ہی کتابوں کی کسی سند
کو لیں۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کا حال:

حضرات شیعہ اقرار کرتے ہیں کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ انہی چند لوگوں میں ہیں جو سب
سے اوّل ایمان لائے اور جنہوں نے ارووں سے پہلے پیغمبر ﷺ کی نبوت کو تصدیق کیا،
چنانچہ ہم حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کا حال آیہ غار کے بیان میں لکھ چکے ہیں،
اس مقام پر صرف ان اعتراضات کو بہ تفصیل رد کرتے ہیں جو کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے
ایمان پر علمائے شیعہ نے کیے ہیں۔ منجملہ ان اعتراضات کے جو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایمان
پر حضرات شیعہ کرتے ہیں، ایک یہ ہے کہ انہوں نے کاہن سے سنا تھا کہ ایک پیغمبر ﷺ
پیدا ہوگا اور اس پر ایمان لانے والے اور اس کی اطاعت کرنے والے بڑے مرتبے پر پہنچیں
گے، اس لیے وہ ایمان لائے، چنانچہ مؤلف ”حملہ حیدری“ بھی مثل اپنے اور علماء کے لکھتا ہے: ❶

ابابکر رضی اللہ عنہ پس برہ پاگذاشت

کہ گفتار کاہن بدل یادداشت

باو کاهنے دادہ بود ایس خبر
 کہ مبعوث گردد یکے نامور
 زبطحاز میں در ہمیں چند گاہ
 بود خاتم انبیائے الہ
 تو با خاتم انبیاء بگردے
 چون او بگذرد جانشینش شوی
 ز کاهن چو بودش بیاد این نوید
 بیاورد ایمان نشان چوں بدید

”اس کے بعد ابو بکرؓ اپنے مشغلہ میں لگے رہے اور کاهن کی بات دل سے یاد رکھی۔ ایک کاهن نے ان کو یہ خبر دی تھی کہ ایک (مشہور پیغمبر ﷺ) مبعوث ہوں گے یہاں سے کچھ فاصلے پر سرزمین بطحا میں اللہ کے آخری نبیؐ ہوں گے تم خاتم النبیینؑ کے ساتھ رہو گے ان کے بعد تم ان کے جانشین بنو گے، کاهن کی اس نوید (مسرت) کو انہوں نے یاد رکھا، چنانچہ (محمد ﷺ کے اندر وہ) نشانیاں جب دیکھ لیں تو ایمان لے آئے۔“

لیکن یہ قول باطل ہے چند دلیلوں سے۔

پہلی دلیل:..... اگر یہ امر تسلیم کیا جائے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کاهن کے کہنے سے ایمان لائے تو ضرور اس کے کہنے کو سچ جانا ہوگا تو جس طرح پر اس کے اس کہنے کو تصدیق کیا کہ خلافت بعد رسول کے ان کو ملے گی اسی طرح پر اس کے اس کہنے کو بھی تصدیق کیا ہوگا کہ وہ نبی برحق ہوں گے اور ان کا دین سچا ہوگا تو ضرور وہ پیغمبر ﷺ کو سچا پیغمبر سمجھ کر ایمان لائے ہوں گے، پس اس سے بھی تصدیق رسالت ثابت ہوتی ہے اور اسی کا نام ایمان ہے اور اسی سے حضرات شیعہ انکار کرتے ہیں اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دل سے ایمان لانے والا نہیں کہتے۔ چنانچہ مجتہد صاحب ذوالفقار میں لکھتے ہیں:

خلیفہ اوّل از اوّل امر از ایمان بہرہ

نداشت اتفاق من علماء الامامیہ ❶

”علمائے امامیہ کا اتفاق ہے کہ خلیفہ اوّل (ابوبکر) شروع ہی سے ایمان نہ لائے تھے۔“

لیکن اگرچہ جناب مجتہد صاحب قبلہ و کعبہ نے یہ دعویٰ کیا کہ تمام علماء کا اتفاق ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اوّل سے ایمان نہ لائے تھے مگر حضرت سے غلطی ہوئی، اس لیے کہ علامہ حلّی نے شرح تجرید میں لکھا ہے کہ خود حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے فرمایا کہ (اَمَنْتُ قَبْلَ اَنْ اَمَنَ ابُو بَكْرٍ) کہ میں ایمان لایا قبل اس کے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ایمان لائے ہوں۔“
(شرح تجرید)

تو جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول سے ان کا ایمان لانا ثابت ہو تو پھر مجتہد صاحب کا کہنا کون سنتا ہے۔

دوسری دلیل:..... معلوم نہیں کہ کاہن نے صرف حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے پیغمبر ﷺ کے نبی ہونے کا حال کہا تھا اور صرف ایک وہی کاہن کی تصدیق کر کے ایمان لائے تھے یا اور اصحاب بھی۔ ہم جہاں تک شیعہ کی کتابوں سے واقف ہیں ان کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اکثر اصحاب کاہنوں کے کہنے سے ایمان لائے جیسا کہ حملہ حیدری کے ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے جو اوپر نقل کیے گئے اور بعض کہتے ہیں کہ نہیں صرف دو ہی شخص کاہن کے کہنے سے ایمان لائے، جیسا کہ نزہہ اثنا عشریہ کا مؤلف فرماتا ہے:

((و ہم آنکہ قول او اگر بقول کہنہ و منجمین مدفوع ست

زیرا کہ امامیہ ایس معنی را در حق اکثر صحابہ روایت نہ

کردہ اند بلکه در حق یک دو شخص .))

”نیز یہ کہ اس کا قول اگر کاہنوں اور نجومیوں..... الخ۔ قابل رد ہے، اس لیے کہ

امامیہ اس بات کو (کہ زیادہ تر صحابہؓ کا ہنوں سے سن کر ایمان لائے تھے) اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم کے حق میں نہیں مانتے بلکہ ایک دو کے بارے میں (مانتے ہیں)۔“

پس اگر یہ امر تسلیم کیا جائے کہ اکثر صحابہؓ کا ہنوں کے کہنے سے ایمان لائے تو کچھ جائے اعتراض حضرات شیخین پر نہیں ہے اور اصحاب مقبولین امامیہ کے اس گروہ میں سے مستثنیٰ ہونے کی وجہ نہیں ہے تو جب امامیہ کے صدیق ان کے کہنے سے ایمان لائے تو اہل سنت کے صدیق بھی اگر ان کے کہنے سے ایمان لائے تو معلوم نہیں کہ انہوں نے کاہنوں کے قول کو سچ جانا یا نہیں؟ اگر سچ جان کر ایمان لائے تو کچھ خلل ان کے ایمان میں نہیں ہوا، اس لیے کہ اور لوگ بھی منجملہ اصحاب مقبولین شیعہ کے ایسے ہیں کہ جو چھلی کتابوں کی پیشین گوئیوں کو دیکھ کر ایمان لائے یا خواب میں پیغمبر ﷺ کی نبوت کی تصدیق کر کے مسلمان ہوئے تو اگر حضرات شیخین بھی کاہن کے کہنے سے ایمان لائے تو کیا حرج ہے۔

تیسری دلیل: یہ قول شیعوں کا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کاہن کے کہنے سے ایمان لائے انہی کے علماء کے اقوال سے غلط ہوتا ہے، اس لیے کہ ان کے علماء نے لکھا ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خواب دیکھا تھا اور اس کے سبب سے ایمان لائے تھے، جیسا کہ قاضی نور اللہ شوستری نے ”مجالس المؤمنین“ میں لکھا ہے:

((ابوبکرؓ بہ برکت خوابے کہ او دیدہ بود مسلمان یدہ

بود.))

”ابوبکرؓ نے ایک خواب دیکھا تھا جس کی وجہ سے وہ مسلمان ہوئے تھے۔“

چوتھی دلیل: اگر حضرات شیعہ کے اس کہنے سے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کاہن کے کہنے سے ایمان لائے یہ غرض ہو کہ وہ دل سے ایمان نہیں لائے تو اس کی تکذیب ان کے حالات سے ہوتی ہے، اس لیے کہ وہ ہمیشہ دعوت اسلام میں سعی بلیغ کرتے اور لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کرتے اور اپنے دوست آشناؤں کو سمجھا سمجھا کر حضرتؓ کا مطیع بناتے اور پیغمبر ﷺ سے علانیہ دعوت اسلام کرنے کے واسطے درخواست کیا کرتے اور غلاموں کو خرید

خرید کے خدا کی راہ میں آزاد کرتے اور اپنے مال اور جان کا نقصان گوارا کرتے کہ ان سب باتوں کا ثبوت امامیہ کی کتابوں سے ہوتا ہے تو کیا کوئی عاقل اس کو قبول کرے گا کہ جس کی کوششیں اور محنتیں اجرائے دین میں غایت درجے پر ہوں اور جس کو اعلائے کلمۃ اللہ میں اپنی جان و مال کا خیال نہ ہو وہ خود دل سے پیغمبر ﷺ کو سچا نبی اور اسلام کو سچا دین نہ سمجھتا ہو، ایسی بات حضرات امامیہ کی زبان سے ہی نکل سکتی ہے ورنہ کوئی نادان بھی اس کو نہ مانے گا اور واسطے ثبوت اس امر کے کہ حضرات شیخین نے پیغمبر ﷺ کو اظہار دعوت اسلام پر برا بیچتے کیا اور انہی کے اصرار پر حضرت نے اظہار دعوت فرمایا اور اسی وجہ سے شیخین نے صدمہ اٹھایا ہم قول صاحب ”استقصاء الاقسام“ کا نقل کرتے ہیں۔ مؤلف موصوف تحریر فرماتے ہیں:

((مگر نا صبی پیغمبر خدا را کہ از خوف کفار در حصن غار
 اختفا فرموده و در بدو اسلام از اظہار دعوت اعلانیہ احتراز
 داشته تا آنکہ شیخین دل تنگ شدہ آنحضرت را حث و
 ترغیب باظہار دعوت کردند و آنحضرت بنا بر اظہار عدم
 مصلحت از جہت اصرار ایشان از اعلان مانع نیا مدہ حتی
 اصاب اولہما ما اصاب و قال ثانیہما ایعبدا لعزی
 واللات علانیة و یعبد اللہ سرّاً از خوف خدا ناکل و
 نجوف غیر مائل می داند.))

”مگر نا صبی نے کفار کے خوف سے رسول کریم ﷺ کو غار میں چھپایا اور اسلام کے عہد اوّل میں رسول اکرم ﷺ کو اعلانیہ اسلام کے اظہار سے باز رکھا یہاں تک کہ وہ زمانہ آیا جبکہ شیخین نے عاجز ہو کر رسول اللہ ﷺ کو اسلام کے اعلان پر ابھارا اور آنحضرت ﷺ نے ان کے اصرار کی وجہ سے عدم مصلحت کا اظہار نہیں کیا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے جو پریشانیاں ملیں تو ملیں، دوسرے (عمر رضی اللہ عنہ) نے کہا کہ لات و عزیٰ (بتوں) کی اعلانیہ پرستش کی جائے

اور اللہ کی چھپ کر (یہ نہیں ہو سکتا)۔“

پانچویں دلیل: اگر فرض کیا جائے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سچے دل سے ایمان نہیں لائے اور (عیاذاً باللہ) کافر تھے جیسا کہ جابجا مجتہد صاحب نے اس عقیدہ کو ظاہر کیا ہے، چنانچہ ذوالفقار میں فرماتے ہیں:

((اوّل ایمان اصحابِ ثلاثہ باثبات بایدر سانید بعد ازیں
بایں افسانہ بیہودہ ترنم باید نمود زیرا کہ دانستی کہ مسلک
امامیہ درین باب اینست کہ اصحابِ ثلاثہ از اوّل امر از ایمان
بہرہ نداشتند .))

”پہلے ضروری ہے کہ اصحابِ ثلاثہ کی ایمان آوری ثابت کی جائے، پھر اس
بیہودہ افسانہ کے گیت گائے جائیں کیونکہ اس بارے میں شیعوں کا مسلک یہ
ہے کہ تینوں اصحاب پہلے سے ایمان سے بہرہ ور نہیں ہوئے۔“

اور مجتہد صاحب کے مقلد صاحب ”استقصاء الافحام“ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

((فَإِنَّ كُفْرَهُمْ وَارْتِدَادَهُمْ وَاضِحٌ لَا سِتْرَةَ فِيهِ .))

”کہ کفر اور ارتداد اصحابِ ثلاثہ کا واضح ہے چھپا ہوا نہیں۔“

پس اگر مطابق اصولِ شیعہ کے کفر اور عدم ایمان حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا فرض کیا
جائے تو تمام مہاجرین اور انصار بلکہ تمام اصحاب کا کافر ہونا لازم آتا ہے، اس لیے کہ تمام نے
ان کو اپنا سردار بنایا اور بعد پیغمبر خدا ﷺ کے ان کو خلیفہ کیا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور
یہ بیعت کرنے والے اور ان کو خلیفہ بنانے والے دس، بیس، سو، دوسو، ہزار دو ہزار آدمی نہ تھے
بلکہ لاکھوں تھے، اس لیے کہ اصحابِ نبوی بعد پیغمبر خدا ﷺ کے بروایت ایک لاکھ سے زائد
اور بروایت ملا باقر مجلسی جو انہوں نے ”تذکرۃ الائمہ“ میں لکھی ہے چار لاکھ تھے تو جب چار
لاکھ آدمی (عیاذاً باللہ) ایک کافر کو اپنا سردار بنا دیں تو پھر ان کے کفر میں کیا شک رہا.....
رہا یہ امر کہ سب مسلمانوں نے جو اس وقت تھے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کی باقرار علمائے

شیعہ ثابت ہے جیسا کہ شریف مرتضیٰ کے قول سے ظاہر ہے جو بحار الانوار کے مجلد تین میں منقول ہے اور جس کا ترجمہ مجتہد صاحب نے بایں الفاظ کیا:

((جمیع مسلمانان با ابو بکر بیعت کردند و اظهار رضا و خوشنودی باو، و سکون و اطمینان بسوے او نمودند و گفتند کہ مخالف او بدعت کنندہ و خارج از اسلام ست.))
 ”تمام مسلمانوں نے ابو بکر رضی اللہ عنہ سے بیعت کی اور اپنی رضا و خوشنودی کا اظہار کیا اور ان کی طرف سے پُر سکون اور مطمئن ہوئے اور کہا ہے کہ ان کی مخالفت کرنے والے بدعتی اور اسلام سے خارج ہیں۔“

سبحان اللہ! کیا دین و ایمان ہے حضرات شیعہ کا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عداوت سے دین محمدیؐ کو باطل کرتے ہیں اور چار لاکھ مسلمانوں کو جو مہاجرین و انصار اور مجاہد تھے اور جن میں بنی ہاشم اور اہل بیت نبوی بھی داخل تھے ان سب کو صراحتاً کافر بتاتے ہیں۔
 (نعوذ باللہ من ذالک)

چھٹی دلیل:..... ہم کو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایمان کے اثبات میں زیادہ دلائل بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ خود علمائے شیعہ نے یہ سمجھ کر کہ ان کے کفر کا دعویٰ ایسا بیہودہ ہے کہ اس سے سننے والے کو تعجب ہوتا ہے اس سے انکار کیا اور اپنے ان علماء کو جنہوں نے ایسا دعویٰ کیا ہے خود جھٹلایا، اس لیے ہم ان کے ان اقوال کو نقل کرتے ہیں.....
 قاضی نور اللہ شوستری مجالس المؤمنین میں فرماتے ہیں:

((نسبت تکفیر بجناب شیخین کہ اہل سنت و جماعت بہ شیعہ نمودہ اند سنخے ست بے اصل کہ در کتب اصول ایشان از ایشان اثری نیست و مذهب ایشان ہمین ست کہ مخالفانِ علیؑ فاسق اند و محاربان او کافر.))

”اہل سنت و جماعت نے شیخین کے کافر ہونے کو شیعوں کی جانب جو منسوب کیا

ہے یہ بے معنی سی بات ہے، کیونکہ اس کا ثبوت شیعوں کے کتبِ اصول میں موجود نہیں ہے، البتہ شیعوں کا مسلک و مذہب یہ ہے کہ علی رضی اللہ عنہ کے مخالف فاسق ہیں اور ان سے جنگ کرنے والے کافر ہیں۔“

جناب مجتہد صاحب قبلہ و کعبہ اس قول کے جواب میں ذوالفقار میں فرماتے ہیں:

((پوشیدہ ❶ نماند کہ این کلام بر تقدیر صحت و صدور آن از

فاضل قادح مقصود ماو مفید مطلب اونمی شود زیرا کہ

سابق گزشتہ کہ فاسق در مقابلہ مومن اطلاق شدہ پس فرق

میان کفر و فسق ہمیں ست کہ کافر نجس ست در دنیا و

مخلدست فی النار در عقبی و فاسق کہ بسبب انکاریکی از

ضروریات مذہب باشد مخلددر نار خواهد بود گودر دار دنیا

احکام مسلمین بسبب اقرار شہادتین بر او جاری شود.))

”واضح رہے کہ فاضل شوستری کے اس بیان کو صحیح مان لیا جائے تو یہ کلام ہمارے

مقاصد پر ضرب کاری اور ان کے مفید مطلب نہیں کیونکہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ

لفظ فاسق مومن کے مقابلہ میں آیا ہے، اس لیے کفر و فسق کے مابین فرق یہ ہے

کہ کافر دنیا میں نجس اور آخرت میں ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا اور ضروریات

مذہب کے انکار کرنے کی وجہ سے فاسق ہمیشہ دوزخ میں رہے گا اگرچہ اقرار

شہادتین کی وجہ سے دنیا میں اس پر اسلامی احکام جاری ہوں۔“

لیکن اس عبارت میں یا تو حضرت قبلہ و کعبہ نے غلطی فرمائی یا دیدہ و دانستہ اغماض کیا،

اس لیے کہ یہ فرمانا کہ ”بر تقدیر صحت و صدور آن از فاضل“ کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا کہ اس

قول کو قاضی نور اللہ شوستری کے حضرت نے تسلیم کیا ہے یا اس سے انکار فرمایا ہے ایسی گول

گول عبارت لکھنے سے سوائے ہم سے کم فہم جاہلوں کو مغالطہ میں ڈالنے کے دوسرا فائدہ نہیں

تھا، اگر یہ عبارت ”مجالس المؤمنین“ میں موجود ہے تو بر تقدیر کہنا کیا معنی اور اگر یہ عبارت اس میں نہیں ہے تو صاف اس سے انکار فرمایا ہوتا اور صاحب ”تحفہ اثنا عشریہ“ کے طعن و تشنیع میں موافق اپنی عادت کے دو چار ورق سیاہ کیے ہوتے ہاں، شاید حضرت نے ”مجالس المؤمنین“ نہ دیکھی ہوگی، اس لیے نہ انکار کیا نہ اقرار، بہر حال ان الفاظ سے قبلہ و کعبہ کے اس عبارت کا موجود ہونا پایا جاتا ہے اور اگر اب بھی کسی کو شک ہو وہ ”مجالس المؤمنین“ میں دیکھ لے۔ رہا جواب جو مجتہد صاحب نے دیا ہے وہ بھی ایسا ہے کہ اس کے معنی سمجھ میں نہیں آتے، اس لیے کہ قاضی صاحب نے اقرار کیا ہے کہ تکفیر شیخین ہمارے اصول کے مخالف ہے اور حضرت مجتہد صاحب اسی کو ثابت کرتے ہیں، پس یا خطائے اجتہادی قاضی صاحب سے ہوئی کہ وہ تکفیر سے انکار کرتے ہیں یا مجتہد صاحب سے کہ وہ اس کو ثابت کرتے ہیں یا شاید درمیان کفر اور ایمان کے ایک تیسرا مرتبہ اثبات فرمایا چاہتے ہیں جس کا نام ان کی اصطلاح میں اسلام ہے جس کے معنی نفاق کے ہیں، یعنی ظاہر میں کلمہ پڑھنا اور باطن میں کافر ہونا، اس لیے ہم کو لازم ہوا کہ اس تیسرے مرتبہ پر بھی نظر کریں اور اس کے اثبات اور ابطال کے دلائل پر غور کریں، اس لیے ہم مجتہد صاحب کی روح سے اور ان کے مقلدین سے استفسار کرتے ہیں کہ اس تیسرے مرتبے کے قائم کرنے سے کیا غرض ہے، آیا یہ کہ خلفائے ثلاثہ کے ایمان سے انکار کیا جائے اور ان کے اسلام کو تسلیم کیا جائے اور اسلام کے یہ معنی مراد لیے جائیں کہ وہ ظاہر میں کلمہ گو تھے اور باطن میں منافق یا کہ وہ دل سے بھی مثل زبان کے پیغمبر ﷺ کی نبوت کی تصدیق کرتے تھے مگر امام برحق کی امامت کے منکر تھے اور ان کے حقوق کے غاصب اور ان پر جابر تھے اور چونکہ امامت اصول دین سے ہے، اس لیے بہ سبب انکار ایک اصل کے اصول دین سے وہ ایمان کے دائرے سے خارج تھے، یا سوائے اس کے اس تیسرے مرتبے کے قائم کرنے سے اور کچھ مقصد ہے، بہر حال اور کوئی دوسرا فائدہ تو سمجھ میں نہیں آتا، اس لیے امر اوّل کو تسلیم کر کے اس سے بحث کی جاتی ہے۔ پس اگر خلفائے ثلاثہ کے ایمان سے اس وجہ سے انکار کیا ہے کہ وہ صرف ظاہر میں کلمہ گو تھے اور باطن میں توحید اور

نبوت سے بھی منکر تھے جیسا کہ اکثر حضرات شیعہ فرماتے ہیں بلکہ حضرات شیعہ کس حساب میں ہیں خود ان کے امام مہدی فرماتے ہیں کہ ظاہر میں وہ کلمہ گو تھے اور باطن میں کافر جیسا کہ مُلّا باقر مجلسی نے ”رسالہ رجعیہ“ میں حضرت امام کی طرف منسوب کر کے یہ قول لکھا ہے:

((ایشاں از روئے گفته یہود بظاہر کلمتین گفتند از برائے طمع اینکہ شاید ولایتی و حکومتی حضرت بایشاں بدھد و در باطن کافر بودند .))

”یہودیوں کے کہنے سے ان لوگوں نے کلمہ پڑھا جس کے پس پردہ یہ خیال تھا کہ کلمہ پڑھنے کی وجہ سے شاید آنحضور ﷺ ان کو گورنری اور حکومت دے دیں جبکہ وہ باطنی طور پر کافر تھے۔“

پس اس کا جواب ہم اوپر دے چکے، اس کا اعادہ ضروری نہیں، اسی واسطے اس قول سے اکثر علمائے شیعہ نے انکار کیا اور جو لوگ ایسا کہتے ہیں ان کو خود انہوں نے ناصب فرمایا جیسا کہ ملا عبد اللہ جو علمائے شیعہ سے ہیں ”اظہار حق“ میں فرماتے ہیں کہ انکار کرنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایمان سے انصاف سے بعید ہے، و ہذہ عبارتہ:

((جواب گفتن ایس سخن بارتکاب آنکہ در سبق ہجرت ایمان شرط ست و آن شخص یعنی ابو بکر معاذ اللہ ہیچ وقت ایمان نداشتہ حتی قبل از سنوح نا خوشی امیر المومنین از انصاف دوراست .))

”اس امر کے جواب دینے میں یہ بات پیش نظر رہے کہ ہجرت میں سابق ہونے کے لیے ایمان شرط ہے اور وہ شخص یعنی ابو بکرؓ (معاذ اللہ) کسی وقت صاحب ایمان نہ تھے حتیٰ کہ امیر المومنین کو ناخوش کرنے سے پہلے بھی ایمان والے نہ تھے، یہ بات انصاف سے بعید ہے۔“

اور ملا عبد الجلیل قزوینی کتاب ”نقص الفضائح“ میں لکھتے ہیں:

((اماثناء خلفاء پس برآں انکارے نیست بزرگانند از
مهاجرین و السابقون الاولون من المهاجرین والانصار
والذین اتبعوهم باحسان .))

”خلفاء کی تعریف سے انکار کی مجال نہیں، بڑے مهاجروں میں سے ہیں جو
سابقین اولین سے تھے۔“

اور پھر دوسرے مقام پر لکھا ہے:

((اما آنچه سیرت ابوبکرؓ و عمرؓ و دیگر صحابہ بیان کردہ
مجملے ست نہ مفصل آں را خلاف نہ کردہ اند شیعه الادرجہ
خلافت و امامت را شیعه انکار کنند دریشاں کہ درجہ امامت
نداشتند و آن فقد ان عصمت و نصوصیت و کثرت علمی
ست ، اما صحابہ رسول ایشاں را دانند و از درجہ شاں نہ
گزرانند .))

”ابوبکرؓ و عمرؓ اور جو دوسرے صحابہ کی سیرت بیان کی گئی ہے وہ مجمل ہے اور اس کی
تفصیل نہیں کی گئی ہے اس کی شیعه مخالفت نہیں کرتے، البتہ خلافت و امامت کے
بارے میں کہتے ہیں کہ انہیں درجہ امامت حاصل نہ تھا جس کا سبب یہ تھا کہ ان
میں عصمت و کثرت علم کا فقدان تھا، نیز ان کا عقیدہ و بیان ہے کہ یہ لوگ رسول
اللہ ﷺ کے صحابی تھے اور ان کو ان کے درجات سے علیحدہ نہیں کرتے۔“

اور ”احتجاج طبرسی“^① میں لکھا ہے کہ امام باقر علیہ السلام نے فرمایا:

((لست بمنکر فضل ابی بکر و لست بمنکر فضل عمر
ولکن ابابکر افضل من عمر .))

”میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی فضیلتوں سے انکار نہیں کرتا لیکن

ابوبکر، عمر فاروق رضی اللہ عنہما سے افضل ہیں۔“

پس ان روایتوں اور ہزار مثل اس کے اور روایتوں سے جن کو ہم نقل کریں گے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایمان اور فضیلت میں کون شک کر سکتا ہے۔ پس یہ دعویٰ کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ باطن میں (معاذ اللہ) کافر تھے خود علمائے شیعہ اور ائمہ کبار کی احادیث سے باطل ہوا اور اگر اب بھی کسی کو شک ہو تو وہ تفاسیر اور احادیث امامیہ کو دیکھے کہ باوجود اس عناد و تعصب کے جو ان کو خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم سے ہے اب بھی صد ہا روایات اور احادیث مدح و ثنا میں خلفاء کی موجود ہیں، چنانچہ ان کے مفسرین قبول کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ غلاموں کو مول لیا کرتے اور بہ سبب اسلام کے ان کو آزاد کر دیتے، جیسا کہ علامہ طبرسی نے ”مجمع البیان“ میں لکھا ہے:

((عن ابن زبیر قال ان الایة نزلت فی ابی بکر لانه اشتری

الممالیک الذین اسلموا مثل بلال و عامر بن میسرہ و غیرہما

واعتقہم .))

”کہ آیت (وَسَيَجْنِبُهَا الْأَتَقَى) شان میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نازل ہوئی کہ وہ

غلاموں کو جو اسلام لاتے مول لیتے اور پھر خدا کی راہ میں آزاد کر دیتے جیسے

بلالؓ اور عامر بن میسرہؓ وغیرہ۔“

پس چونکہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے مال کو خدا کی راہ میں صرف کرتے تب خدا نے یہ آیت نازل کی کہ دوزخ سے وہی بڑا پرہیزگار بچے گا جو اپنے پاک مال کو خدا کی راہ میں صرف کرتا ہے۔ پس تعجب ہے کہ جو شخص اپنے مال سے مسلمان غلاموں کو خریدے اور ان کو آزاد کرے اور اس کی شان میں خدا آیتیں نازل کرے اور اس کو اتقی الناس فرمائے اس کی فضیلت اور بزرگی بیک طرف اس کے ایمان سے بھی انکار کیا جائے اور ایسا شخص منافق اور کافر سمجھا جائے۔ غرض کہ ایمان اور اسلام میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کچھ شبہ نہیں رہا اور باقر علمائے شیعہ اس کا ثبوت ظاہر ہو گیا۔

اب باقی رہا تیسرا امر کہ مراد ایمان سے اصول دین کی تصدیق کرنا ہے اور چونکہ امامت بھی ایک اصل اصول دین سے ہے اور اس سے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ منکر تھے، اس سے ان پر اطلاق ایمان کا نہیں ہوتا، اس کی تردید ہم بخوبی بحث امامت میں کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ لیکن ہمارے نزدیک ابتدائے زمانہ نبوت میں امامت کو اصول دین میں داخل کرنا اور جو اس وقت امامت پر ائمہ اثنا عشر کے ایمان نہیں لایا اس کو مومن نہ جاننا نادانی ہے، اس لیے کہ جب پیغمبر ﷺ صاحب نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اسلام کی دعوت فرمائی تو اس وقت خدا کی توحید اور اپنی نبوت کی تصدیق ایمان کی علامت رکھی، ائمہ کی امامت کی تصدیق کی تکلیف کسی کو نہیں دی بلکہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی اسلام کی دعوت صرف توحید اور نبوت کی تصدیق پر کی۔ پس اس وقت امامت کا کچھ ذکر ہی نہ تھا کہ کوئی اس کو قبول کرتا یا اس سے انکار کرتا۔ اگر ہم غلط کہتے ہوں تو حضرات شیعہ اپنی ہی کتابوں سے یہ بات ثابت کر دیں کہ جب اوّل اوّل پیغمبر خدا ﷺ نے لوگوں کو اسلام کی طرف بلایا تو ان سے توحید اور نبوت کے سوا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کی تصدیق کو بھی فرمایا، حضرت علی رضی اللہ عنہ خود اس وقت لڑکے تھے کسی شخص سے اس وقت پیغمبر ﷺ نے نہیں فرمایا کہ جس طرح پر خدا کی توحید اور میری نبوت کی تصدیق تم پر ایمان کے لیے ضروری ہے، اسی طرح میرے چھوٹے بھائی علی کی امامت کی تصدیق بھی ضروری ہے اور جبکہ ایسا کسی سے اس وقت نہیں کہا اور امامت کو اصول دین سے قرار نہیں دیا تو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انکار یا اقرار کرنا بھی اس سے ثابت نہیں ہوتا اور جب یہ ثابت نہ ہو تو ان کے ایمان میں بھی کچھ خلل نہیں آیا..... ہاں حضرات شیعہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آخر زمانہ نبوت میں خم غدیر پر جب خطبہ امامت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا پڑھا اور لوگوں کو توحید اور رسالت کے علاوہ امامت کے اقرار پر بھی دعوت کی اس وقت امامت کا انکار گویا ایمان کے خلل کا سبب ٹھہرا لیکن جب کہ اس کا نام و نشان بھی نہ تھا اور کوئی لفظ امامت سے واقف تک نہ تھا اس کو اس وقت اصول دین سے ٹھہرانا اور اس سے ناواقف آدمی کو منکر قرار دینا اور اس کے انکار کو اس کے عدم ایمان کا سبب کہنا بڑی نادانی ہے۔ ہاں حضرات شیعہ یہ کہہ سکتے ہیں

کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خم غدیر کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت سے دل میں انکار کیا اور بعد وفات پیغمبر خدا ﷺ کے اس کو ظاہر کیا، یعنی خود امام بن بیٹھے تو ہم اس بات کو سن سکتے ہیں لیکن اس سے صرف اطلاق ارتداد کا (نعوذ باللہ من ذالک) ان پر ہو سکتا ہے، اس سے ان کے اس ایمان میں جو اوّل اوّل لائے کچھ خلل نہیں آ سکتا اور ابتدائے زمانہ نبوت میں ان کا نہایت سچے دل سے ایمان لانا اپنے حال پر قائم رہتا ہے۔

رہا ارتداد ان کا بہ سبب غصب خلافت کے اس کو ہم بحث امامت میں بیان کریں گے،

ان شاء اللہ۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کا بیان:

جب کہ ہم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایمان کو ثابت کر لیا، اس لیے اب ہم کچھ ذکر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کا کرتے ہیں..... یہ بات سب کو معلوم ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ رات دن اس فکر میں رہتے تھے کہ اسلام کی ترقی ہو اور خدا کے دین میں لوگ داخل ہوں، کوئی لحظہ کوئی دم اس سے غافل نہ ہوتے تھے اور جو تدبیر اس کے حاصل ہونے کی ہوتی تھی اس میں دریغ نہ فرماتے تھے، لیکن باوجود اس کوشش اور محنت کے چھ برس کے عرصے میں صرف چند ہی شخص جو کہ چالیس سے کم تھے ایمان لائے، آخری پیغمبر خدا ﷺ نے اس تھوڑی سی جماعت کو دیکھ کر خدا سے دعا کی کہ خداوند اس گروہ کو بڑھا اور ایسے شخص کو مسلمان کر کہ جس کے رعب اور عزت سے اس گروہ کو قوت اور اسلام کی تائید ہو اور جس کی ذات سے بہت جلد اسلام کو رونق ہو، چنانچہ حضرت نے اپنے نزدیک ایسے صرف دو شخص اپنی قوم میں خیال کیے ایک حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ دوسرا ابو جہل کہ یہ دونوں نہایت ہی معزز اور مشہور اور نامور تھے اور ان کو سب سے زیادہ عداوت بھی پیغمبر ﷺ کے ساتھ تھی اور شب و روز اسلام کے معدوم ہو جانے کی فکر میں رہتے تھے، پس حضرت نے خدا سے دعا کی کہ الہی اپنے دین کو ان دو آدمیوں میں سے کسی ایک آدمی کے مسلمان کر دینے سے قوی کر اور عمر یا ابو جہل میں سے ایک کو ایمان عطا فرما۔ چنانچہ یہ دعا خدا نے حضرت ﷺ کی حضرت

عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں قبول کی اور ان کو ایمان سے مشرف کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کا مختصر حال یہ ہے کہ ابو جہل نے جس کو پیغمبر ﷺ کے ساتھ دلی عداوت تھی اپنے بھائیوں سے کہا کہ جو کوئی پیغمبر ﷺ کو قتل کرے اور ان کا سر میرے پاس لائے اس کو ہزار شتر سرخ بال والے اور بہت سے دینار و درہم اس کے صلے میں دوں گا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کام کو اپنے ذمہ لیا اور پیغمبر ﷺ کے قتل کے ارادے سے چلے، ادھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا چلنا تھا اور خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کو ہماری طرف کھینچو اور جس کے سر لانے کو جاتا ہے اس کے قدموں پر گراؤ، ہماری قدرت کا تماشا دیکھو کہ شقی ہو کر جاتا ہے اور سعید ہو کر لوٹے گا، کافر ہو کر نکلا ہے اور مومن پاک ہو کر پھرے گا، ہماری دشمنی کے ارادے پر مستعد ہو کر اٹھا ہے اور ہماری محبت کے دام میں ابھی پھنستا ہے، وہ تو اپنی خوشی سے ہمارے دوست کے قتل کو چلا ہے اور ہم اس کو زبردستی کافروں کے قتل کے لیے مقرر کرتے ہیں۔ اب تم سطح زمین پر جاؤ اور اس کی خبر لو اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ہمارے دین میں لے آؤ۔ مصرع.....

گر نیاید ۱ بخوشی موئے کشائش آرید

چنانچہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ تلوار کو گلے میں جمائل کر کے نہایت غصے اور طیش میں پیغمبر ﷺ کی طرف چلے، فرشتگانِ ملاءِ اعلیٰ نے شادی کا غلغلہ بلند کیا، ”طَرَقُوا، طَرَقُوا“ کا شور مچایا، زبان حال سے یہ شعر پڑھنا شروع کیے۔ ابیات

آمد آں یارے کہ من می خواستم
راست شد کارے کہ من می خواستم
رفتہ رفتہ می روداں سوئے دام
ہم بہ ہنچارے کہ من می خواستم

”میں جس دوست کو چاہتا تھا وہ آگیا، جو میری چاہ تھی وہ کام ٹھیک ہو گیا، آہستہ

۱ اگر ہنسی خوشی نہ آئے تو اس کے بال پکڑ کر (زبردستی) لے آؤ۔

آہستہ وہ جال میں (پھنسنے) آرہا ہے جیسے کہ میری خواہش تھی۔“

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اثنائے راہ میں بہت سے معجزات دیکھے، راہ میں ایک شخص مسلمان ملا اس کے مارنے کا قصد کیا اس نے کہا کہ اوّل اپنی بہن اور بہنوئی کی خبر لو کہ وہ مسلمان ہو گئے ہیں تب غیروں کی خبر لینا، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی بہن کے گھر گئے، دروازہ بند پایا اور قرآن پڑھنے کی آواز سنی، اس کو باہر سے سنتے رہے، آخر دروازہ کھٹکھٹایا، ان کی بہن نے دروازہ کھولا، پوچھا کہ تم لوگ کیا پڑھتے تھے، ہم کو دو، انہوں نے دینے میں انکار کیا، آخر اپنی بہن اور بہنوئی کو خوب مار پیٹ کی، جب ان کی بہن نے یہ زیادتی دیکھی تو پکار اٹھی کہ اے عمر ہوشیار ہو، ہم تو ایمان لائے اور سچے دین میں داخل ہو گئے ”اشہد ان لا الہ الا اللہ و اشہد ان محمدا رسول اللہ“ تم کو جو کرنا ہو سو کرو۔ تب تو حضرت عمرؓ ڈھیلے پڑے اور کہا کہ اس قرآن سے کچھ سناؤ تب سورہ طہ ان کو سنائی، اس کی فصاحت اور بلاغت پر غش ہو کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل کو یقین ہو گیا کہ بے شک یہ کلام خدا کا ہے اور اسی وقت کلمہ شہادت پڑھا اور ایمان لائے اور قصد پیغمبر ﷺ کے حضور میں حاضر ہونے کا کیا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آنے کی خبر ہوئی تو اصحاب رسولؐ میں تہلکہ مچ گیا اس لیے کہ وہ ان کی شوکت اور ارادے سے واقف تھے، یہاں تک کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ دروازے پر پہنچے تو کوئی دروازہ کھولنے کو نہ اٹھتا تھا مگر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ چچا پیغمبر ﷺ کے یہ کہہ کر اٹھے کہ ”وہ ایک آدمی ہے اگر اطاعت کے ارادے پر آیا ہے خیر ورنہ اسی کی تلوار ہے اور اسی کا سر۔“

چنانچہ حضرت عمرؓ اندر داخل ہوئے، پیغمبر ﷺ بہ نفس نفیس اٹھے اور ان کو آغوشِ رحمت میں لے کر ایسا دبایا کہ ان کی آنکھیں نکل پڑیں، تب تو حضرت ﷺ مسکرائے اور ان کی طرف دیکھ کر خندہ زن ہوئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ صدق دل سے نعرہ مار کر کہنے لگے: ”اشہد ان لا الہ الا اللہ و اشہد ان محمدا رسول اللہ“ تب سب مسلمان خوشی سے تکبیر کہنے لگے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے پر حمد و ثنا خدا کی کرنے لگے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی وقت پیغمبر خدا ﷺ سے کہا کہ یا حضرت بتوں کی عبادت تو علانیہ ہو اور خدا کی عبادت

چھپ کر، یہ مناسب نہیں ہے، آئیے خانہ کعبہ کو چلیے اور بااعلان نماز ادا کیجیے۔ چنانچہ ان کی عرض کو حضرتؑ نے قبول فرمایا اور خانہ کعبہ کی طرف توجہ کی اور نہایت شان و شوکت سے حضرت ﷺ مع سب صحابہ کے عازم خانہ کعبہ کے ہوئے جب حضرت تشریف فرمائے خانہ کعبہ ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی آگے آگے چلے، کافروں نے کہ وہ منتظر تھے کہ سر پیغمبر ﷺ کالائے ہوں گے۔ یہ دیکھ کر کہا: اے عمر! یہ کیا حال ہے؟ تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سنو میں ایمان لایا اور پیغمبر ﷺ کی غلامی کا غاشیہ میں نے اپنے دوش پر لیا، جو اطاعت کرے گا خیر ورنہ اگر مزاحمت کرے گا تو یہی تلوار ہے اور اس کا سر۔ چنانچہ چند آدمیوں کو اسی وقت اپنا زور دکھلایا اور خانہ کعبہ میں جا کر پیغمبر ﷺ کے پیچھے نماز ادا کی۔

یہ حال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کا ہے اور اس میں ہم نے دو باتوں کا ذکر کیا ہے، اوّل پیغمبر ﷺ کے دعا کرنے کا جو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کے واسطے کی، دوسرے اس کیفیت سے ایمان لانے کا۔ چنانچہ ہم دونوں باتوں کو شیعوں کی کتابوں سے ثابت کرتے ہیں۔ امر اوّل کے ثبوت میں پہلے ہم کو یہ لکھنا ضروری ہے کہ اکثر مجتہدین اور علمائے شیعہ نے اس دعا سے انکار کیا ہے اور اس کو سنیوں کی تہمت اور افتراء تصور کیا ہے، جیسا کہ ایک مجتہد صاحب کا خلاصہ عبارت یہ ہے:

((فاروق عزتے در عرب نداشتہ پس این احادیث را علمائے

سنیاں از پیش خود بر تافته اند و حاشا کہ جناب پیغمبر ﷺ

ایں دعا کہ مخالف عقل و نقل ست بر زبان مبارک آورده

نباشند.))

”عمر فاروق کی عرب میں کوئی عزت نہ تھی اور آپؐ کے اسلام لانے سے اسلام کو

عزت دینے کی دعا والی حدیث سنی علماء نے خود گھڑی ہے اور اس قسم کی دعا جو

عقل و نقل کے سراسر خلاف ہے حاشا و کلاً رسول اکرم ﷺ کی زبان مبارک

سے ادا نہیں ہوئی۔“

لیکن یہ انکار صرف دھوکا دینا اور عوام کو اپنے مذہب کی برائی پر واقف ہونے سے بچانا ہے، ورنہ بہت سے محدثین اور علمائے شیعہ نے اس کی صحت پر اقرار کیا ہے، چنانچہ فضل بن شاداں اور شیخ طوسی اور علم الہدیٰ اور شیخ مفید^۱ کے اقرار سے اس کی صحت ثابت ہوتی ہے، چنانچہ ہم ان سے قطع نظر کر کے ملا مجلسی کی تصدیق کو سنداً بیان کرتے ہیں اور ان کی کتاب بحار الانوار سے جس کا نام نامی اور اسم گرامی خدا کی کتاب سے بڑھ کر حضرات شیعہ کی زبان پر ہے، اس روایت کو نقل کرتے ہیں۔ وہو ہذہ۔ ملا باقر مجلسی ”بحار الانوار“ کی چودھویں جلد میں جس کا نام ”کتاب السماء والعالم“ ہے مسعود عیاشی سے روایت کرتے ہیں:

((روى العیاشی عن الباقر علیہ السلام ان رسول اللہ ﷺ

قال اعز الاسلام بعمر بن الخطاب ابوبابی جهل بن هشام .))

”یعنی امام باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے خدا سے دعا

کی کہ الہی عزت دے اسلام کو عمر بن خطاب یا ابو جہل بن ہشام کے اسلام

لانے سے۔“

غرض کہ اب ہم ان مجتہدین کی نسبت جنہوں نے اس دعا سے انکار کیا اور عوام کو دھوکا دیا کیا کہیں بجز اس کے کہ ان کے مقلدین کے سامنے ان کے انکار کو اور ملا باقر مجلسی کے اس اقرار کو رکھ دیں اور یہ عرض کر دیں کہ اب خود ہی انصاف کرو کہ تمہارے پہلے جھوٹے ہیں یا

① شیخ مفید محمد بن نعمان العبکری بغدادی ۳۳۸ھ میں پیدا ہوئے شیعوں میں شیخ مفید کے نام سے مشہور ہیں۔ اس لیے کہ بقول ان کے امام غائب نے انہیں یہ لقب دیا تھا۔ (معالم العلماء صفحہ ۱۰۱) شیعہ حضرات کے اکابر اور بڑے مشائخ و اساتذہ میں شمار ہوتا ہے۔ متاخرین میں سب نے ان سے استفادہ کیا۔ فقہ، کلام اور حدیث میں ان کی فضیلت مشہور و مسلم ہے۔ اپنے زمانے میں شیعوں کے سب سے ثقہ اور بڑے عالم تھے۔ ان کی تقریباً دو سو (۲۰۰) چھوٹی بڑی تصنیفات ہیں۔ (روضات الجنات جلد ۶ صفحہ ۱۵۳) شیعوں کے نزدیک شیخ مفید کے مقام کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ان کے بارہویں امام غائب غار میں روپوش ہو جانے اور غیبت صغریٰ کا دور ختم ہو جانے کے بعد بھی شیخ مفید کو خطوط لکھتے تھے جو کسی غیبی نامعلوم طریقے سے ان کو مل جاتے تھے، شیعوں کی معتبر کتاب احتجاج طبری میں ان کے نام امام غائب کے وہ خطوط موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ امام غائب کے معتمدین میں سے تھے ۴۱۳ھ میں بغداد میں فوت ہوئے، سید مرتضیٰ برادر رضی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ ۱۲

پچھلے..... رہا مردوم، یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کی کیفیت اس کے واسطے ہم اشعار حملہ حیدریہ کو نقل کرتے ہیں اور اہل انصاف سے چاہتے ہیں کہ اس کے ہر ہر لفظ کو غور کریں اور انصاف فرمائیں کہ باوجود تعصب اور عناد کے اس مؤلف نے کیا کچھ لکھا ہے اور یہ کوئی خیال نہ کرے کہ حملہ حیدریہ کتب معتبرہ سے نہیں ہے بلکہ اس کو خود حضرت مجتہد صاحب شیعوں کے قبلہ و کعبہ نے تصحیح کیا ہے اور اس کی اصلاح اور تحشی خود حضرت سید محمد صاحب نے فرمائی ہے اور جو کتاب مطبع سلطانی میں باہتمام مدد علی داروغہ کے لکھنؤ میں چھپی ہے اس کے عنوان پر یہ سب کیفیت لکھی ہوئی ہے اور اس کے سرے پر اس کتاب کی تعریف میں لکھا ہے۔ ابیات:

عجب ۱ کتابے پر از نور ہست
 کہ ہر بیت آن بیت معمور ہست
 بہ بزمے کہ خوانند فصلے ازاں
 سخن از حلاوت شود لب گزاں
 مشام محبان معطر شود
 دل از نور ایماں منور شود
 تعالیٰ اللہ آن باذل بے بدل
 کہ آوردہ ہر نکتہ را بر محل
 بوفوق روایت رقم میزند
 براہ دیانت قدم میزند
 بہ ترجیح اخبار دارد مناط
 بروں نیست از جادہ احتیاط
 بہ نہجے گرفت ست ایراد و دق
 کہ افتادہ در جان اعداء قلق

عجب دفتر دل کشای نوشت
 کہ پیچیدہ دروے هوای بہشت
 معطر چون مشک تارست این
 معنبر چون باد بہارست این
 زہر نکتہ سازد معطر دماغ
 زہر نقطہ اش می شود تر دماغ
 دل آشفگان راتما شاست این
 جگر خستگان رامسیحاست این
 بس ست از نعوت و صفاتش ہمیں
 کہ گردیدہ مقبول سلطان دین
 فرازندہ رایت اجتہاد
 زحق حجت و آیتے بر عباد
 طریق شریعت موید ازوست
 کہ نام و نشان محمد ازوست
 دل سنیان داغدارست ازو
 کہ ہندوستان سبزہ زارست ازو ❶

”عجیب پر نور کتاب ہے کہ اس کا ہر ہر شعر بیت معمور ہے، جس محفل میں اس کی ایک فصل پڑھ دی جائے تو بات کی مٹھاس سے ہونٹ چپکنے لگیں، دوستوں کی مشام جاں معطر ہو جائے اور دل نور ایمان سے روشن ہو جائے، اللہ کی ذات بڑی ہے کہ ان (علامہ) باذل نے جن کی کوئی مثال نہیں ہر نکتہ کو بر محل ذکر کیا ہے۔ روایت کے مطابق ہی وہ لکھتے ہیں اور دیانت کی راہ اختیار کرتے ہیں۔“

ترجیح روایات میں مشاق ہیں، احتیاط سے باہر قدم نہیں نکالتے، اس طریقہ سے اعتراض اور گرفت کرتے ہیں کہ دشمن (ناصری سنی) تلملا اٹھتے ہیں، عجب دل کش دفتر لکھ ڈالا کہ جس میں جنت کی ہوا لپٹی ہوئی ہے، مشک تار کی طرح عطر بیز ہے، باد بہاری کی مانند خوشبو ریز ہے، ہر نکتہ سے دماغ معطر ہو جاتا ہے، اس کا ہر نقطہ دماغ کو تر کر دیتا ہے۔ آزرده دلوں کے لیے یہ تماشا ہے اور خستہ جگروں کے لیے یہ مسیحا ہے، اس کی تعریف و توصیف میں اتنا کافی ہے کہ سلطان دیں (سلطان العلماء) کی پسندیدہ ہے، اجتہاد کے جھنڈے کو بلند کرنے والی ہے، بندوں پر حق کی حجت اور نشانی ہے، طریق شریعت کی اس سے تائید ہوتی ہے، اس سے محمد ﷺ کا نام و نشان (قائم) ہے، سنیوں کے دل اس سے داغدار ہیں ہندوستان اس سے سبزہ زار ہو گیا ہے۔“

پس ہم اس کتاب سے جس کے نور سے دل مومنین کے منور ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان کے نور کو دکھلاتے ہیں، جو اندھے نہ ہوں وہ دیکھیں اور اسی کتاب سے جس کی خوشبو سے دماغ مجبوں کے معطر ہیں حضرت فاروقؓ کے اسلام کی خوشبو پھیلاتے ہیں، جو دماغ رکھتے ہوں وہ سونگھیں اور ہم اسی محقق کے قول سے جو موافق روایت کے لکھتا ہے اور جو قدم قدم دیانت پر چلتا ہے اس روایت کو ثابت کرتے ہیں اور ہم اسی کی تصدیق سے جس نے سنیوں کی جان کو رنج میں ڈال رکھا ہے حضرات شیعہ کو رنج دیتے ہیں اور اسی کے کلام سے جس کا کلام شیعوں کے زخموں کے لیے مرہم ان کے دلوں مجروح کرتے ہیں اور اس قبلہ و کعبہ کی تصحیح اور قبولیت سے جس نے سنیوں کے دلوں کو داغدار کر دیا ہے ان کے مقلدین کے دلوں کو داغدار کرتے ہیں.....

اے بھائیو: اس روایت کو سنو اور دیکھو کہ حقیقت میں کیسا نور چمک رہا ہے اور سونگھو کہ در

اصل کیسی خوشبو مہک رہی ہے، بے شک اس روایت کی نسبت ہم بھی یہ شعر پڑھتے ہیں:

بہ نہجے گرفت ست ایرادو دق

کہ افتادہ درجان اعدا قلق

زہر نکتہ سازد معطر دماغ
 زہر نقطہ اش میشود تر دماغ
 معطر چوں مشک تارست این
 معنبر چوں باد بہارست این
 اب ہم اس روایت کو بعینہ کتاب مذکور سے نقل کرتے ہیں۔

در کیفیت ایمان آوردن عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب:

عمر ❶ بعد ازاں از پس چند گاہ
 در آمد بدین رسولِ الہ
 چنان بدکہ بوجہل ازاں سر زنش
 بکیفیتے شد عداوت منش
 کہ جز قتل پیغمبر ذوالجلال
 نبودش دگر هیچ فکر و خیال
 یکے روز می گفت با اشقیا
 کہ آرد کسے گر سر مصطفےٰ
 ہزار اشتر از خود بہ بخشم باد
 دو کوهاں سیہ دیدہ و سرخ مو
 زدییای مصری و بردیمن
 دگر سیم و زر بخشش چند من
 عمر چوں شیند آن سخن گفتنش
 بجنیید عرق طمع در تنش

باو گفتم سو گند گرمی خوری
 که از گفته خویشتن نه گزری
 من امروز خدمت رسانم بجا
 بیارم به پیشت سر مصطفی
 گرفتم از ابوجهل اوّل قسم
 پس انگاه زد در ره کیس قدم
 بآنکار چون رفت بیرون عمر
 یکی گفتم با او نداری خبر
 که همشیره ات نیز با جفت خویش
 گرفت دین محمد به پیش
 بر آشفتم ابا حفص ازین گفتگو
 بگفتابریزم کنون خون او
 سوی خانه خواهر خویش رفت
 چون آمد بنزدیک در پیش رفت
 بیامد به پیش درو ایستاد
 صدائے شیندوبیاں گوش داد
 شیند آنکه میخواند مرد نکو
 کلامے که نشنیده بُد مثل او
 وزدمی گرفتند یاد آن کلام
 همان خواهر و جفت او بالتمام
 عمر ز در و خواهرش باز کرد
 چون آمد درون شور آغاز کرد

در افتاد با جفت خواهر ب جنگ
 گرفتش ز حلق و بیفشرد تنگ
 در آویخت داماد هم با عمر
 گرفتند خصمانه هم را به بر
 بختند گه روی هم گاه پشت
 لکد گه زدندی بهم گاه مشت
 زهم پوست کردند گاه مو
 گهے ایس بزیر آمدے گاه او
 ازو چوں عمر بود پر زور تر
 فگندش بزیر و نشست از زبر
 گلویش به تنگی فشرد آنچنان
 که نزدیک شد تا شود قبض جان
 بیا مددواں خواهرش نوحه گر
 به گفتش چه خواهی ز ما ای عمر
 اگر شاد گردی ز ما در ملول
 نمودیم دین محمد قبول
 کنون گر کشی سر بداریم پیش
 ولے برنگردیم از دین خویش
 چوں بشنید از وایس حکایت عمر
 بدانست کو برنگردد دگر
 بگفتش چه دیدی تو از مصطفے
 که گشتی بد بنش چنین مبتلا

بگفتی کلام خدائے جلیل
 کہ آرد باو حضرت جبرئیل
 شنیدیم گردید بر ما یقین
 کہ هست این کلام جہاں آفرین
 عمرؓ گفت ازاں قول معجزا ساس
 اگر یاد داری بخوان بے ہراس
 برو خواہرش آیہ چند خواند
 عمرؓ گوش چون کرد حیراں بماند
 دلش زان شنیدن بسے نرم شد
 بسو دائے اسلام سر گرم شد
 عمرؓ گفت دیگر بخوان زین کلام
 بگفتاد گرنیست زین می بجام
 ولے هست استاد ما در نہفت
 کہ گردید پنہاں چو نامت شنفٹ
 قسم گر خوری کو کہ نیا بد زیاں
 بیاریم پیشت کہ خواند ازاں
 چوب گرفت سو گندازو خواہرش
 بیا ورد استاد خود را برش
 بد از اہل اسلام نامشق خباب
 بیا مد بر نزد عمرؓ بے حجاب
 برو خواند آیات پروردگار
 ابا حفصؓ اسلام کرد اختیار

چون آیاتِ معجزیای را شنید
 همش قول کاهن بخاطر رسید
 به اسلام شد رغبتش بیشتر
 که آن هم شود راست چون این خبر
 وزان پس بگشتند باهم روان
 بنزدِ رسولِ خدائے جهان
 بدولت سرائے پیمبر شدند
 چو در بسته بُد حلقه بر در زدند
 یکی آمد و دید از پشت در
 که استاده باتیغ بر در عمر
 بنزد نبیّ رفت و احوال گفت
 بماندند اصحاب اندر شگفت
 چنین گفت پس عم خیر البشر^ص
 که غم نیست بروی کشائید در
 گراز راه صدق آمده مرحبا
 و گریاشد او را بخاطر دغا
 یه تیغے که دارد حمائل عمر
 تنش را سبکبار سازم ز سر
 چو در باز کردند بر روئے او
 در آمد عمر بالب عذر گو
 گرفتش به بر سرور انبیاء^ص
 نشاندش بجائیکه بودش سزا

بگفتند اصحاب ہم تهنیت
 وزاں بیشتر یافت دیں تقویت
 پس اصحاب دیں راشدائیں مدعا
 کہ از خدمت سرورِ انبیاء
 بسوی حرم آشکارا روند
 نماز جماعت بجا آورند
 رسید این سخن چون بعرضِ رسول
 زخیر البشر یافت عزّ قبول

”عمرؓ (بھی) چند دن کے بعد رسول اللہ ﷺ کے دین میں داخل ہو گئے، ہوا
 یہ کہ ابو جہل کے دل میں ایسی عداوت پیدا ہو گئی کہ پیغمبر ذوالجلال کے قتل کے
 علاوہ اس کو کوئی دوسری سوچ و فکر ہی نہ تھی۔ ایک دن اس نے بد بختوں سے کہا
 کہ اگر کوئی شخص (محمد) مصطفیٰ ﷺ کا سر لے آئے تو میں اس کو ایک ہزار
 اونٹ دو کوہان والے، کالی آنکھوں اور لال رنگ کے دوں گا۔ مصری ریشم اور
 یمنی چادریں اور سونا چاندی مزید دوں گا۔ عمرؓ نے جب اس کی یہ بات سنی تو ان
 کے جسم میں لالچ کی رگ پھڑک اٹھی۔ اس سے کہا کہ اگر تم قسم کھاؤ کہ اپنی بات
 پر قائم رہو گے تو میں آج ہی یہ خدمت انجام دیتا ہوں کہ (محمد) مصطفیٰ ﷺ کا
 سر تیرے سامنے لاتا ہوں۔ ابو جہل سے قسم لینے کے بعد اس (مقصد قتل) کے
 لیے روانہ ہو گئے۔ اس کام کے لیے جب عمرؓ باہر نکلے تو ایک شخص نے ان سے
 کہا کہ کچھ پتہ ہے کہ تمہارے بہن اور بہنوئی محمد ﷺ کا دین قبول کر چکے
 ہیں۔ ابو حفص (عمر) اس بات سے آگ بگولہ ہو گئے اور کہا کہ ابھی میں ان کو
 قتل کر دوں گا۔ اپنی بہن کے گھر گئے تو دروازہ بند تھا دروازے کے پاس آ کر
 کھڑے ہو گئے۔ کچھ آواز سنائی دی تو اس کو غور سے سننے لگے۔ انہوں نے سنا

کہ کوئی بھلا آدمی ایسا کلام پڑھ رہا ہے کہ اس جیسا کلام اب تک نہیں سنا، وہ بہن اور بہنوئی ان سے یہ کلام سارا کا سارا یاد کر رہے ہیں۔ عمرؓ نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ان کی بہن نے کھول دیا جیسے ہی اندر پہنچے تو چیخنے لگے اور اپنے بہنوئی سے لڑنے لگے، اس کی گردن پکڑ کر دبائی۔ عمرؓ کے ساتھ بہنوئی کی دھڑپک ہونے لگی، کبھی چہرہ کے بل اور کبھی پیٹھ کے بل گرتے، کبھی لات مارتے اور کبھی گھونسے چلاتے، کبھی کھال نوچتے تو کبھی بال، کبھی یہ نیچے آتے کبھی وہ آتے، عمرؓ ان سے زیادہ طاقت ور تھے، چنانچہ ان کو نیچے گرا کر اوپر بیٹھ گئے اور ان کی گردن اتنی زور سے دبائی کہ قریب تھا ان کی جان نکل جائے۔ ان کی بہن روتی ہوئی دوڑ کر آئیں ان سے کہا: اے عمر! ہم سے کیا چاہتے ہو، اب تم چاہے خوش ہو یا ناخوش ہم نے محمد ﷺ کا دین قبول کر لیا ہے۔ اب اگر تم مارنا چاہتے ہو تو سر حاضر ہے لیکن اپنے دین سے ہم نہیں پھر سکتے۔ عمرؓ نے جب ان کی یہ بات سنی سمجھ گئے کہ یہ باز نہیں آئیں گے، ان سے کہا کہ آخر محمد میں کیا دیکھا کہ ان کے دین میں اس طرح گرفتار ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ خدائے برتر کا کلام جو حضرت جبرئیل علیہ السلام ان کے پاس لائے (وہ کلام) سنا تو ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ خالق کائنات کا کلام ہے۔ عمرؓ نے کہا اس اعجازی کلام سے اگر کچھ یاد ہو تو بے خوف و خطر سناؤ۔ ان کی بہن نے چند آیتیں ان کو پڑھ کر سنائیں، جب عمرؓ نے سنا تو حیران رہ گئے، ان کا دل اس کلام کے سنتے ہی بے حد نرم ہو گیا اور اسلام کا سودا سر میں سما گیا۔ عمرؓ نے کہا کہ اس کلام سے کچھ اور پڑھو، انہوں نے کہا اس میں اور تو کچھ یاد نہیں لیکن ہمارے استاد چھپے ہوئے ہیں جو آپ کا نام سن کر چھپ گئے تھے اگر تم قسم کھاؤ کہ ان کو تکلیف نہ دو گے تو وہ کلام پڑھنے کے لیے آپ کے سامنے لائیں۔ ان کی بہن نے جب ان سے قسم لے لی تو اپنے استاد کو ان کے سامنے پیش کیا، وہ اسلام لا چکے تھے ان کا نام خبابؓ تھا۔ عمرؓ کے

سامنے بے حجاب آگئے، ان کو پروردگار (عالم) کی آیتیں سنائیں، ابو حفص (عمرؓ) نے اسلام قبول کر لیا، جب یہ معجزانہ (کلام کی) آیات سنیں تو کاہن کی بات ان کے دل میں جم گئی، اسلام سے ان کی رغبت بڑھ گئی کہ وہ (کاہن کی بات) بھی اس خبر کی طرح سچی ہوگی۔ اس کے بعد وہ رسول خدا ﷺ کی طرف روانہ ہوئے۔ پیغمبر خدا ﷺ کے گھر پہنچے، دروازہ بند تھا تو کنڈی بجائی، ایک شخص نے آکر دروازے کی پشت سے دیکھا کہ عمرؓ تلوار لیے کھڑے ہیں۔ وہ حضور ﷺ کے پاس گئے اور حال بتایا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمعین (یہ سن کر) حیران ہو گئے۔ حضور ﷺ کے چچا (حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ) نے کہا کوئی پریشانی کی بات نہیں دروازہ کھول دو اگر وہ نیک ارادے سے آئے ہیں تو ان کو مرحبا ہے اور اگر ان کے دل میں دغا بازی ہے تو جو تلوار عمرؓ لٹکائے ہوئے ہیں اسی سے ان کا سر تن سے جدا کر دوں گا جب دروازہ ان کے لیے کھولا تو عمرؓ کنناں اندر آئے، سرور انبیاء ﷺ نے ان کا دامن پکڑ کر ان کے لائق مقام پر انہیں بٹھایا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمعین نے ان کو مبارک باد دی، ان سے دین کو مزید تقویت حاصل ہو گئی، اب دیندار لوگوں کی یہ خواہش تھی کہ سرور انبیاء ﷺ علانیہ حرم شریف چل کر نماز باجماعت ادا فرمائیں۔ جب حضور ﷺ کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ ﷺ نے اسے قبول فرمایا۔“



آمدن سید اختیار بتائید ملک جبار بحر محترم و نماز گزاردن با اصحاب
سعادت انتساب و آمدن قریش مرتبہ دیگر نزد ابوطالب رضی اللہ عنہ
سخن گفتن از روی قہر و طیش

اللہ کی تائید سے حضور کا حرم شریف میں آنا اور اپنے سعادت مند اصحاب کے ہمراہ
نماز ادا کرنا، قریش کا ابوطالب کے پاس دوبارہ آکر ان سے سختی سے بات کرنا

بیاساقی ای رشک خلد بریں
بساط نشاط بگیتے بچیں
زخم بادہ بے فکر و اندیشہ ریز
سبوسبوشیشہ بر شیشہ ریز
فرود آریں طاق فیروزہ فام
زخورشید جام و زمہ نیم جام
بکن راز پوشیدہ را برملا
بہ دور و بہ نزدیک در دہ صلا
ازاں مے نمے ہم بکامم فگن
وزاں نم بعیش مدامم فگن
چناں مست کن زان مے پُرب
کہ جوشد ز خورشید نورم زلب
دریں بزم ساقی بنور ایاغ
فروزد بدینگونہ روشن چراغ
کہ کردند اصحاب چون اتفاق
برآمد رسول خدا از وثاق

رواں شد بتائید دیان دیں
 چو سوئے حرم سید المرسلین
 ببالید از بس زمیں شد گمان
 کہ بیرون رود از بر آسمان
 ز شادی برق قص اندر آمد سپهر
 چو خورشید هر ذره افروخت چهر
 همی رفت جبریل بالائی سر
 بفرق همایون بگسترده پر
 ملائک چپ و راست در دور باش
 شیاطین ز هیبت شده پاش پاش
 به پهلورواں حمزہ^{رضی} نام دار
 به پیشش علی^{رضی} صاحب ذوالفقار
 ہمیں رفت در پیش حیدر عمر
 حمائل همان تیغ کین بر کمر
 بگرد آمده جمع یاران تمام
 برفتند ز نیشان به بیت الحرام
 جدارِ حرم سر بعرش مجید
 رسانید چون گرد موکب رسید
 چو دیدند کفار زان گونه حال
 نمودند باهم بسے قیل وقال
 یکی رفت از انها به نزد عمر^{رضی}
 بد و گفت این چیست ای بد گهر
 نه ز انساں کہ رفتی تو باز آمدی

بکیں رفتی و بانیاں آمدی
 عمر کرد اسلام خود آشکار
 پس آنگہ باو گفت اے نابکار
 ہران کز شما جنبداز جای خویش
 بہ بیند سر خویش برپای خویش
 چون کفار دریافتند از سخن
 کہ درد دل چہ دارند آن انجمن
 نہادند پاد رہ امتناع
 نمودند با اہل ملت نزاع
 چون دیدند آن صحبت اصحاب دین
 ہمہ دست بردند بر تیغ کیس
 ازاں حال کفار پس پاشدند
 دلیران دیں مسجد آراشدند
 بہ پیش اندر آمد رسول خدا
 نمودند یاران باو اقتدا
 نبیؐ گفت تکبیر چون در حرم
 فتادند اصنام بر روئے ہم
 زتائید ایزد بمسجد نماز
 ادا کرد و آمد سوئے خانہ باز

”اے ساقی آ، رشک خلد بریں بساط نشاط بچھا دے، بے فکر و اندیشہ شرابِ منگے سے بہا،
 پیالہ پر پیالہ اور شیشہ پر شیشہ ڈال، اس طاق فیروزہ فام (آسمان) سے لے کر آسورج سے
 جام اور چاند سے نیم جام لا، پوشیدہ راز کو ظاہر کر دے اور دور و نزدیک صلائے عام دے
 دے، اس شراب کے چند قطرے میرے منہ میں بھی ٹپکا دے اور مجھے اس کا مزہ مسلسل عطا

کرتا رہ، اس پر کیف شراب سے ایسا مست کر دے کہ اس کی گرمی سے نور میرے لبوں سے چھلکنے لگے، اس بزم میں ساتی نور و نکہت کا چراغ یوں روشن کرتا ہے کہ اصحاب نے جب اتفاق کر لیا رسول خدا ﷺ سے تائید حاصل ہوگئی، اللہ تعالیٰ کی تائید سے جب سید المرسلین ﷺ حرم روانہ ہوئے زمین لرزنے لگی جیسے لگتا تھا کہ آسمان سے اوپر نکل جائے گی مارے خوشی کے آسمان رقص کر رہا تھا جیسے سورج ہر ذرہ کو تابناک بنا رہا تھا، جبرئیل امین علیہ السلام اپنے پروں کا سایہ کیے اوپر چل رہے تھے، فرشتے دائیں بائیں تھے، شیاطین ہیبت کے مارے پاش پاش ہو رہے تھے۔ آپ ﷺ کے پہلو میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ چل رہے تھے اور آپ ﷺ کے آگے علی رضی اللہ عنہ صاحب ذوالفقار تھے، حیدر (علی رضی اللہ عنہ) کے آگے عمر رضی اللہ عنہ اپنی کمر میں تلوار لٹکائے چل رہے تھے، آپ ﷺ کے ارد گرد تمام اصحاب جمع تھے، اس شان سے بیت الحرام (کعبہ) کو روانہ ہوئے دیوارِ حرم کا سرعش معلیٰ پر پہنچ گیا، جس وقت یہ قافلہ وہاں پہنچا کفار نے جب یہ صورت حال دیکھی تو آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ ان میں سے ایک شخص عمرؓ کے پاس گیا، ان سے کہا کہ میاں یہ کیا ماجرا ہے؟ تم جیسے گئے تھے ویسے تو نہیں آئے، گئے تھے غصہ میں اور آئے نیاز مندانہ، عمرؓ نے برملا اپنے اسلام کا اظہار کر دیا اور اس سے کہا کہ اے نامراد! اگر تم میں سے ایک نے بھی اپنی جگہ سے جنبش کی تو اپنا سر اپنے پیروں پر دیکھے گا، کفار پوری بات سمجھ گئے کہ ان لوگوں کے دل میں کیا، چنانچہ انہوں نے رکاوٹ ڈالنی چاہی اور مسلمانوں سے لڑنا چاہا، حضور ﷺ کے ساتھی مسلمانوں نے ان کی نیت بھانپ لی، چنانچہ سب تیغ بکف ہو گئے، اس کو دیکھ کر کفار پیچھے ہٹ گئے اور ان دین کے بہادروں نے مسجد کو اپنے سجدوں سے آراستہ کیا۔ سب سے پہلے رسول خدا ﷺ اندر آئے، اصحاب رضی اللہ عنہم نے بھی آپ کی اقتدا کی، نبی ﷺ نے جب حرم میں تکبیر بلند کی تو سارے بت سرنگوں ہو گئے، اللہ تعالیٰ کی مدد سے مسجد میں نماز ادا کر کے گھر واپس آئے۔“

اے حضراتِ شیعہ! تم کو اپنے باذل بے بدل اور اپنے قبلہ و کعبہ کے آب و گل کی قسم ہے کہ اس روایت کو دیکھو اور غور کرو کہ جو شخص اس دھوم دھام سے ایمان لائے اور جو آدمی

اس شان و شوکت سے مسلمان ہو اس کی نسبت کون خیال کر سکتا ہے کہ وہ منافق ہو گا یا سچے دل سے ایمان نہ لایا ہو گا یا بعد ایمان کے مرتد ہو گیا ہو گا یا ایسے شخص سے کبھی پیغمبر ﷺ رنجیدہ ہوئے ہوں گے یا ایسے آدمی کو دشمن اسلام کا اور منافق سمجھے ہوں گے..... دیکھو جو دعا پیغمبر ﷺ نے ان کے لیے کی تھی کیسی جلد خدا نے قبول کی اور اس کا اثر کیسا جلد ظاہر ہوا کہ ان کے ایمان لانے کا پہلا کام تو یہ ہوا کہ اوّل اوّل نماز جماعت کی خانہ کعبہ میں ادا ہوئی اور اخیر کا کام ان کا یہ ہوا کہ روم، شام اور حلب و دمشق میں کلمہ کفر کا پست اور خدا کا کلمہ بلند ہوا، ابتدائے اسلام کی عزت بھی انہی کی ذات سے ہوئی اور خاتمہ بھی انہی پر ہوا، حقیقت میں دعا اس کو کہتے ہیں اور قبولیت اسی کا نام ہے۔

اے یارو! ذرا تو انصاف کو دخل دو اور تعصب و عناد کو چھوڑو کہ جس کی ذات سے ایک ہزار چھتیس شہر کفر کے دارالاسلام ہوئے اور جس کی بدولت ہزاروں بت خانے اور گرجے ٹوٹ کر مسجدیں بن گئیں اور جس کے سبب سے کسریٰ اور قیصر کے محلوں میں اللہ اکبر کا غلغلہ بلند ہوا اور جس کی وجہ سے ان کی بیٹیاں مسلمانوں کی لونڈیوں میں داخل ہوئیں اور جس کی ذات سے ظلمت کفر کی دور ہوئی اور روشنی اسلام کی از شرق تا غرب پھیل گئی وہی تمہارے نزدیک منافق ہے اور اسی کا نام تمہارے یہاں دشمن خدا اور عدو رسول ہے تو معلوم نہیں کہ پھر خدا کا دوست اور رسول کا محب کون ہے..... اگر حضرت عمرؓ کی ذات نہ ہوتی تو آج تمہارے قبلہ و کعبہ لکھنؤ میں بیٹھ کر علیؓ علیؓ کہتے یا اجودھیا میں رام رام پکارتے، یہ عمرؓ ہی کی جوتیوں کا طفیل ہے کہ تم خدا کی توحید سے اور پیغمبر ﷺ کی نبوت سے واقف ہوئے اور کفر چھوڑ کر اسلام اور ایمان کے نام سے آگاہ ہوئے، لیکن آفریں تمہاری احسان فراموشی پر کہ اسی کی دشمنی کو تم نے ایمان قرار دیا ہے اور کفر کی بنیاد کھودنے والے اور اسلام کا نیزہ گاڑنے والے کا نام منافق اور کافر رکھا ہے..... حقیقت یہ ہے کہ جب شیطان نے دیکھا کہ بعد اسلام کے کفر پھیلا نہیں سکتا اور شرک صریح میں گرفتار کر نہیں سکتا تب اس نے یہ تدبیر کی کہ لوگوں کے دلوں میں کفر کی جڑ دوسری طرح قائم کرے، اور باوجود مسلمانی کے دعوے کے ان کو اسلام سے

خارج کر دے تب اس نے یہ تدبیر کی اور رخص کا عقیدہ لوگوں کے دلوں میں مضبوط کیا اور جن لوگوں نے پیغمبر ﷺ کی مدد کی اور جنہوں نے اسلام کو پھیلایا اور جن کے سائے سے شیطان بھاگا ان کی عداوت دلوں میں ڈال دی تاکہ اس حیلے سے اس کا کام نکلے اور لوگ اسلام سے نفرت کریں یا اسلام کا نام لیں مگر اصل میں اس کو چھوڑ بیٹھیں۔ چنانچہ اس ملعون کا مطلب حضرات شیعہ سے بخوبی حاصل ہو گیا اور اس شقی ازلی نے ان کے دلوں کو اندھا کر دیا کہ وہ ایسے اصحابِ جلیل القدر کو برا جاننے لگے اور ایسے دوستوں کو پیغمبر ﷺ کے برا کہنے لگے، ان کی دشمنی کو ایمان سمجھے اور ان کو گالیاں دینا عبادتِ جانا۔ حقیقت میں ان لوگوں نے ایمان چھوڑ دیا اور شیطان کے دام میں آ کر اسلام سے ہاتھ دھویا ورنہ جس کو ذرا بھی عقل ہوگی کیا وہ یہ نہ سمجھے گا کہ اگر وہی لوگ جو اس شد و مد سے ایمان لائے کافر تھے اور وہی آدمی جنہوں نے اسلام کو عرب سے لے کر عجم تک اور عجم سے لے کر ہند تک پھیلایا اسلام کے دشمن تھے تو پھر دوسرا کون مسلمان ہو سکتا ہے، ضرور اس کا عقیدہ اسلام سے پھر جائے گا۔ حقیقت میں اسلام کی حقیقت پر کوئی معتقد نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ شیعوں کے عقیدے نہ چھوڑے اور پاک سنی نہ بن جائے۔ ﴿وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ اِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ میں اس مقام پر ایک اور بات شیعوں کی لکھنا مناسب سمجھتا ہوں تاکہ ان کے عقیدے کی خوبی اس سے ظاہر ہو جائے اور ان کی دشمنی اسلام اور ایمان سے ثابت ہو جائے۔

یہ امر تو بخوبی ثابت ہو گیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ذات سے نہایت تقویت دین کی ہوئی اور اسلام کی جڑ انہی کے سبب سے مضبوط ہوئی، چنانچہ صاحبِ حملہ حیدریہ نے بایں تعصب خود اقرار کیا ہے: کما قيل: مصرع.....

وزاں بیشتر یافت دیں تقویت

اور ظاہر ہے کہ جس کی ذات سے دین نے تقویت پائی ہوگی اس کی ذات سے پیغمبر ﷺ کو محبت بھی بدرجہ غایت ہوگی لیکن موافق روایت شیعوں کے پیغمبر ﷺ کو کسی سے اس قدر عداوت نہ تھی جیسے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے تھی اور ان کے مرنے کی خبر سے جس

قدر حضرت کو خوشی ہوئی ایسی کسی خبر سے نہ ہوئی تھی اور جو فضائل اس روز کے جس روز کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شہادت پائی پیغمبر خدا ﷺ نے بیان کیے ہیں ایسے فضائل جمعہ، عید اور روز غدیر کے بھی بیان نہیں کیے اور جو برکات اور فائدے اہل بیت کو اس تاریخ میں ہوئے ہیں جس تاریخ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وفات پائی ایسے کبھی کسی روز نہیں ہوئے..... چنانچہ ”زاد المعاد“ میں جو معتبرین کتب شیعہ سے ہے اور ملا باقر مجلسی جس کے مؤلف ہیں اس کے آٹھویں باب کی پہلی فصل میں ایک طول طویل روایت لکھی ہے جس کو ملا صاحب نے اپنے نامہ اعمال کی طرح سیاہ کیا ہے، اس کا مختصر مضمون ہم لکھتے ہیں:

”حذیفہ ❶ بن یمان رضی اللہ عنہ صحابی سے روایت ہے کہ میں نوے ربيع الاول کو پیغمبر ﷺ

❶ بدر ستیکہ خبر داد مراد پدرم کہ حذیفہ بن یمان در روز نهم ربيع الاول داخل شد بر جدم رسول خدا، حذیفہ گفت کہ دیدم حضرت امیر المومنین و حضرت امام حسن و امام حسین را کہ با حضرت رسالت پناه طعام تبادل می نمودند و حضرت بروی ایشان تبسم میفرمود و با حضرت امام حسن و امام حسین میگفت بخورید گو ارباد از برائے شما برکت و سعادت این روز بدرستیکہ این روزیست کہ حق تعالیٰ هلاک میکند دشمن خود و دشمن جد شمار او مستجاب میگرداند درین روز دعائے مادر شما، بخورید کہ این روزیست کہ حق تعالیٰ قبول می کند اعمال شیعیان و محبان شمارا درین روز، بخورید کہ این روزیست کہ ظاہر میشود راستی گفتہ خدا کہ میفرماید ﴿فتلک بیوتهم خاویة بما ظلموا﴾ یعنی این ست خانہای ایشان کہ خالی گردیدہ ست بسبب ستمہای ایشان، بخورید کہ این روزیست کہ شکستہ می شود درین روز شوکت جد شما و یاری کنندہ جد شما و یاری کنندہ دشمن شما، بخورید کہ این روزیست کہ هلاک میشود درین روز فرعون اہل بیت من و ستم کنندہ برایشان و غصب کنندہ حق ایشان بخورید کہ این روزیست کہ حق تعالیٰ عملہائے دشمنان شمارا باطل دہبا میگرداند، حذیفہ گفت کہ من گفتم کہ یارسول اللہ آیا در میان امت تو کسی خواهد بود کہ ہتک این حرمتہا نماید حضرت فرمود کہ ای حذیفہ بتی از منافقان برایشان سرگروہ خواهد شد و دعویٰ ریاست در میان ایشان خواهد کرد و مردم را بسوی خود دعوت خواهد نمود و تازیانہ ظلم و ستم را بردوش خود خواهد گرفت و مردم را از راه خدا منع خواهد نمود و کتاب خدا را تحریف خواهد نمود و سنت مرا تغیر خواهد دادا و میراث فرزند مرا متصرف خواهد شد و خود را پیشوائے مردم خواند و زیادتی بر وصی من علی بن ابی طالب خواهد کرد و مالہائے خدا را بنا حق بر خود حلال خواهد کرد و در غیر طاعت خدا صرف خواهد کرد و مراد بر اور من و وزیر من ⇐⇐⇐

کی خدمت میں حاضر ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت کے پاس امیر المؤمنین علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور حضرت امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما بیٹھے ہوئے ہیں اور کھانا نوش فرما رہے ہیں اور حضرت نہایت خوش ہیں اور حسین رضی اللہ عنہ سے کہہ رہے ہیں کہ کھاؤ بیٹا کھاؤ یہ کھانا تم کو مبارک

﴿﴾ علی بن ابی طالب رابدروغ نسبت خواهد داد و دختر مرا از خود محروم خواهد گردانید پس دختر من اور انفریں خواهد کرد و حق تعالیٰ نفریں اور امستجاب خواهد کرد۔ حذیفہ گفت یارسول اللہ چرادعا نمی کنی حق تعالیٰ اور در حیات شما هلاک کنده حضرت فرمود کہ اے حذیفہ دوست نمیدارم کہ جرأت کنم بر قضای خدا و از و طلب کنم تغیر امرے را کہ در علم او گزشتہ است و لیکن از حق تعالیٰ سوال کردم کی فضیلت دهد آنروز را کہ در آن روز او بجہنم میرود و برسائے روزها تا آنکہ احترام آن روز سنتے گردد و در میان دوستان من و شیعیان اہل بیت من، پس حق تعالیٰ وحی کرد بسوی من کہ اے محمد ﷺ در علم سابق من گزشتہ است کہ دریا بد ترا و اہل بیت ترا مختہا و بلائے دنیا و ستمہائے منافقان و غضب کنندگان از بندگان من آن منافقان کہ تو خیر خیر خواهی ایشاں کردی و با تو خیانت کردند و تو با ایشاں راستی کردے و ایشاں با تو مکر کردند و تو با ایشاں صاف بودی ایشاں دشمنی ترا بدل گرفتند و تو ایشاں را خشنود کردی و ایشاں ترا تکذیب کردند و تو ایشاں را بر گزیدی و ایشاں ترا در ملبہ گذاشتند و قسم یا دمیکنم بحول و قوت و باد شاہی خود کہ البتہ بکشایم بر روئے کسیکہ غضب کند حق علیؑ را کہ وصی تست بعد از تو ہزار دراز پس ترین طبقات جہنم کہ آنرا فیلوق می گویند و او را و اصحاب او را در قعر جہنم جاد ہم کہ شیطان از مرتبہ خود براو مشرف شود و او را می کند، و آن منافق در روز قیامت عبرتے گردانم برائے فرعونہا کہ در زمانہائے پیغمبران دیگر بودند و برائے سائر دشمنان دین و ایشاں و دوستان ایشاں را بسوی جہنم برم و با دیدہائے کبود و روہائے ترش با نہایت مذلت و خواری و بہ پشیمانی ایشاں را ابد آلاباد در عذاب خود بدارم، اے محمد نمیر سا علی بمنزلت تو مگر آنچه میر سد باو از بلاہا از فرعون اور غضب کنندہ حق او کہ جرأت میکند بر من و کلام مرا بدل می کند و شرک بمن می آورد و مردم را منع میکند از راہ رضائے من و گو سالہ از برائے امت تو برامیکند کہ آن ابو بکرؓ است و کافر میشود بمن در عرش عظمت و جلال من بدرستیکہ کہ من امر کرده ام ملائکہ ہفت آسمان خدرا کہ برائے شیعیان و محبان دین شما عید کنند آن روزے را کہ آن کشتہ میشود، امر کردم کہ کرسی کرامت مرا نصب کنند در برابر بیت المعمور و ثنا کنند بر من و طلب آمرزش نمایند برائے شیعیان و محبان شما از فرزندان آدم، و امر کرده ام ملائکہ نویسندگان اعمال را کہ ازین روز تا سہ روز قلم از مر دم بردارند و نہ نویسند گناہان ایشاں را برائے کرامت تو وصی تو، اے محمد ﷺ این روز را عیدے گردانند برائے تو و اہل بیت تو و برائے ہر کہ تابع ایشاں باشد از مومنان و شیعیان ایشاں، ﴿﴾

ہو کہ آج کا دن وہ ہے جس میں خدا اپنے دشمن کو اور تمہارے جد کے دشمن کو ہلاک کرے گا اور تمہاری مادر مشفقہ کی دعا کو قبول کرے گا، کھاؤ بیٹا کھاؤ کہ آج وہ دن ہے کہ خدا تمہارے شیعوں اور مجبوں کے اعمال کو قبول کرے گا، کھاؤ بیٹا کھاؤ کہ آج کی تاریخ خدا میرے اہل

﴿﴾ و سو گند یا دمیکنم بعزت و جلال خود و علو منزلت و مکان خود کو عطا کنم کسے را کہ عید کند این روز را از برائے من ثواب آنها کہ بد در عرش احاطہ کردہ اند و قبول کنم شفاعت اور از خویشاں و زیادہ کنم مال اور اگر کشادگی دہد بر خود و بر عیال خود و دریں روز و ہر سال در این روز ہزار ہزار کس از موالیان و شیعیان شمارا از آتش جہنم آزاد گردانم و اعمال ایشاں را قبول کنم و گناہان ایشاں را بیا مرزم۔ حذیفہؓ گفت پس بر خواست حضرت رسول خداؐ و بخانہ ام سلمہؓ رفت و من برگشتم و صاحب یقین بودم در کفر عمر تا آنکہ بعد از وفات حضرت رسولؐ دیدم کہ او چہ فتنہا برانگیخت و کفر اصلی خود را اظہار کرد و ازین دین برگشت و دامان بے حیائی و وقاحت برای غصب امامت و خلافت برزد و قرآن را تحریف کرد و آتش در خانہ وحی رسالت زد و بدعتہادر دین خدا پیدا کرد و ملت پیغمبر را تغیر داد و سنت آنحضرت را بدل کرد و شہادت حضرت امیر المومنین را رد کرد و فاطمہ دختر رسول خدا را بد روغ نسبت داد و فدک را غصب کرد و یہود و نصاریٰ محوس را از خود راضی کرد و نور دین مصطفیٰؐ رانجشم آورد و رضا جوئے اہل بیت رسالت نہ کرد و جمیع سنتہای رسول خدا را بر طرف کرد و تدبیر کشتن امیر المومنین کرد و جور و ستم در میانہ مردم علانیہ کرد و ہر چہ خدا حلال کردہ بود حرام کرد و ہر چہ حرام کردہ بود حلال کرد و حکم کرد کہ از پوست شتر درہم و دینار بسازند و خرچ کنند و در بر رو و شکم فاطمہ زہرا زد و بر منبر حضرت رسالت بغضب و جور بالا رفت و بر حضرت امیر المومنین افترا بست و بآنحضرت معارضہ کرد، رای آنحضرت را بسفاهت نسبت داد۔ حذیفہؓ گفت پس حق تعالیٰ دعائے برگزیدہ خود و دختر پیغمبر خود را در حق آنمنافق مستجاب گردانید و قتل اور ابرو سنت کشنده اور حمۃ اللہ جاری ساخت۔ پس رفتیم بخدمت حضرت امیر المومنین کہ آنحضرت را تہنیت و مبارک باد بگوئیم بآنکہ آن منافق کشتہ شد و بعذاب حق تعالیٰ و اصل گردید چون حضرت مرادید فرمودای حذیفہ آیا در خاطر داری آن روزے را کہ آمدی بنزد سید من رسول و من و دو سبط من حسن و حسین نزد او نشستہ بودیم و با و طعام میخوردیم پس ترا دلالت کرد بر فضیلت این روز گفتم بلے ای برادر رسول حضرت فرمود بخدا سو گند کہ این روزیست کہ حق تعالیٰ در آن دیدنہ آل رسولؐ را روشن گردانید و من برائے این روز ہفتاد دو نام میدانم حذیفہؓ گفت کہ یا امیر المومنین میخواہم کہ آن نامہارا از تو بشنوم حضرت فرمود کہ این روز استراحت ست کہ مومناں از شر آن منافق استراحت یافتند و روز زائل شدن کرب و غم است و روز غدیر دوم ست و روز تخفیف ﴿﴾

بیت کے فرعون کو ہلاک کرے گا، کھاؤ بیٹا کھاؤ کہ آج کے دن خدا تمہارے دشمنوں کے عمل کو

﴿﴾ گناہانِ شیعانست و ردوز اختیار نکوئی برائے مومنان ست و روز برداشتن قلم از شیعانست و روز برہم شکستن بنائے کفر و عدوانست و روز عافیت ست و روز برکت ست و روز طلب کردن خونہائی مومنان ست و روز عید بزرگ خداست و روز مستجاب شدن دعاست و روز موقف اعظم ست و روز وفائے بعہدست و روز شرط ست و روز کندن جامہ سیاہست و روز ندامت ظالمست و روز شکستہ شدن شوکت مخالفانست و روز نفی ہموم ست و روز فتح ست و روز عرض اعمال آل کافرست و روز ظہور قدرت خداست و روز عفو گناہانِ شیعان ست و روز فرح ایشانست و روز توبہ ست و روز انابت ست بسوی حق تعالیٰ و روز زکوٰۃ بزرگ و روز قطر دوم ست و روز اندوہ باغیانست و روز گرہ شدن آب دہاں در گلوی مخالفانست و روز خوشنودی مومنانست و روز عید اہل بیت ست و روز ظفر یافتن بنی اسرائیل بر فرعونست و روز مقبول شدن اعمال شیعانست و روز پیش فرستادن تصدقات ست و روز زیادتی مثنوبانست و روز قتل منافق ست و روز وقت معلوم ست و روز سرور اہل بیت ست و روز مشہودست و روز قہر بر دشمن ست و روز خراب شدن بنیان ضلالت ست و روزیست کہ ظالم انگشت ندامت بدنہاں میگذرد و روز بیتہ ست در روز شرفست و روز خنک شدن دلہای مومنانست و روز شہادتست و روز در گزشتن از گناہ مومنان ست و روز تازگی بوستان اہل ایمانست و روز شیرینی کام ایشانست و روز خوشی دلہای مومنانست و روز برطف شدن پادشاہی منافقانست و روز توفیق اہل ایمانست و روز رہائی مومنان ست از شر کافران اور روز مظاهر تست و روز مفاخرتست و روز قبول اعمالست و روز تبجیل و تعظیم ست و روز بخلہ و عطاست و روز شکر حق تعالیٰ ست و روز یاری مظلومانست و روز یاریت کردن مومنانست و روز محبت کردن ایشانست و روز رسیدن برحمتہائے الہی ست و روز پاک گردانیدن اعمال ست و روز فاش کردن رازست و روز برطرف شدن بدعتہاست و روز ترک کردن گناہانِ کبیرہ ست و روز ندا کردن بحق ست و روز عبادتست و روز موعظت و نصیحت ست و روز انقیاد پیشوایان دین ست۔ حذیفہؓ گفت کہ پس از خدمت امیر المومنین بر خاستم و گفتم اگر درنیا ہم از اعمال و افعال خیر و آنچه امید ثواب دارم از ان اگر محبت این روز دانستن فضیلت این راہر آئینہ منتهای آرزوی من خواہد بود۔ پس محمد و یحییٰ راویان حدیث گفتند کہ چون این حدیث را از احمد بن اسحاق شنیدیم ہریک بر خواستیم و سر اور ابو سیدیم و گفتیم حمد و شکر میکنیم خداوندی را کہ برانگیخت ترا از برائے ماتا آنکہ فضیلت این روز را بمار سانیدی پس بخانہای خود برگشتیم و این روز را عید کردیم۔ (زادالمعاد از ملا باقر مجلسی، متن مع فتاویٰ حجة الاسلام جناب مرزا محمد حسن نجفی دام ظلہ العالی علی حسن تصحیح تعادہ دودمان مصطفوی سلالہ خاندان مرتضوی مولوی سید محمد علی موسوی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ صفحہ ۵۷۷ تا ۵۸۴۔)

باطل کرے گا، کھاؤ بیٹا کھاؤ کہ آج کی تاریخ خدا کے اس قول کی تصدیق ہوگی ﴿فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةٌ بِمَا ظَلَمُوا﴾ کہ آج کے دن گھر ان کے خالی ہو گئے بہ سبب ظلم کے جو انہوں نے کیا تھا۔ حدیث صحابی کہتے ہیں کہ میں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! کیا آپ کی امت میں بھی کوئی ایسا ہوگا؟ حضرت نے فرمایا کہ ہاں ایک بت منافقوں سے ان کا سرگروہ ہو گا اور دعویٰ ریاست کا کرے گا اور تازیانہ ظلم و ستم کا اپنے ہاتھ میں لے گا اور آدمیوں کو خدا کی راہ سے منع کرے گا اور خدا کی کتاب میں تحریف کرے گا اور میری سنت کو بدل دے گا اور میرے وصی علیؑ پر زیادتی کرے گا اور خدا کے مال کو ناحق اپنے اوپر حلال کرے گا اور غیر طاعت میں خدا کے صرف کرے گا اور مجھے اور میرے بھائی علیؑ کو جھوٹا کہے گا۔ حدیث نے کہا کہ حضرت اگر وہ ایسا ہے تو کیوں آپ اس کے لیے دعا نہیں کرتے تاکہ وہ آپ کی زندگی میں ہلاک ہو جائے، حضرت نے جواب دیا کہ میں خدا کی قضا پر جرات نہیں کرتا اور جو کچھ اس نے اپنے علم میں قرار دے دیا ہے اس کا بدلنا اس سے نہیں مانگتا، لیکن یہ خدا سے سوال کرتا ہوں کہ اس روز کو فضیلت دے اور تمام دنوں پر اس دن کو عزت بخشے۔ چنانچہ حضرت کی دعا خدا نے قبول کی اور وحی کی کہ اے پیغمبر! میں اس دن کو افضل کرتا ہوں اور علیؑ کو تیرا سارے اس کے ظلم کے سبب سے عطا کروں گا، وہ شخص مجھ پر جرات کرے گا، میرے کلام کو بدل دے گا، میرے ساتھ شرک کرے گا، لوگوں کو میری راہ سے منع کرے گا، میرے ساتھ بہ کفر پیش آئے گا اس لیے میں نے ملائکہ ہفت آسمان کو حکم دیا کہ اس دن کو جس میں وہ مارا جائے شیعوں اور مجبوں کے لیے عید کریں، اس تاریخ کو میری کرسی کرامت کو بیت المعمور کے برابر نصب کریں اور تمام شیعوں کی مغفرت کی دعا کریں، اور میں نے تمام فرشتوں کو حکم دیا ہے کہ اس تاریخ سے تین دن تک قلم آدمیوں سے اٹھالیں اور کوئی شخص کوئی گناہ کیوں نہ کرے اس کو نہ لکھیں۔ اے محمد! اس دن کو میں نے تیرے لیے اور تیرے شیعوں کے لیے عید بنا دیا ہے۔“ انتھی .

﴿أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ﴾ (اے مومنو!) اس روایت کو دیکھو اور شیعوں کے ایمان انصاف

اور عقل پر روؤ۔ تعجب ہے کہ زمیں شق نہیں ہو جاتی کہ وہ سما جائیں قہر کی بجلی نہیں گرتی کہ وہ

جل جائیں، طوفانِ غضب نہیں آجاتا کہ وہ ڈوب مریں۔ دیکھو پیغمبر ﷺ پر اس حدیث میں کیسی تہمت ہے اور خدا کے محبوب پر کیا افترا باندھا ہے، خدا اس قوم سے جس نے اپنی آنکھوں کو اندھا اور کانوں کو بہرا اور دلوں کو غافل کر رکھا ہے اس تہمت اور افترا کا بدلہ لے، درحقیقت انہیں کی شان میں یہ صادق ہے:

﴿لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ أُذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ﴾ (الاعراف: ۱۷۹)

”ان کے دل ہیں ان سے سمجھتے نہیں ان کے آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے گئے گزرے وہ غافل لوگ ہیں۔“

کوئی دقیقہ کفر اور بے ایمانی کا نہیں ہے جو اس حدیث کے واضح نے چھوڑا ہو، کوئی جھوٹ و افترا نہیں رہا جو پیغمبر ﷺ کی طرف منسوب نہ کیا ہو۔ بھلا کون شخص ہے جو اس بات کو مانے گا کہ جس شخص کے ایمان لانے کے لیے خود ہی حضرت نے دعا کی ہو اور جس کے لیے بروایت امام باقر علیہ السلام ((اللهم اعزنا لاسلام بعمر بن الخطاب)) کہا ہو اور جس کے حق میں خدا نے حضرت کی دعا قبول کی ہو اور جس نے مسلمان ہوتے ہی اسلام کا جھنڈا کعبہ میں گاڑ دیا ہو اور جس نے اسلام لاتے ہی حضرت کو کعبے چلنے پر مستعد کیا ہو اور جس نے اپنی تمام عمر حضرت کی محبت، اطاعت اور فرمانبرداری میں اور اپنی ساری زندگی اسلام کے پھیلانے میں صرف کر دی ہو اور جس نے دنیا کی کسی قسم کی لذت نہ اٹھائی ہو اور جس نے خدا کی راہ میں جان دے دی ہو اس سے پیغمبر ﷺ اس قدر رنجیدہ ہوں کہ اس کے مرنے پر اس قدر خوشی کریں اور اس کے مرنے کے دن کو عید الفطر عید الضحیٰ اور عید غدیر سے بھی بڑھ کر افضل جانیں اور خدا اس کے مرنے سے اس قدر خوش ہوئے کہ تین دن تک گناہوں کے لکھنے سے قلم اٹھالے اور شیعوں کو اجازت دے دے کہ اس تین دن کے عرصہ

میں چاہیں زنا کریں، چاہیں شراب پیئیں اور چاہیں مسجدیں ڈھاویں، چاہیں قرآن جلائیں جو دل چاہے کریں نہ کوئی پوچھنے والا ہے نہ بتلانے والا، کراماً کاتبین موقوف، لکھنا پڑھنا بند، پس ایسی حالت میں بھی اپنی خواہشیں پوری نہ کریں تو کب کریں گے۔ خدا کے لیے انصاف کرو اور اس عقل کے دشمن، ایمان کے عدو فرقتے کو دیکھو کہ ان کو کس قدر شیطان نے بہکایا ہے اور اسلام کی راہ سے کس قدر دور کر دیا ہے۔۔۔ سبحان اللہ! کیا دین اور کیا مذہب ہے کہ بے چارے نمازی برسوں نماز پڑھتے پڑھتے مریں، روزے رکھنے والے تیس دن تک گرمیوں کے دنوں میں بھوک پیاس کی تکلیف اٹھائیں، حاجی ہزاروں منزل سے راہ کی مصیبت طے کر کے کعبے میں پہنچیں اور حج کریں تب صبر کے مستحق ٹھہریں اور شیعہ بھائی گھر بیٹھے زنا کریں، شرابیں پیئیں اور ربیع الاول کی نویں تاریخ کو اپنے بابا شجاع کے نام پر حلوے کھائیں اور لعنتی کھانا نوش کریں اور سب سے زیادہ ثواب پائیں۔

واہ کیا خدا کا عدل ہے، شاید اسی سبب سے خدا کو عادل سمجھتے ہیں اور عدل کو اصولِ خمسہ دین میں جانتے ہیں، اگر ایمان اسی کا نام ہے اور محبت اہل بیت اسی کو کہتے ہیں تو افسوس ایسے ایمان اور ایسی محبت پر اور اگر محبت اور مومن ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں تو وائے ان کے حال پر.....

گرولی ایں ست لعنت برولی

اس روایت کی صحت اگر تسلیم کی جائے تو ضرور یہ امر بھی ماننا پڑے گا کہ پیغمبر ﷺ بھی تقیہ فرماتے تھے اور وہ بھی کافروں بلکہ اپنے یاروں سے ڈرتے تھے اور خوف کے سبب سے جو کچھ ان کے دل میں ہوتا اس کو ظاہر نہ فرماتے تھے، اس لیے کہ اگر خوف نہ ہوتا تو ایسے دشمن خدا اور رسول کو جیسے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے اور جن کے مرنے کی خبر سے اس قدر خوش تھے اور جن کی موت کی تاریخ کو عید اور جمعے سے افضل جانتے تھے اور جن کو فرعون اہل بیت کہتے تھے کیوں اپنی صحبت میں رکھتے اور کس لیے ان کو اپنا مصاحب بناتے اور کس واسطے ان سے ہمیشہ صلاح و مشورہ لیا کرتے، کسی آدمی کی عقل میں یہ بات آسکتی ہے کہ پیغمبر ﷺ جن کا کام خلق کی ہدایت تھا اور احکام الہی کا پہنچانا جن کے اوپر فرض تھا اور امت کو نیک و بد پر آگاہ

کر دینا جن کے اوپر لازم تھا وہ بھی تقیہ کرتے ہوں اور خوف جان کے سبب سے عمر رضی اللہ عنہ کا نام بھی نہ لے سکتے ہوں اور باوجود اس کے کہ ان کو اپنے دین کا دشمن جانا اور جان بوجھ کر ان کو اپنی صحبت سے نہ نکالا اور علانیہ لوگوں پر ان کے کفر و نفاق کا حال ظاہر نہ فرمایا اور لوگوں کو دھوکے میں رکھا، بلکہ بر ملا کہنا اور لوگوں سے علانیہ ان کے کفر و نفاق کا حال ظاہر کرنا بیک طرف اپنے گھر میں بھی پوچھنے والے سے ان کا نام نہ لیا اور ”دیوار ہم گوش دارد“ کا مضمون پیش نظر رکھ کر گول گول ہی بات فرمائی، اسی واسطے حدیفہ رضی اللہ عنہ صحابی سے سب حال تو حضرت نے بیان فرما دیا لیکن عمر رضی اللہ عنہ کا نام نہ لیا بلکہ ان کے پوچھنے پر بھی جواب صاف نہ دیا اور فقط ان کی صفات بیان کر کے سکوت فرمایا، اگر ان کا نام حدیفہ رضی اللہ عنہ سے کہہ دیا ہو تو اس کے ساتھ سکوت کی بھی نصیحت کر دی ہو۔

تعب ہے حضرات شیعہ سے کہ وہ مسلمانی کا نام بدنام کرتے ہیں اور پیغمبر خدا ﷺ پر ایسی تہمت لگاتے ہیں اور خدا اور رسول سے کچھ نہیں شرماتے۔ خانہ خراب ہو تقیے کا جس سے کسی کو محفوظ نہیں جانتے اور پیغمبر ﷺ پر بھی اس کا افترا کرتے ہیں، حالانکہ خود ان کے علماء کا اقرار ہے کہ پیغمبر ﷺ تقیہ نہ کرتے تھے بلکہ وہ تقیے سے ممنوع تھے، چنانچہ ہم بحث تقیے میں اس کا ذکر کریں گے اور حقیقت میں اگر پیغمبر ﷺ بھی تقیہ کرتے ہوتے اور وہ کافروں سے ڈرتے ہوتے اور جو بات سچ ہے اس کو زبان پر نہ لاتے تو دین کیوں کر جاری ہوتا اور مذہب اسلام کیوں کر پھیلتا اور لوگوں کو حضرت کی صداقت پر کس طرح یقین رہتا۔ پس جبکہ پیغمبر خدا ﷺ نے ابتدائے نبوت میں تقیہ نہ کیا اور باوجود تکلیف اٹھانے کے کفار کے ہاتھ سے ان کے کفر کی برائی اور ان کے بتوں کی ہجو کو ترک نہ کیا اور سب طرح کے صدموں کو صرف اسی بات پر گوارا فرمایا اور بعد ہجرت کے اور بعد شروع ہونے جہاد کے کفار و مشرکین کو قتل کیا اور جو واجب القتل معلوم ہوا اس کے خون کو ہدر کیا اور ان کے نام لے کر لوگوں کو ان کے قتل پر آمادہ کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو باوجود جاننے اس امر کے کہ ان سے بڑھ کر کوئی کافر اور منافق نہیں ہے اور ان سے زیادہ کوئی دشمن خدا اور رسول نہیں ہے کبھی اپنی آغوش سے

جدانہ کیا اور سوائے تعریف کے کبھی ان کی برائی کا کلمہ بھی زبان مبارک پر نہ لائے تو ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا خوف ہوگا اور حضرت سے زیادہ تقیہ کون کرے گا۔

میں اس مقام پر چند اشعار ”حملہ حیدریہ“ کے لکھتا ہوں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ کفار کی برائیوں کے ظاہر کرنے اور ان کے معبودوں اور بتوں کی ہجو کرنے میں کچھ کسی کا خیال نہ کرتے تھے اور ہر چند کوئی سمجھاتا اس سے باز نہ آتے تھے۔ کما قیل:

بفر ❶ موداگر قوم از آسماں
بیارند خورشید را ترجمان
گزارند بردشت من ہدیہ وار
نہ بندم لب از امر پروردگار
بجز طعن اصنام و وصف آلہ
بجز لعن آبائے گم کردہ راہ
زمن قوم حرف دگر نشنوند
اگر نیک دانند اگر بد برند

”آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر قوم آسمان سے سورج کو ترجمان بنا کر لے آئے اور میرے ہاتھوں پر ہدیتا رکھ دے تو بھی میں حکم پروردگار سے منہ نہیں بند کر سکتا سوائے بتوں کی برائی اور خدا کی تعریف کے (نیز) گمراہ پرکھوں کی مذمت کے قوم مجھ سے دوسری بات نہیں سنے گی چاہے ان کو اچھا لگے یا برا لگے۔“

اور پھر یہی مؤلف آئندہ پیغمبر ﷺ کے اظہار دعوت میں لکھتا ہے، اشعار:

بدعوت ❷ شد آمادہ تراز نخست
کمر بستہ در کار خود سخت چست

❶ حملہ حیدری جلد اوّل صفحہ ۱۶ مطبوعہ مطبع سلطانی ۱۲۶۷ء ہجری۔ ۱۲ منہ

❷ حملہ حیدری جلد اوّل صفحہ ۱۶ مطبوعہ مطبع سلطانی ۱۲۶۷ء ہجری۔ ۱۲ منہ

نیا سودیکدم زار شاد خلق
 نہ تنگ آمداز جور بیداد خلق
 بہ صبح و بشام و بروز و بہ شب
 نمودے بحق قوم خود را طلب
 نہ از طعن اصنام بستے زباں
 نہ از لعن برزمرہ کافراں
 نہ کردی ازاں ناکساں احتراز
 نمودی ادا آشکارا نماز
 چو در شان قومی شقاوت نشان
 در احوال آبائے آن گمرہاں
 ز نزد خدائے جہاں آفریں
 بسوی نبی جبرئیل امیں
 رسانیدے آیات قہر و عقاب
 بخواندے برایشان نبی بے حجاب
 شدی خوں ازیں غم دل مشرکاں
 فتادی ازاں غصہ آتش بجان
 تلافی نمودندے آن اشقیاء
 بدست وزباں باشہ انبیاء
 و لیکن بتائید یزدان پاک
 نبی را ازیشان نہ بدھیچ باک
 بدانساں کہ در کار خود بود بود
 خدائی جہاں را چناں می ستود

”پہلے سے زیادہ دعوت کے لیے آپؐ آمادہ ہو گئے، اپنے مشن میں سختی سے

کمر بستہ ہو گئے مخلوق کی ہدایت کے لیے ایک لمحہ بھی دم نہ لیا اور نہ ہی ظالم مخلوق کے ستم سے تنگ ہوئے، صبح و شام اور رات دن اپنی قوم کو حق کی طرف بلا تے رہے، بتوں کی برائی سے نہ زبان بند کی نہ ہی کافروں کی مذمت سے باز آئے، نہ ہی ان نانبجاؤں سے اپنا بچاؤ کرتے بلکہ علانیہ نماز ادا فرماتے رہے، جب ان لوگوں کی بدبختی اور ان کے گمراہ پرکھوں کے بارے میں خداوند کائنات کی طرف سے جبرئیل امین حضور ﷺ کے پاس قہر و عذاب کی آیتیں لے کر آتے تو آپ ان کو بے جھجک سنا دیتے جس سے مشرکوں کے دل خون خون ہو جاتے اور غصہ میں آگ بگولہ ہو جاتے، وہ بدبخت اس کی تلافی کے لیے سرور انبیاء کو ہر طرح ستاتے لیکن اللہ تعالیٰ کی مدد سے نبی ﷺ ان سے بالکل نہ ڈرتے۔ جو شخص اپنی دھن کا پکا ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی اسی طرح تعریف کرتا ہے۔“

اے حضرات شیعہ! پیغمبر ﷺ کے وعظ و ارشاد پر غور کرو اور تبلیغ دعوت پر خیال کرو اور سوچو کہ ابتدائے زمانہ نبوت میں جب نہ کوئی یار تھا نہ مددگار نہ فوج تھی نہ لشکر، چھوٹی چھوٹی بات میں تو پیغمبر ﷺ اپنی جان اور عزت کا خیال نہ کریں اور جس قوم اور جس شخص کی برائی اور کفر میں جبرئیل خدا کا پیام لائیں اس کو صاف صاف کہہ دیں اور اخیر میں جبکہ ہزاروں شخص مسلمان اور لاکھوں آدمی مطیع موجود ہوں اور سلاطین اور بادشاہان زمین بھی خائف اور ترساں ہوں اس وقت پیغمبر خدا ﷺ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس قدر ڈریں کہ باوجود ان کے نفاق اور کفر کے اس کا ذکر بھی کسی سے نہ فرمائیں اور سوائے حذیفہ رضی اللہ عنہ کے وہ بھی گھر میں بیٹھ کر کسی سے کچھ ارشاد نہ کریں بلکہ لوگوں سے کہنا کیسا خود عمر رضی اللہ عنہ کو کبھی اپنے پاس سے جدا نہ کریں اور ہمیشہ ان سے صلاح و مشورہ لیتے رہیں اور جن کے حق میں خدا نے (وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ) فرمایا ہو ان میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو داخل کریں۔

اگر کوئی شیعہ یہ کہے کہ خدا کا حکم نہ تھا کہ یہ امر ظاہر کیا جائے تو ہم کہتے ہیں کہ سلام ہے اس خدا کو جو عمر رضی اللہ عنہ سے ڈرتا تھا اور جو ایسی بڑی بات کو صرف ایک آدمی کے خوف سے ظاہر

نہ کر سکتا تھا اور پیغمبر ﷺ کو اس پر خاموش رہنے کے لیے تاکید فرماتا تھا..... اور اگر کوئی یہ سمجھے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے یہ خیال کر کے کہ لوگ نہ مانیں گے بلکہ ان کے کفر و نفاق ظاہر کرنے سے سب لوگ پھر جائیں گے اس کا علانیہ ذکر نہیں کیا تو اس بات کو ہم نہیں مانتے، اس لیے کہ پیغمبر ﷺ کا کام تھا ہر ایک امر کا ظاہر کر دینا باقی ماننا نہ ماننا امت کے اختیار میں تھا۔ اگر پیغمبر خدا ﷺ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کفر و نفاق کو ظاہر کر دیتے اور سب کو اس پر آگاہ فرما دیتے تو حضرت کی حجت تو ختم ہو جاتی اور اگر نہ مانتا تو اس کا قصور ثابت ہوتا۔ یہ فضائل جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل کے دن کے پیغمبر خدا ﷺ نے حدیفہ سے بیان کیے ایسے تھے کہ حضرت کو لازم تھا کہ تمام مسلمانوں کو جمع کرتے اور خم غدیر کے خطبہ کی طرح منبر پر چڑھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر اس کا خطبہ پڑھتے اور سب لوگوں کو آگاہ کرتے کہ یہ عمرؓ جو میرے پاس ہے کافر اور منافق ہے اور میرے اہل بیت کافر عاون ہے اس کو خوب پہچان رکھو، یہ میرے اہل بیت پر ظلم کرے گا، تازیانہ جو رستم ہاتھ میں لے گا، میرے بھائی علیؓ کا حق غصب کرے گا، اس کے مرنے کے دن کی خدا یہ فضیلتیں بیان کرتا ہے..... اگر حضرت ایسا کرتے تو حق رسالت ادا کرتے۔ سبحان اللہ پیغمبر ﷺ ذرا ذرا سی بات کو تو علانیہ بیان کر دیں اور ایک ادنیٰ ادنیٰ منافق کے واسطے خدا آیتیں نازل کر کے ان کو مشتہر اور بدنام کرے اور عمر رضی اللہ عنہ سے منافق کے لیے (نعوذ باللہ منہ) نہ خدا کوئی آیت نازل کرے نہ پیغمبر ﷺ کچھ زبان سے فرمائیں، افسوس ایسی سمجھ پر اور تف ایسے عقیدے پر کہ جس کے نہ اصول درست ہیں نہ فروع۔ شعر

نے فروعت محکم آمد نے اصول
شرم بایت از خدا و رسولؐ



صحابہ رضی اللہ عنہم کے تابعین کی فضیلتیں اور ان کی نشانیاں

اس دعا میں جس طرح پر امام زین العابدین علیہ السلام نے پیغمبر خدا ﷺ کے اصحاب پر درود بھیجا ہے اسی طرح پر ان کے تابعین کے حق میں رحمت کی طلب کی ہے، چنانچہ یہ الفاظ امام کی دعا کے ہیں:

((اللَّهُمَّ وَ أَوْصِلْ إِلَى التَّابِعِينَ لَهُمْ بِإِحْسَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا
اغْفِرْ لَنَا وَلَاخَوَانَنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ خَيْرَ جَزَائِكَ الَّذِينَ
قَصَدُوا أَسْمَتَهُمْ وَتَحَرُّوا وَجْهَتَهُمْ وَمَضَوْا عَلَىٰ شَاكِلَتِهِمْ لَمْ
يُثْبِتْهُمْ رَيْبٌ فِي بَصِيرَتِهِمْ وَلَمْ يَخْتَلِجْهُمْ شَكٌّ فِي قَفْوِ آثَارِهِمْ
وَإِلَّا يَتِمَّامَ بِهَدَايَةِ مَنَارِهِمْ مُكَانِفِينَ مُوَارِزِينَ لَهُمْ يَدِينُونَ
بِدِينِهِمْ وَيَهْتَدُونَ بِهَدْيِهِمْ تَيَفَّقُونَ عَلَيْهِمْ وَلَا يَتَّهَمُونَهُمْ فِيمَا
أَدُّوا إِلَيْهِمْ.))

”خدا ان کی پیروی کرنے والوں کو جزائے خیر دے جو کہ دعا کیا کرتے ہیں کہ
پروردگار مغفرت کر ہماری اور ہمارے ان بھائیوں کی جو ہم میں سے ایمان میں
سبقت لے گئے ہیں، کیسے تابعین جو اصحاب کی چال پر چلتے ہیں اور ان کے آثار
کی پیروی کرتے ہیں اور ان کی ہدایت کی نشانیوں کی اقتدا کرتے ہیں جن کو کوئی
شک ان کی خوبی میں نہیں ہوتا اور کیسے تابعین جو اپنا دین ویسا ہی رکھتے ہیں، جیسا
کہ اصحاب کا تھا اور ان سے اتفاق رکھتے ہیں اور اصحاب پر کچھ تہمت نہیں کرتے۔“

ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ بعد اصحاب کرام کے تابعین کا رتبہ ہے اور وہی سب امت سے افضل ہیں اور ان کی نشانیاں وہی ہیں جو کہ امام علیہ السلام نے بیان کر دیں۔ پس اب اس میں تو کچھ شبہہ باقی نہیں رہا کہ امت محمدیٰ میں وہی گروہ سب سے افضل ہے جو کہ اصحاب کی تبعیت کرے اور وہی فرقہ ایمان کی اصل راہ پر ہے جو قدم بہ قدم صحابہ کے چلے..... اب یہ امر باقی رہ گیا کہ وہ فرقہ جو اصحاب کی چال پر چلتا ہے کون سا ہے، وہ جس کا نام اہل سنت ہے یا وہ جس کا نام شیعہ ہے اور یہ امر دونوں کے عقائد پر نظر کرنے سے طے ہو سکتا ہے۔ پس سنیوں کے عقیدے وہی ہیں جو امام نے اپنی دعا میں بیان فرمائے کہ وہ اصحاب کے تابع ہیں اور اصحاب کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں اور ان کو ایمان میں سابق اور مقدم جان کر ان کے لیے رحمت طلب کرتے ہیں، ان کے آثار کی پیروی کرتے ہیں، ان کو اچھا جانتے ہیں اور شیعوں کے عقیدے بالکل اس کے خلاف ہیں، وہ اصحاب کو برا جانتے ہیں، ان کو برا کہتے ہیں، ان پر تبرا کرتے ہیں اور ان کو منافق اور کافر جانتے ہیں، ان کی پیروی کو کفر سمجھتے ہیں، ان کی خوبیوں میں شک و شبہہ رکھتے ہیں اور ان پر ہر طرح کی تہمتیں لگاتے ہیں..... غرض کہ جو شخص عقل اور ایمان رکھتا ہو اسے لازم ہے کہ وہ اوّل امام کی دعا کے الفاظ پر غور کرے بعدہ سنیوں اور شیعوں کے عقیدوں پر غور کرے تب انصاف کرے کہ امام کے قول کے مطابق سنی حق پر ہیں یا شیعہ۔

تیسری شہادت:

شیعوں کی معتبر ترین تفسیر میں جس کو وہ امام حسن عسکری علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہیں لکھا ہے:

((اِنَّ اللّٰهَ اَوْحٰى اِلٰى اٰدَمَ - اِنَّ اللّٰهَ لِيُفِيضُ عَلٰى كُلِّ وَاٰحِدٍ مِّنْ مُّحِبِّ مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّ اَصْحَابِ مُحَمَّدٍ مَّا لَوْ قُسِمَتْ عَلٰى كُلِّ عَدَدٍ مَّا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ طُوْلِ الدَّهْرِ اِلٰى آخِرِهِ وَكَانُوْا كُفَّارًا لَا دَاٰهَمَ اِلٰى عَاقِبَةٍ مُّحْمُوْدَةٍ وَّ اِيْمَانٍ بِاللّٰهِ حَتّٰى يَسْتَحِقُّوْا بِهٖ

الْجَنَّةَ وَأَنَّ رَجُلًا مِّمَّنْ يُبْغِضُ آلَ مُحَمَّدٍ وَأَصْحَابِهِ أَوْ وَاحِدًا
مِّنْهُمْ لَعَذْبَهُ اللَّهُ عَذَابًا لَوْ قَسَمَ عَلَىٰ مِثْلِ خَلْقِ اللَّهِ لَا هُلَاكَ لَهُمْ
أَجْمَعِينَ .))

”خدا نے عزوجل نے آدم علیہ السلام پر وحی کی کہ خدا ان لوگوں پر جو محبت رکھتے ہیں
محمد ﷺ سے اور ان کی آل سے اور ان کے اصحاب سے ایسی رحمت نازل
کرے گا کہ اگر وہ تقسیم کی جائے اوّل سے آخر تک تمام مخلوق پر تو وہ کافی ہے اور
اگر سب کفار ہوں تو ان کی عاقبت بھی اچھی ہو جائے اور وہ مومن ہو جائیں اور
اگر کوئی آدمی دشمنی رکھے گا آل محمد اور اصحاب محمد ﷺ کے ساتھ یا ان میں سے
ایک سے بھی تو خدا اس پر ایسا عذاب نازل کرے گا کہ اگر وہ عذاب تمام
مخلوقات پر نازل ہو تو وہ سب کے سب ہلاک ہو جائیں۔“

چوتھی شہادت:

اسی تفسیر میں لکھا ہے:

((لَمَّا بَعَثَ اللَّهُ مُوسَىٰ بْنَ عِمْرَانَ وَاصْطَفَاهُ نَجِيًّا وَفَلَقَ لَهُ
الْبَحْرَ وَنَجَّىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَاعْطَاهُ التَّوْرَةَ وَالْأَنْوَاحَ رَأَىٰ
مَكَانَهُ مِنْ رَبِّهِ عَزَّوَجَلَّ فَقَالَ يَا رَبِّ لَقَدْ أَكْرَمْتَنِي بِكَرَامَةٍ لَمْ
تَكْرَمْ بِهَا أَحَدًا مِنْ قَبْلِي فَهَلْ فِي أَنْبِيَائِكَ عِنْدَكَ مَنْ هُوَ أَكْرَمُ
مِنِّي فَقَالَ اللَّهُ تَعَالَىٰ يَا مُوسَىٰ أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ مُحَمَّدًا أَفْضَلُ
عِنْدِي مِنْ جَمِيعِ خَلْقِي فَقَالَ مُوسَىٰ فَهَلْ فِي آلِ الْأَنْبِيَاءِ أَكْرَمُ
مِنْ آلِي فَقَالَ عَزَّوَجَلَّ يَا مُوسَىٰ أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ فَضْلَ آلِ مُحَمَّدٍ
عَلَىٰ آلِ جَمِيعِ النَّبِيِّينَ كَفَضْلِ مُحَمَّدٍ عَلَىٰ جَمِيعِ الْمُرْسَلِينَ
فَقَالَ يَا رَبِّ إِنْ كَانَ فَضْلُ آلِ مُحَمَّدٍ عِنْدَكَ كَذَلِكَ فَهَلْ فِي
صَحَابَةِ الْأَنْبِيَاءِ عِنْدَكَ أَكْرَمُ مِنْ أَصْحَابِي فَقَالَ يَا مُوسَىٰ

أَمَّا عَلِمْتَ أَنَّ فَضْلَ صَحَابَةِ مُحَمَّدٍ عَلَىٰ جَمِيعِ صَحَابَةِ
 الْمُرْسَلِينَ كَفَضْلِ آلِ مُحَمَّدٍ عَلَىٰ آلِ جَمِيعِ النَّبِيِّينَ فَقَالَ
 مُوسَىٰ إِنَّ كَانَ فَضْلُ مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ وَأَصْحَابِ مُحَمَّدٍ كَمَا
 وَصَفْتَ فَهَلْ فِي أُمَّمِ الْأَنْبِيَاءِ أَفْضَلُ عِنْدَكَ مِنْ أُمَّتِي ظَلَلْتَ
 عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَانزَلْتَ عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ وَفَلَلْتَ لَهُمُ
 الْبَحْرَ فَقَالَ اللَّهُ يَا مُوسَىٰ إِنَّ فَضْلَ أُمَّةٍ مُحَمَّدٍ عَلَىٰ أُمَّةٍ جَمِيعِ
 الْأَنْبِيَاءِ كَفَضْلِي عَلَىٰ خَلْقِي.))

”جب خداوند تعالیٰ نے حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور ان کو
 برگزیدہ کیا اور ان کے سبب سے دریا کو پل بنایا اور بنی اسرائیل کو نجات دی اور
 توریت اور لوح ان کو عطا کی تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا رتبہ دیکھ کر خدائے
 عزوجل سے عرض کی کہ یا الہی تو نے مجھے ایسی بزرگی دی ہے کہ کسی اور نبی کو
 پہلے نہیں دی، تیرے یہاں مجھ سے زیادہ اور کسی کی بھی بزرگی ہے؟ خداوند تعالیٰ
 نے جواب دیا کہ اے موسیٰ! تمہیں معلوم نہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرے نزدیک تمام
 مخلوقات سے افضل ہیں، تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی کہ کسی نبی کی آل
 میری آل سے بزرگ تر ہے، جواب ہوا کہ تم نہیں جانتے کہ فضیلت آل
 محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سب انبیاء کی آل پر ایسی ہے جیسے کہ ان کی فضیلت سب پیغمبروں
 پر ہے، تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی کہ الہی میرے اصحاب سے زیادہ
 تیرے نزدیک اور کسی نبی کے اصحاب کا رتبہ ہے، جواب ہوا کہ اے موسیٰ علیہ السلام تم
 نہیں جانتے کہ فضیلت اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام انبیاء کے اصحاب پر اس طرح
 ہے جس طرح کہ فضیلت آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سب انبیاء کی آل پر ہے۔ تب
 حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی کہ اگر فضیلت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آل محمد اور اصحاب
 محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی ہے جیسی کہ آپ نے ارشاد فرمائی، پس کسی نبی کی امت

میری امت سے زیادہ افضل ہے جن پر تو نے بادلوں کا سایہ کیا جن پر من و سلویٰ نازل کیا جن کے لیے دریا کو پل کر دیا، خداوند تعالیٰ نے فرمایا کہ فضیلت امت محمد ﷺ کی سب انبیاء کی امت پر اتنی ہے جتنی کہ مجھ کو میری خلقت پر فضیلت ہے۔“

ان دونوں روایتوں سے دو باتیں ثابت ہوئیں:

۱۔ یہ کہ جو شخص پیغمبر خدا ﷺ کے اصحاب سے دشمنی رکھے وہ عذاب کا مستوجب ہے اور عذاب بھی ایسا کہ جس سے تمام دنیا ہلاک ہو جائے اور جو دوستی رکھے وہ مستحق ثواب کا ہے اور ثواب بھی کیسا کہ جس سے کفار کی عاقبت بن جائے..... دوسری یہ کہ اصحاب نبی کی فضیلت اور نبیوں کے اصحاب پر ایسی ہے جیسی کہ فضیلت پیغمبر ﷺ کی آل کی اور پیغمبروں کی آل پر۔ اور ان دونوں باتوں کے ثابت ہونے سے مذہب شیعوں کا باطل ہو گیا، اس لیے کہ مدار ان کے مذہب کا صحابہ رضی اللہ عنہم کی دشمنی اور ان کے برا جاننے پر ہے، جو شخص اصحاب سے دشمنی رکھے وہی پکا مومن ہے اور جو ان کو سب سے برا جانے وہی سچا شیعہ ہے۔

پس ان دونوں روایتوں سے جس کے راوی امام حسن عسکری علیہ السلام ہیں اور جو شیعوں کے اقرار سے صحیح اور مستند ہیں۔ حضرات شیعہ کو سوائے دو امروں کے تیسرا چارہ نہیں رہا یا کہ اصحاب کو بہتر جانیں اور ان کی فضیلت کے قائل ہوں اور ان سے محبت رکھیں تاکہ وہ ثواب کے مستحق ہوں، یا کہ ان کو برا جانیں اور ان سے دشمنی رکھیں تاکہ مستوجب عذاب ہوں، لیکن حضرات شیعہ جب تک کہ اپنا مذہب ترک نہیں کریں گے اور سنیوں کے شریک نہ ہو جائیں گے تب تک وہ فضیلت صحابہ رضی اللہ عنہم کے قائل نہ ہوں گے، کوئی شخص باوجود اقرار فضیلت صحابہ کے شیعہ رہ نہیں سکتا۔ تمام علماء شیعہ عبداللہ بن سبا کے وقت سے لے کر جناب قبلہ و کعبہ کے عصر تک اسی فکر میں مر گئے کہ اصحاب کے معائب تلاش کریں اور ان کی برائیاں ثابت کریں اور ان کے فضائل سے انکار کریں، اگر کسی کو انکار ہو تو وہ ذرا تکلیف گوارا کرے

اور شیعوں کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھئے کوئی ورق نہ ہوگا جس میں اصحاب کی برائیاں نہ ہوں، کوئی صفحہ نہ ملے گا جس میں ان پر تبرانہ ہو..... جناب مجتہد صاحب قبلہ ”صوارم“ میں ارشاد فرماتے ہیں:

”اما احادیث فضائل صحابہ رضی اللہ عنہم از طریق امامیہ باوجود کثرت احادیث مختلفہ درہر امر جزئی از جزئیات اصلیه و فرعیہ اگر تمام کتب احادیث امامیہ ورقا و رقابہ نیت تفحص بمطالعہ در آرنند مظنون آنست کہ زیادہ از سہ چہار حدیث کہ سرو پادرسٹ نداشتہ باشد دست بہم نہد اما احادیث مثالب و معائب آن ہا بلا اغراق این ست کہ متجاوز از ہزار حدیث باشد۔“

”صحابہ رضی اللہ عنہم کے فضائل کی احادیث بلحاظ جزئیات اور باعتبار اصول و فروع بہت ہیں، لیکن اگر ان تمام کتب احادیث شیعہ کا ایک ایک ورق تلاش و تفحص کی نگاہ سے دیکھیں تو زیادہ سے زیادہ تین چار احادیث ملیں گی اور وہ بھی اس صورت میں کہ ان کا سر پیر درست نہ ہوگا، اس کے برخلاف جو احادیث ان صحابہ کی برائیوں کو واضح کرتی ہیں ان کی تعداد ہزار سے زیادہ ہے۔“

اے اہل انصاف! ذرا آنکھ کھولو اور نیند سے چونکو اور حضراتِ شیعہ کے حال کو دیکھو کہ خود ہی اپنے اماموں کی طرف سے روایت کرتے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا رتبہ سب سے بڑھ کر ہے اور کسی اور نبی کے یاران کے درجے کو نہیں پہنچتے اور جو ان سے محبت رکھے وہ ناجی اور جو دشمنی رکھے وہ ناری ہے اور پھر خود ہی یہ فرمائیں کہ کوئی آیت کوئی حدیث کوئی روایت ان کی فضیلت میں نہیں ہے اور جو ہے وہ بے سرو پا ہے بلکہ ہزار ہا احادیث ان کی برائیوں میں ہیں، اگر ہم ہزار برس تک سوچیں اور اس مشکل عقدے کو حل کرنا چاہیں مگر نہ ہماری سمجھ اس مسئلہ تک پہنچ سکتی ہے نہ ہم سے یہ گرہ کھل سکتی ہے۔ اگر حقیقت میں ہمارے

پیغمبر ﷺ کے اصحاب ایسے افضل ہیں کہ کسی پیغمبر ﷺ کے اصحاب ان کے درجے تک نہیں پہنچ سکتے اور ان کی دشمنی باعث عذاب اور ان کی دوستی ذریعہ ثواب ہے تو چاہیے کہ سنیوں کا قول درست ہو اور ایسے بزرگوں کی تعریف میں اگر ہزاروں احادیث اور لاکھوں روایتیں منقول ہوں تو بھی تھوڑی ہیں اور اگر قول شیعوں کا صحیح ہے تو چاہیے کہ ایسے شخصوں کی دشمنی باعث نجات اور دوستی موجب ہلاکت ہو لیکن درحقیقت یہ قول مجتہد صاحب کا محض غلط اور بالکل باطل ہے، اس لیے کہ خود شیعوں کی کتابوں سے ہزار ہا احادیث اور اقوال صحابہ کے فضائل میں ہم نکال سکتے ہیں، چنانچہ اسی رسالے میں ہم اپنے اس قول کو ثابت کریں گے اور صد ہا روایتیں فضیلت صحابہ کی کتب شیعہ سے نکال کر مجتہد صاحب کے مقلدین کی خدمت میں پیش کر کے قبلہ و کعبہ کے قول کی تکذیب کریں گے..... اگر کوئی شیعہ تعجب کرے کہ کیوں کر ہمارے علماء نے اصحاب کی فضیلت بیان کی ہے اور کس طرح ان کی تعریف کی روایتوں کی تصدیق فرمائی ہے تو اس کے واسطے ہم ایک قاعدہ مسلمہ مجتہد صاحب کا بیان کرتے ہیں کہ وہ صوارم میں فرماتے ہیں کہ ”اگرچہ کسی اہل مذہب سے جو کہ کسی کے فضائل کا اعتقاد رکھے اس کے معائب کی روایات کی توقع رکھنا یا جس کسی کے معائب کا معتقد ہو اس کے فضائل کے اقرار کی امید رکھنا بے جا ہے لیکن خدا نے اپنی حجت تمام کرنے کے واسطے سنیوں کو مجبور کر دیا کہ انہوں نے اصحاب کی برائیوں کو خود ہی روایت کیا، چنانچہ الفاظ اس کے یہ ہیں:

((ہر چند • از اہل مذہبے کہ روایات مطاعن شخصی کند

توقع روایات فضائل آن شخص داشتن بیجاست و ہم چنیں
 بالعکس لیکن جناب حق سبحان و تعالیٰ اتماماً للحجة
 قلوب مخالفین جناب امیر المومنین علیہ السلام چنان
 مسخر گردانیدہ کہ باوجود اینکہ بنا پر پیش آمد و تقرب
 سلاطین بنی عدی و تیم و بنی امیہ اخبار فضائل آن ہارا

بسیار وضع نموده اند، چون دروغگورا حافظہ نمی باشد ہماں مخالفین از غایت ناقباحت فہمی باعجاز جناب امیر المؤمنین باز مثالب اصحاب ثلاثہ و اتباع ایشان را ہم مذکور ساختہ اند و علماء و محدثین ایشان چنین احادیث و اخبار را در کتب و مصنفات خود مندرج فرمودہ اند .))

”اگرچہ کوئی مذہب والا جو کسی کی برائیوں کا معتقد ہو اسی سے اس شخص کے فضائل بیان کرنے کی توقع رکھنا ناممکن ہے اور اس کے بالعکس بھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اتمام حجت کے پیش نظر امیر المؤمنین کے مخالفوں کے دل ایسے مسخر کر دیے کہ شاہان بنو عدی تیم اور بنو امیہ کی قربت کے باوجود حضرت علیؑ کی بے انتہا فضیلت بیان کی ہے اور چونکہ جھوٹے کو یاد نہیں رہتا اس لیے ان کے علماء و محدثین نے امیر المؤمنین کے اعجاز سے اصحاب ثلاثہ اور ان کے ساتھیوں کے معائب اپنی تصنیفات میں درج کیے ہیں۔“

ہم اسی قاعدے کو تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا نے اپنی حجت تمام کرنے کے لیے شیعوں کو مجبور کر دیا کہ انہوں نے اصحاب کی بزرگیاں اور فضیلتیں اپنی کتابوں میں ائمہ کرام کی زبان سے روایت کیں:

((ہر چند از اہل مذہبے کہ روایات مطاعن شخصی کند توقع روایات فضائل آن شخصی داشتن بے جاست و ہم چنین بالعکس جناب حق سبحانہ و تعالیٰ اتماماً للحجة قلوب مخالفین صحابہ کبار چنان مسخر گردانیدہ کہ باوجود اینکہ بضرورت ترویج عقائد عبداللہ بن سباد شیعانہ اخبار مثالب صحابہ را بسیار وضع نمودہ اند چون دروغگورا حافظہ نمی باشد ہماں مخالفین از غایت

نافہمی باعجاز جناب امیر المومنین باز فضائل اصحاب
ثلاثہ و اتباع ایشاں راہم مذکور ساختہ اندو علمائے
محدثین ایشاں چنیں احادیث و اخبار را در کتب و مصنفات
خود مندرج فرمودہ اند .))

”جس طرح کسی کو برا کہنے والوں سے اس شخص کو اچھا کہنا اور اس کے فضائل
بیان کرنا یا اس کے بالعکس بھی کرنا بالکل ناممکن ہے لیکن اتمام حجت کے لیے
اللہ نے صحابہ عظام کے مخالفوں کے دل ایسے مسخر کر دیے کہ یہ لوگ عبداللہ بن سبا
وغیرہ کے عقائد کو رواج دینے اور اس کے عقائد کو ماننے کے باوجود صحابہ کی بے
حد تعریف کرتے ہیں اور چونکہ جھوٹے کو یاد نہیں رہتا، اس لیے ان مخالفین اسلام
نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اعجاز سے ناواقف رہتے ہوئے اپنی نا فہمی کے ثبوت میں
اصحاب ثلاثہ اور ان کے تبعین کے فضائل بیان کیے ہیں اور شیعہ علماء محدثین نے
اس قسم کی احادیث و حالات و سیرت اپنی تصنیفات میں خود لکھی ہیں۔“

پانچویں شہادت:

شیخ ابن بابوہ تمی نے کتاب ”معانی الاخبار“ ۱ میں امام موسیٰ رضا علیہ السلام سے
روایت کی ہے:

((عَنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ أَبَا بَكْرٍ مَنِيَّ
بِمَنْزِلَةِ السَّمْعِ وَأَنَّ عُمَرَ مَنِيَّ بِمَنْزِلَةِ الْبَصْرِ وَأَنَّ عُثْمَانَ مَنِيَّ
بِمَنْزِلَةِ الْفُؤَادِ .))

”اور جب کہ حضرات خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کا امام حسن کے قول سے بمنزلہ
پیغمبر خدا ﷺ کے سمع و بصر اور دل کے ہونا ثابت ہوا تو پھر ان سے محبت نہ
رکھنا درحقیقت پیغمبر خدا ﷺ سے محبت نہ رکھنا ہے اور ان سے عداوت رکھنا

در اصل پیغمبر خدا ﷺ سے دشمنی رکھنا ہے۔“

سننے والوں کو تعجب ہوگا کہ امام حسن رضی اللہ عنہ کی روایت سے علمائے شیعہ نے کیوں کر ایسی حدیث کو اپنی کتابوں میں ذکر کیا اور انتظار ہوگا کہ اگر اس کو نقل کیا ہے اور اس کی صحت کو تسلیم کر لیا ہے تو اس کا کیا جواب دیا ہے، اس لیے ہم اس جواب کو بیان کرتے ہیں۔ وہ جواب یہ ہے کہ اس حدیث کے ان الفاظ کے بعد جن کو ہم نے اوپر بیان کیا ہے، یہ الفاظ اور بڑھائے ہیں اور انہیں کو جواب اس حدیث کا تصور کیا ہے: (فلما ۱ کان من الغد الخ) امام حسنؓ فرماتے ہیں کہ جب دوسرا دن ہوا تب میں حضرتؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت امیر المومنین علیؓ اور ابوبکر، عمر، عثمان موجود تھے، میں نے حضرتؓ سے عرض کی کہ اے پدر بزرگوار! میں نے کل آپؓ کی زبان سے سنا، جو کچھ آپؓ نے ان اصحاب کی نسبت فرمایا وہ کیا ہے؟ حضرتؓ نے فرمایا کہ ہاں میں نے کہا ہے اس کے بعد حضرتؓ نے ان کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ یہی سمع، بصر اور دل ہیں اور اس وصی، یعنی علیؓ کی محبت سے سوال کیے جائیں گے اور یہ کہہ کر یہ آیت پڑھی کہ خدائے عزوجل فرماتا ہے کہ ﴿إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا﴾ بعد فرمایا کہ قسم ہے مجھ کو اپنے پروردگار کے عزت کی کہ میری تمام امت قیامت کے دن کھڑی کی جائے گی اور ان سے سوال علیؓ کی محبت کا ہوگا اور یہی مطلب ہے خدا کے اس قول کا کہ ﴿وَقِفُّهُمْ إِنَّهُمْ مَسْئُولُونَ﴾ کہ ”کھڑا کرو ان کو، ابھی ان سے پوچھنا ہے۔“

۱ عن الحسن بن علی قال قال رسول الله ﷺ ان ابابكر منى بمنزلة السمع و ان عمر منى بمنزلة البصر و ان عثمان منى بمنزلة الفؤاد فلما كان من الغد دخلت عليه و عنده امير المؤمنين و ابوبكر و عمر و عثمان فقلت له، يا ابت سمعتك تقول في اصحابك هولا قولاً فما هو فقال نعم ثم اشاراً ليهم فقال هم السمع و البصر و الفؤاد و يسألون عن ولايه وصيته هذا و اشار الى علي بن ابي طالب ثم قال ان الله عزوجل يقول ان السمع و البصر و الفؤاد كل اولئك كان عنه مسؤلاً، ثم قال ان الله وعزة ربي ان جميع امتي لموقوفون يوم القيمة و مسؤلون عن ولاية علي و ذلك قول الله عزوجل وقفوا هم انهم

اس حدیث کے ان الفاظ کو ہم چند دلیلوں سے صحیح نہیں مانتے اور اس کو دوسرے دن کا جمایا ہوا فقرہ سمجھتے ہیں۔

پہلی دلیل:..... اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اوّل روز جب امام حسنؑ نے حضرتؑ سے سنا کہ ابو بکرؓ بمنزلہ سمع کے اور عمرؓ بمنزلہ بصر کے اور عثمانؓ بمنزلہ دل کے ہیں تو اس روز کچھ استفسار نہ کیا، دوسرے دن پوچھنے کا کیا سبب ہے، اگر امام حسنؑ کو پوچھنا ہوتا تو اسی وقت پوچھتے۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ پہلے دن بہ سبب موجود ہونے خلفائے موصوفین کے ان کے خوف سے نہ پوچھا تو دوسرے دن بھی اسی حدیث سے ان کا موجود ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اگر ان کا خوف تھا تو گھر میں پوچھتے کہ یا حضرت! آپ نے ان کے سامنے ایسا ایسا فرمایا، اس کی حقیقت کیا ہے نہ کہ پھر مجلس میں انہیں کے سامنے استفسار کرتے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ فقرہ دوسرے دن کا جمایا ہوا ہے۔

دوسری دلیل:..... اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اوّل روز پیغمبر خدا ﷺ نے صرف تشبیہ اور تمثیل پر قناعت فرمائی اور حضرات خلفائے ثلاثہ کو بمنزلہ سمع، بصر اور فواد کے کہہ کر سکوت کیا، تو یہ فرمانا یا دل سے تھا یا براہِ تقیہ یا بطور استہزاء، اگر دل سے تھا جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں (فَنِعْمَ الْوَفَاؤُ) جھگڑا طے ہوا، اگر براہِ تقیہ تھا تو اوّل پیغمبر خدا ﷺ کی نسبت تقیہ کرنا ثابت ہوا حالانکہ خود حضرات شیعہ اس کے قائل نہیں، دوسرے اگر پہلے دن حضرتؑ نے براہِ تقیہ فرمایا تھا تو دوسرے دن بھی وہی سبب تقیہ کا، یعنی حاضر ہونا ان خلفاء کا جن کے خوف سے یا جن کے خوش کرنے کو حضرتؑ نے ایسا کچھ فرمایا موجود تھا، اگر بطور استہزاء تھا تو پیغمبر ﷺ کی نسبت مسخرگی اور ٹھٹھے بازی کا اطلاق کرنا ہے اور یہ سوائے شیعوں کے دوسرے سے نہیں ہو سکتا، وہ جو چاہیں پیغمبر ﷺ پر تہمت کریں۔

تیسری دلیل:..... پیغمبر خدا ﷺ جو کچھ فرماتے تھے اور کچھ کہتے تھے وہ صاف صاف، کچھ لگی لپٹی نہ رکھتے تھے اور کسی کو دھوکہ نہ دیتے تھے اور کسی کو شبہے میں نہ ڈالتے تھے۔ پس اگر دوسرے دن کے جمائے ہوئے فقرے کو ہم صحیح مانیں تو گویا پیغمبر ﷺ پر تہمت

کریں۔ اس لیے کہ اگر دوسرے دن امام حسنؑ استفسار نہ کرتے اور پیغمبر ﷺ اصل مطلب نہ بتاتے تو لوگ شبہے میں رہتے اور حضرتؑ کے کلام کو صدق اور صفائی پر قیاس کر کے حضرات ابو بکر صدیق اور عمر فاروق اور عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہم کو بمنزلہ سمع، بصر اور دل کے سمجھتے، جیسا کہ ان لفظوں سے جو حضرت نے فرمائے ہیں معلوم ہوتا ہے۔ پس کیا کوئی ایمان رکھنے والا پیغمبر ﷺ پر ایسی تہمت کر سکتا ہے اور جس کا کام صاف بیان کر دینے اور لگی لپٹی نہ رکھنے کا ہو اس کی باتوں کی ایسی تاویل کر سکتا ہے۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

حقیقت یہ ہے کہ حضرات شیعہ نے دین کو مسخرے پن اور ٹھٹھے میں ڈال دیا ہے اور پیغمبر خدا ﷺ کی احادیث اور کلام اللہ کی آیات کو تحریف اور تغیر کر کے بدل دیا ہے، نہ خدا کے کلام کو کلام مبین جانتے ہیں، نہ پیغمبر ﷺ کی حدیث کو صاف سمجھتے ہیں، سب میں شک اور شبہ کرتے ہیں اور سب کو ذوجہتین اور ذومعینین جانتے ہیں۔ چونکہ مذہب تشیع کی بنیاد نفاق اور جھوٹ پر ہے، اس لیے سب کو اپنا سا ہی جان کر ایسی تاویلات کرتے ہیں، ورنہ کون شخص ہے کہ پیغمبر ﷺ کی نسبت ایسا کہے گا کہ وہ ایک روز کچھ کہتے ہیں دوسرے دن اس کی کچھ تاویل کرتے تھے۔ فرض کرو کہ اگر کسی شخص نے پہلے ہی دن کی باتیں سنی ہوں اور اس نے پیغمبر ﷺ کو ہادی اور نبی سمجھ کر ان کے کلام کو حق جانا ہو حالانکہ بقول شیعوں کے وہ حق نہ تھا اور اس کا مطلب دوسرا ہی تھا جس کو دوسرے دن حضرت نے امام حسن رضی اللہ عنہ کے پوچھنے پر بتلایا اور وہ شخص دوسرے دن حضرت کے حضور میں حاضر نہ ہوا ہو اور اس نے پیغمبر خدا ﷺ کی زبان سے اس مجمل فقرے کی شرح نہ سنی ہو تو اس کے دل میں جو یقین اس کلام کی صحت پر ہو گیا ہو اور جس کے سبب سے وہ گمراہ ہوا ہو اس کا الزام کس پر ہوگا؟ اس بے چارے..... سننے والے پر یا معاذ اللہ! معاذ اللہ حضرت ﷺ پر۔

چوتھی دلیل:..... معلوم نہیں کہ امام حسنؑ کو دوسرے دن استفسار کی کیا ضرورت تھی۔ شاید حضرات شیعہ یہ فرمائیں کہ امام حسن رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ وہ اصحاب جن کی نسبت حضرت نے ایسی تمثیل اور تشبیہ دی ہے، منافق اور کافر تھے (و نعوذ باللہ منہ) اور انہیں

کی نسبت حضرتؑ نے ایسا کچھ فرمایا تو ان کو تعجب ہوا، اس لیے اس کے رفع کرنے کے لیے پوچھا۔ مگر یہ بات تسلیم کرنے کے لائق نہیں ہے، اس لیے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے اکثر ان اصحاب کی تعریف کی ہے اور ان کی ثنا اور صفت بیان فرمائی ہے جس کو خود ائمہ نے اپنی سند سے روایت کیا ہے اور جس کو جا بجا ہم نے نقل کیا اور نقل کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ، تو پھر ان کی تعریف پر امام حسن رضی اللہ عنہ کو تعجب ہونے کا کوئی موقع نہ تھا، ہاں اگر کبھی حضرت ﷺ نے ان کی تعریف نہ کی ہوتی اور کبھی ان کو امام حسن رضی اللہ عنہ نے پیغمبر ﷺ کی صحبت میں نہ دیکھا ہوتا اور پھر ان کی نسبت ایسا سنتے تو تعجب کرنے کا محل تھا..... اگر کوئی صاحب یہ فرمائیں کہ امام حسن رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ وہ اصحاب منافق ہیں اور ان کے سامنے کبھی پیغمبر خدا ﷺ نے ان کی تعریف نہیں کی تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ امام حسن رضی اللہ عنہ کو ایسا شبہ نہ تھا اور وہ ان اصحاب کو حضرتؑ کے یاروں میں سے جانتے تھے، چنانچہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں (يَا اَبَتِ سَمِعْتُكَ تَقُولُ فِي اَصْحَابِكَ) کہ اپنے یاروں اور اصحاب کی نسبت آپ سے میں نے ایسا کچھ سنا: تو اگر امام حسنؑ ان کو پیغمبر کا اصحاب نہ جانتے تو (اَصْحَابِكَ) نہ فرماتے اور جب ان کو اصحاب میں جانتے تھے تو پھر تعجب کرنے کا کوئی مقام نہ تھا، اس لیے کہ قطع نظر حضرات خلفاء ثلاثہ کے اور اصحاب کی نسبت بھی بہت کچھ ثنا و صفت حضرتؑ نے کی ہے کہ اس کا خود حضرات شیعہ کو اقرار ہے اور ان کی کتابیں اس سے بھری ہوئی ہیں اور بالفرض اگر امام حسنؑ کو شبہ تھا تو وہ گھر میں اس کو رفع کرتے اور تنہائی اور خلوت میں پوچھتے پھر انہیں اصحاب کے سامنے پوچھنا اور پیغمبر ﷺ کی مجمل بات کو صاف کرانا اور گول گول نہ رہنے دینا موافق اصول شیعہوں کے شانِ امامت کے خلاف تھا۔

پانچویں دلیل:..... قطع نظر اور صفات اور تعریف کے جو پیغمبر خداؑ نے ان اصحاب

کی اکثر کی ہے، اپنے سمع و بصر سے بھی تشبیہ دی ہے، یہ تشبیہ فقط اس حدیث پر موقوف نہیں ہے بلکہ اور روایتوں سے بھی اس کا ثبوت ہوتا ہے، چنانچہ خود شیعہ علماء امام حسن عسکری علیہ السلام کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ پیغمبر خداؑ نے ہجرت کی شب میں ابو بکر صدیقؓ سے کہا:

((جَعَلَكَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ السَّمْعِ وَالْبَصْرِ وَالرَّأْسِ مِنَ الْجَسَدِ
وَبِمَنْزِلَةِ الرُّوحِ مِنَ الْبَدَنِ .))

”خدا تجھ کو بمنزلہ میرے سمع اور بصر کے اور بجائے سر کے جسم میں اور بمنزلہ روح کے بدن میں، گردانے گا۔“

پس جب کہ ایک مرتبہ فقط ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نسبت سمع، بصر، سر اور روح کے سب الفاظ پیغمبر ﷺ نے فرمادیے ہوں تو پھر کیا تعجب ہے کہ دوسری مرتبہ ان کی نسبت صرف سمع کا لفظ فرمایا ہو اور ان کے ساتھ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کی بھی تشبیہ بصر اور فواد سے کی ہو۔

چھٹی دلیل:..... علماء شیعہ نے ایسی تاویلات سے جیسی کہ اس حدیث میں کی ہیں اکثر احادیث اور اقوال کو مضحکہ اطفال بنا دیا ہے اور تحریف لفظی و معنوی میں محرفین اہل کتاب کو بھی مات کر دیا ہے، چنانچہ بطور نظیر کے میں اس مقام پر ایک روایت لکھتا ہوں، و هو ہذہ .
میرن صاحب ❶ قبلہ حدیقہ سلطانیہ کے باب سوم میں لکھتے ہیں کہ امام حسن عسکری علیہ السلام سے منقول ہے کہ ایک ❷ مرتبہ ایک مخالف سرکش امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت

❶ سید حسن عرف میرن صاحب، مولوی دلدار علی نصیر آبادی کے سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ ۱۳ ربیع الثانی ۱۲۱۱ھ، اکتوبر ۱۷۹۶ء کو ولادت ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد والد سے پڑھنے لگے۔ جب ان کی طبیعت ناساز ہوئی تو بڑے بھائی سید محمد مجتہد سے درس لیا اور جب ان کا مزاج رو بصحت ہو گیا تو پھر ان سے سبق شروع کر دیے۔ شاہ اودھ امجد علی شاہ نے مولانا ہی کے اشارے سے مدرسہ سلطانیہ قائم کیا اور ایک مہنڈر کی جس میں ”الہ مجتہد العصر سید العلماء“ کندہ تھا اور سرکاری طور پر فرمان جاری کیا کہ اب مولانا کو انہیں القاب سے یاد کیا جائے۔ میرن صاحب کو نگران تعلیم کا غیر رسمی منصب ملا اور وہ پورے ملک میں شیعوں کے دینی سربراہ بن کر ابھرے، متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ شب شنبہ ۱۷ صفر ۱۲۷۳ء مطابق اکتوبر ۱۸۵۶ء کو دنیا سے رخصت ہوئے۔ بڑے بھائی سلطان العلماء سید محمد مجتہد نے نماز جنازہ پڑھائی اور امام باڑہ غفران مآب میں اندرونی دالان مولوی دلدار علی کے پائیں پا مغربی حجرے میں دفن ہوئے۔ (شیخ محمد فراست) ۱۲

❷ از امام حسن عسکری علیہ السلام منقول ست کہ بعض مخالفین از سر کشان شان بمجلس حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام در آمدو مردے از شیعیان آنحضرت گفت کہ ماتقول ⇐ ⇐ ⇐

میں آیا اور ایک شیعہ سے پوچھنے لگا کہ تو عشرہ مبشرہ کے، یعنی دسوں اصحاب کے حق میں کیا کہتا ہے، شیعہ نے جواب دیا کہ میں ان کے حق میں وہ کلمہ خیر کہتا ہوں کہ جس کے سبب سے خداوند عالم میرے گناہ بخشا ہے اور میرے درجات بلند کرتا ہے، پس اس ناصبی نے کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ مجھے تیری دشمنی سے نجات دی، مجھے یہ گمان تھا کہ تو رافضی ہے اور صحابہ کبار سے دشمنی رکھتا ہے، تب اس مردِ مومن نے دوسری بار کہا کہ خبردار ہو کہ جو شخص صحابہ میں سے ایک کو دشمن رکھے اس پر خدا کی لعنت ہو، ناصبی نے کہا شاید تو نے کچھ تاویل کی اس لیے بتلا کہ جو

﴿﴿﴿ فی العشرة من الصحابة چه می گوئی در حق عشرہ مبشرہ از صحابہ پیغمبر، شیعہ گفت میگوئم در حق شان کلمہ خیرے کہ خداوند عالم بسبب آن گناہاں مرافرد میریزد و درجات مرابلندمی فرماید پس آن ناصبی گفت، حمد و شکر برائے خداست کہ مرا از دشمنی تو نجات داد، من گمان داشتم کہ تو رفض و بغض صحابہ کبار داری، آن مرد مومن بارد گرگفت آگاہ باش کہ هر کس کہ از صحابہ یکی را دشمن دارد پس براوست لعنت خدا، ناصبی گفت شاید تاویلی کرده لکن بگو کہ کسیکہ عشرہ مبشرہ را دشمن دارد در حق او چه می گوئی، مرد مومن گفت هر کس کہ عشرہ صحابہ را دشمن دارد براوست لعنت خدا و ملائکہ و تمام خلق، پس آن ناصبی برجست و سرش را بوسه داد و گفت بخش مرا کہ من ترا بر فض متهم ساخته بودم، مرد مومن گفت بر تو چیزی نیست من این افترا از تو مواخذہ ندارم تو برادر منی، آن ناصبی از انجا برفت، پس حضرت صادق علیہ السلام فرمود کہ کلام محکمی گفتے بر خداست جزائے تو هر آئینہ فرشتگان از حسن توریہ تو خوشنود شدند کہ دین خود را از اختلال نگہ داشتی و خود را از دست او برهانیدی زادا لله فی مخالفینا عمی الی عمی، خداوند عالم در دشمنان ما بر نافی ایشاں نافی هادیگر بیفزاید کسانیکہ بمعاریض کلام اطلاع نداشتند عرض کردند کہ این مرد چه کرد در ظاهر آنچه ناصبی میگفت این ہم باو موافقت مینمود، حضرت فرمودند کہ اگر شما نفهمیدید مراد او پس بدرستی کہ مافهمیده ایم و حق تعالی قول او را قبول فرموده، هر گاہ یکی از دوستان مادر دست دشمنان مامی افتد خداوند عالم اور ابجوابی موافق میسازد کہ دین و آبرویش از دست آن بدبختان محفوظ میماند مراد آن مرد مومن از قول او من البغض واحد من الصحابة آن بود کہ هر کہ دشمن دار دیکے از عشرہ را کہ آن امیر مومنان علی بن ابی طالب ست بر آن دشمنی کننده لعنت خدا باد او آنچه بارد گرگفت من البغض العشره فعلیه لعنت الله راست گفته چرا کہ هر کس کہ همه ده کس را عیب میکند پس علی علیہ السلام را هم عیب کرده ست پس باین جهت بلعنت خدا گرفتار میشوند۔ ۱۲۔

شخص عشرہ مبشرہ کو دشمن رکھے اس کے حق میں تو کیا کہتا ہے؟ تب مرد مومن نے کہا کہ جو شخص عشرہ مبشرہ، یعنی دسوں کو دشمن رکھے اس پر خدا کی اور فرشتوں کی اور تمام خلق کی لعنت ہو، پس وہ ناصبی اٹھا اور اس نے اس مومن کے سر کو بوسہ دیا اور کہا کہ مجھے معاف کر میں تجھ کو رافضی جانتا تھا، اس مرد مومن نے کہا کہ میں تجھ سے مواخذہ نہیں کرتا، تو میرا بھائی ہے۔ یہ سن کر وہ ناصبی چلا گیا، جب وہ باہر گیا تب امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس مرد مومن سے کہا کہ تو نے نہایت محکم کلام کہا، خدا تجھ کو جزائے خیر دے، فرشتے تیرے حسن تواریہ سے خوش ہوئے کہ تو نے اپنے دین کو بھی خلل سے بچایا اور اپنے آپ کو اس کے ہاتھ سے چھڑایا، خدا ہمارے مخالفوں کی نابینائی کو اور زیادہ بڑھائے اور ان کی نا فہمی پر نا فہمی زیادہ کرے کہ وہ کچھ نہیں سمجھتے۔ جب یہ امام نے فرمایا تو جو لوگ ایسی باتوں کو نہیں سمجھتے تھے انہوں نے عرض کی کہ یا حضرت! اس مرد مومن نے کیا کہا جیسا وہ ناصبی کہتا تھا ویسا ہی یہ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتا جاتا تھا، تب امام نے فرمایا کہ تم نہیں سمجھتے، میں اس کا مطلب سمجھتا ہوں۔ مراد اس مرد مومن کے اس کہنے سے کہ جو شخص ایک کو دشمن کہے اصحاب میں سے اس پر خدا کی لعنت ہو، حضرت علی ہیں، اور مطلب اس کہنے سے کہ جو شخص دشمن رکھے دسوں کو اس پر خدا کی لعنت ہو یہ ہے کہ حضرت علیؑ بھی ان میں داخل ہیں، پس جو شخص دسوں کو دشمن رکھے گا وہ لامحالہ حضرت علیؑ کو بھی دشمن رکھے گا، اس لیے اس پر خدا کی لعنت۔

اس روایت کو دیکھ کر گو حضراتِ شیعہ فخر کرتے ہوں اور اپنے بزرگوں کی حیلہ سازیوں پر ناز فرماتے ہوں لیکن جو کوئی عاقل سنے گا وہ تعجب ہی کرے گا اور ایسے دین و مذہب پر کہ جس کی بنا سراسر حیلہ سازی اور مکاری اور دغا بازی پر ہے، ہزار دل سے نفرت کرے گا..... نہایت تعجب کا مقام ہے کہ جن اماموں کا کام ہدایتِ خلق اللہ ہو اور جن کی امامت مثل نبوت کے اصول دین میں داخل ہو اور جن کے اقوال، افعال اور حرکات و سکنات پر مدار مذہب کا ہو جب وہ ہی ایسے ہوں کہ کبھی صاف بات نہ کہیں اور دھوکہ دہی اور حیلہ سازی کو موجب رضائے الہی کا فرمائیں تو پھر ان کی امت کے لوگ کیسے ہوں گے اور وہ نفاق اور دغا بازی کو

کیوں اپنا شعار نہ گردانیں گے۔ ہم اس سے بھی زیادہ خوش کن ایک اور روایت بیان کرتے ہیں اور حضرات شیعہ کی دقیقہ فہمی اور نکتہ سنجی کو ظاہر کرتے ہیں اور صاف سیدھے لفظوں سے جو عجیب معنی وہ مراد لیتے ہیں اس کا نمونہ دکھلاتے ہیں۔

چھٹی شہادت:

امام جعفر صادق علیہ السلام نے حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی نسبت فرمایا ہے:

((هُمَا اِمَامَانِ عَادِلَانِ قَاسِطَانِ كَانَا عَلَي الْحَقِّ وَ مَا تَا عَلَيهِ
فَعَلِيهِمَا رَحْمَةُ اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ .))

”دونوں امام عادل اور انصاف کرنے والے تھے، دونوں حق پر تھے اور حق پر
مرے، ان دونوں پر قیامت کے دن اللہ کی رحمت ہو۔“

اس حدیث سے چند فائدے حاصل ہوئے۔

- ۱۔ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا امام اور خلیفہ برحق ہونا، اس لیے کہ اگر ان کی خلافت حق نہ ہوتی اور وہ غاصب ہوتے تو امام جعفر صادق کیوں کر ان کو امام کہتے۔
- ۲۔ ان کا عادل اور منصف ہونا اور اس سے تمام مطاعن جو شیعوں نے ان کی نسبت بیان کیے ہیں باطل ہوئے۔ اس لیے کہ اگر ان کے عدل و انصاف میں کچھ بھی فرق ہوتا تو امام ہرگز ان کو عادل اور منصف نہ فرماتے۔
- ۳۔ ان کا حق پر ہونا اور حق پر مرتے دم تک قائم رہنا۔
- ۴۔ قیامت کے دن مستحق رحمت الہی ہونا، اور کوئی شخص جو ایمان اور پرہیزگاری میں کامل نہ ہو مستحق رحمت الہی نہیں ہو سکتا۔

اہل انصاف ذرا انصاف کو دخل دیں اور غور کریں کہ اس سے زیادہ اور فضیلت حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی کیا ہوگی جو زبان سے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ثابت ہوئی اور جس سے امامت، خلافت، معدلت اور استحقاق رحمت الہی ان کی نسبت

بخوبی ظاہر ہوا۔ حضراتِ شیعہ جب ہمارے محدثین کی بیان کی ہوئی کسی حدیث کو صحابہ کبار کی شان میں سنتے ہیں تو اس کو غلط اور موضوع اور جھوٹ کہہ دیتے ہیں اور اس سے انکار کر جاتے ہیں، لیکن اب ایسی روایتوں کو کیا کریں گے جس کو انہی کے علماء نے نقل کیا ہے اور جو انہی کی کتابوں میں مذکور ہیں بجز اس کے کہ ان میں تحریف کریں اور کسی قصہ کہانی کو ملا کر اس کے معنی بدلیں، چنانچہ اس حدیث میں بھی ایسا ہی کیا ہے اور چند فقرے بڑھا کر اس حدیث کی تحریف کی ہے اس کو ہم بیان کرتے ہیں۔

رسالہ ”ادلہ تقیہ در ثبوت تقیہ“ میں جو کہ مزین بدستخط حضرت سلطان العلماء یعنی سید محمد صاحب مجتہد کے ۱۲۸۲ ہجری میں لدھیانہ میں چھپا ہے اس حدیث کی نسبت یہ لکھا ہے: ”علمائے اہل سنت نے نقل حدیث میں خیانت کی ہے اور ان الفاظ کو منتخب کر لیا ہے کہ جو بنظر سرسری موہم مدح شیخین کے ہیں حالانکہ باطناً وہ الفاظ بھی سراپا طعن و تشنیع سے مملو اور مشحون ہیں، چنانچہ خود امام جعفر صادق علیہ السلام نے اسی حدیث میں ان الفاظ کے معنی بہ تفصیل و توضیح ارشاد فرمائے ہیں۔“ اور بعد ایک تقریر پوچ لچر کے اس رسالے میں اصل خیانت کے الفاظ اس طرح پر منقول ہیں: ”واضح ہو کہ اصل حدیث یہ ہے کہ بعض مخالفین نے حضرت سے دربارہ شیخین سوال کیا، حضرت نے ازراہ تور یہ یہ ارشاد فرمایا:

((هُمَا اِمَامَانِ عَادِلَانِ اِنْخَ فَلَمَّا اِنْصَرَفَ النَّاسُ قَالَ لَهُ مِنْ خَاصَّتِهِ يَا اِبْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ لَقَدْ تَعَجَّبْتُ مِمَّا قُلْتَ فِي حَقِّ اَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ فَقَالَ نَعَمْ هُمَا اِمَامَانِ اَهْلِ النَّارِ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اٰیٰةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ﴾ وَاَمَّا الْعَادِلَانِ فَلِعْدُوْلِهِمْ عَنِ الْحَقِّ كَقَوْلِهِ تَعَالٰی ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهٖمْ يَّعْدِلُوْنَ﴾ وَاَمَّا الْقَاسِطَانِ فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی ﴿وَاَمَّا الْقَاسِطُوْنَ فَكَانُوْا الْجَهَنَّمَ حَطَبًا﴾ وَالْمُرَادُ مِنَ الْحَقِّ الَّذِيْ كَانَا مُسْتَوَلِيْنِ عَلَيْهِ هُوَ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ حَيْثُ اَذِيَا وَغَضَبًا حَقَّهُ وَالْمُرَادُ مِنْ مَوْتِهِمَا عَلٰی

الْحَقِّ إِنَّهُمَا مَاتَا عَلَىٰ عِدَاوَتِهِ مِنْ غَيْرِ نَدَامَتِهِ عَن ذَٰلِكَ وَالْمُرَادُ
مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ رَسُولُ اللَّهِ فَإِنَّهُ كَانَ رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ وَسَيَكُونُ
خَصْمًا لَهُمَا سَاخِطًا عَلَيْهِمَا مُنْتَقِمًا عَنْهُمَا يَوْمَ الدِّينِ .))

”وہ دونوں امام عادل تھے (الخ) جب لوگ چلے گئے تو ایک آدمی نے جو ان کے
خواص میں سے تھا کہ اے فرزند رسول! مجھے تعجب ہوا اس بات سے جو آپ نے
ابوبکر و عمرؓ کے بارے میں کہی (امام نے) کہا ہاں وہ دونوں جہنمیوں کے امام ہیں
جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے ان (کافروں) میں امام بنائے جو دوزخ
کی طرف بلا تے ہیں، اور ان کا عادل ہونا اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے حق
سے عدول کیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کافروں میں سے جو اللہ سے عدول
کرنے والے ہیں، اور ان کا قاسط ہونا، اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد
فرمایا کہ ظالم جہنم کی لکڑیاں ہیں، اور حق سے مراد جس پر وہ تھے امیر المؤمنین ہیں
کہ انہوں نے ان کو اذیت دی اور ان کا حق مارا، اور حق پر ان کے مرنے سے
مراد یہ ہے کہ وہ (علی) کی عداوت پر مرے اور اس پر ان کو ندامت نہ ہوئی اور
اللہ کی رحمت سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں کیونکہ وہ تو رحمتہ للعالمین ہیں کہ ان
دونوں کے دشمن ہوں گے اور ان پر غضب ناک ہوں گے اور روزِ قیامت ان
سے انتقام لیں گے۔“

خلاصہ ان کلمات کا یہ ہے کہ جب مجلس مخالفین سے خالی ہوئی تو ایک شخص نے خواص
اصحاب سے امام معصوم کی خدمت میں عرض کی کہ میں ان کلمات سے جو آپ نے حق شیخین
میں فرمائے بہت متعجب ہوا، حضرت نے ارشاد فرمایا کہ میں نے ان دونوں کو امام اس سبب
سے کہا کہ وہ امام اہل نار تھے چنانچہ حق تعالیٰ قرآن میں کافروں کو امام اہل نار فرماتا ہے
﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ... الْآيَةَ﴾ یعنی کافروں کو ہم نے امام اہل نار گردانا ہے اور عادل اس وجہ
سے کہا کہ ان دونوں سے عدول کیا تھا حق سے جیسا کہ خداوند عالم کافروں کو انہی معنوں سے

عادل فرماتا ہے ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ... الخ﴾ مترجم کہتا ہے کہ کتب احادیث اہل سنت میں وارد ہے کہ پیغمبر برحق نے نوشیروان کو عادل فرمایا حتیٰ کہ سعدی شیرازی نے اس کو گلستان میں نظم کیا ہے اور کہا ہے: شعر.....

در آوانِ عدلش بنازم چناں
کہ سید بدورانِ نوشیرواں

”اس کے عدل کے وقت پر مجھے ناز ہے کہ نوشیرواں زمانہ کا سردار ہے۔“

پس جب کہ مدح عدل نوشیرواں کافر کو مفید نہیں تو شیخین کو بھی مفید نہ ہوگی اور یہ وجہ بھی انہی ستر وجہوں سے ہے، اور قاسط اس وجہ سے کہا کہ قاسط کے معنی ظالم کے ہیں، چنانچہ قرآن میں وارد ہے ﴿وَأَمَّا الْقَاسِطُونَ فَكَانُوا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا﴾ یعنی ظالمین جہنم کی لکڑیاں ہیں۔ پھر امام معصوم فرماتے ہیں کہ یہ جو میں نے کہا کہ (كَانَا عَلَى الْحَقِّ) تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ دونوں غالب تھے حق پر اور حق مغلوب تھا اور مراد اس حق سے کہ جن پر غالب تھے، امیر المؤمنین ہیں کہ ان کو اذیت دی اور ان کے حق کو چھین لیا۔

مترجم کہتا ہے کہ امام معصوم نے اس جملہ میں جار مجرور کو متعلق گردانا ہے، بلفظ مستولین کہ وہ خبر خاص ہے اور محذوف ہے بقرینہ مقام اور مذہب جمہور نحاۃ کا مانند سبویہ وغیرہ کے یہ ہے کہ جب خبر خاص پر کوئی قرینہ دلالت کرے تو حذف اس کا جائز ہے اور چونکہ امام جعفر صادق علیہ السلام بالاتفاق جمہور اہل اسلام فصیح الفصحاء اور از جملہ عرب عرباء ہیں، پس کلام ان حضرت کا بجائے خود مستند ہوگا خواہ موافق نحاۃ کے ہو خواہ مخالف چہ جائے آنکہ بہ سبب پائے جانے قرینہ کے کلام ان حضرت کا موافق جمہور نحاۃ کے بھی ہے، پس اب جائے اعتراض بھی باقی نہ رہی، اور وہ قرینہ یہ ہے کہ علی کے معنی کلام میں استعلاء کے ہیں اور استعلاء ان کے محاورے میں بمعنی غلبہ اور استیلاء بھی آیا ہے، چنانچہ ملاحظہ کتب لغت سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کہتے ہیں (عَلَوْتُ الرَّجُلَ أَيْ غَلَبْتُهُ) پس معنی (كَانَا عَلَى الْحَقِّ) کے یہ ہوں گے کہ (كَانَا غَالِبِينَ عَلَى الْحَقِّ وَالْحَقُّ مُغْلُوبًا عَنْهُمَا) اور یہ جو امام معصوم نے

فرمایا ہے کہ مراد حق سے امام بحق جناب امیر ہیں امر حق ہے اور کچھ بعید نہیں اس وجہ سے کہ لفظ حق کا اطلاق خدا و رسول اور امام بلکہ موت اور قیامت اور کلمہ اور کلام پر ہوتا ہے کما لایخفی۔ پس اگر مراد حق سے مولائے برحق ہوں خلاف حق لازم نہیں آتا اور مخفی نہ رہے کہ اس مقام میں دو وجہیں اور بھی ہیں کہ حمل کلام معصوم کا ان پر صحیح ہے۔

وجہ اوّل یہ ہے کہ علی بمعنی استعلاء ہو پس معنی (كَانَا عَلَى الْحَقِّ) کے یہ ہوں گے کہ وہ دونوں کہ عین باطل تھے حق پر فوقیت لے گئے اور انہوں نے حق کو پست کر دیا، جیسا کہ معصوم دعائے صنمی قریش میں ارشاد فرماتے ہیں، پس بنا بر طریقہ جمع بین الحدیثین کے ارادہ اس معنی کا کلام معصوم سے صحیح ہوگا اور یہ نوع استعلاء مستلزم استیلاء بھی ہے، پس اس وجہ سے بھی مقدر ہونا لفظ مستولین کا صحیح ہوگا کما فعله المعصوم فتأمل۔

وجہ دوم یہ ہے کہ کلام عرب میں علیٰ کو مقام مخالفت اور مضرت اور عداوت میں بھی اطلاق کرتے ہیں، چنانچہ شائع و ذائع ہے کہ محاورہ عرب میں جواب یا اعتراض کے مقام میں کہتے ہیں کہ (هُذَا لَنَا لَا عَلَيْنَا) یعنی یہ امر ہمارے واسطے نافع ہے، نہ مخالف اور مضر۔ اور مشہور ہے کہ جب اثنائے راہ میں لشکر حُر جناب سید الشہداء سے ملاقی ہوا تو حضرت نے حُر سے فرمایا (أَعَلَيْنَا أَمْ لَنَا) یعنی تو ہماری کمک کو آیا ہے یا ہماری عداوت پر کمر باندھی ہے۔

(وَإِيضًا قَالَ اللَّهُ تَعَالَى لَا يَكْفُلُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وَسَعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا كَسَبَتْ قَالَ صَاحِبُ الْكَشَافِ يَنْفَعُهَا مَا كَسَبَتْ مِنَ الْخَيْرِ وَيُضِرُّهَا مَا كَسَبَتْ مِنَ الشَّرِّ) پس بنا پر اس وجہ کے معنی (كَانَا عَلَى الْحَقِّ) کے یہ ہوں گے کہ وہ دونوں مخالف حق کے اور دشمن حق تھے اور یہی معنی قول آئندہ میں بھی معصوم نے فرمائے ہیں، پس اس ارادہ اس معنی کا کلام امام سے اس مقام میں بھی صحیح ہوگا فافہم.....

پھر معصوم علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ جو میں نے کہا (مَا تَا عَلَى الْحَقِّ) مراد اس سے یہ ہے کہ عداوتِ حق پر مرے، یعنی جناب امیرؓ کی عداوت تادم مرگ ان کے دلوں میں رہی اور تادم مرگ نادم نہ ہوے۔ اس مقام میں علیؓ کو بہ معنی عداوت امام نے اطلاق فرمایا

ہے جیسا کہ ہم نے وجہ ثانی میں بیان کیا..... پھر معصوم فرماتے ہیں کہ یہ جو میں نے (فَعَلَيْهِمَا رَحْمَةُ اللَّهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ) پس مراد (رَحْمَةُ اللَّهِ) سے رسولِ خدا ہیں کہ ان دونوں کے دشمن ہوں گے بروز قیامت اور ان پر غضب ناک ہوں گے اور ان سے روز قیامت کو انتقام لیں گے..... مترجم کہتا ہے کہ اس مقام میں بھی علیؑ کو معصوم نے مقامِ عداوت میں ارشاد فرمایا ہے اور رحمتِ خدا ہونا حضرت رسالت مآب کا مقامِ شک و ارتیاب نہیں، حق تعالیٰ خود فرماتا ہے ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ بہر صورت اہل انصاف پر ان الفاظ کے معانی ظاہر و باہر ہوئے کہ ہرگز یہ الفاظ مقامِ مدحِ شیخین میں وارد نہیں ہیں، بلکہ سراپا یہ حدیث رد و قدحِ شیخین پر دلالت کرتی ہے۔ انتہی بلفظہ۔

اس تاویل کی غلطی ہم چند دلائل سے ثابت کرتے ہیں:

پہلی دلیل:..... اس رسالے کے مؤلف نے اپنے علماء کی تقلید میں جو کچھ واہیات بیان کیا ہے اس کے نقل کرنے سے مجھے شرم آتی ہے۔ اگر احادیث کی ایسی ہی تاویلیں کی جائیں تو کوئی حدیث کسی کی مدح و ثنا میں باقی نہ رہے بلکہ ہر ملحد اور زندیق آیاتِ قرآنی کو ایسی تاویل سے اپنے مطلب کے موافق بنا لے..... کسی ہندو کی نقل ہے کہ اس نے ایک مسلمان سے کہا کہ ہمارے رام کچھمن کا ذکر تمہارے قرآن میں بھی ہے وہ مسلمان حیران ہو کر پوچھنے لگا کہ کسی جگہ قرآن میں ان کا ذکر ہے اس نے کہا کہ سورہ یوسف کے اوّل میں جو (الر) حروفِ مقطعات ہیں ان میں الف سے مراد اللہ ہے اور لام سے مراد کچھمن اور ر سے مراد رام ہیں، وہ مسلمان یہ سن کر ہنسنے لگا، لیکن ہمارے نزدیک جو تاویل امام جعفر صادق علیہ السلام کے قول کی حضراتِ شیعہ نے کی ہے وہ اس ہندو کی تاویل سے بھی بدتر ہے۔ اس لیے کہ اس نے تو حروف کے لحاظ سے کچھ جوڑ ملا دیا لیکن شیعوں کے علماء نے جو کچھ فرمایا وہ تو سراسر بے جوڑ ہے اور ہر ایک خارجی اور ناصبی اہل بیت علیہم السلام کی شان میں جو احادیث ہیں ان میں بھی ایسی ہی تاویلات کر سکتا ہے۔ فَمَا هُوَ جَوَابُهُمْ فَهُوَ جَوَابُنَا۔

دوسری دلیل:..... یہ قول جو حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی شان میں

کہا گیا وہ امام جعفر صادق کا ہے اور امام موصوف تقیے سے ممنوع تھے ان کو حکم تھا کہ وہ کسی سے خوف نہ کریں اور بلا خوف و خطر علوم اہل بیت کو منتشر کریں تو انہوں نے کس لیے تقیہ کیا اور کیوں ایک دو ناصبی کے ڈر سے ایسی بڑی تعریف کی اور پھر جب وہ چلے گئے تو اس کی تاویل کر کے اپنے خواص کو اصل مطلب سمجھایا۔ اور وہ قول جس سے ثابت ہوتا ہے کہ امام موصوف تقیے سے ممنوع تھے یہ ہے: بحار الانوار میں ملا باقر مجلسی نے اور کافی ۱۰ میں ملا یعقوب کلینی نے لکھا ہے کہ جو صحیفہ امام جعفر صادق کا تھا اس میں ان کے لیے یہ حکم تھا:

((حَدِيثِ النَّاسِ وَافْتِهِمْ وَلَا تَخَافَنَّ إِلَّا اللَّهَ وَانْشُرْ عُلُومَ أَهْلِ

بَيْتِكَ وَصَدِّقِ آبَائِكَ الصَّالِحِينَ فَإِنَّكَ فِي حِرْزٍ وَأَمَانٍ .))

”تمام مخلوق سے باتیں کرو اور ان کو فتویٰ دو اور کسی سے سوائے خدا کے نہ ڈرو

اور اپنے اہل بیت کے علوم کو منتشر کرو اور اپنے آباء صالحین کی تصدیق کرو، اس

لیے کہ تم حرز اور امان میں ہو۔“

پس باوجود اس کے کہ جب ایسے اطمینان کا حکم الہی ان کو ہو چکا تھا اور تقیہ کرنے سے وہ منع کر دیے گئے تھے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کا خوف تھا جس کے سبب سے ایسی تعریف صحابہ کی کرتے تھے اور لوگوں کو دھوکہ دیتے تھے، افسوس ہے کہ شیعینان علی نے اپنے اماموں کی محبت کے پیرائے میں کیسی ہجو کی ہے اور ان پر کیا کیا تہمتیں لگائیں۔

تیسری دلیل: اگر کوئی شیعہ کہے کہ جب یہ عبارت زائد بھی اصل حدیث میں

داخل ہے تو کیا وجہ ہے کہ ایک ٹکڑا اس کا تسلیم کیا جائے اور دوسرا ٹکڑا زائد اور غلط ٹھہرایا جائے، اس لیے ضرور ہے کہ کل عبارت حدیث کی تسلیم کی جائے اور جو تاویل اس حدیث کی امام نے بیان کی ہے وہ بھی امام کی طرف سے ہی سمجھی جائے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مسئلہ متفق علیہ ہے کہ (اِقْرَارُ الْعُقَلَاءِ حُجَّةٌ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ دُونَ الْإِدْعَاءِ لَهُمْ) کہ آدمی کا اقرار اس پر حجت ہوتا ہے، پس اسی قاعدے سے جس قدر اقرار فضیلت شیخین کا ہے وہ ان پر حجت

ہے اور جو تاویل کی گئی ہے وہ ہم پر حجت نہیں اور قطع نظر اس کے عادت بھی شیعہ محدثین کی یہ ہے کہ وہ حدیث کی عبارت کو کم و بیش کر دیا کرتے ہیں اور اپنے مذہب کے موافق بنا لیتے ہیں، جیسا کہ ملا باقر مجلسی نے حدیث مسئلہ قضا و قدر میں شیخ صدوق کی نسبت بیان کیا ہے:

((اِنَّمَا فَعَلَ ذَلِكَ لِيُوَافِقَ مَذْهَبَ اَهْلِ الْعَدْلِ .))

”یہ (تحریف) اس لیے کہ تاکہ (یہ مسئلہ) شیعوں کے مذہب کے مطابق ہو جائے۔“

پس جب ان پر اعتماد اس امر کا نہ رہا کہ وہ حدیث میں تحریف نہیں کرتے اور کچھ تغیر و تبدل کی راہ نہیں دیتے تو پھر کیوں کر وہ تاویل جو سراسر پوچ اور خرافات ہو صحیح مانی جائے اور ایسی واہیات کی ائمہ کی طرف کیوں کر نسبت دی جائے حالانکہ ائمہ خود اس امر کی شکایت کرتے رہے ہیں اور اپنے شیعوں پر لعنت و ملامت کرتے آئے ہیں کہ وہ غلط تاویلات ان کی احادیث میں کر دیتے ہیں اور حدیث کے مضمون کو اور کا اور بنا دیتے ہیں..... چنانچہ ابو عمر وکشی نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث کو اسی بارہ میں نقل کیا ہے۔ وھو ہذہ:

((ان الناس اولعوا بالكذب علينا ان الله اقترض عليهم

لا يريد منهم غيره واني احدث احدهم بالحديث فلا يخرج

من عندي حتى يتأوله على غير تاويله ذلك انهم لا يطلبون

بحديثنا وبحبنا ما عند الله وانما يطلبون الدنيا .))

”کہ آدمیوں نے بہت زیادتی کی ہم پر جھوٹ لگانے کی، میں جو حدیث ان

سے کہتا ہوں وہ میرے پاس سے نکلنے نہیں پاتے کہ وہیں اس کی دوسری تاویل

خلاف کرنے لگتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ میری احادیث اور محبت سے

اس چیز کے طالب نہیں جو خدا کے پاس ہے بلکہ صرف دنیا کے طلب گار ہیں۔“

پس جب کہ خود امام کی تصدیق سے ثابت ہوا کہ ان کے پاس بیٹھنے والوں کی یہ عادت

تھی کہ وہیں بیٹھے بیٹھے ان کی احادیث کی تاویل غلط کر دیا کرتے تھے تو پھر ایسے لوگوں سے کیا

بعید ہے کہ انہوں نے ایسی تاویل اس حدیث کی بھی کی ہو۔

چوتھی دلیل: اس تاویل پر جو اس حدیث کے الفاظ کی، کی ہے اگر غور و فکر کریں تو ہم کو معلوم ہو جائے کہ وہ کس قدر مہمل غلط اور خلاف محاورہ ہے..... اوّل تاویل لفظ (اِمَامَان) کی یہ کی ہے کہ (اِمَامَا اَهْلِ النَّارِ) تو مضاف الیہ کو محذوف کر دیا ہے لیکن موافق قاعدہ نحو کے حذف مضاف الیہ کا سوائے حالت تنوین یا بناء مضاف یا اضافت ثانیہ کے جائز نہیں، اگر شک ہو تو رضی اٹھا کر دیکھ لو۔ دوسرے لفظ امام جب مطلق رکھا گیا تو اس سے وہی معنی جو اصلی ہیں، یعنی مدح اور صفت کے مراد لیے جائیں گے، اس لیے کہ لفظ مطلق سے فرد کامل مراد ہوتا ہے تو کیوں کر اس سے امام اہل النار مراد ہو سکتے ہیں، بخلاف آیت ﴿اِنَّمَا يَدْعُونَ اِلَى النَّارِ﴾ کے کہ وہاں یہ مقید ہے نہ کہ مطلق..... دوسری تاویل قاسطون کی بھی غلط ہے اس لیے کہ قرآن شریف میں بمقابلہ مسلمون کے قاسطون وارد ہے۔ پس تعین معنی کے واسطے قرینے کا ہونا ضروری ہے کہ وہ آیت میں موجود ہے اور حدیث میں مفقود بلکہ آیت کریمہ ﴿وَاَقْسَطُوا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾ کی طرف اشارہ ہے..... تیسرے حق سے مراد نام علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا لینا عرف عام کے خلاف اور معنی ظاہری کے خلاف ہے، بغیر پہلے ہونے ذکر مرتضوی کے حق سے ان کا نام مراد لینا حدیث کو چستان بنانا ہے، اس کے علاوہ حرف ”علی“ کو بمعنی استیلاء بلا دلیل قرار دینا اور استیلاء کو مرادف استعلاء ٹھہرانا زبردستی معنی بنانا اور خرافات بکنا ہے اور لغت میں قیاس کو دخل دینا ہے حالانکہ قیاس فی اللغۃ جائز نہیں، غور کرنا چاہیے کہ (زَيْدٌ عَلٰی الْحَقِّ) جب بولا جاتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ حق پر ہے یا یہ مراد ہوتی ہے کہ وہ باطل پر..... چوتھی تاویل (عَلَيْهَمَا رَحْمَةُ اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ) کی جو کی گئی ہے اس کی نسبت کسی نے خوب لطیفہ کہا ہے کہ حضرات امامیہ جب اپنے پیشواؤں کے حق میں رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ علیہ سے وہی مخالفت مراد ہے اور رحمتہ اللہ سے رسول اللہ مراد ہیں، یعنی مخالف ہے رسول اللہ کا..... استغفر اللہ کو حضرات شیعہ احادیث کو ایسی تاویلات بے جا سے مضحکہ اطفال بناتے ہیں اور

ائمہ پر ایسی بے جاتاویلات کی تہمت کر کے اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں۔

ساتویں شہادت:

”نہج البلاغہ“ میں حضرت امیر المؤمنین علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف سے حضرت ابوبکر

صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں یہ عبارت منقول ہے:

((لِلّٰهِ ۱۰ بِلَادُفُلَانٍ فَقَدْ قَوْمَ الْاَوْدُودَا وَالْعَمَدَ وَاَقَامَ السُّنَّةَ
وَخَلَفَ الْبِدْعَةَ وَذَهَبَ نَقْيَ الثَّوْبِ قَلِيلَ الْعَيْبِ اَصَابَ خَيْرَهَا
وَسَبَقَ شَرَّهَا اَدَىٰ اِلَى اللّٰهِ طَاعَتَهُ وَاَنْقَاهُ بِحَقِّهِ رَحَلَ وَتَرَكَهُمْ
فِي طُرُقٍ مُّتَشَبِّهَةٍ لَا يَهْدِي فِيهَا اِتِّصَالٌ وَلَا يَسْتَيْقِنُ الْمُهْتَدِي .))
”خدا انعام کرے فلاں یعنی ابوبکرؓ پر جس نے کجی کو سیدھا کیا، جس نے امراض
نفسانیہ کی دوا کی، جس نے پیغمبر ﷺ کی سنت کو قائم کیا اور بدعت کو دور کیا،
اس دنیا سے پاک دامن کم عیب گیا، خلافت کی خوبی پائی اور اس کے فساد سے
پہلے رحلت کی، خدا کی اطاعت کو اچھی طرح ادا کیا اور حق کے موافق پرہیزگاری
کو پورا کیا، کوچ کیا اس دنیا سے اور چھوڑ گیا آدمیوں کو شاخ درشاخ راہوں میں
کہ نہ گمراہ ہدایت پاتا ہے اور نہ راہ پانے والا یقین حاصل کر سکتا ہے۔“

میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول کی نسبت تمام اقوال کو اہل سنت اور شیعہ کے نقل کرتا
ہوں اور جو کچھ دونوں نے اب تک اس قول کی نسبت لکھا ہے اس کو بیان کرتا ہوں اور
حضرات شیعہ کی خدمت میں نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ اس بحث کو ذرا دل سے سنیں
اور غور سے دیکھیں اور تعصب و عناد کو چھوڑ کر انصاف کریں کہ ان کے علماء حق پر ہیں یا اہل
سنت کے۔ میں اس قول کی نسبت اوّل تحفہ اثنا عشریہ کے مضمون کو لکھتا ہوں، بعدہ جو علامہ
کنٹوری نے اس کا جواب دیا ہے اس کو لکھ کر جو تردید اس کی جناب خاتم المتکلمین مولانا

۱ ”نہج البلاغہ“ طبع مصری جلد ۱ صفحہ ۲۵۷۔ نہج البلاغہ طبع لاہور مع ترجمہ اردو حصہ اوّل صفحہ ۵۴۱ ناشر شیخ غلام

مولوی حیدر علی صاحب نے کی ہے لکھوں گا۔

خاتم المحدثین • تحفہ اثنا عشریہ میں اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

• خاتم المحدثین سے مراد شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بن شاہ عبدالرحیم بن شیخ وجیہہ الدین ہیں۔ آپ حکیم الامت شاہ ولی اللہ کی دوسری زوجہ محترمہ سونی پت کے ثناء اللہ صاحب کی دختر نیک اختر کے بطن مبارک سے شب پنج شنبہ ۲۵ رمضان المبارک ۱۱۵۹ھ مطابق ۱۷۴۶ء میں پیدا ہوئے، تاریخی نام ”غلام حلیم“ ہے۔ شاہ عبدالعزیز نے ایک ایسے علمی گھرانے میں آنکھ کھولی جو زمانہ قدیم سے علم و فضل میں معروف و ممتاز تھا۔

شیخ محمد اکرام نے آپ کے والد شاہ ولی اللہ کے خاندانی حالات کے سلسلہ میں تحریر کیا ہے کہ ”شاہ ولی اللہ صاحب“ کا سلسلہ نسب والد کی طرف سے حضرت عمرؓ اور والدہ کی طرف سے امام موسیٰ کاظمؑ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے ایک بزرگ شیخ شمس الدین مفتی اسلامی حکومت کے آغاز میں ہندوستان آئے اور بمقام ”رہتک“ مقیم ہوئے۔ آپ کا خاندان علم و فضل میں ممتاز تھا لیکن ایک بزرگ شیخ محمود نے منصب قضا ترک کر کے سپاہیانہ زندگی شروع کر دی اس کے بعد یہ خاندان عرصے تک بہادری و دلیری میں نامور رہا۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے دادا شیخ وجیہہ الدین صاحب سیف و قلم تھے، چنانچہ شاہ صاحب کے والد شاہ عبدالرحیم صاحب نے قرآن مجید انہیں سے پڑھا۔“ (رود کوثر صفحہ ۵۳۴) حضرت شاہ عبدالعزیز نے زیادہ تر علوم کی تعلیم اپنے والد سے پائی اور کچھ تعلیم حضرت شاہ محمد پھلتی اور شاہ نور اللہ بڈھانوی سے حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو غیر معمولی ذہانت و ذکاوت اور بے نظیر حافظہ عطا ہوا تھا۔ آپ پندرہ سال کی عمر میں اپنے والد کے سامنے ہی علوم و فنون مروجہ سے فارغ ہو گئے اور اسی زمانہ میں پڑھانا شروع کر دیا۔ آپ ابھی سترہ سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور آپ کو ان کا قائم مقام بنا دیا گیا۔ اس کے بعد آپ درس و تدریس، ارشاد و ہدایت میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ آپ کی معلومات بے حد وسیع تھیں، آپ نہ صرف ایک بلند پایہ محدث و محقق تھے بلکہ اسلامی علوم کے علاوہ دوسری امتوں کے علوم پر بھی آپ کی گہری نظر تھی، عربی انشاء پردازی اور شاعری میں بھی بڑا ملکہ حاصل تھا۔ آپ نے کئی عربی نظمیں لکھی ہیں، ایک منظوم عربی خط جو اپنے عم بزرگوار شاہ اہل اللہ صاحب کو لکھا تھا اس میں اپنے زمانہ کے حالات مرہٹہ اور سکھ حملہ آوروں کے طریقے بڑی خوبی سے نظم کیے ہیں۔ ہندوستان و پاکستان اور بنگلہ دیش کے اکثر محدثین کا سلسلہ اسناد آپ تک اور آپ کے ذریعے شاہ ولی اللہ تک پہنچتا ہے۔

مولانا نسیم احمد فریدی مرحوم نے آپ کے چوالیس تلامذہ کا ذکر کیا ہے جن میں اکثریت ان حضرات کی ہے جن کے علم و عمل کی گونج آج بھی سارے برصغیر میں سنائی دے رہی ہے۔ ہم ذیل میں ان کے چند مشہور تلامذہ کے نام درج کرتے ہیں:

شاہ رفیع الدین صاحب شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی صاحبان (برادران گرامی) شاہ محمد اسلم، شاہ محمد یعقوب (ہردنوا سے) شاہ محمد اسلم صاحب تقویۃ الایمان، (برادر زادہ) مولانا عبدالحی بڈھانوی، مولانا حیدر علی فیض آبادی مؤلف ازالۃ الغین و منتہی الکلام مولانا رشید الدین خان دہلوی جن کے متعلق شاہ عبدالعزیز کا

”جناب امیر کی اس عبارت میں جامع نہج البلاغہ شریف رضی نے اپنے حفظ مذہب کے واسطے عجیب تصرف کیا ہے یعنی لفظ ”ابوبکر“ کو حذف کر کے اس کے بجائے لفظ ”فلاں“ لکھ

⇐ ⇐ ⇐ مقولہ مشہور ہے کہ ”میری تقریر تو محمد اسمعیل نے لے لی اور تحریر رشید الدین نے۔“ مولانا رشید الدین خان کئی کتابوں کے مصنف تھے ان میں ”الصولۃ الغضنفریہ“ اور ”شوکتِ عمریہ“ معرکہ آراء کتابیں ہیں۔ مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی، مرزا حسن علی صغیر محدث لکھنؤی، مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی صدر الدین آزر دہ وغیرہ۔

آپ چونکہ درس و تدریس ارشاد و ہدایت میں زیادہ مشغول رہے اس لیے تصنیف و تالیف کا زیادہ موقع نہ مل سکا لیکن جو کتابیں بھی تصنیف کیں وہ شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ آپ کی کتابوں میں ”تحفہ اثنا عشریہ بہت مشہور نہایت جامع اور معرکہ آلا کتاب ہے جو علم کلام میں ایک زبردست علمی شاہکار ہے، اس کی تالیف میں شاہ صاحب نے بڑی محنت اور جان فشانی سے کام لیا ہے، اسے اگر شیعہ سنی مسائل کا انسائیکلو پیڈیا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

تحفہ اثنا عشریہ کی وجہ تالیف:

شروع کتاب میں خود شاہ صاحب نے تحفہ کی وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”ہمارے زمانے اور ہمارے شہروں میں شیعہ مذہب کی اشاعت کی اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ شاید ہی کوئی گھر ہوگا جس میں ایک دو آدمی اس مذہب کے قائل اور شیعہ خیالات سے متاثر نہ ہوں، لیکن چونکہ یہ صورت، حالات سے ناواقفیت اور غلط فہمی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے، اس لیے اس کتاب میں اس کے تدارک کا انتظام کیا گیا ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے تحفہ اثنا عشریہ ۱۲۰۰ھ یعنی نومبر ۱۷۸۵ء کے بعد شائع کی۔ کتاب کا شائع ہونا تھا کہ دنیائے شیعیت میں ایک ہلچل مچ گئی خصوصاً مرکز شیعیت لکھنؤ کے شیعہ علماء نے اس کے جواب کی طرف خصوصی توجہ فرمائی۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ تحفہ اثنا عشریہ کی صحیح اہمیت کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب ہم نے شیعہ علماء کے حالات پڑھے اور دیکھا کہ کس کثرت سے انہوں نے اس کی تردید میں قوت بیان صرف کی ہے۔ ”جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء سے پہلے اکابر شیعہ علماء کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اس کتاب کے اثر کو زائل کرنا تھا اور اس میں بہتوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ علمائے لکھنؤ میں سب سے ممتاز نام مولوی دل دار علی مجتہد اول کا ہے۔ انہوں نے چھ کتابیں اور رسالے شاہ عبدالعزیز کی تحریروں کی تردید میں لکھے..... حکیم مرزا محمد کامل دہلوی نے تحفہ کے جواب میں نہ صرف ”نزہتِ اثنا عشریہ“ لکھی بلکہ ان مباحث سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جو تحفہ کی اشاعت سے پیدا ہوئے تھے انہوں نے اپنی عمر صرف کر دی..... اسی طرح مفتی محمد قلی کثوری کا وظیفہ حیات ہی تحفہ اثنا عشریہ کی تردید معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے تشنید المطائن و کشف الضغائن، سیفِ ناصری، تقلیب المکائد، مصارع الانعام اور برہانِ سعادت میں تحفہ کا جواب دیا۔ لیکن ان کے علاوہ بھی کئی کتابیں تھیں جو تحفہ کے جواب میں لکھی گئیں، مثلاً مولوی دل دار علی کے جانشین سلطان العلماء سید محمد صاحب کی سوانحِ عمری میں لکھا ہے کہ انہوں نے تحفہ کے جواب میں رسالے لکھے۔ ان مباحث کی گونج دور دور تک پہنچی..... مثلاً: ”آسودگانِ ڈھا کہ“ میں حکیم حبیب الرحمن صاحب ڈھا کہ کے ایک مشہور شیعہ رئیس میرا شرف کی نسبت لکھتے ہیں کہ کتاب ”تحفہ اثنا عشریہ“ ڈھا کہ پہنچی تو میرا شرف علی نے تحفہ کا ⇐ ⇐ ⇐

دیا تا کہ اہل سنت کو اس پر سند پکڑنے کا موقع نہ ہو، لیکن حضرت امیر کی کرامت ہے کہ اوصاف مذکورہ اس پر صریح دلالت کرتے ہیں کہ اس سے مراد کون ہیں۔ اسی واسطے نہج البلاغہ

﴿﴾ ﴿﴾ ﴿﴾ جواب لکھنے کے لیے دس ہزار روپیہ عراق بھیجا تھا۔“ یہ میرا شرف فارسی کے مشہور شاعر سید محمد آزاد جہانگیری اور اردو کے مشہور ادیب نواب سید محمد کے پردادا تھے لیکن حکیم حبیب الرحمن کے بیان کے مطابق یہ دونوں صاحبان اہل سنت ہو گئے تھے۔

یہاں پر ایک لطیفہ کا ذکر مناسب ہوگا جسے مفتی انتظام اللہ شہابی نے ”غدر کے چند علماء“ نامی کتاب میں صفحہ ۱۵ پر امیر الروایات صفحہ ۲۰ سے لکھا ہے کہ ”دلی میں علم و فضل کے ساتھ حضرت شاہ ولی اللہ کا گھر انہ فارسی میں بھی یگانہ حیثیت رکھتا تھا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کی فارسی دانی اور زبان کی شہرت عام تھی، جب تحفہ اثنا عشریہ لکھنوپنچھی تو نواب آصف الدولہ نے مجتہدین شیعہ سے درخواست کی کہ تحفہ کا جواب لکھا جائے۔ مجتہدین میں سے مولوی دلدار علی نے جواب لکھنے کا بیڑا اٹھایا لیکن تحفہ کی زبان چونکہ بے نظیر تھی اس لیے مرزا قتیل سے کہا گیا کہ مضامین قبلہ و کعبہ لکھیں اور آپ ان کو اپنی عبارت میں ادا کریں تا کہ مضامین کا جواب مضامین سے اور عبارت کا جواب عبارت سے ہو جائے..... مرزا قتیل نے معذرت کر لی..... ناچار مولوی دلدار علی نے اپنی ہی عبارتوں میں تحفہ کا جواب لکھا..... جب قبلہ و کعبہ جواب لکھ چکے تو نواب صاحب نے مرزا قتیل کے سامنے پیش کیا اور پوچھا کیسا جواب ہے۔ مرزا قتیل نے کہا کہ اگر گرنا گوارا خاطر نہ ہو تو کچھ عرض کروں، نواب صاحب نے فرمایا کہ فرمائیے۔ مرزا قتیل نے کہا کہ سچ تو یہ ہے کہ قبلہ و کعبہ کو تو اپنی کتاب کا نام بھی رکھنا نہ آیا۔ شاہ صاحب تو تحفہ پیش کرتے ہیں اور قبلہ و کعبہ تحفہ کے جواب میں ذوالفقار (نامی کتاب)۔ اس کے بعد نواب نے فرمایا کہ اچھا عبارت کی نسبت کچھ کہیے قتیل نے کہا کہ حضور کہاں جائس کا جلاہہ (قبلہ و کعبہ جائس کے رہنے والے تھے) اور کہاں دلی کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا شہدا۔

الغرض! تحفہ کے اثر کو زائل کرنے کے لیے علماء شیعہ نے جو محنت شاقہ برداشت کی وہ نقش بر آب ثابت ہوئی اور مذہبی تاریخ کا طالب علم یہ رائے قائم کرنے میں حق بجانب ہوگا کہ اٹھارویں صدی عیسوی میں شیعہ مذہب کو جو فروغ حاصل ہوا تھا اسے روکنے میں تحفہ اثنا عشریہ نے بہت اہم خدمت انجام دی:

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب

ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

شاہ عبدالعزیز نے بروز اتوار ۷ شوال ۱۲۳۹ھ بعمر ۸۰ سال بعد نماز فجر داعی اجل کو لبیک کہا اور اس دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف انتقال فرمایا انا لله وانا الیہ راجعون۔ اپنے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ کے پہلو میں مہندیوں میں دفن ہوئے۔ حکیم مومن خان مومن نے جو اپنے اصلی نام حبیب اللہ سے نہیں بلکہ شاہ صاحب کے دیے ہوئے نام مومن خان سے زیادہ مشہور ہوئے تاریخ کہی:

انتخاب نسخہ دیں مولوی عبدالعزیز

بے عدیل و بے نظیر و بے مثال و بے مثل

کے شارحین نے ”فلاں“ کے لفظ کی تعیین میں اختلاف کیا ہے بعضوں نے کہا ہے کہ مراد ابو بکرؓ ہیں اور بعضوں نے کہا ہے کہ عمرؓ ہیں، لیکن اکثر شراح نے اوّل ہی کو ترجیح دی ہے۔

اب ان جوابات کو سننا چاہیے جو کہ علمائے شیعہ نے اس قول کی نسبت دیے ہیں:

جواب اول:..... حضرت علی گاہ گاہ اوصاف اور لیاقت شیخین کی اس لیے بیان کر دیا کرتے تھے کہ لوگ ان کے معتقد تھے اور ان کی حسن سیرت اور خوبی انتظام کے قائل تھے، پچاس خاطر لوگوں کے ان کی تعریف کرنا مناسب وقت تھا۔ پس یہ کلمات بھی اسی قبیل سے ہیں۔ لیکن یہ جواب لائق تسلیم کرنے کے نہیں ہے، اس لیے کہ کوئی عاقل منصف اس کو نہ مانے گا کہ ایک معصوم دس جھوٹ صرف دنیا کی ایک آسان غرض کے واسطے، یعنی چند شخصوں کی دل داری کے لیے وہ بھی یقینی نہ تھی اپنی زبان سے کہے اور ان لوگوں کی تعریف کرے جنہوں نے خدا و رسول کا صریح عصیان کیا اور دین اسلام کو چھوڑ کر ارتداد پر کمر باندھی اور خدا کی کتاب کی تحریف کی اور دین محمدی کی تبدیلی کی حالانکہ حدیث صحیح میں وارد ہے: (اِذْ مُدِحَ الْفَاسِقُ غَضَبَ الرَّبِّ) کہ جب فاسق کی تعریف کی جاتی ہے تو خدا غضب میں آجاتا

جانب ملک عدم تشریف فرما کیوں ہوئے
آگیا تھا کہیں مردوں کے ایماں میں خلل
ہے ستم اے چرخ تو کس کو یہاں سے لے گیا
کیا کیا یہ ظلم تو نے بیکسوں پر اے اجل
کیا کس و ناکس پہ تھا صدمہ کیا جس وقت ذن
ڈالتا تھا خاک سر پر ہر عزیز و مبتذل
جب اٹھائی لاش ایک عالم تہ و بالا ہوا
لوٹتا تھا خاک پر ہر قدسی گردول محل
مجلس درد آفریں تعزیت میں میں بھی تھا
جب پڑھی تاریخ مومن نے یہ آکر بے بدل
دست بیدا اجل سے بے سرو پا ہو گئے
فقر و دین فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

ہے۔ پس جب ایک فاسق کی تعریف سے خدائے جل شانہ غضب میں آئے تو ایسے شخص کی تعریف سے جو محرف کتاب اللہ اور مبدل دین خدا ہو اور جس نے پیغمبر خدا ﷺ کی حدیثوں کو بھلا دیا ہو اور اس کے وصی کے حقوق کو غضب کیا ہو اور اس کی اولاد کو ستایا ہو اور کوئی دقیقہ ظلم اور جبر کا خاندانِ رسول پر نہ چھوڑا ہو تو ایسے شخص کی تعریف سے معلوم نہیں خداوند عالم کس قدر غضب میں آیا ہوگا اور اس کا باعث کون ہوا ہوگا۔ شیعوں کے دین اور دیانت اور عقل و فراست سے نہایت ہی بعید ہے کہ ایسے معصوم کی نسبت جیسے کہ امیر المؤمنینؑ تھے ایسی معصیت کا اطلاق کرتے ہیں اور یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ایسی تعریف کرنے کی کیا ضرورت تھی، کون سا لشکر باغی ہو گیا تھا کہ جس کا راہِ راست پر آنا بغیر ایسے جھوٹ بولنے اور قسمیں کھانے کے ممکن نہ تھا۔ اگر صرف دل دہی حضرات شیخین رضی اللہ عنہم کے معتقدین کی منظور تھی تو صرف تعریف ان کی جس میں ذکر ان کے انتظامِ خلافت کا ہوتا کافی تھی تا کہ مطلوب بھی حاصل ہو جاتا اور بہت جھوٹ بھی نہ بولنا پڑتا بلکہ ایسے مضامین جیسے کہ اس عبارت میں مذکور ہیں معصوم کی زبان سے ادا ہونا اور اس کو باطل اور غلط سمجھنا اور اس کو جھوٹ اور غلط کہنا درحقیقت ان کی معصومیت میں داغ لگانا ہے۔“

اس جواب کو علامہ کنٹوری نے بجواب ”تحفہ اثنا عشریہ“ اس طرح پر رد کیا ہے کہ یہ دعویٰ تحفہ کا محض جھوٹ ہے، کسی شیعہ نے یہ توجیہ نہیں کی اور ایسی توجیہات کی شیعوں کو ضرورت بھی نہ تھی، اس لیے کہ ان توجیہات کی اس وقت ضرورت ہوتی جب کہ شیعوں کی کتابوں میں بجائے لفظ فلاں لفظ ابو بکر موجود ہوتا اور جب وہ لفظ ہی کتب شیعہ میں موجود نہیں ہے تو ان کو ایسی توجیہات کی احتیاج کیا ہے۔ و ہذہ عبارتہ:

((قوله عمدہ آن توجیہات نزد ایشاں آنست الخ قولنا این ادعا

کذب محض است - احتیاج این توجیہات شیعہ را وقتی

افتاد کہ در کتب شیعہ بجای لفظ فلاں لفظ ابو بکرؓ موجود می

بود و چون لفظ ابو بکرؓ در کتب شیعہ موجود نیست ایشاں را

احتیاج هیچ يك از توجیہات نیست پس آنچه ناصبی بعد
تقریر ایں توجیہات از ہذیانات خود سر کرده از جہت
ابتناى آن بر فاسد از قبیل بناء الفاسد على الفاسد باشد .))
”توجیہات کی بابت علامہ کنٹوری نے تحفہ اثنا عشریہ کی تردید میں لکھا ہے کہ اس
توجیہہ کو شیعوں کی جانب منسوب کرنا سفید جھوٹ ہے کیونکہ اس قسم کی توجیہہ کی
شیعوں کو اس وقت ضرورت ہوتی جبکہ شیعہ کتب میں لفظ فلاں کے بجائے لفظ
ابوبکرؓ ہوتا اور جبکہ کتب شیعہ میں لفظ ابوبکر پایا ہی نہیں جاتا، اس لیے ان کو کسی قسم
کی توجیہہ کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ خلاصہ یہ کہ سنیوں نے خود ہی اپنے ہزریانات
کی توجیہہ کی ہے اور یہ بناء فاسد على الفاسد ہے۔“

یہ جواب علامہ کنٹوری کا غلط ہے اور جو انہوں نے خاتم المحمد ثین صاحب تحفہ کی نسبت
فرمایا کہ ادعای کذب محض است، وہی ہم علامہ مجیب کی نسبت کہتے ہیں کہ ایں جواب کذب
محض ست، اور ثبوت اس کا یہ ہے کہ خود شیعوں کے علماء نے لکھا ہے کہ مراد فلاں سے ابوبکر
صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، چنانچہ ابن میثم بحرانی ❶ جو محققین شیعہ سے ہیں شرح نہج البلاغہ میں فلاں
کے لفظ کی شرح میں لکھتے ہیں کہ مراد فلاں سے ابوبکرؓ ہیں یا عمرؓ لیکن میرے نزدیک مراد فلاں
سے ابوبکرؓ ہیں۔ و ہذہ عبارتہ:

((اقول ان رادته لابی بکر اشبه من ارادته لعمر .))

”میں کہتا ہوں (اس فلاں) سے ابوبکر مراد لینا بہ نسبت عمر کے زیادہ بہتر ہے۔“

غرض معلوم نہیں باوجود اس کے کہ ابن میثم بحرانی سا تبر فاضل جس کے علم اور تقدس پر

❶ ابن میثم بحرانی۔ ان کا پورا نام کمال الدین میثم بن علی میثم البحرانی ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں پیدا ہوئے۔ کہا
گیا ہے کہ خواجہ نصیر الدین طوسی نے فقہ کمال الدین میثم سے اور میثم نے حکمت خواجہ سے پڑھی تھی۔ فلسفی، محقق،
صاحب حکمت اور نہج البلاغہ کی شروحات کے مصنف تھے۔ ۶۷۹ھ میں وفات پائی اور ماخوذ کے قریب ایک بستی ہلنا
میں دفن ہوئے۔ (الکنی واللقاب جلد ۱ صفحہ ۴۱۹) (شیخ محمد فراست)

ملا باقر مجلسی کو ناز ہے فلاں کے لفظ سے ابو بکرؓ مراد لیتا ہے اور اس کے باوجود جناب علامہ کنٹوری اس سے انکار فرماتے ہیں اور صاحب تحفہ کی جناب میں کذب کی نسبت کرتے ہیں..... شاید علامہ موصوف کی یہ غرض ہوگی کہ برائے نام تحفہ کا جواب تو لکھنا شروع کر دیا ہے اور حقیقت میں ایسی روایتوں کا کچھ جواب نہیں ہے، اس لیے اس سے انکار ہی کر دینا مناسب ہے تا کہ عوام کی نظروں میں وقعت پیدا ہو جائے اور وہ شاہ صاحب کو جھوٹا جانیں لیکن یہ نہ سمجھے کہ خدا نے ہر فرعون کے پیچھے ایک موسیٰ کر دیا ہے، علماء اہل سنت کب پیچھا چھوڑیں گے اور کس طرح دار و گیر سے نجات دیں گے اور ابن میثم کے قول کو دکھلا کر (الا لعنة الله على الكاذبين) پڑھنے لگیں گے۔

اور قطع نظر اس کے کہ لفظ فلاں سے مراد ابو بکرؓ ہیں یا نہیں جو تو جیہہ شیعوں کی جناب صاحب تحفہ نے بیان کی ہے وہ خود شیعوں کے علماء کے قول سے ثابت ہے اور اس کا لفظ بہ لفظ ان کی عبارت کے مطابق ہے۔ چنانچہ ابن میثم بحرانی جو نہایت نامی علمائے شیعہ سے ہے اسی شرح نہج البلاغہ میں لکھتا ہے کہ شیعوں نے اس کے دو جواب دیے ہیں منجملہ ان دو کے ایک یہی ہے جسے شاہ صاحب نے بیان کیا ہے، چنانچہ اس کی عبارت یہ ہے:

((جازان يكون ذالك الممدح منه على وجه استصلاح من

يعتقد صحة خلافة الشيخين و استجلاب قلوبهم بمثل هذا

الكلام .))

”ہو سکتا ہے کہ ان کی یہ تعریف ان لوگوں کے پاس خاطر کے لیے ہو جو شیخین کی

خلافت کی صحت کا اعتقاد رکھتے ہیں اور اس قسم کی بات سے ان کے دل جیتنا

مقصود ہو۔“

افسوس ہے کہ علامہ کنٹوری مر گئے ورنہ میں ان کے پیشوا اور مجتہد کی اس عبارت کو ان کے سامنے کر کے عرض کرتا کہ حضرت ”ادعای شاہ صاحب کذب محض ست یا انکار جناب کذب محض ست، لیکن چونکہ سنتا ہوں کہ ان کے صاحبزادہ زندہ ہیں اور کتاب استقصاء

الانعام کی تحریر پر ناز کر رہے ہیں، خدا کرے کہ کوئی شخص ان کے سامنے اس عبارت کو رکھ دے اور ان کے پدربزرگوار کی قلعی ان کے سامنے کھول دے۔

دوسرا جواب:..... علماء شیعہ سے بعضوں نے جواب دیا ہے کہ مراد فلاں سے کوئی اور ہی آدمی ہے منجملہ اصحاب رسول اللہ ﷺ کے جو کہ حضرت کے سامنے ہی وفات کر گیا اور دنیا میں فتنہ و فساد کے وقوع سے قبل رخصت کر گیا اور علامہ راوندی نے جو علماء شیعہ سے ہیں اسی قول کو پسند کیا ہے۔ لیکن ذرا سوچنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ قول نہایت ہی پوچ اور بے بنیاد ہے، اس لیے کہ اس خطبے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان لفظوں سے تعریف کی ہے کہ وہ شخص خود حلت کر گیا اور لوگوں کو شاخ درشاخ راہوں میں چھوڑ گیا کہ کوئی گمراہ ہدایت نہیں پاسکتا۔ پس جو شخص پیغمبر ﷺ کے سامنے مر گیا ہو اس کی نسبت یہ تعریف کیوں کر صادق ہو سکتی ہے۔ کسی کے خیال میں یہ بات آسکتی ہے کہ پیغمبر ﷺ کے موجود ہونے کے باوجود کسی کے مرنے سے اس قدر خرابی ہوئی ہو کہ لوگ شاخ درشاخ راہوں میں پڑ گئے ہوں، پس کیوں کر حضرت امیر المومنین کسی ایسے آدمی کی نسبت جو پیغمبر ﷺ کے سامنے مر چکا ہو یہ تعریف فرماتے اور جو بات ایک ادنیٰ آدمی سے نہیں نکل سکتی وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے۔ غرض کہ صاف ظاہر ہے کہ مراد حضرت کی فلاں سے ایسا ہی آدمی ہے جو کہ سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ کی وفات کے بعد مرا ہو اور جس کے مرنے کے بعد لوگ شاخ درشاخ راہوں میں پڑ گئے ہوں اور ایسا آدمی کوئی نہیں ہے سوائے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے، اور جس کسی کو ان میں سے حضرات شیعہ لفظ فلاں سے مراد لیں ہمارا مطلب حاصل ہے۔

اس جواب کا علامہ کنٹوری نے بجواب ”تحفہ اثنا عشریہ“ کے عجیب جواب دیا ہے کہ جس سے نہ انکار نکلتا ہے نہ اقرار، اور جس کے لفظوں سے اور عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کنٹوری پر آنے جانے کی راہ بند ہے اور ایسی بردمات میں بے چارہ گرفتار ہے کہ کچھ نہیں کر سکتا اور شاہ صاحب قدس سرہ کی تقریر کا کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ و ہذہ عبارتہ:

((قوله و بعضے امامیہ گفته اند کہ مراد آنجناب ازین مرد شخصے دیگر ست از جملہ صحابہ رسول الخ قولنا دانستی کہ بنا بر تصریح ابن ابی الحدید این قول قطب راوندی ست و هیچک از امامیہ و غیر امامیہ پیش ازین ابی الحدید سوائے قطب الدین راوندی شرح کتاب نہج البلاغہ نہ نوشته .))

”شیعوں کا کہنا ہے کہ آنجناب کی مراد ”اس شخص سے“ جملہ صحابہ کرام میں سے ایک دوسرا شخص ہے۔ ہماری بات آپ جانتے ہیں کہ ابن ابی الحدید نے لکھا ہے کہ یہ قول دراصل قطب راوندی کا ہے جو انہوں نے شرح نہج البلاغہ میں لکھا ہے جسے سوائے ان کے کسی شیعہ یا غیر شیعہ نے نہیں لکھا ہے۔“

لیکن اس تقریر سے یہ ظاہر ہے کہ علامہ کنتوری نے اس قول کو تسلیم کر لیا اور مثل پہلے جواب کے اس سے انکار نہیں کیا اور شاہ صاحب کو کاذب نہیں بنایا۔

باقی رہا یہ امر کہ کسی نے شرح نہج البلاغہ کی قطب الدین راوندی سے پہلے لکھی ہے یا نہیں وہ بحث سے خارج ہے، پس حضرات شیعہ کو چاہیے کہ اپنے علماء کے جواب کا خیال کریں کہ جب چاروں طرف سے راہ بند ہو جاتی ہے تو کیسا سکوت کر جاتے ہیں اور اصل مطلب کو چھوڑ کر خارج از بحث گفتگو کرنے لگتے ہیں لیکن ہم بایں نظر کہ شاید کوئی شیعہ اپنے بزرگ قطب الدین راوندی کے قول سے براہِ جہالت یا بوجہ دھوکہ دہی انکار کرے اس کی اصل عبارت کو بھی نقل کرتے ہیں:

((فَإِنَّهُ قَالَ فِي الشَّرْحِ أَنَّهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَمْدَحُ بَعْضَ أَصْحَابِهِ بِحُسْنِ السِّيَرَةِ وَأَنَّهُ مَاتَ قَبْلَ الْفِتْنَةِ الَّتِي وَقَعَتْ بَعْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ .))

”انہوں نے شرح میں کہا ہے کہ (امیر المؤمنین) علیہ السلام اپنے بعض اصحاب کے حسن سیرت کی تعریف کر رہے ہیں اور یہ کہ اس فتنہ سے پہلے وہ انتقال کر

گئے جو رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد رونما ہوئے۔“

تیسرا جواب:..... بعض علمائے امامیہ نے یہ جواب دیا ہے کہ غرض امیر المؤمنینؑ کی اس قول سے تو بیخ عثمان تھی تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ وہ سیرت شیخین پر نہیں چلے اور ان کے زمانہ میں فتنہ و فساد بہت ہوا.....

لیکن یہ جواب پچھلے دونوں جوابوں سے بھی زیادہ پوچ ہے۔ اس لیے کہ عثمان رضی اللہ عنہ کو تو بیخ اور طرح پر بھی ہو سکتی تھی اور فقط یہ کہہ دینا کہ وہ سیرت شیخین پر نہیں چلے حصول مطلب کے لیے کافی تھا اس جھوٹ بولنے سے معصوم کو کیا حاصل تھا..... علاوہ بریں اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ سیرت شیخین حضرت امیرؑ کے نزدیک بھی پسندیدہ تھی۔ اگر حضرات شیعہ اس امر کو مانیں تو خلافت شیخینؑ کی اس سے ثابت ہوتی ہے اگر نہ مانیں اور سیرت شیخین کو پسندیدہ نہ کہیں تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کی سیرت ناپسندیدہ کے چھوڑنے پر تو بیخ کے کیا معنی؟ لیکن علاوہ ان باتوں کے یہ جواب کسی طرح پر تسلیم کے لائق نہیں، اس لیے کہ سیرت شیخینؑ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مخالفت ہرگز اس عبارت میں مذکور نہیں ہے نہ صراحتاً نہ اشارتاً۔ اور یہ عبارت حضرت امیرؑ نے خطبہ ہائے کوفہ میں ارشاد فرمائی ہے، اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کہاں تھے اور فتنہ و فساد کہاں۔ اور اگر تو بیخ عثمان رضی اللہ عنہ حضرت امیر کو منظور ہوتی تو صراحتاً کیوں نہ فرماتے کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے ایسا ایسا کیا اور ان کے زمانہ میں فتنہ و فساد پیدا ہوا۔

اگر کوئی کہے کہ صاف کہنے میں لوگوں کی مخالفت کا ڈر تھا اس کا جواب یہ ہے کہ جس بات کا ڈر تھا، یعنی مخالفت اہل شام وہ موجود ہی تھی اور صرف حضرت عثمانؑ کے قتل کے بہانے سے اہل شام حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پھر گئے تھے اور نوبت مقاتلہ اور مجادلہ کی پہنچ چکی تھی، پس اس سے زیادہ صاف کہنے میں کس مضرت کا اندیشہ تھا..... شاید شیعوں نے یہ مثل نہیں سنی کہ (انا الغریق فما خوفی من البلبل) ”یعنی میں ڈوبا ہوا ہوں پھر مجھ کو بھگینے کا کیا ڈر ہے۔“

علامہ کنٹوری نے بجواب تحفہ کے اس جواب کا یہ جواب دیا ہے کہ کسی نے علمائے امامیہ سے یہ توجیہ جو صاحب تحفہ بیان کرتے ہیں نہیں کی، گویا علامہ موصوف نے پہلے جواب کے

مثل اس جواب سے بھی انکار کیا اور اس کو شاہ صاحبؒ کا جھوٹ تصور کیا۔ کما قیل:

((قوله بعضے از امامیہ چنین گفته اند کہ غرض حضرت امیر
تو بیخ عثمان و تعریض براو بود الخ قولنا ، هیچک از امامیہ
این توجیہ نہ کردہ مگر ابن ابی الحدید در شرح این کلام این
مقابلہ را بطرف جارودیہ کہ از فرق زید یہ ست نسبت دادہ
الی قولہ بعض مقالہ زید یہ ست نسبت دادہ الی قولہ بعض
مقالہ زید یہ رابا امامیہ نسبت دادن کذب صریح ست .))

”بعض شیعوں نے کہا ہے کہ حضرت علیؑ کا مقصد حضرت عثمانؓ کو ڈانٹ ڈپٹ
تھی۔ اور ہم کہتے ہیں کہ شیعوں میں سے کسی نے ایسی کوئی توجیہ نہیں کی، البتہ
ابن ابی الحدید نے اس کلام کی شرح میں اس مقابلہ کو فرق زید یہ کے فرقہ
جارود یہ کی جانب منسوب کیا ہے اور فرقہ زید یہ کے اقوال کو شیعوں کا قول بتانا
صریح جھوٹ ہے۔“

لیکن یہ جواب علامہ کثوری کا پہلے جواب کے مثل غلط ہے، اس لیے کہ خود علمائے امامیہ
نے اس جواب کو قبول کیا ہے اور اس سے انکار نہیں کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کثوری نے
ان اقوال کو ملاحظہ نہیں فرمایا، اس لیے اس سے انکار فرمایا یا دیدہ و دانستہ عوام کو دھوکہ دیا۔ اگر
کسی کو علامہ کثوری کی جہالت یا دھوکہ دہی دریافت کرنا منظور ہو تو وہ ابن میثم بحرانی کی تحریر کو
ان کی شرح نہج البلاغہ میں دیکھے، چنانچہ بلفظ ہم اس عبارت کو نقل کرتے ہیں اور علمائے شیعہ
کی خدمت میں اسے تحفتاً پیش کرتے ہیں:

((واعلم ان الشيعة قد اوردوا ههنا سوا لا فقالوا ان هذه
المماد ح التي ذكرها عليه السلام في احد هذين الرجلين
ينافي ما اجمعنا عليه من تخطيتهما اخذهما المنصب
الخلافة فاما ان يكون هذا الكلام من كلامه عليه السلام او ان

يكون إجماعاً خطأً ثم اجابوا من وجهين احدهما لانسلم
التنافي المذكور فانه جازان يكون ذلك المدح منه عليه السلام
على وجه استصلاح من يعتقد صحة خلافة الشيخين
واستجلاب قلوبهم بمثل هذا الكلام الثاني انه جازان يكون
مدحه ذلك لاحد هما في معرض توبيخ عثمان لوقوع الفتنة
في خلافته واضطراب الامر عليه واسارة سب مال
المسلمين هو وبنوايه حتى كان ذلك سببا لثوران المسلمين
من الامصار وقتلهم له و ينييه على ذلك قوله و خلف الفتنة
و ذهب نقى الثوب قليل العيب اصاب خيرها و سبق شرها
وقوله و تركهم في طرق متشعبة الى اخره فان مفهوم ذلك
يستلزم ان الوالى بعد هذا الموصوف قد اتّصف باضداد هذه
الصفات . والله اعلم))

”شيعوں نے اس قول کی نسبت یہ بحث کی ہے کہ یہ تعریف حضرت امیرؓ کی بہ نسبت
ابوبکر یا عمر رضی اللہ عنہما کے ہمارے اجماع کے مخالف ہے جو بہ نسبت ان کے خاطی
ہونے کے ہے کہ انہوں نے منصب خلافت کو غصب کیا اور جو روظلم کیا، پس دو
حال سے خالی نہیں یا تو یہ کلام حضرت امیر علیہ السلام کا نہیں ہے یا اجماع ہم
شیعوں کا بہ نسبت خطا شیخین کے غلط ہے، اور شیعوں نے دو طرح سے اس کا
جواب دیا ہے، اوّل یہ کہ ہم مخالفت کو اس طرح سے دفع کرتے ہیں کہ جائز ہے
کہ یہ تعریفیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بہ نسبت ابوبکر یا عمر رضی اللہ عنہما کے بنظر استمالہ قلوب
ان آدمیوں کے تھیں جو کہ شیخینؓ کی حسن سیرت اور صحت خلافت کے معتقد تھے،
دوسرے یہ کہ یہ تعریفیں بنظر توبیح عثمانؓ کے تھیں کہ امر خلافت ان کے زمانہ میں
فتنوں کے ظہور کے سبب سے ابتر ہو گیا اور مسلمانوں نے بلوہ کر کے ان کو قتل

کیا، اور یہ جواب قرین قیاس ہے، اس لیے کہ خطبے کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو خلیفہ اس کے بعد جس کی تعریف حضرت علی رضی اللہ عنہ کرتے ہیں ایسا تھا کہ جس میں صفت متذکرہ کے اضداد جمع تھے۔ واللہ اعلم،

علامہ بحرانی کی اس تحریر سے چند فائدے حاصل ہوئے:

۱۔ یہ کہ جو انکار علامہ کثوری نے کیا تھا کہ (هیچك از امامیه ایس تو جیہہ نکرده) ”یعنی امامہ میں سے کسی نے یہ تو جیہہ نہیں کی ہے۔“ اس کا بطلان ثابت ہو گیا اور انہیں کے مجتہد اور پیشوا کے اقرار سے ان کا جھوٹا ہونا ظاہر ہوا۔

۲۔ یہ معلوم ہوا کہ اولاً بجائے فلاں کے اصل خطبہ میں لفظ ابو بکرؓ یا عمرؓ کا تھا اور بعد میں اصل لفظ کو بدل کر لفظ فلاں لکھ دیا، اس لیے کہ کیوں کہ عقل سلیم قبول کر سکتی ہے کہ حضرت امیرِ صالح و بلیغ ایسے خطبے میں لفظ مبہم فرمائے اور بجائے نام کے حرف فلاں ارشاد کرے۔

۳۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک جب کہ علامہ بحرانی نے شرح نہج البلاغہ لکھی تمام شیعہ لفظ فلاں سے یا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سمجھتے تھے یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ مراد لیتے تھے، اس لیے کہ شارح موصوف شیعوں کے قول کو نقل کر کے کہتا ہے (فقالوا ان هذا الممدوح التي ذكرها عليه السلام في احد هذين الرجلين) کہ شیعہ کہتے ہیں کہ یہ ممدوح دو میں سے ایک ہے یا ابو بکر یا عمر رضی اللہ عنہما۔

۴۔ اس تحریر سے قطب الدین راوندی کی تقریر مہمل ہو گئی یعنی انہوں نے اپنے بچانے کے لیے یہ تو جیہہ کی کہ مراد فلاں سے وہ شخص ہے جو کہ پیغمبرِ خدا کے سامنے مرچکا تھا۔ اس لیے کہ اگر اس تقریر کو اور علماء شیعہ قبول کر لیتے اور اس کو مہمل جان کر مطروح نہ کر دیتے تو ایسی تاویلات کی حاجت نہ ہوتی جو علامہ بحرانی نے شیعوں کی طرف سے بیان کی ہیں۔

اگرچہ اس تحریر سے جو ہم کر چکے سب مطلب حاصل ہو گیا اور علماء شیعہ کی توجیہات کا

پوچ اور بیہودہ ہونا ثابت ہو گیا۔ لیکن ہم ذرا اس امر کی اور تصریح کرتے ہیں کہ لفظ فلاں سے علماء شیعہ کے نزدیک دو ہی شخص مراد ہیں یا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ، چنانچہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ ”تحفہ“ میں فرماتے ہیں:

((ولہذا شارحین نہج البلاغہ از امامیہ در تعیین فلاں اختلاف کرده اند بعضے گفته اند کہ مراد ابوبکرؓ ست و بعضے گفته اند عمرؓ ست .))

”اس لیے شیعوں میں سے نہج البلاغہ کے شارحین میں ”فلاں“ کی تعیین میں

اختلاف ہے کچھ کہتے ہیں کہ ابوبکرؓ مراد ہیں تو کچھ کہتے ہیں عمرؓ مراد ہیں۔“

یعنی ملاکمال الدین جو شیعوں کے ایک نامور عالم ہیں شرح نہج البلاغہ میں لکھتے ہیں کہ ”فلاں“ کے لفظ سے مراد لینے میں اختلاف ہے، قطب الدین راوندی جو شیعوں کے ایک بڑے عالم ہیں کہتے ہیں کہ حضرت امیرؓ کی مراد اس ”فلاں“ سے کوئی دوسرا آدمی ہے جو کہ پیغمبرؐ کے سانے دنیا سے رحلت کر گیا تھا اور ابن ابی الحدید کا قول ہے کہ مراد اس سے عمر ہیں لیکن میرے نزدیک مراد ”فلاں“ سے ابوبکرؓ ہیں..... فقط اس کو دیکھ کر حضرات شیعہ کو چاہیے کہ اپنے محدثین اور علماء کے جوابات پر خیال کریں کہ باوجود موجود ہونے ایسی روایات کے اس سے انکار کرتے ہیں اور حضرت مؤلف تحفہ قدس سرہ کو جھٹلاتے ہیں اور عوام کو دھوکہ دیتے ہیں۔^①

اگرچہ عبارت جناب امیرؓ کی اظہار فضائل ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ میں ایسی صریح اور صاف ہے کہ اس کے سننے کے بعد کسی قسم کا کوئی طعن ان پر شیعوں کی زبان سے نہیں نکل سکتا لیکن جو فضیلتیں ان لفظوں سے ظاہر ہوتی ہیں ان کو ذرا تفصیل سے ہم بیان کرتے ہیں۔ واضح ہو کہ جناب امیرؓ نے اس خطبے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دس وصفوں کا بیان کیا ہے:

① بعض اصحابہ فی زمن الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ممن مات قبل وقوع الفتن و انتشارها و قال ابن ابی الحدید ان ظاہر الاوصاف المذكورة فی الکلام یدل علی انه اراد رجلا ولی امر الخلافة قبلہ کقولہ قوم الاود وداوی العمد ولم یرد عثمان لوقوعه فی الفتنه و سعه بسببہ ولا ابا بکر لقصر مدۃ خلافته و بعد عہدہ عن الفتن و کان الاظہرا نہ اراد عمر و اقول ابن ارادته لابی بکر اشبه من ارادته لعمر۔ ۱۲

- ۱: یہ کہ خلق کو جو کجی میں گرفتار تھی نکال کر خدا کی راہ پر لائے اور ان کو راہِ راست دکھلائی۔
- ۲: امراضِ نفسانیہ کا اپنے وعظ و نصیحت سے معالجہ کیا۔
- ۳: پیغمبرِ خدا ﷺ کی سنت کو قائم کیا۔
- ۴: ایسا انتظام کیا کہ کچھ فتنہ و فساد ان کے زمانہ میں نہ ہوا۔
- ۵: خاشاکِ ملامت سے پاک دامن گئے۔
- ۶: خلافت کی خوبی پائی اور اس کے شر سے محفوظ رہے۔
- ۷: خدا کی اطاعت جیسی کہ چاہیے بجالائے۔
- ۸: خوف اور تقویٰ کا حق بخوبی ادا کیا۔
- ۹: خلقِ خدا ان کے بعد حیرت اور تشویش میں پڑ گئی۔
- ۱۰: ان کے بعد لوگ مختلف ہو گئے۔

چنانچہ انہیں اوصاف کی تصریح میں مولانا صاحب تحفہ میں فرماتے ہیں:

((پس دریں عبارت سراسر بشارت ابوبکر رابده وصف
عالی موصوف نمودہ .))

”پس اس عبارت میں صراحتاً ابوبکر کے لیے بشارت ہے کہ دس بلند اوصاف ان
کے بیان کیے۔“

لیکن علامہ کنٹوری اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

((ثبت الجدار ثم انقش اول این معنی باثبات بایدر سانید کہ
مراد از لفظ فلاں دریں کلام ابوبکرؓ ست بعد ازاں باین
اوصاف اثبات فضل ابوبکرؓ باید نمود .))

”پہلے دیوار بناؤ پھر نقش و نگار کرو، پہلے تو یہ بات ثابت کرنا چاہیے کہ اس کلام
میں لفظ فلاں سے ابوبکرؓ مراد ہیں اس کے بعد ان اوصاف سے ابوبکرؓ کی فضیلت
ثابت کرنا چاہیے۔“

اس کی تردید میں مولانا حیدر علی صاحب ”ازالة الغین“ میں فرماتے ہیں:

((بحمد الله هم بناء دیوار محکم شد و هم نقش و نگار صورت بست و خود شراح نهج البلاغه آن اوصاف را که تلك عشرة كاملة عبارت از انست به ہمیں عدد یاد کرده اند عبارت بحرانی بعد از ترجیح صدیق باید شنید و صفه بامور احد هما تقویمة للاود و هو کنایة عن تقویمة .))^①

”خدا کا شکر ہے کہ دیوار مضبوط ہوئی اس کے نقش و نگار ہویدا ہوئے۔ اور نہج البلاغہ کے شارحین نے خود ان اوصاف کو جو مکمل دس ہیں انہیں اعداد کے ساتھ مخصوص کیا ہے اور عبارت بحرانی بعد ترجیح ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ قابل سماعت ہے۔“

اے مسلمانو! حضرات شیعہ کو دیکھو کہ کس طرح صحابہ رضی اللہ عنہم کی ہر فضیلت سے انکار کر جاتے ہیں اور اپنے بزرگوں کے اقرار کے باوجود صاف منکر ہو جاتے ہیں اور فضیلت اور رسوائی سے بالکل بے خوف ہو جاتے ہیں۔ اس علامہ کثوری نے بایں فضیلت جب دیکھا کہ کچھ جواب ایسی روایتوں کا نہیں ہے، پس بہ مجبوری انکار کرنا شروع کیا اور لانسلم اور

① لا عوجاج الخلق عن سبیل اللہ الی الاستقامة فیہا الثانی مداواتہ للعمد واستعار لفظ العمد للامراض النفسانية باعتبار استلزامہ للاذی کا لعمد و وصف المداراة لمعالجة تلك الامراض بالمواعظ البالغة والزواج القولية والفعلية النافعة، الثالث اقامہ للسننة ولزومها، الرابع تخليفه للفتنة ای موتہ قبلها ووجه كون ذلك مدحاله هو اعتبار عدم وقوعها بسببه وفي زمانه لحسن تدبيره الخامس ذها به نقى الثوب واستعار لفظ الثوب لعرضه وقيامه به سلامته عن دنس المذام السادس فاعيبوه السابع اصابة خیرها وسبق شرها والضمير فی موضعين يشبه ان يرجع الی العهود له مما هو فيه من الخلافة ای اصاف مافيها من الخیر المطلوب وهو العدل وقامة دين الله الذى به يكون الثواب الجزيل فى الآخرة والشرف الجليل فى الدنيا و سبق شرها ای مات قبل وقوع الفتنة فیها و سفك الدماء لاجلها الثامن اذاه الی طاعته، التاسع القاه له بحقه ای ادى حقه خوفا من عقدتہ العاشر رحيله الی الآخرة تاركا للناس بعده فى طرق متشعبة من الخيالات لايهتدى فیها من ضل عن سبیل الله ولا يستيقن المهتدى فى سبیل الله انه على سبيل الاختلاف طرق الضلال و كثرة المخالف له ايهاذا لوفى قوله و تركهم

لیس بصحیح کہہ کر اپنے جواب کو ختم کیا۔ لیکن قطع نظر اس کے کہ خود علماء شیعہ نے اقرار کیا ہے کہ مراد فلاں سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں یا حضرت عمر رضی اللہ عنہما بالفرض اگر وہ اقرار بھی نہ کرتے تو بھی لفظ فلاں سے کوئی شخص مراد ہوگا یا مسوائے حضراتِ شیخین کے دوسرا کوئی ہو یا انہیں میں سے کوئی ایک ہو اگر کوئی تیسرا شخص مراد لیا جائے تو وہی شخص ہوگا جو کہ پیغمبر ﷺ کے سامنے مرچکا تھا، جیسا کہ قطب راوندی نے دعویٰ کیا ہے اور جب کہ یہ صفتیں ایسے شخص کی نسبت جو کہ پیغمبر ﷺ کے سامنے مر گیا ہو ثابت نہیں ہو سکتیں تو لامحالہ مراد فلاں سے یا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہوں گے یا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، تو پھر اس سے انکار کرنا اور بجواب تحفہ کے اپنے نامہ اعمال کی طرح چند ورق سیاہ کرنا بالکل عبث اور لغو تھا، اس سے تو یہی بہتر تھا کہ اس روایت سے ہر انکار کرتے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرنے سے منکر ہو جاتے یا اس کو تقیے پر محمول کر کے اپنے جواب میں صرف تقیے کا عذر پیش کرتے لیکن ان دو راہوں کو چھوڑ کر علامہ کنٹوری کا تیسری راہ پر چلنا سراسر نادانی تھی، آخر اس کا لطف اٹھایا کہ جس امر سے انکار کیا اور جس روایت سے منکر ہوئے اسی کو ہم نے ان کی کتابوں اور ان کے علماء کے اقوال سے ثابت کر کے ان کو بدنام کیا:

((اے معاشر مسلمین رحمکم اللہ اکنوں کجا ماند دعا وای لا طائلہ روافض کہ در مطاعن تقریر کردہ ہزاراں رسائل و کتب رامثل نامہای اعمال خود در سیاہی و تباہی گرفتند و انصاف باید داد کہ حالیا از عمدہ طعنہای رفضہ کہ در اسفار کلامیہ ایشاں مبسوط ست چیزے باقیست کہ بعد شہادت جناب مرتضوی حاجت بہ رد آن افتد پس برسوی عاقبت ایس قوم بنا لہای جانکاه باید گریست وریگ بیابانِ مذلت برسرہای ایشاں بارید ریخت .))

”اے گروہ مسلمان! اللہ تمہارے حال پر رحم کرے اب رافضیوں کے بے کار

دلائل دعویٰ کہاں باقی رہ سکتے ہیں جو انہوں نے (صحابہ رضی اللہ عنہم کی) برائیوں میں بیان کیے ہیں اور ہزاروں کتابیں اپنے نامہ اعمال کی طرح سیاہ کر کے تباہ ہوئے ہیں، انصاف کرو کہ شیعوں نے تمام طعنے جو ان کتابوں میں تفصیل سے لکھے ہیں بہ حالت وضاحت کیا اب باقی رہ سکتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کی جانب توجہ کی جائے، اس لیے ان رافضیوں کو اپنی بد انجامی پر نالہ وزاری کرتے ہوئے ذلت کے جنگلوں کی ریت اپنے سر پر ڈالنا چاہیے۔“

اگر حضرات شیعہ کو اب بھی سیری نہ ہوئی ہو اور ایسی روایتوں کے باوجود ان کی خاطر جمع نہ ہوئی ہو تو ہم ان کی تسکین کے لیے ابھی بہت سی سندیں اور روایتیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فضیلت میں موجود رکھتے ہیں اور خود ائمہ کرام کی زبان سے اس کے ثابت کرنے پر مستعد ہیں جس کو سننا ہو وہ سنے۔

آٹھویں شہادت:

علی بن عیسیٰ ارد ۱ بیلی امامی اثنا عشری نے اپنی کتاب ”کشف الغمۃ“ فی معرفۃ الائمة“ میں لکھا ہے:

((اِنَّهُ سَيْلُ الْاِمَامِ اَبُو جَعْفَرٍ عَلَيْهِ السَّلَامَ عَنْ حُلِيَةِ السَّيْفِ هَلْ

۱ علی بن عیسیٰ ارد بلی کا پورا نام بہاء الدین ابو الحسن علی بن حسین فخر الدین عیسیٰ بن ابی الفتح ارد بلی ہے۔ ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں موصل کے قریب اربل نامی ایک شہر میں پیدا ہوئے۔ تمام امامیہ اس بات پر متفق ہیں کہ علی بن عیسیٰ ارد بلی ان کے عظیم ترین علماء میں سے ہیں۔ تمی ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ عالم و فاضل، شاعر، ادیب، اور بہترین املا نگار تھے، ماہر محدث اور بزرگ ثقہ آدمی تھے، بے شمار فضائل و محاسن کے مالک ”کشف الغمۃ فی معرفۃ الائمة“ کے مصنف تھے ۶۸۷ھ میں اس کی تصنیف سے فارغ ہوئے۔ ائمہ کی تعریف میں انہوں نے بہت سے اشعار کہے ہیں جن میں کچھ ”کشف الغمۃ فی معرفۃ الائمة“ میں ذکر کیے گئے ہیں، ان کی کتاب ”کشف الغمۃ“ ایک نفیس جامع اور عمدہ کتاب ہے ۶۹۳ھ میں بغداد میں وفات ہوئی۔ (الکنسی واللقاب جلد ۳ صفحہ ۱۴-۱۵، قم ایران) ۱۲۔ (شیخ محمد فراست)

۲ ”کشف الغمۃ فی معرفۃ الائمة“ از علی بن عیسیٰ ارد بلی جلد ۲ صفحہ ۳۶۰، مطبوعہ جدید ایرانی مع ترجمہ فارسی

يَجُوزُ فَقَالَ نَعَمْ قَدْ حَلَّى أَبُو بَكْرٍ الصِّدِّيقُ سَيْفَهُ بِالْفِضَّةِ فَقَالَ
الرَّأْوِي تَقُولُ هَكَذَا فَوَثَبَ الْإِمَامُ عَنْ مَكَانِهِ فَقَالَ نَعَمْ الصِّدِّيقُ
نَعَمْ الصِّدِّيقُ نَعَمْ الصِّدِّيقُ فَمَنْ لَمْ لَهُ الصِّدِّيقُ فَلَا صَدَقَ اللَّهُ
قَوْلَهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ.))

”کسی شخص نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ تلوار کے قبضہ کو حلیہ کرنا درست ہے یا نہیں تب امام نے جواب دیا کہ ہاں، اس لیے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تلوار کے قبضہ پر بھی حلیہ چاندی کا تھا، راوی کہتا ہے کہ اس نے امام سے عرض کی کہ یا حضرت آپ بھی ابو بکر کو صدیق کہتے ہیں، یہ سنتے ہی امام اپنی جگہ سے اچھل پڑے اور کہنے لگے کہ ہاں وہ صدیق ہے ہاں وہ صدیق ہے ہاں وہ صدیق ہے جو کوئی اس کو صدیق نہ کہے خدا اس کی دنیا و آخرت میں تصدیق نہ کرے۔“

اس روایت سے چند فائدے حاصل ہوتے ہیں:

پہلا فائدہ:..... امام علیہ السلام کی زبان سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا صدیق ہونا اور صدیق ہونے سے ان کا تمام امت سے افضل ہونا لازم آتا ہے۔ اس لیے کہ قواعد مقررہ منصوصہ قرآن سے یہ امر ظاہر ہے کہ پیغمبروں کے بعد صدیق کا مرتبہ ہے اور تمام امت سے صدیقین کا درجہ افضل ہے جیسا کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا﴾ (النساء: ۶۹)

”سو وہ ان کے ساتھ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا کہ وہ نبی، صدیق، شہداء اور نیک بخت ہیں اور اچھی ہے ان کی رفاقت۔“

دوسرا فائدہ:..... امام سے جب سائل نے سوال کیا تو اس نے صرف ایک مسئلہ کا

استفسار کیا اس کے جواب میں ہاں یا نہیں کہنا کافی تھا، مگر امام نے اس پر قناعت نہ کی بلکہ

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فعل کو سند لے کر جواب دیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسائل دینی میں افعال صحابہ رضی اللہ عنہم پر تمسک کرنا چاہیے اور یہ حصہ صرف اہل سنت کو نصیب ہوا ہے حضرات شیعہ اس سے محروم ہیں، وہ کسی بھی مسئلے میں قول یا فعل صحابہ رضی اللہ عنہم کو سند نہیں جانتے، پس درحقیقت اماموں کے تابع اہل سنت ہیں نہ کہ شیعہ۔

تیسرا فائدہ:..... امام سے جب مسائل نے مسئلہ پوچھا اور انہوں نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ذکر بھی کیا تو ان کو صدیق کہنا ضروری نہ تھا یہی کافی تھا کہ ابوبکر نام لیتے مگر امام کو ان سے ایسی محبت تھی کہ بغیر صدیق کے ان کا نام لینا ان کے دل کو گوارا نہیں ہوا، اس لیے اس لقب سے ان کو یاد کیا۔ پس یہ بڑی عمدہ دلیل محبت ائمہ کی صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ ہے، افسوس حضرات شیعہ کی سمجھ پر کہ وہ ائمہ کو صحابہ کا دشمن جانتے ہیں۔

چوتھا فائدہ:..... اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام کو مسائل کے تعجب پر نہایت غصہ آیا اور جب اس نے پوچھا کہ آپ بھی ابوبکر کو صدیق کہتے ہیں تو آپ کو اس قدر غیظ ہوا کہ اپنی جگہ سے اچھل پڑے اور تین مرتبہ فرمایا ((نَعَمْ الصِّدِّيقُ نَعَمْ الصِّدِّيقُ نَعَمْ الصِّدِّيقُ)) اور اسی پر قناعت نہ کی بلکہ یہ فرمایا کہ جو کوئی ان کو صدیق نہ کہے خدا اس کی دنیا و آخرت میں تصدیق نہ کرے..... پس حضرات شیعہ کو چاہیے کہ وہ ذرا انصاف سے اس روایت کو دیکھیں اور امام کی شہادت سے اپنے آپ کو خدا کے نزدیک دنیا و آخرت میں بہ سبب نہ تصدیق کرنے صدیقیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے جھوٹا جانیں۔

پانچواں فائدہ:..... اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پوچھنے والا شیعہ تھا اور صحابہ کا دشمن، اسی واسطے امام کے صدیق کہنے پر اس کو تعجب ہوا، اگر کوئی سنی ہوتا تو وہ تعجب نہ کرتا اور جب مسائل کا شیعہ ہونا ثابت ہوا تو پھر موقع تقیہ کا بھی نہ رہا۔ ہاں، اگر مسائل سنی یا ناصبی یا خارجی ہوتا تو تقیہ کی گنجائش تھی۔

اب ہم حضراتِ شیعہ کے اقوال کو جو اس روایت کی نسبت ہیں بیان کر کے ان کا رد کرتے ہیں۔

پہلا قول: قاضی نور اللہ شوستری نے ”احقاق الحق“ میں اس روایت سے انکار کیا ہے اور بہت کچھ زبانِ درازی فرمائی ہے اور صاف لکھا ہے کہ اس روایت کا کچھ پتہ نشان ”کشف الغمہ“ میں نہیں ہے بلکہ ایسی روایت کا ”کشف الغمہ“ میں موجود ہونا خلاف قیاس ہے، اس لیے کہ اس کتاب میں پیغمبر خدا ﷺ اور ائمہ اثنا عشر کا حال لکھا ہے نہ کہ ابوبکرؓ کا، تو کیا وجہ تھی کہ مؤلف اس کتاب کا ایسی روایت کو لکھتا، چنانچہ قاضی صاحب کی عبارت کا الفاظ یہ ہیں:

((وَكَذَا الْحَالُ فِيمَا نَقَلَهُ عَنْ رَاسِ التَّعَصُّبِ وَالْحَيْفِ مِنْ حَدِيثِ حُلِيَّةِ السَّيْفِ لَيْسَ ذَلِكَ فِي الْكِتَابِ عَنْهُ خَبْرٌ وَلَا عَيْنٌ وَلَا آثَرٌ وَأَيْضًا لَا مُنَاسِبَةَ لِذِكْرِ ذَلِكَ فِي هَذَا الْكِتَابِ الْمَقْصُودُ عَلَى ذِكْرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ وَالْأئِمَّةِ الْإِثْنَا عَشَرَ وَذِكْرِ أَسْمَاءِهِمْ وَكُنَاهُمْ وَأَسْمَاءِ آبَائِهِمْ وَأُمَّهَاتِهِمْ وَمَوَالِيدِهِمْ وَوَفِيَّاتِهِمْ وَمُعْجَزَاتِهِمْ كَمَا لَا يَخْفَى عَلَى مَنْ طَالَعَ هَذَا الْكِتَابَ .))

”یہی حال اس روایت کا ہے جس کو بر بنائے تعصب نقل کیا ہے یعنی تلوار کے قبضہ پر چاندی والی حدیث کا کوئی اتہ پتہ کتاب میں نہیں ہے، نیز اس کتاب میں اس کا ذکر کرنا بھی غیر مناسب ہے کیونکہ اس کتاب کا مقصد نبی ﷺ اور ائمہ اثنا عشر کے اسماء، کنیتوں اور ان کے والدین، ان کی جائے ولادت، وفات اور معجزات کا ذکر ہے، جیسا کہ اس کتاب کے مطالعہ کرنے والوں پر پوشیدہ نہیں۔“

پس اس قول کو دیکھ کر کون ایسا شیعہ ہوگا کہ جس کو اس روایت کے موجود نہ ہونے پر یقین نہ آئے گا اور سنیوں کے قول کو کیوں کر غلط نہ جانے گا لیکن الحمد للہ کہ کتاب ”کشف الغمہ“ اس ہندوستان میں صدہا جگہ موجود ہے جس کسی کو شک ہو وہ اس کو لے کر دیکھے کہ یہ روایت موجود ہے یا نہیں اور قاضی صاحب کی صداقت کو داد دے لیکن اگر کوئی شخص یہ خیال

کرے کہ شاید بعد میں کسی سنی نے یہ عبارت ملا دی ہے اور کتاب ”کشف الغمہ“ میں اس روایت کے موجود ہونے سے اس کو اطمینان نہ ہو تو اس کے اطمینان کے لیے ہم مجتہد صاحب کی کتاب کو پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے بفضلہ تعالیٰ اس روایت کے موجود ہونے سے کتاب مذکور میں اقرار کیا اور یہ تو جیہہ فرمائی کہ یہ روایت مولف کتاب نے ابن جوزی سے جو کہ سنیوں کے عالم ہیں نقل کی ہے خیر جو کچھ ہو اس کی بحث ہم آئندہ کریں گے۔ فی الحال ہم کو قاضی نور اللہ شوستری صاحب کی تکذیب منظور ہے کہ انہوں نے اس روایت کے موجود ہونے سے ہی انکار کیا ہے اور اس کے واسطے ہم مجتہد^۱ صاحب کی کتاب ”طعن الرماح“ کی عبارت نقل کرتے ہیں جس میں انہوں نے اس روایت کے موجود ہونے کا اقرار کیا ہے،
وہو ہذہ:

((قال المجتهد القم مقام فی طعن الرماح روایت الصدیق
راسناد بکتب شیعان نمودہ از کتاب کشف الغمہ نقل کردہ
چوں اتفاق مراجعت بآن کتاب شد مصنف آن کہ مولانا
الوزیر علی بن عیسیٰ اردبیلی ست ابن جوزی کہ از

۱ یہاں مجتہد سے مراد سلطان العلماء سید محمد صاحب لکھنوی ہیں۔ آپ مولوی دل دار علی نصیر آبادی کے فرزند اکبر اور جانشین تھے۔ ۱۷ صفر ۱۱۹۹ھ - ۱۷۹۳ء کو بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ والد بزرگوار نے خود تعلیم دی اور ۱۹ سال کی عمر میں مفصل اجازہ عطا فرمایا۔ شاہ اودھ امجد علی شاہ (تحت نشین ۱۲۵۸ھ) نے آپ کو سلطان العلماء کا خطاب اور مختار کل کا منصب پیش کیا، سلطان العلماء کا حکم سب پر فائق رکھا۔ شاہان اودھ (بالخصوص امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ) کے زمانے میں سلطان العلماء کو جو اقتدار حاصل تھا وہ ان کے والد بزرگوار کے حصہ میں بھی نہ آیا۔ تیرہویں صدی میں تمام شیعہ آپ کو مقتدائے اعظم مانتے تھے۔ شاہان اودھ کے وقت میں آپ کا وہی مرتبہ تھا جو بعض سنی ممالک میں شیخ الاسلام کا ہوتا ہے۔ شمالی ہند میں شیعہ جماعت کی مذہبی تنظیم اور فروغ دینے کا جو کام آپ کے والد نے شروع کیا تھا اسے آپ نے کمال تک پہنچایا۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ضربت حیدریہ (دو جلد) بجواب شوکت عمریہ، ”طعن الرماح“، بارقہ ضعیفیہ در بحث متعہ جواب شاہ عبدالعزیز دہلوی، بوارق موبقہ در بحث امامت، رد تحفہ وغیرہ مشہور کتابیں ہیں۔ پچاسی سال سے کچھ زیادہ عمر میں شب پنجشنبہ ۲۲ ربیع الاول ۱۲۸۲ء - ۱۸۶۷ھ کو لکھنؤ میں وفات پائی اور امام باڑہ غفران مآب میں مدفون ہوئے۔ ۱۲۔ (شیخ محمد فراست)

مشاہیر علمائے اہل سنت ست روایت مذکورہ را نقل
 کردہ .))

”مجتہد اعظم نے کتاب ”طعن الرماح“ میں ، نعم الصدیق ، کی روایت کی
 اسناد کو شیعہ کتب کی جانب سے لکھا ہے اور اسے ”کشف الغمہ“ سے نقل کیا ہے ،
 اس کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس کتاب کے مصنف مولانا وزیر علی بن
 عیسیٰ اردبیلی ہیں ، جو انہوں نے سنیوں کے عالم ابن جوزی سے نقل کی ہے۔“

اس تحریر سے مثل آفتاب نیمروز کے قاضی نور اللہ شوستری کا جھوٹا ہونا ثابت ہو گیا اور خود
 مجتہد صاحب کی تحریر سے ان کے قاضی کا جس کو مولانا اور سیدنا کہہ کر اپنی کتابوں میں یاد کیا
 ہے افترا ظاہر ہو گیا۔ عجب حال ہے علماء شیعہ کا کہ جب کوئی روایت ان کی کتاب سے سند
 لا کر پیش کی جاتی ہے تو اوّل صاف انکار کرتے ہیں اور نقل کو جھوٹا اور کاذب بتاتے ہیں
 اور جب اس کی صحت اور سند پہنچائی جاتی ہے تب تو جیہات لاطائل کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ
 اس روایت کو قاضی نور اللہ شوستری نے اپنے مذہب کے خلاف پایا اس سے انکار کیا لیکن جب
 وہ روایت اس کتاب سے ثابت کر دی گئی تب بہ مجبوری مجتہد صاحب نے اس کی موجودگی کا
 اقرار کیا اور ایک دوسری توجیہ لاطائل سے اس کو باطل کرنا چاہا، چنانچہ اب ہم اس توجیہ کو
 بھی باطل کرتے ہیں۔

مجتہد صاحب کی توجیہ کا سارا خلاصہ یہ ہے کہ یہ روایت ”نعم الصدیق“ کی اگرچہ
 کتاب ”کشف الغمہ“ میں موجود ہے لیکن اس مؤلف موصوف نے اسے علامہ ابن جوزی
 سے جو کہ مشاہیر علمائے اہل سنت سے ہے نقل کیا ہے، اس لیے گویا یہ روایت اہل سنت کی
 ہے نہ کہ شیعوں کی..... اس کا جواب یہ ہے کہ شاید مجتہد صاحب نے کتاب ”کشف الغمہ“ کو
 از اوّل تا آخر ملاحظہ نہیں فرمایا ورنہ ایسا ارشاد نہ فرماتے اس لیے کہ مؤلف کتاب موصوف نے
 جو کچھ اس کتاب میں لکھا ہے اور نقل کیا ہے وہ متفق علیہ فریقین ہے اور علمائے شیعہ نے یکے
 بعد دیگرے اس کو قبول کیا ہے اور وہ شیعوں کے نزدیک مسلم ہے۔ چنانچہ علامہ معز الدین

صدر کتاب امامت میں لکھتے ہیں:

((کتاب کشف الغمہ از تصنیفات وزیر سعید اردبیلی ست
و آنچه در کتاب مستطاب مذکورست مقبول طبائع موافق و
مخالف ست .)) انتھی

”کشف الغمہ مصنفہ وزیر سعید اردبیلی ہے اور جو کچھ اس میں تحریر ہے وہ متفقہ
طور پر دونوں فرقوں کے لوگوں کو مقبول ہے۔“

پس گو کہ صاحب ”کشف الغمہ“ نے یہ روایت ابن جوزی ہی سے نقل کی ہو لیکن
جبکہ وہ التزام اس امر کا کر چکا ہے کہ جو روایت لکھی جائے گی وہ مقبول فریقین ہوگی اس سے
ثابت ہوتا ہے کہ یہ روایت بھی مقبول فریقین ہوگی اور جب مقبول فریقین ہونا ثابت ہوا تو
اس روایت سے شیعوں پر التزام دینا درست ٹھہرا اور اس کا جواب شیعوں سے لینا واجب ہوا.....
صاحب ❶ ”استقصاء الافحام“ نے جن کی کتاب پر آج کل شیعوں کو بڑا ناز ہے،
نہایت جودت طبع کو دخل دیا ہے اور اپنی دقیقہ منہی اور نکتہ سنجی سے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ
زر دستانی کے کلام سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو ”کشف الغمہ“ میں مذکور ہے اس کو اہل حق بھی

❶ صاحب ”استقصاء الافحام“ کا نام میر حامد حسین بن محمد قلی بن محمد حسین بن حامد حسین بن سید زین العابدین
الموسوی نیشاپوری ہے۔ ۵ محرم ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۰ء کو میرٹھ ضلع یوپی میں پیدا ہوئے۔ ان دنوں ان کے والد
بزرگوار میرٹھ کے صدر الصدور تھے۔ ۷ ربیع الاول ۱۲۵۲ء کو تقریب بسم اللہ ہوئی۔ ابتدائی اور وسطی علوم متداولہ والد
نے تعلیم دیے، ابھی آپ کا سن پندرہ سال کا تھا کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ (۹ محرم ۱۲۶۰ھ) ان دنوں آپ لکھنؤ
میں تھے اور یہاں ادب مولوی برکت علی حنفی اور مفتی محمد عباس سے، معقولات سید مرتضیٰ ابن سید محمد صاحب اور فقہ و
اصول سلطان العلماء سید محمد صاحب اور سید حسین (عرف میرن صاحب) سے پڑھ کر سند لی۔

تکمیل تعلیم کے بعد اپنے والد کی تصنیفات مثل فتوحات حیدریہ، رسالہ تقیہ، تشنید المطاعن وغیرہ کی ترتیب و
اشاعت کی طرف توجہ کی۔ مطبوعہ کتابوں میں استقصاء الافحام، انعام اہل المین رد ازالۃ الغین، عبقات الانوار زیادہ
مشہور ہیں۔ ۱۸ صفر ۱۳۰۶ھ مطابق ۲۵ اکتوبر ۱۸۸۸ء کو اپنے کتب خانے واقع کھجوا (شاستری نگر لکھنؤ) میں رحلت
فرمائی۔ وفات کے بعد جنازہ گھر لایا گیا اور امام باڑہ غفران مآب میں سپرد خاک ہوئے۔ ۱۲۔ (مطلع الانوار طبع
کراچی شیخ محمد فراست)

قبول کرتے ہیں اور اس کا انکار نہیں کرتے اور یہ امر آخر ہے کہ اور ہونا روایات ”کشف الغمہ“ کا اجماعیات اہل حق اور اہل خلاف سے دوسرا امر ہے، اس لیے کہ قبول کرنا کبھی اس لیے ہوتا ہے کہ اپنے واسطے حجت پکڑیں نہ کہ اس لیے کہ مخالف اس سے ہم پر حجت پکڑیں۔ علاوہ اس کے کلام زردستانی محمول اصول اور مقاصد کتاب ”کشف الغمہ“ پر ہے کہ جو مقصود بالذات ہے وہ مقبول اہل حق ہے نہ کہ وہ جو مقصود بالذات نہیں ہے وہ بھی مقبول ہے فقط، چنانچہ اصل عبارت استقصاء کی یہ ہے:

((اوّل آنکہ ازیں کلام زردستانی نہایت آنچه مستفاد میشود ایں ست کہ آنچه در کشف الغمہ مذکورست آنرا اہل حق ہم قبول میسازند و برو انکار آن نمی پردازند و این امر آخرست و بودن روایات کشف الغمہ از اجماعیات و اتفاقیات اہل حق و اہل خلاف کہ مخاطب مدعی آنست امر آخر، زیرا کہ مفہوم ثانی آنست کہ اہل حق در روایت ایں روایات شریک اند و از قبول کردن آن روایات ایں معنی مستفاد میشود چہ قبول روایت باین وجہ ہم متصورست کہ اہل خلاف روایت آن کردہ باشند و اہل حق قبول آن نمودہ باشند و قبول گاہی باین معنی ست کہ ایں روایت را صحیح میدانیم و آنچه در آن مذکورست آنرا حجت میگیریم و گاہے باین معنی کہ چون بآن بر بعض مطالب خود احتجاج میکنیم پس برای ایں امر قبولش کردہ ایم نہ باین معنی کہ خصم بآن بر ما احتجاج نماید، دوم آنکہ کلام زردستانی محمول بر اصول و مقاصد آن کتاب ست یعنی آنچه در آن کتاب برائے احتجاج و استدلال از اہل خلاف نقل فرمودہ و مقصود

بالذات ست مقبول اہل حق ہم ست نہ اینکہ آنچه مقصود بالذات نیست محض استطراداً و تبعاً نقل شدہ آنہم مقبول ست و لیاقت حجیت نزد اہل حق وارد حاشا و کلا .))

”زردستانی کے کلام سے اوّلایہ ثابت ہوتا ہے کہ ”کشف الغمہ“ کی تحریر فریقین کی منظورہ و مقبولہ ہے اور کوئی فریق اس کا انکاری نہیں ہے، اس سے سنیوں کا مقصد یہ ہے کہ ان روایات کی صداقت میں شیعہ بھی شریک ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان روایات کے قبول کرنے میں جو سنیوں کی پیش کردہ ہیں شیعوں کو اتفاق ہو، ایسا نہیں کیونکہ قبولیت اور اتفاق کے معنی یہ ہیں کہ اس روایت کو صحیح مان کر اس میں جو کچھ ہو اس کو حجت قرار دیں اور کبھی یہ معنی ہوتے ہیں کہ اس روایت کی صحت سے غیر ہم پر حجت لائیں اور اس دوسرے معنی کے لحاظ سے ”کشف الغمہ“ کی روایات پر ہمارا اتفاق نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ ”کشف الغمہ“ کے اصول و مقاصد کے پیش نظر زردستانی کے کلام کے معنی یہ ہیں کہ سنیوں کے خلاف استدلال پر جو کچھ اس میں فخر پر اور مقصود بالذات ہے اسے ہم شیعہ مانتے ہیں اور ہرگز یہ مطلب نہیں کہ جو غیر مقصود ہے اور تبعاً تحریر ہے وہ بھی شیعوں کے نزدیک مقبول ہو، حاشا و کلا غیر مقصود تحریر کو شیعہ ہرگز نہیں مانتے۔“

لیکن صاحب ”استقصاء“ کی اس عبارت کا مطلب معلوم نہیں ہوتا اور اس سے یہ مشکل مسئلہ حل نہیں ہوتا، یعنی ہمارا یہ قول ہے کہ مؤلف ”کشف الغمہ“ نے جو روایت لکھی ہے خواہ وہ اپنے یہاں سے لی ہو، خواہ سنیوں سے وہ روایت وہی ہے جس کو علماء شیعہ نے بھی قبول کیا ہے اور اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ روایت ”نعم الصدیق“ بھی مقبول علماء شیعہ ہے، خواہ مولف موصوف نے اپنے کسی عالم کی کتاب سے نقل کی ہو، خواہ ابن جوزی کے کسی نسخے سے لی ہو اور اس سے مجتہد صاحب کی وہ توجیہ کہ یہ روایت ابن جوزی سے نقل کی

ہے باطل ہوتی ہے اور صاحب استقصاء کی تحریر سے کچھ مطلب حاصل نہیں ہوتا۔ حقیقت میں وہ بے چارہ کیا کرے ایسی بردمات میں پڑ گیا ہے کہ نہ کچھ کہہ سکتا ہے نہ کچھ جواب دے سکتا ہے، اپنے مجتہدین اور علماء کے اضطراب پر حیرت کر کے جہاں تک اس سے ہوتا ہے ان کی بات بناتا ہے اور چونکہ جھوٹی بات کو کوئی سوائے ایسی آبلہ فریب تقریروں کے سچ کر کے دکھلا نہیں سکتا اسی واسطے وہ بھی ایسی ہی پوچ باتوں سے اپنا دل خوش کرتا ہے، ورنہ نہایت تعجب کی بات ہے کہ ایسی توجیہہ لاطائل جو صاحب ”استقصاء“ نے کی ہے کسی لڑکے کی زبان سے بھی نہ نکلے گی، یعنی اس کا تو اقرار ہی کرتے جاتے ہیں کہ جو کچھ ”کشف الغمہ“ میں لکھا ہے وہ مقبول فریقین ہے اور جب اس کو بعض روایات میں اپنے مذہب کے حق میں مضر جانتے ہیں تو اس کی توجیہہ اس طرح کرتے ہیں مقبولیت سے صرف انہیں روایات کی مقبولیت مراد ہے جن سے ہم حجت کریں نہ کہ وہ روایات جن سے مخالف ہم پر حجت کرے یا قبولیت سے ان روایات کی مقبولیت مراد ہے جو کہ مقصود بالذات ہیں نہ کہ وہ روایات جو مقصود بالذات نہیں ہیں، اور یہ خیال نہیں فرماتے کہ ایسی پوچ و لچر توجیہات کو مخالف کب سنے گا اور وہ ایسی باتوں کو کب مانے گا۔ چنانچہ ہم بوجوہات قوی اس تحریر کو رد کرتے ہیں۔

۱۔ یہ بات تو خود صاحب استقصاء نے قبول کی ہے کہ ❶ ”آنچه در کشف الغمہ

مذکورست آنرا اهل حق ہم قبول میسازند و بردو انکار آن نمی

پردازند“ پس ہم ایسے امر مقبول کردہ صاحب استقصاء کو منظور کر کے کہتے ہیں:

((روایت نعم الصدیق در کشف الغمہ مذکورست و آنچه

در کشف الغمہ مذکورست آنرا اهل حق ہم قبول میسازند و

بردو انکار آن نمی پردازند و قاضی نور اللہ شوستری آنرا

قبول نمی سازند و جناب مجتہد صاحب قبلہ بردو انکار آن

می پردازند پس ہر دو قاضی و مجتہد از اهل حق ہستند و

❶ ”کشف الغمہ“ میں جو کچھ تحریر ہے اسے شیعہ قبول کرتے ہیں اور اس کا انکار نہیں کرتے۔ ۱۲۔

ہر کہ از اہل حق باشند آنرا لازم ست کہ این روایت را قبول ساز دو بردو انکار آن نپر دازد .))

”نعم الصدیق“ کی روایت ”کشف الغمہ“ میں مذکور ہے جسے شیعہ بھی قبول کرتے ہیں اور کوئی فرقہ اس کا انکاری نہیں ہے، البتہ قاضی نور اللہ شوستری اسے نہیں مانتے اور جناب مجتہد صاحب اس کے انکاری ہیں اور وہ قاضی اور مجتہد دونوں شیعہ ہیں، اس لیے انہیں بھی چاہیے کہ اس روایت کو قبول کریں اور انکار نہ کریں۔“

۲- صاحب استقصاء نے قبول کے دو معنی فرض کیے ہیں کہ ”قبول گاہے بایں معنی ست کہ این روایت را صحیح میدانیم و آنچه در آن مذکور ست آنرا حجت میگیریم و گاہے بایں معنی کہ چون بآں بر بعض مطالب خود احتجاج میکنیم پس برائے این امر قبول کردہ ایم نہ بایں معنی کہ خصم بآں بر ما احتجاج نماید“^۱ لیکن انہیں فرضی معنی پر مقولہ مضمون ”الشعر فی بطن الشاعر“ صادق ہے، اس لیے کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ اس کتاب کی روایتوں کی نسبت معزالدین اثنا عشری نے لکھا ہے کہ (آنچه در کتاب مستطاب مذکور ست مقبول طبائع موافق و مخالف ست) ”یعنی کتاب میں جو کچھ موجود ہے وہ شیعہ سنی دونوں کو مقبول ہے۔“ اور جب مقبول فریقین ہونا اس کا ثابت ہوا تو پھر کہنا کہ ہم نے اس لیے قبول کیا ہے کہ ہم حجت پکڑیں نہ کہ اس لیے کہ مخالف ہم پر حجت پکڑے محض نادانی ہے۔ اس کی مثال بعینہ ایسی ہے کہ ایک شخص کسی قبالہ اور دستاویز کی صحت کا اقرار کرے اور اس امر کو قبول کرے کہ جو کچھ

۱ قبول کرنے کے کبھی یہ معنی ہوتے ہیں کہ اس روایت کو ہم صحیح مانتے ہوئے اس میں جو کچھ ہے اسے حجت سمجھتے ہیں اور کبھی یہ معنی ہوتے ہیں کہ اگر اس کے بعض مطالب سے ہم خود حجت لائیں تو اسے ہم قبول کرتے ہیں اس کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ اس کے ذریعے دشمن ہم پر دلیل لائیں۔ ۱۲

اس میں لکھا ہے خواہ وہ میرا لکھا ہو یا دوسرے فریق کا وہ سب مجھے مقبول اور منظور ہے اور پھر جب کسی عبارت پر اس دستاویز کی دوسرا فریق گرفت کرے تو اس دستاویز کا قبول کرنے والا کہے کہ یہ عبارت لکھائی ہوئی دوسرے فریق کی ہے میں نے تو اس لیے اس کو قبول کیا تھا کہ اس پر حجت پکڑوں گا نہ کہ اس لیے کہ وہ مجھ پر حجت پکڑے۔ پس منصف کیا فیصلہ کرے گا، یعنی کیا فتویٰ دے گا اور چونکہ صاحب استقصاء بھی منصف ہیں اور ان کے والد مفتی تھے اس لیے وہ خود ہی برائے خدا اس کا انصاف کریں اور اس امر کو فیصلہ فرمائیں۔

۳۔ اگر یہ امر تسلیم کیا جائے کہ روایت کا قبول کرنا اپنے واسطے حجت لانے کے لیے ہے نہ کہ دوسرے کی حجت کرنے کے لیے، تو سب جھگڑا ہی طے ہو جائے کوئی فریق کسی دوسرے پر کسی روایت کی سند نہیں لاسکتا اور یہی جواب دے سکتا ہے جیسا کہ صاحب استقصاء نے دیا ہے کہ ((چوں باں بر بعض مطالب خود احتجاج میکنیم پس برائے این امر قبولش کردہ ایم نہ باین معنی کہ خصم باں بر ما احتجاج کند)) ”یعنی چونکہ روایت سے ہم اپنے بعض مقاصد کے لیے دلیل لاتے ہیں، اس لیے ہم اسے قبول کرتے ہیں، اس لیے قبول نہیں کرتے کہ اس کے ذریعہ دشمن ہم پر حجت لائے اور ہم پر احتجاج کرے۔“

۴۔ عام قاعدہ ہے کہ جب کسی فریق کی روایت یا خبر کی صحت تسلیم کی جائے تو اس کی جواب دہی صحت کے تسلیم کرنے والے پر ایسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ اصل روایت کرنے والے پر، چنانچہ قطع نظر معاملات دنیاوی کے ہم دینی سند بیان کرتے ہیں کہ اکثر باتیں توریت و انجیل کی ہماری کتابوں میں مذکور ہیں اور ہم ان کو قبول اور منظور کرتے ہیں، پس جب ان روایتوں کی صحت ہم نے تسلیم کر لی تو اس کی جواب دہی ہمارے ذمہ بھی ویسی ہی ہے جیسے کہ یہود اور عیسائیوں کے ذمے۔ پس اگر کسی روایت یا خبر کی نسبت جس کو ہم نے تسلیم کر لیا ہے کوئی اعتراض کرے تو اس کا ہم یہ جواب دے سکتے ہیں

جیسا کہ صاحب استقصاء نے دیا ہے کہ (چوں ❶ بآں بر بعض مطالب خود احتجاج میکنیم پس برائے این امر قبولش کردہ ایم نہ باین معنی خصم بآں بر ما احتجاج کند) ”حقیقت میں ہم ایسا جواب نہیں دے سکتے اور اگر دیں تو کوئی مخالف اس کو تسلیم نہیں کر سکتا۔“

۵۔ اگر کسی فریق مخالف کی کوئی روایت ہم نقل کریں اور اس کو قبول کرنے سے کوئی خاص غرض ہو اور اس میں کوئی ایسا امر ہو جس کو ہم قبول نہ کرتے ہوں ہم کو لازم ہوگا کہ ہم اس کے مطلب کو جو کہ ہمارے مفید ہو لے کر باقی عبارت کو چھوڑ دیں یا اس کی نسبت صاف لکھ دیں کہ اس روایت کا اسی قدر مضمون ہم کو تسلیم ہے اور باقی سے انکار ہے، اگر ہم ایسا نہ کریں اور اس روایت کو بلا انکار اس کے کسی جز کے قبول کر لیں تو پھر ہم اس کی قبولیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ اسی طرح پر اگر مؤلف کتاب ”کشف الغمہ“ کا اس روایت کو کسی خاص مطلب کے واسطے قبول کرتا تو اس کو اس کا مطلب ہی کہہ دینا کافی تھا یا اصل روایت لکھ کر اس کے جزو نامقبول پر اشارہ کر دینا لازم تھا، جب اس نے ایسا نہیں کیا تو اب چند سال بعد صاحب استقصاء کی توجیہ کچھ کارآمد نہیں ہوتی۔

۶۔ یہ قول صاحب استقصاء کا:

((کلام زردستانی محمول بر اصول و مقاصد آن کتاب ست

نه اينکه آنچه مقصود بالذات نيست آنهم مقبول ست .))

”زردستانی کا کلام اس کتاب کے اصول و مقاصد پر محمول ہے، اس کا مطلب یہ

نہیں کہ جو چیز بذاتہ مقصود نہیں وہ بھی قابل قبول ہو۔“

یہ فقط قول ہی قول ہے نہ اس کی کچھ سند نہ اس پر کچھ حجت ہے، ایسا دعویٰ بلا دلیل سماعت کے لائق نہیں ہے۔ اگر مؤلف موصوف یہ لکھ دیتا کہ جو اصول اور مقاصد اس کتاب

❶ چونکہ اس کے ذریعہ ہم اپنے بعض مقاصد کے لیے حجت قائم کرتے ہیں، اس لیے قبول کرتے ہیں نہ کہ اس لیے

کہ دشمن اس کے ذریعے ہم پر حجت پیش کرے۔ ۱۲

کے ہیں وہ مقبول ہیں نہ وہ جو کہ مقصود بالذات نہیں ہیں وہ بھی مقبول ہیں تو بے شک ہم تسلیم کرتے لیکن جب کہ اس نے یہ قید نہیں کی اور اپنے کلام کو بہ نسبت کتاب کے مطابق چھوڑ دیا تو ہم بھی اس سے فرد کامل مراد لیں گے یعنی جو کچھ اس کتاب میں ہے خواہ مقصود بالذات ہو یا نہ ہو وہ سب مقبول ہے۔

اے حضراتِ شیعہ! تم کو خدا کی قسم ہے کہ ذرا غور کرو اور انصاف کو دخل دو کہ اس بحث میں تمہارے علماء کس گردابِ بلا میں پڑ گئے ہیں اور کیسے بے دست و پا ہو رہے ہیں اور ہر چند ہاتھ پاؤں مارتے ہیں مگر مقصود کے کنارے تک پہنچنے نہیں پاتے، کوئی تو اس روایت کے موجود ہونے ہی سے انکار کرتا ہے، کوئی موجود ہونے کا تو اقرار کرتا ہے لیکن اس کو سنیوں کے علماء سے نقل کرنا بیان کرتا ہے، کوئی اس کو قبول ہی نہیں کرتا، کوئی قبولیت کے معنی گھڑ گھڑ کر بیان کرتا ہے اور حقیقت میں کوئی اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتا اور (مثل الغریق یتشبث بکل حشیش) پر عمل کر رکھا ہے۔

دوسرا قول: بعض نے اس روایت سے یہ جواب دیا ہے کہ اگر اس کی صحت تسلیم کی جائے تو امام کا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی نسبت صدیق کہنا تو بنظر تخصیص اور تمیز مخاطب کے ہوگا بغیر اس کے مضمون کی تصدیق کے، جیسا کہ قاضی نور اللہ شوستری نے احقاق الحق میں لکھا ہے:

((اقول ذکر الصدیق لاجل التخصیص والتمییز للمخاطب

من غیر تصدیق بمضمونه .))

”میں کہتا ہوں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی نسبت صدیق کہنا مخاطب کے لیے تخصیص و تمیز

کی بنا پر ہوگا اس کے مضمون کی تصدیق مقصود نہیں۔“

لیکن یہ قول باطل ہے۔ اس لیے کہ اگر امام حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے نام کے بعد ان کا لقب صدیق کہہ کر سکوت فرما جاتے تو حضراتِ شیعہ کو اس تاویل کی گنجائش تھی لیکن یہ تخصیص مخاطب کی اس کے مضمون کی تصدیق کے بغیر آئندہ کے فقرہ سے باطل ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ جب سائل نے متعجباً نہ سوال کیا کہ یا حضرت آپ بھی ان کو صدیق کہتے ہیں، تو امام اپنی

جگہ سے اچھل پڑے اور کہا کہ (نَعَمْ الصّٰدِقُ نَعَمْ الصّٰدِقُ نَعَمْ الصّٰدِقُ) کہ ہاں وہ صدیق ہیں، ہاں وہ صدیق ہیں، ہاں وہ صدیق ہیں۔ اور پھر اس پر بھی قناعت نہ کی بلکہ یہ بھی فرمایا کہ (مَنْ لَمْ يُصَدِّقْهُ فَلَا صَدَقَ اللَّهُ قَوْلَهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ) جو ان کو صدیق نہ کہے اس کی خدا دنیا و آخرت میں تصدیق نہ کرے۔ اگر ایسے کلمات پر بھی حضرات شیعہ یہ فرمائیں کہ امام نے صرف مخاطب کے سمجھنے کے لیے صدیق کہا تھا اس کے مضمون کو تصدیق نہ کیا تھا تو یہ انہیں کوزیبا ہے۔

تیسرا قول: جب حضرات شیعہ نے خیال کیا کہ یہ تاویل بھی بوجہ موجود ہونے جملہ (مَنْ لَمْ يُصَدِّقْهُ فَلَا صَدَقَ اللَّهُ قَوْلَهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ) کے نہیں بنتی۔ جب تیسری تاویل شروع کی کہ شاید حضرت امام علیہ السلام نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نسبت جو کچھ فرمایا ہے وہ بہ نظر استہزاء کے فرمایا ہوگا جیسا کہ ”احقاق الحق“ میں لکھا ہے: (وَالْإِسْتِهْزَاءُ كَمَا فِي قَوْلِهِ ذُقْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ) یعنی امام نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو صدیق بنظر استہزاء اور ٹھٹھے کے فرمایا، جیسا کہ خدا نے دوزخیوں کی نسبت بھی عزیز اور کریم فرمایا ہے اور بنظر استہزاء کے ان کی شان میں قرآن میں کہا ہے کہ چکھو تم بڑے عزیز اور کریم ہو..... مگر یہ قول بھی باطل ہے اس لیے کہ الفاظ کو حقیقی معنی سے پھیرنے کے لیے کوئی قرینہ چاہیے ورنہ بغیر قرینہ کے بلا قیاس الفاظ سے معنی حقیقی مراد نہ لینا جائز نہیں ہے یس آیت کریمہ میں وہ قرینہ موجود ہے کہ اوپر سے ذکر زقوم اور عذاب دوزخ کا ہے اور خطاب بھی دوزخیوں سے ہے اور چونکہ دوزخی اوّل آپ کو بڑا عزیز اور کریم جانتے تھے، اس لیے ان سے خطاب کیا گیا:

كما قال الله تبارك و تعالیٰ :

﴿إِنَّ شَجَرَةَ الزُّقُومِ ۝ طَعَامُ الْأَثِيمِ ۝ كَالْبُهْلِ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ ۝
كَغَلِيِّ الْحَيِّمِ ۝ خُدُوهُ فَاعْتَلُوهُ إِلَىٰ سَوَاءِ الْجَحِيمِ ۝ ثُمَّ صُبُّوا
فَوْقَ رَأْسِهِ مِنْ عَذَابِ الْحَيِّمِ ۝ ذُقْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ ۝﴾

”گناہ گار کا کھانا سینڈ کا درخت ہے، جیسے پگھلا ہوا تانبا کھولتا ہے، پیٹوں میں جیسے کھولتا پانی، پکڑو اس کو اور دھکیل کر لے جاؤ بیچوں بیچ دوزخ کے پھر ڈالو اس کے سر پر کھولتے پانی کا عذاب، یہ چکھ، تو ہی ہے بڑا عزت والا سردار۔“

اس روایت کے کسی مقام سے کوئی ایسا قرینہ پایا نہیں جاتا جس سے معلوم ہو کہ امام نے بنظر استہزاء اور ٹھٹھے کے یہ فرمایا ہو۔ اس لیے کہ اوّل تو سائل شیعہ تھا اس کے سامنے استہزاء کرنے کا کیا موقع تھا، دوسرے اس نے اپنی طرف سے کچھ استفسار صدیق اکبرؓ کی نسبت نہ کیا تھا بلکہ اس نے ایک فقہی مسئلہ پوچھا تھا کہ آیا حلیہ سیف کا جائز ہے یا نہیں؟ امام نے اس کو جائز فرمایا اور اس کی سند میں حضرت ابو بکر صدیق کا ذکر کیا، جب اس سائل کو تعجب ہوا تو اس کے تعجب کو دور کرنے کے لیے حضرت نے کلمہ ”نعم الصدیق“ مکرر سے کر زبان مبارک سے ارشاد فرمایا تو یہ بھی بنظر استہزاء کے ہو لیکن اس کے بعد جو حضرت نے فرمایا کہ ((مَنْ لَمْ يُصَدِّقْهُ الخ)) یہ کلمہ استہزاء اور ٹھٹھے پر کس قرینے سے محمول کیا جائے گا اور اگر بغیر قرینہ بلا قیاس کے ایسے کلماتِ طیبات استہزاء اور سخریہ پر محمول کیے جائیں تو ہر ملحد و زندیق ہر حدیث اور آیت کی نسبت ایسا ہی کہہ سکتا ہے۔ (فما هو جوابکم فہو جوابنا)

چوتھا قول: جب حضرات شیعہ نے دیکھا کہ یہ تاویل بھی نہیں بنتی اور امام کی نسبت استہزاء اور سخریہ کے منسوب کرنے سے کام نہیں نکلتا تو اپنی اس معمولی تاویل سے پناہ لی جو سینوں کے ہر حملہ کے لیے سپر بنائی گئی ہے اور جو ناصبیوں کے ہر حربے کے واسطے ڈھال مقرر کی گئی ہے یعنی تقیہ۔ جیسا کہ ”احقاق الحق“ میں بر سبیل تنزل لکھا ہے (اول للتقیة عن السائل) ’یعنی سائل سے تقیہ کر لیا۔‘ اور مجتہد صاحب نے بھی اخیر پر ”طعن الرماح“ میں فرمایا ہے:

((ولونز لنا عن ذالك پس محمول بر تقيه خواهد بود.))

”بر سبیل تنزل (امام کا یہ قول) تقیہ پر محمول ہے۔“

لیکن اس تاویل کی بھی گنجائش نہیں ہے، اس لیے کہ الفاظِ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسائلِ مومنین اور مجہین میں سے تھا ورنہ جب امام نے حضرت ابو بکرؓ کو صدیق کہا تو اسے کچھ تعجب نہ ہوتا اور امام کا غصہ ہو کر جواب دینا صاف اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ مسائل سنی نہ تھا جس سے تقیہ کرنے کی ضرورت ہوتی۔ اور اگر مسائل سنی بھی ہوتا تب بھی امام کا تقیہ کرنا اور سنی سے ڈر کر خلفاءِ جور کی تعریف کرنا نشانِ امامت کے خلاف تھا اس لیے کہ امام باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام تقیہ سے ممنوع تھے اور ان کو تقیہ کرنا جائز ہی نہ تھا اور جو صحیفہ خدا نے ان پر بھیجا تھا اس میں ان کو علوم منتشر کرنے اور شرعی مسائل کو بلا خوف و خطر ظاہر کرنے کی تاکید تھی، ان کو خدا نے مطمئن کر دیا تھا اور ان کے حق میں (فانک فی حرز و امان) فرما دیا تھا۔ پس ایسی حالت میں امام کا ایک سنی سے ڈر جانا اور اس کے خوف سے ایک غاصب بلکہ کافر کو صدیق کہنا اور باوجود اطمینانِ خدا کے جان و عزت کا اندیشہ کرنا تعجب کا مقام ہے۔

علاوہ بریں امام کے حالات پر بھی نظر کرنا اور ان کے طور و طریقے کو بھی دیکھنا چاہیے کہ آیا وہ ہمیشہ سنیوں سے ڈر جاتے تھے اور ناصبیوں کے خوف سے صحابہ رضی اللہ عنہم کی جھوٹی تعریف کیا کرتے تھے یا کبھی اپنی امامت کے جلال پر بھی آجاتے تھے اور اپنی شانِ صدق گوئی کو بھی ظاہر فرماتے تھے، اگر یہ ثابت ہو کہ کبھی کسی سنی کے مقابلے میں حضرت نے اپنے عقیدے کو ظاہر نہیں کیا اور ہمیشہ ہر ایک سنی کے روبرو تقیہ پر عمل کیا، تو اخیر اس حدیث کی نسبت بھی ہم عذر تقیہ کو تسلیم کر سکتے ہیں۔ اور اگر یہ امر معلوم ہو کہ امام نے بڑے بڑے سنیوں کے سامنے اظہارِ حق فرمایا ہے اور بلا خوف ان کے جو کچھ دل میں تھا اس کو ظاہر کر دیا ہے، تو پھر کیوں کر ہم اس حدیث کی نسبت عذر تقیہ کو قبول کریں..... اب ہم امر دوم کو کتب شیعہ سے ثابت کرتے ہیں۔ ملا باقر مجلسی کتاب ”حق الیقین“ میں لکھتے ہیں:

((در زمان حضرت امام محمد باقر و امام جعفر صادق

علیہما السلام کہ او اخر زمان بنی امیہ و اوائل دولت بنی

عباس بود ازاں دو بزرگوار آن قدر از مسائل حلال و حرام و

علم تفسیر و کلام و قصص انبیاء و سیر و تواریخ ملوک عرب و عجم و غیر آنها از غرائب علوم منتشر گردید کہ عالم را فرا گرفت و محدثان شیعه در اطراف عالم منتشر گردید و پیوسته در مناظرات و مباحثات علماء بر جمیع فرق غالب بودند و چهار ہزار کس از علماء مشہور از حضرت صادق روایت کردہ اند و چہار صد اصل در میان شیعه بہم رسید کہ اصحاب باقر و صادق و کاظم علیہم السلام روایت کردہ بودند (الیٰ قولہ) و بطریق معتبرہ منقولست کہ قتادہ بصری کہ از مفسرین مشہورہ عامہ ست بخدمت حضرت امام محمد باقر علیہ السلام آمد، حضرت فرمود توئی فقیہ اہل بصرہ گفت بلے حضرت فرمود و ای بر توی قتادہ حق تعالیٰ خلق آفریدہ است کہ ایشان را حجتہای خود گردانیدہ ست بر خلق خود پس ایشان میخہای زمین اند و خازنان علم الہی اند پس قتادہ مدتے ساکن شد کہ یارای سخن گفتن نداشت پس گفت بخدا سوگند کہ در پیش فقہای و خلفاء و پادشاہان و ابن عباسؓ نشستہ ام و دل من نزد ایشان مضطرب نشد چنانچہ نزد تو مضطرب شدہ است حضرت فرمود می دانی کہ کجائی در پیش خانہ نشستہ کہ حق تعالیٰ در شان ایشان فرمودہ است کہ ”فی بیوت اذن اللہ ان ترفع و یذکر فیہا اسمہ“ قتادہ گفت راست گفتی . (۱)

”بنوامیہ کے آخری زمانہ اور بنو عباس کے ابتدائی عہد میں امام محمد باقر اور امام

جعفر صادق علیہ السلام موجود تھے اور ان دونوں بزرگوں نے مسائلِ حلال و حرام علم تفسیر و کلامِ قصصِ انبیاء و سیرتِ تاریخِ ملوکِ عرب و عجم اور دوسرے نادرِ علوم اس قدر عام و مشہور کیے کہ دنیا کو مالا مال کر دیا اور شیعہ محدثین پوری دنیا میں پھیل گئے اور تمام فرقوں کے علماء سے مباحثوں اور مناظروں میں غالب رہے، چار ہزار مشہور علماء نے جعفر صادق سے روایت کی اور چار سو شیعوں نے امام باقر و صادق و کاظم علیہم السلام سے روایت کی اور معتبر طریقے سے منقول ہے کہ مشہور عام مفسر قتادہ بصری حضرت امام محمد باقر کے پاس آئے، آپ نے پوچھا کہ کیا تم ہی اہل بصرہ کے فقیہ ہو؟ جواب دیا جی ہاں۔ تو امام نے کہا: افسوس اے قتادہ! اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا اور ان (ائمہ) کو اپنی حجت بنایا پس یہ (ائمہ) زمین کی میخیں ہیں اور علمِ الہی کے امین ہیں۔ اس پر قتادہ تھوڑی دیر اس طرح خاموش رہے کہ انہیں بات کرنے کی طاقت نہ رہی، اس کے بعد کہا کہ خدا کی قسم! میں فقہاء، علماء، خلفاء اور ابنِ عباسؓ کے پاس بیٹھا لیکن ان کے پاس میرا دل اتنا بے چین نہیں ہوا جتنا آپ کے پاس۔ جس پر امامؑ نے فرمایا: جانتے ہو تم کہاں ہو، اس گھر کے سامنے بیٹھے ہو جس کے بارے میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ان گھروں کو بلند کرو اور اس میں اللہ کا نام لو، یہ سن کر قتادہ نے کہا آپ سچ فرماتے ہیں۔“

پس جبکہ بڑے بڑے مفسرین اور مشہور فقہاء اور نامی علماء کے مقابلے میں امامِ تقیہ نہ کریں اور ان کو برا بھلا کہیں اور ”وائے بر تو“ اور مثل کے اور کلماتِ عتاب کے فرمانے میں کچھ تامل نہ فرمائیں اور ان کے شاگرد اور حاضر باش بڑی بڑی مجلسوں میں سنیوں سے مباحثہ کریں اور ان کو ہر ادیں اور ہزاروں عالم اور سیکڑوں فقیہ ان سے تعلیم پائیں تو کیوں کر ہم اس امر کو مانیں کہ ایسے زبردست امام جن کی مجلس میں آنے سے بڑے بڑے عالموں کے بدن میں رعشہ پڑ جائے اور صورت دیکھنے سے ان کا دل کا پنے لگے، ایک سنی کے سامنے آنے سے ڈر جائیں اور خلفاء جوہر کی ایسی بڑی تعریف کرنے لگیں، کیا وہ سائل جس نے حلیہ سیف کا

سوال کیا تھا قتادہ بصری سے بھی بڑھ کر تھا یا کوئی لشکر اور فوج لے کر امام سے مسئلہ پوچھنے آیا تھا کہ امام قتادہ سے تو نہ ڈرے اور اس پر تو عتاب کیا اور سائل سے ڈر کر ابو بکرؓ کو صدیق صدیق صدیق کہنے لگے۔ ہمارے نزدیک تو اگر کوئی بادشاہ اور امیر بھی آتا تب بھی امام کلمہ حق کہنے سے درگزر نہ فرماتے اور جو کچھ ان کے دل میں ہوتا اس کے خلاف ہرگز کچھ بھی زبان سے نہ نکالتے۔ اور یہ صرف ہمارا خیال ہی خیال نہیں ہے بلکہ اس کا ثبوت شیعوں کی کتابوں سے ہوتا ہے، چنانچہ ملا باقر مجلسی ”حق الیقین“ میں لکھتے ہیں:

((در روایت دیگر معتبر و اردشدہ است کہ در سالیکہ هشام بن عبدالمک بحج رفتہ بود در مسجد الحرام دید کہ مردم نزد حضرت امام محمد باقرؑ هجوم آوردہ اند و از امور دین خود سوال کنند عکرمہ شاگرد ابن عباسؓ از هشام پُر سید کہ کیست اینکہ نور علم از جبین او را ساطع ست میروم کہ او راحجل کنم چون نزدیک حضرت آمد و ایستاد لرزہ بر اندام او افتاد و مضطرب شد و گفت یا بن رسول اللہ من در مجالس بسیار نزد ابن عباسؓ و دیگران نشستہ ام این حالت مرا عارض نشدہ حضرت ہماں جواب را فرمود، پس معلوم شد کہ از معجزات امام و شواہد امامت آن ست کہ حق تعالیٰ محبت ایشان را در دل دو ستاں و مہابت ایشان را درد لہای دشمنان می افگند.))

”ایک معتبر روایت ہے کہ جس سال ہشام بن عبدالمک حج کے لیے گیا تو اس نے وہاں مسجد حرام میں دیکھا کہ امام محمد باقرؑ کے پاس لوگوں کا ہجوم ہے اور اپنے مذہبی امور کی بابت سوالات کر رہے ہیں، ابن عباسؓ کے ایک شاگرد عکرمہ نے ہشام سے پوچھا: یہ کون ہے کہ نور علم اس کی پیشانی سے درخشاں ہے، میں جاتا

ہوں اور اس کو شرمسار کرتا ہوں لیکن عکرمہؓ جب امام کے پاس آیا تو کانپنے لگا اور بے چین ہو کر کہا: اے فرزند رسول! میں نے اکثر مجالس میں ابن عباسؓ وغیرہ کے پاس نشست کی لیکن میری کبھی یہ حالت نہیں ہوئی، اس پر امام نے وہی جواب دیا (جو قتادہ کو دیا تھا) اس سے معلوم ہوا کہ معجزات امام اور شواہد امامت میں سے یہ ہے کہ اللہ اماموں کی محبت دوستوں کے دلوں میں پیدا کرتا ہے اور دشمنوں کے دل میں ان کا رعب ڈالتا ہے۔“

پس جبکہ ہشام بن عبد الملک جیسے ظالم بادشاہ کے موجود ہونے پر امام کا رعب دشمن پر ہو جائے اور امام کے خوف سے ان کے بدن پر لرزہ آجائے تو تعجب ہے کہ پھر امام ایک سنی کے رعب میں آجائیں اور ایک ادنیٰ آدمی سے ڈر جائیں۔

میں ہر چند غور کرتا ہوں اور بہت سوچتا ہوں لیکن حضرات شیعہ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں اور امامت کی حقیقت تو فرشتے اور انبیاء بھی نہیں سمجھے تو وہ میں کیا سمجھ سکتا ہوں لیکن اس کے ظاہری شواہد بھی میری سمجھ میں نہیں آتے کہ کبھی تو حضرات شیعہ اماموں کو ایسا شجاع اور ذی رعب بنا دیتے ہیں کہ بادشاہوں اور ظالموں کو بھی ان کے سامنے گفتگو کی مجال نہ تھی اور عالموں اور فقیہوں کو بھی ان سے بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی، سب کو برا بھلا کہتے تھے اور لوگ چپ چاپ سنا کرتے تھے اور سوائے درست اور بجا کے امام کے سامنے کسی کی زبان سے کوئی لفظ نہ نکلتا تھا، اور کبھی حضرات شیعہ اماموں کو ایسا خوف زدہ اور جبان (بزدل) نعوذ باللہ بنا دیتے ہیں کہ وہ ایک ادنیٰ آدمی سے ڈر جاتے تھے اور اگر ان کی مجلس میں ایک سنی بھی آجاتا تھا تو وہ چپ ہو جاتے تھے اور اس کا ایسا رعب ان پر چھا جاتا تھا کہ ایک بات بھی ایسی کہ جو اس سنی کے عقیدے کے خلاف ہوتی تھی نہ فرماتے تھے۔ حقیقت میں یہ سب تہمتیں شیعوں کی اماموں پر ہیں، وہ تو نبی زادے اور رسولؐ کے جان و جگر تھے، ان کی رگ رگ میں ان کے جد کی عادات اور اخلاق کا اثر تھا، ان کی بات بات میں ان کے نانا کے کلام کا جلوہ ظاہر ہوتا تھا، جس طرح ان کا ظاہری جمال پیغمبر ﷺ کے حسن کا نمونہ تھا

اسی طرح ان کے باطنی کمالات سے کمالات نبوی ﷺ کا ظہور ہوتا تھا، ان کا دل، ان کی زبان حضرت پیغمبر خدا ﷺ کے مانند یکساں تھی، نفاق اور جھوٹ، حیلہ اور تقیہ ان کے کمالات کے حق میں ایک سخت عیب تھا، کیوں کر خدا ایسے لوگوں کو جو سراسر نور کے پتلے تھے ایسی کثافتوں سے پاک نہ رکھتا اور کس لیے ان پاک اماموں کو جو سراپا طہارت کی صورت تھے ایسی نجاستوں سے دور نہ رکھتا۔

اے حضرات شیعہ! جن کی شان میں آیت تطہیر نازل ہو، جن کی پاکی پر پاکی نے قسم کھائی ہو، جن کی صداقت پر صدق کو ناز ہو، جن کی صورت اور سیرت پیغمبر ﷺ جیسی ہو، جن کی گہوارہ جنبانی جبرئیل امین کے متعلق ہو، جن کی زیارت کو عرش بریں کے ملائکہ آتے ہوں، جن کے قول و فعل پر دین و مذہب کا مدار ہو، انہی پر تم ایسی تہمتیں کرو اور خوف اور جھوٹ اور حیلے کو ان پاک اماموں کی طرف نسبت کرو..... اے بھائیو، کیا محبت کے یہی معنی ہیں جو تم رکھتے ہو۔ اگر امامت کی یہی شان ہے تو مسلمانوں کا کیا ذکر ہے گبر و ترسا بھی نفرت کریں گے اور ایسی باتوں کو سن کر سب الامان الامان پکاریں گے اگر تم کو یہ شبہ ہو کہ ہمارے علماء اور محدثین نے ایسی روایتوں کو لکھا ہے اور ایک گروہ نے فقہاء کے اس کو نقل کیا ہے تو یہ شبہ ذرا سے غور سے دفع ہو سکتا ہے، یعنی تم ان لوگوں کے حالات پر غور کرو جو راوی تمہارے یہاں کی روایتوں کے ہیں اور جن پر تمہارے مذہب کی احادیث کا مدار ہے کہ وہ سب کے سب جھوٹے تھے اور امام ان پر لعنت کیا کرتے تھے کہ اس کو ہم تمہاری ہی کتابوں سے اپنے موقع پر آئندہ ثابت کریں گے تب تم کو معلوم ہوگا کہ امام کا ظاہر و باطن ایک تھا جو ان کے دل میں ہوتا تھا وہی زبان سے ارشاد فرماتے تھے۔ اگر تم ہمارے کہنے کو غلط سمجھو تو اپنے ہی علماء کے اقوال پر نظر کرو کہ انہوں نے بھی ائمہ کرام کی طرف سے ایسا ہی لکھا ہے اور خود ائمہ کی حدیث کو لکھ کر اس بات کو ثابت کر دیا ہے۔ چنانچہ محدثین شیعہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث میں لکھتے ہیں کہ امام علیہ السلام نے فرمایا ہے:

((لَا تَذْكُرُوا اسِرَّنَا بِخِلَافِ عَلَانِيَتِنَا وَلَا عَلَانِيَتِنَا بِخِلَافِ اسِرِّنَا))

حَسْبُكُمْ أَنْ تَقُولُوا مَا نَقُولُ وَتَصْمِتُوا اَعْمَانَصْمِتُ الخ))
 ”ہمارا ظاہر و باطن ایک ہے، ہمارے باطن کو برخلاف ہمارے ظاہر کے ہرگز
 نہ کہو اور نہ ہمارے ظاہر کو مخالف باطن کے کہو، یہی تمہارے واسطے کافی ہے کہ جو
 ہم کہتے ہیں وہی تم بھی کہو اور جس سے ہم چپ رہتے ہیں اس سے تم بھی
 خاموش رہو۔“

پس اے حضراتِ شیعہ! اگر حقیقت میں تم امام کے حکم پر عمل کرتے ہو اور ان کے کہنے
 پر چلتے ہو تو ان کے قول کو سنو اور اس پر عمل کرو، جیسا انہوں نے حضرت ابو بکر صدیق کہا ویسا
 ہی تم بھی چپ چپ ان کو صدیق صدیق کہو اور سوائے اس کے وہ بات جس سے امام نے
 سکوت فرمایا تم بھی اس سے خاموش رہو۔

پانچواں قول:..... بعض حضراتِ شیعہ یہ فرماتے ہیں کہ امام علیہ السلام ابو بکر کو کس طرح
 صدیق کہتے، اس لیے کہ یہ لقب خاص جناب امیر علیہ السلام کا ہے کہ خود حضرت امیر نے
 فرمایا ہے:

(أَنَا الصِّدِّيقُ الْأَكْبَرُ لَا يَقُولُ بَعْدِي إِلَّا كَذَّابٌ)

”کہ میں صدیق اکبر ہوں، جو کوئی میرے بعد اس لقب کو اپنی نسبت کہے گا وہ
 جھوٹا ہے۔“

لیکن یہ فرمانا بھی ان حضرات کا ان کے لیے چند دلیلوں سے مفید نہیں:

پہلی دلیل:..... حضرت امیرؓ کے اس قول سے خود ان کا جواب ظاہر ہے، اس لیے
 کہ حضرت نے یہ فرمایا کہ میرے بعد کوئی شخص نہ ہوگا اور جو کوئی اس کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا
 ہے اور یہ فرمانا اس پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت امیرؓ کے پہلے کوئی صدیق گزرا ہے اور وہ کون
 ہے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہے۔

دوسری دلیل:..... اگر کوئی شیعہ یہ کہے کہ سوائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ان سے
 پہلے بھی کوئی صدیق نہیں ہوا تو اس کا جواب ہم انہی کی کتابوں سے دے سکتے ہیں، وہ یہ ہے

کہ ”عیون اخبار الرضا“ وغیرہ کتب حدیث میں ان کے موجود ہے:

((أَبُو ذَرٍّ صَدِيقٌ هَذِهِ الْأُمَّةِ .))

”ابو ذر رضی اللہ عنہ اس امت کے صدیق ہیں۔“

پس جب ابو ذرؓ کی نسبت لفظ ”صدیق“ مذکور ہے تو تخصیص مرتضویٰ باقی نہ رہی۔

تیسری دلیل:..... یہ امر دیکھنے کے قابل ہے کہ آیا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ حضرت

علی رضی اللہ عنہ سے پہلے بہ لقب صدیق کے بین الصحابہ رضی اللہ عنہم مشہور تھے یا نہیں اور لوگ حضرات

امیرؓ کے سامنے بلکہ پیغمبر خدا ﷺ کے سامنے ان کو صدیق کہتے تھے یا نہیں، چنانچہ بلفظہ اس

کا ثبوت خود شیعوں کی کتابوں سے ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک شیعہ عالم ”منہج المقال“ میں فضیل

سے روایت کرتا ہے:

((قَالَ سَمِعْتُ أَبَا دَاوُدَ يَقُولُ حَدَّثَنِي بَرِيدَةُ الْأَسْلَمِيُّ قَالَ

سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ إِنَّ الْجَنَّةَ مُشْتَقٌّ إِلَى ثَلَاثَةِ فَجَاءَ

أَبُوبَكْرٍ فَقِيلَ لَهُ يَا أَبَا بَكْرٍ أَنْتَ الصِّدِّيقُ وَأَنْتَ ثَانِي اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا

فِي الْغَارِ فَلَوْ سَأَلْتَ رَسُولَ اللَّهِ مِنْ هَوْلَاءِ الثَّلَاثِ .))

”بریدہ اسلمیؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول ﷺ سے سنا کہ حضرت نے

فرمایا: کہ جنت تین آدمیوں کی مشتاق ہے کہ اتنے میں ابو بکرؓ آئے، لوگوں نے

ان سے کہا کہ اے ابو بکرؓ تم صدیق ہو اور تم ثانی اثنین اذہما فی الغار ہو،

تم پوچھو حضرت سے کہ وہ تین کون ہیں؟۔“

پس یہ روایت اس امر کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ کے زمانے میں

سب اصحاب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو صدیق جانتے تھے اور اسی خطاب سے ان کو یاد کیا کرتے

تھے گویا صدیق اور ثانی اثنین اذہما فی الغار ان کا خطاب اور لقب ہو گیا تھا۔

اگر کسی شیعہ کو ان روایات سے بھی سیری نہ ہو اور وہ اس روایت کی تائید امام کے

دوسرے قول سے چاہیں اور یہ پوچھیں کہ سوائے اس روایت ”نعم الصدیق“ کے اور بھی کبھی

کسی امام نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو صدیق کہا ہے تو اس کا بھی ہم ثبوت دے سکتے ہیں اور جب تک کہ اچھی طرح پر حضراتِ شیعہ کو اطمینان نہ ہو جائے ہم ان کی تسکین اور تسلی کے واسطے روایت انہیں کی کتابوں سے لانے سے باز نہیں رہتے، چنانچہ ہم اس کا ثبوت دیتے ہیں کہ اسی کتاب ”کشف الغمہ“ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک دوسری حدیث موجود ہے، جس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ امام نے صدیق کا لفظ فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ امام فرماتے ہیں:

((ولدنی ابوبکر الصدیق مرتین .))

”ابوبکر صدیق نے مجھے دو مرتبہ جنا۔“

اور طرفہ یہ ہے کہ قاضی نور اللہ شوستری نے اگرچہ پہلی حدیث کے موجود ہونے سے ”کشف الغمہ“ میں انکار کیا تھا لیکن اس حدیث کے موجود ہونے پر سکوت ہی فرمایا اور کچھ زبان مبارک سے نہ نکالا اور حقیقت میں کہاں تک تکذیب کرتے اور آفتاب پر کہاں تک خاک ڈالتے، آخر کار انکار کرتے کرتے تھک گئے اور سکوت اختیار کیا۔

اگر اس روایت کے بعد بھی کچھ تشنگی باقی رہے تو حضراتِ شیعہ کو لازم ہے کہ خود جناب امیر علیہ السلام کے اقوال پر نظر کریں اور ان کی زبان سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نسبت صدیق کا خطاب سنیں۔ احتجاج طبرسی میں علامہ طبرسی جو کہ معتمدین علماء شیعہ سے ہیں لکھتے ہیں کہ حضرت امیر فرماتے ہیں:

((كُنَّا مَعَهُ أَيَّ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ جَبَلُ حِرَاءَ إِذْ تَحَرَّكَ الْجَبَلُ فَقَالَ لَهُ

قَرِّفَانَهُ لَيْسَ عَلَيْكَ إِلَّا نَبِيٌّ وَصِدِّيقٌ وَشَهِيدٌ .))

”کہ ہم پیغمبر خدا ﷺ کے ساتھ جبل حراء پر تھے کہ یکا یک پہاڑ نے حرکت

کی، تب پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا کہ قرار پکڑ کوئی نہیں تجھ پر سوائے نبی اور

صدیق اور شہید کے۔“

اور کتب شیعہ کے دیکھنے سے ظاہر ہے کہ اس وقت پیغمبر خدا ﷺ کے ساتھ ابوبکر

صدیق رضی اللہ عنہ اور علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ تھے، پس حضرت نے اپنی ذات کے لیے نبی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نسبت صدیق اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں شہید فرمایا۔ اگر کوئی متعصب شیعہ کہے کہ امام کے اقوال سے اگرچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نسبت صدیق کا لفظ معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں خیالات استہزاء اور تقیہ وغیرہ کے ہیں۔ اس لیے ان سے خاطر خواہ اطمینان نہیں ہوتا۔ اگر خدا کی کتاب سے ان کی نسبت اس خطاب کا ہونا ثابت کر دیا جائے تو پھر کچھ شبہ نہ رہے۔ چنانچہ ہم ایسے متعصب سخت کی بھی خاطر شکنی گوارا نہیں کرتے اور اس کے (لیطمئن قلبی) کہنے پر اس کا ثبوت خدا کی کتاب سے بہ تصدیق مفسرین شیعہ کے پیش کرتے ہیں..... واضح ہو کر تفسیر مجمع البیان طبری ۱ میں جو نہایت معتبرین تفسیر شیعہ سے ہے لکھا ہے:

((قَالَ اللَّهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ
أُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ .))

”جو شخص آیا صدق کے ساتھ اور جس نے اس کی تصدیق کی وہی متقی ہیں۔“

اس کی تفسیر میں علامہ موصوف لکھتا ہے:

((قِيلَ الَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ رَسُولُ اللَّهِ وَصَدَّقَ أَبُو بَكْرٍ عَنْ
أَبِي الْعَالِيَةِ وَالْكَلْبِيِّ .))

”جو شخص آیا صدق کے ساتھ اس سے مراد رسول خدا ہیں اور جس نے تصدیق کی

ان کی اس سے مراد ابوبکر ہے۔“

اور جس نے پیغمبر خدا ﷺ کی سچے دل سے سب سے زیادہ تصدیق کی اسی کا لقب صدیق ہے۔ پس بفضلہ تعالیٰ خدا کی کتاب سے بھی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہونا ثابت ہو گیا۔
والحمد لله على ذلك!

اب بھی اگر حضرات شیعہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو صدیق نہ جانیں اور باوجود موجود ہونے

۱ طبری کا پورا نام ابوعلی الفضل بن الحسن طبری ہے، اس کا شمار چھٹی صدی ہجری کے فاضل ترین شیعہ علماء میں ہوتا ہے، اس کی تفسیر پانچ جلدوں اور دس پاروں میں موجود ہے۔ ۱۲۔ (شیخ محمد فراست)

ان کی صدیقیت کے خدا کی کتاب اور رسول ﷺ کے کلام اور امام کے اقوال سے ان کی صدیقیت کی تصدیق نہ کریں اور خدا کی کتاب اور رسول اور ائمہ کے اقوال سے روگردانی کریں تو اب سوائے اس کے کہ ہم بھی ان کی نسبت وہی کہیں جو امام نے فرمایا ہے کیا چارہ ہے۔ اس لیے ہم اوّل تو نہایت منت اور عاجزی سے حضرات شیعہ کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ اے بھائیو! ابو بکر صدیقؓ کو صدیق سمجھو، ان کو پیغمبر ﷺ کا دوست اور ثانی اثین (اذھمّا فی الغار) جانو اور جس لقب سے ان کو ائمہ کرام علیہم السلام نے یاد کیا ہے، اسی لقب سے تم بھی یاد کرو، اگر اس پر بھی وہ کچھ نہ سینیں اور ان کو صدیق نہ کہیں تو پھر ہم امام کی وعید کو انہیں سنائے دیتے ہیں اور ان کو دنیا و آخرت کی رسوائی سے ڈرائے دیتے ہیں کہ ہزار برس پہلے سے امام فرما چکے ہیں:

((مَنْ لَمْ يُصَدِّقْهُ فَلَا صَدَقَ اللَّهُ قَوْلَهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ .))

”جو ان کو صدیق نہ کہے اللہ اس کی دنیا اور آخرت میں کوئی بات سچ نہ کرے۔“

نویں شہادت:

سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نکاح کا بیان

یہ بات از روئے کتب معتبرہ شیعہ و اہل سنت کے ثابت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نکاح حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہوا جو کہ خاص بیٹی حضرت فاطمہ علیہا السلام کی تھیں۔ اس امر کے ثبوت سے چند فائدے ظاہر ہوتے ہیں:

۱۔ اس نکاح سے یہ امر ظاہر ہوتا ہے کہ باہم حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے کچھ عداوت نہ تھی بلکہ نہایت ہی دوستی تھی، اگر دوستی نہ ہوئی تو حضرت علیؓ اپنی بیٹی، وہ بیٹی جو کہ خاص حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھیں نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ نہ کرتے اور دشمن کو اپنے خاندان میں نہ لیتے۔

۲۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کافر یا منافق یا مرتد نہ تھے، ورنہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ شیر خدا، غالب کل، مطلوب کل طالب، مظہر العجائب والغرائب اپنی

ایسی پیاری بیٹی کا نکاح ان کے ساتھ نہ کرتے اور اگر ان کے ایمان و عبادت اور زہد و پرہیزگاری پر اطمینان کامل حضرت امیر کونہ ہوتا تو وہ کبھی ان کو اپنا داماد نہ بناتے۔

۳۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کبھی کسی قسم کا رنج اور صدمہ جناب امیرؓ کو یا حضرت فاطمہ علیہا السلام کو نہیں دیا اور کبھی کسی قسم کی دشمنی یا عداوت ان کے ساتھ نہیں رکھی، ورنہ ممکن نہ تھا کہ حضرت امیرؓ ایسے شخص کے ساتھ جس نے ان کو یا حضرت فاطمہؓ کو رنج دیا ہوتا اس نکاح کا ہونا جائز رکھتے۔ بہر حال یہ امر اخلاص اور اتحاد و محبت پر باہم جناب امیرؓ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایسا شاہد عادل ہے کہ کسی طرح پر بعد ثبوت اس امر کے شیعوں کی زبان پر عداوت کا نام نہیں آسکتا اور باوجود ہزار سعی باطل کے کوئی عذر و حیلہ ان کا اس معاملہ میں نہیں چلتا۔ کسی معاملہ میں ایسے دق اور زچ نہیں ہوئے جیسے کہ اس معاملہ میں ہوئے ہیں۔ حقیقت میں یہ بحث غور سے دیکھنے کے لائق ہے کہ حضرات شیعہ نے عبداللہ بن سبا کے زمانے سے لے کر جناب قبلہ و کعبہ کے وقت تک اس معاملہ میں کیا کیا رنگ بدلے ہیں اور کیسی تو جیہات لاطائل کی ہیں، کسی نے اس نکاح کے ہونے سے ہی انکار کیا ہے، کوئی ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے بنت مرتضوی ہونے ہی کا منکر ہوا ہے، کسی نے نکاح پر غصب کا اطلاق فرمایا ہے، کوئی بعد نکاح کے ہم بستر ہونے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ منکر ہوا ہے، کوئی کہتا ہے کہ جنیہ بشکل حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آتی تھی اور وہ ہم خواب ہوتی تھی، کسی نے اس کو جناب امیرؓ کے اعلیٰ درجہ کے صبر کا نتیجہ کہا ہے، کسی نے اس کو تقیہ پر ٹالا ہے۔ بہر حال ہر ایک کا نیا ترانہ اور ہر تنفس کا جدا فسانہ ہے جس کے سننے سے فقط ایک ہمیں محو حیرت نہیں بلکہ ان کی نغمہ سرائی اور ترانہ سنجی کو سن کر ایک عالم اپنے قابو سے نکلا جاتا ہے اور وجد میں آ کر مرجبا اور احسنت پڑھتا ہے۔ شعر.....

اک ہم ہی تیری چال سے پستے نہیں صنم
پامال کبک بھی تو ہوئے کوہسار میں

اب میں علماء شیعہ کے اقوال مختلفہ کو بیان کرتا ہوں:

پہلا قول:..... بعض متعصب شیعوں نے اس نکاح کے ہونے ہی سے انکار کیا ہے

اور اس روایت کو بے اصل محض کہہ کر اپنا دامن چھوڑا ہے، جیسا کہ مجتہد صاحب ^۱ قبلہ و کعبہ اپنے ایک رسالہ میں لکھتے ہیں:

((و انتساب تزوج حضرت ام کلثوم بابت الخطاب بہ ثبوت

نرسیدہ و مثل سید مرتضیٰ کہ قریب العهد از زمان ائمہ

معصومین بود و غیر ایشان انکار بلیغ ازاں نمودہ اند.))

”عمر بن الخطاب سے ام کلثوم بنت فاطمہ کے عقد ہونے کا ثبوت مہیا نہیں ہوا

اور ائمہ معصومین کے زمانہ سے قریب جناب سید مرتضیٰ وغیرہ نے اس نکاح کے

وجود سے قطعی انکار کیا ہے۔“

لیکن مجتہد صاحب کا یہ دعویٰ چند دلائل سے غلط معلوم ہوتا ہے:

پہلی دلیل:..... جناب قبلہ و کعبہ کا یہ ارشاد فرمانا کہ جناب سید علی المرتضیٰ نے جو کہ

ائمہ کے زمانے سے قریب تھے نکاح کے ہونے سے انکار کیا ہے صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ سید

مرتضیٰ دو ہیں ایک ابوالقاسم ثمانینی برادر رضی، دوسرا سید مرتضیٰ رازی صاحب ”تبصرۃ

العوام“ پہلے سید صاحب تو قدمائے متکلمین اور فقہائے شیعہ سے ہیں اور شہید ثالث کی تحریر

کے موافق جو مجالس المؤمنین میں کی ہے۔ ۳۵۵ھ میں پیدا ہوئے اور دوسرے میر صاحب ان

سے بہت پیچھے ہوئے ہیں۔ پس وہ سید مرتضیٰ جن کی نسبت مجتہد صاحب فرماتے ہیں:

”قریب العهد از زمان معصومین بود“ روایت نکاح کے منکر نہیں ہیں اور ان کی تالیفات مثل

”شافی“ اور ”تنزیہ الانبیاء والائمہ“ اس پر شاہد ہیں، معلوم نہیں کہ ان کی طرف انکار روایت

نکاح کو مجتہد صاحب نے کیوں کر منسوب فرمایا..... اور اگر دوسرے سید مرتضیٰ مراد ہیں اور

شاید انہوں نے انکار کیا ہو تو ان کی نسبت اس فقرہ کا مضمون کہ ”قریب العهد از زمان معصومین

بود“ صحیح نہیں ہوتا..... اب ہم ان سید مرتضیٰ کی تالیفات کو جو کہ زمانہ معصومین کے قریب تھے مجتہد صاحب کے قول کی تکذیب کے لیے پیش کرتے ہیں۔

واضح ہو کہ سید صاحب موصوف نے دو کتابوں میں اس کا ذکر کیا ہے ایک کتاب ثانی میں مفصلاً اور دوسرے ”تنزیہ الانبیاء والائمة“ میں مجملاً۔ چنانچہ ہم ”نزہہ اثنا عشریہ“ سے جو ”تحفہ“ کا جواب ہے ان کے قول کو نقل کرتے ہیں:

((سید مرتضیٰ علم الہدی در کتاب تنزیہ ۱ الانبیاء می فرماید: فَأَمَّا اِنْكَاحُهُ فَقَدْ ذَكَرْنَا فِي كِتَابِ الشَّافِي الْجَوَابُ عَنْ هَذَا لِبَابِ مَشْوُوحًا وَبَيْنَا أَنَّهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مَا أَجَابَ عُمَرَ إِلَى نِكَاحِ ابْنَتِهِ إِلَّا بَعْدَ تَوْعُّدٍ وَتَهْدِيدٍ وَمَرَّاجِعَةٍ وَمُنَازَعَةٍ وَكَلَامٍ طَوِيلٍ مَا شُورَ اشْفَقَ مَعَهُ مِنْ سُوءِ الْحَالِ وَظُهُورِ مَا لَا يَزَالُ..... الخ))

”سید مرتضیٰ اپنی کتاب ”تنزیہ الانبیاء“ میں فرماتے ہیں کہ عمر کا نکاح ام کلثوم کے ساتھ (جس کو اہل سنت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں شمار کرتے ہیں) جواب ہم نے اپنی کتاب ثانی میں بہ تفصیل دیا ہے اور وہاں ہم نے بیان کیا ہے کہ حضرت امیر نے عقد اپنی بیٹی کا عمر کے ساتھ بہ طیب خاطر قبول نہیں فرمایا بلکہ یہ عقد بعد اس کے ہوا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے بار بار بلکہ یہ عقد بعد اس کے ہوا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے بار بار حضرت امیر سے درخواست کی اور نوبت منازعت اور تخویف و تہدید کی پہنچی۔ جب حضرت امیر نے دیکھا کہ کار دین و ملت فاش ہوتا ہے اور دامن تقیہ ہاتھ سے نکالا جاتا ہے اور حضرت عباس نے بھی بخیاں فتنہ و فساد کے سمجھایا تب بلا رضا اور بغیر اختیار کے جناب امیر نے یہ نکاح کر دیا۔“

تب بلا رضا اور بغیر اختیار کے جناب امیر نے یہ نکاح کر دیا۔

فقط اس تحریر کو سید مرتضیٰ کی کوئی شخص جناب قبلہ و کعبہ کی تحریر سے ملاوے اور اس فقرے کو کہ ”مثلاً جناب سید مرتضیٰ کہ قریب العهد از زمان ائمہ معصومین بود انکار بلیغ ازاں نمودہ“ تنزیہ الانبیاء کی عبارت مذکورہ سے مقابل کر کے جناب اجتہاد مآب کی صداقت کی داد دے۔ اگر کوئی شخص اس تحریر پر بھی مجتہد صاحب کی صداقت پر شبہ نہ کرے تو خود ان کے والد ماجد کی زبان سے ہم ان کا جھوٹ ثابت کرتے ہیں..... جناب مولوی دلدار علی صاحب قبلہ ”مواعظ حسینیہ“ میں فرماتے ہیں کہ سید مرتضیٰ نے فرمایا ہے کہ تزویج ام کلثوم حضرت امیر کے اختیار سے نہیں ہوئی، اور بہت سی احادیث انہوں نے اس قول کے ثبوت میں بیان کی ہیں اور جب کہ باختیار حضرت امیر کے نکاح کا ہونا ثابت نہیں ہوا تو پھر محل اشکال باقی نہ رہا، چنانچہ حاصل کلام ”مواعظ حسینیہ“ کا کما نقلہ فی ازالة الغین یہ ہے۔

((سید مرتضیٰ گفتہ ست کہ تزویج ام کلثوم باختیار حضرت امیر واقع نشدہ و احادیث بسیار مؤید قول خود ذکر کردہ و ہر گاہ باختیار حضرت امیر واقع نشد محل اشکال نیست.))

”سید مرتضیٰ نے کہا ہے کہ ام کلثوم کا نکاح حضرت امیر کے اختیار سے نہیں ہوا اور بہت سی احادیث اپنے قول کی تائید میں ذکر کی ہیں اور جب حضرت امیر کے اختیار سے نکاح نہ ہوا تو جائے اعتراض نہیں۔“

پس ان تحریرات سے صاف ظاہر ہے کہ بے چارہ سید مرتضیٰ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نکاح کا منکر نہیں ہے بلکہ اس کا ہونا قطعی اور یقینی جانتا ہے ہاں اس کا ہونا بخوشی خاطر جناب امیر کے اور برضا مندی ان کے بیان نہیں کرتا اور یہ امر آخر ہے اور انکار اصل واقعہ کے وقوع سے دوسرا امر ہے۔ مگر قربان صداقت پر جناب قبلہ و کعبہ کی کہ ایسے دعویٰ کے کرنے میں جس کا غلط ہونا محتاج بیان نہیں ہے، بایں تقدس و اجتہاد کا کچھ لحاظ و خیال نہ فرمایا۔

غرض کہ یہ قول مجتہد صاحب کا کہ سید مرتضیٰ نے وقوع نکاح سے انکار کیا ہے خود سید

مرٹضیٰ کی تحریر سے اور خود ان کے والد ماجد کی تحریر سے غلط ثابت ہوا، لیکن ان کا یہ قول کہ سوائے ان کے اوروں نے بھی انکار کیا ہے کسی قدر صحیح ہے، چنانچہ منجملہ منکرین اس قصے کے اگلے علماء شیعہ میں سے ایک قطب الاقطاب راوندی مولف خراج و جراح ہیں کہ انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ اس نکاح کا ہونا پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتا، چنانچہ ان کے قول کو جناب مجتہد صاحب قبلہ نے کتاب مواعظ حسینہ میں نقل کیا ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے جس کو ہم ”ازالۃ الغین“ سے نقل کرتے ہیں:

((گفت عرض نمودم بخدمت حضرت صادق علیہ السلام کی مخالفین بر ما حجت می آرندو میگویند کہ چرا علیؑ دختر خود را بخلیفہ ثانی داد پس حضرت صلوات اللہ علیہ کہ تکیہ کردہ نشستہ بودند درست نشستہ فرمودند کہ آیا چنین حرفہامی گویند بدرستی کہ قوم چینی زعم می کنند لا یہتدون سوا السبیل .))

”کہا کہ میں نے حضرت جعفر صادق سے عرض کیا کہ سنی ہم پر حجت لاتے اور کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے اپنی بیٹی خلیفہ ثانی کو کیوں دی! تو حضرت جو تکیہ لگائے ہوئے تھے سیدھے بیٹھے اور فرمایا کیا لوگ یہ باتیں کرتے ہیں۔ جو لوگ ایسا خیال کرتے ہیں وہ راہِ راست نہیں پاسکتے ہیں۔“

لیکن قطب الاقطاب صاحب کا یہ دعویٰ سراسر باطل ہے اور بروایات ائمہ کرام نکاح کا ہونا ثابت ہے، چنانچہ ہم اس کو ان کی کتب احادیث اور فقہ اور کلام سے ثابت کرتے ہیں۔



حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے نکاح کا ثبوت

پہلا ثبوت: قاضی نور اللہ شوستری نے ”مجالس المؤمنین“^۱ میں اس نکاح کا اقرار کیا ہے اور ان لفظوں سے اس کی صحت کو ظاہر فرمایا ہے:

((اگر نبی دختر بہ عثمان داد ولی دختر بہ عمر فرستاد))

”اگر نبی ﷺ نے اپنی لڑکی کا نکاح عثمان رضی اللہ عنہ سے کیا تو علی رضی اللہ عنہ نے اپنی

لڑکی کا نکاح عمر رضی اللہ عنہ سے کر دیا۔“

دوسرا ثبوت: شراعی جو مشہور کتب فقہی شیعہ سے ہے اس کا شارح ابوالقاسم

متمی شرح شراعی میں جس کا نام مسالک^۲ ہے صاحب شراعی کے اس قول کے تحت ”یَجُوزُ

نِكَاحِ الْعَرَبِيَّةِ بِالْعَجَمِيِّ وَالْهَاشِمِيَّةِ غَيْرِ الْهَاشِمِيِّ وَبِالْعَكْسِ“ فرماتا ہے:

① مجالس المؤمنین صفحہ ۸۵ تذکرہ مقداد بن اسود طبع قدیم ایرانی تختی کلاں - ۱۲

② ابوالقاسم متمی شیخ زین الدین احمد العالمی المعروف الشہید الثانی نے ۹۶۲ھ میں شراعی الاسلام کی ”مسالک الافہام“

کے نام سے نہایت معتبر شرح لکھی ہے وہاں پر محقق الحلی المتوفی ۶۷۶ھ کی مذکورہ بالا عبارت کی شرح کرتے ہوئے

شہید ثانی نے پانچ عدد رشتوں کا بطور فقہی استدلال کے ذکر کیا ہے جس میں ایک رشتہ حضرت ام کلثوم کا بھی ہے عربی

عبارت یہ ہے: (وَزَوْجِ النَّبِيِّ ابْنَتُهُ عَثْمَانَ وَزَوْجِ ابْنَتِهِ زَيْنَبَ بَابِي الْعَاصِ بْنِ رَبِيعٍ وَكَيْسَا مِنْ بَنِي

هَاشِمٍ وَكَذَلِكَ زَوْجِ عَلِيٍّ ابْنَتَهُ أُمَّ كَلْثُومَ مِنْ عُمَرَ وَتَزَوَّجَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ وَبَنِي عَثْمَانَ فَاطِمَةَ

بِنْتِ الْحُسَيْنِ وَتَزَوَّجَ مُصْعَبُ بْنُ الزُّبَيْرِ أُخْتَهَا سَكِينَةَ وَكُلُّهُمْ مِنْ غَيْرِ بَنِي هَاشِمٍ-) ”مسالک

الافہام“ شرح ”شراعی الاسلام“ کتاب النکاح، باب لواحق العقد، جلد اول مطبوعہ ایران، سن طباعت ۱۲۷۳ھ۔“

مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی صاحبزادی کا نکاح عثمان بن عفان سے کر دیا تھا اور اپنی دختر کا نکاح ابو

العاص بن الربیع سے کر دیا تھا حالانکہ دونوں بنی ہاشم سے نہ تھے۔ اسی طرح حضرت علیؑ نے اپنی دختر ام کلثوم کا نکاح عمر بن

الخطاب سے کر دیا تھا اور عبداللہ بن عمرو بن عثمان کے ساتھ فاطمہ بنت حسین کی شادی ہوئی اور ان کی بہن سکیکہ بنت الحسین

کی شادی مصعب بن زبیر سے ہوئی۔ بنی ہاشم کے یہ سب رشتے غیر بنی ہاشم میں ہوئے۔ ۱۲۔ (شیخ محمد فراست)

((زَوْجَ عَلِيٍّ بِنْتَهُ أُمَّ كَلْثُومٍ مِنْ عُمَرَ .))

”کہ نکاح کیا علیؑ نے اپنی بیٹی ام کلثومؑ کا عمرؑ کے ساتھ۔“

تیسرا ثبوت:..... ابوالحسن علی بن اسماعیل شیعہ اثنا عشری جس کی نسبت امام اعظم امامیہ کے ”خلاصۃ الاقوال“ میں فرماتے ہیں کہ وہی پہلا شخص ہے جس نے علماء کلام کے قاعدہ کے موافق مذہب اہل بیت کے اثبات میں گفتگو کی ہے، وہ بھی اس نکاح کے ہونے کا مقرر ہے۔ چنانچہ اس کے اس قول کو قاضی نور اللہ شوستری نے ”مجالس المؤمنین“ میں نقل کیا ہے اور ہم ”ازالۃ الغین“ سے اس کو نقل کرتے ہیں:

((اور از چند امر پر سیدند کہ از انجمله مقدمہ نکاح خلیفہ

ثانی است جواب داد کہ دادن دختر بہ عمرؑ کہ جناب امیرؑ

المومنین را اتفاق افتاد باین جهت بود کہ اظهار شہادتین

مینمود و زبان اقرار بہ فضیلت رسول می کشود و در اں باب

اصلاح غلظت و فظاظت اُونیز منظور بود .))

”ان سے چند باتیں پوچھیں ان میں سے ایک خلیفہ ثانی کے نکاح کا معاملہ ہے

جواب دیا کہ جناب امیر المؤمنینؑ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی لڑکی اس وجہ سے بیاہ

دی کہ عمر رضی اللہ عنہ کلمہ پڑھتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی فضیلت کا اقرار کرتے

تھے۔ دوسرے لڑکی دے کر ان کی سخت مزاجی اور تن فن کی اصلاح کرنا منظور تھی۔“

چوتھا ثبوت:..... ”مجالس المؤمنین“ میں لکھا ہے کہ بعد وفات حضرت عمر رضی اللہ عنہ

کے ام کلثوم کا دوسرا نکاح محمد بن جعفر طیار کے ساتھ ہوا، و ہذہ عبارتہ:

((محمد بن جعفر الطیار بعد از فوت عمر بن خطاب بشرف

مصاہرت حضرت امیر المؤمنین مشرف گشتہ ام کلثوم را

کہ از روی اکراه در حبالہ عمر بود تزویج نمود .))

”محمد بن جعفر طیار، عمر بن خطابؓ کے انتقال کے بعد امیر المومنین کے شرف دامادی سے مشرف ہوئے، ام کلثومؓ سے جو کہ بہ جبر و اکراہ عمر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں شادی کی۔“

پانچواں ثبوت:..... تہذیب میں جو نہایت معتبر کتاب حدیث کی مذہب امامیہ میں ہے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کی اولاد ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے لطن سے ہوئی اور ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام زید بن عمر تھا اور یہ روایت ائمہ کرام کی سند سے اس محدث نے بیان کی ہے، کما قال:

((عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ أَحْمَدَ بْنِ يَحْيَى عَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدِ الْقُمِيِّ عَنِ الْقَدَاحِ جَعْفَرِ عَنْ أَبِيهِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ قَالَ مَاتَ أُمُّ كَلْثُومِ بِنْتِ عَلِيٍّ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَابْنُهَا زَيْدُ بْنُ عُمَرَ ابْنِ الْخَطَّابِ فِي سَاعَةٍ وَاحِدَةٍ وَلا يَدْرِي أَيُّهُمَا هَلَكَ قَبْلَ فَلَمْ تُورَثْ أَحَدُهُمَا مِنَ الْآخِرِ صَلَّى عَلَيْهِمَا جَمِيعًا.)) ❶

”جعفر اپنے آباء (ائمہ) علیہم السلام سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: ام کلثومؓ بنت علی علیہ السلام اور ان کے بیٹے زید بن عمرؓ بن خطاب کا ایک ہی وقت ساتھ ساتھ انتقال ہوا اور یہ تک نہ معلوم ہو سکا کہ پہلے کس کا انتقال ہوا، اس لیے ان میں سے کوئی ایک دوسرے کا وارث نہ ہوا ان پر درود و سلام ہو۔“

چھٹا ثبوت:..... قول سید مرتضیٰ کا جو شافی اور ”تنزیہ الانبیاء“ میں لکھا ہے اور جس کو کشمیری نے اپنی کتاب ”نزہتہ“ میں بجواب ”تحفہ“ کے اور مجتہد صاحب نے ”مواعظ حسینیہ“ میں نقل کیا ہے اور جس کو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں:

((أَنَّ عَلِيًّا مَا أَجَابَ عُمَرَ إِلَى نِكَاحِ ابْنَتِهِ إِلَّا بَعْدَ تَوَعُّدٍ وَتَهْدِيدٍ.))

”کہ امیر المومنین علیؓ سے اپنی بیٹی کا نکاح کرنے پر ڈرانے دھمکانے

❶ تہذیب الاحکام آخری جلد کتاب المیراث صفحہ ۳۸۰ طبع قدیم ایرانی، باب میراث الغرقی و

کے بعد ہی راضی ہوئے۔“

ساتواں ثبوت:..... کتاب کافی میں ملا یعقوب کلینی لکھتے ہیں کہ کسی نے امام جعفر

صادق علیہ السلام سے اس نکاح کا حال پوچھا تو آپ نے جواب دیا:

((اِنَّ ذَالِكَ فَرَجٌ غُصْبِنَاهُ)) ❶

”کہ یہ ایک شرمگاہ تھی جو ہم اہل بیت سے غصب کی گئی۔“

آٹھواں ثبوت:..... ”مصائب النواصب“ میں لکھا ہے کہ محدثین کا اقرار ہے کہ یہ

نکاح جبر و اکراہ سے ہوا۔

غرض کہ روایات نکاح حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا شیعہ کی کتب احادیث، اخبار، فقہ اور کلام میں اس کثرت سے مذکور ہیں کہ کسی طرح پر اس سے انکار نہیں ہو سکتا اور ایسی متواتر خبر کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ اہل انصاف اس فرقے کے تعصب اور عناد کو دیکھیں اور ان کی کج بیانی کو ملاحظہ فرمائیں کہ باوجودیکہ خود ہی ائمہ کرام علیہم السلام سے اس روایت کی صحت کا اقرار کریں اور اپنی احادیث کی کتابوں میں سنداً اس کو روایت کریں اور اپنے فقہی مسائل کا اس سے استخراج فرمائیں اور نہ ایک شخص بلکہ ”خلفاء عن سلف و ابا عن جد“ بطور میراث کے اس روایت کی صحت بہ سند صحیح نقل کرتے آئیں اور اس کی توجیہات سے سیکڑوں ورق سیاہ کریں اور پھر بھی بعض حضرات غیرت اور انصاف کو چھوڑ کر بے ساختہ اس روایت کے غلط ہونے کا دعویٰ کریں اور اصل واقعے کے منکر ہو جائیں اور یہ خیال نہ کریں کہ اگر ایک دن یا ایک ہفتہ یا ایک مہینہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا نکاح میں حضرت عمرؓ کے رہتیں اور کسی کو خبر نہ ہوتی اور اس کی شہرت درجہ تو اتر تک نہ پہنچتی تو شاید کوئی موقع انکار یا تکذیب کا ہوتا، لیکن جب سالہا سال حضرت ام کلثومؓ زینت افزاء خانہ فاروق ہوئی ہوں اور تاحیات ان کے نکاح میں رہی ہوں اور ان سے اولاد بھی ہوئی ہو اور ان کے بیٹے کا نام بھی زید بن عمر بن خطاب رکھا

❶ فروع کافی جلد ۲ صفحہ ۱۴۱ کتاب النکاح، باب تزویج ام کلثومؓ۔ طبع نولکشور، لکھنؤ۔ ماہ

گیا ہو اور حضرت عمرؓ کے مرنے کے بعد ان کا نکاح محمد بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے ہوا ہو تو ایسے متواتر اخبار کو کون چھپا سکتا ہے اور آفتاب روشن کو کف دست سے کون پوشیدہ کر سکتا ہے؟ ہم نے یہ جو کچھ بیان کیا اس میں نہ اپنے عالموں کے اقوال کو نقل کیا ہے نہ اپنی کتابوں کی سند لائے ہیں..... جو کچھ حضرات شیعہ نے فرمایا اور جو کچھ ان کے محدثین اور علماء نے تحریر کیا وہی ہم نے نقل کیا اور اسی سے نکاح کا ثبوت دیا، پس اگر باوجود اس ثبوت کے بھی کوئی اس نکاح سے انکار کرے تو وہ تواتر کا منکر ہے۔

دوسرا قول:..... جب علماء اعلام شیعہ نے دیکھا کہ اس روایت سے انکار کرنا آفتاب پر خاک ڈالنا ہے اور اس کو غلط اور جھوٹ کہنا مقولہ ”دروغ گویم بروے تو“ پر عمل کرنا ہے، اس لیے اس کی توجیہ پر توجہ فرمائی اور دوسرے طور سے اس فضیلت کے ابطال پر کمر ہمت باندھی، اگرچہ ان بزرگوں نے نہایت ہی سعی و کوشش کی اور ہر طرح کی توجیہ و تاویل فرمائی لیکن اس سے بجائے فائدے کے نقصان ہی ہوتا گیا اور بعض قائم رہنے اصول مذہب تشیع کے اس میں خلل ہی بڑھتا گیا، کاش! وہ انکار ہی کرتے جاتے اور گوان کے محدثین و علماء جھوٹے ہوتے بلا سے مگر کبھی اس کی صحت کا اقرار نہ فرماتے تو بہتر ہوتا، اس لیے کہ جو توجیہات اس نکاح کے معاملہ میں کی گئی ہیں ان کے دیکھنے سے ہر شخص مذہب تشیع سے نفرت کرتا ہے اور ان کے سننے سے ہر مسلمان کے دل میں غیرت کا ایک جوش پیدا ہوتا ہے اور طرفہ یہ ہے کہ جتنی زیادہ توجیہات کرتے ہیں اور جس قدر زیادہ تاویلات بیان فرماتے ہیں ان سے انہیں کے اصول و عقائد کی برائی کا اور ثبوت ہوتا جاتا ہے، شعر.....

مریض عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اور زیادہ تر تعجب اس پر ہے کہ باوجود اس کے کہ خود ان کے دلوں میں اس کا یقین ہے کہ یہ توجیہات باطل اور تاویلات لاطائل ان کے دین کی برائی ثابت کرنے والی اور لوگوں کو ان کے مذہب سے نفرت دلانے والی ہیں مگر بایں ہمہ علم و فضل اس سے باز نہیں رہتے اور

بایں تقدس واجتہاد (هل من مزید هل من مزید) کہہ کر اور بڑھاتے جاتے ہیں اور اپنے معائب کو ظاہر کرتے جاتے ہیں۔ ہم کو ان کے علماء اور فضلاء کی تقریروں اور تحریروں کو دیکھ کر نہایت ہی حیرت ہوتی ہے کہ بار خدایا ان کی عقل پر کیسا پردہ پڑ گیا، ان کی حیا اور غیرت کو کون لے گیا کہ ایسے بے غیرتی کے کلمات زبان پر لانے سے شرم نہیں کرتے اور ایسے عار و ننگ کی باتوں کو ائمہ کی طرف منسوب کرنے سے لحاظ نہیں فرماتے، دین محمدی ﷺ کو تو خراب کر ہی چکے مذہب اسلام کو بھی بگاڑ چکے، اصحاب نبیؐ کو کافر اور منافق کہہ چکے ایک اہل بیت رہ گئے تھے جن کی مزید محبت کا دعویٰ کرتے تھے، جن کے فضائل کا اقرار فرماتے تھے اس کو بھی در پردہ کھودیا، ان کے فضائل کو بھی ایسی بے غیرتی کے کلمات کو ان کی طرف منسوب کر کے معائب سے بدل دیا اور یہ سب کچھ تو کر چکے اور ہنوز ایمان کے دعویٰ میں ثابت قدم ہیں، معلوم نہیں کہ ان کا ایمان اور محبت کیا کیا رنگ دکھلائے گی، شعر.....

دل بردی و دیں و جانِ شیریں
وین طرفہ کہ باز در کمینے

”دل، دین اور جان عزیز سب تو لے گیا اس پر طرفہ یہ کہ پھر بھی گھات میں لگا ہوا ہے۔“
اب ہم اس قول کو بیان کرتے ہیں جو حضرات شیعہ نے بعد قبول کرنے صحت نکاح کے ارشاد فرمایا ہے اور اس کو ائمہ کرام کی طرف (حاشا جنابہم عن ذالک) منسوب کیا ہے۔ وہ قول یہ ہے کہ حضرات فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح جناب امیر کی رضا اور خوشی سے نہیں ہوا بلکہ عمر فاروقؓ نے جناب امیرؓ کو تنگ کیا اور ان کو ڈرایا اور ہر قسم کا خوف دیا اور ان پر نہایت درجہ تشدد کیا یہاں تک کہ قریب تھا کہ نوبت خون ریزی تک پہنچے تب حضرت عباس پیغمبر خدا ﷺ کے چچا نے حضرت امیر علیہ السلام کو دبا کر فتنہ و فساد نہ ہونے کے خیال سے یہ نکاح کر دیا۔ پس اس نکاح سے عمر رضی اللہ عنہ کی برائی ثابت ہوتی ہے..... چنانچہ اس قول کے ثبوت میں ہم چند سندیں علماء شیعہ کی بیان کرتے ہیں۔

پہلی سند:..... سید مرتضیٰ علم الہدی کتاب ”تنزیہ الانبیاء“ میں فرماتے ہیں:

((فَأَمَّا إِنكاحُهُ فَقَدْ ذَكَرْنَا فِي كِتَابِ الشَّافِيِّ الْجَوَابَ عَنْ هَذَا الْبَابِ .))
 یعنی حضرت امیر علیہ السلام نے اپنی بیٹی کا نکاح عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ منظور نہیں کیا مگر بعد اس کے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے اُن کو دق کیا، ڈرایا اور جھگڑا کیا، جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ فتنہ و فساد ہوا چاہتا ہے تب حضرت امیرؓ سے اس کام کو اپنے اختیار میں لے لیا اور ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کر دیا۔“ اور یہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ شرع میں ہرگز ممنوع نہیں ہے کہ بہ جبر واکراہ لڑکی کا نکاح اس شخص کے ساتھ کر دیا جائے جس کے ساتھ حالت اختیار میں جائز نہ ہوتا، خصوصاً عمر رضی اللہ عنہ جیسے آدمی کے ساتھ کہ وہ اسلام بھی ظاہر کرتا تھا اور تمام شریعت کا پابند تھا۔

دوسری سند:.....”مواعظِ حسینہ“ میں مجتہد صاحب فرماتے ہیں، کما نقل فی

ازالة الغین:

((کہ تزویج ام کلثوم باختیار حضرت امیر واقع نشد، الی قوله بالفرض اگر باختیار ہم باشد عقل این راقبیح نمی داند کہ نکاح با مخالفین جائز باشد بلکہ عقل تجویز میکند کہ حضرت حق تعالیٰ مباح سازد برائے ما نکاح کردن را با کفار چہ قیاحت نکاح با کفار عقلے نیست مثل قباحت ظلم و قتل و امثال آن و چہ گو نہ عقلے باشد و حالانکہ معلوم ست کہ پیغمبر خدا ﷺ دختر خود را با کفار تزویج کرده دھر گاہ حقیقت حال چنین باشد پس چہ قباحت ست درینکہ جناب امیر علیہ السلام تزویج نمایند دختر خود را با کسیکہ بہ ظاہر مسلمان باشد .))

”حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی شادی جناب امیرؓ کے اختیار سے نہیں ہوئی اور اگر بالفرض اختیار مان بھی لیا جائے تب بھی عقل اسے فتیح و نازیبا نہیں جانتی کہ

مخالفین سے نکاح ناجائز ہو بلکہ عقلاً جائز ہے کہ اللہ نے ہمارے لیے کافروں سے نکاح کو مباح و درست قرار دیا ہے کیونکہ کفار کے ساتھ نکاح کرنے میں ظلم و قتل کی مانند کوئی قباحت عقلی نہیں ہے اور قباحت عقلی کیوں کر ہو سکتی ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی خود کافر سے بیاہی اور جب کہ یہ امر واقع ہے تو پھر اس میں کون سی قباحت ہے کہ جناب امیرؓ نے اپنی صاحبزادی (ام کلثومؓ) کی ان سے شادی کی جو بظاہر مسلمان تھے۔“

تیسری سند: قاضی نور اللہ شوستری ”مصائب النواصب“ میں لکھتے ہیں کہ صاحب استغاثہ فرماتے ہیں کہ ایک مخالف نے پوچھا کہ کیا سبب ہے کہ امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے اپنی بیٹی کا نکاح عمر بن خطاب سے کر دیا، ہم کہتے ہیں کہ ہم کو خبر دی ہے ایک جماعت نے ہمارے مشائخ ثقات سے جن میں جعفر بن محمد بن مالک کوفی ہیں، انہوں نے احمد بن فضل سے انہوں نے محمد بن ابی عمیر سے، انہوں نے عبداللہ بن سنان سے کہ میں نے سوال کیا امام جعفر سے نکاح ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی بابت، انہوں نے جواب دیا کہ (إِنَّ ذَٰلِكَ فَرَجٌ غُصْبِنَاهُ) کہ یہ ایک فرج ہے جو ہم سے غصب کی گئی ہے اور یہ خبر مناسب اس خبر کے ہے جس کو ہمارے مشائخ نے بابت نکاح ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے ساتھ عمر رضی اللہ عنہ کے روایت کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے (حضرت) عباسؓ کو حضرت علیؓ کے پاس بھیجا اور درخواست کی کہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح ان کے ساتھ کر دیا جائے، حضرت امیرؓ نے انکار کیا، جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ یہ خبر عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لائے تب عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر علی رضی اللہ عنہ اپنی بیٹی کا نکاح میری ساتھ نہ کریں گے تو ان کو قتل کر دوں گا، تب پھر حضرت عباس رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ انہوں نے تب بھی انکار کیا، یہاں تک کہ آخر حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اگر تم نکاح نہیں کرتے ہو میں کیسے دیتا ہوں اور تم کو قسم دیتا ہوں کہ میرے قول و فعل کے خلاف نہ کرنا اور یہ کہہ کر حضرت عباس رضی اللہ عنہ عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور کہا کہ تمہارا نکاح ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہوا جاتا ہے، پھر عمرؓ نے آدمیوں کو جمع کیا اور

کہا کہ یہ عباس رضی اللہ عنہ علی رضی اللہ عنہ کے چچا ہیں اور علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی ام کلثوم رضی اللہ عنہا پر ان کو اختیار دیا ہے، اور ان کے ساتھ میرا نکاح کر دینے کی اجازت دی ہے، پس حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کر دیا اور تھوڑی مدت کے بعد ان کو عمر رضی اللہ عنہ کے گھر بھیج دیا۔ فقط!

اس روایت کو لکھ کر قاضی صاحب اسی کتاب میں فرماتے ہیں کہ اصحاب حدیث اس روایت کو قبول نہیں کرتے لیکن ان کے درمیان اس میں اختلاف نہیں ہے کہ عباس رضی اللہ عنہ نے بہت سے جھگڑوں اور قصوں کے بعد ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کر دیا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ جس کسی نے اس حکایت سے انکار کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ نہیں کیا مگر بہ سبب اس کے کہ جسے ہمارے مشائخ نے روایت کیا ہے اور وہ مطابق اس روایت کے ہے جو کہ امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضرت امام نے فرمایا: (إِنَّ ذَلِكَ فَرَجٌ غُصْبِنَاهُ) ”کہ یہ ایک شرم گاہ ہے جو ہم سے غصب کی گئی۔“ ❶

❶ یہ اردو ترجمہ ہے قاضی نور اللہ شوستری کے کلام کا اور فارسی ترجمہ اس کا علی ماہوند کور فی ازالۃ الغمین یہ ہے: ”و صاحب استغاثہ گفتہ کہ قائلے از اہل خلافت گفتہ کہ علت چہیست در تزویج امیر المومنین علیہ السلام ابنۃ خود را بعمر بن الخطاب و مامی گوئیم کہ خبر دادہ اند مارا جماعتے از مشائخ ثقات از ایشان جعفر بن محمد بن مالک کوفی ست از احمد بن فضل از محمد بن ابی عمیر از عید اللہ بن سنان گفت سوال کردم جعفر بن محمد صادق را علیہ السلام از تزویج عمر از ام کلثوم پس گفت این اوّل فرجے ست کہ غصب کردہ شد از ماو این خبر مشکلی آن خبریست کہ روایت کردہ اند آن را مشائخ مادر تزویج عمر از ام کلثوم و آن این ست کہ در خبرست کہ عمر عباس را نزد علی فرستاد و سوال کرد کہ تزویج کندام کلثوم باؤ پس آنحضرت امتناع کرد و چون عباس باز گشت و خبر امتناع علی علیہ السلام بہ عمر رسانید پس عمر گفت اے عباس آیا تانف میکند علی از تزویج من واللہ اگر تزویج نکنند اور اخو اہم کشت، پس عباس باز آمد بسوی علی و آنحضرت در مقام امتناع افتاد پس خبر داد عباس عمر را و گفت اے عباس حاضر شوروں جمعہ در مسجد و قریب بہ منبر باش و بشنو آنچه مذکور خواہد شد پس خواہی دانست کہ من قادرم بر قتل او اگر ارادہ کنم پس حاضر شد عباس در مسجد چون عمر از خطبہ فارغ شد گفت ای مردم د رینجا مردی از اصحاب رسول خدا ﷺ

الحاصل ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی خوشی سے نکاح نہیں کیا بلکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے زبردستی نکاح کر دیا، لیکن یہ قول چند دلیلوں سے باطل ہے۔

پہلی دلیل: اگر ہم تسلیم کریں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود نکاح نہیں کیا بلکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو اختیار دے دیا اور انہوں نے نکاح کر دیا لیکن اس سے اصل نکاح کے ہونے میں کچھ شبہ نہ رہا۔ اگر حضرت امیر ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے باپ تھے تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے دادا ہوتے تھے اگر باپ نے نکاح نہ کیا نہ سہی ان کی اجازت سے دادا نے نکاح کر دیا اصل مطلب جو ہم ثابت کرتے ہیں ثابت ہو گیا۔

دوسری دلیل: حضرت عمر رضی اللہ عنہ لائق زوجیت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے تھے یا نہ تھے، اگر لائق زوجیت کے نہ تھے تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور جناب سید الانبیاء کے چچا تھے ان پر معاذ اللہ! سخت الزام عائد ہوتا ہے کہ انہوں نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کی بیٹی، پیغمبر خدا ﷺ کی نواسی کا نکاح ایسے شخص کے ساتھ کر دیا جو کہ زوجیت کی صلاحیت نہیں

◀◀◀ کہ زنا کردہ واو محصن است مطلع شدہ برآں امیر المومنین تنہا شمادریں یاب چہ می گوئید پس مردم از ہر جانب گفتند کہ ہر گاہ امیر المومنین اطلاع یافتہ شدہ چہ حاجت ست کہ مطلع شود برآں غیر او باید کہ امضا کند حکم خدارادرو چون از مسجد باز آمد عباس گفت برو نزد علی و معلوم او کن آنچه شیندی پس اگر و اللہ نکند من میکنم پس عباس نزد علی رفت و آنچه شنیدہ بود بسمع آنحضرت رسانید علی فرمود من می دانم کہ این نزد او آسان ست و من نیستم کہ بکنم آنچه او التماس می کند پس عباس گفت اگر نمی کنی من میکنم و قسم می دہم ترا کہ مخالف قول و فعل مانمائی پس عباس نزد عمر رفت و گفت کہ میکند آنچه ارادہ کردہ پس جمع کرد عمر مردم راو گفت ابن عباس رضی اللہ عنہما عم ابی طالب ست واوامر ابنتہ خود ام کلثوم را بادراجع کردہ و امر کردہ اورا کہ تزویج کنداز برای من پس تزویج نمود عباس رضی اللہ عنہما و بعد از اندک مدتہ نزد عمر فرستاد، و اصحاب حدیث این روایت را قبول نکرده لیکن خلافیہ نیست کہ میان ایشاں درینکہ عباس تزویج نمودہ ام کلثوم رضی اللہ عنہما را بعمر بعد از طول مطالعہ و مدافعہ پس می گوئیم کسے را کہ انکار کردہ این حکایت را از فعل عمر آنکہ تزویج عباس ام کلثوم رضی اللہ عنہما را نبود مگر از جہت چیزے کہ روایت کردہ انداز مشائخ ما چنانچہ حکایت کردیم و این مشاکل روایتی ست کہ از صادق علیہ السلام کردہ اند کہ گفتہ کہ این اوّل فرجے ست کہ از ما غصب کردہ اند ۱۲۔

رکھتا تھا اور جو ایمان اور زہد و تقویٰ سے بھی بری تھا۔ پس جو الزام حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات پر (و حاشا جنابہ عن ذالک) اصول شیعہ کے موافق ہوتا ہے وہی حضرت عباس رضی اللہ عنہ ان کے چچا پر ہوگا۔

تیسری دلیل:..... وکیل اور مختار ہونا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا حضرت علیؑ کی طرف سے معاملہ تزویج میں ان روایات سے بھی ثابت ہوتا ہے پس شرعاً اور عرفاً فعل وکیل عین فعل موکل ہے، اس لیے جو فعل عباس رضی اللہ عنہ کا ہے وہی فعل حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سمجھنا چاہیے، پس گو یہ نکاح حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کر دیا ہو مگر جب کہ وہ وکیل اور مختار جناب امیر کے ہوئے تو یہ نکاح بہ اجازت جناب امیر کی سمجھنا چاہیے اور اگر حضرت علیؑ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو اجازت نہیں دی اور وکیل نہیں بنایا تو بلا اجازت ان کے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا وکیل اور مختار ہونا جائز نہ ٹھہرا اور اس سے سخت الزام حضرت عباس رضی اللہ عنہ پر آتا ہے اور غصب کرنے میں ان کا مددگار ہونا ثابت ہوتا ہے اور پھر نکاح کا بلا اجازت ولی کے ہونا لازم آتا ہے اور اس کا عدم جواز شرعاً و عرفاً ظاہر ہے اور اس سے جو کچھ نتیجہ حاصل ہوتا ہے وہ عقلاًء کو معلوم ہے۔

خدا حضرات شیعہ کو ذرا عقل و انصاف عطا فرمائے اور تھوڑی سی غیرت اور شرم عنایت کرے کہ وہ ان اقوال کے نتائج پر غور کریں اور جو جو خرابیاں ان میں ہیں ان پر نظر فرمائیں، بار خدایا! یہ اہل بیت کے کیسے دوست ہیں اور ان کی فضیلت و بزرگی کے کیسے قائل ہیں کہ ایسی باتیں ان کی طرف منسوب کرتے ہیں اور محبت کے پردے میں ان کی برائیاں بیان کرتے ہیں، خدا کے لیے کوئی انصاف کی آنکھ کھول کر دیکھے کہ وہ کیا کیا تہمتیں ائمہ کے اوپر کرتے ہیں اور ذرا گوشِ ہوش سے پنبہ غفلت نکال کر سنے کہ یہ حضرات کیسی برائیاں اہل بیت اطہار کی بیان کرتے ہیں (نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ هَفْوَاتِهِمْ وَمِنْ سُوْءِ عَقِيْدَتِهِمْ اَللّٰهُمَّ اَحْفِظْنَا مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِهِمْ وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِهِمْ .)

چوتھی دلیل:..... اگر ہم تسلیم کریں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دل سے راضی نہ تھے کہ نکاح ہو لیکن حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے سمجھانے سے راضی ہوئے اور وہ رضا مندی بھی کچھ خوشی

سے نہ تھی بلکہ مجبوری سے تو اس سے بھی وہی الزام حضرت علی رضی اللہ عنہ پر عائد ہوتا ہے جس کے بچانے کے لیے یہ بناوٹ کی گئی ہے، پس جان کے خوف سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے کہنے سے بہ مجبوری قبول کر لیا اور جان بچانے کے لیے عزت دینا گوارا فرمایا (ونعوذ باللہ من ذالك) اور اگر خوفِ جان نہ تھا تو ایسے معاملے میں جس میں عزت و آبرو کی ہتک ہوتی اور جس سے خاندانِ اہل بیت کو بٹھ لگے، حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا کہنا ماننا ضروری نہ تھا بلکہ لازم تھا کہ اپنے انکار پر اصرار فرماتے اور عباس رضی اللہ عنہ ہزار سمجھاتے ایک بات بھی ان کی نہ مانتے بلکہ صاف کہتے کہ چچا تم کو بایں بزرگی کیا ہوا ہے جو ایسی سفارش کرتے ہو اور ہمیشہ کے لیے اہل بیت اطہار میں داغ لگاتے ہو، عمر رضی اللہ عنہ ایک کافر یا منافق یا مرتد یا غاصب یا خائن ہے کیوں کر مجھ سے ہو سکتا ہے کہ اپنی بیٹی وہ بھی فاطمہ رضی اللہ عنہ کے بطن سے جس کی اولاد کو پیغمبر خدا ﷺ نے اپنی اولاد فرمایا ہے اور جس کے بیٹوں اور بیٹیوں کو سردار انبیاء ﷺ نے اپنا بیٹا اور بیٹی کہا ہے، ایک کافر یا منافق کو دے دوں اور پیغمبر خدا ﷺ اور فاطمہ زہرا کی روح کو ایذا دوں اور اگر عمر فاروق رضی اللہ عنہ نہ مانتے اور جبر کرنے ہی پر آمادہ ہوتے تو لازم تھا کہ اسد الہی دکھلاتے، ذوالفقار کو میان سے باہر نکالتے، عرش سے اتری ہوئی تلوار کے جوہر دکھلاتے، مرحب و انتر کی طرح غصب کرنے والوں کے ایک ایک وار میں دو دو ٹکڑے کرتے۔ آخر وہ تلوار جس نے جبرئیل امین کے پر کاٹے اور وہ ذوالفقار جس نے جعفر جتنی کے دو ٹکڑے کیے، کس دن کے لیے تھی اور وہ شجاعت و مردانگی جو بدر و حنین میں کفار کو دکھلائی، وہ قوت جو جنگِ خیبر میں ظاہر فرمائی کس روز کے واسطے رکھ چھوڑی تھی۔

برائے خدا کوئی اس عقل کے دشمن فرقے سے پوچھے کہ اس سے زیادہ شیر خدا کے حق میں دوسری ہتک اور بے حرمتی کی بات کیا ہوگی کہ ان کی بناتِ طیبات کو بہ جبر و اکراہ کافرو فاسق لینے پر مستعد ہوں اور شیر خدا، سرور اولیاء، سند الاصفیاء، سید اوصیاء، اسد اللہ الغالب، امام المشارق و المغرب امیر المؤمنین علی بن ابی طالب، کافروں کے قتل کرنے والے خیبر کے فتح کرنے والے دشمن کو ایک نگاہ میں ہلاک کرنے والے، ہزار جنوں کو ایک دودستی میں زیر و زبر

کرنے والے، جن کی ذات خدا کی قدرت کی نشانی، جن کا وجود اللہ کے جلال و عظمت کا نمونہ، جن کے نام سے کفارِ عجم لرزاں، جن کی صورت سے شجاعانِ عرب ترساں، کیسے علی خدا کے شیر، رسول ﷺ کے بھائی، بتول کے شوہر نامدار، حسنین کے پدر بزرگوار۔ اشعار.....

وصی	نبی جفت پاک	بتول	نبی کے وصی بتول	(فاطمہ رضی اللہ عنہا) کے شوہر
فروزندہ	شمع	دین رسول	دین رسول کی شمع	روشن کرنے والے
فشانندہ	جاں	براہِ خدا	خدا کی راہ میں	جان نچھاور کرنے والے
نمائندہ	کفر	از دین	کفر کو دین سے	جدا کرنے والے
درآرندہ	عمر	مرحب	زپای عمر	مرحب کو پچھاڑنے والے
برآرندہ	باب	خیبر ز	جای دروازہ	خیبر کے اکھاڑنے والے
رہانندہ	موسیٰ	عَلَيْهِ السَّلَام	از رود نیل	موسیٰ عَلَيْهِ السَّلَام کو دریائے نیل سے نجات دینے والے
دمانندہ	گل	زنارِ خلیل	(عَلَيْهِ السَّلَام)	نارِ خلیل عَلَيْهِ السَّلَام کو گل و گلزار بنانے والے
بساحل	رسانندہ	فلک	نوح	کشتی نوح کو کنارے پہنچانے والے
کشائندہ	با	بہائے	فتوح	فتوحات کے دروازے کھولنے والے
خواہ	او	جبرئیل	امیں	جبرئیل امیں ان کے خیر خواہ
بفرمان	او	آسمان	و زمیں	آسمان و زمیں ان کے تابع
نہ	کس	جز	نبی ہم	ترازوی او نبی ﷺ کے سوا کوئی ان کے ہم پلہ نہیں
قوی	دست	قدرت	ز بازوی او	دست قدرت کو ان کے بازووں سے قوت ملی ہو

بایں ہمہ شجاعت و ہیبت اور بایں جلال و عظمت ایک عمر رضی اللہ عنہ کے ڈرانے سے ڈر جائیں اور کچھ چون و چرانہ کریں اور عار و ننگ کو اپنے اوپر گوارا کر لیں اور بلا رضا مندی اپنے اس کے گھر اپنی بیٹی لخت جگر نور نظر کو جانے دیں۔ تف ایسے عقیدے پر اور نفیس ایسی تہمت پر۔ شعر

گر مسلمانی ہمیں ست کہ حافظ دارد

وای گراز پس امروز بود فردائی

”اگر یہی مسلمانی ہے جو حافظ رکھتا ہے تو افسوس اگر آج کے بعد کل ہو۔“

پانچویں دلیل:..... دیکھنے سے کتبِ معتبرہ شیعہ کے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت

عباس رضی اللہ عنہ صلاحیت و وکالت جناب امیر کی نہ رکھتے تھے کیوں کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک خوار و ذلیل تھے، اگرچہ ہمارا یہ لکھنا حضرات شیعہ کو ناگوار گزرے گا اور نا واقفوں کو باعث حیرت و تعجب ہوگا لیکن ہمارا قصور نہیں ہے، ہم یا ہمارے علماء معاذ اللہ! ان کی نسبت ایسا نہیں کہتے بلکہ حضرات شیعہ کے محدثین ان کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک خوار و ذلیل ہونا بیان کرتے ہیں..... چنانچہ علامہ طبرسی علماء شیعہ سے اپنی کتاب احتجاج میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

((ذَهَبَ مَنْ كُنْتُ أَعْتَصِدُ بِهِمْ عَلَى دِينِ اللَّهِ مِنْ أَهْلِ بَيْتِي وَ

بَقِيَتْ بَيْنَ حَضْرَ قَرِيْبَتِي الْعَهْدِ بِجَاهِلِيَّةٍ عَقِيْلٌ وَ عَبَّاسٌ))

”میرے اہل بیت کے وہ لوگ جاتے رہے جن کی قوت کا خدا کے دین میں

مجھے بھروسہ تھا اور اب صرف دو ذلیل و خوار قریب زمانہ جاہلیت کے رہ گئے ہیں،

یعنی عقیلؓ اور عباسؓ۔“ ①

پس حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کو ذلیل و خوار کہتے اور ان کو جاہل سمجھتے تو کیوں کر ایسے اہم معاملہ میں ان کو اپنا وکیل بناتے اور کس لیے ایسے بڑے معاملے میں ان کی بات سنتے اور کیوں ان کے کہنے پر چلتے..... شاید حضرات شیعہ نے اسی واسطے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اوپر بار نکاح کر دینے کا رکھ دیا ہے کہ وہ بقول مرتضوی خوار و ذلیل تھے، اسی واسطے ایسی ذلت کی باتیں کیا کرتے، مگر تعجب ہے حضرت امیر علیہ السلام سے کہ انہوں نے ایسے ذلیلوں کی بات کیوں سنی اور کیوں ان کے کہنے پر عمل فرمایا، یہ کوئی شیعہ خیال نہ کرے کہ فقط خوار و ذلیل کہہ

دینے پر جناب امیر نے قناعت کی ہے بلکہ اگر ان کی کتب معتبر سے ڈھونڈا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر نے اپنے اور پیغمبر ﷺ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ کو صاف گالیاں سنائی ہیں اور معاذ اللہ! ”توبہ توبہ نقل کفر کفر نہ باشد“ جناب امیر نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو ولد الزنا بتایا ہے اگر کسی کو شک ہووے وہ ”روضہ کلینی“ اور ”حیوة القلوب“ کو ملاحظہ کرے..... مولانا و بالفضل اولانا مولوی علی بخش خان صاحب اپنے ایک رسالہ میں اس کی نقل کرتے ہیں اس سے ہم منتخب کر کے مشتاقین کو سناتے ہیں، وھو ہذہ:

ملا باقر مجلسی نے ”حیوة القلوب“ میں لکھا ہے:

((ابو جعفر طوسی بسند معتبر روایت کردہ از امام صادق کہ فضیلہ مادر عباس کنیز مادر زبیر و ابوطالب و عبداللہ ابنائے عبدالمطلب بود، عبدالمطلب باو مقاربت کردہ کہ عباس ازاں بہم رسید، زبیر با عبدالمطلب دعویٰ کرد و پر خاش برآمد کہ این کنیز از مادر ما بما میراث رسیدہ است تو بے رخصت او با و مقاربت کردی و این فرزند کہ بہم رسید یعنی عباس بندہ ماست پس عبدالمطلب اکابر قریش را بہ شفاعت نزد وی فرستاد کہ تا آنکہ زبیر راضی شد کہ دست از عباس بردار و بشرطیکہ نامہ نوشتہ شود کہ عباس و فرزند انش در مجلسی کہ ما و فرزندان مانشتہ باشند نہ نشیند و در ہیچ امری با ما شریک نشود و حصہ نبرد پیش باین مضمون نامہ نوشتہ شد و اکابر قریش مہر کردند و این نامہ نزد ائمہ علیہم السلام بود.))

”جعفر طوسی نے معتبر اسناد کے ساتھ بحوالہ امام جعفر صادق تحریر کیا ہے کہ عباسؓ کی والدہ فضیلہ دراصل زبیر، ابوطالب، عبداللہ فرزندان عبدالمطلب کی والدہ کی

کنیز (لونڈی) تھیں، جن سے عبدالمطلب نے ہم بستری کی اور ان سے عباس رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔ زبیر نے اپنے والد عبدالمطلب سے بطور پر خاش کہا کہ یہ کنیز ہماری ماں کی ہے جو میراث میں ہمیں ملی ہے، آپ نے بغیر اجازت کے اس سے مقاربت کی لہذا ان کا جو بیٹا عباسؑ ہے وہ ہمارا غلام ہے، اس پر عبدالمطلب نے معززین قریش کو بیچ میں ڈالا تا آنکہ زبیر اس پر راضی ہو گئے کہ وہ عباس سے دست بردار ہو جائیں گے بشرطیکہ ایک اقرار نامہ لکھ دیا جائے کہ جس مجلس میں ہم اور ہمارے فرزند بیٹھے ہوں وہاں عباس رضی اللہ عنہ اور ان کے فرزند نہ بیٹھیں گے اور ہمارے کسی کام میں شریک و ذخیل نہ ہوں گے اور کسی قسم کے حصہ کا مطالبہ نہیں کریں گے۔“

غرضیکہ اس مضمون کا ایک اقرار نامہ عباسؑ نے تحریر کیا جس پر معززین قریش نے مہر کی اور یہ اقرار نامہ ائمہ کے پاس تھا۔

پس اس روایت سے صاف ظاہر ہوا کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ معاذ اللہ! معاذ اللہ! کنیز کے زادے اور توبہ توبہ ولد الزنا تھے اور ان کی کنیزک زادگی وغیرہ کی سند مہری دستخطی ائمہ کے پاس موجود تھی۔ شاید اسی سبب سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایسا ذلیل کیا کہ ان کی بیٹی ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا بہ جبر و اکراه عمرؓ کے ساتھ نکاح کر دیا۔

جبکہ بروایت اہل تشیع حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی نسبت والد الزنا ہونا (وحاشا جنابہ عن ذالک) ثابت ہوا تو لامحالہ ان کا دشمن اہل بیت ہونا بھی لازم ہوا، اس لیے کہ ہزار ہا احادیث اور اقوال سے ثابت ہے کہ نہ ولد الزنا کا کوئی عمل مقبول ہے نہ وہ کبھی اہل بیت کے ساتھ دوستی کرے گا کہ اس کو ہم بحار الانوار اور علل الشرائع اور احتجاج طبرسی^۱ اور تالیفات

۱ احتجاج کے مصنف کا پورا نام احمد بن علی بن ابی طالب ہے، یہ طبرستان کے رہنے والے تھے۔ شیعہ حضرات کے متقدمین میں سے فاضل ترین آدمی تھے، ان کی کتاب ”احتجاج“ قوم کے یہاں مشہور و معروف ہے، اہل الآل میں بھی ان کا ذکر کیا گیا ہے کہ عالم، فاضل، محدث اور ثقہ تھے، ان کی کتاب ”الاحتجاج“ بہت عمدہ اور بہت سے فوائد کی حامل ہے۔ (روضات الجنات جلد ۱ صفحہ ۶۵) (شیخ محمد فراست)

قاضی نور اللہ شوستری سے آئندہ ثابت کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ لیکن یہ بات ایسی مشہور ہے کہ عوام و خواص مومنین اس سے واقف ہیں، ان کے بچوں کی زبان پر یہی کلمہ جاری ہے کما قال قائلہم: شعر.....

محبت شہ مرداں مجوز بے پردے
کہ دست غیر گرفتہ است پای مادراو

”علی کی محبت بے باپ والے سے مت تلاش کرو کہ جس کی ماں نے دوسرے کا ہاتھ پکڑا ہو۔“

کوئی صاحب مومنین سے یہ شبہ نہ کریں کہ یہی ایک روایت حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی نسبت ہوگی بلکہ اس کے علاوہ بہت سی احادیث اور اخبار ان کی شان میں موجود ہیں۔ چنانچہ ملا باقر مجلسی ”حیوة القلوب“ میں بہ سند معتبر فرماتے ہیں:

((کہ حضرت امام زین العابدین فرمود کہ در حق عبداللہ بن عباس و پدرش این آیة نازل شد ﴿مَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَى فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَى﴾))

”کہ امام زید العابدین نے فرمایا کہ یہ آیت عبداللہ بن عباس اور ان کے والد عباس کے بارے میں نازل ہوئی ﴿مَنْ كَانَ... الخ﴾ کہ جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔“

پس اب تو صاف باپ بیٹے دونوں کا دنیا و عاقبت میں اندھا ہونا ان کی کتابوں سے نکل آیا بلکہ خدا کی شہادت سے ان دونوں یعنی عباس رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے عبداللہ کا اعمیٰ اور بے بصیرت ہونا ثابت ہو گیا۔ (استغفر اللہ، استغفر اللہ) تشیع بھی عجیب مذہب ہے جس کی تیر ملامت سے کوئی نہیں بچا، اصحاب کو تو کافر اور منافق پہلے ہی بنا چکے اہل بیت رہ گئے تھے وہ بھی لعن طعن سے نہ بچے، خدایا تشیع دین و مذہب ہے یا الحاد و زندقہ ہے جس کے بانی نہ رسول اللہ ﷺ کا خیال کرتے ہیں، نہ اہل بیت کا لحاظ رکھتے ہیں، نہ اصحاب رضی اللہ عنہم کو برا

بھلا کہنے سے چھوڑتے ہیں، نہ حضرت کے قریبوں کو لعن و ملامت سے محفوظ رکھتے ہیں، پس جو سامنے آیا اسی کو برا بھلا کہنا شروع کیا، جس کا ذکر آیا اُسے تبراً کرنے لگے، کسی کو صراحۃً کافر بنایا کسی کو اشارتاً منافق کہا، کسی کو تقیاً فاسق ٹھہرایا، کسی کو ولد الزنا، کسی کو اندھا فرمایا۔ واہ کیا دین ہے اور کیا مذہب ہے! جس کے طعن و تشنیع سے کوئی نہ بچا۔ تو ایسے با حیا فرقے کی شکایت ہم صرف اصحابؓ کے برا بھلا کہنے پر کیا کریں: شعر

گھائل ترے نظر کا بنوع دگر ہر ایک
زخمی کچھ ایک بندہ در گاہ ہی نہیں

اگر کوئی مومن حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اور فضائل و کمالات کو اس روایت کے معارضہ میں پیش کرے اور اس زخم پر مرہم رکھے تو اس کو چاہیے کہ اس خیال محال سے درگزرے اور ملا باقر مجلسی کے فیصلے کو جو ”حیوة القلوب“ میں اس نے کر دیا ہے دیکھ لے کہ وہ فرماتے ہیں:

((بدانکہ درباب احوال عباس و مدح و ذم او احادیث متعارض است و اکثر علماء بخوبی او میل نمودہ اند و آنچه از احادیث ظاہر میشود آنست کہ او در مرتبہ کمال ایمان نہ بودہ است.))

”جاننا چاہیے کہ عباسؓ کے سلسلہ میں اور ان کی تعریف و برائی کے بارے میں احادیث متعارض ہیں اور اکثر علماء ان کی اچھائی کا رجحان رکھتے ہیں، لیکن احادیث سے جو ظاہر ہوتا ہے یہی ہے کہ مرتبہ ایمان میں کامل نہیں تھے۔“

پس مُلا صاحب نے سب جھگڑا قصہ ہی طے کر دیا اور حضرت عباسؓ کے ناقص الایمان ہونے پر فتویٰ دے دیا، شاید ان کے نقص ایمان کا سبب سے زیادہ یہی تصور کیا گیا ہو کہ انہوں نے ام کلثومؓ کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کر دیا۔

چھٹی دلیل:..... اگرچہ حضرات شیعہ نے جواز نکاح کے واسطے حضرت عمر رضی اللہ عنہ

کے اسلام ظاہری کا اقرار کیا اور ان کو متمسک بکمال شریعت قرار دیا لیکن ((وَلَا يُصْلِحُ

العَطَّارُ مَا أَفْسَدَهُ الدَّهْرُ .)) ” جسے زمانے نے خراب کیا ہو عطار اسے کیا درست کرے گا۔“ جو رخنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان میں ان کے بزرگوں نے ڈالا ہے وہ اب ان کے بند کرنے سے بند نہیں ہوتا اور بغیر ترک مذہب تشیع کے اور اقرار فضیلت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس نکاح کا جواز موافق عقائد مذہب شیعہ کے ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ حضرت عمرؓ موافق عقائد شیعہ کے ایمان اور اسلام سے بے بہرہ تھے، اور معاذ اللہ! منافق اور مرتد تھے اور اہل بیت کے دشمن اور ناصبیوں کے پیشوا تھے اور ناصبیوں کے ساتھ نکاح مومنہ کا جائز ہی نہیں ہے، پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نکاح جو کہ کفر و نفاق اور عداوت اہل بیت میں سب سے بڑھ کر تھے ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے ساتھ جو عزت اور بزرگی اور سیادت میں تمام جہاں سے بہتر تھیں کیوں کر جائز ہوتا..... چنانچہ ان دونوں امروں کو ہم کتب شیعہ سے ثابت کرتے ہیں:

۱- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مومن نہ ہونا۔

۲- ناصبی کے ساتھ نکاح مومنہ کا جائز نہ ہونا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ مطابق اصول شیعہ کے مومن نہ تھے، کافر اور منافق اور دشمن اہل بیت کے تھے ایسا صاف کھلا ہوا ہے کہ حاجت سند اور دلیل اور شاہد کی نہیں ہے لیکن عبرتاً للناظرین دو ایک روایتیں ان کے یہاں کی بیان کرتے ہیں۔

پہلی روایت:..... زاد المعاد ❶ ملا باقر مجلسی حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ جب میں نے فضائل روز قتل عمر رضی اللہ عنہ کے حضرت پیغمبر خدا ﷺ کی زبان سے سنے تب سے میں ان کے کفر پر یقین رکھتا تھا۔ چنانچہ عبارت اس کتاب کی بلفظ یہ ہے:

((حذیفہ گفت پس برخاستم و برخاست حضرت رسول

خدا و بخانہ ام سلمہ رفت و من برگشتم و صاحب یقین

بودم در کفر عمر تا آنکہ بعد از وفات حضرت رسول اللہ ﷺ

دیدم کہ اوچہ فتنہا برانگیخت و کفر اصلی خود را ظاہر کرد

واز دین برگشت و دامان بے حیائی و وقاحت برائے غضب
امامت و خلافت برزد و قرآن را تحریف کرد و آتش در خانه
وحی و رسالت زد و بدعتها در دین خدا پیدا کرد و ملت
پیغمبر ﷺ را تغیر داد و سنت آنحضرتؐ را بدل کرد و نصاریٰ
و مجوس را از خود راضی کرد و نور دیدہ مصطفیٰ را بختم
آورد و تدبیر کشتن امیرالمومنین کرد و جور و ستم در میانہ
مردم علانیہ کرد و ہرچہ خدا حلال کردہ بود حرام کرد و
ہرچہ حرام کردہ بود حلال کرد۔ الیٰ آخر ہذیانات
(المجلسی .)

”حذیفہؓ کا بیان ہے کہ میں اور رسول اللہ ﷺ اٹھے، رسول اللہ ﷺ ام سلمہ
کے گھر چلے گئے اور میں واپس ہو گیا، مجھے عمر رضی اللہ عنہ کے کافر ہونے کا یقین ہو چکا
تھا یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد میں نے دیکھا کہ عمر رضی اللہ عنہ
نے کیسے کیسے فتنے اٹھائے، اپنے اصلی کفر کو ظاہر کیا، اسلام سے برگشتہ ہوا،
امامت و خلافت کو غضب کرنے کے لیے بے حیائی کا دامن پھیلا کر قرآن میں
تحریف کی، فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر کو آگ لگائی، اللہ کے دین میں بدعتیں پیدا کیں،
رسول اللہ ﷺ کے طرز حکومت کو متغیر کیا، ان کی سنتوں کو بدلا، عیسائیوں اور
آتش پرستوں کو اپنا ہم نوا بنایا، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غضب ناک کیا، امیر
المومنین علی رضی اللہ عنہ کو مار ڈالنے کی تدبیر کی، عوام کے سامنے علانیہ جور و ستم کیے اللہ
کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دیا۔“

غرض کہ اس روایت سے صاف کفر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا (نعوذ باللہ من ذالک)
ثابت ہوا اور ان کا کفر اصلی کا ظاہر کرنا اور مرتد ہو جانا اور قرآن کا تحریف کرنا اور نصاریٰ و
مجوس کو راضی کرنا ثابت ہوا تو اب وہ دعویٰ جو بعض مجتہدین نے کیا تھا کہ وہ اسلام کے

دائرے سے خارج نہیں ہوئے باطل ہوا۔

دوسری روایت:..... ملا باقر مجلسی ”رسالہ رجعیہ“ میں لکھتے ہیں کہ امام مہدی علیہ السلام نے ایک سائل کے جواب میں فرمایا کہ ابوبکرؓ و عمرؓ بظاہر کلمہ گو تھے اور بطمع دنیا اسلام کے مظہر ہوئے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ پیغمبر خدا ﷺ نے ان کو کوئی حکومت نہ دی تب پیغمبر ﷺ کے قتل و ہلاک پر آمادہ ہوئے، وھوھذہ عبارتہ بلفظہ:

((ایشان (یعنی ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) از روئ گفتہ یہود بہ ظاہر کلمتین گفتند از برای اینکہ شاید ولایتی و حکومتی حضرت ایشان بدھد و در باطن کافر بودند چون در آخر مایوس شدند با منافقان بر بالای عقبہ رفتند و دھن های خود را بستند کہ کسی ایشان را نشاسد و دبھا انداختند کہ شتران حضرت رارم و هند و حضرت را ہلاک کنند پس خدا جبرئیل رافر ستاد و پیغمبر خود را از شر ایشان حفظ کرد.))

”ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما دونوں نے یہودیوں کے کہنے سے بظاہر کلمہ پڑھا تا کہ رسول اللہ ﷺ ان کو حکومت و ولایت دے دیں اور یہ دونوں باطنی طور پر کافر ہی تھے، جب مایوس ہو گئے تو منافقوں کے ساتھ عقبہ کے بالائی حصہ پر اس طرح پہنچے کہ ڈھاٹا باندھ رکھا تھا تا کہ کوئی انہیں پہچان نہ سکے اور یہاں پہنچ کر رسیاں وغیرہ راستے میں ڈال دیں تا کہ آپ ﷺ کے اونٹوں کو قابو میں کر لیں اور اس طرح رسول اللہ ﷺ کو ہلاک کر دیں، پس اللہ نے جبرئیل علیہ السلام کو بھیج کر آپ کو ان کی ایذا سے بچا لیا۔“

پس شیعوں کے امام مہدی کے اس قول سے ثابت ہوا کہ شیخین پیغمبر ﷺ کے سامنے ہی بہ سبب مایوسی کے درپے قتل رسول ﷺ ہو گئے تھے اور حضرت کے ہلاک کرنے کی تدبیر کر چکے تھے تو جو شخص پیغمبر خدا ﷺ کے قتل پر مستعد ہو جائے اس سے زیادہ کفر اور کس کا ہو

گا اور جب یہ جرم حضرات شیخین رضی اللہ عنہما پر امام مہدی فرضی کی زبان سے ثابت ہو گیا تو امام کے قول کو کون رد کر سکے گا۔

روایت سوم: ملا باقر مجلسی نے ”بحار الانوار“ میں ایک حدیث کافی کی نقل کی ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو نص جلی امامت مرتضوی کا منکر ہے وہ کافر ہے اور واجب القتل ہے۔ چنانچہ ہم اس حدیث کو ”استقصاء الافحام“ سے نقل کرتے ہیں:

(بیان قوله عليه السلام من ان يرتدوا عن الاسلام اى عن ظاهره والتكلم بالشهادتين فابقاء هم على ظاهر الاسلام كان صلاحاً للامة ليكون لهم والآولادهم طريق الى قبول الحق والى الدخول فى الايمان فى كرور الازمان وهذا الاينافى ما مروسياتى ان الناس ارتدوا الا ثلثة لان المراد فيها ارتدادهم عن الدين واقعاً وهذا محمول على بقاء هم على صورة الاسلام و ظاهره و ان كانوا فى اكثر الاحكام الواقعية فى حكم الكفار و خص هذا بمن لم يسمع النص على امير المؤمنين عليه السلام ولم يبغضه ولم يعاده فان من فعل شيئاً من ذلك فقد انكر قول النبى ﷺ ظاهراً ايضاً و لم يبق له شئ من احكام الاسلام و وجب قتله.....)) انتهى بلفظه

”یعنی یہ فرمایا ہے حضرت امام ابو جعفر علیہ السلام نے کہ جناب امیر علیہ السلام نے دعویٰ امامت اس خوف سے نہیں کیا کہ ایسا نہ ہو کہ اصحاب اس کو قبول نہ کریں اور اسلام چھوڑ دیں اور مرتد ہو جائیں اور مرتد ہو جانے سے غرض یہ ہے کہ ظاہر اسلام کو چھوڑ دیں اور کلمہ شہادت سے منکر ہو جائیں، اس لیے ان کا اسلام ظاہری پر باقی رہنا امت کے حق میں بہتر تھا تا کہ شاید وہ یا ان کی اولاد میں سے کوئی حق کو قبول کر کے اور کسی آئندہ زمانہ میں مومن ہو جائے اور یہ

مخالف اس روایت کے نہیں ہے کہ سب اصحاب مرتد ہو گئے تھے مگر تین اس لیے کہ مراد اس ارتداد سے ارتداد واقعی ہے اور ارتداد جس کا ذکر امام نے کیا، نہ پھر نا ان کا ظاہری اسلام کی نظر سے ہے اگرچہ وہ اکثر احکام واقعی میں حکم کفار میں داخل تھے لیکن یہ اسلام ظاہری بھی صرف انہیں لوگوں کی نسبت ہے جنہوں نے نص امامت امیر المؤمنین کو نہیں سنا اور ان سے دشمنی اور عداوت نہیں رکھی اور جس نے نص امامت سن کر اس سے انکار کیا یا عداوت رکھی تو اس نے پیغمبر خدا ﷺ کے قول سے انکار کیا اور ظاہر میں بھی کافر ہو گیا اور اسلام کا کوئی حکم اس کے لیے باقی نہیں رہا اور اس کا قتل کرنا واجب ہو گیا۔ فقط۔“

اور صاحب ”استقصاء الافحام“ اس حدیث کے لکھنے کے بعد خود یہ فرماتے ہیں:

((اگر غرض از نقل ایس عبارت محض اثبات ایس معنی است کہ صاحب بحار ثلاثہ و اتباع ایشاں را کافر و مرتد می داند پس البتہ ایس معنی بسر و چشم مقبولست اصلاً جای استنکاف و انکار نیست .))

”یہاں اس عبارت کی نقل صرف اس امر کے ثبوت کے لیے ہے کہ مؤلف ”بحار الانوار“ نے اصحاب ثلاثہ اور ان کے تبعین کو کافر و مرتد قرار دیا ہے تو یہ معنی ہمارے سر آنکھوں پر قبول ہیں اور انکار و ناپسند کی کوئی گنجائش بالکل نہیں۔“

پس باقر صاحب ”بحار الانوار“ اور صاحب ”استقصاء“ کے خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کا کافر ہونا ثابت ہوا اور ان کا اسلام ظاہری بھی ان کے قول سے جاتا رہا۔ تو اب کفر و ایمان کے درمیان کوئی تیسرا واسطہ جسے اسلام سے تعبیر کرتے ہیں باقی نہ رہا اور جب ان کا کافر ہونا نعوذ باللہ! ثابت ہوا تو ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح کافر کے ساتھ ہونا لازم آیا تو اب کہاں رہا قول سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کا جو انہوں نے ”شافی“ اور ”تزییہ الانبیاء“ میں فرمایا ہے کہ حضرت عمر مظہر اسلام اور متمسک بہ تمام شریعت تھے، اس واسطے ان کے ساتھ نکاح کر دینے میں کچھ

دینی خلل نہ تھا اور باطل ہو گیا قول صاحب ”نزہہ اثنا عشریہ“ کا جو انہوں نے جواب میں تحفہ کے فرمایا ہے کہ کسی امامیہ کا یہ قول نہیں ہے کہ حضرت علیؑ نے اپنی بیٹی کا فرکود دی ہو بلکہ بدعتی اور مظہر اسلام اور منافق کو دی ہے اور ممنوع اور حرام مشرک کے ساتھ نکاح کرنا ہے نہ کہ بدعتی اور منافق کے اس لیے کہ ان کے امام فرضی کی زبان سے موافق روایت ”بحار الانوار“ کے صاف کفر خلفاء ثلاثہ کا اور واجب القتل ہونا ان کا ثابت ہوتا ہے۔

عجب حال ہے علماء شیعہ کا کہ جب جیسا موقع ہوتا ہے ویسا ہی کہنے لگتے ہیں، جیسی ضرورت ہوتی ہے ویسی ہی حدیثیں بنا لیتے ہیں، کبھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کافر اور منکر اسلام اور واجب القتل کہتے ہیں کبھی ان کو مظہر اسلام اور متمسک سائر الشریعہ فرماتے ہیں..... چونکہ امر اوّل یعنی کفر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا (و نعوذ باللہ منہ) موافق روایات صحاح اہل تشیع کے ثابت ہو گیا، اب ہم کو اس امر کی ضرورت باقی نہ رہی کہ ہم اس مسئلے کو ثابت کریں کہ مومنہ کا نکاح ناصبی کے ساتھ گو وہ مظہر اسلام ہو جائز نہیں ہے لیکن تاکہ وہ لوگ جو ان روایات کو غلط سمجھیں اور کفر ظاہری کے قائل نہ ہوں اور اسلام کا حکم حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر جاری رکھیں، اپنے اصول کے مطابق اس نکاح کو جائز نہ سمجھیں ہم اس مسئلے کو بھی بیان کرتے ہیں:

امردوم:..... یعنی مومنہ کا نکاح، ناصبی کے ساتھ جائز نہ ہونا:

((روى الكليني عن الفضيل بن يسار قال سالت ابا عبد الله عن
نكاح الناصب فقال لا والله ما يحل قال فضيل ثم سألته مرة
اخرى فقلت جعلت فداك ما تقول في نكاحهم قال والمرأة
العارفة قال ان العارفة لا توضع الا عند عارف .))

”کلینی میں روایت ہے کہ فضیل بن یسار کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا کہ ناصبی کا نکاح جائز ہے تو حضرت نے فرمایا کہ خدا کی قسم! ہرگز حلال نہیں ہے، پھر دوسری مرتبہ میں نے پوچھا تو امام نے فرمایا کہ عورت عارفہ ہے یعنی مومنہ ہے، میں نے کہا کہ ہاں تب امام نے فرمایا کہ عارفہ نہیں رہے گی

مگر پاس عارف کے، یعنی مومنہ کو مومن کے نکاح میں ہونا چاہیے۔“

پس اس روایت سے صاف ثابت ہو گیا کہ حضرت امام کے ارشاد کے مطابق عارف کا نکاح جائز نہیں ہے مگر عارف کے ساتھ۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مومن اور عارف کہیں یا حضرت ام کلثومؓ کو ایمان اور معرفت کے دائرے سے خارج کریں۔ (و نعوذ باللہ منہ) غرض کہ اب موافق قول امام کے سوائے ان دو حالتوں کے تیسری حالت منتظرہ باقی نہیں رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ امام کے اس قول سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عارف اور کامل الایمان ہونا ثابت ہو رہا ہے، اس لیے کہ اگر وہ ایسے نہ ہوتے تو ام کلثومؓ کا نکاح حضرت امیرؓ ان کے ساتھ کسی حالت میں گو کہ اس کو حضرات شیعہ جبر و اکراہ سے تعبیر کریں نہ ہونے دیتے۔ کیا جناب امیرؓ اس آیت کے مضمون سے واقف نہ تھے:

﴿الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ

وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ﴾ (النور: ۲۶)

”بری عورتیں برے مردوں کے لیے اور برے مرد بری عورتوں کے لیے اور

پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے۔“

اور کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ اس حدیث سے جو امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمائی منکر تھے کہ (العارفة لا توضع الا عند عارف) پس ایسی آیت اور قول امام کے ہونے کے باوجود کیوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے خلاف کرتے..... جبکہ ہم اس امر کو ثابت کر چکے کہ یہ نکاح بہ جبر و اکراہ نہیں ہوا تو ہم کو اس قول ناپاک سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں رہی جس کو علمائے شیعہ نے امام کی طرف منسوب کیا ہے کہ امام نے فرمایا کہ (إِنَّ ذَلِكَ فَـرْجٌ غُصْبَنَاهُ) کہ یہ ایک شرمگاہ ہے جو ہم سے غصب کی گئی، لیکن عبرتاً للسا معین اس کو بغیر بحث کے چھوڑنا مناسب نہیں سمجھتے۔

پوشیدہ نہ رہے کہ محدثین شیعہ روایت کرتے ہیں کہ امام صادق علیہ السلام سے کسی نے اس نکاح کی نسبت سوال کیا تو امام نے فرمایا: (إِنَّ ذَلِكَ فَـرْجٌ غُصْبَنَاهُ .) صاحب

”تحفہ“ قدس سرہ اس بحث میں لکھتے ہیں:

((سبحان اللہ چہ کلمہ ایست کہ از زبان ایشان برمی آید نزدیک است کہ آسماں فرو افتدوز میں بشگافد اوّل در حق آن سیدہ پاک بضعة الرسولؐ فلذہ کبد البتولؑ چہ فحش و سوء ادب ست و کدام خصلت خبیثہ را بد امن پاک آن طاہرہ مطہرہ می بندند دیگر در حق حضرت امیرؑ و حضرت حسنینؑ چہ قدر بے حفاظتی و بے ناموسی ثابت می کنند و در حق حضرت صادق کہ ایس کلمہ بر آنجناب تہمت می نمایند چہ قدر بے حمیتی و بے غیرتی اعتقاد دارند این لفظ را اوّل بزرگان بر نمی آرند علی الخصوص ذکر این عضو مستور الاسم و المسمیٰ از ارقارب بلکه بزرگان خود امریست کہ ار اذل و اوباش نیز احتراز واجب می دانند.))

”واہ کیسی بات زبان سے نکالتے ہیں قریب ہے آسمان گر پڑے اور زمین پھٹ جائے پہلی بات تو یہ کہ حضرت فاطمہؑ کی جگر گوشہ ام کلثومؑ کے بارے میں فحش اور بے ادبی ہے اور کس بری خصلت کو اس پاک باز کے دامن میں لگاتے ہیں دوسرے جناب امیرؑ اور حضرات حسنینؑ رضی اللہ عنہم کی کس قدر بے غیرتی اور عدم حفاظت ثابت کرتے ہیں اور حضرت صادقؑ کے حق میں اس کلمہ کی تہمت لگاتے ہیں اور کس قدر بے حمیتی اور بے غیرتی کے معتقد ہیں، اس قسم کی گفتگو بڑے لوگ اپنی زبان پر نہیں لاتے خاص کر شرمگاہ کا لفظ تو انہوں نے کہا ہی نہیں، بڑوں اور بزرگوں کی بات دیگر، اوباش اور گھٹیا لوگ بھی اس سے پرہیز کرتے ہیں۔“

اس کا جواب علامہ کشمیری نے ”نزہة“ میں چند طرح پر دیا ہے، کما قال:

((مردود دست بچند وجہ اوّل آنکہ بر تقدیر تسلیم صحت

روایت و محفوظ بودن آن آنچہ افادہ فرمودہ تسویل و تحویل بیش نیست .))

”یہ چند وجوہ سے مردود اور ناقابل قبول ہے اوّل یہ کہ بنا بر تسلیم و قبول صحت روایت اور پھر اس کا اس طرح محفوظ رہنا کہ جو کچھ فرمایا ہے شیطانی فریب اور مکاری سے زیادہ نہیں ہے۔“

علامہ کشمیری کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت کی صحت ان کے نزدیک مسلم نہیں ہے، حالانکہ بر تقدیر تسلیم صحت کہنا عوام کو دھوکہ دینا ہے، اس لیے کہ یہ حدیث چند طرح سے موافق اصول شیعہ کے ثابت ہے، اوّل یہ حدیث کافی کلینی میں جس کو حضرات شیعہ اصح الکتب کہتے ہیں انہی الفاظ سے امام صادق سے مروی ہے..... دوسرے قاضی نور اللہ شوستری نے ”مصائب النواصب“ میں اس حدیث کو چند جگہ نقل کیا ہے چنانچہ جہاں بحث فاروق اعظمؓ و ام کلثومؓ کی لکھی ہے اس کی بحث پنجم میں چند جگہ اس کا ذکر کیا ہے اور کسی جگہ اس سے انکار نہیں کیا۔ چنانچہ ترجمہ فارسی اس کا کما هو مذکور فی ازالة الغین یہ ہے:

((واما خامسا بواسطه آنکہ قول امام صادق عليه السلام کہ
ایں اوّل فرجے ست کہ غصب کردہ شدہ از ما مستلزم و وقوع
زنا نیست .))

”پانچویں یہ کہ امام صادق کا کہنا کہ یہ پہلی شرمگاہ ہے جو ہم سے زبردستی چھینی گئی
وقوع زنا اس سے لازم نہیں آتا۔“

اور پھر اسی بحث میں صاحب استغاثہ کے قول کو نقل کر کے اس طرح فرماتے ہیں: و
ترجمة فی الفارسیة هكذا:

((خبر داده اند مارا جماعتے از مشائخ ثقات ما از ایشاں
جعفر بن محمد بن ملک کوفی ست از احمد بن فضل از

محمد بن ابی عمیر از عبداللہ بن سنان گفت سوال کردم
جعفر بن محمد صادق علیہ السلام از تزویج عمرؓ از ام کلثومؓ

پس گفت این اوّل فرجے ست کہ غضب کرده شد از ما .))
”معتبر بزرگوں کی جماعت نے ہمیں بتایا ہے کہ جعفر بن ملک کوفی نے احمد بن
فضل کے ذریعے محمد بن ابی عمیر کے واسطے سے عبداللہ بن سنان سے مروی ہے
کہ میں نے جعفر صادق سے عمرؓ کے ساتھ ام کلثومؓ کی شادی کے بارے میں
پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ پہلی شرمگاہ ہے جو ہم سے زبردستی چھین لی گئی۔“
اس کے بعد پھر قاضی صاحب لکھتے ہیں:

((مشاکل روایتے ست کہ از صادق علیہ السلام کردہ اند کہ

گفته کہ این اوّل فرجے ست کہ از ما غضب کرده اند .))

”امام جعفر صادق علیہ السلام سے یہ مشکل ترین روایت ہے جو لوگوں نے بیان
کی ہے کہ یہ پہلی شرمگاہ ہے جو ہم سے چھینی گئی۔“

اور پھر جہاں جناب امیر علیہ السلام کے صبر اور تحمل پر وصیت رسول کا ذکر کیا ہے، وہاں

قاضی صاحب موصوف فرماتے ہیں، و ترجمۃ فی الفارسیۃ ہکذا:

((چوں عمرؓ خواستگاری ام کلثومؓ نمود علیؓ متفکر شدہ

وگفت اگر مانع شوم اور قصد قتل من خواہد کرد و اگر

قصد قتل من کند و ممانعت کنم اورا از نفس خود بیروں روم

از طاعتِ رسولِ خدا ﷺ پس تسلیم ابنۃ دریں حال اصلاح

بود از قتل او و بیروں رفتن از وصیت رسول خدا پس

تفویض نمود امر اورا بخدا و دانستہ بود کہ آنچہ عمرؓ

غضب کردہ ز اموال مسلمانان و ارتکاب کردہ از انکار حق

او و قعود بجائی رسول خدا او تغیر احکام الہی و تبدیل

فرائض خدا چنانچہ گزشت اعظم است نزد حق تعالیٰ
واقطع و اشنع ست از اغتصاب این فرج پس تسلیم کرد و
صبر نمود.)

”جب عمرؓ نے ام کلثومؓ کو مانگا تو علیؓ متفکر ہوئے اور کہا کہ اگر منع کر دوں تو یہ
مجھے قتل کر دے گا اور اگر یہ میرے قتل کا ارادہ کرے اور میں منع کروں اپنے نفس
(کو بچانے) کی خاطر تو رسول اللہ ﷺ کی اطاعت سے خارج ہوتا ہوں،
پس اس کے قتل اور رسول خدا ﷺ کی وصیت سے باہر ہونے سے بہتر ہے کہ
لڑکی سپرد کر دی جائے، چنانچہ ایسا ہی کیا اور معاملہ اللہ کے حوالے کر دیا اور معلوم
تھا کہ عمرؓ نے مسلمانوں کا مال غصب کیا اور حق سے انکار کیا اور رسول خدا ﷺ
کی جگہ بیٹھا، احکام الہی میں تغیر کیا اور خدا کے فرائض بدلے اور یہ تمام امور اللہ
کے نزدیک ایک شرمگاہ کے غصب کرنے سے زیادہ برے ہیں، اس لیے علیؓ نے
صبر کیا۔“

اور اس کے علاوہ اور طرق متکثرہ سے ان الفاظ کا ثبوت ہوتا ہے، پس علامہ کشمیری کا
بر تقدیر تسلیم صحت کہنا صرف دھوکا دینا ہے جو کہ تمام قدیم علماء متقدمین شیعہ کا شعار ہے۔ اگر
یہ الفاظ امام نے نہیں فرمائے اور ان کی کتابوں میں مذکور نہ تھے تو چاہیے تھا کہ صاف انکار
کرتے اور اگر مذکور تھے تو اس کا اقرار کرتے، بر تقدیر تسلیم صحت کہنا کیا معنی؟

غرض کہ اس حدیث کی صحت میں کچھ شک و شبہ نہ رہا۔ اب ہم تو جیہہ اور تاویل علماء
شیعہ کی جو اس لفظ کی نسبت ہے بیان کرتے ہیں۔ علامہ کشمیری ”نزہہ“ میں فرماتے ہیں:

((مراد ازیں کلام آنست کہ این نکاح اوّل نکاحیست کہ از

خاندانِ عالیہ بغیر طیب خاطر اولیاء بطریق اجبار و اکراہ بنا
بر مصلحت وقت واقع شدہ و سبب وقوع آن باجبار و اکراہ
تعبیر ازاں بغصب فرمودہ اند و دریں معنی ہیچ گو نہ

شناعتی نیست و مع وضوح المرام لاعبرۃ بالالفاظ عقد نکاحیکہ بغیر طیب خاطر باشد اصلاً مستلزم زنا نیست۔))

”اس کلام کا مطلب یہ ہے کہ خاندان عالیہ میں یہ پہلا نکاح ہے جو اولیاء کی خوشی کے بغیر جبر کے سبب صرف وقتی مصلحت کے پیش نظر واقع ہوا اور اس جبر و ستم کو ”غصب“ کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا اور یہ معنی مراد لینے میں کوئی قباحت نہیں ہے، مقصد کی وضاحت کے بعد الفاظ کا اعتبار نہیں ہوتا اور جو عقد نکاح رضا مندی اور خوشی کے بغیر ہوا سے زنا نہیں کہا جاسکتا۔“

خلاصہ اس توجیہ کا یہ ہے کہ غصب بہ معنی عدم رضا کے ہے اور مطلب (ذَالِكَ فَرَجٌ غُصْبَانًا) جو امام نے فرمایا ہے یہ ہے کہ یہ پہلا نکاح ہے کہ خاندان اہل بیت اطہار سے بلا رضا مندی ولی کے بہ جبر و اکراہ ہوا اور لفظ غُصِبَتْ مستلزم زنا نہیں ہے، لیکن یہ توجیہ بجائے خود صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اگر یہ معنی حضرت امام کے دل میں تھے تو چاہیے تھا کہ انہیں لفظوں سے ادا فرماتے نہ کیا ایسا لفظ کریہ (و حاشا جنابہ عن ذالك) زبان پر لاتے پس لفظ غُصِبَتْ کا فرمانا اور عدم رضا مراد لینا بلا وجہ الفاظ کو ان کے حقیقی معنی سے پھیرنا ہے۔ علاوہ بریں جو نکاح صحیح نہ ہو وہ مستلزم زنا ہے اور از روئے کتب معتبرہ امامیہ کے مثل ”غنیہ“ اور ”تبصرہ“ اور ”کنز العرفان“ اور ”غایۃ المرام“ وغیرہ کے ثابت ہے کہ مومنہ کا نکاح ناصبی کے ساتھ جائز نہیں ہے، پس جب ایک عام مومنہ کا نکاح ایک عام ناصبی کے ساتھ درست نہ ہو تو کیوں کر نکاح قدوہ مومنات بنت بضعہ سرور موجودات کا ایک کافر یا منافق کے ساتھ درست ہوگا۔

علامہ کشمیری کا یہ فرمانا کہ ”دریں معنی ہیج گونہ شناعتی نیست“ انہیں کوزیبا ہے۔ بلاشک نزدیک عبداللہ بن سبا یہودی کے مقلدین کے جو کہ لباس محبت اہل بیت میں چاہتے ہیں کہ شریعت مصطفوی ﷺ کے اصول و فروع کو برہم کریں اور اسلام و دین محمدی کی بیخ کو ادھیڑ دیں اور خوارج و نواصب سے بھی گونے سبقت لے جائیں اور زخارف دنیوی مداہنت اور

قربت کے پیرایہ میں حاصل کریں۔ بے شک یہ امر کب بعید معلوم ہوگا کہ رسول ﷺ کی نواسی، فاطمہ زہراؑ کی بیٹی، حسن مجتبیٰؑ کی بہن ایک رئیس مرتدین اور سرگروہ منافقین کے گھر میں غصب سے جائے اور وہ غاصب جو چاہے سو کرے اور پھر بھی نہ شیرا خدا، نہ حسن مجتبیٰؑ، نہ شہید کر بلا کچھ چون و چرا کریں اور ایسے واقعہ ہوش ربا کا تماشا دیکھتے رہیں ورنہ ہم جیسے ناقص ایمان والوں کے تو ایسے سانحے کے سننے سے ہوش گم ہوتے ہیں اور ہمارے ضعیف دل زبان حال سے الامان الامان پکارتے ہیں۔ ہم حضرات شیعہ جیسی محبت کہاں سے لائیں کہ خود ہی امام کی زبان سے (ذَالِكَ فَرْجٌ غُصْبِنَاهُ) کی روایت کریں اور پھر خود ہی اس کی نسبت ”ہیچ گو نہ شاعتے نیست“ کا کلمہ زبان پر لائیں اور ایسے ناملائم اور نامناسب الفاظ کو سن سن کر خوشی اور فرحت کے شادیاں بجا لیں اور اپنے دین و ایمان کے دعویٰ میں ثابت قدم رہیں اور ہرگز اس کو ائمہ کی شان کے خلاف نہ سمجھیں اور اس سے ان کی فضیلت و عزت میں کچھ خلل کا خیال بھی نہ کریں فقط..... اس کے بعد علامہ کشمیری فرماتے ہیں:

((ہر گاہ جابر سے شخص سے را در طلاق دادن زوجه اش اجبار نماید در عرف می گویند غصبت زوجته باوصف آن اگر جابر عقد نکاح با آن زن بکند نزد امام اعظم ابو حنیفہ کوفی زنا متحقق نمی شود و آن جابر زانی نیست .))

”جب کوئی ستم گر کسی شخص کو مجبور کرے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو اس موقع پر کہتے ہیں کہ اس کی بیوی غصب کر لی گئی، اگر وہ ستم گر اس عورت سے نکاح کر لے تو امام اعظم ابو حنیفہؒ کوفی کے نزدیک یہ زنا نہیں ہے اور یہ ستم گر زانی نہیں کہلائے گا۔“

معلوم نہیں کہ علامہ کشمیری نے بایں علم و عقل اس جملے کے لکھنے سے جواب عبارت تحفہ کا کیا تصور فرمایا ہے اس لیے کہ الزام شاہ صاحب قدس سرہ کا مطابق اصول شیعہ کے ہے نہ کہ موافق اصول حنفیہ کے، پس ان کو اپنے اصول پر جواب دینا چاہیے، امام ابو حنیفہؒ کے اصول پر

نظر کرنے سے کیا حاصل۔ اگر وہ فقہی مسائل میں امام ابوحنیفہؒ کے قول پر چلنا چاہتے ہیں اور سوائے اس کے کوئی چارہ اس بلائے جانکاح سے نکلنے کا نہیں دیکھتے تو دلِ ماشاد و چشمِ ماروشن وہ فروعِ حنیفہ کو اختیار کریں اور اس پر عمل فرمائیں، لیکن صرف فروع کو لینا اور اصول و عقائد کو چھوڑنا کارآمد نہیں ہے، پس ایک کلمہ کہہ کر حنیفہ کے شریک ہو جائیں اور فضیلتِ فاروقی کا اقرار کرنے لگیں، پس نہ کچھ جھگڑا رہے، نہ قصہ نکاح کے ہونے کو بھی تسلیم کریں اس کی نسبت (الطَّيِّبَةُ لِلطَّيِّبِينَ) پڑھنے لگیں، ورنہ جب کہ موافق مذہب امامیہ کے مومنہ کا نکاح نواصب کے ساتھ جائز ہی نہیں ہے تو بے چارے ابوحنیفہؒ کے قول سے ان کو کیا فائدہ ہو گا بلکہ اگر کوئی روایاتِ حضراتِ شیعہ کو دیکھے تو اس کو اس فعلِ قبیح کی شاعت جس کو (اِنَّ ذَالِكَ فَرَجٌ غُصْبَنَاہُ) سے تعبیر کیا ہے معلوم ہووے کہ شیخ صدوق نے ”معانی الاخبار“ وغیرہ میں ”معاذ اللہ معاذ اللہ تو بہ تو بہ نقل کفر کفر نہ باشد“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو والد الزنا قرار دیا ہے اور اس کی سند امام تک پہنچائی ہے، کما قال فی ”معانی الاخبار“:

((حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ أَحْمَدَ بْنِ مُوسَى رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ الْكُوفِيُّ عَنْ مُوسَى بْنِ عِمْرَانَ النَّخَعِيِّ عَنْ عَمِّهِ الْحَسَنِ بْنِ يَزِيدِ النَّوْفَلِيِّ عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي حَمْزَةَ عَنْ أَبِي بَصِيرٍ قَالَ سَأَلْتُهُ عَمَّا رَوَى عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ إِنَّ وَالدَّ الزَّانَا شَرُّ الثَّلَاثَةِ قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَنِّي بِهِ الْاَوْسَطُ اِنَّهُ شَرُّ مَنْ تَقَدَّمَ وَ مِمَّنْ تَلَاہُ .))

”ابو بصیر روایت کرتا ہے کہ میں نے امام علیہ السلام سے پوچھا کہ یا حضرت اس حدیث پیغمبر ﷺ کے کیا معنی ہیں کہ ”ولد الزنا شر الثلثة“ کہ ولد الزنا تینوں میں سے بدتر ہے۔ امام نے فرمایا کہ مراد اس سے عمر ہے کہ وہ اپنے پہلے (یعنی ابو بکر رضی اللہ عنہ) سے اور اپنے پچھلے (یعنی عثمان رضی اللہ عنہ) سے بھی بدتر ہے اور تینوں سے زیادہ برا ہے۔“

پس جب ایسے ناپاک مذہب کے معتقدین ائمہ کی طرف ایسی تہمت کریں اور ان کی زبان سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اولاد زنا سے ہونا بیان کریں۔ (و نعوذ باللہ منہ) تو اگر بنت فاطمہؓ کا ایسے شخص کے ساتھ نکاح ہونے کو امام کی زبان سے بالفاظ (ذَلِكَ فَرَجٌ غُصْبَانَاهُ) کے لفظوں سے ادا کر کے مصداق (سَوَادُ الْوَجْهِ فِي الدَّارَيْنِ) نہ ہوں تو کیا کریں۔

لیکن اگر ہم اس امر کو بھی تسلیم کریں کہ موافق اصول شیعہ کے لفظ کفر کا اطلاق حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر نہیں ہوتا اور ان کا مظہر اسلام اور متمسک بہ تمام شریعت ہونا ثابت ہوتا ہے اور اس بات کو بھی فرض کر لیں کہ ان کے مذہب میں ناصبی کے ساتھ مومنہ اور عارفہ کا نکاح کر دینا بھی جائز ہے لیکن حضرات شیعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نفاق و بدعت سے کیوں کر انکار کریں گے اور ان کے مومن اور مخلص اور تابع سنت ہونے کو کیوں کر قبول کریں گے اگر وہ یہ قبول کر لیں کہ حضرت عمرؓ نہ منافق تھے نہ بدعتی بلکہ سچے مومن اور پکے تابع سنت تھے ”فَنِعَمَ الْوِفَاقُ“ اگر اس کو نہ مانیں تو سب تو جیہات جو ام کلثومؓ کے نکاح کے معاملہ میں کی ہیں عبث فضول اور بے کار ہو جاتی ہیں۔ اس لیے کہ جو شاعت کافر کے ساتھ نکاح میں ہے اس سے بڑھ کر قباحت منافق کے ساتھ نکاح میں ہے..... چنانچہ خود صاحب ”نزہہ اثنا عشریہ“ نے اس کا اقرار کیا ہے اور اس مضمون کو ان لفظوں سے ادا فرمایا ہے:

((قال الفاضل الناصب چہارم آنکہ گویند کہ حضرات بنات و اخوات خود بکفرہ فجرہ بزنی می دادند مثل حضرت سکینہ کہ در نکاح مصعب بن زبیر بود و علیٰ هذا القیاس دیگر قریبان خود را در نکاح کفرہ و نواصب در آوردند چنانچہ در کتاب الہیات بہ تفصیل شروع ست اقوال و بہ نستعین اگر مراد از کافر دو قول را گویند حضرات بنات و اخوات خود را بکفرہ فجرہ میدادند مشرک است، این قول کذب محض ست، چہ ہیچک از امامیہ قائل باین قول

نیست و اگر مراد ازاں مبتدع است به بدعتی کہ منجر به کفر صاحبش نہ شود کہ اور اکافر تناوّل گویند یا منافق کہ مظهر اسلام و متمسک به سائر شریعت مسلم و محذوری ندارد به فحوای ولا تنکحوا المشرکین حتی یومنوا الآیة ممنوع و محرم انکاح با مشرک ست و بر حرمت مطلق انکاح مبتدع کدائے و تزویج با منافق دلیلے قائم نیست و قیاس یکے بر دیگرے مع الفارق چه منافق اگر چه حرمتش در حقیقت عظیم ترست و فسادهش در شریعت شدید تر و به فحوای ﴿إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرَكِ الْأَسْفَلِ﴾ در عقبی بعقوبت الیم گرفتارست لیکن حکمت الہیہ داعی و مقتضی آن شد کہ احکام منافقین و مشرکین در دار دنیا از ہم ممتاز باشد و ازینجاست کہ مشرکین را به فحوای ﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ﴾ معاقب و ماخوذ گردانیدہ منافقین را زین ورطہ نجات بخشیدہ .))

”فاضل ناصب نے کہا ہے کہ ائمہ نے اپنی بیٹیاں اور بہنیں فاسقوں اور کافروں کو دیں جیسے حضرت سلینہ کی شادی مصعب بن زبیر سے کی وغیرہ وغیرہ اور اپنے دوسرے رشتہ داروں کا کافروں اور ناصبیوں سے عقد کیا جس کی تفصیل کتاب الہیات میں ہے، اس کا جواب میں یہ دیتا ہوں کہ اگر کافر سے مراد دو قولہ آدمی ہے تو ائمہ نے اپنی بیٹیاں اور بہنیں کافروں اور فاجروں کو دیں اور ایسا آدمی مشرک ہے تو یہ بات جھوٹی ہے کیونکہ کوئی شیعہ اس کا قائل نہیں اور اگر کافر سے ایسا بدعتی مراد ہے جو بدعتوں سے کافر نہ ہوا ہو تو ایسے شخص کو کافر تناوّل یا منافق کہتے ہیں جو بظاہر اسلام اور احکام شریعت بجالاتا ہو تو اس میں کوئی ممانعت نہیں

ہے۔ صرف مشرکین سے نکاح کرنا حرام ہے اور بدعتی یا منافق کے ساتھ نکاح حرام ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے، ان میں سے ایک کو دوسرے پر قیاس کرنا قیاس فارق ہے۔ اگرچہ منافق بہت برا اور شریعت میں اس کی فساد انگیزی سخت برا کام ہے اور منافق آخرت میں دردناک عذاب میں مبتلا ہوں گے لیکن حکمت خداوندی نے مشرکین و منافقین کے احکام دنیا میں علیحدہ مقرر کیے ہیں اور مشرکین کی بابت حکم الہی ہے کہ انہیں جہاں پاؤ قتل کرو اور اس کے برخلاف منافقوں کو اس بھنور سے نجات دی ہے۔“

علامہ کشمیری کی اس تحریر پر ہم ان کا دل و جان سے شکر ادا کرتے ہیں اور اپنی ممنونی ظاہر کرتے ہیں کہ جو بات ہم کو لکھنی چاہیے تھی وہ خود علامہ ممدوح نے لکھ دی اور جو تکلیف ہم کو کرنی پڑتی وہ خود گوارا فرمائی اور ان فقروں کو لکھ کر کہ (منافق اگرچہ حرمتش در حقیقت عظیم ترست و فسادش در شریعت شدید تر) ”یعنی منافق اگرچہ بہت برا اور اس کی فساد انگیزی شریعت میں بڑا برا کام ہے۔“ ہماری طرف سے خود ہی جواب دے دیا..... لیکن ہم محو حیرت ہیں کہ علامہ ممدوح نے صاحب تحفہ قدس سرہ کے اعتراض کے جواب میں اس تحریر سے کیا فائدہ خیال کیا، اس لیے کہ ان کا اعتراض اس پر ہے کہ شیعوں کے نزدیک حضرات ائمہ علیہم السلام نے اپنی بیٹیاں کافروں کو دی ہیں، علامہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ نہیں کافروں کو نہیں دیں بلکہ منافقوں کو اس پر ہمارا یہ جواب ہوتا ہے کہ مومنہ کا نکاح کافر کے ساتھ ہونے پر کوئی دلیل عقلی نہیں ہے بلکہ صرف قباحت شرعی ہے اور وہ قباحت منافق کے ساتھ نکاح کرنے میں بھی موجود ہے بلکہ کچھ زیادہ ہے، وہ خود حضرت نے فرما دیا۔ پس اب اہل انصاف غور کریں کہ صاحب ”تحفہ“ کا اعتراض اس سے اور مدلل ہو گیا یا ان کا اعتراض اس جواب سے اٹھ گیا..... باقی رہا یہ امر کہ منافقین کے احکام بہ نسبت کافروں کے ظاہر شریعت میں سخت نہیں ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ منافق ظاہر میں اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور احکام شریعت ظاہر پر جاری ہیں، اس لیے وہ قتل

وغیرہ سے محفوظ ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ کوئی شخص سوائے خدا کے علم غیب نہیں رکھتا جو دل کا حال جانے پس شریعت نے ظاہر اسلام پر نظر کرتے ہوئے ان کے قتل کا حکم نہیں دیا لیکن موافق اصول شیعہ کے ائمہ کرام کو (عِلْمٌ مَا كَانَ وَمَا يَكُونُ) حاصل ہوتا ہے اور پوشیدہ امور ان پر روشن ہوتے ہیں اور حالات قلوب بنی آدم ان پر ظاہر ہوتے ہیں، پس ان کو منافقوں سے احتراز کرنا اور ان کو ذلت دینا اور ان سے عداوت رکھنا اور ان سے قرابت نہ رکھنا بلکہ اگر وہ کسی دینی کام میں مدد کرنا چاہیں تو ان سے اعانت نہ لینا اور ان کو کسی دینی کام میں شریک نہ کرنا اور اگر وہ مر جائیں تو ان پر جنازے کی نماز نہ پڑھنا اور ان کے لیے استغفار نہ کرنا واجب و لازم ہے..... چنانچہ جن منافقوں کا نفاق پیغمبر ﷺ کے سامنے کھل گیا تھا یا جن کے نفاق کی خبر خدائے جل شانہ نے حضرتؐ کو دے دی تھی ان کے ساتھ اسی طرح پر برتاؤ کرنے کے لیے آیاتِ قرآنی نازل ہوئیں اور ان کے لیے سخت احکام صادر ہوئے بلکہ جس طرح پر جہاد کرنے کا حکم کفار کے اوپر ہوا اسی طرح پر منافقوں کے اوپر ہوا، جیسا کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَا أُوهُمْ
جَهَنَّمَ وَبِعْسِ الْمَصِيرُ﴾ (التحریم: ۹)

”اے پیغمبر! جہاد کر اوپر کافروں کے اور منافقوں کے اور نہایت سختی کر ان پر اور ان کی جگہ جہنم ہے۔“

غرضیکہ جب کہ ان منافقوں کا جن کے نفاق کا حال معلوم ہو گیا حال مثل کفار کے ہوا اور جہاد بھی ان پر واجب ہوا اور ان پر غلظت اور شدت بھی مثل کفار کے کرنے کا حکم ہو تو پھر نکاح میں درمیان کفار کے اور ان منافقوں کے کیا فرق رہا..... اب سوائے اس کے کہ یا حضرات شیعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو منافق نہ کہیں اور اس کلمہ کفر کے کہنے سے باز آئیں یا اس نکاح کو حرام جانیں دوسرا کوئی علاج نہیں ہے۔

اگرچہ علمائے شیعہ نے اس معاملے میں عوام کے فریب دینے کو اور جاہلوں کے سمجھانے

کو بہت ابلہ فریبی کی تقریر کی ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مظہر اسلام کہہ کر اس نکاح کا جواز ثابت کیا ہے لیکن یہ فریب ذرا سی بات میں کھلا جاتا ہے اور یہ سب تو طیبہ ان کا ایک ادنیٰ بات ((ہبءاً منثوراً)) ہو جاتا ہے، یعنی ہم ایک استفتاء کرتے ہیں اس کا فتویٰ لکھ دیں اور جو بات ہم پوچھتے ہیں اس کے جواب میں صرف لا یا نَعَمْ فرمادیں و ہو هذا:

”کیا فرماتے ہیں جناب قبلہ و کعبہ ان دو مسئلوں میں کہ جن میں سے پہلا یہ ہے کہ ایک منافق جس نے خدا کی کتاب میں تحریف کی، جس نے پیغمبرؐ کی سنت کو بدلا، جس نے حضرت فاطمہ علیہا السلام کا حق غصب کیا، جس نے معصومہ کے جسم اطہر پر ایسا صدمہ جسمانی پہنچایا کہ اس سے معصوم بچہ شہید ہوا، اور جس نے سیدۃ النساء کا حق نہ دیا اور ان کو جھوٹا جانا اور ان کا دعویٰ ارثِ پدری کا نہ سنا اور جس نے امیر المؤمنین علی علیہ السلام کا حق غصب کیا اور جس نے ان پر جبر و ظلم کیا وہ ایک مومنہ عارفہ کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا ہے جائز ہے یا نہیں؟

دوسرا مسئلہ: ایک مومن نے جس کو خدا نے ذاتی شجاعت و شرافت میں یکتائے روزگار پیدا کیا ہے اور جس کے بازو و کوفت اور طاقت قلعہ شکنی کی دی اور جس کو جرأت دس ہزار جنگی سوار کے ساتھ لڑنے کی دی ہے، اس نے اپنی بیٹی مومنہ عارفہ کا نکاح ایک منافق مرتد غاصب خائن کے ساتھ صرف اس کی تہدید زبانی پر کر دیا اس کی نسبت کیا حکم ہے آیا وہ گناہ گار ہوا یا نہیں؟

اور اگر ایسے استفتاء پر فتویٰ دینے میں بھی چون چرا کو جناب قبلہ و کعبہ دخل دیں اور صاف جواب نہ دیں تو ان سے ہم ایک صاف مسئلہ پوچھتے ہیں، اس کو لکھ دیں کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیان شرح متین کہ مومنہ کا نکاح سنی ناصبی کے ساتھ جائز ہے یا نہیں؟ پس جو کچھ جواب اس کا لکھ دیں وہی تمام اس بحث کے طے کرنے کے لیے کافی ہے، پھر نہ کسی توجیہ کی حاجت ہے نہ کسی تاویل کی ضرورت ہے۔ ایک دو حرفی فتویٰ پر مدار اس تمام قصے جھگڑے کے فیصلے کا ہے۔ پس اے حضراتِ شیعہ! بہ نظر عنایت اس سوال کا جواب لکھ دو اور اس جھگڑے قصے کو میٹو۔ شعر.....

ادا سے دیکھ لو جاتا رہے گلہ دل کا

بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

بعدہ اس کے علامہ کشمیری بجواب ”تحفہ“ کے فرماتے ہیں:

((استبعاد ذکر فرج مستور الاسم والمسمى برزبان اکابر در کمال استعجاب ست و در واقع ژاژ خائی ست کہ ہیچ خر نہ نماید چہ در کلام الہی کہ چند جاذکر این عضو مستور الاسم والمسمى جاری شدہ و حضرت عائشہ صدیقہؓ در مجالس و محافل نام عضو مخصوص حضرت سرور عالم علیہ السلام کہ مستور الاسم ست برزبان می بردند..... الخ .))

”شاہ صاحب کا یہ قول ہے کہ امام کی زبان پر لفظ فرج آنا بعید از قیاس ہے در حقیقت یہ بکو اس ہے جو کوئی گدھا بھی نہیں کہہ سکتا کیونکہ قرآن میں کئی جگہ اس عضو مخصوص کا ذکر آیا ہے اور حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اپنی زبان سے رسول اللہ ﷺ کے عضو مخصوص کا ذکر کئی محفلوں اور مجلسوں میں کیا ہے۔“

اس تقریر سے علامہ کشمیری کا مطلب یہ ہے کہ شاہ صاحب کا یہ فرمانا کہ فرج کا لفظ امام کی زبان پر آنا بزرگی کی شان کے خلاف ہے موجب تعجب ہے، اس لیے کہ خدا کے کلام میں یہ لفظ مذکور ہوا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عضو مستور الاسم کا نام لیا ہے تو پھر امام نے اگر لیا تو کیا گناہ کیا۔ فقط

جواب اس کا یہ ہے کہ یہ نا فہمی اور نادانی علامہ کی ہے، اس لیے کہ آیات اور احادیث میں اس عضو کا نام ہے تو مسائل شرعیہ کے بیان میں یا ستائش مومنین کے مقام پر ہے نہ کہ ایسے موقع اور محل میں جو محل نزاع ہے اور مسائل شرعیہ کے بیان میں ایسے الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کے بیان کا ایک سبب خاص ہے۔ ہاں، اگر شاہ صاحب ان احادیث و اخبار

امامیہ پر طعن کرتے جن میں شرعی مسئلہ بتانے کے واسطے اس عضو کا نام لیا گیا ہے تو یہ معارضہ با تمثیل صحیح ہوتا حالانکہ صدہا احادیث امامیہ میں ائمہ کرام کی زبان سے اس عضو کا نام مذکور ہے اور شاہ صاحب نے کسی پر کچھ اعتراض نہیں کیا اور اس محل خاص پر جو اعتراض کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اراذل عوام کو بھی اس قدر غیرت اور حیا ہوتی ہے کہ اگر کوئی ان کی بیوی یا بیٹی کو لے جائے تو وہ ایسا لفظ زبان پر نہیں لاتے اور اپنی بیوی بیٹی کی نسبت شرمگاہ کے غضب کر لینے کا لفظ زبان پر نہیں لاتے تو کیوں کر ممکن ہے کہ جناب امام نے ایسا لفظ نکالا ہو بلکہ اگر فی الواقع یہ نکاح بہ جبر و اکراہ ہوا تھا تو امام کو مناسب تھا کہ وہ سائل کے جواب میں فرمادیتے کہ بہ ضرورت یہ نکاح ہوا تھا اور بوجہ مظہر اسلام اور متمسک بہ شریعت ہونے عمر رضی اللہ عنہ کے شرعاً ایسا نکاح کر دینا جائز تھا نہ کہ اس عبارت اور الفاظ چھوڑ کر ایسا کر یہ لفظ جس کے ہزار معنی بنائے جائیں مگر سمجھنے والے اور ہی کچھ سمجھتے ہیں زبان پر لاتے اور اس تقریر کا جواب خدا کے کلام میں اس لفظ کے ہونے یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بہ نظر ضرورت مسئلہ شرعی کے اس لفظ کو زبان پر لانے سے نہیں ہوتا۔ ایس ہذا من ذالک۔

تیسرا سوال:..... بعض علماء شیعہ نے یہ خیال کر کے کہ نکاح کے ہونے سے انکار کرنا اپنی احادیث اور اخبار کی کتابوں پر خط نسخ کھینچنا ہے اور روایت (ذَالِكَ فَرَجٌ غُصْبَانًا) کہ جو خاص کلینی نے کافی میں امام صادق علیہ السلام کی حدیث کر کے لکھی ہے غیر صحیح کہنا امام کو جھٹلانا ہے اور اس کو بغیر توجیہ و تاویل کے تسلیم کرنا عقل اور ایمان اور عزت سے ہاتھ اٹھانا ہے، اس لیے اس کے معنی بنانے اور الفاظ کو حقیقت سے مجاز کی طرف پھیرنے پر آمادہ ہوئے، جب اس کو بھی بے سود دیکھا اور اس سے بھی کچھ مطلب حاصل نہ ہوا تب دوسری طرح کی تاویلات و تزیینات کی جانب توجہ فرمائی اور صبر، وصیت اور تقیے سے پناہ لی، چنانچہ ہم ہر ایک تاویل کو بہ تفصیل بیان کرتے ہیں:

پہلی تاویل صبر:..... بعض علماء شیعہ نے فرمایا ہے کہ جو معاملہ جناب امیرؑ کو پیش آیا اکثر انبیاء اور اوصیاء کو ایسے معاملے پیش آئے ہیں اور انہوں نے صبر فرمایا ہے اور اس سے خدا

نے ان کے درجات بڑھائے ہیں جیسا کہ حضرت لوط علیہ السلام پر بھی ایسا ہی واقعہ گزرا ہے، چنانچہ حضرت لوط علیہ السلام کے پاس جب فرشتے آدمی کی صورت ہو کر آئے اور ان کو کچھ شبہ ہوا تو انہوں نے اپنی بیٹیاں ان کے سامنے کر دیں اور کہا:

﴿يَقَوْمِ هَؤُلَاءِ بَنَاتِي هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ﴾ (ہود: ۷۸)

”کہ اے میری قوم! یہ میری بیٹیاں حاضر ہیں اور یہ اچھی ہیں تمہارے لیے۔“

﴿هَؤُلَاءِ بَنَاتِي إِنْ كُنْتُمْ فَعِيلِينَ﴾ (الحجر: ۷۱)

”یہ میری بیٹیاں موجود ہیں اگر تم کو کچھ کرنا ہے کرو۔“

پس تعجب ہے کہ جب حضرت لوط پیغمبر خدا علیہ السلام نے اپنی بیٹیاں سامنے کر دیں اور ایسا کلمہ فحش زبان سے کہا کہ اگر کرنا ہے تو یہ بیٹیاں حاضر ہیں اور اس کا ثبوت آیت قرآنی سے ہوتا ہے تو پھر ناصبیوں کا یہ اعتراض کہ حضرت امیرؓ نے کیوں اپنی بیٹی عمرؓ کو دے دی تھی سراسر بے جا ہے، جو جواب ناصبی حضرات لوط علیہ السلام کے معاملے کا دیں گے وہی ہم مومنین کی طرف سے خیال کریں فقط..... چنانچہ قاضی نور اللہ شوستری نے ”مصائب النواصب“ میں اور اور علماء شیعہ نے اپنی کتابوں میں اس کو لکھا ہے اور علاوہ اس کے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا زن فرعون کی بھی مثالیں دی ہیں، چنانچہ ہم ان سب کو لکھ کر اس کا جواب دیں گے، بالفعل بہ نسبت صبر جناب امیر کے جو کچھ حضرات شیعہ نے لکھا ہے اس کو ہم ایک کتاب سیف صارم سے جو بعد ملاحظہ جناب مجتہد صاحب کے ۱۲۶۷ھ میں مطبع جعفریہ، یعنی مطبع اثنا عشریہ میں چھپی ہے نقل کرتے ہیں گویا مؤلف نے اپنے تمام مجتہدین و علماء کے اقوال کا خلاصہ اس میں لکھا ہے مسلمانوں کو چاہیے کہ اس کو غور سے دیکھیں اور اس بے چارے مؤلف کی اور ان کے مجتہدین و علماء کی حیاء و شرم کی داد دیں اور ان کے حق میں احسن و آفریں کہیں۔ و ہو هذه بلفظه:

((تو اب کا شمس فی وسط النهار طاہر و ہویدا ہے کہ ایسی صغیر سن معصومہ کا نکاح

ایسے شخص مظہر الاسلام اور مظہر اور مقرر کلام مرقومہ سے قربت و وصلت کا بھی مفید

نہیں، صرف ظہور اجبار شیخ فانی تھا اور اذیت رسانی اور مضطر کرنا اور بظاہر تہتک پہنچانا نفس رسول کو اور مظہر اتمام حجت اور ثبوت غلبہ غالب کل غالب تھا نفس پر کہ اگرچہ درحقیقت قربت معصومہ طاہرہ، یعنی وقوع اتصال و مواصلت جو کہ ظاہر میں غایت مناکحت ہے بہ موجب اقرار شیخ فانی اور ہم بہ سبب صغیرہ ہونے شیخ فانی کے ممتنع الوجود یقینی تھا اور باعتبار ظاہر کے بھی اور باعتبار باطن کے از روئے علم باطنی کے بھی حضرت مولیٰ پر ہویدا تھا اور مظہر الاسلام بظاہر مقرر رسالت و شراعی رسول امام سے قطع نظر اس کے بھی مناکحت ممنوع شرعی نہیں تھی، لیکن باعتبار ظاہر حال بہ نظر خواص و عوام البتہ کما انتہاک حرمت دلی خدا ظاہر کہ ایک منگیتر بیٹی ایسی صغیرہ باوصف دامادی اور ابن عمی رسول اور ملقب ہونے ساتھ نفس رسول کے اور خیبر گیر اور غالب کل ہونے کے اور مخاطب بہ لافتی الاعلیٰ، لاسیف الاذوالفقار ہونے کے ایک شیخ فانی سے نکاح کرنا اور باوجود درپیشی اس قدر اعتدال و تکرار کے ایسے سید عرب و عجم امیر المؤمنین کہ اس لقب کے خود صدیق و فاروق و صدیقہ نواصب تک گواہ ہیں، لوگوں کی نظر میں ایک شیخ نو مسلم ظاہری سے مغلوب دکھائی دیں اور مجبور کہلائیں حتیٰ کہ بیٹی حوالہ کر دیں کہ نفس سرکش کسی بشر کا ہرگز باوصف علت اباحت شرعی کے بھی اس ہتک کو گوارا نہیں کر سکتا سوائے انبیاء و اوصیاء کے کہ صبر و رضائے حضرات علیہ التحیۃ والبرکات بعطائے حضرت کبریا انہیں پر ختم ہے کہ باوصف عطائے قوت و معجزہ صبر و تحمل بھی ایسا ہی ان کو عطا ہے کہ یہ استعداد اور حوصلہ کسی اور بشر کو نہیں، حاصل کہ نفس پر اتنا غلبہ ہو سکے کہ انتہائے مرتبہ اور غایت کمال ہے غالب کل غالب ہونے کا۔“

اے مسلمانو! کہاں ہو، کس نیند میں سو رہے ہو، ذرا چونکو! ہوش میں آؤ اٹھ کر بیٹھو! اس بچہ نادان مؤلف ”سیف صارم“ اور اس کے پیران نابالغ، یعنی مجتہدین و علماء کی عقل و حیا پر نوحہ کرو، ان کے ایمان و انصاف کے جانے پر مرثیہ پڑھو، ان کے حال زار پر رحم کرو، دیکھو

کہ کیسی عقل و حیا ان کی جاتی رہی ہے کہ عیب کو ہنر کر کے دکھلاتے ہیں اور پردے میں محبت اہل بیت کے ان کی شان میں کیا کچھ بکتے ہیں جس کے سننے سے بدن پر ریشہ جس پر خیال کرنے سے دل کو لرزہ ہوتا ہے، خیال کرو کہ بے عزتی کو شجاعت کہتے ہیں، بے حیائی کو صبر سے تعبیر کرتے ہیں..... اے یارو! یہ کیسے اہل بیت کے دوست ہیں کہ ان حضرات عالی درجات پر جن کی شان میں آیہ تطہیر نازل ہوئی، جن کی عصمت و عفت پر پاکی نے قسم کھائی ان کی نسبت کیا کیا کہتے ہیں..... اے بھائیو! صبر اسی کا نام ہے کہ ایک منافق بیٹی کو غضب کر لے اور بہ جبر و اکراہ ناجائز نکاح کر لے اور حضرات علیہم السلام بیٹھے بیٹھے دیکھا کریں اور سوائے سکوت کے زبان سے بھی کچھ نہ فرمائیں اور باوصف عطاءے قوت و معجزہ و کرامات کے صبر و تحمل اختیار کریں۔ خدا کی قسم ہے کہ میں تعصب کو دخل نہیں دیتا اور اپنے مذہب پر خیال نہیں کرتا بلکہ صرف عقل و حیا سے پوچھتا ہوں کہ جس کا نام حضرات شیعہ نے صبر رکھا ہے اور جس حالت کو صبر و تحمل سے تعبیر فرمایا ہے حقیقت میں وہ صبر و تحمل ہی ہے یا اس کی حقیقت کچھ اور ہے، میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ انہوں نے بے حیائی اور بے عزتی کا نام صبر و تحمل رکھا ہے اور محبت کے حیلے سے اہل بیت کو ذلیل کیا ہے۔ (نعوذ باللہ نعوذ باللہ) یہ کیا خرافات ہے جو شیعہ لکھتے ہیں۔ ابھی کسی ادنیٰ آدمی کے گھر جا کر کوئی شخص، گروہ شجاعت میں بے نظیر اور قوت میں لاثانی اور مال و دولت میں لاجواب ہو اس کی بیٹی سے بہ جبر و اکراہ نکاح کرنے کا قصد کرے پھر تماشا دیکھے کہ وہ عامی چپ چاپ رہتا ہے یا اپنی جان و عزت قربان کرتا ہے۔ معلوم نہیں کہ حضرات شیعہ نے امیر المومنین یعسوب الدین صاحب ذوالفقار جد ائمہ اطہار کی عزت و ہمت اور شجاعت کو ایک ادنیٰ آدمی کے برابر بھی خیال نہ کیا اور وقاحت (بے حیائی) کو بنام صبر و تحمل کے قرار دیا ہے اور طرفہ ماجرا یہ ہے کہ ایسی وقاحت کی باتیں ان کی طرف منسوب کرتے جاتے ہیں اور ایسے الزام ان کو دیتے جاتے ہیں اور پھر بھی ان کو غالب کل غالب مطلوب کل طالب امیر البررة، قاتل الکفرة و الفجرة، سید الابرار، مخاطب بہ لافتا الاعلیٰ لاسیف الاذوالفقار کہتے جاتے ہیں۔ نہ خدا سے شرماتے ہیں، نہ رسول ﷺ کا

لحاظ کرتے ہیں۔ حقیقت میں دین و ایمان کو حضرات شیعہ نے بگاڑا اور شریعت محمدیؐ کو انہوں نے درہم برہم کیا اور شیطان کا نام بدنام ہوا۔ یہ باتیں شیطان کے دادا کو بھی نہ سوجھی ہوں گی جو ان حضرات کو سوجھی ہیں، شعر.....

کارِ زلفت تسل مشک افشانی اما عاشقان
مصلحت را تہمتے بر آہو چین بستہ اند

”مشک افشانی آپ کی زلفوں کا کارنامہ ہے لیکن عاشقوں نے چینی ہرن کو مصلحتاً الزام دے رکھا ہے۔“

اب میں قصہ لوط علیہ السلام کا بھی مختصر جواب لکھتا ہوں اور آیت کریمہ کی تفسیر بیان کرتا ہوں، پوشیدہ نہ رہے کہ آیت مذکورہ کے یہ معنی نہیں ہیں جو حضرات شیعہ نے تصور کیے ہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام نے ویسے ہی بلا نکاح اپنی بیٹیاں زنا کرنے کے لیے کسی کے سامنے پیش کر دی ہوں بلکہ مراد حضرات لوط علیہ السلام کی پیش کرنے سے یہ ہے کہ تم ان سے نکاح کر لو اور چونکہ اس وقت تک کافر کے ساتھ نکاح جائز تھا، اس لیے اس میں کوئی قباحت شرعی نہ تھی اس واسطے حضرت لوط علیہ السلام کی طرف سے خدا نے یہ الفاظ فرمائے ہیں کہ ﴿هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ﴾ کہ حضرت لوط علیہ السلام نے یہ فرمایا کہ یہ میری بیٹیاں ہیں جو تمہارے واسطے پاک و پاکیزہ ہیں اور طہارت بے نکاح کے نہیں ہوتی۔

اگر کوئی شیعہ کہے کہ ہم اس امر کو نہیں مانتے لفظ نکاح آیت میں نہیں ہے۔ اس لیے جواب میں ہم کہیں گے کہ وہ تفسیروں کو ملاحظہ کریں اور سنیوں کی تفسیروں کو نہ دیکھیں اپنی ہی تفاسیر سے اس کی سند لیں، چنانچہ امین الدین طبرسی ”مجمع البیان“ میں جو کہ نہایت معتبر تفاسیر شیعہ سے ہے اور طہران دارالسلطنت ایران میں چھپی ہے اسی آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں:

﴿قَالَ يَا قَوْمِ هُوَ لَاءِ بَنَاتِي هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ وَكَانَ يَجُوزُ فِي شَرْعِهِ
تَزْوِيجُ الْمُؤْمِنَةِ مِنَ الْكَافِرِ﴾

”لوط علیہ السلام نے) کہا: اے میری قوم! یہ میری بیٹیاں تمہارے لیے پاک ہیں۔

ان کی شریعت میں مومنہ کا نکاح کافر کے ساتھ جائز تھا۔“

اگر کوئی دانش مند شیعہ یہ کہے کہ گو اس آیت کے ان الفاظ سے مطلب نکاح کا ہو لیکن دوسری آیت میں تو صاف فعل کرنا مذکور ہے کہ ﴿هُوَ لَا يَبْنَانِي إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ﴾ کہ

حضرت لوط علیہ السلام نے کہا کہ یہ میری بیٹیاں ہیں اگر تم کرنے والے ہو تو کرو۔ اس کے جواب میں بھی ہم انہیں کی تفسیروں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور جو ان آیات کا مطلب انہوں نے بیان کیا ہے اس کو نقل کرتے ہیں۔ چنانچہ تفسیر ”مجمع البیان“ میں علامہ موصوف فرماتا ہے:

((قَوْلُهُ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ كِنَايَةٌ عَنِ النِّكَاحِ أَيْ إِنْ كُنْتُمْ

مُتَزَوِّجِينَ .))

”حضرت لوط علیہ السلام کا کہنا ﴿إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ﴾ فعل سے مراد نکاح ہے۔

اگر تم کرنا چاہتے ہو تو نکاح کرو۔“

اگرچہ حضرات شیعہ کو ایک تفسیر پر اطمینان نہ ہو تو دوسری تفسیر کی عبارت بھی سنیں کہ علماء شیعہ کے فاضل کا شانی ”خلاصۃ المنہج“ میں اسی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

((گفت لوط اے گروہ من اینہا دختران من اندایشان را

بخواہید کہ ایشان پاکیزہ اند شمار او تزویج دختران بشرط

ایمان بودہ یا در شریعت او تزویج مومنات بکفار جائز

بود .))

”لوط علیہ السلام نے کہا اے میری قوم! یہ میری لڑکیاں ہیں ان کو لو کہ یہ تمہارے لیے

پاک ہیں۔ لڑکیوں کی شادی بشرط ایمان تھی یا ان کی شریعت میں مومن عورتوں

کی شادی کافروں سے جائز تھی۔“

الحاصل قصہ لوط علیہ السلام کی واقعہ نکاح ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے کیا مناسبت ہے، دونوں میں بڑا

فرق ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی شریعت میں مومنہ کا نکاح کافر کے ساتھ جائز تھا اور ان کا کہنا

زنا کے لیے نہ تھا بلکہ نکاح کے واسطے تھا اور پیغمبر خدا ﷺ کی شریعت میں آخر کو کافر کے ساتھ نکاح حرام ہو گیا تھا اور مطابق اصول شیعہ کے دشمن اہل بیت اور ناصبی کے ساتھ بھی نکاح حرام تھا..... علاوہ بریں حضرت لوط علیہ السلام کی بیٹیوں کو کوئی غصب کر کے نہیں لے گیا نہ ان کی عفت و عصمت میں خلل آیا اور یہاں تو معاملہ برعکس ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نکاح بھی بہ جبر کر لیا جو کہ شرعاً جائز نہ تھا اور پھر ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو اپنے گھر لے گئے اور چند سال تک رکھا اور ان سے اولاد پیدا ہوئی۔ پس دونوں شخصوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اے حضرات شیعہ! کہاں تک باتیں بناؤ گے، کیا کیا تاویلیں کرو گے، جو کچھ کہو گے اس میں ہی جھوٹے ٹھہرو گے، جو کچھ تاویل کرو گے اسی سے اہل بیت پر الزام دو گے۔ اس بحث کو اوّل سے آخر تک دیکھ لو کہ جو کچھ ہم کہتے ہیں وہ سچ ہے یا جھوٹ۔ اب لاف (ڈینگ) محبت اہل بیت نہ مارو اور صاف صاف ان کی دشمنی کا اقرار کرو اور اپنے ہر عقیدے اور ہر مسئلے پر غور کر کے انصاف کرو کہ اس سے اہل بیت کی محبت ظاہر ہوتی ہے یا عداوت، اگر محبت اہل بیت ہوتی تو کیا ان کے جناب پاک کی نسبت ایسی ایسی بے شرمی کی باتیں منسوب کرتے، ان کی شان میں ایسی ایسی بے عزتیاں بیان کرتے۔ استغفر اللہ، استغفر اللہ۔ شعر.....

جامی چہ لاف میزنی از پاک دامنی

بر خرقہ تو ایں ہمہ داغ شراب چست

چونکہ حضرت لوط علیہ السلام کے قصہ کا جواب بھی بخوبی ہو چکا، اب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے کا کچھ بیان کرتا ہوں۔

بعض حضرات شیعہ نے فرمایا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بی بی سارہ علیہا السلام کو بھی ایک بادشاہ جابر نے زبردستی چھین لیا تھا اور اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام سے سوائے صبر اور دعا کے کچھ نہ ہوا۔ چنانچہ مؤلف ”سیف صارم“ اس مضمون کو اس عبارت سے بیان کرتا ہے، و هو ہذہ بلفظہ:

”علاوہ اس کے تفسیر عزیزی سے ایک اور مختصر مضمون مقام حاجت ہم لکھتے ہیں،

زیادہ تفصیل تفسیر مذکور میں وہ دیکھ سکتے ہیں کہ ان کے پیر عزیز کی ہے المختصر کہ سارہ بی بی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کہ بہت خوبصورت تھیں بہ سبب ظلم و جور اشیاء کے اپنے خاوند ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ سر بصر ا نکلیں، جب مصر میں پہنچیں تو وہاں کا بادشاہ نہایت جبار تھا، اس کی عادت تھی کہ جو عورت خوش رو ہوتی تھیں اس کے خاوند کو مار ڈالتا تھا اور بھائی بند ہوتا تو اس سے چھین لیتا تھا غرض ان پر بھی وہی نوبت پہنچی کہ پیادے ظالم کے حضرت پاس آئے اور پوچھا کہ یہ عورت تمہاری کون ہے؟ حضرت نے کہا کہ بہن ہے، یعنی مراد حضرت کے دل میں یہ تھی کہ دینی بہن ہے اور اولاد آدم، منصف فہم اس جگہ سے طریقہ تقیہ اور شعار انبیاء ایسے مقامِ مجبوری و اضطراب میں خیال کر سکتا ہے کہ اوصیاء کو اسوۃ اقتداء با انبیاء ہوتی ہے اور مومنین کو ان سے، تو ناصح صاحب کو اگر کچھ بھی قوتِ منفعہ ہو تو سوچیں اور شرم کریں کہ ان کے پیر عزیز خود کیا لکھتے ہیں، غرض کہ پیادگانِ شاہِ مذکور نے ابراہیم علیہ السلام کو تو چھوڑ دیا اور حضرت سارہ علیہا السلام خاتون کو زبردستی لے گئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب ان کا یہ حال دیکھا تو نماز و دعا میں مشغول ہوئے اور حضرت سارہ علیہا السلام جب اس شقی کے پاس پہنچیں وہ شقی عاشق ہو گیا اور چاہا کہ بے ادبی کرے بالجملہ حضرت سارہ علیہا السلام نے دعا کی، اس کا حال یہ ہوا کہ دونوں ہاتھ خشک ہو گئے بد حال ہوا انجام کو حضرت سارہ علیہا السلام نے دعا کی اچھا ہو گیا پھر بد ذاتی کی، پھر وہی حال ہوا غرض تیسری دفعہ حضرت سارہ علیہا السلام کو رخصت کیا اور ہاجرہ علیہا السلام حوالہ کیں۔“

ہم اس تحریر پر بھی آفریں و مرحبا کہتے ہیں اور اس قصے کے اس موقع پر ذکر کرنے پر شاباش شاباش کہہ کر مؤلف کا دل بڑھاتے ہیں کہ اس نے ایسے قصے کو چھیڑا جس سے ہمارا مطلب حاصل ہوتا ہے اور ہم کو ایک حجت اُن پر ہوتی ہے، لیکن سخت حیرت ان کی عقل اور سمجھ پر ہے کہ اس میں انہوں نے اپنا کیا فائدہ تصور کیا ہے، یعنی خلاصہ اس قصے کا یہی ہے کہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بی بی سارہ علیہا السلام کو اس بادشاہ جابر کے آدمی پکڑ لے گئے اور جب اس شقی نے بے حرمتی چاہی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا سے دعا کی خدا نے اس کا ہاتھ خشک کر دیا اور ان کی بی بی کی عصمت کو بچا دیا بلکہ ایسا معجزہ دکھلایا کہ جس کے سبب سے اس نے ایک لونڈی ہاجرہ علیہا السلام اور نذر کی..... اب کوئی اس قصے کو حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے حال سے ملائے کہ مطابق ہے یا مخالف اگر حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہوتا کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو اپنے گھر لے گئے تھے تب حضرت علی رضی اللہ عنہ خدا سے دعا کرتے اور اللہ جل شانہ حضرت ابراہیم کی طرح ان کی عصمت بچانے کے لیے عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ خشک کر دیتا اور ان کو ڈرا دیتا اور وہ معجزہ دیکھ کر صحیح و سالم ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر بھیج دیتے بلکہ اپنی طرف سے ایک لونڈی اور پیش کش کرتے اور اپنی تقصیر معاف کراتے تو بے شک ابراہیم و سارہ علیہما السلام کا قصہ ان کے حال کے مطابق ہوتا حالانکہ برخلاف اس کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زبردستی ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح کر لیا اور آٹھ دس برس تک ان کو اپنے گھر رکھا اور ایک بیٹا اور ایک بیٹی بھی ان سے پیدا ہوئی اور ان کے جیتے جی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا ان کے گھر رہیں اور ان کی وفات کے بعد حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے بیٹے کے ساتھ ان کا نکاح ہوا..... پس تعجب ہے کہ خدا نے حضرت سارہ علیہا السلام کی عصمت بچانے کے لیے تو معجزات دکھلائے، بادشاہ جابر کا ہاتھ بھی خشک کر دیا اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا بنت فاطمہ بنت رسول کے غضب کا ایک منافق مرتد نے ارادہ کیا تو نہ خدا کے دریائے غیرت کو جوش ہوا نہ اس کا قہر و جلال ظاہر ہوا نہ اس نے کوئی معجزہ دکھلایا، نہ اس غاصب کا ہاتھ خشک کیا، نہ کسی اور طرح اپنے رسول ﷺ کی نواسی کو بچایا..... پس سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ شیعوں کا خدا بھی عمر رضی اللہ عنہ سے ڈر گیا اور اس نے بھی خوف کے مارے کچھ دم نہ مارا یا یہ کہ اپنے رسول کے وصی کی طرح اس نے بھی صبر کیا اور تحمل فرمایا۔ چونکہ ادنی آدمیوں کو ایسے معاملات میں بے صبری ہو جاتی ہے اور وہ جان دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں مگر چونکہ امام اور وصی کا رتبہ اور درجہ سب سے بڑا ہوتا ہے، اس لیے انہوں نے ایسے معاملات میں بھی صبر کیا۔

(نعوذ باللہ من ہفواتہم و سوء عقیدتہم۔)

اس قصے میں ایک جاہلانہ شبہ اور رہا جاتا ہے جس کا رفع کرنا بھی مناسب ہے، وہ یہ ہے کہ تواریخ و سیر سے ثابت ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بی بی کو اس جابر شقی نے پکڑوایا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا سے دعا کی اس دعا پر خدا نے معجزہ دکھلایا اور اس کا ہاتھ خشک کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے جانے کے بعد دعا نہیں کی کہ خدا اس کو قبول کرتا اور معجزہ دکھلاتا۔ فقط

بے شک یہ سچ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دعا نہیں کی اور یہ بھی درست ہے کہ جب خود حضرت امیر جن کی بیٹی غصب کی گئی خاموش ہو گئے تو خدا کیا کرتا، وہ بغیر دعا اور سوال کے کیوں اپنا قہر نازل کرتا لیکن حضرت امیرؓ کو دعا سے مانع کون تھا، انہوں نے کیوں سکوت فرمایا اور دعا کے لیے انہوں نے اپنے گھر میں رات کے وقت کیوں دروازہ بند کر کے ہاتھ نہ اٹھائے، اگر مقابلہ کرنے میں جان کا خوف اور لڑنے میں قتل کا اندیشہ تھا تو خیر ایک مجبوری تھی، جس کے باعث خاموش ہو گئے، لیکن گھر میں رات کے وقت کس کا ڈر تھا جس کے سبب سے دعا تک نہ مانگی..... شاید خیال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہوگا کہ وہ اکثر رات کو بھی گشت کے لیے نکلا کرتے اور لوگوں کی خبر لیا کرتے تھے۔ اگر کہیں حضرت امیرؓ کو دعا کرتے سن لیتے تو شاید ان کو تکلیف دیتے اور پھر وہی امر پیش آجاتا جس کے لحاظ سے حضرت امیرؓ ساکت ہو گئے تھے، یعنی خوف قتل۔ مگر یہ خیال اس وقت کرنا ضرور تھا جبکہ دعا کے لیے چلانا ضروری ہوتا، حالانکہ جہر دعا کے لیے ضروری نہیں ہے خدا دل کی دعا کو بھی ویسا ہی سنتا ہے، جیسا کہ زبان سے چلانے کو سنتا ہے۔ پس دل ہی سے دعا کرتے اور زبان سے کچھ نہ فرماتے غرض تو مطلب حاصل ہونے سے تھی پس حضرت امیرؓ کے مقابلہ نہ کرنے کا سبب تو ہم نے مانا کہ جان کا خوف تھا اور آواز سے دعا نہ کرنے کے لیے بھی ہم نے معذور تصور کیا کہ اندیشہ عمر رضی اللہ عنہ کے سن لینے کا تھا لیکن دل سے دعا نہ کرنے کا کوئی سبب سمجھ میں نہیں آتا..... کاش! کوئی شیعہ ہم کو یہ بتلا دے اور ہمارا شبہ دور کر دے۔

اگر کوئی دانش مند یہ فرمائے کہ جب نکاح کر دیا تو پھر دعا مانگنے کی کیا ضرورت تھی، معاذ اللہ! معاذ اللہ! عمر رضی اللہ عنہ زانی اور فاسق نہ تھے جن کے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح کرنے سے حضرت علیؑ کچھ لحاظ فرماتے تو بس یہی قول ہمارا ہے پھر روایت (ذَلِكَ فَرَجٌ غُصْبِنَاهُ) کو کیا کریں گے، اور ان صدہا اوراق کو جو اس نکاح کی توجیہ کے لیے علماء نے سیاہ کیے ہیں، کس آنکھ کے پانی سے دھوئیں گے، اگر نفس الامر یہی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے راضی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خوش تھے اور دونوں ایمان اور اخلاص میں ایک دوسرے پر بھروسہ رکھتے تھے، اس لیے اپنی خوشی سے نکاح کر دیا تو بس جھگڑا طے ہوا لیکن مذہب تشیع کا بطلان کا شمس فی نصف النہار ثابت ہوا۔ اگر حقیقت میں یہ بات جو ہم نے بیان کی حضرات شیعہ تسلیم کر لیں تو ان کو سوائے اپنے مذہب کے چھوڑنے کے دوسرا چارہ نہیں ہے اور اسی واسطے ان کے علماء نے ہزاروں قسم کی تاویلات فرمائیں جن کی ضرورت نہ تھی لیکن اصل حقیقت کے بیان کرنے سے چشم پوشی کی، کسی نے خوفِ جان کا عذر بیان کیا، کسی نے اس کو صبر و تحمل پر محمول کیا، کسی نے اس کے معارضے میں حضرت لوط علیہ السلام کے قصے کو پیش کیا، کسی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بی بی سارہ کے پکڑے جانے کو بطور نظیر بیان کیا، کسی نے حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی شکل پر جنیہ کی شکل ہونے کا دعویٰ کیا..... بہر حال یہ سب نظیریں اور مثالیں اور حکایتیں بیان کرنا اور اس کے عذرات اور وجوہات پیش کرنا بلکہ اس نکاح کو مثل مردار کے کھانے کے جو ضرورتاً شرعاً حلال ❶ ہو جاتا ہے سمجھنا کس لیے ہے، اس لیے تا کہ یہ ثابت نہ ہو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی زوجیت کے لائق تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوشی سے ان کے ساتھ نکاح کیا..... پس ایک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت سے انکار کے واسطے کیا کیا توجیہات کی ہیں اور کیسے کیسے الزام حضرات اہل بیت پر دیے ہیں کہ کچھ ہو خواہ اہل بیت بدنام ہوں، خواہ ان کی بناتِ طیبات مغصوبہ ٹھہریں، خواہ اولیاء پر بے شرمی کا الزام

❶ جیسا کہ صاحب ”نزہہ“ نے لکھا ہے کہ تجویز تزویج در مقام ضرورت واضطرار از باب رخصت است، چنانچہ تجویز

آئے سب کچھ منظور اور قبول ہے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا اقرار نہ کیا نہ کرتے ہیں نہ کریں گے۔

دوسری تاویل وصیت..... ہم اوپر صبر و تحمل کی تاویل کا جواب دے چکے اب دوسری تاویل کو بیان کر کے اس کا رد کرتے ہیں۔

جب حضرات شیعہ نے خیال کیا کہ صبر کی تاویل درست نہیں ہے اور بغیر کسی وجہ خاص کے ایسے نازک معاملے میں تحمل کا عذر صحیح نہیں ہے، اس لیے اس کی تائید دوسری طرح سے کی اور اس کے لیے ایک وجہ خاص پیدا کی، یعنی وصیت کرنا پیغمبر خدا ﷺ کا کہ حضرت سرور کائنات اپنے وصی اور امام اوّل کو وصیت فرما گئے تھے کہ وہ سوائے صبر کے کچھ نہ کریں اور جو ظلم و ستم خلفاء جو رکریں ان کی برداشت کریں اور جو جو واقعے پیش آنے والے تھے سب حضرت ﷺ جناب امیر سے کہہ چکے تھے اور ہر ایک واقعے پر صبر و تحمل کی وصیت کر گئے تھے تو پھر کیوں کر ممکن تھا کہ وصی نبی کے حکم کے خلاف کرتے اور صبر کو چھوڑ دیتے۔ چنانچہ اس مضمون کو قاضی نور اللہ شوستری نے اپنے ”مصائب“ میں بیان کیا ہے جس کا ترجمہ فارسی ”ازالۃ الغین“ میں مذکور ہے، ہم اس کو نقل کرتے ہیں، وہو ہذہ:

((و بعضے از جہاں ایشاں گفته اند کہ چہ گنجائش دارد کہ علیؑ تسلیم نکاح کند ابنة خود را برینکہ شما وصف کردید وما میگوئیم کہ این سخن جہل ست بہ وجود تدبیر و بیان این آنست کہ چون رسول خدا ﷺ وصیت کرد علیؑ را بانچہ محتاج بود در وقت وفات و معلوم او گردانید جمیع آنچه جاری خواهد شد از امر مستولین و احداً بعد و احدٍ پس علی گفت مرا بچہ امر میکنی آنحضرت فرمود صبر کن تا مردم رجوع کنند بسوی تو از روی طوع پس آن هنگام قتال کن با ناکشین و قاسطین و مارقین و با احدی از ثلاثہ منازعت مکن

تا خود را بدست خود در تہلکہ نیندازی و مردم از نفاق بشقاق بر کردند پس علی علیہ السلام حافظ وصیت رسول خدا ﷺ بود بواسطہ حفظ دین تا مردم بہ جاہلیت بر نہ گردند و چون عمر رضی اللہ عنہ خواستگاری ام کلثوم رضی اللہ عنہا نمود علی رضی اللہ عنہ متفکر شد و گفت اگر مانع شوم او قصد قتل من خواهد کرد واگر قصد قتل من کند و ممانعت کنم اور از نفس خود بیرون روم از اطاعت رسول خدا ﷺ و مخالفت وصیت او میکنم و داخل میشود در دین آنچه مذکور میکرد از ان رسول خدا ﷺ پس تسلیم ابنہ درین حال اصلح بود از قتل او و بیرون رفتن از وصیت رسول خدا ﷺ پس تفویض نمود امر اور ابخدا و دانستہ بود کہ آنچه عمر غضب کرد از اموال مسلمانان و ارتکاب کردہ از انکار حق او و قعود بجای رسول خدا ﷺ و تغیر احکام الہی و تبدیل فرائض خدا، چنانچہ گزشت اعظم است نزد حق تعالی و اقطع و از اشنع است از اغتصاب ایس فرج پس تسلیم کرد و صبر نمود، چنانچہ رسول خدا ﷺ امر نموده بود.))

”بعض جاہل کہتے ہیں کہ جب یہ حالات تھے جو تم نے بتائے تو ایسے میں علیؑ کو اپنی بیٹی کے نکاح کر دینے کو مان لینے کی کیا گنجائش تھی؟ اس کا جواب ہمارے پاس یہ ہے کہ اس قسم کی گفتگو جہالت ہے، واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ کو ضروری امور کی وصیت کی اور اپنی وفات کے وقت حضرت علیؑ کو لفظ بہ لفظ وہ سب کچھ بتا دیا جو ان کے بعد ہوگا۔ اس پر علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں۔ ارشاد ہوا اس وقت تک صبر کرو جبکہ لوگ تمہاری جانب

بحیثیت اطاعت و فرمانبرداری رجوع ہوں اور پھر اس وقت معاہدہ شکن ظالموں اور دین سے خارج ہونے والی جماعت سے جنگ کرنا اور خلفائے ثلاثہ میں سے کسی سے تنازعہ نہ کرنا تا کہ خود ہلاک نہ ہو اور لوگوں کے نفاق و اختلاف سے بچے رہو، پس حضرت علیؓ دراصل رسول اللہ ﷺ کی وصیت کے بلحاظ حفاظت دین نگہبان تھے تا کہ جاہلیت اور کفر کو دوبارہ اختیار نہ کر لیں اور جب عمر رضی اللہ عنہ نے ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے لیے پیغام بھیجا تو علیؓ متفکر ہوئے اور کہا کہ اگر میں اس میں مانع و مزاحم ہوں تو یہ مجھے قتل کرے گا، اگر یہ میرے قتل کا ارادہ کرے اور میں اپنی جان بچانے کے لیے اس کو منع کروں تو رسول اللہ ﷺ کی اطاعت سے خارج ہوا جاتا ہوں اور ان کی وصیت کے خلاف عمل کرتا ہوں، لہذا دین میں خلل واقع ہوگا، یہ سوچ کر بیٹی دینا بہتر سمجھا اور معاملہ اللہ کے حوالے کر دیا درآں حالیکہ علی واقف تھے کہ عمرؓ نے مسلمانوں کا مال غصب کیا اور ان کے حق کا انکار کرتے ہوئے رسول اللہ کی جگہ بیٹھ گئے، احکام الہی میں تبدیلی و تحریف کی، چنانچہ یہ سب باتیں بہ نسبت اس ایک شرمگاہ کے غصب کے اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ فتنج اور بری تھیں، لہذا اپنی بیٹی سپرد کردی اور صبر کیا، جیسا کہ فرمان رسول ﷺ تھا۔“

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ حضرت امیرؓ کو پیغمبر خدا ﷺ نے وصیت کی کہ تم خلفائے ثلاثہ کے عہد میں کچھ نہ کہنا اور کچھ نہ کرنا، جو ظلم و ستم وہ چاہیں کریں سر نہ ہلانا، جو کچھ وہ چاہیں غصب کریں کچھ نہ بولنا، اسی واسطے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اصل معاملہ امامت و خلافت میں کچھ دم نہ مارا اور سکوتِ کامل اختیار فرمایا..... حالانکہ عمرؓ کے خلیفہ ہونے سے جو کچھ خرابیاں ہوئیں وہ ظاہر ہیں۔ پس خلافت کا غصب کرنا اور مسلمانوں کے مال پر متصرف ہونا اور جناب امیرؓ کو الگ کر کے خود پیغمبر خدا ﷺ کی جگہ پر بیٹھنا خدا کے نزدیک بہت فتنج اور شنیع تھا، بہ نسبت غصب کرنے فرج ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے۔ پس جب ایسے بڑے فتنج اور شنیع معاملے میں

یعنی غصبِ خلافت میں حضرت پیغمبر خدا ﷺ کی وصیت کے سبب سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صبر کیا تو پھر ایک بیٹی کی شرمگاہ غصب کرنے پر صبر فرمایا تو کیا تعجب ہے؟

اور اس تقریرِ لطیف کو لکھتے لکھتے قاضی نور اللہ شوستری ”مصائب النواصب“ میں اپنی حیا و شرم کے جوہر دکھلاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ خلافت کا دعویٰ کرنا جو عمر رضی اللہ عنہ نے کیا اور مسند رسول ﷺ پر بیٹھنا خدا کے نزدیک ہزار فرج کے غصب کرنے سے بھی زیادہ برا تھا، چہ جائے فرجِ واحد، کما ذکر ترجمۃ فی ”ازالة الغین“:

((وآنچه دعویٰ کرد از برائے خود از امامت از روی ظلم و جور و تعدی و خلاف بر خدا و رسول خدا ﷺ و دفع امامے کہ نصب کرده اور اخدا و رسول خدا و استیلاء او بر امور مسلمانان، پس حکم بہ خلاف خدا و رسول اعظم ست نزد حق تعالیٰ از اغتصاب ہزار فرج از زنان مومناں چہ جائے فرج واحد.))

”عمر رضی اللہ عنہ نے ظلم و ستم کے ذریعے جو اپنی خلافت و امامت کا دعویٰ کیا اللہ اور رسول کے حکم کی خلاف ورزی کی خدا اور رسول کے مقرر کیے ہوئے امام کو ہٹا دیا اور مسلمانوں کے امور پر قبضہ جمایا۔ پس خدا اور رسول کے حکم کی خلاف ورزی خدا تعالیٰ کے نزدیک مومن عورتوں کی ہزار فرجوں (شرمگاہوں) کے غصب سے زیادہ بڑی ہے بہ نسبت ایک (ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی) فرج کے۔“

اے مومنین با حیا! اور اے شیعین با صفا! تم کو اپنی حیا اور صفائی کی قسم ہے کہ قاضی نور اللہ شوستری کی اس تقریرِ لطیف کی لطافت دیکھو اور اس کے الفاظ اور مضامین کو سوچو کہ ائمہ اطہار اور بناتِ طیبات کی نسبت کیا کچھ فرمایا ہے اور نکاحِ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو کن لفظوں سے تعبیر کیا ہے..... سبحان اللہ جناب سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی محبت کا دعویٰ بھی کرنا اور ان کی بناتِ طاہرات پر ایسی تہمت بھی کرنا اور ایسی بے ادبی کے الفاظ ان کی شان میں زبان

سے نکالنا قریب ہے کہ زمین شق ہو جائے، آسمان سے قہر کی بجلی گرے کہ کس منہ سے کس کی شان میں کیا کہتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا اس معصومہ کی بیٹی ہیں جن کی صورت کسی نے نہیں دیکھی، جس کی عفت کی عصمت نے قسم کھائی..... جب قیامت کے دن میدانِ حشر میں ان کا گزر ہو گا تب منادی ندا کرے گا کہ (غَضُّوا أَبْصَارَكُمْ) یعنی سب اپنی آنکھیں بند کر لو کہ رسولؐ کی بیٹی عقیقہ معصومہ گزرتی ہے، کسی کی ان پر نظر نہ پڑے غرضیکہ جس کی ماں کی عصمت کی خدا کے نزدیک یہ قدر و منزلت ہو اس کے جگر گوشہ کی حضرات امامیہ ایسی فضیلت و رسوائی بیان کریں اور جو باتیں ایک عامی کی نسبت کسی کی زبان سے نہ نکلیں ان کو ایسی جناب کی شان میں بیان کریں..... رہا عذر و وصیت رسول خدا ﷺ کا یہ ایسا عذر ہے کہ نہ عقلاً لائق تسلیم ہے نہ نقلاً..... عقلاً اس لیے کہ پیغمبر خدا ﷺ ہدایتِ خلق کے لیے مبعوث ہوئے تھے ان کا کام تھا خود وہ کام کرنا جس میں لوگ گمراہی سے بچیں اور اوروں سے خصوصاً اپنے جانشینوں اور وصیوں سے وہ کام کرنا جس میں خلق خدا ضلالت سے محفوظ رہے..... پس کیوں کر عقل قبول کرے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے یہ وصیت حضرت امیرؓ کو کی ہو کہ گو خلفائے ثلاثہ خلافت کو غصب کریں اور تمہارا حق چھین لیں اور لوگوں کے مال پر متصرف ہو جائیں اور خدا کی کتاب میں تحریف کریں اور میری سنت کو بدلیں اور تمہاری بیٹیوں کو چھین لے جائیں مگر دم نہ مارنا اور چپ رہنا اور یہ سب جو رستم اپنے نفس پر گوارا کرنا..... بھلا کس کی سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے ایسا فرمایا ہو، (نعوذ باللہ منہ) اس سے بڑھ کر اور کیا تہمت پیغمبر خدا ﷺ پر ہوگی..... رہا یہ عذر کہ یہ اس وجہ سے پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا تھا کہ لوگ ظاہر اسلام نہ چھوڑ دیں اور علانیہ کفر و شرک نہ کرنے لگیں..... تو یہ امر بھی عقل کے خلاف ہے، اس لیے کہ اگر وہ لاکھوں آدمی جنہوں نے برسوں پیغمبر خدا ﷺ کی صحبت پائی ہو اور جنہوں نے ابتدائے اسلام سے اس کی ترقی کے وقت تک وقتاً فوقتاً ایمان قبول کیا ہو اور جنہوں نے جہاد اور لڑائیوں میں اپنی جان دینے میں دریغ نہ کیا ہو اور جنہوں نے اپنی آنکھ سے ہزار ہا معجزات دیکھے ہوں اور جن کی شان میں خدا نے آیاتِ فضیلت نازل

کی ہوں وہ سب کے سب (اَلَا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ) ایسے منافق اور ناقص ایمان والے ہوں کہ وہ سب حضرت علیؑ کے خلفائے ثلاثہ کے ساتھ مقابلہ کرنے سے ظاہری اسلام کو بھی چھوڑ دیں اور اپنے کفر اصلی کو ظاہر کر دیں اور اعلانیہ مشرک ہو جائیں اور باوجودیکہ حضرت امیرِ حق پر ہوں اور صرف مسلمانوں کی جانوں اور مالوں کو ان کے دستِ تعدی سے محفوظ رکھنے اور خدا کے دین کو تغیر و تبدل سے بچانے اور لوگوں کے گمراہ نہ ہونے کے واسطے وہ ان سے مقابلہ اور مقاتلہ کریں اور پھر بھی کوئی مسلمان ان کا ساتھ نہ دے بلکہ ساتھ دینا کیسا اسی تصور میں حضرت علیؑ کو چھوڑ دیں اور ظاہری اسلام سے ہاتھ اٹھا کر بت پرستی اختیار کر لیں تو ایسی جماعت کے ایمان و اسلام سے کیا فائدہ تھا اور بلکہ ان کا مسلمان رہنا اور کافر ہو جانا برابر تھا تو پھر پیغمبر خدا ﷺ کا وصیت فرمانا اور حضرت علیؑ کو بہ خیال کافر نہ ہونے ان لوگوں کے صبر پر تاکید کرنا کیا ضروری تھا۔ اس لیے کہ جس امر کا اندیشہ تھا کہ لوگ ایمان و اسلام سے نہ پھر جائیں وہ موجود ہی تھا اور وہ سب کے سب ایمان و اسلام سے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے ورنہ خیال کرنا چاہیے کہ اگر حضرت علیؑ اس بات پر کہ ان کی خلافت خلفائے جور نے غصب کی اور لوگوں کے مالوں پر تصرف کیا اور سنت نبوی ﷺ کو بدل دیا اور رسول ﷺ کی نواہی کو غصب کر لے گئے ان خلفاء سے مقابلہ کرتے اور اصحاب رسول ﷺ سے مدد چاہتے تو وہ بجائے مدد دینے کے کلمہ شہادت سے بھی منکر ہو جاتے اور خدا کی توحید اور رسول ﷺ کی رسالت کا بھی انکار کرنے لگتے تو پھر ان کے اسلام کا لحاظ کیا ضروری تھا۔ اگر ایسے دلی کافر ظاہری مسلمان ظاہر میں کلمہ گورہتے تو کیا اور بت پرست ہو جاتے تو کیا، صرف ان کے ظاہری اسلام کے لحاظ سے اس قدر ظلم و ستم اٹھانا اور خدا کے دین کو غارت ہونے دینا اور بیٹیوں کو چھین لے جانے دینا کیا معنی اور ایسے لوگوں کی خاطر وصیت کرنا پیغمبر خدا ﷺ کا اور صبر و تحمل پر ثابت قدم رہنے کی اپنے وحی کو تاکید کرنے سے کیا حاصل تھا۔

اے حضرات! یہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے نکاح کا معاملہ ایسا آسان نہیں کہ (اِنَّ ذَالِكَ فَرَجٌ

غُصْبَنَاهُ) کہہ کر اس کو ٹال دو اور اس کو ایسی پوچ لچر باتوں میں بہلا دو ذرا انصاف کرو کہ

اگر کسی شخص کا غلام یا خدمت گار یا ملازم جس نے چند ہی روز اپنے آقا کا نمک کھایا ہو وہ دیکھے کہ اس آقا کے مرنے کے بعد کوئی شخص اس کے مال کو غصب کرتا ہے یا اس کے خاندان کی کسی لڑکی کی عزت لیتا ہے بلکہ غصب کرنا کیسا عزت لینا کیسا، وہ یہ سمجھے کہ ایسا ارادہ بھی رکھتا ہے تو اگر وہ نمک حلال ہوگا تو ضرور اپنی جان دینے پر مستعد ہوگا اور اپنے جیتے جی اپنے آقا کی حرمت و عزت میں داغ نہ آنے دے گا..... پس کیا چار لاکھ اصحاب رسولؐ میں ایک بھی ایسا نہ تھا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا شریک ہوتا اور پیغمبر خدا ﷺ کے خاندان کی عصمت و عفت بچاتا، اصحاب رسول کو جانے دو ان سب کو مرتد اور منافق سمجھو، کیا بنی ہاشم میں بھی کوئی شخص نہ تھا جو اپنی بیٹیوں کی عزت بچاتا اور ایک منافق کے دست تعدی سے ان کو محفوظ رکھتا۔ شاید اس کا جواب حضرات شیعہ یہ دیں گے کہ پیغمبر خدا نے صبر کی وصیت کی تھی اور فرما دیا تھا کہ اگر کوئی شخص کتنا ہی ظلم کرے اور گوتمہاری لڑکیوں کو غصب کر لے جائے اور جو چاہے سو کرے مگر کوئی دم نہ مارنا..... تب ہم کہیں گے کہ وہ وصیت جنگِ شام اور صفین میں کیوں بھلا دی گئی اور کس لیے ہزاروں آدمی کا خون کرایا؟ تب شاید فرمائیں کہ اس وصیت میں یہ بھی تھا کہ خلفائے ثلاثہ کے زمانے میں کچھ نہ کرنا مگر معاویہ سے لڑنا..... تب ہم کہیں گے کہ وصیت پیغمبر خدا ﷺ کی کیا ٹھہری، مرزا دبیر اور مرزا انیس کا مرثیہ ٹھہرا کہ جو مضمون ان کے ذہن میں آیا اسی وقت ایک روایت اپنی طرف سے جھوٹی سچی بنالی اور اپنی شاعری دکھلا دی۔ آخر اس وصیت کا کوئی سبب یا کوئی وجہ بھی ہے یا نہیں۔ اگر یہ وجہ ہو کہ نوبت خون ریزی کی نہ پہنچے تو جنگ معاویہ رضی اللہ عنہ میں یہ وجہ موجود تھی کہ ہزار ہا آدمیوں کے قتل کی نوبت آئی اور اگر یہ سبب ہو کہ کوئی اصحاب میں سے شریک نہ ہوگا اور اگر ناحق علی رضی اللہ عنہ کی جان جائے گی تو اس کا حال جنگ معاویہ رضی اللہ عنہ میں کھل گیا کہ تمام مہاجرین اور انصار اور اہل حل و عقد اور بزرگانِ دین حضرت علیؑ کے ساتھ اور ہزاروں ان کی اعانت میں شہید ہوئے تو کیا وہ لوگ جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بعد میں مدد دی پہلے مدد نہ دیتے اور جس طرح معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ لڑے اس طرح خلفاء کے ساتھ نہ لڑتے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ یہ وصیت کا مضمون صرف بنایا ہوا

ہے اور ناحق تہمت رسولِ خدا پر ہے۔ اگر شک ہو تو ہم اس کو نقلاً بھی ثابت کرتے ہیں۔ پوشیدہ نہ رہے کہ قطع نظر دلائل عقلی کے جس سے اس وصیت کا بطلان ثابت ہوتا ہے اگر ہم احادیث و اخبار پر کتب شیعہ کے غور کرتے ہیں تو اس سے بھی اس کا غلط ہونا معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ ماہصل وصیت کا یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلفائے ثلاثہ کے زمانے میں صبر و تحمل کریں اور ان کے کسی ظلم و ستم پر کچھ نہ بولیں۔ پس اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے زمانے میں صابر و شاکر رہے ہوں اور ان کے ساتھ سختی و درشتی کے ساتھ پیش نہ آئے ہوں اور ان کا مقابلہ نہ کیا ہو تو بے شک ہم بھی تسلیم کر سکتے ہیں کہ شاید ایسی وصیت ہوئی ہو لیکن اگر یہ امر ثابت ہو جائے کہ حضرت علیؑ نے اپنے قہر و جلال کا اظہار کیا اور خلفائے ثلاثہ سے بہ سختی پیش آئے اور ان سے مقابلہ کیا اور ان کو ہر طرح پر ڈرایا اور ان کے قتل پر آمادہ ہوئے تو کیوں کر ہم قبول کریں کہ پیغمبر خدا ﷺ نے وصیت کی تھی، اس لیے کہ اگر وہ وصیت کرتے تو ضرور حضرت علیؑ اس پر عمل کرتے اور کسی امر میں چون و چرا نہ فرماتے لیکن چھوٹی چھوٹی باتوں میں تو حضرت امیرؑ ان کا مقابلہ کریں اور مرنے مارنے پر مستعد ہو جائیں اور وصیت نبوی کو بھلا دیں اور ایسے بڑے معاملے میں مثل غصب ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے صبر و تحمل کریں اور وصیت پر عمل فرمائیں، یہ امر ہماری ناقص فہم کی سمجھ سے باہر ہے۔ اس دقیق مضمون کو حضرات شیعہ ہی سمجھتے ہوں گے۔

پہلی روایت:..... ”کشف الغمہ“ میں محمد بن خالد سے ایک روایت لکھی ہے، جس کا مضمون یہ ہے کہ ایک روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اثناء خطبے میں لوگوں سے کہا کہ اگر میں چاہوں کہ تم کو معلومات دینیہ اور معتقدات یقینیہ اور احکام شرعیہ محمدیہ سے پھیروں اور یہ کہوں کہ اس کو چھوڑ کر ان قاعدوں پر چلو جو جاہلیت کے زمانے میں تھے تو تم میری اطاعت کرو گے یا نہیں؟ کسی نے کچھ جواب نہ دیا۔ جب تین مرتبہ اس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر یہ حالت تمہاری ہم دیکھیں اور تم کو خدا کے دین سے پھرا ہوا پائیں تو دوسرا نائب ہم طلب کریں اور اگر تم توبہ کرو تو تمہاری توبہ قبول کریں اور اگر توبہ نہ کرو

تو ہم تمہاری گردن ماریں..... حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر کہا کہ الحمد للہ کہ ہمارے دین میں ایسے آدمی ابھی ہیں کہ اگر میں منحرف ہو جاؤں تو وہ مجھے راہِ راست پر لاسکتے ہیں۔ فقط!

پس جب حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پوچھنے پر ایسا سخت جواب دیں اور ان کے قتل کرنے اور گردن مارنے پر اپنی مستعدی ظاہر کریں تو اگر حقیقت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ دین سے پھر جاتے اور احکامِ شرعیہ محمدیہ کو بدل دیتے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے قول کو پورا کرتے اور ان کو مار ہی ڈالتے، پس حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مستعد کیوں کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی بیٹی لے جانے دیتے اور کچھ چون و چرا نہ کرتے۔ اصل ترجمہ بلفظ اس حدیث کا یہ ہے:

((روایت ست از محمد بن خالد الضبی کہ روزے عمر بن خطاب در اثناء خطبہ از حاضران سوال کرد کہ اگر من خواہم کہ شمارا از معلوماتِ دینیہ و معتقداتِ یقینیہ و احکامِ شرعیہ محمدیہ صرف نمایم و گویم کہ از معتقداتِ برگردید و رجوع نمائید بقواعد کہ در زمانِ جاہلیت بود شما با من چہ خواہید کرد آیا تابع در آن خواہید شد یا مخالف من، مردمانِ ہمہ خاموش شدند و ہیچ کس جواب نگفت عمرؓ دیگر بار ہمیں سخن را اعادہ کرد، از ہیچ کس جوابی نشنید، پس دیگر بار ہمیں مقالہ اعادہ کرد شاہِ ولایتؓ فرمود کہ ہر گاہ از تو این حالت مشاہدہ گردو و ترا از دینِ مصطفیٰؐ منحرف یا بم نائِب دیگر طلب کنیم و اگر توبہ کنی توبہ ترا قبول کنیم و اگر نکنی ترا گردن زنیم، عمرؓ چون این سخن از شاہِ اولیاؓ شنید گفت کہ در دین ما مردمان ہستند کہ اگر منحرف شویم مارا بطریقِ مستقیم مقیم و

ثابت دارند.))

”محمد بن خالد ضعی سے روایت ہے کہ ایک دن عمر بن خطاب نے درمیانِ خطبہ حاضرین سے سوال کیا کہ اگر میں چاہوں کہ تم کو معلوماتِ دینیہ، معتقداتِ یقینیہ اور احکامِ شرعیہ محمدیہ سے پھیروں اور کہوں کہ ان اعتقادات کو چھوڑو اور ان قواعد کی طرف رجوع کرو جو زمانہ جاہلیت میں تھے تو تم میرے ساتھ کیا کرو گے، میری پیروی کرو گے یا مخالفت؟ سب لوگ خاموش تھے کسی نے جواب نہ دیا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے دوبارہ یہی بات کہی، پھر کسی نے جواب نہ دیا تو عمر رضی اللہ عنہ نے پھر سے یہی بات دہرائی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب کبھی تمہاری یہ حالت دیکھوں گا اور تم دینِ مصطفیٰ سے ہٹا ہوا پاؤں گا تو دوسرا نائب تلاش کروں گا اور اگر تم نے توبہ کر لی تو تمہاری توبہ قبول کر لوں گا، ورنہ تمہاری گردن مار دوں گا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے علی رضی اللہ عنہ کی جب یہ بات سنی تو کہا کہ ہمارے دین میں ایسے لوگ ہیں کہ اگر میں منحرف ہو جاؤں تو مجھے راہِ راست پر لگا دیں گے۔“

دوسری روایت: ملا باقر مجلسی نے ”حیاء القلوب“ ۱ میں ایک طویل روایت نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عمر فاروقؓ کے دل میں شاہِ مردانؓ کی اس قدر ہیبت اور خوف تھا کہ صرف دیکھنے ہی سے لرزہ آجاتا تھا۔ چنانچہ ایک طول طویل قصہ لکھنے کے بعد اس مضمون کو ان لفظوں سے ادا کیا ہے:

((علی بن ابراہیم از ابو و اثلہ روایت کردہ است کہ گفت روزے با عمر بن خطاب براہے می رفتم ناگاہ اضطرابی در راہ یافتم و صدائ از سینہ او شنیدہ شد مانند کسی کہ از ترس مدہوش شود، گفتم چہ میشود ترا ای عمرؓ گفت مگر نہ بینی شیر بیشہ شجاعت را او معدن کرم و فتوت را و کشندہ طاغیان و باغیان و زبندہ شمشیر را علمدار صاحب تدبیر

راچوں نظر کردم علیٰ بن ابی طالب را دیدم۔ الی قولہ۔ تا
ایں ساعت ترس اور از دل من بدر نرفته است و ہر گاہ کہ
اور امی بینم چنیں ہر اسان میشوم۔))

”علی بن ابراہیم نے ابو واثلہ سے بیان کیا ہے کہ ایک دن میں عمر بن خطاب
کے ساتھ جا رہا تھا، اثناءِ راہ میں ان پر بے قراری طاری ہو گئی اور ان کے سینہ
سے ایسی آواز سنی جیسے مارے خوف کے کوئی مدہوش ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا:
اے عمر! آپ کو کیا ہوا؟ انہوں نے کہا تم (شیر بیشہ شجاعت معدن کرم و سخاوت
باغیوں) اور سرکشوں کو کھینچنے والے زیب شمشیر صاحب تدبیر کو نہیں دیکھتے۔ جب
میں نے نظر دواڑئی تو علی بن ابی طالب دکھائی دیے..... اب تک میرے دل
سے ان کا خوف نہیں نکلا، میں جب کبھی ان کو دیکھتا ہوں اسی طرح ڈر جاتا ہوں۔“

پس اب اس حدیث سے زیادہ اور کیا سند چاہیے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت
عمر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صورت دیکھنے سے ڈر جاتے تھے اور ان کے بدن پر ہیبت سے
لرزہ ہونے لگتا تھا اور بہت دیر تک ان کے ہوش و حواس درست نہ ہوتے تھے، پس جب کہ
حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دیکھنے سے یہ حال عمر رضی اللہ عنہ کا ہوتا ہو اور ان کے ہوش و حواس ان کی
صورت دیکھنے سے جاتے رہتے ہوں تو کیوں کر قیاس میں آئے کہ پھر ان کی بیٹی سے بہ جبر
نکاح کرایا ہو..... شاید حضرات شیعہ یہ فرمائیں کہ اس وقت حضرت کا جلال جاتا رہا تھا بلکہ
معاملہ برعکس ہو گیا تھا۔

تیسری روایت:..... جناب مولوی سید دلدار علی صاحب قبلہ ”عماد الاسلام“ میں لکھتے
ہیں کہ کتب امامیہ میں لکھا ہوا ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو حکم کیا کہ سب کے دروازے
مسجد سے بند کریں سوائے اپنے اور حضرت علیؑ کے دروازے کے۔ چند دن کے بعد حضرت
عباسؑ نے عرض کی کہ میرے لیے خدا سے عرض کیجیے کہ میرا دروازہ کھول دیا جائے۔ آپ نے
کہا ممکن نہیں۔ تب حضرت عباس نے کہا کہ ایک میزاب ہی کے لیے دعا کر دیجیے۔ حضرت

خاموش ہوئے اور خدا نے حضرت عباسؓ کی درخواست ثانی کو منظور کیا۔ پس حضرت خود اٹھے اور حسبِ خواہش حضرت عباسؓ کے سقفِ خانہ پر پرنا لہ نصب کیا۔ چنانچہ وہ پرنا لہ تین سال تک زمانہٴ خلافتِ عمر رضی اللہ عنہ میں قائم تھا۔ ایک روز اس پرنا لہ کا پانی بہتا تھا کہ عمرؓ کے کپڑوں پر گرا، انہوں نے حکم دیا کہ یہ پرنا لہ اکھاڑ دیا جائے، چنانچہ وہ اکھاڑ دیا گیا اور عمر رضی اللہ عنہ نے غیظ و غضب میں آ کر کہا کہ اگر کوئی اس کو پھر لگائے گا تو میں اس کی گردن مار دوں گا۔ حضرت عباسؓ اپنے لڑکوں پر سہارا لگا کر اسی شدتِ مرض میں حضرت امیرؓ کے پاس فریاد کو آئے اور کہا کہ میں دو آنکھیں رکھتا تھا ایک تو جاتی رہی، یعنی پیغمبر خدا ﷺ، دوسری باقی ہے، یعنی علیؓ بن ابی طالب۔ میں نہ جانتا تھا کہ تمہارے جیتے جی یہ مصیبت مجھ پر ہوگی۔ حضرت امیرؓ نے فرمایا کہ تم اپنے گھر میں آرام سے بیٹھو، دیکھو میں کیا کرتا ہوں:

((ثم نادى يا قنبر على بذى الفقار فتقلده ثم خرج الى المسجد والناس حوله و قال يا قنبر اصعد ورد الميزاب الى مكانه فصعد قنبر وردة الى موضعه و قال على و حق صاحب هذا القبر و المنبر لئن قلعه قالع لا ضربن عنقه و عنق الامر له بذلك و لا صلبنها فى الشمس حتى ينفذ و ابلغ ذلك عمر بن الخطاب فنهض و دخل المسجد و نظر الى الميزاب و هو فى موضعه فقال لا يغضب احد ابا الحسن فيما فعله و تكفر عنه عن اليمين فلما كان من الغداة مضى على بن ابى طالب الى عمه العباس فقال له كيف اصبحت يا عم قال بافضل النعم ما و مت لى يا بن اخى فقال له يا عم طب نفسك و قرعينا فوالله لو خاضمنى اهل الارض فى الميزاب لخصمتهم ثم لقتلتهم بحول الله و قوته لا ینالك ضيم و لا غم فقام العباس فقبل بين عينيه و قال يا بن اخى ما خاب من

انت ناصرہ ، فكان هذا فعل عمر بالعباس عم رسول الله و قد قال في غير موطن وصية منه في عمه ان عمى العباس بقية الالباء والا جداد فا حفظوني فيه كل في كنفى و انا في كنف عمى العباس فمن اذاه فقد اذانى و من عاداه فقد عادانى فسلمه سلمى و حربہ حربى و قد اذاه عمر فى ثلث موطن ظاهرة غير خفية منها قصة الميزاب و لولا خوفه من على عليه السلام لم يتركه على حاله.....)) انتهى

”حضرت امیرؓ نے قبر کو آواز دی اور کہا کہ میری ذوالفقار لانا، چنانچہ وہ ذوالفقار لایا اور حضرت علیؓ نے اسے جھانک لیا اور ہمراہ آدمیوں کے مسجد میں آئے اور قبر سے کہا کہ پرنا لے کو جہاں تھا وہیں لگا دے، چنانچہ قبر نے لگا دیا۔ اس کے بعد حضرت امیرؓ نے فرمایا کہ قسم ہے مجھ کو صاحب قبر و منبر کی! اگر کسی نے اس پرنا لے کو اکھاڑا تو میں اس کی گردن ماروں گا۔ یہ خبر عمرؓ کو پہنچی، تب وہ مسجد میں آئے اور پرنا لے کو اپنی جگہ پر دیکھا اور کہا کہ کوئی ابوالحسن، یعنی امیرؓ کو غضب میں نہ لائے۔ وقت صبح کے حضرت امیرؓ نے حضرت عباسؓ سے پوچھا کہ کہیے کیا ہوا۔ حضرت عباسؓ نے کہا کہ جب تک تم زندہ ہو چین و آرام سے گزرتی ہے۔ حضرت امیرؓ نے فرمایا کہ قسم ہے خدا کی کہ اگر تمام اہل زمین مجھ سے خصومت پیش آویں میں سب کو قتل کر دوں۔ آپ کو کوئی غم اور فکر نہیں لاحق ہوگی، حضرت عباسؓ نے کھڑے ہو کر ان کی پیشانی کو بوسہ دیا اور کہا کہ اے بھتیجے تو جس کا مدد گار ہو وہ کبھی نامراد نہیں ہو سکتا۔ عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ کے چچا عباسؓ کے ساتھ یہ معاملہ کیا۔ اپنی وصیت میں متعدد مقامات پر اپنے چچا کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے چچا عباسؓ میرے باپ دادا کی یادگار ہیں، لہذا ان کے بارے میں میری رعایت رکھو، ہر ایک میری حمایت میں ہے اور میں

اپنے چچا عباسؓ کی حمایت میں ہوں۔ جس نے ان کو ستایا اس نے مجھے ستایا، جس نے ان سے دشمنی رکھی اس نے مجھ سے دشمنی رکھی، ان کی صلح میری صلح اور ان کی لڑائی میری لڑائی ہے۔ اور عمرؓ نے ان کو تین موقعوں پر ستایا ہے جو ظاہری ہیں پوشیدہ نہیں۔ ان میں سے ایک موقع میزاب (پرنا لہ) کا قصہ ہے، اگر ان کو علیؓ کا خوف نہ ہوتا تو اس کو اس حالت پر نہ رہنے دیتے۔“

اس روایت کو مطاعن عمر رضی اللہ عنہ میں لکھ کر مجتہد صاحب فرماتے ہیں کہ اگر عمرؓ کو علیؓ کا خوف نہ ہوتا تو کبھی پرنا لے کر اپنی جگہ پر لگانے نہ دیتے..... غرض یہ کہ جب ایک خفیف بات، یعنی پرنا لے کے لگانے پر جناب امیرؓ اس قدر غیظ و غضب میں آجائیں اور قنبر سے ذوالفقار منگا کر مسجد میں آئیں اور اپنے سامنے کھڑے کھڑے پرنا لہ نصب کروائیں اور باوجودیکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تین سال گزر چکے تھے اور ان کی خلافت کا زمانہ شباب پر تھا اور پھر بھی ان سے نہ ڈریں اور ان کے قتل کرنے پر مستعد ہو جائیں بلکہ تمام دنیا کے قتل کا بحالت مخالفت دعویٰ کریں تو کیوں کر قیاس قبول کرے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے ان کو صبر کی وصیت کی ہوگی، اگر واقعی حضرت نے وصیت کی ہوتی تو اس واقعہ میزاب میں جناب امیرؓ کیوں اس کو بھول جاتے اور کس لیے ذوالفقار لے کر باہر آتے اور اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عمر رضی اللہ عنہ ڈرتے نہ ہوتے تو وہ کیوں چپ ہو جاتے اور کیوں ان کے لگائے ہوئے میزاب کو اکھڑوانہ دیتے.....!

عجب حال ہے حضرات شیعہ کا کہ کبھی تو حضرت علیؓ کو ایسا شیر دلیر بنا دیتے ہیں کہ ذرا ذرا سی بات پر ان کے قہر و جلال کے قصے بیان کرتے ہیں اور ہلکے ہلکے معاملات میں ان کا قتل و قتال پر مستعد ہو جانا بیان کرتے ہیں اور کبھی کبھی ان کو ایسا خائف اور کمزور کر دیتے ہیں کہ بڑے بڑے معاملات میں ان کو صابر و شاکر کہتے ہیں۔ کیا حضرات شیعہ کے نزدیک حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا غضب ہونا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے سقف خانے کے میزاب کے برابر بھی نہ تھا کہ اس پر تو اس قدر غیظ و غضب ہوئے اور اس پر صبر و سکوت کیا جائے..... کاش! جناب امیرؓ میزاب کے معاملے میں سکوت فرماتے اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے معاملے میں اپنے قہر و

جلال کو ظاہر کرتے اور قنبر سے ذوالفقار لے کر باہر آتے اور عمر رضی اللہ عنہ کے قتل کرنے اور گردن مارنے پر مستعد ہوتے تو یہ قہر و غضب بجائے خود ہوتا۔

معلوم نہیں کہ حضرات شیعہ اس نکاح کو قبل از واقعہ میزاب کے روایت کرتے ہیں یا اس کے بعد۔ اگر نکاح قبل از واقعہ میزاب تھا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا جناب امیرؓ کے پاس معاملہ میزاب میں فریاد کو آنا بعید از قیاس ہے، اس لیے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ خوب جانتے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ڈر سے انہوں نے اپنی بیٹی کو دے دیا اور کچھ نہ بولے تو کیوں کر حضرت عباس رضی اللہ عنہ پھر اپنے میزاب کے معاملے میں ان کے پاس فریاد کو جاتے، کیونکہ جب جناب امیرؓ لڑکی کے معاملے میں نہ بولے اور صبر کیا تو پھر ایسے معمولی معاملے میں کیا بولتے..... اور اگر یہ نکاح بعد از واقعہ میزاب ہوا تو جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سمجھانے گئے تھے کہ عمرؓ آمادہ فساد ہے تم نکاح ہونے دو ورنہ وہ تم کو تکلیف دے گا تب اگر حضرت عباس رضی اللہ عنہ اس قصے کو بھول گئے تھے تو جناب امیرؓ یاد دلاتے کہ چچا تم کو یاد نہیں ہے کہ تمہارے میزاب کے معاملے میں نے کیا کیا اور عمر رضی اللہ عنہ کو کیسا ڈرا دیا، پس کیوں کر ایسے بڑے معاملے میں اس سے ڈر جاؤں اور اسی وقت قنبر سے تلوار منگا کر عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آتے اور ان کو میزاب کے معاملے کی طرح ڈرا دیتے۔ اگر ایسا کرتے تو پھر کیا مجال عمر رضی اللہ عنہ کی تھی کہ وہ کچھ بولتے..... غرض یہ کہ اب تو حضرات شیعہ ان روایات کو دیکھیں اور صبر یا وصیت کا نام زبان پر نہ لائیں اس لیے کہ ان روایات سے ان کا ابطال ایسا ہوا ہے کہ کسی کو کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہی۔

تیسری تاویل:..... تقیہ، اگرچہ جو کچھ ہم نے صبر اور وصیت کی تاویل میں بیان کیا ہے اس کا بھی بطلان بخوبی ہو گیا لیکن خاص اس لفظ سے ہم کچھ بحث کرتے ہیں۔

بعض علماء شیعہ نے فرمایا ہے کہ حضرت امیرؓ کو تقیہ کرنے کا حکم تھا، اس لیے وہ معذور و مجبور تھے اور نکاح کر دینے میں وہ فرمانِ الہی کی بجا آوری کرتے تھے اور امتثال امر الہی مقتضیٰ اجر ہے۔ چنانچہ اس مضمون کو باس الفاظ صاحب ”نزہہ اثنا عشریہ“ نے بجواب

”تحفہ“ کے ادا کیا ہے:

((قائلین بہ تقیہ می گویند کہ شارع فعلی را کہ بطریق تقیہ واقع شود مقام مامور بہ قرار داده پس درینجا آور دن آن امثال امر الہی ست و این معنی مقتضی اجرست .))
 ”بعض لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بابت کہتے ہیں کہ انہوں نے تقیہ کیا جو کام بطور تقیہ واقع ہو شارع نے اس کو مامور بہ قرار دیا ہے، پس ام کلثومؓ کی شادی بطور تقیہ کرنا حکم الہی کی بجا آوری ہے اور اس میں اجر ہے۔“

اور اسی طرح سید مرتضیٰ ملقب بہ علم الہدیٰ اور ابن مطہر حلی نے بھی فرمایا ہے کہ یہ تقیہ اس سے زیادہ نہیں ہے جو کہ امامت کے باب میں جناب امیرؑ نے کیا اور صاحب ”نزہہ“ کی یہ عبارت بعینہ ”مصائب النواصب“ کے اعتراض چہارم کا ترجمہ ہے..... غرض کہ ان روایات سے یہ امر ثابت ہے کہ جناب امیرؑ نے تقیہ کے سبب سے نکاح کر دیا اور چونکہ حضرت امیرؑ مامور بہ تقیہ تھے، اس لیے اس نکاح میں مستحق اجر ہوئے لیکن تقیہ کی تاویل باطل ہے چند وجوہ سے:

وجہ اول:..... تقیہ خود تہمت حضرات شیعہ کی ہے اہل بیت کرام پر اور کبھی کسی امام نے تقیہ نہیں کیا نہ وہ مامور بہ تقیہ تھے۔ اس کو ہم بحث تقیہ میں ثابت کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ!
 وجہ دوم:..... تقیہ کرنے کے دو سبب سمجھ میں آتے ہیں: یا خوفِ جان یا خوفِ عزت..... عزت تو اس نکاح کے کر دینے سے جاتی رہی، پس اس کا خوف تو باقی ہی نہ رہا جس کے لیے تقیہ کی حاجت ہوتی، رہا خوفِ جان اس کے سبب سے جناب امیرؑ مامور بہ تقیہ نہ تھے، علمائے شیعہ نے اس کو خود تسلیم کیا ہے جیسا کہ ”تقلیب المکائد“ میں علامہ کنٹوری لکھتے ہیں:

((شیعیان ہر گز نمی گویند کہ حضرت امیر المومنین بہ سبب خوفِ ہلاکت جانِ خود ترکِ قتل و قتال ابوبکر کردہ

بود بلکہ می گویند کہ حضرت امیر المومنین ہیچک از
فرائض و واجبات را ترک نہ کردہ و تقیہ بجهت خوف
ہلاکت جان خود نبود بلکہ بجهت خوف ہتک عرض و
ناموس بود .))

”شیعہ کبھی بھی یہ نہیں کہتے کہ جناب امیرؑ نے اپنی جان جانے کے پیش نظر ابو بکرؓ
سے جنگ و جدال ترک کی بلکہ شیعہ کہتے ہیں کہ جناب امیرؑ نے کوئی فرض
واجب نہیں چھوڑا اور آپ کا تقیہ کرنا اپنی جان جانے کے خوف سے نہ تھا بلکہ اس
کا سبب ہتک عزت و ناموس تھا۔“

وجہ سوم: اگر ہم تسلیم کریں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جان کا خوف تھا تو خود حضرات
شیعہ اس کو قبول نہ کریں گے، اس لیے کہ ان کی مذہبی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ کئی
دفعہ حضرت صدیقؓ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما نے حضرت امیرؑ کے قتل کا ارادہ کیا تھا لیکن وہ
بہ سبب شجاعت حضرت امیرؑ کے پورا نہ ہوا، جیسا کہ ملا باقر مجلسی ”حق الیقین“^① میں لکھتے
ہیں: ^②

جب حضرت علیؑ نے معاملہ فدک میں ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو بہت سخت و سست کہا اور ان
سے معارضہ کیا تب ابو بکرؓ نے عمرؓ کو بلایا اور کہا کہ تم نے دیکھا آج علیؑ نے کیا کیا اگر ایک
دفعہ اور ایسا ہی وہ کریں گے تو ہمارے سب کام درہم برہم ہو جائیں گے، یہ سن کر عمرؓ نے کہا
کہ میری صلاح یہ ہے کہ علی قتل کر دیے جائیں اور اس خدمت پر خالد بن الولید کو متعین کیا اور
صبح کی نماز کا وقت ان کے قتل کا مقرر ہوا۔ چنانچہ جب صبح کی نماز کو حضرت علیؑ مسجد میں آئے
اور براہ تقیہ ابو بکرؓ کے پیچھے نماز کو کھڑے ہوئے اور خالد تلوار باندھ کر حضرت علیؑ کے برابر

① اصل عبارت بحث تقیہ میں نقل ہوگی۔ ۱۲۔

② اسی طرح کی ایک روایت کتاب ”الخرائج و الجرائح“ صفحہ ۱۲۳ مطبوعہ ممبئی میں قطب الدین راوندی نے
بھی نقل کی ہے۔ ۱۲۔

کھڑے ہوئے مگر جب ابو بکر تشہد کے لیے بیٹھے تب ان کو ندامت ہوئی اور فتنہ و فساد سے ڈرے اور شدت اور سطوت اور شجاعت حضرت امیر کی ان کو معلوم تھی تب ایسا خوف ابو بکر پر غالب ہوا کہ نماز ختم نہ کر سکے۔ بار بار تشہد پڑھیں اور خوف کے مارے اسلام نہ پھیریں، آخر خالدؓ سے کہا کہ جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ نہ کرنا، چنانچہ بعد نماز کے حضرت علیؓ نے خالدؓ سے پوچھا کہ تم سے ابو بکرؓ نے کیا کہا تھا؟ انہوں نے کہا: تمہارے قتل کرنے کو کہا تھا اور اگر وہ مجھے منع نہ کرتے تو ضرور میں تم کو مار ڈالتا، حضرت علیؓ نے غصے میں آ کر خالدؓ کو پکڑا اور زمین پر دے مارا۔ جب عمرؓ چلانے لگے اور لوگ جمع ہو گئے تب حضرت امیرؓ نے خالدؓ کو تو چھوڑ دیا اور گریبان عمرؓ کا پکڑا اور کہا کہ اگر وصیت رسول خداؐ کی اور تقدیر الہی نہ ہوتی تو تم اس وقت دیکھتے کہ کون ضعیف ہے، ہم یا تم۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ حضرت امیرؓ نے خالدؓ کو ایک انگلی پراٹھا لیا اور ایسا دبایا کہ اس کی جان نکلنے کے قریب ہو گئی اور خالدؓ نے پاخانہ پھر دیا اور پاؤں میں ریشہ پڑ گیا اور بات زبان سے نہ نکل سکی اور جو کوئی نزدیک جاتا کہ خالدؓ کو چھڑائے اس کی طرف شیر خداؐ ایسی غضب کی نگاہ سے دیکھتے کہ وہ ڈر کے مارے لوٹ جاتا کہ آخر حضرت عباسؓ آئے اور انہوں نے قسم دے کر خالدؓ کو چھڑایا۔ فقط

اے حضرات شیعہ! اس روایت کو دیکھو اور شیر خدا و صی رسولؐ کی شجاعت اور مردانگی پر خیال کرو اور پھر معاملہ نکاح ام کلثوم رضی اللہ عنہا پر نظر کرو اور سوچو کہ اگر نکاح بہ جبر و اکراہ ہوتا اور حضرت امیرؓ کو منظور نہ ہوتا تو عمر رضی اللہ عنہ کی یا کسی شخص کی مجال نہ تھی کہ وہ جناب امیرؓ کو ڈرا کر ان کی بیٹی لے لیتا اور حضرت علیؓ قتل کے خوف سے کچھ نہ کہتے۔ اگر حضرت امیرؓ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خوف دلایا تھا اور ان کے مارنے کی دھمکی دی تھی تو کیوں حضرت علی رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے اور کس لیے عمر کو ایک انگلی پراٹھا کر زمین پر نہ دے مارا اور اگر کوئی ان کا حامی ہوا تھا تو کیوں اس کی طرف غضب کی نگاہ سے نہ دیکھا۔ ہم اگر ملا باقر مجلسی کی روایت کو قبول کریں تو پھر کبھی ہمارے ذہن میں یہ بات نہیں آسکتی کہ..... حضرت علی رضی اللہ عنہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے نکاح میں ایسے خوف زدہ اور مضطرب ہو جائیں کہ کچھ نہ فرمائیں اور اپنی معصومہ بیٹی کا غضب ہونا پسند

کریں۔ اگر اس روایت پر بھی خاطر جمع نہ ہو تو ہم دوسری سند شجاعت علی مرتضیٰ شیر خدا کی بیان کرتے ہیں کہ ملا باقر مجلسی حق الیقین میں لکھتے ہیں:

((بعد از غصب فدک حضرت امیر المومنینؑ بہ ابوبکرؓ نامہ نوشت در نہایت شدت و وحدت و تہدید و و عید بسیار در آن درج نمود ، چون ابوبکرؓ نامہ را خواند بسیار تر سیدو خواست کہ فدک را و خلافت راہر دور کند .))

”فدک غصب کرنے کے بعد امیر المومنینؑ نے ابوبکرؓ کو نہایت شدت آمیز خط لکھا اور سخت تہدید اور وعید اس میں لکھی، ابوبکر نے جب خط پڑھا تو بہت ڈرے اور یہاں تک ارادہ کر لیا فدک اور خلافت دونوں سے دست بردار ہو جائیں۔“

پس اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک خفگی کے خط سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایسا ڈر گئے کہ فدک اور خلاف چھوڑنے پر مستعد ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کون مانع تھا کہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے معاملے میں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک نامہ لکھتے اور اپنی شجاعت و مردانگی کی یاد دلاتے اور جو تہور اور سطوت پہلے حضرت نے ظاہر کی تھی اس کا ذکر کر کے ڈراتے حالانکہ یہ بھی شیعوں کی کسی روایت سے ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوئی خط لکھا ہو یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ڈرایا ہو، اگر اور کچھ نہ ہوتا تو حجت تو تمام ہو جاتی لیکن جناب امیرؓ کے سکوت اور خاموشی کا سبب ایسے نازک معاملے میں ہماری سمجھ میں نہیں آتا اور تقیہ کرنے کی کوئی وجہ ایسے بڑے عظیم امر میں ہم کو معلوم نہیں ہوتی۔ شاید اس معاملے میں کوئی سر، اسرار امامت کا ایسا ہوگا جو ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا، اس لیے کہ اسرار امامت کو کوئی ملک مقرب اور نبی مرسل کے اور مومن کامل کے سوا دوسرا سمجھ ہی نہیں سکتا جیسا کہ ملا باقر مجلسی ”حق الیقین“ میں لکھتے ہیں:

((غائب احوال و خفایای اسرار ایشاں را خلق نمید اندو

تاب شنیدن آنها ندارد مگر ملک مقربے یا پیغمبر مرسلے یا

مومن کا ملے کہ حق تعالیٰ دلِ اُور امتحان کردہ باشد و
بُنورِ ایمان منور گردانیدہ باشد .))

”ائمہ کے مخفی حالات اور پوشیدہ راز مخلوق نہیں جانتی اور نہ ہی ان کے سننے کی
تاب رکھتی ہے سوائے مقرب فرشتے یا پیغمبر مرسل یا مومن کامل کے کہ حق تعالیٰ
نے جس کے دل کو آزما لیا ہو اور ایمان کے نور سے اس کو روشن کر دیا ہو۔“

مجھے اس مقام پر امام باقر علیہ السلام کی ایک حدیث یاد آتی ہے جو کلینی ^۱ نے بہ سند
معتبر لکھی ہے کہ امام کی دس نشانیاں ہیں منجملہ ان نشانیوں کے نشانی نہم میں وہ لکھتے ہیں کہ جو
فضلہ امام سے جدا ہوتا ہے اس سے مشک کی بو آتی ہے اور زمین کو خدا نے مؤکل کر دیا ہے کہ
وہ اس فضلے کو نگل جاتی ہے۔“ فقط!

پس نہایت تعجب ہے حضرات شیعہ سے کہ باوجودیکہ امام کے فضلے کی نسبت تو یہ اعتقاد
کریں کہ اسے زمین نگل جاتی ہے اور اس میں بدبو نہیں ہوتی بلکہ مشک کی بو اس سے آتی ہے
اور پھر اسی امام کے جگر پارے اور بدن کے ٹکڑے کی نسبت یہ کہیں کہ اسے ایک غاصب نے
غصب کر لیا..... اے حضرات شیعہ! ذرا تو سوچو کہ فضلہ امام کا کیوں زمین کے سپرد ہوا اور
خدا نے کیوں اس میں مشک کی خوشبو رکھی؟ اس واسطے کہ فضلہ ایک نجس اور ناپاک چیز ہے اور
وہ زمین پر رہے گا کیڑے پڑیں گے، بدبو پھیلے گی، لوگ دیکھ کر نفرت کریں گے اور چونکہ اس
کو ایک تعلق امام سے ہے، گو وہ تعلق نہایت تعلقات بعیدہ سے ہے، اس لیے خدا نے امام کی
فضیلت ظاہر کرنے کے لیے فضلے کو زمین کے سپرد کر دیا کہ وہ نگل جائے..... تو کیا حضرت ام
کلثوم رضی اللہ عنہا جو حضرت سیدۃ النساء کی ایک جز تھیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جسم کا ایک ٹکڑا تھیں،
خدا کے نزدیک ایسی بے قدر تھیں کہ خدا نے ان کی کچھ بھی حفاظت نہ کی اور ان کو ایک
غاصب کے پنچے سے نہ بچایا۔ کیا ان کو کچھ بھی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نہ تھی اور کیا ان کو
کچھ بھی تعلق سیدۃ پاک سے نہ تھا اور کیا ان کی ایسی ایسی بے عزتی سے کچھ لوٹ دامن پاک پر

جناب امیرؓ کے نہ آتا تھا اور کیا ان کے غضب سے کوئی داغِ ائمہ اطہار کی شان میں نہ لگتا تھا۔ اے بھائیو! ذرا سوچو اور شرماء اور انصاف کو دخل دو کہ سوائے اس کے کہ تم اقرار کرو کہ حضرت عمرؓ زوجیت کی صلاحیت رکھتے تھے اور کسی طرح پر یہ الزام رفع ہو سکتا ہے یا نہیں؟ چوتھا قول:..... جب کہ حضرات شیعہ نے دیکھا کہ نہ تاویل صبر کی درست ہوتی ہے نہ وصیت اور تقیہ کی توجیہ سے کچھ مطلب حاصل ہوتا ہے، اس لیے بعضوں نے ان سب کو چھوڑ کر اور ہی دعویٰ کیا اور صحبت اور ہم بستری سے انکار کیا۔ چنانچہ صاحب سیف صام فرماتے ہیں:

”اگرچہ درحقیقت قربت معصومہ طاہرہ، یعنی وقوع اتصال و مواصلت جو کہ ظاہر میں غایت مناکحت ہے موجب اقرار شیخ فانی اور ہم بہ سبب صغیرہ ہونے معصومہ کے ممتنع الوجود یقینی تھا اور باعتبار ظاہر کے بھی اور باعتبار باطن کے از روئے علم باطنی کے بھی حضرت مولیٰ پر ہویدا تھا۔“

اور پھر چند اوراق کے بعد مؤلف مذکور لکھتے ہیں:

”مواظبِ حسینہ جناب غفر انمآب و غیرہا کتب حقہ میں جو اہل ایمان بتصریح دیکھنا چاہیں تو وہاں رجوع کر سکتے ہیں صاف واضح ہوگا کہ مواصلت و قربت زن و شوی ہرگز نہیں وقوع میں آئی بلکہ بطریقہ اہل بیت طاہرہ روایت صحیح مخبر ہیں اس بات کے کہ ظاہر میں یہ رنج و صعوبت بے شک مولائے مومنین نے اپنے سر لیا لیکن حقیقت میں قربت و مواصلت با معصومہ ہرگز وقوع میں نہیں آئی بلکہ ازراہ اعجاز بہ عنایت کریم کار ساز ایک جنیہ مشککہ بہ شکل جناب معصومہ حوالہ کی گئیں اور جناب معصومہ تا حیات شیخ فانی نظر سے لوگوں کے غائب کی گئیں“ وزید التصریح فی المبسوطات۔ انتھی بلفظہ۔“

چونکہ مؤلف ”سیف صام“ نے اس عبارت کے بعد بڑی بڑی کتابوں کا حوالہ دیا ہے، اس سے مشتاقین کو ان کے دیکھنے کا اشتیاق بھی پیدا ہوگا تا کہ معلوم ہووے کہ ان کے بڑوں

نے کیا نکات و اسرار لکھے ہیں، اس لیے میں ان کے علماء اعلام کے قول کو بھی نقل کرتا ہوں اور سامعین کے لیے حالت منتظرہ باقی نہیں رکھتا ہوں۔

واضح ہو کہ قطب الاقطاب راوندی مؤلف ”خرائج و جرائح“ نے یہ دعویٰ کیا ہے اور مولوی دلداری صاحب قبلہ نے ”مواعظ حسینیہ“ میں اس کو ان لفظوں سے بیان فرمایا ہے:

((گفت عرض نمودم بخدمت حضرت علیہ السلام کہ مخالفین بر ما حجت می آرند و میگویند کہ چرا علیؑ دختر خود را بہ خلیفہ ثانی پس حضرت صلوة اللہ علیہ تکیہ کردہ نشستہ بودند درست نشستہ فرمودند کہ آیا چنین حرفہامی گویند بدرستیکہ قومیکہ چنین زعم میکنند ”لایہتدون سواء السبیل“ سبحان اللہ حضرت امیر را این قدر قدرت نبود کہ حائل شود میان خلیفہ و دختر خود ، دروغ میگویند کہ ہرگز چنین نبود بدرستیکہ چون خلیفہ ثانی پیغام عقد را بہ حضرت امیرؑ داد حضرت انکار نمودند۔ پس خلیفہ ثانی عباسؑ گفت کہ اگر دخت علیؑ را بمن عقد نمی کنی سقایت و زمزم از دست تو میگیرم پس عباسؑ بخدمت امیرؑ آمدہ حقیقت حال را می گفت۔ حضرت انکار نمودند ، چون عباسؑ باز الحاح نمود ، حضرت امیرؑ با عجاز خود جنیہ را از اہل نجران طلبیدند و او یہودیہ بود پس او بموجب امر بصورت ام کلثومؑ ممثل گردید و حضرت امیرؑ ام کلثومؑ را با عجاز خود از نظر ہامستور گردانیدند پس تاملت دراز جنیہ پیش او ماند تا اینکہ یک روز بہ بعضی از قرائن دریافت نمود کہ زن او ام کلثومؑ نیست بلکہ از بنی آدم ہم نیست ،

گفت ندیدم ام ساحر تر از بنی ہاشم کسی را و چون خواست کہ ایس امر را اِظهار نمایند خود کشته شد ، پس جنّیہ بخانہ خو درفت و ام کلثومؓ ظاہر گردید.....)) انتہی

”میں نے امام جعفر صادق سے عرض کیا کہ لوگ ہم سے حجت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ علیؑ نے اپنی بیٹی کی شادی خلیفہ ثانی سے کیوں کر دی؟ امام جو تکیہ کے سہارے بیٹھے ہوئے تھے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور کہا کیا لوگ اس قسم کی بکواس کرتے ہیں اور اس شادی کا یقین کرتے ہیں، یہ ہرگز ہرگز راہ راست پر نہ آسکیں گے۔ کیا حضرت امیرؓ کو یہ قدرت نہ تھی کہ وہ خلیفہ ثانی اور اپنی بیٹی کے درمیان حائل ہو جاتے۔ کہنے والے جھوٹے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ خلیفہ ثانی نے جناب امیرؓ کو جب شادی کا پیام بھیجا تو آپؓ نے انکار کر دیا۔ خلیفہ ثانی نے عباسؓ سے کہا کہ اگر علیؑ کی لڑکی سے میری شادی نہ کراؤ گے تو پانی پلانے اور زم زم کا حق تمہارے قبضے سے لے لوں گا۔ اس پر جناب عباسؓ جناب امیرؓ کے پاس آئے اور حقیقت حال ظاہر کی۔ جناب امیرؓ نے انکار کر دیا، پھر عباسؓ کے اصرار پر جناب امیرؓ نے بطور معجزہ ایک جنّیہ اہل نجران سے طلب فرمائی جو یہودن تھی۔ پس وہ جناب امیرؓ کے حکم سے ام کلثومؓ کی صورت میں ہو گئی اور جناب امیرؓ نے اپنے معجزہ کے ذریعے ام کلثومؓ کو لوگوں کی نظر سے چھپا دیا۔ اس طرح وہ جنّیہ ایک عرصہ تک خلیفہ ثانی کے پاس رہی۔ ایک دن کسی قرینے سے خلیفہ ثانی کو معلوم ہو گیا کہ ان کی بیوی ام کلثومؓ نہیں ہے اور لطف یہ کہ انسان بھی نہیں، تو کہا کہ میں نے بنی ہاشم سے زیادہ کسی کو جادو گر نہیں دیکھا اور جب اس امر کو ظاہر کرنا چاہا تو خود مارے گئے اور وہ دیوزادی یہودن (جنّیہ) اپنے گھر چلی گئی اور ام کلثومؓ ظاہر ہو گئیں۔“

اے حضراتِ شیعہ! اپنے قطب الاقطاب اور قبلہ و کعبہ کے علم و عقل اور فہم کی داد دو اور

ان کے احسان کا شکر ادا کرو کہ ایک نکتے میں سب مشکلیں حل کر دیں اور سنیوں ناصبیوں کے اعتراض کو ایک لطیفے میں دور کر دیا اور معصومہ کی عفت و عصمت بچانے کے لیے عمر رضی اللہ عنہا کے ساتھ ان کی مقاربت سے انکار کیا اور حضرت امیرؓ کی قدرت اور معجزہ دکھلانے کے واسطے ایک جنیہ کا ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی شکل میں مشکل کر دینے کا دعویٰ کیا..... حقیقت میں اس تقریر سے ناصبیوں کے تمام اعتراض باطل ہو گئے۔ اب نہ کوئی معصومہ کی عصمت پر حرف رکھ سکتا ہے۔ نہ کوئی حضرت امیرؓ کو عاجز کہہ سکتا ہے، نہ کوئی خلیفہٴ دوم کی فضیلت بیان کر سکتا ہے، نہ اہل بیت کے ننگ و ناموس پر کوئی انگلی اٹھا سکتا ہے..... لیکن اس جواب میں یہ امر عرض کرنے کے لائق ہے کہ اگر جنیہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی شکل میں بنا کر خلیفہٴ دوم کے پاس بھیج دی گئی تھی تو اولاد بھی اس سے پیدا ہوئی تھی یا کہ وہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے اور زید بن عمر رضی اللہ عنہ جو بالغ ہو کر مرا، ماں اس کی وہی جنیہ تھی یا ام کلثوم رضی اللہ عنہا۔



ضمیمہ:

☆ نکاح ام کلثوم رضی اللہ عنہا

مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا کے نکاح پر جس مدلل اور مفصل انداز میں بحث کی ہے اور جس طرح ائمہ کرام کے اقوال اور شیعہ علماء کے اقرار سے نکاح کا ثبوت پیش کیا ہے اس کے بعد کسی بھی ایسے شخص کے لیے جو پورے اخلاص اور ایمان داری سے حقیقت واقعہ سمجھنا چاہتا ہو اس نکاح سے انکار کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا کے نکاح کا انکار ایسا ہی ہے جیسے دن کی روشنی میں سورج کا انکار۔ مگر برا ہو کر وہی پاسداری اور مذہبی تعصب کا کہ فخر محققین اور آیات اللہ فی العالمین کہے جانے والے اشخاص بھی جس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسے لوگ جان بوجھ کر صاف اور سیدھی باتوں کو بھی فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقی بحثوں میں الجھا کر اپنے عوام کو مغالطے میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ قرآن کریم نے ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا ہے:

﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾

(سورہ بقرہ: ۴۲)

”اور مت ملاؤ صحیح میں غلط اور مت چھپاؤ سچ کو جان بوجھ کر۔“

ابھی کچھ دنوں قبل ایک دوست نے یکے بعد دیگرے مجھے دو کتابیں اس موضوع پر پڑھنے کے لیے دی تھیں۔ پہلی کتاب شیعوں کے فخر محققین سابق مدیر ”اصلاح“ مولانا سید علی حیدر صاحب متوفی ۱۳۸۰ھ کی تصنیف ہے جو کہ خاص اسی موضوع پر عقداً کلثوم کے نام سے لکھی گئی ہے..... دوسری کتاب جناب مولانا سید کلب جواد صاحب ابن مولانا کلب عابد

صاحب کی نتیجہ فکر ہے جسے انہوں نے حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نور اللہ مرقدہ کی کتاب ”ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت“ کے جواب میں ”ایران کا اسلامی انقلاب فتنہ وہابیت اور شیعیت“ کے نام سے تحریر کیا ہے۔

موصوف نے اس کتاب کے صفحہ ۲۲۵ پر نکاح ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی بحث کی ہے مگر اس کی تردید میں کوئی نئی دلیل نہیں پیش کی بلکہ فخر المحققین صاحب کی دلیلوں کو ہی مختصراً دہرایا ہے۔ فخر المحققین مولانا سید علی حیدر صاحب کی کتاب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان سے پہلے ان کے والد بزرگوار سید المتکلمین و آیت اللہ فی العالمین سید علی اظہر صاحب قبلہ بھی اسی موضوع پر دو کتابیں ”کنز مکتوم فی حل عقد ام کلثوم“ اور ”رفع الوثوق عن نکاح الفاروق“ کے نام سے لکھ چکے ہیں، اس کے بعد شاید ان کتابوں کو نا کافی سمجھ کر موصوف نے یہ کتاب تحریر کی ہے۔

مولانا علی حیدر صاحب نے اس کتاب میں حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو دختر علی رضی اللہ عنہ کے بجائے دختر ابو بکر رضی اللہ عنہ ثابت کرنے کی دھن میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ چنانچہ ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ ”جناب امیر اپنی بیٹی کا نکاح عمرؓ کے ساتھ کیسے کر سکتے تھے، کیا وہ قرآن کی اس آیت سے ناواقف تھے:

﴿الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ
وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ﴾ (النور: ۲۶)

”گندی عورتیں گندے مردوں کے لیے اور گندے مرد گندی عورتوں کے لیے،
ستھری عورتیں ستھرے مردوں کے لیے اور ستھرے مرد ستھری عورتوں کے لیے۔“

فخر المحققین صاحب کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا واضح حکم نازل ہو چکا تھا، تو پھر جناب امیرؓ جیسا پابند شریعت ایک مومنہ کا نکاح ایک منافق سے کیسے کر سکتا تھا؟

موصوف کی دلیل سے خواہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دامن عصمت اس داغ سے (جس کو وہ

داغ سمجھتے ہیں) محفوظ ہو گیا ہو، مگر نعوذ باللہ! رسول اکرم ﷺ کا دامن تو داغ دار ہوا جاتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے تو بقول شیعوں کے دو منافقاؤں سے عقد کیا اور انہیں تا حیات اپنے نکاح میں برقرار رکھا۔ تو اب یا تو یہ سمجھا جائے کہ معاذ اللہ! رسول اکرم ﷺ اس آیت سے ناواقف تھے، یا پھر جان بوجھ کر اس آیت کے خلاف کیا۔ جبکہ یہ دونوں باتیں امرِ محال ہیں، تو پھر ان دونوں (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا) کو مومنہ ماننا پڑے گا جو کہ شیعوں کے عقیدے کے خلاف ہے۔ یہ بھی قدرت کا ایک انتقام ہے کہ جب کوئی شخص حقائق کا انکار کرتا ہے تو جانے انجانے اپنے اصولوں کو ہی پامال کر بیٹھتا ہے۔

فخر المحققین صاحب اپنی تحقیق کالب لباب بیان کرنے کے لیے کتاب کے آخر میں ”اس بہتان کی اصل حقیقت“ کا عنوان قائم کر کے لکھتے ہیں:

”حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے فوراً بعد ان کی ایک لڑکی ۱۳ھ میں پیدا ہوئی اس کا نام بھی ام کلثوم رکھا گیا، دیکھو استیعاب، تاریخ طبری، تاریخ کامل وغیرہ، اور چونکہ ان کی زوجہ اسماءؓ نے اب حضرت علیؓ سے اپنی شادی کر لی تھی، اس لیے وہ اس بچی کو لیے ہوئے جناب امیرؓ کے گھر آگئیں..... اور تمام واقعات مذکورہ انہیں ام کلثومؓ دختر ابوبکرؓ و اسماءؓ کے ہیں صرف ایک مکان جناب امیرؓ کے گھر رہنے کی وجہ سے لوگوں نے حضرت ام کلثومؓ کو جناب امیرؓ سے متعلق سمجھ لیا..... بنو امیہ کی بے حد و انتہا جال و فریب کی کارروائیوں سے متاثر ہو کر مورخین و محدثین اہل سنت نے غلطی سے انہیں ام کلثومؓ دختر ابوبکرؓ و اسماءؓ کو دختر جناب امیرؓ و فاطمہ سمجھ لیا، کیونکہ یہ بھی تو جناب امیرؓ کے گھر رہتی تھیں۔“

(حضرت ام کلثومؓ، صفحہ ۱۶۶ صفحہ ۱۶۷)

فخر المحققین مولانا علی حیدر صاحب کی اس عبارت سے چند باتیں مستفاد ہوتی ہیں:

۱: جو ام کلثوم رضی اللہ عنہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں وہ دختر علیؓ نہیں بلکہ دختر ابوبکرؓ تھیں۔

- ۲: ان کی ماں کا نام فاطمہؑ نہیں بلکہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا تھا۔
- ۳: یہی ام کلثومؑ اپنی ماں اسماء کے ساتھ جناب امیرؑ کے گھر آ گئیں۔
- ۴: مؤرخین و محدثین اہل سنت نے غلطی سے ام کلثومؑ دختر ابوبکرؑ و اسماءؑ کو دختر جناب امیرؑ و فاطمہؑ سمجھ لیا۔

جناب مولانا علی حیدر صاحب نے اپنے دعوے کی عمارت جس بنیاد پر کھڑی کی ہے وہ بنیاد ہی بے اصل ہے..... تاریخ اسلام کا معمولی طالب علم بھی اس بات سے واقف ہوگا کہ ام کلثومؑ دختر ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ماں کا نام حبیبہ بنت خارجہ تھا نہ کہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا..... چنانچہ اس بات کا ثبوت کہ ام کلثومؑ دختر ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ماں کا نام حبیبہ بنت خارجہ تھا کسی سنی ناصبی یا بنو امیہ کے کسی حاشیہ بردار کی کتاب سے نہیں بلکہ شیعوں کی مشہور و معروف تاریخ ”ناسخ التواریخ“ سے ملاحظہ ہو جس کے مصنف مرزا محمد تقی خاں، سلطان ناصر الدین قاجار والی ایران کے وزیر اعظم تھے اور انہیں کمال لیاقت و قدردانی میں بادشاہ مذکور کے دربار سے..... ”لسان الملک“ کا خطاب عطا ہوا تھا۔

(عقد ام کلثوم: مؤلفہ حضرت مولانا عبدالمومن صاحب فاروقی صفحہ ۲۷)

مرزا محمد تقی خاں ”ناسخ التواریخ“ کے صفحہ ۶۱ پر حبیبہ بنت خارجہ کے حال میں لکھتے ہیں:

۱ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا ختمیہ کو مہاجرین اولین کی جماعت میں امتیازی درجہ حاصل ہے۔ وہ مہاجرین حبشہ میں سے ہیں۔ علامہ ابن سعد اور ابن ہشام کا بیان ہے کہ جس زمانے میں حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سعادت اندوز اسلام ہوئیں اس وقت صرف تیس نفوس شرف اسلام سے بہرہ ور ہوئے تھے۔ حضرت اسماء کا پہلا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی حضرت جعفر طیار بن ابی طالب سے ہوا تھا۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے صلب سے تین لڑکے عبداللہ، محمد اور عون پیدا ہوئے۔ حضرت جعفر جنگ موتہ میں شہید ہو گئے تو شہادت کے چھ ماہ بعد ۸ھ (غزوہ حنین کے زمانہ میں) حضور ﷺ نے حضرت اسماء کا نکاح اپنے محبوب رفیق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کر دیا جن کے صلب سے ایک صاحبزادے محمد پیدا ہوئے۔ ۱۳ھ ہجری میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت اسماء کا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہو گیا۔ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی عمر اس وقت تقریباً تین برس کی تھی۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ حضرت علیؑ کے گھر آئے اور انہی کے زیر سایہ پرورش پائی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صلب سے ایک لڑکے یحییٰ نامی پیدا ہوئے۔ ۴۰ھ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جلد ہی حضرت اسماء نے بھی پیک اجل کو لبیک کہا۔ (شیخ محمد فراست)

”حبیبہ دختر خارجه بن زید بن ابی زبیر بن مالک بن امراء القیس بن مالک بن ثعلبہ بن کعب بن خزرج تھیں، یہ ابوبکر کی زوجہ تھیں اور ان کی وفات کے وقت حاملہ تھیں، بعد وفات ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ام کلثومؓ رکھا تھا۔ عمر بن خطاب نے ان کی خواستگاری کی تھی مگر ام کلثومؓ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں عمر بن الخطاب جیسے درشت طبع کے ساتھ گزارا نہیں کر سکتی۔“

اس مؤرخ نے حبیبہ دختر خارجه زوجہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی الادکا حال ایک جگہ اور لکھا ہے، وہاں لکھتے ہیں:

((در وقت و فات ابوبکر حاملہ بود پس ازو سے دختر سے آورد
نام او ام کلثوم است.))

”ابوبکر کی وفات کے وقت وہ حاملہ تھیں، ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام ام کلثوم ہے۔“ (ناخ التوارخ صفحہ ۲۱۵)

بچے خود ایک شیعہ مؤرخ ہی نے وہ بنیاد کھود ڈالی جس پر فخر المحققین صاحب نے ساری عمارت کھڑی کی تھی، اور یہ بات ثابت ہو گئی کہ ام کلثوم بنت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ماں کا نام اسماء نہیں بلکہ حبیبہ بنت خارجه تھا اور جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تھا تو پھر ام کلثوم بنت ابی بکر کا خانہ علیؓ میں جانے اور رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر آتی نہیں

① ۱۳ ہجری میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہو گیا۔ محمد بن ابی بکر کی عمر اس وقت تقریباً تین برس کی تھی۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ حضرت علیؓ کے گھر آئے، اور انہی کے زیر سایہ پرورش پائی۔ حضرت علیؓ کے صلب سے ایک لڑکا یحییٰ نامی پیدا ہوا۔ ۴۰ ہجری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جلد ہی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے بھی پیک اجل کو لبیک کہا۔ (شیخ محمد فراست)

ہاں یہ بات صحیح ہے کہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کے بطن سے بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ایک اولاد پیدا ہوئی تھی مگر وہ لڑکی نہیں بلکہ لڑکا تھا جس کا نام محمد بن ابوبکر تھا.....، چنانچہ یہی مورخ حضرت اسماء عمیس رضی اللہ عنہا کے حال میں لکھتے ہیں:

”پہلے یہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں اور ہجرت حبشہ کے وقت ان کے ہمراہ تھیں اور فتح خیبر کے روز یہ بھی اپنے شوہر جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہما کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے پاس تشریف لائیں، پھر جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے نکاح کر لیا۔“

آگے کے الفاظ یہ ہیں:

((و محمد بن ابی بکر از و متولد شد و بعد از ابوبکر رضی اللہ عنہ علی

علیہ السلام اور اتزویج بست و یحیٰ از و متولد شد.))

”اور محمد بن ابوبکر ان سے پیدا ہوئے ابوبکر کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے

ان سے نکاح کر لیا اور اس سے یحییٰ پیدا ہوئے۔“ (ناسخ التواریخ صفحہ ۷۱۸)

اب ہم شیعہ کتب سے یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ جو ام کلثوم رضی اللہ عنہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے

نکاح میں تھیں وہ دختر ابوبکر رضی اللہ عنہ نہیں بلکہ دختر علی ابن طالب رضی اللہ عنہ تھیں۔ چنانچہ مرزا محمد تقی

خان ”ناسخ التواریخ“ میں لکھتے ہیں:

((ام کلثوم بنت علی علیہ السلام عمر بن خطاب ویر اتزویج

کرد و از وے زید و رقیہ متولد شد۔ وفات ام کلثوم و پسرش

در وقت واحد بود و ما قصہ اور ادر کتاب عمر بہ شرح

کتاب عمر نوشتیم.))

”ام کلثوم بنت علی علیہ السلام سے عمر بن خطاب نے شادی کی اور ان سے زید

اور رقیہ پیدا ہوئے۔ ام کلثوم اور ان کے لڑکے (زید) کا انتقال ایک ہی وقت

میں ہوا، ہم نے ان کا قصہ ”کتاب عمر“ میں لکھ دیا ہے۔“

”ناسخ التواریخ“ کے مذکورہ بالا بیان سے حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا زوجہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بنت علی رضی اللہ عنہ ہونا تو ثابت ہو گیا مگر بنت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا ہونا ثابت نہ ہوا، لہذا اس کا ثبوت بھی کتب شیعہ سے ملاحظہ ہو۔

تیرہویں صدی کے مشہور شیعہ مؤرخ مرزا عباس علی قلی خاں (جو مصنف ”ناسخ التواریخ“ کے خلف الرشید و دولت پر ایران کے بادشاہ قاجار کے وزیر اعظم تھے) نے اپنی تصنیف ”تاریخ طراز مذہب مظفری“ میں ایک مستقل باب (حکایت تزویج ام کلثوم با عمر بن خطاب) کے عنوان سے قائم کیا ہے۔ یہ باب تاریخ مذکورہ مطبوعہ ایران میں صفحہ ۴۷ سے شروع ہو کر صفحہ ۶۷ پر ختم ہوا ہے، وہاں لکھتے ہیں:

((جناب ام کلثوم کبریٰ دختر فاطمہ زہرا در سرائے عمر بن خطاب بود و ازوے فرزند بیاورد چنانکہ مذکور گشت و چون عمر مقتول شد محمد بن جعفر بن ابی طالب اور ادر حبالہ نکاح در آورد.))^①

”حضرت فاطمہ الزہراء کی صاحبزادی ام کلثوم عمر بن خطاب کے گھر میں تھیں، ان سے ایک فرزند بھی پیدا ہوا جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے جب حضرت عمر قتل کیے گئے تو محمد بن جعفر بن ابی طالب ان کو اپنے نکاح میں لائے۔“

پھر اسی مؤرخ نے ایک بحث یہ کی ہے کہ حضرت فاطمہ زہراء کی صاحبزادیوں کی اولاد بھی رسول خدا ﷺ کی اولاد کہی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اس بحث میں لکھا ہے:

((اما گفته انداز خصائص رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ ست کہ فرزندان فاطمہ سلام اللہ علیہا بآن حضرت نسبت دهند لاکن در حق دختران دخترش این عنوان راجاری

① تاریخ طراز مذہب مظفری، باب حکایت تزویج ام کلثوم با عمر بن الخطاب، طبع ایران

نداشتہ اند، پس جریان امر در حق ایشاں بر قانونِ شرع است دریں کہ ولد در نسب با پدر می رود نہ بمادر، بہ ہمیں سبب گویند پسر شریف را اگر پدرش شریف نہ باشد شریف نمی خوانند، پس فرزندانِ فاطمہؑ بہ رسولِ خداً منسوب، و اولادِ حسن و حسینؑ بایشاں و آنحضرت ﷺ منسوب باشد و فرزندانِ خواہرانِ ایشاں زینب خاتون و ام کلثوم بہ پدرانِ خود عبداللہ بن جعفر و عمر بن خطاب نسبت برندنہ بمادر و نہ بر رسولِ خدا ﷺ زیرا کہ ایشاں فرزندانِ دختر بنت آنحضرت ہستند نہ فرزندانِ دخترش .))

”لیکن علماء نے کہا ہے کہ یہ خصوصیت رسولِ خدا ﷺ کی ہے کہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی اولاد کو آنحضرتؑ کی اولاد کہتے ہیں لیکن حضرت فاطمہؑ کی دختر کی دختر کے حق میں یہ مسئلہ جاری نہیں رکھا ہے، ان کے حق میں وہی عام حکم ہے جو قانونِ شرع کے موافق ہے کہ اولاد کا نسب باپ کی طرف کیا جاتا ہے نہ کہ ماں کی طرف۔ اسی وجہ سے اگر کسی شخص کا باپ شریف نہ ہو تو اس کو شریف نہیں کہتے۔ پس حضرت فاطمہؑ کی اولاد تو رسولِ خداؑ کی اولاد کہی جائے گی اور حسنین کی اولاد حسنین کی اور رسولِ خداؑ کی اولاد کہی جائے گی اور حسنین کی بہنوں، یعنی زینب اور ام کلثوم کی اولاد اپنے باپ عبداللہ بن جعفر اور عمر بن خطاب کی طرف منسوب ہوگی، نہ اپنی ماں کی طرف اور نہ رسول اللہ ﷺ کی طرف، کیونکہ یہ آنحضرتؑ کی لڑکی کی لڑکی کی اولاد ہیں نہ آپؑ کی لڑکی کے لڑکوں کی۔“^①

اب ہم اس بحث کے آخر میں اس نکاح کے واقع ہونے پر ایک ایسے شیعہ مجتہد کی گواہی

پیش کرتے ہیں جن کا سکہ شیعہ دنیا میں سب سے زیادہ چلتا ہے اور چودھویں صدی ہجری کے مجتہد اعظم، انقلاب ایران کے رہنما، آیت اللہ العظمیٰ روح اللہ خمینی نے جن کی کتابوں کے مطالعہ کی بطور خاص تلقین فرمائی ہے، یعنی گیارہویں صدی ہجری کے مشہور شیعہ مجتہد ملا باقر مجلسی جنہوں نے ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا کے مسئلہ کو اپنی تصانیف میں ذکر کیا ہے۔

چنانچہ ”اصول کافی و فروع کافی“ کی شرح ”مرآة العقول“ جلد سوم صفحہ ۴۲۸-۴۲۹ ”باب تزویج ام کلثوم“ طبع قدیم ایرانی میں اس پر مفصل بحث کی ہے اور منکرین نکاح کے جوابات دیے ہیں، آخر بحث میں چل کر نکاح ہذا کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے:

((والاصل فی الجواب ان ذالك وقع علی سبیل التقیة
والاضطرار .))

”یعنی اصل جواب یہ ہے کہ یہ نکاح مجبوری اور تقیہ کی بنا پر واقع ہوا تھا۔“

اب جبکہ شیعہ مجتہدین، محدثین و مؤرخین کے اقرار سے یہ ثابت ہو چکا کہ جو ام کلثوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کی نہیں بلکہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ و حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کی بیٹی و حسنین رضی اللہ عنہما شریفین کی حقیقی بہن تھیں۔ اس کے بعد جناب مولوی علی حیدر صاحب کی اس بات میں کوئی دم نہیں رہ جاتا:

”بنو امیہ کی بے حد و اتہا جال و فریب کی کارروائیوں سے متاثر ہو کر مؤرخین و محدثین اہل سنت نے غلطی سے ام کلثوم دختر ابوبکر و اسماء کو دختر جناب امیر و فاطمہ سمجھ لیا۔“

در اصل یہ جملے فخر المحققین صاحب نے شیعہ عوام کو اندھیرے میں رکھنے کے لیے تحریر کیے ہیں جس سے ان کی سراپیمگی اور گھبراہٹ کا اندازہ ہوتا ہے، نیز یہ کہ ہر الزام بنو امیہ اور اہل سنت کے سر تھوپنے کے جذبے کو تھی تسکین مل جاتی ہے۔

ہم شیعہ دوستوں سے التماس کرتے ہیں کہ وہ ہٹ دھرمی اور مذہبی تعصب سے اوپر اٹھ

کر اس بات پر سنجیدگی سے غور کریں کہ ان کے یہاں چار کتابیں (جو کہ اصولِ اربعہ کے نام سے مشہور ہیں) تمام کتب میں معتبر و مستند یقین کی جاتی ہیں:

- ۱: ”الکافی“ از محمد بن یعقوب کلینی الرازی المتوفی ۳۲۹ھ
- ۲: ”من لایحضرہ الفقیہ“ از الشیخ صدوق ابو جعفر محمد بن علی بن بابویہ القمی متوفی ۳۸۱ھ۔

- ۳: ”الاستبصار“ از ابو جعفر محمد بن حسن الطوسی ”شیخ الطائفہ“ المتوفی ۴۶۰ھ
- ۴: ”تہذیب الاحکام“۔

ان اصولِ اربعہ میں ”من لایحضرہ الفقیہ“ کے علاوہ تینوں کتابوں میں ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا کے نکاح کا مسئلہ ائمہ معصومین کے باسناد اقوال کے ساتھ مذکور ہے۔ نیز یہ کہ امام معصوم نے اس نکاح کے واقعہ سے دینی مسئلہ میں استنباطِ احکام بھی کیا ہے۔ اہل علم خوب جانتے ہیں کہ مجتہدین کرام کس درجہ کے واقعات کو مثال بنا کر فتوے دیتے ہیں اور یہاں تو امام معصوم نے حضرت ام کلثومؑ کے واقعہ کو ہی مثال بنا کر فتویٰ دیا ہے..... فروع کافی طبع نو لکشور لکھنؤ جون ۱۸۸۶ء جلد ۲ صفحہ ۳۱۱ ”باب المتوفی عنہا زوجہ المدخول بہا این تعدد و ما یجب علیہا“ میں ہے:

((عن سلیمان بن خالد قال سألت ابا عبد الله عليه السلام عن امرأة توفی عنہا زوجہا این تعدد فی بیت زوجہا او حیث شاءت قال بل حیث شاءت ثم قال ان علیا صلوات اللہ علیہ لمامات عمراتی ام کلثوم فاخذ بیدہا فانطلق الی بیتہا.))

”سلیمان بن خالد سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس عورت کے متعلق پوچھا جس کا شوہر مر گیا تھا کہ وہ کہاں

عدت بیٹھے؟ اپنے شوہر کے گھریا جہاں چاہے؟ امام نے فرمایا: جہاں چاہے۔
اس کے بعد فرمایا بہ تحقیق علی صلوات اللہ علیہ عمر کی وفات کے بعد ام کلثومؓ کے
پاس گئے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے آئے۔“

امام جعفر صادقؑ کا یہ فتویٰ اسی طرح ”استبصار“ جزء ثالث، ابواب العدة
صفحہ ۱۸۵ و ص ۱۸۶ طبع مطبع جعفریہ نخاس جدید لکھنو طبع
قدیم، ”وتہذیب الاحکام“ صفحہ ۲۳۸، کتاب الطلاق باب عدت
النساء طبع ایران قدیم ۱۳۱۶ء میں بھی موجود ہے۔ جو صاحب دیکھنا چاہیں وہاں
دیکھ سکتے ہیں۔

تہذیب الاحکام آخری جلد کتاب المیراث صفحہ ۳۸۰ طبع قدیم ایران میں امام جعفر
صادق سے ایک روایت ہے جسے انہوں نے اپنے والد امام محمد باقر سے نقل کیا ہے:

((عن جعفر عن ابیہ قال ماتت ام کلثوم بنت علی و ابنہا زید
بن عمر بن الخطاب فی ساعة واحدة لا یدری ایہما ہلک
قبل فلم یورث احدہما من الآخر و صلی علیہا جمیعاً.))
”امام جعفر صادقؑ نے امام محمد باقرؑ سے نقل کیا ہے کہ جب علی مرتضیٰؑ کی دختر
ام کلثومؓ اور ان کے لڑکے زید ولد عمر بن خطابؑ ایک وقت میں فوت ہوئے اور یہ
پتہ نہ چل سکا کہ کون پہلے فوت ہوا ہے تو اس صورت میں ایک کو دوسرے کا وارث
نہ بنایا جاسکا اور ان دونوں پر نماز جنازہ ایک ہی وقت میں یکجا ادا کی گئی۔“

ناظرین کرام! مولوی علی حیدر صاحب نے حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لیے جو جو کارستانیاں
کی ہیں، مذکورہ بالا ثبوت ان کا پردہ فاش کرنے کے لیے کافی ہیں اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے
عقل سلیم میں سے تھوڑا سا حصہ بھی عطا کیا ہے اسے سچائی تک پہنچنے کے لیے بہت زیادہ دماغ
سوزی کی ضرورت نہیں ہے۔

اہل نظر کے لیے یہ بات بھی غور طلب ہے کہ محمد بن یعقوب کلینی جنہیں بہ یک واسطہ گیارہویں امام کی شاگردی کا شرف حاصل ہے اور ان کی کتاب ”الکافی“ بارہویں امام (فرضی) کی تصدیق شدہ بھی ہے، انہیں اپنی کتاب میں ایک مستقل باب ”باب تزویج ام کلثوم“ قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر یہ شیخ الطائفہ محمد بن حسن طوسی جنہوں نے اپنی کتابوں ”استبصار“ اور ”تہذیب الاحکام“ میں اس واقعہ کو سند نقل کیا ہے۔ شریف المرتضیٰ علم الہدیٰ صاحب شافی متوفی ۴۰۶ھ، شیخ زین الدین احمد العالمی المعروف الشہید الثانی متوفی ۹۶۲ھ، قاضی نور اللہ شوستری ”شہید ثالث“ متوفی ۱۰۱۹ھ، گیارہویں صدی ہجری کے مشہور مجتہد ملا باقر مجلسی متوفی ۱۱۱۱ھ، تیرہویں صدی کے مشہور شیعہ مورخ صاحب ”ناسخ التواریخ“ مرزا محمد تقی خاں، وزیر اعظم سلطان ناصر الدین قاجار والی ایران اور ان کے فرزند صاحب ”طراز مذہب مظفری“ مرزا عباس علی قلی خاں وزیر اعظم شاہ قاجار چودھویں صدی ہجری کے شیعہ فاضل و مجتہد شیخ عباس قمی صاحب ”منتہی الآمال“ جنہوں نے اپنی اپنی تصانیف میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح کو تسلیم کیا ہے۔ کیا یہ سب حضرات اہل سنت اور بنو امیہ کے حاشیہ بردار تھے؟

نواب محسن الملک صاحب رحمۃ اللہ علیہ ”آیاتِ بینات“ نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ شیعوں نے اس مسئلہ میں کیا کیا رنگ بدلے ہیں اور کیسی کیسی توجیہات لاطائل کی ہیں۔ کسی نے اس نکاح کے ہونے سے ہی انکار کیا ہے، کوئی ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے بنت مرتضوی ہونے ہی کا منکر ہوا ہے، کسی نے نکاح پر غصب کا اطلاق فرمایا ہے، کوئی نکاح کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہم بستر ہونے کا منکر ہوا ہے، کوئی کہتا ہے کہ بخران کی ایک جتیبہ ام کلثوم کی شکل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آتی تھی اور وہ ہم خواب ہوتی تھی، کسی نے اس کو جناب امیر کے اعلیٰ درجہ کے صبر کا نتیجہ کہا ہے، کسی نے اس کو تقیہ پر ٹالا ہے..... بہر حال ہر ایک کا نیا ترانہ اور ہر متنفس کا جدا افسانہ ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں مگر کوئی بات بنائے نہیں بنتی۔ غرض یہ کہ شیعہ

علماء کی جان بڑی ضیق میں ہے اور ان کے حال پر غالب کا یہ شعر تھوڑی سی لفظی تبدیلی کے ساتھ صادق آتا ہے:

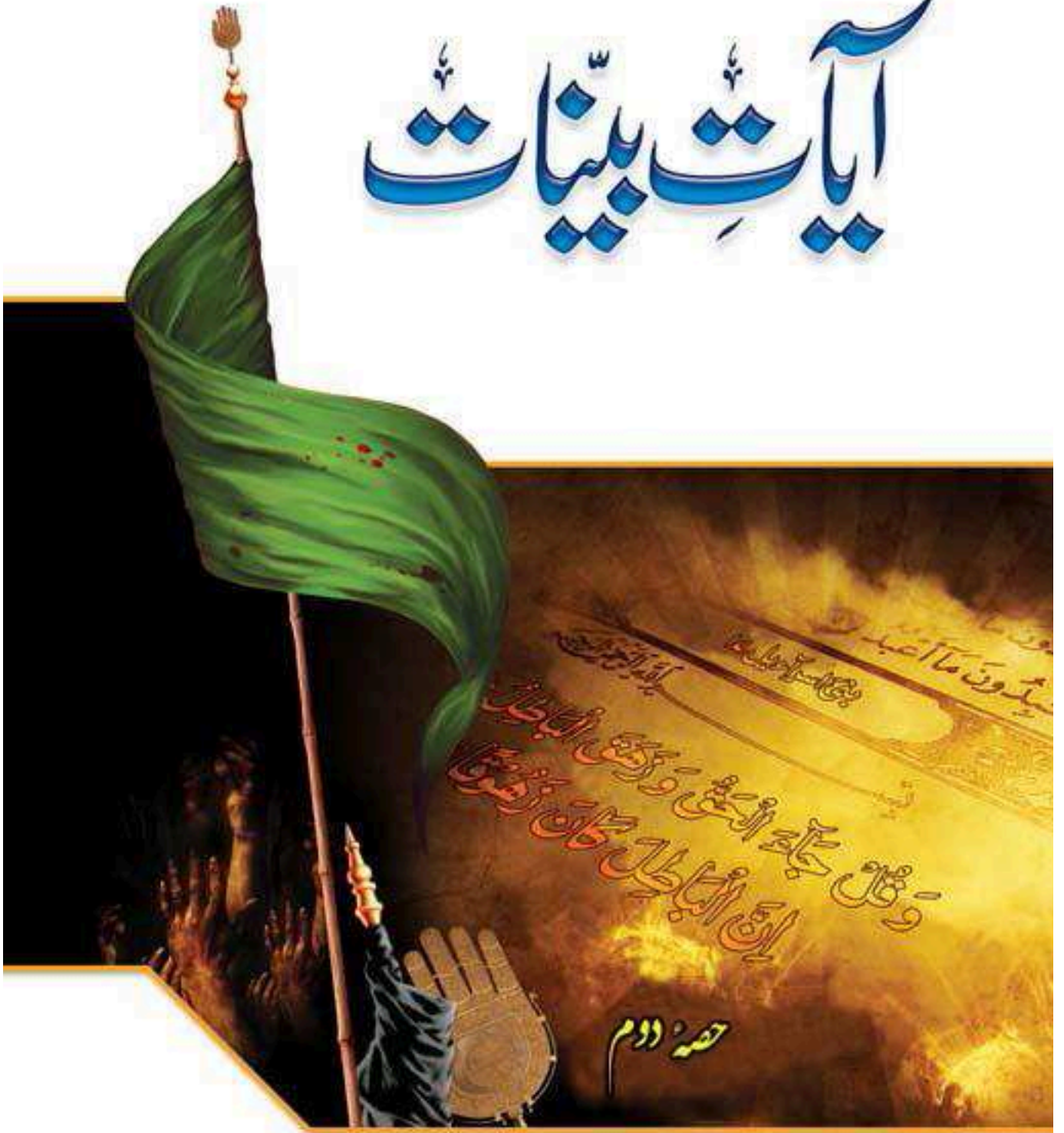
بوجھ وہ سر پہ رکھا ہے جو اٹھائے نہ اٹھے

باب وہ آن پڑی ہے جو بنائے نہ بنے



وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاقُونَ

آيَاتِ بَيِّنَاتٍ



نواب محسن الملک سید محمد ہمدی علی خان

تمہید

حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے نکاح کی بحث کو ہم نہایت تفصیل کے ساتھ لکھ چکے، اس لیے ہم اب پھر فضائل صحابہ رضی اللہ عنہم لکھنا شروع کرتے ہیں لیکن جس قدر فضائل از روئے کتب معتبرہ شیعہ کے اب تک ہم نے لکھے ان سے خدا کی قدرت نظر آتی ہے کہ باوجودیکہ حضرات شیعہ حد سے زیادہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے دشمنی رکھتے ہیں اور پھر بھی انہی کی کتابوں میں اس کثرت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کے فضائل کی روایتیں موجود ہیں اور جب تک کہ لفظ بہ لفظ انہیں نقل نہ کیا جائے اور کتاب کھول کر نہ دکھلائی جائے تب تک حضرات امامیہ اس کا اقرار ہی نہیں کرتے اور جہاں تک ہو سکتا ہے انکار ہی کرتے رہتے ہیں، چنانچہ جناب قبلہ و کعبہ مولوی سید دلدار علی صاحب اپنی ”صوارم“ میں فرماتے ہیں:

((اما ❶ احادیث فضائل صحابة از طریق امامیہ باوجود کثرت احادیث مختلفہ درہر امر جزئی از جزئیاتِ اصلیه و فرعیہ اگر تمام کتب احادیث امامیہ ورقاً و رقاً بہ نیت تفحص مطالعہ در آرد مظنون آنست کہ زیادہ از سہ چہار احادیث کہ سرو پادرسند نداشتہ باشد دست بہم نہد اما احادیث مثالب آنها پس بلا اغراق اینست کہ متجاوز از ہزار حدیث باشد.))

”فضائل صحابہ رضی اللہ عنہم کی احادیث بہ طریقہ فرقیہ امامیہ جو اصلی اور فرعی جزئیات میں مختلف ہیں اگر تمام کتب احادیث امامیہ بہ نظر تحقیق ورق ورق کر کے دیکھی

جائیں تو یقین ہے کہ صرف تین چار حدیثیں ملیں گی اور وہ بھی بے سرو پا اور ان کی تنقیص کی احادیث بلاشک و شبہ ہزاروں سے زیادہ ہیں۔“

لیکن اس قوت کی تصدیق ہماری اس چھوٹی سی کتاب سے ہوتی ہے بلا مبالغہ سو (۱۰۰) روایت سے زیادہ فضائل صحابہ رضی اللہ عنہم میں بروایت کتب معتبرہ شیعہ پہلے ہی حصہ میں موجود ہیں، چنانچہ کچھ تو اب تک ہم لکھ چکے اور کچھ اب لکھتے ہیں۔ حضرات شیعہ کو اگر سو تک گنتی آتی ہو تو وہ شمار کر لیں کہ سو سے زیادہ روایتیں فضیلت صحابہ رضی اللہ عنہم میں موجود ہیں کہ نہیں اور پھر اگر حضرات شیعہ انصاف کریں تو علماء کے جوابات پر بھی خیال فرمائیں اور خدا کو حاضر و ناظر جان کر عقل کی ترازو میں ہماری تقریر کو اور ان کے جواب کو تو لیں اور اپنے تئیں اہل عدل سمجھ کر سچ سچ فرمائیں کہ کس کا پلہ بھاری ہے اور کس کا ہلکا اور بغض و عناد کا تو کچھ علاج ہی نہیں ہے۔

چونکہ حضرات شیعہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے دلی عداوت رکھتے ہیں، اس لیے ان کی فضیلت کا کسی طرح اقرار نہیں کرتے اور کیا خدا کے کلام کو کیا رسول کی حدیث کو کیا ائمہ کے اقوال کو جہاں تک ہو سکتا ہے تحریف لفظی و معنوی کر کے چاہتے ہیں کہ ان کی بزرگی ثابت نہ ہو مگر یہ فحوائے آیت ﴿وَيَأْتِي اللَّهُ إِلَّا أَنْ يُتَمَّ نُورًا وَلَا نُورًا وَلَا كُفْرًا﴾ (سورہ توبہ: ۳۲) اور اللہ نہ رہے گا اپنی پوری کیے بغیر اور گرچہ کافر برائیاں ہیں۔“ خدا اپنے دوستوں کی بزرگیوں کو دشمنوں کی زبان سے ظاہر کر دیتا ہے اور بہ مقتضائے (الفضل ما شهدت به الاعداء) ”بڑائی وہ ہے جس کی دشمن بھی گواہی دیں۔“ اس سے ان کی فضیلت کو ثابت کرتا ہے، چنانچہ ہم نے اپنی اس کتاب میں اس کا التزام کیا ہے کہ اپنی اس کتاب کے اس حصے کو صحابہ رضی اللہ عنہم کے فضائل سے بروایاتِ امامیہ بھر دیں گے اور شیعوں ہی کی کتابوں سے اتنی سندیں لائیں گے کہ آخر کار وہ سنتے سنتے اور دیکھتے دیکھتے تھک جائیں اور کلمہ شہادت میں ہمارے شریک ہو جائیں اور پھر اپنے فضلاء اور مجتہدین کے انصاف کی داد دیں کہ ایسی روایتوں اور حدیثوں کے موجود ہونے کے باوجود انہوں نے فضائل صحابہ رضی اللہ عنہم سے کیسا انکار کیا ہے اور جس مجتہد

نے سنیوں کی کتابوں کے جواب لکھے ہیں اس میں بعض کو کتنا دخل دیا ہے۔ خصوصاً پچھلے مجتہدین نے سوائے گالیوں کے حقیقت میں کسی بات کا کچھ بھی جواب نہیں دیا اور جاہلوں کی سی باتوں سے اپنی کتابوں کو بھر دیا ہے۔ اگر کسی کو شک ہو وہ مولوی دلدار علی صاحب کی تالیفات کو دیکھے کہ جواب لکھنے کے وقت کیسے عامی بن گئے ہیں اور علماء کی شان کے خلاف بات بات پر گالیاں دی ہیں مگر حقیقت میں یہ قصور ان کے متبحر ہونے اور تقدس کا نہیں ہے بلکہ یہ قصور اس تہذیب کا ہے جو عمر بھر پاک لوگوں کی شان میں کہا اور رات دن لعنت لعنت کہتے رہے جس نے موافق حدیث کے انہیں پر رجعت کی۔ میں نے بہت سی کتابیں اس فن میں شیعوں اور سنیوں کی دیکھیں اور میری نظر سے علم کلام کے بہت سے رسالے گزرے اور اکثر لوگوں کے کلام میں شوخی بھی پائی لیکن وہ خوبی جو جناب قبلہ و کعبہ مولوی سید دلدار علی صاحب کی تالیفات میں ہے وہ کسی میں نہ دیکھی۔ حضرت کا طریقہ تالیف کیا ہے کہ اول تو دل بھر کے مؤلف کو جس کا جواب لکھتے ہیں گالیاں دینا اور پھر اس پر تبرا کرنا بعدہ کچھ تعریف اپنے تبحر اور فضیلت اور تقدس کی فرمانا اور خود ہی اپنی زبان سے اپنی تالیف کی نسبت یہ کہنا:

((گمان فقیر چنیں ست کہ دریں جزو زمان چشم روز گار

نظیر این کتاب ندیدہ و گوش چرخ بریں نشنیدہ .))

”فقیر کا خیال ہے کہ اس عہد میں زمانہ کی آنکھوں نے ایسی کتاب نہ دیکھی ہوگی

اور چرخ بریں کے کانوں نے ایسے (مضمون) نہ سنے ہوں گے۔“

جب اس سے فارغ ہوں گے تب خارج از بحث گفتگو کریں گے اور ورق کے ورق ان باتوں کے لکھنے سے رنگین کریں گے جن کو اس بحث سے کسی طرح کا کچھ بھی تعلق نہیں ہے، صوفیوں کی برائیاں بیان کرنے لگیں گے، اولیاء اللہ کی شان میں جو دل چاہے گا فرمادیں گے، جب اس سے نجات پائیں گے اور مؤلف کتاب کے کلام کے نقض کی طرف متوجہ ہوں گے، تب کسی معتزلی یا کسی شیعہ یا کسی گننام کو فاضل سنی قرار دے کر اس کے اقوال کو معارضہ میں پیش کریں گے۔ جس کسی کو شک ہو وہ ذرا ”ذوالفقار“ اور ”صوارم“ وغیرہ کو اٹھا کر دیکھے اور

غور کرے کہ فقیر کے کلام کی تصدیق ہوتی ہے یا نہیں..... ذوالفقار میں صوفیوں کو گالی دینے کا کیا موقع تھا اور ان لوگوں کی شعروں اور مثنوی کے بیتوں کی نقل کرنے سے جن کو علمائے کرام اپنے مناظروں میں آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے اور اپنے کسی اصولی و فروعی مسئلہ پر ان کو سند نہیں لاتے، کیا حاصل تھا، سوائے اس کے کہ کتاب کو بڑھائیں اور اپنے رسالے کو ایسی پوچ باتوں کے لکھنے سے موٹا کریں اور کیا نتیجہ نکلتا ہے..... صوارم کو دیکھیے کہ اس کیا حال ہے، کوئی ورق اور کوئی صفحہ اس کا ایسا نہیں ہے کہ جس میں مغالطات نہ ہوں، سطریں کی سطریں گالیوں اور لعنت سے سیاہ ہیں اور صفحے کے صفحے پوچ اور بے ہودہ باتوں سے بھرے ہوئے ہیں اور جہاں حضرت سند دلیل لائے ہیں وہاں اکثر اپنے استاد اور پیر ابن ❶ ابی الحدید معتزلی شیعہ کے اقوال مردودہ کو نقل کیا ہے کہ اگر کوئی بے چارہ جاہل سنی اتنا بڑا نام جس میں دس حرف سے بھی زیادہ ہیں سنے اور عربی زبان میں بڑی لمبی چوڑی عبارت اس کی دیکھے اور سراسر اپنے مذہب کے مخالف اور مطابق حضرات شیعہ کے پائے تو اس کو حیرت ہو اور یہ خیال کرے کہ شاید یہ کوئی بڑا عالم اور فاضل سنیوں کا ہے اور اس کا کلام بھی مستند بین العلماء ہے، دھوکے میں آ کر ان مسائل میں شک کرنے لگے۔ حالانکہ جناب قبلہ و کعبہ نے یہ خیال نہ فرمایا کہ جو ادنیٰ درجے کے طالب علم ہیں اور مکتب میں شرح عقائد اور شرح مواقف پڑھتے ہیں وہ بھی اس سے بخوبی واقف ہیں کہ ابن ابی الحدید معتزلی ہے اور اپنے اعتزال کے ساتھ تشیع کو ملائے

❶ ان کا نام عزالدین بن عبد الحمید بن ابی الحسن بن ابی الحدید ہے۔ ۵۸۶ ذی الحجہ کے ابتدائی ایام میں بمقام مدائن پیدا ہوئے۔ زیادہ تر اہل مدائن انتہائی عالی شیعہ تھے، یہ بھی انہیں کی رو میں بہہ گئے اور ان کا مذہب قبول کر لیا۔ انہیں کے طریقے پر عقائد کو نظم میں بیان کیا ہے، ان اشعار میں غلو اور افراط بہت ہے۔ بعد میں یہ بغداد چلے گئے اور اعتزال کی جانب مائل ہو گئے اور جیسا کہ صاحب ”نسخة السحر“ نے کہا ہے کہ یہ عالی شیعہ ہونے کے بعد پھر معتزلی ہو گئے تھے۔ شیعہ وزیر مؤید الدین محمد بن علقمی کی لائبریری کے لیے بیس جلدوں پر مشتمل ایک کتاب ”شرح نہج البلاغہ“ لکھی، جب لکھ چکے تو اپنے بھائی موفق الدین ابی صالی کے ہاتھ اس کے پاس بھیجی، اس نے ان کو ایک لاکھ دینار خلعت اور گھوڑا انعام میں عطا کیا۔ (روضات الجنات، جلد ۵، ص: ۲۰-۲۱) ۶۵۵ھ میں بغداد میں انتقال ہوا۔ (شیخ محمد فراست)

ہوئے ہے، اس کے کلام کو اہل سنت کے معارضے میں پیش کرنا بعینہ ایسا ہے جیسا کہ حضرات زرارہ اور ہشام بن حکم کے قولوں کا حوالہ دینا۔ اس لیے کہ سنیوں کے نزدیک دونوں برابر ہیں اور بمقتضائے (الْكَفْرُ مِلَّةٌ وَاحِدَةٌ) کے بوجہ ترک سنت کے ابن ابی الحدید اور زرارہ ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور باوجودیکہ حضرت کی کتاب صوارم اسی کے اقوال مردودہ سے بھری ہوئی ہے، پھر اس کتاب پر آپ کو اس قدر ناز ہے کہ اس کی خوبیوں کو بیان کرنے کے لیے الفاظ ہی میں اس کی تعریف لکھتے لکھتے کاغذ میں جگہ نہیں رہی اور صرف اپنی کتاب ہی پر ناز نہیں کرتے بلکہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کی طرف مقابل بننے پر بھی اپنا عار سمجھتے ہیں اور اس پر بھی افسوس ظاہر کرتے جاتے ہیں، چنانچہ صوارم کے خطبے میں فرماتے ہیں کہ جب میں نے امام رازی کی کتاب ”نہایۃ العقول“ کا جواب لکھ لیا تو پھر مجھے دوسرے جواب لکھنے کی خواہش نہیں رہی۔

((۱) چہ معلوم ست و پیدا و ظاہر ست و هویدا کہ چوں شاہ
 باز طبیعت بقید سیمرغ مضامین عالیہ خو گرفتہ باشد دیگر
 مخالیب ہمت خود را بہ خون کر گس کندیدہ نیالاید
 و کیسکہ ابکارا افکار را بحبالہ خود در آورده باشد نگاہ
 التفات بہ طرف عجوزہ شوہا نہ فرماید لیکن از انجا کہ روز
 گار ناہموار نمی گزارد کہ از باب ہُمم عالیہ از دست سفلہ
 ناس و بے خبر دان حق ناشناس نجات یافتہ دمے باستراحت
 بگزرانند و ابارد شیاطین نمی شود کہ از اضلال بنی آدم دمے
 تغافل نمایند قبل ازین تقریباً پنج شش سال باب دوازده از
 کتاب بعضے دوے الاذنب در نفض مذهب عترت جناب
 رسالت مآب دریں بلده کہ بالفعل محل اقامت فقیرست

بردریافت و شبهات موهومه و هذیاناتِ ملمعه اودلهای
عوام مومنین رامنقبض ساخت جهال سنیان راسر باوج
مُباهات رسید و آن صحیفه ملعونه بلاشبه عصائے کوری این
کور باطنان گردید و احقر درین بات چول بدل خود رجوع
می نمود نظر باین که مثل کتاب ”نهایة المعقول“ امام سنیان
را جواب گفته و از سرتاپا منتفض و باطل ساخته هرگز به
نقض کلام نافر جام ناصب عداوت اهل بیت که از اوّل تا
آخر آثار غباوت و غوایت ازاں پیدا و امارات بغض و عداوت
عترت رسولّ ظاهر و هویدا راضی نمی گردید و طرف
گفتگو شدن باچنین جاهل مدبر عار دانسته هرگز بر خود
نمی پسندید چون حال برین منوال مشاهده نمودم دل خود
را مخاطب ساخته گفتم که این مجادله و معارضه که ترا با
چنین جاهل غبی پیش آمده لیس اوّل قارورة کسرت فی
الاسلام و طرف گفتگو شدن تو بامثال چنین نادرستان ”لیس
ما اعجب من مجادلة الانبياء الكرام والا وصياء الفخام مع
معاصرهم من الكفرة الفجرة الیام جرا نظر نمی نمائی و
نگاه التفات نمی فرمائی بحال جناب حضرت ابراهیم^ع و
حضرت موسی^ع و جناب هارون علیه السلام که بآن علوم و
کمالات مبتلا گردیدند به مجادله نمودن بانمروود و مردود
فرعون ملعون که از کمال جهل و غباوت باوجود ظهور آثار
مخلوقیت و باوج امارات افتقار دعوی خدائی می کردند و
هم چنین نگاه کن به طرف جناب سید المرسلین صلعم که

بالاتفاق افضل و اکمل خلائق ست چگونہ مبتلا گردید
مجادلہ جہال مشرکین قوم خود کہ بہ سبب فرط جہالت
جماداتے چندرا کہ خودمی تراشیدند عبادت و پرستش می
نمودند و ہم چنیں اند کے از خواب غفلت بیدار شود چشم
بکشاد بہ بیں جناب باب مدینہ علم رسول را کہ بالاتفاق
اعلم ناس بود بعد رسول خدا صلعم چہ قسم مبتلا گردید بہ
معارضہ و مجادلہ چند ناکس منافقین قریش و ہر گاہ
حقیقت حال اینمنوں باشدنا چار عنان التفات عالی خود
رابہ نقض کردن کلام مورد ملام او منعطف باید ساخت و
براستیصال ہذیانات بیہودہ او ہمت والا تہمت خود را باید
گماشت .)) انتہی بلفظہ ملخصاً

”یہ امر ظاہر و عیاں ہے کہ جب شہباز طبیعت نے سمرغ مضامین عالیہ کی
عادت بنائی ہے تو پھر اپنی ہمت کے ناخونوں سے کرگس کا خون بہانا نہیں چاہتا
اور جو کہ نادرہ باکرہ افکار کو اپنے عقد میں لے آئے وہ بوڑھی عورت کی جانب
توجہ نہیں کرتا اس کے باوجود زمانہ نامہموار عالی ہمت لوگوں کو اپنے دست سفلہ پر
ورحق ناشناس بے عقلوں کو نجات دے کر ایک لمحہ کے لیے آرام نہیں لینے دیتا اور
شیطان انسانوں کو بہکانے سے ایک لمحہ تغافل نہیں کرتا۔ اب سے تقریباً پانچ چھ
سال پہلے بعض کم مرتبہ لوگوں نے بارہواں باب عترت رسالت مآب کے
بارے میں اسی شہر (لکھنؤ) میں جہاں یہ فقیر مقیم ہے ظاہر کیا اور ان موہومہ
شبہات و ہذیانات نے قلب مومنین کو منقبض کیا اور جاہل سنیوں کے سرفخر سے
اونچے ہوئے اور یہ ملعون کتاب ان عقل کے اندھوں کے لیے عصائے نابینا
ثابت ہوئی نظر برآں سنیوں کے امام کو ایک معقول دستاویز کے ساتھ جواب

دینے کا خیال دامن گیر ہوا کہ اس کی کتاب کو سراسر باطل کروں لیکن اس کتاب میں بے ہودہ کلام شروع سے آخر تک اہل بیت کی عداوت کے سوا کچھ نہ تھا، اس لیے میرا دل اس طرف متوجہ نہ ہوا اور میں نے ایسے جاہلوں سے گفتگو پسند نہیں کی۔ اس حالت کے اندر میں نے خود سے مخاطب ہو کر کہا کہ ایسے جاہل اور غبی سے تم کو جو مجادلہ درپیش ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ایسے ناکارہ لوگوں سے مجادلہ و معارضہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ انبیاء کرام اور معزز اوصیاء نے اپنے زمانے کے کافروں، فاجروں اور ملعونوں سے کیا ہے، اس لیے تم بالکل ان کی طرف نظر نہ کرو اور حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام کو نہیں دیکھتے کہ اپنے علوم و کمالات کے باوجود مردود و نمرود، ملعون فرعون سے جو الوہیت کا دعویٰ کرتا تھا مجادلہ کیا، اسی طرح افضل و اکمل ختم المرسلین ﷺ نے اپنی جاہل مشرک قوم سے مجادلہ کیا جو اپنی جہالت سے پتھروں کو خود تراش کر ان کی پوجا اور پرستش کرتے تھے، اسی طرح خواب غفلت سے بیدار ہو کر، آنکھ کھول کر باب مدینۃ العلم کو دیکھو جو تمام لوگوں سے زیادہ عالم تھے، رسول خدا ﷺ کے بعد، وہ بھی منافقین قریش سے مباحثہ اور مجادلہ کے لیے مبتلا کیے گئے، جب حقیقت حال یہ تھی تو مجبوراً ہم اپنی بلند و بالا توجہ اس ملعون کلام کی تردید و تنقیص کی طرف منعطف کریں گے اور ان کے بیہودہ بکواس کا استیصال کریں گے۔ یہ ہیں صوارم کے الفاظ جو مختصر طور پر پیش کیے گئے۔“

غرض کہ یہ چند سطریں قبلہ و کعبہ کے تقدس اور تہذیب اجتہاد اور وقار کی نمونہ ہیں باقی کو اس پر قیاس کرنا چاہیے، لیکن ہم اس سے بحث نہیں کرتے اور اس کے جواب میں ہم جاہل اور عامی بن کر گالی کا جواب گالی سے نہیں دیتے ہاں حضرت کی لن ترانیوں اور خود ستائیوں پر کبھی کبھی یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر کاش! قبلہ و کعبہ جواب بھی ایسے ہی دیتے جیسی گالیاں دی ہیں اور شاہ صاحب کے اعتراضات کو بھی اس خوبی سے رد کرتے جس خوبی سے اپنی تعریف

فرماتے ہیں تو یہ تعریف بجائے خود ہوتی اور اس تہذیب اور شائستگی پر بھی خاک پڑ جاتی، یعنی یہ عیب بھی کچھ چھپ جاتا لیکن افسوس ہے کہ کسی مسئلے کے جواب میں حضرت نے اپنے وقار طبیعت کے جوہر نہ دکھلائے اور کسی عقیدے کے اثبات میں اپنے اجتہاد اور تبحر کو ظاہر نہ فرمایا وہی پرانی باتیں جو ان کے پیشوا لکھتے آئے ہیں لکھ کر سکوت اختیار کیا اور انہیں قصے کہانیوں کو جو پشت در پشت سے سنتے آئے تھے نقل کر کے کتاب کو ختم کیا، پس ہم کو افسوس اسی بات پر آتا ہے کہ حضرت نے اپنے آپ کو انبیاء اولوالعزم کے ساتھ مشابہ بھی بنایا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت سید الانبیاء علیہ التَّحیۃ و التَّسلیم کا عہدہ بھی اپنے ذمہ لیا اور سید الاوصیاء باب مدینۃ العلم کی نیابت کا بھی دعویٰ کیا اور خلق کی ہدایت کی اور ایک منافق جاہل کا مثل مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کے جن کی کم علمی اور بے بضاعتی اور جہالت سے نہ ہندوستان بلکہ عرب و عجم کے لوگ بھی واقف ہیں طرف مقابل بننا نہایت مجبوری سے گوارا کیا اور ایسے بڑے عار و ننگ کو صرف شیعیاں پاک کے دین و ایمان کی خاطر سے اختیار کیا مگر افسوس ہے کہ کچھ کر کے نہ دکھلایا اور جتنا دعویٰ کیا تھا اسے پورا نہ کیا اور اپنے آپ کو ان علماء کے زمرے میں داخل کیا جس کی صفت جناب امیر علیہ السلام اپنے ایک خطبے میں کرتے ہیں:

((وان أبغض الخلق الی اللہ تعالیٰ رجل قمش علماء اغار فی اغباش الفتنة سماء اشباء الناس و اراد لهم عالما ولم یعش فی العلم یوماً سالماً بکرفا ستکثر مما قل منه خیر مما کثر حتی اذا ارتوی من ماء اجن و اکثر من غیر طائل جلس للناس مفتیاً لتخلیص ما التبس علی غیره فان نزلت به احدی المبهمات هباءً لها من رائه حشواً الرائی فهو من قطع الشبهات فی مثل نسج العنکبوت لا یدری اخطا ام اصاب رگاب جهالات خبّاط عشوات لا یعتذر مما لا یعلم فیسلم ولا یعض علی العلم بضرر س قاطع فیغتم تبکی منه الدماء و تستحل

بقضائه الفروج الحرام لاملئ واللہ باصدار ماورد علیہ ولا
ہم اهل لما فوض الیہ اولئک الذی حلت علیہم المثلاث
وحقت علیہم النسیاحۃ والبکاء ایام الحیوۃ الدنیا .))
”کہ سب خلق سے زیادہ تر دشمن خدا کے نزدیک وہ آدمی ہے جو ادھر ادھر سے
علم کو جمع کر کے فتنہ و فساد کی تاریکی میں جلد جلد دوڑتا ہے اور جس کو ایسے لوگ جو
آدمیوں کی صورت رکھتے ہیں اور حقیقت میں انسانیت سے بے بہرہ ہوتے ہیں،
عالم فاضل کہنے لگتے ہیں حالانکہ وہ ایک دن بھی علم سے سروکار نہیں رکھتا، صبح
ہوئی اور اس چیز کو جمع کرنے پر متوجہ ہوا جس کی قلت بہتر ہے اس کی کثرت
سے، یعنی مال یہاں تک کہ جب سڑے پانی سے پیٹ بھر لیا تو وہ مفتی بن کر
بیٹھا اور اپنی پوچ لچر رائے سے مشکلات اور شبہات کے حل کرنے پر آمادہ ہوا،
جس کی رائے ان کے حل کرنے میں وہی قوت رکھتی ہے جو کہ مکڑی کے جالے کو
ہوتی ہے، یہ بھی نہیں جانتا کہ خود اس نے غلطی کی یا صحت، وہ اندھوں کے موافق
چلتا ہے اور ہر بات میں بے بصیرت ہوتا ہے، اپنی لاعلمی کا عذر نہیں کرتا تا کہ
آفت سے بچ جائے اور علم کو مضبوطی سے نہیں پکڑتا کہ فائدہ پائے، اس کے
فتوے سے ناحق خون بہائے جاتے ہیں جو کہ اسی کو روتے ہیں اور اس کے حکم
سے بہت سی حرام فرجیں حلال ہو جاتی ہیں، نہ وہ اس لائق ہوتا ہے جو اس سے
پوچھا جاتا ہے نہ وہ اس کام کی اہلیت رکھتا ہے جو اس کے سپرد کیا جاتا ہے پس وہ
اس میں ہے جس پر عذاب حلال ہو جاتا ہے اور جس پر نوحہ و بکاء کرنا زندگی بھر
واجب ہوتا ہے۔“

میں نے جو کچھ کہا اس کا ثبوت خود جناب والا کی تالیفات اور جوابات سے ہوتا ہے،
چنانچہ میں اپنی اس کتاب میں ان شاء اللہ تعالیٰ ان کی ساری تالیفات سے جو بجواب تحفہ کے
ہیں بحث کروں گا اور کیا ”ذوالفقار“ اور کیا ”صوارم“ اور کیا ”حسام“ سب ان کی تلواروں کے

وار انہیں کے ہاتھ سے انہی کے منہ پر ماروں گا اور جو کچھ انہوں نے ان کتابوں میں لکھا ہے اس کو جس بحث کے متعلق ہے بالاستیعاب نقل کر کے اس کی خوبیاں ان کی پیروی کرنے والوں پر ظاہر کر دوں گا تا کہ مخالف بھی شہادت دینے لگیں اور زبان سے نہیں مگر دل میں تو ضرور سنیوں کا کلمہ پڑھنے لگیں اور ﴿وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾ (الاسراء: ۸۱) کا شور آسمان تک پہنچ جائے۔

(وہا انا اشرع فی بیان ما کتب فی صدہ) جو کچھ میں نے اب تک لکھا یہ فضائل صحابہ رضی اللہ عنہم کے بیان میں تھا جس کو میں نے نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور خود شیعوں ہی کی کتابوں سے اس کو ثابت کیا اور جو کچھ جواب ان کے عالموں نے دیے ہیں ان کو موقع بموقع نقل کیا، اب میں شیعوں کے ان اقوال کو بیان کرتا ہوں جو تمام آیات اور احادیث فضائل صحابہ رضی اللہ عنہم سے دیتے ہیں اور اس کے ضمن میں بہت کچھ روایتیں ان کے فضائل کی موقع بہ موقع لکھتا جاؤں گا۔

آیاتِ فضیلت صحابہ رضی اللہ عنہم کی نسبت شیعوں کا جواب:

قرآن مجید کی جو آیات صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان میں ہیں اور جن میں سے چند آیتوں کو اوپر میں نے بیان کیا ہے ان کی نسبت شیعوں کا عام جواب یہ ہے:

جو آیتیں مہاجرین کی شان میں اور ان کی بزرگیوں میں خدا نے بیان کی ہیں اور ان کی نسبت اپنی رضامندی کا اظہار فرمایا ہے، اس کا حضرات شیعہ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہجرت کی صحت میں اور اس پر مستحق ثواب ہونے میں ایمان اور صحت نیت شرط ہے، چنانچہ اپنے بزرگوں کی تقلید میں جناب مولوی دلداری صاحب قبلہ بھی ”ذوالفقار“ میں اس مقام پر جہاں کہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب نے آیت:

﴿وَالسَّابِقُونَ الْأُولُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ... الخ﴾

(سورہ توبہ)

① اور کہہ آیا حق اور نکل بھاگا جھوٹ اور بے شک جھوٹ نکل بھاگنے والا ہے۔“ (بنی اسرائیل)

”اور جو لوگ قدیم ہیں پہلے وطن چھوڑنے والے اور مدد کرنے والے۔“
کا ذکر کیا ہے فرماتے ہیں:

((پس ❶ بیابددانست کہ باتفاق اہل اسلام در صحت ہجرت و ترتب ثواب برآں ایمان شرط است و ازینجاست کہ دلیل پیمبر خدا کہ دریں ہجرت شریک ابوبکرؓ بودہ مشرک بود چنانچہ در کتاب طبقات و اقدی تصریح بآں واقع شدہ مقبول الہجرت نخواہد بود زیرا کہ باتفاق ایمان بشرط صحت عبادت است و ہم چنین باتفاق فریقین شرط ترتب ثواب بر ہجرت صحت نیت ست چنانچہ دلالت میکند برآں حدیث متواتر ، انما الاعمال بالنیات و کل امرئ ما نوى و من کانت ہجرته الی اللہ ورسولہ الخ و این ہمہ در اوائل بخاری وغیرہ مسطورست پس مادامیکہ مارا علم بہ صحت نیت ابوبکرؓ بہ ثبوت نہ رسد دخول او در مدلول این آیہ متیقن نمی شود و تاتیقن نہ شود احتجاج باین آیہ بر علو مرتبہ اونمی تواندشد .))

”جاننا چاہیے کہ اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ ہجرت کی صحت اور اس پر ثواب ملنے میں ایمان شرط ہے۔ اور ابوبکر جو پیغمبر خدا ﷺ کے ساتھ ہجرت میں شریک تھے وہ مشرک تھے، جیسا کہ طبقات میں واقدی نے صراحت کی ہے کہ ان کی ہجرت مقبول نہ تھی کیونکہ بالاتفاق عبادت کی صحت کے لیے ایمان شرط ہے، اسی طرح فریقین (شیعہ سنی) کا اتفاق ہے کہ ہجرت پر ثواب ملنے کے لیے نیت کا صحیح ہونا شرط ہے، چنانچہ اس پر حدیث متواتر (انما الاعمال بالنیات)

دلالت کرتی ہے۔ اور یہ شروع بخاری وغیرہ میں مذکور ہے سو جب تک ہم کو ابوبکرؓ کی صحت نیت کا ثبوت نہ ملے اس وقت تک آیت ﴿السَّابِقُونَ الْأُولُونَ﴾ کا اطلاق ان پر نہیں ہوتا اور جب تک یقین نہ ہو اس آیت سے ان کے علم مرتبہ پر دلیل نہیں ہو سکتی۔“

اور نیز اسی کتاب میں ایک دوسرے مقام پر جہاں کہ مولانا صاحب نے آیت : ﴿لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ﴾ (سورة الحشر: ۸) ”واسطے ان مفلسوں کے وطن چھوڑنے والوں کے جو نکالے گئے اپنے گھروں سے۔“ کا ذکر کیا تھا۔ مجتہد صاحب فرماتے ہیں:

((کہ برفرض تسلیم فضیلت ہجرت و امثال آں از اعمال مشروط است بر ایماں باجماع و اتفاق اہل اسلام و درستی نیت چنانچہ بخاری در صحیح خود از لیث روایت نموده است کہ گفت شنیدم عمرؓ خطاب را کہ بر منبر می گفت کہ شنیدم رسول خداؐ را کہ می فرمود انما الاعمال بالنیات و انما لكل امرئ ما نوى فمن كانت هجرته الى الله فهجرته الى الله ورسوله و من كانت هجرته الى دنيا يصيبها او الى امرأة ينكحها فهجرته الى ما هاجر اليه و ايس هر دو فيما نحن فيه در معرض عدم تسلیم ست .))

”ہجرت وغیرہ اعمال کی فضیلت اگر تسلیم کر لی جائے تو یہ بالاتفاق اہل اسلام ایمان اور درست نیت کے ساتھ مشروط ہے، چنانچہ بخاری نے اپنی صحیح میں لیث سے روایت کیا ہے، انہوں نے کہا کہ میں نے عمرؓ بن خطاب کو منبر پر کہتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے، ہر آدمی کو نیت کے اعتبار سے ثواب ملتا ہے جس کی ہجرت اللہ کی طرف

ہے، اس کی ہجرت اللہ ورسول کے لیے مانی جائے گی اور جس کی ہجرت دنیا کی طرف یا کسی عورت سے نکاح کے لیے ہو تو اس کی طرف ہوگی اور یہ دونوں ہم کو تسلیم نہیں۔“

اور پھر ایک مقام پر فرماتے ہیں:

((وایضا ❶ احتجاج باین آیت موقوف ست کہ بہ ثبوت رسد کہ ہجرت ابوبکرؓ بہ اجازت حضرت نبی ﷺ واقع شدہ و شیعہ این راقبول ندارند .))

”اس آیت سے دلیل پکڑنا اس پر موقوف ہے کہ پہلے یہ ثابت ہو جائے کہ ابوبکرؓ کی ہجرت حضور ﷺ کی اجازت سے ہوئی تھی، اور شیعہ اسے نہیں مانتے۔“ اور پھر ایک جگہ اسی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

((ہجرت و نصرت ممدوح امری ست کہ تعلق بہ صحت نیت دارد و آں امرے ست باطنی .)) ❷

”ابوبکرؓ کی ہجرت اور نصرت ایسا معاملہ ہے جس کا تعلق درستگی نیت سے ہے اور یہ باطنی امر ہے۔“

اب میں اس قول کو چند طرح سے رد کرتا ہوں:

اول:..... جو سند احادیث بخاری کو قبلہ و کعبہ لائے ہیں اس سے سوائے فضیلت کے اور کچھ فائدہ نہیں ہے، اس لیے کہ ہر عمل میں نیت شرط ہے اور تمام فرقے اسلام کے بلکہ سارے اہل مذہب اس پر متفق ہیں کسی کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ کوئی عمل بغیر نیت کے مقبول ہے تو اس حدیث کے نقل کرنے سے بجز کتاب کے حجم کے بڑھانے کے کیا فائدہ، ہاں مجتہد صاحب کی شاید یہ غرض ہو کہ اس حدیث کو سن کر بعض جہلاء شبہ میں پڑ جائیں اور یہ وسوسہ

❶ ”ذوالفقار“ مطبع مجمع البحرین لدھیانہ ۱۲۸۱ء صفحہ ۳۷ سطر ۱۵۔

❷ ایضاً صفحہ ۵۷

کرنے لگیں کہ یہ حدیث انہیں ہجرت کرنے والوں کی نسبت ہے جو پیغمبر ﷺ کے ساتھ یا آگے پیچھے چند روز کے ہجرت کر کے مکہ سے مدینے کو آئے اور جن کی شان میں خدا نے آیتیں نازل کی ہیں تو اگر وہ سب کے سب مستحق ثواب ہوتے تو پیغمبر خدا ﷺ ایسی حدیث نہ فرماتے اور صحت نیت کی شرط ترتب ثواب پر نہ کرتے، پس ظاہر ہوتا ہے کہ شاید بعض اصحاب ایسے بھی تھے کہ جن کی نیت ہجرت میں بخیر نہ تھی تو یہ شبہ ان کی اس تدلیس سے کسی کو نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ سب جانتے ہیں کہ ہجرت ختم نہیں ہوگی اور پیغمبر ﷺ کی قید حیات تک جاری رہے گی اور سب لوگ مثل مہاجرین اولین کے خاص خدا و رسول ہی کے لیے ہجرت نہ کریں گے بلکہ بعض دنیا اور عورتوں کے پیچھے اپنے گھر چھوڑ جائیں گے، جیسا کہ آج کے زمانے میں ہم لوگ اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں کہ کوئی عورت کے پیچھے اپنا وطن چھوڑ دیتا ہے کوئی رنڈی کی خاطر سے مسلمان ہو جاتا ہے، یعنی مسلمانوں کے ساتھ کھانے پینے لگتا ہے تو اس حدیث کا مضمون انہیں لوگوں کے حق میں صادق ہوگا۔ علاوہ اس کے جناب قبلہ و کعبہ کو چاہیے تھا کہ شانِ نزول اس حدیث کا اس کی شرحوں میں دیکھتے اور اس بات کو دریافت فرماتے کہ یہ حدیث کس کے حق میں اور کس کے لیے حضرت نے فرمائی ہے اور مہربانی کر کے اسی میں لکھ دیتے تاکہ ہم بھی ان کی دیانت کی داد دیتے اور ان کو اہل عدل کہتے مگر وہ اسے کیوں لکھتے، اس لیے کہ اس سے تو ان کا مطلب ہی ہاتھ سے جاتا رہتا چونکہ حضرت نے اس کو نہیں لکھا، اس لیے میں شرح مشکوٰۃ شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے اسے لکھتا ہوں:

واضح ہو کہ ایک شخص مدینے میں آیا تھا ایک عورت کی طلب کے لیے جس کا نام ام قیس تھا اس کے حق میں یہ حدیث پیغمبر خدا ﷺ نے فرمائی، چنانچہ اس کو مہاجر ام قیس کہتے تھے کہ اس نے ہجرت عورت کے پیچھے کی تھی۔ اے حضرات شیعہ! اپنے قبلہ و کعبہ کے تقدس اور دیانت کی داد دو اور جو کچھ انہوں نے لن ترانیاں فرمائی ہیں اس پر غور کرو، چنانچہ خود حضرت نے ”صوارم“ میں نسبت شاہ صاحب قدس سرہ کے فرمایا ہے:

((می بایدھر گاہ شعور داشته باشد ارادہ تصنیف و تالیف

ننماید ما دامیکہ قابلیت آن بہم نرساند بالجملہ بامتحان رسیدہ کہ ناصب عداوت اہل بیت ہر گاہ مسئلہ علیہ کہ اندک وقتے داشتہ باشد در اثناء تحریر آن دست و پاگم میکند از انجملہ ست این کہ در ان کمال انتشار و براگندگی بکار بردہ لیکن نہ فہمید کہ ہر گاہ آتش قہر الہی راموردو مستوقد گردید بہمہ تر و خشک او خواهد رسید و ببادفنا خواهد داد و ہیچ حیلہ و مکر در ان وقت مفید نخواہد افتاد .))..... انتہی بلفظہ ملخصاً . ❶

”اب اگر شعور آیا ہوگا تو تصنیف و تالیف کا ارادہ کیا ہوگا اور قابلیت پیدا ہوئی ہو گی اس وقت لکھا ہوگا اور امتحان و تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ اہل بیت کے دشمنوں کے معمولی مسائل کی تحریر سے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں، ان مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ جس پر ان کی سٹی گم ہوگئی ہے اور وہ یہ نہیں سمجھے کہ جس وقت آتش قہر الہی بھڑکے گی تو ان کے خشک وتر کو جلا کر بادفنا میں اڑا دے گی اور اس وقت کوئی حیلہ و فریب کام نہ آئے گا۔“

اب کوئی مومن منصف انصاف کرے کہ یہ مضمون خود جناب قبلہ و کعبہ پر اس روایت میں کتنا صادق ہے کہ انہوں نے کلام کو کتنا منتشر کیا ہے اور دھوکہ دینے کے لیے بیچ میں کی حدیث کا ذکر فرمایا ہے، مہاجرین کو اس سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے حقیقت میں قبلہ و کعبہ نے سچ فرمایا:

((مادامیکہ انسان ہر گاہ شعور داشتہ باشد ارادہ تصنیف و

تالیف نہ نماید مادامیکہ قابلیت آن بہم نہ رساند .))

”یعنی جب تک انسان میں قابلیت پیدا نہ ہو تو وہ تصنیف و تالیف کا ارادہ نہ کرے۔“

دوسرے حضرت کا یہ فرمانا:

((باتفاق اہل اسلام در صحت ہجرت و ترتب ثواب برآں

ایمان شرط ست .)) ❶

”اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ ہجرت کی صحت اور ثواب کے لیے ایمان شرط ہے۔“
یہ بیان بھی سچ اور بالکل ٹھیک ہے نہ اس کے لیے کسی آیت کی سند لانے کی حاجت ہم
نہ کسی حدیث کے نقل کرنے کی ضرورت ہے لیکن یہ فرمانا:

((پس مادامیکہ مارا علم بہ صحت نیت ابی بکرؓ بہ ثبوت

نرسددخول اودر مدخول این آیت متیقن نمی شود .))

”یعنی جب تک ہم کو ابو بکرؓ کی نیت کی صحت کا ثبوت نہ مل جائے اس وقت تک

یہ آیت ان پر چسپاں نہیں ہوتی، اس میں ہم کو جرح ہے چند طرح سے:

۱- جناب صاحب تحفہ قدس سرہ نے اس آیت کو صرف ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کی شان میں نہیں
فرمایا ہے بلکہ سب مہاجرین کے فضائل میں اس کو نقل کیا ہے، پس حضرت نے سب کا
ذکر تو چھوڑ دیا صرف حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کا نام لکھا۔ یہ آدابِ مناظرہ کے
خلاف ہے، اگر شاہ صاحب اس آیت کو خاص صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی نسبت بیان کرتے
تو ان کو بھی جواب میں انہی کے نام کی قید کرنی مناسب تھی واذ لیس فلیس۔

۲- اگر بہ خیال اس کے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ مہاجرین میں بھی اول درجہ رکھتے ہیں
اور ان کی نسبت اس قضیہ کے ابطال سے اوروں کے قضیہ کا بطلان خود اسی دلیل سے
ہوگا حضرت قبلہ و کعبہ نے ان کا نام لکھا ہے تو خیر ہم اس سے بحث نہیں کرتے اسی کا
جواب دیتے ہیں کہ آپ کو صحت نیت کا علم کیوں کر ہووے اور کس طرح آپ اس علم کو
حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ اگر یہ خیال کر کے کہ ”آں امریست باطنی“ کہ یہ ایک باطنی
معاملہ ہے، سوائے خدا کے دوسرا نہیں جانتا تو ہم تسلیم کرتے ہیں اور آپ کو خدا کے سپرد

کرتے ہیں، یقین ہے اب خدا نے آپ کو اس کا حال قبر میں بتلا دیا ہوگا اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صحت نیت کا حال اب آپ پر کھل گیا ہوگا..... اور اگر آپ نیت کا حال ان کے اعمال سے جو ہجرت کے وقت انہوں نے کیے دریافت کرنا چاہتے ہیں تو اپنے ہی علماء کے اقوال سے دریافت کر لیجیے اور پیغمبر خدا ﷺ کا ان کے گھر جانا اور اپنے ساتھ لے کر غار کو چلنا اور راہ میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کا حضرت کو دوش پر چڑھانا اور اپنے گھر سے کھانا پہنچانا ان سب باتوں کا اپنی ہی کتابوں سے ثبوت دیکھ لیجیے کہ اس کو ہم نہایت تفصیل کے ساتھ آیت غار کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں جس کو دیکھنا ہو اس کتاب کے چند ورق الٹ کر دیکھ لے، اگر کوئی شخص اتنی زحمت گوارا نہ کرے اور چند ورق الٹ کر اس ساری بحث کو جس پر حقیقت میں یہ مضمون صادق آتا ہے:

(دریں جزو زمان چشم روزگار نظیر ایس بحث یعنی فضیلت صدیق اکبر ﷺ از آیہ غار ندیدہ باشد و گوش چرخ بریں نشنیدہ)

”آیت غار سے جو فضیلت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ظاہر ہوتی ہے اس کی نظیر زمانہ کی نگاہوں نے نہ دیکھی ہوگی اور آسمان کے کانوں نے نہ سنی ہوگی۔“

نہ دیکھے تو اس کے لیے بھی اس مقام پر ہم ایک روایت لکھتے ہیں جسے صاحب تحفہ نے ملا عبد اللہ کی کتاب ”اظہار الحق“ سے نقل کیا ہے کہ وہ خود اپنے ہم مذہبوں کے اس انکار کو پوچھ اور بیہودہ کہتا ہے، کما قال:

((جواب گفتن این سخن بہ ارتکاب آن کہ در سبق ہجرت و نصرت ایمان شرط است و آن شخص یعنی ابو بکرؓ معاذ اللہ ہیچ وقت ایمان نداشته چنیں فعل از سنوح ناخوشی با امیر المومنینؓ از انصاف دوست .))

”اس امر کے جواب دینے میں کہنا لازم ہے کہ ہجرت اور نصرت کے لیے ایمان

شرط ہے اور ابو بکر کسی وقت بھی ایمان نہیں لائے یہ کہنا گناہ ہے، امیر المومنین کی ناخوشی کا سبب ہے اور انصاف سے بھی دور ہے۔“

مجتہد صاحب قبلہ اپنی ”ذوالفقار“ میں اس روایت کی نسبت فرماتے ہیں:

((کہ پس ❶ معلوم است کہ یا ملا عبداللہ از امامیہ نبودہ و یا اینکہ جامع کلمات این مزخرفات را از پیش خود داخل نمودہ و یا مراد او از ایمان دریں مقام اسلام ست و معلوم ست کہ خلیفہ اول از اول امر از ایمان بھرہ نداشت باتفاق من علماء امامیہ .))

”معلوم ہوتا ہے کہ یا تو ملا عبداللہ امامیہ (شیعہ) نہ تھے یا یہ کہ ان خرافات کے جمع کرنے والے نے اپنی طرف سے داخل کر دیا ہے، یا ان کی مراد ایمان سے اس مقام پر اسلام ہے اور اس بات پر ہم علماء امامیہ کا اتفاق ہے کہ ابو بکرؓ شروع ہی سے ایمان نہ لائے تھے۔“

اس جواب میں تین امر مجتہد صاحب نے لکھے ہیں:

۱۔ ملا عبداللہ مشہدی کے امامیہ ہونے سے انکار کرنا، جس پر ہم ابھی زیادہ بحث نہیں کرتے، اگر مجتہد صاحب اپنے سارے علماء کے امامیہ ہونے سے منکر ہو جائیں تو ہمارا کچھ حرج نہیں ہے اگرچہ سارے علماء نے ملا عبداللہ کے امامیہ ہونے پر بہت کچھ ثبوت دیا ہے، مگر ہم مجتہد صاحب ہی کی بات کو مانتے ہیں اور اس کے امامیہ ہونے کا ثبوت دینا لغو سمجھتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ صرف اس لیے مجتہد صاحب نے اس کے امامیہ ہونے سے انکار کیا ہے کہ وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایمان کا قائل ہے تو اس کا ثبوت ان علماء امامیہ کے اقوال سے بھی ہوتا ہے جو کہ مجتہد صاحب کے پیشوا ہیں اور جن کے اقوال کو (کالوحي المنزل من السماء) (آسمانی وحی کی طرح) جانتے ہیں، چنانچہ قاضی

نور اللہ شوستری ”مجالس المؤمنین“ میں فرماتے ہیں:

((اما آنکہ تکفیر ابوبکر و عمر بہ شیعہ نسبت نمودہ است سخنی ست بے اصل کہ در کتب اصول ایشان ازاں اثرے نیست و مذهب ایشان ہمین ست کہ مخالفان علی فاسق اند و محاربان او را کافر اند .))

”شیعوں کی طرف یہ نسبت کرنا کہ یہ ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کو کافر کہتے ہیں یہ وہ قول ہے جس کا کوئی ثبوت شیعوں کی کتابوں میں نہیں ہے، البتہ شیعوں کا مذہب یہ ہے کہ علی رضی اللہ عنہ کے مخالف فاسق اور ان سے جنگ کرنے والے کافر ہیں۔“

اس کا جواب مجتہد صاحب کو جب کچھ نہ ملا اور قاضی نور اللہ شوستری کے امامیہ ہونے سے انکار کرنا خلاف ایمان جانا تو دوسری طرح سے اس قول کو باطل کرنا چاہا، چنانچہ اس کے جواب میں ذوالفقار میں فرماتے ہیں:

((پوشیدہ ❶ نماند کہ این کلام بر تقدیر صحت و صدور آں از فاضل قادح مقصود ما و مفید مطلوب او نمی شود زیرا کہ سابق گزشتہ کہ فاسق در مقابلہ مومن اطلاق شدہ .))

”پوشیدہ نہ رہے کہ یہ کلام اگر صحیح مانا جائے اور فاضل (شوستری) نے کہا ہو تو ہمارے مقصد کے خلاف اور ان کے مفید مطلب نہیں ہے کیونکہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ مومن کا لفظ فاسق کے مقابلہ میں آیا ہے۔“

اب کوئی اس دھوکہ دینے کو خیال کرے کہ قاضی نور اللہ جیسا مؤلف اور ”مجالس المؤمنین“ جیسی مشہور کتاب پر بھی جناب علامی فہامی فرماتے ہیں کہ (بر تقدیر صحت و صدور آں از فاضل) گویا ان لفظوں میں اس کا بھی انکار کرتے ہیں مگر صاف انکار کرنے سے کچھ تقدس کا لحاظ فرماتے ہیں، اگر حضرت کو دیانت کا دعویٰ تھا تو چاہیے تھا کہ ایسا دھوکہ نہ دیتے اور

”مجالس المؤمنین“ کی اصل عبارت کو جس میں کچھ تحریف نہ ہوئی ہوتی نقل کر دیتے، چنانچہ بہ جبر اس کے شاہ صاحب لکھتے ہیں: ((کہ نسبت تکفیر بہ جناب شیخین کہ اہل سنت و جماعت بہ شیعہ نمودہ اند سخنی ست بے اصل کہ در کتب اصول ایشان ازاں اثری نیست)) اور بلفظ عبارت ”مجالس المؤمنین“ کی وہ ہے جو اوپر ہم نے نقل کی، اگر کسی کو شک ہو وہ ”مجالس المؤمنین“ کو دیکھ لے اور مجتہد صاحب کے ((بر تقدیر صحت و صدور آن از فاضل)) لکھنے پر داد دے۔

اور سب سے زیادہ حیرت مجھے یہ ہے کہ ایسے مجتہد فاضل نے ”بر تقدیر صحت“ اس عبارت کی نسبت کیوں فرمایا، اس لیے کہ ”مجالس المؤمنین“ میں نہایت شد و مد سے ملا نور اللہ شوستری نے تکفیر حضراتِ شیخین سے انکار کیا ہے اور صرف انہیں چند لفظوں سے اپنے انکار کو ثابت نہیں کیا بلکہ بہت لمبی چوڑی تقریر کی ہے، چنانچہ مجلس سوم میں فرماتے ہیں:

((کہ از ایراد این مقدمہ دفع تو ہمی ست کہ در اوہام عامہ استقرار یافتہ کہ شیعہ امامیہ تکفیر جمیع یا اکثر صحابہ می نمایند و ایس معنی رامستبعد یافتہ عوام مذہب خود را تبقریر آن از مذہب حق متنفر نمودہ از راہ بردہ اندو چگونہ چنیس باشدو حالانکہ افضل المحققین خواجہ نصیر الدین طوسی در کتاب ”تجرید“ فرمودہ کہ محاربوا علی کفرہ و مخالفوہ فسقہ و ظاہر است کہ اگر صحابہ بآن حضرت محاربہ نہ کردہ اند بلکہ بقوت کثرت خیل و حشم بے نیت استعمال سیف و علم مقام مخالفت در آمدہ باستقلال غصب منصب عترت رسول متعال نمودہ ند .)) انتہی بلفظہ ”اس مقدمہ کا مطلب ان غلط اوہام کو دفع کرنا ہے جو عام لوگوں کے ذہن نشین ہیں کہ شیعہ لوگ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم یا اکثر صحابہ کو کافر کہتے ہیں اور اس وہم کی وجہ

سے عام لوگ مذہبِ حق سے نفرت کرنے لگے ہیں اور راہ سے دور ہو گئے ہیں، حالانکہ صحابہؓ کافر نہیں ہو سکتے۔ خواجہ نصیر الدین طوسی نے اپنی کتاب ”تجرید“ میں لکھا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ سے لڑنے والے کافر اور علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت کرنے والے فاسق ہیں اور یہ امر واضح ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت سے جنگ نہیں کی بلکہ قوتِ شان و شوکت اور سوار یوں کے ذریعہ آپؐ کی امداد کی ہاں بغیر لڑائی کے عترتِ رسولؐ کے منصب کو غصب کیا ہے۔“

غرض کہ اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قاضی نور اللہ شوستری نے بہ دلیل قطعی ان صحابہ رضی اللہ عنہم کی تکفیر سے جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑائی نہیں کی بلکہ صرف مخالفت کی ہے انکار کیا ہے، اس لیے کہ وہ خود لکھتے ہیں کہ اس مقدمہ کے لکھنے سے ہماری غرض یہ ہے کہ شیعہ امامیہ سب صحابہ رضی اللہ عنہم کو کافر کہتے ہیں اور اسی سے عوام کو فریب دے کر وہ شیعوں کے مذہب کی برائی ان کے دل میں پیدا کر کے امامیہ مذہب سے ان کو نفرت دلاتے ہیں، حالانکہ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ ہم امامیہ مذہب کے لوگ سب صحابہ کو کافر کہیں حالانکہ افضلِ محققین خواجہ نصیر الدین نے ”تجرید“ میں صاف لکھا ہے کہ علیؑ کے مخالف فاسق اور لڑنے والے کافر ہیں۔ اور پھر قاضی نور اللہ شوستری اسی پر قناعت نہیں کرتے بلکہ آپ اس فصل کو لکھ کر آپ اپنے دعوے عدم تکفیر اصحابؓ کے ثبوت میں یہ لکھتے ہیں کہ یہ ظاہر ہے کہ اکثر اصحاب نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ لڑائی نہیں کی بلکہ بغیر لڑائی کے خلافت کو غصب کر لیا۔ پس باوجود ایسی مدلل تقریر کے جو قاضی نور اللہ شوستری نے کی ہے جناب مجتہد صاحب اول تو ”بر تقدیر صحت“ فرماتے ہیں تا کہ عوام کو شبہ ہو کہ یہ روایت ہی ”مجالس المؤمنین“ میں نہ ہوگی اور ”بر تقدیر صحت“ فرما کر اس کے یہ معنی لکھتے ہیں کہ ((قادح ❶ مقصود و مفید مطلوب او نمی شود زیرا کہ سابق گزشتہ کہ فاسق در مقابلہ مومن اطلاق شدہ)) یعنی اس سے کچھ ہمارے مطلوب میں قدح اور شاہ صاحب کے دعوے کو

فائدہ نہیں ہوتا، اس لیے کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ فاسق بمقابلہ مومن کے آیا ہے جس کے معنی کافر کے ہوتے ہیں۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ!

بریں عقل و دانش باید گریست

کیا فہم و ذکا خدا نے حضرت کو دیا تھا کہ اپنے دعویٰ تکفیر صحابہ رضی اللہ عنہم کو قاضی نور اللہ شوستری کے دعویٰ عدم تکفیر سے ملاتے ہیں اور پھر کیا شوخی اور بے باکی ہے کہ فرماتے ہیں: ہمارا ان کا مطلب ایک ہے، درحقیقت وجود و عدم اور اسلام و کفر کو ایک سمجھنا حضرت کی فہم و فراست سے کچھ بعید نہیں ہے، آپ کی سمجھ پر خیال کر کے ہم بھی کہتے ہیں کہ بے شک جو آپ فرماتے ہیں وہی درست و بجا ہے، شاہ صاحب جاہل و نادان تھے، جنہوں نے قاضی نور اللہ شوستری کی عبارت کو عدم تکفیر صحابہ پر محمول کیا۔

اے حضرات شیعہ! یہ حال ہے تمہارے مجتہدین و علماء کے علم و فضل کا، غرض کہ ثابت ہوا کہ قاضی نور اللہ شوستری اور محقق نصیر الدین طوسی عدم تکفیر صحابہ کے معتقد ہیں اور سوائے محاربین کے کسی کو کافر نہ جانتے تھے، اب سنیوں کے مجتہد صاحب کیا فرماتے ہیں۔ جناب قبلہ و کعبہ اپنی کتاب ”ذوالفقار“ میں فرماتے ہیں:

((استنتاج نتیجہ مسطورہ موقوفست بریں کہ بنا بر اصول

شیعہ باثبات رسانی کہ اصحاب تو از اول امر مومن اند و این

از جملہ ممتنعات و محالات است چہ علماء ایشاں بدلائل

بسیار و اخبار بے شمار کفر و پیشوایان شمار ادر کتب خود

باثبات رسانیدہ و ہر گاہ حقیقت حال چنیں باشد پس کلام

تو از محل اعتبار ساقط باشد.)) ❶

”مذکورہ نتیجہ نکالنا اس امر پر موقوف ہے کہ جب کتب اصول شیعہ کے لحاظ سے

صحابہ اول سے مومن ہوں اور یہ جملہ ممتنعات و محالات میں سے ہے، اس لیے

کہ ہمارے علماء نے بے شمار دلیلوں اور ثبوتوں سے تمہارے صحابہ اور پیشوایان مذہب کو فاسق و فاجر کہا ہے اور جب حقیقت یہ ہے تو تمہارا کلام بے اعتبار ہے۔“
اب اے حضرات شیعہ! تم کو اپنے دین و ایمان کی قسم ہے اور تم کو اپنے غفران مآب کے تقدس و اجتہاد کی قسم ہے کہ قاضی نور اللہ شوستری کی اس عبارت کو:

((اما تکفیر ابوبکر و عمر بشیعہ نسبت نمودہ است سخنے

ست بے اصل کہ در کتب اصول ایشاں اثرے نیست .))

”ابوبکرؓ و عمرؓ کو شیعوں کی زبانی کافر کہنا یہ ایسی بے اصل بات ہے جس کا شیعوں

کی اصولی کتابوں میں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔“

جناب قبلہ و کعبہ کی اس عبارت سے:

((علماء ایشاں بدلائل بسیار و اخبار بے شمار کفر و نفاق

پیشوایان شمارا در کتب خود باثبات رسانیدہ اند .))

”ہمارے علماء نے بدلائل کثیر و ثبوت بسیار تمہارے پیشواؤں کے منافق و کافر

ہونے کا اپنی کتابوں سے ثبوت دیا ہے۔“

ملاؤ! ذرا کلمہ حق زبان پر لاؤ اور اتنا فرما دو کہ ان میں کون صاحب سچے ہیں اور کون صاحب جھوٹے اور ہم بے چارے جاہل سنی قاضی نور اللہ شوستری کے قول کو مانیں جو کہ نہایت زور و شور سے فرماتے ہیں کہ یہ بات ایسی بے اصل ہے کہ ہماری اصول کی کتابوں میں اس کا اثر و نشان بھی نہیں ہے، یا کہ جناب قبلہ و کعبہ کی بات کو سنیں جو کہ نہایت مضبوطی سے فرماتے ہیں کہ ہمارے علماء نے ان کے کفر کو بدلائل بسیار اور اخبار بے شمار سے ثابت کیا ہے۔

اے حضرات! یہ حال ہے تمہارے علماء کا کہ خود ہی اپنی ایک بات پر قائم نہیں رہتے اور ایک دوسرے کے کلام کو نقض کرتا ہے اور سبب اس کا یہ ہے کہ جہاں جیسا موقع ہوتا ہے وہاں ویسی ہی بات کہنے لگتے ہیں اور ”ہر سخنے موقع اور ہر نکتہ مقامی دارد“ پر عمل کرتے ہیں، جہاں دیکھا کہ صحابہ کی تکفیر کرنے کا موقع ہے وہاں ایسی دھوم دھام سے ان پر کفر کا اطلاق کریں

گے کہ امام اوّل سے امام آخر تک کی زبان سے ان کا کفر ثابت کریں گے اور جہاں دیکھا کہ اس سے دین کے اصول برہم ہوئے جاتے ہیں اور اسلام ہی ہاتھ سے جاتا ہے وہاں اس زور و شور سے انکار کریں گے کہ کانوں پر ہاتھ دھریں گے، اس کو سنیوں کی تہمت و افتراء کہیں گے اور اپنے تمام علماء کو تکفیر کی نسبت سے بری کریں گے۔ عجب حال ہے ان حضرات کا کہ ان کے اقوال و روایات اور جوابات کو دیکھ کر عقل حیران ہے اور مجتہد صاحب صرف تکفیر شیخین رضی اللہ عنہم پر قناعت نہیں فرماتے اور اسی پر کفر کا دامن نہیں چھوڑتے بلکہ یہاں تک کفر کے پیچھے پڑے ہیں کہ ایک مقام پر صاف فرماتے ہیں:

((قال عليه السلام من شك في كفر اعدائنا فهو كافر .))

”یعنی جو شخص ہمارے دشمنوں کے کفر میں شک کرے وہ کافر ہے۔“

اے حضرات شیعہ! اس عبارت پر غور کرو اور اپنے مجتہد صاحب کے اس ارشاد کو سنو اور بے چارے محقق نصیر الدین طوسی اور قاضی نور اللہ شوستری وغیرہ اپنے مذہب کے علماء اعلام پر شوق و ذوق سے تبرا بھیجو اور ان کو کافر کہو، اس لیے کہ ان کو مخالفین علی المرتضیٰ کے کفر میں شک ہے۔ ”وہر کہ در کفر شاں شک کند کافر است۔“

افسوس ہے کہ جب مجتہد صاحب نے کتاب تالیف کی تھی اور اپنے اجتہاد کا نقارہ بجایا تھا اور امام علیہ السلام کی یہ حدیث لکھی تھی تو دونوں بے چارے محقق اور قاضی مرمت چکے تھے، ورنہ وہ قبلہ و کعبہ کے اس ارشاد کو سن کر ضرور انہیں کو کافر کہتے اور ”ہر کہ ایشاں را کافر گوید کافرست“ (یعنی جو ان صحابہ رضی اللہ عنہم کو کافر کہے وہ خود کافر ہے) کہہ کر ہم سنیوں کا ساتھ دیتے..... اس مقام پر میں مجتہد صاحب کی دیانت کو اور بھی ثابت کرتا ہوں اور ان کے تبحر اور تقدس کو ظاہر کرتا ہوں کہ حضرت نے قاضی نور اللہ شوستری کی تکذیب اسی روایت میں نہیں کی ہے بلکہ اور مقامات پر بھی در پردہ توبہ توبہ در پردہ کیسا صاف اور صریح احمق بنایا ہے یا اپنی دانش مندی کو ظاہر فرمایا ہے چنانچہ صاحب ”تحفہ“ قدس اللہ سرہ اسی باب دوازہم میں ایک مقام پر فرماتے ہیں:

((قاضی نور اللہ شوستری در مجالس المومنین خود آورده کہ مفہوم تشیع آنست کہ خلیفہ بلا فصل بعد از حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم مرتضیٰ علی ست و لعن و سب درو معتبر نیست میگذرد کہ نام حضرات خلفای ثلاثہ بر زبان شیعه جاری شود و اگر جاہلان شیعه حکم بہ وجوب لعن کردند سخن ایشان معتبر نیست و آنچه خبث و فحش دربارہ ام المومنین عائشہ نسبت بہ شیعه میکنند حاشا تم حاشاکہ واقع باشد چہ نسبت فحش بکافہ آدمیان حرام ست چہ جائے حرم حضرت پیغمبر خدا ﷺ و بعد از ان متصل ہمیں کلام گفته است کہ این ضعیف حدیثی در کتاب حدیث از کتب شیعه دیدہ باین مضمون کہ عائشہ در خدمت امیر از حرب توبہ کردہ ، ہر چند قصہ حرب متواتر است و حکایت توبہ خبر و احدو اما بنا بریں طعن کردن در حق و مے جائز نیست .))

”قاضی نور اللہ شوستری نے ”مجالس المومنین“ میں لکھا ہے کہ شیعیت کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد خلیفہ بلا فصل حضرت علیؑ ہیں اور (خلفائے ثلاثہ پر) اس سلسلہ میں لعنت ملامت کرنا صحیح نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ اسی سلسلہ میں خلفاء ثلاثہ کا نام شیعوں کی زبان پر آئے۔ اور اگر لعن کو جاہل شیعه واجب جانتے ہیں تو ان کا قول غیر معتبر ہے اور امام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں فحش کلامی کرنا شیعوں کی جانب منسوب کیا جاتا ہے، توبہ توبہ! ان کی جانب کوئی برائی نہیں کہی جاسکتی، جب دوسرے لوگوں کو گالی دینا حرام ہے تو حرم

محترم رسول اللہ! کو گالیاں کیسے دی جاسکتی ہیں؟ اس کے فوراً ہی بعد ایک ضعیف حدیث شیعوں کی کتب حدیث کی لکھی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جنگ کے سلسلہ میں علی کی خدمت میں توبہ کی، اگرچہ جنگ کا واقعہ متواتر ہے لیکن توبہ کرنے کی حکایت خبر واحد ہے، لیکن اس بنا پر عائشہ رضی اللہ عنہا پر لعن طعن کرنا جائز نہیں ہے۔“

اب ذرا گوش ہوش مجتہد صاحب کے کلام سننے پر متوجہ کیجیے کہ حضرت اس کے جواب میں ”ذوالفقار“ میں کیا فرماتے ہیں:

((اما آنچه از سید نور اللہ شوستری نوشته پس البتہ در نقل تدلیس و تلبیس نموده بالجملہ سب و شتم البتہ نزدیک امامیہ در حق ہیچکس از کفار و مسلم جائز نیست اما تبراً و بیزاری از اعدای دین واجب و لازم گو بحسب اتفاق اگر از زبان نگوید قباحت نباشد لیکن اگر گناہ دانستہ نگوید البتہ گناہ گار بلکہ بہ نسبت ناکثین و مارقین و قاسطین اگر گناہ دانستہ نگوید از ایمان بیروں می شود چہ اور دریں صورت منکر ضروری مذهب امامیہ شدہ .))

”قاضی نور اللہ شوستری کے حوالے سے کچھ لکھا گیا ہے اس کے نقل کرنے میں مکروفریب اور لاگ لپیٹ سے کام لیا گیا ہے، فرقہ شیعہ کے نزدیک کسی کافر و مسلم کو سب و شتم اور گالیاں دینا جائز نہیں ہے، البتہ دشمنانِ دین سے بیزاری اور تبراً کرنا لازم اور واجب ہے، اگر زبان سے تبراً نہ کہا جائے تو کوئی قباحت نہیں لیکن اگر مجرم کو گنہگار جان کر تبراً نہ کہے تو ایسا شخص خود گنہگار، ساقط المعاہدہ، ظالم اور دین سے خارج ہے اور اگر گناہ کو دانستہ نہ کہے تو ایمان سے ہاتھ دھوتا ہے

کیونکہ اس حالت میں وہ ضروریاتِ مذہبِ امامیہ کا منکر ہے۔“
 ذرا اہل انصاف غور فرمائیں کہ یہ تدلیس و تلبیس صاحب ”تحفہ“ کے حق میں نسبت کرنا
 بجا ہے یا جناب مجتہد صاحب کی شان میں زیبا ہے کہ صاحب ”تحفہ“ تو صاف صاف قاضی
 نور اللہ شوستری کے کلام کو بیان کرتے جاتے ہیں اور مجتہد صاحب ”مجالس المؤمنین“ اٹھا کر
 ملاحظہ نہیں فرماتے ہیں اور صرف اپنی تدلیس و تلبیس کے ظاہر کرنے پر بلا مقابلہ کتاب کے
 ان پر تدلیس کی تہمت کرتے ہیں۔

اے حضراتِ امامیہ! اپنے مجتہد صاحب کی تدلیس کے کیا اب بھی قائل نہ ہو گے اور ان
 کے اجتہاد میں اس طرح کی برائیوں سے بھی کچھ شک نہ کرو گے، خیال کرو کہ ”مجالس
 المؤمنین“ ملا عبداللہ کی ”اظہار الحق“ نہیں ہے کہ جو نہ ملے یا اس کے انکار کرنے سے پیچھا
 چھوٹ جائے یا وہ کتاب ایسی نادر الوجود نہیں ہے کہ مجتہد صاحب کے پاس نہ ہوتی اور قبلہ و
 کعبہ کا کتب خانہ اس سے خالی ہوتا، تو اگر شاہ صاحب نے اپنی طرف سے ان کی نسبت کچھ
 تہمت کی تھی اور جو قاضی صاحب نے نہ لکھا تھا اور نہ کہا تھا وہ ان کی طرف منسوب کیا تھا تو
 کیا مشکل تھا کہ ”مجالس المؤمنین“ کو اٹھا لیتے اور اس کی اصل عبارت صاف صاف نقل کر
 دیتے۔ یہ عجب قسم کی تدلیس ہے کہ کتاب تو نہیں دیکھتے نادیدہ و دانستہ اس سے انماض کرتے
 ہیں اور صاحب ”تحفہ“ کو برا بھلا کہتے ہیں۔ بے شک یہ غلطی تو ان کی ضرور ہے کہ انہوں نے
 ایسی روایت جو عقیدہ امامیہ کے مخالف ہے، ایسے عالم کی کتاب سے نکال دی جو شیعوں کا رکن
 اعظم ہے اور جس نے اپنے مذہب پر جان بھی قربان کر دی ہے لیکن اس اجمال پر کفایت
 کرنے کا سبب یہ ہے کہ اگر صاف لکھیں تو کیا لکھیں، کیوں کہ اصل عبارت کو نقل کریں، اگر
 کچھ فرق ہو یا اپنی طرف سے شاہ صاحب نے کچھ ملا دیا ہو تو اسے لکھیں اور اگر اس کا صاف
 صاف اقرار کریں تو پھر جواب میں کیا خاک کر بلا لکھیں، اس لیے شیطان الطاق کے وتیرے
 پر چلے اور ”ہم اقرار وہم انکار“ کر کے پہلو بچا گئے مگر افسوس ہے کہ اسی عبارت کے بعد دو
 لفظ ایسے حضرت کے قلم سے نکل گئے ہیں کہ اس سے اس مضمون کی تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ

فرماتے ہیں:

((مراد سید ❶ نور اللہ ہر جا کہ گفتہ باشد اگر گفتہ باشد ہمین ست و عبارت ایشاں ہرگز آنچہ فقیر گفتہ مخالفت ندارد.))

” (قاضی) نور اللہ کی مراد جہاں کہیں انہوں نے یہ لکھا ہے اگر لکھا ہے تو وہی ہے جو میری مراد ہے ان کی عبارت فقیر کے قول کے ہرگز مخالف نہیں۔“

اس عبارت کو دیکھ کر بے ساختہ دل چاہتا ہے کہ جناب غفران مآب کی شان میں کچھ لکھوں مگر سوائے ”اس گل دیگر شکفت“ کے کچھ نہیں لکھتا اور یہی کہہ کے ان کے مقلدین سے پوچھتا ہوں کہ بھائیو، شاید میری سمجھ کی غلطی ہے جو میں دونوں مضمونوں کو مخالف پاتا ہوں، کوئی مجھے یہ سمجھا دے کہ قاضی نور اللہ شوستری کی اس عبارت کا:

((مفہوم تشیع آنست کہ خلیفہ بلا فصل بعد از حضرت رسول خدا ﷺ مرتضیٰ علیٰ رضی است و سب و لعن در و معتبر نیست.))

”شیعیت کا مطلب یہ ہے کہ رسول خدا ﷺ کے بعد بلا فصل خلیفہ علی المرتضیٰ ہیں اس سلسلہ میں (کسی پر) لعن طعن معتبر نہیں ہے۔“

مضمون کیوں کر اس عبارت سے مجتہد صاحب کی مطابق ہے:

((اما تبراً ❷ و بیزاری از اعدائے دین واجب.))

”دین کے دشمنوں سے براءت اور بیزاری واجب ہے۔“

اور نیز قاضی نور اللہ شوستری کے اس فقرہ کو:

((اگر جاہلان شیعہ حکم بوجوب لعن کردند سخن ایشاں

❶ عبارت ”ذوالفقار“ مطبوعہ مطبع مجمع البحرین لدھیانہ ۱۲۸۱ھ صفحہ ۷۷-۱۲

❷ عبارت ”ذوالفقار“ مطبوعہ مطبع مجمع البحرین لدھیانہ ۱۲۸۱ھ صفحہ ۷۷-

معتبر نیست .))

”اگر جاہل شیعہ لعن طعن کو ضروری سمجھیں تو ان کی بات قابل اعتبار نہیں۔“

کس طرح قبلہ و کعبہ کے اس فقرے کے مطابق ہے:

((گو ❶ بحسب اتفاق اگر زبان نگویند قباحت نباشد لیکن

اگر گناہ دانستہ نگوید البتہ گناہ گار بلکہ بہ نسبت ناکثین و

قاسطین و مارقین اگر گناہ دانستہ نگوید از ایمان بیرون می

شود .))

”اتفاقاً اگر زبان سے تبرانہ کریں تو کوئی قباحت نہیں، لیکن مجرم پر اگر گناہ کو جان

کر تبرانہ کرے تو ایسا شخص خود گنہگار بلکہ ساقط المعاہدہ، ظالم اور دین سے خارج

ہے اگر گناہ کو دانستہ نہ کہے تو ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔“

میں قاضی صاحب کی عبارت کا یہ مطلب سمجھتا ہوں کہ ان کے نزدیک سب ولعن تشیع

کے لیے معتبر اور ضروری نہیں ہے اور لعن کو واجب سمجھنا جاہلوں کی بات ہے اور مجتہد صاحب

کے قول سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک سب ولعن تشیع کے ضروری ہے بلکہ جو تبرا

نہ کرے وہ مومن نہیں ہے اور پھر باوجود ایسی مخالفت مضمون کے مجتہد صاحب فرماتے ہیں:

((عبارت ❷ ایشاں ہرگز بہ آنچه فقیر گفته مخالفت ندارد .))

”ان کی عبارت ہرگز فقیر کے قول کے مخالف نہیں ہے۔“

اب اس پر کیا کہا جائے حقیقت میں جو کچھ ناز و افتخار ذوالفقار کی تالیف پر حضرت کو ہوا

ہے وہ بجا ہے، اگر حضرت خود اس کی تعریف اپنی زبان سے نہ کرتے اور بقول صائب: شعر

ثنای خود بخود کر دی نمی زیبد ترا صائب

چوں زں پستان خود مالذ حظوظ نفس کے یابد

❶ عبارت ”ذوالفقار“ مطبوعہ مطبع مجمع البحرین لدھیانہ ۱۲۸۱ھ صفحہ ۷۷۔

❷ ایضاً۔

خودستانی سے احتیاط کرنی تب تھی جبکہ خود کتاب حضرت کی ثنا و صفت کرتی اور اب تو خدا کے فضل سے حضرت کی ستائش کی تصدیق ہوتی ہے اور جو کچھ خود بدولت نے اپنے شبہے اور اپنی کتاب کی نسبت فرمایا ہے اس کا ثبوت ہوتا جاتا ہے۔ دیکھو حضرات امامیہ وہ کتاب ”ذوالفقار“ ہے جس میں حکیمانہ تقریریں بھری ہوئی ہیں اور جس کی نسبت حضرت نے ”صوارم“ میں فرمایا ہے کہ جب باب دہم ”تحفہ“ کا ہم نے ملاحظہ فرمایا تو بہ خیال اس کے کہ ایک جاہل عامی آدمی کی طرف مقابل بننا موجب عار و ننگ ہے دل جواب لکھنے پر متوجہ نہ ہوا مگر یہ خیال کر کے کہ بڑے بڑے پیغمبروں اور اماموں کو زمانہ نے مجبور کر دیا ہے اور ان کو کافروں اور جاہلوں کا جواب دینا پڑا ہے میں نے اس کا جواب لکھا:

((❶ چنانچہ بحمد اللہ تعالیٰ درہمان او ان سعادت تو امان در عرصہ دہ بست روز بصر فقلیلے از اوقات بہ نقض آن پردا ختم و بیہودہ گوئی اور ابہ بیان واضح برہر کس و ناکس ظاہر و لائح ساختم در رسالہ مذکورہ باسم ”ذوالفقار“ اختصاص دادہ مع جلد کتاب ”عماد الاسلام“ پیش آن ناصب مولف کتاب ”تحفہ اثنا عشریہ“ مرسل داشتم تا شاید از خواب غفلت بیدار شود و از سرمستی جہل مرکب ہوشیار گردد ولله الحجة البالغة کہ مدت پنج شش سال منقضی گشتہ کہ آن رسالہ در اطراف بلاد شائع و منتشر گردیدہ و از نظر بسیارے از فضلاء سُنّیاں گزشتہ بمتانت و استحکام کلام کہ در اثنا نقضِ شبہات و کشفِ عیوب مہوہات او بلا ارتکاب تکلفات و تعسفات مذکور ساختہ ام ہیچکس چہ آن ناصب عداوتِ اہل بیت مصنف کتاب

مذبور چہ غیر او از فضلائے مذهب مسطور مجال این نیافتہ اند کہ بہ نقض آن پردازند و در جوابِ آن چیزے برنگارند و بمقتضای اینکہ ”الحق یعلو او لایعلیٰ“ انتھی بلفظہ ملخصاً

”چنانچہ بحمد اللہ اسی زمانے میں دس بیس دن کے اندر تھوڑے سے اوقات میں اس کتاب کی تنقید کرتے ہوئے اس کی بیہودگیاں ظاہر کیں تاکہ ہر ایک پر واضح ہو جائے کہ اس کی کیا کی بیہودگیاں ہیں اور ایک رسالہ کی صورت دے کر اس کا نام ”ذوالفقار“ رکھا اور وہ کتاب ”عمادالاسلام“ کے ساتھ بنام مؤلف کتاب ”تحفہ اثنا عشریہ“ رسال کیا تھا کہ خواب غفلت سے بیدار ہو اور جہل مرکب کی سرمستیوں سے ہوشیار ہو جائے، مکمل دلیل اللہ ہی کے لیے ہے پانچ چھ سال کی مدت گزر گئی اور وہ رسالہ شائع ہو گیا، بہت سے سنی فضلاء کی نظروں سے بھی گزرا، شبہات کو ختم کرنے اور اس کے عیبوں کو ظاہر کرنے میں سنجیدگی اور پختگی کے ساتھ بغیر تعصب اور تکلف کے لکھا ہے، اس ناصبی دشمن اہل بیت مصنف کتاب (تحفہ اثنا عشریہ) اور سنی مذہب کے فضلاء کی مجال نہ ہوئی کہ اس کی تردید کرتے اور اس کے جواب میں کچھ لکھتے کیونکہ حق تو بلند رہتا ہے اس پر باطل بلند نہیں ہو سکتا۔“

حقیقت میں جو کچھ حضرت نے اس ”ذوالفقار“ کی نسبت فرمایا وہ سب بجا اور درست ہے، عبارت بھی اس کتاب کی متانت اور فصاحت سے بھری ہوئی ہے۔ دلائل بھی اس کے سب حکیمانہ، دیانت اور امانت، اس کی سطر سطر سے عیاں اور تکلف اور تعسف کا تو ذکر ہی نہیں ہے جو کچھ حضرت نے لکھا ہے صاف صاف، سچ سچ بیان کر دیا ہے اور اپنی فضیلت اور تبحر کو بخوبی ظاہر کر دیا ہے مگر قصور اتنا ہو گیا کہ اس کے لکھنے میں جلدی بہت کی تھی اور صرف بیس روز میں اس کو ختم کر دیا تھا، حالانکہ ایسی کتاب کو سوچ سمجھ کر لکھنا چاہیے تھا اور فضیحت و رسوائی

کا خیال بھی کرنا لازم تھا اگر ”صوارم“ کی طرح پانچ چھ برس میں اس کو بھی لکھتے اور کسی ایرانی سے اس کی عبارت بھی درست کرا لیتے تو شاید عبارت بھی درست ہو جاتی، تقریر میں بیہودگی بھی کم ہوتی تب، البتہ جس طرح ”صوارم“ کا جواب ایک ملتانی نے لکھ دیا اور حضرت کی متانت کو سفاہت سے مرادف ثابت کر کے اس جواب کا نام ”تنبیہ السفیہ“ رکھ دیا تو مجتہد صاحب کے حق میں کوئی طالب علم اٹھ کر جواب لکھ دیتا اور بندگان والا کی خدمت میں تحفہ بھیج دیتا۔ حضرت نے اس کتاب کی تالیف میں جلد بازی سے کام لیا اور شیخ سعدی کے اس مصرعہ پر جسے لڑکے بھی جانتے ہیں خیال نہ کیا:

تجیلِ کارِ شیاطین بود

میں جب ”ذوالفقار“ اور ”صوارم“ کا مطالعہ کرتا اور حضرت کی گالیوں، فحش اور خود ستائی کو دیکھتا تو اپنے دل میں کہتا کہ جناب والا نے جس قدر حصہ اپنی اوقات عزیز کا گالیوں اور فحش میں صرف کیا ہے بہتر ہوتا کہ جوابات کو سوچنے اور تامل اور غور کر کے لکھنے میں صرف کرتے مگر آخر اس کا جواب خود ہی حضرت کے قول سے جو انہوں نے ”صوارم“ میں لکھا ہے میں نے پالیا کہ میری سخت گوئی اور طعن و تشنیع پر کوئی اعتراض نہ کرے، اس لیے کہ شاہ صاحب اس کے ہادی ہیں اور پھر ہم تو شیعہ ہیں:

((اگر ❶ ازایں جانب نظر باینکہ شیوہ شیعیان تبراً نمودن

است از اعدای دین زیاد از آنچه نوشتہ اند بہ عمل آید

مستبعد نباشد .))

”اگر اس جانب نظر کریں کہ تبراً کرنا شیعوں کا شیوہ ہے تو جو کچھ دشمنانِ دین نے

لکھا ہے اس سے زیادہ لکھنا بعید نہیں ہے۔“

اب میں پھر شروع کرتا ہوں جناب قبلہ و کعبہ کے جواب کو جو قاضی نور اللہ شوستری کی

تقریر کا دیا ہے:

((اما ❶ آنچه از سید نور اللہ نقل نموده کہ این ضعیف حدیثے در کتاب حدیث از کتب شیعہ دیدہ باین مضمون کہ عائشہؓ در خدمت امیر علیہ السلام از حرب توبہ کردہ الخ . اقول ہر چند ازین قبیل سخنان ہرگز بہ مسلک جناب سید نور اللہ شوستری نمی زبید کہ آنچه ایشان در تصرف حدیث امامیہ بدل جہد نمودہ اند و جہاد سنان و قلم و سیف زبان کہ افضل از جہاد سیف و سنان باشد کردہ اند اظہر من الشمس ست و اگر بہ حسب اتفاق روایتے باین مضمون بنظر ایشان رسیدہ باشد ہر گاہ در مذهب اہل اسلام روایات متضمن جسم بودن خدا و مکانی بودن او تعالیٰ شانہ مروی شدہ باشد لکن چون تخالف ضروری دین ست محل اعتبار نباشد پس چنین روایات ہم بشیعیان ضرر نخواہد رسانیدہ زیرا کہ اگر روایت توبہ او صحیح می بود جناب ائمہ ازوتبرانی نمی نمودند و معلوم ست کہ جناب صادق علیہ السلام بعد ہر نماز عبادت دانستہ از و از غیر او کہ اعدائے دین می بودند تبرامی فرمودند .))

”سید نور اللہ شوستری کے حوالے سے جو نقل کیا گیا کہ یہ ضعیف حدیث شیعوں کی کتب حدیث میں اس طرح ہے کہ عائشہؓ نے خدمت امیرؓ میں آ کر جنگ سے توبہ کی الخ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کی باتیں جناب سید نور اللہ شوستری کو زیبا نہیں، کیونکہ انہوں نے احادیث شیعہ میں دل و جان سے کوشش کی ہے قلم کی برچھی اور زبان کی تلوار کا جہاد شمشیر و سنان کے جہاد سے افضل ہے جو

انہوں نے انجام دیا اور یہ بالکل ظاہر ہے اور حسب اتفاق روایات یہ مضمون ان کی نظر سے گزرا ہوگا کہ مذہب اسلام میں اللہ کا جسم ہونا اور اس کا کسی مکان و مقام میں ہونا لکھا ہے، لیکن چونکہ اس عقیدہ سے انحراف کرنا دین کے لیے ضروری ہے، پس ایسی روایات شیعوں کے نزدیک ناقابل اعتبار ہیں اور وہ شیعوں کے لیے نقصان دہ نہیں ہیں، اس لیے کہ اگر ان کی توبہ کی روایت صحیح ہوتی تو ائمہ ان سے بیزاری نہ کرتے اور یہ بات معلوم ہے کہ جناب صادق علیہ السلام ہر نماز کے بعد بطور عبادت ان پر اور دوسرے دشمنان دین پر تبرا کرتے تھے۔“

اس قول میں بھی حضرت نے دیانت سے کام لیا کہ صرف اس خیال سے کہ سید نور اللہ بڑے مجاہد تھے اور آخر تشیع کی بدولت شہید بھی ہو گئے وہ کیوں کر ایسی روایت لکھیں گے؟ اس روایت کو صاف قبول نہ کیا لیکن الحمد للہ کہ اس سے انکار بھی نہ فرمایا اور ”مجالس المؤمنین“ سے نقل کر کے اس میں کچھ تعریف شاہ صاحب کی ثابت نہ کی۔ پس ہم حضرت کے خیال کو صرف وسوسہ شیطانی سمجھتے ہیں اور جو کچھ بہ نسبت منقول ہونے روایات جسم اور مکان باری تعالیٰ کے حضرت نے لکھا ہے اس میں تدلیس کو دخل دیا، یعنی فرماتے ہیں کہ مذہب اسلام میں ایسی روایتیں ہیں حالانکہ اس تعجب سے بے چارے سنی محروم ہیں۔ یہ دولت صرف حضرات شیعہ کے قدام اور علماء کے حصہ میں ہے، اس لیے بجائے اہل اسلام کے اہل تشیع لکھنا چاہیے تھا تا کہ لوگ دھوکے میں نہ پڑتے اور سمجھ جاتے کہ جب باری تعالیٰ کی جسمیت اور مکان کی روایتیں مذہب تشیع میں موجود ہیں اور اس سے باوجود یکہ اس کے اعتقاد رکھنے والے اور ان روایتوں کو احادیث ائمہ میں نقل کرنے والے علماء شیعہ تھے اور صرف علماء نہ تھے بلکہ نائب ائمہ اور نہ فقط نائب ائمہ بلکہ جان اور جگر ائمہ کے کہ اس کو ہم خاص ایک بحث میں ثابت کریں گے اور پھر ان روایتوں سے متاخرین امامیہ منکر ہوں گے تو پھر کیا تعجب ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت توبہ کے اگلے مقرر تھے اور اب پچھلے منکر ہیں..... علاوہ بریں اس قول کو

مجتہد صاحب کے دیکھنا چاہیے کہ وہ معاذ اللہ! معاذ اللہ! حضرت امام جعفر صادقؑ کی نسبت تبرا کرنے کی تہمت کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ وہ ہر نماز کے بعد عبادت سمجھ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور خلفاء رضی اللہ عنہم پر تبرا کرتے تھے حالانکہ قاضی نور اللہ شوستری اس کے وجوب کو جاہلوں کی طرف نسبت کرتے ہیں اور اس کو تشیع کے مفہوم میں معتبر نہیں جانتے..... دیکھو نور اللہ شوستری نے کچھ ایمان کا پاس کیا اور کہا:

((نسبت فحش بہ کافہ آدمیاں حرام ست چہ جائے حرم
حضرت پیغمبر خدا .))

”عام انسانوں کو گالی دینا حرام ہے چہ جائیکہ پیغمبر خدا ﷺ کی بیویوں کو۔“
اور مجتہد صاحب اسی کو امام کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ (و حاشا جنابہم عن
ذالك .)

حقیقت میں مجتہد صاحب در پردہ قاضی نور اللہ کو جھٹلاتے ہیں اور ایسا لفظ لکھنے پر جس سے وجوب تبرا ثابت نہ ہو خفا ہوتے ہیں مگر تقدیر کے لکھے کو امکان نہیں دھوتا جو کچھ وہ لوگ لکھ گئے سو لکھ گئے (جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ) اب بات بنانے اور نوحہ و بکا کرنے سے کیا ہوتا ہے، سچ لکھا ہے نشی سبحان علی خان صاحب نے مولوی نور الدین کے خط میں:

((البتہ مشکل ست کہ علماء ما وقت تحریر کار بہ دور
اندیشی و حفظ از اعتراض حریف بہ بعض جاہا نکرده
اند .))

”مشکل یہ ہے کہ ہمارے علماء نے لکھتے وقت دور اندیشی اور حریف کے
اعتراضات سے بچنے کا کام بعض مقامات پر نہیں کیا ہے۔“

ایک اور خط میں جناب نشی صاحب موصوف ان لفظوں سے اپنا افسوس ظاہر کرتے ہیں:

((غرض کہ متعصبین ❶ جفا پیشہ را حق ذائقہ عدل خود چشاند کہ مازیس تعصبات میدان مناظرہ بسیار تنگ شدہ و تناقض اخبار رگِ جان رامی خراشد .))
 ”غرض کہ ظالم تعصب کرنے والوں کو اللہ اپنے عدل و انصاف کا مزہ خود چکھائے گا کہ ان تعصبات کی وجہ سے میدانِ مناظرہ بہت تنگ ہو چکا ہے اور متضاد اخبار و احادیث کی وجہ سے جان مشکل میں ہے۔“
 اور پھر لکھتے ہیں:

((حقیقۃ الحال ❷ اینکہ بندہ پیشتر ہا بوا دید اختلاف مضامین احادیث و قصور فہم امثال ما ہیچ مدانا از اسرار تفسیر اکثر آیات مصحف مجید مروی بطریق فرقہ حقہ اثنا عشریہ بر خود می لرزید کہ اگر مخالف دست تشبث بذیل این مرویات می زند تفصیے مشکل خواهد بود ہما پیش آمد .))
 ”حقیقت حال یہ ہے کہ بندہ نے اکثر مقامات پر ان احادیث کا تناقض اور قرآن کی آیات کے تفسیری نکات کی نا فہمی کا معاملہ دیکھا جو فرقہ حقہ اثنا عشریہ سے مروی ہیں تو لرزہ طاری ہو گیا کہ اگر یہ روایات مخالف کے ہاتھ لگ گئیں تو جان بچانا مشکل ہو جائے گا، چنانچہ یہی خطرہ سامنے آ گیا۔“
 الحاصل! جو کچھ ہم نے لکھا اس سے بخوبی ثابت ہوا کہ قاضی نور اللہ شوستری کے نزدیک مخالفانِ علی المرتضیٰ کافر نہیں ہیں بلکہ فاسق ہیں اور وہ اپنے قول پر محقق نصیر الدین طوسی کے قول کو سند لاتے ہیں جو کہ انہوں نے تجرید میں کہا ہے:
 ((مُخَالَفُوهُ فَسَقَةٌ وَ مُحَارِبُوهُ كَفْرَةٌ .))

”ان کی مخالفت کرنے والے فاسق ہیں اور لڑنے والے کافر ہیں۔“
 اب ہم مجتہد صاحب کے اس جواب کو بہ تفصیل بیان کرتے ہیں جو انہوں نے
 ”ذوالفقار“ میں دیا ہے اور جس میں حضرت نے اپنی وقاد طبعیت کے جوہر دکھائے ہیں،
 فرماتے ہیں:

((بر تقدیر ❶ مطلب عبارت محقق طوسی علیہ الرحمة کہ
 چیزے باشد کہ بذهن قاصر او رسیده وجہ استحقاق لعن
 ایشاں منحصر در محاربه امیر المومنین نیست چہ بر تو
 سابق بریں ظاہر گشتہ وہم عنقریب واضح خواہد شد کہ
 ہر کہ منکر یکے از ضروریات دین یا مذہب باشد ملعون
 ست گو محارب نباشد و محقق طوسی علیہ الرحمة نگفتہ
 کہ کل من یا یكون محارباً لایكون ملعوناً کافراً الجواز ان
 یكون المحمول..... الخ .))

”محقق طوسی کی عبارت کا مطلب جو شاہ صاحب کے ناقص ذہن میں آیا وہ کچھ
 اور ہے حالانکہ ان پر لعنت و ملامت کی وجہ امیر المومنین سے جنگ کرنا نہیں ہے،
 بلکہ وہ ہے جس کا اظہار تم سے پہلے کیا جا چکا ہے اور پھر عنقریب واضح ہو جائے گا
 کہ جو کوئی دین و مذہب کی ضروریات میں سے کسی ایک کا منکر ہو تو وہ ملعون ہے
 اگرچہ اس نے جنگ نہ کی ہو، محقق طوسی نے یہ نہیں کہا کہ جو جنگ نہ کرے وہ
 ملعون و کافر نہیں بلکہ جائز ہے کہ اس پر یہ بھی صادق آئے۔“

اس حکیمانہ تقریر کے شروع میں جو لفظ ”بر تقدیر“ کا ہے اس پر غور کرنا چاہیے کہ اس سے
 پایا جاتا ہے کہ ”مُخَالَفُوهُ فَسَقَهُ مُحَارِبُوهُ كَفَرَةٌ.“ کا مطلب جو شاہ صاحب سمجھے ہیں
 وہ گویا غلط سمجھے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مخالفان علی فاسق ہیں اور محاربان علی کافر،

معلوم نہیں کہ پھر اس کا مطلب کیا ہے اور ان لفظوں کے اور کیا معنی ہیں..... اگر شاہ صاحب نے اس کے معنی سمجھنے میں غلطی کی اور ”خطبہ شقشیہ“ کی طرح بغیر ”قاموس صحاح“ اور ”جوہری“ کے دیکھنے کے اس کا مطلب سوائے مجتہد صاحب کے دوسرا نہیں سمجھ سکتا تو جو کچھ قاضی نور اللہ شوستری اس کا مطلب سمجھے ہیں اور انہوں نے فارسی میں اس کو بیان کیا ہے وہ بھی تو یہی ہے، چنانچہ ہم بلفظ اس کی نقل اوپر لکھ چکے ہیں، پس معلوم نہیں کہ باوجود ایسی سلاست الفاظ اور صراحت معنی کے لفظ ”بر تقدیر“ مجتہد صاحب کے قلم سے کیوں کر نکلا ہے۔ اب مجتہد صاحب کے معنی سنیے کہ وہ جو کچھ اس کا مطلب سمجھے ہیں اسے خود بیان کرتے ہیں:

((اما قوله ان مخالفوه فسقة فمعناه انه لا بد من ان يكون مخالفا فاسقا لانه لا يكون الا فاسقا فانه من ضروريات مذهبنا ان بعض انواع مخالفة ينجرالى الكفر والكفر مستلزم للفسق .))^①

”محقق طوسی کا قول کہ ان کے مخالف فاسق ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو ان (علی رضی اللہ عنہ) کا مخالف ہوگا وہ فاسق ہوگا یہ مطلب نہیں کہ وہ فاسق کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ ہمارے ضروریات دین میں ہے کہ بعض مخالفتیں کفر کا سبب ہیں اور فسق کے لیے کفر لازم ہے۔“

اور اس کے بعد فرماتے ہیں:

((② ہم میتواند شد کہ مراد محقق این باشد کہ مخالف علی بن ابی طالب علیہ السلام مادامے کہ منکر یکے از ضروریات دین نباشد مسلم فاسق است چنانچہ سائر مخالفین اعنی

① عبارت ”ذوالفقار“ مطبوعہ مطبع مجمع البحرین لدھیانہ ۱۲۸۱ء صفحہ ۴۶۔

دردارِ دنیا احکامِ اسلام بر آنها جاری می شوند مگر در دارِ
آخرت مخلد به نار خواهد بود.))

”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محقق طوسی کی مراد یہ ہو کہ علی بن ابی طالبؑ کا مخالف جب
تک ضروریاتِ دین کا منکر نہ ہو تو وہ مسلم فاسق ہے، جیسا کہ تمام مخالفین، یعنی
دنیا میں ان پر احکامِ اسلام جاری ہوں گے مگر آخرت میں وہ ہمیشہ کے لیے
دوزخ میں رہیں گے۔“

اس معنی پر مثل مضمون ”المعنی فی بطن الشاعر“ بلکہ مقولہ (توجیہ القول
مالایرضی بہ قائلہ) صادق آتا ہے..... اب ہم اس سے بحث کرتے ہیں کہ حضرت
مجتہد صاحب قبلہ آگے چل کر فرماتے ہیں:

((اکثر اوقات ❶ استعمال فسق در خصوص معنی خروج عن
طاعة الله مع الايمان میشود و ازیں لازم نمی آید کہ ہر جا
کہ لفظ فاسق مستعمل شود ہمی معنی مراد باشد کیف و
جناب حق سبحانہ و تعالیٰ میفرماید ﴿وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا ❷ إِلَيْكَ
آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ﴾ ❸ ﴿فَأُولَٰئِكَ هُمُ
الْفَاسِقُونَ﴾ و ظاہر ست کہ او سبحانہ تقدس و تعالیٰ
درینجا لفظ فاسق بر مرتد اطلاق کردہ و امثال این آیات در
کلام مجید بسیا رست و ازیں مبرهن می شود کہ این
متعصب کلام محقق علیہ الرحمة رادریں مقام محض
بر سبیل تدلیس و مغالطہ ذکر نمودہ و بر کلام سفاهت نظام

❶ عبارت ”ذوالفقار“ مطبوعہ مطبع مجمع البحرین لدھیانہ ۱۲۸۱ء صفحہ ۲۶۔

❷ سورہ بقرہ، رکوع ۱۲۔

❸ سورہ آل عمران: رکوع ۹-۱۲۔

خود آنرا دلیل شمرده و حالانکہ کلام محقق علیہ الرحمة درغایت جودت و متانت ست .))

”اکثر اوقات فسق کا استعمال اپنے خاص معنوں، یعنی ایمان کے ساتھ اللہ کی اطاعت سے خارج ہو جانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جہاں لفظ فاسق استعمال ہو وہاں یہی معنی مراد ہوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اللہ نے کہا ہے کہ ہم نے واضح آیات اتاریں اب ان سے وہی لوگ انکار کریں گے جو فاسق اور بے حکم ہیں، ظاہر ہے کہ فاسق کا لفظ مرتد کے لیے اللہ تعالیٰ نے استعمال کیا ہے۔ اس قبیل کی آیتیں قرآن کریم میں بکثرت ہیں اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس متعصب شخص نے محقق طوسی کے کلام کو یہاں بطور مغالطہ بیان کیا ہے اور اپنے بیہودہ کلام کو خود ہی ثبوت میں پیش کیا ہے حالانکہ محقق طوسی کا کلام نہایت خوب و متین ہے۔“

اس ساری تقریر کا جس میں حضرت نے بہت بحث کر کے دو چار آیتیں بھی لکھی ہیں یہی مطلب ہے کہ لفظ فاسق کبھی بہ معنی مرتد اور کافر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے سو ہم تسلیم کرتے ہیں لیکن قرینہ اور سیاق عبارت کا ہونا ضروری ہے کہ وہ آیات قرآنی میں موجود اور محقق طوسی کے کلام میں مفقود ہے بلکہ کلام طوسی میں کسی طرح پر لفظ فاسق سے کافر کے معنی لینا درست ہی نہیں ہو سکتا بلکہ مطلب ہی اس کا فوت ہوا جاتا ہے، اس لیے کہ اگر وہ کسی موقع اور محل پر صرف اتنا کہتے کہ ”مخالفوه فسقة“ اور اس کے مقابلہ میں ”محاربوه کفرة“ نہ فرماتے تو اس کی گنجائش ہوتی کہ مراد فاسق سے کافر ہے، لیکن جبکہ وہ دو فریق کا حال بیان فرماتے ہیں اور دونوں کے احکام کو بھی جدا جدا ذکر کرتے ہیں تو بحال اتحاد معنی محمول کے تو اس مقام پر اتحاد معنی موضوع میں ضرور لازم ہے۔ پس جب انہوں نے دو فریق قائم کیے وہ جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مخالفت کی، دوسرے وہ جنہوں نے ان سے لڑائی کی اور ان دونوں کی نسبت دو حکم قائم کیے، مخالف کو فاسق قرار دیا اور محارب کو کافر تو اگر یہاں فاسق کے

معنی کافر کے لیے جائیں تو مطلب ہی فوت ہوتا ہے بلکہ یہ جملہ ہی خبط ہوا جاتا ہے اور محقق طوسی جیسے علامہ کا کلام وہ بھی ”تجریدی“ کتاب کا جو باعتبار الفاظ و معنی کے نہایت ہی متین ہے مہمل ہوا جاتا ہے اس لیے کہ اگر ان کی مراد فاسق سے کافر تھی تو بجائے ”مخالفوہ فسقہ و محاربوہ کفرہ“ کے اتنا ہی کہہ دیتے کہ ”مخالفوہ کفرہ“ تاکہ محارب بھی اس میں آجاتے یا اگر بہت تصریح کرتے تو ”مخالفوہ و محاربوہ کفرہ“ فرماتے، یا اگر کفر ہی پر ان کو قناعت ٹھہرتی اور بغیر لفظ فسق کے ان کو صبر نہ آتا تو یہ کہتے کہ ”مخالفوہ و محاربوہ کفرہ فسقہ“ پس محقق کا ان سب عبارتوں کو چھوڑنا اور پھر جملے کے جداگانہ موضوع کے لیے جدا ہی محمول لانا صاف اس پر دلالت کرتا ہے کہ دونوں کے معنی علیحدہ علیحدہ ہیں اور مجتہد صاحب جو ان دونوں کے ایک معنی بیان کرتے ہیں یہ صرف خوش فہمی حضرت کی ہے۔ قطع نظر اس کے مجتہد صاحب کو قاضی نور اللہ شوستری کے قول پر بھی غور کرنا چاہیے تھا کہ وہ صاف شیخین رضی اللہ عنہم کی تکفیر سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے:

((نسبت تکفیر حضرات شیخین کہ اہل سنت و جماعت

بہ شیعہ نمودہ اندسخنے ست بے اصل کہ در کتب اصول

ایشان ازاں اثر سے نیست .))

”سنیوں کا یہ بیان کہ شیعہ جماعت حضرات شیخین رضی اللہ عنہم کو کافر کہتی ہے، یہ

بات بالکل بے اصل ہے کیونکہ کتب شیعہ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔“

اور اپنے اس قول کے ثبوت میں نصیر الدین طوسی کے اس قول کو سنداً بیان کرتا ہے:

((چنانچہ نصیر الدین طوسی در تجرید آورده مخالفوہ فسقہ

محاربوہ کفرہ .))

”جیسا کہ نصیر الدین طوسی نے ”تجرید“ میں ذکر کیا ہے کہ ان کے مخالف فاسق

اور لڑنے والے کافر ہیں۔“

تو اگر فاسق کے معنی کافر لیے جائیں تو قاضی نور اللہ شوستر کی بات ”گوزشتر“ ہو جائے گی اور ”ترہات مجانین“ میں داخل سمجھی جائے گی، اگر اس پر بھی مجتہد صاحب کے ذہن مبارک میں نہ آیا تھا تو قاضی نور اللہ شوستر کی اگلی عبارت کو دیکھتے کہ وہ کہتا ہے:

((بمقتضائے حدیث حربك حربى و سلمك سلمى واقع

ست و ظاهر ست کہ حضرات شیخین با امیر المومنین علیہ

السلام حرب نہ نمودہ اند .))

”اور بلحاظ حدیث کہ تم سے جنگ مجھ سے جنگ اور تم سے صلح مجھ سے صلح ہے اور

ظاہر ہے کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہم نے امیر المومنین سے جنگ نہیں کی۔“

اس سے کیسا صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں فاسق سے مراد کافر نہیں ہے بلکہ (خروج

عن طاعة الله مع الايمان) مراد ہے۔ اب اگر اس پر بھی مجتہد صاحب کے مقلدین ان

کے اجتہاد کے رتبہ پر خیال کر کے ان کو سفیہ نہ کہیں اور ان کی سمجھ پر افسوس نہ کریں اور

”ذوالفقار“ کی متانت اور استحکام کا دعویٰ ہی کرتے چلے جائیں تو بس ان کے حق میں سوائے

اس کے کیا کہیے کہ..... شعر.....

پہچ آدابے و ترتیبے مجو

ہرچہ می خواہد دل تنگت بگو

”کسی ادب و ترتیب کی فکر نہ کرو جو تمہارے دل میں آئے کہہ ڈالو۔“

اگر فقط مجتہد صاحب کو لفظ فاسق کے اطلاق سے یہ معنی مرتد یا کافر جو قرآن مجید میں

ہیں شبہ ہوا ہے تو ہم پوچھتے ہیں کہ کیا جہاں لفظ فاسق بولا جائے گا مراد اس سے کافر ہوگا، اگر

یہ ہے تو ہم ان سے استفتا کرتے ہیں کہ ایک مجتہد نے شراب پی ہے یا زنا کیا ہے یا عمداً نماز

نہیں پڑھی ہے وہ کافر ہے یا فاسق، اگر جواب دیں گے کہ فاسق ہے تو ہم کہیں گے کہ مجتہد

کافر ہو گیا، اس لیے کہ خدا نے قرآن مجید میں فرمایا ہے ﴿وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ﴾

(البقرہ: ۹۹) ”اور منکر نہ ہوں گے ان سے مگر وہی جو بے حکمے ہیں۔“ قسم ہے اس خدا کی

جس نے مجھے پیدا کیا ہے کہ میں مبالغہ سے نہیں کہتا ہوں اور مطلق تعصب کو دخل نہیں دیتا ہوں کہ جو تقریر مجتہد صاحب نے اس مقولہ طوسی کی کی ہے وہ ایسی پوچ اور لچر اور سفاہت سے بھری ہوئی ہے کہ حضرت تو مجتہد، علامہ، فخر العلماء اور سلطان العلماء ہیں، ان کی نسبت کیا کہوں چھوٹا منہ بڑی بات ہے لیکن اگر کسی اور شخص عامی کے قلم سے نکلی ہوئی تو میں دو حرف بھی اس کے جواب میں نہ لکھتا اور اس کی تردید میں ایک لمحہ بھی اپنی عمر عزیز کا ضائع نہ کرتا کیونکہ یہ تقریر ایسی پوچ، لچر ہے کہ اس کی تردید میں جو کاغذ صرف ہو اس کی قیمت بھی وصول نہیں ہوتی۔ بار خدایا یہ کیسے مجتہد تھے اور ان کی فضیلت و تبحر پر شیعوں کو کیسا ناز تھا اور کیسے پاک باحیا تھے کہ ایسی تقریروں پر ناز کرتے تھے اور ایسی بیہودہ باتوں کے لکھنے پر جامے سے نکلے جاتے تھے، استغفر اللہ، استغفر اللہ.

اب میں اس امر سے بحث کرتا ہوں کہ جو کچھ مجتہد صاحب نے فرمایا کہ ساری ضروریات دین میں سے کسی کا بھی منکر ہو وہ کافر ہے، پس اس سے مقولہ طوسی کے کچھ معنی تو نہ بدل جائیں گے اور جو کچھ اس نے فرمایا ہے اس میں فرق نہ ہوگا اس لیے مجتہد صاحب کو چاہیے تھا کہ بجائے اس کے کہ گھڑ گھڑ کے اس کے کلام کے معنی بناتے اور اس کے لفظوں سے وہ معنی نکالتے جو اس نے خواب میں بھی نہ خیال کیے ہوں گے اور اگر وہ زندگی میں اپنے کلام کے ایسے معنی سنتا تو معنی بنانے والوں کے سر پر پٹکتا، صاف یہ کہہ دیتے کہ گو نصیر الدین طوسی یا قاضی نور اللہ شوستری نے یہ لکھا ہے مگر چونکہ مخالف احادیث ائمہ اور جمہور علماء امامیہ کے ہے، اس لیے ان سے غلطی ہوئی ہے، ہم اسے تسلیم ہی کرتے۔ پس جس طرح ہم ملا عبد اللہ کے کلام نہ ماننے سے مجتہد صاحب پر دار و گیر نہیں کرتے اسی طرح اس کو سن کر چپ ہو جاتے اور حقیقت میں یہ امر بیجا نہیں ہے، اس لیے کہ یہ کچھ ضروری نہیں کہ اہل مذہب کو ہر مجتہد اور ہر عالم کے سب قولوں اور سب باتوں کا ماننا لازم ہے خصوصاً وہ بات جو کہ صرف اپنی رائے سے کسی نے لکھی یا کہی ہو بلکہ قرآن و حدیث کا ماننا ضروری ہے۔ پس اگر مذہب شیعہ کے عالم ہوں یا سنیوں کے جس کا کلام قرآن و حدیث کے مطابق ہوگا اس کلام کو ماننا اس مذہب

والے کو ضروری ہے ورنہ کچھ ضروری نہیں، چنانچہ ہم صرف علامہ طوسی کے اس قول پر تکیہ کر کے نہیں بیٹھتے بلکہ جس راہ پر مجتہد صاحب چلیں چلنے کو تیار ہیں اور جس کو جمہور کا مذہب کہیں اور جس پر اپنے اجتہاد کا مدار رکھیں اسی پر جرح کرنے کو مستعد ہیں۔ شعر.....

رشته در گردنم افگندد وست
می برد ہر جا کہ خاطر خواه اوست

جناب قبلہ کعبہ شروع کتاب میں فرماتے ہیں:

((پوشیدہ مخفی نماند کہ این عبارت ناصب کہ اودریں جا التزام نموده کہ بانچه دریں اجزاء بر شیعیان احتجاج نماید در عدم استحقاق لعن اصحابِ ثلاثہ و احزاب آنها از اصول مقررہ پیش شیعه باشد و اصلاً قول اہل سنت را در ان دخل نہ دہد پس بدانکہ از جملہ اصول مقررہ پیش شیعه اثنا عشریہ اصول دین ست کہ عبارت از توحید و عدل و نبوت و امامت و معاد باشد پس شکے نیست کہ امامیہ منکر یکے از اصول مذکورہ را مومن نمی دانند و اور از جملہ ملاعین می انگارند آرے منکر امامت را با وجود اقرار او بہ توحید و نبوت و معاد کا فر نمید اند یعنی احکام کفار را در دنیا بر آنها جاری نمی سازند.))

”واضح رہے کہ ناصبی دشمن نے یہ عبارت اس جگہ اس لیے لکھی ہے کہ ان اجزا کے ذریعے شیعوں سے احتجاج کرے کہ اصحابِ ثلاثہ اور ان کے گروہ کے لوگوں کو گالی نہ دینا شیعوں کے اصول میں سے ہے اور اہل سنت کے قول کو اس میں کوئی دخل نہیں جاننا چاہیے کہ شیعوں کے اصول مقررہ میں سے وہ اصل دین ہے جس میں توحید، عدل، نبوت، امامت اور قیامت داخل و شامل ہو اور حقیقت بھی

یہی ہے کہ اصول مذکورہ میں سے کسی اصول کا جو کوئی انکار کرے وہ شیعوں کے نزدیک مومن نہیں بلکہ ایسے شخص کو ملعون سمجھتے ہیں، البتہ یہ ضرور ہے کہ جو کوئی امامت کا انکار کرے اور توحید و نبوت اور معاد کا اقرار کرے تو ایسے شخص کو کافر نہیں جانتے، یعنی کفار کے احکام ایسے شخص پر دنیا میں جاری نہیں کرتے۔“

پھر ایک اور مقام پر بھی لکھتے ہیں:

((از کلام ❶ بعضے معلوم می شود کہ کفر واقعی ایشاں را

اجماعی می دارند.))

”بعض کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے کافر ہونے کو وہ اجماعی طور پر

مانتے ہیں۔“

اس کے بعد فرماتے ہیں:

((ہر گاہ کہ این دانستہ شد پس بنا بریں می گوئیم کہ منشاء

تبراً از اصحاب ثلاثہ و عائشہ و حفصہ و طلحہ و زبیر و

معاویہ و احزابِ آنها مخالفت ہریکے از اصول معتبرہ مقررہ

نزدیک شیعہ امامیہ ست چہ باتفاق معلوم ست کہ ایشاں و

تبعہ ایشاں با مامت ائمہ اثنا عشریہ قائل نبودند و نیستند

بخوبیکہ شیعہ قائل اند و این نیز ثابت است کہ ائمہ ما علیہم

السلام از آنها تبراً فرمودہ اند و رعیت خود را حکم نمودہ اند

کہ تبراً از آنها نمایند و حکم بنفاق اینہا کنند.)) ❷

”جب یہ معلوم ہو گیا تو میں صاف صاف کہتا ہوں کہ اصحاب ثلاثہ عائشہ، حفصہ،

طلحہ، زبیر، معاویہ رضی اللہ عنہم جمعین اور ان کے ساتھیوں پر تبراً کرنا اس لیے ہے کہ یہ امامیہ

❶ عبارت ذوالفقار مطبوعہ مطبع مجمع البحرین لدھیانہ، ۱۲۸۱ھ صفحہ ۱۱-۱۲

❷ ایضاً صفحہ ۱۱-۱۲

شیعوں کے مقررہ معتبرہ اصول کے مخالف تھے اور متفقہ طور پر معلوم ہے کہ یہ اور ان کے پیرو بارہ اماموں کی امامت کے قائل نہ تھے اور جس طرح شیعہ مانتے ہیں یہ نہیں مانتے تھے اور یہ بھی ثابت ہے کہ ہمارے اماموں نے ان سب سے بیزاری کی اور اپنے ماننے والوں کو ان پر تبرا کرنے اور ان کو منافق ماننے کا حکم دیا ہے۔“

اور حضرت والا مقدمہ چہارم کے جواب میں فرماتے ہیں:

((بباید ❶ دانست کہ تنازع عامہ باخاصہ بآن ماند کہ زن بامرد مخاصمہ نماید زیرا کہ معلوم است کہ صدّد شنام زن به يك دشنام مرد مقاومت نمی تواند کرد و مصداق این حرف این ست تطویلات بلا طائل کہ بکاربرده ویک حرف کہ عدم ثبوت ایمان اصحابِ ثلاثہ و نظرای ایشان از جهت عدم اعتراف بامامت ائمه اثنا عشرست کافست و بازهرگز احتیاج گفتگو باقی نمی ماند.))

”جاننا چاہیے کہ عام آدمی کا تنازعہ خاص کے ساتھ ایسا ہی ہے کہ جیسے عورت مرد سے جھگڑے اور یہ ظاہر ہے کہ عورت کی سوگالیاں مرد کی ایک گالی کے مقابلہ کی تاب نہیں لاسکتیں اور بے کار دلائل اور گفتگو بے سود ہے، اصحابِ ثلاثہ اور ان کے ساتھیوں کے مومن نہ ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ بارہ اماموں کی امامت کے قائل و معترف نہ تھے۔“

پھر ایک مقام پر فرماتے ہیں:

((محقق ❷ طوسی علیہ الرحمۃ در رسالہ قواعد العقائد گفته

❶ عبارت ذوالفقار مطبوعہ مطبع مجمع البحرین لدھیانہ، ۱۲۸۱ھ صفحہ ۲۳۔

❷ ایضاً صفحہ ۵۱-۱۲

اصول ایمان نزد شیعه سہ چیزست تصدیق بہ وحدانیت خدا در ذات اور و در افعال او و تصدیق پیغمبری پیغمبران و تصدیق بہ امامت ائمہ بعد از پیغمبران انتہی کلام المحقق رحمہ اللہ و ایس کلام برہان قاطع ست بر فساد ذہن و اعوجاج طبع این معاند مجادل کہ از عبارت تجرید محقق می خواہد کہ کفر را مخصوص بمحاربین گردانیدہ خلفاء ثلاثہ خود را از ان نجات دہد و نجات متصور نیست .))

”محقق طوسی نے رسالہ ”قواعد العقائد“ میں لکھا ہے کہ شیعوں کے نزدیک اصول ایمان تین ہیں: ایک یہ کہ اللہ اپنی ذات و صفات میں واحد ہے، دوسرے پیغمبروں کی پیغمبری کی تصدیق اور تیسرے یہ کہ پیغمبروں کے بعد امامت حق ہے..... یہ کلام اس دشمن کے فسادِ ذہن و کجرویِ طبیعت پر دلیل قاطع ہے۔ اس دشمن کی خواہش محقق طوسی کے کلام کے بیان سے یہ ہے کہ علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کرنے والوں کو ہی کافر قرار دے اور خلفائے ثلاثہ کو کفر سے چھٹکارہ دلا دے حالانکہ نجات اور چھٹکارہ نہیں۔“

جو کچھ قبلہ و کعبہ نے فرمایا اسی کے مثل اور علماء متاخرین امامیہ نے ارشاد کیا ہے، چنانچہ بڑے بھائی جناب منشی سبحان اللہ علی خان صاحب کے جواب میں ”ایضاح لطافۃ المقال“ کے، فرماتے ہیں:

((حالا بجواب معارضہ کہ حضرت مخدومی فرمودہ اند ہرچہ حاضر طبع ماہرست گزارش می رود و آن این ست کہ لمحض معارضہ جناب اینکہ قدمائ امامیہ قاطبہ معتقد کفر منکران امامت بودہ اند و از کلام خواجہ نصیر الدین طوسی و علامہ حلّی و میر نور اللہ شوستری فسق ایشان

مستفاد می گردد ، بنده عرض میکنم کہ مختار جمہور امامیہ اثنا عشریہ خواہ از متقدمین و یا از متاخرین ہمین ست کہ مخالف جناب امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام اعم من ان یکون محارباً ام لا کافرست لیکن اطلاق کافر براو نظراً الی دار لآخرۃ و سوء مآل اوست نہ باعتبار دردار دنیا مثل جواز مناکحت یا یا مجالست و امثال آن و وجہ این عقیدہ نہ آن ست کہ ملازمان خیال فرمودہ اند اعنی در دو حدیثیکہ مضمونش این ست کہ بعد رحلت حضرت حضرت رسالت مآب ﷺ ہمگین صحابہ مرتد شدند بجز چہار کس و جناب بزغم خود این حدیث را منافی آیات کثیرہ و احادیث شہیرہ فہمیدہ اند مع ”ان الامر لیس کذالک“ چنانچہ بوجہ وجیہ این حدیث بموقع خواهد آمد بلکہ احسن اینکہ امامت بلا فصل علی بن ابی طالب علیہ السلام و ہمچنین امامت سائر ائمہ نزد امامیہ از اصول دین مثل توحید و نبوت است و رکنی از ارکان ایمان نہ جزو اسلام ست و این مماثلت باعتبار دار آخرت ست یعنی منکر ہر یکے ازینہا مخلد بجهنم ست نہ باعتبار این دار چہ معترف بہ شہادتین را در دار دنیا کافر نمی گویند گو مومن نباشد .))

”جناب محترم کے کتابی مقالہ کے جواب میں عرض ہے کہ جناب کا خلاصہ جواب یہ ہے کہ اعتقاد منکرین امامت کو متقدمین امامیہ نے قطعاً کافر کہا ہے اور خواجہ نصیر الدین طوسی، علامہ حلی اور نور اللہ شوستری کے کلام سے منکرین امامت کا فاسق ہونا ظاہر ہے اور خادم عرض کرتا ہے کہ بارہ اماموں کے ماننے والے

متقدمین ہوں یا متاخرین سب کے نزدیک یہ ہے کہ امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ سے چاہے کوئی جنگ کرے یا نہیں ان کا مخالف کافر ہے اور ایسے شخص پر کافر (ہونے) کا اطلاق بنا بر آخرت ہے کہ وہاں اس کا نتیجہ خراب ہے، دنیا میں اس کے ساتھ کافروں جیسا برتاؤ نہیں کہ ان کے ساتھ نکاح، نشست و برخاست وغیرہ جائز ہے۔ اس عقیدہ کا وہ سبب نہیں جو جناب نے خیال فرمایا ہے، جیسا حدیثوں میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد بجز چار کے تمام صحابہ مرتد ہو گئے اور جناب نے اس حدیث کو بزعم خود بکثرت آیات و احادیث کے مخالف تصور فرمایا ہے حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے اور یہ حدیث حسب موقع لکھی جائے گی اور بہتر بات یہ ہے کہ علی بن ابی طالبؑ کی بلا فصل امامت دوسرے ائمہ کی امامت فرقہ امامیہ کے نزدیک اصول دین میں سے اسی طرح ہے جیسے کہ توحید و نبوت ہے اور اقرار امامت ایک رکن دین ہے یہ جز اسلام نہیں ہے اور کافر ہونا باعتبار آخرت کے ہے، یعنی جو کوئی ارکان دین کا انکار کرے وہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا اور ایسے منکر کو چونکہ وہ کلمہ شہادتین پڑھتا ہے، اس لیے دنیاوی طور پر کافر نہیں کہتے اگرچہ وہ مومن بھی نہیں ہے۔“

غرض کہ ان ساری تقریروں کا خلاصہ یہ ہے کہ اصحاب ثلاثہ رضی اللہ عنہم اور ان کے تابع امامت ائمہ اثنا عشر سے منکر تھے، اس لیے وہ کافر ہیں اور دنیا میں ان پر کفر کے سب احکام جاری نہیں ہیں اقرار توحید و نبوت کے سبب سے ان پر اسلام کا اطلاق ہے لیکن قیامت میں ان پر سب احکام کافروں کے جاری ہوں گے اور وہ ”مخلد فی النار“ ہوں گے..... اب ہم چند طرح سے اس کا جواب دیتے ہیں:

اول: مجتہد صاحب قبلہ نے خلفاء ثلاثہ اور حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی نسبت فرمایا:

((ایشان و تبعہ ایشان با مامت ائمہ اثنا عشر قائل نبودند.))

”یہ اور ان کے پیروکار بارہ اماموں کی امامت کے قائل نہ تھے۔“

مگر یہ خیال نہ فرمایا کہ ان بے چاروں کے زمانہ میں ائمہ اثنا عشر کہاں تھے اور سوائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اور بہت آخری زمانے میں سوائے حسنین رضی اللہ عنہما کے تو امام پیدا تک نہ ہوئے تھے، ان سب کے مرنے کے بعد ان کا ظہور ہوا تھا تو اگر وہ ائمہ اثنا عشر پر ایمان نہ لائے تو یہ قصور ان کا ہے یا معاذ اللہ خدا کا، کہ کیوں اس نے سب اماموں کو ان کے سامنے پیدا نہ کر دیا..... سبحان اللہ! کیا عقل و دانش ہے حضرت قبلہ و کعبہ کی کہ لکھنے کے وقت لفظوں کا خیال بھی نہیں فرماتے اور اپنے کمال کے نشہ میں ایسے مدہوش ہو جاتے ہیں کہ پھر نظر ثانی بھی نہیں فرماتے، اے مومنین خدا کے لیے انصاف کرو کہ اللہ جل شانہ تو فرماتا ہے کہ ﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ کہ خدایاقت سے خارج کسی امر کی کسی کو تکلیف نہیں دیتا اور جناب قبلہ و کعبہ رسول کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس حکم سے بھی مستثنیٰ کرتے ہیں اور ان کو اس وجہ سے کافر بتلاتے ہیں کہ ”یہ اور ان کے متبعین بارہ اماموں کی امامت کے قائل نہ تھے“، ”آفریں ایسی سمجھ پر شاہباش ایسے فہم پر۔“

دوسرے: اگر مجتہد صاحب کا یہ مطلب ہو کہ ائمہ اثنا عشر سے مراد صرف ذات علی رضی اللہ عنہ ہے، اس لیے کہ ان کی امامت کا اقرار اس وقت میں گویا ائمہ اثنا عشر کی امامت کا اقرار تھا اور اس سے صحابہ منکر تھے..... خیر ہم اس عذر کو بھی قبول کرتے ہیں اور ایسی پوچ تو جیہہ کو بھی مانتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب خدا نے مہاجرین و انصار کی شان میں آیتیں نازل کیں اور جب ان کی ہجرت و نصرت اور جہاد پر ان کی ثنا و صفت کی کبھی فرمایا کہ ﴿وَالسَّابِقُونَ الْأُولُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ﴾^① کبھی ارشاد کیا ﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾^② کبھی فرمایا کہ ﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ﴾^③

① ترجمہ: ”اور جو لوگ قدیم ہیں، پہلے وطن چھوڑنے والے اور مدد کرنے والے۔“ (سورہ توبہ)

② ترجمہ: ”جو یقین لائے اور گھر چھوڑ آئے اور لڑے اللہ کی راہ میں۔“ (سورہ توبہ)

③ ترجمہ: ”اللہ راضی ان سے اور وہ راضی اللہ سے۔“ (سورہ مائد)

وَرَضُوا عَنْهُ ﴿۱﴾ کبھی کہا کہ ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ ﴿۱﴾ تو اس وقت میں جبکہ یہ آیتیں نازل ہوئیں کیا سوائے توحید اور نبوت کے امامت بھی اصول دین سے تھی اور علی مرتضیٰؑ کی امامت کا منکر کافر کہلاتا تھا۔ اگر کوئی آیت قرآن مجید میں ہو تو ذرا دکھلا دیجئے..... جب یہ آیتیں نازل ہوئیں اس وقت کچھ ذکر بھی امامت کا نہ تھا، اس لیے کہ امامت کہتے ہیں خلافت کو اور خلافت کی بنیاد ہے بعد وفات پیغمبر ﷺ کے، تو ان لوگوں کو جو کہ پیغمبر ﷺ کے سامنے ایمان لائے اور ان کے ساتھ ہجرت کی اور ان کے ساتھ جہاد کیا اور ان کی شان میں خدا نے آیتیں نازل کیں، زمانہ خلافت شروع ہونے سے قبل اور ایک نئے اصول امامت کے قائم ہونے سے قبل کافر کہنا حقیقت میں پیش از مرگ واویلا کرنا ہے۔ ہاں اصول شیعہ کے موافق ان لوگوں کے حق میں کفر کا اطلاق ہو سکتا ہے جنہوں نے زمانہ خلافت کا پایا اور جنہوں نے علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی امامت کا انکار کیا۔

تیسرے:..... اگر کوئی شیعہ کہے کہ جن لوگوں نے علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ پایا اور جنہوں نے ان کی امامت سے انکار کیا ان میں خلفاء ثلاثہ داخل ہیں، اسی واسطے ہم ان کو کافر کہتے ہیں اور ان کو ان آیات کی فضیلت سے مستثنیٰ کرتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا کفر بھی اس اصول شیعہ کے موافق کہ منکر امامت کافر ہے اس زمانے سے شروع ہوا جبکہ وہ خلافت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے منکر ہوئے اور خود خلیفہ بن بیٹھے کہ یہ زمانہ پیغمبر ﷺ کی وفات کے بعد شروع ہوا ہے اور قرآن مجید بھی پیغمبر ﷺ کے سامنے اتر ا ہے اور ہجرت اور نصرت اور جہاد جو کچھ مہاجرین نے کیا ہے وہ پیغمبر ﷺ کے سامنے، اور انہیں کاموں اور خدمتوں کو خدا نے قبول کر کے ان کی تعریف میں آیتیں نازل کی ہیں تو جب تک ان بے چاروں نے خلافت کو غصب نہیں کیا اور امام اول کی امامت سے منکر نہیں ہوئے وہ کس قصور میں ان آیتوں کی فضیلت سے محروم کیے جاتے ہیں اور کس جرم میں باوجود مہاجر اور انصار ہونے کے ﴿وَالسَّابِقُونَ الْأُولُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ﴾ کے زمرے سے خارج کیے

﴿۱﴾ ترجمہ: ”اللہ خوش ہوا ایمان والوں سے جب ہاتھ ملانے لگے تجھ سے اس درخت کے نیچے“ ۱۲۔ (سورہ فتح)

جاتے ہیں۔

چوتھے: بار خدایا کوئی قابل اٹھ کر یہ فرمائے کہ پیغمبر ﷺ نے اپنے ہی سامنے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ کر دیا تھا اور ان کا خطبہ پڑھ دیا تھا اور ”من كنت مولاه فعلى مولاه“ کہہ کر سب سے ان کی امامت کا اقرار لے لیا تھا اور صحابہؓ پیغمبر ﷺ کے سامنے ہی منکر امامت ہو گئے تھے، اس لیے وہ کافر ہیں۔ اس کا ہم دو طرح سے جواب دیتے ہیں:

اول: یہ کہ خلافت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی پیغمبر خدا ﷺ نے کس وقت سے ظاہر کی آیا شروع اسلام کے زمانے سے جبکہ اپنی نبوت کا اعلان کیا اسی وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کو قائم کیا، اگر پیغمبر خدا ﷺ نے ایسا کیا ہے تو ذرا اس کا نشان دیجئے، ہم جہاں تک سمجھتے ہیں ہمارے نزدیک کوئی دانش مند اگرچہ مولوی دلدار علی صاحب قبلہ بھی کیوں نہ ہوں ایسی بات زبان سے نہ نکالے گا اور آخر یہی کہے گا کہ حجۃ الوداع میں خم غدیر پر خلافت کا خطبہ پڑھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اخیر زمانہ پیغمبر خدا ﷺ کا ہے اور اس کے بعد بہت ہی کم آیتیں نازل ہوئیں ہیں اور ﴿الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴾ اقرار شیعہ کے موافق دین کے کامل ہونے پر شاہد ہے اور جو آیتیں صحابہ رضی اللہ عنہم کے فضائل میں ہیں وہ یا مکی ہیں یا مدنی اور حجۃ الوداع سے برسوں پہلے نازل ہو چکی ہیں تو اس سے بھی ان آیتوں کے مصداق سے صحابہ کبار خارج نہیں ہو سکتے۔

دوسرے: پیغمبر ﷺ کے سامنے بقول شیعوں کے کسی نے امامت کا انکار نہیں کیا اور سب نے اس کو ظاہر میں قبول کر لیا تو اس وقت میں بھی زبان سے صریح انکار کسی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر نہیں کیا اور جب تک زبان سے کوئی محض توحید اور نبوت سے انکار نہ کرے وہ کافر نہیں ہوتا ظاہر میں، تو جو محض امامت سے ظاہر میں انکار نہ کرے وہ کیوں کافر ہوگا۔

غرض کہ مجتہد صاحب کا یہ قول کہ (اصحاب ثلاثة وعائشة و طلحة و زبیر

وغیر ہم بہ امامت ائمہ اثنا عشر قائل نبودند) ”اصحابِ ثلاثہ، عائشہ اور طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم وغیرہ بارہ اماموں کی امامت کے قائل نہ تھے۔“ اور نیز حضرت کا یہ ارشاد کہ (عدم ایمان اصحابِ ثلاثہ و نظرای ایشاں از جہت عدم اعتراف با امامت ائمہ اثنا عشرست کافیت) ”اصحابِ ثلاثہ اور ان کے جیسوں کا ایمان والا نہ ہونا، اس لیے کافی ہے کہ وہ بارہ اماموں کی امامت کو نہ مانتے تھے۔“ ایسا پوچ اور بیہودہ ہے کہ اس تقریر کے بعد جو میں نے کی ہے اگر اس پر کوئی انہیں کے اس مقولہ کو کہ (تنازعہ عامہ با خاصہ بآں ماند کہ زن بامرد مخاصمہ نماید زیرا کہ معلوم ست کہ صد دشنام زن بیک دشنام مرد مقاومت نمی تواند کرد) ”یعنی عام لوگوں کا جھگڑا خاص لوگوں کے ساتھ ایسا ہے جیسے کہ عورت اپنے شوہر سے جھگڑے اور یہ ظاہر ہے کہ عورت کی سوگالیاں مرد کی ایک گالی کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہیں۔“ انہیں پر اعادہ کرے اور یہ کہے کہ ”تنازعہ خاصہ یعنی حضراتِ شیعہ با عامہ یعنی سنیاں بآں ماند کہ زن بامرد مخاصمہ نماید زیرا کہ معلوم است کہ صد دشنام زن بیک دشنام مرد مقاومت نمی تواند کرد، یعنی سنیوں اور شیعوں کا جھگڑا بالکل ایسا ہی ہے کہ عورت اپنے مرد سے جھگڑتی ہے اور یہ امر واضح ہے کہ عورتوں کی سوگالیاں مرد کی ایک گالی کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔) تو کیا ٹھیک اور درست ہے لیکن ہم اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتے اور گالی گلوچ نہیں کرتے..... اے حضراتِ شیعہ! اپنے غفران مآب کے تقدس اور تہذیب و متانت کو دیکھو کہ حضرت قبلہ و کعبہ مثال بھی دیتے ہیں تو گالی گلوچ ہی کی، کاش! بجائے اس کے دوسری مثال دیتے اور اپنی تہذیب و متانت کو برقرار رکھتے تو لوگوں کے سامنے شرمندگی نہ ہوتی۔

دیکھو کہ ”ذوالفقار“ میں ورق کے ورق اس اصول کی تصدیق میں کہ علماءِ شیعہ کے نزدیک امامت کا منکر کافر ہے سیاہ کیے ہیں اور ناحق کتاب کا حجم بڑھایا ہے تا کہ لوگ سمجھیں کہ بڑی موٹی کتاب لکھی ہے حالانکہ سب کا مطلب یہی ہے کہ شیعوں کے نزدیک امامت اصولِ دین سے ہے اور منکر اس کا کافر ہے، لیکن اس سے کچھ جواب صاحب ”تحفہ“ کے کلام کا نہیں ہوتا، اس لیے کہ وہ تمام سنیوں کے ایمان ثابت کرنے پر بحث نہیں کرتے کہ جس پر

موافق اصول شیعہ کے بہ سبب انکار امامت ائمہ اثنا عشر کے عدم ایمان یا کفر کا اطلاق ہو بلکہ وہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم سے بحث کرتے ہیں اور اس امر کا دعویٰ کرتے ہیں کہ اصحابِ رسولؐ پر کفر کا اطلاق نہیں ہوتا اور اس کے ثبوت میں وہ آیتیں جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان میں نازل ہوئی ہیں پیش کرتے ہیں اور ملا نصیر الدین طوسی اور نور اللہ شوستری وغیرہ کے کلام کو اس کی تائید میں لاتے ہیں اور مجتہد صاحب اس واضح فرق کو تو ملاحظہ نہیں کرتے اور صاحب ”تحفہ“ کی تحریر کا مطلب تو نہیں سمجھتے، دونوں امروں کو خلط ملط کر کے عامیوں کی طرح جواب دیتے ہیں کہ ہمارے اصول سے تو یہ ہے کہ منکر امامت ائمہ اثنا عشر کا فر ہے..... اے صاحب آپ کے اصول دین میں منکر امامت ائمہ اثنا عشر کا فر کیسا؟ اگر آپ کے اصول میں آپ کے تقدس اور اجتہاد کا منکر بھی کافر ہو، صاحب ”تحفہ“ اس سے بحث نہیں کرتے۔ پس حقیقت میں جو کچھ مجتہد صاحب نے لکھا اس سے صرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ منکر امامت کافر ہے اور چونکہ انکار امامت اصحاب نے نہیں کیا مگر بعد وفات پیغمبر خدا ﷺ کے اس لیے ان کا اس اصول سے کافر ہونا حالت حیات نبوی میں ثابت نہ ہوا اور جب ان کا کفر ثابت نہ ہوا تو جو آیتیں مہاجرین و انصار کی شان میں نازل ہوئی ہیں ان میں بدرجہ اولیٰ ان کا داخل ہونا واضح ہوا، اس لیے ایمان، ہجرت، جہاد، نصرت اور بیعت وغیرہ جو جو باتیں آیتوں میں خدا نے بیان کی ہیں ان سب صفات کا مہاجرین و انصار خصوصاً خلفاء ثلاثہ میں بدرجہ کامل ہونا ثابت ہے۔ پس کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ اس سے خارج ہوں اور اگر یہی خارج ہوں گے تو پھر سوائے ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دو تین اوروں کے خاص احباب کے کون رہے گا اور ساری آیتوں کا اطلاق صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کی شان میں کہنا اور سب مہاجرین و انصار کو اس سے خارج کرنا حقیقت میں صاف قرآن مجید کی تحریف کرنی ہے۔

میں اس موقع پر اس قول کو بھی باطل کیے بغیر چھوڑنا مناسب نہیں سمجھتا جو کہ مجتہد صاحب نے محقق طوسی کا ان کے رسالہ ”قواعد العقائد“ سے نقل کیا ہے، جس کو اوپر ہم نقل کر چکے ہیں اور جس سے انہوں نے اس امر کو ثابت کیا ہے کہ محقق موصوف امامت کو اصول دین

سے سمجھتا ہے سو وہ کیوں کر کفر کو محاربین سے مخصوص کرے گا۔

جواب اس کا یہ ہے کہ اوّل تو محقق کا یہ قول جو انہوں نے رسالہ ”قواعد العقائد“ میں لکھا ہے بہت سے علمائے شیعہ کے مخالف ہے، اس لیے کہ وہ لکھتے ہیں:

((اصولِ ایمان نزد شیعہ سہ چیز ست تصدیق بہ وحدانیت

خدا و تصدیق پیغمبری و تصدیق بہ امامت .))

”شیعوں کے نزدیک اصول ایمان تین چیزیں ہیں: خدا کی وحدانیت کی

تصدیق، پیغمبری اور امامت کی تصدیق۔“

اور اکثر علماء نے لکھا ہے دین کے اصول پانچ ہیں، چنانچہ خود قبلہ و کعبہ نے اپنی کتاب

”ذوالفقار“ میں فرمایا ہے:

((از جملہ اصول مقررہ پیش شیعہ اثنا عشریہ اصول دین

ست کہ عبارت از توحید و عدل و نبوت و امامت و معاد

باشد .))

”بارہ اماموں کے ماننے والے شیعوں کے نزدیک جملہ اصول مقررہ دین یہ

ہیں، (۱) توحید، (۲) عدل و انصاف، (۳) نبوت، (۴) امامت (۵)

آخرت۔“

پس محقق صاحب نے دو اصول یعنی عدل اور معاد کو تو اڑا ہی دیا اور پانچ کو چھوڑ کر تین

کو اختیار کیا تو جب ان کو تین سے ایسی محبت تھی کہ اصول دین کے بھی تین ہی لکھے تو اگر تینوں

خلفاء کو انہوں نے ”مخالفہ فسقہ“ کہہ کر کفر سے خارج کر دیا تو کیا عجب ہے۔

علاوہ بریں یہ قول محقق صاحب کا جو انہوں نے رسالہ ”قواعد العقائد“ میں لکھا ہے

درحقیقت ان کے اس مقولے کو جو تجرید میں لکھا ہے کچھ باطل نہیں کرتا، اس لیے کہ یہ قول کہ

(اصول ایمان نزد شیعہ سہ چیز ست) یہ عام ہے اور وہ قول کہ ”مخالفہ

فسقہ و محاربوہ کفرہ“ خاص ہے، ”وما من عام الا وقد خص“ پس گویا وہ صحابہ جنہوں نے مخالفت کی اس حکم سے مستثنیٰ ہیں اگر کوئی کہے کہ جب تم مجتہد صاحب کی توجیہ کو نہیں مانتے جو انہوں نے ”مخالفوہ فسقہ“ کی نسبت کی ہے تو تم کیوں ایسی توجیہ کرتے ہو..... اس کا جواب یہ ہے کہ اس توجیہ کی ہم سند رکھتے ہیں اور ایک دوسرے محقق شیعہ کے قول سے اس کی تائید ہوتی ہے، یعنی قاضی نور اللہ شوسترے مقولہ محقق طوسی کی تائید میں فرماتے ہیں:

((حضرات شیخین با امیر المومنین علیہ السلام حرب نہ نمودہ اند بلکہ بے زحمت قتال و تکلف استعمال سیف القتال و کثرت خیل الرجال حق اور ابطال نمودند و غصب خلافت رسول متعال از و نمودند.))

”حضرات شیخین نے امیر المومنین سے جنگ نہیں کی بلکہ بغیر شمشیر زنی کے لوگوں کو اپنا کر علیؑ کا حق باطل کر دیا اور خلافت رسولؐ کا حق علیؑ سے غصب کر لیا۔“

پس اگر ان کے نزدیک خلافت کا غصب کرنا خلفاء ثلاثہ کے کفر کا موجب ہوتا تو وہ کیوں کر غصب خلافت کو بے جنگ و جدال کے ثبوت میں عدم کفر مخالفین جناب امیرؑ کے بیان کرتے اور اگر مطلب قاضی نور اللہ کے اس قول کا اور کچھ ہو تو بیان فرمائیے۔ (فعلیکم البیان و علینا دفعہ بالبرہان .)

اگر کوئی کہے کہ جس طرح پر تم توجیہ کے لیے دوسرے محقق کی سند لائے اسی طرح پر جناب قبلہ و کعبہ بھی سند لائے ہیں بلکہ تم تو دوسرے شخص کی سند لائے قبلہ و کعبہ تو محقق طوسی ہی کی دوسری کتاب سے سند لائے ہیں..... اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک ہم دونوں اپنی اپنی توجیہ پر سند لائے ہیں مگر دونوں میں فرق ہے۔ ہماری توجیہ مطابق لفظ اور عبارت اور معنی ظاہری محقق کے ہے اور سند سے اس کی تائید بصراحت ہوتی ہے اور قبلہ و کعبہ کی توجیہ

مخالف لفظ اور عبارت اور ظاہری معنی محقق کے ہے اور سند سے بھی اس کی تائید بصراحت نہیں ہوتی۔ ہم نے جو معنی کہے وہ کھلے ہوئے ہیں اور صاف ظاہر ہیں اور قبلہ و کعبہ نے جو معنی بنائے ہیں وہ ایسے پیچیدہ ہیں کہ قواعد نحو و صرف سے اس کی مطابقت نہیں ہوتی اور اگر شک ہو تو کسی طالب علم عربی خواں کے سامنے دونوں کے معنی رکھ دو اور طالب علم بھی وہ ہو جو نہ سنی ہو نہ شیعہ اور اس سے پوچھو کہ کون سے معنی صحیح ہیں؟ تو ضرور وہ یہ کہے گا کہ یہی معنی صحیح ہیں جو یہ سنی کہتا ہے اور جو معنی مجتہد صاحب فرماتے ہیں وہ ان لفظوں سے نہیں نکلتے۔ ایسے دقیق مضمون کو شاید امام سمجھیں گے اس لیے ”سر من رای“ جا کر امام صاحب سے پوچھو پس جب تک امام صاحب ظاہر نہ ہوں اور مجتہد صاحب کی فہم و فراست اور جودتِ طبع کی تعریف کر کے ان کے بنائے ہوئے معنی کی تصدیق نہ کریں تب تک کوئی بھی ان کے معنی کو تسلیم نہ کرے گا۔

اس بحث کو ہم لکھ چکے اس لیے اب اس قول سے بحث کرتے ہیں کہ اسلام کا اطلاق اصحاب کبار اور خلفاء ابرار پر اصول شیعہ کے مطابق ہوتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ مجتہد صاحب اس کا اقرار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ منکر امامت کافر نہیں ہے، یعنی احکام کفر کے دنیا میں اس پر جاری نہیں ہیں، چنانچہ اس قول کو اوپر ہم نقل کر چکے اور ”جواب ایضا لطافة المقال“ سے اس کی تائید کر چکے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ علماء شیعہ کے نزدیک موافق قول مجتہد صاحب کے تین درجے ہیں:

- ۱۔ ایمان جو پانچوں اصول توحید نبوت امامت عدل اور معاد کا قائل ہو۔
 - ۲۔ کفر، جو ان پانچوں اصول کا یا سوائے امامت کے ایک کا بھی منکر ہو کہ نہ اس پر ایمان کا اطلاق ہو گا نہ اسلام کا۔
 - ۳۔ اسلام، جو فقط امامت کا منکر ہو کہ وہ قیامت میں تو مثل کافروں کے ہو گا مگر دنیا میں اس پر کفر کے احکام جاری نہیں ہیں۔
- غرض ان تین درجوں کے قائم کرنے سے یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو کافر بھی کہنے کا موقع

رہے اور مسلمان کہنے کا بھی، یعنی جب ان کو توحید اور نبوت کے اقرار میں سچا اور اعمالِ حسنہ میں کامل اور دین میں پکا دیکھتے ہیں اور کسی طرح کا نقص ظاہری اعمال میں ان کے نہیں پاتے تو کہتے ہیں کہ وہ مسلمان تھے اور جب ان کو آیاتِ فضیلت کے مصداق سے خارج کرتے ہیں اور ان کو برا کہتے ہیں تب فرماتے ہیں کہ وہ مومن نہ تھے، یعنی اصولِ دین میں اسے ایک اصول یعنی امامت کے منکر تھے اسی واسطے درمیان کفر اور ایمان کے ایک تیسرے واسطے قائم کیا اور اس کا نام ”اسلام“ رکھا۔

اب آگے سینے کہ جب یہ خیال کیا کہ جو شخص اس تفرقے کو سنے گا وہ ہنسے گا اور ایسے اصول قائم کرنے والوں کو احمق کہے گا، اس لیے کہ دین کے پانچ اصول تو قائم کیے اور پانچوں کو برابر کا درجہ دیا اور پھر چار اصول تو ایسے ہیں کہ اگر ان میں سے چاروں کا یا ایک کا بھی کوئی انکار کرے وہ اسلام سے خارج ہو جائے اور کفر کا اس پر اطلاق ہو اور ایک اصول امامت ایسا ہو کہ جس کا منکر نہ کافر ہو نہ مومن بلکہ مسلم رہے اور وہ دائرۃ اسلام سے خارج نہ ہو تو یا تو یہ اصول امامت حقیقت میں اصولِ دین سے نہیں ہے فروع سے ہے یا اگر اصولِ دین سے ہے تو اس کا منکر بھی کافر ہے تو اس سفاہت کے جتانے کے لیے اس کی وجہ اور علت تحریر کرنے پر بحث کی اور اس کا سبب خاص بیان فرمایا ہے جس سے سوائے اس کے کہ سفاہت پر پردہ پڑے اس کی بیہودگی اور دو بالا ہوگئی، چنانچہ اب میں اس وجہ کو بیان کرتا ہوں اور اپنے قول کی تائید کرتا ہوں کہ جناب قبلہ و کعبہ ”ذوالفقار“ میں فرماتے ہیں:

((بنا برورد احادیث بسیار محققین امامیہ در کتب خود تصریح نموده اند کہ مخالفین در عقبی حکم کفار دارند و ہرگز از جہنم بیرون نمی آیند و درین دنیا نیز در احکام کفار شریک اندا ماچوں علام الغیوب می دانست کہ دولتِ باطل بر دولتِ حق پیش از ظہور قائم آلِ محمد غالب خواهد گردید و شیعیان را معاشرت موصلت و معاملت با مخالفان

ضرور خواہد شد دریں دو لتھائی باطل احکام اسلام رابرا ایشاں جاری گردانید کہ جان و مال ایشاں محفوظ بودہ باشد و حکم بہ طہارت ایشاں بہ کنندو ذبیحہ ایشاں را حلال دانند ودختر از ایشاں بخواهند و میراث بایشاں بد ہندواز ایشاں بگیری ند و دیگر احکام اسلام بر ایشاں جاری کنند تا بر شیعیاں کار دُشوار نہ شود در دولت ایشاں و ہر گاہ حضرت صاحب الامر ظاہر شود حکم بت پرستاں رابر ایشاں جاری کندو در ہمہ احکام مثل سائر کفار باشند و این تفضل خداست نسبت بحال شیعیاں زیرا کہ فرق کفار بسیار اند اگر برسُنیان نیز دریں ایام احکام کفار جاری می گردید در امور مسطورہ عسرتے بر شیعیاں می شد کہ مزیدی بر آن متصور نیست .))

” بہ کثرت احادیث کے حوالہ سے شیعہ محققین نے اپنی کتابوں میں صراحت کی ہے کہ مخالفین علیؑ بلحاظ آخرت کافر ہیں جو دوزخ سے ہرگز باہر نہ نکل سکیں گے اور اس دنیا میں بھی وہ کفار کے احکام میں شریک ہیں اور خدا کو معلوم تھا کہ امام صاحب الزمان کے ظہور سے پہلے حکومت حق پر باطل کی حکومت غالب آئے گی اور شیعوں کو اپنے مخالفین سے معاشرتی معاملات کرنے پڑیں گے، اس لیے باطل حکومت کرنے والوں کو مسلمان کہنے کے احکام جاری کر دیے تاکہ شیعوں کی جان و مال محفوظ رہے اور وہ سنیوں کو پاک کہیں ان کے ذبیحہ کو حلال سمجھیں، ان کی لڑکیوں سے شادی کریں، ان کو میراث دیں اور ورثہ لیں اور دوسرے احکام اسلام ان پر جاری کریں تاکہ شیعوں پر سنیوں کی حکومت میں دنیاوی کاروبار تنگ نہ ہوں اور جب امام صاحب الزمان کا ظہور ہو تو سنیوں پر بت پرستوں

کے احکام جاری کریں اور اس وقت سنیوں پر تمام کافروں کی طرح احکام جاری ہوں، شیعوں پر یہ اللہ کا فضل و کرم ہے کیونکہ کافروں کے فرقوں کی اکثریت ہے، اگر اس زمانے میں سنیوں پر کافر ہونے کا حکم لگا دیا جائے تو شیعوں پر دنیاوی عرصہ حیات اس قدر تنگ ہو جائے گا کہ جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔“

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بحیثیت اس کے خدا کو معلوم تھا کہ شیعہ بے چارے ذلیل و خوار رہیں گے اور عزت اور دولت سنیوں کو ملے گی بس اگر سنیوں پر کفر کے احکام جاری کیے جائیں تو بے چارے شیعہ روٹی کہاں سے پائیں گے اور ان کو کھانا کون دے گا اور چونکہ شیعوں کو بہ مجبوری سنیوں کی خدمت گزاری کرنی پڑے گی اور وہ سنیوں کے دست نگر رہیں گے، اگر سنیوں پر کفر کے احکام جاری کر دیے جائیں اور شیعہ ان کو کافر کہنے لگیں تو سارے شیعہ پاک بھوکوں کے مارے مرجائیں گے اور سنی ان کا نان و نفقہ بند کر دیں گے بلکہ غصے میں آکر کافر کہنے پر ان کو جان ہی سے مار ڈالیں گے اور اگر ایسا ہوا تو دین جعفری جاتا رہے گا اور کوئی خدا و رسول کا نام لینے والا دنیا میں نہ رہے گا، گویا خدا کی عبادت حضرات شیعہ کے فنا ہوتے ہی دنیا سے موقوف ہو جائے گی اور چونکہ بے چارے شیعوں کی مظلومیت اور غربت پر خدا کو بڑا رحم ہے اور ان کے حال زار پر اس کو بہت توجہ ہے، اس لیے حضرات شیعہ کے طفیل خدا نے سنیوں کو دنیا میں کفر سے بچایا اور ان کو مسلمان رکھا مگر یہ اسی وقت تک ہے بہ نظر عنایت و مہربانی جب تک کہ امام صاحب الزمان پیدا ہوں جبکہ امام شیعوں کے غار ”سرمن رای“ سے ظہور فرمائیں گے اور بعد چندیں ہزار سال سنیوں کے خوف سے نجات پائیں گے اسی وقت پر کیا ہی دار و مدار شیعوں کا ہے، سلطنت اور حکومت ان کی ہے، کسی کے ہاتھ میں عباس کا علم ہوگا، کسی کے دوش پر امام کا شدار رکھا ہوگا، کوئی ذوالفقار چومنے کے لیے دوڑا جاتا ہوگا، کوئی صواری اور صمصام اپنی کھولتا ہوگا۔ کوئی زرارہ کی غول میں بھاگتا ہوگا، کوئی ہشام اور شیطان الطاق کو ڈھونڈتا ہوگا، پس اس وقت وہ دھوم دھام شیعوں کی ہوگی کہ لوگ محرم کی دسویں کو بھول جائیں گے اور یا امام یا امام کا غل آسمان پر پہنچا دیں گے تو جب ایسے زور و شور

کا امام شیعوں کا ہوگا اور کچھ بھی غرض شیعوں کی ان سے نہ رہے گی، پس اس وقت شیعوں کے امام پکار کر کہہ دیں گے کہ آج اسلام کا حکم تو موقوف ہوا کفر کے اعلانیہ اطلاق کرنے کا زمانہ آگیا اب ہمارے شیعوں کو کوئی کام سنیوں سے نہیں رہا، اس لیے کوئی آج سے کسی سنی کو مسلمان نہ کہے اور اسلام کا لفظ بھی زبان پر نہ لائے، اب ان کو کافر مطلق جانو اور نجس سمجھو اور بت پرستوں کے احکام ان پر جاری کرو نہ ان کے ہاتھ کا ذبیحہ کھاؤ، نہ ان کے ہاتھ کا پانی پیو بلکہ اپنی اپنی ذوالفقار اور حسام نکال کر خوب ان کو قتل کرو، بہت دنوں تک انہوں نے ہمارے شیعوں کو دبایا اور صد ہا برس تک ان سے تقیہ کرایا، انہیں کمبخت سنیوں کے سبب سے ہمارے شیعوں کو جھوٹ بولنا پڑا بلکہ شیعہ کیسے خود ہم اماموں کو سچ بولنا مشکل ہو گیا اور بجزوری ذو جہین بنا پڑا بہت کچھ تکلیف ان کم بختوں نے ہم کو اور ہمارے شیعوں کو دی ہیں، اب خوب بدلہ لو اور مزے سے چین کرو، حکومت کا نقارہ بجاؤ، ذوق و شوق سے سلطنت کرو اور اپنے ہزار برس کے دلی غبار سنیوں سے نکال لو..... پس اے سنیو! خدا کے واسطے شیعوں کا شکر ادا کرو کہ انہی کی بدولت تم کفر سے بچے اور انہیں پر رحم کر کے خدا نے تم کو تا ظہورِ امام کافر نہ گردانا اور اسلام کے احکام تم پر جاری کیے..... اگر شیعہ نہ ہوتے تو یہ لطف تمہارے حق میں خدا ہرگز ہرگز نہ کرنا۔

یہ وجہ جو جناب قبلہ و کعبہ نے عدم اطلاق لفظ کفر کی نسبت سنیوں کے تا ظہور امام بیان فرمائی، اس سے بے شک سارے اعتراض دفع ہو گئے، سنیوں کی سب شیخی جاتی رہی، بھلا کسی سنی کی مجال ہے کہ اس پر کچھ اعتراض کرے اور اسی وجہ کو جو دلائل فلسفہ سے بڑھ کر مدلل ہے رد کر سکے، بے شک ہم ہارے اور مجتہد صاحب جیتے۔

اس تقریر کا جس کی متانت اور استحکام پر اس کے الفاظ و معانی خود شاہد ہیں، ہمارے پاس کچھ جواب نہیں ہے۔ اے حضراتِ امامیہ! تم غور سے سنو اور اس وجہ کو دل میں جگہ دو کہ بہت بڑی باریک بات قبلہ و کعبہ نے فرمائی اور نہایت حکم کی تقریر تم کو سکھلائی ہے۔ مجتہد ہوں تو ایسے اور محقق ہوں تو ایسے کہ جن کی تقریر پر ہر شخص کی زبان سے ”آمنا و صدقنا“ کے

سوا دوسرا کلمہ نہ نکلے اور جن کی بات کو سوائے بجا اور درست کے کوئی رد نہ کر سکے:

اذا قالت ۱ حذام فصد قوها

فان القول ما قالت حذام

جب میں نے صوارم میں مجتہد صاحب کو دیکھا تھا کہ انہوں نے ذوالفقار پر بڑا ناز کیا ہے اور اس کی تقریر و تحریر کو لا جواب تصور فرمایا ہے اور اس کی نسبت یہ بھی ارشاد کیا کہ اب تک کسی نے جواب نہیں لکھا تو مجھے ذوالفقار کے بالاستیعاب دیکھنے کا شوق ہوا تا کہ دریافت ہو کہ وہ حکیمانہ دلیلیں اور فلسفی تقریریں کیا حضرت نے اس کتاب میں بھردی ہیں کہ کسی نے اس کا جواب نہیں لکھا۔ جب اس کو اول سے آخر تک دیکھا تو خدا گواہ ہے کہ میں مبالغے سے نہیں کہتا ہوں کہ اس کے برابر کیا باعتبار عبارت کے، اور کیا بلحاظ مضمون کے، اور کیا بخيال انتشار مطالب اور کیا بوجہ خلط محث اور تقریر لا طائل کے میں نے کسی عالم کی کتاب کو اس سے زیادہ پوچ لچر نہیں پایا اور نظر اٹھا کر دیکھنے کے لائق بھی اسے تصور نہ کیا، اسی واسطے شاید اس وقت تک کسی نے اس کا جواب نہ لکھا ہوگا، اگر کسی کو شکیج ہو تو جس قدر تقریریں اس کتاب کی میں نقل کر چکا ہوں ان کو بخوبی دیکھے اور میرے کلام کی تصدیق کرے۔

اب میں خاص اس وجہ پر جو عدم اطلاق کفر کی نسبت سنیوں کے مجتہد صاحب نے بیان کیا ہے کچھ دو ایک لطفی لکھتا ہوں اور شیعوں کو سناتا ہوں جو شائق ہوں وہ سنیں کہ میں جو کہتا ہوں وہ بڑے کام کی بات ہے اور بہ مقتضائے ”تدان“ سننے کے قابل ہے بس ”ایہا المومنون“ غور سے سنو:

سخن ماشنیدنی دارد

جلوہ مفت ست دیدنی دارد

۱ حذام عرب میں ایک عورت تھی کہ جب وہ کچھ بات کہتی تو اس کے عاشق سنا کرتے تھے اور کچھ زبان سے نہ کہتے، اسی عورت کے حال میں کسی شاعر نے یہ شعر کہا: ”جب کوئی بات حذام کہے اس کی تصدیق کرو اور کچھ نہ بولو کیونکہ بات تو وہی ہے جو وہ کہتی ہے اس کی بات کو کون رد کر سکتا ہے۔“ ۱۲

”ہماری بات سننے کے لائق ہے مفت کا جلوہ ہے جو دیکھنا چاہیے۔“

اول یہ کہ خدا نے سنیوں پر اطلاق اسلام کے لیے صرف یہی وجہ قرار دی ہے کہ ”تاہر شیعہ کا رنگ نہ شود“ (یعنی شیعوں کا معاملہ تنگ نہ ہو جائے) تو اس خدا نے ان کے حال پر ذرا زیادہ رحم کیوں نہ کیا اور سارے بت پرستوں اور کافروں کو ان کا بھائی کیوں نہ بنا دیا اور ان کی خاطر سے جس طرح ایک اصول امامت کے انکار سے باوجود یکہ وہ صریح کفر ہے سنیوں پر اسلام کا اطلاق کیا، کس لیے ان کی خاطر سے پانچوں اصول کے منکر پر لفظ اسلام کا اطلاق نہ فرمایا اس لیے کہ اب اسلام کے معنی وہ تو باقی ہی نہیں رہے جو کہ قرآن اور حدیث میں مذکور ہیں بلکہ یہ ایک اصطلاح جدید مقرر ہوئی ہے (ولا مساحۃ فی الاصطلاح) تو پھر جس طرح پر کہ باوجود کفر کے اور ”مخلد فی النار“ ہونے ان کے شیعوں کے اوپر مہربانی کر کے ان کے اوپر اسلام کا اطلاق کیا اسی طرح پر اور کافروں پر بھی اس لفظ کے اطلاق کی اجازت دیتا تا کہ شیعوں کا دائرہ کار اور بھی زیادہ وسیع ہو جاتا۔

دوسرے، شیعوں کی خاطر سے تا ظہور امام محرمات کو حلال کیوں نہ فرمایا؟ ”تا کار بر شیعیان تنگ نہ شود“ جب ان کی خاطر پر ہی کفر و اسلام کا اطلاق ٹھہرا اور خدا نے اپنے آپ کو انہیں کے اختیار میں دے دیا تو مناسب تھا کہ ان کے لیے سب چیزوں کو حلال کر دیتا کہ وہ خوشی سے شراب ارغوانی کے جام کے جام اڑاتے اور زنانہ پارہ کے ساتھ ہم بستر ہو کر خوب ذوق و شوق سے حرام کرتے، سارے دنیا کے مال و متاع کو ان کے لیے حلال کرتا کہ جس کے گھر سے جو چاہتے لے جاتے اور خوب لوٹ مار کر کے اپنی معیشت کے دائرے کو وسیع کرتے، سب جانوروں کو اگرچہ خوک ہی کیوں نہ ہو ان کے لیے حلال کر دیتا تا کہ وہ خوب مزے سے نوش فرماتے اور بے چارے کسی بات کی تکلیف نہ اٹھاتے، نماز کو ان کے اوپر سے ساقط کر دیتا، روزے کو ان پر واجب نہ فرماتا تا کہ بے چارے کسی بات کی ذرا تکلیف نہ پاتے۔ اگرچہ میں نے اپنے نزدیک اس کو نہایت ہی عجیب اور ناممکن تصور کر کے لکھا ہے مگر حقیقت میں بہت سی باتوں کو حضرات شیعہ نے اپنے لیے حلال کر رکھا ہے، دیکھو

پانچ نماز کے بدلے تین وقت ہی پڑھتے ہیں دو وقت کی تکلیف سے محفوظ ہیں، نکاح کی قید سے آزاد ہی ہو گئے ہیں، متعہ کی بدولت خوب چین سے جس کو چاہتے ہیں رات بھر کی اجرت دے کر اپنے صرف میں رکھتے ہیں اور خدا کا شکر ادا کرتے ہیں لیکن بہتر ہو کہ وہ امام کے ظہور تک شریعت کی سب قیدیں جو تھوڑی بہت رہ گئی ہیں اڑادیں اور خاصے ملحد بن جائیں اور اگر کوئی اعتراض کرے تو اپنے قبلہ و کعبہ کا قول نقل کر دیں کہ ”این تفضل خداست نسبت بحال شیعیان .“

تیسرے: اگر حقیقت میں خدا نے صرف شیعوں کے حال پر رحم کر کے سنیوں کو ظاہری کفر سے بچایا تو قید زمانہ ظہورِ امام کی بے جا ہے بلکہ ظہورِ مجتہد کی قید کافی تھی اور خدا کو یہ کہہ دینا کافی تھا کہ جب تک کسی مجتہد کا ظہور نہ ہو تب تک یہ حکم ہے، ورنہ جب کسی خطے میں زمین کے اس قدر عزت شیعوں کو ہو جائے کہ مجتہد صاحب مسند اجتہاد پر بیٹھ جائیں اور دو چار ہزار دنیا طلب ان کے گرد حاضر ہو جائیں اور وہ سنیوں کے رد میں کتابیں بھی لکھنا شروع کر دیں تب یہ حکم موقوف کر دیا جائے، اس لیے کہ (اذا فاسد العلة فاسد المعلول) جب علت ختم ہو تو معلول بھی ختم ہو جاتا ہے۔ پس تعجب ہے کہ لکھنؤ اور ایران میں یہ حکم کیوں اب تک جاری نہ ہوا اور ظہورِ امام کے لیے وہاں کس کا انتظار رہا۔ جبکہ مجتہد صاحب نے ”ذوالفقار“ کو دارالسلطنت لکھنؤ میں لکھ کر مشتہر کیا تھا اس وقت تو ان کو ایسی بات زبانا نہ تھی اس لیے کہ جو زور تشیع کا ان کے وقت میں وہاں تھا اس سے زیادہ ہونا تو کبھی ممکن ہی نہیں ہے، اس لیے کہ ان کو لکھنؤ میں یہ حکم جاری کر دینا تھا لیکن حقیقت میں انہوں نے جاری کر دیا تھا گو کتاب میں صاف نہیں لکھا مگر سنیوں کے کفر اور نجاست کا فتویٰ دے دیا تھا، یہ حال لکھنؤ میں ہو گیا تھا کہ اگر کوئی سنی کسی شیعہ پاک کے فرش پر جاتا تو وہ اس وقت دریا پر اس کو دھونے کے لیے بھیج دیتا اور ان کے یہاں کے کھانے پینے کو حرام اور ناپاک سمجھتا۔ پس حقیقت میں حضرت کا یہ فرمانا:

((حکم بطہارت ایشان بکنید و دیگر احکام اسلام برایشان

جاری کنید .))

”ان کو پاک سمجھو اور ان پر اسلام کے احکام جاری کرو۔“

فقط کتاب کی زنیت دینے کے لیے ہے نہ کہ عمل کرنے کے لیے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیعوں کے مجتہد ٹھیک ٹھیک عیسائیوں کے پوپ اور پادریوں کے مطابق ہیں، جس طرح وہ اپنے آپ کو معصوم جانتے ہیں اور شریعت کے سارے احکام کے رد و بدل پر اختیار رکھتے ہیں وہی حضرات مجتہدین کا حال ہے کہ احکامِ نبویؐ کو اپنے اختیار میں سمجھتے ہیں جو چاہا وہ حکم دیا، جب چاہا کفر کا اطلاق کر دیا، جب چاہا اسلام کا حکم دیا، چونکہ خدائی ان کے اختیار میں ہے، اس لیے جو چاہیں سو کریں اور جو دل میں آئے وہ فرمائیں، قیامت کو اس کا حال معلوم ہوگا، ہم ہوں گے اور مجتہد صاحب کا گریبان۔

چوتھے: مجتہد صاحب نے اپنی تقریر میں میراث کے باب میں فرمایا:

((میراث بایشان بدھند و ازیشان بگیری ند .))

”ان (سنیوں) کو میراث دیں اور ان سے میراث لیں۔“

اور نکاح کی نسبت کہا:

((دختر از ایشان بخوہند اور براہ دیانت دختر بایشان

بدھند .))

”ان سے لڑکی لیں اور دیانت داری سے ان کو لڑکیاں دیں۔“

کے کہنے سے شرم فرمائی، گویا سنیوں کو لڑکی دینا جائز نہیں ہے کہ اس کی شاعت کا حال اس شخص پر ظاہر ہو سکتا ہے جو ہماری کتاب کے چند ورق الٹ کر بحث نکاح ام کلثومؑ کو دیکھے۔

یہ بحث جو میں نے لکھی اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ مجتہد صاحب ایمان کا اطلاق اصحابِ ثلاثہؓ پر نہیں کرتے بلکہ ان پر ”اسلام“ کا اطلاق کرتے ہیں اور اسی کے ثبوت میں بہت سی سندیں لاتے ہیں مگر حقیقت میں ان کا یہ قول بھی غلط ہے اور انہیں کے محققین اور محدثین نے اس کو باطل اور غلط قرار دیا ہے۔ پس تعجب ہے کہ حضرت مجتہد صاحب سے کہ نہ

اس کو دیکھا اور نہ اسے نقل کیا اور خلاف اپنے پیشواؤں کے ”اسلام“ کا اطلاق کیا۔ افسوس! ہے کہ اپنے تشیع میں بھی کامل نہیں ہیں اور اپنے اصول سے بھی اچھی طرح واقف نہیں ہیں اور کتاب لکھنے پر مستعد ہیں اور ناحق اپنے اہل مذہب کو اپنی پوچ تفریروں سے اور رسوا کرتے ہیں۔ و نعم ما قیل:

((در کفر ہم کامل نہ زنا ررار سوا مکن .))

”کفر میں یکے نہیں ہوزتار کور سوامت کرو۔“

اب اس قول کو سنیے جو علماء اعلام شیعہ نے اس باب میں لکھا ہے اور نہ وہ علماء مثل ملا عبداللہ کے ہیں جس سے حضرت مجتہد صاحب انکار کریں نہ وہ ایسے گمنام ہیں کہ جن کے نام سے واقف نہ ہوں بلکہ اس علامہ اور محقق کی سند پیش کرتا ہوں جس کے علم و اجتہاد کا انکار گویا امامت کا انکار ہے اور اس کے تقدس کا اقرار گویا دین کا چھٹا اصول ہے، وہ کون ہیں جناب فضیلت مآب جامع معقول و منقول حاوی فروع و اصول، فاضل محقق، خبیر مدقق جناب ملا باقر مجلسی علیہ الرحمہ کہ وہ حدیث ارتداد صحابہ کو ”کافی“ سے نقل کر کے فرماتے ہیں:

((بیان قوله عليه السلام من ان یرتد و اعن الاسلام ای عن

ظاہرہ و التکلم بالشہادتین الی قوله ولیاتے ان الناس ارتد و

الاثلاثہ لان المراد منها ارتد و اوهم عن الدین واقعا و هذا

محمول علی بقائهم علی صورة الاسلام و ظاہرہ و ان كانوا

فی اکثر الاحکام الواقعیة فی حکم الکفار و قص هذا بمن لم

یسلم علی امیر المومنین علیہ السلام ولم یبغضه ولم

یعاده فان من فعل شیئاً من ذلك فقد انکر قول النبی صلی

الله علیہ وسلم و کفر ظاہراً ایضاً ولم یبق له شیء من احکام

الاسلام و وجب قتله .))

”امام کے قول کی وضاحت کہ وہ (اصحاب) اسلام سے پھر گئے یعنی ظاہر اسلام

سے اور کلمہ پڑھنے سے، الٰہی قولہ، کہ تین کے علاوہ سب مرتد ہو گئے کیونکہ اس کا مطلب ہے کہ وہ واقعی طور پر دین سے منحرف ہو گئے۔ اور یہ اس پر محمول ہے کہ وہ اسلام کی صورت اور ظاہر پر باقی اور قائم تھے اگرچہ اکثر حقیقی احکام میں وہ کفار کے حکم میں تھے۔ اور اسی سے سمجھ لو کہ جس نے امیر المؤمنینؑ کی امامت کی نص نہیں سنی اور ان سے بغض و عداوت نہ رکھی (تو وہ ظاہراً مسلمان ہے اور حقیقتاً کافر) اور اگر کسی نے ان سے بغض و نفرت رکھی تو تو اس نے نبی ﷺ کے قول کا انکار کیا اور ظاہراً بھی کافر ہو گیا اور اس کے لیے اسلام کے احکام باقی نہ رہیں گے اور اس کا قتل واجب ہے۔“

خلاصہ مطلب اس کا یہ ہے کہ جن اصحاب نے پیغمبر خدا ﷺ نے نص خلافت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو نہیں سنا اور نہ ان کے ساتھ دشمنی رکھی ان پر اسلام کے احکام جاری ہیں گو بہ سبب بیعت خلفاء کے اکثر حقیقی احکام میں کفار کے احکام میں داخل ہیں مگر جس نے نص نبوی کو سنا ہے یا حضرت علیؑ سے دشمنی رکھی ہے وہ ظاہر میں کافر ہو گیا اور کوئی حکم احکام اسلام سے اس کے حق میں باقی نہ رہا اور اس کا مسلمان کہنا جائز نہیں ہے اور اس کا قتل کر دینا واجب ہے۔

اگر کسی کو یہ شک ہو کہ ملا باقر مجلسی نے ایسا فرمایا ہوتا تو کیوں کر مجتہد صاحب پھر اس کے خلاف خلفاء پر اسلام کا اطلاق کرتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا کام اس روایت کی تصحیح کرنا ہے اور تمہارا کام ہے اس کا تصفیہ کرنا کہ مجتہد سچے ہیں یا ملا باقر مجلسی حق پر ہیں۔ ہم نے جو کچھ لکھا ہے سو اس کی تصدیق ہم سے سنو کہ اسی حدیث کو صاحب ”استقصاء الافحام“ ”منتھی الکلام“ کے جواب میں نقل کر کے فرماتے ہیں:

((اگر غرض از نقل این عبارت محض اثبات این معنی ست کہ صاحب بحار ثلاثہ و اتباع ایشاں را کافر میداند پس البتہ این معنی بسر و چشم مقبول است اصلاً جای استنکاف و

انکار نیست .))

”اگر اس عبارت کے نقل کرنے کی غرض یہ ہے کہ اصحابِ ثلاثہؓ اور ان کے تبعین کو صاحب ”بحار الانوار“ کافر جانتا ہے تو یہ معنی سر آنکھوں پر منظور و مقبول ہیں اور اس مضمون سے ہرگز کسی قسم کا عار اور انکار نہیں ہے۔“

اور بحار الانوار ترجمہ فارسی کی عبارت یہ ہے:

((ایس حکم یعنی بقای ظاہر اسلام مخصوص بکسی ست کہ از رسولِ خدا ﷺ نص بر خلافت امیر علیہ السلام نشنیدہ و بغض و عداوت آنحضرت نداشتہ چہ مرتکب این امور منکر قولِ پیغمبر ﷺ ست و بحسب ظاہر ہم کافر ست و ہیچک از احکام برای او ثابت نیست و قتلش واجب ست .)) انتھی بلفظہ .

”یہ حکم یعنی ظاہری اسلام پر باقی رہنا اس شخص کے لیے ہے جس نے امیر المؤمنینؓ کی خلافت پر رسول اللہ ﷺ کی نص نہ سنی ہو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض و عداوت نہ رکھتا ہو، کیونکہ ان امور کا مرتکب پیغمبر ﷺ کے قول کا منکر ہے اور ظاہری اعتبار سے بھی کافر ہے اور اسلام کا کوئی بھی حکم اس کے لیے ثابت نہیں، اس کا قتل واجب ہے۔“

غرض کہ اگر حضراتِ شیعہ انصاف کریں اور تعصب و عناد کو دخل نہ دیں تو جناب قبلہ و کعبہ کے تقدس و دیانت پر افسوس کریں کہ حضرت نے سارے اقوال جو اس مقام کے مفید تھے نقل کیے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا:

((دَر دَارِ دُنْیَا احْکَامِ اِسْلَامِ بَر اَیْنِهَا جَارِی مِی شُود گُودر دَارِ

آخِرْتِ مَخْلُودِ بِنَارِ خَوَاهِد بُوَد .))

”دنیا میں تو ان (اصحابِ رضی اللہ عنہم) پر اسلام کے احکام جاری ہوں گے لیکن

آخرت میں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں جائیں گے۔“
اپنے امام اور علامہ کے قول کو نقل نہ کیا جس سے اسلام ظاہری سے اطلاق کرنا بھی
خلفاء پر نادرست ہے بلکہ کفر ہے۔ عجب حال ہے حضرات شیعہ کا کہ کسی بات پر ثابت قدم
نہیں رہتے اور ایک کلمے پر قائم نہیں رہتے، کبھی کہتے ہیں کہ اصحاب و خلفاء مسلمان تھے ظاہر
میں ان پر احکام اسلام کے جاری تھے، کبھی فرماتے ہیں کہ وہ کافر مطلق تھے اور ان کا قتل کرنا
واجب تھا، خدا اس قوم کو اپنے عدل کا مزہ چکھائے اور جو کچھ خرابی دین محمدی کی انہوں نے کی
ہے اس کا بدلہ لے۔

ایہا المومنون! ذرا ”ذوالفقار“ کو اٹھا کر دیکھو کہ اس میں اجرائی احکام ظاہری
اسلام کا خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی نسبت کس زور و شور سے دعویٰ کیا ہے اور پھر ”بحار الانوار“ اور
”استقصاء“ کو دیکھو کہ انہوں نے انکار کفر کس صفائی سے ظاہر کیا ہے اور اپنے اس اختلاف کی
خود داد دو۔

((فاعتبروا یا اولی الابصار وانظر والی ہولاء الکبار لانہم

فی کل وادیہمون و فی کل تہ یتہون تلک آیات اللہ نتلوھا

علیک بالحق فبای حدیث بعد اللہ وایاتہ یومنون .)) ❶

جو کچھ ہم نے اب تک بیان کیا اس سے یہ ثابت ہوا کہ علماء شیعہ کفر و اسلام میں
صحابہ رضی اللہ عنہم کے مختلف ہیں، یعنی ان پر کچھ ”اسلام“ کا اطلاق کرتے ہیں اور اکثر کفر کا اطلاق
کرتے ہیں وہ بھی صرف بہ نظر ترحم حال شیعیان علیؑ کے اور بیان میں کفر و اسلام کو برابر سمجھتے
ہیں، اس لیے اب ہم اس سے بحث کرتے ہیں کہ ان پر کفر کا اطلاق کس وجہ سے ہے، آیا اس
وجہ سے کہ وہ توحید کے منکر تھے، خدا کو ایک نہ جانتے تھے۔

❶ پس غور کرو اے صاحبانِ بینائی اور دیکھو ان بڑوں کی طرف تحقیق وہ لوگ ہر جنگل کے بیچ گھومنے والے ہیں اور
ہر میدان کے بیچ پھرنے والے ہیں، یہ باتیں ہیں اللہ کی ہم سناتے ہیں تجھ کو ٹھیک پھر کون سی بات کو اللہ اور اس کی
باتیں چھوڑ کر مانیں گے۔ ۱۲

لات و عزیٰ کی عبادت کرتے تھے، ابو جہل و ابولہب وغیرہ کے مثل بت پرست تھے۔ یا نبوت کے منکر تھے، پیغمبر ﷺ کو سچا نبی نہ جانتے تھے بلکہ اور کافروں کی طرح ایمان میں ان کی تکذیب کرتے تھے یا صرف امامت کے منکر تھے اور توحید و نبوت میں کامل تھے۔ پس ہم تینوں صورتوں سے علیحدہ علیحدہ علاحدہ بحث کرتے ہیں۔

بعض علماء شیعہ تینوں امروں کا دعویٰ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حقیقت میں خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم اول ہی سے ایمان نہیں لائے اور خدا کی توحید اور پیغمبر ﷺ کی نبوت کے سچے دل سے معتقد نہیں ہوئے۔ چنانچہ یہ امر شیعوں کے نزدیک مسلمات سے ہے اور اس پر سند لانے کی کچھ حاجت نہیں ہے اور خود مجتہد صاحب ”ذوالفقار“ میں جا بجا ”از ۱۰ امر از ایمان بھرہ نداشت“ کا لفظ تحریر فرماتے ہیں۔

اس کے جواب میں جو کچھ ہم کو لکھنا تھا وہ اوپر بحث ایمان شیخین رضی اللہ عنہم میں لکھ چکے اب انہی تقریروں کا اعادہ نہیں کرتے لیکن علاوہ ان دلیلوں کے ان کے ایمان کو اور دلائل سے ثابت کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ جو دعویٰ نفاق کا بہ نسبت صحابہ رضی اللہ عنہم کے حضرات شیعہ نے کیا ہے وہ باطل ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے منافق نہ ہونے کا اثبات دلائل سے:

دلیل اول:..... یہ تو ظاہر ہے کہ خلفاء ثلاثہ اور صحابہ کبار رضی اللہ عنہم جمعین ظاہر میں مسلمان تھے اور توحید و نبوت کا اقرار کرتے تھے، پس ان کے ظاہری ایمان سے تو انکار ہو ہی نہیں سکتا، باقی رہا یہ کہ دل میں توحید اور نبوت کے منکر تھے اور اس وجہ سے وہ منافق تھے تو اس کا ثبوت دینا چاہیے ورنہ ہر خارجی اور ناصبی جناب امیر علیہ السلام کی نسبت ”وحاشا جنابہم عن ذالک“ بھی کہہ سکتا ہے پس جس طرح پر تم ان خارجیوں کو جواب دو گے اور جس طرح سے جناب امیرؓ کے ایمان کو ثابت کرو گے وہی ہماری طرف سے صحابہ رضی اللہ عنہم کے حق میں سمجھو۔

دلیل دوم:..... اگر صحابہ رضی اللہ عنہم منافق ہوتے جیسا کہ جاہ مجتہد صاحب اور ان کے

بزرگوں نے دعویٰ کیا ہے تو ضرور ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ ان سے بیزاری کرتے اور ان کو اپنے مشورے اور صلاح میں شریک نہ کرتے اور جہاں اور لڑائیوں میں ان کو اپنے ساتھ نہ لیتے اور ہجرت میں اپنا شریک نہ کرتے اور خدا بھی ان سے بیزاری کا حکم دیتا اور پیغمبر ﷺ کو ان کی صحبت سے منع کر دیتا اور ان کے اوپر جہاد کا حکم کرتا اور ان کو بدترین وقت کی حالت پر پہنچاتا، اس لیے کہ خدا نے منافقین کے حق میں ایسا ہی فرمایا ہے اور ایسا ہی کیا ہے اور افسوس ہے کہ جناب قبلہ و کعبہ نے ”ذوالفقار“ میں بعض ان آیات کو خود ہی نقل کر کے ہماری طرف سے جواب دیا ہے، چنانچہ جو آیتیں شاہ صاحب نے ”تحفہ“ میں فضائل صحابہ رضی اللہ عنہم میں لکھی ہیں ان کے معارضے میں وہ آیتیں جو کہ منافقین کی شان میں ہیں جناب قبلہ و کعبہ نے پیش کیں اور یہ نہ خیال کیا کہ انہی آیتوں سے ان کا دعویٰ غلط ہوتا ہے اور خدا ان کو اپنے کلام سے جھوٹا کرتا ہے، چنانچہ منجملہ ان آیتوں کے ایک آیت یہ ہے:

﴿مِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ
سَنُعَذِّبُهُمْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّونَ إِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيمٍ ۝﴾

(سورہ توبہ: ۱۰۱)

”بعض مدینے والے اڑ رہے ہیں نفاق پر تو ان کو نہیں جانتا ہم کو معلوم ہیں ان کو

عذاب کریں گے دوبار پھر پھیرے جائیں گے بڑے عذاب میں۔“

اب خدا کے لیے اس آیت میں لفظ ﴿مِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ﴾ کا خیال کرو اور سوچو کہ اس آیت کا مضمون خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم جو کہ مکہ کے رہنے والے تھے کیوں کر صادق ہوگا۔ علاوہ بریں خدا اس آیت میں خبر دیتا ہے کہ وہ دو مرتبہ عذاب دیے جائیں گے اور ظاہر ہے کہ اس سے مراد عذاب دنیاوی ہے تو سوائے منافقین کے جن کا حال کھل گیا اور جو مارے گئے اور ذلیل ہو گئے اس آیت کا مضمون صحابہ کبار رضی اللہ عنہم پر کیوں کر صادق ہوگا۔ اس کے علاوہ آیت میں خدا فرماتا ہے کہ ﴿لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ﴾ تو ان کو نہیں جانتا بلکہ ہم جانتے ہیں، حالانکہ موافق اصول اور روایات شیعہ کے پیغمبر خدا ﷺ کو خلفاء ثلاثہ کے نفاق کا حال

معلوم تھا جیسا کہ ہم اوپر حدیث سے بروایت ”زاد المعاد“ نقل کر آئے ہیں اور جس سے ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے ان کے نفاق کا حال حذیفہؓ صحابی سے بھی کہہ دیا تھا۔ ایک دوسری آیت مجتہد صاحب معارضے میں فضائل صحابہ رضی اللہ عنہم کے اپنی ”ذوالفقار“ میں لکھتے ہیں:

﴿لَوْ لَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ

عَظِيمٌ﴾ (سورہ انفال: ۶۸)

”اگر نہ ہوتی ایک بات کہ لکھ چکا اللہ آگے سے تو تم کو پڑتا اسے لینے میں بڑا عذاب۔“

اس آیت کی ہم اوپر تشریح کر چکے ہیں مگر اب اور زیادہ تصریح کے ساتھ بیان کرتے ہیں..... یہ آیت درحقیقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں ہے، اس لیے کہ بدر کی لڑائی کے فتح ہونے کے بعد بیشتر کافر قید ہوئے تو پیغمبر خدا ﷺ نے مشورہ کیا کہ ان قیدیوں کی نسبت کیا کیا جائے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اور سعد بن معاذ انصاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قتل کیے جائیں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ فدیہ لیا جائے، چنانچہ حضرت نے فدیہ لیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس کی تصدیق خود مفسرین شیعہ کرتے ہیں۔

پہلا ثبوت: علامہ طبرسی اپنی تفسیر ”مجمع البیان“ میں فرماتے ہیں:

((قال عمر بن الخطاب يا رسول الله كذبوك و اخرجوك

فقدمهم و اضرب اعناقهم و مكن علياً من عقيل فيضرب عنقه

و مكنى من فلان اضرب عنقه فان هؤلاء ائمة الكفر و قال

ابوبكر اهلك و قومك خذ منهم فدية يكون لناقوة على الكفار

قال ابن زيد فقال رسول الله ﷺ لئن نزل عذاب من السماء ما

نجامنكم غير عمر بن الخطاب و سعد بن معاذ.))

”حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پیغمبر خدا ﷺ سے کہا کہ یا رسول اللہ! ان کافروں نے

آپ کو جھٹلایا اور آپ ﷺ کو مکے سے نکالا ان کی گردنیں مارنا چاہئیں، عقیلؓ کو علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کرو کہ وہ اسے مارے اور فلاں شخص کو میرے سپرد کرو کہ وہ میں اسے قتل کروں، کیونکہ یہ سب کفر کے پیشوا ہیں اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ سب آپ ہی کی قوم کے لوگ ہیں، ان سے فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دینا چاہیے، چنانچہ وہ چھوڑ دیے گئے۔ ابن زید کہتا ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا: اگر عذاب نازل ہوتا تو سوائے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے کوئی نجات نہ پاتا۔“

دوسرا ثبوت:..... کاشانی تفسیر ”خلاصۃ المنہج“ میں لکھتا ہے:

((روز بدر ہفتادتن اسیر شدند حضرت درباب ایشاں با اصحاب مشورہ کرد ابوبکرؓ کہ از مهاجرین بود گفت یارسول اللہ صلی اللہ وآلہ وسلم اکابروا صاغرا این قوم اقارب و عشائر تو اند، اگر هر يك بقدر طاقت و استطاعت فداى بدهد باشد کہ روزے بدولت اسلام برسد.....)) الخ

”بدر کے دن ستر (کافر) قید ہوئے، حضرت ﷺ نے ان کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا، ابوبکرؓ نے جو کہ مهاجرین میں سے تھے کہا کہ اے اللہ کے رسول! یہ چھوٹے بڑے آپ ہی کی قوم کے ہیں، اگر ہر ایک بقدر طاقت و حیثیت فدیہ دے دے اور وہ چھوٹ جائے تو ہو سکتا ہے کہ کسی دن اسلام لے آئیں۔“

اے مومنین! تم کو دل سے اپنے مجتہد صاحب کے تبحر اور فضیلت کی داد دینی چاہیے کہ معارضہ میں فضائل صحابہ رضی اللہ عنہم کے وہ آیت پیش کی جس سے اور بھی فضیلت خلیفہ ثانی کی ثابت ہوگئی، سچ ہے ((الحق یعلو! ولا یعلی .)) شعر.....

عدو شو سبب خیر گر خدا خواهد
خمیر مایہ دوکان شیشہ گر سنگ ست

اس آیت کے معارضہ میں پیش کرنے سے ہم بھی دل و جان سے اس کا شکر ادا کرتے ہیں اور ان کے تقدس اور فضیلت کی داد دیتے ہیں لیکن اگر ان کے کسی مقلد کو صرف تفسیر ”مجمع البیان“ کی ایک روایت پر سیری نہ ہو اور وہ اس کی تائید میں دوسری روایت کا طالب ہو تو بسم اللہ ہم دوسری سند اسی قول کی تائید میں ایک بڑے شیعہ عالم فاضل کی پیش کرتے ہیں۔
تیسرا ثبوت:..... ابن جمہور صاحب ”غوالی اللالی“ جو اکابر امامیہ میں علم و فضل میں مشہور ہیں، روایت کرتے ہیں:

((ان النبی ﷺ اخذ سبعین اسیراً یوم البدر و فیہم العباس و عقیل بن عمہ فاستشار ابابکرؓ فیہم فقال و قومک و اهلك و استبقہم لعل اللہ یتوب علیہم و خذ الفدیة لقوی بہا احبابک فقال عمر نبذوک و اخرجوک فعذبہم و اضرب اعناقہم فانہم ائمة الکفر و لا تاخذہم الفداء مکن علیاً من عقیل و حمزة من العباس و مکنی من فلان و فلان فقال ﷺ ان اللہ یلین قلوب رجال حتی تكون الین من اللبن و یقسی قلوب رجال حتی تكون اشد من الحجارة فمثلك یا ابابکر مثل ابراهیم اذ قال فممن تبعنی فانه منی و من عصانی فانک غفور الرحیم و مثلك یا عمر مثل نوح اذ قال رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا۔ ثم ان شئتم قتلتم و ان شئتم فادیتم و یستشهد منکم بعدتہم فقالوا بل ناخذ الفداء ما استشهد بعدتہم فاخذ كما قال صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم .))

”نبی ﷺ نے بدر میں ستر لوگوں (کافروں) کو قیدی بنایا جن میں آپ کے چچا عباسؓ اور چچا زاد بھائی عقیل بھی تھے۔ ابوبکرؓ سے ان کے بارے میں آپ ﷺ نے مشورہ لیا تو انہوں نے کہا کہ یہ آپ کے گھر اور آپ کی قوم کے لوگ ہیں ان کو مارے مت، شاید اللہ ان کو ایمان کو توفیق دے دے، آپ ان سے فدیہ لے لیں اس سے آپ کو قوت ملے گی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: انہوں نے آپ کو چھوڑا اور (وطن سے) نکالا ان کو سزا دیجئے اور گردنیں مار دیجئے یہ کافروں کے پیشوا ہیں فدیہ نہ لیجئے عقیلؓ کو علی رضی اللہ عنہ کے اور عباسؓ کو حمزہؓ کے حوالے کیجئے اور فلاں فلاں کو مجھے دیجئے (تا کہ ان کو قتل کریں) حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے دل دودھ سے زیادہ نرم کر دیتا ہے اور بعض کے دلوں کو پتھر سے زیادہ سخت کر دیتا ہے۔ اے ابوبکر! تمہاری مثال ابراہیم علیہ السلام کی سی ہے انہوں نے کہا تھا کہ جو میری پیروی کرے وہ میرا ہے اور جو میرا کہنا نہ مانے تو تو معاف کرنے والا رحم والا ہے۔ اور اے عمر! تمہاری مثال نوح علیہ السلام کی سی ہے کہ انہوں نے کہا اے اللہ! زمین پر کوئی کافر بسنے کے لیے نہ چھوڑ، پھر اگر تم چاہو تو قتل کر دو یا فدیہ لے لو، صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہم فدیہ لیں گے، چنانچہ فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دیا گیا۔“

اس علامہ کی تحریر کا جو بلفظہ نقل کی گئی اصل مطلب تو وہی ہے جو اوپر ”مجمع البیان“ سے منقول ہوا مگر اس عالم نے اتنا اور زیادہ کر دیا ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی باتوں کو سن کر کہا کہ خدا کی شان ہے کہ بعضوں کے دلوں کو تو مثل دودھ کے نرم کر دیتا ہے اور بعضوں کے دلوں کو پتھر کی طرح سخت کر دیتا ہے اور یہ کہہ کر حضرت ﷺ نے فرمایا کہ اے ابوبکر! تیری مثال ابراہیم علیہ السلام کی سی ہے کہ انہوں نے خدا سے کہا کہ جو میری اطاعت کرتا ہے وہ مجھ سے ہے اور جو نافرمانی کرتا ہے سو بخشے والا مہربان ہے اور اے عمر! تیری مثال نوح علیہ السلام کی سی ہے کہ انہوں نے خدا سے کہا کہ اے پروردگار!

زمین میں کسی کافر کو نہ چھوڑ۔

پس اے حضراتِ مومنین! جن کو تمہارے مجتہدین منافق کہتے ہیں وہ ایسے منافق تھے کہ اپنے باپ بھائیوں کو خدا کے لیے قتل کرنے پر مستعد تھے اور قتل کرتے تھے اور پیغمبر خدا ﷺ اُن کی تمثیل پیغمبروں سے دیتے تھے، شان ہے خدا کی کہ ایسے لوگوں کو منافق کہتے ہیں، منافق کچھ بھی شرم و حیا کا خیال نہ کریں اور جنہوں نے کفر و نفاق کی جڑ عرب سے کھودی انہیں کو کافر اور منافق کہیں:

﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُوا إِلَّا كَذِبًا﴾

(سورہ کہف: ۵)

”کیا بڑی بات ہو کر نکلتی ہے ان کے منہ سے سب جھوٹ ہے جو کہتے ہیں۔“

اگر اس روایت پر بھی سیری نہ ہو اور فارسی خواں شیعہ کسی فارسی تفسیر سے اس روایت کی تصدیق چاہیں تو بفضلہ تعالیٰ وہ بھی حاضر ہے۔

چوتھا ثبوت:..... ”کنز العرفان“ سے شیعوں کے علامہ رازی نے اپنی تفسیر میں اس مضمون کو ان لفظوں سے نقل کیا ہے:

((روایت ست کہ در روز بدر هفتاد تن اسیر گرفته بودند از انجمله عباس و عقیل بودند حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دربا ایشاں باصحاب مشورہ فرمود ابوبکرؓ گفت کہ اکابر و اصاغر این قوم اقارب و عشائر تو اند اگر هر يك بقدر طاقت و استطاعت فدائے بدهند باشد کہ روزے بهدایت برسند و حالا عدد و مدد مسلمانان زیادہ شود، عمر^{رض} گفت یارسول اللہ ایناں تکذیب کردند ترا و بیروں کردند اینها ائمہ کفر اند همه را بفرمائی تاگردند زنند و مگیر از یشاں فدیہ عقیل رابعلی سپار و عباس رابحمزہ و فلاں رابمن تاگردن

زَنِيمَ اَنْحَضْرَتِ ﷺ فَرَمُوْدَ كِه حَقِّ سَبْحَانَ وَ تَعَالَى دِلْهَائِي
 مَرْدَمِ رَا اَكَاہِ اسْتِ كِه نَرْمِي سَازْدِ وَ بَمَرْتَبِه كِه نَرْمِ تَرَا زِ شِيْر
 سْتِ وَ دِيْكَرِ دِلْهَامِي بَاشْد كِه سَخْتِ تَرَا زِ سَنَكِ اسْتِ مِثْلِ تُو
 اَمِ اِبَا بَكْرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ مِثْلِ اِبْرَاهِيْمِ عَلَيْهِ السَّلَامِ سْتِ كِه
 كَفْتِ ﴿فَمَنْ تَبِعَنِي فَاِنَّهُ مِنِّي وَمَنْ عَصَانِي فَاِنَّكَ عَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾
 وَ مِثْلِ تُو اَمِ عَمْرٍ هَمْچُو مِثْلِ نُوْحٍ سْتِ وَ قَتِيكِه كَفْتِ ﴿رَبِّ
 لَا تَذَرْ عَلَيَّ الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دِيَّارًا﴾ .))

”روایت ہے کہ جنگ بدر میں ستر آدمیوں کو مسلمانوں نے گرفتار کیا جن میں
 عباسؓ اور عقیلؓ بھی تھے، رسول اکرم ﷺ نے ان لوگوں کے بارے میں مشورہ
 کیا جس پر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا یہ قوم کے بڑے اور چھوٹے آپ کے رشتہ دار
 ہیں، اگر ہر ایک اپنی استطاعت کے بہ موجب فدیہ دے کر رہائی حاصل کریں تو
 امید ہے کہ یہ ایک دن یہ ہدایت یافتہ ہو جائیں گے اور مسلمانوں کی اکثریت ہو
 جائے گی، اس پر عمر رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ! ان لوگوں نے آپ ﷺ کو
 جھٹلایا اور آپ کو وطن سے نکالا۔ یہ کافروں کے سردار ہیں، ان سب کی گردنیں
 مارنے کا حکم صادر فرمایا جائے اور ان سے فدیہ نہ لیا جائے، عقیلؓ کو علی رضی اللہ عنہ کے
 حوالے کیجیے، عباسؓ کو حمزہؓ کے اور فلاں کو میرے سپرد فرمائیے تاکہ ہم ان کی
 گردنیں اڑا دیں، اس پر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا اللہ واقف ہے جو اپنے
 بندوں کے دل دودھ سے زیادہ نرم کر دیتا ہے اور اکثر دلوں کو پتھر سے زیادہ سخت
 کر دیتا ہے اور اسے ابو بکر! تمہاری مثال ابراہیم علیہ السلام کی طرح ہے جنہوں نے
 کہا جس نے میری پیروی کی وہ میرا ہے اور جس نے میرا کہا نہ مانا تو اے اللہ! تو
 بخشنے والا کرم پرور ہے اور اے عمر! تمہاری مثال نوح علیہ السلام کے مانند ہیں، جیسا کہ
 انہوں نے کہا تھا کہ اے اللہ! زمین پر کسی کافر کو بسنے کے لیے باقی نہ رکھ۔“

غرض کہ اے حضرات امامیہ! ذرا غفلت کی آنکھ کھولو اور اپنے قبلہ و کعبہ کے حال پر رحم کرو کہ جو کچھ انہوں نے لکھا تھا اس سے الٹی فضیلت صحابہ رضی اللہ عنہم کی ثابت ہوئی اور ساری محنت ان کی خاک میں مل گئی..... اصل یہ ہے کہ ”ذوالفقار“ کی تالیف کی نسبت خود حضرت لکھ چکے ہیں کہ دس بیس روز کے عرصے میں تالیف کی تھی اور عجلت بہت فرمائی تھی اسی سے یہ خرابی ہوئی، اگر سوچ سمجھ کر لکھتے اور غور و تامل کو دخل دیتے تو ایسی غلطی کبھی نہ فرماتے اور فضیلت کی آیت کو معارضے میں پیش نہ کرتے، خیر اب تو جو کچھ ہوا سو ہوا اب بجز اس کے کہ حضرت شیعہ افسوس کریں اور دل میں شرمائیں کیا ہوتا ہے۔

اے حضرات! اسی لیے ہم نے اوپر کہا ہے اور پھر کہتے ہیں کہ زرارہ اور ہشام ہی کے اقوال کی سند لایا کرو، للہ خدا کے واسطے قرآن مجید کی طرف توجہ نہ کرو اور اس کی آیتوں سے سند نہ لاؤ، اس لیے تم کو اس کے مطلب سے واقفیت نہیں ہے اور اس کے شان نزول سے آگاہ نہیں ہو اور اس کو قرآنِ محرف اور بیاضِ عثمانیٰ جانتے ہو، اگر ہمیشہ دیکھا کرو اور اس کے نظم پر غور کرتے رہو تو ایسا دھوکہ نہ کھاؤ ورنہ ایسے ہی مغالطے ہوں گے اور جس امر کے اثبات میں کوئی آیت لاؤ گے اسی سے اس کی تردید ہوگی، اس قرآنِ دانی پر شاہ صاحب مؤلف ”تحفہ“ کے جواب لکھنے کا ارادہ کیا بلکہ ان کا مقابل بننے پر اظہارِ عار و ننگ فرمایا اور استاد کا یہ شعر جس کو ”صواریم“ میں خود حضرت نے لکھا ہے بھول گئے کہ: شعر.....

مشو ہم پنچہ با من گرچہ سحر سامری داری
زبانم در سخن گفتن ید بیضاست می گویم

”ہم سے پنچہ نہ لڑانا، گرچہ سامری کا جادو رکھتے ہو، اس لیے کہ ہماری زبان بھی توید بیضا ہے۔“

میں اپنی بحث کو ختم نہیں کرتا ایک اور شبہے کو جو اکثر حضرات شیعہ کیا کرتے ہیں بیان کرتا ہوں کہ..... بعضے حضرات کہا کرتے ہیں کہ پیغمبر خدا ﷺ کی نسبت جو ناصبی یہ تہمت کرتے ہیں کہ وہ شیخین رضی اللہ عنہم اور صحابہ سے مشورہ لیا کرتے تھے وہ ان کی تہمت ہے، یہ امر

کیوں کر ممکن ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ صاحب الوحي والالہام کسی سے مشورہ کریں۔ اور اس ابلہ فریبی کی تقریر کو سن کر جہلاء گھبرا جاتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں کہ سچ تو ہے کہ رسول مقبول ﷺ جن پر ہر معاملے کے لیے خدا وحی بھیج دے اور جس سے سب باتیں جبرئیل علیہ السلام کہہ جائیں اور جن کی شان ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ ﴿النجم: ۴، ۳﴾ ہو وہ ابو بکر یا عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ سے صلاح لیں، بے شک یہ بات عقل کے خلاف اور قیاس سے باہر ہے اور ایسی تقریروں سے قرطاس وغیرہ کے مطاعن کو خوب رونق دیتے ہیں۔ اس لیے میں ان حضرات سے کہتا ہوں کہ وہ اس آیت پر غور کریں جس کو مجتہد صاحب نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی برائی ظاہر کرنے کے لیے تحریر فرمائی ہے اور پھر ان کی تفسیروں کو دیکھو اور پھر دیکھو کہ اس سے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کرنا ثابت ہوتا ہے یا نہیں، اور ان مشورہ دینے والوں میں سب سے اول ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا نام ہے یا نہیں..... دیکھو اور پھر دیکھو اور خوب غور سے دیکھو کہ مشورہ کرنا رسول اللہ ﷺ کا ان سے اور ان کا حضرت ﷺ کو صلاح دینا تمہارے مفسرین کے قول سے ثابت ہوتا ہے یا کچھ اس میں فرق ہے۔ ﴿فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِنْ فُطُورٍ ۚ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ﴾ ﴿الملك: ۶۷﴾

سبحان اللہ، سبحان اللہ! شیعوں کو ایسے لوگوں کی نسبت منافق کا لفظ کہتے ہوئے کچھ خدا کا خوف، رسول ﷺ کا لحاظ بھی ہوتا ہے یا نہیں اور قیامت کے مواخذہ سے بھی ڈرتے ہیں یا نہیں، جناب مجتہد صاحب نے ایسے صحابہ کبار کے منافق لکھنے میں یہ بھی خیال نہ کیا کہ آخر ایک روز انتقال کرنا ہے اور خدا کو جواب دینا ہے، جو کچھ ہم کتاب میں لکھتے ہیں اس کا خدا کو کیا جواب دیں گے، رسول اللہ ﷺ کو کیا منہ دکھائیں گے جو ہم ان کے حواریں اور

① ترجمہ: ”اور نہیں بولتا اپنی چاؤ سے یہ تو حکم ہے جو پہنچتا ہے اس کو۔“

② ترجمہ: پھر دوہرا کر نگاہ کو کہیں دیکھتا ہے شکاف، پھر دوہرا کر نگاہ دو دو بار الٹی آئے تیرے پاس تیری نگاہ رد ہو کر

تھک کر۔“ (سورہ ملک) ۱۲

اصحاب کو جن سے وہ مشورہ لیتے تھے، جن کو اپنا مصاحب بنائے ہوئے تھے، منافق کہتے ہیں، اگر یہ ڈر ہوتا اور اس پر یقین رکھتے ہوتے کہ قیامت کے دن جب ہاتھ میں نامہ اعمال دیے جائیں گے اور ”ذوالفقار“ کی کفریات پر ملائکہ عذاب ﴿۱﴾ اِقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ﴿۲﴾ (الاسراء: ۱۴) خدا کی طرف سے کہیں گے اس وقت کیا حال ہو گا، نہ ان کے مقلدین بچا سکیں گے، نہ ان کا اجتہاد کام آئے گا..... توبہ توبہ جان بوجھ کر یہ لوگ کفریات بکتے ہیں اور مراتب صحابہ رضی اللہ عنہم پر یقین رکھ کر اسی سے انکار کرتے ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان کہہ کر وہ لغویات منہ سے نکالتے ہیں کہ جن کو سن کر کفار بھی الامان الامان! پکارتے ہیں..... حقیقت میں نہ یہ مبالغہ ہے، نہ تعصب ہے، امر حق کا اظہار ہے کہ جس طرح پر دین محمدی ﷺ کو اس فرقے نے اور خوارج نے خراب کیا ہے وہ کسی دوسرے نے نہیں کیا، وہ وہ باتیں دین میں داخل کیں کہ جن کو خدا کسی مسلمان کے کان تک نہ پہنچائے ان کے کفریات اور ہزلیات اور لغویات پر شیطان بھی حیران ہوگا اور وہ بھی ان کی شان میں کہتا ہو گا..... اگر کوئی حضرات شیعہ نہایت ہی غور کو داخل دیں اور قرآن مجید کی اس آیت کو مکرر سہ کر عینک لگا کر پڑھیں اور دو چار مجتہد جی ان کے مل کر یہ فرمائیں کہ خاص آیت میں تو ذکر مشورہ کرنے کا نہیں ہے، اس لیے ہم اسے نہیں مانتے اور جو تفسیریں تم نے بیان کیں ان کو بھی ہم قبول نہیں کرتے، اگر مشورہ لینے کا حکم خدا کا ہوتا تو آیت میں اس کا ذکر ہوتا..... جواب اس کا یہ ہے کہ قرآن کو ذرا اول سے آخر تک پڑھو اور دیکھو کہ خدا نے مشورہ کرنے کا ارشاد کیا ہے یا نہیں، چنانچہ اب ہم اسی آیت کو بیان کرتے ہیں۔

مسلمان نشنواد و کافر مبینا ﴿۳﴾

دلیل سوم:..... اللہ جل شانہ ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَلَوْ كُنْتَ فَضًّا غَلِيظًا لَّالْقَلْبِ لَا نَفْضُوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾

۱ ترجمہ: ”پڑھ لے لکھا اپنا تو ہی بس ہے آج کے دن اپنا حساب لینے والا۔“ (سورہ بنی اسرائیل) ۱۲

۲ مسلمان کو نہ سنے اور کافر کو نہ دیکھے۔ ۱۲

وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ﴿سورہ آل عمران : ۱۵۹﴾
 ”بہ نسبت رحمت خدا کے تو ان پر نرم ہو گیا ہے اگر تو سخت ہوتا تو وہ تیرے پاس سے
 بھاگ جاتے، پس عفو کر ان سے اور استغفار کر ان کے لیے اور مشورہ کر ان سے۔“
 خیال کرنے کی بات ہے کہ جناب احدیت کس قدر عنایت سے پیغمبر خدا ﷺ کو
 صحابہؓ پر رحم کرنے کا اور ان کے زلات و قصورات کو معاف کرنے کا اور ان سے مشورہ لینے کا
 حکم کرتا ہے اور اس سے کیسی کچھ خدا کی مہربانی صحابہؓ کی نسبت ظاہر ہوتی ہے۔ پس اس سے
 زیادہ اصحابؓ رسول ﷺ کی فضیلت کے لیے کون سی دلیل و برہان چاہیے اور آیاتِ خدا
 سے بڑھ کر کس کی شہادت ہم پیش کریں، اب ہم اس آیت کی تفسیر کو جو علماء شیعہ نے کی ہے
 بیان کرتے ہیں۔ علامہ طبرسی مجمع البیان میں فرماتے ہیں:

((فاعف عنہم ما بینک و بینہم و استغفر لہم بینہم و بینی و
 قیل معناه فاعف عنہم فرارہم باحد و استغفر لہم من ذلک
 الذنب و شاورہم فی الامر ای استخراج رائہم و اعلم ما
 عندهم۔ و اختلفوا فی فائدة مشاورتہ ایا ہم مع استغناء
 مایوحی عن تعرف صواب الراى من العباد علی اقوال
 احدها ان ذلک علی وجہ التطیب لنفوسہم و التالیف لہم
 و الرفع من اقدارہم لتبیین انہم ممن یوثق باقوالہم و یرجع
 الی ارائہم عن قتادة و الربیع و ابن اسحاق ، و ثانیہا ان ذلک
 لتقتدی بہ امتہ فی المشاورۃ و لم یردہا نقیصۃ کما مدحوا بان
 امرہم شورى بینہم عن سفیان بن عیینہ و ثالثہا ان ذلک
 الامرین لا جلال اصحابہ و یقتدی امتہ فی ذلک عن الحسن
 و الضحاک و رابعہا ان ذلک لیمتحنہم بالمشاورۃ لیتمیز
 الناصح من الناس و خامسہا ان ذلک فی امور الدنیا و مکائد

الحرب و لقاء العدو و فی مثل ذلك يجوز ان يستعين بأرائهم
عن ابی علی الجبائی .)) انتھی بلفظہ .

”یعنی خدا کے اس کہنے کا کہ معاف کر ان سے یہ مطلب ہے کہ جو تمہارے ان
کے بیچ ہے اور اگر وہ اس میں کچھ چوک جائیں یا کچھ تیرا قصور کریں تو تو معاف
کر، اور ان کے لیے استغفار کر اس کا مطلب یہ ہے کہ جو معاملہ ہمارے اور ان
کے بیچ میں ہے اور اس میں وہ چوک جائیں یا گناہ کریں تو تو ان کی معافی کے
لیے ہم سے استغفار کر، اور مشورہ کر ان سے اس کا مطلب یہ ہے کہ مشورہ لینے کا
مطلب یہ ہے کہ ان کی رائے لے اور دیکھ کہ وہ کیا کہتے ہیں اور پھر یہ فقیر
بیان کرتا ہے کہ مشورہ لینے کے فائدہ میں اختلاف ہے کہ باوجود مستغنی ہونے
پیغمبر خدا ﷺ کے بوجہ وحی کے دریافت رائے صواب سے کسی بندہ سے مشورہ
لینے کا کیوں حکم ہوا اور اس میں لوگوں نے بہت سے قول کیے ہیں۔“

پہلا قول: یہ کہ یہ حکم اس لیے ہے تاکہ اصحاب رسول کے دل خوش ہوں اور ان کو
محبت اور الفت پیدا ہو اور ان کا مرتبہ بلند ہو اور ان کی قدر ہو کہ یہ بھی ان لوگوں میں سے ہیں
جن کے قول پر اعتماد کیا جاتا ہے اور جن سے رائے لی جاتی ہے۔ یہ قول ہے قتادہ، ربیع اور
ابن اسحاق رحمہ اللہ کا۔

دوسرا قول: یہ ہے: تاکہ امت نبوی اس کی اقتدا کریں اور اس کو عیب نہ سمجھیں،
جیسا کہ صحابہ رسول ﷺ کی تعریف میں کہا جاتا ہے کہ وہ جو کام کرتے تھے سو صلاح و مشورہ
سے کرتے تھے، یہ قول ہے سفیان بن عیینہ کا۔

تیسرا قول: یہ ہے کہ اس سے دو فائدے منظور تھے، ایک صحابہ رضی اللہ عنہم کی عزت
دوسرے امت کی اقتدا اس بات میں۔ یہ قول ہے حسن اور ضحاک کا۔

چوتھا قول: یہ ہے کہ امتحان ہو جائے کہ دوست کون ہے اور دشمن کون۔
پانچواں قول: یہ ہے کہ یہ مشورہ لینے کا حکم امور دنیا میں اور لڑائی کی باتوں میں

ہے اور ایسی باتوں میں ان سے صلاح لینا جائز ہے۔ یہ قول ہے ابی علی جبائی کا۔ فقط اس تفسیر سے چند فائدے حاصل ہوئے:

- ۱۔ یہ کہ خدا اپنے پیغمبرؐ سے فرماتا ہے کہ اگر یہ لوگ بہ اقتضائے بشریت تیرا تصور کریں تو تو خود انہیں معاف کر دے اور اگر میرا گناہ ان سے ہو جائے تو ان کے لیے مجھ سے استغفار کر، سبحان اللہ کیا مہربانی ہے خدا کی صحابہ رضی اللہ عنہم کے حال پر کہ ان کی خطاؤں کی عفو کرنے کے لیے اپنے پیغمبر ﷺ سے ان کی سفارش کرتا ہے اور ان کے گناہوں کے خود معاف کرنے کے لیے اپنے پیغمبرؐ کو ان کے واسطے شفاعت کا حکم دیتا ہے۔ افسوس ہے شیعوں کے حال پر کہ وہ ایسے ہی لوگوں کو کافر اور منافق کہتے ہیں۔
- ۲۔ یہ کہ جنگ احد کے فرار کا عفو اس سے ثابت ہوتا ہے جس پر بہت کچھ زبان داری حضرات شیعہ کرتے ہیں۔

۳۔ یہ ثابت ہوا کہ صرف ان کے اظہارِ قدر و منزلت کے لیے خدا نے یہ حکم پیغمبر ﷺ کو دیا کہ ان سے مشورہ کیا کرو..... اس تفسیر کی نسبت اگر بعض حضرات یہ فرمائیں کہ قتادہ وغیرہ اہل سنت تھے جس سے صاحب ”مجمع البیان“ نے ان اقوال کو نقل کیا ہے، اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ اقوال مختلفہ کے نقل کرنے سے پہلے جو کچھ مفسر موصوف نے کہا ہے وہ تو کسی سے نقل نہیں کیا اور جن اقوال کو اس نے نقل کیا ہے وہ فوائد اور وجوہ میں مشورہ لینے کے ہیں، اگر تم کسی قول منجملہ ان اقوال کے نہ مانو تو ذرا بیان فرماؤ کہ خود صاحب ”مجمع البیان“ کا کیا قول ہے اور پھر ﴿شاور ہم فی الامر﴾ کے کیا معنی ہیں اور اس حکم دینے کے کیا فائدے ہیں۔

دلیل چہارم:..... یہ سب مسلمان جانتے ہیں کہ سب سے پہلی لڑائی بدر کی ہے اور جو لوگ اس دن پیغمبر خدا ﷺ کے ساتھ تھے ان کا بڑا رتبہ ہے، اس لیے کہ اللہ جل شانہ نے فرشتوں کو مدد کے لیے بھیجا اور آیات قرآنی نازل کر کے اپنے احسان کو ظاہر کیا اسی واسطے تمام اصحاب نبوی میں وہی لوگ بڑے رتبے کے شمار ہوتے تھے جو اس لڑائی میں شریک تھے.....

اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ وہ اصحاب رضی اللہ عنہم جن کو حضرات شیعہ کافر اور منافق کہتے ہیں وہ اس لڑائی میں کس طرف تھے، پیغمبر ﷺ کی طرف یا کفار کی طرف..... اگر کوئی شیعہ یہ ثابت کر دے کہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم اس وقت پیغمبر ﷺ کی طرف نہ تھے اور وہ اس لڑائی میں شریک نہ تھے تو ہم ان کے دعویٰ کو تسلیم کرتے ہیں اور اگر ہم ثابت کر دیں کہ وہ عین معرکہ میں موجود تھے بلکہ خاص پیغمبر ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے تو حضرات شیعہ کو چاہیے کہ وہ تشیع سے فارغ خطی لکھ دیں۔ اس لیے میں لڑائی کے شروع ہونے اور عین لڑائی کے وقت کا حال حملہ حیدری سے نقل کرتا ہوں کہ ایسا متعصب کیا لکھتا ہے۔ لڑائی کے شروع ہونے سے پہلے کا حال مؤلف موصوف اس طرح لکھتا ہے کہ جب پیغمبر خدا ﷺ نے سنا کہ مشرکین قریش لڑائی کے لیے آرہے ہیں تب اپنے اصحاب سے مشورہ کیا تو اس وقت سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا اور جہاد پر آمادہ ہونے پر اپنی رغبت ظاہر کی، چنانچہ اس کے اشعار یہ ہیں:

پس از ایس خبر سید المرسلین
یکے انجمن ساخت با اهل دین
بفرمود آنکہ با صحاب خویش
کہ اے حق پرستان پاکیزہ کیش
بدانید کز کعبہ اهل جفا
کمر بستہ برکین و پر خاش ما
رسید ند نزدیک آمد خبر
بیایند خود ہم بروز دگر
شمارا کنوں چست تدبیر کار
کہ دشمن رسید از پئے کار زار
بپاسخ ابوبکر رض از جائے خاست

وزاں پس عمرؓ نیز قد کرد راست
 بگفتند یا سید المرسلین
 قدم پیش بگذار و ما را به ببین
 که بادشمن دین چهامی کنم
 چه ساں در پیت جان فدا میکنم
 وزاں پس زجا خاست مقدار نیز
 بگفت اے حبیب خدای عزیز
 بودتابتن جان و در کف تو او
 بیاریم شمشیر بر دشمنان
 ازاں گشته خوش دل رسول خدا
 بفرمود در حق ایشان دعا
 چنین خواست پس بهترین بشر
 که از راز انصاریا بدخبر
 دگر بار فرمود کای دوستان
 چه گوئید اندر حق دشمنان
 زجا خاست ایس بار سعد معاذ
 چنین گفت از روی صدق و نیاز
 که با جان و دل باهمین عهد دست
 بدست تو روزیکه دادیم هست
 سرو مال و فرزندان و خویش و تبار
 همان روز کردیم بر تو نثار
 پیمبر برایشان نمود آفرین

برائے صدق و ایمان انصارِ دین

”اس خبر کے (آنے کے) بعد حضور ﷺ نے مسلمانوں کی ایک میٹنگ کی، اپنے اصحاب سے اس وقت آپ نے کہا کہ اے پاکیزہ صفت حق پرستو تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ مکے کے ظالم ہمارے بیر اور دشمنی پر کمر بستہ ہیں، اطلاع ملی ہے کہ وہ قریب آچکے ہیں اگلے دن تک وہ آجائیں گے اب آپ حضرات کی کیا رائے ہے کیونکہ دشمن لڑائی کے لیے آرہا ہے، سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے، کہنے لگے اے رسولوں کے سردار! آپ قدم آگے بڑھائیں، پھر ہمیں دیکھیں کہ دشمنانِ دین سے ہم کیا برتاؤ کرتے ہیں، کس طرح آپ پر اپنی جان فدا کرتے ہیں، اس کے بعد حضرت مقداد بھی اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ محبوب خدا ﷺ جب تک بدن میں جان ہے دشمنوں پر تلوار چلاتا رہوں گا رسول اللہ ﷺ کا دل اس سے مسرور ہو گیا، ان لوگوں کے حق میں دعا فرمائی، خیر البشر ﷺ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ انصار کا نظریہ بھی معلوم ہونا چاہیے، دوبارہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے دوستو دشمنوں کے بارے میں کیا کہتے ہو، اس بار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے، پوری سچائی کے ساتھ فرمایا کہ جان و دل سے اسی عہد پر قائم ہیں جس پر آپ کے ہاتھ پر بیعت کی ہے، سر مال، اولاد اور عزیز و اقارب اسی دن (سے) آپ ﷺ پر نچھاور کر دیے ہیں، انصار کی اس سچائی اور ایمان پر رسول اللہ ﷺ نے ان کو شاباش کہا۔“

پس اے حضراتِ امامیہ! ذرا منافقین کے ایمان اور جاں نثاری کو خیال کرو اور ان کے صدق اور اخلاص کو دیکھو سمجھو تو کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایسے منافق تھے کہ سب سے پہلے جاں بازی پر مستعد ہوئے اور سب سے پہلے پیغمبر خدا ﷺ کے ساتھ ہوئے اور اپنے اخلاص کو اپنے اعمال سے سب پر ظاہر کر دیا اور خدا کے حضور سے ”افضل

المہاجرین“ کا خطاب پایا..... اے حضرات! پیغمبر خدا ﷺ کو مدینے کے منافقین نے جو شوکتِ اسلام کے بعد ظاہری کلمہ گو ہو گئے تھے ایسے ہی اخلاص کے جواب دیے ہیں اور وقت پر اسی طرح کا ساتھ دیا ہے اور رسول مقبول ﷺ نے ان منافقوں کے حق میں اسی طرح دعا اور آفریں کی ہے۔

مجتہد صاحب قبلہ اپنی ﴿ ذوالفقار ﴾ میں منجملہ اور آیات کے جو اثبات فضائل صحابہ رضی اللہ عنہم کے معارضے میں پیش کی ہیں ایک یہ آیت لکھتے ہیں:

﴿ فَإِذَا أَنْزَلَتْ سُورَةٌ مُحْكَمَةٌ وَذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمُبْغِضِ عَلَيْهِ الْبُوتُ ﴾

(سورہ محمد: ۲۰)

”کہ جب سورت جہاد کی نازل ہوتی ہے تو جن کے دل میں بیماری ہے وہ تجھے اپنے پیغمبر بری نگاہ سے دیکھتے ہیں۔“

اس آیت کو گویا وہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے حق میں صادق سمجھتے ہیں:

﴿ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللَّهِ ﴾ (سورہ توبہ: ۲۰)

”جو یقین لائے اور گھر چھوڑ آئے اور لڑے اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے انکار بڑا درجہ ہے اللہ کے پاس۔“

کی نسبت فرماتے ہیں:

((پس شك نیست دریں کہ از صحابہ کسانیکہ ایمان داشتند و هجرت و جهاد به نیت صحیح کردند لالت بر فضیلت آنها دارد و لیکن چون ایمان غاصبین حق ولایت و هجرت اینها به نیت درست به ثبوت نرسیده است دلایدین آیات بر

فضیلت ایشاں و جہی نداد لاسیما نظر باینکہ او سبحان و تعالیٰ مقارن این هر دو صفت، صفت جہادرا نیز مذکور نموده و کیفیت جہاد ایشاں در جنگِ احد و خیبر و حنین اظہر من الشمس ست پس ایشاں را ازین آیۃ بہرہ نخواہد بود بلکہ ایشاں از مصداق قول او سبحانہ تعالیٰ ”و من یولہم یومئذ دبرہ..... الخ.“ ((حظ وافر دارند.

”اس میں شک نہیں کہ صحابہ میں سے جو مسلمان تھے اور ہجرت و جہاد صحیح نیت سے کیا یہ (آیت) ان کی فضیلت کی دلیل ہے لیکن چونکہ حق ولایت غصب کرنے والوں کا ایمان اور ہجرت کی نیت کی درستگی کا ثبوت نہیں ہے تو ان آیات سے ان کی فضیلت پر استدلال صحیح نہیں، خاص طور پر اس امر کے پیش نظر کہ اللہ نے ان دونوں صفات کے ساتھ صفت جہاد کا بھی تذکرہ کیا ہے اور غاصبین حق ولایت کے جہاد کی کیفیت جنگِ احد، خیبر و حنین وغیرہ میں روزِ روشن ہے، اس لیے ان کو ان آیات سے بہرہ مند نہیں کیا جاتا بلکہ یہ لوگ اللہ کے قول ”جن لوگوں نے آج کے دن پیٹھ پھیری..... الخ.“ کے مصداق ہیں۔“

پس کوئی شخص ”حملہٴ حیدری“ کے ان اشعار کو حضرت کی قبر پر پڑھ دے کہ شاید ان کی روح کو خبر ہو جائے کہ ان کی ساری تقریر و تحریر انہیں کے ایک شاعر کے قول سے رد و باطل ہو گئی، بڑے قبلہ و کعبہ کی وفات کے بعد جب ان کے ولی عہد صاحبِ جزادے، یعنی دوسرے قبلہ و کعبہ مولوی سید محمد صاحب نے حملہٴ حیدری کی اصلاح کی تھی اور اس کو تصحیح کر کے نظر ثانی فرمائی تھی تب امید تھی کہ شاید وہ ان اشعار کو دیکھ کر متنبہ ہوں گے اور اپنے والد ماجد کی تحریر پر خط نسخ کھینچ دیں گے مگر افسوس ہے کہ انہوں نے بھی دیانت کی آنکھ بند کر لی اور ”ذوالفقار“ کے اوپر ان اشعار کا حاشیہ نہ لکھ دیا تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہم اس جہاد میں جو کہ سب سے اول ہوا کس فریق میں تھے؟ منافقین کے یا مخلصین کے، اور انہوں

نے رسول مقبول ﷺ کی خدمت میں سب سے اول لڑائی پر آمادگی ظاہر کی تھی یا کسی اور نے اور لڑائی کے وقت پیغمبر ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے یا نہیں؟

باقی رہا حال احد خیبر وغیرہ کی لڑائی کا کہ بار بار مجتہد صاحب کے قلم سے احد اور فدک اور قرطاس کا لفظ نکلتا ہے اور ہر سطر اور ہر صفحہ میں موقع اور بے موقع اسی کا نام آتا ہے، سو حضرات امامیہ ذرا صبر کریں، دوسرا حصہ مطاعن صحابہ کے جواب کا چھپنے دیں تب اس کی بھی حقیقت کھل جائے گی اور جو کچھ حضرت نے لکھا اس کا حال سب کو معلوم ہو جائے گا مگر اس وقت ایک آیت کو لکھ کر اس کا جواب دیتا ہوں کہ جنگ احد میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو لغزش ہو گئی تھی اس کو خدا قرآن مجید میں بیان فرماتا ہے کہ:

﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَيْنِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ
بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ حَلِيمٌ﴾

(سورہ آل عمران: ۱۵۵)

”جو لوگ تم میں ہٹ گئے جس دن ٹھہریں دو فوجیں، سوان کو ڈگمگا دیا شیطان نے کچھ ان کے گناہ کی شامت سے، اور ان کو بخش چکا اللہ، اللہ بخشنے والا تحمل رکھنے والا ہے۔“

پس اس کو خدا نے خود صاف کر دیا اس کے معاف کرنے کے بعد اس کا ذکر کرنا گویا خدا کی تکذیب کرنا ہے کہ اس کو بھی مجتہد صاحب نے ظاہر کر دیا اور خدا کو جھٹلا دیا، ونعوذ باللہ منہ۔ چنانچہ اسے ذوالفقار میں فرماتے ہیں:

((فرار صحابہ در روز احد متیقن و عفو ایشاں بحیثیتی کہ
مطلق ماواى ایشاں در جہنم نہ باشد مشکوک، والیقین
لایزول الا بالیقین مثله .))

”جنگ احد میں صحابہ کا فرار (بھاگنا) امر واقعی ہے اور ان کی بخشش اس طرح کہ ان کا ٹھکانہ دوزخ میں نہ ہوگا مشکوک ہے اور یقین تو یقین ہی سے ختم ہوتا ہے۔“

اب ذرا غور سے حضرت کے الفاظ کو جو ہم نے اوپر مختصراً نقل کیے ہیں دیکھنا چاہیے کہ خدائے جل شانہ تو صاف فرماتا ہے کہ ﴿لَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ﴾ کہ ”میں نے ان کو معاف کر دیا“ اور حضرت فرماتے ہیں کہ عفو یقینی نہیں ہے۔ اب جو شخص خدا کے قول کو بھی جھٹلا دے اور اللہ جل شانہ کے کلام میں بھی شک کرے اور اس کو یقینی نہ سمجھے کون ہے کہ پھر اس کو باایمان کہے گا اور ایسے منکر آیات قرآنی کو کون ہے جو دشمن خدا اور رسول نہ سمجھے گا..... عجب حال ہے ان حضرات کا کہ صرف اصحاب نبوی کی عداوت سے ایسے جاہل اور خدا ناشناس ہو گئے ہیں کہ ایسی صریح اور صاف آیاتِ الہی میں بھی شک کرتے ہیں۔ خیر اس وقت تو اس بحث کا موقع نہیں ہے، مطاعن کے باب میں ہم اس اعتراض کو تفصیل کے ساتھ بیان کر کے حضرات شیعہ کی خدمت میں پیش کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اب میں پھر جنگ بدر کا حال لکھتا ہوں، غرض کہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے جو حال مہاجرین اور انصار کا تھا وہ تو ظاہر ہو گیا، اب میں عین لڑائی کے وقت کا حال اسی کتاب سے نقل کرتا ہوں..... اے مومنو! مؤلف موصوف لکھتا ہے کہ جب لڑائی کی صفیں آراستہ ہو گئیں اور لڑائی شروع ہونے کے قریب ہوئی تب پیغمبر خدا ﷺ نے بحضور کبریٰ دعا کی اور جو کچھ حضرت نے دعا میں فرمایا اس کا حال ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے:

جنگ بدر کے حال میں حملہ حیدری کے اشعار.....

پس آورد رو سوی یزدان پاک
بنالید و مالید رو رابہ خاک
بگفت اے نمائندہ عدل و داد
فرستندہ انبیاء بر عباد
تو دانی کہ من رہنمائے قریش
به حکم تو بودم نہ بر رائے خویش
کشیدم برایشان به حکم تو تیغ

مکن نصرت خویش از من دریغ
 الہی اگر ایس چند تنے از عباد
 کہ کردند حکم ترا انقیاد
 بحکم تو بستند ہر کس میاں
 نہ دیدند بیش و کم دشمنان
 بمانند از فتح کو تاهم دست
 بیابند از دست دشمن شکست
 بروئے زمیں تا قیامت دگر
 نہ گردد پر ستندہ ای داد گر
 بایں زاری و عجز رنجیدہ بود
 کہ خواہش بفرمان حق درر بود
 دراں دم صفِ خشم نزدیک شد
 زبس کرد خورشید تاریک شد
 ابوبکرؓ نزد نبی داشت جای
 بگفت اے بحق خلق را رہنمای
 در آمد بہ تنگی سپاہِ ضلال
 چہ فرمای اکنوں برای قتال

” (آپ ﷺ نے) خدائے پاک کی طرف رخ کیا، روئے اور اپنا رخسار پاک زمین رکھ دیا، فرمایا: اے عدل و انصاف کے دکھانے والے، انبیاء کو اپنے بندوں پر بھیجنے والے تو جانتا ہے کہ ہم قریش کے رہنما ہیں، ہم تیرے حکم کے تابع ہیں اپنی رائے کے نہیں۔ ہم نے تیرے ہی حکم سے ان پر تلوار اٹھائی ہے تو اپنی مدد ہم سے نہ روک، الہی اگر تیرے یہ چند بندے جنہوں نے تیری

فرمانبرداری کی ہے تیرے حکم پر ہی سب تیار ہوئے ہیں اور دشمنوں کی کمی بیشی کو نہیں دیکھا ہے، اگر یہ فتح یاب نہ ہو سکے اور دشمنوں سے شکست کھا گئے تو قیامت تک دوبارہ روئے زمین پر اے خدا تیری عبادت نہ ہو سکے گی، اس الحاح وزاری سے رنج ٹپک رہا تھا کہ فرمانِ خداوندی سے خواہش پوری ہووے دشمنوں کی صف اس وقت نزدیک آگئی اور ادھر سورج بھی ڈوب گیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے پاس ہی تھے کہنے لگے: اے مخلوق کے رہنما! دشمنوں کی فوج نے گھیرا تنگ کر دیا ہے اب لڑائی کے لیے آپ ﷺ کیا فرماتے ہیں:

کہاں ہیں ایمان کے کان اور انصاف کی آنکھ جو حضرات شیعہ اس مؤلف کے الفاظ کو دیکھیں اور سنیں اور اس کے مطلب کو سوچیں کہ ساری نفاق کی باتیں اور کفر کے کلمے خاک میں مل گئے اور ایمان بھی اور اخلاص بھی اور ہجرت بھی اور نصرت و یاری بھی سب کا مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم کی نسبت ثبوت ہو گیا۔“

اے مسلمانو! خدا کے لیے دیکھو، اب اس سے زیادہ اصحابِ نبوی کی فضیلت کیا ہوگی کہ پیغمبر خدا ﷺ ان کے حق میں خدا سے عرض کرتے ہیں کہ خدایا ان چند آدمیوں نے صرف تیرے حکم سے جہاد پر مستعدی کی ہے، اگر ان کو شکست ہوئی اور یہ مارے گئے تو پھر قیامت تک کوئی تیری عبادت نہ کرے گا۔ پس اہل سنت اور کیا کہتے ہیں، انہیں باتوں پر اصحابِ نبوی سے محبت کرتے ہیں اور ایسی ہی فضیلتیں ان کی بیان کرتے ہیں۔ جب پیغمبر خدا ﷺ ان کے حق میں یہ فرما دیں کہ یہی لوگ تیری عبادت پھیلانے اور تیرا نام بلند کرنے کے ذریعے ہوں گے، اگر یہ مارے گئے تو دین کا خاتمہ ہو جائے گا اور قیامت تک کوئی تیرا نام نہ لے گا تو کیوں کر ہم اہل سنت ان کو مومن اور مخلص نہ جانیں اور کس طرح صرف ایک عبد اللہ ابن سبا یہودی کے بہکانے سے ایسے پاک لوگوں کو منافق کہہ کر ایمان سے دست بردار ہو جائیں..... اور خدا کی قدرت کا تماشا دیکھنا چاہیے کہ اس مقام پر بھی اس مؤلف کے قلم سے خدا نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام لکھوا دیا اور وہ بھی ایسے موقع پر کہ جس سے قربتِ نبوی ﷺ

ثابت ہوتی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پیغمبر ﷺ کے برابر ہی کھڑے تھے جیسا کہ مولف موصوف فرماتا ہے کہ: مصرع.....

ابوبکرؓ نزد نبیؐ جائے داشت

اے یارو! کیا حملہ حیدر یہ کا مؤلف ناصبی اور سنی ہے جس نے اپنے مذہب کی خاطر سے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام لکھ دیا اور اس کو ابو بکر رضی اللہ عنہ سے محبت تھی جس کی وجہ سے اس نے ان کے حق میں یہ کچھ کہہ دیا۔ آخر کیا سبب ہے؟ خدا کے لیے اس کا کچھ سبب تو بتلاؤ، بھائیو، بجز اس کے دوسرا کوئی سبب نہیں ہے کہ قربت نبوی ﷺ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ایسی حاصل تھی کہ اس سے انکار کرنا اور ان کا نام نہ لکھنا درحقیقت آفتاب کو چھپانا تھا۔ باذل بے بدل کو مجتہد صاحب کی سی جرأت نہ ہوئی کہ وہ ایسی کھلی ہوئی بات کو چھپاتا اور جو بات تمام مہاجرین و انصار میں مشہور تھی اور جس کا شہرہ اس وقت سے اب تک ہے اس سے انکار کرتا..... اسے مومنین! ذرا غور کرو کہ جو دعا پیغمبر خدا ﷺ نے اصحاب رضی اللہ عنہم کی نسبت کی ہے اور ان کا جو حال انہوں نے خدا کے سامنے بیان کیا ہے اس سے بھی ان کا نفاق ثابت ہوتا ہے، کیا منافقوں کے حق میں پیغمبر خدا ﷺ نے ایسا ہی ارشاد فرمایا ہے، کیا منافقوں کے حق میں پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر فتح نہ ہوگی تو خدایا تیری عبادت قیامت تک پھر کوئی نہ کرے گا۔ باوجود ایسی نص صریح ہونے کے جس کا ثبوت تمہارے ہی مذہب والوں کے کلام سے ہوتا ہے، تم ان کو کافر اور منافق کہتے رہو گے اور کیا ایسی باتوں کو سن کر بھی نفاق سے توبہ نہ کرو گے، اگر اس کے باوجود بھی تم ان کی نسبت نفاق کا اطلاق کرو تو معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری اصطلاح میں اخلاص اور ایمان اور قربت نبوی ﷺ کے معنی نفاق کے ہیں، پس لامشاحہ فی الاصطلاح .

مجتہد صاحب بار بار اپنی کتاب ذوالفقار..... وغیرہ میں یہی فرماتے ہیں کہ شیخین رضی اللہ عنہما اور ان کے متابعین کی نیت بخیر نہ تھی اور جب تک نیت بخیر ہونے کا حال معلوم نہ ہو اثبات فضیلت کی مصداق سے ان کو کچھ حصہ نہیں ہے۔ اس لیے میں نہایت ادب سے عرض کرتا

ہوں کہ اگر خوارج لعنہم اللہ جناب امیر علیہ السلام کی نسبت یہی سوال کریں تو اے حضرات شیعہ! تم کیا جواب دو گے؟ اگر قرآن مجید سے ان کا نام نکال دو اور پھر ہم ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام نہ نکال دیں تو بے شک تم سچے ہم جھوٹے، جب قرآن مجید میں تو کسی کا نام ہی نہیں ہے تو جس طرح تم ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت سے باوجود ان کے ان فضائل اور درجات کے انکار کرتے ہو اسی طرح پر وہ جناب امیرؓ کے فضائل سے باوجود ان کے اعلیٰ مراتب کے انکار کرتے ہیں..... اب ذرا غور کرو کہ جب تم جناب امیرؓ کے فضائل کو ان کے اعمال اور حالات سے ثابت کرو گے اور ان کی صدق نیت کو جو کہ امر ناطق ہے ان کے اعمالِ حسنہ ظاہری سے ظاہر کرو گے وہی ہم ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نسبت ثابت کرتے ہیں۔ پس ذرا غور سے دیکھو کہ جس طرح پر تم آیت:

﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ
وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رُكُوعُونَ﴾ (سورہ مائدہ: ۵۵)

”تمہارا رفیق وہی اللہ ہے اور اس کا رسول ﷺ اور ایمان والے جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور رکوع کی حالت میں (بھی وہی جایا کرتے ہیں)۔“

سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امانت ثابت کرتے ہو کیا اس کے برابر یہی ہمارا ثبوت صدق نیت کا ہجرت میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نسبت نہیں ہے، آیت ﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ﴾ میں تو کوئی ایسی تمیز خاص کے باب میں نہیں ہے جیسے کہ آیت غار میں ہے کہ وہاں ﴿إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ﴾ ”جب کہنے لگا اپنے رفیق کو۔“ کا صاف لفظ ہے جو دلالت کرتا ہے کہ مراد اس سے وہی یار ہے جو غار میں تھا اور غار میں ہونا سوائے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دوسرے کا کسی کے قول سے بھی ثابت نہیں ہوتا، پس غور کرو کہ قرآن مجید سے تمہارا دعویٰ ثابت ہوتا ہے یا ہمارا۔ ذرا دونوں کو ملا کر دیکھو اور انصاف کرو کہ کون اپنے دعوے میں غالب ہے اور کون ضعیف!

آ شانے کو شانے سے ملا دیکھ
قد میں ہی کچھ بلند ہوں گے

قرآن کو جانے دو، اس کو بیاض عثمانی سمجھ کر اس کی سند نہ لو تو اپنی اور اپنے بھائیوں خوارج کی کتابوں پر نظر کرو، دیکھیں تم خوارج مخذلوں کی کتاب سے جناب امیرؓ کے کس قدر فضائل ثابت کرتے ہو..... اور پھر ان کو گن کر علیحدہ کرو اور پھر ہم سے شمار کر کے اس سے تین حصے زیادہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے فضائل میں اپنی کتابوں کی سند لو۔ آخر جب ایک فرقہ خوارج کا دشمن اہل بیت ہو گیا اس نے کیا کیا نہیں کیا ہے جو کہ تم صحابہ رضی اللہ عنہم کی نسبت کرتے ہو، وہ بھی جناب امیرؓ کو ساری فضیلتوں کی آیتوں سے ویسا ہی خارج سمجھتے ہیں، (ونعوذ باللہ من هفواتهم) جیسا کہ تم خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کو..... وہ بھی ساری مطاعن کی آیتوں کو ذات پاک سید الاولیاء کی نسبت صادق سمجھتے ہیں، جیسا کہ تم صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کی نسبت، وہ بھی ساری خوبیوں سے جناب امیر علی بن ابی طالب کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کی اس طرح انکار کرتے ہیں جس طرح کہ تم اصحاب نبوی کی خوبیوں سے، وہ بھی ہزاروں اعتراض اور مطاعن جناب امیرؓ کی شان میں قائم کرتے ہیں جیسا کہ تم پیغمبر ﷺ کے یاروں کی شان میں، وہ بھی اس برائی سے ان کے پاک نام کو لیتے ہیں، جیسا کہ تم صحابہ رضی اللہ عنہم کے ناموں کو..... غرض کہ ایک ترازو میں اپنے آپ کو اور خوارج کو تو لو دونوں کا پلہ برابر ہے، نہ تم کم ہو نہ وہ زیادہ، نہ تم زیادہ ہو نہ وہ کم ہیں۔

پس ذرا انصاف کرو کہ جب تم نے دشمنی صحابہ کو اپنے معتقدات اور اصول دین میں قائم کر لیا تو تم ان کی فضیلت کا کیوں کر اقرار کرو گے، لیکن خدا کی شان ہے کہ اپنے رسول ﷺ کے یاروں کی فضیلت ظاہر کرنے کے لیے تمہارے ہی مذہب کے عالموں اور محدثوں کی زبان سے بعض کلمے فضیلت کے ظاہر کر دیے اور کیسی باتیں ان کی قدر و منزلت کی تمہارے مورخین کے قلم سے نکال دیں کہ اگر وہ سب جمع کی جائیں تو نام بنام خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی شان میں ہزار ہا احادیث و اقوال سے متجاوز ہوں گے اور جس سے ان

کے ایمان اور اخلاص اور جہاد اور امامت اور خلافت سب کا ثبوت اچھی طرح پر ہوگا، چنانچہ بطور نمونے کے میری اس چھوٹی سی کتاب میں سو حدیث و اقوال اور اخبار سے زیادہ ہوں گے اور جس میں باقر تمہارے محدثین کے ائمہ علیہم السلام کی زبان سے ان کی صدیقیت اور امامت اور فضیلت کا ثبوت ہوتا ہے۔ پس اس سب کو جب تم سنتے ہو تو کیا یہ خیال نہیں ہوتا کہ باوجود اس بغض و عناد کے جب ہمارے محدثین و علماء کے اقوال سے ان کے فضائل ثابت ہوتے ہیں تو حقیقت میں وہ کیسے افضل ہوں گے۔ اگر حقیقت میں تم سوچ کر اور سمجھ کر رہ جاتے ہو اور بہ مقتضائے ”احزاب النار علی النار“ کے ترک مذہب کو گوارا نہیں کرتے تو خیر مجبوری ہے اور اگر نہیں سمجھتے ہو تو پھر ایسی سمجھ کا کیا علاج..... خدا کی کتاب سے سمجھایا، مہاجرین و انصار کی شان میں آیاتِ بینات کو کھول کر دکھایا احادیث نبوی کو جو تمہاری ہی کتابوں میں ہیں نقل کر کے ان کی فضیلت کو ثابت کیا، اقوال ائمہ کرام سے تمہارے ہی مذہب کے موافق ان کے ایمان اور مراتب کو ظاہر کیا، ان کے اعمال حسنہ کو بھی تمہارے مورخین و علماء کی شہادت سے ثابت کر دیا۔ اور پھر جب تم کہو تو یہی کہو کہ نیت اصحاب رضی اللہ عنہم کی بخیر نہ تھی اور وہ منافق تھے تو سوائے خدا کے جس کی شان ہے کہ ﴿يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَيُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ﴾ ”جسے چاہے ہدایت کرے اور جسے چاہے گمراہ کرے۔“ ہم تم کو ہدایت نہیں کر سکتے اور ہم کسی نسخے سے تمہاری بیماری کی دوا نہیں دے سکتے۔ ﴿لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ﴾ ”ہم کو ملنے ہیں ہمارے کام اور تم کو تمہارے کام۔“ شعر.....

ہمارا کام کہہ دینا تھا یارو

اب آگے چاہے تم مانو نہ مانو

غرض جو آیت ﴿لَوْ لَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ﴾ کو مجتہد صاحب نے معارضے میں پیش کیا تھا اس نے کس خوبی سے صحابہ رضی اللہ عنہم کے فضائل کو ثابت کیا خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان میں باقر علماء شیعہ پیغمبر خدا ﷺ نے کیا کچھ فرمایا سبحان اللہ، صحابہ رضی اللہ عنہم کے نقص و عیب ثابت کرنے کے لیے جو سارے قرآن کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر حضرت نے آیتیں نکالیں ان سے

بھی ان کی فضیلتیں ثابت ہوئیں۔ پس جو آیتیں خاص کر ان کی فضیلت میں ہیں ان کا حال اسی پر قیاس کرنا چاہیے کہ ان سے کیا کچھ فضیلت ان کی ثابت ہوئی ہوگی جو کہ تین آیتوں سے جن کا ذکر مجتہد صاحب نے کیا تھا بفضل فراغت ہوگئی اب میں ایک اور چوتھی آیت نقل کرتا ہوں جسے مجتہد صاحب نے اظہار معائب صحابہ کے لیے ”ذوالفقار“ میں نقل کیا ہے:

قوله تعالى:

﴿مَا كَانَ لِنَبِيِّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَى حَتَّىٰ يُثَخِّنَ فِي الْأَرْضِ تَرِيدُونَ
عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ (سورہ انفال: ۶۷)

”کیا چاہیے نبی کو کہ اس کے ہاں قیدی آئیں جب تک کہ نہ خون کرے ملک میں تم چاہتے ہو جس دنیا کی اور اللہ چاہتا ہے آخرت اور اللہ زور آور اور حکمت والا ہے۔“

اس آیت کے لکھنے سے غرض حضرت کی یہ ہے کہ بعض لوگ پیغمبر خدا ﷺ کی نسبت کچھ اور خیال کرتے تھے اور حضرت کی تقسیم کو پسند نہ کرتے تھے..... پس اس سے یہ مطلب حضرت کا ثابت نہیں ہوتا کہ وہ کہنے والے جن کے حق میں یہ سورت نازل ہوئی ہے وہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم یا صحابہ کبار رضی اللہ عنہم تھے، بلکہ جو مفسرین شیعہ کے اقرار سے اسی آیت سے اہل بدر کی جن کا حال ابھی ہم لکھ رہے ہیں فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ کاشانی ”خلاصۃ المنہج“ میں اسی آیت کی تفسیر میں لکھتا ہے:

((اگر نہ حکمے و فرمانے می بود از خدائے تعالیٰ کہ پیشی

گرفته شدہ اثبات آن در لوح محفوظ کہ بے نہی صریح

عقوبت نہ فرمایدیا اصحاب بدر را عذاب نہ کند.))

”اگر اللہ کی طرف سے پہلے سے طے شدہ امر نہ ہوتا جو کہ لوح محفوظ میں ثابت

ہے کہ بدر والوں کو عذاب نہ کرے گا۔“

پس اس آیت سے بھی اہل بدر کی صاف فضیلت ظاہر ہوتی ہے کہ خدا ان کے حق میں

وعدہ کر چکا ہے کہ ان پر عذاب نہ کرے گا تو ایسی آیت کو معرضِ مناظرہ میں اس وقت مجتہد صاحب کو پیش کرنا چاہیے تھا جبکہ پہلے اس کی تفسیر کو ملاحظہ کر لیا ہوتا آخر اس کی تفسیر سے بھی اہل بدر کی فضیلت ثابت ہوئی۔ اصحاب بدر کی فضیلت اور ان کی مغفرت کا وعدہ خدائے پاک کی طرف سے شیعہ مفسرین کے اقرار سے ایسا ثابت ہے کہ ان کو اس سے انکار کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، چنانچہ ہم اس کو تفاسیر شیعہ سے بخوبی اس روایت کے علاوہ ثابت کرتے ہیں۔ واضح ہو کہ آیت:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ﴾

(سورہ ممتحنہ: ۱)

”اے ایمان والو نہ بناؤ میرے اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست۔“

کی شان نزول نزول میں مفسرین امامیہ لکھتے ہیں کہ ایک شخص تھا حاطب بن ابی بلتعہ صحابی اس نے کفار مکہ کو بہ نظر حفاظت اپنے خویش و اقارب کے یہ لکھ بھیجا کہ پیغمبر خدا تم پر حملہ کرنے کا قصد رکھتے ہیں سو تم بھی مستعد رہنا۔ چنانچہ پیغمبر خدا ﷺ کو وحی سے اس کا حال معلوم ہوا، تب پیغمبر خدا نے پوچھا، اس نے جواب دیا کہ میں نے بوجہ ارتداد کے ایسا نہیں کیا ہے بلکہ اپنے اہل و عیال کی اعانت کی نظر سے..... پیغمبر خدا نے اس کا عذر قبول کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! اجازت ہو تو میں اس کو قتل کروں کہ یہ منافق ہے۔ رسول مقبول ﷺ نے فرمایا کہ نہیں یہ اہل بدر سے ہے اور خدائے تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے جو جنگ بدر میں شریک تھے مغفرت کا وعدہ کیا ہے اور ان کے حق میں فرمایا ہے ﴿إِعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ﴾ ”جو چاہو کرو میں نے تم کو بخش دیا۔“ پس امید ہے کہ خدا اس کے نامہ سیاہ کو مغفرت کے پانی سے دھو دے۔

یہ خلاصہ ہے اس تقریر کا جو مفسرین امامیہ نے کی ہے۔ چنانچہ میں بلفظ ”خلاصہ المنہج“ سے جو کہ معتبر تفاسیر شیعہ سے ہے، اس کو نقل کرتا ہوں تاکہ کسی شیعہ کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہو کہ شاید کچھ تحریف کر دی ہوگی، و ہو ہذہ:

((حضرت رسالت مآب ﷺ بطریق خفا عزیمت مکہ داشت
 سارہ کنیز ابی عمرو..... الخ .))
 ”حضرت رسالت مآب ﷺ نے خفیہ طور سے مکہ جانے کا ارادہ کیا، ابو عمرو کی
 کنیز سارہ آگے بڑھی..... الخ“
 اور اسی روایت کے مطابق اہل بدر کی مغفرت کا مضمون ہے، تفسیر ”مجمع البیان“ میں کہ
 مفسر موصوف لکھتا ہے:

((وما یدریک یا عمر لعل اللہ اطلع علی اہل بدر فغفر لہم
 فقال اعملوا ماشئتم فقد غفرت لکم .))
 ”کیا جانتے ہو تو تم اے عمرؓ شاید اللہ آگاہ ہو اہل بدر پر، پس ان کو بخش دیا، پس
 کہا: کرو تو جو چاہو میں نے تم کو معاف کر دیا ہے۔“
 اس روایت کا جواب جو علماء شیعہ دیتے ہیں اس کا حال سوال و جواب سے جو باہم منشی
 سبحان علی خان صاحب اور مولوی نور الدین کے ہوئے ہیں..... ظاہر ہوتا ہے۔ منشی سبحان علی
 خان سوال کرتے ہیں:

((در تفسیر ❶ مذکور از ابتداء سورہ ممتحنہ در مطاوی بیان
 حال حاطب بن ابی بلتعہ مسطورست کہ جناب رسالت
 پناہ ﷺ بحق او فرمودند کہ اور ابحالش بگذارند و از اہل
 بدرست و بدریاں را حق تعالیٰ وعدہ مغفرت فرمودہ ، امید
 ہست کہ نامہ عصیاں اور ابہ آب مغفرت بشوید انتھی
 خلاصہ ، حالا عرض من ست کہ اصحاب ثلاثہ ہم از
 بدریاں ہستندمی باید کہ ایشان را ہم بحال ایشان گزاشتہ
 شود و لعن و طعن بحق ایشان کردہ نہ شود .))

”تفسیر ”مجمع البیان“ میں سورہ ممتحنہ کے آغاز میں حاطبؓ بن ابی بلتعہ صحابی کی بابت تحریر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حاطبؓ کے بارے میں فرمایا: اسے اس کے حال پر چھوڑ دو، یہ اصحاب بدر میں سے ہے اور بدر والوں کو بخش دینے اور معاف کر دینے کا اللہ نے وعدہ کیا ہے امید ہے کہ ان لوگوں کے گناہوں کو وہ خود آپ مغفرت سے دھو ڈالے گا۔ اس بنا پر میں عرض کرتا ہوں کہ اصحاب ثلاثہ بھی بدری ہیں، اس لیے ان کو بھی ان کے حال پر رہنے دیا جائے اور ان پر ملامت نہ کی جائے۔“

اس کے جواب میں مولوی صاحب نہایت درد دینی سے لکھتے ہیں:

((قصہ حاطب برائے خلفاء ثلاثہ بر اصول امامیہ قیاس مع الفارق ست زیرا کہ روایات جامعین اصول دلالت براں دارد کہ اینها هرگز با اعتقاد قلب سوئے جناب ختمی مآب مائل نبودند تمامی امور ایشان از صلاح و تقوی هم در حیات شریف و ہم بعد وفات مبنی بر سمعہ وریا و اینها کلهم معتقدین کاهنین و منجمین بودند بد لالت احادیث بخلاف حاطب کہ مثل اینها نبود الیٰ قوله پس عفوا حاطب مستلزم عفواز مشائخ سنیاں نیست، علاوہ گناہ حاطب را ملاحظہ فرمایند کہ فقط افشاء امریست بے آنکہ فرمودہ باشند کہ این راز را هرگز فاش نہ باید کرد و هر گاه دختران اول و ثانی بعد منع سر حضرت را فاش کردند و توبہ شان مقبول افتاد چنانچه از مجمع و غیرہ ظاہر ست پس عفو حاطب بطریق اولیٰ و آن ہم برائے آنکہ کفار قریش سرپرستی اهل و عیالش نمانید بخلاف حال کسانیکہ جناب

ختمی مآب رابز هر كشتند و چند معصوم را شهيد كردند و هزاران نسخ قرآن مجيد رآباتش نهادند و آنچه باقى گزاشتند در ان هم دادِ تحريف دادند .))

”حاطب رضی اللہ عنہ کا قصہ خلفاء ثلاثہ کے حق میں اصول امامیہ کے پیش نظر قیاس مع الفارق کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اصول جمع کرنے والوں کی روایات اس امر کا ثبوت ہیں کہ یہ تینوں خلفاء نیک نیتی کے ساتھ رسول اکرم ﷺ کی طرف مائل نہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اور آپ کی رحلت کے بعد ان تینوں کے صلاح و تقویٰ کے کام دکھائے اور ریا کاری پر منحصر رہے اور یہ سب دراصل کاہنوں اور نجومیوں کے معتقد تھے، جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے اور حاطب رضی اللہ عنہ کی کیفیت ان سے جدا تھی، حاطب رضی اللہ عنہ کو معاف کر دینے سے سنیوں کے سرداروں کو معاف کرنا لازم نہیں آتا، حاطب رضی اللہ عنہ کا جرم فقط یہ تھا کہ اس نے راز فاش کیا باوجودیکہ یہ راز فاش نہ کرنے کی کوئی ممانعت نہ تھی اور جیسا کہ ان دونوں کی لڑکیوں نے رسول اللہ ﷺ کا راز فاش کیا تو ان کی توبہ قبول ہوگئی جیسا کہ مجمع وغیرہ نے لکھا ہے، اس لیے حاطب کو معاف کر دینا بطریق اولیٰ درست تھا اس وجہ سے بھی کفار قریش اس کے اہل و عیال کی سرپرستی کریں، اس کے خلاف وہ لوگ جنہوں نے رسول اکرم ﷺ کو زہر دے کر ہلاک کیا اور کئی معصوموں کو شہید کیا اور قرآن کریم کے ہزاروں نسخے نذر آتش کیے اور جو کچھ بچے تھے ان میں تحریف و تبدیلی کی۔“

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ چونکہ خلفاء ثلاثہ کا کوئی کام مکرو فریب اور نفاق سے خالی نہ تھا، اس لیے بہ سبب عدم ایمان وہ اس فضیلت سے محروم ہیں جو کہ اہل بدر کو حاصل ہے اور یہ کہنا حقیقت میں مثل اس کہنے کے ہے کہ حضرات شیخین بدر میں شریک ہی نہ تھے یا بدر کی لڑائی فی نفسہ ہوئی ہی نہ تھی یا شیخین دنیا میں پیدا ہوئے تھے، یا پیغمبر ﷺ نے دعویٰ پیغمبری ہی نہیں

کیا کہ ایسے منکرین کا سوائے خدا کے کسی کے پاس کچھ جواب نہیں ہے۔

اس عبارت اعملاً ما شئتم فقد غفرت لکم کی نسبت بعض شیعہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ امر بعید از قیاس ہے کہ خدا کسی سے وعدہ کرے کہ جو چاہو کرو ہم نے تم کو بخش دیا ہے اور ان کے واسطے محرمات کو حلال کر دیا ہے اس کا تحقیقی جواب یہ ہے کہ اللہ یعلم حیث یجعل رسالتہ کہ خدا کو ہر شخص کی خوب خبر ہے، وہ اپنے علم اور تقدیر کے موافق ہر کام کرتا ہے، جب اس کو اہل بدر پر اطمینان تھا، تب اس نے یہ ارشاد فرمایا..... اور الزامی جواب یہ ہے کہ ذرا اپنے یہاں کی ان روایتوں کو دیکھیں جو شیعوں کی مغفرت میں ہیں کہ جن میں صاف لکھا ہے کہ بس علیؑ کی دوستی کافی ہے کسی گناہ کے بمقابلہ اس کے پرش نہیں ہے اس کو ہم اس کے مقام پر صدہا اقوال سے ثابت کریں گے۔ پس اسی طرح پر ذرا اصحاب بدر کے حال پر رحم کرو کہ اگر خدا نے بایں خیال کہ انہوں نے اپنے گھروں کو چھوڑا، اپنے وطن سے ہجرت کی، اپنے عزیزوں قریبوں سے قطع تعلق کیا، اپنے مال و دولت کو لٹایا، اپنی جان اور مال کو خدا کی راہ میں نثار کیا اور پھر اپنے بھائی بندوں کے قتل پر مستعد ہوئے اور ان کے مارنے میں خدا کی محبت کے مقابلہ میں کچھ بھی خوف نہ کیا اور جن کے مرتبے کو بڑھانے میں خدا نے ملائکہ کو ان کی مدد کے واسطے بھیجا اور سب سے پہلے لڑائی اسلام کی ان کے ہاتھوں سے فتح ہوئی اور اول معرکہ میں خدا نے ان کی ثابت قدمی اور جاں نثاری ظاہر کر دی اور اسلام کا غلبہ ان کے ہاتھ پر کیا اور آئندہ کوفتوحات اور اجراء اسلام کا دروازہ ان کی تلواروں سے کھول دیا اور سب کچھ ان کے عاشقوں، رسول ﷺ کے یاروں نے اس پاک ذات کی حضوری میں کیا جو خدا کا محبوب تھا اور جو سارے پیغمبروں کا سردار تھا، جس کی شفاعت سے بڑے بڑے کبیرہ گناہ ہوں کو خدا بخشنے گا اور جس کی سفارش سے ان لوگوں کو جنہوں نے سوائے اقرار توحید و نبوت کے کوئی بھی نیک کام نہ کیا ہوگا اور جس کی ساری عمر محرمات کے ارتکاب میں گزری ہوگی بخش دے گا..... پس جب ایسے سردار اور دین و دنیا کے بادشاہ کے ساتھ ہو کر جو سپاہی اول لڑائی میں لڑتے ہوں اور ایسے خدا کے محبوب اور ممتاز کے

قدموں پر اپنی جانوں کے نثار کرنے پر سب سے اوّل آمادہ ہوئے ہوں اور نہ صرف منافقانہ مستعدی اور ظاہری آمادگی دکھلائی ہو بلکہ جو کہا ہو وہ کر دکھلایا ہو اور جن کے لڑنے پر پیغمبر خدا نہایت عجز و منت سے دعا کرتے ہوں کہ ابھی بے چارے ان چند غریبوں محتاجوں نے صرف تیری رضا حاصل کرنے کے لیے اپنی جانوں کو قربان کرنے کا ارادہ کیا ہے، ان کو فتح دینا یہی لوگ تیرا نام بلند کرنے کے ذریعے اور تیرا دین پھیلانے کے وسیلے ہیں، اگر ان کو فتح نہ ہوئی تو پھر قیامت تک کوئی تیری عبادت نہ کرے گا اور پھر خدا نے ان کے ہاتھ پر فتح بھی دی اور انہوں نے باوجود بہت قلیل ہونے کے کفار کی ایک فوج کی فوج کو مٹا دیا اور بڑے بڑے نامی قریشی کافروں کو مثل ابوجہل وغیرہ کے تہ تیغ کیا اور ان دشمنوں کو جنہوں نے نہایت ایذا اور مصیبت سے پیغمبر خدا ﷺ کو مکہ سے نکالا اور جن مردودوں نے کمال دکھ اور تکلیف سے خدا کے حبیب ﷺ سے اس کا گھر چھڑایا خاکِ مذلت پر لٹایا اور ان کے گوشت پوست زانغ وزغن کا لقمہ کر دیا اور جن کے اس غلبے سے کافروں کے کلیجے دہل گئے اور کفارِ قریش کے بدن کا پنے لگے اور بڑے بڑے سلاطین میں ان کے ایمان اور شوکت کا شہرہ ہو گیا تو پھر ایسی محنتوں، کوششوں اور ایمان اور اخلاص کے صلے میں خدا نے جو نکتہ نواز ہے اور جو اپنے رحم و کرم سے ایک عمل کے بدلہ میں ستر اور سات سو حصہ زیادہ ثواب دیتا ہے اور جو صرف اپنے فضل سے براہ بندہ نوازی صرف زبان و دل سے بغیر کسی عمل کرنے کے توبہ قبول کر لیتا ہے اور بہ موجب آیت کریمہ:

﴿يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ﴾ (سورہ فرقان : ۷۰)

”بدل دے گا اللہ برائیوں کی جگہ بھلائیاں۔“

کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیتا ہے، ان پاک لوگوں سے مغفرت کا وعدہ کر لیا اور ان کی شان میں اعمالوا ماشئتم فقد غفرت لکم فرما دیا تو کیا مقام تعجب اور حیرت کا ہے..... کیا اے حضراتِ شیعہ! تم خدا کو رحیم نہیں جانتے، کیا تم اللہ جل شانہ کو نکتہ نواز نہیں سمجھتے، کیا وہ اپنے بندوں پر فضل نہیں کرتا، وہ ان کے اعمال سے ہزار ہا حصہ زیادہ ثواب نہیں

دیتا..... تو جب تمام آدمیوں کے ساتھ بلکہ گناہ گاروں کے ساتھ اور کافروں کے ساتھ اس کے رحم و کرم کا یہ حال ہو کہ اگر گبر صد سالہ اور مشرک ہفتاد سالہ جس نے اپنی ساری زندگی بت پرستی اور کفر میں ضائع کر دی ہو ایک دفعہ صدق دل سے کلمہ شہادت پڑھ لے اور توحید و نبوت کا مقرر ہو جائے تو خدا اس کے ایک لمحہ کے ایمان پر اس کے سو برس کے کفر و شرک بخش دیتا ہے تو پیغمبر خدا ﷺ کے یاروں اور رسول مقبول کے اوپر جاں نثاروں کے حق میں بغیر دیکھے ان کے ایمان اور اخلاص اور ہجرت اور جہاد اور نصرت کے وعدہ مغفرت کا کیا تو کیا تم بعد از قیاس سمجھتے ہو..... کیا تم نہیں جانتے کہ اکثر اعمال خاص کسی خاص وجہ سے زیادہ عزت اور عمدہ صلہ کے مستحق ہو جاتے ہیں..... مثلاً: دنیا کے حال پر خیال کرو کہ اگر کوئی سپاہی کسی جمع دار کے ساتھ کسی چھوٹی لڑائی پر جائے اور فتح کر لے تو اس کی عزت ہوگی اور اس کو جمع دار کے ساتھ لڑنے میں کیا انعام ملے گا اور بادشاہ کے ساتھ ہو کر لڑنے اور فتح ہونے پر کیا نغمہ ملے گا؟ اگر تم دونوں میں کچھ فرق نہیں کرتے اور دونوں حالتوں کو برابر سمجھتے ہو تو حقیقت میں تم خطاب کے لائق نہیں ہو اور اگر دونوں کے رتبے میں تمیز کرتے ہو تو پھر اس وعدے کو خدائی نغمہ کیوں نہیں سمجھتے جو کہ ایسی بڑی لڑائی کے صلہ میں ہو جو سید الانبیاء سند الاصفیاء محبوب کبریا شاہ ہر دوسرا کی معیت میں ہوئی۔

دیکھو حدیث شریف میں آیا کہ قیامت کے دن کچھ گناہ گار ایسے دوزخ میں پڑے رہیں گے جن کے گناہوں کی کثرت اور شدت سے انبیاء بھی بلکہ سید الانبیاء ﷺ بھی شفاعت نہ کریں گے تو خدا ان کے حال پر خود رحم کرے گا اور ان کو دوزخ سے نکال کر جنت میں بھیج دے گا اور ان کی نور کی گردنوں میں نور کی تختی پر نور سے لکھ دے گا کہ (هَذَا عِتْقَاءُ الرَّحْمٰنِ مِنَ النَّیْرَانِ) کہ یہ آزاد کیے ہوئے ہیں خدا کے دوزخ سے، جن کا نہ کوئی شفیع تھا نہ سفارشی۔ پس اگر خدا نے ان لوگوں کو جو کہ خاص اس کے بندے تھے اور جنہوں نے اپنے قصور کو ظاہر بھی کر دیا اور ان کے نیک کاموں کا نتیجہ بھی ظاہر ہو گیا، اپنے فضل سے دنیا میں نور کا نغمہ کہ (اعملوا ما شئتم فقد غفرت لكم) دے دیا تو سوائے کفار اور

فاسقین کے کون اس پر تعجب کر سکتا ہے اور کس کو خدا کی ذات سے اس بخشش پر تعجب ہو سکتا ہے۔ ذرا اُن روایتوں کو چند صفحے لوٹ کر دیکھو کہ پیغمبر خدا ﷺ نے جب جہاد پر آمادگی ظاہر کی اور مہاجرین و انصار سے پوچھا تو انہوں نے کیا جواب دیا اور پھر ان میں بھی سب سے اوّل کون بولا سوائے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اور کون پہلے اٹھا اور کس نے پیغمبر خدا ﷺ کے قدم چوم کر یہ کہا کہ یا حضرت ہم تو اوّل ہی جان و مال اپنا آپ ﷺ پر قربان کر چکے ہیں اور اپنا گھر بار آپ پر لٹا چکے، بھائی بندوں کو چھوڑا، یار دوستوں کو چھوڑا۔ اب ایک جان باقی ہے وہ بھی آپ پر نثار ہے اور ایک جان کیا ہزار جانیں ایسی یا رسول اللہ ﷺ آپ پر قربان ہیں۔ قطعہ:

میخواہم از خدا بد عاصد ہزار جاں
تاصد ہزار بار بمیرم برائے تو
من کیستم کہ بھر تو جاں را فدا کنم
اے صد ہزار جاں مقدس فدائے تو

”اے خدا! مجھے سو ہزار جانیں دے دے تاکہ تیرے واسطے سو بار مر سکوں، میں

کون ہوں کہ تیرے واسطے جان فدا کروں تیرے لیے سو ہزار جانیں فدا ہیں۔“

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کہنے نہ پائے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور سعد بن معاذ رضی اللہ

اٹھے اور انہوں نے بھی اپنی جاں نثاری کا شوق ایسا ہی بیان کیا۔ دیکھو تمہارے ہی مذہب کا مؤرخ ان اصحاب کبار کے ولولے اور شوق اور عشق اور آمادگی کو کتنی لفظوں سے لکھتا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ جب پیغمبر خدا ﷺ نے سوال کیا تب، اشعار.....

پس اسخ ابوبکر از جای خاست
وزاں پس عمر نیز قد کر دراست
بگفتند یا سید المرسلین
قد پیش بگذار و مارا بہ بیس

کہ با دشمن دیں چھامی کنیم
 چہ ساں در پیت جاں فدای کنیم
 بود تابہ تن جاں و در کف تو او
 بیاریم شمشیر بر دشمنان
 ز جا خاست ایں بار سعد معاذ
 چنیں گفت از روی صدق و نیاز
 کہ با جان و دل با ہمیں عہد دست
 بدست تو روزیکہ دادیم دست
 سر و مال و فرزند و خویش و تبار
 ہماں روز کردیم بر تو نثار

”پہلے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے، اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے انہوں نے کہا اے سید المرسلین ﷺ آپ آگے بڑھیے اور پھر ہمیں دیکھئے کہ ہم دشمنوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں کس طرح آپ پر جان فدا کرتے ہیں، جب تک جسم میں جان اور ہاتھوں میں طاقت ہے دشمنوں پر تلوار چلاتے رہیں گے، اس مرتبہ سعد بن معاذ کھڑے ہوئے اور سچائی و نیاز مندی سے کہا کہ جان و دل سے اسی عہد پر قائم ہیں جس پر آپ کے ہاتھوں بیعت کی ہے، سر مال اولاد اور عزیز واقارب اسی دن آپ پر قربان کر چکے ہیں۔“

پس جب ان اہل بدر کے شوق، محبت، ایمان اور اخلاص کا یہ حال تو تم صرف ایک اعملوا ما شئتم پر تعجب کرتے ہو اور ان وعدوں کو جو خدا نے ان کے واسطے جاہہ جا قرآن مجید میں کیے ہیں کچھ خیال نہیں کرتے اس سے تو صرف مغفرت ثابت ہوتی ہے۔ ذرا قرآن مجید کھول کر دیکھو کہ مہاجرین و انصار کی شان میں خدا نے کیا کیا فرمایا ہے..... دیکھو.....

﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾ (سورۃ توبہ: ۱۰۰)

”اللہ راضی ان سے وہ راضی اس سے۔“

ان کی شان میں فرمایا ہے یا نہیں؟

﴿أَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾ (سورہ توبہ: ۱۰۰)

اللہ نے ان کے لیے باغ تیار کیے اس کے نیچے نہریں جاری۔“

ان کے حق میں کہا ہے یا نہیں؟

﴿ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ (سورہ توبہ: ۱۰۰)

”یہی تو بڑی کامیابی ہے۔“

ان کی نسبت قرآن میں آیا ہے یا نہیں۔

پس جو جو وعدے خدا نے ان سے کیے ہیں اس سے تو سارا قرآن بھرا ہوا ہے۔ تم ایک ہی وعدے پر تعجب کرتے ہو اور ان کی ساری خوبیوں سے چشم پوشی کر کے ان کے معائب تلاش کرتے ہو، اے یارو! ذرا انصاف کرو اور خدا کے لیے اپنے یہاں کی حدیث اور سیر کی کتابوں کو دیکھو کہ شیعین کوفی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا کیا اور ان کی کیسی قدر کی اور کوفہ کے فضائل میں تمہارے یہاں کے محدثین کیا لکھتے ہیں وہی شیعین کوفی تھے جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ چھوڑا اور جنہوں نے ہمیشہ جناب امیرؓ کو رنجیدہ رکھا..... وہی کوفی تھے جنہوں نے امام حسن رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہ دیا، جنہوں نے ان کے قدموں سے مصلیٰ تک نکال لیا، وہی کوفی تھے جنہوں نے اول حضرت مسلم کے ساتھ بیعت کی اور پھر وقت پر سب کے سب چنپت ہو گئے اور آخر بے چارے مسلم تن تنہا مع دو معصوم بچوں کے شہید ہو گئے۔ وہی کوفی تھے جنہوں نے امام حسین رضی اللہ عنہ کو بلایا اور شوق و ذوق کے خط لکھے، چنانچہ بارہ ہزار خط شیعوں نے امام کو بھیجے اور جن کے سرنامہ پر یہی تھا کہ یہ خط علی رضی اللہ عنہ اور تمہارے شیعوں کی طرف سے ہے اور پھر ان خطوں میں کیسا اپنا شوق بیان کیا کہ کچھ بیان نہیں ہوتا، پس جب اس تمنا سے بلائیں اور نہایت اپنی آرزو ظاہر کریں کہ یا ابن رسول اللہ ﷺ آپ جلد تشریف لائیے اور اس خطہ کو رونق دیجیے، کوفہ کی زمین ہمہ تن چشم انتظار ہو رہی ہے، درودیوار

سے خیر مقدم کی آواز آرہی ہے، ہر شخص کی زبان پر لبیک لبیک کی صدا ہے، ہر آدمی جمال باکمال کے انتظار میں محو ہو رہا ہے، ذرا جلد تشریف لائیے، ہم سب جاں نثاری کو حاضر ہیں پھر دیکھیے ہم کیا کرتے ہیں، اشعار.....

سپاہی چوں آشفقہ پیلانِ مست
 ہمہ نیزہ گرزو خنجر بدست
 ز تورایت فتح افراختن
 زمال شکر بیکراں ساختن
 چو باتیغ آہنگ خون آورند
 ز سنگ آب و آتش بروں آورند
 چوں تیر از کمان در کمین آورند
 سر آسماں برز میں آورند

”مست ہاتھی کی طرح ہم آپ کے سپاہی ہیں سب نیزہ گرز اور خنجر لیے ہوئے ہیں آپ کے ذریعہ فتح کا جھنڈا بلند ہوگا، اس کے لیے ہمارا بے حساب لشکر تیار ہے جب تلوار سے لڑائی کا ارادہ کریں گے تو پتھر سے پانی اور آگ نکال لیں گے جب کمان سے تیر نشان پر لگائیں گے تو آسمان کا سرزمین پر لے آئیں گے۔“

جب حضرت امامؑ جائیں تو ایک بھی ساتھ نہ دے اور عذر و فریب کر کے یکہ و تنہا امام کو شہید کریں اور تین دن کا بھوکا پیاسا قتل کریں جس کے حال پر آسمان وزمین کو قیامت تک رقت ہے اور اس کے باوجود کوفہ کی وہ عزت بیان کی جائے کہ مکہ اور مدینہ کو بھی وہ عزت نہیں ہے، چنانچہ ملا باقر مجلسی ”تحفہ الزائرین“ میں لکھتے ہیں:

((در حدیث معتبر دیگر از حضرت امام جعفر صادق
 منقول است کہ حق تعالیٰ عرض کرد و لایت مارا بر ہر اہل
 شہر پس قبول نہ کردند مگر اہل کوفہ .)) انتھی بلفظہ

”ایک دوسری معتبر حدیث میں حضرت امام جعفر صادق سے منقول ہے کہ حق تعالیٰ نے ہماری ولایت کو ہر شہر والوں پر پیش کیا تو کسی نے قبول نہ کیا سوائے کوفہ والوں کے۔“

اس سے صاف ثابت ہوا کہ جو رتبہ خدا نے کوفہ کو دیا ہے اور اس کے رہنے والوں کو وہ نہ مکے کو ہے نہ مدینے کو بلکہ ایک حدیث میں امام زین العابدینؑ کی طرف سے ملا باقر مجلسی نے صاف لکھ دیا ہے کہ امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں:

((بقدری جای پادر کوفہ نزد من بہتر ست از خانہ کہ در مدینہ داشتہ باشم .))

”کہ کوفے کی ایک قدم رکھنے کی جگہ میرے نزدیک اس گھر سے بہتر ہے جو مدینے میں ہو۔“

یہ کوئی شبہ نہ کرے کہ کوفہ کے رہنے والے شیعہ نہ تھے اس لیے کہ بہ مقتضائے الحدیث بعضا یفسر بعضا خود قاضی نور اللہ شوستری ”مجالس المؤمنین“^① میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں، ذرا اس کو سینے، عبداللہ بن ولید سے روایت ہے:

((گفت در زمان بنی مروان بخدمت امام جعفر علیہ السلام رفتم آنحضرت از من ورفیقان من پرسیدند کہ شما چہ کسانید گفتم از اهل کوفہ ایم آنحضرت فرمودند در ہیچ از يك بلاد ایس قدر دوست نداریم کہ در کوفہ بعد از ان فرمودند کہ ایتها العصابہ ان اللہ ہدا کم الامر جہلہ الناس و جتہمونا و ابغضنا الناس و بایعتمونا و خالقا الناس و وافقتمونا و کذبنا الناس و صدقتمونا فاحیا کم اللہ محیانا و اما تکم مماتنا .))

① مجالس المؤمنین ترجمہ اردو صفحہ ۱۲۰، صفحہ ۱۲۱ ناشر اکبر حسین جیوانی ٹرسٹ، کراچی۔

”میں ایک روز مروانیوں کے سلطنت کے زمانہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور امام نے پوچھا تم کہاں رہتے ہو، میں نے جواب دیا کہ کوفہ میں، حضرت نے فرمایا کہ کسی شہر میں ہمارے اتنے دوست نہیں ہیں جتنے کوفہ میں اور پھر فرمایا کہ خدا نے تم کو فیوں کو اس بات کی ہدایت کی ہے، جس سے اور سارے لوگ جاہل رہے، تم کو فیوں نے ہم سے محبت کی اور سب نے ہمارے ساتھ دشمنی کی، تم کو فیوں نے ہماری بیعت کی اور سب نے مخالفت، تم نے ہمارا ساتھ دیا اور سب نے ہم کو جھٹلایا، تم نے ہماری تصدیق کی ہے۔ خدا تم کو ہماری زندگی پر جیتا رکھے اور ہماری سی موت پر تمہاری موت ہو۔“

اس حدیث کو کہیں کہیں قاضی نور اللہ شوستری لکھتے ہیں:

((بالجملہ تشیع اہل کوفہ حاجت بہ اقامت دلیل ندارد.))

”اہل کوفہ کے شیعہ ہونے پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔“

پس اے مومنین! اب دبیر اور انیس کے مرثیے جلاؤ اور کتاب خوانی موقوف کرو، اس لیے کہ جن کو فیوں کی تم شکایت کرتے ہو اور جنہوں نے امام حسین علیہ السلام کو شہید کیا وہ خاص اس کوفہ کے تھے جہاں کے رہنے والے امام کے جان و جگر تھے اور جس کا رتبہ امام کے نزدیک مکہ مدینہ سے بھی زیادہ تھا اور جس کے رہنے والوں کی موت اور زندگی امام کی سی تھی۔ پس وہ کوفہ جس کی ایسی عزت ہو اور وہ کوفی جن کی یہ قدر و منزلت ہو، مذمت کے لائق نہیں ہیں، ان کی شان میں مدح کے قصیدے کہو اور ان پر رحمت بھیجو، اس لیے کہ وہ کوفہ معیار تشیع ہے، کوفی ہونا شیعہ ہونے کی دلیل ہے۔ چنانچہ قاضی نور اللہ شوستری تمہاری ”مجالس المومنین“ میں فرماتے ہیں:

((کوفی بودن شخصے دلیل تشیع است اگرچہ ابو حنیفہ

کوفی باشد.))

”کسی شخص کا کوفی ہونا شیعہ ہونے کی دلیل ہے اگرچہ ابو حنیفہ کوفی ہے۔“

پس اے حضراتِ شیعہ! جن کو فیوں کے حالات آج کل تمہارے چھوٹے چھوٹے بچے بھی جانتے ہیں اور جاہل لڑکے بھی ان کے حق میں اَلْكَوْفِيُّ لَا يُوفِيْ پڑھتے ہیں اور جن کے حالات مکروغدر اور بے وفائی کے محرم میں علی رُوَس المنابر تمہارے چھوٹے بڑے سب بیان کرتے ہیں اور جن کا امام کو تشنہ کام شہید کرنا ہر آدمی پر ظاہر ہے اور اس شعر کا مضمون: شعر

از آب ہم مضائقہ کردند کو فیاں

خوش داشتند حرمتِ مہمان کربلا

”کو فیوں نے پانی بھی تنگ کر دیا کربلا کے مہمان کی اچھی عزت کی۔“

سب پر روشن ہے، ان کی شان میں ائمہ کرام کی ایسی ایسی تعریفیں تمہارے محدثین نقل کریں اور اس کو امام کی طرف نسبت دیں اور امام کی زبان سے ان کے حق میں یہ کلمہ کہ ”تم کو خدا ہماری سی زندگی اور ہماری سی موت دے۔“ نقل کریں اور کوفہ کی ایک مشیت خاک کو مدینہ منورہ کی زمین سے بھی زیادہ امام کے نزدیک محبوب ہونا بیان کریں اور کو فیوں کو ائمہ کا محبوب اور دوست کہیں اور ائمہ کی دوستی کے سبب ان کو جنتی اور بہشتی جانیں اور پھر ان لغویات اور ہدیانات کو سن کر تمہارے ایمان کی رگ کو ذرا بھی جنبش نہ ہو اور تمہارے پاک دلوں کو کچھ بھی وسوسہ پیدا نہ ہو بلکہ ان کو فیوں کی حرکتوں کی ہر سال خود نقلیں کر کے مَا هَذِهِ التَّمَاثِيلُ الَّتِي أَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُونَ کا مضمون ادا کرو اور اپنے مجتہدین و محدثین کی نسبت ان روایات کا ذبہ اور اقوالِ مہملہ کے نقل کرنے پر کچھ غیرت ایمانی کا جوش نہ دکھلاؤ بلکہ سب کو جھوٹ ہو یا سچ، غلط ہو یا صحیح آمننا و صدقنا کہہ کر تصدیق کرو اور جب رسول ﷺ کے یاروں اور پیغمبر کے حواریوں کا نام آئے اور بدریوں کی نسبت مغفرت کا وعدہ کسی بے چارے سنی کی زبان سے سنو تو بس سنتے ہی سارے بدن کا خون جوش کرنے لگے اور تمام جسم تعصب کی آگ سے پھکنے لگے، تشیع کا وہ جوش ہو کہ رگ رگ مارے غصے کے پھول جائے، عداوت کا وہ غلیان ہو کہ سودا صفر اسب ایک ہو جائے، اس وقت سارے شیطانی وسوسے دل میں پیدا ہو جائیں، لفظ لفظ پر گرفت بات بات پر شبہ کرنے لگو۔

سبحان اللہ! اپنے کوفیوں کے برابر بھی بدریوں کا رتبہ نہیں سمجھتے اور ان کے حق میں جن باتوں اور جن قولوں کو صادق سمجھتے تھے ان کو پیغمبر ﷺ کے یاروں کے حق میں غیر صادق کہتے ہو۔ یہ کیسا ایمان ہے کہ نام تو رسولؐ کا لو اور کلمہ پڑھو عبد اللہ بن سبا کا، ایمان تو تم کو نصیب ہو خلفاء کے طفیل اور شکر ادا کرو اس یہودی ملعون کا اور پھر پاک صاف بن کر سنیوں کے سامنے ہو کر مباحثہ کا قصد کرو اور خدا کی آیتوں اور رسول ﷺ کی حدیثوں اور ائمہ کے قولوں کو چند مفتری مکاروں کے مقابلہ میں جھٹلاؤ۔

بھائیو! یہ کیسا دین اور ایمان ہے، یا تو مسلمانی کو چھوڑو، پاک صاف یہودی بن جاؤ یا اگر مسلمان ہو تو مسلمانوں کے سے عقیدے رکھو، اس خرافات و اہیات مذہب پر جس کی بنا سراسر جھوٹ اور فریب پر ہے تبرا بھججو، اس کے بانیوں پر لعنت کرو ورنہ ایسے دو لفظ ہیں چھوٹا چھوٹا کاذب چھوٹے چھوٹے منہ سے ایسا بڑا دعویٰ ایمان کا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ مسلمان ہونا اور پھر رسول خدا ﷺ کے یاروں کو برا سمجھنا عجب ایمان ہے کہ جو لفظ ہی لفظ ہے جس کے کچھ معنی نہیں اور پوست ہی پوست ہے جس میں کچھ مغز نہیں سچ کہا ہے جس نے کہا ہے: شعر

وجدو منع بادہ اے زاہد چہ کافر نعمتے ست

دشمن می بودن و ہمرنگ مستان زیستن

”مستی اور شراب سے روکنا اے زاہد کیسی نعمت کی ناشکری ہے، دشمن بھی ہو

شراب کے اور مستوں کی سی زندگی بھی ہے۔“

غرض جو فضیلت خدا نے اہل بدر کو دی اور جس کا ثبوت قرآن مجید سے ہوتا ہے اور جس کا اقرار مفسرین شیعہ بھی کرتے ہیں اور جن کے اعمال بھی اس پر دلالت کرتے ہیں وہ کسی قدر ہم لکھ چکے اب اس کے مقابل میں ایک قول مجتہد صاحب ثانی کا جو ”مقالہ ثالثہ“ میں اپنی کتاب کے لکھا ہے اور جس کا جواب ”ازالۃ الغین“ ہے نقل کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ حضرات شیعہ کے نزدیک ان کا درجہ کیسا ہے، مجتہد صاحب فرماتے ہیں:

((دعویٰ نفاق ایشاں و غدر اہل بدر .))

”ان کے نفاق کا دعویٰ اور اہل بدر کی دعا۔“

((ورضوان علی مدعا ماست ماہم ﴿يُخْدِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ

أَمَنُوا وَمَا يُخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسُهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ﴾ (سورہ بقرہ: ۹)

”اور اللہ کی رضا مندی ہمارے مدعا کے مطابق ہے کہ دعا بازی کرتے ہیں اللہ

سے اور ایمان والوں سے حالانکہ نا سمجھی میں وہ خود ہی کو دعا دیتے ہیں۔“

سبحان اللہ! کیا دین و ایمان ہے کہ کوئی تو اہل وفا ہوں اور اصحابِ بدر رضی اللہ عنہم اہل غدر

ہوں۔ خدا اس قوم سے سمجھے اور ان کے کفریات کا بدلہ دے، نعوذ باللہ من ہفواتہم!

مجتہد صاحب قبلہ ”ذوالفقار“ میں آیات فضیلت صحابہ رضی اللہ عنہم کے معارضے میں ایک اور

آیت لکھتے ہیں، یعنی:

﴿إِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ وَإِنْ يَقُولُوا تَسْبَعُ لِقَوْلِهِمْ كَأَنَّهُمْ

خُشْبٌ مِّنْ سِنْدٍ لَا يَحْسَبُونَ كُلَّ صَحِيَةٍ عَلَيْهِمْ هُمُ الْعُدُو فَاخْذِرْهُمْ

قَتَلَهُمُ اللَّهُ أَنَّى يُؤْفَكُونَ﴾ (سورہ منافقون: ۴)

”جب تو دیکھے ان کو اچھے لگیں تجھ کو ان کے جسم اور اگر بات کہیں تو سننے تو ان کی

بات، کیسے ہیں جیسے کہ لگا دی لکڑی دیوار سے، جب کوئی چیخ ہو تو سمجھیں ہمیں پر

بلا آئی، وہی ہیں دشمن، ان سے بچتا رہ، گردن مارے اللہ ان کی کہاں سے

پھرے جاتے ہیں۔“

مگر اس میں بھی مجتہد صاحب نے مغالطہ دیا اور تحریف سے کام لیا اور اخیر کی آیتوں کو

چھوڑ کر بیچ میں سے ایک دو آیتیں لکھ دیں، اب میں ان کو لکھ کر اس کی تفسیر بیان کرتا ہوں۔

واضح ہو کہ یہ آیت جو مجتہد صاحب نے فضیلت کے معارضہ میں پیش کی ہے یہ سورہ

منافقوں کی ہے جو کہ منافقین کی شان میں خدا نے نازل کی ہے اور شروع اس کا یہ ہے:

﴿إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ وَاللَّهُ

يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ ۝ اتَّخَذُوا
 أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝
 ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا فَطُبِعَ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ ۝
 وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ وَإِنْ يَقُولُوا تَسْبَحَ لِقَوْلِهِمْ كَأَنَّهُمْ
 خُشُبٌ مُسْنَدَةٌ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ
 قَاتَلَهُمُ اللَّهُ أَنَّى يُؤْفَكُونَ ۝ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ
 رَسُولُ اللَّهِ لَوَّارُءٌ وَسَهُمٌ وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ ۝
 سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ
 لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝ هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا
 تُنْفِقُوا عَلَى مَنْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ حَتَّى يَنْفَضُوا وَاللَّهُ خَزَائِنُ
 السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَفْقَهُونَ ۝ يَقُولُونَ لَعِنَ
 رَبَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ
 وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝ ﴿المنافقون : ١-٨﴾

”جب آئیں تیرے پاس منافقین، کہیں ہم قائل ہیں تو رسولؐ ہے اللہ کا، اور اللہ جانتا ہے کہ تو اس کا رسولؐ ہے اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔ انہوں نے رکھا ہے اپنی قسموں کو ڈھال بنا کر، پھر روکتے ہیں اللہ کی راہ سے۔ یہ لوگ جو کر رہے ہیں برے کام ہیں۔ یہ اس لیے کہ وہ ایمان لائے پھر منکر ہو گئے، پھر مہر لگ گئی ان کے دل پر، سو وہ اب کچھ نہیں سمجھتے، اور جب تو دیکھے ان کو تو اچھے لگیں تجھ کو ان کے ڈیل اور اگر بات کہیں سنے تو ان کی بات، کیسے ہیں جیسے کہ لکڑی لگا دی دیوار سے، جو کوئی چنچے جانیں ہمیں پر بلا آئی، وہی ہیں دشمن ان سے بچتا رہ، گردن مارے ان کی اللہ، کہاں سے پھرے جاتے ہیں اور جب کہیں ان کو آؤ معاف کرادے تم کو اللہ کا رسولؐ، مٹکاتے ہیں اپنے سر اور تو دیکھے

کہ وہ رکتے ہیں اور وہ غرور کرتے ہیں، برابر ہے ان پر تو معافی چاہے ان کی یا نہ معافی چاہے، ہرگز نہ معاف کرے گا ان کو اللہ، بے شک اللہ راہ نہیں دیتا نافرمان لوگوں کو۔ وہی ہیں جو کہتے ہیں مت خرچ کرو ان پر جو پاس رہتے ہیں، رسول اللہ کے یہاں تک کہ متفرق ہو جائیں، اور اللہ کے ہیں خزانے آسمانوں کے اور زمین کے لیکن منافق نہیں سمجھتے۔ کہتے ہیں البتہ اگر ہم پھر گئے مدینہ کو تو نکال دے گا جس کا زور ہے وہاں سے کمزور لوگوں کو۔ اور زور تو اللہ کا ہے اور اس کے رسول کا اور ایمان والوں کا، لیکن منافق نہیں جانتے۔“

ان ساری آیتوں کے نقل کر دینے سے ہی مجتہد صاحب کا جواب ہو گیا اور جو مغالطہ اور دھوکہ حضرت نے دیا تھا وہ کھل گیا اور یہ معلوم ہوا کہ یہ آیتیں منافقوں کے بارے میں ہیں۔ مگر حضرات شیعہ سے کب امید ہے کہ وہ صرف قرآن مجید کے الفاظ اور اس کے معنی پر قناعت کریں۔ ضرور ہے کہ وہ اس پر بھی ساکت (خاموش) نہ ہوں گے، اس لیے ہم انہیں کی تفسیر سے اس کی شان نزول بیان کرتے ہیں:

واضح ہو کہ تفسیر علی^۱ بن ابراہیم قمی میں جو کہ ابو جعفر^۲ کلینی کے استاذ تھے سورہ منافقون

۱ تفسیر علی بن ابراہیم قمی روافض کی قدیم ترین تفسیروں میں ہے۔ بقول روافض اس کے مفسر ابو الحسن علی بن ابراہیم بن ہاشم قمی گیارہویں امام حسن عسکریؑ کے شاگرد تھے، تیسری صدی ہجری کے ممتاز شیعہ علماء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ فہرست طوسی میں ان کی نسبت لکھا ہے علی بن ابراہیم بن ہاشم القمی ابو الحسن ثقہ فی الحدیث ثبت معتمد صحیح المذہب۔ (فہرست طوسی مطبوعہ کلکتہ صفحہ ۲۰۹) یعنی علی بن ابراہیم بن ہاشم قمی ابو الحسن حدیث میں ثقہ ہے پکا ہے معتمد ہے صحیح المذہب ہے۔

۲ ابو جعفر محمد بن یعقوب بن اسحاق کلینی الرازی ایران کے شہر رے کے قریب کلین نامی ایک دیہات میں بزمانہ حضرت امام حسن عسکریؑ لگ بھگ ۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ دوسرے اساتذہ کے علاوہ انہیں علی بن ابراہیم قمی اور علی بن محمد سمری آخری نائب خاص (امام فرضی) کی شاگردی کا شرف بھی حاصل تھا۔ روافض کے مذہب کی اساس اور بنیاد جن چار کتابوں (کتب اربعہ) پر ہے ان میں سب سے جامع اور مستند ترین کتاب ”الکافی“ انہیں کی تالیف ہے..... روافض کے خیال میں اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اسے امام زمانہ کے نائبین کے عہد میں لکھا گیا ہے اور وہ بارہویں (فرضی) امام کی تصدیق شدہ بھی ہے۔ الفضل مطبع اللہ کے دور حکومت میں ۳۲۹ھ میں انتقال ہوا۔ (شیخ محمد اثرست)

کے نزول کا سبب اس طور پر لکھا ہے کہ ۷ ہجری میں جبکہ غزوہ بنی المصطلق پر پیغمبر خدا ﷺ تشریف لے گئے جب وہاں سے لوٹے تو راہ میں ایک کنویں پر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے اجورہ دار نے جس کا نام ججاہ تھا، انس بن سیار کو جو کہ انصار کا منہ بولا بھائی تھا مارا۔ عبد اللہ بن ابی کو جو کہ مدینہ کا رہنے والا تھا یہ خبر ہوئی، اس کو ناگوار ہوا اور اپنے لوگوں، یعنی مدینہ والوں سے کہا کہ اسی لیے قریشیوں کا آنا نہیں چاہتا تھا، یہ سب تمہارے کام ہیں کہ تم نے ان مکے کے رہنے والوں کو اپنے گھروں میں اتارا اور اپنے مالوں کو ان پر خرچ کیا اور اپنی جانوں کو ان کے پیچھے تلف کیا اور اپنی بیویوں کو بیوہ، اپنے بچوں کو ان کی خاطر سے یتیم کیا، تب یہ ذلت ہوئی اگر تم ان کو نکال دیتے تو وہ دوسروں کے اوپر جا پڑتے اور یہ کہہ کر یہ کہا: ﴿لَعْنُ رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لِيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ﴾ ”یعنی اگر ہم مدینہ واپس لوٹے تو عزت والا ذلیلوں کا نکال دے گا۔“ اس قوم میں ایک لڑکا موجود تھا جس کا نام زید بن ارقم تھا، اس نے پیغمبر خدا ﷺ سے یہ خبر کہہ دی، حضرت ﷺ کو اس بات کے سننے سے بڑا رنج ہوا اور انہوں نے کوچ کی تیاری کی کہ سعد بن عبادہ دوڑے آئے اور کہا کہ یا رسول اللہ! یہ تو وقت آپ کے کوچ کرنے کا نہیں ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم نے اپنے صاحب کی باتیں سنیں، انہوں نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ! ہمارا صاحب تو آپ ﷺ کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہے۔ تب حضرت ﷺ نے فرمایا کہ عبد اللہ بن ابی گمان کرتا ہے کہ اگر مدینے کو لوٹے تو عزت والے ذلیلوں کو نکال دیں گے۔ تب سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یا حضرت آپ ﷺ اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم عزت والے ہیں اور عبد اللہ بن ابی اور اس کے اصحاب ذلت والے ہیں۔

غرض یہ سن کر خزرج جو مدینہ والوں کا ایک قبیلہ ہے، عبد اللہ بن ابی پر لعنت ملامت کرنے لگے، اس نے حلف کیا کہ میں نے تو کچھ نہیں کہا تو لوگوں نے کہا کہ اچھا پیغمبر صاحب ﷺ کے سامنے چل کر عذر کر، اس نے اپنی گردن جھکائی تب دوسرے دن صبح کو وہ پیغمبر ﷺ کے سامنے آیا اور حلف کیا (قسم کھائی) کہ میں نے کچھ نہیں کہا اور کہا کہ اَشْهَدُ

اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ اور عذر کیا کہ زید نے میرے اوپر جھوٹی تہمت کی تھی۔ پھر لوگ زید رضی اللہ عنہ پر ملامت کرنے لگے، آخر خدا نے سورہ منافقون نازل کی اور پیغمبر خدا نے وہ سورہ اصحاب کو جمع کر کے سنائی۔ فقط

غرض کہ یہ قول ایک بڑے مفسر سے ثابت ہوا کہ یہ سورت عبداللہ بن ابی بن سلول مناقق کے بارے میں نازل ہوئی اور جناب قبلہ وکعبہ نے نہ معنی سمجھے نہ شان نزول پر خیال فرمایا، نہ اپنی تفسیروں کو دیکھا، بلکہ دیدہ و دانستہ کچھ آیتیں اوپر کی اڑا دیں اور کچھ نیچے کی، بیچ میں کی دو آیتیں لکھ کر اصحاب رضی اللہ عنہم کی فضیلت کے معارضے میں پیش کیں..... اگر ایسا ہی معارضہ کرنا تھا تو جو آیتیں قرآن مجید میں بنی اسرائیل، فرعون اور نمرود اور شداد کی شان میں ہیں ان سب کو فضیلت صحابہ رضی اللہ عنہم کی آیات کے معارضے میں لکھ دیتے تاکہ کتاب کا حجم بھی بڑھ جاتا اور حضرت کی قرآن دانی کا بھی لوگ اقرار کرنے لگتے۔

غرض کہ جناب قبلہ وکعبہ ان آیات کو لکھ کر فرماتے ہیں:

((وامثال این دیگر آیات ست پس لابدست کہ در جمع بین آلیات گفته شود کہ مورد آیات مناقب غیر مورد آیات ذم ست پس بعضے صحابہ آنحضرت عموماً ممدوح باشند و بعضے مذموم و این عین مطلوب شیعیان است.))

”مندرجہ بالا آیات کی مانند اور بھی آیات ہیں اور ضروری ہے کہ جمع آیات کے بارے میں وضاحت کی جائے کہ آیات مناقب اور آیات مذمت جن کے بارے میں نازل ہوئی ہیں یہ لوگ الگ الگ ہیں، یعنی رسول اللہ ﷺ کے بعض صحابہ قابل تعریف اور بعض قابل مذمت ہیں اور شیعوں کا کہنا بھی یہی

ہے۔“ (ذوالفقار مطبوعہ مطبع مجمع البحرین لدھیانہ ۱۲۸۱ھ صفحہ ۶۴)

پس یہ وہم جناب قبلہ وکعبہ کو قرآن مجید کی آیات کے معنی نہ سمجھنے سے پیدا ہوا ہے، اس وہم کا علاج تفسیر اور شان نزول کا مطالعہ تھا، اگر حضرت شان نزول دیکھتے اور اپنی ہی تفسیروں

کو ملاحظہ فرماتے اور اگلی پچھلی آیتوں کو ملا کر غور کرتے تو حضرت یہ ضابطہ اور کلیہ جمع بین الآیات کا ارشاد نہ فرماتے۔ اس لیے کہ جو آیتیں کافروں اور منافقوں کی شان میں ہیں ان سے مہاجرین اور انصار و اصحاب نبوی کو کچھ تعلق ہی نہیں ہے اور یہ آیتیں جن میں کفر، نفاق اور دین میں سستی وغیرہ کا ذکر ہے وہ منافقوں کی شان میں ہیں جو اصحاب نبوی ﷺ میں داخل نہیں ہیں..... اصحاب نبوی اور منافقوں میں تناقض کی نسبت ہے نہ کہ توافق کی..... اس لیے ان آیتوں کا جو کہ اصحاب رضی اللہ عنہم کی فضیلت میں ہیں ان آیتوں سے ملانا جو کہ منافقین کی مذمت میں ہیں درحقیقت جمع بین الآیات نہیں ہے بلکہ حضور جمع بین النقیضین ہے جو ہمارے نزدیک ممتنع اور آپ کے نزدیک ممکن ہے۔ پس اپنے لیے آپ گھر بیٹھے ایسی آیتوں کو جمع کیا کیجیے اور اپنے دل میں قاعدے بنایا کیجیے اور انہیں موضوع اور غلط اصول پر کسی کو خارج کسی کو داخل کیجیے۔ یہاں تو خدا کی ہدایت و ضلالت نے ہم کو اس جمع سے فارغ کر دیا جن کو چاہا مہاجرین و انصار میں داخل کیا جن کو چاہا منافقین میں شامل کیا۔

یا نچو یں دلیل صحابہ رضی اللہ عنہم کے منافق نہ ہونے کی:

جو شخص قرآن مجید پر ایمان رکھتا ہوگا وہ مہاجرین اور انصار کی نسبت منافق کے لفظ کو ہرگز نہ بولے گا، اس لیے کہ قرآن مجید میں بہت سی آیتیں ہیں جس میں صاف یہ حکم ہے کہ منافقوں سے نہ ملو، ان سے راضی نہ رہو اور ان کو اپنے ساتھ جہاد میں نہ رکھو، ان کا کچھ عذر نہ سنو..... پس اگر مہاجرین اور انصار خصوصاً خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم منافق ہوتے تو کیوں پیغمبر ﷺ ان کو ذلیل نہ کرتے اور کیوں ان کو اپنی صحبت میں رکھتے اور کیوں ان سے صلاح و مشورہ لیتے اور کیوں ان کو اپنے ساتھ جہاد میں رکھتے..... چنانچہ جو دعویٰ میں نے کیا ہے اس کے ثبوت میں دو تین آیتوں کو لکھتا ہوں:

اللہ جل شانہ فرماتا ہے:

پہلی آیت:

﴿يَعْتَذِرُونَ إِلَيْكُمْ إِذَا رَجَعْتُمْ إِلَيْهِمْ قُلْ لَا تَعْتَذِرُوا لَنْ نُؤْمِنَ

لَكُمْ قَدْ نَبَأْنَا اللَّهُ مِنْ أَخْبَارِكُمْ وَ سَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُولُهُ
 ثُمَّ تَرُدُّونَ إِلَىٰ عِلْمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝
 سَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ إِذَا انْقَلَبْتُمْ إِلَيْهِمْ لِنُعْرِضُوا عَنْهُمْ فَأَعْرِضُوا
 عَنْهُمْ إِنَّهُمْ رَجَسٌ وَ مَا وَبِيهِمْ جَهَنَّمَ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝
 يَحْلِفُونَ لَكُمْ لِنُرَضُوا عَنْهُمْ فَإِنْ تَرَضُوا عَنْهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَرْضَىٰ
 عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ۝ (التوبه: ۱۴ تا ۹۶)

”بہانے لائیں گے تمہارے پاس جب پھر کر جاؤ گے ان کی طرف، تو کہہ
 بہانے مت بناؤ، ہم نہ مانیں گے تمہاری بات، ہم کو بتا چکا ہے اللہ تمہارے
 احوال، اور بھی دیکھے گا اللہ تمہارے کام اور اس کا رسول، پھر جاؤ گے اس چھپے اور
 کھلے جاننے والے کی طرف، سو وہ بتا دے گا تم کو جو کر رہے تھے۔ اب قسمیں
 کھائیں گے اللہ کی تمہارے پاس جب پھر جاؤ گے ان کی طرف تا کہ ان سے
 درگزر کرو، سو درگزر کرو ان سے، وہ لوگ ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے،
 بدلہ ان کی کمائی کا، قسمیں کھائیں گے تمہارے پاس کہ تم ان سے راضی ہو جاؤ
 سو اگر تم راضی ہو گے ان سے تو اللہ راضی نہیں ہوتا نافرمان لوگوں سے۔“

ان آیتوں سے چند باتیں ثابت ہوئیں:

- ۱۔ منافقوں کا عذر کرنا اور اس پر پیغمبر ﷺ کا یقین نہ کرنا۔
 - ۲۔ پیغمبر خدا ﷺ کا ان کے حال سے آگاہ ہونا۔
 - ۳۔ ان کا جلد سزا پانا اپنے اعمال کے بدلے میں۔
 - ۴۔ پیغمبر ﷺ کو ان سے روگردانی کا حکم ہونا اور ان سے ملنے کی ممانعت۔
 - ۵۔ کتنا ہی وہ حلف دیں کہ راضی ہو، ان سے راضی ہونے کی ممانعت۔
 - ۶۔ ان کا مسلمانوں کی ہمیشہ ذلت چاہنا اور اسی فکر میں رہنا اور پھر خود ہی ان کا ذلیل ہونا۔
- اب ان باتوں میں سے صرف ایک ہی بات کو مہاجرین اور انصار خصوصاً خلفائے ثلاثہ

سے مطابق کر دیجئے یا پیغمبر ﷺ کو باوجود ایسے احکام الہی کے اور نفاق خلفائے ثلاثہ کے ان سے روگردانی نہ کرنے پر پیغمبر ﷺ کی شان میں جو چاہے سو کہیے ہماری زبان سے تو کچھ بے ادبی کا کلمہ نہیں نکلتا اور عدول حکمی یا تقیہ کا ایسے پاک صاف کی نسبت اطلاق نہیں ہو سکتا۔

دوسری آیت:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ﴾ (سورہ توبہ: ۷۳)
 ”کہ اے پیغمبر! جہاد کر کافروں سے اور منافقوں سے۔“

تو اگر منافقین و انصار منافق تھے تو اتنا ارشاد کر دیجئے کہ کب اور کس کے ساتھ پیغمبر خدا ﷺ نے ان پر جہاد کیا یا ان کے منافق ہونے کے باوجود پیغمبر نے خدا کے حکم کی تعمیل نہ کی۔

تیسری آیت:

﴿فَإِنْ رَجَعَكَ اللَّهُ إِلَى طَائِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَأْذِنُوكَ لِلْخُرُوجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوا مَعِيَ أَبَدًا وَلَنْ تُقَاتِلُوا مَعِيَ عَدُوًّا﴾ (سورہ توبہ: ۸۳)
 ”پھر اگر پھیر لے جائے اللہ تجھ کو کسی فرقہ کی طرف ان میں سے، پھر یہ رخصت چاہیں تجھ سے نکلنے کی تو تو کہہ کہ ہرگز نہ نکلو گے میرے ساتھ کبھی اور نہ لڑو گے میرے ساتھ کسی دشمن سے۔“

اس آیت کے مطالعے کے بعد یہ فرما دیجئے کہ پیغمبر ﷺ اپنے ساتھ جہاد پر ان لوگوں کو جنہیں تم منافق کہتے ہو لے گئے یا نہیں؟ اگر تمہیں معلوم نہ ہو تو چند ورق الٹ کر ”حملہ حیدری“ کے اشعار جنگ بدر کے دیکھ لو۔

چوتھی آیت:

﴿يَحْذَرُ الْمُنَافِقُونَ أَنْ تَنْزَلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِي قُلُوبِهِمْ قُلِ اسْتَهِزْءُ وَإِنَّ اللَّهَ مَخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُونَ﴾ (سورہ توبہ: ۶۴)

”ڈرا کرتے ہیں منافق کہ نازل نہ ہو ان پر کوئی سورت کہ جتائے اُن کو جو ان کے دل میں ہے تو کہہ ٹھٹھے کرتے ہو، اللہ کھولنے والا ہے جس چیز کا تم کو ڈر ہے۔“

اس آیت کو پڑھ کر ذرا یہ فرما دیجئے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے ان لوگوں کے نفاق کو جنہیں تم منافق کہتے ہو کبھی ظاہر کیا اور لوگوں پر ان کا نفاق کھول دیا، یا نہیں اور سوائے حذیفہ رضی اللہ عنہ کے جس سے دروازہ بند کر کے نہایت آہستہ زبان دبا کر نفاق ظاہر کرنے کا حال آپ لوگ بیان کرتے ہیں کسی مجمع میں بھی ان کے نفاق کا حال حضرت نے ظاہر کیا۔

غرض کہ اس کے مثل بہت سی آیتیں منافقوں کے حال میں ہیں جن کا لکھنا ضروری نہیں ہے، پس مسلمان کو اتنا سوچ لینا چاہیے کہ اگر مہاجرین و انصار منافق ہوتے تو پیغمبر ﷺ ان کے نفاق کو ظاہر کیوں نہ کرتے اور کیوں وہ ذلیل نہ ہوتے اور ان کے مارے جانے اور قتل ہونے اور ذلیل و رسوا ہونے کا جو وعدہ خدا نے کیا تھا وہ کیوں پورا نہ ہوتا بلکہ برخلاف اس کے اور ان کی عزت ہوتی اور روم و شام اور ایران و مصر پر ان کو غلبہ ہوتا۔ استغفر اللہ! عجیب عقیدہ ہے شیعوں کا کہ نہ قرآن کے مطابق نہ حدیث کے۔

اب باقی رہے چند اعتراض جو خلفائے ثلاثہ اور مہاجرین و انصار کی نسبت حضرات شیعہ کرتے ہیں اور اس سے ان کے نفاق پر دلیل لاتے ہیں:

- ۱۔ احد اور حنین کی لڑائی کا معاملہ۔
- ۲۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نفاق کا حال حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھنا۔
- ۳۔ صلح حدیبیہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا شک کرنا۔
- ۴۔ لیلۃ العقبہ کو قتل پیغمبر ﷺ کا ارادہ کرنا۔
- ۵۔ فدک کا غصب کرنا۔
- ۶۔ قرطاس (قلم و کاغذ) پیغمبر ﷺ کو نہ دینا۔
- ۷۔ علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے خلافت کا غصب کرنا۔

۸ آل رسول ﷺ سے عداوت رکھنا۔

اور اس کے مثل دوسرے اعتراضات جن کے نام ہر ورق اور ہر صفحہ میں مجتہد صاحب کے قلم سے ”ذوالفقار“ وغیرہ میں نکلے ہیں اور جن کا شافی جواب دینا ہم کو منظور ہے نہ کہ مجتہد صاحب کی طرح خلطِ مبحث کرنا اور گول مول بات کہہ کر آگے بڑھ جانا۔ اس لیے ان شاء اللہ تعالیٰ مطاعن صحابہ اور خلافت کی بحث میں اس تفصیل کے ساتھ یہ سب بیان کیے جائیں گے کہ جس کو دیکھ کر حضراتِ شیعہ بے اختیار کہنے لگیں:

﴿وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾

(سورة بنی اسرائیل: ۸۱)

”یعنی حق آیا اور باطل گیا، باطل تو جانے ہی والا ہے۔“

غرض کہ اس مقام پر میں نے آیاتِ فضیلتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کو بیان کر کے سب شیعوں کی طرف سے یہ بیان کیا تھا کہ وہ کہتے ہیں: جو آیتیں مہاجرین و انصار کی فضیلت میں ہیں یہ ان لوگوں سے متعلق ہیں جو کہ ایمان دار تھے اور اکثر اصحاب رضی اللہ عنہم خصوصاً خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم ایمان نہ رکھتے تھے، چنانچہ اس سے میں نے یہ بحث کی کہ ایمان نہ رکھنے کے دو معنی ہیں:

۱۔ یہ کہ خدا اور رسول کے منکر تھے کہ ایسے شخص کو منافق کہتے ہیں، چنانچہ جو آیتیں اس کے معارضے میں مجتہد صاحب نے لکھی ہیں اس کا جواب ہو گیا اور بخوبی ثابت ہو گیا کہ وہ منافق نہ تھے۔

۲۔ یہ کہ وہ اصولِ موضوعہ شیعہ میں سے ایک اصول ”امامت“ کے منکر تھے کہ اس وجہ سے وہ کافر تھے۔ اس کا بھی اجمالی جواب دے چکا کہ جب آیتیں نازل ہوئیں اور جس وقت خدائے جل شانہ نے ان کی تعریف کی اس وقت امامتِ اصولِ دین سے نہ تھی، اگر اس وقت امامت کا اصول دین سے ہونا ثابت کر سکو تو کرو (و فعلیکم بالبیان وعلینا وقفہ بالبرهان .)

پس دو باتیں باقی رہ گئیں:

۱۔ یہ کہ پیغمبر خدا ﷺ کی وفات کے بعد وہ امامت کے منکر ہو گئے اور علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا حق چھین لیا۔

۲۔ اہل بیت سے عداوت رکھی اور ان کے حقوق غصب کیے کہ یہ امور بھی کفر ہیں۔ چنانچہ اس کا جواب میں بحث امامت اور مطاعن میں دوں گا اور ہر بات کو اس تفصیل سے لکھوں گا کہ نہ کسی شیعہ کی کوئی دلیل رہ جائے نہ کسی سنی عالم کا جواب باقی رہے، یعنی وہ سوال و جواب جن کے سننے کے بغیر حالت منتظرہ باقی رہے، نہ یہ کہ جتنے دنیا میں شیعہ سنی ہوئے ہیں ان سب کی باتیں کہ یہ مجال اور فضول بھی ہیں مگر ان شاء اللہ تعالیٰ اس صراحت سے لکھوں گا کہ صرف دیکھنے والے کو انصاف اور فیصلہ کرنا رہ جائے اور اکثر روایت کے دیکھنے کی ضرورت نہ رہے۔ لیکن اس مقام پر وہ جوابات جو عام آیات فضیلت صحابہ رضی اللہ عنہم سے شیعہ دیتے ہیں اور جس میں سے کچھ اوپر مذکور ہوئے اور کچھ رہ گئے ہیں ان باقی ماندہ جوابوں کو بیان کر کے قرآن و حدیث ہی سے اس کا جواب دینا شروع کرتا ہوں:

﴿فَاسْتَبِعُوا لَهُ وَانصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ (سورہ اعراف: ۲۰۴)

”تو اس طرف کان رکھو اور چپ رہو شاید تم پر رحم ہو۔“

شیعوں کا دوسرا جواب آیاتِ فضیلت صحابہ رضی اللہ عنہم سے:

جو کچھ اوپر ہم نے بیان کیا اس میں صرف ہم نے شیعوں کا یہی جواب لکھا ہے کہ مہاجرین میں سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نیت بخیر نہ تھی۔ اب سنیوں کے علاوہ اور کیا جواب دیتے ہیں..... شاہ صاحب ”تحفہ“ میں ملا عبداللہ کی تقریر کو نقل کرتے ہیں کہ ملا عبداللہ نے یہ جواب دیا ہے کہ اللہ جل شانہ نے جو رضا مندی اپنی آیت:

﴿وَالسَّابِقُونَ الْأُولُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ﴾

(سورہ توبہ: ۱۰۰)

”اور سابقون الاولون مہاجرین اور انصار میں سے۔“

میں مہاجرین اور انصار کی نسبت بیان کی ہے یہ صرف سبقتِ ہجرت و نصرت کی نسبت ہے اور خاص اس فعل سے وہ راضی ہوا مگر اس سے ان کا جتنی ہونا لازم نہیں ہوتا، اس لیے کہ اس کے واسطے اس رضا کا آخر تک باقی رہنا ضروری ہے اور آخرت تک رضا باقی رہنے کا حال خاتمے پر ہے..... اس تقریر کو لکھ کر شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ تقریر قواعد اصول کی رو سے درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ خدائے جل شانہ نے مہاجرین و انصار کی ذات کی تعریف کی ہے اور چونکہ وصفِ عنوانی میں سبقتِ ہجرت و نصرت کا ذکر کیا، اس لیے یہ وصف غلبہ تعلق رضا کی ہوگی نہ کہ یہی وصف تعلق رضا کے..... اس کے جواب میں جناب مجتہد صاحب ”ذوالفقار“ میں فرماتے ہیں:

((هنوز باثبات نہ رسیده کہ مراد از سبقت دریں جا سبقت فی
الہجرت ست پس غایت مافی الباب علت رضا سبقت الی
الاسلام یا سبقت الی الموت یا سبقت الی الہجرت لا علی
الیقین خواہد بود و این علت مبہمہ برائے تو بھیچ وجہ مفید
نمی تو اند شد .))

”یعنی یہ سب تقریریں تو اس وقت کی جائیں کہ جب یہ بات ثابت ہو جائے کہ مراد السابقون الاولون من المهاجرین و الانصار سے ہجرت میں سابق ہونا ہے حالانکہ یہی بات ہمارے یہاں صاف نہیں ہے کہ ﴿وَالسَّابِقُونَ﴾ سے کیا مراد ہے آیا ہجرت کی سبقت یا اسلام کی سبقت یا موت کی سبقت، پس جبکہ علت مبہم ہے تو وہ کچھ مفید مطلب نہیں۔“

غرض کہ حضرت نے سارا قصہ ہی طے کر دیا کوئی جھگڑے کی بات ہی نہ رکھی، یعنی یہ سب فضیلتیں تو جب ثابت ہوں کہ ﴿وَالسَّابِقُونَ﴾ کے کیا معنی ہیں؟ آیاتِ ہجرت میں سبقت کرنے والے مراد ہیں یا کہ اسلام میں سبقت کرنے والے مقصود ہیں یا کہ موت پر سبقت کرنے والے، یعنی مردے مراد ہیں..... پس جب اسی میں شبہ ہے تو ایسی مبہم بات کی

سند کچھ مفید نہیں..... غرض کہ علت رضا کے مبہم ہونے کے سبب اس آیت سے کچھ کسی کی فضیلت ہی ثابت نہیں ہوتی اور یہ معنی جو حضرت نے فرمائے ہیں یہ بڑے غور و تامل کے بعد فرمائے ہیں، چنانچہ خود اس سے پیشتر فرما چکے ہیں:

((ایضاً آنچہ بعد تامل و نظر دقیق ظاہر می گردو صفحه ۵۷

ذوالفقار تا قولہ اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال .))

”نیز غور فکر اور تامل کے بعد ظاہر ہوتا ہے صفحہ ۵۷ از ذوالفقار، اور جب شک و

شبہ پیدا ہو جائے تو استدلال باطل ہو جاتا ہے۔“

اب قبلہ و کعبہ اس تقریر کو اپنی مدلل کرتے ہیں اور منطقی دلائل سے اس امر کو ثابت فرماتے ہیں کہ مراد ﴿وَالسَّابِقُونَ﴾ سے موت کی طرف سبقت کرنے والے ہیں، یعنی مردے جو مر چکے ہیں وہ مراد ہیں، کما یقول:

((وثنائاً اینکہ علت رضائے مهاجرین و انصار از حق تعالیٰ

مجرد ہجرت و نصرت نمی تواند شد بلکه نظر دقیق حکم

می کند کہ رضای آنها از حق تعالیٰ و تسلیم او امر و نواہی

او علت ہجرت و نصرت شدہ و این قرینہ دیگر است بر اینکہ

مراد از سابقین سابقین الی الموت اند .))

”یعنی مهاجرین و انصار سے خدا کی رضا مندی کا سبب یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ فقط

پیغمبر خدا ﷺ کے ساتھ ہجرت کرنے سے یا رسول مقبولؐ کو مدد دینے سے وہ

راضی ہو جائے بلکہ نظر دقیق حکم کرتی ہے کہ ان کا خدائے تعالیٰ سے راضی ہونا

اور اس کے اوامر و نواہی کا بجا لانا ان کی ہجرت و نصرت کی علت ہے۔ پس یہ

دوسرا قرینہ ہے کہ مراد ﴿وَالسَّابِقُونَ﴾ سے سابقین الی الموت ہیں، یعنی جو کہ

مرنے میں سبقت اور پیش قدمی کر گئے اور سب سے پہلے مر گئے۔“ فقط

سبحان اللہ! کیا نظر دقیق ہے جناب قبلہ و کعبہ کی کہ کیا خوب معنی نکالے ہیں، حقیقت

میں بے چارے شاہ صاحب ایسی دقیق نظر کہاں سے لاتے جو ان باریک نکتوں کو سمجھتے کہ مراد ﴿وَالسَّابِقُونَ﴾ سے مُردے ہیں..... خیر ہم نہایت شکر ادا کرتے ہیں، مجتہد صاحب کا کہ مردے مہاجرین و انصار تو اس میں داخل رکھے اگر وہ ﴿وَالسَّابِقُونَ﴾ کے معنی یہی کہتے کہ حضرت آدم علیہ السلام مراد ہیں کہ انہوں نے سب سے پہلے جنت سے ہجرت کی تھی۔ یا حضرت موسیٰ علیہ السلام مراد ہیں جنہوں نے مدین کو ہجرت کی تھی تو ہم کیا کرتے، یا فرما دیتے کہ ﴿وَالسَّابِقُونَ﴾ سے مراد جبرئیل و میکائیل ہیں جو سب سے پہلے پیدا ہوئے ہیں تو ہمارا کیا بس چلتا..... بہر حال جب معنی ہی بنانا پڑے اور نظم قرآنی کا کچھ لحاظ نہ رہا تو پھر بے سرو پا بات کہہ دینے والے سے کیا زور چل سکتا ہے۔ جو کچھ وہ رعایت کرے وہی احسان ہے۔

کوئی یہ خیال نہ کرے کہ قبلہ و کعبہ نے بے دلیل یہ دعویٰ کیا ہے، اس لیے کہ بے دلیل بات کہنا جاہلوں کا کام ہے اور یہ شاہ صاحب کا حصہ ہے، حضرت کوئی بات بے دلیل و برہان کے زبان پر نہیں لاتے۔ چنانچہ اس دعویٰ کی دلیل میں فرماتے ہیں:

((وایس قرینہ دیگر است براینکہ مراد از سابقین اولین الی

الموت اندچہ موت اهل جنت و مشاہدہ درجات را مدخلیہ

تمام در رضائے آنها از حق تعالیٰ ست .))^①

”کہ ﴿وَالسَّابِقُونَ﴾ کے لفظ سے وہ لوگ جو موت کی طرف سبقت کر گئے

مراد لینے کا یہ دوسرا قرینہ ہے، اس لیے کہ جنت میں پہنچ جانا اور اپنے مراتب و

درجات کا دیکھنا اور آرام سے بہشت میں چین کرنا ان سب باتوں کو بڑا دخل

ہے کہ وہ لوگ خدا سے راضی ہوئے۔“ فقط

بے شک درست ہے جو لوگ زندہ ہیں وہ بہ سبب اس کے کہ نہ معلوم خدا جنت دے گا یا

نہیں اور اگر دینے کا یقین بھی ہو تو بہ سبب دنیاوی تکالیف کے وہ خدا سے پورے پورے

راضی نہیں ہو سکتے، جب مر گئے اور خدا نے ان کو بہشت نصیب کر دی اور آزادی سے جنتوں

کے لطف اٹھانے لگے تو وہ بخوبی خدا سے راضی ہو جائیں گے اور نصرت و ہجرت کا سبب آپ اوپر لکھ ہی چکے ہیں کہ یہ ہے کہ وہ خدا سے راضی تھے تو اب کیا شک رہا کہ ﴿وَالسَّابِقُونَ﴾ سے وہی لوگ مراد ہیں جو آیت کے نازل ہونے سے پہلے مر چکے تھے..... بے شک جیسا دعویٰ تھا اس سے بہت بڑھ کر دلیل ہے، مجتہدوں اور مقدس لوگوں کے ایسے ہی دعوے اور ایسی ہی دلیلیں ہوتی ہیں..... زہے نصیب ایسے فرقے کے جس کے ایسے عاقل، ذکی اور ذہین مجتہد ہوں۔

چونکہ جناب قبلہ و کعبہ نے اپنی کتاب کو نہایت ہی مدلل اور مبرہن لکھا ہے، اس لیے صرف ایک دو دلیل ہی اپنے دعوے پر نہیں بیان فرمائیں بلکہ اپنے ہر ایک دعوے کو دلیلوں سے ثابت کیا ہے کہ کسی سنی کو اس کے رد کرنے کی جرأت نہیں ہے، چنانچہ اسی آیت کی نسبت جو تیسرا جواب دیا ہے اسے بھی میں لکھتا ہوں، حضرت فرماتے ہیں:

((ثالثاً اینکه غایت مافی الباب آنکہ از آیہ علت بودن هجرت و نصرت در باب رضائے حق تعالیٰ از آنها و رضای آنها از و تعالیٰ شانہ، می تواند شد و علت اعم است از اینکه تامہ باشد یا ناقصہ استعمال علت ناقصہ در کلام حق تعالیٰ و احادیث نبوی شیاع تمام دارد و اگر بسبب غباوتِ ذہن کہ داری دریس باب تأمل داشته باشی پس قرآن مجید را از اول بنظر بصیرت تلاوت کن و در آیات و وعدہ و عید تأمل نماتا صدق این مقال واضح گردد.))^①

”سوم خلاصہ یہ کہ اس آیت سے ان کی ہجرت و امداد کی علت و دلیل اللہ سے خوش ہونا اور ان سے اللہ کی رضا مندی ہو سکتی ہے اور یہ علت و سبب عام ہے تام ہو یا ناقص، اور سبب و علت ناقص کا استعمال کلام الہی اور احادیث نبوی ﷺ

میں عمومی طور پر پایا جاتا ہے، اگر تم بے انتہا کند ذہن ہونے کے باوجود ذرا سا غور و تامل کرو اور قرآن کریم کو اوّل سے آخر تک بہ غور پڑھو، جزا و سزا کی آیات پر غور کرو تو ہماری بات کی صداقت واضح ہو جائے۔

اس سے پایا گیا کہ گویا اللہ جل شانہ، ان کی ہجرت و نصرت سے تو راضی ہو گیا مگر یہ علت ناقص ہے، اس لیے ان کے سب کاموں سے راضی ہونا ثابت نہ ہوا..... افسوس ہے کہ ذرا مجتہد صاحب نظم قرآنی کو ملاحظہ نہیں فرماتے اور ترجمہ لفظی کو بھی نہیں دیکھتے اور تحریف معنوی خدا کے کلام میں فرماتے ہیں۔ بارِ خدایا تیرا کلام چہستان ہے یا یہ آیت پہلی ہے یا کوئی معممہ ہے جس کے لیے ایسے ایسے خیالات کو حضرت قبلہ و کعبہ استعمال کرتے ہیں..... چار لفظ اس آیت کے ہیں ذرا اس کا ترجمہ کریں اور سمجھ لیں۔

اے مومنین! ذرا سنو کہ اس آیت کا لفظی ترجمہ وہی ہے جو میں بیان کرتا ہوں یا اور کچھ، اوّل آیت کے الفاظ سنو کہ یہ ہیں:

﴿وَالسُّبْقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ
بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي
تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾

(سورہ توبہ: ۱۰۰)

”اور آگے بڑھ جانے والے پہلے ہجرت کرنے والوں سے اور مدد دینے والوں سے اور وہ لوگ کہ پیروی کرتے ہیں ان کی نیکی کے ساتھ، راضی ہوا اللہ ان سے اور راضی ہوئے وہ اس سے اور تیار کیں ان کے واسطے بہشتیں چلتی ہیں ان کے نیچے نہریں، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، یہ ہے مراد پانا بڑا۔“

اب خیال کرو کہ جو علتیں تامہ اور ناقصہ مجتہد صاحب ان صاف لفظوں میں پیدا کرتے ہیں یہ تحریف ہے یا نہیں اور اگر ایسی ہی علتوں کو خدا کے کلام میں دخل دیا جائے تو سارا قرآن باز بچہ پغلاں ہو جائے اور کسی آیت اور کسی حکم پر عمل کرنا جائز اور تصدیق کرنا ممکن نہ ہو۔ اللہ

جل شانہ تو صاف صاف فرماتا ہے ﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾ کہ میں ان سے اور وہ مجھ سے راضی، حضرت فرماتے ہیں کہ یہی علت رضا مندی کی ناقص ہے، وہ سب باتوں سے راضی نہیں ہے بلکہ صرف ہجرت اور نصرت کے سبب سے راضی ہے اور گو حضرت نے صاف نہیں فرمایا مگر مطلب یہی ہے کہ غصب خلافت اور عداوت اہل بیت کے سبب سے ناراض ہے، اس لیے اے میرے بندو اس رضا مندی کو تام، یعنی پوری نہ سمجھنا اور اس سے مہاجرین و انصار کو اچھا نہ جاننا..... افسوس ہے کہ قبلہ و کعبہ نے یہ نہ فرمایا کہ قرآن میں یہ بھی ہے کہ اگر کسی کو شک ہو اور میری آیتوں سے یہ مطلب کوئی نہ سمجھے تو مجتہد صاحب نے فرمایا کہ ﴿وَالسَّابِقُونَ﴾ سے مراد ضرور مُردے ہیں، اس لیے کہ خدا ان کے حال سے خبر دیتا ہے کہ وہ خدا سے راضی ہوئے اور یہ امر معلوم ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو یہ مناسب تھا کہ خدا فرماتا ﴿يَرْضُونَ﴾ یعنی مضارع کے صیغہ سے کہ وہ راضی ہوں گے خدا سے، چنانچہ حضرت کے الفاظ یہ ہیں:

((زیرا کہ جناب حق سبحانہ و تعالیٰ از حال ایشاں خبر می دہد کہ ایشاں از خدای خود راضی شدند و معلوم است کہ اگر اینہا زندہ می بودند مناسب این بود کہ حق تعالیٰ بصیغہ مضارع کہ یرضون باشد این مطلب را اد انماید نہ بصیغہ ماضی .))^①

”اس لیے کہ اللہ ان کے حالات کی اطلاع دے رہا ہے کہ وہ اپنے خدا سے راضی ہوئے اور واضح ہے کہ یہ لوگ زندہ رہتے تو ضروری تھا کہ اللہ ماضی کے صیغہ کے بجائے مضارع کا صیغہ لاتا، یعنی راضی ہوں گے اور اس سے مطلب واضح ہو جاتا۔“

۱۔ پس اوّل تو یہ فرمانا حضرت کا کہ ”معلوم است کہ اگر اینہا زندہ می بوند“

ہم کو معلوم نہیں یہ جناب ہی کو معلوم ہوگا اور دنیا میں بندوں کا خدا سے راضی ہونا آپ ہی کے نزدیک بعید از قیاس ہوگا ورنہ ہم کو یہ معلوم کیا بلکہ یقین ہے کہ جتنے خاص بندے اللہ جل شانہ کے ہیں وہ اس دنیا میں بھی راضی ہیں اور کیسے ہی کچھ دکھ درد پائیں وہ راضی رہتے ہیں تو زندوں کی نسبت ﴿وَرَضُوا عَنْهُ﴾ کا مضمون آپ کو باعث تعجب ہوگا کیونکہ آپ حالت زندگی میں خدا سے راضی نہیں رہے، ورنہ ہم تو اسے یقینی جانتے ہیں۔

۲۔ یہ سب علتیں تامہ اور ناقصہ اور صیغہ ماضی مضارع کے احتمالات اور استدلال صرف بے چارے مہاجرین اور انصار ہی کی نسبت ہیں یا کہ اہل بیت علیہم السلام کی نسبت بھی۔ پس جو تقریریں آپ صحابہ رضی اللہ عنہم کی نسبت کرتے ہیں اور جس طرح آیات فرقانی میں آپ مہاجرین و انصار کی فضیلت باطل کرنے کے لیے تحریفات اور احتمالات کرتے ہیں اگر خوارج و نواصب اہل بیت علیہم السلام کی نسبت کریں تو آپ کیا جواب دیں گے۔ جو آپ ان کو جواب دیں وہی ہماری طرف سے تصور فرمائیں۔

۳۔ مجتہد صاحب نے احتمالات کر کے ان آیتوں کے معنی بدلنے میں ایک بڑی خطا کی اور بوجہ اس کے کہ اس کتاب کے لکھنے میں بہت عجلت کی تھی ایک بہت بڑی بات بھول گئے کہ ﴿وَالسَّابِقُونَ الْأُولُونَ﴾ میں جناب امیر علیہ السلام بھی داخل ہیں اور ان کی فضیلت پر بھی یہی آیتیں سند لائی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ وہ سب سے اول اور سابق ہیں اسلام میں اور ہجرت میں، پس جبکہ ﴿وَالسَّابِقُونَ﴾ سے مراد مردے ہیں اور کوئی زندہ اس میں داخل نہ رہا تو پھر جناب امیرؑ بھی اس سے خارج ہو گئے۔ بارخدا یا تب شاید یہ کہیں کہ زندوں میں صرف وہی اس آیت کے مصداق ہیں اور باقی سب مردے مراد ہیں اور اگر کوئی تخصیص کی وجہ پوچھے تو پھر وہی اپنا شیوہ اختیار کریں اور اپنی تشبیح پر آجائیں اور گالیاں دینا شروع کریں اور غبی، کودن اور احمق فرما کر اس کی بات نہ سنیں جیسا کہ اس مقام پر علت تامہ و ناقصہ کے نہ سمجھنے پر شاہ صاحب کی نسبت

فرماتے ہیں:

((اگر بہ سبب غباوت ذہن کہ داری دریں باب تامل داشتہ باشی پس قرآن مجید را از اوّل جز بنظر بصیرت تلاوت کن و در آیات وعده و وعید تامل نماتا صدق این مقال واضح گردد.)) ❶

”اگر اپنی کند ذہنی کے باوجود قدرے غور و فکر کرتے تو مناسب تھا قرآن کریم کو اوّل سے آخر تک بہ غور پڑھو، آیات جزا و سزا میں فکر کرو تا کہ ہماری بات کی صداقت واضح ہو جائے۔“

چوتھے: جناب قبلہ و کعبہ کا ماضی مضارع کے صیغوں سے بحث کرنا درحقیقت دائرہ تشبیح کو تنگ کرنا ہے، اس لیے کہ پھر بہت سی آیتیں فضیلت اہل بیت کی انہیں صیغوں کی بحث سے نکل جائیں گی اور ایسے اعتراض کرنے والوں کا جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔ اس سے قواعد نحو و صرف کا نام ہی زبان پر نہ لائیے ورنہ اگر کوئی پوچھ بیٹھے:

﴿وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا﴾

(سورہ دھر: ۸)

”کھلاتے ہیں کھانا اس کی محبت پر محتاج، یتیم اور قیدی کو۔“

مضارع کے صیغے ہیں اور ماضی کے معنی میں لیے جاتے ہیں اس لیے کہ نذر پوری کر دینے اور یتیموں، مسکینوں اور اسیروں کو کھانا کھلانے کے بعد یہ آیات جناب فاطمہ اور حسنین علیہم السلام کی شان میں نازل ہوئیں تو آپ کیا جواب دیں گے۔ اور اگر کوئی کہے:

﴿فَوْقَهُمُ اللَّهُ شَرُّ ذَلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّهْمُ نَصْرَةً وَسُرُورًا ۝ وَجَزَاهُمْ

بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا﴾ (سورہ دھر: ۱۲-۱۱)

”پھر بچایا ان کو اللہ نے اس دن کی برائی سے اور ملائی ان کو تازگی اور خوشی اور

بدلہ دیا ان کو ان کے صبر کا جنت اور ریشمی پوشاک۔“
 سب صیغہ ماضی کے ہیں اور معنی مضارع کے مراد لیے جاتے ہیں تو آپ کیا فرمائیں گے،
 پس اگر فرض بھی کیا جائے اور آپ کا قول تسلیم بھی کیا جائے:

((مناسب این بود که حق تعالیٰ بصیغہ مضارع کہ یرضون

باشد این مطلب را ادا نماید نہ بصیغہ ماضی .))

”مناسب یہ تھا کہ حق تعالیٰ اس مطلب کو مضارع کے صیغہ سے ادا فرماتا نہ کہ

ماضی کے صیغہ سے۔“

تو اس کا جواب یہ ہے:

((حق تعالیٰ امرے را کہ یقینی و قطعی ست بصیغہ ماضی

ادامی نماید چنانکہ در فضائل اہل بیت امرے را کہ بعد از

قیام قیامت ظہور خواهد یافت بصیغہ ماضی ادا کردہ حیث

قال تبارک و تعالیٰ ﴿فَوْقَهُمُ اللَّهُ شَرُّ ذَلِكَ الْيَوْمُ وَلَقَّهُمْ نَصْرَةً وَّ

سُرُورًا.....الخ﴾ ہمچنین رضای سابقین اولین از مہاجرین و

انصار زیرا کہ در آخرت علو مرتبہ خود را دیدہ راضی

خواہند شد بصیغہ ماضی ادا کردہ و برای این حکم فرمودہ

کہ رضواعنہ .))

”جو بات قطعی ہے اللہ سے بصیغہ ماضی ادا فرماتا ہے جیسا کہ فضائل اہل بیت کو

جو قیامت میں ظاہر ہوں گے انہیں بصیغہ ماضی ادا کرتے ہوئے فرمایا فواقہم

..... الخ کہ اللہ نے ان کو اس دن کی برائی سے بچایا اور ملائی ان کو تازگی اور

خوشی۔ اس طرح مہاجرین و انصار میں سابقین اولین کی رضا مندی ہے کہ

آخرت میں اپنے بلند رتبوں کو دیکھ کر راضی ہوں گے، اس کو ماضی کے صیغہ سے

ادا کیا اور رضواعنہ فرمایا۔“

اگر آپ کو ماضی و مضارع کے صیغوں میں شک ہو اور ایک سے دوسرے معنی مراد لینا آپ کے نزدیک خلاف فصاحت و بلاغت ہوں تو ذرا..... ”میزان الصرف“ اٹھا کر دیکھیے اور ”بداں اسعدک اللہ تعالیٰ“ کے معنی سوچیے کہ اس کے معنی ”نیک بخت کند“ ہیں یا ”نیک بخت کرد“ ہیں اور پھر غور کیجیے کہ صیغہ تو ماضی کا ہے اور معنی حال کے لیے جاتے ہیں تو اس شک کے دور کرنے کے لیے اس کا حاشیہ دیکھ لیجیے تا کہ آپ کو معلوم ہو کہ کیوں ماضی کے صیغے سے حال کے معنی لیے جاتے ہیں اور اس کے بعد اگر انصاف ہے تو قصور کا اعتراف کیجیے ورنہ ایک روز تو اقرار کرنا ہی پڑے گا جس کا ذکر خدا نے بصیغہ ماضی کیا ہے، حالانکہ ہنوز وہ روز نہیں آیا، کما قال سبحانہ تعالیٰ:

﴿وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ ۝

فَاعْتَرَفُوا بِذَنبِهِمْ فَسُحْقًا لِأَصْحَابِ السَّعِيرِ﴾ (سورہ ملک: ۱۰-۱۱)

”اور بولے اگر ہم ہوتے سنتے یا بوجھتے، نہ ہوتے دوزخ والوں میں، سو قائل ہوئے اپنے گناہ کے، اب دفع ہوں دوزخ والے۔“

پس حضرات شیعہ کے تعصب و عناد بلکہ جہالت و نادانی کو دیکھنا چاہیے کہ صرف اصحاب نبوی کی عداوت سے قرآن مجید کی آیات کے ایسے معنی بناتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اس سے خارج ہوئے جاتے ہیں اور ان پر بھی اس فضیلت کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ پس جبکہ شیعوں نے اپنے ہی پہلے امام کو اس آیت کے مصداق سے خارج کر دیا تو اگر ہمارے تین خلیفوں کو بھی نکال دیا تو جائے شکایت نہیں ہے۔

اس مقام پر یہ امر بھی لکھنا فائدے سے خالی نہیں ہے کہ جناب شاہ صاحب نے ”تحفہ اثنا عشریہ“ میں فرمایا ہے کہ اگر مہاجرین و انصار کی نسبت ان آیتوں کے یہ معنی مراد لیے جائیں کہ خدا کی رضا مندی ان کی ذات سے متعلق نہیں ہے بلکہ ان کی صفت ہجرت و نصرت سے ہے اور کامل رضا مندی حسن خاتمہ پر موقوف ہے تو آیت موالات جس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا ثبوت کیا جاتا ہے، ان میں بھی تو یہی جرح ہو سکتی ہے کہ کہا جائے:

((ولایت شما باین وصف متعلق ست یعنی اقامت صلوة و ایتاء زکوٰۃ در حالت رکوع و بقائی این وصف مشروط است به حسن خاتمہ و کذا و کذا.))

”آپ کی ولایت کی صفت یہ ہے کہ نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں حالت رکوع میں، اور اس وصف کا باقی رہنا حسن خاتمہ پر موقوف ہے۔“

اس کے جواب میں مجتہد صاحب فرماتے ہیں:

((اما آنچه دریس مقام در باب آیہ ولایت بہ ترانہ بیہودہ مترنم گردہ پس از قبیل قیاسی ست مع الفارق چہ امثال چنیس تقیّدات دور از کار در آیہ ولایت خلاف اجماع اہل اسلام پس از معرض اعتبار ساقط باشد.))

”یہاں آیت ولایت کی تفصیل میں جن بیہودگیوں کے ترانے الاپے ہیں یہ صرف قیاس مع الفارق ہے کیونکہ اس قسم کے دور از کار قیود آیت ولایت میں عائد کرنا اہل اسلام کے اجماع کے خلاف ہے، اس لیے ناقابل اعتبار ہے۔“

سوائے ان لفظوں کے حضرت نے کچھ نہیں لکھا اور گالی دے کر سکوت اختیار کیا اور یہ

فرمانا کہ آیت ولایت میں ایسے احتمالات بعیدہ کرنا اہل اسلام کے اجماع کے خلاف ہے،

باعث صد ہزار حیرت ہے، اس لیے کہ اگر اہل اسلام سے مراد صرف حضرات شیعہ ہیں تو یہ

فرمانا مسلم لیکن اگر اور سب فرقے اسلام کے مراد ہیں تو ان کے اجماع کا دعویٰ محض غلط

ہے۔ ﴿هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾

اے حضرات امامیہ! ذرا اپنے مجتہدین کی توجیہات اور احتمالات پر خیال کرو، وہی

احتمال مہاجرین و انصار کے حق میں تو جائز اور واجب سمجھا جائے اور وہی احتمال جناب امیرؓ

کے حق میں ممنوع اور محال ہو..... اگر کہا جائے کہ یہ مقتضائے محبت و عداوت ہے تو ہم قبول

کریں گے لیکن یہ بھی اس کے ساتھ عرض کریں گے کہ یہ مقتضائے ایمان و انصاف نہیں

ہے..... اس جواب پر مجھے بہرام گور کی ایک حکایت یاد آئی کہ ایک مرتبہ اس نے تیر سے گور کا شکار کیا اتفاق سے تیر اس کے منہ پر ایسا لگا کہ منہ سی گیا۔ ایک لونڈی سے بہرام گور نے اپنی تعریف کی اس کی زبان سے نکل گیا کہ مشق اور تعلیم کے متعلق ہے۔ بہرام گور نے خفا ہو کر اسے نکال دیا۔ اس نے یہ مشق شروع کی کہ گائے کے بچے گود میں لے کر ہر روز دو وقت بالا خانہ پر چڑھ جائے۔ یہاں تک کہ جب وہ بچہ بڑا ہوا تب بھی مشق کے سبب وہ بالا خانے پر لے جایا کرتی یہ خبر بادشاہ نے سنی وہ بھی گیا، دیکھ کر کیا کہتا ہے کہ مشق و تعلیم سے متعلق ہے۔ تب لونڈی نے دست بستہ ہو کر عرض کیا کہ جہاں پناہ آپ جب گور کو تیر سے شکار کریں تو وہ مشق سے متعلق نہ ہو اور جب میں اس سے بہت زیادہ حیرت انگیز کام کروں وہ مشق کے متعلق نہ سمجھا جائے، یہ کون سا انصاف ہے۔ کما قال شعر.....

گفت شہ راند متے ست عظیم
گاؤ تعلیم گور بے تعلیم

وہی حال بعینہ مجتہد صاحب کا ہے کہ ایسی صریح اور صاف آیت میں جیسی کہ ﴿وَالسَّبِقُونَ الْأَوْلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ﴾ ہے علت تامہ اور ناقصہ کے احتمالات کریں اور ان کے علماء علت رضائے الہی کو فعل خاص کا مخصوص کہیں اور جب کوئی آیہ موالات سے معارضہ کرے جس میں صرف یہ ہے کہ ﴿يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ﴾ کہ دیتے ہیں زکوٰۃ کہ دریاں حالیکہ وہ رکوع میں ہوتے ہیں اور اس کے لفظوں سے کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ لوگ کون ہیں، صیغہ جمع کا ہے اور معنی واحد کے لیے جاتے ہیں اور زکوٰۃ کے معنی خیرات کے کہتے جاتے ہیں، اس لیے کہ یہ ظاہر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اتنا مال نہ رکھتے تھے کہ زکوٰۃ ان پر واجب ہو اور پھر رکوع و سجد میں کسی دوسرے کی بات سننا گو وہ سائل اور محتاج ہی ہونماز کے خلوص کے خلاف ہے۔ پس ان سب باتوں کے باوجود جب کوئی کہے کہ وہ احتمالات جو مہاجرین و انصار کی فضیلت والی آیات میں آپ کرتے ہیں وہ اس آیت میں ہو سکتے ہیں بلکہ اس سے بھی بہت کچھ زیادہ..... تب فرمائیں کہ یہ بیہودہ ترانہ ہے اور

خلاف اجماع ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انسان انصاف، ایمان اور حیا کا پابند نہ رہے تب مختار ہے جو چاہے سو کہے۔

((اذا أَلْقَيْتَ جَلْبَابَ الْحَيَاةِ فَقُلْ مَا شِئْتُ فَاِنْ مِنْ لِحْيَاءِ لَه
لَا إِيْمَانُ لَهُ .))

”جس وقت گرایا تو نے حیا کی چادر کو، پس کہہ جو کچھ چاہے تو، پس بہ تحقیق وہ شخص جس کے پاس حیا نہیں اس کے پاس ایمان نہیں۔“

اب چوتھے معنی ﴿وَالسَّابِقُونَ﴾ کے سینے جو مجتہد صاحب بیان فرماتے ہیں، حضرت ”ذوالفقار“ میں لکھتے ہیں:

((اقوال بعضے از علماء دلالت می کند کہ مراد از سبقت فی

الہجرت مهاجرت بنی ہاشم ست از مکہ .))

بعض علماء کے اقوال سے ثابت ہے کہ سبقت فی الہجرت سے مراد بنی ہاشم کا مکہ سے ہجرت کرنا ہے۔“

لوگ حیران ہوں گے کہ مکے سے مکے میں کون سی ہجرت ہے، اس لیے میں اس کی تصریح کرتا ہوں کہ جب کفار نے حضرت ﷺ کو بہت ستایا تب شعب ابوطالب میں حضرت نے قیام فرمایا اور کئی برس تک وہاں رہے۔ پس اس کا نام حضرت نے ہجرت رکھا ہے یعنی ایک گھر سے دوسرے گھر میں جانا۔ شاید یہ معنی اس لیے ہوئے ہوں تاکہ اپنے اور اپنے شیعوں کی نسبت بھی ہجرت کا اطلاق کر سکیں، اس لیے کہ حضرت یقیناً ایک دن میں سو جگہ بدلتے ہوں گے اور جب جگہ بدلنے ہی کے معنی ہجرت کے ہوئے تو بس حضرت اور حضرت کے شیعہ دن بھر سو سو دفعہ ہجرت کے ثواب کے مستحق ہوں گے۔

اور بعض علماء سے جن کا قول حضرت نے بیان کیا ہے ایک جناب قاضی نور اللہ شوستری شہید ثالث ہیں کہ وہ ”مصائب النواصب“ میں بجواب ”نواقض الروافض“ لکھتے ہیں:

((فارطمہ صاحب النواقض تبعاً للجمہور من ان ابابکر و

عمر كانا من المهاجرين السابقين الاولين انما هو تحريص و زور بل السابقون الاولون هم الذين هاجروا هجرة الاولى وهى هجرة رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم فى حصاره بمكة حين هاجرت قريش بنى هاشم مع رسول الله ﷺ فى شعب عبدالمطلب اربع سنين والامة مجتمعة على ان ابابكر و عمر لم يكونا معهم فى ذلك الموطن .))

”پس طعن کیا صاحب نواقض نے باتباع جمہور اس بات سے کہ بہ تحقیق ابوبکرؓ اور عمرؓ مهاجرین سابقین اولین میں سے اس کے علاوہ نہیں ہے کہ وہ حرص دلانا اور مکر ہے، بلکہ سابقین اولین تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے پہلی ہجرت کی اور وہ رسول اللہ ﷺ کی ہجرت ہے حصار مکہ میں جب کہ قریش بنی ہاشم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہجرت کی شعب عبدالمطلب میں چار برس اور امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اس جگہ ان لوگوں کے ساتھ نہیں تھے۔“

یہ معنی ہجرت کے کہ مکے سے مکے ہی میں ہجرت کرنا ایسے بے معنی اور نئی اصطلاح ہے کہ ہنسنے والے کے لیے اس سے زیادہ کوئی لطیفہ نہ ملے گا..... میرے نزدیک مجتہد صاحب نے غلطی کی کہ مهاجرین و انصار سے آدمی مراد لیے اور ناحق معنی بنانے کی تکلیف اٹھائی مناسب تھا کہ سابقین مهاجرین سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام کو لیتے کیونکہ وہ سب سے اول سدرۃ المنتہی سے ہجرت کر کے مکے میں آئے اور انصار سابقین سے مراد حضرت عزرائیل لیتے جنہوں نے بڑے بڑے دشمنوں کو پیغمبر ﷺ کی مدد کر کے ہلاک کیا۔ اور ان کی روحمیں قبض کیں..... پس حقیقت میں صحیح اور کامل ہجرت حضرت جبرئیلؑ کی اور پکی اور پوری نصرت حضرت عزرائیلؑ کی ہے اور خدائے جل شانہ کے کلام سے اس مضمون کی بخوبی تصدیق بھی ہوتی ہے خصوصاً رضی اللہ عنہم و رضوعنہ کا مضمون تو ان پر ایسا ٹھیک صادق آتا ہے کہ کسی سنی جاہل کو کچھ جائے اعتراض نہیں رہتی..... اس لیے کہ سچی رضا مندی خدا کی فرشتوں سے ہے

اور فرشتوں کی خدا سے جن کی شان ہے کہ وہ ذرا برابر خدائے جل شانہ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرتے اور فرشتوں میں سب سے سابق اور اول حضرت جبرئیل اور میکائیل علیہما السلام ہیں۔ تو کیا باعتبار لفظوں کے اور کیا بلحاظ معنی کے یہ مضمون ایسا چسپاں ہوتا کہ فرشتے بھی داد دیتے۔

پانچویں معنی والسابقون کے:

((یا ہجرت ۱ بہ طرف حبشہ کہ بمراتب پیشتر از ہجرت مدینہ بودہ، پس دریں صورت ابی بکر رض را شرف سبقت ہجرت صوری ہم نخواهد بود.))

”یا پھر حبشہ کی طرف ہجرت کرنا مراد ہے جو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے سے کافی پہلے ہوئی اس صورت میں بھی ابو بکر رض کو صورتاً ہجرت میں سبقت کرنے کی بزرگی حاصل نہیں۔“

مجتہد صاحب نے توفیق اس دعوے ہی پر قناعت فرمائی اور اتنا کہہ کر سکوت کیا لیکن صاحب ”تقلب المکائد“ نے بجواب کید نو دو ویکم (۹۱) کے اس دعوے کو اپنے نزدیک مدلل بھی کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

((اصحاب ۲ ثلاثہ از مهاجرین اولین نبودند چنانچہ در صحیح بخاری مذکور است عن ابی موسیٰ قال بلغنا مخرج النبی و نحن باليمن فخر جنا مهاجرین الیہ..... الخ.))

”اصحاب ثلاثہ مهاجرین اولین میں سے نہ تھے جیسا کہ صحیح بخاری میں مذکور ہے..... ابو موسیٰ سے مروی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکے سے نکلنے، یعنی ہجرت کی اطلاع ملی اور اس وقت ہم یمن میں تھے، چنانچہ ہم بھی ہجرت کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ گئے۔“

۱ عبارت ذوالفقار مطبوعہ مطبع مجمع البحرین لدھیانہ، ۱۲۸۱ھ صفحہ ۵۷ سطر ۷-۱۲

۲ اس حدیث کی شرح دیکھو۔ منہ ۱۲

مؤلف موصوف نے ایک بہت بڑی حدیث نقل کرنے سے یہ فائدہ تصور کیا ہوگا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ خود اہل سنت کی صحیح بخاری سے ثابت ہوتا ہے کہ خلفائے ثلاثہ مہاجرین اولین سے نہ تھے..... لیکن یہ محض حضرت کی غلطی ہے، اس لیے کہ اس حدیث سے جس قدر ثابت ہو سکتا ہے وہ یہی ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا کہ اے اصحاب سفینہ تمہارے لیے دو ہجرتیں ہیں۔ اور یہ حضرت نے نہیں فرمایا کہ تمہی وَالسَّابِقُونَ الْأَوْلُونَ میں ہو اور اس سے کوئی سنی انکار نہیں کرتا کہ جن لوگوں نے حبشہ کی ہجرت کی وہ مہاجر نہیں اور نہ ان کے درجات اور مراتب میں کچھ جائے سخن ہے بلکہ وہ زمانہ تو پیغمبر ﷺ کا تھا، اس وقت کافروں کے خوف سے کسی ملک کو چلا جانا کیوں کہ ہجرت میں داخل نہ ہوگا جبکہ قیامت تک ہجرت کا حکم اور ثواب باقی ہے اگر کلام ہے تو اس میں ہے کہ یہ آیت جس کا ذکر ہے، یعنی ﴿وَالسَّابِقُونَ الْأَوْلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ﴾ اس سے کون ہجرت کرنے والے مراد ہیں۔ آیا وہ جو حبشہ کی طرف ہجرت کر کے گئے یا وہ جو مکہ سے مدینے کو آئے..... پس اس لمبی چوڑی حدیث میں اگر ایک لفظ بھی ایسا ہو کہ ﴿وَالسَّابِقُونَ الْأَوْلُونَ﴾ سے مراد مہاجرین حبشہ ہیں تو بے شک ہم تسلیم کریں۔

علاوہ بریں ہم حضرات شیعہ سے کہتے ہیں کہ جس طرح پر خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم حبشہ کو ہجرت کر کے نہیں گئے اس طرح پر جناب امیرؓ بھی حبشہ کو نہیں گئے۔ پس جس دلیل سے اور جس وجہ سے خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم مہاجرین اولین سے خارج کیے جاتے ہیں وہی وجہ حضرت امیرؓ کی نسبت بھی ہے۔ پس کیا وہ بھی خارج کر دیے جائیں گے اور ان کی نسبت بھی مہاجرین اولین کی فضیلت کا اطلاق نہ کرو گے، نعوذ باللہ منها! پس جس طرح پر قبلہ حضرت مجتہد صاحب نے فرمایا:

((مراد ❶ از ہجرت بطرف حبشہ بمراتب پیشتر از ہجرت

مدینہ بودہ پس دریں صورت ابی بکرؓ اشرف سبقت

ہجرت صوری ہم نخواهد بود .))

”ہجرت سے مراد حبشہ کی طرف ہجرت ہے جو کہ ہجرت مدینہ سے کافی پہلے ہوئی

تھی، لہذا اس صورت میں ابو بکرؓ کو تو ہجرت کا شرف صورتاً بھی حاصل نہ ہوگا۔“

کوئی خارجی ایسی تقریر کو جناب امیر علیہ السلام کی نسبت معارضے میں پیش کرے تو

معلوم نہیں اس وقت کے لیے مجتہد صاحب نے کیا جواب سوچا ہے۔

چونکہ ہم مجتہد صاحب کے سارے تار و پود درہم برہم کر چکے، اس لیے اب اس آیت

کے اصلی معنی لکھتے ہیں جو کہ مفسرین شیعہ نے اپنی تفسیروں میں بیان کیے ہیں تاکہ اس سے

معلوم ہو جائے کہ یہ تقریریں جو مجتہدین شیعہ نے کی ہیں لغو و پوچ ہیں یا کچھ اصلیت رکھتی

ہیں۔ علامہ طبرسی ”مجمع البیان“ میں لکھتے ہیں:

((لما تقدم ذكر المنافقين والكفار عقبه سبحانه بذكر

السابقين الى الايمان فقال والسابقون الاولون اي السابقون

الى الايمان والى الطاعات و انما مدحهم بالسبق لان السابق

الى الشئى تبعه غيره فيكون متبوعاً وغيره تابع له فهو امام فيه

وداع فيه الى الخير سبقه اليه و كذلك من سبق الى الشر

يكون اسؤ حالاً بهذه العلة من المهاجرين الذين هاجروا من

كنافى المدينة والى الحبشة . والانصار اى و من الانصار

الذين سبقوا نظرائهم من اهل المدينة الى الاسلام و من قراؤا

والانصار برفع لم يجعلوا من السابقين و جعل السابق

للمهاجرين خاصة والذين اتبعواهم باحسان اى افعال الخير

بالدخول فى الاسلام بعد هم وسلوك مناهجهم ويدخل فى

ذلك من يجرى بعد هم الى يوم القيمة رضى الله عنهم و رضوا

عنه اخبر سبحانه انه رضى عنهم و رضوا عن الله كما له لما

اجزل لهم من الثواب على طاعتهم وايمانهم به و يقينهم
 واعدلهم جنات تجري تحتها الانهار خالدین فیها ابدًا یبقون
 ببقاء الله فقال ذلك الفوز العظيم ای الفلاح العظيم ای الذی
 يصعر من جنسه كل نعيم۔ و فی هذه الاية دلالة على فضل
 السابقین و مزيتهم على غیرهم لما لحقهم من انواع المشقة
 فی نصره الدين فمنها مفارقة العشائر و الاقربین و منها مبانیه
 المالوف من الدين و منها نصره الاسلام و قلة العدو كثرة
 العدو و منها السبق الى الايمان و الدعاء اليه .))

”منافقین اور کفار کے ذکر کے بعد اللہ سبحانہ نے سابقین فی الایمان کا ذکر کیا،
 ارشاد فرمایا ﴿وَالسَّابِقُونَ الْأَوْلُونَ﴾ یعنی ایمان اور طاعات کی طرف سبقت
 کرنے والے اور اللہ نے ان کی اسی واسطے مدح فرمائی کہ جو کسی چیز کی طرف
 سبقت کرنے والا ہے اس کی دوسرے لوگ تابعداری کرتے ہیں تو وہ پیشوا ہوتا
 ہے اور دوسرے اس کی پیروی کرنے والے، پس وہ اس کام میں امام ہے اور
 اس کام میں نیکی کی طرف بلانے والا، اور ایسے ہی جو شخص برے کام کی ابتدا کرتا
 ہے وہ شخص اسی واسطے بدحال ہوتا ہے (یعنی اوروں کا خراب کرنے والا) مِنْ
 الْمُهَاجِرِينَ مہاجرین وہ لوگ ہیں جنہوں نے مکے سے مدینے اور حبشہ کی
 طرف ہجرت کی وَالْأَنْصَارُ اور انصار سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے سبقت
 کی اپنے برابر والوں اہل مدینہ سے اسلام کی طرف جس شخص نے وَالْأَنْصَارُ
 کو پیش پڑھا اس نے انصار کو سابقین سے نہیں کہا اور فضیلت سابقیت کو
 مہاجرین کے واسطے خاص کر دیا، وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ یعنی وہ لوگ
 جنہوں نے نیک کاموں میں مہاجرین و انصار کی تابعداری کی اور اسلام لانے
 میں اور ان کی راہوں پر چلے اور اس حکم میں داخل ہے جو شخص ایسا قیامت تک

ہوگا، رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ اللہ سبحانہ، نے خبر دی ہے کہ بے شک اللہ بہت راضی ہو ان سے اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ اللہ کا راضی ہونا بہ سبب ان کی طاعتوں اور ایمان و یقین کے ہے اور ان کا راضی ہونا اس سبب سے کہ ان کے واسطے بڑا ثواب رکھا گیا۔ وَأَعَدَّ لَهُمْ اور ان کے واسطے جنت مقرر کی گئی کہ اس کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے، پھر اللہ سبحانہ نے فرمایا: یہ اتنی بڑی کامیابی ہے کہ اس کے مقابل میں کل نعمتیں چھوٹی معلوم ہوتی ہیں۔ اس آیت میں سابقین کے مقام و مرتبہ پر دلالت ہے کہ انہوں نے دین کی مدد میں طرح طرح کی مشقتیں جھیلیں جیسے خاندان اور رشتہ داروں کو چھوڑنا، اور اپنی پسندیدہ چیزوں کو خیر باد کہنا، اپنی قلت اور دشمنوں کی کثرت کے باوجود دین کی مدد کرنا، ایمان لانا اور اس کی طرف دعوت دینا۔“

اس کے علاوہ دوسری تفسیر سنئے کہ صاحب ”خلاصۃ المنہج“ لکھتا ہے:

((السابقون الاولون یعنی پیشی گزید گان پیشینیاں ای آنها کہ سبقت گرفتند بر عامہ مومناں در ایمان من المهاجرین از مهاجرین ای آنانکہ از مکہ ہجرت کردند و بمدینہ آمدند .))
 ”سابقون الاولون یعنی جن مهاجرین نے عام مسلمانوں کی بہ نسبت ایمان لانے میں سبقت کی اس کا مطلب یہ ہے کہ مکہ سے مدینہ آنے میں سبقت کی۔“

ان تفسیروں سے جو معنی مهاجرین کے معلوم ہوئے اور جو فضائل ان کے ثابت ہوئے اس کے لیے اس کا ترجمہ ہی کافی ہے، زیادہ لکھنا کچھ ضروری نہیں اگر اس پر بھی سیری نہ ہو تو میں دوسری آیت کی تفسیر سناتا ہوں جس میں ہجرت کا ذکر ہے، یعنی اللہ جل شانہ فرماتا ہے:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾

”اور جو لوگ ایمان لائے اور گھر چھوڑے اور لڑے اللہ کی راہ میں۔“

ہَاجِرُوا کے اخیر میں مفسر طبری ”مجمع البیان“ میں لکھتے ہیں:

((هَاجِرُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَوْطَانِهِمْ يَعْنِي مِنْ مَكَّةِ إِلَى

الْمَدِينَةِ .))

”ہجرت کی ان لوگوں نے اپنے ملکوں اور وطنوں سے، یعنی مکے سے مدینے کو۔“

شیعوں کا تیسرا جواب آیاتِ فضیلت صحابہ رضی اللہ عنہم کی:

بعض دانش مندوں نے یہ جواب دیا ہے کہ اللہ جل شانہ نے مہاجرین و انصار کی نسبت جو رضا مندی کا ذکر قرآن مجید میں کیا ہے اس سے سب مہاجرین و انصار مراد نہیں ہیں بلکہ خاص خاص۔ گو ظاہر میں کچھ تخصیص نہیں کی..... چنانچہ قاضی نور اللہ شوستری اپنی ”مصائب“ میں فرماتے ہیں:

((بل هم يقولون اذ شهادته تعالى لهم بالرضا و من اتبعهم

باحسان يميكن ان يكون خصوصاً من قول الله تعالى و ان

كان يخرج الكلام للعموم وهذا في كتاب الله موجود من

خطاب الخصوص وهمو عموم و من خطاب العموم وهو

خصوص من استقام منهم دون من لم يستقم والنظر يدلنا

على ان الله عز وجل انما رضى عن استقام في طاعته وان

الجنة و عدها لمن سارع الى مرضياته و تجتنب عن معاصيه

و من خرج عن هذه الحال كان محالاً ان يستحق الرضا من

الله تعالى فما لهم ايضا في هذا الحال حجة .))

”بلکہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ شہادت اللہ تعالیٰ ان کی رضا کے واسطے اور اس شخص

کے واسطے جس نے ان کی تابعداری کی احسان میں ممکن ہے یہ کہ ہو خصوص اللہ

تعالیٰ کے قول سے اگرچہ کلام عموم کے کیے لایا گیا ہے اور یہ کتاب اللہ میں

موجود ہے کہ خطابِ خصوص سے اور وہ عام ہے اور خطابِ عموم سے اور وہ خاص ہے، بتلاتی ہے ہم کو یہ بات کہ واسطے اس شخص کے کہ وہ مستقیم ہوا، اُن سے سوا اس شخص کے کہ نہ استقامت کی اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص سے راضی ہوا جو اس کی اطاعت میں ثابت قدم رہا اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے لیے جنت کا وعدہ کیا ہے جس نے اس کی خوشی کی طرف جلدی کی اور اس کے گناہوں سے بچا اور جو شخص اس حال سے خارج ہوا تو اللہ کی رضا کا مستحق ہونا اس کے لیے محال ہے، پس ان (سینوں) کے واسطے کیا چیز حجت ہے۔“

قاضی صاحب مؤلف ”نواقض الروافض“ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ جو تم نے کہا کہ شیعوں کا قول ہے کہ یہ بشارتیں صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے مثل خلافتِ غصب ہونے کے ہیں، سو یہ تمہارا افتراء ہے شیعوں کا یہ قول نہیں ہے بلکہ صحابہ کی فضیلت کی آیتوں کا شیعہ یہ جواب دیتے ہیں کہ مراد اس سے خاص خاص لوگ ہیں اور قرآن مجید میں ایسا بہت جگہ واقع ہے کہ کلام عام ہے اور مراد اس سے خاص ہیں یا کلام خاص ہے اور مراد اس سے عام ہے اور غور کرنے سے یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ خدا نہیں راضی ہوا مگر اس سے جو کہ اس کی اطاعت میں ثابت قدم ہوا اور جنت نہیں تیار کی گئی مگر اس کے لیے جو کہ اس کی مرضی پر چلا اور اس کے گناہوں سے بچا اور جو اس حال پر ثابت قدم نہیں رہا اور اس سے نکل گیا محال ہے کہ وہ خدا کی رضا کا مستحق ہو، پس سینوں کے پاس حجت کیا ہے۔ فقط

اس تقریر کے اخیر پر قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ ”الحمد لله“ ہم نے خوب مدلل تقریر کی اور سینوں کے قول کو خوب رد کیا۔ مگر حقیقت میں یہ قول بھی ﴿كَسْرَابٍ بِقِيَعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمَانُ مَاءً﴾ ❶ محض دھوکہ ہے، چنانچہ اس کی غلطی میں چند وجہ سے ثابت کرتا

ہوں۔

اوّل:..... قاضی صاحب نے اس امر سے انکار کیا کہ شیعوں کا یہ قول نہیں ہے کہ خلافتِ غصب کرنے کے بعد مہاجرین و انصار اس فضیلت سے مستثنیٰ ہو گئے، لیکن اس کے بعد وہ تقریر کی جس سے ثابت ہوا کہ حضرت بھی یہی کہتے ہیں اس لیے کہ خدائے جل شانہ، تو اپنی رضا مندی بیان کرتا ہے ہجرت و نصرت اور بیعت رضوان سے، اور یہ سب امور واقع ہو چکے تھے اور ان کے وقوع کے بعد یہ آیتیں انہیں افعال کی مقبولیت میں نازل ہوئیں۔ تو اب دو باتیں ثابت کرنی چاہئیں یا یہ کہ خلفائے ثلاثہ اور دیگر مہاجرین و انصار نے یہ کام نہیں کیے، نہ انہوں نے ہجرت کی نہ انہوں نے نصرت و بیعت کی، تاکہ وہ لوگ اس بیعت سے مستثنیٰ ہو جائیں، یا یہ ثابت کیجیے کہ اس فعل کے بعد ان سے ایسے افعال ہوئے جن کے سبب سے وہ اس رضا مندی کے مستحق نہ رہے اور وہ فعل سوائے غصبِ خلافت اور عداوتِ اہل بیت کے دوسرا کوئی نہیں ہے تو اس سے وہی بات ثابت ہوئی جس کا انکار کیا تھا۔ لیکن بغیر ان دو اموروں سے کسی ایک امر کے اقرار کرنے کے یہ بات کہ مہاجرین کی ہجرت کو بھی قبول کرنا، انصار کی نصرت کا بھی اقرار کرنا، اور بیعت رضوان کی شرکت کو صحیح جاننا اور ان آیتوں کو انہیں کاموں کے صلہ میں نازل سمجھنا اور پھر مہاجرین و انصار کو اس عموم سے خارج کرنا نہ عقلاً درست ہے نہ نقلاً..... عقلاً اس لیے کہ جب خدائے جل شانہ کہے رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ، کہ میں مہاجرین و انصار سے راضی ہوا اور وہ مجھ سے راضی ہوئے، اور اگر کوئی شک کرے کہ ہجرت و نصرت کے لیے ایمان شرط ہے اور مہاجرین و انصار ایمان نہ رکھتے تھے تو ان کے گمان و وہم کے باطل ہونے پر خدا دوسری آیت میں فرماتا ہے:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوْا
وَنَصَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ (سورہ انفال: ۷۴)

”کہ جن لوگوں نے خدا اور رسول کی تصدیق کی اور جو اپنے گھر مکہ چھوڑ کر مدینہ میں ہجرت کر آئے اور جنہوں نے اعلاءِ دینِ خدا کے لیے جہاد کیا اور جنہوں نے ان لوگوں کو اپنے یہاں پناہ دی اور پیغمبر خدا ﷺ کی مدد کی وہی لوگ سچے

ایمان والے ہیں۔“

پس ایسی صریح آیتوں سے مہاجرین و انصار کو خارج کرنا نصوص قطعیت سے انکار کرنا ہے اس لیے کہ اس آیت میں خدائے تبارک و تعالیٰ یہ نہیں بیان کرتا ہے کہ جو لوگ ایمان لائیں گے اور نیک کام کریں گے ان کو میں جنت دوں گا کہ یہاں بقائے حکم اور خصوص و عموم سے بحث کی جائے بلکہ یہاں تو ایک امر گذشتہ اور ایک گروہ خاص کے ایمان سے خبر دیتا ہے اور ان کے مومن ہونے کی تصدیق کرتا ہے، اس لیے کہ کوئی شبہ نہ کرے اور اس طائفہ (جماعت) کی نسبت عموم و خصوص کی قید نہ لگائے اور اسی لیے ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ (الانفال: ۷۴) کو فرمایا کہ وہی لوگ جنہوں نے نصرت کی، یعنی مہاجرین و انصار وہی سچے مومن ہیں۔ پس یہ جملہ خبر یہ ہے نہ کہ انشائیہ اور از قبیل اخبار ہے نہ کہ از قبیل امر و نہی۔ پس کسی طرح شیخ کا شبہ بھی اس میں نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ اخبار میں شیخ واقع نہیں ہوتا۔ ورنہ جو قصے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام وغیرہ انبیاء کرام علیہم السلام کے خدانے قرآن مجید میں بیان فرمائے ہیں سب سے یقین جاتا رہے اور انجام اور خاتمے کے معلوم نہ ہونے کا احتمال کر کے ان پر یقین نہ رکھا جائے اور عموم و خصوص کی قید لگا کر سارے قرآن شریف میں تحریف کر دی جائے۔

پس باوجود ایسے صریح نصوص کے مہاجرین و انصار کو مومن نہ کہنا حقیقت میں ایسا ہے کہ جس طرح پر انبیاء کی نبوت اور اصحاب کہف کی فضیلت اور اخبار ماضیہ مذکورہ قرآن کی صحت سے انکار کرنا۔ کیونکہ اگر کوئی اعتراض کرے کہ ہم اصحاب کہف کے ایمان کے قائل نہیں ہیں، اس لیے کہ معلوم نہیں کہ وہ قیامت میں نیکوں میں ہوں گے یا معاذ اللہ! دوسرے گروہ میں، اور یہ بھی ہم کو معلوم نہیں کہ ان کی نیت بخیر تھی یا نہیں اس لیے کہ (نیت امر بست باطنی) ”یعنی نیت ایک باطنی معاملہ ہے۔“ اور یہ بھی ممکن ہے کہ سب اصحاب کہف با ایمان نہ ہوں اس لیے کہ خدا کے کلام میں اکثر عموم و خصوص ہے کہ کلام عام ہوتا ہے اور مراد اس سے خاص ہوتی ہے۔ پس ایسے ملحد احمق کے جواب میں سواء اس کے کیا کہو گے کہ خدائے جل

شانہ، صاف ان کے حال کی خبر دیتا ہے کہ ﴿إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى﴾ ”کہ وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کی رہنمائی میں اضافہ کر دیا۔“ اور خدا ان کے ایمان و ہدایت کی جملہ خبریہ میں صاف خبر دیتا ہے..... تو ایسے نص قطعی میں احتمال کرنا اور ان میں عموم و خصوص کے شکوک پیدا کرنا خدا کے کلام سے انکار کرنا ہے، پس اسی طرح پر برائے مہربانی مہاجرین و انصار کے ایمان پر خیال کرو کہ خدائے پاک ان کے حق میں بھی صاف فرماتا ہے کہ ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ (الانفال: ۷۴) اور یہ جملہ خبریہ ان کے ایمان کو بیان کرتا ہے۔ پس جب ایسی نص صریح سے کوئی انکار کرے اور پھر بھی انصار و مہاجرین کو مومن نہ کہے وہ ایسا ہی ہے جیسا اصحاب کہف کے ایمان کا منکر، اور ایسے نصوص صریح کا منکر ملحد اور مرتد ہے یا نہیں۔

﴿ذٰلِكَ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُضِلِّ فَلَنْ

تَجِدَلَهٗ وَاٰیٰتٍ مُّرْسَلًا﴾ (سورہ کہف: ۱۷)

”یہ اللہ کی قدرتوں سے ہے، جس کو راہ دے اللہ وہی راہ پر ہے اور جس کو وہ بچلا

دے پھر نہ پاوے اس کو کوئی رفیق راہ پر لانے والا۔“

دلیل نقلی:..... اگر اس تقریر سے بھی آپ کا اطمینان نہ ہو تو اپنے ہی مفسرین سے اس

کلام کی تصدیق سنیے کہ علامہ طوسی ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

((ثم عاد سبحانه إلى ذكر المهاجرين والانصار و مدحهم

والثناء عليهم فقال ﴿ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي

سَبِيلِ اللَّهِ﴾ ای صدقوا لله ورسوله وهاجروا من ديارهم

واوطنانهم یعنی من مكة الى المدينة وجاهدوا مع ذلك في

اعلاء دين الله و الذين آووا و نصر و ای ضموا هم اليهم

ونصروا النبي اوليك هم المومنون حقا ای اوليك الذين

حَقُّوْا اِيْمَانَهُمْ بِالْهَجْرَةِ وَالنَّصْرَةَ بِخِلَافٍ مِّنْ قَامِ بَدَارِ الشِّرْكِ .)) انتھی بلفظہ

”یعنی پھر خدا شروع کرتا ہے جو مہاجرین و انصار کے ذکر کو اور ان کی مدح کرتا ہے اور ان کی ثنا و تعریف فرماتا ہے کہ آمنوا ”یعنی ایمان لائے، ایمان سے کیا مراد ہے ہے کہ تصدیق کی خدا کی اور اس کے رسول ﷺ کی اور ہاجروا من دیار ہم یعنی اپنے گھروں سے ہجرت کی یعنی مکے سے ہجرت کی اور مدینے کو آئے و جاہدوا یعنی اتنی ہی تکلیف پر قناعت نہ کی بلکہ خدا کا دین بڑھانے کے لیے جہاد بھی کیا والذین آوا و انصروا سے کیا مراد ہے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے ان گھر چھوڑنے والوں کو اپنے یہاں جگہ دی اور پیغمبر خدا ﷺ کی مدد کی، پھر خدا فرماتا ہے کہ ﴿اُولَئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ یعنی یہی لوگ جو کہ مہاجرین و انصار ہیں سچے مومن ہیں اور خدا نے فقط مومنون نہ کہا بلکہ آگے حقا کی قید اور بڑھادی، اس حقا سے یہ مراد ہے کہ انہوں نے اپنے ایمان کو ثابت کر دیا بہ سبب ہجرت اور نصرت کے بخلاف ان لوگوں کے جو دارالشک میں رہ گئے۔“

پس اب کیا ایسی تصریح کے بعد بھی کسی کی زبان پر یہ لفظ آسکتا ہے کہ مہاجرین و انصار مومن نہ تھے اور پھر بھی کوئی شخص جرات رکھ سکتا ہے کہ یہ کہے کہ ہجرت سے مراد شعب ابوطالب کی ہجرت ہے یا ﴿وَالسَّبِقُونَ الْأَوْلُونَ﴾ سے مراد موت کی طرف سبقت کرنے والے ہیں یا اور کسی کو یہ قدرت ہوگی کہ اس کے سننے کے بعد عموم و خصوص کا نام کسی کے منہ سے نکلے گا۔

غرض کہ یہ کہنا شیعوں کا کہ رضا مندی کے لیے حسن خاتمہ کا حال معلوم ہونا ضروری ہے صرف دھوکہ ہے، اس لیے کہ یہ رضا مندی ہی حسن خاتمہ کی شاہد ہے۔ اس لیے کہ اگر خدا جانتا کہ اس گروہ کا خاتمہ نیک نہ ہوگا اور یہ فرقہ بعد میں مرتد ہو جائے گا اور علی رضی اللہ عنہ کی

خلافتِ غصب کرنے کے سبب اور فدک چھین لینے کے باعث کافر ہو جائے گا تو خدا پاک کے علمِ غیب سے بعید ہے کہ وہ پھر اپنی رضا مندی بیان کرتا اور ان کے ایمان کے لیے یہ لفظ کہہ کر ﴿أُولَئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ کہ یہی لوگ جو مہاجرین و انصار ہیں سچے مومن ہیں۔“ تصدیق کرتا جو شخص خدا کی نسبت ایسا خیال کرے وہ کافر ہے نہ کہ مسلمان۔

خیال کرنے کی بات ہے کہ خدا نے کبھی کسی منافق کی بھی تعریف کی، کسی مرتد کی ثنا و صفت کی، کسی کافر کے کسی نیک کام کی ثنا و صفت کی، آخر بہت سے کافر گزرے ہیں کہ جو سخی تھے، انصاف بھی کرتے تھے مگر صرف اس وجہ سے کہ کافر تھے اور کفر کی وجہ سے جہنم کے مستحق، خدا نے ایک لفظ بھی ان کی تعریف میں نہ کہا اور اپنی رضا مندی سے ان کے کسی فعل کو منسوب نہ کیا، اس لیے کہ جب وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ کافر ہیں اور آخر کار دوزخ میں بھیجنا ہوگا تو رضا مندی کا اظہار کرنا گویا تدلیس کرنا ہے اور دھوکہ دینا ہے نعوذ باللہ من هذه..... پس اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہجرت یا نصرت یا بیعت سے راضی ہوتا اور باقی ان کے سارے کاموں سے یا اکثر کاموں سے ناخوش، یا ان کے کفر و نفاق کے سبب ان کو دوزخی کرنا ہوتا تو پھر یہ لمبی چوڑی تعریفیں ان کی اور ایسی اعلیٰ درجے کی ان کی ثنا و صفت کرنا کس نظر سے تھا، کیا خدا نے بھی تقیہ کیا تھا، یا معاذ اللہ ظاہر میں دل خوش کرنے کے لیے اور اپنا کام نکالنے کے لیے ان سے تدلیس فرمایا تھا، یا اس سے غلطی ہو گئی تھی کہ بے انجام سوچے ایسے فرقے کی جو آخر کو سب کے سب مرتد ہو گئے یا جیتے جی سب کے سب منافق تھے ان کی ثنا و صفت کی۔ اس سے زیادہ نہیں کہ اگر خدا کو صاف کہنا منظور نہ ہوتا تو یہ فرما دیتا کہ جن لوگوں نے ہجرت کی ہے اور جنہوں نے نصرت کی ہے یہ سب کے سب مومن اور اچھے نہیں ہیں اور سب سے میں راضی نہیں ہوں..... یا جو مرتے دم تک حقیقت میں ثابت قدم رہے گا اور جو علیؑ کی خلافت اور فاطمہؑ کا فدک نہ چھینے گا یا جو ان دردناک واقعات کے ظہور سے پہلے سبقت الی الموت کر جائے گا انہی کی نسبت میری رضا مندی ہے تاکہ کسی کو کچھ دھوکہ نہ رہتا..... نہ کہ بجائے اس کے اس سارے فرقے اور کل گروہ کی ہجرت اور نصرت ہی کی تعریف کرے اور

ان کی ہجرت و نصرت ہی کو ان کے ایمان کی حجت میں دلیل لائے۔

پس اے مومنین! ذرا آیات قرآنی پر غور کرو اور اس کا مالہ و ماعلیہ سوچو اور تدلیس و تقیہ اور بداد کو خدائے پاک کی جناب میں نسبت نہ کرو، معلوم نہیں کہ تم نے اپنے ذہنوں میں کس کو امام تصور کیا ہے، کس کو پیغمبر جانا ہے، کس کو خدا سمجھا ہے کہ کسی کی نسبت سچائی اور صفائی کا اعتماد نہیں کرتے، سب کی باتوں میں دغل فصل بیان کرتے ہو، جس طرح پر تم اپنے فرضی اماموں کی نسبت تقیہ کی تہمت کرتے ہو، بعینہ ویسے ہی اپنے خدا کی شان میں تدلیس اور بداد کو منسوب کرتے ہو، ورنہ ہمارے اماموں نے بھی ہمیشہ صاف صاف معاملہ رکھا، ہمارے سچے اور ایک خدا کی بات بھی ہمیشہ ایک ہی ہے..... جس کو اس نے مومن جانا پیغمبر خدا ﷺ سے کہہ دیا کہ یہ مومن ہیں ان کو اپنے ساتھ رکھ، ان کو اپنا مصاحب بنا، ان سے مدد لے، ان کے گھروں میں آرام کر..... جن کو منافق جانا ان کی نسبت صاف اپنے رسول سے کہہ دیا کہ ان کو بے ایمان سمجھ، کسی بات میں اپنا شریک نہ کر، کبھی اپنی صحبت میں ان کو نہ بٹھلا۔ چنانچہ خاص پیغمبر خدا ﷺ کے برتاؤ سے سب پر کھل گیا کہ کون منافق تھے اور کون مخلص تھے..... صحبت نبوی ﷺ حقیقت میں ایمان کی کسوٹی تھی۔ مگر ہمارے نزدیک وہ سچے ہیں اور تمہارے نزدیک جھوٹے، پس دو حال سے خالی نہیں یا یہ کہ پیغمبر خدا نے ان مہاجرین و انصار کے نفاق کو جانا یا ان کا نفاق آنحضرت ﷺ پر نہ کھلا۔ اگر ان کا نفاق کھل گیا تو ان کو اپنی صحبت میں رکھایا نہیں؟ اگر کہو کہ رکھا تو منافق کو اپنی صحبت میں رکھنا کیا معنی اور اگر نہیں رکھا تو ساری حدیث اور تفسیر اور سیر اور تاریخ کی کتابوں کو گنگا جمنما میں ڈال کر میلادِ نبویؐ ہی سے انکار کرنے لگو اور سارے متواترات کے منکر ہو جاؤ اور اگر ان کا نفاق نہیں کھلا تو اول تو ان منافقین پر آفریں کرو کہ کیسے ہوشیار اور چالاک تھے کہ ابتدائے طلوعِ نیرِ نبوت سے غروب کے زمانے تک اپنے نفاق میں ایسے ہوشیار رہے کہ کبھی پیغمبر خدا ﷺ پر ان کا حال نہ کھلا اور آنحضرت ﷺ کو ان کے نفاق پر اطلاع نہ ہوئی، نہ جبرئیلؑ ان کی خبر لائے، نہ خدا نے ان پر وحی کی، (نعوذ باللہ من ذالک)۔ اس کے بعد یہ خیال کرو کہ وہ منافقین کتنے تھے دو

چار تھے یا ہزار دو ہزار، پس اگر ”ارتدت الصحابة كلهم الا ثلاثة“ پر نظر گئی تو یہی ارشاد ہوگا کہ سوائے تین چار کے باقی سب کے سب منافق یا کافر تھے یا مرتد ہو گئے اور اگر ﴿يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا﴾^۱ پر خیال کیا تو کہو گے کہ اگرچہ منافق بھی بہت تھے مگر سچے اور پکے مومن بھی بارہ ہزار سے کم نہ تھے بلکہ منجملہ بارہ ہزار منافقوں پر غالب تھے یا منافق ان پر غالب تھے..... اگر یہ کہو کہ منافقوں پر غالب تھے تو تعجب ہے کہ باوجود غلبے کے پھر منافقوں کو پیغمبر ﷺ نے جیتے جی نکال نہ دیا اور ان کو ذلیل و خوار نہ فرمایا..... اور پھر بعد پیغمبر خدا ﷺ کے ان منافقوں کا کسی نے مقابلہ نہ کیا اور وصی برحق، امام مطلق کا دو تین کے سوا کسی نے ساتھ نہ دیا بلکہ خاص بضعہ رسول سیدۃ النساء تین چار رات برابر گھر گھر پیادہ پادوڑیں اور سارے مہاجرین و انصار سے مدد چاہی، عمامہ رسول ﷺ بھی دکھلایا، جامہ نبوی ﷺ کو بھی پیش کیا، حسنین رضی اللہ عنہما سے معصوم بچوں کے حال پر بھی ترحم کی خواہش کی اور خود بھی ایک دشمن کی لات کے صدمے سے مجروح ہوئیں اور ایک معصوم بچہ شکم مبارک ہی میں شہید ہوا اور داماد رسول کو بھی منافق گلے میں رسی ڈال کر کھینچتے لے چلے اور ادھر وہ خدا اور رسول کا واسطہ دلاتے رہے اور ادھر سیدۃ پاک دروازے سے اس حال زار کو دیکھ دیکھ کر ”وابتاهوا واما محمداه“ چلاتی رہیں اور داد بے داد کا غل ملائکہ نے سنا، اس ہنگامہ قیامت کے دیکھنے کو سدرة المنتہیٰ سے فرشتے دوڑے اور ان منافقوں نے کیا جو کچھ کیا اور ان معصوموں پر گزرا جو کچھ گزرا اور پھر ایسی حالت میں کہ غیروں کو رحم آجاتا ہے، دشمنوں کے دل بھی نرم ہو جاتے ہیں، جس سے کچھ تعلق نہیں ہوتا وہ بھی مدد پر آمادہ ہو جاتا ہے، مظلوموں کو ظالم سے بچاتا ہے مگر ایسی مصیبت اور تکلیف کی حالت میں بھی باوجودیکہ بارہ ہزار سچے پکے مومن موجود تھے جس میں سے نہ کوئی جبری تھا نہ قدری نہ کوئی دشمن علیؑ تھا اور علاوہ ان کے تمام بنی ہاشم ہتھیار بند موجود تھے اور پھر بایں قوت و شوکت اور بایں شجاعت و صولت کوئی بھی ان بارہ ہزار میں سے، نہ بنی ہاشم میں سے ایک بھی حمایت کو اٹھا اور نہ کسی نے وصی رسولؐ کی

۱ ترجمہ: ”اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں۔“ (سورہ نصر)

مدد کی اور نہ کسی نے بضعہ نبوی کی اعانت کی، سب کے سب بیٹھے تماشا دیکھتے اور ان منافقوں کو جن کے نہ دل میں ایمان تھا، نہ بدن میں قوت تھی، نہ جن کی قریش میں کچھ عزت تھی، نہ جن کو کسی قسم کی فضیلت تھی..... ہمیشہ پیغمبر خدا سے نفاق کرتے رہے، آنحضرت ﷺ کے مارنے کی تدبیریں سوچتے رہے، نہ کسی لڑائی میں کبھی تلوار نکالی بلکہ اپنی عمر بھر میں ایک پشتے کا خون بھی نہیں بہایا، مارنا کیسا، ساری لڑائیوں وقت پر فرار ہی اختیار کیا۔

پس ایسے لوگوں سے ان بارہ ہزار آدمیوں کا ڈرنا اور بنی ہاشم کا بھی چون و چرا نہ کرنا دو حال سے خالی نہیں یا یہ کہ وہ بھی منافق تھے اور دشمن اہل بیت گو خود ظالم و غاصب نہ ہوں لیکن ظالموں اور غاصبوں کے معین ہونے میں تو کچھ کلام ہی نہیں اور جب وہ بھی منافق ٹھہرے تو پھر ایمان والے تین کے تین ہی رہ گئے..... اور یا یہ جتنی باتیں ہم نے تمہاری طرف سے نقل کیں اس میں سے کوئی ثابت نہ ہوئی۔ نہ کسی نے کسی کا حق غصب کیا، نہ کسی نے کسی پر ظلم کیا بلکہ حق بہ حق دار دیکھ کر کسی نے مخالفت کسی کی نہ کی اور سب کے سب مہاجرین و انصار مومن اور مخلص تھے۔

پس اے حضراتِ شیعہ! سوائے ان صورتوں کے اور کوئی دوسری صورت ہی نہ تھی جس سے حفاظت ہو سکے۔ یا تو سب مہاجرین و انصار کو کافر کہو، منافق جانو اور یا سب کو مومن اور مخلص کہو و انسی لهم ذالک..... مگر کبھی یہ کہنا کہ سب منافق تھے اور کبھی فرمانا کہ بارہ ہزار با ایمان صحابی تھے اور کبھی یہ ارشاد کرنا کہ پیغمبر خدا کے مرتے ہی سب مرتد ہو گئے اور کبھی یہ کہنا کہ بعد خلیفہ سوم کے پھر لوگ تائب ہو گئے تھے اور ایمان کی طرف رجوع ہو گئے تھے اور اس کے مثل ہر موضع اور ہر مقام پر رنگ بدلنا اور بات بات میں دورنگی کرنا عقل کے بھی خلاف ہے اور ایمان کے بھی اور حیا کے بھی مخالف ہے اور انصاف کے بھی..... کیا وہ لوگ جنہوں نے ساری عمر تو پیغمبر خدا ﷺ کی صحبت پائی اور تمام زندگی میں اپنی حضرت کی نصیحت سنی اور نمازوں میں حضرت کے شریک رہے اور جہادوں میں مارنے مرنے پر مستعد رہے وہ سب کے سب پیغمبر خدا ﷺ کے وفات فرماتے ہی مرتد ہو جائیں اور اگر کچھ لوگ رہ جائیں تو وہ

خاندانِ نبویؐ پر ایسا ظلم صریح ہوتا ہو ادیکھ کر نہ زبان کو منہ سے نہ ہاتھ کو آستین سے نکالیں..... اور پھر باوجود ایسے ارتداد ایسی صریح اور واجب القتل ہونے کے بعد پچیس برس کے جب حضرت علیؑ خلیفہ ہوں تب پھر توبہ کریں اور حضرت علیؑ کے شریک ہوں۔ اور تم ان کی توبہ کو قبول کر لو اور ان کو با ایمان کہو اور ان کو جنتی جانو..... کیا خوب عقیدے ہیں آپ کے اور کیا اچھی باتیں ہیں آپ کی جو آپ ہی کو زیبا ہیں۔ شعر.....

ای دہانت زلب و لب زد ہاں شیریں تر
خندہ شیریں و سخن گفتن ازاں شیریں تر

یہ جو کچھ میں نے لکھا اس کے لفظ لفظ کی شرح باب امامت میں ہوگی اور اس اجمال کی تفصیل ایسی کی جائے گی کہ کسی شیعہ کی زبان سے بجز بجا و درست کے کچھ اور نہ نکلے مگر اس مقام پر دو چار فقرے لکھتا ہوں تاکہ اس کا حال لوگوں کو معلوم ہو جائے۔ اعلموا یا ایہا الخلائق ہداکم اللہ۔ شیعوں نے اول یہ دعویٰ کیا کہ خلافت حضرت امیرؑ کا حق تھا اور پیغمبر خدا ﷺ نے ان کو اپنی حیات میں اپنا خلیفہ کر دیا تھا مگر خلفائے ثلاثہ نے ان کا حق چھین لیا اور یکے بعد دیگرے خود خلیفہ بن بیٹھے اور خلافت کو اصول دین میں داخل کیا کہ اس کا منکر گویا توحید اور نبوت کا منکر ہے۔ پس اس اصول سے یہ نتیجہ نکالا کہ خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کافر ہو گئے۔ و نعوذ باللہ منہ۔ اور چونکہ ایک لاکھ آدمی سے زیادہ مسلمان پیغمبر خدا ﷺ کے بعد تھے اور جس میں سے ہزاروں مہاجرین و انصار اور بیعت الرضوان والے تھے، سبھوں نے خلیفہ اول کی بیعت کی تو ان کی نسبت بھی ارتداد کا حکم قائم کیا اور سب کو معاذ اللہ کافر ٹھہرایا اور چونکہ اس کے لیے کسی امام کا قول چاہیے اس لیے اماموں کی طرف منسوب کیا کہ ائمہ کرام نے فرمایا کہ پیغمبر خدا ﷺ کی وفات کے بعد سب اصحاب مرتد ہو گئے سوائے تین کے اور حضرت علیؑ ایسے مجبور ہو گئے کہ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اگر چالیس جانباز میرے شریک ہوتے تو میں مقابلہ کرتا۔ جب سب اصحاب رضی اللہ عنہم کے ارتداد کا دعویٰ کیا اس وقت آیات کلام اللہ پر نظر کی تو دیکھا کہ وہ تو تمام مہاجرین و انصار کی مدح و ثنا سے بھرا ہوا

ہے اس لیے اس میں تاویلات بعیدہ کرنا شروع کیں، مہاجرین کے یہ معنی بنائے کہ مراد اس سے شعب ابوطالب کی ہجرت کرنے والے ہیں، یا حبشہ کے ہجرت کرنے والے، ”انصار“ سے یہ معنی لیے کہ وہی ساٹھ ستر آدمی مراد ہیں جو کہ اوّل اوّل مکہ معظمہ میں پیغمبر خدا ﷺ کے حضور میں حاضر ہوئے تھے اور ”سابقون“ کے معنی یہ بنائے کہ مراد ان سے وہ لوگ ہیں جو پیغمبر خدا کے سامنے ہی مرچکے تھے۔

جب یہ خیال کیا کہ آخر یہ سب تعریفیں اصحاب رضی اللہ عنہم کی جو خدا کی کتاب میں ہیں ان کا مصداق کسی کو کرنا چاہیے تو جہاں تک ہو سکا ان آیتوں کو صرف علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شان میں قرار دیا اور جو کچھ خلافت کا وعدہ خدا نے اصحاب رضی اللہ عنہم سے کیا تھا اس کو امام مہدی آخر الزماں کے عہد پر ٹالا اور جو شوکت و نصرت اور غلبہ اسلام کا خدا نے قرآن مجید میں بیان کیا تھا اور جس کا ظہور خلفائے ثلاثہ کے ہاتھ سے ہوا تھا اس کو امام صاحب کے ظہور پر ملتوی کیا..... باقی وہ آیتیں رہ گئی ہیں جن کا مصداق سوائے اصحاب نبویؐ کے اور کوئی نہ ہو سکا تب یہ اقرار کیا کہ مراد اس سے وہ اصحاب ہیں جو ایمان پر ثابت قدم تھے اور جن کے اعمال بھی اچھے تھے..... اور بہت سی آیتوں کو جس میں کثرت اصحاب اور غلبہ اہل اسلام کا ذکر ہے دیکھ کر کوئی چارہ سوائے اس کے نہ پایا کہ تین کو چھوڑیے اور دو چار ہزار اصحاب کی خوبیوں کا اقرار کیجیے۔ چنانچہ یہ سمجھ کر اور اہل سنت کی دار و گیر سے تنگ ہو کر اور کچھ خدا سے شرم کر آخر شیخ صدوق محمد بن بابو یہ قمی نے ”کتاب خصال“ میں یہ اقرار کیا کہ پیغمبر خدا کے بارہ ہزار اصحاب تھے جس میں سے آٹھ ہزار مدینے کے اور دو ہزار غیر مدینے کے اور دو ہزار آزاد اور رہا کیے ہوئے، جس میں نہ کوئی قدری تھا کہ جبر کا قائل ہو، نہ کوئی معتزلی تھا، نہ کوئی صاحب الرأی تھا بلکہ سب کے سب نہایت نیک اور پاک تھے، رات دن خدا کے خوف میں رویا کرتے اور خدا سے دعا کرتے کہ الہی قبل اس کے کہ ہم میدے کی روٹی کھائیں ہماری روح قبض کر لینا۔ لیکن اس میں بھی کیا ہوشیاری کی کہ بوجہ خلفائے ثلاثہ کے مکے والوں کا کچھ ذکر نہ کیا کہ وہاں کے بھی کچھ لوگ مسلمان تھے یا نہیں، گویا باوجود اس کثرت کے بھی ان بے چاروں

کو خارج ہی رکھا..... خیر بہر حال جب کسی سنی نے اعتراض کیا کہ عجب مذہب ہے تمہارا کہ اصحابِ نبویؐ کو جن کی تعریف سے قرآن بھرا ہوا ہے کافر اور مرتد کہتے ہو تو جواب میں وہی روایت پیش کر دی کہ ہم بارہ ہزار اصحاب کو با ایمان جانتے ہیں اور ساری آیتوں اور احادیث اور اقوال کے مصداق کے لیے ان بارہ ہزار کے ایمان کا اقرار کیا اور بعضوں نے یہ خیال کر کے کہ اگر کوئی ان کے نام پوچھ بیٹھے تو کیا جواب دیں گے ایک فہرست بھی تیار کی جس میں سو اصحاب کے نام لکھے مگر خدا کے فضل سے وہ فہرست بھی ایسی ہے کہ جس کے دیکھنے سے ہنسی آتی ہے۔ بعض تو وہ لوگ ہیں جو ہجرت کے وقت کافر تھے اور بعض وہ لوگ ہیں جو جنگ بدر میں کافر ہونے کے سبب سے پکڑ کے آئے تھے اور ان سے فدیہ لے کر ان کو چھوڑا تھا اور بعض ایسے ہیں جو پیغمبر ﷺ کی وفات کے وقت شاید نابالغ ہوں گے اور بعض وہ ہیں جن کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ذلیل و خوار فرمایا ہے یا خائن اور بددیانت کہا ہے۔ خیر بہر حال دکھلانے کے واسطے سو نام کی فہرست تیار کی اور باقیوں کی نسبت کہا کہ شیخ اعظم محمد بن حسن بن بابو یہ قتی نے اسماء الرجال کی کتابیں تیار کی ہیں، اس میں بہت اصحاب کے نام ہیں مگر افسوس ہے کہ ناصبیوں نے جلا دیں اور اب ان کا پتہ نہیں چلتا۔

غرض کہ اب دو دعوے جو ایک دوسرے سے مخالف تھے حضرات نے کیے کہ ایک دعویٰ تو یہ کیا کہ سب اصحاب مرتد ہو گئے اور دوسرا دعویٰ یہ کیا کہ بارہ ہزار اصحاب نہایت نیک اور پاک تھے اور دونوں متناقض روایتوں پر جب اہل سنت نے اعتراض کیا تو اب ارتداد الصحابة کلہم عدول کے معنی بنائے کہ یہ جو امام نے فرمایا ہے کہ سب اصحاب سوائے تین کے مرتد ہو گئے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ سب کافر ہو گئے بلکہ تین فریق ہو گئے تھے، ایک فریق تو صاف مرتد ہو گئے، یعنی دین سے پھر گئے اور بعض ضروریات اسلام کے منکر ہو گئے، ان کے ارتداد کا نام ارتداد دینی دیا گیا اور دوسرا فریق اخلاق حمیدہ اور صفات پسندیدہ کا تارک ہوا، یعنی جو افعالِ حسنہ، اعمالِ صالحہ اور خصوصی محبتِ اہل بیت کے ساتھ پیغمبر ﷺ کے زمانے میں رکھتے تھے اسے چھوڑ دیا اور حضرت سید المرسلین ﷺ کی ذریت کی نصرت

اعانت نہ کی اور اس کے ترک میں مداہنت کی، اس ارتداد کا نام ”ارتدادِ خلقی رکھا گیا..... اور تیسرا فریق وہ قرار دیا گیا جس نے حقوقِ اہل بیت کو غضب کیا اور علی مرتضیٰؑ کا اور فاطمہ زہراؑ کا حق چھین لیا اور عترتِ نبویؐ کو ستایا اور اس کا نام ”ارتدادِ ایمانی“ رکھا، یعنی ایمان کو چھوڑ دیا گو ظاہر میں اسلام کا نام ان پر باقی رہا..... پس اس حکیمانہ تقریر سے دونوں مختلف حدیثوں یا روایتوں کو تطبیق دیا کہ جس حدیث میں کل صحابہ کے ارتداد کا ذکر ہے اس سے ارتدادِ دینی اور ارتدادِ ایمانی مراد ہے اور جس روایت میں بارہ ہزار اصحاب کا ذکر ہے وہ اس زمرہ میں داخل نہیں ہیں جن پر ارتدادِ دینی کا اطلاق ہے۔

اس کے بعد جب یہ خیال کیا کہ منجملہ ان تین فریق کے دو فریق تو حقیقت میں دین و ایمان سے محروم ہوئے ایک فریق رہ گیا جن کے ارتداد کا نام ”ارتدادِ خلقی“ رکھا گیا، ان پر بھی یہ اعتراض ہوتا ہے کہ انہوں نے کیوں علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی اعانت نہ کی اور اس جم غفیر نے اہل بیت کی محبت کیوں چھوڑی اور ایسے ظلم صریح کو دیکھ کر معاندین کا مقابلہ نہ کیا؟ تب اکثر نے اس کا اقرار کیا حقیقت میں کوئی سچا اور کامل ایمان والا نہ رہا تھا۔ اور جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے چند شخصوں نے اعانت کا وعدہ کیا اور جناب امیرؓ نے ان کا امتحان لیا تو وہ بھی امتحان میں پورے نہ اترے۔ اس لیے حقیقت میں ترکِ اعانتِ اہل بیت سے وہ بھی مرتد ہو گئے اور صرف دو تین سچے رفیق رہ گئے مقدادؓ، سلمانؓ، ابوذرؓ اور بعضوں نے ان کو بھی اڑا دیا اور سچا دوست ایک مقدادؓ ہی کو قرار دیا۔ پھر جب خیال کیا کہ آخر تین خلیفوں کے بعد اصحابِ نبویؐ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کی تو اگر وہ ان سے مخالف ہوتے تو کیوں چوتھی دفعہ ان کو خلیفہ کرتے، کیا کوئی چوتھا آدمی باقی نہ رہا تھا؟ تب یہ مضمون تراشا کہ یہ لوگ اول و ہلہ میں مرتد ہو گئے تھے مگر تھوڑی مدت کے بعد بہ بدرقہ عنایتِ ایزدی حق کی طرف ہوئے اور انہوں نے توبہ کی اور ہدایت پائی اور اپنے حق اور راہِ راست پر ثابت قدم ہو گئے۔

لیکن یہ روایتیں اور حدیثیں کتبِ شیعہ میں ایک دوسرے سے مخالف ہیں کہ کسی کی تصدیق کرنی اصولِ شیعہ کے موافق محالات سے ہے، اس لیے کہ ان کے بڑے بڑے فقہاء

اور مجتہدین اسی کے معتقد رہے کہ جس نے نص نبویؐ کو سنا اور پھر منکر خلافت ہوا وہ اسلام سے خارج اور واجب القتل ہو گیا..... بہر حال گوشینی کر کے بہت سی باتیں بنائیں اور دس پانچ ہزار کو اصحاب نبویؐ میں شمار کیا مگر بہ فحوائے ”ولا یصلح العطار ما افسدہ الدھر“^۱ جو سلسلہ ایمان کا ان کے بزرگوں نے توڑا تھا وہ پھر نہ جڑ سکا اور اب تک اس بات کا کسی شیعہ سے جواب نہ ہو سکا کہ جو لوگ حقوق اہل بیت کے غصب کرنے والے تھے وہ تو صرف تین آدمی ہی تھے باقی جو ہوں گے وہ ان کے معین و مددگار ہوں گے، تو اگر ان کے معین و مددگار بہت نہ ہوتے تو وہ کیوں حق اہل بیت غصب کرنے پاتے اور اگر بہت تھے تو کچھ بھی ان کے مخالف تھے یا نہیں؟ اگر کچھ لوگ بھی مخالف نہ تھے تو وہی ”ارتدادت الصحابة کلہم“ کا مضمون صادق آیا اور اگر دس پانچ ہزار آدمی بھی ان سے مخالف تھے تو پھر انہوں نے تلوار کا تلوار سے، زبان کا زبان سے، لشکر کا لشکر سے بہ مقتضاء ﴿السِّنِّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحِ قِصَاصٌ﴾^۲ مقابلہ کیوں نہ کیا۔

پس معلوم ہوا کہ ان خلفائے جور کے مخالفین بہت ہی کم تھے، اس لیے بعض روایات میں آیا ہے کہ علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پیغمبر خدا ﷺ کے بعد سمجھوں نے وصیت نبویؐ کو بھلا دیا اور ایمان کو چھوڑ دیا، کوئی بھی مجھے ایسا نظر نہ آیا تھا جس کے بھروسے پر میں مخالفین کا مقابلہ کرتا۔ تو اس صورت میں وہ دعویٰ کہ بارہ ہزار افراد ایسے تھے جو رات دن روتے تھے، باطل ہوا، اس لیے کہ اگر دو چار ہزار بھی ان میں سے اس وقت تک زندہ ہوتے تو وہ کچھ مدد کرتے یا نہ کرتے، شاید ان کو رونے سے فرصت نہ ملی ہوگی اور گوشہ عبادت سے نکلنا مناسب نہ تصور کیا ہوگا مگر وہ وقت جبکہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا روتی پھرتی تھیں اور علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ گھر گھر مدد مانگتی پھرتی تھیں وہ وقت رونے کا اور گوشہ نشینی کا تھا یا کہ تلوار ہاتھ میں لے کر غاصبین کے مارنے کا اور ذریت نبویؐ کو ظلم و ستم سے بچانے کا.....

۱ عطار اس چیز کو درست نہیں کر سکتا جس چیز کو زمانے نے بگاڑ دیا ہو۔ ۱۲

۲ ترجمہ: دانت کے بدلے دانت اور زخموں کا بدلہ برابر۔“ (سورہ مائدہ)

اگر کہا جائے کہ انہوں نے بعد میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا کہ آخر انہیں میں سے ہزاروں آدمی جنگ صفین میں مارے گئے اور ہزاروں آدمی معاویہ رضی اللہ عنہ امیر شام کے مقابلہ میں علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے قتل ہوئے تو ان کی توبہ پر کیا بھروسا ہو سکتا ہے، اس لیے کہ جب اصل وقت پر انہوں نے دغادی اور بضعہ نبویؐ کو ظلم و ستم سے نہ بچایا اور پچیس برس تک خلفاء جور کی بیعت کرتے رہے تو ان کے ایمان پر کیا اطمینان ہو سکتا ہے اور سوائے اس کے کہ یا ان کو ارتداد کی حالت پر رہنے دیا جائے یا ان کے ارتداد کا نام ہی نہ لیا جائے ان کی نسبت اول ایمان کی نسبت کرنا پھر بیچ میں مرتد بنانا پھر توبہ کر کے ایمان کا ان پر اطلاق کرنا اور طلاق رجعی کی طرح نکال دینا اور داخل کر لینا دین کو باز بیچہ اطفال بنانا ہے۔

غرض کہ اصحاب نبویؐ تو اس حیص بیص میں پڑ گئے اور اب تک پڑے ہوئے ہیں، کوئی سب کو کافر بناتا ہے، دو تین کو پکا ایمان والا کہتا ہے، کوئی بارہ ہزار کو با ایمان کہہ کر اپنی دینداری ظاہر کرتا ہے مگر ہر چند باتیں بناتے ہیں کوئی بات نہیں بنتی..... خیر اصحاب نبویؐ کو چھوڑو، اب خاص علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی طرف خیال کرو کہ جناب امیرؓ کی نسبت کیا فرماتے ہیں۔ قبلہ ان کا بھی وہی حال ہے کہ جب انہوں نے خلفائے ثلاثہ کی بیعت کر لی تو ان کی بیعت سے خلافت کا ثبوت ہو گیا اور جب ثبوت خلافت ہو گیا تو مذہب تشیع باطل ہوا، اس لیے یہ مضمون تراشا گیا کہ حضرت علیؓ نے خوشی سے بیعت نہیں کی بلکہ جب یہ کیفیت ہوئی:

بدست عمر بودیک ریسماں

دگر در کف خالدؓ پہلوان

فگندند بر گردن شیر نر

کشیدند اور ابر ابوبکرؓ

”ایک رسی عمرؓ کے ہاتھ میں تھی دوسری خالدؓ پہلوان کے ہاتھ میں شیر نر (علیؓ) کی

گردن میں وہ رسی ڈال کر ابوبکرؓ کے پاس گھسیٹ کر لے گئے۔“

یعنی کشاں کشاں ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس لائے اور باوجودیکہ راہ میں بہت سے معجزات دکھائے گئے اور پیغمبر خدا ﷺ نے قبر مبارک سے ہاتھ بھی نکال دیا اور ہاتھ غیبی نے مرثیہ بھی پڑھا اور کسی نے کچھ نہ سنا تب بہ مجبوری حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیعت کی۔

جب مجبوری کے لفظ کو علی مرتضیٰ کی شان میں نقص اور عیب خیال کیا کہ باوجود وہ خدا کے شیر تھے اور شجاعت و مردانگی میں نظیر نہ رکھتے تھے، ان کا مجبور ہونا کیسا، تب دوسرا مضمون تراشا گیا کہ پیغمبر خدا ان کو وصیت کر گئے تھے کہ تم خلفاء ثلاثہ سے مقابلہ و مقاتلہ نہ کرنا اس لیے حضرت نے مقابلہ نہ کیا ورنہ اگر پیغمبر خدا کی وصیت نہ ہوتی تو پھر لوگ تماشا دیکھتے اور ذوالفقار علی کے جوہر نکلتے، مجبوری تھی کہ پیغمبر خدا ﷺ کی وصیت کے خلاف علی مرتضیٰ کچھ مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔

جب یہ اندیشہ ہوا کہ لوگ کہیں گے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے ایسی وصیت کیوں کی تھی کہ جس کے اوپر عمل کرنے سے دین ہی غارت ہوا اور خاندان نبویؐ تہہ و بالا ہو گیا اور کفار منصب خلافت کے غاصب ہو گئے، تو اس کے لیے ایک حدیث بنائی جس کا مضمون یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے خاض جبرئیل علیہ السلام کی معرفت اپنا نامہ علی مرتضیٰ کے نام اور حضرت جبرئیل نے سب کو ہٹا کر رسول اور وصی کو وہ نامہ دیا اور دینے سے قبل بہت سے عہد لیے اور قسمیں لیں جب حضرت جبرئیل کو اطمینان ہو گیا کہ ضرور اس پر عمل ہو گا تب چپکے سے وہ نامہ خدا کا دیا، اس میں لکھا تھا کہ تم خلفائے ثلاثہ کے مقابلہ میں تلوار نہ لینا، اس لیے حضرت علی نے مقابلہ نہ کیا۔

اور جب یہ خیال ہوا کہ حضرت علی نے امیر شام کے مقابلہ میں کیوں تلوار لی اور ہزاروں آدمیوں کو قتل کیا؟ تب اس نامہ میں یہ مضمون اور بڑھا دیا کہ امیر شام اور خوارج کے مقابلہ میں تلوار اٹھانا اور خوب گردنیں ان کی اڑانا۔ سبحان اللہ، کیا نامہ تھا اور کیا مضمون تھا کہ ایک فریق سے مقابلہ کا حکم، دوسرے سے سکوت و خاموشی کی وصیت، اختیار تھا کہ جو چاہتے اس نامہ میں اور بڑھا دیتے۔ شعر.....

ایں سخن راجوں تو مبدا بودہ
گر بیفزاید تو آں افزودہ

بہر حال جب کسی نے یہ پوچھا کہ خدا نے ایسی وصیت کیوں کی جس کا مضمون مختلف ہے؟ اس کا یہ جواب دیا کہ خدا کی حکمت خدا ہی جانے بندے کی کیا قدرت ہے جو اس کے اسرار اور حکمتوں سے واقف ہو، ایمان والوں کا کام ہے بے چون و چرا اس کی باتیں مان لینا نہ کہ اس کی حقیقت اور سبب کا پوچھنا اور اس کے واسطے ہزاروں آیات اور لاکھوں احادیث کی سند موجود ہے۔

خیر بہر حال اس نامے کی بدولت شجاعت بھی حضرت امیرؓ کی قائم رہی اور بیعت کا عذر بھی معقول ہو گیا اور خلافت بھی خلفائے ثلاثہ کی حق نہ ہونے پائی اور جب کسی سنی جاہل نے اعتراض کیا کہ علی مرتضیٰؓ نے بیعت کیوں اختیار کی تمہارے نزدیک خلفاء ثلاثہ معاذ اللہ! مرتد تھے اور بیعت تو فاسق کی بھی حرام ہے۔ اردو کے مرثیہ پڑھنے والے بھی جانتے ہیں کہ اسی اسطے امام حسینؓ نے یزید کی بیعت نہ کی اور جب اس نے بیعت کرنے کے لیے لکھاتب آپؓ نے انکار کیا اور فرمایا: شعر.....

سب جانتے ہیں بیعت فاسق حرام ہے
اس کا نہیں پیام اجل کا پیام

تو باوجودیکہ خود امام حسینؓ شہید ہوئے اور سارا خاندان بھوکا پیاسا شہید ہوا مگر چونکہ یزید فاسق تھا حضرت نے اس کی بیعت نہ کی، تو اگر خلفائے ثلاثہ بھی فاسق ہوتے چہ جائے مرتد ہونے اور کافر ہونے کے، تو اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب کس طرح بیعت کرتے؟ تو اس سے کہہ دیا کہ تم جاہل ہو، نہیں جانتے کہ حضرت علیؓ کے لیے خدا کا ایک خاص نامہ آیا تھا اس میں نہایت تاکید کے ساتھ صبر کی اور عدم مقابلے کی وصیت تھی اور جب کسی نے کہا کہ امام حسینؓ نے کیوں اس پر عمل نہ کیا؟ تب کہہ دیا کہ ان کے لیے دوسرا صحیفہ تھا، ان کو یہی حکم تھا کہ تم بیعت نہ کرنا شہید ہونا..... تم سنی خارجی دشمن اہل بیت ہو، تم

ائمہ کے حال سے کیا واقف ہو، یہ راز کی باتیں ہیں، انبیاء اور ملائکہ تو اس کے متحمل نہیں ہوئے، یہ خاص حصہ شیعوں اور کوفیوں کا ہے، ہر امام کے لیے خدا نے جدا صحیفہ بھیجا تھا اور سب باتیں جو ان کو کرنی چاہئیں وہ اس میں لکھی ہوئی ہیں، پس ہر امام کا اس پر عمل تھا۔ کیا ہمارے امام تمہارے خلیفہ سے تھے کہ جن کو سوائے خدا کے دوسرے سے کچھ پوچھنے کی حاجت ہوتی، سب علم ماکان و مایکون ان کو حاصل تھا، بلا واسطہ جبرئیلؑ کے خدا سے وہ باتیں کیا کرتے تھے اور سارے کام اور تمام افعال ان کے خدا کی اجازت سے اس کی مرضی کے موافق ہوتے تھے۔ پس جس طرح حضرت آدم سے لے کر خاتم النبیین تک سب اولوالعزم پیغمبروں کے جدا جدا صحیفے اور علیحدہ علیحدہ کتابیں خدا نے بھیجیں اسی طرح پر سب ائمہ کو جدا جدا صحیفے بھیجے، اسی واسطے ان کا عمل ایک دوسرے کے موافق نہ تھا۔ اگر ائمہ کے اختلافِ عمل پر تم کو شبہ ہو تو جو اختلاف پیغمبروں کی شریعتوں میں ہو اس پر بھی شبہ کرو۔

بہر حال اس امر میں حضراتِ شیعہ بڑے موحد، صابر اور متوکل علی اللہ بن گئے، بے چون و چرا سارے افعالِ ائمہ کو ان کے صحائفِ آسمانی پر محمول کر دیا اور اہل بیت کے ساتھ اپنی دوستی پر اسی کو شاہد کیا۔

یہ حال تو ائمہ کا ہوا، اب باقی کیفیت خلفاء اور اصحاب کی سنیے کہ بعضوں نے تو ان کے اعمالِ حسنہ سے بھی انکار کیا اور کہا کہ کوئی نیک عمل کبھی ان سے صادر ہی نہیں ہوا اور بعضوں نے جب اس امر کو متواترات کا انکار خیال کیا تو اقرار کیا کہ بے شک وہ ظاہری اعمال کے بڑے پابند تھے اور روزہ نماز وغیرہ کے کامل مقید تھے، اور ان کے چال چلن ظاہر میں بہت ہی اچھے تھے مگر تا کہ اس سے ان کی فضیلت ثابت نہ ہو اور مستحقِ ثواب نہ ٹھہریں تو ”طینت“ کا مسئلہ ایجاد کیا، یعنی ائمہ کی طرف منسوب کر دیا کہ حدیث میں آیا ہے کہ امام باقر علیہ السلام فرماتے:

”حق تعالیٰ سبحان ❶ نے ایک پاک زمین پر سات دن تک شیریں پانی جاری کیا پھر ہمارے خمیر کو اس سے جدا کیا اور اس کی تلچھٹ سے شیعوں کی مٹی بنائی اور

پھر ایک دوسری ملعون زمین میں شور پانی اسی طرح جاری کیا اور اس سے ہمارے دشمنوں کا خمیر بنایا۔ پس اگر وہ سب الگ رہتے تو کبھی کسی شیعہ سے گناہ نہ ہوتا اور سب شیعہ ہماری ہی طرح معصوم رہتے اور کسی سنی ناصبی ہمارے مخالف سے کوئی نیک کام نہ ہوتا، سب ظاہری کافر رہتے، مگر خدا نے دونوں مٹیوں کو خلط ملط کر دیا اور کچھ پاک مٹی ناپاک مٹی میں مل گئی۔ اس لیے جو شیعہ گناہ کرتے ہیں وہ سنیوں اور ناصبیوں کی ناپاک مٹی کا اثر ہے اور جو ناصبی اعمال صالحہ کرتے ہیں وہ اس پاک مٹی کا اثر ہے، مگر جب قیامت کا دن ہوگا اور خدا اپنا عدل ظاہر کرے گا تو جس کی مٹی سے جو عمل ہوا ہے وہ اس کو دے گا، شیعوں کے گناہ ناصبیوں کے سر پڑیں گے کیونکہ انہیں کم بختوں کی مٹی کے اثر سے ہوئے تھے اور ناصبیوں کے نیک کام سب شیعوں کو مل جائیں گے، اس لیے کہ انہیں کی پاک مٹی کی تاثیر سے ہوئے تھے..... راوی کہتے ہیں کہ جب میں نے امام سے یہ سنا تو کہا میں قربان ہوں آپ کے یا حضرت، سنیوں کے نیک کام سب ہم کو مل جائیں گے اور ہمارے گناہ سب ان کے سر پڑیں گے، امام نے فرمایا خدا کی قسم ہے ضرور بالضرور ایسا ہی ہوگا۔ راوی کہتے ہیں، میں نے امام سے پوچھا کہ یا حضرت، قرآن مجید میں بھی کچھ اس کا ذکر ہے امام نے فرمایا واہ وہ بھی کوئی بات ہے جو قرآن میں نہ ہو، دیکھو اس آیت کو کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے ﴿أُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ﴾ کہ خدا بدل دے گا ان کے گناہوں کو نیکیوں سے، اس کا یہی مطلب ہے۔“

غرض کہ اس مسئلہ طینت کی بدولت اصحابِ نبویؐ اور تمام سنیوں کے اعمالِ حسنہ جو قیامت تک ہوں گے سارے شیعہ ان علیؑ کے حصے میں آگئے اور ان کی ہجرت اور نصرت اور

① یہ عبارت ”علل الشرائع“ کی ایک طویل روایت کا خلاصہ ہے۔ ”علل الشرائع“ از شیخ صدوق م ۱۳۸۱ھ ترجمہ

جہاد وغیرہ جس کی جا بجا خدا نے قرآن مجید میں تعریف کی ہے وہ گھر بیٹھے شیعوں کو مل گئے اور وہ بے چارے باوجود ان محنتوں اور کوششوں کے محروم اور بے نصیب رہے، (نعوذ باللہ من ہفواتہم) پس جو اہل سنت اصحابِ نبویؐ کے اعمال پر بہت ناز کرتے تھے اور ان کی ہجرت و نصرت کو بار بار ان کی فضیلت میں بیان کرتے تھے ان کا تو منہ مسئلہ طینت سے بند کیا گیا۔ اب باقی رہی ایک اور بات کہ خدا نے جا بجا قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ جو منافق ہیں وہ ذلیل و خوار ہوں گے اور قتل کیے جائیں گے اور مارے جائیں گے اور اصحابِ نبویؐ باوجود یکہ منافق تھے۔ (ونعوذ باللہ من ذلک) خلیفہ ہوئے اور ان کی عزت و شوکت زیادہ ہوئی تو خدا کا یہ وعدہ پورا نہ ہوا، پس یا خدا کو جھوٹا کہنا لازم آتا تھا یا اصحاب کے نفاق سے انکار کرنا پڑتا تھا اس لیے بہ مقتضائے مصرع:

ہم لعل بدست آید وہم یار نہ رنج

خدا کا کلام بھی سچا ہو اور اصحابِ نبویؐ کا نفاق بھی قائم رہے ”رجعت“ کا مسئلہ بنایا گیا۔ رجعت ❶ کا مسئلہ یہ ہے کہ جب امام مہدی ظاہر ہوں گے تب پیغمبر ﷺ زندہ ہوں گے اور سارے اچھے اور پاک لوگ زندہ ہوں گے اور حضرت خاتونِ جنتؑ زندہ ہوں گی، حضرت علیؑ زندہ ہوں گے اس وقت خلفائے ثلاثہ قبروں سے نکالے جائیں گے اور ان پر مقدمہ دائر ہوگا، ایک طرف سے حضرت علیؑ رضی اللہ عنہ اپنا دعویٰ پیش کریں گے کہ میری خلافت

❶ شیعہ عقائد و اعمال کے بیان میں ”تحفۃ العلوم“ اردو زبان میں ایک قدیم ترین کتاب ہے اس میں اس ”عقیدہ رجعت“ کا بیان ان مختصر الفاظ میں کیا گیا ہے: ”اور ایمان لانا رجعت پر بھی واجب ہے، یعنی جب امام مہدی ظہور و خروج فرمائیں گے اس وقت مومن خاص اور کافر اور منافق مخصوص زندہ ہوں گے اور ہر ایک اپنی داد و انصاف کو پہنچے گا اور ظالم سزا و تعزیر پائے گا۔“ تحفۃ العلوم صفحہ ۵

ملا باقر مجلسی نے اپنی مشہور کتاب ”حق الیقین“ کے صفحہ ۱۳۹ پر ابنِ بابویہ قمی کی علل الشرائع کے حوالہ سے امام محمد باقرؑ سے روایت نقل کی ہے: ”چونکہ قائم ما ظاہر شود عائشہ رازندہ کنڈیا براوحد بزند و انتقام فاطمہ ما از و بکشد“ (حق الیقین صفحہ ۱۳۸) ”جب ہمارے قائم (یعنی مہدی) ظاہر ہوں گے تو وہ (معاذ اللہ) عائشہ رضی اللہ عنہا کو زندہ کر کے ان کو سزا دیں گے اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کا انتقام ان سے لیں گے۔“ (شیخ محمد فراست)

غضب کی دوسری جانب سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا مدعی ہوں گی کہ مجھے مجروح کیا، حسن کو شہید کیا، باغ فدک کو چھینا..... غرض کہ بعد ثبوتِ کامل یہ حکم ہوگا کہ یہ لوگ درخت سے لٹکائے جائیں اور ان کو پھانسی دی جائے..... اور کیا کہا جائے ایسی خرافات اور واہیات باتیں ان مردودوں نے لکھی ہیں کہ جن کے دیکھنے سے مسلمان کے بدن پر لرزہ ہوتا ہے..... غرض کہ ان کے نزدیک اس وقت خدا کا وعدہ پورا ہوگا اور تب ان کی ذلتِ کامل ہو کر لوگوں پر ان کے نفاق کا حال کھلے گا اور پھر اس مسئلہ رجعت کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ فرقہ حقہ اثنا عشریہ کے عقائد خاص سے ہے اور سب فرقے اس پاک اور نیک عقیدے سے بے نصیب ہیں۔

ان سب باتوں کے علاوہ ایک بہت بڑی مصیبت اس مذہب پر یہ تھی کہ جناب امیرؑ سے لے کر گیارہویں امام تک سب کے سب ظاہر میں اسی روش پر تھے اور رہے جو کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تھی اور ہمیشہ ان کے اوصاف و محامد بیان کیے اور جب کسی نے پوچھا تب ان کی تعریفوں میں نہایت ہی مبالغہ کیا بلکہ خود جناب امیرؑ برابر پانچوں وقت کی نمازیں انہیں کی اقتدا میں ادا کرتے رہے اور لڑائیوں اور جہادوں میں ان کو مشورہ دیتے رہے نہ اسی زمانے میں جبکہ خلفائے ثلاثہ مسندِ خلافت پر تھے بلکہ ان کے پیچھے بھی ان کے شاخوایں رہے اور اپنے عہدِ خلافت میں بھی جبکہ ان کو مکمل قوت و اقتدار حاصل تھا خلفائے سابقین کی تعریف و توصیف کرتے رہے اور یہ کہ خلفائے سابقین نے جو احکامات جو جاری کیے تھے ان کو بھی ختم نہیں کیا نہ فدک و ارثانِ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو لوٹایا، نہ تراویح جیسی بدعت کو موقوف کیا، نہ متعہ کو حلال قرار دیا..... اس مصیبت سے چھٹکارے کا حل یہ سوچا کہ ایسی بات پیدا کرنی چاہیے کہ باوجود اس موافقتِ ظاہری کے ائمہ کرام کی مخالفت صحابہ سے قائم رہے اور مذہبِ شیعہ کی جڑ مضبوط کی جائے تب ایک نہایت ہی سچا اور صاف اور عمدہ و دلچسپ اصول قائم کیا یعنی ظاہر کا باطن سے مخالف ہونا اور جھوٹ بولنا مگر چونکہ یہ لفظ نہایت ثقیل اور مکروہ تھا، اگر اسی کو عقیدہ میں داخل کرتے تو جو سنتا وہ اس لفظ کے سنتے ہی نفرت کرتا، اس لیے اس کی حقیقت کو ایک خوبصورت اور خوشنما لفظ کے پردے میں ظاہر کیا اور جھوٹ بولنے اور ظاہر کے باطن سے

مخالف ہونے کا نام تقیہ ❶ رکھا اور اس کو ہمارے سوالوں کا جواب اور کل شبہات و شکوک کا حل ٹھہرایا..... مگر افسوس ہے کہ یہ نہ خیال کیا کہ صورت اصلی لباس سے بدل نہیں سکتی اور کسی شے کی حقیقت الفاظ کے تبدیل کرنے سے متغیر نہیں ہو سکتی، جھوٹ کا کچھ ہی نام کیوں نہ رکھو، جب اس کے معنی کہو گے اس کی برائی ظاہر ہو جائے گی، خواہ نام اس کا تقیہ رکھو، خواہ اصول دین میں اسے داخل کرو۔ شعر.....

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت رامی شناسم

اب غرض کہ تقیہ کو اصول دین میں سے قائم کرنے کے لیے کسی امام کی سند چاہیے، اس لیے کہ حضرات امامیہ اہل سنت تو نہیں ہیں کہ جو قیاس و استحسان کو دین میں دخل دیں، خدا کے فضل سے ان کے سارے عقیدے اور کل اصول ائمہ کرام کے فرمائے ہوئے ہیں اور ان کی احادیث کی کتابیں ناصبیوں کی طرح بے اعتبار تو نہیں ہیں کہ جو اور جس زید و عمرو نے چاہا احادیث نبوی کی تصحیح کر دی اور ان کا نام صحیح اور سنن رکھ لیا بلکہ حضرات امامیہ محدثین نے جو

❶ اصول کافی میں ”تقیہ“ کا ایک مستقل باب ہے اسی باب کی مندرجہ ذیل روایتیں تقیہ کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں: ”عن ابی عمیر الاعجمی قال قال لی ابو عبد اللہ علیہ السلام یا ابا عمیر تسعة اعشار الدین فی الدین فی التقیة ولادین لمن لاتقیة له والتقیة فی کل شیئی الا فی النبیذ و المسح علی الخفین“ (اصول کافی مطبوعہ لکھنؤ صفحہ ۲۸۲)

”ابو عمیر عجمی راوی ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے مجھ سے فرمایا اے ابو عمیر دین کے دس حصوں میں سے نو حصے تقیہ میں ہیں اور جو تقیہ نہیں کرتا وہ بے دین ہے اور تقیہ ہر چیز میں ہے سوا نبیذ پینے کے اور موزوں پر مسح کرنے کے۔“

”ابو بصیر سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ تقیہ اللہ کا دین ہے، میں نے (تجب سے) کہا کہ اللہ کا دین ہے، امام نے فرمایا کہ ہاں، خدا کی قسم اللہ کا دین ہے بہ تحقیق یوسف علیہ السلام پیغمبر نے کہا کہ اے قافلے والو تم چور ہو حالانکہ انہوں نے کچھ چرایا نہ تھا اور بہ تحقیق ابراہیم پیغمبر نے کہا تھا کہ میں بیمار ہوں حالانکہ اللہ کی قسم وہ بیمار نہ تھے۔“ امام فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے چوری نہیں کی تھی اس کو چور کہا گیا یہ تقیہ ہے۔ ایک شخص بیمار نہ تھا اس نے اپنے کو بیمار کہا اسی کا نام تقیہ ہے اور اسی کو تمام دنیا جھوٹ کہتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ تقیہ کے معنی ہیں جھوٹ بولنا۔ (شیخ محمد فراست)

کتاب حدیث کی لکھی اسے لفظ بلفظ امام کو سنا دیا اور جب ان کے حضور سے اس کی صحت ہو گئی بلکہ جب ائمہ کرام سے دستخط مہر کرا لی تب اس کو جاری کیا تا کہ لوگوں کا عمل ٹھیک ٹھیک اماموں کی طرح ہو..... پس اس واسطے تقیہ کی تعریف میں اماموں کی طرف سے حدیثیں بنانا شروع کیں اور نہ صرف اس کے جواز پر قناعت کی بلکہ اس کے وجوب اور اس کی فضیلت میں ایسی حدیثیں قائم کیں کہ روزہ نماز کے ثواب بھی تقیہ کے ثواب کے مقابلہ میں نیست و نابود ہو گئے۔ حقیقت میں تقیہ کو دین کا ایک عمدہ اصول ٹھہرایا اور ”التقیة دینی و دین آبائی“ کی حدیث ائمہ کی زبان سے نقل کر کے تقیہ کے منکر کو کافر بنایا، یہاں تک کہ صاحب ”نواقض الروافض“ نے غلطی سے لکھا کہ شیعہ کہتے ہیں کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تقیہ کے سبب سے اسلام لائے تھے تو قاضی نور اللہ شوستری ”مصائب النواصب“ میں نہایت خفا ہو کر کہتے ہیں کہ یہ ”ناصبی جھوٹا ہے، کوئی شیعہ یہ بات نہیں کہہ سکتا اس لیے کہ تقیہ ابرار اور پاک لوگوں کا دین ہے، کیوں کر ممکن ہے کہ ابو بکر صدیق تقیہ کرتے اور پاک اور ابراروں میں داخل ہوتے۔“

غرض تقیہ ابراروں اور اماموں کا دین ٹھہرایا گیا اور تقیہ کے صدقے میں سنیوں کی دارو گیر سے کامل طرح پر نجات پائی، ناصبیوں کے سارے اعتراض اور کل دلیلیں ان کی خاک میں مل گئیں، بڑی بڑی فضیلت کی حدیثیں اماموں کی زبان سے شیعوں کی کتابوں سے سنیوں نے نکالیں اور اپنے خلفاء کی بزرگی اور فضیلت پر سند لائے اور اپنے نزدیک شیعوں کو لاجواب کرنا چاہا مگر ایک ایک ادنیٰ طالب علم بلکہ جاہل شیعہ نے جواب دے دیا کہ یہ حدیث امام نے تقیہ کے سبب سے فرمائی ہے، اور بڑے بڑے متکلمین اور فقہاء کو سنیوں کے ایسی دلیل سے ایک ایک لڑکے نے چپ کرادیا، حقیقت میں جو فائدہ مذہب تشیع کو تقیہ کے سبب سے ہوا ہے اور جو حفاظت ان کی اس روش سے ہوئی ہے وہ کسی دوسرے عقیدے سے نہیں ہوئی ہے۔

کسی جاہل نے خوب لطیفہ کہا ہے کہ تقیہ کو تشیع سے وہ نسبت ہے جو تار برقی کو آہنی سرک سے ہے کہ اگر تار برقی نہ ہو تو ریل کا چلنا بند ہو جائے اور ایک گاڑی دوسری سے ٹکرا کر

کر ٹوٹ جائے۔ درحقیقت برقی تار ہی سے گاڑیوں کی حفاظت ہے۔ اسی طرح پر تقیہ کا حال ہے کہ اگر تقیہ کا اصول مذہب شیعہ میں نہ ہوتا تو مذہب ہی خاک میں مل جاتا اور ایک قول کی دوسرے قول سے اور ایک فعل کی دوسرے فعل سے اور ایک حدیث کی دوسری حدیث سے تناقض اور مخالف کے سبب سے مطابقت نہ ہو سکتی اور سب کا جھوٹ اور غلط ہونا کھل جاتا..... پس نہایت ہی ذکی اور ذہین تھا وہ شخص جس نے مذہب تشیع کو ایجاد کیا کہ جھوٹ کو جھوٹ سے بچایا، تقیہ کی وہ گرم بازاری ہوئی اور اس عقیدہ باطل کو ایسی رونق دی گئی کہ امام اوّل سے لے کر امام آخر الزمان تک سب کی زبان سے اس کی فضیلت میں احادیث نقل کی گئیں اور تقیہ کرنے والوں کے بڑے درجے مقرر کیے گئے، شیعوں کو خدا نے تقیہ کی بدولت سب آفتوں سے بچایا اور تقیہ پر ثواب کا وعدہ کر کے خدا نے اپنے شیعوں پر بڑا فضل کیا کہ سنیوں کے ساتھ گوشت پلاؤ کھائیں اور جب تک ان کے دسترخوان پر کاسہ لیسی کریں تب تک خوب چکنی چیرٹی باتیں زبان سے کہیں اور ان کی خوب لمبی چوڑی ثنا و صفت کریں اور خلفاء ثلاثہ اور اصحاب کبار کی نہایت مبالغے سے تعظیم و عزت بجلائیں اور ﴿وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا﴾ ❶ کا مضمون ادا کریں اور جب گھر آئیں اور خاص یاروں کا مجمع ہوا اور دروازہ بند کر کے دیکھ لیں کہ کوئی منہم (ان ناصبیوں میں سے) تو نہیں ہے اس وقت بہ فحوائے ﴿وَإِذَا خَلَوْا إِلَى شَيطَانِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزَءُونَ﴾ کے خوب قہقہے اڑائیں اور اپنی دھوکہ دہی اور نفاق کی خود ہی تعریف کریں اور پھر تبراً شروع کریں ایک اپنے اوپر لعنت کرے دوسرا بیش باد کہے اور بہ موجب احادیث اور اقوال ائمہ کے دونوں حالتوں میں اپنے آپ کو مورد ثواب جانیں، سنی کے سامنے جو جھوٹ اور نفاق کی باتیں کہیں اس پر تو بہ سبب تقیہ کے اور گھر آ کر جو تبراً کہیں اس پر بہ سبب لعنت کے ایک ایسے ثواب کے مستحق ہوئے کہ جو ہزار نماز و روزہ میں نہ پاتے اور اگر خدا نخواستہ کوئی

❶ ترجمہ: ”جب ملاقات کریں مسلمانوں سے کہیں ہم مسلمان ہوئے۔“ (سورہ بقرہ)

❷ ترجمہ: ”اور جب اکیلے جائیں اپنے شیطانوں کے پاس کہیں ہم ساتھ ہیں تمہارے ہم تو ہنسی کرتے ہیں۔“ ۱۲

گناہ ہو گیا تو پھر اس کا بھی کچھ غم نہیں، اس لیے کہ یہ مسئلہ طینت کا موجود ہے، سینوں کا روزہ نماز کیا ہوگا اس کا ثواب انہیں تو مل ہی نہیں سکتا اور ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ﴾ ❶ تو خدا نے فرمایا ہی نہیں ہے وہ بھی آخر شیعوں ہی کے واسطے ہے۔ پس ایسے عقیدوں پر اپنے مذہب کی بنا قائم کی اور الحاد و زندقہ کا نام تشیع رکھا اور اپنے آپ کو مصداق ﴿فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا وَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ ❷ کا بنایا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان اصول و عقائد کو دیکھ کر آدمی کی عقل دنگ رہ جاتی ہے، حیرت کی مہر سمجھ کے منہ پر لگ جاتی ہے، دیکھنے والا حیران و ششدر رہ جاتا ہے کہ الہی تشیع دین ہے یا الحاد، یہ معاملہ کیا ہے کہ ایسے اصول جس کی سفاہت کسی پردے میں چھپانے سے چھپ نہیں سکتی اور ایسے عقیدے جن کی بیہودگی خود اسی سے ظاہر ہوتی ہے، جس کے بطلان پر نہ کسی دلیل کی حاجت، نہ کسی برہان کی ضرورت، کیوں کر ایسے فرقے نے قائم کیے ہیں، جس کو خدا نے آدمی بنایا ہے اور جس کو اوروں کی طرح عقل بھی دی ہے اور پھر طرہ یہ ہے کہ ان اصولوں پر خوش ہیں، ان عقیدوں پر نازاں ہیں اور اپنے آپ کو ائمہ کرام کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اپنا بوجھ ذریعہ نبوی کے سر پر رکھتے ہیں، (و حاشا جنابہم عن ذالک)۔

حقیقت میں ان کے اصول و عقائد لکھ کر خدا کا یہ کلام یاد آتا ہے کہ:

﴿لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ﴾

(سورہ اعراف : ۱۷۹)

”جن کے دل ہیں ان سے سمجھتے نہیں اور آنکھیں ہیں ان سے دیکھتے نہیں اور

کان ہیں ان سے سنتے نہیں جیسے چوپائے بلکہ ان سے گئے گزرے۔“

علاوہ تقیے کے ایک تقیے کی دم بھی شیعوں کے بزرگوں نے قائم کی تھی جسے اب حضرات شیعہ

❶ ترجمہ: ”جس نے کی بھلائی سوا اپنے واسطے۔“ (سورہ حم سجدہ: ۴۶)

❷ ترجمہ: ”ان کے دل میں آزار ہے پھر زیادہ دیا اللہ نے ان کو آزار اور ان کو رکھ کی مار ہے۔“ (سورہ بقرہ: ۱۰)

نے ضرورت نہ رہنے کے سبب کاٹ ڈالا ہے اور تقیہ کو دُم بریدہ کر دیا، وہ دم کیا تھی بد..... اس کا حال یہ ہے کہ جب حضرات شیعہ کے پیشوا اور اس مذہب کے سرپرست ائمہ کرام کی خدمت میں جاتے اور بیٹھتے اور پھر باہر آتے تو اپنے اور یاروں سے کہتے کہ آج امام نے فرمایا ہے کہ اب بہت جلد سلطنت شیعوں کو ملتی ہے اور چند روز کے بعد ان کی حکومت ہوتی ہے اور جب وہ میعاد ہو جاتی، کسی وعدے کا کچھ ظہور نہ ہوتا اور لوگ کچھ شبہ کرتے تو وہ حضرت کہتے کہ امام نے فرمایا ہے کہ خدا کو بد اہوا ہے، یعنی اب اس نے وقت بدل دیا اور اپنی پہلی تجویز کو بدل دیا۔ اور جب کوئی امام کے سامنے ان پیشواؤں کے حالات بیان کرتا تو امام اس سے بیزاری ظاہر کرتے اور لعنت کرتے اور (قاتلہ اللہ و خذلہ اللہ) فرماتے اور پھر کوئی شخص ان لوگوں سے بیان کرتا تو بہت ہنستے اور قہقہے لگاتے اور کہتے کہ امام نے خیرات نورہ کا تمہارے ساتھ عمل کیا، سننے والا حیران رہتا کہ بھائی خیرات نورہ کیا ہے؟ تب کہتے کہ تقیہ۔

غرض کہ جب کسی کو شبہ ہوتا کہ ائمہ ان کو برا کہتے ہیں، ان پر لعنت کرتے ہیں، ان کو شیطان بتاتے ہیں تب اس کے شبہ کو تقیہ سے دور کرتے کہ حضرت نے تقیہ کیا ہے تم نہیں جانتے ہو تقیہ۔

تقیہ ابراروں اور اماموں کا دین ہے، خدا کے پاس جگہ قیامت میں صرف تقیہ کی بدولت ملے گی..... اور جب وہی حضرات کسی سے امام کے طرف سے کچھ وعدہ کرتے اور وہ وعدہ پورا نہ ہوتا تو کہہ دیتے کہ خدا کو بد اہوا، یعنی اپنی رائے بدل دی اور جب کوئی کچھ شک کرتا تو کہتے کہ تم نہیں جانتے ہو اس میں مصلحت تھی اور خدا کی مصلحت کو سوائے خدا یا امام کے کوئی نہیں جانتا، اور کیا تعجب کرتے ہو بد اہر، وہ ایک قسم نسخ کی ہے، دیکھو شریعتوں میں خدا نے احکام بدل دیے اور ایک کو دوسرے حکم سے منسوخ کر دیا یا نہیں، پس چپ رہو، خدا کی باتوں میں چوں چرانہ کرو۔

جب بعض شخصوں کو بہت ہی شبہ ہونے لگا کہ وہ کیسا خدا ہے جو آج کچھ کہتا ہے اور

جب وقت آتا ہے تب پورا نہیں کرتا اور بدا کو نسخ سے کیا علاقہ، نسخ تو یہ ہے کہ ایک حکم کسی وقت دیا اور کسی چیز کو کسی قوم یا کسی وقت کی ضرورت سے حلال کیا اور پھر اس حکم کو کسی وقت ضرورت کے سبب سے بدل دیا اور حرام کو حلال کر دیا مگر یہ خدا نے نہیں کیا کہ پیغمبر صاحب سے کوئی خبر کہی ہو یا کسی فتح کا وعدہ کیا ہو اور پھر اس کو پورا نہ کیا ہو تو اگر امام نے یہ بات خدا کی طرف سے کہی ہوتی یا خدا نے ان سے یہ وعدہ کیا ہوتا، اس لیے اس شبہے کو دور کرنے کے لیے ان بزرگواریوں نے دو لوحیں قائم کیں، ایک لوح محفوظ، دوسری لوح محو و اثبات۔ اور یہ کہا کہ خدا نے دو لوحیں رکھی ہیں اور سب کچھ اس میں لکھ دیا ہے جو کچھ ٹھیک ٹھیک ہونے والا ہے وہ تو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے اس میں کچھ تغیر و تبدل نہیں ہوتا..... دوسری لوح محو و اثبات، کہ اس میں جو کچھ لکھا ہوا ہے خدا بدلتا رہتا ہے..... پس وہ فرق جو امام کے قول میں ہوا وہ بہ سبب لوح محو و اثبات کے ہوا کہ اس میں خدا نے پہلے کچھ لکھ دیا پھر اس کو محو کر کے دوسری بات اور امام نے پہلی بات سے خبر دی، ان کو کیا معلوم تھا کہ خدا اس کو بدل دے گا اور جب کسی نے یہ کہا کہ یہ بات سمجھ کے خلاف ہے اور دوسری لوح کے مقرر کرنے سے کیا فائدہ ہے تب وہ جواب دیا جو مجتہد صاحب نے ”صوارم“ میں دیا ہے:

((وازاں جملہ ہر گاہ آنکہ انبیاء و اوصیاء خبر دھنداز ”کتاب محو و اثبات“ و بعد از آن خبر دھند بخلاف آن بندگان را واجب باشد اذعان نمودن بآن و چوں این اذعان بر نفس بسیار دشوار است موجب مزید اجر آنها گردد، فان افضل الاعمال احمزها و بها امتاز المسلمون الذین فازوا بدرجات الیقین عن الضعفاء الذین لیس لهم قدم راسخ فی الدین .))

”اور اس کے منجملہ واقعہ یہ ہے کہ جب ”لوح محو و اثبات“ دیکھ کر انبیاء اور وصی کسی بات کی اطلاع دیتے ہیں اور پھر اس کے خلاف کوئی بات کہتے ہیں تو لوگوں کو لازم آتا ہے کہ اس کے موافق سر تسلیم خم کریں اور چونکہ اس آخری حکم پر

یقین کرنا بہت دشوار ہے اسی لیے اس کا ثواب زیادہ ہے۔

کہ یہ بات کہ ایک دفعہ انبیاء اور اوصیاء کچھ بات فرمائیں اور پھر اس کے برخلاف بندوں سے ہیں اس کا بھی یقین کرنا واجب ہے اور اسی یقین کرانے کے لیے خدا نے دوسری لوحِ محو و اثبات قائم کی ہے اور چونکہ ایسا یقین نفس پر بہت دشوار ہے، اس لیے زیادہ ثواب کا موجب ہے، اس لیے کہ جو عمل سب سے زیادہ ترش ہوتا ہے وہی سب سے افضل ہے اور اسی سبب سے مسلمان اوروں سے ممتاز ہوئے ہیں اور ایسی ہی باتوں پر یقین کرنے سے یقین کے درجات پر پہنچے ہیں اور ان لوگوں سے جو کہ دین میں راسخ اور مضبوط نہیں ہوتے ہیں جدا ہوتے ہیں..... غرض کہ بد پر یقین کرنا ہزاروں درجات اور ثواب کا باعث ٹھہرا اور اس پر یقین نہ کرنا نقصِ ایمان کی دلیل ٹھہرا، بلکہ بد کو خدا نے اسی واسطے تجویز کیا ہے کہ اس پر یقین اور شبہ کرنے سے ایمان کا امتحان ہوا۔

اب خیال کیجیے کہ حضراتِ شیعہ کے بزرگوں نے کس خوبی اور ہوشیاری سے دین کے اصول قائم کیے ہیں اور کیا کیا اچھے عقیدے تجویز کیے ہیں..... اس بد کے حقیقی معنی سے گو مجتہد صاحب نے ”صوارم“ میں بظاہر انکار کیا ہے مگر جو کچھ انہوں نے لکھا اس سے اور زیادہ ثبوت ہوا، چنانچہ اس شبہ کو کہ ائمہ کرام اس بات کا جو ہونے والی نہ تھی کیوں وعدہ کیا کرتے تھے کس خوبی سے رفع کرتے ہیں۔ حضرت قبلہ و کعبہ ”صوارم“ میں فرماتے ہیں:

((وازاں جملہ این اخبار موجب تسلیہ مومنین کہ انتظار فرج اولیاء اللہ و غالب شدن حق می کشند می شود چنانچہ این معنی درباب قصہ نوح و درباب فرج اہل بیت مروی گشتہ چہ اگر از اول شیعیان را خبر می دادند آنہارا باینکہ ممکن است کہ حاصل شود فرج آل محمد عنقریب و منظور ازیں اخبار ایس بود کہ تا شیعیان بر دین خود ثابت بمانند و بر

انتظار کشیدن مثاب شوند و بعد ازینکہ جناب مولانا مجلسی درباب تائید این احتمال و مناسب این مقالہ دوستہ روایت ذکر نمودہ گفتہ فمعنی قوله علیہ السلام ما عند اللہ بمثل البداء این ست کہ ایمان بداء از اعظم عبادات قلبیہ ست بہ جہت صعوبت آن و معارض بودن آن بو ساوس شیطانہ و بجهت آنکہ اقرار بداء در حقیقت اقرار ست باینکہ ”لہ الخلق ولہ الامر“ وایں کمال توحید ست و یا معنی ایں حدیث این ست کہ اعظم اسباب دواعی ست بطرف عبادت جناب رب العالمین .)) انتہی

منجملہ اس کے یہ ہے کہ یہ روایات مومنین کی تسلی کا سبب ہیں کہ اولیاء اللہ کے آنے اور حق کے غالب ہونے کا انتظار کریں جیسا کہ نوح کے قصہ میں اور اہل بیت کی کشادگی کے بارے میں مروی ہے کیونکہ اس میں شیعوں کو خبر دی ہے کہ عنقریب آل محمد کا ظہور ہوگا..... اور ان روایات کا مقصد یہ تھا کہ شیعہ اپنے دین پر ثابت قدم رہیں اور انتظار پر ان کو ثواب ملے، مزید یہ کہ علامہ مجلسی نے اس کی تائید میں دو تین روایتیں ذکر کی ہیں۔ پس امام کے اس قول کا مطلب کہ ”اللہ کے نزدیک بد جیسی کوئی (بڑی) چیز نہیں ہے“ یہ ہے کہ بد پر ایمان لانا دل کی عظیم عبادتوں میں سے ہے، اس کی سختی اور وساوس شیطانی سے معارض ہونے کی وجہ سے اور اس لیے بھی کہ بداء کا اقرار حقیقت میں اس بات کا اقرار ہے کہ اللہ ہی کے لیے خلق و امر کا اختیار ہے اور یہی کمال توحید ہے یا اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف بلانے والے بڑے اسباب میں سے یہ ہے۔“

حقیقت یہ ہے کہ جیسا کلمہ حق اور سخن راست جناب قبلہ و کعبہ اور ملا باقر مجلسی نے یہ

فرمایا ہے اپنی ساری عمر میں ایسا سچ کلمہ دوسرا زبان سے ارشاد نہ کیا ہوگا۔ جو کچھ ان بزرگواروں نے فرمایا اس پر دل سے ان کا شکر کرنا چاہیے کہ صاف صاف کہہ دیا کہ اگر امام شیعوں سے جھوٹے وعدے نہ کرتے اور ان کو وعدوں پر نہ ٹالا کرتے تو اکثر شیعہ دین سے پھر جاتے اور مذہب پر ثابت قدم نہ رہتے۔ پس ایسی دورنگی باتوں کے کہنے سے غرض یہ تھی کہ لوگ شیعہ بنے رہیں ورنہ اگر ایک ہی دفعہ امام کہہ دیتے کہ ہزار دو ہزار برس تک شیعوں کو غلبہ نہ ہوگا تو بس نا اُمیدی سے شیعوں کی جان ہی نکل جاتی اور مایوس ہو کر گھر بیٹھ رہتے اور خاک پاک کا کنٹھا اور عقیق کی انگوٹھی اور سجدہ گاہ امام کے دروازے پر رکھ کر سب کے سب چنپت ہو جاتے، وہاں جو خاص خاص با ایمان شیعہ تھے مثل حضرات زرارہ اور ہشام اور شیطان الطاق وغیرہ کے وہ یکہ و تنہا بے یار و مددگار رہ جاتے، پس اس جماعت کو جو صرف جھوٹے وعدہ سے حضرات زرارہ وغیرہ نے درہم برہم نہ ہونے دیا اور اپنی ہوشیاری سے ضرورت وقت کے مناسب فوراً ہی ایک عقیدہ نیا اور ایک اصول جدید بنا لیا اور امام علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا، ورنہ کوئی مسلمان ایسا عقیدہ رکھے گا اور بداء کو خدا کی طرف منسوب کرے گا۔ قیامت تو یہ ہے کہ فقط منسوب کرنے پر کفایت نہ کی بلکہ موافق اپنی عادت کے کہ جس بات کو شروع کیا اس کو انجام تک پہنچایا۔ اس مسئلہ بداء کی وہ فضیلت بیان کی کہ آخر امام کی طرف منسوب کر دیا، امام علیہ السلام فرماتے ہیں ”ما عبد اللہ بمثل البداء“ کہ جیسی بداء کے سبب خدا کی عبادت ہوتی ہے ایسی کسی دوسرے سبب سے نہیں ہوتی۔ سبب اس کا ظاہر ہے کہ جب شیعوں سے کہہ دیا کہ بہت جلد تم کو سلطنت ملتی ہے، ان بے چاروں نے دنیا کی طمع میں حضرات زرارہ وغیرہ کے حضور میں حاضر باشی شروع کی، خاک پاک کی سمونوں اور چٹائی کی جانمازوں اور مٹی کی سجدہ گاہوں کو لے لیا اور خوب رگڑ رگڑ کر پیشانیوں کو داغا اور ﴿فیوخذ بالنواصي والاقدام﴾ کا مضمون ادا کیا، جب وہ وعدہ پورا نہ ہوا اور دن گزر گئے اور کچھ ظہور نہ ہوا تب مایوس ہو کر زرارہ وغیرہ سے پوچھا کہ یہ کیا ہوا، اس نے ادھر ادھر جا کر دو چار روز کے بعد کہہ دیا کہ امام فرماتے ہیں کہ خدا کو بداء ہوا، یعنی اس

نے وقت بدل دیا مگر تم پھر عبادت کرو اور خوب تبرے کہو اور اپنے اوپر لعنت بھیجو، دیکھو خدا بہت ترقی دیتا ہے۔

غرض کہ اسی طرح پر چند احمقوں، بے وقوفوں کو اپنے دام تزویر میں رکھا، کبھی تقیے سے بہکایا، کبھی بداء کہہ کر دم میں رکھا، کبھی طینت کا مسئلہ ملا کر ان کو خوش کر دیا۔ یہ کرتے کرتے آخر دین محمدی میں رخنہ ڈال ہی دیا اور ایک فرقے کو اپنا ساتھی کر لیا۔ پس ہوا جو کچھ کہ ہونے والا تھا اور دین بگڑ گیا جیسا کہ اس نے سمجھا تھا۔ (فقد استحوذ علیہم الشیطان واستغواہم الطغیان)۔

وکل احد منہم بعاجل حظ مشغوفاً

فصاریری المعروف منکرا والمنکر معروفاً

”ان میں کا ہر ایک اپنے فوری نفع کا دل دادہ ہے، تو اچھے کو برا اور برے کو اچھا سمجھتا ہے۔“

غرض کہ اے حضرات شیعہ! تم اپنے مذہب کے اصول و عقائد پر غور کرو اور اس کے حسن و قبح کو دیکھو اور اگر پھر بھی نہ سمجھو تو خیر اختیار ہے تقیہ کرو، رجعت کی امید پر بیٹھو، بداء کا الزام ذات باری پر لگاتے رہو، طینت کا مسئلہ یاد کر کے خوب شوق و ذوق سے گناہوں میں مصروف رہو، اس لیے کہ جتنے اگلے پچھلے سنی گزرے ہیں اور جتنی عبادتیں انہوں نے کی ہیں وہ تو آخر تمہیں کو ملیں گی اور آخر تمہارے گناہوں کا بار تو ہم کو اٹھانا ہی پڑے گا۔ بس پھر عبادت کی محنت اٹھانی اب تم کو فضول ہے۔ مصرع

تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر



تقریر دل پذیر چکیدہ خامہ ناظم رنگین خیال ناثر عدیم المثال صباح بحر زار نکتہ دانی گلچین بوستان زار و بیان و بدائع و معانی بزم مرہ شعرائے ہمعصر فائق محمد مرتضیٰ بیگ عُرف مرزا مچھو بیگ عاشقِ حرسہ اللہ تعالیٰ

سبحان اللہ! پاک ہے وہ بے نیاز جس نے اپنے حبیب کے خادم جاں نثاروں کی شان میں ﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾ ارشاد فرما کے ان کا مرتبہ ظاہر کیا اور ہر مخالفین کے حق میں ﴿خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ﴾ کے اشارے سے اچھے برے کو علیحدہ کر دیا، سچا ہے وہ نبی جس نے (أَفْضَلُ النَّاسِ بَعْدَ النَّبِيِّ) کی حدیث سے ترتیبِ خلافت و افضلیت بیان کر دی۔ ہٹ دھرمی کا ذکر نہیں، حق شناسوں کے لیے کوئی بات شک و شبہ کی نہ باقی رہی، سب سے بڑھ کر تو یہ کام کیا کہ اپنے سچے دین کی حفاظت کا پورا پورا وعدہ اپنے خدا سے لے لیا، اس وقت کسی بزرگ کا یہ قول ورد زبان ہے باقی داستان ہے:

الہی	ویا	احکم	الحاکمین	الہی	ویا	اکرم	الاکریمین
فصل	علی	سید	المرسلین	وصل	علی	شافع	المذنبین
فصل	علی	آلہ	الطاہرین	وصل	علی	صحبہ	الصالحین

بعد حمد خدا و نعت سرور انبیاء بندہ سراپا خطا محمد مرتضیٰ عاشقِ آلِ نبی خادمِ اصحابِ محمدی حق شناسوں کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ کیوں حضراتِ انصاف کبھی دینِ محمدی کی بھی کیا بنا ہے کہ ابتدا سے تا اس دم بلکہ تابقائے عالم دشمنانِ خدا نے کیسا کیسا چاہا اور چاہتے ہیں کہ اس چمکتے ہوئے چراغ کو پھونک پھونک کر بجھائیں، حق نا حق آتش افروزی کر کے شعلہٴ فساد بڑھائیں، لیکن وہ قدرتی نورِ دباں برقِ طور اور سوا تجلی دکھاتا ہے۔ ذرا دال نہیں گلتی، اسی

کو کے سے خود انہیں کا دل جل کے سارا حوصلہ پست، وضو شکست ہو جاتا ہے، مجال کیا ہے کہ زبان ہلائیں اور منہ کی نہ کھائیں، ادھر ذرا گردن اٹھائی ادھر سر کوبی ہوئی، قدرتی سکندری کھائی، جہاں چار قدم دوڑ کے چلے کہ چو پٹ گرے، دون کی لیتے ہی چھکے چھوٹتے ہیں اور رنج و الم سے ماتم کے بہانے سینہ کوٹتے ہیں..... یوں تو صد ہا برس سے کیسی کیسی قلعی کھلی ساری شیخی کر کری ہوئی، لیکن اس ہنگام میں اخیر زمانہ دنیا کی فکر دوزخ کے دھندے سے نجات ہی نہیں، عاقبت کا خیال کیسا، قیامت کا قرب چودہویں صدی، ابھی ابھی سے نفسی نفسی کا ترجمہ اپنی اپنی پڑی ہے۔ دینیات کا علم پھر اس میں کمال بالکل خواب و خیال ہے، جو بات ممکن نہیں محال ہے لیکن یہ فقط ہماری خام خیالی ہے، مردانِ خدا سے اب بھی دنیا کب خالی ہے چنانچہ تفصیل اس اجمال کی معاینہ کتاب لا جواب جز دوم ”آیاتِ بینات“ تصنیف عالم علم معقول و منقول حامی دین خدا و رسول، سر آمد متکلمین، سلطان المناظرین، واقف اسرار خفی و جلی، عالی جناب والا خطاب نواب محسن الدولہ محسن الملک مولوی سید محمد مہدی علی خاں صاحب بہادر منیر نواز جنگ معتمد پولیٹیکل فنانس سرکار آصفی سے ہوتی ہے۔ اللہ اللہ کس متانت کی تقریر، کس زور و شور کی تحریر ایک دریا ہے کہ موجیں مارتا ہے۔ نمونہ قدرت خدا بہ تائید غیبی نہیں تو کیا ہے، ایسی کثرت کار و ضیق اوقات میں جو بات ہے شرح و بسط کے ساتھ ہے، حتی الوسع کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا، مخالف ہی کے قول سے منکرین کے زعم باطل کو توڑا ہے، عبارت کی پاکیزگی پر درود پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ مناظرے میں باوجود سخت کلامی مدعی نے اپنی تہذیب ہاتھ سے نہ جانے دی، ادب سے کام لیا ہے، سحر بیانی اس کا نام ہے کہ شیریں بیانی کی میٹھی چھری سے دشمن کا کام تمام ہے۔ ماشاء اللہ زور قلم کی ادنیٰ سی یہ بات ہے جس وادی میں قدم رکھا میدان اپنے ہاتھ ہے۔ لطف تو یہ کہ جو دعویٰ ہے بادل لیل، بایں ہمہ مطلب کثیرہ عبارت قلیل، جو بات ہے لا جواب، جو فقرہ ہے انتخاب۔ بلاغت ایسی کہ ذرا سا نکتہ ایک دفتر، فصاحت کا بیان طاقت سے باہر۔ خدا شاہد یہ طرز تحریر بہت مشکل ہے، معقولیت کے یہ معنی کہ دشمن اپنے ہی قول سے قائل ہے۔ حافظہ وہ کہ سارا علم مناظرہ از بر، نگاہ اتنی وسیع

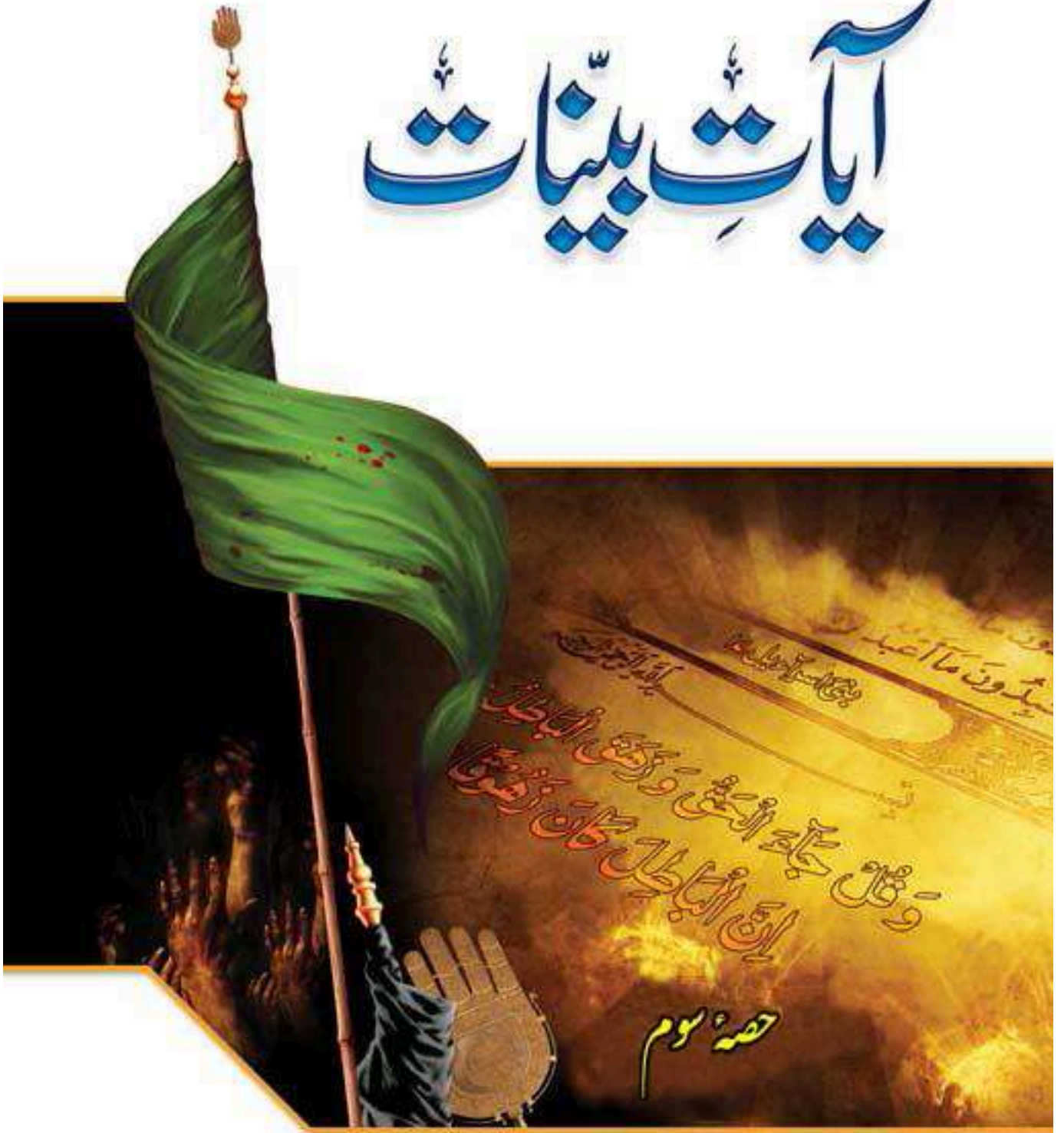
کہ دشمن کا کتب خانہ پیش نظر۔ یہ فقط کرامت صحابہ کرامؓ ہے، نہیں یہ اعجازِ قلمی انسان کا کام ہے۔ جیسا دل چاہتا ہے ویسی پوری تعریف اس مختصر میں کب ہو سکتی ہے۔ ساتھ ہی اس شخص کی محنت و جانفشانی کی تعریف کرنی چاہیے جس نے اس کے چھاپنے اور شائع کرنے میں کوشش کی ہے خاص فائدہ عام و عقبی کا نیک کام سمجھ کے نہ کسی طمع و لالچ سے، وہ کون، یعنی جوان صالح فخر خاندان، حافظ قرآن، جیسی و شفقتی حافظ عبدالواجد خاں خلف الصدق برگزیدہ خدا پابند شریعت مصطفیٰ درویش صفت و فرشتہ خصلت و حید الزماں جناب محمد عبدالواحد خاں صاحب مالک و مہتمم مطبع مصطفائی جانشین جنت مکاں محمد مصطفیٰ خاں اسکند اللہ فی فردوس الجنان۔ پہلی جلد با جازت حضرت مصنف ۱۳۰۱ء میں دوبارہ چھپوا کے شائع کی جو حضرات شائقین علم دین کی نظر سے گزری ہوگی۔ دوسری جلد، یعنی جزو دوم کے لیے کیسا کیسا اہتمام کیا، زمین و آسمان ایک کر دیا لیکن کسی طرح وہ نسخہ دستیاب نہ ہوتا تھا، بارے جناب مخدومی و مکرمی منشی سید محمد ممتاز علی صاحب پیش کار کلکٹری بنارس رئیس قصبہ سندیلہ ملک اودھ نے بہزار کوشش و جہد جناب منشی سید برکت علی صاحب سررشتہ دار کمشنری بنارس پبلیشرز یافتہ سرکار سے جن کے پاس ایک مسودہ کٹا کٹا دستی حضرت مصنف کا تھا حاصل کیا اور نقل و اصل دونوں نسخے حافظ صاحب موصوف کے نام روانہ کیے۔ اب اس محنت کو دیکھنا چاہیے کہ حافظ صاحب موصوف نے بعد نظر ثانی و اجازت مصنف بصحت کمال صفائی و پاکیزگی سے طبع کیا۔ در حقیقت جیسی محنت حضرت مصنف نے اس کی تصنیف میں کی ہے، اس سے کسی قدر کم حافظ صاحب موصوف کو بھی مشقت کرنی پڑی۔ شکر ہے خدا کا جس نے اس محنت کی راحت دی اور دوسری جلد بھی چھپ گئی..... اب خدا سے دعا ہے کہ اس کے مصنف اور جن سے یہ نسخہ دستیاب ہوا وہ اور جس نے بہزار کوشش اسے چھاپا اور شائع کیا ہے ان سب کے لیے۔

عمر و اقبال و آبرو ہو زیاد
بمحمد و آلہ الامجاد



وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاقُونَ

آيَاتِ بَيِّنَاتٍ



نواب محسن الملک سید محمد ہمدی علی خان

تمہید فدک

اگرچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمعین کے فضائل کو خدا کی شہادت، رسول کی گواہی اور اماموں کے اقوال سے پایہ ثبوت تک پہنچا دینے کے بعد مطاعن کا ذکر کرنا اور اس کی تردید پر متوجہ ہونا ضروری ہے۔ مگر اس خیال سے کہ حضرات شیعہ نے اس کے متعلق ہماری روایتوں اور اقوال کو سنداً پیش کیا ہے، اور عوام کو اپنی کتابوں کا نام سن کر اور اپنے یہاں کی روایتیں دیکھ کر خلجان پیدا ہوتا ہے اور شک و شبہ کرنے لگتے ہیں، اس لیے ہمارے علماء نے اسے ضروری خیال کیا کہ ان مطاعن کی تردید کی جائے اور مغالطہ اور دھوکہ کا وہ لباس جو اس قسم کے اقوال اور روایتوں کو پہنایا گیا ہے دور کر دیا جائے اور اصلی حقیقت ان کی بیان کر دی جائے۔ ہم بھی علمائے کرام کی تقلید میں مطاعن صحابہ رضی اللہ عنہم سے بحث کرتے ہیں اور چونکہ ان مطاعن میں فدک اور قرطاس کی بہت شہرت ہے، اس لیے سب سے اول انہی دو بحثوں کو ہم لکھتے ہیں، مگر قبل اس کے کہ اصل بحث کی طرف متوجہ ہوں چند مقدمات کا لکھنا ضروری اور مفید سمجھتے ہیں اور وہ یہ ہیں۔ و ماتوفیقی الا باللہ۔



پہلا مقدمہ

کوئی نبی، کوئی امام اور کوئی بزرگ کسی مذہب میں، بلکہ کوئی نامور آدمی کسی قوم میں ایسا نہیں ہوا جس پر معاندین نے اعتراض نہ کیے ہوں اور اس کی نیک باتوں اور عمدہ کاموں کو عداوت کی نظر سے دیکھ کر برانہ جانا ہو اور ان کے دوستوں کے دلوں میں شبہ پیدا کرنے کے لیے ان کی بعض غلطیوں اور لغزشوں کو نہایت آب و تاب سے بیان کر کے اسے ان کی بد نیتی سے منسوب نہ کیا ہو۔ یہودیوں کو دیکھو کہ وہ حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام پر کیسے طعن کرتے ہیں۔ ان کی ولادت کی نسبت اپنی ناپاک زبانوں سے کیا کچھ کہتے ہیں۔ ان کے معجزات کو کس طرح سحر و افسوس سے منسوب کرتے ہیں۔ اور ان کے حواریوں کو کیسا مکار، جاہل و دعا باز جانتے ہیں۔ عیسائیوں کو دیکھو کہ وہ سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات پر عیاری اور طمع دنیاوی کی کیسی ہمتیں لگاتے ہیں اور آپ جیسے متمم مکارم اخلاق کی نسبت کیسی زبان درازی کرتے ہیں، یہاں تک کہ عیاذاً باللہ ایسے ہادی اور دنیا کے رہنما کو گمراہ کنندہ عالم سمجھتے ہیں۔ خوارج و نواصب پر خیال کرو کہ وہ اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کو کیسا برا جانتے ہیں۔ جناب امیر المؤمنین اور حضرت سیدۃ النساء اور حضرت حسنین علیہم السلام کو جو کہ آنحضرت ﷺ کے جگر کے ٹکڑے تھے اور خدا اور اس کے محبوب کے پیارے، انہیں کو معاذ اللہ کافر کہتے ہیں ﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا﴾^① اور ان سے عداوت رکھنے اور ان پر تبرا کرنے کو ذریعہ نجات خیال کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان اشقیاء میں سے بعض نے ابن ملجم ملعون کی شان میں جو اشقی الاولین والآخرین تھا، قصیدے لکھے اور جناب امیر کے شہید کرنے کو افضل ترین عبادت جانا۔ جیسا کہ عمران بن حطان جو خوارج کا سردار اور

① کیا بڑی بات ہو کر نکلتی ہے ان کے منہ سے سب جھوٹ ہے جو کہتے ہیں۔ ۱۲ پارہ ۱۵ سورہ کہف رکوع اول۔

ان کا بڑا شاعر تھا ابن ملجم کی نسبت کہتا ہے:

يا ضربة تقى ما ارا د بها الا
ليبلغ من ذى العرش رضوانا
انى لا ذكره حينما فاحسبه
او فى البرية عند الله رضوانا

”یعنی کیا اچھی ضرب ہے ایک مرد متقی (ابن ملجم) کی جس سے کوئی غرض اس کی سوائے اس کے نہ تھی کہ صاحب عرش بریں کی خوشنودی حاصل کرے۔ میں جب اسے یاد کرتا ہوں تو ساری خلق سے اس کے ثواب کا پلہ خدا کے نزدیک بھاری پاتا ہوں۔“

غرض کہ یہ ایک معمولی بات ہے کہ دشمن ہنر کو عیب سمجھتا ہے:

چشم بد اندیش کہ بر کندہ باد
عیب نماید هنرش در نظر

یہی حال حضرات شیعہ کا ہے۔ تعصب اور تقلید خیالات سے انصاف اور غور کا مادہ گویا ان سے سلب ہو گیا ہے اور زبانی محبت اہل بیت کے غلو سے ان کے قدم جادہ اعتدال سے نکل گئے ہیں۔ وہ صحابہ کی کوئی خوبی اور کوئی صفت نہیں دیکھتے، ان کی اچھی بات بھی ان کو بری معلوم ہوتی ہے اور ان کے ہنر بھی انہیں عیب نظر آتے ہیں۔

اگر کوئی تعجب کرے کہ باوجود آیات و احادیث اور اقوال ائمہ کے کیوں کر ایک فرقہ مسلمانوں کا صحابہ کے فضائل کا منکر ہوا! تو اسے چاہیے کہ یہود و نصاریٰ، نواصب اور خوارج کے حال پر نظر کرے۔ کیا وجہ ہے کہ یہودی آنحضرت ﷺ کی تعریف تو ریت میں دیکھتے تھے اور آپ کی آمد کے منتظر تھے اور آپ کو ایسا پہچانتے تھے ﴿كَمَا يَعْرِفُونَ ابْنَاءَهُمْ﴾..... ”جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔“..... مگر جب آپ نے نبوت کا دعویٰ کیا تو دشمن ہو گئے اور آپ کی صفات کے چھپانے اور آپ کی نسبت غلط الزام لگانے میں کوئی دقیقہ عداوت کا باقی

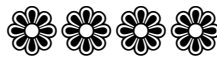
نہ رکھا۔ اور کیا سبب ہے کہ عیسائی اس کے باوجود کہ انجیل میں جناب سرور کائنات علیہ التحیات والصلوة کی بشارت تفصیل نام دیکھتے اور ﴿يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ﴾ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے سن چکے تھے اور دن رات اپنی کتاب میں اسے پڑھتے تھے، مگر جب آپ ﷺ نے نبوت کا اعلان فرمایا تو ان بشارتوں کو چھپانے اور انجیل کی آیات کی جن میں آپ کا نام اور خبر تھی غلط تاویلیں کرنے لگے اور اپنے نبی کے قول سے پھر گئے۔ اور کیا باعث ہے اس کا کہ خوارج باوجود اس بات کے جاننے کے کہ اہل بیت کرام پیغمبر ﷺ کی جان و جگر ہیں، قرآن اور حدیثیں ان کی فضیلتوں سے بھری ہوئی ہیں، ان کے دشمن ہو گئے اور جو بہترین خلق خدا تھے ان کو نعوذ باللہ سب سے برا جاننے لگے، یہاں تک کہ ان پر کفر و فسق کے الزام لگانے سے بھی باز نہ رہے۔ پس جو سبب ان گمراہ فرقوں کی گمراہی کا ہے وہی سبب حضرات امامیہ کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے عداوت رکھنے اور ان پر عیوب لگانے کا ہے:

إذا لم يكن للمرء عين صحيحة

فلا غروا ان يرتاب والصبح مسفر

”جب آدمی کی آنکھ صحیح نہ ہو تو اگر وہ روشن صبح کا انکار کر دے تو کوئی حیرت

نہیں۔“



دوسرا مقدمہ

وہ باتیں جو حقوقِ اہل بیت کے غضب سے متعلق امامیہ بیان کرتے ہیں، اگر صحیح سمجھی جائیں تو اسی سے تمام مہاجرین و انصار اور کل اصحابِ نبویؐ کا اسلام، ایمان اور اخلاق، بلکہ انسانی صفات سے بے بہرہ ہونا لازم آتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ شیخین کو غضبِ حقوق سے باز رکھتے اور اہل بیت اطہار پر ظلم کرنے میں ان کے شریک و معین نہ ہوتے یا دیدہ و دانستہ اعانتِ آلِ رسول سے چشم پوشی نہ کرتے تو دو شخص اور چند ان کے ساتھی کیسے ایسی جرأت کر سکتے تھے اور ان کو اپنے ظلم و ستم میں کس طرح کامیابی حاصل ہو سکتی تھی، رہا تمام مہاجرین و انصار اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو اسلام اور ایمان و اخلاق سے بے بہرہ سمجھنا، گویہ حضراتِ امامیہ کا منتہائے مقصود ہے، مگر ان خوفناک نتائج پر غور نہیں کرتے جو اس بات کے ماننے سے پیدا ہوتے ہیں، بلکہ اسے صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کی ذات تک محدود سمجھ کر اس کے دعویٰ کرنے میں کچھ پس و پیش نہیں فرماتے۔ مگر وہ شخص جسے خدا نے تھوڑی سی بھی سمجھ دی ہے اور جس کے قوائے عقلی تعصب و تقلید کے بوجھ میں دب نہیں گئے، ضرور ان خوفناک نتیجوں کے خیال سے ڈرے گا اور اسلام پر اس کا نہایت ہی برا اثر دیکھ کر الامان الامان پکارے گا۔ اس لیے کہ قرآن کے کلامِ الہی اور حضرت محمد ﷺ کے مؤید من اللہ ہونے کا بڑا ثبوت جو کچھ دیا جاتا ہے اور جسے زندہ معجزہ کہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ قرآن نے لوگوں کے دلوں پر بہت بڑا روحانی اثر کیا اور آنحضرت ﷺ کی ہدایت سے عرب کی حالت میں عظیم تبدیلی پیدا ہو گئی۔ قرآن مجید لوگوں کے دلوں کی تسخیر اور روحانی اور اخلاقی تعلیم کی وہ قوت تھی، جس نے حیرت انگیز ربانی کرشمے دکھائے اور دائم الاثر حقانی نتیجے پیدا کیے۔ اور اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ جس کلام کے ایسے عظیم الشان، قوی اور قائم نتیجے ہوں وہ بلاشبہ خدا کا کلام ہے۔ اور

آنحضرت ﷺ کی ذات بابرکات کی نسبت یہی دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ ایسے زمانے میں پیدا ہوئے جب دنیا ایک عجیب روحانی سکتے کے عالم میں تھی۔ اور آپ ﷺ ایسے ملک میں مبعوث ہوئے جہاں اخلاقی تعلیم کا کچھ سامان نہ تھا۔ اور ایسی قوم کی اصلاح آپ کے ذمے کی گئی جو سوائے اوہام اور فاسد عقیدوں اور باطل خیالات اور غلط کاریوں اور وحشیانہ اعمال و بد اخلاقی، نفاق اور جنگ جوئی کے کسی قسم کی اخلاقی خوبی نہ رکھتی تھی، مگر آپ کے الہامی بیان اور خدائی قوت نے ان پر ایسی عجیب و غریب تاثیر کی کہ اس سے ان کی تمام ظاہری و باطنی حالتیں بدل گئیں۔ برسوں کے بہکے ہوئے خدا کی راہ پر چل نکلے اور مدتوں کے سوئے ہوئے غفلت کی نیند سے چونک پڑے، جو مشرک تھے وہ موحد ہو گئے، جو کافر تھے وہ ایمان لے آئے، جو بت پرست تھے وہ بت شکن بن گئے، جو گمراہ تھے وہ خدا کی راہ دکھانے لگے، جاہلانہ حمیت اور وحشیانہ عصبیت کا ان میں نام نہ رہا۔ خاندانی جھگڑے اور پشتینی عداوتیں جاتی رہیں۔ دماغ غرور و نخوت سے خالی ہو گئے اور ان کے دل صبر و توکل، حلم و بردباری، زہد و پرہیزگاری اور جمیع اخلاقی صفات سے بھر گئے آپ کی تعلیم اور ہدایت نے ایک ایسا گروہ خدا پرست، پاک طبیعت، راست باز، نیک دل لوگوں کا قائم کر دیا جن کی کوششوں سے شرک و بت پرستی کی آواز جو تمام جزیرہ نمائے عرب میں گونج رہی تھی بند ہو گئی اور اس کے بدلے ایک بے چون و بے چگون، بے شبہ و بے نمون خدا کی منادی پھیل گئی، بتوں نے عدم کا راستہ لیا، بت خانوں کا نشان مٹ گیا، آتش کدے ٹھنڈے پڑ گئے، تثلیث کا طلسم ٹوٹ گیا، اوہام پرستی کا باطل خیال باطل ہو گیا ﴿جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾ اور اس سے اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ آپ حقیقت میں سچے رسول اور خدا ہی کی طرف سے مویذ تھے، ورنہ انسان کا کام نہ تھا کہ وہ ایسا انقلاب عظیم عرب کی روحانی اور اخلاقی حالت میں پیدا کر دیتا اور ایسے جنگجو اور ستم پیشہ لوگوں کو جو بات بات پر لڑتے اور جھگڑتے تھے اخوت کے ایک رشتے میں باندھ دیتا اور ان کی پشتینی عداوتوں اور کینوں سے ان کے

دلوں کو ایسا صاف کر دیتا کہ اس کا کچھ اثر باقی نہ رہتا، بلکہ دنیا میں ان کو اخلاق اور انسانیت کا نمونہ بنا دیتا۔

قرآن مجید کے اس حیرت انگیز نتیجے اور سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہدایت کی ایسی عجیب و غریب تاثیر کو دیکھ کر منکرین بھی اس بات کے معترف ہیں کہ درحقیقت یہ بات بشری قدرت سے خارج تھی۔ چنانچہ کوئی ان میں سے کہتا ہے کہ وہ پیغام جو آپ لائے وہ ایک سچا اور حقیقی پیام تھا، جس کا مخرج وہی ہستی تھی جس کی تھاہ کبھی کسی نے نہیں پائی۔

کوئی لکھتا ہے کہ قرآن ہی کی تعلیم کا یہ اثر ہے کہ عرب کے رہنے والے ایسے بدل گئے جیسے کسی نے سحر کر دیا ہو۔ متعصب سے متعصب عیسائیوں میں سے سخت متعصب یہ اقرار کرتا ہے کہ دین مسیحی کی ابتدا سے آنحضرت ﷺ کے وقت تک کبھی حیات روحانی ایسی براہیختہ نہ ہوئی تھی جیسی کہ اسلام کی تعلیم سے ہوئی۔ مگر قرآن کی یہ دائم الاثر تاثیر اور آنحضرت ﷺ کی صحبت و ہدایت کا یہ غیر زوال پذیر اثر اسی وقت تک مانا جاسکتا ہے جبکہ ہمارے عقائد کے موافق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خصوصاً مہاجرین و انصار سب سے اول ایمان لانے والے، اسلام میں پکے، اخلاق میں انسانیت کا نمونہ، پاک دلی اور نیک نیتی اور راست بازی میں کامل مانے جائیں۔ مگر شیعوں کے اصول کے مطابق یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ عجیب و غریب انقلاب جو آپ کی صحبت و ہدایت سے صحابہ کی حالت میں ہوا تھا عارضی تھا اور وہ اثر جو قرآن کی تعلیم نے ان پر کیا تھا ناپائیدار تھا، وہ دل جو وحی والہام کی برکت سے پاک ہو گئے تھے جلد ارتداد کی گندگی سے ملوث ہو گئے تھے، اور وہ لوگ جو شمع نبوت کے پروانے تھے اسلام اور ایمان کو جلد خیر باد کر بیٹھے۔ وہ خدائی روشنی جس نے سیکڑوں دل روشن کر دیے تھے جلد بجھ گئی۔ وہ نفاق و کفر کا حجاب جو ان کے دل سے اٹھ گیا تھا پھر ان کے دلوں پر پڑ گیا اور مشکوٰۃ نبوت کی وہ شعاعیں جو مہاجرین و انصار کے دلوں پر پڑی تھیں جلد زائل ہو گئیں۔ اور وہ خدائی آواز جو یاران نبی نے دل کے کانوں سے سنی تھی جلد بند ہو گئی۔ ایسی حالت میں، میں نہیں سمجھتا کہ وہ عظیم اور حیرت انگیز نتیجے جو خدا کے کلام کے پیش کیے جاتے ہیں اور وہ عجیب تاثیر آپ کے

وعظ و ہدایت کی جس کی دنیا میں دھوم ہے کیوں کر صحیح سمجھی جائے گی اور اسلام کی وہ خوبی جس کا غلغلہ زمین سے آسمان تک پہنچا ہوا ہے کہاں باقی رہے گی ﴿هَيَّاتَ هَيَّاتَ اَنْتِ يَوْفُكُونَ﴾ ”کہاں پھرے جاتے ہو۔“ (موضح پ ۱۰ سورہ توبہ رکوع ۵)

شیعوں کے اس خیال کے مطابق اگر خدا کے کلام کو دیکھیں تو معاذ اللہ! وہ جھوٹا نظر آتا ہے۔ اور جن کے محامد و صفات اس میں بیان کیے گئے ہیں وہ بدترین خلاق پائے جاتے ہیں۔ جب ہم خدا کے کلام پر نظر کرتے ہیں تو اسے اس خیال کے مطابق پاتے ہیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نسبت ہمارا ہے اور اپنی خوبیوں سے ان کو متصف پاتے ہیں جن کا ہم ان کی نسبت اعتقاد رکھتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کہیں خدا ان کے ایمان اور عبادت کی نسبت فرماتا ہے:

﴿مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ
تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا﴾

(سورہ فتح: ۲۹)

”محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر زور آور ہیں اور آپس میں نرم دل ہیں تم ان کو دیکھتے ہو رکوع اور سجدے میں کہ چاہتے ہیں اللہ سے اس کا فضل اور اس کی رضا مندی۔“

کہیں ان کی شان میں کہتا ہے:

﴿سَيَبَاهُهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَةِ
وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ﴾ (سورہ فتح: ۲۹)

”نشانی ان کی ان کے منہ پر ہے سجدے کے اثر سے، یہی مثل ہے ان کی توریت اور انجیل میں۔“

کہیں ان کی نسبت اپنی رضا مندی ان لفظوں سے ظاہر کرتا ہے:

﴿وَالسَّبِقُونَ الْأُولُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ

بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي
تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ﴿١٠٠﴾ (سورہ توبہ: ۱۰۰)

”جو لوگ کہ پہلے مہاجر و انصار ہیں اور وہ لوگ جنہوں نے ان کا اتباع اچھی
طرح کیا ان سب سے اللہ راضی ہے اور وہ سب اللہ سے راضی ہیں اور خدا نے
مہیا کی ہیں ان کے لیے جنتیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ
رہیں گے۔“

کہیں ان کے مصائب اور تکلیف پر صلہ دینے کی بشارت اس طرح سناتا ہے:

﴿وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا
وَقُتِلُوا أَلْكَفَرْنَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَا دُخْلَ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ
تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾ (سورہ آل عمران: ۱۹۵)

”جن لوگوں نے ہجرت کی اور اپنے وطنوں سے نکالے گئے اور میری راہ میں
وہ تکلیف دیے گئے اور انہوں نے جہاد کیا اور مارے گئے ان سے ان کی
برائیاں دور کر دوں گا اور ان کو جنتوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں
بہتی ہوں گی۔“

کہیں ان کے ایمان کی تصدیق فرما کر ان کو مغفرت اور رزق کریم کا وعدہ ان لفظوں

سے فرماتا ہے:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آؤُوا
وَنَصَرُوا أُولَئِكَ هُمُ الْبُؤْمِنُونَ حَقًّا لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿٧٤﴾﴾
(سورہ انفال: ۷۴)

”جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے
ان کو جگہ دی اور نصرت کی، یہی لوگ ہیں سچے ایمان والے، انہی کے لیے ہے
مغفرت اور رزق کریم۔“

کہیں ان کی فضیلت تمام انبیاء کی امتوں پر ان لفظوں سے ظاہر فرماتا ہے:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ﴾ (سورہ آل عمران: ۱۱۰)

”تم ہو بہترین امت کہ جن لیے گئے ہو آدمیوں میں سے، تم بھلی بات کا حکم کرتے ہو اور بری بات سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔“

کہیں ان کے مصائب اور تکلیف پر انہیں خلافت کا وعدہ دے کر یوں تسلی فرماتا ہے:

﴿ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ ﴾ (سورہ نور: ۵۵)

”اللہ وعدہ کرتا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور اچھے عمل کیے کہ وہ ان کو خلیفہ بنائے گا زمین میں۔“

کہیں ان کی قلت سے کثرت پر پہنچنے کی ان دل خوش کن لفظوں سے تمثیل دیتا ہے:

﴿ كَزَّرِعِ أَخْرَجَ شَطْئَهُ فَازْرَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لَيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ﴾ (سورہ فتح: ۲۹)

”جیسے کھیتی نے نکالا اپنا پٹھا پھر اس کی کمر مضبوط ہوئی، پھر موٹا ہوا اور اپنی تال پر کھڑی ہو گئی خوش معلوم ہوتا ہے کھیتی والوں کو تا کہ جلا دے ان سے کافروں کو۔“

کہیں ان کی کثرت پر:

﴿ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ﴾ (سورہ نصر: ۲)

”داخل ہوتے ہیں اللہ کے دین میں فوج در فوج۔“

اور ان کے غلبہ و نصرت پر:

﴿ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ۝ وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴾ (سورہ فتح: ۱۸، ۱۹)

”اور پہنچائے گا ان کو فتح قریب اور بہت سی غنیمت کہ وہ لیں گے اس کو اور اللہ

عزیز و حکیم ہے۔“

فرما کر دنیا میں اسلام کی خوبی اور استحکام کا اشتہار دیتا ہے۔ لیکن اگر شیعوں کے عقیدے سچ ہیں۔ اور ان کے خیالات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نسبت صحیح ہیں تو ان آیتوں کی تکذیب لازم آتی ہے اور اگر یہ صرف اہل بیت کی شان میں سمجھی جائیں یا ان کی نسبت جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے انتقال کر گئے تھے، یا ان کی شان میں جو حسب زعم شیعہ پچیس برس تک مرتد رہ کر پھر امیر المومنین کے شریک ہو گئے تو اس سے گویا خدا کے کلام میں تحریف معنوی کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔

((وکیف یجوز لا حد من المسلمین ان یتکلم بمثل هذا ویبدل کلام اللہ من تلقاء نفسه و یحرفه عن موضعه ، فیا حسرة علیہم لما لا یتفکرون فی هذه الایات الیس فیہم رجل رشید .))

”کسی مسلمان کے لیے یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ اس طرح کی بات کرے اور اللہ کے کلام کو اپنی طرف سے بدل دے اور اس میں تحریف کر دے، ان پر افسوس ہے کہ وہ ان آیات میں غور کیوں نہیں کرتے! کیا ان میں ایک آدمی بھی سمجھ دار نہیں ہے۔“

اگر ہم آیات قرآنی اور مذہبی خیالات سے درگزر کریں اور صرف انسانی عقل کو کام میں لائیں تو شیعوں کے عقیدے کے موافق مذہب اسلام سب مذہبوں سے زیادہ کمزور، اور اس کے بانی کے وعظ و ہدایت کا اثر دیگر مذاہب کے پیشواؤں کی بہ نسبت زیادہ ضعیف معلوم ہو۔ کیونکہ جب ہم اس بات کو مانیں کہ وہ لوگ جنہوں نے بلا واسطہ قرآن سنا اور جبرئیل علیہ السلام کا آنا دیکھا اور آپ کی صحبت کا فیض حاصل کیا اور سب سے اول ایمان لائے، آپ کے بعد بھی ساری عمر اشاعت اسلام اور اعلائے کلمۃ اللہ میں صرف کرتے رہے، وہ سب کے سب إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ اپنے پیشوا کے انتقال فرماتے ہی بدترین افعال کی طرف جھک پڑے اور دیانت و صداقت

کے وہ اخلاقی جوہر جس سے ان کے دل مزین اور مزیب ہو گئے تھے، ان کے سینوں سے یک لخت جاتے رہے۔ تو ہم اس کے سوا کیا نتیجہ اس سے نکال سکتے ہیں کہ مذہب اسلام جو بہترین مذہب کہا جاتا ہے سب مذہبوں میں ذلیل اور امت محمدی جو سب امتوں میں افضل سمجھی جاتی ہے، دیگر امتوں سے بدتر ہے، اس لیے کہ جب ہم دوسرے مذہبوں پر نظر ڈالتے ہیں یہاں تک کہ بدھ، ہنود، جین اور پارسی فرقہ کے ابتدائی معتقدین کے حالات سنتے ہیں تو ہم کسی مذہب میں یہ نہیں دیکھتے کہ ان مذاہب کے ابتدائی معتقدین نے اپنے پیشواؤں کی ہدایت اور نصیحت کو اس قدر جلد بھلا دیا ہو اور ان کے احکام سے ایسی سرتابی کی ہو جیسے کہ اسلام کے ابتدائی ماننے والوں کی نسبت شیعہ حضرات بیان کرتے ہیں۔ جب ہم مشرکین اور کفار کے مذہب میں یہ مثال نہیں پاتے اور ان کے طبقہ اولیٰ کو اپنے رہنما کے بتائے ہوئے راستے سے ایسا بھٹکتا اور گمراہی کے قعر میں ایسا گرتا ہوا نہیں دیکھتے تو شیعوں کے قول کے موافق اس قسم کی ضلالت اور بد اخلاقی اور بد اعمالی کو اسلام ہی کے پہلے طبقے میں پاتے ہیں۔ تو سوا اس کے کیا چارہ ہے کہ ان کے اصول کے موافق مذہب اسلام کو قدرت کے اس عام قاعدے سے بھی مستثنیٰ سمجھیں اور اس کے بانی کے وعظ و ہدایت کو ایسا کمزور و ضعیف مانیں کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار مسلمانوں میں سے سوائے چار کے کسی پر وہ اپنا اثر قائم نہ رکھ سکا اور نہ بجز چند عزیزوں اور دو چار اغیار کے کسی کو ارتداد اور رجعت الی الکفر سے روک سکا۔

یہ وہ باتیں ہیں کہ مسلمان تو ایک طرف، مخالفین اسلام بھی غلط سمجھتے ہیں۔ ان کو بھی صحابہؓ کے حالات نے یہ کہنے پر مجبور کیا کہ وہ اس کو نہ صرف پکا مومن سمجھیں بلکہ حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے اصحاب و حواریں پر بھی فضیلت دیں۔

فضیلت صحابہ رضی اللہ عنہم بہ شہادت سرولیم میور مورخ نصرانی:

اگر کوئی شخص ان تحریروں کو دیکھے جو منکرین نبوت نے باوجود انکار نبوت کے اسلام کی نسبت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق کی ہیں تو بے اختیار اس کے دل سے یہی آواز نکلے گی

کہ ان مسلمانوں سے جو صحابہ رضی اللہ عنہم کو مرتد و کافر اور منافق سمجھتے ہیں وہی زیادہ منصف اور سمجھ دار ہیں جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی نسبت غیر متعصبانہ رائے ظاہر کرتے ہیں۔ دیکھو سر ولیم میور جیسے متعصب عیسائی کیا لکھتے ہیں کہ واقعات نے ان کو کس چیز کی تحریر پر مجبور کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب ”لائف آف محمد ﷺ“ کی جلد دوم میں لکھتے ہیں کہ ہجرت سے تیرہ برس پہلے مکہ ایک ذلیل حالت میں بے جان پڑا تھا، مگر ان تیرہ برسوں میں کیا ہی اثر عظیم پیدا ہوا کہ سیکڑوں آدمیوں کی جماعت نے بت پرستی چھوڑ کر خدائے واحد کی پرستش اختیار کی اور اپنے عقائد کے موافق وحی الہی کی ہدایت کے مطیع و منقاد ہو گئے، اسی قادر مطلق سے بکثرت و بشدت دعا مانگتے، اسی کی رحمت پر مغفرت کی امید رکھتے اور حسنات و خیرات اور پاک دامنی اور انصاف کرنے میں بڑی کوشش کرتے تھے، اب انہیں شب و روز اسی قادر مطلق کی قدرت کا خیال تھا اور یہ کہ وہی رازق ہماری ادنیٰ حوائج کا بھی خبر گیراں ہے، ہر ایک قدرتی اور طبعی عطیہ میں، ہر ایک امر متعلقہ زندگانی میں اور اپنی جلوت و خلوت کے ہر ایک حادثے اور تغیر میں اسی کے ید قدرت کو دیکھتے تھے۔ اور اس سے بڑھ کر اس نئی روحانی حالت کو جس میں خوش حال اور حمد کناں رہتے تھے، خدا کے فضل خاص و رحمت باختصاص کی علامت سمجھتے تھے اور اپنے کور باطن اہل شہر کے کفر کو خدا کے تقدیر کیے ہوئے خذلان (خرابی) کی نشانی جانتے تھے، محمد ﷺ کو جو ان کی ساری امیدوں کا ماخذ تھے، اپنا حیات تازہ بخشنے والا سمجھتے تھے اور ان کی ایسی کامل طور پر اطاعت کرتے تھے جو ان کے رتبہ عالی کے لائق تھی، ایسے تھوڑے ہی زمانے میں مکہ اس تاثیر سے دو حصوں میں منقسم ہو گیا تھا جو بلا لحاظ قبیلہ و قوم ایک دوسرے کے درپے مخالف و ہلاکت تھے۔ مسلمانوں نے مصیبتوں کو تحمل و شکیبائی سے برداشت کیا اور گویا ایسا کرنا ان کی مصلحت تھی مگر تو بھی ایسی عالی ہمتی کے بردباری سے وہ تعریف کے مستحق ہیں۔ ایک سومرد اور عورتوں نے اپنا گھر بار چھوڑا لیکن ایمان عزیز سے اپنا منہ نہ موڑا اور جب تک کہ یہ طوفان مصیبت فرد ہوئے جلس کو ہجرت کر گئے۔ پھر اس تعداد سے زیادہ آدمی کہ ان میں نبی بھی شامل تھے۔ اپنے عزیز شہر اور مقدس کعبہ کو جو ان کی نظر میں تمام روئے زمین پر

سب سے زیادہ مقدس تھا چھوڑ کر مدینہ ہجرت کر آئے اور یہاں بھی اسی جادو بھری تاثیر نے دو یا تین برس کے عرصہ میں ان لوگوں کے واسطے جو نبی اور مسلمانوں کی حمایت میں جان دینے کو مستعد ہو گئے، تیار کر دی۔

فضیلت صحابہ رضی اللہ عنہم بشہادت گاؤ فری ہینگس مورخ نصرانی:

ایک دوسرا عیسائی فاضل گاؤ فری ہینگس اپنی کتاب موسوم بہ ”اپالوجی فرام محمدؐ“ میں لکھتا ہے کہ ”باوجودیکہ محمد ﷺ اور عیسیٰ علیہ السلام کی ابتدائی سوانح عمری میں ایسے حالات ہیں جن میں عجیب مشابہت پائی جاتی ہے لیکن بہت سے ایسے ہیں جن میں بالکل اختلاف ہے، مثلاً: عیسیٰ علیہ السلام کے اول بارہ مریدوں کو نارتربیت یافتہ و کم رتبہ مانا گیا ہے، بخلاف محمد ﷺ کے اول مریدوں کے کہ بجز اس کے غلام کے سب لوگ بڑے ذی وجاہت تھے۔ اور جب وہ خلیفہ اور افسر فوج اسلام ہوئے تو اس زمانے میں جو کچھ انہوں نے کام کیے ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں اول درجے کی لیاقتیں تھیں اور غالباً ایسے نہ تھے کہ باسانی دھوکہ کھا جاتے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے اول مریدوں کی کم رنگی کو موشم صاحب دین عیسائی کی خوبی سمجھتے ہیں۔ مگر سچ پوچھو تو میں بہ مجبوری مقرر ہوں کہ اگر لاک اور نیوٹن جیسے اشخاص مذہب عیسوی کے اول محققین میں سے ہوتے تو مجھ کو بھی اطمینان کامل ویسا ہی ہوتا، پس اس سے ثابت ہے کہ ایک ہی شے مختلف شخصوں کو کیسی مختلف معلوم ہوتی ہے۔

مورخ گبن کا بیان:

بڑے مشہور مورخ گبن نے بیان کیا ہے کہ ”پہلے چاروں خلیفوں کے اطوار یکساں صاف اور ضرب المثل تھے۔ ان کی سرگرمی و دل دہی اخلاص کے ساتھ تھی اور ثروت و اختیار پا کر بھی انہوں نے اپنی عمریں ادائے فرائض اخلاقی و مذہبی میں صرف کیں۔ پس یہی لوگ محمد ﷺ کے ابتدائی جلسے کے شریک تھے جو پیشتر اس سے کہ اس نے اقتدار حاصل کیا، یعنی تلوار پکڑی اس کے جانب دار ہو گئے۔ یعنی ایسے وقت میں کہ وہ ہدف آزاد ہوا اور جان بچا کر اپنے ملک سے چلا گیا۔ ان کے اول ہی اول تبدیلی مذہب کرنے سے ان کی سچائی ثابت

ہوتی ہے اور دنیا کی سلطنتوں کے فتح کرنے سے ان کی لیاقت کی قوت معلوم ہوتی ہے۔ اس صورت میں کوئی یقین کر سکتا ہے کہ ایسے شخصوں نے ایذا نہیں سہیں اور اپنے ملک سے جلا وطنی گوارا کی اور سرگرمی سے اس کے پابند ہوئے۔ اور یہ سب امور ایک ایسے شخص کی خاطر ہوئے ہوں جس میں ہر طرح کی برائیاں ہوں اور اس سلسلہ فریب اور سخت عیاری کے لیے ہوں جو ان کی تربیت کے بھی خلاف ہو، اور ان کی ابتدائی زندگی کے تعصبات کے بھی مخالف ہو، اس پر یقین نہیں ہو سکتا یہ خارج از حیطہ امکان ہے۔

عیسائی اس بات کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد ﷺ کے مسائل نے اس درجہ نشہ دینی اس کے پیروکاروں میں پیدا کیا کہ جس کو عیسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی پیروکاروں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے اور اس کا مذہب اس تیزی کے ساتھ پھیلا جس کی نظیر دین عیسوی میں نہیں، چنانچہ نصف صدی سے کم میں اسلام بہت سے عالی شان اور سرسبز سلطنتوں پر غالب آ گیا۔ جب عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر لے گئے تو اس کے پیروکار بھاگ گئے اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجے میں چھوڑ کر چل دیے۔ اگر بالفرض اس کی حفاظت کرنے کی ان کو ممانعت تھی تو اس کی تشفی کے لیے تو موجود رہتے اور صبر سے اس کے اور اپنے ایذا رسانوں کو دھمکاتے۔ برعکس اس کے محمد ﷺ کی پیروی کرنے والے اپنے مظلوم پیغمبر ﷺ کے گرد و پیش رہے اور اس کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر کل دشمنوں پر اس کو غالب کر دیا۔..... انتھی قولہ .

کیسی حالت بدل جائے اور کس قدر اصلاح مذہبی حالات میں حضرات امامیہ کے ہو جائے اگر وہ اس بات کو یاد رکھیں جس کے یاد رکھنے کی نصیحت یہ عیسائی مؤرخ اپنے بھائی عیسائیوں کو کرتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے اصحاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں سے زیادہ دل کے قوی اور ایمان میں زیادہ پکے اور اخلاص میں زیادہ ثابت اور اپنے نبی کی حفاظت میں جان کے قربان کرنے والے تھے۔ مگر افسوس کہ وہ ان تاریخی واقعات کو جنہیں منکرین اسلام تک مانتے ہیں، نہیں مانتے اور اسلام کے ان نتائج سے جس سے اس کی عظمت اور صداقت اور فضیلت ثابت ہوتی ہے انکار کرتے ہیں۔

سرولیم مؤرخ پھر اپنی کتاب ”لائف آف محمدؐ“ میں جہاں انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریں اور مہاجرین و انصار کے حالات کا مقابلہ کیا ہے، لکھتے ہیں کہ ”جس زمانے تک مقابلہ کرنا ممکن ہے ان میں تکلیفات کی برداشت کرنے اور دنیوی لالچوں کے قبول نہ کرنے میں دونوں (حضرت مسیح اور آنحضرت) برابر ہیں، لیکن محمدؐ کے تیرہ برس کے موعظہ نے بمقابلہ کل زمانہ زندگی کے ایک ایسا انقلاب پیدا کیا جو ظاہر میں لوگوں کی نظر میں بہت بڑا معلوم ہوتا ہے۔ مسیح کے تمام پیروکار خوف کی آہٹ معلوم ہوتے ہی بھاگ گئے اور ہمارے خداوند کی تعلیم نے ان پانچ سو آدمیوں کے دل پر جنہوں نے ان کو دیکھا تھا، خواہ کیسا ہی گہرا اثر پیدا کیا مگر ظاہر میں اس کا کچھ نتیجہ دکھائی نہیں دیا۔ ان میں سے کسی نے بھی اپنی خوشی سے اپنا گھر نہیں چھوڑا اور نہ سیکڑوں نے مسلمانوں کی طرح بالاتفاق مہاجرت اختیار کی، اور نہ ویسا پر جوش ارادہ ہی کسی سے ظاہر ہوا جیسا کہ ایک غریب شہر (یثرب) کے نو مسلموں نے اپنے خون کے عوض اپنے پیغمبر کے بچانے میں کیا۔

بیان تحریری سرولیم میور:

یہ چند روایتیں جو کہ اوپر ہم نے نقل کیں وہ عام مہاجرین، انصار اور اصحاب نبویؐ کی نسبت تھیں۔ اب ہم بالتحصیل اس رائے کو بیان کرتے ہیں جو حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی نسبت سرولیم میور نے ظاہر کی ہے، چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی نسبت وہ اپنی کتاب موسوم بہ ”ازلی خلافت“ میں یہ لکھتے ہیں:

”آخری دم تک ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دل و دماغ کی صفائی اور طاقت کا مطلع مکر نہ ہونے پایا، جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں انہوں نے اپنی زندگی کے آخری دن باریابی دی اور معاملات کی نازک صورت کو جانچ کر عمر رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے ایک دستہ فوج تیار کر کے عراق روانہ کر دیں۔ بیماری کی حالت میں زندگی کی بے ثباتی اور ناپائیدار زینت کے متعلق ان اشعار کا مضمون ان کی زبان پر جاری رہا۔ (یہ ترجمہ سرولیم میور کی کتاب سے انگریزی اشعار کا

نظم میں کیا گیا ہے)

کون ایسا ہے یہاں جو حشمت و مال و متاع
اپنے وارث کو نہیں جاتا ہے چھوڑ انجام کار
ایک دن اس شخص کا بھی مال لوٹا جائے گا
جس نے ہو کر بے دھڑک کی ہے بہت سی لوٹ مار
لوٹ کر آ جائے گا اک دن سفر سے بالضرور
گر مسافر نے سفر کوئی کیا ہے اختیار
موت کے رستے سے لیکن لوٹنا ممکن نہیں
سخت جاں فرسا ہے اور ہیبت بھرا یہ راہ گزار
ایک شخص نے جو آپ کے بستر مرگ کے پاس بیٹھا ہوا تھا، زمانہ جاہلیت کے ایک
شاعر کے کچھ اشعار مناسب حال پڑھے آپ ناراض ہوئے اور فرمانے لگے کہ ایسا مت کہو
بلکہ یوں کہو:

﴿وَجَاءَتْ سَكْرَةٌ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذَلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيدُ﴾

(سورہ ق: ۱۹)

”اور آئی بے ہوشی موت کی تحقیق یہ وہ ہے جس سے تو ملتا رہتا تھا۔“

آخری کلام جو انہوں نے کیا وہ یہ تھا کہ عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس بلایا اور انہیں ایک طول
طویل نصیحت کی اور فرمایا کہ یہ میری آخری وصیت ہے کہ درستی اور سختی کو نرمی اور لینت کے
ساتھ ملائے رکھنا۔ تھوڑی دیر کے بعد ان پر غشی کا عالم طاری ہونے لگا، اور نزع کے وقت کو
قریب پہنچتا دیکھ کر ان الفاظ کو زبان پر لا کر جاں بحق تسلیم ہوئے ”یا اللہ! ایسا کر کہ میں سچا
مومن مروں۔ یا اللہ! مجھے ان لوگوں کے گروہ میں اٹھا جن کو تو نے برکت بخشی ہے۔“
ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دو برس اور تین مہینے عہد حکومت کے بعد ۲۲، اگست ۶۳۲ء کو رحلت فرمائی۔
آپ کی خواہش کے بموجب غسل میت انہیں ان کی بی بی اسماءؓ اور آپ کے بیٹے عبدالرحمن رضی اللہ

نے دیا۔ تکفین آپ کی انہی کپڑوں میں ہوئی جو وفات کے وقت وہ پہنے ہوئے تھے۔ کیونکہ انہوں نے فرمایا تھا کہ نئے کپڑے زندوں کے لیے موزوں ہیں اور پرانے کپڑے جسم بے جان کے لیے، جسے کپڑوں کا لقمہ ہونا ہے۔ جن اصحاب رضی اللہ عنہم نے رسول اکرم ﷺ کے جنازے کو کندھا دیا تھا وہی ابو بکر رضی اللہ عنہ کے جنازہ بردار ہوئے۔ انہیں اس مزار میں دفن کیا جس میں رسول اللہ ﷺ آرام فرماتے تھے۔ خلیفہ مغفور کا سر اپنے آقا کے بازو کے برابر تکیہ زن تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے جنازے کی نماز پڑھائی۔ جنازے کو بہت دور نہیں جانا تھا، صرف مسجد نبوی کا صحن طے کرنا تھا کیونکہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اسی مکان میں انتقال فرمایا جو رسول اللہ ﷺ نے ان کے رہنے کے لیے اپنے مکان کے سامنے تجویز فرمایا تھا اور جہاں سے مسجد نبوی کے کشادہ صحن پر نگاہ پڑتی تھی۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانے کا اکثر حصہ اسی مکان میں بسر کیا۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد چھ مہینے تو البتہ پہلے کی طرح زیادہ ترسخ میں ان کا قیام رہا جو مدینے کے نواح میں واقع ہے۔ یہاں پر ان کا مسکن ایک سادہ سا مکان تھا جو کھجور کے تختوں سے پٹا تھا، اس مکان میں وہ اپنی بی بی حبیبہ کے اعضاء و اقارب کے ساتھ رہتے تھے۔ حبیبہ سے ان کی شادی اس وقت ہوئی جبکہ وہ مدینے میں تشریف لائے تھے۔ ان کی وفات پر ان کی یہ بی بی حاملہ تھیں اور تھوڑے عرصے بعد ان کے لطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔

ہر صبح ابو بکر رضی اللہ عنہ سوار ہو کر پیادہ پا مسجد نبوی کی طرف جہاں رسول اللہ ﷺ اپنی حین حیات میں فرمانروا رہے تشریف لے جاتے تھے تاکہ امور مملکت کو انجام دیں۔ اور ان کی غیر حاضری میں عمر رضی اللہ عنہ ان کے قائم مقام ہوتے تھے، ہاں جمعہ کے دن جبکہ کوئی خطبہ یا وعظ کہنا ہوتا تھا تو وہ دو پہر تک گھر میں رہتے تھے۔ اس دن وہ اپنے سر اور داڑھی کو خضاب لگاتے تھے اور لباس کے پہننے میں ذرا زیادہ احتیاط اور صفائی کو مد نظر رکھتے تھے، اس سیدھے سادے مکان میں اپنے اوائل عمر کی سادگی اور روکھی پھیکی طرز زندگی کو اختیار رکھا، گھر کی بکریوں کے لیے چارہ آپ خود لاتے تھے اور ان کا دودھ آپ خود دوہتے تھے۔ اول اول تو آپ نے اپنے خانگی اخراجات کی کفالت کے لیے تجارت کا سلسلہ جاری رکھا، مگر جب آپ کو معلوم ہوا کہ

ایسا کرنے سے انتظام سلطنت میں فرق آتا ہے تو آپ نے اور سب کاموں کو چھوڑ دینا اور اپنے گھر کے خرچ کے لیے چھ ہزار درہم سالانہ کی رقم قبول کرنا منظور فرمایا۔

چونکہ سخ مسجد نبوی سے بہت فاصلے پر واقع تھا اور مسجد نبوی میں رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے سلطنت کے امور طے ہوتے چلے آتے تھے، اس لیے آپ نے یہاں نقل مکان کر لیا اور ساتھ ہی بیت المال کو بھی یہیں لے آئے۔ اسلام کا بیت المال ان دنوں میں بہت سادہ ہوتا تھا۔ نہ تو اس کے لیے پہرہ اور چوکیدار کی ضرورت ہوتی تھی، نہ حساب کے دفتر کی احتیاج۔ خراج کی آمدنی غرباء میں تقسیم کر دی جاتی تھی یا سامان جنگ اور اسلحہ پر صرف ہوتی تھی، مال غنیمت اور سونا چاندی، خواہ وہ گاؤں سے آتا یا اور کہیں سے، آتے ہی یا آنے کے بعد دوسری صبح کو تقسیم کر دیا جاتا۔ اس تقسیم میں سب کا حصہ برابر ہوتا تھا، نو مسلم اور دیرینہ مسلم ذکور و اناث، غلام و احرار سب مساوی حصے کے مستحق ہوتے تھے۔ بیت المال اسلام پر ہر مومن عرب کا ایک سا دعویٰ ہوتا تھا۔ جب کوئی یہ کہتا کہ اسلام پہلے قبول کرنے کے باعث مجھے ترجیح حاصل ہے اور اس لیے مجھے زیادہ حصہ ملنا چاہیے تو ابو بکرؓ فرماتے کہ یہ اللہ کا کلام ہے، اللہ ہی ان لوگوں کو جنہوں نے ترجیح حاصل کی ہے دوسری دنیا میں نیک اجر عطا فرمائے گا۔ یہ انعام و اکرام محض موجودہ زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کی وفات پر عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المال کو کھلوا یا تو معلوم ہوا کہ صرف ایک دینار باقی ہے جو شاید بالاتفاق تھیلیوں میں سے گر پڑا تھا یہ دیکھ کر سب کے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور انہوں نے آپ کے لیے دعائے مغفرت مانگی اور برکت بھیجی۔ آپ نے بیت المال میں سے جو کچھ بطور وظیفہ لیا تھا اسے بھی آپ کی کاشینس نے روانہ رکھا، لہذا وفات کے وقت آپ نے حکم صادر فرمایا کہ بعض حصص آراضی جو میری ملکیت سے ہیں فروخت کی جائیں اور جو قیمت وصول ہو اس میں سے بقدر اس روپے کے جو میں نے بیت المال میں سے لیا ہے بیت المال میں واپس داخل کر دیا جائے۔

ابو بکر رضی اللہ عنہ کی طبیعت نہایت ہی حلیم اور نرم واقع ہوئی تھی۔ عمر رضی اللہ عنہ کا قول تھا کہ ایسا

اور کوئی شخص نہیں جس پر لوگ اپنی جان اس شوق سے نثار کر دیں گے جیسی ابو بکر رضی اللہ عنہ پر۔
 آپ ایسے نرم دل تھے کہ لوگوں نے آپ کو ”ٹھنڈی سانس بھرنے والا“ کا خطاب
 دے رکھا تھا۔ باسٹنا ایک دفعہ کے جبکہ آپ نے ایک مفسد قزاق کو آگ میں جلوا دیا اور جس کا
 آپ کو ہمیشہ افسوس رہا، اور کوئی بے رحمی آپ سے ظہور میں نہیں آئی۔
 ابو بکر رضی اللہ عنہ کی زندگی دربار میں بھی اسی سادگی اور قناعت کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی،
 جیسے حضرت محمد ﷺ کی۔ آپ کے دربار پر یہ مصرعہ صادق آتا ہے:

گیرو دار حاجب و درباں دریں در گاہ نیست
 تزک و احتشام اور عظمت و شان جو درباروں کے ساتھ لازمی طور پر وابستہ ہوا کرتے
 ہیں ان کے دربار میں نام کو بھی نہ تھے۔ امور مملکت کے طے کرنے میں وہ نہایت مستعد اور
 سرگرم تھے۔ وہ اکثر راتوں کو اکیلے نکل جایا کرتے تاکہ محتاجوں اور ستم رسیدوں کی حاجت
 براری اور شنوائی کریں اور عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ انہیں ایک اندھی غریب بیوہ کا پرسان حال
 پایا جس کی حاجت براری کے لیے خود تشریف لائے تھے۔ محکمہ عدالت عمر رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا
 گیا۔ مگر روایت ہے کہ سال بھر کے عرصے میں مشکل سے دو مدعی بھی مقدمے کے لیے نہیں
 آئے۔ ریاست کی مہر پر الفاظ ((نعم القادر اللہ)) کندہ تھے۔ خط و کتابت کا کام علی رضی اللہ
 عنہ کے سپرد تھا اور ابو بکر رضی اللہ عنہ زید رضی اللہ عنہ (رسول اللہ کے میر منشی اور جامع قرآن) اور عثمان رضی اللہ
 عنہ سے یا اور کسی اہل قلم سے جو وقت پر پاس ہوتا مدد لیا کرتے تھے۔ اعلیٰ عہدوں اور اعلیٰ فوجی
 خدمتوں کے لیے اپنے نائبوں کے انتخاب میں آپ نے کبھی طرفداری یا رعایت کو مد نظر نہیں
 رکھا، اور چال چلن کے اندازہ لگانے میں ان کی رائے ہمیشہ سلیم اور صائب ہوتی تھی۔

ابو بکر رضی اللہ عنہ میں عزیمت اور استقلال کی کچھ کمی نہیں ہوتی تھی۔ اسامہ رضی اللہ عنہ کے زیرِ کمان
 فوج روانہ کرنا اور مشرک قوموں کے برخلاف مدینہ کو محفوظ رکھنا اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ
 آپ تنہا تھے اور چاروں طرف گویا ایک کالی گھٹا چھا رہی تھی اس عزم اور جرأت کا شاہد ہے
 جو فتنہ و فساد کی آگ بجھانے اور بغاوت کے فرو کرنے میں بہ نسبت کسی بات کے زیادہ کارآمد

ثابت ہوا۔ ابو بکرؓ کی قوت کا راز وہ ایمان راسخ تھا جو آپ حضرت محمد ﷺ پر لائے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے خلیفہٴ خدمت کہو میں تو رسول خدا کا خلیفہ ہوں۔ آپ کو ہمیشہ یہی سوال مد نظر رہتا تھا کہ حضرت محمد ﷺ کا کیا حکم تھا۔ یا اس وقت وہ ہوتے تو کیا کرتے۔ اس سوال کے جواب پر عمل کرتے وقت وہ سرمو تجاوز نہ فرماتے تھے، اور اس طرح پر آپ نے شرک اور بت پرستی کو پائمال کر دیا اور اسلام کی بنیاد استوار قائم فرمائی۔ آپ کا عہد مختصر تھا مگر رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی ایسا نہیں ہوا جس کا اسلام کو ان سے زیادہ ممنون اور مرہون احسان ہونا چاہیے۔ چونکہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دل میں رسول اکرم ﷺ کا اعتقاد نہایت راسخ طور پر متمکن تھا اور یہی عقیدہ خود رسول اکرم ﷺ خلوص اور سچائی کی ایک زبردست شہادت ہے، لہذا میں نے آپ کی حیات و صفات کے تذکرے کے لیے کچھ زیادہ جگہ وقف کی ہے۔

اگر حضرت محمد ﷺ کو ابتدا سے اپنے کذاب ہونے کا یقین ہوتا تو وہ کبھی ایسے شخص کو دوست اور عقیدت مند نہ بنا سکتے جو نہ صرف دانا اور ہوش مند تھا بلکہ سادہ مزاج اور صفائی پسند بھی تھا۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ کو نفسانی عظمت و شوکت کا کبھی خیال نہیں آیا۔ انہیں شاہانہ اقتدار حاصل تھا اور وہ بالکل خود مختار تھے، مگر وہ اس طاقت اور اقتدار کو صرف اسلام کی بہتری اور کافہ اُنام کے فائدہ پہنچانے میں عمل میں لائے گئے۔ ان کی ہوش مندی اس امر کی مقتضی نہ تھی کہ خود فریب کھالیں، اور خود وہ ایسے متدین تھے کہ کسی کو دھوکہ نہ دے سکتے تھے۔“ انتہی قولہ .

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی نسبت سرو لیم میور یہ لکھتے ہیں:

”۲۶ ذی الحجہ ۲۳ھ کو عمر رضی اللہ عنہ نے ساڑھے دس سال کی عہد حکومت کے بعد

انتقال فرمایا۔ ① رسول اللہ ﷺ کے بعد سلطنت اسلام میں سب سے بڑے

شخص عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ کیونکہ یہ انہی کی دانائی اور استقلال کا ثمرہ تھا کہ ان دس سال

کے عرصے میں شام، مصر اور فارس کے علاقے جن پر اس وقت سے اسلام کا

① حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ذی الحجہ ۲۳ مطابق ۳ نومبر ۶۴۴ء بروز بدھ فجر کی نماز میں حملہ ہوا، ۲۹ ذی الحجہ ۲۳ھ کو شہادت

ہوئی اور تدفین یکم محرم ۲۴ھ بروز ہفتہ عمل میں آئی۔

قبضہ رہا ہے، تسخیر ہو گئے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مشرک اقوام کو مغلوب تو کر لیا تھا لیکن ان کے عہد میں افواج اسلام صرف شام کی سرحد تک ہی پہنچی تھیں۔ عمر رضی اللہ عنہ جب مسند خلافت پر بیٹھے تو اس وقت ان کے قبضے میں صرف عرب تھا۔ مگر جب آپ نے انتقال فرمایا تو آپ ایک بڑی سلطنت کے خلیفہ تھے جو فارس، مصر، شام اور بنائیں اپنے سلطنت کے بعض نہایت ہی زرخیز اور دلکش صوبوں پر مشتمل تھی۔ مگر باوجود ایسی عظیم الشان سلطنت کے فرمانروا ہونے کے آپ کو کبھی اپنی فراست اور قوت فیصلہ کی متانت کے میزان میں پاسبان رکھنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ آپ نے سردار عرب کے سادہ اور معمولی لقب سے کسی زیادہ عظیم الشان لقب سے اپنے آپ کو ملقب نہیں کیا۔ دور دراز صوبوں سے لوگ آتے اور مسجد نبوی کے صحن کے چاروں طرف نظر دوڑا کر استفسار کرتے کہ خلیفہ کہاں ہیں۔ حالانکہ شہنشاہ، یعنی خلیفہ سادہ لباس میں ان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

عمر رضی اللہ عنہ کی سوانح عمری کا نقشہ کھینچنے کے لیے صرف چند خطوط کی ضرورت ہے۔ سادگی اور پابندی فرائض ان کے اصول کے اعلیٰ ارکان تھے۔ اپنی تمام خدمت کے بجالانے میں کسی کی رعایت نہ رکھنا اور سرگرمی سے کام لینا آپ کا خاصہ ہو گیا تھا اور اس بڑی جواب دہی کا بار آپ کو ایسا گراں معلوم ہوتا تھا کہ بسا اوقات آپ فرماتے:

کاش کہ مادر نہ زادے مر مرا

”اے کاش! بجائے اس کے میں گھاس کا تنکا ہوتا۔“ آپ کا مزاج ناص بور اور جلد مشتعل ہو جانے والا تھا اور ایام جوانی میں بلکہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے آخری حصہ میں بھی آپ انتقال کے سخت مؤید اور حامی خیال کیے جاتے تھے۔ تلوار کو نیام سے نکالنے کے لیے آپ ہر وقت تیار رہتے تھے اور آپ ہی نے جنگ بدر کے خاتمے پر یہ مشورہ دیا تھا کہ تمام قیدیوں کو تہ تیغ کیا جائے۔

لیکن عمر اور رتبے نے ان کے مزاج کی تندگی اور درشتی کو حلم سے بدل دیا تھا۔ عدل اور انصاف ان میں بحد کمال تھا، اور سوائے اس سلوک کے جو آپ نے غیر فیاضانہ اشتعال کے ساتھ خالد رضی اللہ عنہ سے کیا اور وہ بھی اس لیے کہ آپ کو خالد رضی اللہ عنہ کی وہ نامعقول حرکت ان سے ایک مغلوب دشمن سے بدسلوکی کرنے میں سرزد ہوئی نہایت قابل نفیریں معلوم ہوئی اور کسی ایسے فعل کا آپ سے ظہور میں آنے کا پتہ نہیں چلتا جس سے بے انصافی یا ظلم مترشح ہو۔

فوج کے سرداروں اور گورنروں کا انتخاب آپ نے بلا رورعایت کیا اور مغیرہ رضی اللہ عنہ اور عمار رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر باقی سب کا تقرر نہایت مناسب اور موزوں ہوا۔ سلطنت کی متفرق قوتیں اور جماعتیں جو مختلف الاغراض اور مختلف المقاصد تھیں، آپ کی قوت اور دیانت پر کامل بھروسہ رکھتی تھیں اور آپ کے تنومند بازو نے قانون کے قواعد کو جاری اور سلطنت کو نہایت عمدگی سے سنبھال لے رکھا۔

بصرہ اور کوفہ کی مخالفت آئین مقامات کے گورنروں کے تغیر و تبدل میں آپ کی کچھ کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی بددوں اور قریش کی متضاد و عاوی پر آپ نے ایک دباؤ ڈال لے رکھا اور انہوں نے اسلام میں آپ کی حین حیات میں کبھی فتنہ برپا کرنے کی جرأت نہ کی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے جو زیادہ ممتاز تھے انہیں آپ اپنے پاس مدینے میں رکھتے تھے جس کی وجہ کچھ تو بلاشبہ یہ تھی کہ صلاح و مشورہ سے آپ کو تقویت دیں اور کچھ اس لیے (جیسا کہ آپ کا قول تھا) کہ ”میں نہیں چاہتا کہ ان کو اپنے سے کم رتبہ دے کر ان کی شان و عزت میں فرق لاؤں۔“

ہاتھ میں تازیانہ لے کر آپ مدینے کی گلیوں اور بازاروں میں پھرا کرتے اور جو قصور وار ہوتا اسے وہیں سزا دیتے۔ یہ بات ضرب المثل ہو گئی تھی کہ عمر رضی اللہ عنہ کا تازیانہ دوسرے کی تلوار سے زیادہ خوفناک ہے۔ مگر بائیں ہمہ آپ نہایت نرم

دل تھے اور بے شمار واقعات آپ کے حلم اور مہربانی کے مذکور ہیں۔ مثلاً: بیواؤں اور یتیموں کی حاجت براری کرنا۔ ایک مثال ہم یہاں درج کرتے ہیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ قحط کے سال میں عرب میں سفر کر رہے تھے، آپ کا گزر ایک نادار غریب عورت پر ہوا جو بچوں کے لیے ہوئے چولھے کے پاس بیٹھی تھی اور بچے بھوک کے مارے بلبلارہے تھے، چولھے پر ایک خالی ہنڈیا بچوں کی تسلی کے لیے بے چاری عورت نے چڑھا رکھی تھی۔ عمر رضی اللہ عنہ نے جب یہ دیکھا تو آپ بھاگتے ہوئے دوسرے گاؤں میں گئے۔ گوشت اور روٹی لائے۔ گوشت خود ہنڈیا میں چڑھایا اور خوب سا کھانا پکا کر بچوں کو کھلایا اور انہیں ہنستا کھیلتا چھوڑ کر تب آگے روانہ ہوئے۔ 'انتھی' قولہ .

مجھے امید ہے کہ ناظرین حق پسند ان تحریروں کو دیکھ کر تسلیم کریں گے کہ ان واقعات نے عیسائیوں تک کو اسلام کی تعریف اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مکارم اخلاق اور محامد و اوصاف کے ظاہر کرنے پر مجبور کیا ہے، مگر تعجب ہے کہ خود اسلام کے مدعی ان واقعات سے انکار کریں اور عموماً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اسلام اور اخلاق سے بے بہرہ بتائیں۔ افسوس انسان کیسا ہی دانش مند اور عالم ہو مگر مذہبی تعصب اور آبائی تقلید اس کو سچ بات کے قبول کرنے اور کم سے کم اس کے اقرار کرنے سے ہمیشہ مانع ہوتی ہے۔ آفتاب کو دیکھتے ہیں کہ روشن ہے مگر اس کا اقرار نہیں کرتے۔ آنکھوں پر کچھ ایسا پردہ پڑ جاتا ہے کہ اسے دیکھتے ہی نہیں۔ بعینہ یہی حال حضرات امامیہ کا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا اسلام اور ان کا اخلاص آفتاب نیم روز کی طرح روشن ہے، قرآن بہ آواز اس کا اشتہار دے رہا ہے، اسلام کے دشمن تک اس کی تصدیق کر رہے ہیں، مگر وہ ہیں کہ اپنے تعصب اور ضد پر قائم ہیں اور ایک لاکھ چودہ ہزار اصحاب نبوی کے مرتد اور منافق کہنے میں سرگرم بلکہ اس پر نازاں ہیں۔

کیا اسلام کی بنیاد صرف اس بات سے مضبوط اور مستحکم مانی جاسکتی ہے کہ تیئیس برس کی مدت میں جو کوشش رسول اللہ ﷺ نے ایمان اور اخلاص کی تعلیم پر فرمائی۔ اور جس خدائی

قوت اور آسمانی مدد سے آپ نے لوگوں کو ہدایت کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے اپنی وفات کے بعد قریب سوا لاکھ آدمی..... اسلام کے نام لینے والے چھوڑے مگر ان میں چند عزیزوں کے سوا چار آدمیوں سے زیادہ کوئی سچا مسلمان اور پکا مومن اور دل سے خدا اور رسول کا ماننے والا اور ان کے حکموں پر چلنے والا نہ تھا۔ باقی نہ صرف منافق اور ایمان سے بے بہرہ تھے بلکہ ایسے ظالم سفاک سنگ دل، بے رحم تھے کہ آپ کے وفات فرماتے ہی سب نے اسی سردار کے گھر کو لوٹنا شروع کیا جس کے سایہ عاطفت میں پرورش پائی تھی۔ اور اسی کی اولاد پر ظلم کرنے لگے جن سے محبت رکھنا اور جن کی اطاعت کرنے کا انہوں نے بارہا اقرار اور دعویٰ کیا تھا اور ظلم بھی ایسے کیے کہ کبھی چشم فلک نے نہ دیکھے تھے۔ اس قسم کے خیالات سے جو خود مسلمانوں کا ایک طبقہ رکھتا ہے، منکرین نبوت کو اس بات کے کہنے کا موقع ملے گا کہ رسالت کا مقصد صرف دنیاوی سلطنت کا قائم کرنا تھا اور لوٹ مار کر طمع اور امارت اور ریاست کی حرص نے ایک گروہ خود غرض، بدنفس، طماع اور حریصوں کا اس کے بانی کے ارد گرد جمع کر دیا تھا۔ ان ہزاروں آدمیوں کے دلوں پر جو رات دن پیغمبر خدا ﷺ کی صحبت میں رہتے تھے نہ قرآن کی تعلیم کا کچھ اثر ہوا تھا نہ خدا کے رسول ﷺ کے وعظ و نصیحت نے ان پر کچھ تاثیر کی تھی۔ نہ بانی اسلام اور اسلام کے ماننے والوں میں کوئی رشتہ اخلاص اور اطاعت و ایمان اور محبت کا، جیسا کہ کسی سچے پیغمبر اور اس کے ایمان لانے والوں میں ہوتا ہے قائم تھا بلکہ دونوں اپنے اغراض کے حاصل کرنے میں سرگرم اور مستعد تھے اور دو مختلف اور متناقض قوتیں اپنے مقاصد کے پورا کرنے میں کام کرتی تھیں۔ سردار تو یہ چاہتا تھا کہ جو سلطنت اور ریاست اس کی قوت بازو سے قائم ہو وہ اسی کے گھر میں رہے کسی دوسرے کا تسلط نہ ہونے پائے۔ اور اس کے ساتھی اس فکر میں تھے کہ ان کی محنت اور کوشش کا صلہ خود ان کو حاصل ہو، اور ریاست کی مسند پر اپنے سردار کے بعد خود قابض ہوں۔

میرا یہ کہنا حقیقت میں نہ مبالغہ ہے نہ شیعوں کے عقائد پر بے جا الزام لگانا، بلکہ ان واقعات اور حالات سے جن کو حضرات امامیہ سچ سمجھتے ہیں اور جن پر ان کے مذہب کی بنیاد

قائم ہے یہی نتیجہ نکلتا ہے، ان کے خیال کے موافق سوا اس کے اور کیا بات معلوم ہوتی ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ کی آرزو و بعثت کے روز سے وفات کے وقت تک یہ تھی کہ جناب امیران کے بعد خلیفہ ہوں اور الی یوم القیامہ نسلاً بعد نسل و بطناً بعد بطن دینی اور دنیاوی سلطنت پر انہیں کے خاندان کا قبضہ رہے۔ چنانچہ شیعوں کے اعتقاد کے موافق اس آرزو کو آپ نے طرح طرح سے ظاہر کیا اور اس کے لیے کوئی دقیقہ سعی اور کوشش کا اٹھانہ رکھا۔ کوئی موقع خلوت میں اور جلوت میں، سفر میں اور حضر میں، صلح اور جنگ میں، صحت میں اور بیماری میں ایسا نہیں چھوڑا جس میں اپنی یہ خواہش اشارتاً یا صراحتاً ظاہر نہ فرمائی ہو اور خدا کے احکام اور اس کے پیام اس کے متعلق نہ سنائے ہوں اور اس حکم کے ماننے والوں کے فضائل اور ان کے لیے انواع و اقسام کے ثواب اور اس سے عدول کرنے والوں کے معائب اور ان کے واسطے طرح طرح کے عذاب بیان نہ کیے ہوں۔ یہاں تک کہ آخری کوشش آپ کی وہ تھی جو خم غدیر میں ظاہر فرمائی کہ ایک لاکھ آدمیوں کے مجمع میں اس کا اعلان صاف صاف لفظوں میں فرما دیا اور جناب امیر کی امارت اور خلافت کا اشتہاد دے کر سب سے اقرار لے لیا۔ اور اپنے سامنے اپنی جانشینی کو ہر طرح سے مستحکم اور قوی کر دیا۔ چنانچہ اس پر مبارک سلامت کی آوازیں بھی چاروں طرف سے بلند ہو گئیں اور خوشی کے شادیاں بھی بج گئے مگر اللہ نے بغض و نفاق اور اتفاق صحابہ کا کہ تین چار آدمیوں کے سوا ایک نے بھی اس کا خیال نہ رکھا اور کسی نے بھی امیر المؤمنین کی خلافت اور امارت کا جو اس زور و شور سے قائم کی گئی تھی اقرار نہ کیا۔ بلکہ آپ کی آنکھ بند ہوتے ہی سب کے سب اس عہد سے پھر گئے۔ اور اس پر غضب یہ ہے کہ اصل واقعہ کے واقع ہونے سے بھی ناواقفیت جتانے لگے۔ سب نے کچھ ایسا اتفاق کر لیا کہ گویا وہ مہتمم بالشان واقعہ واقع ہی نہ ہوا تھا اور خم غدیر میں علیؑ رؤوس الاشہاد بر سر منبر آپ نے اپنی جانشینی کا اعلان فرمایا ہی نہ تھا۔ اس تمام واقعات کی یادگار میں اگر کسی کی زبان پر کچھ باقی رہا تو صرف آپ کا یہ ارشاد کہ ((انی تارك فيكم الثقلين كتاب الله و عترتي)) اور

① میں چھوڑنے والا ہوں تم میں دو بھاری چیزیں ایک کتاب اللہ دوسری اپنی عترت۔

اس تمام تقریر میں اگر کسی نے اقرار کیا تو صرف آپ کے اس قول کا کہ ((من کنت مولاه فعلی مولاه)) اس کا مقصود اور ما حاصل بیان کیا تو صرف یہ کہ ان سے محبت رکھنا اور ان کی خاطر داری کرنا چاہیے۔ مگر اس پر بھی عمل نہ کیا اور بجائے محبت کے کھلم کھلا عداوت ظاہر کرنے لگے اور پرانے کینے اور پشتینی رنج کے بدلے لینے لگے اور رسول خدا ﷺ کی وصیت کو بھلا دیا اور قرآن کو پس پشت ڈال دیا۔ اور جو عہد کیے تھے انہیں توڑ دیا۔ اور اس طرح وہ دین سے خارج ہو گئے۔

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی حالت میں رسالت اور شریعت پر کیا اطمینان رہے گا۔ اس لیے کہ یہی لوگ جن کے اخلاق اور خصائل ایسے برے تھے وہی اسلام کے ارکان تھے۔ انہی کے سلسلے سے ہم کو قرآن پہنچا، انہی کے ذریعہ سے ہم کو رسول خدا ﷺ کے حالات معلوم ہوئے، اور انہی کے وسیلے سے وحی کا آنا اور جبرئیل علیہ السلام کا نازل ہونا اور پیغمبر خدا ﷺ کا ملکوتی صفات سے متصف ہونا ثابت ہوا تو کیا تعجب ہے ایسے بد دین اور بد اخلاق، ستم پیشہ، سفاک، ناخدا ترس، بد عہد بد باطن بد طینت، طماع اور حریص لوگوں نے باہم سازش کر کے دنیا کمانے اور خلق خدا لوٹنے کے لیے کسی کو سردار بنا لیا ہو۔ اور لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے اس کے جھوٹے حالات مشہور کر دیے ہوں۔ اور اس کے نام سے جھوٹے احکام جاری کیے ہوں اور جھوٹے قواعد اور ضوابط بنائے ہوں۔ اور لوگوں کو دام میں پھنسانے کے لیے اس کی نبوت اور رسالت کو شہرت دے دی ہو۔ اور قرآن کو چند لائق فصیح و بلیغ لوگوں سے لکھوا کر اس کی طرف منسوب کر دیا ہو۔ کیونکہ جس گروہ کا یہ حال ہو کہ بد اخلاقی کے علاوہ سازش میں بھی ایسے پکے ہوں کہ جو بات عمر بھر ان کا سردار بیان کرتا رہا اور جس کے لیے ہمیشہ قرآن کا نازل ہونا بیان فرماتا رہا اور جس کی تاکید سر او جہراً ہمیشہ ان کا پیشوا کرتا رہا ہو اور اپنی وفات سے چند روز پہلے اس کا اعلان ستر ہزار یا ایک لاکھ چودہ ہزار آدمیوں کے سامنے اس طرح کر دیا ہو کہ زمین ملک و فلک، شجر و حجر، جن و انسان سب نے سنا ہو اور نہایت فصیح و بلیغ اور پر زور اور پر جوش خطبے میں آخری حجت پوری کرنے کے لیے جانشینی کا

مسئلہ پورے طور پر کر دیا ہو اور سب کے سامنے خم غدیر میں اپنے جانشین کی خلافت کی بیعت بھی لے لی ہو اور خدا نے آیت ﴿الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاتَّيَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي﴾ کی مہر بھی خلافت کی سند پر کر دی ہو۔ باوجود اس کے ایسے متواتر اور غیر پوشیدہ رہنے والی بات کو انہوں نے چھپا ڈالا۔ اور اس پر عمل کرنا بیک طرف اس کے ہونے اور اس واقعہ کے وقوع میں آنے سے ہی انکار کر دیا اور ایسی امامت کی نسبت جو نہایت شد و مد کے ساتھ قائم کی گئی تھی، نص جلی بلکہ نص خفی سے بھی منکر ہو گئے۔ تو ایسے لوگوں سے جن کی سازش انسانی فطرت کے خلاف ہو اور جو ایسی متواتر اور مشہور بات کو جو ستر ہزار آدمیوں کے سامنے ہوئی ہو پوشیدہ رکھ سکتے ہوں، کیا بعید ہے کہ انہوں نے رسالت کے نام سے ایک جھوٹا کارخانہ کھڑا کیا ہو اور بے بنیاد باتوں کو مشہور کر کے کسی کو رسول اور نبی بنا لیا ہو۔ اور اگر ہم تسلیم بھی کریں کہ رسول خدا ﷺ خود ان سے بیزار تھے اور ان کے احکام و شریعت جاری کرنے والے ان کے اہل بیت اور چند خاص لوگ تھے، تو ایسے لوگ اتنے کم تھے کہ ان کی تعداد عشرات کے درجے سے بھی زیادہ نہیں تھی اور ان کے ذریعہ سے جو کچھ لوگوں کو معلوم ہوا وہ انہی لوگوں کے ذریعہ سے جو مہاجرین و انصار اور اصحاب نبوی کہلاتے تھے۔ اور جبکہ ان کی یہ کیفیت تھی کہ جو چاہتے وہ ظاہر کرتے اور جو چاہتے وہ جاری کرتے اور ان میں سے چند لوگوں کا رعب و داب ایسا تھا کہ باقی تمام لوگ ان کی اطاعت کرتے یا ان کے دھوکے میں آجاتے تھے تو جس طرح ان سے یہ ہو سکا کہ انہوں نے بہ سبب حسد یا عداوت کے امیر المؤمنین کے امامت کی نص جلی کو چھپا ڈالا اور حقوق اہل بیت کے غصب کرنے کے لیے جھوٹی حدیثیں بنا کر لوگوں کو اپنا ساتھی کر لیا، بھی ان سے ہو سکتا تھا کہ شریعت کو بدل دیا ہو اور جو کچھ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہو اس کے خلاف شہرت دی ہو، قرآن میں کمی زیادتی کر دی ہو، نمازیں بڑھا گھٹا دی ہوں، حج و زکوٰۃ کے اصلی احکام چھپا کر اپنی مرضی کے موافق بتا دئے ہوں اور اگر یہ باتیں جائز سمجھی جائیں اور کیوں نہ جائز سمجھی جائیں، اس لیے کہ جن باتوں کو ہم بالفرض

والتسلیم بیان کرتے ہیں، شیعوں کے عقائد میں داخل ہیں تو انجام اس کا سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ شرع پر سے بھروسا اٹھ جائے گا اور اسلام کی کوئی بات بھی وثوق اور یقین کے قابل نہ رہے گی۔

اگر شیعہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو بد اخلاق اور مرتد سمجھ کر اس نتیجہ پر راضی ہیں تو خیر، وہ جانیں اور ان کا خدا۔ مگر اسلام پر اعتقاد رکھنے والے کے بدن پر صرف اس خیال سے لرزہ آتا اور الخدر الخدر پکارتا ہے اور اسلام کے ساتھ ان خیالات کا جمع ہونا ناممکن سمجھتا ہے۔



تیسرا مقدمہ

اگر فدک کے غصب کرنے اور جناب سیدۃ النساء پر ظلم و ستم کرنے کی وہ روایتیں صحیح مانی جائیں جو اس باب میں حضرات امامیہ بیان کرتے ہیں تو اس سے حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ پر اور تمام بنی ہاشم پر جو شجاعت اور عصبیت اور غیرت و حمیت میں ضرب المثل تھے، سخت الزام آتا ہے، اور ان کے مقابلہ بلکہ مقاتلہ نہ کرنے اور نہایت عاجزی اور بے کسی سے تمام باتوں کے برداشت کرنے پر حیرت ہوتی ہے، اس لیے کہ جو ظلم و ستم حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا پر کیے گئے وہ کچھ معمول نہ تھے، نہ اس پر صبر و تحمل کرنا شرعاً و عقلاً اور اخلاقاً و عرفاً قابل ستائش تھا۔ بلکہ اس کا روکنا اور مقابلہ کرنا واجبات میں سے تھا۔ اگر صرف فدک غصب کر لیا جاتا یا مال کو وہ چھین لیتے تو اس پر صبر ہو سکتا تھا، مگر جبکہ حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کو جسمانی ایذائیں پہنچائیں، انہیں طمانچے لگائے، اور لائیں ماریں، اور محسن کو شہید کیا اور بعد سیدہ کی وفات کے ام کلثوم کو غصب کیا تو یہ وہ باتیں ہیں جن پر سکوت کرنا ہرگز جائز نہیں ہو سکتا۔

اس کا جواب حضرات امامیہ چند طرح سے دیتے ہیں:

ایک یہ کہ جو کچھ آپ نے عمل کیا اس پر آپ مجبور تھے، اس لیے کہ خدا کا حکم یہی تھا اور آپ کو خدا کی طرف سے اسی بات کی وصیت تھی اور وصیت بھی ایسی شدید اور سخت کہ آپ اس سے انحراف نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ اصول کافی کلینی کتاب الحجۃ صفحہ ۱۷۲ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۳۰۲ء میں صریح روایت موجود ہے کہ جبرئیل علیہ السلام خدا کی طرف سے ایک لکھا

① اصل عبارت یہ ہے: حدثنی موسیٰ بن جعفر قال قلت لابی عبد اللہ الیس کان امیر المومنین کاتب الوصیة و رسول اللہ صلعم اطمعل علیہ و جبریل و الملائکة المقربون علیہم السلام شہود قال فاطرق طویلا ثم قال یا ابا الحسن قد کان ماقلت و لکن حین نزل برسول اللہ الامر نزلت الوصیة من عند اللہ کتابا مسجلا انزل به جبریل مع امناء اللہ تبارک و تعالیٰ من الملائکة فقال جبریل یا محمد ﷺ

ہو نامہ جس پر مہریں تھیں اور جس کے ساتھ ملائکہ مقربین تھے، آنحضرت ﷺ کے پاس لائے اور کہا کہ اے محمد! سب آدمیوں کو باہر کر دو اور سوائے تمہارے اور تمہارے وصی علی بن

﴿﴾ ﴿﴾ ﴿﴾ باخراج من عندك الاوصيك يقبضهما منا وتشهدنا بدفعك اياها اليه ضامنالها يعني عليا فامر النبي باخراج من كان في البيت ما خلا عليا وفاطمة فيما بين السر والباب فقال جبريل يا محمد ربك يقرئك السلام ويقول هذا كتاب ما كنت عهدت اليك وشرطت عليك وشهدت به عليك واشهدت به عليك ملائكتي وكفى بي يا محمد شهيد اقال فار تعدت مفاصل النبي وقابل يا جبريل ربي هو السلام ومنه السلام واليه يعود السلام صدق عزوجل وبرهات الكتاب فدفعه اليه وامره بدفعه الي امير المؤمنين فقال له اقراه وقراه حرفا حرفا فقال يا علي هذا عهد ربي تبارك وتعالى الي وشرحه الي وامانته وقد بلغت ونصحت واديت فقال علي وانا اشهدك بابي انت وامى بالبلاغ والنصيحة والتصديق علي ما قلت ويشهد لك به سمعي وبصري ولحمي ودمي فقال جبريل وانا لكما علي ذالك من الشاهدين فقال رسول الله يا علي اخذت وصيتي وعرفتھا وضمنت الله ولي الوفاء بما فيها فقال علي نعم بابي انت وامى علي ضمانهما وعلى الله دعونى وتوفيقى علي ادائها فقال رسول الله يا علي انى اريدان اشهد عليك بموافاتى بهايوم القيامة فقال علي نعم اشهد فقال النبي ان جبريل ميكائيل فيما بينى وبينك الآن وهما حاضران معهما الملائكة المقربون لاشهد هم عليك فقال نعم ليشهدوا وانا بابي وامى اشهد هم فاشهد هم رسول الله صلعم وكان فيما اشترط عليه النبي بامر جبريل فيما امر الله عزوجل ان قال له يا علي تفى بما فيها من موالاته من والى الله ورسوله والبراءة والعداوة لمن عادى الله ورسوله والبراءة منهم على الصبر منك على كظم الغيظ وعلى ذهاب حقدك وغضب خمسك وانتهاك حرمتك فقال نعم يا رسول الله فقال امير المؤمنين والذى خلق الجنة وبراء النسمة لقد سمعت جبريل يقول النبي يا محمد! عرفه انه ينتهك الحرمة وهى حرمة الله وحرمة رسوله صلعم وعلى ان تخضب لحيته من رأسه بدم عبيط قال امير المؤمنين فصعقت حين فهمت الكلمة من الامين جبريل حتى سقطت على وجهى وقلت نعم قبلت ورضيت وان انتهك الحرمة وعطلت السنن ومزق الكتاب وهدم الكعبة وخضبت لحيتى من رأسى بدم عبيط صابراً محتسباً ابداً حتى اقدم عليك ثم دعى رسول الله فاطمة والحسن والحسين واعلمهم مثل ما علم امير المؤمنين فقالوا مثل قوله فتختمت الوصية بخواتيم من ذهب لم يمسه النار ودفعت الى امير المؤمنين فقلت لابي الحسن بابي انت وامى! لاتذكر ما كان فى الوصية فقال سنن الله وسنن رسوله فقلت اكان فى الوصية يوتيههم وخلافهم على امير المؤمنين فقال نعم والله شيئاً شيئاً وحرفاً اما سمعت قول الله عزوجل انا نحن نحى الموتى ونكتب ما قدموا واثارهم وكل شيئاً احصيناه فى امام مبين والله لقد قال رسول الله لامير المؤمنين وفاطمة اليس قد فهمت ما قدمت به اليكما وقبلتماه فقالا بلى مقبوله وصبرنا على ما سائنا و

ابن ابی طالب کے کوئی دوسرا نہ رہے تا کہ وہ فرمانِ الہی ہم سے لیں اور آپ کا وصی ہمیں گواہ کرے کہ آپ نے وہ نامہ ان کو دے دیا اور وہ ضامن ہوں کہ جو کچھ اس میں لکھا ہوا ہے۔ اس پر عمل کریں گے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے سب لوگوں کو باہر کر دیا سوائے علی بن ابی طالب کے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر دے میں بیٹھی ہوئی تھیں جب گھر اغیار سے خالی ہو گیا اس وقت جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ اے محمد! آپ کا پروردگار آپ کو سلام بھیجتا ہے اور فرماتا ہے کہ یہ وہ نامہ ہے کہ جس کا شب معراج وغیرہ میں، میں نے وعدہ کیا تھا اور آپ سے شرط کی تھی اور آپ نے ملائکہ کو اس بات پر گواہ کیا تھا گو کہ میں گواہی کے لیے کافی تھا۔ یہ الفاظ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے سن کر حضرت خوفِ الہی سے کانپنے لگے۔ اور آپ کے بدن کے اعضا پر لرزہ پڑ گیا اور کہا کہ اے جبرئیل! میرا خدا تمام نقصوں سے پاک ہے اور اس نے اپنے عہد کو وفا کیا ہے۔ اب آپ وہ نامہ دیجئے، جبرئیل علیہ السلام نے وہ نامہ آپ کو دیا اور کہا کہ امیر المؤمنین علیہ السلام کے حوالہ کرو، پیغمبر خدا نے اس کے موافق جناب امیر کو دیا اور فرمایا کہ پڑھو حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے اسے حرف بحرف پڑھا۔ تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ خدا کا عہد ہے اور اس کی شرط ہے جو مجھ سے لی ہے اور اس کی امانت ہے جو مجھے دی ہے اور میں نے اسے پہنچا دیا اور جو کچھ امت کی خیر خواہی تھی اسے عمل میں لایا اور خدا کی رسالت ادا کی۔ حضرت امیر نے بھی اس کی تصدیق کی اور کہا کہ میرے کان آنکھ اور گوشت و خون اس پر گواہ ہیں۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ میں بھی ان باتوں کا گواہ ہوں جو تم دونوں نے کیں۔ پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اے علی! تم نے یہ وصیت مجھ سے لی اور اسے سمجھ لیا اور اس کی ضمانت کرتے ہو خدا کے واسطے کہ ایسا ہی کرو گے اور اس عہد پر پورے پورے طور پر عمل آور ہو گے۔ حضرت امیر نے فرمایا کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں میں اس کا ضامن ہوں اور اقرار کرتا ہوں کہ اس پر عمل کروں گا اور خدا مجھے اس پر عمل کرنے کی یاری اور توفیق دے۔ پھر رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ اے علی! میں چاہتا ہوں کہ اس پر تم سے گواہی لوں کہ جب قیامت کے دن تم میرے پاس آؤ تو وہ گواہ گواہی دیں کہ میں نے تم پر حجت تمام کر دی۔

حضرت امیر نے فرمایا کہ جبرئیل علیہ السلام و میکائیل علیہ السلام اور یہ ملائکہ مقررین جو اس کے ساتھ آئے ہیں اس پر گواہ ہیں، پیغمبر خدا نے ان کو گواہ کیا۔

اور منجملہ ان باتوں کے جن پر جبرئیل علیہ السلام نے خدا کی طرف سے آنحضرت ﷺ سے شرط لی تھی کہ اے علی! اس بات کو قبول کرتے ہو اور اس پر عمل کرو گے کہ جو خدا اور رسول کا دوست ہے، اس سے دوستی کرنا اور جو ان کا دشمن ہے اس سے دشمنی کرنا اور جو حق تمہارے چھینے جائیں اور تمہارا خمس غصب کیا جائے اور تمہاری حرمت ضائع کی جائے تو ان سب پر صبر کرو گے اور غصہ نہ کرو گے۔ جناب امیر نے کہا: ہاں یا رسول اللہ! پھر حضرت امیر نے فرمایا: قسم ہے اس خدا کی جس نے مخلوق کو پیدا کیا! میں نے جبرئیل سے یہ سن لیا جو انہوں نے آپ سے کہا کہ ان کو آپ آگاہ کر دیں کہ ان کی حرمت کو برباد کریں گے، حالانکہ ان کی حرمت حرمت خدا اور رسول ہے اور ان کی ریش مبارک ان کے سر کے خون سے رنگین کریں گے۔ اور یہ کہہ کر حضرت امیر نے فرمایا کہ جب میں نے یہ کلمے جبرئیل سے سنے تو میں بیہوش ہو گیا اور منہ کے بل گر پڑا اور کہنے لگا کہ ہاں یا رسول اللہ! میں نے اسے قبول کیا اور میں راضی ہوا گو وہ میری حرمت کی ہتک کریں اور آپ کی سنت کو معطل۔ اور خدا کی کتاب کو پارہ پارہ اور کعبہ کو خراب اور میری داڑھی سر کے خون سے رنگین کریں، ہر حال میں صبر کروں گا اور اس کے جزا کی امید سوائے پروردگار کے کسی سے نہ رکھوں گا جب تک کہ مظلوم اس کے پاس آؤں۔ پھر حضرت رسول خدا نے فاطمہ اور حسنین رضی اللہ عنہم کو بلایا اور ان کو بھی آگاہ کیا جس طرح پر کہ حضرت امیر کو کیا تھا انہوں نے بھی یہی جواب دیا۔ اس کے بعد اس وصیت نامے پر بہشت کی مہروں سے مہر کی جن کو آگ نے نہ چھوا تھا اور پھر وہ مہر شدہ نامہ حضرت امیر کے سپرد کر دیا۔ حضرت امام موسیٰ بن جعفر جب یہاں تک فرما چکے تو راوی نے پوچھا کہ آیا اس وصیت میں یہ بھی لکھا تھا کہ منافقین خلافت کو غصب کریں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ ہاں قسم خدا کی جو کچھ انہوں نے کیا سب اس میں لکھا تھا کیا تم نے نہیں سنا خدا کا یہ کلام ﴿إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ وَكُلُّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ

مُبَيِّنٍ ﴿۵﴾ (سورہ یس: ۱۲) ﴿۱﴾ پھر رسول خدا ﷺ نے کہا کہ اے علی وفاطمہ! تم سمجھے جو میں نے تم سے کہا اور اسے قبول کیا اور اس پر عمل کرو گے ان دونوں نے کہا ((بلی و صبرنا علی ما ساءنا و غاضنا))..... کہ ہاں ہم نے قبول کیا اور صبر کریں گے جو کریں گے جو کچھ کہ ہم کو ایذا پہنچے گی اور جو رنج دیا جائے گا۔

ہم اس جواب کو تسلیم کر لیتے اگر ہم کو اس کے خلاف کوئی عمل حضرت امیر المومنین اور جناب سیدہ کا معلوم نہ ہوتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو حضرات امامیہ نے جناب امیر کو صبر و سکوت اور تحمل و برداشت کے درجے کو اعلیٰ درجے پر پہنچانے کے لیے خدا کا تحریری اور مہری وصیت نامہ پیش کیا۔ اور اس سے گویا ان تمام جاہلانہ اعتراضات کے جواب دے دیے جو سنی ناصبی اپنی بے وقوفی اور جہالت سے کر سکتے تھے کہ حضرت امیر نے باوجود شجاعت اور عصبيت کے ایسے مظالم کو کیوں جائز رکھا، اور بضعہ رسول پر ایسی تکلیفیں دیکھ کر کیوں سکوت اختیار کیا۔ اور دوسری طرف بعض مواقع پر وہ روایتیں بیان کی ہیں جن سے گو شیر خدا کی حیدری صولت اور غضنفری سطوت اچھی طرح ثابت ہوتی ہے، مگر خدا کا مہری اور دستخطی وصیت نامہ باطل ہوا جاتا ہے اور مثل دیگر روایات کے اس قسم کی روایتوں کا تناقض دیکھنے والے کو خلیجان میں ڈالتا ہے۔

چنانچہ منجملہ ان روایات کے ایک یہ ہے کہ جب فدک ﴿۱﴾ سے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے کارندے کو موقوف کر دیا اور اس کی جگہ اشجع کو مقرر کیا اس شخص نے رعایا کو ستایا اور وہ حضرت امیر کے پاس فریادی آئے تو حضرت امیر کو ایسا غصہ آیا کہ چند عزیزوں اور ہمراہیوں کے وہاں گئے اور اس کو بلا کر قتل کر دیا اور خالد بن ولید سے اسی موقع پر ایسی گفتگو کی کہ ان کے بدن پر لرزہ آ گیا اور انہوں نے منت سماجت کر کے پیچھا چھڑایا۔

﴿۱﴾ ہم ہیں جو جلاتے ہیں مردے اور لکھتے ہیں جو آگے بھیجا اور ان کے پیچھے نشان رہے اور ہر چیز گن لی ہے ہم نے ایک کھلی اصل ہیں۔

﴿۲﴾ یہ روایت بحث دعویٰ فدک میں نقل کی گئی ہے وہاں دیکھیں۔

اس موقع پر آپ نے خلیفہ وقت کا خیال کیا نہ خالد سے جنگ ہونے کا اندیشہ فرمایا، بلکہ اپنا ہاشمی دبدبہ اور قریشی جوش اور حیدری سطوت اور اسد اللہی ہیبت ایسی دکھائی کہ نہ صرف خالد بلکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ بھی دم بخود ہو گئے۔

دوسری روایت یہ ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ جب علی رضی اللہ عنہ فجر کی نماز میں مشغول ہوں تم ان کو قتل کر دینا، مگر عین نماز میں سلام پھیرنے سے قبل، ابوبکر نے کچھ سوچ سمجھ کر خالد کو منع کر دیا اور دوسرے موقع پر اس کام کو محمول رکھا اور جب علی رضی اللہ عنہ سلام سے فارغ ہوئے تو علی رضی اللہ عنہ نے خالد رضی اللہ عنہ سے کہا کہ کیا تم اس کام کو پورا کرتے جو تم سے کہا گیا ہے۔ انہوں نے کہا بلاشک اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی دونوں انگلیوں سے ایسا دبایا کہ قریب تھا ان کی آنکھیں نکل پڑیں مگر لوگوں کی شفاعت سے آپ نے انہیں چھوڑ دیا، لیکن خالد ایک دوسرا موقع ڈھونڈتے اور چاہتے تھے کہ علی رضی اللہ عنہ اگر اتفاقاً کہیں مل جائیں تو انہیں قتل کر دیں اور آخر انہیں ایسا موقع ملا مگر شیر خدا نے خالد رضی اللہ عنہ کی جس طور پر خبر لی اور جس طرح ان کو اپنے ارادے کی سزا دی وہ ”بحار الانوار“ اور ”ارشاد القلوب“ میں منقول ہے، چونکہ بغیر کل قصے کے نقل کرنے کے ناظرین اس کا لطف نہیں اٹھا سکتے اس لیے ہم اسے بحسنہ نقل کرتے ہیں۔

ملا باقر مجلسی کتاب الفتن میں لکھتے ہیں کہ ”ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک لشکر خالد رضی اللہ عنہ کے ہمراہ کہیں کو روانہ کیا۔ سب لوگ نکل کر مدینے سے باہر آ گئے، خالد مسلح تھے اور ان کے آس پاس شجاع لوگ تھے، جن کو حکم دیا تھا کہ جو خالد کہیں وہ کریں، اتنے میں خالد رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ اپنی زمین مزروعہ پر سے تنہا بے ہتھیار آرہے ہیں، جب قریب پہنچے تو اس وقت خالد رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں ایک لوہے کا گرز تھا انہوں نے گرز اٹھا کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سر پر مارنا چاہا لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے ہاتھ سے چھین کر خالد بن ولید کی گردن میں لپیٹ دیا اور ہار کر طرح پہنا دیا۔ تب خالد ابوبکر کے پاس لوٹ کر آئے لوگوں نے ہر چند اس کے توڑنے کے ذریعے پیدا کیے لیکن یہ ٹوٹ نہ سکا، اس کے بعد بہت سے لوہاروں کو بلایا ان

سب نے کہا کہ بغیر آگ میں گلانے کے اس کا نکلنا ممکن نہیں ہے اور اس سے ان کے مر جانے کا اندیشہ ہے۔ جب لوگوں نے ان کی یہ کیفیت دیکھی تو کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی اس سے نجات دے سکتے ہیں۔ جیسے انہوں نے ان کی گردن میں اس کو ڈال دیا ہے اور خدا نے تو ان کے لیے لوہے کو نرم کر دیا ہے جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے نرم کر دیا تھا۔ تب ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سفارش کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہاتھ سے پکڑ کر گرز کا ایک ایک ٹکڑا الگ کر دیا۔“ ❶

ارشاد القلوب میں جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہما اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس ان کے زمانہ خلافت میں بیٹھے ہوئے تھے اور دن خوب چڑھ گیا تھا کہ اچانک خالد بن ولید مخزومی ایک ایسے لشکر کے ساتھ آئے جس کا غبار بلند تھا اور اس لشکر کے گھوڑے بکثرت ہنہنا رہے تھے کہ ایک چکی کا پاٹ خالد کی گردن میں لپٹا ہوا ہے خالد رضی اللہ عنہ سامنے آتے ہی اپنے گھوڑے سے اتر کر مسجد کے اندر آ گئے اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سامنے آ کھڑے ہوئے، لوگوں نے اپنی آنکھیں ان کی طرف بلند کیں کہ اس کے دیکھنے سے خوب خوف معلوم ہوا۔ پھر خالد رضی اللہ عنہ نے کہا اے ابو قحافہ کے بیٹے! انصاف کر اس لیے خدا نے تجھ کو ایسی جگہ بٹھایا ہے جس کے تو لائق نہیں ہے اس جگہ پر تو اسی طرح بلند ہوا ہے جیسے پانی پر مچھلی ابھر آتی ہے وہ تب ہی ابھرتی ہے کہ جب اس میں چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رہتی۔ اس کے بعد خالد رضی اللہ عنہ نے طائف سے اپنے لوٹنے کی کیفیت اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ملنے کی کیفیت کے بعد یہ بیان کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ میرے حلقوں پر مارا اور مجھے گھوڑے سے نیچے اتار لیا اور مجھ کو گھسیٹتے ہوئے لے گئے اور حارث بن کلاب ثقفی کی چکی منگائی اور اس کا موٹا سا پاٹ اٹھایا اور میری گردن کھینچ کر دونوں ہاتھوں سے اس پاٹ کو گردن میں لپیٹ دیا اور وہ ایسا لپٹتا جاتا تھا جیسے گرم کی ہوئی لاکھ، اور سب میرے ہمراہی کھڑے ہوئے تھے ان سے کچھ نہ ہو سکا۔ خدا ان کو سزا دے۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایسا دیکھتے تھے جیسے اپنے

ملک الموت کو۔ اس کی قسم جس نے آسمانوں کو بغیر تھوینوں کے بلند کیا کہ قریب سو آدمیوں کے بلکہ زیادہ نہایت مضبوط عرب لوگ اس پاٹ کے علیحدہ کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے لیکن ان سے وہ جدا نہ ہو سکا۔ تب لوگوں کے عاجز ہونے سے معلوم ہوا کہ اس نے جادو کیا ہے یا اس میں فرشتے کی قوت ہے۔ اس کے بعد ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عمر رضی اللہ عنہ کو بلایا اور پھر قیس بن عبادہ انصاری رضی اللہ عنہ کو اس چکی کے پاٹ جدا کرنے کے لیے بلایا مگر قیس سے بھی جدا نہ ہو سکا اور خالد رضی اللہ عنہ اسی حالت سے کہ پاٹ ان کی گردن میں پڑا ہوا تھا مدتوں تک مدینے میں پھرتے رہے چند روز کے بعد پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ابھی سفر سے آئے ہیں اور ان کی پیشانی سے پسینہ ٹپک رہا ہے اور چہرہ سرخ ہے۔ یہ سن کر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اقرع بن سراقہ بابلی کو اور اشوش بن اشجع ثقفی کو بھیجا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہمارے پاس مسجد میں بلا لاؤ۔ وہ دونوں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور پیام دیا کہ ابو بکر تم کو ایک خاص امر کے لیے بلاتے ہیں جس کے سبب سے ان کو رنج ہے، وہ چاہتے ہیں کہ آپ مسجد نبوی میں ان کے پاس چلیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا۔ انہوں نے کہا کہ آپ اس کا کچھ جواب نہیں دیتے جس کے لیے ہم آئے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تمہارا برا طریقہ ہے، مسافر پہلے اپنے مکان کو جاتا ہے پھر کسی سے ملتا ملاتا ہے۔ بہر حال وہ دونوں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس سے لوٹ آئے اور پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ ایک جماعت کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مکان پر گئے، ان میں خالد بن ولید بھی تھے۔ ان کو دیکھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے ابوسلیمان! تمہاری گردن میں کیا عمدہ ہار ہے۔ اور پھر ان دونوں میں دیر تک کدورت آمیز گفتگو ہوتی رہی۔ تب ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم اس لیے نہیں آئے ہیں۔ ہم تم سے کہتے ہیں کہ خالد کی گردن میں سے اس لوہے کو کھول دو اس کے بوجھ سے ان کو تکلیف ہے اور ان کے حلق پر اس کا اثر ہو گیا ہے اور تم نے تو اپنے سینے کی سوزش بجھالی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر میں سینے کی سوزش بجھانا چاہتا تو تلوار میں بیماری کا پورا علاج تھا اور یہ لوہا جو اس کی گردن میں ہے اس کو جدا نہیں کر سکتا اس کو خالد خود جدا کر لیں یا تم لوگ اس کو جدا کر لو۔

بہر حال بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہا اور عامر بن اشجع اور عمارہ رضی اللہ عنہما وغیرہ نے التجائیں کیں، لیکن کسی کا کہنا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نہ مانا اور آخر میں ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ خدا کے واسطے اور اپنے بھائی مصطفیٰ رسول اللہ ﷺ کے واسطے خالد پر رحم کر کے یہ لوہا علیحدہ کر دو۔ جب اس طرح پر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے درخواست کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ شرمندہ ہو گئے، کیونکہ ان میں حیا بہت تھی، تب خالد کو اپنی طرف کھینچا اور اس طوق کا ٹکڑا توڑ کر اپنے ہاتھ پر لپیٹتے جاتے تھے وہ موم کی طرح لپٹتا جاتا تھا، پہلے ٹکڑے کو انہوں نے خالد کے سر پر مارا اور پھر دوسرے کو جب ان کے سر پر مارا تو خالد نے کہا یا امیر المؤمنین، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تو نے اس لفظ کو ناخوشی سے کہا ہے، اگر تو اس کو نہ کہتا تو میں تیسرے ٹکڑے کو تیرے نیچے سے نکالتا اور وہ ایسے ہی لوہے کو برابر توڑتے رہے یہاں تک کہ سب کو کھول دیا۔ سب حاضرین تکبیر اور تہلیل کرنے لگے اور ان کی قوت سے سب کو تعجب ہوا۔

ایک اور موقع پر غالب علی کل غالب، مطلوب کل طالب، امیر البربرۃ، قاتل الکفرۃ، شیر خدا، علی المرتضیٰ نے وصیت کے خلاف اپنے چچا عباس رضی اللہ عنہ کی حمایت میں اپنی ہاشمی قوت اور قریشی دبدبہ دکھایا اور تلوار لے کر قتل و جہاد پر مستعد ہو گئے اور یہ وہ موقع ہے جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے مکان کا پرنا لہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نکلوا دیا ❶ اس لیے کہ جب وہ جمعہ کی نماز کو

❶ یہ روایت عماد الاسلام میں اس طور پر لکھی ہے: فلما كان بعد ايام دخل عليه الباس فقال يا رسول الله قد علمت ما بيني وبينك من القرابة والراحم الماسة وانا ممن يدين الله بطاعتك فاسأل الله تعالى ان جعل لي بابا الى المسجد اشرف به علي من سواي فقال ﷺ يا عم ليس لي الى ذلك سبيل قال فميز ابا يكون من داري الى المسجد اشرف به الى القريب والبعيد فسكت النبي ﷺ وكان كثير الحياء لا يذري ما يعيد من الجواب خوف من اللع تعالى وحياء من عمه فحبط جبريل في اطلال علي النبي و قد علم الله نبيه ما في نفسه من ذلك فقال يا محمد ان الله يامر ان تجيب سوال عمك و امر ان تنصب له ميزاباً الى المسجد كما اراد فقد علمت ما في نفسك و قد اجبت الى ذلك كرامة لك و نعمة مني عليك و علي عمك العباس فكبر النبي ﷺ و قال ابي الله الا كرامتكم يا بني هاشم و تفضلكم علي الخلق اجمعين ثم قام و معه جماعة من الصحابة و العباس بين يديه حتى صار علي سطح بيت العباس فنصب له ميزاباً الى المسجد و قال معاشر المسلمين ان الله قد شرف عمي العباس بهذا

جایا کرتے تو اس پر نالے کے پانی سے ان کے کپڑے خراب ہو جاتے حالانکہ یہ پر نالہ بحکم خدا خاص آنحضرت ﷺ نے لگا دیا تھا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ عمر نے اس پر نالے کو اکھڑوایا ہے اور یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اگر کوئی پھر اسے لگائے گا تو میں اس کی گردن مار دوں گا۔ وہ اپنے دونوں بیٹوں عبداللہ اور عبید اللہ پر تکیہ کیے ہوئے بیماری کی حالت

﴿﴾ المیزاب فلا توذوننی فی عمی فانہ بقیة الالباء والاحداد فلعن اللہ من آذانی فی عمی اوبخسه حقہ اوعان علیہ و لم یزل المیزاب علی مدة ایام النبی ﷺ و خلافة ابی بکر و ثلاث سنین من خلافة عمر بن الخطاب فلما کان فی بعض الایام و عمک العباس و مرض مرضاً شديداً و صعدت الجارية تغسل قميصه فجر الماء من المیزاب الی صحن المسجد فانال بعض الماء ثوبه مرقتہ الرجل فغضب غضباً شديداً و قال لغلामه اصعد و اقلع المیزاب فصعد الغلام فقلعه و رمی به الی سطح العباس و قال واللہ لئن رده احد الی مکانہ لاضر بن عنقه فشق ذالک علی العباس و دعی بولديه عبداللہ و عبیداللہ و نهض یمشی متوکیا علیہما و هو یرتعد من شدة المرض و سارحتی دخل علی امیر المومنین فلما نظر الیہ امیر المومنین انزبح لذلک و قال یا عم ما جاء بک و انت علی هذه الحالة فقص علیہ القصة و ما فعل معہ عمر من قلع المیزاب و تهدده لمن یعبده الی مکانہ و قال له یا بن اخی انه قد کان لی عینان انظر بهما فمضت احدیہما و هی رسول اللہ ﷺ و بقیت الاخری و هی انت یا علی و ما انی اظلم و یزول ماشر فنی به رسول اللہ ﷺ و انت لی فانظر فی امری فقال له یا عم ارجع الی بیتک فترى ما یسرك اللہ ان شالہ تعالیٰ ثم نادى یا قنبر علی بذی الفقار فتقلده ثم خرج الی المسجد و الناس حوله و قال یا قنبر اصعد و رد المیزاب الی مکانہ فصعد قنبر فردہ الی موضعه و قال علی و حق صاحب هذا القبر و المنبر لئن قلعه قالع لاضر بن عنقه و عنق الامر له بذالک و اصلبته فی الشمس حتی ینفذا و ابلغ ذلک عمر بن الخطاب فنهض و دخل المسجد و نظر الی المیزاب و هو فی موضعه فقال لا یغضب احد ابا الحسن فیما فعله و تکفر عنه عن الیمین فلما کان من الغداة مضی علی بن ابی طالب الی عمہ العباس فقال له کیف اصبحت یا عم قال بافضل النعمة ماد مت لی یا ابن اخی فقال له یا عم طب نفسک و قرعیناً فواللہ لو خاصمنی اهل الارض فی المیزاب لخصمتهم ثم لقتلتهم بحول اللہ و قوته و لاینا لك ضم و غم فقال العباس فقبل بین یمینہ و قال یا ابن اخی ما خاب من انت ناصرہ فكان هذا فعل عمر بالعباس عم رسول اللہ ﷺ و قد قال فی غیر موطن و صیة منه فی عمہ ان عمی العباس بقیة الالباء والاحداد دفا حفظونی فیہ کل فی کنفی و انا فی کنف عمی العباس فمن آذاه فقد آذانی و من عاداه فقد عادانی فسلمہ سلمی و حربہ حربی و قد آذاه عمر فی ثلاث موطن ظاهرة غیر خفية منها قصة المیزاب و لولا خوفہ من علی علیہ السلام لم یرکہ علی حالہ۔ انتهى بلفظه، ازالة الغین۔

میں لرزتے کانپتے حضرت امیر کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ میں دو آنکھیں رکھتا تھا، ایک تو جاتی رہی، یعنی پیغمبرؐ اور دوسری باقی ہے، یعنی تم۔ اور میں نہیں گمان کرتا کہ تمہاری زندگی میں، میں مصیبت میں پڑوں۔ جناب امیر نے فرمایا کہ آپ آرام سے گھر میں تشریف رکھئے اور دیکھتے رہیے کہ کیا ہوتا ہے، یہ کہہ کر آپ نے قنبر کو حکم دیا کہ اے قنبر! ذوالفقار حاضر کرو، اور آپ ذوالفقار جمائل فرما کر اور چند آدمیوں کو اپنے ساتھ لے کر مسجد میں تشریف لائے اور قنبر کو حکم دیا کہ اے قنبر چڑھ جاؤ اور میزاب (پرنا لے) کو اپنی جگہ پر لگا دو، قنبر نے ایسا ہی کیا اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قسم کھاتا ہوں صاحب قبر و منبر، یعنی رسول خدا ﷺ کی کہ اگر کسی نے اس پرنا لے کر پھر اپنی جگہ سے نکالا تو میں اس کی اور حکم دینے والے کی گردن مار دوں گا اور جلتی ہوئی دھوپ میں صلیب پر چڑھا دوں گا۔ یہ خبر عمر کو پہنچی وہ مسجد میں آئے اور دیکھا کہ میزاب پھر اپنی جگہ پر لگا ہوا ہے مگر دیکھ کر کچھ نہ کر سکے اور ڈر کے مارے صرف یہ کہنے لگے کہ خدا نہ کرے کہ کوئی ابوالحسن کو غصہ میں لائے۔ صبح کے وقت امیر المؤمنین نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آج کیسی گزری؟ انہوں نے جواب دیا کہ جب تک تم زندہ ہو میں چین و آرام سے ہوں۔ اس پر جناب امیر نے فرمایا کہ اے چچا، قسم ہے خدا کی! اگر تمام اہل زمین اس میزاب کے معاملے میں مجھ سے جھگڑا کریں تو میں سب کا مقابلہ کروں اور سب کو ماروں۔ آپ بے فکر رہیے، حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آپ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور کہا کہ جس کے تم مددگار ہو اسے کیا غم ہے۔

ایک اور واقعہ بیان کیا جاتا ہے جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے و مقاتلے کے لیے آمادہ ہونا بیان کیا گیا ہے کہ جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہو گیا ❶ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ

❶ یہ مضمون ناسخ التواریخ جلد ۱۴ حالات حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا مطبوعہ بمبئی کے صفحہ ۱۴۱ میں اس طرح پر لکھا ہے: بامداد ابو بکر و عمرو گروہے از مهاجر و انصار بردر سرائے علی حاضر شدند تا بر فاطمہ نماز گزارند مقداد بن اسود گفت فاطمہ رادوش با خاک سپردند عمر روئے بابو بکر آورد الم اقل لك انهم سيفعلون ذالك گفت نگفتم چنین خواهند کرد عباس گفت فاطمہ وصیت کرد کہ شما بروے نماز نہ گزارید فقال عمر لا تتر کون یابنی هاشم حسد کم القدیم لنا ابدًا ان هذه الضغائن التي فی

نے رات ہی میں آپ کو دفن کر دیا۔ اس کی صبح کو ابو بکر و عمر اور کچھ مہاجرین و انصار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مکان پر آئے تاکہ جنازہ کی نماز پڑھیں، مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ فاطمہ کو کل رات ہی دفن کر دیا۔ عمر نے ابو بکر کی طرف منہ کر کے کہا کہ ((الم اقل لك انهم سيفعلون ذلك)) کہ میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ یہ ایسا ہی کریں گے۔ عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وصیت یہی تھی کہ تم ان پر نماز نہ پڑھو۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے

﴿﴿﴿ صدور کم لن تذهب والله لقد همت ان ابنشها فاصلى عليها فقال على والله لورمت ذلك يابن صهاك لارجعت اليك يميناك لئن سللت سيفي لا اغمده دون از هاق نفسك، عمر گفت اے بنی ہاشم ایس حقد دیرینہ کہ از مادر خاطر دارید ہرگز ترک نخواہید کرد و این کبد و کینہ کہ در سینہ نہفتہ دارید ہیچ گاہ بیرون نخواہید گذاشت سو گند باخداے اگر بخوام اور از قبر بر آرام و بروے نماز گزارم، علی گفت اے پسر صهاک سو گند باخداے اگر این قصد کنی دست راست تو باتو باز نہ گردد چہ اگر شمشیر برانگیزم تا خون تو نیزم جائے در غلاف ندم عمر دانست کہ علی سو گند خویش راراست کندم فرو بست۔ در خبر است کہ مہاجر و انصار در بقیع غرقد انجمن شدند و چہل قبر یافتند کہ ہمگان ہمائد بودند و قبر فاطمہ شناختہ نمی شد از مردمان نالہ و نحیب بر آمد و یک دیگر را مورد ملامت ساختند و بسرزنش و شناخت گرفتند و گفتند پیغمبر شما جز دخترے مخلف نگذاشت و او بمرد و مدفون گشت و حاضر نشدید و نماز بروے نگذاشتید و قبر اور انشناختید چہ بے حمیت مردم کہ شمائد بعضے از بزرگان قوم گفتند زنان مسلمین حاضر نداین قبور رابنش می کنند چند کہ فاطمہ رادریا بند انگاہ بروے نمازی کنیم و دیگر باو بخاک سپاریم و قبر او شناختہ میگردد این خبر با امیر المومنین بردند آنحضرت چون شیر خشمناک از خانہ بیرون شد چشمہائے مبارکش گونه طیر خون دہاشت در گہائے و در جشن و آگندہ از خون بود و جامہ اصغر کہ خاص روز مقاتلہ و یوم کریہ بود در برداشت با حمائل ذوالفقار طی طریق می فرمودند تادر بقیع در آمد مردمان یک دیگر راہمی آنها نمودند کہ اینک علی بن ابی طالب ست کہ باین صفت می نگرید درمی رسد و سو گند یاد می کند کہ اگر کسے این قبور سنگی راجنبش می دہد این جماعت راتا بر آخر باتیغ درمی گزارنم این وقت عمر با گروہے آنحضرت رادیدار کرد وقال له مالک یا ابالحسن والله انبش قبرها و نصلین علیها، فضرب علی بیده الی جوامع ثوبہ فہزه ثم ضرب به الارض وقال له یابن اسودا ما حقی فقد ترکتہ مخافت ان یرتد الناس عن دینہم داما قبر فاطمہ فوالذی نفس علی بیدہ لئن رمت و اصحابک بشئ من ذالک لاسقینا الارض من دماء کم فان شئت فاعرض یا عمر فتلقاه ابو بکر فقال یا ابالحسن بحق رسول الله و بحق من فوق العرش الاخلبت عنه فانا غیر فاعلین شیئا تکرہہ۔

بنی ہاشم! اپنے پرانے کینے تم نہیں چھوڑتے قسم خدا کی اگر ہم چاہیں تو قبر سے نکال کر فاطمہ رضی اللہ عنہا پر نماز پڑھیں یہ سن کر اسد اللہ غضب میں آئے اور فرمانے لگے کہ اے پسر ضحاک، قسم ہے خدا کی! اگر تم ایسا ارادہ کرو تو پھر تم اپنے آپ کو نہ پاؤ اس لیے کہ اگر میں تلوار نکالوں تو جب تک تمہارا خون نہ بہا لوں پھر اسے میان میں نہ کروں۔ عمر رضی اللہ عنہ یہ سمجھ کر کہ علی رضی اللہ عنہ اپنی قسم ضرور پوری کریں گے چپ ہو گئے اور کچھ نہ بولے۔ اور اسی خبر کو دوسرے طور پر یوں لکھا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دفن کر دیا تو مہاجرین و انصار بقیع میں گئے وہاں چالیس قبریں ایک قسم کی پائیں اور ان میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی قبر پہچانی نہ جاتی تھی۔ اس میں بعض کہنے لگے کہ ہم ان سب قبروں کو کھود کر فاطمہ رضی اللہ عنہا کی نعش باہر نکالیں گے اور نماز پڑھیں گے۔ جب یہ خبر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو آپ مثل شیر خشم ناک گھر میں سے آئے، آپ کی آنکھیں غصے سے سرخ تھیں اور گردن کی رگوں پر خون۔ اور وہ زرد جامہ کہ خاص لڑائی کے دن آپ پہنا کرتے تھے، پہنے ہوئے اور ذوالفقار جمائل کیے ہوئے بقیع میں تشریف لائے۔ لوگوں نے یہ حالت دیکھ کر ایک دوسرے سے کہا کہ دیکھتے ہو کس جوش اور کس حالت سے علی آرہے ہیں اور قسم کھالی ہے کہ اگر کسی نے ایک پتھر بھی قبر سے اٹھایا تو تمام جماعت کو از اول تا آخر قتل کر دوں گا۔ پھر جب عمر رضی اللہ عنہ مع اور لوگوں کے آپ کے سامنے آئے تو عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یا ابوالحسن! آپ کو کیا ہو گیا ہے، ہم تو فاطمہ کو قبر سے نکال کر جنازہ کی نماز ضرور پڑھیں گے۔ آپ نے یہ سن کر عمر رضی اللہ عنہ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ان کے کپڑے پکڑ کر ان کو ایسی جنبش دی کہ وہ زمین پر گر پڑے اور زمین پر گرا کر آپ نے کہا کہ اے سیاہ لونڈی کے بچے! خلافت جو میرا حق تھا تم نے لے لیا اور میں کچھ نہ بولا اس خیال سے کہ لوگ مرتد ہو جائیں گے اور دین سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے، لیکن قسم ہے اس کی جس کے قبضے میں علی کی جان ہے! اگر تم نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کی قبر کھودنے کا ارادہ کیا تو زمین کو تم لوگوں کے خون سے سیراب کر دوں گا۔ اب اگر چاہتے ہو تو آگے بڑھو اور قبر کو ہاتھ لگاؤ۔ اس پر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر آپ کو قسم دلائی کہ اے ابوالحسن! آپ کو رسول خدا ﷺ اور عرش کے پیدا کرنے والے کی قسم ہے عمر کو

چھوڑ دیجئے، ہم کوئی کام ایسا نہ کریں گے جو آپ کو ناگوار خاطر ہو۔ اس پر جناب امیر نے ان کو چھوڑ دیا اور لوگ چلے گئے اور علی اپنے گھر کو تشریف لے آئے۔

یہ روایتیں اگرچہ جناب امیر المؤمنین کی شجاعت و ہمت اور غیرت و حمیت اور اسد اللہی کی شان کے مطابق ہیں اور اس سے آپ کا سطوت و جلال بلاشبہ ثابت ہوتا ہے لیکن اسی کے ساتھ خدا کا بھیجا ہوا وصیت نامہ **هَبَاءً اَمْنُشُورًا** ہوا ہو جاتا ہے اور وہ اقرار اور عہد جو جناب امیر نے رسول خدا سے کیا تھا اور جس پر جبرئیل و میکائیل اور ملائکہ مقررین کی گواہی ہوئی تھی کہ میں صبر کروں گا اگرچہ میری حرمت کو ہتک کریں، اور میرا ننگ و ناموس برباد ہو، اور خانہ کعبہ خراب کیا جائے، باطل ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ گوان مواقع پر جہاں عقلاً و شرعاً غیظ و غضب ظاہر کرنے کی ضرورت تھی آپ نے ایسا تحمل فرمایا جو انسانی طاقت سے باہر ہے مگر دوسرے موقعوں پر جو بمقابل اس کے نہایت ہی خفیف تھے آپ نے ایسی اسد اللہی دکھائی کہ زمین و آسمان پر لرزہ پڑ گیا اور تمام مہاجرین و انصار کانپ اٹھے اور فقط غیظ و غضب کا اظہار ہی نہیں کیا بلکہ بعض موقعے پر ذوالفقار کے جوہر دکھانے اور خون بہانے سے بھی دریغ نہیں فرمایا۔

یہ مختلف حالتیں جناب امیر کی جو مختلف روایتوں سے شیعوں کی پائی جاتی ہیں، ہماری انسانی سمجھ سے باہر ہیں۔ درحقیقت یہ ان اسرار امامت سے ہیں جن کو نہ فرشتے سمجھ سکے نہ انبیاء اولوالعزم، پھر دوسرے لوگ کیونکر سمجھ سکتے ہیں۔ ہم اگر کچھ سمجھ سکتے ہیں تو صرف یہ کہ یہ روایتیں محض بے بنیاد ہیں اور ہر موقع اور ہر محل کے مناسب بنائی گئی ہیں اور الف لیلیٰ کی کہانیوں اور امیر حمزہ کی داستانوں سے کچھ کم نہیں ہیں اور اگر عقل کو ذرا بھی دخل دیا جائے تو خدا اور اس کے رسول اور ائمہ کی شان سے یہ تمام باتیں نہایت بعید معلوم ہوتی ہیں اور ہرگز قیاس میں نہیں آتا کہ جس خدا نے پیغمبر خدا ﷺ کو تبلیغ رسالت کے لیے مامور فرمایا ہو اور جس نے صیانت اسلام اور حفاظت مسلمین کے لیے سیف و سنان سے کام لینے کا حکم دیا ہو وہ خلیفہ بلا فصل اور وصی رسول اور ابوالائمہ اور اسد اللہ کو تاکید پر تاکید کرے کہ خلفاء کی مخالفت

نہ کرنا اور وہ کیسے ہی ظلم و ستم کریں یہاں تک کہ اہل بیت نبوی کے ناموس برباد کریں، خانہ کعبہ کو ڈھادیں، قرآن کو پارہ پارہ کریں مگر چوں نہ کرنا۔ اول تو اسلام کے اصول اور خدا کی عام ہدایتوں اور رسول خدا کے طرز عمل اور امامت کے مقصود سے اس وصیت کو کچھ مناسبت معلوم نہیں ہوتی، بلکہ یہ وصیت سراسر اس کے مخالف پائی جاتی ہے۔ اور بالفرض یہ وصیت صحیح ہو اور جس شان سے اور جس اہتمام سے وصیت نامہ بھیجا گیا کہ جبرئیل علیہ السلام پر بھی خدا نے اطمینان نہ کیا شاید یہ خیال ہو کہ وہ کچھ بدل نہ دیں لکھا یا عرش سے نازل کیا اور اس لیے کہ کوئی کھول نہ لے اور قرآن کی طرح اس میں تحریف نہ کر دے، اس پر مہریں بھی جنت کی لگائی گئیں اور ملائکہ مقربین حفاظت کے لیے اس کے ساتھ کیے گئے اور پیش کرنے کے وقت سوائے وصی رسول کے تمام لوگ خواہ وہ اہل بیت ہی میں سے ہوں ہٹا دیے گئے اور بجز علی رضی اللہ عنہ کے کوئی حاضر نہ رکھا گیا، اور پھر اس کی تمہید ایسے لفظوں سے جبرئیل امین نے شروع کی کہ رسول خدا کانپ اٹھے اور ایک ایک جوڑ آپ کے بدن کا ہلنے لگا اور پھر جب علی مرتضیٰ وصی رسول اور شیر خدا نے اسے سنا تو مارے دہشت اور خوف کے زمین پر گر پڑے اور بیہوش ہو گئے۔ اور خداوند تعالیٰ کو اس وصیت نامے کی شدت اور سختی اور غیر ممکن التعمیل ہونے پر خود اس قدر خیال تھا کہ فقط رسول خدا کا کہہ دینا اور جناب امیر کا اقرار کر لینا کافی نہ سمجھا بلکہ جبرئیل و میکائیل اور ملائکہ مقربین کی اس پر شہادت لی اور بغیر شہادت لیے اس اقرار کے وفا کرنے کے عہد کو کافی نہ خیال کیا جبکہ ایسے اہتمام سے اس وصیت نامہ پر عہد لیا گیا، اس کی تعمیل غصب فدک اور غصب خلافت پر محدود رہی اور دیگر مواقع پر اس کا کچھ خیال نہ رکھا گیا نہ وہ عہد پورا کیا گیا۔ یہ عہد تو ایسا سخت تھا کہ غصہ کرنے کی بھی اجازت نہ تھی اور بڑے سے بڑے واقعات پر چون و چرا کرنے کی ممانعت تھی، مگر کس آسانی سے اس کے خلاف کرنا اور اس عہد کا توڑنا بیان کیا جاتا ہے، خفیف سے خفیف معاملات پر نہ صرف اظہار غیظ و غضب پر جناب امیر نے کفایت فرمائی بلکہ ذوالفقار علی سے بھی کام لیا اور کام لینے کا ڈر دکھایا اور ان عہود و مواثیق کا جن پر ملائکہ عرش بریں کی شہادت تھی کچھ خیال نہ کیا۔

انسوس ہے کہ اس قسم کی روایتیں بیان کرنے اور ہر موقع کے لیے ایک روایت گھڑ لینے سے بجز مذہب کی ہنسی کرانے اور خدا اور رسول پر تہمت لگانے کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اور ان روایتوں کا تناقض اور اختلاف ان کا کذب اس طرح پر ظاہر کر دیتا ہے کہ دوسرے کو اس کی تردید اور تکذیب کی وجہ پیش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

پھر یہ بات بھی خیال میں نہیں آتی کہ اس وصیت نامے کا مضمون کلا یا جزءاً کیسے ظاہر ہوا اور کس طرح راویوں کو معلوم ہوا کہ اس مہری اور دستخطی وصیت نامہ کا یہ مضمون تھا جو اوپر بیان کیا گیا۔ اس کے مضمون کا افشاء کرنا بدعہدی تھا اور اس لیے یہ نہیں مانا جاسکتا کہ ائمہ نے کسی سے اس کا ذکر کیا ہو۔ اس لیے کہ جیسا کہ روایت مذکورہ بالا سے معلوم ہوا یہ وصیت نامہ ایک راز سر بستہ تھی اور اس کے پوشیدہ رکھنے اور کسی پر ظاہر نہ ہونے کے لیے خدا کی طرف سے خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ اول یہ کہ وہ لکھا ہوا تھا اور سوائے خدا کے کوئی دوسرا اس کا لکھنے والا نہ تھا، دوسرے سر بمہر تھا اور گوجر نیل امین اور ملائکہ مقررین اسے لائے اور کوئی اندیشہ اس کے مضمون کے ظاہر ہونے کا نہ تھا جس کے لیے مہر کی ضرورت ہوتی مگر مزید احتیاط سے اس پر جنت کی مہر لگائی گئی تھی اور پھر جب جبرئیل امین رسول خدا کے پاس پہنچے تو سب کو ہٹا دیا اور خدا کی طرف سے اول یہی حکم سنایا کہ سوائے علی رضی اللہ عنہ کے اور کوئی نہ رہنے پائے، البتہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پس پردہ بیٹھی ہوئی تھیں اور ان سے بھی آخر یہ عہد لیا گیا تھا۔ جب ایسی پوشیدہ کاروائی اس وصیت نامے کے متعلق کی گئی تو اس وصیت نامے کا مضمون کس نے فاش کیا اور حضرات امامیہ تک کیسے پہنچا۔ جناب امیر یا فاطمہ رضی اللہ عنہا یا حسین رضی اللہ عنہ کی نسبت تو کوئی خیال بھی نہیں کر سکتا کہ وہ ایسے سر مکتوم اور وصیت مختوم کو کسی پر ظاہر کر دیں۔ اور ان کے بعد یہ وصیت نامہ صرف ائمہ کرام کے ہاتھ میں رہا، وہ بھی اس کے اخفاء پر ویسے ہی مامور تھے، جیسا کہ جناب امیر۔ پھر امام موسیٰ کاظمؑ یا امام جعفر صادقؑ نے کسی شخص سے گو وہ ان کے شیعیان خالص میں سے ہی کیوں نہ ہو کس طرح ظاہر کیا اور کیونکر ایسی عہد شکنی گوارا کی۔

غرض کہ یہ روایت ایسی لطیف اور دل کش اور دل خوش کن ہے کہ اس کے جس پہلو کو

دیکھئے عجیب تماشا نظر آتا ہے اور جس بات پر نظر کیجئے تعجب انگیز معلوم ہوتی ہے۔

جناب امیر نے جس طرح پر اس وصیت نامے پر عمل کیا اس کا حال تو ناظرین کو معلوم ہو گیا اب سنئے کہ جناب سیدہ نے کہ وہ بھی اس کے عمل کرنے پر مامور تھیں کس طرح تعمیل کی۔ اس کا حال یہ ہے کہ کافی میں عبداللہ بن محمد جعفی^۱ نے امام باقر اور امام جعفر صادق سے روایت کی کہ ان دونوں اماموں نے فرمایا: ”جب ہوا جو کچھ ہونے والا تھا تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے عمر کا گریبان پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور کہا کہ اے ابن خطاب، واللہ! اگر مجھ کو یہ پسند نہ ہوتا کہ بے گناہ بھی مصیبت میں پڑ جائیں گے تو میں خوب جانتی ہوں کہ اگر خدا پر قسم کھا بیٹھوں گی تو وہ میری دعا فوراً قبول کرے گا۔“ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف اس خیال سے کہ بے گناہ بھی عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بددعا نہیں کی۔ مگر صبر کے درجے پر بھی قدم ثابت نہیں رکھا، اس لیے کہ غیر محرم کا گریبان پکڑ کر کھینچنا حضرت سیدہ کی شان سے نہایت بعید ہے اور اسی وجہ سے ہم اس روایت کو غلط کر سکتے ہیں۔

ایک روایت میں اس سے بڑھ کر بیان کیا گیا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا^۲ حسنین رضی اللہ عنہما کا ہاتھ پکڑ کر فریاد کے لیے مرقد مبارک پر پہنچیں۔ حضرت امیر نے سلیمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ جاؤ دختر محمد ﷺ کی خبر لو میں دیکھتا ہوں کہ مدینے کی دیواریں ہلنے لگی ہیں اور اگر وہ بالوں کو کھول اور گریبان کو پھاڑ کر رسول کی قبر پر فریاد کریں گی تو فوراً مدینہ معہ اس کے رہنے والوں کے زمین میں دھنس جائے گا اور لوگوں کو بالکل مہلت نہ ملے گی۔ پس سلیمان رضی اللہ عنہ فوراً ان کے پاس پہنچے اور کہنے لگے کہ حضرت امیر نے فرمایا ہے کہ آپ واپس جائیں اور صبر کریں اور اس امت پر عذاب کا باعث نہ بنیں۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اگر انہوں نے کہا ہے تو اچھا میں لوٹ جاتی ہوں اور صبر کروں گی۔ اور ایک دوسری روایت میں حضرت امام جعفر صادق سے یہ

۱ اصول کافی صفحہ ۲۱۹ مطبوعہ نولکشور ۱۳۰۲ھ یا ابن خطاب لولانی اکرہ ان یصیب البلاء

لا اذنب له لعلمت انی ساقسم علی اللہ ثم اجدہ سریعۃ الاجابۃ۔

۲ یہ روایت حق الیقین میں ہے جو چاہے اصل سے مقابلہ کرے ضرورت نقل اصل عبارت کی معلوم نہ ہوئی۔

منقول ہے کہ جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بال کھولنے کا ارادہ کیا تو سلمان کہتے ہیں کہ میں ان کے پاس موجود تھا اور بخدا میں نے دیکھا کہ مسجد کی دیواریں جڑ سے اکھڑ گئیں اور اتنی اونچی ہو گئیں کہ ان کے نیچے سے آدمی گزر سکتا تھا، پس میں ان کے پاس گیا اور کہا کہ سیدہ من و خاتون من خدا نے تمہارے والد بزرگوار کو جملہ عالم کے لیے رحمت بنایا تھا عذاب کے نزول کا سبب مت بنو۔ اس پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا مسجد کے باہر چلی گئیں اور دیواریں اپنی جگہ پر آ گئیں۔ دیواروں کے بلند ہو جانے اور اپنی جڑ چھوڑ دینے اور پھر اپنی اصلی حالت پر آنے جو خاک اڑی اس کی گرد ہماری ناکوں میں پہنچی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سیدہ نے اپنی طرف سے نہ صبر فرمایا اور نہ وصیت کا کچھ ذکر کیا اور نہ اس کی رعایت کی ترحماً للناس یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کہنے سے یا سلمان رضی اللہ عنہ کے عرض کرنے سے اپنے ارادے سے باز رہیں اور لوگوں کے ہلاک کرنے اور عذاب نازل کرنے کی دعا نہ کی۔ اگر وصیت کی روایت صحیح ہوتی تو جناب سیدہ رضی اللہ عنہا خود ہی صبر فرماتیں اور اس قسم کا ارادہ ہی نہ کرتیں۔ یا وصیت کو یاد کر کے اس ارادے سے باز رہتیں نہ کہ دیگر وجوہ سے۔

علاوہ بریں بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تو صحابہ رضی اللہ عنہم کا ظلم دیکھ کر صبر کر چکے تھے اور محزون اور مظلوم بیٹھے رہتے تھے، مگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کے اس سکوت اور خانہ نشینی کو اپنا حق طلب نہ فرمانے کو پسند نہ کرتی تھیں اور اس پر غصہ کیا کرتیں۔ یہاں تک کہ ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا امیر المومنین سے اس بات پر رنج

① چون آنحضرت راد ستیاری و پامردی نبود دل بر صبر نهاد و محزون و مظلوم بہ نشست يك روز چنان افتاد کہ فاطمہ از تقاعد امیر المومنین و در طلب حق خویش اظهار زجرت می فرمود گاہ بانگ اذان بالا گرفت و مؤذن گفت اشهدان محمد رسول الله فقال لها ايسرك زوال هذا الندء من الارض قالت لا قال فانه لا اقول لك چون بانگ اذان فرار سید و نام رسول خدا گوش زد فاطمہ گشت، علی فرمود دوست داری کہ این نام از زبانها مہجور افتد عرض کرد دوست ندارم فرمود من بیم دارم کہ چون دست بشمشیر کنم یکبارہ مرد ماں مشرک شوند۔ از ناسخ التواریخ صفحہ ۵۲ جلد ۴

کا اظہار کر رہی تھیں کہ یکا یک مؤذن نے اذان دی اور اشہدان محمد رسول اللہ کی آواز سنائی دی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا ایسے رک زوال هذا النداء من الارض قالت لا . قال فانه لا اقول لك کہ کیا آپ اس بات کو پسند کرتی ہیں کہ یہ نام زبان پر نہ آئے اور یہ ندا سنائی نہ دے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا نہیں، تب آپ نے فرمایا کہ اسی کا تو مجھے خوف ہے کہ اگر میں اپنے حق کے لیے مقابلہ اور مقاتلہ کروں تو خوف ہے کہ یکبارگی سب آدمی مشرک ہو جائیں۔

سب سے بڑھ کر جو چیز وصیت کی روایت کو باطل کرتی ہے وہ جناب امیر المومنین کا خطبہ شتشیقیہ ہے۔ اور یہ وہ خطبہ ہے جس کو امامیہ قرآن مجید کے برابر سمجھتے ہیں اور اس کی صحت میں شبہ کرنا گویا قرآن مجید میں شبہ کرنا خیال کرتے ہیں، اس میں حضرت امیر فرماتے ہیں کہ ((اما والله لقد تقمصها فلان وانه ليعلم ان محلى منها محل القطب من الرحي ينحدر عن السيل ولا يرقى الى الطير فسدت دونها ثوبا وطويت عنها كشحاو طفقت ان ارتتى بين ان اصول بيد جذاء و اصبر على طخية عمياء يهرم فيها الكبير و يشيب فيها الصغير و يكدح فيها مومن حتى يلقي ربه فرأيت ان الصبر على هاتالا حجي فصبرت و فى العين قذى و فى الحلق شجى .))..... جس کا ما حاصل یہ ہے کہ جب ابو بکر رضی اللہ عنہ نے خلافت لے لی باوجودیکہ وہ خوف جانتے تھے کہ نظام خلافت کا مدار مجھ پر ہے اور تمام علوم اور حکمتیں اور تدبیرات اور تصرفات مجھ سے خلق پر ایسے نازل ہوتے ہیں جس طرح کسی بلند پہاڑ سے پانی گرتا ہو، میرے کمالات کو کوئی نہیں پہنچ سکتا اور اس کی طلب سے ہاتھ کھینچا اور اس کی طرف التفات نہ کیا کیونکہ میں نے اس معاملہ میں خوف فکر کی اور اچھی طرح اس پر غور کیا کہ دو کاموں میں سے مجھے ایک کام کرنا چاہیے یا تو کٹے ہوئے ہاتھ سے حملہ کرنا، یعنی بے معاون و ناصر کے ان سے مقابلہ کرنا یا صبر و شکیبائی اختیار کر کے چپ رہ جانا۔ اور صبر بھی اس تاریکی کی حالت پر جس میں امور خلافت مشتبہ ہو رہے ہوں اور لوگ قعر ضلالت میں مثل

اندھوں کے گر رہے ہوں۔ اور نیز ایسے زمانے تک کہ جس میں جوان بوڑھا اور بچہ جوان ہو جائے اور مومن رنج و مصیبت اٹھاتا رہے یہاں تک کہ اپنے خدا سے ملے۔ ان دور ایوں پر جب میں نے غور کیا تو مجھے بھی مناسب معلوم ہوا کہ اس شدت و ظلمت میں صبر کرنا قرین عقل ہے۔ اس لیے میں نے صبر کیا اور منازعت اور محاربے کو چھوڑا حالانکہ میری آنکھوں میں خار کھٹکتا تھا اور یہ حالت دیکھ کر میرا عیش منغض ہوتا تھا۔

علامہ فتح اللہ شرح فارسی نہج البلاغہ میں فسدت دونہا ثوباً اور اس کے بعد کے فقروں کے ترجمہ اور شرح میں لکھتے ہیں:

پس فرو گذاشتم نزد آن خلافت جامہ صبر را و دست از طلب آن باز داشتم و در نور دیدم ازاں تھی گاہ را و بیک جانب شدم یعنی اعراض نمودم ازاں و اصلاً التفات بجانب او نکردم و در ایستادم بفکر کردن در امر خود و جولان دادن فکر میان آنکہ حملہ آرام بدست بریدہ۔ این کنایہ ست از عدم معاون و ناصر چہ در ملازمت او بیش ازد و از دہ کس نبودند۔ یا صبر نمایم و شکیبائی پیشہ کنم بر ظلمتے کہ متصف بصف کوری ست۔ و این کنایہ ست از شدت التباس در امور خلافت کہ خلق بآن مہتدی نمیشوند بحق و ابواسطہ آن در وادی ضلالت می افتند مثل کوری کہ بآن راہ نبرند و در چاہ ہلاکت افتند و آن چنان ظلمتے کہ بہ نہایت پیری میرسد در آن بزرگ سال و بحال پیری میرسد در آن خورد سال بسبب عدم انتظام امور معاش و تعب و رنج میکشند در آن مومن بجهت سعی و اجتهاد در حصول حق و دفع فساد نمیرسد بآن تا برسد بہ پروردگار خود و چون حال بریں

منوال بود پس دیدم کہ صبر کردن دریں شدت ظلمت اقرب
ست بعقل واولی والیق ست بآن بسبب انتظام اسلام
بواسطہ عدم معاون و کثرت معاند پس صبر کردم و ترک
منازعت و محاربه نمودم در حالتی کہ در چشم من خاشاک
بود و غبارازان ایذامی یافتم و متاذی می شدم و درگلو
ستخوان گرفته بود کہ ازان منغض بود عیش من این هر دو
فقرہ کنایت انداز شدت غصہ و غم و مرارت صبر و الم .
.....انتہی بلفظہ .

”خلافت اول میں میں نے جامہ صبر پہن لیا اور مطالبہ سے ہاتھ کھینچ لیا اور ادھر
التفات نہ کر کے ایک جانب ہو بیٹھا اور ادھر سے اعراض کر کے اس جانب
بالکل توجہ نہ دی اور غور و خوض کیا کہ کٹے ہوئے ہاتھ سے حملہ کیا جائے جبکہ میرا
کوئی ہمدرد و مددگار نہیں ہے اور اس وقت آپ کے پاس بارہ آدمیوں سے زیادہ
نہ تھے یا پھر یہ کروں کہ صبر و شکیبائی اختیار کروں اس ظلمت پہ جس میں تاریکی
ہے اور یہ کناہیہ ہے اس کیفیت کا کہ اس تاریک حالت میں جنگ کرنے کی
بہ نسبت صبر کروں جس میں امور خلافت مشتبہ ہو رہے ہیں اور ان سے مخلوق کو
ہدایت حاصل نہ ہوگی اور لوگ وادی گمراہی میں رہ کر ہلاکت کے گڑھے میں
گر رہے ہوں اور یہ تاریکی کا زمانہ اتنا طویل نظر آ رہا ہے کہ اقتصادی بد حالی اور
خراب انتظام کے سبب جوان بوڑھے اور بچے جوان ہو جائیں گے رفع فساد و
حصول حق کے لیے مومن کی کوشش کرتے ہوئے اللہ کو پیارے ہو جائیں گے۔ ان
حالات میں یہی مناسب معلوم ہوا کہ اس سخت تاریک دور میں صبر کرنا ہی قرین
عقل و مناسب ہے، اس طرح اسلام کو ٹھیک رکھ سکتا ہوں اور حالت یہ ہے کہ
دوست ندارد اور دشمنوں کی کثرت ہے، اس لیے میں نے صبر کیا جنگ و جدال

نہیں کیا حالانکہ یہ سب امور میری آنکھ میں اس طرح کھٹک رہے تھے جن سے میری زندگی منغض اور برباد تھی۔ یہ دونوں فقرے شدت غم و غصہ اور صبر و رنج کی کیفیات کو بطور کنایہ ظاہر کرتے ہیں۔“

ابن میثم بحرانی و طہفت بین ان اصول کسی شرح میں فرماتے ہیں: ”یریدانی جعلت اجیل الفکر“ یعنی جناب امیر کا مقصود یہ ہے کہ امر خلافت کی تدبیر میں نے اپنی رائے کو دو تفسیروں کے درمیان میں پایا، یا تو یہ کہ جو لوگ میرے سوا امامت کے غاصب ہیں ان سے لڑوں یا امامت کو چھوڑ دوں۔ اور ان دونوں باتوں میں بڑا خطرہ دیکھا، اس لیے کہ کٹے ہوئے ہاتھ سے، یعنی بے معاون و معین کے مقابلہ کرنا جائز نہیں کیونکہ اس میں علاوہ اپنے نفس کو ایذا دینے کے نظام مسلمین کو بے فائدہ تشویش میں ڈالنا ہے، اور اس کو چھوڑ دینے میں حق و باطل کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ اور معاملات کا التباس اور اختلاط میں پڑ جانا اور اس کا دیکھنا نہایت تکلیف دہ ہے۔ پھر آپ نے اپنی ترجیحی رائے کا اظہار دوسرے امر کے اختیار کرنے یعنی امامت سے صبر کرنے اور اس کے چھوڑ دینے پر آپ نے اس قول سے فرمایا کہ امامت پر صبر کرنے کو میں نے زیادہ اچھا خیال کیا اور انتظام اسلام کے لیے زیادہ مناسب جانا تا کہ دین قائم رہے اور اس کے قواعد قانون مستقیم پر جاری رہیں اور امور خلق کا انتظام جو شارعین کا مقصود ہے، بنا رہے۔ اور بے یار و مددگار کے آپ کا لڑنا امامت کے قائم رہنے کے لیے مفید نہ تھا، کیونکہ اگر لڑائی ہوتی تو اس سے مسلمانوں کے امور پر اگندہ ہو جاتے اور ان کی ایک بات بنی نہ رہتی اور ان میں فتنہ و فساد بڑھتا، اس لیے کہ اسلام کی محبت اکثر لوگوں کے دلوں میں راسخ نہ ہوئی تھی اور ابھی وہ حلاوت اسلام سے واقف نہ ہوئے تھے اور منافق اور اعداء اور مشرکین اپنی نہایت قوت کے ساتھ اقطار عالم اور مسلمانوں میں موجود تھے۔ تو باوجود ان حالات کے مشاہدہ کرنے کے امامت کے لیے لڑائی منازعت پر جسارت کرنا کسی طرح ممکن نہ تھا اور صبر کرنا اور امامت کے لیے نہ لڑنا، اگرچہ اس میں بھی آپ کی رائے کے موافق دین کا خلل اور اپنے مقصود کے برخلاف تھا، اس لیے کہ اگر آپ امامت پر قائم ہوتے تو

انتظام و قوام دین پوری طرح پر ہوتا۔ مگر یہ خلل بہ نسبت اس خلل کے جو امامت کے لیے لڑائی کرنے اور آپ کی طلب امامت میں ہوتا کم ہے۔ کیونکہ بعض برائی دوسری برائی سے آسان ہوتی ہے۔

فقط ان الفاظ سے جو جناب امیر نے اس خطبہ میں فرمائے وصیت کی روایت کی پوری پوری تردید ہوتی ہے۔ اس لیے کہ آپ نے مقابلہ اور مقاتلہ سے اس لیے ہاتھ نہیں اٹھایا کہ اس کے نہ کرنے کی وصیت تھی، اور نہ اس خلافت کے معاملے میں آپ کے لیے خدا کی طرف سے کوئی ہدایت تھی، کیونکہ اس خطبہ میں آپ صاف صاف فرماتے ہیں کہ میں نے دونوں پہلو پر نظر کی اور دونوں میں خرابیاں پائیں، مگر ترک منازعت کو زیادہ آسان پایا اور مقابلے میں اسلام کی خرابی دیکھی اور اس لیے آسان تر خرابی، یعنی ترک منازعت کو اختیار کیا۔ پس یہ فیصلہ آپ نے صرف اپنی رائے سے کیا اور جس طرح ایک دانش مند اور دور اندیش، نیک طینت، خیر خواہ خلق اور بے نفس و بے غرض آدمی معاملات کے ہر ایک جانب اور ہر ایک پہلو کو دیکھ کر آسان اور اسہل چیز کو اختیار کرتا ہے، آپ نے بھی ترک مخالفت کو اختیار کیا۔ اگر خدا کا حکم ہوتا اور آپ کے لیے کوئی خاص وصیت خدا کی طرف سے ہوتی تو پھر رائے اور قیاس کو دخل دینے کی نہ ضرورت تھی اور نہ دخل دینا جائز تھا کیونکہ خدا کے حکم اور وصیت میں رائے اور قیاس کا کیا کام ہے۔ پس اس خطبے سے جس کو حضرات امامیہ جناب امیر کا معتبر ترین کلام سمجھتے ہیں اور جس کے کسی ایک لفظ اور ایک حرف میں شک نہیں رکھتے وصیت نامے کی روایت غلط ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا، بلکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گو آپ کی خلافت ہونے سے انتظام دین زیادہ مستحکم ہوتا مگر دوسروں کے خلیفہ ہو جانے سے بھی اسلام کا انتظام قائم رہا اور لوگ مسلمانی پر ثابت قدم رہے اور منافقین اور اعداء اور مشرکین کی قوت کا اثر اسلام پر نہ پڑنے پایا۔

دوسری وجہ جناب امیر کے مقابلہ اور مقاتلہ نہ کرنے اور ہر طرح کے ظلم و ستم سہنے کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ آپ کے اعوان و انصار نہ تھے اور گو کوئی شخص کیسا ہی شجاع، دلیر، باہمت اور باغیرت ہو مگر اس کا ساتھ دینے والے اور اس کی اعانت و مدد کرنے والے لوگ نہ ہوں تو

اس اکیلے سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر جناب امیر کا ساتھ دینے والے اہل بدر کی تعداد کے برابر بھی ہوتے تو آپ بلاشبہ مقابلہ اور مقاتلہ کرتے۔ اور معاون و انصار کے نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تمام مہاجرین و انصار اور سارے اصحاب پیغمبر خدا ﷺ کے وفات پاتے ہی مرتد ہو گئے تھے۔ ملا باقر مجلسی نے بحار الانوار میں بحوالہ رجال کشی امام محمد باقر سے یہ روایت لکھی ہے: ”تمام آدمی بعد نبی کے مرتد ہو گئے سوائے تین شخص اور وہ مقداد بن الاسود، ابوذر غفاری اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہم تھے۔“ ان تین میں عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا نام نہیں ہے، مگر ایک اور روایت میں اخیر کو ان کا نام بھی مرتدین سے خارج کیا گیا ہے۔

ابو بکر جعفری نے امام محمد باقر سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: ”بجز تین شخصوں سلمان، ابوذر و مقداد کے سب مرتد ہو گئے تھے، میں نے کہا کہ عمار کا کیا حال ہوا تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ پہلے انہوں نے حق سے عدول کیا تھا، لیکن پھر حق کی طرف رجوع کر گئے۔ اس کے بعد امام نے فرمایا کہ اگر تو ایسا شخص چاہتا ہے کہ جس نے بالکل شک نہ کیا ہو اور اس کے دل میں کوئی وسوسہ نہ آیا ہو تو صرف مقداد ہیں۔ اور سلیمان رضی اللہ عنہ کے دل میں عارضی یہ بات آئی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس اسم اعظم ہے، اگر وہ اس کو اپنی زبان سے نکال دیں تو سب مخالف زمین میں دھنس جائیں اور یہ بات بھی ٹھیک تھی..... پھر اسی روایت میں آگے چل کر یہ لکھا ہے کہ اس کے بعد ابوساسان انصاری اور ابو عمرہ اور شیبہ تین آدمیوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع کیا..... غرض کہ جن لوگوں نے حضرت امیر کا حق پہچانا وہ سات آدمی تھے۔ (بحار الانوار کتاب الفتن صفحہ ۴۶-۴۷)

عبدالملک بن اعین سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں: ”میں نے امام جعفر صادق سے صحابہ کے ارتداد کے متعلق سوال کرنا شروع کیا اور برابر سوال کرتا رہا یہاں تک کہ میں نے آپ سے کہا کہ اس صورت میں تو سبھی ہلاک ہو گئے۔ امام نے فرمایا کہ ہاں بخدا اے ابن اعین! سب ہلاک ہو گئے۔ میں نے کہا کہ کیا جو شرق کے رہنے والے تھے وہ بھی اور جو عرب کے رہنے والے تھے وہ بھی ہلاک ہوئے؟ آپ نے جواب دیا کہ ہاں خدا کی قسم! سوائے

تین کے سب ہلاک ہو گئے۔ لیکن بعد کو ابوساسان، عمار اور شبیرہ اور ابو عمرہ آملے تھے اور سب مل کر سات شخص ہو گئے تھے۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ابو بکر کی بیعت کے بعد مہاجرین و انصار نے جناب امیر سے بیعت کرنے کی خواہش ظاہر کی مگر ثابت قدم نہ رہے، جیسا کہ ابو بصیر نے امام جعفر صادق سے روایت کی ہے کہ اس کے بعد مہاجرین و انصار حضرت علی کے پاس آئے اور کہا کہ آپ ہی امیر المؤمنین اور خلافت کے مستحق ہیں، آپ ہاتھ بڑھائیے، ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر تم سچے ہو تو کل سر کے بال منڈوا کر میرے پاس آؤ، مگر سوائے سلیمانؓ، مقدادؓ اور ابوذرؓ کے کسی نے بال نہ منڈائے، اور پھر دوسری مرتبہ آئے اور بیعت کرنے کے لیے آمادگی ظاہر کی، پھر حضرت نے وہی فرمایا اور پھر بھی انہوں نے اس کی تعمیل نہ کی۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے حضرت سے پوچھا کہ کیا عمار رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں داخل نہ تھے جنہوں نے حضرت کے حکم کی تعمیل کی تھی؟ فرمایا: نہیں۔ پھر میں نے کہا کہ عمار بھی مرتدین میں داخل ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ وہ اس کے بعد حضرت علی کی طرف سے لڑے۔ اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ گو وہ اس وقت مرتد ہو گئے تھے مگر بعد میں حضرت علی کا ساتھ دینے اور ان کی طرف سے لڑنے کے سبب ان کا ایمان قائم رہا۔

اور کافی میں ابو الہیثم بن تیہان سے روایت ہے کہ امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ نے مدینے میں لوگوں کے سامنے ایک خطبہ پڑھا جس میں حمد کے بعد آنحضرت ﷺ کے فضائل بیان کیے اور یہ فرمایا کہ آپ نے اپنی پیغمبری کا کام پورا کیا اور رہنمائی کے راستے مقرر کیے، اے لوگو! جن کو فریب دیا گیا اور وہ فریب میں آگئے اور فریب دینے والے کے مکر کو پہچان گئے اور جان بوجھ کر اسی پر اڑے رہے اور سوئے نفس کا اتباع کرتے رہے حق ان کے لیے ظاہر ہوا لیکن وہ اس سے باز رہے اور کھلا ہوا راستہ ان کے سامنے تھا اور وہ اس سے پھر گئے۔ اس ذات کی قسم جس نے دانے کو اگایا اور بچے کو پیدا کیا! اگر تم علم کو معدن علم سے حاصل کرتے اور شیریں پانی پیتے اور نیکی کو توقع سے نیکی کا ذخیرہ کرتے اور صاف صاف راستے اختیار کرتے اور کھلے

ہوئے حق کے راستے پر چلتے تو صاف صاف راستے تم پر کھل جاتے اور تمہارے لیے نشانیاں ظاہر ہو جاتیں اور اسلام تمہاری نظر میں روشن ہو جاتا، خوشی اور مزے سے تم کھاتے اور کوئی شخص تم میں سے تنگ حال نہ ہوتا، اور کوئی مسلمان اور وہ شخص جس سے عہد کیا گیا ہوتا ستم رسیدہ نہ ہوتا۔ لیکن تم لوگ ظلم کے راستے پر چلے اس واسطے باوجود فراخی کے دنیا تم پر تاریک ہو گئی اور علم کے دروازے تمہارے سامنے سے بند ہو گئے، تم نے اپنی خواہشوں سے گفتگو نہیں کیں اور اپنے دین میں مختلف ہو گئے، اور بغیر علم کے دین الہی میں فتوے دیے اور کج طبع لوگوں کا تم نے اتباع کیا، انہوں نے تم کو گمراہ کر دیا اور تم نے اماموں کا ساتھ چھوڑا، انہوں نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا۔ تم عنقریب اپنی بوئی ہوئی چیزوں کو قطع کرو گے اور اس کی ناگواری معلوم کرو گے جو تم نے گناہ کیے ان کا ناگوار مزہ چکھو گے۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے دانے کو اگایا اور بچے کو پیدا کیا! بے شک تم جانتے ہو کہ میں تمہارا صاحب اور حاکم اور عالم ہوں، میں وہ شخص ہوں کہ تمہاری نجات میرے علم پر موقوف ہے، تمہارے پیغمبر سرور عالم ﷺ کا وصی ہوں، تمہارے پروردگار نے مجھے منتخب کیا ہے، عنقریب آہستہ آہستہ وہ مصیبتیں تم پر نازل ہوں گی جن کا وعدہ کیا گیا ہے اور پہلی امتوں پر وہ نازل ہو چکی ہیں۔ واللہ! اگر میرے پاس طاقت کے ساتھیوں کے برابر یا اہل بدر کی تعداد کے برابر لوگ ہوتے تو میں تم کو تلوار سے ایسا مارتا کہ تم سب حق کی طرف رجوع کرتے اور صدق کی طرف متوجہ ہوتے، اس وقت میں بندوبست کرتا اور لطف اور نرمی سے کام لیتا۔ اے بارخدا! تو ہم میں حق بات کا فیصلہ کر دے، تو سب حاکموں میں بہتر ہے۔

اس خطبے کے پڑھنے کے بعد حضرت علیؓ مسجد سے باہر آئے اور ان کا گزر ایک بکریوں کے گلے پر ہوا جس میں تیس بکریاں تھیں، تب حضرت علیؓ نے کہا کہ اگر میرے پاس ان بکریوں کی تعداد کے برابر خدا اور رسول کے خالص دوست ہوتے تو میں اکلۃ الذبان کے بیٹے (ابوبکر) کو حکومت سے نکال دیتا۔ پھر شام کے وقت تین سو ساٹھ آدمیوں نے مرجانے پر ان سے بیعت کی، حضرت علیؓ نے کہا: تم صبح کے وقت مقام اجار الزیت میں (نام مقام

قریب مدینہ) سرمنڈوا کر آؤ، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سرمنڈا لیا لیکن ان لوگوں میں سے سوائے ابوذر، مقداد، حذیفہ اور عمار کے کسی اور کو سرمنڈا ہوا نہ پایا۔ سب کے اخیر میں سلمان آئے، پھر حضرت علیؑ نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہا: بارخدا یا! ان لوگوں نے ہم کو کمزور پالیا ہے، جیسا کہ بنی اسرائیل نے حضرت ہارون علیہ السلام کو کمزور پالیا تھا، بارخدا یا تو ان چیزوں کو بھی جانتا ہے جن کو ہم چھپاتے ہیں اور ان کو بھی جن کو ظاہر کرتے ہیں، کوئی چیز زمین و آسمان کی تجھ پر مخفی نہیں ہے، تو مجھ کو اسلام پر موت دے اور نیک لوگوں سے مجھ کو ملا دے۔ قسم ہے بیت اللہ کی اور حج کے لیے بیابان میں نکلنے والے کی اور مزدلفہ کی کہ اگر مجھ کو اس عہد کا خیال نہ ہوتا جو آنحضرت ﷺ نے مجھ سے لیا تھا تو میں مخالفتوں کو موت کی خلیج تک پہنچا دیتا اور میں ان پر موت کی بدلی موسلا دھار پانی برساتی اور گرجتی ہوئی بھیجتا اور بے شک بہت جلد ان کو معلوم ہو جائے گا۔

عمر بن ثابت سے روایت ہے کہ میں نے ابو عبید اللہ سے سنا کہ آنحضرت ﷺ کا انتقال ہو گیا تو سب لوگ مرتد ہو گئے صرف تین مسلمان رہے سلمان، مقداد اور ابوذر۔ اور نیز روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد چالیس آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، انہوں نے کہا: واللہ! ہم تمہارے بعد کسی کی کبھی اطاعت نہیں کریں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کیا وجہ؟ انہوں نے کہا کہ روز غدیر ہم نے تمہارے حق میں سنا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا تم ایسا کرو گے؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: کل تم میرے پاس سرمنڈا کر آ جاؤ۔ ابو عبد اللہ نے کہا کہ بجز ان تینوں کے کوئی نہیں آیا۔ ابو عبد اللہ کہتے ہیں کہ عمار بن یاسر ظہر کے بعد آئے تو ان کے سینے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہاتھ مارا اور فرمایا: ابھی وقت نہیں آیا کہ تم غفلت کی نیند سے جاگو۔ جاؤ مجھ کو تمہاری کوئی حاجت نہیں ہے، تم نے سرمنڈا نے میں تو میرا کہنا مانا نہیں، لوہے کے پہاڑوں سے جنگ کرنے میں تم میرا کیا کہنا مانو گے، تم چلے جاؤ مجھے تمہاری کوئی حاجت نہیں۔

ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سوائے تین کے سب لوگ مرتد ہو گئے تھے، مگر کافی

میں ایک روایت ہے جو اس کے مخالف ہے، اور جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف مرتد ہو جانے کے خیال سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے حقوق کا دعویٰ نہیں کیا اور ترجماً للناس تمام مصائب اپنے اوپر گوارا کیے۔ زرارہ نے امام باقرؑ سے بیان کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: جب لوگوں نے ابو بکر رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لی اور کیا جو کچھ کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو رحم دلی کی وجہ سے اپنی طرف نہیں بلایا، ان کو اندیشہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ لوگ اسلام سے پھر جائیں اور بت پرستی کرنے لگیں اور کلمہ شہادت ترک کر دیں۔ بلکہ آپ کو یہی پسند ہوا کہ لوگ اسلام سے مرتد نہ ہوں، اور اپنی حالت پر قائم رہیں۔ اس لیے جن لوگوں نے قصداً آپ کی بیعت نہیں کی تھی اور لوگوں کی دیکھا دیکھی بغیر علم اور بغیر عداوت امیر المومنین کے ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تھی وہ لوگ اس بیعت کی وجہ سے کافر نہیں ہو سکتے اور نہ دائرہ اسلام سے نکل سکتے ہیں۔ اسی واسطے حضرت علیؑ اپنی حالت کو چھپا گئے اور بہ اکراہ خود بھی بیعت کر لی۔ چونکہ یہ حدیث بالکل منافی اور مناقض احادیث سابقہ کے ہے کیونکہ ان سے تمام مسلمانوں کا مرتد ہونا ثابت ہوتا ہے، اور اس حدیث سے حضرت علیؑ کا دعویٰ نہ کرنا اور مقابلہ نہ فرمانا صرف اس خیال سے بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کو اندیشہ تھا کہ ایسا کرنے سے لوگ مرتد ہو جائیں گے۔ اس لیے جناب ملا باقر مجلسی اس حدیث کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ اسلام سے مرتد نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ظاہر اسلام کی پابندی کریں اور کلمہ پڑھتے رہیں، اس لیے کہ امت کی بھلائی اسی میں تھی کہ وہ اسلام پر باقی رہیں تا کہ مدتوں کے بعد ان کو یا ان کی اولاد کو حق کے قبول کرنے اور ایمان میں داخل ہونے کا موقع مل سکے۔ اس صورت میں یہ قول اس قول کے منافی نہیں ہے کہ صرف تین ہی آدمی مرتد ہونے سے بچ گئے تھے، اس لیے کہ مرتد ہونے کے وہاں یہ معنی ہیں کہ انہوں نے عموماً دین کو فی الحقیقت چھوڑ دیا تھا، اور یہاں اس کے یہ معنی ہیں کہ ان میں اسلام کی صورت باقی تھی اگرچہ وہ اکثر احکام واقعی کے لحاظ سے کافروں کے حکم میں داخل تھے۔ اور یہ بھی ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے حضرت علیؑ کی امامت کی نص کو نہ سنا ہو اور اسے حضرت علی سے بغض و عداوت نہ ہو، مگر جس شخص نے ان باتوں میں

سے کوئی ایک بات بھی کی وہ گویا پیغمبر کے قول کا منکر ہو گیا اور ظاہر میں بھی کافر اور اسلام کے احکام میں سے کوئی حکم اس کے لیے باقی نہ رہا اور وہ واجب القتل ہے۔

جناب عمدۃ المتکلمین وزبدۃ المتاخرین مولوی سید حامد حسن صاحب قبلہ استقصاء کی جلد دوم میں بھی اسی کی تائید کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

((حدیث ارتدت الصحابة کلهم الاثلاثه: وامثاله هرگز اهل حق محمول برردت شرعی و کفر ظاہری نمی سازند چنانچه در عبارت بحار کہ آنفاً منقول شد صریح مذکور است کہ مراد از ارتداد دریں احادیث ارتداد در دین واقعی است یعنی نہ ارتداد از دین و ظاہر بالجمله مراد از ارتداد در امثال ایں احادیث ارتداد بمعنی عام است کہ منافی اسلام ظاہری نیست و در معنی عام ارتداد همه ها داخل می تو اند شد هم مرتدین شرعی و هم کسانی کہ بر اسلام ظاہری باقیماند ندواز ایمان بدر رفتند.))

”ارتدت الصحابه..... الخ (تین کے علاوہ سارے صحابہ مرتد ہو گئے تھے) گواہل حق ارتداد شرعی اور ظاہری کفر پر محمول نہیں کرتے، جیسا کہ ”بحار الانوار“ کی عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ احادیث ارتداد میں ارتداد سے مراد دینی ارتداد ہے نہ ظاہری اسلام کے منافی نہیں اور اس عام ارتداد میں یہ سب داخل ہو سکتے ہیں، چاہے وہ مرتدین شرعی ہوں یا وہ لوگ جو ظاہری اسلام پر تو باقی رہے اور ایمان سے نکل گئے۔“

پھر اس کے آگے مولوی صاحب ممدوح فرماتے ہیں:

((وتوضیح مقام اینست کہ ارتداد رادو معنی ست یکے عام ویکے خاص، اما ارتداد عام پس بمعنی لغوی ست یعنی

برگشتن از چیزے و این معنی شامل ست جمیع انواع ارتداد را، خواه ارتداد از اخلاق حسنه و عادات جمیلہ و امثال ذالک۔ و اما ارتداد خاص پس ارتداد شرعی ست یعنی برگشتن از اسلام و اختیار کردن کفر کہ موجب جریان احکام کفار در دار دنیا بر صاحب آن تواند شد۔))

اس کی وضاحت یہ ہے کہ ارتداد کے دو معنی ہیں ایک عام دوسرا خاص، ارتداد عام کے معنی ہیں کہ کسی چیز سے پھر جانا اور یہ معنی عام اقسام کے ارتداد پر حاوی اور شامل ہیں، عام اس سے کہ اسلام سے ارتداد ہو یا ایمان سے یا اخلاق حسنه کا ترک ہو یا عمدہ عادات و خصائل سے کنارہ کشی۔ ارتداد خاص کے معنی ہیں ارتداد شرعی، یعنی اسلام سے پھر جانا اور کفر اختیار کر لینا اور ایسے شخص پر دنیا میں کافروں جیسے احکام جاری ہو سکتے ہیں۔“

اس کے بعد جناب ممدوح نے خلفائے ثلاثہ کی نسبت دونوں قسم کے ارتداد کا دعویٰ کیا ہے اور فرمایا ہے ”فان کفر ہم و ارتداد ہم واضح لاسترة فيہ“ (ان کا کافر و مرتد ہونا ایسا واضح ہے جس پر کوئی پردہ نہیں ہے)

غرض کہ حضرات امامیہ نے ارتداد کی دو قسمیں کی ہیں: ارتداد حقیقی، یعنی ظاہراً و باطناً مرتد ہو جانا، اس میں خلفائے ثلاثہ کو نعوذ باللہ من ذالک اور سامعین نص کو شریک کیا ہے، اور دوسری ارتداد باطنی، یعنی بظاہر اسلام پر قائم رہنا، اور اس میں ان لوگوں کو داخل کیا ہے جنہوں نے بغیر علم اور عداوت جناب امیر کے، دھوکہ میں آکر یا ان لوگوں کی دیکھا دیکھی خلفائے ثلاثہ کی بیعت کی، اور پھر اس قسم کے لوگوں کو جبکہ وہ جناب امیر کے شریک ہو گئے مسلمانوں اور مومنین میں داخل کر لیا ہے۔

اول تو یہ تقسیم ہماری سمجھ میں نہیں آتی، اس لیے کہ ارتداد اصلی یہ ہے کہ خدا اور اس کے رسول اور ماجاء بہ النبی ﷺ سے انکار کیا جائے، اور ایسا انکار صحابہ رضی اللہ عنہم کی نسبت

ثابت نہیں، خصوصاً خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم اور ان کے اعموان و انصار کی نسبت۔ اس لیے کہ ان کے اسلام ظاہری پر قائم رہنے کی تصدیق خود حضرات امامیہ کے اکثر اقوال سے ہوتی ہے، جیسا کہ علم الہدیٰ صاحب معنی کے جواب میں لکھتے ہیں کہ یہ کہنا قاضی کا کہ (جس طرح امام حسین رضی اللہ عنہ نے یزید سے مخالفت کی اور اس کی برائیاں ظاہر کیں، جناب امیر کو بھی چاہیے تھا کہ اپنے مخالفین سے مخالفت کرتے اور نکیر یعنی اعتراض اور انکار ظاہر کرتے، اور لوگوں کو اس کے خلاف برا بیچتے فرماتے) بعید از صواب ہے، اس لیے کہ جو خوف یزید سے تھا مثل اس خوف کے نہیں تھا جو خلفاء سے کیا جاتا، اس لیے کہ یزید فسق و فجور کا اعلان کرتا اور دینداری سے بے پروا تھا اور سب جانتے تھے کہ اس میں خلافت اور امامت کی اہلیت نہیں ہے اور کوئی شرط شرائط امامت میں اس میں نہیں پائی جاتی، بخلاف خوف کرنے کے ایسے شخص سے جو مقدم قوم ہو اور حسن ظاہر میں متصف، اور جم غفیر اسے امامت کے لائق جانتے ہوں بلکہ اس کے رتبے کو خلافت سے بڑھ کر سمجھتے ہوں، پس قیاس ایک کا دوسرے پر قیاس مع الفارق ہے..... اس میں جناب علم الہدیٰ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نسبت ان باتوں کو تسلیم کیا ہے کہ وہ مقدم اور معظم قوم تھے اور حسن ظاہری سے متصف، اور امامت کو لوگ ان کے رتبے سے کم سمجھتے تھے، چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں:

((و کیف یکون الخوف من مظهر الفسق و الخلاعة و لاشبهة فی ان امامته ملک و غلبة و انه لا شرط من شرائط الامامة فيه كالخوف من مقدم معظم جمیل الظاهر بری اکثر الامة ان الامامة دونہ و انها ادنی منازلہ و مالجمع بین الامرین الا کالجامع بین الضدین .))

”جو خوف یزید سے تھا جو کہ فسق و فجور کا اعلان کرتا تھا اور اس کی امامت بادشاہت اور غلبہ تھا اور شرائط امامت میں سے کوئی شرط اس میں نہیں تھی، اس خوف کی طرح نہیں جو بزرگ اور مقدم قوم ہو اور حسن ظاہر میں متصف اور

جم غفیر اس کے رتبے کو خلافت سے بڑھ کر سمجھتے ہوں، پس ایک کا قیاس دوسرے

پر قیاس مع الفارق ہے۔“

اور محقق جیلانی فتح السُّبُل میں لکھتے ہیں:

((سبب دیگر در تقویت حسن ظن مردم بعاقدین بیعت آن شد کہ آنها نفوس خود را از اموال باز داشتند و شیوہ زہد در دنیا پیش گرفتند و رغبت بدنیا وزینت آنرا ترک کردند و قناعت بقلیل و اکل خش و لباس کرہاس ملک خود ساختند در حالتی کہ اموال برائے ایشان حاصل و دینار و کردہ بودند و آنرا در میان قوم قسمت می کردند و خود را با آن اصلاً آلودہ نمی کردند پس دلہائے مردم بایشان مائل شد و ایشان را دوست داشتند و ظنون مردم بایشان نیک شد و ہر کس را کہ در بارہ ایشان شبہ در خاطر بود یا توقفے داشت با خود گفت کہ اگر ایشان بہوائے نفس مخالفت نص پیغمبر کردہ بودند بایست اہل دنیا باشند و ترک دنیا و لذات نکنند تا خسران دنیا و آخرت ہر دو برائے ایشان نباشد و اینہا اہل عقل و رای صحیح اند چگونہ خسران دنیا و عقبی ہر دورا پسندیدہ باشند پس فعل ایشان صحیح ست و کسی راشکے در صلاح ایشان باقی نماند و اعتقاد بولایت ایشان کردند و افعال ایشان پسندیدند.....)) انتہی بلفظہ

”لوگوں کو پختہ گمان تھا جس کی وجہ سے انہوں نے بیعت کی کہ انہوں نے اپنی ذات کو دولت دنیاوی سے باز رکھا، دنیا میں زاہدوں کا شیوہ اختیار کیا، اور دنیا اور دنیا داری سے رغبت نہ کی اور تھوڑے پر ہی قناعت کی، سوکھی غذا اور موٹا لباس

اختیار کیا، اس دور خلافت میں جبکہ دولت و وزران کے قبضے میں تھا اور یہ لوگ آمدہ مال کو قوم میں تقسیم کر دیتے تھے۔ اور اس میں سے کوئی جبہ خود نہ لیتے تھے اور سرکاری مال سے خود کو انہوں نے بالکل بھی آلودہ نہ کیا، اس کی وجہ سے لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہو گئے اور ان کو دوست رکھنے اور ان سے نیک گمان کرنے لگے اور جن لوگوں کو ان خلفاء کی بابت شک و شبہ تھا یا بیعت کرنے میں انہوں نے توقف کیا تھا، انہوں نے اپنے دل میں کہا: اگر ان خلفاء نے رسول اللہ ﷺ کے احکام کی مخالفت کی ہوتی تو یہ لازماً دنیا دار ہوتے اور لذت دنیا و دولت ترک نہ کرتے اور دنیاوی و اخروی ذلت ان کے لیے نہیں ہے اور یہ واضح ہے کہ چونکہ یہ خلفاء عقلمند اور صائب الرائے ہیں، اس لیے دنیاوی اور اخروی نقصان دونوں کو پسند نہیں کرتے، اس لیے بھی ان کے افعال صحیح و درست ہیں اور کسی شخص کو ان کی صلاحیت کے بارے میں شک و شبہ باقی نہ رہا اور لوگ ان کی ولایت و خلافت کے معتقد ہو گئے اور ان کے اعمال و افعال کو بنظر پسندیدگی دیکھا۔“

پس یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ خلفاء اور ان کے اعوان و انصار نے اسلام کو اس معنی میں ترک کر دیا کہ وہ خدا اور رسول کے منکر ہو گئے، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ امامت جو علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا حق تھا نہ دی، اور نہ صرف منکر امامت بلکہ غاصب امامت ہو گئے۔ اس لحاظ سے ان کو شیعہ اپنے اصطلاحی ارتداد کے مطابق مرتد کہیں تو کہیں، مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ دوسرے صحابی جن کی تعداد ہزاروں سے کچھ کم نہ تھی اور جو جناب امیر کے زمانے میں ان کے شریک ہوئے کیوں شروع میں علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے پھر گئے اور ان کی اعانت و مدد نہ کی؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ دھوکہ میں آ گئے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہ امامت کا معاملہ پیغمبر خدا ﷺ نے اس اعلان کے ساتھ طے کیا تھا اور اس کا اس خوبی سے اشتہار دیا تھا کہ کسی کو کوئی موقع عذر کا یا دھوکے میں آنے کا باقی نہ رہا تھا۔ خم غدیر

میں صاف صاف لفظوں میں ستر ہزار آدمیوں کے سامنے آپؐ نے علیؑ کو امام بنایا اور ان کو اپنا ولی عہد کیا اور سب سے بیعت لی اور سب نے مبارک باد دی، اور پھر پیغمبر خدا ﷺ نے اس عہد پر قائم رہنے والوں کے ثواب کے درجے اور اس سے پھر جانے والوں کے عذاب جو خدا نے مقرر کیے ہیں وہ بھی صاف صاف بتا دیے اور خدا پر ایمان لانے اور اسے معبودِ مطلق سمجھنے کی طرح امامت کے مسئلے کو بھی اسلام اور ایمان کے لیے لازمی قرار دیا۔ ایسی صورت میں سوائے دیوانوں اور بے سمجھ بچوں کے کوئی جاہل اور بدوی بھی دھوکے میں نہیں آسکتا تھا۔ نہ ایسی نص جلی اور خبر متواتر بلکہ مشاہدے سے انکار کر سکتا تھا، بجز ان لوگوں کے جن کو ایمان اور اسلام سے بہرہ نہ ہو اور جن کو حرص دنیا نے غصبِ خلافت پر آمادہ کیا ہو یا ان غاصبوں کا ساتھ دینے کو اپنے لیے مفید سمجھتے ہوں۔ اور ان تمام صورتوں میں جس طرح پر خلفاء اور ان کے معاون و انصار شیعوں کے اصول کے مطابق دائرہ اسلام سے خارج ہیں اسی طرح پر تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اور سارے مسلمان جنہوں نے خلفاء کا ساتھ دیا اور ان کی خلافت پر بیعت کی اور کسی کا کوئی عذر مقبول نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ اگر انہوں نے کوئی نص بھی نہ سنی ہوتی، تاہم جناب امیر نے علیؑ رؤوس الاشهاد (سب کے سامنے) اپنی خلافت کا دعویٰ کیا اور خلفاء کو غاصب اور ظالم ٹھہرایا اور سب سے مدد مانگی اور حسنین رضی اللہ عنہما اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کو لیے لیے گھر گھر پھرے، کوئی دقیقہ اپنے حق کے مطالبے کا بقول شیعوں کے باقی نہ رکھا۔ ایسی صورت میں کسی کو دھوکہ میں آنے کا موقع باقی نہ تھا اور نہ ان کا یہ عذر قابلِ سماعت ہو سکتا ہے۔

اور بالفرض اگر خلافت اولیٰ میں دھوکے سے بیعت کر لینے کا عذر قبول بھی کر لیا جائے تو دوسری اور تیسری خلافت میں غاصبین خلافت سے بیعت کرنے اور ان کی خلافت ماننے کے لیے کیا عذر ہو سکتا ہے، بجز اس کے کہ تمام مہاجرین اور کل مومنین و مسلمین اس زمانے کے سوائے تین کے مرتد قرار دیے جائیں، شیعوں کے اصول کے مطابق کسی طرح ان کا اسلام ثابت نہیں ہو سکتا۔ اور اس لیے اگر حضرات امامیہ اس دعوے پر ثابت قدم رہتے اور سب صحابہ رضی اللہ عنہم کو سوائے تین چار کے خواص ہوں یا عوام، مکی ہوں یا مدنی، حضری ہوں یا بدوی

مردمانتے اور کسی کو کسی عذر سے خارج نہ کرتے تو بھی مقابلہ اور مقاتلہ نہ کرنے اور ظلم و ستم سہنے کی وجہ کچھ خیال میں آتی، مگر تعجب یہ ہے کہ اس بات پر بھی تو حضرات امامیہ ثابت قدم نہیں رہتے بلکہ اپنی شوکت اور اپنے مذہب کے حامیوں کی کثرت اور عظمت دکھانے کے لیے وہ روایتیں بیان کرتے ہیں جس سے یہ تمام اقوال باطل ہو جاتے ہیں اور ان لوگوں کی جو اسلام اور ایمان پر ثابت قدم رہے بہت بڑی تعداد معلوم ہوتی ہے اور نیز بہت سے قبیلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حامی اور مددگار پائے جاتے ہیں۔

چنانچہ ”ریاض السالکین شرح صحیفہ سجادیہ“ میں صدر الدین حسنی حسینی روضہ چہارم میں جہاں حضرت امام زین العابدین کی اس دعا کا ذکر ہے جو آپ نے اصحاب رسول پر کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ پیغمبر خدا ﷺ کی وفات کے وقت ایک لاکھ چودہ ہزار صحابی موجود تھے۔ اور بحوالہ کتاب ”الخصال رئیس المحدثین“ کے حضرت امام جعفر صادقؑ سے نقل کرتے ہیں کہ بارہ ہزار پیغمبر کے اصحاب جن میں سے آٹھ ہزار مدنی اور دو ہزار غیر مدنی اور دو ہزار طلقاء میں سے ایسے تھے جن میں نہ کوئی قدری تھا نہ خارجی، نہ معتزلی نہ صاحب الرائے، رات دن رویا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ قبل اس کے کہ ہم خمیری روٹی کھائیں خدایا ہماری روح قبض کر لے۔ اور اوس، خزرج، بنو حنیف، ہمدان، مدحج، ربیعہ، مضر، ازداء، وائل، خزاعہ اور طی یہ سب قبیلے شیعان علی رضی اللہ عنہ میں سے تھے اور ایسے صادق العقیدہ کہ جن کے خلوص، عقیدت اور مددگاری و نصرت کا خود جناب امیر نے اپنے اشعار میں ذکر کیا ہے اور ان کی تعریف کی ہے۔ چنانچہ قاضی نور اللہ شوستری ”مجالس المؤمنین“ کی مجلس دوم میں جس کا عنوان ہے ”مجلس دوم در بیان حال طائفہ چند کہ بہ تشیع مشہور و در سلك ایمان مذکور اند“ فرماتے ہیں کہ اوس اور خزرج دو بڑے قبیلے انصار کے ہیں کہ ان کا حال غایت اشتہار کی وجہ سے محتاج اشتہار نہیں ہے اور اخلاص خصوصاً سعد بن عبادہ خزرجی اور ان کی اولاد امجاد کا نسبت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے سب پر ظاہر ہے۔ چنانچہ ”شارح دیوان مرتضوی“ قاضی میر حسین شافعی کہتے ہیں کہ سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ جب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ متوجہ حرب

معاویہ رضی اللہ عنہ ہوئے تو نوے ہزار آدمی ہمراہ تھے، ان میں سے آٹھ سو انصار اور نو سو اہل بیعت رضوان سے تھے اور جن کی نسبت حضرت علیؑ نے فرمایا:

الاولوس و الخزرج القوم الذین ہم
اووا فاعطوا فوق ما وہبوا
”یعنی اوس اور خزرج اس قوم کے لوگ ہیں کہ جن لوگوں کو اپنے یہاں پناہ دیں
تو ان کے ساتھ اپنی استطاعت سے زیادہ سلوک کرتے ہیں۔“
اور قبیلہ ہمدان کی نسبت حضرت امیر المومنین نے فرمایا:

ونادی ابن ہندذ الکلاع و یخصبا
وکندہ فی لحم وحی جزام
تیممت الہمدان الذین ہم
اذاناب امر جتی و سہامی
جزی اللہ الہمدان الجنان فانہم
سہام العدی فی کل یوم خصام
فلو کنت بو ابا علی باب الجنة
لقلت لہمدان ادخلی بسلام

”کہ جب انب ہندہ، یعنی معاویہ نے ذوالکلاع اور یخصب اور کندہ کے قبیلوں کو بلایا، میں نے ہمدان کے قبیلوں کو پکارا، کیونکہ وہی لوگ ہیں کہ سخت وقت پر میری تلوار اور ڈھال ہیں۔ خدا قبیلہ ہمدان کو اس کے صلہ میں جنت دے کہ وہی ہر لڑائی کے دن دشمنوں کے تیر رہے ہیں، اگر میں جنت کا دربان ہوں گا تو ہمدان سے کہہ دوں گا کہ بے دھڑک چلے آؤ۔“

اور قبیلہ ازد کی نسبت حضرت امیر المومنین نے فرمایا ہے:

الازد سیفی علی الاعداء کلہم
وسیف احمد من دانت له العرب
قوم اذانا جاہ واو فواوان غلبوا
لا یجمعون ولا یدرن ما الہرب

ان اشعار کا ترجمہ قاضی صاحب نے فارسی میں یہ کیا ہے:

یاران من اند اہل شمشیر ہمہ
مائل بخدا از جہاں سیر ہمہ
معنی گریختن ندانند کہ چیست
باشند بروز حرب چوں شیر ہمہ

”ہمارے دوست ہیں جو شمشیر باز ہیں دنیا سے آسودہ اور خدا کی طرف مائل
ہیں، جو بھاگنے کے معنی نہیں جانتے کہ کیا ہیں، لڑائی کے دن سب شیر کی طرح
ہو جاتے ہیں۔“

اور نیز حضرت امیر المومنینؑ کا اصل شعر قبیلہ ازد کی نسبت نقل کر کے اس کا ترجمہ یوں ہے:

((کہ حضرت امیر المومنین علی می فرماید ائے جماعت
از دبدرستیکہ من از ہمہ شما خوشنودم و شما سرہائے کار
خلافت من آید ہرگزنا امید نشوید از راحت و آمرزیدن و
خدا نگاہ دار دایشاں را از ہر جا کہ روند۔ پاکید شما در
حالیکہ تو آید چناں کہ پاکست اول شما و خار چیدہ نشود از
سر شاخ انگور.))

”حضرت علی کا ارشاد ہے کہ گروہ قبیلہ ازد میں تم سے راضی و خوش ہوں تم میری
خلافت کے قیام کے کوشاں ہونا امید نہ ہو راحت اور بخشش سے تم جہاں جاؤ اللہ
تمہاری حفاظت کرے۔ کرے موجودہ حالت میں بھی اس طرح پاک رہو جیسے

کہ پہلے پاک تھے اور انگور کی شاخ پہ کانٹے نہیں ہوتے جو الگ کیے جائیں۔“ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ تعریفیں جو قبائل انصار کی مجالس المؤمنین میں بیان کی گئی ہیں، یہ چونکہ انساب سمعانی وغیرہ کتب عامہ سے لی گئی ہیں، شیعوں کے مقابلے میں پیش نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے کہ قاضی نور اللہ نے ان تمام قبائل کو مخلصین اور شیعیان علی میں داخل سمجھ کر ان اقوال کو اس کے ثبوت میں پیش کیا ہے اور ایسی حالت میں یہ اقوال حضرات امامیہ پر اسی طرح حجت ہو سکتے ہیں جس طرح خود ان کے مورخین کے اقوال۔ اور ایسی حالت میں یہ اقوال حضرات امامیہ پر اسی طرح حجت ہو سکتے ہیں، جس طرح خود ان کے مورخین کے اقوال۔ اور اس سے غرض اصلی قاضی نور اللہ کی یہی ہے کہ وہ ثابت کریں کہ شیعیان علی کچھ کم نہ تھے، اور بہت سے قبائل جناب امیر کے حامی اور مددگار تھے۔ لیکن اگر حضرات امامیہ قاضی نور اللہ شوستری کی تحریر کو رد کر دیں اور اسے نہ مانیں اور جن قبائل کا شیعیان علی میں سے ہونا انہوں نے بیان کیا ہے اسے غلط سمجھیں اور ان کو بھی اعدائے اہل بیت میں سے شمار کریں، تاہم وہ اسے تو رد نہیں کر سکتے کہ ایک لاکھ چودہ ہزار صحابی پیغمبر خدا ﷺ کے بعد موجود تھے۔ اور اس کو بھی تکذیب نہیں کر سکتے کہ بارہ ہزار صحابی حسن اعتقاد کی صفت سے موصوف تھے اور رات دن خدا کی عبادت میں مشغول رہتے تھے، اگر یہ سب کے سب تین چار کے سواء مرتد ہو گئے تھے تو بس اسلام پر فاتحہ پڑھنا چاہیے اور کسی کے سامنے اسلام کی خوبی کا نام نہ لینا چاہیے۔ مگر اس بات کا کہ حضرت علیؑ کی حمایت میں نہ صرف عام صحابہ تھے بلکہ ان کے ساتھ بڑا لشکر جرار مہاجرین و انصار و تابعین باحسان کا تھا، حضرات امامیہ انکار ہی نہیں کر سکتے، کیونکہ اس کا ثبوت ان کتابوں سے ہے جن کو مثل خدا کی کتاب کے حضرات امامیہ صحیح سمجھتے ہیں۔ دیکھو نہج البلاغہ ①۔ جناب امیر المؤمنین معاویہ رضی اللہ عنہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ”تم نے اپنے خط میں یہ لکھا ہے کہ ہمارے بیچ میں شمشیر آبدار کے سوا اب دوسری چیز فیصلہ کرنے والی نہیں ہے، اس نے مجھے بہت ہنسایا اور نہایت متعجب کیا۔ کیا کبھی بنو عبدالمطلب دشمنوں سے

خائف ہوئے ہیں اور تلوار سے ڈرے ہیں بلکہ وہ اس جنگل کے شیر ہیں اور میدان جنگ کے مرد۔ اب تم دور مت سمجھو اسے کہ جسے تم طلب کرتے ہو وہ تمہیں طلب کرے اور جسے تم دور سمجھتے ہو وہ تمہارے پاس پہنچے، یعنی میں تمہاری طرف آ رہا ہوں ایک ایسے لشکر جرار اور فوج بے شمار کے ساتھ، اور اس لشکر بے شمار میں کون ہیں وہ مہاجرین و انصار اور تابعین باحسان ہیں کہ جن کا گروہ قوی اور جن کا غبار بلند ہے اور جو موت کے پیرا ہن پہنے ہوئے ہیں اور جو خدا کی موت کو سب سے زیادہ چاہتے اور اس کی آرزو رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ ہیں زیریہ بدریہ اور سیوف ہاشمیہ، یعنی اہل بدر کی اولاد اور شمشیر ہائے ہاشمی۔ چنانچہ اس خط کے الفاظ کا فارسی ترجمہ جو ملاحظہ اللہ نے کیا ہے یہ ہے:

((ویاد کردہ در نامہ خود آنکہ نیست مراد نہ مر اصحاب
مرانزد تو مگر شمشیر آبدار پس ہر آئینہ بخندہ آوردی مراو
یاران مرا پس از اشک فرو آوردن بایں گفتار یعنی ہر کہ
شنیداین گفتار ترا از مومنین خندید از روی تعجب بعد از
گریستن ایشان بردین بجهت تصرف بے وجہ تو دارد۔ کجا
یافتہ شدند پسران عبدالمطلب کہ از دشمنان واپس رفتگان
بودہ باشند از جہت جہانت و بشمشیر ترسانیدہ شدہ باشند و
ہراساں چہ ایشان شیر بیشہ رجولیت اندواز روباہ صفتان
چہ اندیشہ دارند، پس درنگ کن اند کہے تاملحق شود بصف
جنگ جمل بن بدر، وایں مثلی ست برائے وعید اعداء
الحرب۔ وقائل آن جمل بن بدرست و او مردے بود از قشیر
کہ شتران اور ابغارت بردہ بودند اور در میان ہیجا رفت
بدلاوری و شتران خودا باز ستداز اعداء۔ پس زود باشد کہ
طلب کند ترا کسیکہ طلب میکنی اور او نزدیک شد بتو آنچه

دوری می جوئی ازو، ومن شتابنده ام بجانب تو در لشکر
عظیم بے شمار از مهاجرین و انصار و تابعان به نیکوئی کہ
سخت ست انبوہے ایشان مرتفع ست غبارایشان، گویند کہ
نود ہزار کس بودند و در بر کنند گان پیراھن ہائے مرگ را،
ایں کنایہ ست از زرهاو جو شنہا کہ در برداشتند ہمچوں
پوشش اکفان دوست ترین ملاقات کردن ایشان ست
بر رحمت پروردگار خود بہ تحقیق کہ ہمراہست ایشان
رازریہ بدریہ یعنی فرزندان بدری خونخوار و سیوف ہاشمیہ
یعنی شمشیر ہائے ہاشمی آتشبار.....)) انتہی

”تم نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ ہمارے تمہارے درمیان شمشیر آبدار فیصلہ
کرے گی، تمہاری اس تحریر سے مجھے اور میرے دوستوں کو ہنسی آئی اور تعجب ہوا،
یعنی اسلام پر تمہارے تصرف بے جا کرنے کے سبب تعجب کے رونے کے بعد
ہنسی آئی، کیا کبھی اولاد عبدالمطلب دشمنوں کے مقابلے سے واپس ہوئی ہے، کیا
کبھی بزدلی دکھائی اور کیا کبھی خائف و ترساں ہوئے؟ یاد رہے کہ ہمارے
بزرگ مردمیداں اور شیریں اور لومڑی صفتوں سے کوئی خوف نہیں رکھتے، تھوڑی
دیر ٹھہرے کہ جمل بن بدر جنگ میں دشمنوں کو ہیبت ناک کرنے کی، یہ جمل بن
بدر کا قول ہے جو قشیری تھا، جس کے اونٹ لوگ بھگالے گئے تھے وہ فوراً ہی
دشمنوں میں پہنچا اور جواں مردی سے ان کو دشمنوں سے چھڑا لیا، اب قریب سمجھو
یہ کہ تم جسے طلب کر رہے ہو وہ تمہیں طلب کرے اور جسے تم دور سمجھ رہے ہو وہ
تمہارے پاس پہنچے، اور اس عظیم الشان فوج کے ساتھ جس میں مهاجرین و انصار
اور تابعین ہیں، جلد تر تمہاری طرف آ رہا ہوں یہ فوج بے انتہا نیک کردار ہے ان
کی سوار یوں وغیرہ کا غبار بلند ہے یہ نوے ہزار جوان مرد کفن پوش زرہ و جوش

وغیرہ جیسے اسلحہ سے لیس ہیں اور پروردگار کی رحمت حاصل کرنے کے لیے اللہ کو پیارا ہو جانا ان کی سب سے بڑی خواہش ہے، یاد رہے کہ میرے ساتھ یہ وہ لوگ ہیں جو اہل بدر کی اولاد اور آتش بار ہاشمی تلواروں والے ہیں۔“

جبکہ خود جناب امیر المومنین مہاجرین و انصار و اصحاب و تابعین کے ایک لشکر جرار کا اپنے ساتھ ہونا بیان کرتے ہیں اور ان کے ثبات قدم اور شجاعت و مردانگی اور جہاد فی سبیل اللہ کی تعریف کرتے ہیں اور شارحین نہج البلاغہ نوے ہزار آدمیوں کا اس وقت آپ کے ساتھ ہونا بیان کرتے ہیں، تو کیوں کر سمجھ میں آئے کہ یہ لوگ مسلمان نہ تھے اور ان کے دل ایمان کے نور سے اور اہل بیت کی محبت سے خالی تھے۔ یا کسی زمانے میں کسی سبب سے وہ مرتد یا اہل بیت کے دشمن ہو سکتے تھے، یا کسی کے دھوکے میں آ کر وصی رسول کا ساتھ چھوڑ سکتے تھے۔ کیا یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلفائے سابقین کی خلافت کو قبول نہ کیا ہوتا اور ان کو غاصب اور مرتد جانا ہوتا تو وہ اپنے مقابلے اور مقابلے کا ارادہ نہ فرماتے اور اگر ارادہ فرماتے تو کیا ایسے جانباز اور جاں نثار جن کی تعریف اس خط میں جناب امیر نے کی ہے وہ جناب امیر کا ساتھ نہ دیتے اور ان کے دشمنوں سے مقابلہ نہ کرتے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت پر آمادہ نہ ہوتے۔ مگر یہ بات ہے کہ درحقیقت جناب امیر نے نہ ان خلفاء کو غاصب تصور کیا نہ ان کے ساتھ مقابلے اور مقابلے کا ارادہ فرمایا بلکہ جو کچھ ہوا اسے تسلیم کیا اور مثل دوسروں کے خود بھی خلفائے سابقین کی مدد دینے میں معین اور شریک رہے اور مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم کے اتفاق کو ہمیشہ رضائے الہی کے مطابق سمجھا۔ اور یہ خیال ہمارا کچھ قیاسی نہیں بلکہ خود جناب امیر علیہ السلام کے ان بیانات پر مبنی ہے جو آپ نے کیے اور جس پر اپنی خلافت کی حقیقت پر استدلال کیا۔

کیا حضرات امامیہ اس خط پر غور نہیں فرماتے جو جناب امیر نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا؟ چنانچہ آپ کے الفاظ جو نہج البلاغہ میں منقول ہیں وہ یہ ہیں:

((ومن کتاب له علیه السلام الى معاوية انه بايعنى القوم

الذین بايعوا ابابكر و عمر و عثمان على ما بايعوهم عليه فلم يكن للشاهد ان يختار ولا للغائب ان يردو انما الشورى للمهاجرين والانصار فان اجتمعوا على رجل وسموه اما ماكان ذلك الله رضى فان خرج من امرهم خارج بطعن او بدعة ردوه الى ماخرج منه فان ابى قاتلوه على اتباعه غير سبيل المؤمنين وولاه ماتولى .))

”کہ مجھ سے انہی لوگوں نے بیعت کی ہے جنہوں نے ابو بکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ سے بیعت کی تھی اور انہی شرائط پر کی ہے جن پر ان سے کی تھی، لہذا نہ تو حاضر کے لیے حق باقی رہ گیا ہے کہ بیعت میں اختیار سے کام لے اور نہ غیر حاضر کو حق ہے کہ بیعت سے روگردانی کرے، شوریٰ تو صرف مهاجرین و انصار کے لیے ہے اگر انہوں نے کسی آدمی کے انتخاب پر اتفاق کر لیا اور اسے امام قرار دے دیا تو یہ اللہ کی اور پوری امت کی رضا مندی کے لیے کافی ہے، اب اگر امت کے اس اتفاق سے کوئی شخص اعتراض یا بدعت کی بنا پر خروج کرتا ہے تو مسلمان اسے حق کی طرف لوٹا دیں گے جس سے وہ خارج ہوا ہے انکار کرے گا تو اس سے جنگ کی جائے گی کیونکہ اس نے مومنوں کی راہ سے کٹ کر الگ راہ اختیار کی ہے اور خدا سے اس کی گمراہی کے حوالے کر دے گا، اور اے معاویہ! میں بہ قسم کہتا ہوں کہ اگر تو نفس سے ہٹ کر عقل سے کام لے تو مجھے عثمان رضی اللہ عنہ کے خون سے بالکل بری الذمہ پائے گا اور جان جائے گا کہ میرا اس خون سے دور کا بھی لگاؤ نہیں یہ اور بات ہے کہ تو اپنے مطلب کے لیے تہمتیں تراشے خیر جو کرنا ہے کرتا رہ۔“

(نیچ البلاغہ حصہ دوم صفحہ ۶۰۳ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور)

شارحین نیچ البلاغہ کا یہ کہنا کہ یہ خطاب آپ نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے ان لوگوں کے خیال

کے مطابق کیا تھا جو خلافت کو شوریٰ پر مبنی سمجھتے تھے یا یہ کہ مدارات اور تقیہ کے طور پر آپ نے یہ لکھا تھا، صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ اول تو کوئی لفظ اس خیال کے ثبوت اور تصدیق کے متعلق پایا نہیں جاتا اور اگر آپ کی خلافت پر نص ہوتی تو اس کے اظہار کا یہ موقع تھا اور آپ کے دعوے کے لیے وہ ایک عمدہ اور قوی دلیل تھی اور آپ اپنے حق پر ہونے کے ثبوت میں یہ فرما سکتے تھے کہ میری خلافت منصوص ہے اور علی رؤس الاشهاد پیغمبر خدا ﷺ غدیر خم میں مجھے اپنا خلیفہ کر گئے تھے۔ اس صحیح اور قوی دلیل کو تو آپ نے چھوڑ دیا اور اس بات سے استدلال کیا جس کو آپ غلط اور جھوٹ جانتے تھے اور جس سے خلفائے سابقین کی خلافت غصبی کی حقیقت کا ثبوت ہوتا تھا۔ ان ہذا لشیبیٰ عجاب .

رہا یہ خیال کہ معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی اس استدلال کو نہ مانتے، اس لیے جھوٹی اور غلط بات سے ان کے عقیدے کے موافق آپ نے استدلال فرمایا، قابل تسلیم نہیں ہے۔ اس لیے کہ آخر وہ لوگ پیغمبر خدا ﷺ کی تصدیق فرماتے تھے اور ان میں نص کے سننے والے بھی موجود تھے، بالفرض اگر وہ نہ مانتے تو آپ کے ساتھ جتنے مہاجرین اور انصار اور نوے ہزار آدمی تھے وہ تو آپ کی تصدیق فرماتے اور جب کہ یہ لوگ آپ کے ساتھ جان دینے اور خون بہانے پر آمادہ تھے اور اپنے قول کو اپنے عمل سے ثابت کر رہے تھے تو کیا وہ آپ کے حق میں نص خلافت کی تصدیق نہ کرتے اور اس دلیل کو اپنے مخالفین کے سامنے پیش کرنے سے باز رہتے۔ بلکہ اگر ایسی نص صریح ہوتی تو حامیان جناب امیر بالضرور اسی کو آپ کے ساتھ دینے کے لیے اپنے حق پر ہونے کے ثبوت میں پیش کرتے اور کہتے کہ ہم نے جو ان کا ساتھ دیا ہے وہ صرف پیغمبر خدا ﷺ کے حکم کی تعمیل ہے اور جو کچھ ہم کرتے ہیں اور ان کے ہمراہ ہو کر اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں وہ اسی لیے ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے جن پر ہم ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے ہم کو ہدایت کی ان کے حکم کو پورا کریں اور ان کے مقرر کیے ہوئے امام کے ساتھ دینے پر اپنا اسلام اور ایمان دکھائیں۔ اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے استدلال کو اور قوت ہوتی اور ایک ایسے گروہ کثیر کی بات کے انکار پر ہمراہیان معاویہ رضی اللہ عنہ کو

جرات نہ ہوتی۔

پس ایسے استدلال کو چھوڑنا اور جھوٹی اور غلط بات کو سند میں پیش کرنا درحقیقت جناب امیر کی عصمت بلکہ صداقت میں شک پیدا کرنا ہے۔ رہا تقیہ تو اس کا موقع اور محل ہی کیا تھا، اس لیے کہ اگر وہ روایتیں حضرات امامیہ کی صحیح ہیں جن میں صحابہ کی برائیاں برسر منبر اور علی رؤس الاشہاد جناب امیر نے بیان کیں تو پھر خوف کس کا تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی غلط اور جھوٹی تعریفیں کرتے اور مہاجرین اور انصار کی شان میں ایسے تعریف کے فقرات لکھتے۔ غرض کہ اگر عقل سلیم کو دخل دیا جائے تو اس میں کچھ شبہ نہیں رہتا کہ جناب امیر بھی خلافت کو غیر منصوص سمجھتے تھے اور مہاجرین و انصار کبھی ان کے مخالف نہ تھے اور خلافت مہاجرین و انصار اور اہل حل و عقد کے اتفاق پر مبنی تھی۔ جب آپ کا وقت آیا تو مہاجرین و انصار نے آپ سے بیعت کی اور آپ کو خلیفہ قرار دیا اور آپ کی مدد کرنے میں سعی کا کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ اور اسی سے ہر غیر متعصب منصف اس بات کو تسلیم کرے گا کہ اگر لوگوں نے آپ کا حق چھینا اور فدک کو غصب اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر ظلم و ستم کیا ہوتا تو بلاشبہ حضرت امیر مقابلے اور مقاتلے پر آمادہ ہوتے اور وہ لوگ جنہوں نے آپ کی خلافت میں آپ کا ساتھ دیا ضرور آپ کے ساتھ ہوتے، اور جس طرح امیر شام کے مقابلے میں اپنی جانیں علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر قربان کیں اس سے بڑھ کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا ساتھ دیتے، ان پر ظلم و ستم کرنے والوں سے مقابلہ کرتے اور اہل بیت کے ساتھ اپنی محبت دکھاتے۔ اور اس سے ہر شخص یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ وہ روایتیں جن میں ظلم و ستم کے واقعات نہایت مبالغے سے بیان کیے گئے ہیں بے اصل اور غلط ہیں۔

علاوہ ان امور کے جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا، یہ بات بھی غور کرنے کے لائق ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے دو بڑے گروہ، ایک مہاجرین دوسرے انصار۔ مہاجرین کی نسبت حضرات شیعہ کہتے ہیں کہ انہیں جناب امیر سے اس لیے عداوت تھی کہ ان کے عزیز و قریب اکثر جہادوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے مارے گئے تھے اور اسی بات کا رنج ان لوگوں کے دلوں میں چلا آتا تھا۔ اسی لیے مہاجرین نے آپ کا ساتھ نہ دیا اور آپ کے حقوق غصب

کرنے والوں کے ساتھ ہو گئے، یہ بات بچوں کے ہنسنے کے لائق ہے۔ اس لیے کہ اول تو تنہا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہی جہاد کرنے والوں میں سے نہ تھے اور نہ صرف ایک انہوں نے ہی سب لوگوں کو قتل کیا تھا بلکہ خود مہاجرین نے اپنے عزیزوں اور قریبوں کو چھوڑ دیا تھا اور پیغمبر خدا ﷺ کے ساتھ جہاد میں شریک ہو کر اپنے خویش و اقارب کے قتل کرنے میں دریغ نہ کیا تھا۔ علاوہ بریں جو کچھ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیا اور جن کو جہاد میں مارا وہ سب پیغمبر خدا ﷺ کے حکم سے کیا۔ اس لیے چاہیے تھا کہ مہاجرین سب سے زیادہ جناب سرور کائنات سے عداوت رکھتے اور انہیں کی رسالت کے منکر ہوتے نہ یہ کہ پیغمبر خدا ﷺ پر تو اپنی جانیں نثار کرتے اور شمع نبوت پر پروانہ وار قربان ہوتے رہتے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنہوں نے صرف پیغمبر خدا ﷺ کے حکم سے اور ان کی مدد کے لیے مہاجرین کے خویش و اقارب کو قتل کیا عداوت رکھتے۔ اس کے سوا اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتل بھی کیا تو مہاجرین کے خویش و اقارب کو کیا تھا، انصار کے گروہ میں سے تو کوئی ایسا نہ تھا جس کے عزیز اور رشتہ داروں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتل کیا ہو۔ پھر ان کو آپ کے ساتھ عداوت رکھنے کا کیا سبب ہے۔ کیونکہ جو علت عداوت کی بیان کی جاتی ہے وہ انصار میں موجود ہی نہ تھی بلکہ انصار کا وہ معزز فرقہ ہے کہ جس کو اپنی وفات کے اخیر وقت تک جناب پیغمبر خدا ﷺ چاہتے رہے اور ان کی نصرت و مدد کا شکر یہ ادا فرماتے رہے، یہاں تک کہ آپ نے انصار کی شان میں فرمایا کہ یہ میری عیال و فرزند ہیں اور ان کے ساتھ نیکی کرنے اور اچھی طرح سے پیش آنے کی آخری دم تک وصیت فرمائی۔ ایسے لوگوں کو جناب امیر کے ساتھ خاص محبت اور ایک خصوصیت ہونی چاہیے تھی نہ کہ دشمنی اور عداوت۔

کیا حضرات امامیہ اپنے یہاں کی ان روایتوں کو ملاحظہ نہیں فرماتے جن میں انصار کے فضائل اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت پیغمبر خدا ﷺ نے فرمائی ہے۔ ذرا تفسیر ”منہج الصادقین“ اور ”مجمع البیان“ طبرسی ہی اٹھا کر دیکھئے کہ اس میں خود مفسرین امامیہ نے کیا لکھا ہے: ”یہ موقع نہیں ہے کہ میں تمام روایتیں اس کے متعلق یہاں نقل کروں، صرف ایک

روایت منہج الصادقین کہ بیان کرتا ہوں۔“ (مفسر منہج الصادقین)

﴿لَقَدْ نَصَرَ كُمْ اللَّهُ فِي مَوَاطِنٍ كَثِيرَةٍ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ﴾ (سورہ توبہ: ۲۵)

”مدد کر چکا اللہ تم کو بہت میدانوں میں اور حنین کے دن۔“

کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ حنین و اوطاس کی غنیمت سے پیغمبر خدا ﷺ نے موافقۃ القلوب کو حصہ دیا اور مہاجرین کو زیادہ اور انصار کو کم۔ اس تقسیم سے انصار غمگین اور رنجیدہ ہوئے اور بعض کہنے لگے کہ پیغمبر ﷺ نے تمام غنیمت کا مال اپنی قوم کو دیا اور ہم کو محروم کیا۔ آنحضرت ﷺ کو اس کے سننے سے نہایت رنج ہوا اور انصار کو جمع کر کے فرمایا کہ تم دوزخ کے کنارے پر تھے خداوند تعالیٰ نے میرے واسطے سے تم کو اس سے نجات دی کیا یہ سچ نہیں ہے، سب نے کہا یا رسول اللہ! یہ سچ ہے، اسی طرح آپ نے چند اور باتیں فرما کر یہ کہا کہ تم بھی اس کے جواب میں کہہ سکتے ہو کہ میں تنہا آیا تھا اور تم نے میری مدد کی اور میں خائف تھا تم نے امان دی اور یہ لوگ میری تکذیب کرتے تھے، تم نے تصدیق کی۔ انصار رضی اللہ عنہم یہ بات سن کر رونے لگے اور ہائے ہائے کرنے لگے اور پیغمبر خدا ﷺ کے پاؤں پر گر کر کہنے لگے یا رسول اللہ! تن و جان و مال ہمارا آپ پر قربان ہو ہمارا مال بھی آپ کے اختیار میں ہے، اگر آپ چاہیں اپنی قوم کو عطا فرمائیں اور جو کچھ آپ کی نسبت ہم لوگوں میں سے بعض نے کہا ہے وہ بے ادب اور ادنیٰ درجے کے لوگ ہیں اور اب وہ تو یہ کرتے ہیں آپ ان کے لیے استغفار فرمائیے تب آپ نے ہاتھ دعا کے لیے اٹھایا اور فرمایا:

((اللهم اغفر الانصار و ابناء الانصار و ابناء ابنا الانصار

يامعشر الانصار اما ترضون ان ينصرف الناس بالشاة والغنم

وفى سهمكم رسول الله قالوا بلى يا رسول الله! رضينا بالله

وعنه وبرسوله فقال الانصار كرشى¹ وعبيتى لوسلك الناس

¹ كرش عيال و فرزندان خورد يقال هم كرش منشورة ای صبيان صغار، والعبية يقال عبية فلان اذا كان موضع

وادیا و سلك الانصار شعبا لسلكت شعب الانصاره .))

(ص ۱۰، ج ۲، طبع ایران)

”اے اللہ! انصار کو اور ان کے بیٹوں اور پوتوں کو معاف فرما، اے انصار کیا تم اس بات سے راضی نہیں ہو کہ اور لوگوں کے حصے میں مویشی اور بکریاں ہوں اور تمہارے حصے میں خدا کا رسول، انصار کہنے لگے کہ ہاں ہم راضی ہیں خدا سے اور اس کے رسول سے، اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ انصار میری عیال و فرزند اور صاحب اسرار ہیں، اگر لوگ کسی راستے پر چلیں اور انصار دوسرے راستے پر تو میں اسی راہ پر چلوں گا جس پر انصار چلے ہوں۔“

مجمع البیان طبرسی میں اسی روایت میں یہ الفاظ اور بیان کیے گئے ہیں کہ اس کے بعد آپ نے فرمایا:

((ولولا الهجرة لكنت امرأ من الانصار اللهم ارحم الانصار
وابناء الانصار وابناء ابناء الانصار فبکی القوم حتی اخضبت
لحاهم .))

”اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں بھی ایک آدمی منجملہ ان کے ہوتا اور پھر آپ نے یہ دعا کی کہ خدایا رحم کر انصار پر اور ان کے بیٹوں اور ان کے پوتوں پر، یہ سن کر انصار رونے لگے یہاں تک کہ ان کی داڑھیاں تر ہو گئیں۔“

احتجاج طبرسی ۱ میں ابو الفضل محمد بن عبد اللہ شیبانی سے روایت ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ اپنی وفات کے قریب مرض کی حالت میں فضل بن عباس اور ان کے غلام ثوبان پر سہارا لگائے ہوئے نماز کے لیے آئے اور بعد نماز کے مکان کو واپس تشریف لے گئے اور ثوبان سے کہا کہ تم دروازے پر بیٹھے رہو اگر کوئی انصار میں سے آئے تو انہیں اندر آنے سے منع نہ کرنا اور پھر آپ پر غشی طاری ہو گئی، اتنے میں انصار آئے اور کہا کہ ہم پیغمبر خدا ﷺ کے پاس جانا

چاہتے ہیں، حاجب نے جواب دیا کہ اس وقت آپ پر غشی طاری ہے اور ازواج مطہرات آپ کے پاس ہیں، یہ سن کر انصار رونے لگے، جب رسول خدا ﷺ نے ان کے رونے کی آواز سنی پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ جواب میں عرض کیا گیا کہ انصار ہیں، آپ یہ سن کر علی اور عباس رضی اللہ عنہما پر سہارا لگا کر باہر تشریف لائے اور یہ خطبہ فرمایا:

((يا معاشر الناس انه لم يمت نبى قط الا خلفت تركة و قد تركت فيكم الثقلين كتاب الله و اهل بيتى فمن ضيعهم ضيعه الله الا وان الانصار كرشى و عيبتى التى آوى اليها و انى او صيكم بتقوى الله و الاحسان اليهم فاقبلوا من محسنهم و تجاوزوا عن مسيئتهم .))

”یعنی اے لوگو! کسی نبی نے دنیا سے انتقال نہیں کیا جس نے کچھ ترکہ نہ چھوڑا ہو، میں تمہارے واسطے ترکہ میں دو چیزیں چھوڑتا ہوں، اللہ کی کتاب اور اپنے اہل بیت کو جو انہیں چھوڑ دے گا اللہ اسے خراب کر دے گا اور خبردار یہ انصار میرے عزیز اور میرے چھوٹے بچوں کے موافق ہیں اور میرے بھروسے کے لوگ اور میرے محرم اسرار (راز دار) ہیں، میں تم کو اللہ کے خوف اور ان کے ساتھ نیکی کرنے کی وصیت کرتا ہوں جو ان میں نیک ہیں ان کی نیکی قبول کرو اور جن سے خطا ہو ان سے درگزر کرو۔“

یہ آپ کے آخری الفاظ ہیں جو انصار رضی اللہ عنہم کی شان میں فرمائے۔ افسوس ہے ان لوگوں پر کہ جو پیغمبر خدا ﷺ کو خدا کا رسول سمجھیں اور اس پر ایمان لانے کا دعویٰ کریں اور ان کلمات کو آپ کی زبان مبارک سے خود ہی نقل فرمائیں، اور پیغمبر خدا ﷺ کی طرف سے انصار کی شان میں ایسی وصیت بیان کریں اور پھر ان کو مرتد اور دشمن اہل بیت اور خارج از دائرہ ایمان قرار دیں۔ کیا کوئی آدمی ایک لحظہ کے لیے مان سکتا ہے کہ یہ انصار کا گروہ جس کو رسول خدا ﷺ نے اپنے عیال فرزندان خورد کہا ہو، وہ جناب امیر سے عداوت رکھیں گے

اور بلا سبب ان کا ساتھ چھوڑ کر دوسروں کے شریک ہوں گے اور نص جلی سن سن کر اپنے گروہ میں سے سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو امام بنانے کا ارادہ کریں گے اور جناب امیر کی شان میں جو نص جلی تھی اسے ایسا بھلا دیں گے کہ کسی وقت اس کا ذکر بھی زبان پر نہ لائیں اور اسے ایسا نسیا منسیا کر دیں کہ کسی موقع پر اس کا خیال نہ رکھیں۔ حاشائیں حاشا۔

اس کے جواب میں قاضی نور اللہ شوستر نے ”احقاق الحق“ میں یہ فرمایا ہے کہ انصار ۱ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں جو نص ہے اسے سنا تھا اور آپس میں اس کا ذکر کیا تھا لیکن انہوں نے سقیفہ بنی ساعدہ میں اسے ابو بکر رضی اللہ عنہ پر بطور حجت کے بوجہ اس شبہ کے پیش نہیں کیا

۱ اصل عبارت یہ ہے: و اما خامسا فلان قوله فلو كان الانصار سمعوه غير مسموع لانهم سمعوا ذلك النص و تذاكره في ما بينهم لكنهم لم يجعلوا اذا لك اليوم حجة على ابى بكر بشبهة او قعها اولياء ابى بكر وغيره في قلوب الناس من ان علياً قد تقاعد عن تصدى الخلافة والتزم البيت و امسك عن احياء هذلميت فان المذكور في المعبر من كتب السيد والتواريخ انه لما تو في رسول الهل واشتغل على مع اصحابه من بنى هاشم وغيرهم بتجهيز النبي و تعزيتة معتقداً ان احد لا يطمع في هذا الامر مع وجوده اوقع بعض المنحرفين عن علي في قلوب الناس انه قد تقاعد عن تصدى الخلافة يشدة ما اصابه من مصيبة النبي و سكن قربته مشتغلاً بالحزن والتعزية فجاء خزيمة بن ثابت الانصارى و قال لقومه من الانصار ما سمعته من حال علي و ذكر انه لا بد ممن علي هذا لا مرو ليس سواه قرشى يليق بذلك فخاف الانصار ان يشتد عليهم البلية و يلى هذا الامر قرشى فظ غليظ يتقم منهم للثارات الجاهلية والا ضغان البدوية فتوجهوا ابى سعد بن عباده سيده الانصار و حضر و سقيفة ملتمساً منه قبول الخلافة فابى سعد عن ذلك لمكان علي و انه المنصوص بالخلافة عن الله تعالى و رسوله فلما سمع قریش بذلك و كانوا امنتهرين للفرصة والسوافى الامر وعجلوا فى البيعة لابی بكر فبادروا الى السقيفة لتسكين نائرة الانصار و التمسوا بيعة ابى بكر بالطوع و الاجبار فقال لهم الانصار اذا تر كتم فعل الله و رسوله فليس احد منا و منكم بعد علي بن ابى طالب اولى من غيره فمنا امير و منكم امير فابى ابو بكر و اصحابه عند ذلك محتجين فى ذلك بان الائمة من قریش و ابى سعد عن قبول امارا تهم متمسكاً بان النص لذلك غيرهم فاضطرب الحال الى ان مال قلب بشر بن سعد بن ثعلبه الانصارى زعمالاً بن عباده الى ترجيح جانب قریش و موافقتهم فقوى امر قریش و بادر عمرالى صفاق يده على يد ابى بكر و بايعه هو و جماعة من اضرابه فتنه كما اخبر عنه هو بعد ذلك بقوله كانت بيعة ابى بكر فلتة و قى الله شرها عن المسلمين۔ ۱۲ احقاق الحق صفحہ ۶۵۔

جو ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دوستوں وغیرہ نے لوگوں کے دلوں میں ڈال دیا تھا اور وہ یہ تھا کہ علی رضی اللہ عنہ نے خلافت کا خیال چھوڑ دیا ہے اور وہ گھر میں بیٹھ رہے ہیں اور ان لوگوں نے جو علی سے منحرف تھے اس وقت جبکہ آپ رسول خدا ﷺ کی تجھیز و تکلفین میں مشغول تھے اوروں کے دلوں میں یہ بات جمادی کہ آپ پر آنحضرت ﷺ کی وفات کی مصیبت کا ایسا اثر ہوا ہے کہ آپ نے خلافت کا ارادہ ترک کر دیا ہے اور آپ نے خانہ نشینی اختیار کی ہے، چنانچہ خزیمہ بن ثابت انصاری آئے اور اس نے جو علی رضی اللہ عنہ کا حال سنا تھا وہ اپنی قوم سے کہا اور یہ بھی ذکر کیا کہ خلافت کے لیے کوئی ہونا چاہیے اور علی رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی قریشی ایسا نہیں جو اس کے لائق ہو۔ اس وقت انصار کو خوف ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ ان پر بلوہ زیادہ ہو جائے اور خلافت کا متولی کوئی ایسا درشت خو قریشی ہو کہ ان سے جاہلیت کے خونوں اور بدر کے کینوں کا بدلہ لے، اس خیال سے وہ سعد بن عبادہ سردار انصار کے پاس آئے اور سقیفہ میں آکر ان سے خلافت کے قبول کرنے کے لیے کہا، سعد نے بوجہ علی رضی اللہ عنہ کے موجود ہونے کے انکار کیا اور یہ کہا کہ وہی اللہ اور رسول کی طرف سے منصوص بالخلافت ہیں۔ قریش نے یہ بات سنی اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع کیا اور انصار سے طوعاً و کرہاً ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کے لیے التماس کیا، تب انصار نے کہا کہ جب تم اللہ و رسول ﷺ کی نص کو ترک کرتے ہو تو، ہم میں اور تم میں علی بن ابی طالبؑ کے بعد کوئی اور اولی نہیں۔ اس لیے ایک امیر ہم میں سے ہوگا اور ایک تم میں سے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ اور ان کے یاروں نے اس سے انکار کیا اور یہ حجت بیان کی کہ امام قریش ہی میں سے ہوگا۔ الی آخر القصة .

علامہ ابوالسعادات حلّی نے شرح دعائے صنمی قریش میں یہ روایت کی ہے کہ سقیفہ ❶

❶ وروی الشيخ الفاضل ابوالسعادات الحلّی فی شرح دعائے صنمی قریش انه اجتمع ابو بکر و عمر و ابو عبیدہ و اخوانهم فی سقیفہ بنی ساعدة یطلبون الحکم والبیعة من غیر اکثرات باهل البيت و بنی ہاشم و کل واحد من هؤلاء الثلاثة یرجو الحکم والا مرلنفسه و یعطفہ علی صاحبه فانکر علیہم الانصار واصرروا علی الدفاع والا امتناع و احتجوا علیہم بما قال رسول اللہ فی علی من التوکید فی امامتہ فی مواطن شتی و امرایا ہم بالتسلیم علیہ با مارة المومنین فقال ابو بکر قد کان ذالک <<<

کے دن ابوبکر و عمر اور ابو عبیدہ ہر ایک اپنے لیے امارت چاہتا اور بظاہر دوسرے کا نام لیتا تھا، اس پر انصار نے انکار کیا اور یہ اصرار تمام اس سے مخالفت کی اور رسول اللہ ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ کے باب میں اور ان کی امامت کے لیے جو کئی مواقع پر تاکیدیں فرمائی تھیں اس سے احتجاج کیا اور یہ کہ رسول اللہ نے ان کو حکم دیا ہے کہ امارت مومنین کو علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں ایسا ہی تھا لیکن رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس قول سے اسے منسوخ فرما دیا ہے: ہم وہ اہل بیت ہیں کہ خدا نے ہم کو نبوت سے سرفراز کیا اور دنیا کو ہمارے لیے ناپسند فرمایا اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لیے نبوت اور خلافت کو جمع نہیں کرے گا، عمرو رضی اللہ عنہ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے ان کی تصدیق کی اور علی رضی اللہ عنہ کے گھر میں بیٹھ رہنے اور تجہیز و تکفین میں مشغول رہنے کی یہی وجہ بیان کی کہ علی رضی اللہ عنہ جانتے ہیں کہ خلافت ان سے محول ہو چکی ہے۔ اس پر انصار نے کہا: ((منا امیر و منکم امیر.....)) انتھی

ان روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ انصار جناب امیر کے مخالفین میں سے نہ تھے، نہ خود خلافت کے خواہاں، اور جو ارادہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے کیا تو وہ صرف دھوکہ تھا اور علی رضی اللہ عنہ کی نسبت جو نص انہوں نے سنی تھی اسے انہوں نے چھپایا نہیں تھا بلکہ اسے سقیفہ بنی ساعدہ میں پیش کیا تھا اور اس سے جناب امیر کی خلافت کا استحقاق بتایا تھا، مگر جب ان کو یہ دھوکہ دیا گیا کہ علی رضی اللہ عنہ نے فرط غم سے خلافت کا ارادہ چھوڑ دیا ہے تب انہوں نے کہا کہ ایسی حالت میں

لكن نسخه النبي بقوله انا اهل البيت كرمنا الله واصطفانا بالنبوة ولم يرض لنا بالدنيا وان الله لا يجمع لنا النبوة والخلافة فصدقاہ عمر و ابو عبیدة فی ذلك وعللا قعود علی فی بیته والاشتغال بتجهیز النبی دون تصدی امر الخلافة بعلمه بتحويل الامر عنه فقالت الانصار اذا لانرضی والله بامارة غیرنا علینا منا امیر و منکم امیر فذکروا عن رسول الله الائمة من قریش و شبهوا الامر علی الانصار و سائر الامة و قطعوا بذلك حجتهم و اخذوا بیعتهم و لما فرغ علی و اصحابه عن تجهیز النبی و دفنه و تکلموا فی ذلك اعتذروا تارة بان الناس بايعوا و لم یکن لهم علم بانک تنازعهم فی الامر و نکث البيعة الواقعة یورث مفساد بین المسلمین و خلاه فی ارکان الدین و تارة بانهم ظنوا انک لشدة مصیبة النبی طرحت الخلافة و الامارة فاتفق اصحاب رسول الله علی تفویض الامر الی ابی بکر ای غیر ذلك من الاعذار الذی یسجیء مع جوابهانی المواضع لائق بها ۱۲، احقاق الحق صفحہ ۶۵۔

ہم کسی دوسرے قریشی کی امامت منظور نہ کریں گے اور اسی لیے مجالس المومنین میں اوس و خزرج دونوں قبیلہ انصار کو خاص شیعان علی میں سے شمار کیا ہے اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ مدعی امامت کو جناب امیر اور ان کی اولاد امجاد کے مخلصین خاص میں داخل فرمایا ہے، جیسا کہ قاضی نور اللہ شوستری فرماتے ہیں:

((الاولس و الخزرج دو قبیلہ بزرگ انداز انصار کہ حال ایشاں از غایت اشتہار حاجت باظہار ندارد و اخلاص این دو طائفہ خصوصاً سعد بن عبادہ خزرجی و اولاد امجاد او نسبت بحضرت علویہ مرتضویہ غایت ظہور دارد.))
 ”اوس اور خزرج یہ انصار کے دو بڑے قبیلے ہیں جن کی جواں مردی وغیرہ کے اظہار کی ضرورت نہیں ان دونوں جماعتوں خاص کر سعد بن عبادہ خزرجی کی اولاد کو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے بے انتہا خاص خلوص تھا۔“

پس اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ درحقیقت مقابلے و مقاتلے کا ارادہ کرتے اور اپنے حقوق کے لیے غاصبین کی مدافعت چاہتے تو کیا انصار ان کی اعانت نہ کرتے اور ان کا ساتھ نہ دیتے؟
 انصار کی کیفیت اور ان کے ایمان اور اسلام کی حقیقت اور اہل بیت کرام کے ساتھ محبت کی حالت تو یہ ہے کہ جس کو ہم حضرات امامیہ کی روایتوں سے دکھا چکے، رہا دوسرا گروہ قریش کا جن میں مہاجرین داخل ہیں اور جن کو حضرات امامیہ اسلام اور ایمان دونوں سے خارج سمجھتے ہیں خصوصاً حضرات شیخین اور ان کے خاص معاونین کو، اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ حضرات ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم خلیفہ ہوئے اور ان کے زمانہ خلافت میں اسلام نے بہت ترقی کی اور انہی کے عہد میں بہت کثرت سے جہاد ہوئے اور انہی کے ہاتھوں کسریٰ اور قیصر کے ملک مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ یہ وہ واقعات ہیں کہ ان کا کوئی انکار ہی نہیں کر سکتا۔ فرق یہ ہے کہ حضرات امامیہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ ایمان سے بے بہرہ تھے اور منافق اور مرتد۔ اور جو کچھ ان کے زمانے میں ہوا اس سے ان کا ایمان اور اسلام

ثابت نہیں ہوتا، بہت سے ظالم اور دنیا دار بادشاہ ہوئے ہیں کہ باوجود ان کے فاسق و فاجر ہونے کے مسلمانوں کو فتح ہوئی اور کفار کے ملک میں اسلام پھیلا، اس لیے ان کی لڑائیاں مثل اور دنیا طلب بادشاہوں کے دنیاوی لڑائیوں میں داخل ہیں نہ کہ جہاد فی سبیل اللہ میں۔ اور ہم اہل سنت و الجماعت ان کے جہاد اور فتوحات کو ان کی خلافت کی حقیقت کی دلیل سمجھتے ہیں اور بموجب خدا کے اس وعدے کے کہ:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي

الْأَرْضِ﴾ (سورة النور: ۵۵)

”کہ اللہ نے ایمان اور عمل صالح والوں سے وعدہ کیا ہے کہ ان کو زمین میں خلافت دے گا۔“

ان فتوحات کو خدا کی بشارت اور وعدے کے موافق خیال کرتے ہیں۔ اب یہ امر دیکھنا باقی ہے کہ آیا حضرات امامیہ کی مستند اور معتبر کتابوں اور ائمہ کرام کے اقوال سے ہمارا اعتقاد صحیح ثابت ہوتا ہے یا حضرات امامیہ کا؟ اس کے لیے ہم ایک حدیث کافی کی پیش کرتے ہیں جس سے حضرات امامیہ کے تمام معتقدات جو خلفائے راشدین کی نسبت ہیں ہبَاءً اَمْنُورًا ہو جاتے ہیں اور خلفائے راشدین کا ایمان اور اعمال حسنہ سے متصف ہونے کا ثبوت ایسا ہوتا ہے کہ اس کا کوئی معقول جواب ہی نہیں دے سکتے۔

وہ حدیث یہ ہے کہ فروع کافی ① میں (باب من يجب عليه الجهاد و من لا يجب) میں ابو عمیر زبیری نے امام جعفر صادق سے روایت کی ہے ② کہ میں نے امام

① فروع کافی کتاب الجہاد مطبوعہ لکھنؤ صفحہ ۶۰۹۔ الشافی ترجمہ اردو فروع جلد ۴ صفحہ ۵۴۷ تا ۵۴۸۔

② اصل حدیث یہ ہے: عن علی بن ابراہیم عن ایبہ عن بکیر بن صالح عن القاسم بن یزید عن ابی عمیر الزبیری عن ابی عبد اللہ قال قلت اخبرنی عن الدعاء الی اللہ والجهاد فی سبیلہ اھو بقوم لا یحل الالھم ولا یقوم الامن کان منھم ام ھو مباح لكل من وعد اللہ عزوجل و آمن برسول اللہ ﷺ و من کان کذافلہ ان یدعوا الی اللہ عزوجل والی طاعته وان یجاھد فی سبیلہ فقال ذالک لقوم لا یحل

سے پوچھا کہ خدا کی طرف بلانا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا کسی خاص قوم سے مخصوص ہے یا ہر موحد اور مومن اس کا مجاز ہے؟ آپ نے جواب دیا: نہیں، وہ ایک خاص لوگوں سے مخصوص ہے اور کوئی دوسرا نہیں کر سکتا، میں نے پوچھا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ وہ

﴿﴾ ﴿﴾ ﴿﴾ لا اله الا الله ولا يقوم بذالك الا من كان منهم قلت من اولئك قال من قام بشرائط عزوجل في القتال والجهاد على المجاهدين فهو الماذون له في الدعاء الى الله عزوجل و من لم يكن بشرائط الله عزوجل في الجهاد على المجاهدين فليس بمادون له في الجهاد ولا الدعاء الى الله حتى يحكم الله في نفسه ما اخذ الله عليه من شرائط الجهاد قلت فينبى لى يرحمك الله تعالى قال ان الله تبارك و تعالى اخبر فى كتابه ادعاء اليه و وصف الدعاء اليه فجعل ذلك لهم درجات يعرف بعضها بعضا ويستدل بعضها على بعض فاخبرانه تبارك و تعالى اول من دعا الى نفسه فدعا الى طاعته و اتباع امره فبدا بنفسه فقال والله يدعوا الى دارالسلام ويهدى من يشاء الى صراط مستقيم، ثم ثنى برسوله فقال ادع الى سبيل ربك بالحكمة و الموعظة الحسنة و جادلهم بالتي هي احسن يعنى بالقرآن و لم يكن داعيا الى الله عزوجل من خالف امر الله و يدعوا اليه بغير ما امر فى كتابه و الدين امر لا يدعى الاب و قال فى نبى ﷺ و انك لتهدى الى صراط مستقيم يقول يدعو ثم ثلث بالدعاء اليه بكتابه ايضا فقال ان هذا القرآن يهدى للتي هي اقوم اى يدعو و يبشر المومنين، ثم ذكر من اذن فى الدعاء بعده و بعد رسوله فى كتابه فقال و لتكن منكم امة يدعوون الى الخير و يامرون بالمعروف و ينهون عن المنكر و اولئك هم المفلحون، ثم اخبر عن هذه الامة و ممن هي و انها من ذرية ابراهيم و من ذرية اسماعيل من مكان الحرم ممن لم يعبد و غير الله قط الذين و جبت لهم الدعوة دعوة ابراهيم و اسماعيل من اهل المسجد الذين اخبر عنهم فى كتابه انهم اذهب عنهم الرجس و طهرهم تطهيرا الذين و صفناهم قبل هذا فى صفة امة ابراهيم الذين عناهم الله تبارك و تعالى فى قوله ادعوا الى الله على بصيرة انا و من اتبعنى يعنى اول من اتبعه على الايمان به التصديق له و بما جاء به من عند الله عزوجل منه الامة التي بعث فيها و منها و اليها قبل الحق ممن لم يشرك بالله قط و لم يلبس ايمانه بظلم و هوا لشرك ثم ذكر اتباع نبى ﷺ و اتباع هذه الامة التي و صفها فى كتابه بالامر بالمعروف و النهى عن المنكر و جعلها داعية اليه و اذن له فى الدعاء اليه فقال يا ايها النبى حسبك الله و من اتبعك من المومنين ثم و صف اتباع نبى من المومنين فقال عزوجل محمد رسول الله و الذين معه اشد آء على الكفار رحماء بينهم تراهم ركعا سجدا يبتغون فضلا من الله و رضوانا سيما هم فى وجوههم من اثر السجود و ذلك مثلهم فى التوراة و مثلهم فى الانجيل و قال يوم لا يخزى الله النبى و الذين آمنوا معه نورهم يسعى بين ايديهم و بايما نهم يقولون ربنا اتمم لنا نورنا و اغفر لنا انك على كل شئ قدير يعنى اولئك المومنين فقال قدا فلاح المومنون ثم حلاهم و و صفهم كيلا يطمع فى اللحاق بهم الا من كان منهم فقال فيما حلاهم و و صفهم الذين ﴿﴾ ﴿﴾ ﴿﴾

لوگ جن میں وہ شرائط موجود ہوں جو خدا نے مجاہدین اور داعین الی اللہ کے مقرر فرمائے ہیں، اور جن میں وہ شرائط نہ پائے جائیں نہ اسے دعوت الی اللہ کی اجازت ہے نہ وہ جہاد فی سبیل اللہ کے لیے ماذون ہے۔ تب میں نے کہا کہ ان شرائط کو بیان فرمائیے، آپ نے

﴿﴾ ﴿﴾ ﴿﴾ ہم فی صلاتہم خاشعون والذین ہم عن اللغو معرضون الی قوله تعالیٰ اولئک ہم الوارثون الذین یرثون الفردوس ہم فیہا خالدون، ثم حلاہم ووصفہم کیلا یطمع فی اللحاق بہم الامن کان منہم فقال فیما حلاہم بہ ووصفہم و قال فی وصفہم و حلیتہم ایضا الذین لا یدعون مع اللہ الہا آخر آلیۃ ثم اخبر انہ اشتری من ہولاء المومنین و من کان علی مثل صفتہم انفسہم و اموالہم بان لہم الجنة یقاتلون فی سبیل اللہ فیقتلون و یقتلون و عدداً علیہ حقافی التوراة و الانجیل و القرآن ثم ذکر و فائہم لہ بعہدہ و مبايعتہ فقال و من اوفی بعہدہ من اللہ فاستبشر و ابیعکم الذی بايعتم بہ و ذالک ہوا الفوز العظیم فلما نزل ہذہ الآیۃ ان اللہ اشتری من المومنین انفسہم و اموالہم بان لہم الجنة قام رجل الی النبی ﷺ فقال یا نبی اللہ ارینک الرجل یاخذ سیفہ فیقتل حتی یقتل الا انہ یقترب من ہذہ المحارم اشہید ہو ما انزل اللہ عزوجل التائبون العابدون الحامدون السائحون الراكعون الساجدون الامرون بالمعروف و الناهون عن المنکر والحافظون لحدود اللہ و بشر المومنین، ففسر النبی ﷺ المجاہدین من المومنین الذین ہذہ صفتہم و حلیتہم بالشہادۃ و الجنة و قال التائبون من الذنوب العابدون الذین لا یعبدون الا اللہ ولا یشرکون بہ شیئا الحامدون الذین یحمدون اللہ علی کل حال فی الشدۃ و الرخاء السائحون و ہم الصائمون الراكعون الساجدون الذین یواظبون علی الصلوات الخمس الحافظون لہا و المحافظون علیہا برکوعہا و سجودہا و الخشوع فیہا و فی اوقاتها الامرون بالمعروف بعد ذالک و العاملون بہ و الناهون عن المنکر و لانتہون عنہ قال فبشر من قتل و ہو قائم بہذہ الشروط بالشہادۃ و الجنة ثم اخبر تبارک و تعالیٰ انہ لک یا مر با لقتال الاصحاب ہذہ الشروط فقال عزوجل اذن للذین یقاتلون بانہم ظلموا و ان اللہ علی نصرہم لقتیر الذین اخرجوا من ديارہم بغير حق الا ان یقولوا ربنا اللہ و ذالک ان جمیع ما بین السماء و الارض للہ عزوجل و لرسولہ و لا تباعہ من المومنین من اهل ہذہ الصفة فیما کان من الدنیا فی ایدی المشرکین و الکفار و الظلمۃ و الفجار من اهل الخلاف لرسول اللہ ﷺ و المولی عن طاعتہا مما کان فی ایدیہم ظلموا فیہ المومنین من اهل ہذہ الصفات و غلبوہم علیہ ما افاء اللہ علی رسول فہو حقہم افاء اللہ علیہم و ردہ الیہم و انما معنی الفئی کلما ساء الی المشرکین ثم رجع مما قد کان علیہ اوفیہ فمارجع الی مکانہ من قول او فعل فقد افاء مثل قول اللہ عزوجل فان فاء فان اللہ غفور رحیم ای رجعوا ثم قال و ان عز موا الطلاق فان اللہ سمیع علیہ و قال ان طائفتان من المومنین اقتتلوا فاصلحوا بینہما فان بغت احدہما علی الاخری فقاتلتا الی تبغی حتی تفی الی امر اللہ ای یرجع فان فاءت ای رجعت فاصلحوا بینہما بالعدل و اقسطوا ان اللہ ﴿﴾ ﴿﴾ ﴿﴾

فرمایا: خدائے عزوجل نے اس کے درجے مقرر کیے ہیں، اول خدائے تعالیٰ نے اپنی طرف اس دعوت کا بیان فرمایا ہے: ﴿وَاللّٰهُ يَدْعُوۡاۤ اِلَى دَارِ السَّلَامِ وَيَهْدِيۡ مَنْ يَّشَاءُ اِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝﴾ (یونس: ۳۵) ”کہ اللہ جنت کی دعوت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے

﴿﴾ ﴿﴾ ﴿﴾ يحب المقسطين يعنى بقوله نفى ترجع فذاك الدليل على ان الفئى كل راجع الى مكانه قد كان عليه اوفيه و يقال للشمس اذازالت قدفائت الشمس حين نفى الفئى عند رجوع الشمس الى زوالها وكذلك ما افاء الله على المؤمنين من الكفار فانما هي حقوق المؤمنين رجعت اليهم بعد ظلمهم ايا هم فذلك قوله اذن للذين يقاتلون بانهم ظلموا ما كان المؤمنون احق به منصور وانما اذن المؤمنين الذين قاموا بشرائط الايمان التي وصفناها وذلك انه لا يكون ما ذوناله في القتال حتى يكون مظلوما ولا يكون مظلوما حتى يكون مومنا ولا يكون مومنا حتى يكون قائما بشرائط الايمان التي شرط الله عزوجل على المؤمنين و المجاهدين فاذا تكاملت فيه شرائط الله عزوجل كان مومنا واذا كان مومنا كان مظلوما واذا كان مظلوما كان ما ذونا في الجهاد بقوله عزوجل اذن للذين يقاتلون بانهم ظلموا وان الله على نصرهم لقدير الآية وان لم يكن مستكملا بشرائط الايمان فهو ظالم ممن ينبغي و يجب جهاده حتى يتوب و ليس مثله ما ذونا في الجهاد والدعاء الى الله عزوجل لانه ليس من المؤمنين المظلومين الذين اذن لهم في القتال فلما نزلت هذه الآية اذن للذين يقاتلون بانهم ظلموا في المهاجرين الذين اخرجهم اهل مكة من ديارهم و اموالهم احل لهم جهادهم بظلمهم اياهم وان لهم في القتال فقلت فهذه الآية نزلت في المهاجرين بظلم مشركي اهل مكة لهم فما بالهم في قتال كسرى و قيصر و من دونهم من مشركي قبائل العرب فقال لو كان اذن لهم في قتال من ظلمهم من اهل مكة فقط لم يكن لهم في قتال جموع كسرى و قيصر و غير اهل مكة من قبائل العرب سبيل لان الذين ظلموهم غير هم وانما اذن لهم في قتال من ظلمهم من اهل مكة لا اخرجهم اياهم من ديارهم و اموالهم بغير حق ولو كانت آلاية انما عنت المهاجرين الذين ظلمهم اهل مكة كانت الآية مرتفعة الغرض عن بعدهم اذ لم يبق من الظالمين و المظلومين احد و كان فرضا مرفوعا عن الناس بعدهم و ليس كما ظننت ولا كما ذكرت و لكن المهاجرين ظلموا من جهتين ظلمهم اهل مكة باخراجهم من ديارهم و اموالهم فقاتلوهم باذن الله تعالى لهم في ذلك و ظلمهم كسرى و قيصر و من كان دونهم من قبائل العرب و العجم بما كان في ايديهم مما كان المؤمنون احق بهم منهم فقد قاتلوهم باذن الله عزوجل لهم في ذلك و الحجة هذه الآية يقاتل مومنو كل زمان و انما اذن الله عزوجل للمؤمنين الذين قاموا بما وصف الله عزوجل من الشرائط التي شرطها الله على المؤمنين في الايمان و الجهاد و من كان قائما بتلك الشرائط فهو مومن و هو مظلوم و ما ذون له في الجهاد بذلك المعنى و من كان على خلاف ذلك فهو ظالم و ليس من المظلومين و ليس بما ذون له في القتال ولا بالنهي عن المنكر و الا مر ﴿﴾ ﴿﴾ ﴿﴾

سیدھی راہ دکھاتا ہے۔“ بعد اس کے پیغمبر خدا ﷺ کو دعوت کے لیے ارشاد کیا: ﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ (النحل: ۱۲۵)..... ”کہ بلاؤ اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور اچھے وعظ سے اور مجادلہ کرو ان سے اچھے طریقے سے۔“ پھر ایسی قوم کو دعوت کی اجازت دی ہے جو نیک ہوں اور

﴿﴾ بالمعروف لا نه ليس من اهل ذلك ولا ماذون له في الدعاء الى الله عزوجل لا نه ليس هذا كمثلہ و امر بدعائیه ولا يكون مجاهد امن قد امر المومنون بجهادہ او اضطر الجهاد عليه و منعه منه ولا يكون داعيا الى الله عزوجل من امر بدعاء مثله الى التوبة والحق والامر بالمعروف والنهي عن المنكر ولا يا بالمعروف من قدامان يومر ولا ينهي عن المنكر من قدامان ينهي فمن كانت قدمت فيه شرائط الله عزوجل التي وصف بها اهلها من اصحاب النبي ﷺ و هو مظلوم فهو ماذون في الجهاد و كما اذن لهم لان حكم الله عزوجل في الاولين والاخرين وقرائضه عليهم سواء لا من علته او حادث يكون والا ولون والآخرون ايضا في منع الحوادث شركاء والفرائض عليهم واحدة يسأل الآخرون من اداء الفرائض عما يسئل عنه الاولون ويحاسبون عما به يحاسبون و من لم يكن على صفته من اذن له في الجهاد من المومنين و ليس من اهل الجهاد و ليس بما ذون له فيه حتى يفى بما شرط الله عزوجل عليه فاذا تكاملت فيه شرائط الله عزوجل على المومنين و المجاهدين فهو من الماذون و نين لهم في الجهاد فليتق الله عزوجل عهد و لا يغتر بالا نالى التي نهى الله عزوجل عنها من هذه الاحاديث اكاذبة على الله التي تكذبها القرآن و يتبرأ به منها و من حملها اوروايتها ولا يقدم على الله عزوجل بشبهة لا يقدر بها فانه ليس وراء المعترض للقتل في سبيل الله منزلة يوتى الله من قبلها وهي غاية الاعمال في عظم قدرها فليحكم امراء لنفسه ويسرها كتاب الله عزوجل و يعرضها عليه فانه لا احد اعرف بالمرء من نفسه فان وجدها قائمة بما شرط الله عليه في الجهاد فليقدم على الجهاد وان علم تقصير فليصلحها وليقمها على مافرض الله عليها من الجهاد ثم ليقدم بها وهي طاهرة مطهرة من كل دنس يحول بينها و بين جهادها يقول لمن اراد الجهاد و هو على خلاف ما وصفنا من شرائط الله عزوجل على المومنين و المجاهدين لا يجاهد و ولكن يقول قد علمنا كم ما شرط الله عزوجل على اهل الجهاد الذين بايعهم واشترى منهم انفسهم واموالهم بالجنان فيصلح امر اما علم من نفسه من تقصير عن ذلك و ليقضها على شرائط الله فان رأى انه و في بها و تكاملت فيه فانه ممن اذن الله عزوجل في الجهاد و ان ابى لا يكون مجاهداً على ما فيه من الاصرار على المعاصي و المحارم و الاقدام على الجهاد بالخبط و العمى و القدوم على الله عزوجل بالجهل و الروايات اكاذبة فلقد عمرى جاء الاثر فيمن فعل هذا الفعل ان الله عزوجل ينصر هذا الدين باقوام لا خلاق لهم فليتق الله عزوجل امراء و اليحذر ان يكون منهم فقد بين لكم و لا حذرکم بعد البيان في الجهل و لا قوة الا بالله حسبنا الله عليه توكلنا و اليه المصير. (ازالة الغين جلد دوم صفحہ ۱۰۵ تا ۱۰۹)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہوں، جیسے فرمایا: ﴿وَلَتَكُنَّ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْبَعْرِوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (سورہ آل عمران: ۱۰۴) ”یعنی تم میں ایسے لوگ ہونے چاہئیں کہ جو بھلی بات کی دعوت دیں اور اچھی بات کا حکم کریں اور بری بات سے منع کریں اور یہی لوگ فلاح کو پہنچنے والے ہیں۔“ پھر اس امت سے ان لوگوں کو ماذون بہ دعوت فرمایا ہے جو ذریت ابراہیم علیہ السلام اور ذریت اسماعیل علیہ السلام سے ہوں حرم کے رہنے والوں میں سے جنہوں نے سوائے خدا کے کبھی کسی کی عبادت نہ کی ہو اور جن کی نسبت فرمایا ہے: ((اذْهَبْ عَنْهُمْ الرَّجْسَ وَطَهِّرْ تَطْهِيرًا)) ”کہ ان سے نجاست کو دور کر دیا اور ان کو خوب پاک کر دیا۔“ اس کے بعد رسول خدا ﷺ کی اتباع کرنے والوں کو دعوت کا اذن دیا گیا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی نسبت خدا نے فرمایا ہے: ﴿مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَبَاءٌ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا سِيِّئَاتِهِمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ﴾ (سورہ محمد: ۲۹) ”یعنی محمد ﷺ اس کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ایمان والے ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں نرم ہیں تو ان کو رکوع اور سجدے میں دیکھتا ہے کہ وہ اس سے اللہ کا فضل اور اس کی رضا چاہتے ہیں سجدوں کے اثر سے ان کی پیشانی پر نشانی ہے، یہ مثل ہے ان کی توریت اور انجیل میں۔“ پھر ان مومنین کی صفت بھی بیان کی تا کہ جو لوگ اس صفت سے موصوف نہ ہوں ان میں شامل ہونے کی توقع نہ کریں اور وہ صفت یہ ہے:

﴿الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ

مُعْرَضُونَ ۝﴾ (سورہ مؤمنون: ۲، ۳)

﴿وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ﴾ (سورہ الفرقان: ۶۸)

”کہ وہ لوگ اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں اور لغویات سے اعراض کرتے ہیں۔“

”اور اللہ کے ساتھ دوسرے معبود کو نہیں شامل کرتے ہیں۔“

پھر ان لوگوں کو اس میں داخل کیا جو ان مومنین کی سی صفات رکھتے ہوں، جیسے فرمایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعَدًّا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝﴾

(سورہ التوبہ: ۱۱۱)

”اللہ نے مومنین سے ان کی جانیں اور مال جنت کے بدلے میں خرید لیے ہیں کہ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں پھر ماریں اور مارے جائیں، یہ خدا پر وعدہ ہے سچا جو تورات، انجیل اور قرآن میں مذکور ہے اور کون ہے اللہ سے زیادہ اپنے وعدے کو پورا کرنے والا تو تم اپنے اس بیع سے جس کا تم نے اس سے معاملہ کیا ہے! بشارت حاصل کرو اور یہی ہے بڑی مراد کو پہنچنا۔“

جب آیت: ﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ﴾ ”نازل ہوئی تو ایک آدمی نے کھڑے ہو کر پیغمبر خدا ﷺ سے عرض کیا کہ اگر کوئی شخص تلوار لے کر میدان جہاد میں لڑے یہاں تک کہ مارا جائے مگر وہ مرتکب محرمات ہو کیا وہ بھی شہیدوں میں داخل ہوگا؟ اس وقت خدا نے یہ آیت نازل کی: ﴿الَّذِينَ يَبُؤْنَ الْعِبْدُونَ الْحَدُونَ السَّائِحُونَ الرَّكْعُونَ السُّجْدُونَ الْأَمْرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَفِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ۝﴾ (سورہ التوبہ: ۱۱۲) ”پھر آپ نے اس کی تفسیر فرمائی کہ شہادت اور جنت کے لائق گناہوں سے توبہ کرنے والے اور سوائے خدا کے دوسرے کی عبادت کے لیے سر نہ جھکانے والے اور تنگی اور فراخی میں خدا کے شاکر اور روزہ رکھنے والے اور برابر نماز پنج گانہ پڑھنے والے اور امر معروف اور نہی منکر بجالانے والے اور یہی لوگ مبشر بشارت و جنت ہیں۔“ پھر خدائے عزوجل نے خبر دی کہ جہاد کا حکم نہیں دیا گیا مگر انہی لوگوں کو جن میں یہ شرائط پائے جاتے ہوں اور فرمایا: ﴿أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتِلُونَ بِأَنَّهُمْ

ظَلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبَّنَا اللَّهُ ﴿سورہ الحج: ۳۹، ۴۰﴾ ”کہ اجازت دی گئی ان کو جن سے لوگ لڑتے ہیں اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور یہ کہ اللہ ان کو مدد دینے پر قادر ہے، وہ لوگ لڑتے ہیں اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور یہ کہ اللہ ان کو مدد دینے پر قادر ہے وہ لوگ ہیں کہ اپنے شہروں سے ناحق نکالے گئے اس قصور میں کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے، یہ اس لیے کہ جو کچھ آسمان زمین میں ہے خدا، رسول اور رسول کے تابعین کے لیے ہے اور جو کچھ دنیا میں مشرکین کفار اور ظالمین و فاجرین کے ہاتھ میں ہے وہ سب مومنین کے لیے ہے۔ اور جہاد کی اجازت ان مومنین کو جو موصوف ان شرائط سے ہوں نہیں دی گئی مگر انہی کو جو مظلوم ہوں اور مظلوم نہیں ہوتا مگر مومن اور مومن نہیں ہو سکتا مگر وہ جو جامع ہو ان شرائط کا جو مجاہدین کے لیے قرار دی گئی ہیں اور جو شخص شرائط ایمان میں کامل نہ ہو وہ خود ظالم ہے اور اس پر مومنین کو جہاد واجب ہے اور اس کو اللہ کی طرف سے جہاد کی اجازت نہیں ہے۔ اور جب کہ آیت: ﴿اٰذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقْتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظَلِمُوْا﴾ ”نازل ہوئی تو ان لوگوں کو جہاد کا حکم دیا گیا، راوی کہتا ہے کہ میں نے امام سے پوچھا کہ آیت ﴿اٰذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقْتَلُوْنَ ... الخ﴾ ”ان مہاجرین کے حق میں نازل ہوئی تھی جن پر مشرکین مکہ نے ظلم کیا تھا پس جن لوگوں نے مشرکین مکہ کے سوا دوسرے قبائل عرب سے جہاد کیا اور کسریٰ و قیصر سے جہاد کیا ان کا کیا حال ہوگا؟ اس لیے کہ انہوں نے کچھ مہاجرین پر ظلم نہ کیا تھا بلکہ ظالم تو اہل مکہ تھے۔ اور اگر فقط مراد مہاجرین سے ہوتی تو متاخرین اس حکم سے خارج رہتے، اس لیے کہ متاخرین کے وقت نہ ظالمین مکہ میں سے کوئی رہا نہ مظلومین میں سے، امام نے فرمایا کہ یہ بات وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مہاجرین دو طرف سے مظلوم ہیں، ایک اہل مکہ سے دوسرے کسریٰ و قیصر سے، کیونکہ سلطنت مہاجرین کا حق تھا، پس مہاجرین کا جہاد کسریٰ و قیصر پر بھی خدا کے حکم سے تھا۔ اور اسی دلیل سے ہر زمانے کے مومنین جہاد کر سکتے ہیں، لیکن اذن جہاد انہی لوگوں کو ہے جو جامع شرائط ہوں تاکہ ایمان اور مظلوم اور مازون ہونا پایا جائے اور جو ایسا

نہیں ہے وہ ظالم ہے نہ مظلوم، نہ داعی نہ مجاہد، بلکہ مومنین مامور ہیں کہ اس سے قتال کریں۔
انتہی ملخصاً۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ کسریٰ و قیصر پر بھی جہاد بجکم خدا ہوا تھا اور مہاجرین جنہوں نے جہاد کیا وہ ماذون من اللہ تھے اور اس حدیث میں یہ بیان بھی کر دیا گیا ہے کہ ماذون بہ جہاد نہیں ہوتے مگر مومنین جو متصف بصفات ﴿التَّائِبُونَ الْعَبْدُونَ الْحِمْدُونَ السَّائِحُونَ... الخ﴾ (التوبہ: ۱۱۲) کے ہوں اور جب کہ مہاجرین کسریٰ و قیصر کے جہاد پر ماذون من اللہ تھے تو امام کے بیان سے ان کا ان صفات سے متصف ہونا ثابت ہوتا ہے اور یہ ثبوت ایسا ہے کہ اس سے انکار ہی نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مہاجرین کسریٰ و قیصر پر جہاد کرنے والے تھے اور اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ امام نے اس جہاد کو ماذون من اللہ فرمایا اور اس کی وجہ اور دلیل بیان کی۔ اگر ان کا جہاد بلا اذن خدا ہوتا تو راوی کے سوال کے جواب میں امام یہ فرماتے کہ یہ جہاد نہ تھا اور نہ وہ لوگ جہاد کے لیے ماذون تھے، برعکس اس کے امام نے ان کا ماذون من اللہ ہونا اور ماذون من اللہ ہونے کے دلیل صاف صاف لفظوں میں بیان کی اور چونکہ ماذون من اللہ جہاد کے لیے نہیں ہو سکتے، الا وہ لوگ جو ایمان اور اعمال حسنہ کے جامع ہوں۔ اس لیے منطقی دلیل سے صاف یہ نتیجہ نکلا کہ امام نے ان مہاجرین کو جنہوں نے کسریٰ و قیصر پر جہاد کیا تھا مومن اور جامع شرائط جہاد قرار دیا ہے۔

اس حدیث کے جواب میں علمائے امامیہ کو بڑی دقت پیش آئی اور کچھ جواب اس کا بن نہیں آیا۔ مجتہد صاحب ”تشہید المبانی“ میں بجواب مولوی حیدر علی صاحب کے اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں:

((نہایت آنچہ ازیں حدیث ظاہر می شود این ست کہ
مہاجرین ماذون بجہاد کسریٰ و قیصر بودند و حقیقت
خلافت خلفاء ازاں اصلاً مستفاد نمی شود زیرا کہ در احادیث

معتمدہ اہل سنت وارد شدہ کہ جناب رسالت مآب مسلمین
راخبر تسلط خلفاء جو رد دادہ و امر باطاعت آنها نمودہ
بود.....)) انتھی

”یعنی اس حدیث سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مہاجرین کسریٰ و قیصر کے
جہاد کے لیے ماذون تھے، مگر اس سے خلفاء کی خلافت کی حقیقت ثابت نہیں
ہوتی کیونکہ سنیوں کی حدیثوں کی کتابوں میں آیا ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے
خلفائے جور کے تسلط کی خبر دے کر ان کی اطاعت کا حکم فرمایا تھا۔“

اس حدیث سے اتنا تو ثابت ہوا کہ جناب مجتہد صاحب کو اس حدیث کی صحت میں کلام
نہیں ہے، نہ اس کے مضمون میں کچھ عذر ہے اور ہمارے مقصود کے لیے یہی کافی ہے۔ آئندہ
ناظرین حدیث خود غور کر کے اس کا تصفیہ کر سکتے ہیں کہ مجتہد صاحب کے جواب سے ہمارا
دعویٰ جو اس حدیث کی دلیل پر مبنی ہے ثابت ہوتا ہے یا باطل۔ اور چونکہ انہوں نے کوئی
جواب اس کا نہ پایا نہ مہاجرین کے کسریٰ و قیصر پر جہاد سے انکار کر سکے نہ ان کے ماذون من
اللہ ہونے پر اعتراض فرما سکے اور نہ ماذون من اللہ ہونے کے لیے جو شرائط امام نے فرمائے
اس کے انکار کی جرأت کر سکے جب کوئی راستہ نہ ملا تو اہل سنت کی کتابوں کی طرف رجوع
کرنے لگے مگر اس سے نفس حدیث کا مطلب کیوں کر باطل ہو سکتا ہے۔ مانحن فیہ میں یہ
بحث نہیں ہے کہ سنیوں کی روایتوں کے مطابق خلفائے راشدین خلفائے جور تھے، یا خلفائے
برحق، بلکہ بحث طلب امر یہ ہے کہ اس حدیث سے ان مہاجرین کا جنہوں نے کسریٰ و قیصر پر
جہاد کیا ماذون من اللہ ہونا اور ماذون من اللہ ہونے کی وجہ سے ان کا صاحب اعمال صالحہ ہونا
ثابت ہوتا ہے یا نہیں۔ اور اس ثبوت کی تردید نہیں ہو سکتی جب تک دو بدیہی باتوں سے انکار
نہ کیا جائے ایک مہاجرین کے جہاد کرنے سے کسریٰ اور قیصر پر، دوسری امام کے اس ارشاد
سے کہ مہاجرین جہاد کے لیے ماذون من اللہ تھے، اگر حضرات امامیہ کو یہ جرأت ہو کہ وہ فرما
سکیں کہ مہاجرین نے جہاد نہیں کیا نہ کسریٰ و قیصر کا ملک مہاجرین کے قبضے میں آیا بلکہ ان پر

جہاد کرنے والے ایران کے شیعہ یا لکھنؤ کے مومن تھے تو خیر ہم خود اپنے دعویٰ کی غلطی تسلیم کر لیں گے، یا یہ کہہ سکیں کہ امام نے مہاجرین کو ماذون من اللہ ہونا بیان نہیں کیا بلکہ ممنوع من الجہاد ہونا فرمایا تھا تب بھی ہمارا دعویٰ اور دلیل دونوں باطل ہو سکتی ہیں۔
واذ لیس فلیس .

چونکہ مجتہد صاحب بھی اسے خوب سمجھ گئے تھے کہ ان کا جواب نہایت کمزور ہے، اس لیے جناب نے اس حدیث کا ایک اور جواب دیا ہے، اس سے بھی زیادہ عمدہ اور زیادہ مدلل اور ناقابل تردید ہے، وہ یہ ہے کہ یہ جہاد جناب امیر کے مشورے اور مرضی مبارک سے ہوا تھا، پس گویا ماذون بہ جہاد جناب امیر تھے اور انہی کے اذن سے مہاجرین نے کسریٰ و قیصر پر جہاد کیا تھا۔ ہم بھی اس جواب کی داد دیتے ہیں تاکہ دیکھنے والوں کو ہماری طرف بدگمانی نہ ہو۔ اور جناب مجتہد صاحب کی طرف ایسے پاکیزہ جواب دینے میں کوئی شبہ نہ کر لے ہم اصل عبارت ”تشئید المبانی“ کی لکھتے ہیں اور وہ یہ ہے:

((ودریں مقام سرے دیگر ست کہ تعرض باں پر ضرور و آں اینست کہ خلیفہ ثانی بلکہ خلفائے ثلاثہ چون برائے العین مشاہدہ بودند کہ جناب ولایت مآب افضل و اعلم صحابہ ست لہذا در اکثر امور عظام مثل جہاد و اجرائے حدود وغیرہ بطریق مشورہ مرضی مبارک جناب امیر دریافت می نمودند چنانچہ این امر بر متبع خیر ظاہر و روشن ست و کلام صدق نظام خلیفہ ثانی لولا علی لہلک عمر و معضلة لا ابا حسن لہا کہ در کتب معتمدہ اہل سنت وارد شدہ نیز دلالت صریح براں دار دودر خصوص جہاد فارس ، فاضل دہلوی نیز مشورہ نمودن خلیفہ ثانی باں حضرت مذکور ساختہ پس بریں تقدیر ماذون بودن مہاجرین و انصار برائے

جہادِ فارس و شام و غیرہ مستغنی عن البیان ست و آنچہ جناب امام جعفر صادق درباب اذن آنها فرمودہ بسبب اذن و اذن جناب امیر بودنہ سبب حقیقت خلافت ثلاثہ .)) انتھی ”یہاں ایک دوسرے نکتے کی بات ہے جس سے روگردانی نہیں کی جاسکتی، اور وہ یہ کہ خلیفہ دوم بلکہ تینوں خلفاء نے پچشم خود مشاہدہ کیا تھا کہ جناب علی تمام صحابہؓ میں افضل اور عالم ہیں، اس لیے بڑے بڑے کاموں، مثلاً: جہاد اور سزا دہی وغیرہ میں جناب علیؓ کی مرضی بطریقہ مشورہ معلوم کرتے تھے اور یہ سب پر واضح ہے اور خلیفہ دوم کا کلام صدق نظام ”اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتے“ سنیوں کی معتبر کتابوں میں موجود ہے، اور یہ صریح دلالت ان سے مرضی اور مشورہ کی ہے، اور فاضل دہلوی نے حضرت عمرؓ کا حضرت علیؓ سے جنگِ فارس پر مشورہ کرنا تحریر کیا ہے، اس لیے مہاجرین و انصار کا جہادِ فارس و شام وغیرہ میں ماذون و اجازت یافتہ ہونے کو مزید بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور امام جعفر صادق نے باب اجازت میں فرمایا ہے کہ جنگ کے لیے جناب امیر کی اجازت ہوئی تھی اور استحقاقِ خلافت ثلاثہ کے لیے کوئی اجازت نہیں ہوئی۔“

جناب قبلہ و کعبہ کے جواب سے بجائے اس کے کہ ہمارا دعویٰ ضعیف ہو اور قوی ہوتا ہے، اس لیے کہ بموجب منطق کی شکل اول کے اس حدیث کا صغریٰ و کبریٰ یہ ہوتا ہے کہ مہاجرین ماذون بہ جہاد تھے اور ماذون بہ جہاد نہیں ہوتے، مگر وہی لوگ جو جامع شرائط ایمان اور مورد آیت ﴿التَّائِبُونَ الْعَبْدُونَ الْحِمْدُونَ... الخ﴾ (سورۃ التوبہ: ۱۱۲) کے ہوں، پس اس کا نتیجہ نکلا کہ مہاجرین مومن اور جامع شرائط اور داخل زمرہ ﴿التَّائِبُونَ الْعَبْدُونَ الْحِمْدُونَ... الخ﴾ کے تھے۔ و هذا هو المقصود .

اگر جناب قبلہ و کعبہ اس حدیث سے انکار فرماتے یا اس کے جواب میں یہ کہتے کہ مہاجرین ماذون من اللہ نہ تھے تب البتہ ہمارا دعویٰ باطل ہوتا۔ مگر مولانا ممدوح نے اس بات

کو کہ مہاجرین ماذون من اللہ تھے نہ صرف تصدیق کیا بلکہ اسے اور قوی کر دیا۔ اس لیے کہ آپ فرماتے ہیں کہ وہ جناب امیر کی طرف سے ماذون تھے، اس لیے کہ خلفاء ایسے امور میں جناب امیر سے مشورے لیتے اور آپ کی مرضی مبارک دریافت کرتے اس لحاظ سے خلفاء کا اذن در پردہ بلکہ در حقیقت اذن جناب امیر تھا اور جناب امیر کے اذن کو خدا کا اذن سمجھنا چاہیے، اب ہم یہ جواب دیتے ہیں کہ اگر مہاجرین جامع ان شرائط کے نہ ہوتے جو مجاہدین کے لیے ضروری ہیں تو حضرت امیر ان کو جہاد کا اذن نہ دیتے اور صلاح مشورہ لینے والوں سے علیحدہ رہتے اور ان کے جہاد کو فتنہ و فساد اور انہی کو واجب القتال سمجھتے، جیسا کہ اس حدیث کا منشا ہے۔

اور جناب قبلہ و کعبہ کا یہ ارشاد کہ اس سے خلافت ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی حقیقت ثابت نہیں ہوتی، نہایت حیرت انگیز ہے، اس لیے کہ جو لوگ ان شرائط کے جامع ہوں جو اس حدیث میں مذکور ہیں، یعنی ایمان میں کامل اور اعمال حسنہ سے متصف اور ﴿التَّائِبُونَ الْعَبْدُونَ الْحَمِيدُونَ﴾ میں داخل تو بالضرور وہ خدا اور اس کے رسول کی مرضی پر چلنے والے ہوں گے اور اہل بیت سے محبت رکھنا اور ان کو مدد دینا اور ان کے مخالفین اور اعداء سے بیزار رہنا ان کا فرض ہوگا اور یہ فرض اسی وقت پورا ہوتا ہے جبکہ ہمارے اعتقاد کے موافق خلفائے ثلاثہ اگر مہاجرین رضی اللہ عنہم سے افضل نہ مانے جائیں، تاہم کم سے کم ان کے برابر اور ان کے زمرے میں تو ضرور شمار ہوں، ورنہ کیا وہ لوگ جو ایمان اور حسن اعمال میں کامل ہوں ایسے شخصوں کی سرداری اور امامت کو تسلیم کریں گے جو ایمان سے بے بہرہ اور حسن عمل سے بے نصیب اور منافقین اور مرتدین میں داخل اور اہل بیت کے دشمن، ان کے حقوق کے اور بضعہ رسول کے ایذا دینے والے ہوں؟ ایسے لوگوں کی اطاعت تو وہی لوگ کریں گے جو کہ ان کی طرح منافق یا مرتد اور ایمان سے بے بہرہ ہوں۔ اور چونکہ اس حدیث نے مہاجرین رضی اللہ عنہم کا جہاد کے لیے ماذون من امیر المؤمنین ومن اللہ ہونا ثابت کر دیا۔ اور ماذون من اللہ ہونے سے ان کے ایمان اور اعمال اور تمام صفات حسنہ کا ثبوت ہو گیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ایسے گروہ کے

سردار اور خلیفہ بھی ایمان اور اعمال اور تمام صفات حسنہ سے متصف اور ﴿التَّائِبُونَ الْعِبَادُونَ
الْحَمِيدُونَ﴾ میں داخل تھے۔ والحمد لله على ذلك .

مہاجرین کا اس حدیث سے جہاد کے لیے ماذون من اللہ ہونا تو خود جناب قبلہ و کعبہ کے جواب سے ثابت ہو گیا۔ اب ہم ایک اور روایت پیش کرتے ہیں جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جو جہاد خلفائے ثلاثہ کے زمانے میں ہوئے اور جو ملک انہوں نے فتح کیے ان کی بشارت پیغمبر خدا ﷺ نے پہلے ہی دے دی تھی، اور ان کی فتوحات کو اپنی فتوحات سے تعبیر فرمایا تھا۔ ابن بابویہ روایت کرتے ہیں کہ جنگ احزاب میں جس کو ”جنگ خندق“ بھی کہتے ہیں حضرت سلمان فارسی کی صلاح سے خندق کھودی گئی، خندق کھودتے قوت ایک ایسا سخت پتھر نکلا کہ کدال اس پر کچھ کام نہیں کر سکتا تھا اور نہ وہ ٹوٹتا تھا، حضرت ﷺ کو اس کی اطلاع دی گئی اور آپ نے دست مبارک میں کدال لے کر اس پتھر پر ایک ضرب لگائی، اس سے ایک روشنی نکلی اور آپ نے اسے دیکھ کر فرمایا کہ اللہ اکبر! شام کی کنجیاں خدا نے مجھے دیں اور قسم ہے خدا کی! اس کے سرخ محل میں دیکھ رہا ہوں پھر دوسری ضرب لگائی اور ایک تہائی پتھر اس سے ٹوٹا، آپ نے فرمایا اللہ اکبر خدا نے فارس ملک کی کنجیاں مجھے دے دیں اور قسم ہے خدا کی! مدائن کے سفید قصر کو میں دیکھ رہا ہوں اور جب تیسری چوٹ لگائی اور وہ پتھر ٹوٹ گیا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ اکبر! یمن کی کنجیاں مجھے دیں اور قسم ہے خدا کی کہ صنعاء کے دروازے کو میں دیکھ رہا ہوں۔ یہ روایت ۱۰ صفحہ ۳۷۶ حیات القلوب کی دوسری جلد مطبوعہ نولکشور اور نسخ التواخ کی کتاب دوم جلد اول مطبوعہ ایران کے صفحہ ۲۱۶ میں نقل ہے اور

۱۰ چون ایس خبر بحضرت رسول رسید اصحاب خود را طلبید و بایشان مشورت کرد هفتصد نفر بودند پس سلمان گفت یا رسول الله جماعت قلیل در مطادلہ و مبارزہ در برابر جماعت کثیر نمیتواند ایستاد حضرت فرمود پس چه کنیم سلمان گفت خندق می کنیم بر در خود کہ حجا یہ باشد میان تو و ایشان کہ ایشان از ہر جانب بر سر مانیایند و جنگ از یک جانب باشد و مادر بلا د عجم وقتیکہ لشکر گرانے متوجہ مامی شد چنیس می کردیم کہ جنگ از موقع معینہ واقع شود پس جبریل بر حضرت رسول نازل شد و گفت رائے سلمان صوابست و بآن عمل می باید کرد حضرت ﴿﴾ ﴿﴾ ﴿﴾

اخیر روایت کے الفاظ یہ ہیں:

﴿﴿﴿ فرمودہ زمیں راپمیودند از ناحیہ احد تا برباح و مربست گام و با سے گام رابجماعتے از مهاجران و انصار داد کہ حفر نمایند و امر کرد کہ بیلها و گلنکها آوردند و حضرت خود ابتدا کرد در حصہ مهاجران کلنگ برداشت و خود می کند حضرت امیر المومنین خاک را نقل می کرد تا آنکہ عرق کرده مانده شد و فرمود کہ عیشے نیست مگر عیش آخرت خداونداندا بیا مرزا نصار و مهاجران را و چون مردم دیدند کہ حضرت خود متوجه کنند گردید اهتمام بسیار کردند در کندن و خاک را نقل می کردند، چون روز دوم شد بامداد آمدند بر سر خندق و حضرت در مسجد فتح نشست و صحابہ مشغول کندن شدننا گاه بسنگی رسید کہ کلنگ براں کار نمیگرد پس جابر بن عبدالله انصاری رانجدمت حضرت فرستادند کہ حقیقت حال را عرض نماید، جابر گفت کہ چون مسجد فتح رفتم دیدم کہ حضرت بر پشت خوابیده است در دوائے مبارک رادزیر سر گذاشته و از گرسنگی بر شکم خود سنگی بسته است گفتم یا رسول الله سنگی در خندق پیدا شده کہ کلنگ در آن اثر نمیکند پس بر خاست و بسرعت روانه شد چون بآن موضع رسید آبه طلیید و ازان آب وضو ساخت و کف آبه در دهان حکمت نشان کرد و مضمضه نمود و بر آن سنگ ریخت پس کلنگ را گرفت و ضربتے براں سنگ زد کہ ازان برقه ساطع شد و ازان برق قصر هائے شام را دیدیم پس بارد گر کلنگ راز دو برقه ساطع شد کہ قصر هائے مدائن را دیدیم پس بارد گر کلنگ راز دو برقه لامع شد کہ قصر هائے یمن را دیدیم پس فرموده این مواضع را کہ برق بر آنها تا بید شما فتح خواهید کرد مسلمان را از استماع این بشات شاد شدند و خدا را حمد کردند و منافقان گفتند کہ وعده ملک کسری و قیصر میدهد و ازان ترس بردر خود خندق میکنند پس حق تعالیٰ آیت قل اللهم مالک الملك را برائے تکذیب و تادیب منافقان فرستاد۔ و ابن بابویه روایت کرده است کہ چون کلنگ اول راز دسنگ شکست فرمود کہ الله اکبر کلید هائے شام را خدا بمن داد بخدا سو گند کہ قصر هائے سرخ آن رامی بینم پس کلنگ دیگر زد و ثلث دیگر را شکست و گفت الله اکبر کہ کلید هائے ملک فارس را بمن داد و خدا سو گند کہ الحال قصر سفید مدائن رامی بینم و چون کلنگ سوم راز دو دهاقه سنگ جدا شد گفت الله اکبر کلید هائے یمن بمن داد و خدا سو گند کہ دروازه هائے صنعاء رامی بینم۔ و کلینی بسند معتبر روایت کرده است از حضرت صادق کہ کلنگ را از دست امیر المومنین یا سلمان گرفت و یک ضربت زد کہ سنگ بس پاره شد فرمود کہ فتح شد بر من در این ضربت گنج هائے کسری و قیصر پس ابوبکر و عمر با یکدیگر گفتند کہ نمیتوانیم از ترس بقضائے حاجت بردیم داد وعده ملک بادشاه عجم و بادشاه روم بمایم دهد۔

((بالجمله در ایام حفر خندق قطعه از سنگی سخت پدید شد که مردم از شکستن آن بی چاره گشتند و سلمان این خبر بر رسول خدا برداشت جابر بن عبدالله انصاری گوید درین هنگام رسول خدا در مسجد فتح بر پشت خوابیده بود و از شدت جوع سنگ بر شکم مبارك بسته داشت چه سه روز می رفت که هیچ کس بطعامی دست نیافت باین همه چون این قصه بشنید متین برگرفت و بخندق در آمد براء بن عازب گوید چون بامتین بر سر سنگ آمد فرمود بسم الله و بضر ب نخستین يك ثلث آن سنگ را بیفگند و گفت الله اكبر و برقی از سنگ جستن کرد پیغمبر فرمود مفاتیح شام مرادادند سوگند باخدای که شام رابا قصور احمر مشاهدهت می کنم و در ضربت دوم ثلث دوم را فرود آورد و هم برقی بجست فرمود الله اكبر مفاتیح فارس مرادادند سوگند باخدای که قصورا بیض مدائن رامی نگریم و در ضربت سیم سنگ رابجمله پراگنده ساخت و نیز برقی جهید و رسول خدا فرمود الله اكبر مفاتیح یمن بهره من افتاد سوگند باخدای که ابواب صنعاء نظاره کنم و در هر کرت مردم با پیغمبر موافقت می کردند و بانگ تکبیر بر می داشتند آنگا روئی با سلمان کرد و صفت كوشك مدائن را بتمامت باز گفت سلمان عرض کردید سوگند خدای که ترا فرستاده این همه صفت كوشك مدائن ست و گواهی می ده که تو رسول خدای پیغمبر فرمود بعد از من ست من این ممالک بکشایند و دفائن

کسریٰ و قیصر رانفقہ دهند .))

”خندق کھودنے کے زمانے میں خندق میں ایک ایسا پتھر نکلا کہ جس کے توڑنے سے لوگ عاجز آگئے، چنانچہ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے اس کی اطلاع رسول اکرم ﷺ کو دی، جابر بن عبد اللہ کا بیان ہے کہ بوقت اطلاع رسالت مآب ﷺ مسجد فتح میں چت سو رہے تھے اور بھوک کی وجہ سے آپ کے شکم مبارک پر پتھر بندھا ہوا تھا کیونکہ تین دن سے آپ نے کچھ نہیں کھایا تھا، آپ نے یہ ماجرا سنا تو کدال لے کر خندق میں آئے۔ براء بن عازب کا بیان ہے کہ رسول خدا ﷺ کدال لیے ہوئے جب پتھر کے پاس آئے تو بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر اس پر ضرب لگائی جس سے اس پتھر کا ایک تہائی حصہ گر پڑا، آپ نے اللہ اکبر کہا اور اس پتھر میں سے ایک شرارہ نکلا تو آپ نے فرمایا کہ مملکت شام کی کنجیاں مجھے دی گئیں اور بخدا شام کے سرخ محل دیکھ رہا ہوں، پھر دوسری ضرب میں باقی ایک تہائی پتھر کٹ کر گرا اور اس میں سے بھی برقی روشنی نمودار ہوئی تو آپ نے اللہ اکبر کہہ کر فرمایا: فارس کی کنجیاں مجھے دی گئیں اور بخدا! مدائن کے سفید محل میں دیکھ رہا ہوں، پھر تیسری ضرب میں باقی ماندہ پتھر کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ اس مرتبہ بھی اس میں سے بجلی نکلی اور آپ نے اللہ اکبر کہہ کر فرمایا: یمن کی کنجیاں ہمارے لیے رکھ دی گئی ہیں اور بخدا! صنعاء کے دروازے میں دیکھ رہا ہوں اور حالت یہ تھی کہ ہر ضرب پر جب آپ اللہ اکبر فرماتے تو دوسرے لوگ بھی آپ کی آواز کے ساتھ ہی اللہ اکبر کہتے تھے۔ پھر رسول اکرم ﷺ نے حضرت سلمان فارسیؓ کو مدائن کے محلات کی پوری صفات سنائیں تو سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کی قسم! جس نے آپ کو سچا رسول بنایا ہے واقعی مدائن کی یہی صفات ہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ آپ برحق رسول ﷺ ہیں۔ اس پر ارشاد عالی ہوا ہمارے بعد ہمارے امتی ان تمام ممالک کو فتح کریں گے اور قیصر و کسریٰ

کے خزانے خرچ کریں گے۔“ (ناسخ التواریخ، کتاب جلد اول مطبوعہ ایران ۲۱۶)

اس روایت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے شام، فارس اور یمن کے فتوحات کی بشارت دی تھی اور فرمایا تھا کہ میری امت کے لوگ اور مسلمان اسے فتح کریں گے اور نیز ان فتوحات کو اپنی طرف منسوب فرمایا اور ارشاد کیا کہ خدا نے ان ملکوں کی کنجیاں مجھے عنایت کیں۔ اگر خلفاء کی خلافت باطل ہوتی اور وہ اور ان کے ساتھ دینے والے اور ان کے حکم پر لڑنے والے جن کے ہاتھ پر یہ ملک فتح ہوا منافق یا مرتد ہوتے اور دائرہ اسلام سے خارج، تو کیا پیغمبر خدا ﷺ ان کے فعل کو اپنی طرف منسوب کرتے اور ان کی فتوحات کو اپنی فتوحات سمجھتے؟ اس کے جواب میں مجتہد صاحب ”تشئید المبانی“ میں فرماتے ہیں:

((نہایت آنچه ازین روایت ثابت می شود این ست کہ ملک شام و یمن وغیرہ در قبضہ اسلام خواهد آمد و ازاں ظاہر نمی شود کہ کسانیکہ در ایام حکومت آنها این ممالک در قبضہ خواهد آمد خلیفہ بحق خواهند بود زیرا کہ از جملہ احادیث معتمدہ اہل سنت ست کہ ”ان اللہ یؤید هذا لدین بالرجل الفاجر“ پس اگر قوت دین و رواج شرح متین در عہد احدے دلیل حقیقت اباشد لازم آید حقیقت خلافت ہر بادشاہ فاجر و جابر ”وہو خلاف مزعوم المجیب“) انتھی

”انجام کا اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ ممالک شام و یمن وغیرہ مسلمانوں کے قبضہ میں آئیں گے لیکن اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ جن اشخاص کی حکومت میں ان ممالک پر اسلامی قبضہ ہوگا وہ سچے اور خلیفہ برحق ہوں گے کیونکہ سنیوں کی کتاب میں یہ معتبر حدیث ہے کہ اللہ ایک فاجر کے ذریعہ اسلام کی تائید کرے گا اس کے مد نظر اگر اسلامی قوت اور شریعت کا رواج کسی کے زمانے میں اس حاکم کے حق و حقیقت کی دلیل تسلیم کی جائے تو اس سے لازم آتا ہے کہ

ہر ایک فاجر و ظالم بادشاہ خلافت کا حق دار و مستحق ہے، حالانکہ یہ بات مجیب کے گمان کے خلاف ہے۔“

اس جواب میں مجتہد صاحب نے پہلی حدیث کے موافق جو ابھی اوپر بیان ہو چکی، پھر اہل سنت کی حدیث کو پیش کیا، حالانکہ ان کو اس روایت کے متعلق جواب دینا چاہیے تھا جو کچھ جواب انہوں نے دیا اس سے بجز اللہ تعالیٰ اس روایت کی تصدیق ہو گئی اور سنیوں کی پیش کردہ حدیث سے مجتہد صاحب کو کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اس لیے کہ جب اس روایت میں یہ لکھا ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے تین دفعہ یہ فرمایا کہ خدا نے فلاں ملک کی کنجیاں میرے ہاتھ میں دیں اور ہر مرتبہ خوش ہو کر تکبیر فرمائی، پس اگر خلفاء فاجر ہوتے تو کیسے پیغمبر خدا ﷺ اپنے مبارک ہاتھ کو ان کا ہاتھ کہتے اور کس طرح خوش ہو کر بشارتاً اصحاب سے خطاب فرماتے کہ ”خدا نے یہ ملک مجھے دیا اور میری امت کے ہاتھ سے فتح ہوگا۔“ کیا وہ پاک رسول ﷺ جس کے ہاتھ کو خدا نے اپنا ہاتھ کہا ہو اور جس کی شان میں ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ﴾^۱ فرمایا ہو ان فاجرین کے افعال پر جنہوں نے دین کو بدل دیا اور اہل بیت نبوی کے حقوق غصب کر لیے اور جو فسق و فجور کے درجے سے گزر کر مرتد اور کافر ہو گئے بلکہ ایسے لوگوں کی نسبت جن کو شیعہ حضرات کبھی مسلم اور مومن سمجھتے ہی نہیں اور ابتدا ہی سے ان کو منافق سمجھتے ہیں، اظہار بشارت فرمائیں اور ان کے مساعی جمیلہ سے جو ملک فتح ہوں اور اسلام ترقی پائے اس پر فخر و مباہات کریں؟ اور اس پر بھی تعجب ہے کہ جس حدیث سے اہل سنت کی جناب قبلہ و کعبہ نے استمساک فرمایا ہے وہ بھی ان کے مفید مطلب نہیں۔ اس لیے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ میرے بعد خلفاء ہوں گے، یعنی خلفائے حق اور اس کے بعد امراء ہوں گے اور اس کے بعد ملوک جابر۔

پس سنیوں کی حدیث کے مطابق اس حدیث کا اطلاق خلفائے کرام پر ہو ہی نہیں سکتا۔

۱ جو لوگ ہاتھ ملاتے ہیں تجھ سے وہ ہاتھ ملاتے ہیں اللہ سے، اللہ کا ہاتھ ہے اوپر ان کے ہاتھ کے۔ موضح پارہ ۲۶ سورہ فتح رکوع اول۔

اور اگر اس طرح پر احادیث کی معنوی تحریف کی جائے اور اس کے مصداق کو غلط ٹھہرایا جائے تو جو حدیثیں امام مہدی کی شان میں ہیں کہ ان سے دین کو تقویت ہوگی اور وہ ساری دنیا میں اسلام پھیلائیں گے، اس کی نسبت بھی خوارج اس حدیث کو جو کہ شیعوں کے یہاں بھی منقول ہے یہی کہہ سکتے ہیں اور نعوذ باللہ! حضرت امام مہدی کے زمانے کے فتوحات پر بھی ((ان اللہ یؤید هذا لدین بالرجل الفاجر)) کہہ کر اپنے نامہ اعمال کو سیاہ کر سکتے ہیں۔ پس جو جواب حضرات امامیہ ان کو دیں اسی کو ہماری طرف سے بھی سمجھیں۔

انصار اور مہاجرین دو گروہ کی نسبت ہم ثابت کر چکے کہ وہ مومنین خاص اور مخلصین با اختصاص سے تھے۔ اور ان جو ابات سے جو علمائے امامیہ نے دیے ہیں یہ بات ہم ظاہر کر چکے ہیں کہ ان روایات کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ تاویل جو معنوی تحریف کے درجے تک پہنچ جاتی ہے۔ فرماتے ہیں: البتہ مہاجرین و انصار کی شان میں جو احادیث ہیں اس سے خلفائے راشدین کی نسبت بھی ایسی احادیث شیعوں کی کتابوں میں موجود ہیں جس سے ان کا ایمان اور اخلاص میں اور مومنین کی صفات سے متصف ہونا، بلکہ اسلام میں ان کا بڑا درجہ ہونا اور ان کی وفات سے اسلام کو سخت نقصان پہنچنا ثابت ہوتا ہے، چنانچہ ان میں سے بعض روایتیں ہم حصہ اول کے جزء اول میں اس کتاب کے بیان کر چکے ہیں، اور بعض مختلف موقعوں پر دوسرے جزء میں بیان کی ہیں اور کچھ اس وقت بیان کرتے ہیں۔

نبی البلاغہ میں امیر المومنین کے وہ اقوال منقول ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے خیالات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نسبت نہایت اعلیٰ درجے کے تھے، وہ ان کو عرب کا مرجع اور قطب سمجھتے تھے اور ان کی سلامتی کو غنیمت جانتے تھے اور ان کو دوستانہ صلاح اور مشفقانہ مشورے دیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس وقت جب کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فارس کی لڑائی پر خود تشریف لے جانے کا ارادہ کیا اور جناب امیر سے مشورہ لیا تو آپ نے یہ فرمایا کہ ۱ اسلام کی نصرت اور

۱ یہ خطبہ ایسا مشہور ہے کہ ہم کو اس کے الفاظ کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ ابن میثم بحرانی نے جو اس کی شرح

میں لکھا ہے وہ ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ صفحہ ۳۰۶ میں لکھا ہے: وقوله فکن قطباً شروع فی

عدم نصرت فوج و لشکر کی کمی و بیشی پر موقوف نہیں ہے یہ خدا کا دین ہے جسے وہ خود ہی غالب کرتا ہے اور اسلام کا لشکر اسی کا لشکر ہے جس کی خود ہی اعانت اور امداد فرماتا ہے، یہاں تک کہ اسلام اس حد کو پہنچا اور دنیا میں پھیل گیا۔ اور ہم سے اللہ نے وعدہ کیا ہے اور خود ہی اس کا پورا کرنے والا اور اپنے لشکر کی مدد دینے والا ہے۔ اور خلیفہ بمنزلہ اس دھاگے کے ہے جس

﴿الرأى الخاص بعمر فاشار عليه ان يجعل نفسه مرجعا للعرب تتول اليه و تدور عليه و استعار له لفظ القطب و لهم لفظ الرحى و رشح بالاستعارة فكنه بذلك عن جعل العرب وربة دونه و حيطه له و لذلك قال واصلهم دونك نار الحرب لانهم ان سلموا و غنموا فذلك الذى ينبغى و ان انقهر و اكان هو مرجعا لهم و سندا يقوى طنور هم به بخلاف شخوصه بهم فانهم ان ظفر و ا فذلك و ان انقهر و الم يكن لهم ظهر يلجاون اليه كما سبق بيانه و قوله فان كان شخصت الى قوله فيك بيان للمفسدة فى خروجہ بنفسه من و جهين احد هما ان الاسلام كان فى ذلك الوقت غضا دو قلوب كثير من العرب ممن اسلم غير مستقرة بعد فاذا انصاف الى من لم يسلم منهم و علموا خروجہ و تركه للبلاد كثر طمعهم و هاجت فتنتهم على الحرمين و بلاد الاسلام فيكون ماتر كه و راء ه اهم يطلبه و يلتقى عليه الفريقان من الاعداء الثانى ان الاعاجم اذا اخرج اليهم بنفسه طمعوا فيه و قالوا المقالة فكان خروجہ محر صالحهم على القتال و هم اشد عليه كلبا و اقوى فيه طمعا، قوله فاما ذكرت من سير القوم الخ فهو انه قال له ان هو لاء الفرس قد قصدو المسير الى المسلمين و قصد هم اياهم دليل قوتهم و انا اكره ان يغزونها قبل ان نغزوهم، فاجابه ان كان كرهت ذلك فان الله تعالى اشد كراهية و اقدر عليك على التغير و الا زالة، و هذا الجواب يدور على حرف و هو ان مسيرهم الى المسلمين و ان كان مفسدة الا ان القاء ه لهم بنفسه فيه مفسدة اكبر و اذا كان كذلك فينبغى ان يدفع العظمى و بكل دفع المفسدة الاخرى الى الله تعالى فانه كان لها و مع كراهية لها فهو اقدر على ازالتها. يعنى تم قطب ہو کر رہو۔ یہ اس رائے خاص کا شروع ہے جو عمر کو آپ نے دی اس کہنے سے آپ نے عمر کو یہ بتلایا کہ تم اپنے آپ کو عرب کے لیے مرجع بناؤ کہ تمہاری طرف عرب لوٹ کر آیا کریں۔ یہاں آپ نے عمر کے لیے لفظ قطب کا استعارہ کیا، اور عرب کے لیے چکی کا مقصود اس کنایہ سے آپ کا یہ ہے کہ عرب تمہارے لیے احاطہ ہے، اس لیے کہ عرب اگر سلامت اور غنیمت لے کر پھرے تو یہ تو مقصود ہی ہے اور اگر مغلوب ہوئے تو تم ہی ان کے مرجع ہو گے، بخلاف ان کے ساتھ تمہارے جانے کے کہ اگر انہوں نے فتح پائی تو بہتر، اگر مغلوب ہوئے تو کوئی بلاء ایسا نہ رہے گا جس کی طرف وہ لوٹ کر آئیں، جیسا کہ پہلے اس کا بیان ہو چکا، پھر آپ بیان کرتے ہیں کہ اگر تم قتال کو گئے تو اس میں دو طرح کی خرابیاں ہوں گی: اول یہ کہ اسلام ابھی تک پھیلا نہیں اور عرب کے جو لوگ مسلمان ہوئے ہیں ان کے دل ابھی تک ٹھکانے نہیں لگے،

میں موتی پرودیے گئے ہوں کہ ان کی لڑی اسی وقت ثابت رہ سکتی ہے جب تک کہ وہ دھاگا سلامت رہے، اگر وہ ٹوٹ جائے تو موتیوں کے سب دانے بکھر جائیں اور پھر جمع نہیں ہو سکتے۔ آج کل عرب اگرچہ کم ہیں لیکن بوجہ اسلام کے زیادہ اور بہ سبب اجتماع کے غالب ہیں۔ تم قطب ہو کر رہو اور عرب کو گھیرے رہو تمہارے بغیر عرب میں لڑائی کی آگ بھڑک اٹھے گی، کیونکہ اگر تم اس زمین سے چلے جاؤ گے تو عرب اطراف و جوانب سے تم پر ٹوٹ پڑیں گے اور جن چیزوں کو تم پیچھے چھوڑ جاؤ گے وہ زیادہ اہم اور نازک ہو جائیں گی بہ نسبت اس کے جس کے لیے جاتے ہو، کیونکہ عجی جب تمہارا جانا دیکھیں گے تو کہیں گے کہ عرب اتنے ہی تھے اور زیادہ دلیری اور طمع کریں گے، اور تم جو یہ کہتے ہو کہ اہل فارس مسلمانوں پر چڑھ کر آئے ہیں تو خدائے تعالیٰ کو تم سے بھی زیادہ ان کا چڑھ کر آنا برا معلوم ہوتا ہے اور جس بات کو وہ برا جانتا ہے اس کے دور کرنے پر وہ قادر ہے، اور تم نے جو ان کی کثرت بیان کی تو ہم پہلے جہاد کچھ کثرت کے بھروسے پر نہیں کیا کرتے تھے بلکہ خداوند تعالیٰ کی مدد اور نصرت

⇐ ⇐ ⇐ پس اگر تم ان لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئے جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے اور عرب کو معلوم ہوگا کہ تم یہاں نہیں ہو اور اپنے شہروں کو تم نے چھوڑ دیا ہے تو ان کی طمع بڑھ جائے گی اور بلاد مسلمین حریمین پر ان کا فتنہ زیادہ ہو جائے گا، تو جو چیز اپنے پیچھے چھوڑتے ہو وہ زیادہ اہم ہو جائے گی بہ نسبت اس کے جو آئندہ ہے اور اس کی طلب میں جاتے ہو اور تم پر دونوں فریق اعداء کے مل کر حملہ کریں گے۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ عجمیوں کی طرف جب تم خود خروج کرو گے تو ان کو طمع ہوگی تو وہ بہت سی بیہودہ بکواس کریں گے اور یہ تمہارا خروج ہی ان کو قتل پر آمادہ کرے گا اور وہ تم سے قتال پر بد خوئی اور طمع میں زیادہ قوی ہیں، (اماما ذکرت من سیر القوم..... الخ) کا مطلب یہ ہے کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ اہل فارس مسلمانوں پر حملہ کرنے کا قصد کر رہے ہیں اور ان کا قصد کرنا ہی ان کی قوت کی دلیل ہے اور مجھے یہ بات بری معلوم ہوتی ہے کہ وہ ہم پر چڑھ کر آئیں پہلے اس سے کہ ہم ان پر چڑھائی کریں آپ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اگر تم کو یہ بات بری معلوم ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ کو تم سے زیادہ بری معلوم ہوتی ہے اور وہ تم سے زیادہ زائل کرنے پر قادر ہے، یہ جواب صرف ایک بات پر ختم ہوتا ہے وہ یہ کہ اگرچہ اہل فارس کا مسلمانوں پر چڑھائی کرنا مفسدے کی بات ہے لیکن تمہارا خود ان کی لڑائی کے لیے جانے میں زیادہ فائدہ ہے، جب یہ بات ہے، تو تم کو لازم ہے کہ بڑے مفسدے کو دفع کرو اور دوسرے مفسدے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرو کہ وہ اس کے ازالہ پر خوب قادر ہے۔

کے بھروسے پر نہج البلاغہ میں ایک خط حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے بنام معاویہ رضی اللہ عنہ کے منقول ہے جس کا آغاز یہ ہے (فارادقو مناقتل نبینا الخ) اس کی نسبت ابن میثم بحرانی اپنی شرع میں لکھتے ہیں کہ یہ اس خط کا ایک جزو ہے جو جناب امیر نے معاویہ کو ان کے خط کے جواب میں لکھا تھا اور جس میں انہوں نے قاتلان عثمان رضی اللہ عنہ کو طلب کیا تھا اور یہ بھی اس میں لکھا تھا کہ مسلمانوں میں سب سے برتر پہلے خلیفہ تھے، پھر دوسرے، پھر تیسرے۔ اور جناب امیر پر یہ طعن کیا تھا کہ تم نے سب پر حسد کیا اور سب سے باغی رہے اور ہمیشہ خلافت کی طمع میں سرد آہیں بھرتے رہے اور بیعت کو تم ہمیشہ ٹالتے رہے یہاں تک کہ جس طرح نکیل پکڑ کر زبردستی اونٹ کھینچا جاتا ہے تم کھینچے گئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ خط معاویہ رضی اللہ عنہ نے ابو مسلم خولانی کے ہاتھ جناب امیر علیہ السلام کے پاس بھیجا۔ اس کے جواب میں آپ نے ایک طولانی خط لکھا جس میں خلفاء کی متعلق یہ جواب تھا:

((و ذکر ت ان اللہ اجتبی له من المسلمین اعوانا ایدہم بہ
فکانوا فی منازلہم عندہ علی قدر فضائلہم فی الاسلام وکان
افضلہم فی الاسلام کما زعمت و انصحہم اللہ و لرسولہ
الخلیفۃ الصدیق و خلیفۃ الخلیفۃ الفاروق و لعمری ان
مکانہما فی الاسلام لعظیم و ان المصاب بہما لجرح فی
الاسلام شدید یرحمہما اللہ و جزاہما اللہ با حسن ما
عملا))

”کہ تم یہ جو کہتے ہو کہ خدا نے رسول خدا کے لیے مسلمانوں میں سے ایسے
اعوان و انصار دیے ہیں جنہوں نے آپ کی تائید کی اور وہ لوگ اپنے اپنے
درجے کے موافق اسلام میں خاص مرتبہ رکھتے ہیں اور ان میں سے افضل جیسا
کہ تم نے گمان کیا اور سب سے بڑھ کر نصیحت کرنے والے خدا اور رسول کے
لیے خلیفہ صدیق رضی اللہ عنہ اور ان کے خلیفہ فاروق رضی اللہ عنہ تھے، میں بھی اپنی جان کی قسم

کھا کر کہتا ہوں کہ ان دونوں کا مرتبہ اسلام میں بہت بڑا ہے اور ان کے
صدے، یعنی وفات اسلام کے لیے بہت سخت مصیبت ہے خدا ان دونوں پر رحم
کرے اور ان کے اعمال کا انہیں نیک بدلہ عنایت کرے۔“

نبی البلاغہ میں لکھا ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر باغیوں نے ہجوم کیا تو جناب امیر
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ لوگوں نے مجھے سفیر بنا کر آپ کے پاس
بھیجا ہے، مگر نہیں جانتا کہ آپ سے کیا کہوں، میں کوئی ایسی چیز نہیں جانتا جو تم نہ جانتے ہو اور
کوئی شے ایسی نہیں بتا سکتا جو تم نہ سمجھتے ہو، تم وہی جانتے ہو جو ہم جانتے ہیں، کسی چیز میں ہم
نے تم سے سبقت نہیں کی جو ہم تمہیں بتا دیں، تم نے وہ سب دیکھا ہے جو ہم نے دیکھا اور تم
نے وہ سب سنا ہے جو ہم نے سنا، تم نے رسول اللہ ﷺ کی ویسی ہی صحبت پائی جیسی کہ ہم
نے، نہ ابن ابی قحافہ تم سے بڑھ کر تھے نہ ابن خطاب تم سے زیادہ مستحق، کیونکہ تم رسول
اللہ ﷺ کے زیادہ قریب ہو اور ان کی دامادی کا شرف رکھتے ہو جو ان کو حاصل نہیں تھا۔ پھر
اس کے بعد اور باتیں کیں اور ان کو سمجھایا۔ مگر ہمارا مطلب اس وقت ان الفاظ کی نقل سے
ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جناب امیر نے کسی بات میں اپنے آپ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ
سے افضل نہیں فرمایا بلکہ صاف صاف کہا کہ جو میں جانتا ہوں وہی آپ جانتے ہیں، جو میں
نے دیکھا ہے وہی آپ نے بھی دیکھا ہے جو میں نے سنا ہی آپ نے بھی سنا اور جو عزت
صحبت نبوی کی مجھے حاصل ہے وہی آپ کو بھی۔ چنانچہ آپ کے اصل الفاظ یہ ہیں:

((واللہ ما ادری ما اقول لك ما اعرف شیئا تجہلہ ولا ادلك

علی امر لا تعرفہ انک لتعلم ما نعلم واللہ ما سبقناک الی شیء

فنخبرک عنہ ولا خلونا بشیء فنبلغکہ و قدرأیت کما رأینا

وسمعت کما سمعنا وصحبت رسول اللہ ﷺ کما صحبنا

وما ابن ابی قحافہ ولا ابن خطاب باولی بعمل الحق منک و

انت اقرب رسول اللہ ﷺ وشیجۃ رحم و قدنلت من صہرہ

مالم ینالا .))

(نہج البلاغۃ حصہ اول صفحہ ۴۴۹-۴۵۰ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور)

”خدا کی قسم! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپ سے کیا کہوں، میں کوئی ایسی بات نہیں جانتا جس سے آپ ناواقف ہوں، نہ میں کسی ایسے امر کی طرف آپ کی راہنمائی کر سکتا ہوں جسے آپ نہ جانتے ہوں، جو آپ جانتے ہیں وہی ہم جانتے ہیں، کوئی بات ایسی نہیں ہے جسے ہم پہلے سے جانتے ہوں کہ اس سے آپ کو باخبر کریں نہ کسی بات میں ہم آپ سے جدا ہوئے کہ اب آپ کو وہ بتا دیں جس طرح ہم نے دیکھا، اسی طرح آپ نے دیکھا جس طرح ہم نے سنا اسی طرح آپ نے سنا، جس طرح ہم نے سنا، اسی طرح آپ نے سنا، جس طرح ہم رسول اللہ ﷺ کے شرف صحبت سے مشرف ہوئے اسی طرح آپ بھی ہوئے ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی حق پر عمل کرنے میں آپ سے زیادہ سزاوار نہیں تھے کیونکہ باعتبار قرابت آپ رسول اللہ ﷺ سے ان دونوں کے مقابلے میں نزدیک تر ہیں، بلاشبہ آپ نے رسول اکرم ﷺ کی دامادی کا شرف (دو) مرتبہ حاصل کیا ہے جو انہیں نہیں ملا۔“

یہ اقوال جناب امیر کے اور وہ روایتیں ائمہ کرام کی جو اوپر ہم نے امامیہ کی معتبر کتابوں سے نقل کی ہیں غالباً دیکھنے والوں کو اس باب میں کچھ شبہ باقی نہیں رہے گا کہ مہاجرین و انصار خدا اور رسول کے ممدوح تھے اور خلفائے راشدین کے مناقب اور محامد ائمہ کی زبان پر جاری تھے اور ان کے حسن اعمال کا صلہ خدا سے چاہتے تھے اور ان پر رحمت بھیجتے تھے، کیا وہ لوگ جن کی نسبت حضرت امیر نے فرمایا: ((هو ولعمری ان مکانہما فی الاسلام لعظیم وان المصاب بہما الجرح فی الاسلام شدید)) ”کہ میری جان کی قسم! ان دونوں کا مرتبہ اسلام میں بہت بڑا ہے اور ان کی وفات اسلام کے لیے سخت مصیبت ہے۔“ ایمان سے خارج اور اسلام سے بے نصیب تھے اور کیا وہ خلفاء جن کے حق میں علی

المرتضى رضی اللہ عنہ نے ((یرحمہما اللہ و جزاہما اللہ باحسن ما عمل))..... ”کہ خدا ان دونوں پر رحم کرے اور ان کے اعمال کا انہیں نیک بدلہ عنایت کرے۔“ کہہ کر دعا کی ہو غاصب اور ظالم خیال کیے جاسکتے ہیں اور بجائے رحمت بھیجنے کے ان کی شان میں کسی قسم کے بے ادبانہ الفاظ کسی مسلمان کی زبان سے نکل سکتے ہیں، اور کیا وہ داماد رسول ﷺ کہ جس کی نسبت جناب امیر نے ((واللہ ما سبقناک الی شی و قدرأیت کما رأینا و سمعت کما سمعنا و صحبت رسول اللہ کما صحبنا و انت اقرب رسول اللہ))..... ”کہ نہ ہم کسی بات میں آپ سے جدا ہوئے جس طرح ہم نے دیکھا اسی طرح آپ نے دیکھا جس طرح ہم نے سنا اسی طرح آپ نے سنا، جس طرح ہم رسول اللہ ﷺ کی شرف صحبت سے مشرف ہوئے، اسی طرح آپ بھی ہوئے، آپ تو رسول اللہ ﷺ کے زیادہ قریب ہیں۔“ فرمایا: وہ نعوذ باللہ منافق اور کافر تھے اور وہ انصار جن کی نسبت رسول اللہ ﷺ نے الانصار ((کرشی و عیبتی)) فرمایا اور ((ولو سلك الناس وادیا و سلك الانصار شعبا لسلكت شعب الانصار))..... ”کہ اگر سارے لوگ ایک راستے پر چلیں اور انصار دوسری راہ پر چلیں تو میں انصار کی راہ پر چلوں۔“ ارشاد کیا ہو اور جن کے حق میں ((اللہم اغفر الانصار و ابناء الانصار و ابناء ابناء الانصار))..... ”اے اللہ انصار اور ان کے بیٹوں اور پوتوں کی مغفرت فرما۔“ دعا میں فرمایا ہو اور وہ مہاجرین رضی اللہ عنہم جن کو امام نے جہاد کے لیے مازون من اللہ فرمایا ہو اور جن کو ﴿التَّائِبُونَ الْعَبَدُونَ الْحَدُونَ السَّائِحُونَ﴾ ”یعنی توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، خدا کا شکر ادا کرنے والے اور روزہ رکھنے والے۔“ میں شمار کیا ہو، شیعوں کے عقائد کے مطابق مرتد ہو گئے اور پیغمبر خدا ﷺ کی وصیت کو ایسے لوگوں نے بھلا دیا ہو اور اہل بیت سے پھر گئے ہوں اور کسی نے جناب امیر کا جو وصی برحق اور خلیفہ بلا فصل تھے ساتھ نہ دیا ہو۔ یہ ایسی باتیں ہیں کہ سوائے اس حالت کہ جبکہ انسان مذہبی تعصب کے جوش میں آکر عقل و فہم کو خیر باد کہہ دے اور بدیہیات کے انکار میں کچھ پس و پیش نہ کرے، ہوش و

حواس کی حالت میں کسی انسان کی زبان سے نہیں نکل سکتے ہیں نہ کسی سمجھ دار آدمی کے خیال میں آسکتی ہیں۔ اگر اس قسم کے خیالات اور اقوال کی قباحت کسی کے خیال میں نہ گزرے تو اسے مرفوع القلم سمجھ کر اس کے حق میں دعا کرنی چاہیے کہ خدا سمجھ عطا کرے اور سفسطہ اور بدیہیات کا پردہ اس کے دل اور آنکھوں سے اٹھادے۔



چوتھا مقدمہ

علمائے امامیہ نے مطاعن صحابہ کے ثابت کرنے میں اکثر وہ روایتیں ہمارے یہاں کی پیش کی ہیں جو جھوٹی ہیں یا ضعیف۔ اور ان کتابوں سے استدلال کیا ہے جو غیر مستند اور نامعتبر ہیں۔ جب ہمارے علماء نے اس قسم کی روایتوں کی تکذیب کی اور ایسی روایتوں کے پیش کرنے اور ایسی کتابوں سے استدلال کرنے کو ناجائز اور دھوکہ قرار دیا تو اس پر عموماً علمائے امامیہ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ سنیوں کی یہ عادت ہے کہ جب کوئی ایسی روایت ان کی کتابوں سے پیش کی جائے جس سے ان کے اصول میں خلل واقع ہو اور جس کا جواب ان سے نہ بن پڑے تو یا اس روایت کی تکذیب کرتے ہیں یا اسے ضعیف کہہ دیتے ہیں، اور اس کتاب کے مؤلف پر تشیع یا میلان تشیع کی تہمت لگا کر اپنے فرقے سے خارج کر دیتے ہیں، اور اگر بوجہ شہرت ایسا نہ کر سکیں تو کبھی یہ کہہ کر مطعون بنا کر اس کی روایت کے تسلیم میں سو حیلے نکالتے ہیں۔ چنانچہ اس اعتراض کو قاضی نور اللہ شوستری ^① اور مجتہدین لکھنؤ اور جناب مولوی حامد حسین صاحب نے اپنی اپنی کتابوں میں بہت زور و شور سے بیان کیا ہے۔

① جیسا کہ قاضی نور اللہ شوستری احقاق الحق میں فرماتے ہیں کہ بہت بری عادتوں سے سنیوں کی اور ان کی بے شرمیوں اور فضیحت کن باتوں سے یہ ہے کہ جب امامیہ کوئی آیت جو فضائل اہل بیت میں نازل ہوئی ہے پیش کرتے ہیں اور ان روایتوں سے جو خود سنیوں نے بیان کی ہیں سند لاتے ہیں تو اسے کبھی ضعیف کہہ کر کبھی مخالف کی بناوٹ بتا کر کبھی تخصیص و تقیم کی قیدیں لگا کر اور کبھی بیہودہ تاویل کر کے رد کرتے ہیں کانہم مفوضون فی الدین موکلون فی تشریح الشرع السید المرسلین و لم یسمعوا کلام رب العالمین حیث قال قتل الخراصون الذین ہم فی غمرۃ ساهون و اما اقل حیاء ہم و اکثر اعتداد ہم فای خیر فی ذالک وای جمیل یترقب من هذا الخلف لایرحمہم اللہ ولا یرحمہم ولہم عذاب الیم۔ صاحب استغاثہ فرماتے ہیں: بالجملہ مقاصد گونہ استعجاب ست از انصاف دشمنے این حضرات کہ خود بعبارات و ہفوات چینی کسان کہ انتساب ایشاں ہم باہل حق ثابت نیست احتجاج و استدلال می نمایند و بوجدمی آیند و خوداز <<<

درحقیقت یہ اعتراض ان کا صحیح نہیں ہے کیونکہ کوئی مذہب دنیا میں ایسا نہیں ہے جس میں تمام علماء اور کل مصنفین پاک عقیدہ، عالی دماغ، اور محقق گزرے ہوں نہ کسی مذہب کی تمام کتابیں ایسی ہیں جو معتبر اور مستند اور مذہبی مباحثوں میں قابل استدلال ہوں بلکہ ہر مذہب میں مذہبی عقائد کے ساتھ رسوم اور اوہام اور الہامی اقوال اور صحیح اخبار کے ساتھ قصص اور حکایات ملے جلے پائے جاتے ہیں اور ہر مذہب میں دنیا طلب یا فاسد العقیدہ یا کم علم لوگوں کی وجہ سے صحیح روایتوں کے ساتھ جھوٹی باتیں بھی مشہور ہو گئی ہیں۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس میں صد ہا فرقے ہو گئے اور ہزار ہا بلکہ لکھو کھا عالم گزرے اور ہر فرقے نے اپنے مذہبی عقائد کی تائید اور اپنے اصول مذہب کی حمایت میں کتابیں تصنیف کیں اور ان میں سے بہت سے ایسے ہوئے جنہوں نے اپنی دلیلوں کو تقویت دینے کے لیے روایتوں کا بنانا اور بانی مذہب اور بزرگان ملت کی طرف سے وضعی اقوال کا منتشر کرنا شروع کیا اور امتداد زمانہ اور ترقی اختلاف سے یہ عادت ایسی بڑھ گئی کہ ہر فرقے میں معتبر کتابوں کے ساتھ نامعتبر کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہو گیا ہے، ہمارے یہاں بھی ہزار ہا عالم گزرے ہیں اور ہزار ہا کتابیں تصنیف ہوئیں، مگر سب عالم نہ ایک درجے کے تھے اور نہ سب کتابیں ایک قسم

↳↳↳ غایت جسارت و عدم استحياء احتجاج را بکلام و مرویات اکاثر ائمه دین خود قبول ندارند و بسع اصغا جانند ہند بلکہ از مزید عناد یا بے بصیرتی آن علماء را گاہے رافضی و شیعی قطعاً و حتماً قرار دهند و گاہے مجهول و غیر معروف گویند و گاہے غیر معتبر و نامعتبر پنداند و مجروح مطروح بودند شان ظاهر سازند چنانچہ ثعلبی را بآں همه جلال اوصاف و امامت مفسرین تضعیف و توهین سازند و مرویات اور اعتبارے نہ ہند و بجولے نخرند و پردہ ناموس اور ابقدح و جرحش بدرند و ابن مغزلی را با وصف ظہور محدثیت مجهول دانند و ابن الصباغ مالکی سنی را توهین و تضعیف کنند و ابن حبان راز از اصحاب صحاح و ائمه متبحرین ایشانست مطروح و متروک گویند و احتجاج بکلامش جائز ندارند و یحییٰ بن سعید بآں همه جلال و امامت گویند کہ هیچ مردست و طبرسی را ساقط الاعتبار سازند بلکہ تهمت رفض برو گزارند و از قبول روایات حاکم سر باز زنند و شہرستانی را ہم مائل برفض و تشیع قرار دهند و اخطب خوارزم را از پایه اعتبار و اعتماد ساقط

کی ہیں۔ بعض عالم ایسے ہوئے ہیں جو تحقیق کے اعلیٰ درجے پر پہنچے، اور بعض ایسے ہوئے جو دھوکے اور غلطی کے عمیق گڑھے میں گرے۔ کسی نے نیک نیتی سے حق کی تحقیق میں بہت کوشش کی، کسی نے نفسانی خواہشوں یا غلط رایوں یا دنیا طلبی کے خیال سے اظہارِ باطل میں تامل تک نہ کیا اور جھوٹ کو سچ سے جدا کرنے میں تکلیف نہ اٹھائی، اور پھر بعض ایسے بھی ہوئے جو حقیقت میں فاسد عقیدے رکھتے تھے اور تسنن کا لباس پہن کر ہمارے علماء میں داخل ہو گئے اور لوگوں نے ان کی ظاہری حالت اور ان کے علم و کمال کو دیکھ کر ان کے اقوال اور روایتوں کے لینے میں دھوکہ کھایا۔ غرض یہ ہے کہ جب ایسے مختلف الخیال اور مختلف المراتب مصنف ہوئے ہوں تو ان سب کی نقل روایت کا ذمہ دار ہمارا مذہب نہیں ہو سکتا اور نہ ہر شخص کی تصدیق صرف اس وجہ سے کہ وہ عالم اور مصنف تھے کی جاسکتی ہے۔ ہاں مذہب ضرور اس بات کا ذمہ دار ہے جو اس کتاب میں لکھی ہو جس کی شان ہے:

﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ
حَبِيدٍ﴾ (حم السجده: ۴۲)

”اس پر جھوٹ کا دخل نہیں نہ آگے سے نہ پیچھے سے، اتاری ہے حکمتوں والے اور سب خوبیوں والے کی۔“

یا اس مبارک منہ سے نکلی ہو جس کی نسبت خدا نے فرمایا ہے:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝﴾ (النجم: ۴، ۳)

”اور نہیں بولتا اپنی خواہش سے یہ تو حکم ہے جو پہنچتا ہے۔“

پس جو کچھ ہمارے یہاں کی کتابوں سے ہمارے مقابلے میں پیش کیا جاتا ہے وہ ہم پر حجت نہیں ہو سکتا تا آنکہ وہ کوئی آیت آیات قرآنی سے یا کوئی صحیح حدیث احادیث نبوی سے سالم عن المعارض و محفوظ عن الشذوذ نہ ہو۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بجائے اس کے حضرات امامیہ کے پیش کردہ روایتوں کا ماخذ یا کتب تاریخ ہیں یا تفاسیر یا غیر مستند حدیث کی کتابیں اور ان تینوں قسم کی روایتوں کا حال یہ ہے۔

تاریخ کی کتابوں کی نسبت جیسا کہ علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے بجز اس کے کچھ نہیں، کہا جاتا کہ اگرچہ بڑے لائق مسلمان مؤرخوں نے کثرت سے تاریخ کی کتابیں لکھی ہیں مگر وہ لغو اور باطل روایات اور وہمیات اور قصص و حکایات سے بھری ہوئی ہیں اور سوائے چند ابتدائی تاریخوں کے باقی تواریخ کی کتابوں میں جو روایتیں لکھی گئی ہیں ان میں نہ اسناد درج ہیں نہ روایت کا سلسلہ بیان کیا گیا ہے جس سے معلوم ہو کہ اس کے بیان کرنے والے سچے ہیں یا جھوٹے، مذہب حق پر ہیں یا اہل بدعت، اور اگر کہیں سلسلہ کاروات کا مذکور بھی ہے تو تنقیح سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر روایتوں کے بیان کرنے والے غیر معتبر مشتبہ اور مجہول تھے۔

متقدمین میں سے بڑے نامور مؤرخ مثل واقدی وغیرہ کے جو امام المؤمنین کہلاتے ہیں خود ان کی کتابیں بیہودہ اور غلط روایتوں سے بھری ہوئی ہیں۔ اور متاخرین کا تو یہ حال ہے کہ وہ صرف انہیں کی بیان کی ہوئی روایتوں اور کہانیوں کے نقل کرنے والے ہیں۔ انہوں نے جو پوچ اور لچر روایتیں اور واہی تباہی کہانیاں پچھلی کتابوں میں دیکھیں یا ادھر ادھر سے سنیں انہیں ہم تک پہنچا دیا، نہ ان کے ماخذ کو تحقیق کیا نہ ان کے مطالب کو غور سے و تامل سے دیکھا۔ خصوصاً ان مؤرخین نے جو پہلے سے کسی رائے یا کسی مذہب کے معتقد یا اس طرف مائل تھے، انہوں نے بمقتضائے طبیعت کے اپنی رائے اور مذہب کے موافق جن خبروں کو سنا قبول کر لیا اور ان کا اعتقاد اور میلان ان کی بصیرت کی آنکھ کا پردہ ہو گیا اور وہ جھوٹی بات کے قبول کرنے اور اس کے نقل کرنے کی مصیبت میں پڑ گئے اور راویوں پر خوش اعتقادی اور حسن ظن کی وجہ سے اعتماد کرنے اور ان کے حالات کی تحقیق نہ کرنے سے اس مصیبت کو عام اور پورا کر دیا۔ انہوں نے نقل کرنے والوں اور راویوں پر ایسا بھروسا کیا کہ نہ تنقیح روایت کے اصول کا لحاظ کیا نہ درایت کے قواعد کو کام میں لائے، اگر راویوں نے خود دھوکہ کھایا یا سمجھ کی غلطی سے وہ مطلب صحیح ادا نہ کر سکے اس کو بھی بجنسہ نقل کر دیا اور بے احتیاطی اور شہرت کی خواہش اور اہل ہوا و بدعت کے اختلاط نے تواریخ کی کتابوں کو قصے اور کہانی بنا دیا۔ یہ قول ابن خلدون کا محتاج دلیل نہیں ہے بلکہ تاریخ کی کتابیں اور ان کے قصص و حکایات اس پر شاہد ہیں۔ مگر

باوجود اس کے حضرات امامیہ نے اس قسم کی تاریخوں سے اکثر روایتیں نقل کی ہیں اور انہی بیہودہ اور غلط اخبار کو ہمارے مقابلے میں پیش فرمایا ہے۔ جیسا کہ دعویٰ ہبہ فدک میں تاریخ اعثم کوفی اور تاریخ آل عباس اور معارج النبوت اور حبیب السیر وغیرہ کتابوں سے غلط سلط روایتیں نقل کر کے ہبہ فدک کے دعویٰ کو ثابت کرنا چاہا ہے مگر محققین کے نزدیک اس قسم کی روایتیں معمولی واقعات میں بھی کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتیں نہ کہ ایسے معاملات میں ان سے استدلال کیا جائے جو ان اصول و عقائد پر مؤثر ہوں جو قرآن مجید اور احادیث مشہورہ سے ثابت اور مسلم ہوں۔

تواریخ کی کتابوں کے علاوہ تفاسیر میں جو اقوال اور اخبار درج ہیں ان کو بھی حضرات امامیہ نے مطاعن صحابہ رضی اللہ عنہم کے ثابت کرنے میں بطور سند کے پیش کیا ہے۔ مگر کسی روایت کا تفسیر کی کتابوں میں لکھا ہونا اس کی صحت کو ثابت نہیں کرتا، کیونکہ تفسیر کی کتابیں بھی مختلف طبیعت کے آدمیوں کی لکھی ہوئی ہیں اور ان میں صحیح اور غلط قوی اور ضعیف اخبار ہر قسم کے درج ہیں، کما قال ابن تیمیہ.....:

((کتب التفسیر التی ینقل فیہا الصحیح و الضعیف مثل تفسیر الثعلبی والواحدی والبغوی و ابن جریر و ابن ابی حاتم لم یکن مجرد روایۃ واحد من هؤلاء دلیلاً علی صحته باتفاق اهل العلم فانه اذا عرف ان تلك المنقولات فیہا صحیح و ضعیف فلا بد من بیان ان هذا المنقول من قسم الصحیح دون الضیف .))

”یعنی تفسیر کی کتب میں صحیح و ضعیف روایتیں منقول ہیں جیسے ثعلبی اور واحدی، بغوی، ابن جریر اور ابن ابی حاتم کی تفسیریں، علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ صرف ان لوگوں کا کسی روایت کو روایت کر دینا دلیل صحت نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ جب یہ معلوم ہے کہ جو ان میں منقول ہے وہ صحیح اور ضعیف دونوں ہیں تو اس کے

ساتھ ضرور ہے کہ یہ بیان کر دیا جائے کہ یہ منقول روایت صحیح ہے ضعیف نہیں۔“
اور علامہ عبدالرؤف فتاویٰ فیض القدر شرح جامع صغیر میں لکھتے ہیں:

((قال ابن الکمال کتب التفسیر مشحونة بالاحادیث
الموضوعة .))

”ابن الکمال کا قول ہے کہ تفسیر کی کتابوں میں موضوع احادیث بھری ہوئی
ہیں۔“

پس جب تک کوئی روایت یا خبر یا حدیث ایسی نہ پیش کی جائے جو اصول روایت اور
درایت کی رو سے صحیح ہو تب تک کوئی قول کسی مفسر کا اور کوئی روایت کسی تفسیر کی صرف اس بنا پر
کہ وہ تفسیر میں درج ہے قابل استدلال نہیں ہو سکتی۔

تفسیر کے سوا اکثر حدیث کی کتابوں سے بھی حضرات امامیہ روایتیں پیش کرتے ہیں، مگر
یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ حدیث کی کتابیں بھی اعتبار و صحت کے لحاظ سے ایک درجے
کی نہیں ہیں۔ سوائے صحاح ستہ کے جتنی کتابیں حدیث کی کہلائی جاتی ہیں ان کی نسبت محققین
کا یہ قول ہے کہ عموماً ان کی حدیثیں نہ قابل عمل ہیں نہ لائق نقل۔ مگر ان لوگوں کے لیے جو
اسماء الرجال سے واقف اور علل احادیث سے آگاہ اور بڑے محقق ہیں کہ وہ ان میں سے
متابعات اور شواہد لے سکتے ہیں، اور یہ بھی ان مسانید اور جوامع اور مصنفات کا حال ہے جو
بخاری و مسلم کے زمانے سے پہلے اور ان کے بعد تصنیف کی گئیں اور جن میں صحیح اور حسن،
ضعیف اور معروف، غریب اور شاذ، منکر اور خطا، صواب اور ثابت اور منقول سب بھری ہوئی
ہیں۔ مثل مسند ابوعلی، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابوبکر بن ابی شیبہ، مسند عبد بن حمید، طیالسی،
کتب بیہقی، طحاوی اور طبرانی کے کہ ان کے مصنفین کا یہ ارادہ تھا کہ جو کچھ پائیں جمع کر
دیں، نہ اس کی تنقید کریں اور نہ تہذیب و تخلص، بلکہ یہ کام دوسروں کے لیے چھوڑ دیں۔ ان
کے علاوہ حدیث کی وہ کتابیں ہیں کہ جن کے مصنفوں نے زمانہ دراز کے بعد تصنیف کا ارادہ
کیا اور جو کچھ صحاح ستہ میں نہ پایا اسے جمع کیا اور جو مسانید اور جوامع چھپے پڑے تھے ان میں

سے روایتیں لے کر اکٹھا کر دیں اور یہ حدیثیں اس قسم کی تھیں جو لوگوں کی زبانوں پر جاری تھیں، مگر محدثین نے ان پر اعتناء نہیں کیا اور ان کو نہیں لیا۔ اور ان میں سے اکثر حدیثیں غیر محتاط اور بکنے والے واعظ بیان کرتے تھے، اہل ہوا اور اہل بدعت اور ضعفاء نقل کرتے رہتے تھے، یا صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کے آثار اور بنی اسرائیل کے اخبار اور حکماء اور واعظین کے کلام تھے جن کو راویوں نے سہواً یا عمداً احادیث میں ملا دیا، یا وہ معانی جو کتاب و سنت کے اشارات سے سمجھے گئے تھے ان کو عمداً احادیث قرار دیا گیا۔ چنانچہ اس قسم کی حدیثیں کتاب الضعفاء ابن حبان، کامل ابن عدی، خطیب، ابو نعیم اور جوزقانی اور ابن عساکر اور ابن نجار اور دیلمی اور مسند خوارزمی میں پائی جاتی ہیں۔ ان کتابوں کا یہ حال ہے کہ سب سے عمدہ اور صحیح حدیثیں ان کی وہ ہیں جو ضعیف ہیں اور سب سے بدتر وہ ہیں جو موضوع اور مقلوب یا منکر ہیں اور انہیں کتابوں کا مادہ کتاب موضوعات ابن جوزی میں ملتا ہے۔

اس قسم کی حدیثوں کے علاوہ اور وہ حدیثیں ہیں جو فقہاء، صوفیہ اور مؤرخین وغیرہم کی زبانوں پر تھیں اور ان کے سبب سے مشہور ہو گئیں جن کی کوئی اصل پہلے طبقات میں نہیں پائی جاتی اور انہی احادیث اور روایتوں میں سے وہ حدیثیں ہیں جن کو ان لوگوں نے جو دین میں بے باک اور باتوں میں زبان دراز تھے اس طور پر حدیثوں میں ملا دیا اور ان کے ایسے قوی اسناد بیان کیے جن میں جرح ممکن نہیں اور ایسے بلوغ کلام میں نقل کیا جس کا صادر ہونا آنحضرت ﷺ سے بعید نہیں۔ ان لوگوں کے اس فریب سے اسلام میں بڑی مصیبت پیدا ہو گئی اور جھوٹے اقوال حدیثوں میں مل گئے۔ اس قسم کی حدیثیں جن کتابوں میں درج ہیں وہی کتابیں شیعوں اور معتزلیوں کی دستاویز ہیں کہ وہ اپنے عقیدوں کے اثبات اور اہل حق کے الزام دینے کے لیے انہیں کتابوں کی روایتیں پیش کرتے ہیں۔ اور جو محقق نہیں ہیں وہ دھوکہ کھا جاتے ہیں۔

ان سب باتوں پر ایک خرابی اور مستزاد ہوئی کہ بعض شخصوں نے مغالطہ کے لیے حدیث کا علم حاصل کر کے احادیث صحاح کی روایت کرنی شروع کی، مگر اسی درمیان میں اپنے عقائد

باطلہ کو اسی اسناد سے جو انہوں نے یاد کر رکھے تھے روایت کر دیا اور اکثر محدثین نے دھوکہ کھایا۔ جیسا کہ جابر جعفی اور ابو القاسم سعد بن عبداللہ الشعری قمی سے ہوا ہے، یہ ایسے ہوشیار استاد تھے کہ حقیقت میں تو شیعہ تھے مگر بہت سے محدثین کو دھوکہ دیا اور غلط حدیثوں کو صحیح حدیثوں کی صورت میں بنا کر ان کو ان کی صحت کا یقین دلا دیا یہاں تک ترمذی، ابوداؤد اور نسائی نے جابر جعفی کی حدیثوں کو اپنی کتابوں میں نقل کر دیا۔ یا صالح نامی ایک شیعہ کی جس نے سنیوں کی بیخ و بن اکھاڑنے کی تدبیر کی تھی یحییٰ بن معین سے محقق نے توثیق کی، اور اس پر اعتماد کیا۔ یہاں تک کہ آخر کار تحقیق کے بعد یہ حال کھلا اور ان کا فریب ظاہر ہوا۔ لیکن چونکہ وہ روایتیں ان کی حدیث کی کتابوں میں لکھ دی گئیں، اس لیے اکثر آدمیوں کو دھوکہ ہوتا ہے اور حدیث کا نام سن کر ان کے اعتقاد میں خلل پڑتا ہے اور واقع میں نہ وہ حدیث ہے اور نہ قول پیغمبر ﷺ۔ بلکہ ایک مغالطہ دینے والے مفتری کا لطیفہ ہے۔

اس قسم کے لوگوں میں ابن ابی الحدید معتزلی ^۱ بھی ہے کہ وہ اعتزال کے ساتھ تشیع کا

۱ زبدة المجتہدین مرزا محمد باقر موسوی بن حاجی زین العابدین نے اپنی کتاب روضات الجنات فی احوال العلماء والسادات مطبوعہ ایران ۱۳۰۷ء میں ابن ابی الحدید کے ترجمے میں یہ لکھا ہے: عبدالحمید بن ابی الحسین بہاء الدین محمد بن محمد بن حسین بن ابی الحدید المدائنی الحکیم الاصول المعتزلی المعروف بابن ابی الحدید صاحب شرح نہج البلاغۃ المشہور ہوں من الکابر الفضلاء المتبعین و اعظم النبلاء المتجرین موالیا لاهل بیت العصمة و الطہارۃ و ان کان فی ذی اہل السنہ و الجماعۃ منصفاً غایۃ الانصاف فی المحاکمۃ بین الفریقین و معترفاً فی ذلک المصاف بان الحق ید و رمع والد الحسنین و ابن ابی الحدید مع تسننہ قدیثوہم عن شرحہ تشیعہ و بالمیثم بالعکس و کان مولدہ فی غرۃ ذی الحجۃ سنۃ ست و ثمانین و خمس مائۃ فمن تصانیفہ شرح نہج البلاغۃ عشرين مجلداً، و قد احتوی هذا الشرح علی ما لم یحتوی علیہ کتاب من جنسہ صنفہ لخرانۃ کتب الوزیر موید الدین بن علقمی ولما فرغ من تصنیفہ انقذہ علی یداخیہ موفق الدین ابی المعالی فبعث لہ بمائۃ الف دینار و خلعه سنیۃ و فرس فکتب الی الوزیر ہذہ الابیات:

یارب العباد رفعت صنیعی، وطللت بمسکبی و بللت ریقی، وزیغ الاشعری کشفتم عنی، فلم اسلك بنیان الطریق، احب الاعتزال و ناصرہ، ذوی الالباب و النظر الدقیق، و اهل العدل و التوحید ابلی، نعم و فریقہم ابدافریقی، و شرح نہج لم ادركہ الا، بعونك بعد مجتهد و ضیق تمثل، ان بدأت

بھی جامع تھا۔ اس نے ابن علقمی وزیر معتمد باللہ کے خوش کرنے اور اس کے کتب خانے کے لیے شرح نہج البلاغہ لکھی اور اس میں گمنام کتابوں اور غیر محقق مصنفوں کی تصنیفات سے وہ جھوٹی اور نامعتبر روایتیں چن چن کر جمع کیں جس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مطعون اور مورد ملامت ٹھہریں اور شیعوں کے اعتراضات اور عقائد کو تقویت ہو۔ ابن علقمی اس کا بڑا مرہون اور دوست تھا۔ اس نے اس کتاب کے صلہ میں ایک لاکھ دینار اور بہت بڑا خلعت فاخرہ ابن ابی الحدید کو دیا۔ اور یہ ابن علقمی معمولی شیعہ نہ تھا بلکہ ایسا عالی شیعہ اور سنیوں کا دشمن تھا کہ اس نے صرف مذہبی تعصب کی وجہ سے عباسی خلافت کو غارت کیا اور ہلاکوں کو پوشیدہ دعوت دے کر بغداد پر حملہ کرنے کے لیے بلایا اور خلیفہ کو دھوکہ دے کر اس کے پاس لے گیا اور اسے مع علماء اور امراء کے شہید کر دیا۔ ابن ابی الحدید کی کتاب اگرچہ نہایت جامع اور عالمانہ ہے اور خود ابن ابی الحدید نہایت قابل اور بڑا ادیب تھا، مذہب تشیع کا حامی تھا کسی عالی اور متعصب شیعہ نے بھی اپنے مذہب کے لیے غالباً اس قدر مواد بہم نہ پہنچایا ہوگا جیسا کہ ابن ابی الحدید نے ان کے لیے مادہ جمع کر دیا۔ اسی کی وہ کتاب ہے کہ اس کے زمانے سے لے کر اب تک اسی سے حضرات امامیہ روایتیں پیش کرتے ہیں اور استناد و استدلال فرماتے ہیں اور ایسے اہل بدعت و مخالف مذہب کو سنیوں کے اکابر علماء میں سے قرار دے کر اس کی روایتوں کو ہمارے مقابلے میں پیش کرتے ہیں۔ شروع زمانے سے لے کر اب تک جس کتاب کو شیعوں کی اٹھا کر دیکھئے اکثر مطاعن صحابہ رضی اللہ عنہم میں ابن ابی الحدید ہی کی کتاب کا حوالہ ہوگا اور اسی کی جھوٹی اور غلط روایتیں ہمارے مقابلے میں پائی جائیں گی، چنانچہ ہماری اس کتاب کے ناظرین کو معلوم ہو جائے گا کہ مطاعن صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق جو روایتیں اہل سنت کے نام سے پیش کی گئی ہیں، ان کا بڑا حصہ اسی ابن ابی الحدید کی کتاب سے لیا گیا ہے۔

﴿﴾ بہ لعینی، اتم کذروۃ الطور السحیق، فتم یحس عینک و ہونائی، من الیعوق اویض العنوق، بآل العلقمی ورت زناری، وقامت بین اهل الفضل سوتی، فکم ثوب انیق نلت منهم، ونلت بهم وکم طرف عتیق، ادام لله دولتهم وانحی علی اعدائهم بالخنفیق۔

مگر روایت اور درایت کے اصول کو جاننے والے اور حدیثوں کی صحت اور غلطی کے پرکھنے والے دھوکہ نہیں کھا سکتے اور وہ وضعی حدیثوں اور جھوٹی روایتوں کو اسی طرح رد کر سکتے ہیں جس طرح صراف کھوٹے کو کھرے سے جدا کرتا ہے، اس لیے کہ محدثین نے ہر حدیث کے متعلق سند بیان کرنے اور راویوں کے نام لکھ دینے سے قیامت تک ہر شخص کے لیے تنقیح، تحقیق کا دروازہ کھول دیا ہے، اور جھوٹ اور سچ میں تمیز کر دینے کا ذریعہ مہیا کر دیا ہے۔ اس لیے جو حدیث یا روایت ہمارے سامنے پیش کی جائے گی تو ضروری ہے کہ ہم اول اس بات پر نظر کریں کہ وہ حدیث از روئے اصول روایت صحیح ہے یا نہیں، اگر ہم کو معلوم ہو کہ اس حدیث کے بیان کرنے والوں میں سے کوئی ایک راوی بھی جھوٹا یا غیر معتبر ہے یا اہل بدعت جس نے اپنے مذہب کی حمایت میں اس حدیث کو روایت کیا ہو تو ہم اسے نہ مانیں گے اور نہ اس سے مخالف کا استدلال کرنا جائز ہوگا۔

اس لیے کہ حدیث اور روایت خبر ہے اور خبر میں صدق و کذب دونوں کا احتمال ہوتا ہے، اور کذب کا احتمال دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے بیان کرنے والے ثقہ، متدین اور صادق القول ہوں۔ پھر اگر وہ خبر اتنی سندوں اور اتنے طریقوں سے بیان کی گئی ہو کہ عادتاً ان کا اجتماع کذب پر محال ہو، اور ابتدا سے انتہا تک اس کے راوی ان معائب سے پاک ہوں جن سے روایت میں خلل اور شبہ پیدا ہوتا ہے تو وہ خبر صحت کے اعلیٰ درجے میں سمجھی جائے گی، اور اسی قسم کی خبر کو ”متواتر“ کہتے ہیں اور صرف اسی قسم کی حدیثیں مفید علم و یقین ہوتی ہیں اور ان پر اعتقاد کی بنیاد قائم ہو سکتی ہے ((وہو الذی یضطر الانسان الیہ .)) مگر اس قسم کی حدیثیں بہت کم ہیں، جیسا کہ ابن صلاح نے کہا ہے:

((مثال المتواتر علی التفسیر المتقدم یعز وجودہ الا ان یدعی

ذالك فی حدیث من کذب علی متعمد افلیتبا مقعدہ من

النار .))

”اس متواتر کی مثال جو تفسیر پر مقدم ہے بہت کم ہے، ہاں، حدیث ((من کذب

علی الخ)) کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے۔“

اور وہ خبر اتنی سندوں اور اتنے طریقوں سے بیان نہ کی گئی ہو مگر اس کے راوی نہایت ثقہ اور نہایت معتبر اور متدین ہوں۔ اور کم سے کم دو طریقوں سے بیان کی گئی ہو تو اس میں بھی صدق کی جانب کو غلبہ ہوگا اور ایسی خبر اصطلاح میں مشہور کہی جاتی ہے۔ اور وہ روایت ماننے کے قابل ہوگی۔ اور اگر وہ خبر اتنے طریقوں اور اتنی سندوں سے جس پر متواتر اور مشہور کا اطلاق ہو سکے بیان نہ کی گئی ہو تو وہ اگر متصل السند غیر معلل ہو اور اس کے راوی ضابطہ اور متصف بہ صفات وثوق ہوں تو گو وہ مفید علم و یقین نہ ہوگی بلکہ اس سے صرف افادہ ظن ہوگا، مگر اسے بھی صحیح سمجھیں گے اور اس پر عمل کرنا جائز ہوگا، لیکن اصول اعتقادات میں بوجہ اس کے کہ اعتقاد کے لیے یقین ضروری ہے وہ بناء اعتقاد نہ ہوگی۔ اور جس حدیث کے سب راوی چھوڑ دیے گئے ہوں یا کوئی راوی چھوڑ دیا گیا ہو اور اس کا چھوڑ دینا بیان کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو، یا کوئی راوی بوجہ من وجوہ الطعن مطعون ہو تو وہ حدیث مطعون سمجھی جائے گی۔ اس لیے کہ اس میں احتمال اس بات کا ہے کہ جو راوی چھوڑ دیا گیا ہے، شاید صحابی ہو یا تابعی۔ اور اگر تابعی ہے تو احتمال ہے کہ وہ ضعیف ہو یا ثقہ۔ سوائے اس کے اگر کوئی راوی ایسا ہو جو جھوٹا ہے یا حدیث کو جان بوجھ کر جھوٹی روایت کرتا ہے یا متہم بہ کذب ہو، یعنی گو خود حدیث کو عمداً بنا کر نہ روایت کرتا ہو مگر اس کا جھوٹ اور طرح پر معلوم ہو یا کثرت سے غلطی کرتا ہو، یا محتاط نہ ہو، یا غفلت کرتا ہو، یا فاسق ہو، یا وہمی، یا اس کی مخالفت ثقات سے پائی جاتی ہو، یا اہل بدعت سے ہو، یا حافظہ کا اچھا نہ ہو۔ ایسے راوی کی بیان کی ہوئی حدیث اعتماد کے قابل نہ ہوگی۔ بلکہ اگر وہ مطعون بہ کذب ہو تو وہ حدیث موضوع ہے۔ اور اگر وہ متہم بہ کذب ہے تو وہ حدیث متروک ہے، اور اگر وہ روایت میں بہت غلطی یا غفلت کرتا ہو یا اس کا فسق ظاہر ہو تو وہ حدیث منکر ہو اور جو مبہم ہو تو اس کی حدیث غیر مقبول ہے۔ اس لیے کہ قبول خبر کی شرط راوی کی عدالت ہے۔ اور جب اس کا نام مبہم ہو اور معلوم نہ ہو کہ کون ہے تو اس کی عدالت کیوں کر معلوم ہو سکتی ہے اور کیوں کر اس کی خبر قبول کی جاسکتی ہے؟ اس لیے مرسل حدیث علی

الاصح قبول نہیں کی جاتی۔

احادیث اور اخبار کے متعلق عموماً اور مطاعن صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق خصوصاً یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اس کا راوی مذہب حق اہل سنت کا مخالف نہ ہو، اس لیے کہ گو ہم اہل بدعت کو کافر نہیں کہتے اور نہ اپنے مذہب کے مخالف کسی مسلمان پر تکفیر کا حکم لگاتے ہیں اور در صورت ضابطہ اور متقی اور صادق ہونے کے اہل بدعت کی روایت کو قبول کرتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس کی روایت اور خبر اس کی بدعت اور اس کے اعتقاد فاسد کی داعی اور موید نہ ہو۔ کیونکہ ممکن ہے کہ وہ اپنی بدعت اور فاسد اعتقاد کی تزئین اور ترویج کی روایتوں کو تحریف کرتا اور اپنے مذہب کے موافق بنا لیتا ہو۔ ایسی حالت میں جو روایت اس کے مذہب اور اعتقاد اور بدعت کو تقویت دیتی ہو علی العموم قبول نہیں کی جائے گی۔

ہماری کتاب کے ناظرین دیکھیں گے کہ اکثر روایتیں مطاعن صحابہ رضی اللہ عنہم اور فدک کے متعلق انہی لوگوں سے مروی ہیں جو مہتمم بہ تشیع تھے، یا مذہب تشیع میں غالی۔ اور گوان کے بوجہ اور طرح سے معتبر ہونے کے محدثین نے ان کی روایتوں کو قبول کیا ہے، مگر جو روایتیں ایسی ہیں کہ جس سے ان کے مذہب کی تائید ہوتی ہو وہ عقلاً اور نقلاً کسی طرح سے قبول کے لائق نہ ہوں گی۔ پھر اصول درایت کے لحاظ سے بھی حدیث قابل تنقیح ہے۔ اگر درایت کی کسوٹی پر وہ کامل المعیار نہ اترے تو ایسی حدیث بھی قابل قبول نہ ہوگی۔ جیسا کہ تدریب الراوی میں لکھا ہے کہ ”جو حدیث عقل یا نقل یا اصول کے خلاف پائی جائے گی وہ موضوع تصور ہوگی۔“ فتح المغیث میں لکھا ہے ❶ کہ ابن الجوزی نے کہا ہے: جو حدیث عقل کے مخالف

❶ قال ابن الجوزی و کل حدیث رایته یخالف العقول او یناقض الاصول فاعلم انه موضوع فلا یتکلف اعتباره ای لاتعتبر رواته ولا تنظر فی جرحهم او یكون مما یدفعه الحسن و المشاهدة او مباینا لنص الكتاب او السنة المتواترة او الاجماع القطعی حیث لا یقبل شی من ذلك التاویل او یتضمن الافراط بالوعید الشدید علی الامر الیسیر و هذا لا خیر کثیر موجود فی حدیث القصاص و الطرفیة و من رکنه المعنی لاتا کلوا القرعة حتی تذبحوا و لذا جعل بعضهم ذلك دلیلاً علی کذب راویہ و کل هذا من القرائن فی المروی و قد تكون فی الراوی قصة غیاث مع المهدی و حکایة سعد بن

ہے یا اصول کے برخلاف، اس کو موضوع جانو۔ اس کے راویوں کی جرح و تعدیل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ علی ہذا القیاس جس حدیث میں ایسا بیان ہو جو حس اور مشاہدہ کے برخلاف ہے، یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی کے ایسا مخالف ہو کہ کسی تاویل صحیح سے مطابق نہ ہو سکے، یا اس کے معنی رکیک اور سخیف ہوں، یا راوی ایسی حدیث میں منفرد ہو جو اوروں کے پاس نہیں ہے اور جس کے مضمون کا جاننا تمام مکلفین کو نہایت ضروری ہے، یا ایسے عظیم الشان واقعہ کا بیان ہو جس کے نقل کرنے کی بہت سے لوگوں کو ضرورت ہے، یا ایسا بیان ہو جسے اتنی بڑی جماعت نے جھٹلا دیا ہے کہ جس کا جھوٹ پر اتفاق کرنا محال ہو اور ان کا دوسرے کی تقلید کرنا عادتاً ناممکن ہے تو یہ سب قرینے روایت کے موضوع ہونے کے ہوئے۔

مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب مرحوم نے عجالہ نافعہ میں فرمایا ہے:

((علامات وضع حدیث و کذب راوی چند چیز است، اول آنکہ خلاف تاریخ مشہور روایت کند، دوم آنکہ راوی رافضی باشد و حدیث در طعن صحابہ روایت کند و یاناصبی باشد و حدیث در مطاعن اہل بیت باشد و علی ہذا القیاس، سوم آنکہ چیزے روایت کند کہ بر جمیع مکلفین معرفت آن و عمل براں فرض باشد و او منفرد بود بروایت، چہارم آنکہ وقت دحال قرینہ باشد بر کذب او، پنجم آنکہ

﴿﴿﴿ ظریف الماضي ذكرهما واختلاف المامون بن احمد الردى حين قيل له الاترى الشافعى و من تبعه بخر اسان ذالك الكلام القبيح حكاة الحاكم فى المدخل، قال بعض المتأخرين و قدرأيت رجلا قام يوم الجمعة قبل الصلوة فابتدأ ليورده فسقط من قامة مغشيا عليه او انفراده عن لم يدر كه بما لم يوجد عنه غيرهما او انفراده بشى مع كو نه فيما يلزم المكلفين علمه و قطع العذر فيه كما قرره الخطيب فى اول الكفايه او بامر جسم يتو فرالدواعى على ثقله كحصر العدد للحاج عن البيت او بما صرح بتكذيبه فيه جمع كثير يمتنع فى العادة توأطعهم على الكذب و تقليد بعضهم بعضاً. فتح المغيث

مخالف مقتضائے عقل و شرع باشد و قوعد شرعیہ آن راتکذیب نمایند، ششم آنکہ در حدیث قصہ باشد از امر حسی واقعی کہ اگر بالحقیقہ متحقق می شد ہزاراں کس آنرا نقل می کردند، ہفتم رکاکت لفظ و معنی، مثلاً لفظے روایت کند کہ بر قواعد عربیہ درست نشود یا معنی کہ مناسب شان نبوت و وقار نباشد ہشتم افراط درو عید شدید بر گناہ صغیر یا افراط درو وعدہ عظیم بر فعل قلیل نہم آنکہ بر عمل قلیل ثواب حج و عمرہ ذکر نماید، دہم آنکہ کسی را از عاملان خیر ثواب انبیاء موعود کند، یاز دہم خود اقرار کردہ باشد بوضع احادیث.))

”موضوع احادیث اور راویوں کے جھوٹے ہونے کی چند نشانیاں ہیں، پہلے یہ کہ مشہور تاریخ کے خلاف روایت کرے، دوسرے یہ کہ راوی رافضی ہو اور صحابہؓ پر طعن کی روایت کرے یا ناصبی اور خارجی ہو اور اہل بیت کو مطعون کرنے کے لیے حدیث روایت کرے، تیسرے یہ کہ وہ اپنی روایت میں بالکل منفرد ہو اور وہ روایت بیان کرے جس سے تمام مکلفین کو اس روایت کے تحت عمل کرنا فرض ہو جائے، چوتھے یہ کہ اس راوی کے جھوٹے ہونے پر حال و قرینہ موجود ہو، پانچویں یہ کہ اس کی یہ روایت عقل و شریعت کے خلاف ہو اور اصول شریعت اس روایت کو جھوٹ بتائیں، چھٹے یہ کہ حدیث میں کسی امر حسی کو بطور مشاہدہ اس طرح بیان کیا جائے کہ اگر وہ درحقیقت صحیح ہوتا تو ہزاروں آدمی اسے بیان کرتے، ساتویں یہ کہ روایت لفظی طور پر بھی اس طرح رکیک ہو کہ عربی قواعد کے لحاظ سے صحیح نہ ہو یا پھر وہ روایت بلحاظ معنی شان اور وقار نبوت کے مناسب نہ ہو، آٹھویں یہ کہ کسی گناہ صغیرہ پر سخت تر وعید یا کسی چھوٹے سے کام پر اجر عظیم

کا وعدہ ہو، نویں یہ کسی چھوٹے سے کام پر حج و عمرہ کے برابر ثواب کا ذکر ہو، دسویں یہ کہ کسی اچھے کام کرنے والے کو انبیاء کے برابر ثواب کا وعدہ ہو اور گیارہویں یہ کہ راوی خود احادیث وضع کرنے کا اقرار کرتا ہے۔“

امام سخاوی نے فتح المغیث میں ابن جوزی سے حدیث کے موضوع ہونے کی یہ نشانیاں لکھی ہیں: ”اَوَّلُ وَه حدیث کہ عقل اس کے مخالف ہو اور اصول کے متناقض ہو، دوم ایسی حدیث کی حس اور مشاہدہ اس کو غلط قرار دیتا ہو، سوم وہ حدیث جو کہ مخالف ہو قرآن مجید یا حدیث متواتر اجماع قطعی کے، چہارم جس میں تھوڑے کام پر وعید شدید اجر عظیم کا وعدہ ہو، پنجم رکاکت معنی اس روایت کی جو بیان کی گئی، ششم رکاکت یعنی سخافت راوی کی، ہفتم منفرد ہونا راوی کا، ہشتم منفرد ہونا ایسی روایت میں جو تمام مکلفین سے متعلق ہو۔ نہم بڑی بات ہو جس کے نقل کرنے کی بہت سی ضرورتیں ہوں، دہم جس کے جھوٹ ہونے پر ایک گروہ کثیر متفق ہو۔“

یہ درایت کے اصول جو شاہ عبدالعزیز صاحب نے بیان کیے ہیں کچھ ان کے خالی خیالات نہیں ہیں، نہ انہوں نے قائم کیے ہیں بلکہ اکثر ہمارے محققین کا اسی پر عمل رہا ہے۔ اور جبکہ کوئی حدیث قرآن مجید یا عقل یا اصول اور عقائد مسلمہ کے مخالف پائی گئی ہے تو اسے مجروح اور مطروح قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ امام رازی نے فرمایا ہے: بعضوں نے پیغمبر خدا ﷺ سے اس حدیث کو روایت کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نہیں جھوٹ بولے مگر تین مرتبہ، تو میں نے جواب دیا کہ ایسی حدیثوں کو نہیں ماننا چاہیے تو کہنے والے نے براہ انکار کہا کہ اگر ہم نہ مانیں تو راویوں کی تکذیب لازم آتی ہے، اس پر میں نے جواب دیا کہ اگر ہم مانیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تکذیب کرنا پڑتی ہے، حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تکذیب کی نسبت سے بچانا بہتر ہے چندنا معتبر آدمیوں کی طرف جھوٹ کے منسوب ہونے سے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے ابو مطیع بلخی نے پوچھا کہ آپ کیا فرماتے ہیں اس حدیث کی نسبت جو لوگوں نے روایت کی ہے کہ جب کوئی مومن زنا کرتا ہے تو ایمان اس کے سر سے ایسا نکل جاتا ہے جیسا کہ قمیض بدن سے۔ آیا اس حدیث کے راویوں کی آپ تصدیق کرتے

ہیں یا شک یا تکذیب فرماتے ہیں؟ اگر تصدیق کرتے ہیں تو آپ کا اعتقاد مثل خوارج کے ہوا جاتا ہے، اور اگر آپ شک کرتے ہیں تو خوارج کے قول میں شک رہتا ہے، اور اگر آپ تکذیب کرتے ہیں تو ان بہت سے آدمیوں کی تکذیب لازم آتی ہے جنہوں نے اس حدیث کو بسند آنحضرت ﷺ سے نقل کیا ہے؟ تو امام نے جواب دیا کہ میں ان سب راویوں کی تکذیب کرتا ہوں اور میرا ان لوگوں کو جھٹلانا اور ان کے قولوں کا رد کرنا پیغمبر خدا ﷺ کی کچھ تکذیب نہیں ہے، اس لیے کہ قول پیغمبر تکذیب یہ ہے کہ کوئی شخص کہے کہ میں پیغمبر خدا ﷺ کے قول کو نہیں مانتا، لیکن جبکہ وہ یہ کہے کہ میں ہر بات پر جو آنحضرت ﷺ نے فرمائی ہے ایمان رکھتا ہوں اور اس کی تصدیق کرتا ہوں لیکن میں جانتا ہوں کہ کوئی بات پیغمبر خدا ﷺ نے قرآن کے خلاف نہیں فرمائی تو یہ حقیقت میں پیغمبر کی تصدیق اور قرآن کی تصدیق ہے اور اس سے تزیہ اور پاکی آنحضرت ﷺ کی مخالفت قرآن سے ثابت ہوتی ہے۔ اور اگر پیغمبر خدا ﷺ قرآن کے خلاف کچھ کہتے تو خدا کب چھوڑتا، اور کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا کا نبی ایسی بات کہے جو خدا کی کتاب کے مخالف ہو، اور جو خدا کی کتاب کا مخالف ہو وہ کیسے خدا کا نبی ہو سکتا ہے۔ پس یہ حدیث خلع ایمان کی زنا سے جو لوگوں نے روایت کی ہے قرآن کے خلاف ہے۔ پس ایسے آدمیوں کے قول کو رد کرنا جو پیغمبر خدا ﷺ کی طرف ایسی بات کو منسوب کریں جو قرآن کے مخالف ہو پیغمبر کی بات کا رد کرنا نہیں ہے اور نہ ان کی تکذیب ہے بلکہ حقیقت میں وہ رد ہے اس کے قول کا جو کہ پیغمبر خدا ﷺ کی طرف سے ایک باطل بات کو نقل کرتا ہے اور آنحضرت ﷺ پر تہمت لگاتا ہے۔ اور ہم پیغمبر ﷺ کی ہر بات کو خواہ ہم نے سنی ہو بسر و چشم قبول کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور شہادت دیتے ہیں کہ وہ بات ایسی ہی ہوگی جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے، لیکن اس طرح پر ہم یہ شہادت دیتے ہیں کہ کوئی بات آنحضرت ﷺ نے قانون کے خلاف نہیں فرمائی، نہ کسی ایسی چیز کا حکم دیا جسے خدا نے منع کر دیا ہو نہ کسی ایسی چیز کو جدا کیا جس کے ملانے کا اللہ نے حکم کیا ہو اور نہ کسی چیز کی ایسی صفت بیان کی جو خدا کے بیان کے مخالف ہو۔ اور ہم شہادت

دیتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا ہر قول خدائے عزوجل کے قول کے موافق تھا اور اسی لیے خدانے فرمایا ہے کہ جس نے رسول اللہ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

یہ نہ خیال کیا جائے کہ حدیث کی غیر معتبر کتابوں میں جو روایتیں درج ہیں انہی پر یہ اصول مستعمل ہوں گے بلکہ حدیث کی تمام کتابوں پر اس کا اطلاق ہوگا۔ اس لیے کہ صحاح میں جتنی حدیثیں درج ہیں وہ سب صحت کے ایک درجے پر نہیں ہیں بلکہ ان کے درجات مختلف ہیں جیسا کہ خود ان کتابوں کو دیکھنے اور ان کی شروحات کے ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے، یہاں تک کہ بخاری اور مسلم جو اصح الکتاب سمجھی جاتی ہیں ان کی نسبت بھی کہا گیا ہے کہ ((انہ صحیح علی ظن مصنفہ و غلبۃ ظنہ و امام السہو و النسیان فمن لوازم طبع الانسان)) اور نیز ان کی بعض حدیثوں اور بعض راویوں میں کلام کیا گیا ہے، جیسا کہ محققین نے بیان کیا ہے کہ بخاری نے چار سو اور کچھ اوپر تیس آدمیوں سے روایت کی ہے جو مسلم میں نہیں ہیں، اور ان میں سے اسی شخص ایسے ہیں جن کے ضعف کی نسبت کلام کیا گیا ہے، اور چھ سو بیس آدمیوں سے امام مسلم نے روایت کی ہے جو بخاری میں نہیں ہیں، اور ان میں ایک سو ساٹھ آدمی ایسے ہیں جن کے ضعف ہونے کی نسبت گفتگو کی گئی ہے۔ اور عکرمہ نے جو روایت ابن عباسؓ سے کی ہے وہ بھی بخاری میں داخل ہیں اور مسلم میں ابوالزبیر عن جابر اور سہیل عن ابیہ اور علاء بن عبد الرحمن عن ابیہ اور حماد بن سلمہ عن ثابت سے جو روایتیں ہیں ان کے راوی ضعیف خیال کیے گئے ہیں۔ اور ایسی حدیثیں جن میں کوئی علت پائی گئی ہے وہ صحیحین میں دو سو دس ہیں، ان میں سے بخاری کی حدیثیں اسی سے کم ہیں، باقی مسلم کی حدیثیں ہیں (دیکھو مقدمہ فتح الباری) اسی لیے ملا علی قاری نے کتاب رجال میں لکھا ہے:

((وما یقولہ الناس ان من روی لہ الشیخان فقد جاز القنطرة

هذا ایضا من التجاهل فقد روی مسلم فی کتابہ عن الیث عن

ابی مسلم وغیرہ من الضعفاء فیقولون انما روی عنہم فی

کتابہ للاعتبار والشواہد المتابعات و هذا لا یقوی لان

الحفاظ قالوا الا اعتبار امور ریتعرفون بها حال الحدیث و کتاب مسلم التزم فیہ الصحة فكيف يتعرف حال الحدیث الذی فیہ بطرق ضعيفة الى قوله وروی مسلم ایضا حدیث الاسراء فیہ و ذالك قبل ان یوحى الیه و قد تكلم الحفاظ فی هذه القصة و بینوا ضعفها الى قوله و قد قال الحفاظ ان مسلما لما وضع كتابه الصحيح عرضه على ابی ذرعة فانكر علیه و تغیظ و قال سمیته الصحيح و جعلته مسلما لا هل البدع و غیرهم انتهى . و الحاصل انه صحيح على ظن مصنفه و غلبة ظنه و اما السهو والنسيان فمن لوازم طبع الانسان و قد ابی الله الا ان یصحح كتابه بقوله ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ ((

”لوگ جو یہ بات کہتے ہیں کہ شیخین (بخاری و مسلم) نے جن سے روایت کی ہے وہ بہت اعلیٰ درجے کے لوگ ہیں، یہ بھی جہالت ہے دیکھو مسلم نے اپنی کتاب میں لیث سے انہوں نے ابو مسلم وغیرہ سے روایت کی ہے۔ جو ضعیف ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ان سے اس لیے روایت کی ہے تاکہ اعتبار اور شہادت ہو جائے، یہ مضبوط بات نہیں ہے، حفاظ کہتے ہیں کہ اس سے حدیث کا حال معلوم ہوتا ہے اور مسلم میں صحت کا التزام کیا گیا ہے۔ لہذا ان حدیثوں سے جو ضعیف طرق سے مروی ہیں حدیث کا حال کیسے معلوم ہو سکتا ہے..... امام مسلم نے تو حدیث معراج کو قبل وحی آنے کے روایت کیا ہے، حفاظ حدیث نے اس قصے پر اعتراض کیا ہے، اور اس کے ضعف کو ظاہر کیا ہے..... حافظ کا قول ہے کہ امام مسلم نے جب اپنی کتاب صحیح مسلم لکھی تو اس نے ابو زرہ کو دکھایا ابو زرہ نے اسے ناپسند کیا اور غصہ بھی ہوئے اور کہا کہ تم نے اس کا نام صحیح رکھا ہے جب کہ

اسے اہل بدعت وغیرہ کے لیے ایک ہتھیار بنا دیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ وہ اپنے مصنف کا گمان کے لحاظ سے صحیح ہے۔“

لیکن سہو اور نسیان کا امکان ہے، کیونکہ یہ انسانی لوازمات میں سے ہے۔ ہاں، اللہ کی کتاب (قرآن) بے شک صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں فرمایا کہ ہم نے قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اور صاحب ”ازالۃ الغین“ نے بھی فرمایا ہے:

((از کتب محدثین چنان بوضوح می انجامد کہ بعد از تحقیق در صحت یعنی روایات صحیح بخاری کلام است و ہم چنیس در بعضے روایات صحیح مسلم، و قبل ازیں گزشتہ کہ آن روایات کہ اہل حدیث در صحت آن قیل و قال دارند ہر چند اقل قلیل ست مگر در صحیح ثانی زیادہ تر از اول ست و بریں قدر اکتفانمی توان کرد زیرا کہ افادہ بن اثیر در صدر جامع الاصول جائیکہ فرع ثالث در طبقات مجروحین قرار دادہ ست دلالت براں دارد کہ بعضے از وضاعین خود اقرار کردہ اند کہ حدیث فدک ساختہ بر مشائخ بغداد خواندیم ہمہ ہا قبول کردند مگر ابن ابی شبیبہ علوی کہ او بعلت جعل و افترا پی برد ہرگز قبول نکرد، عبارت آن مقام این ست .))

”کتب محدثین کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تنقید و تحقیق کے بعد صحیح بخاری کی روایات میں کچھ کلام ہے اور اسی طرح صحیح مسلم کی بعض روایات میں بھی ہے اور قبل اس کے لکھا جا چکا ہے کہ جن روایات کی صحت کے بارے میں اہل حدیث نے قیل و قال کی ہے اگرچہ ان کی تعداد کم ہے مگر صحیح مسلم کی بہ نسبت صحیح بخاری

میں زیادہ قیل و قال ہے، اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ افادہ ابن اثیر صدر جامع الاصول کو مجروح قرار دیا گیا ہے اور بعض خود ساختہ احادیث بنانے والوں نے خود اقرار کیا ہے کہ شیوخ بغداد کے سامنے ہم نے اپنی خود ساختہ حدیث فدک پیش کی جسے انہوں نے قبول کر لیا، البتہ ابن ابی شیبہ علوی وہ شخص ہے جس نے اس کی جعل سازی اور افترا پردازی کے سبب اسے قبول نہیں کیا۔“

جس کی عربی عبارت یہ ہے:

((ومنهـم قوم و ضـعوا الحدیث لہوی یدعون الناس الیہ فمـنہم من تاب عنہ و اقر علی نفسہ ، قال شیخ من شیوخ الخوارج بعد ان تاب ان هذا الاحادیث دین فانظر وامن تاخذون دینکم فان کنا اذا هوینا امرنا صبرناہ حدیثا ، و قال ابو العینا وضعت انا و الجاحظ حدیث فدک واد خلناہ علی الشیوخ بغداد فقبلوہ الا ابن ابی شیبۃ العلوی فانه قال لا یشبہ آخر هذا الحدیث اولہ و ابی ان یقبلہ تم بلفظہ .))

اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مسلم میں جہاں کہ شیخ ابن صلاح کے اس قول کو کہ تمام حدیثیں صحیحین کی قطعی الصدور ہیں، رد کیا ہے یہ کہا ہے:

((هذا الذی ذکر الشیخ فی هذا الموضوع خلاف ما قالہ المحققون و الا کثرون فانہم قالوا احادیث الصحیحین الی لیست بمتواترة انما یفید الظن فانہا احاد و الاحاد انما یفید الظن علی ما تقررو لا فرق بین البخاری و مسلم و غیر ہما فی ذالک الی ان قال و لا یلزم من اجماع الامۃ علی العمل بما فیہما اجماعہم علی انہ مقطوع بانہ کلام النبی صلی اللہ

علیہ وسلم .))

”یعنی شیخ ابن صلاح نے جو یہاں ذکر کیا ہے وہ اکثر محدثین و محققین کے خلاف ہے، اس لیے کہ محققین کا قول ہے کہ صحیحین کی حدیثیں متواتر نہیں ہیں، بلکہ احاد ہیں اور احاد سے ظن کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اور اس باب میں بخاری و مسلم وغیرہ سب کتب احادیث میں کچھ فرق نہیں، یہاں تک کہ امام نووی نے کہا ہے کہ صحیحین کی حدیثوں پر عمل کرنے پر جو امت نے اجماع کیا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ امت کا اس پر بھی اجماع ہے کہ وہ احادیث قطعی الصدور اور آنحضرت ﷺ کا قطعی کلام ہے۔“

اسی لیے جو حدیث صحیح بخاری و مسلم میں لکھی ہو اور وہ شریعت اسلام میں کسی ثابت شدہ چیز کے مخالف ہو وہ بالاتفاق وہم راوی کے اعتبار سے باطل ہوگی یا ماول، جیسا کہ علامہ رشید الدین خاں مرحوم نے شوکت عمریہ میں لکھا ہے:

((چیزے کی مخالف ما ستقر فی شریعة الاسلام ست باتفاق شیعہ و سنی یا محکوم علیہ بطلان ست بجهت وهم راوی یا ماول ست چنانچہ امام نووی در شرح صحیح مسلم در شرح ایس حدیث (حدیث صحیح مسلم کہ ظاہر او دلالت بر قدح بعضے احصاب کبار دارد) نقلا عن القاضی عیاض مازنی می فرماید و اذا انسدت طرق تاویلها نسبنا الکذب الی رواتها .))

”جو چیز اسلام میں ثابت شدہ چیزوں کے خلاف ہو وہ بالاتفاق شیعہ و سنی یا تو وہم راوی کے اعتبار سے ہے یا اس میں تاویل کی جائے گی، جیسا کہ امام نووی نے شرح مسلم میں اس حدیث کی شرح میں جو بعض اکابر صحابہ کی برائی پر دلالت کرتی ہے، قاضی عیاض مازنی سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب اس کی

تاویل ہو سکے تو ہم اس کذب کو راویوں کی طرف منسوب کریں گے۔“
 اور اگرچہ صحیحین میں ان کے جامعین بخاری و مسلم نے جہاں تک کہ انسانی طاقت سے
 ہو سکتا ہے صحیح حدیثوں کے جمع کرنے میں بے انتہا کوشش فرمائی ہے اور اسی لیے تمام کتابوں
 میں ان کا درجہ اعلیٰ اور افضل ہے، مگر آخر وہ بھی بشر تھے اور اپنے اقران و امثال سے تصحیح
 حدیث میں گوشے سبقت لے گئے، اس لیے جائے تحقیق محققین و اجتہاد مجتہدین باقی ہے۔
 جیسا کہ منتہی الکلام میں لکھا ہے:

((آخر ایس بزرگان ہم از جملہ بشر بودہ اند گو در تصحیح
 حدیث بغایت قصویٰ کو شیدہ باشند سیما محمد بن
 اسمعیل بخاری کہ او دریں امور گوئے سبق از اقران و امثال
 ربودہ لیکن باز ہم جائے اجتہاد مجتہدین باقی ست۔ مگر
 یادنداری کہ دربارہ چندے از روایتش بعضے از علماء و فقہاء
 بحث دارند شارحین در جواب آن وجوہے نقل می کنند کہ
 بعضے از اہل خالی از غرابت نیست.))

”یہ تمام بزرگ بھی انسان تھے اگرچہ انہوں نے تصحیح احادیث میں بے انتہا
 کوشش کی خاص طور پر محمد بن اسمعیل بخاری نے تصحیح احادیث میں اپنے ہم
 عصروں کی بہ نسبت زیادہ کوشش سے کام لیا ہے، تاہم اجتہاد مجتہد کی جگہ باقی
 ہے۔ اور تمہیں یاد ہوگا کہ بعض فقہاء و علماء نے ان کی روایات پر بحث کی ہے اور
 شرح لکھنے والوں نے ان اعتراضات کے جواب میں جو اسباب لکھے ہیں وہ
 بہت عجیب و غریب ہیں۔“

اور یہ امر بعید از قیاس بھی نہیں ہے، اس لیے کہ وضعی حدیثوں کے علاوہ اور بھی قدرتی
 اسباب ایسے ہیں جن کی وجہ سے روایات میں اختلاف پڑنا اور ان کی صحت میں شک ہونا ممکن
 الواقع ہے، چنانچہ اس کے آٹھ اسباب محققین نے بیان کیے ہیں۔ (۱) حدیث کے مطلب کی

غلط فہمی۔ (۲) حدیث کے معنی سمجھنے میں دو راویوں کے باہم اختلاف، یعنی ایک ہی حدیث کے ایک نے کچھ معنی سمجھے اور دوسرے نے کچھ۔ (۳) حدیث کا مطلب لوگوں سے صاف صاف بیان کرنے کی عدم قابلیت۔ (۴) چوتھے راوی کے حافظے کا قصور، کہ یا تو اس سے کسی حدیث کا کوئی جز چھوٹ گیا یا دو حدیثیں باہم خلط ملط ہو گئیں۔ (۵) پانچویں راوی کا کسی جز حدیث کی تفصیل کا بیان کرنا اس غرض سے کہ سننے والا آسانی اسے سمجھ جائے لیکن سننے والے نے از راہ غلطی اس تفصیل کو بھی حدیث کا جز سمجھا۔ (۶) راوی نے اپنی گفتگو میں جناب پیغمبر خدا ﷺ کے چند کلمات بیان کیے اور سننے والوں نے اس کے تمام کلمات کو حدیث سمجھ لیا۔ (۷) وہ اختلاف جو زبانی روایات کے سلسلے سے خود بخود عارض ہوتا ہے۔ (۸) مختلف حالات جن میں کہ راوی نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا تھا یا کچھ فرماتے سنا تھا یا کرتے دیکھا تھا۔

اسی لیے اصول فقہ میں یہ قاعدہ قرار دیا گیا ہے:

((العقل شاہد بان خبر الواحد العدل لا یوجب الیقین لان احتمال الکذب قائم وان کان مرجوحا والالزم القطع بالنقیضین عند اخبار العدلین بہما وان خالف خبر الواحد جمیع الاقیسة لا یقبل عندنا و ذالك لان النقل بالمعنی ۱ کان مستفیضا فیہم فاذا قصر فقہ الراوی لم یومن من ان یذهب شی من معاینہ فیدخلہ شبہة زائدة تخلوا عنها القیاس .))

① واما کلامہ ﷺ فیستدل منہ بما ثبت انه قاله علی اللفظ المروى و ذالك نادر جدا نما یوجد فی الاحادیث القصار علی قلة ایضا فان الغالب الاحادیث مروى بالمعنی و قد تدا و لتها الاعاجم و المولدون قبل تدوینہا فردوھا بما ادت الیہ عباراتہم فزادو او نقصوا وقد مواوا کروا و بدلوا الالفاظ بالفاظ و لہذا ترى الحدیث الواحد فی القصة الواحدة مروى علی اوجه شتى بعبارات مختلفة و من ثم انکر علی ابن مالک اثبات القواعد النحویة بالفاظ الواردة فی الحدیث قال ابو حبان فی شرح التہسیل قد اکثر هذا المصنف من الاستدلال بما وقع فی الاحادیث علی اثبات القواعد الكلية فی لسان

اور چونکہ اخبار میں شک کرنا بظاہر عدالت صحابہ رضی اللہ عنہم پر شبہ کرنا سمجھا جاتا ہے، اس لیے عدالت صحابہ رضی اللہ عنہم کی نسبت ہمارے محققین نے کہا ہے:

((فان قيل عدالة جميع الصحابة ثابتة بالآيات والا حاديث الواردة في فضائلهم فقلنا ذكر بعضهم ان الصحابي اسم لمن استشهر بطول صحبة النبي على طريق المتتبع له والا خدمته وبعضهم انه اسم لمومن راى النبي ﷺ سواء طالت صحبته

﴿﴾ العرب ومارايت احد امن المتقدمين والمتأخرين سلك هذه الطريقة غيره على ان الواضعين الاولين لعلم النحو والمستقرئين للاحكام من لسان العرب كابي عمرو و بن العلاء عيسى بن عمرو الخليل و سيبويه من ائمة البصريين و الكسائي و الفراء و على بن مبارك الاحمر و هشام الضرير من ائمة الكوفيين لم يفعلوا ذلك و تبعهم على هذا المسلك المتأخرون من الفريقين و غيرهم عن نحاة الاقاليم كنحاة بغداد و اهل الاندلس و قد جرى الكلام فى ذلك مع بعض المتأخرين الاذكياء فقال انما ترك العلماء ذلك لعدم و ثوقهم ان ذلك لفظ الرسول ﷺ اذ لو و ثقوا بذلك لجرى مجرى القرآن فى اثبات القواعد الكلية و انما كان ذلك لا مرين احد هما ان الرواة جوز و النقل بالمعنى فتجد قصة واحدة قد جرت فى زمانه ﷺ لم تنقل بتلك الا الفاظ جميعا، نحو ما روى من قوله زوجتكها بما معك من القرآن ملكتها بما معك خذها بما معك و غير ذلك من الالفاظ الواردة فى هذا القصة، فنعلم يقينا انه ﷺ لم يلفظ بجميع هذه الالفاظ بل لانجزم بانه قال بعضها او يحتمل انه قال لفظا مراد فالهذاهذا الالفاظ غيرها فاتت الرواة بالمرادف و لم تاتا بلفظه اذ المعنى هو المطلوب و لا سيما مع تقادم السماع و عدم ضبطه بالكتابة و الاتكال على الحفظ فالضابط منهم من ضبط المعنى و امام ضبط اللفظ فبعيد جدا لا سيما فى الاحاديث الطوال و قال سفيان الثورى ان قلت لكم انى احد ثكم كما سمعت فلا تصدقونى انما هو المعنى و من نظر فى الحديث ادنى نظر علم علم اليقين انهم انما يرون بالمعنى و قال ابو حبان انما امنعت الكلام فى هذه المسئلة لئلا يقول المبتدى ما بال النحويين يستدلون بقول العرب و فيهم المسلم و الكافر ولا يستدلون بما روى فى الحديث ينقل العدول كا البخارى و مسلم و امثالهما فمن طالع ما ذكرناه ادرك السبب الذى لاجله لم يستدل النحاة بالحديث انتهى كلام ابن حبان و قال ابو الحسن بن الصائغ فى شرح الجمل تجويز الرواية بالمعنى هو لسبب عندى فى ترك الاثمة كسيبويه الاستشهاد على اثبات اللغة بالحديث و اعتدوا فى ذلك على القرن و صريح النقل عن العرب و لولا تصريح العلماء بجواز النقل بالمعنى فى الحديث لكان الاولى فى اثبات فصيح اللغة كلام النبى ﷺ لانه افصح العرب۔ (الاقتراح للسيوطى از ۱۹ تا ۲۱)

ام لا الا ان الجزم بالعدالة مختص بمن اشتهر بذلك
 والباقون كسائر الناس فيهم عدول و غير عدول .))
 ”اگر کہا جائے کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کی عدالت ان آیات اور احادیث سے ثابت
 ہے جو ان کے فضائل میں آئی ہیں تو ہم کہیں گے کہ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ
 صحابی وہ ہے جس نے حضور کی لمبی صحبت اٹھائی ہو اور آپ کا تابع رہا ہو اور
 آپ سے اکتساب کیا ہو۔ اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ صحابی وہ مومن ہے جس
 نے حضور کو دیکھا ہو چاہے لمبی مدت صحبت میں رہا ہو یا نہیں، ہاں، عدالت انہی
 کے ساتھ خاص ہے جو صحبت کے ساتھ مشہور ہیں اور باقی دیگر عام لوگوں کی
 طرح ہیں ان میں عادل بھی ہیں اور غیر عادل بھی۔

اخبار احادیث کی نسبت جبکہ عقلاً اور نقلاً یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ وہ مفید یقین نہیں ہیں
 تو ضرور ہے کہ جو خبر کتاب یا سنت مشہورہ اور اجماع امت کے معارض ہو وہ ان خیالات کے
 لحاظ سے جو اوپر بیان کیے گئے راویوں کے غیر مشتبہ ہونے کی صورت میں بھی مقبول نہ ہوں
 گی، اس لیے کہ یقین ظن سے زائل نہیں ہو سکتا۔

((فكيف يعتبر خبر الواحد في معارض الكتاب و السنة
 المشهورة و اجماع الامة و كل حديث يخالف كتاب الله فانه
 ليس بحديث الرسول وانما هو مفترى و كذلك كل حديث
 يعارض دليلا اقوى منه فانه منقطع عنه عليه السلام لان
 الادلة الشرعية لا يناقض بعضها بعضا وانما تناقض من
 الجهل المحض .))

”کتاب و سنت مشہورہ اور اجماع امت کے مخالف کسی خبر واحد کا کیسے اعتبار کیا
 جا سکتا ہے، ہر وہ حدیث جو کتاب اللہ کے خلاف ہو وہ حدیث رسول نہیں بلکہ
 موضوع (گڑھی ہوئی) ہے، اسی طرح وہ حدیث جو اپنے سے قوی دلیل کے

خلاف ہو وہ آپ سے منقطع ہوگی، کیونکہ دلائل شرعیہ ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہوتے تناقض اور اختلاف تو نری جہالت ہے۔“

یہ بات بھی ذہن نشیں کرنے کے لائق ہے کہ روایات کی جرح و تعدیل صرف اخبار شرعیہ کی صحت کے لیے ضروری ہے تاکہ اس سے اس خبر کی صحت پر ظن ہو جائے اور تکالیف شرعیہ ظنی اخبار پر واجب ہو سکتی ہیں لیکن واقعات اور مسائل عقلیہ میں جرح و تعدیل کی بھی ضرورت نہیں ہے جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ وہ خبر فی نفسہ ممکن بھی ہے یا نہیں۔ اگر اس کا محال ہونا ثابت ہو تو تعدیل و تخریح فضول ہے، یہاں تک کہ اگر ایسی خبر متواتر بھی ہو تو وہ موجب یقین نہ ہوگی، جیسا کہ تلوح میں کہا گیا ہے:

((ثم المتواتر لا بدان یكون مستندا الى الحسن سمعا او غيره حتى لو اتفق اهل اقليم على مسألة عقلية لم يحصل لنا اليقين حتى يقوم البرهان وقال ابن خلدون في مقدمة تاريخه ولا يرجع الى تعديل الرواة حتى يعلم ان ذلك الخبر في نفسه ممكن او ممتنع و اما اذا كان مستحيلا فلا فائدة للنظر في التعديل والتجريح و لقد عد اهل النظر من المطاعن في الخبر استحالة مدلول اللفظ و تاويله ان ياول بما لا يقبله العقل و انما كان التعديل و التجريح هوالمعتبر في صحة الاخبار الشرعية لان معظمها تكاليف انسانية اوجب الشارع العمل صدقها او صحتها من اعتبار المطابقة فلذلك و جب ان ينظر في امكان و قوعه و صار فيها ذلك اهم من التعديل و مقدا عليه اذ فائدة الانشاء مقتبسة منه فقط و فائدة الخبر منه و من خارج بالمطابقة و اذا كان ذلك فالقانون في تميز الحق من الباطل في الاخبار بالا مكان و الا استحالة ان ننظر في اجتماع

البشرى الذى هو العمران و نميز ما يلحقه من الاحوال الذالته
و بمقتضى طبعه و ما يكون عارضا لا يعتد به .))
”پھر خبر متواتر کے لیے ضروری ہے کہ وہ حسی طور پر معتبر ہو اگر کسی عقلی مسئلہ پر
پورے ملک کے لوگ متفق ہو جائیں تو اس سے یقین حاصل نہیں ہوگا جب تک
کہ اس پر دلیل قائم نہ ہو، ابن خلدون نے اپنے مقدمہ تاریخ میں کہا ہے کہ
راویوں کی تعدیل کی طرف رجوع نہیں کیا جائے گا جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے
کہ فی نفسہ وہ خبر ممکن یا ممتنع ہے، لیکن اگر وہ خبر محال ہو تو جرح و تعدیل سے کوئی
فائدہ نہیں، اہل علم کے نزدیک خبر کے لیے اگر لفظ کا مدلول اور تاویل محال اور
عقل کے خلاف ہو تو یہ عیب شمار ہوتا ہے جرح و تعدیل اخبار شرعیہ کی صحت میں
معتبر ہے کیونکہ اکثر تکالیف انسانیہ جن پر شریعت نے عمل کرنے کو واجب قرار
دیا ہے جب ان کے صدق کا گمان حاصل ہو اور ظن کی صحت کا طریقہ عدالت
اور ضبط کے ذریعہ راویوں پر اعتماد ہے اور واقعات کے سلسلے کی خبروں میں صدق
و صحت کے لیے مطابق ہونا معتبر ہے، اس لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس کا
وقوع ممکن بھی ہے یہ بات اس میں تعدیل سے زیادہ اہم ہے اور اس سے مقدم
ہے۔“

غالباً اخبار اور روایتوں کے متعلق جو کچھ ہم نے لکھا ہے اسے دیکھ کر حضرات امامیہ یہ
فرمائیں کہ اگر تواریخ، تفسیر اور حدیث کی کتابوں کا یہ حال ہے کہ ان میں لکھی ہوئی کوئی خبر
ایسی نہیں ہے جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو، اور کوئی خبر احاد مفید یقین نہیں ہے اور بہت سی
حدیثیں لوگوں نے بنا کر مشہور کر دیں ہیں تو پھر سنیوں کی کسی کتاب کا کچھ اعتبار نہ رہے گا اور
چونکہ انہیں کتابوں پر خصوصاً احادیث کی کتب پر ان کے مذہب کا مدار ہے اور شریعت کی بنیاد
اس پر قائم ہے تو خود سنیوں کے بیان سے وہ بنیاد منہدم ہوتی ہے اور وہ خود اپنی کتابوں کو آپ
غلط بتاتے ہیں، چنانچہ بعض علمائے امامیہ نے یہی لکھا ہے اور صاحب استقصاء نے بھی جا بجا

صراحتاً اور ارشاداً یہ طعنہ کیا ہے۔ مگر یہ کہنا ان کا صحیح نہ ہوگا، اس لیے کہ کوئی کتاب قرآن مجید کی طرح آسمان سے تو نازل ہوئی نہیں اور جبریل امین علیہ السلام خدا کی طرف سے لائے نہیں اور صاحب الوحی نے اسے وحی فرمایا کہ ہم تک پہنچایا نہیں، اس لیے کوئی کتاب، کتاب اللہ کی طرح صحت و یقین کے درجے پر پہنچ نہیں سکتی، کتاب اللہ کے بعد جہاں تک انسان کی کوشش سے ممکن ہے وہاں تک صحیح حدیثوں کے جمع کرنے میں اور وضعی حدیثوں کے قبول نہ کرنے میں صحاح ستہ کے مصنفین نے کوشش کی اور تا بہ امکان بشری صحیح حدیثوں کو جمع کیا، خصوصاً امام بخاری و مسلم نے اور خاص کر امام بخاری نے اور اسی لیے علماء کے گروہ کثیر نے اس کی صحت کو تسلیم کیا اور اسے کتاب اللہ کے بعد تمام کتابوں سے زیادہ صحیح سمجھا۔ مگر یہ امر کہ اس کی ہر حدیث مفید یقین ہو یا کوئی راوی اس کا مشتبہ نہ ہو ایسا دعویٰ کرنا گویا ان کی کتاب کو خدا کی کتاب کے برابر سمجھنا ہے اور اگر باوجود کمال زحمت اور تکلیف کے جو انہوں نے حدیثوں کے جمع کرنے میں اٹھائی اگر بعض ضعیف حدیثیں ان کی کتاب میں درج ہو گئیں یا بعض ایسے راویوں کی روایت انہوں نے قبول کی جن میں کلام کیا گیا ہے تو اس سے ان کی شان میں کچھ فرق نہیں آسکتا اور ان کی کتابیں جس قدر و منزلت کے لائق ہیں اس میں کمی نہیں ہو سکتی، نہ اس سے کوئی شبہ ان کی کتاب پر ہو سکتا ہے، اور نہ باوجود موجود ہونے کے ایسی معتبر کتابوں کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہماری مذہبی کتابیں اعتماد اور اعتبار کے لائق نہیں ہیں۔ بلکہ جوشدت اور سختی حدیثوں اور اخبار کے قبول کرنے اور اس کی صحت کی تحقیق اور تنقیح میں ہمارے محدثین نے فرمائی ہے اور جس صفائی اور زور کے ساتھ غلط اخبار اور ضعیف احادیث اور زید و عمر کی کتابوں پر جرح کی ہے اس سے اس کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ مذہب کے پکے اور نیت کے پاک، صداقت کے جویاں، حق کے متلاشی اور باطل سے متنفر اور مذہب کی بنیاد مستحکم اصول پر قائم کرنے والے تھے۔ اگر ہم انہیں روایتوں کی تحقیق اور اخبار کے قبول کرنے میں ایسا سخت نہ پاتے اور ان کا تساہل اور تسامح مذہبی روایتوں میں دیکھتے تو ہمارا یقین اپنے مذہب کے استحکام پر ایسا نہ ہوتا جیسا کہ اب ہے۔ ہمارے محدثین اور محققین کی تحقیق اور تنقیح نے ہم پر

یہ ثابت کر دیا کہ ہمارا مذہب ایسی مستحکم بنیاد پر قائم ہے جس میں کسی طرح خلل نہیں آسکتا۔
 ﴿كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ﴾

لیکن کیا حال ہوگا حضرات امامیہ کے مذہب کا اگر بعض وضعی حدیثوں اور غلط روایتوں کے ہونے سے کسی مذہب کی تمام کتابیں غلط اور اس کے تمام محدثین اور مجتہدین غیر معتبر سمجھے جاسکتے ہیں، اس لیے کہ جب اسی نظر سے ہمارے علماء نے اپنے یہاں کی کتابوں کو دیکھا ہے وہ اپنے یہاں کی کتابوں کو دیکھیں گے، اگر ہمارے یہاں سے بڑھ کر ان کے یہاں کی کتابیں زیادہ قابل اعتراض نہ سمجھی جائیں تو کسی حالت میں اس سے کم تو نہ ہوں گی بلکہ اگر ادب ملحوظ نہ ہو تو بہت بڑا حصہ ان کی حدیثوں کی کتابوں کا خصوصاً جو امامت سے متعلق ہے صرف قرآن اور عقل کی مخالفت کی وجہ سے غیر قابل اعتبار ثابت کیا جاسکتا ہے، مگر میں ادب کے دائرے سے قدم باہر رکھنا اور اپنے اثنا عشری دوستوں کو اس کے بیان سے رنجیدہ اور شرمندہ کرنا پسند نہیں کرتا، اس لیے ضروری باتوں پر اکتفا کرتا ہوں اور یہ بات دکھاتا ہوں کہ کتابوں کے غیر معتبر ہونے، اور جھوٹی حدیثوں کے بنانے، اور ائمہ پر تہمت لگانے اور راویوں کے حالات تحقیق کرنے، اور جرح کو تعدیل پر مقدم سمجھنے اور اخبار احاد کے مفید یقین نہ ہونے اور ان اخبار کے جو مخالف قرآن، عقل اور عقائد مسلمہ کے ہوں قابل قبول نہ ہونے اور دیگر باتوں کے جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے کی نسبت علماء امامیہ نے کیا فرمایا ہے۔

ملا علی طہرانی کتاب ”توضیح المقال فی علم الرجال“ میں حدیثوں اور راویوں کے متعلق یہ فرماتے ہیں:

((المراد بالحديث ما ينتهي سلسلة سنده الى النبي ﷺ او احد

المعصومين .)) (توضیح المقال صفحہ ۲)

”مراد حدیث سے وہ ہے جس کی سند کا سلسلہ رسول خدا ﷺ یا کسی امام تک

منتہی ہو۔“

چونکہ ❶ احکام شرعی کا استنباط موقوف ہے احادیث کے دیکھنے پر اس لیے ضروری ہے کہ احادیث کی صحت کی تحقیق کی جائے تاکہ اس سے مسائل کا استنباط اور اس پر عمل کرنا جائز ہو اور یہ بات معلوم ہے کہ سب حدیثیں ایسی نہیں ہیں، اور ان کی صحت کا علم موقوف ہے راویوں کے حالات دریافت کرنے، یعنی علم الرجال کے جاننے پر۔

اور ❷ یہ بات بھی معلوم ہے کہ ہماری حدیثوں میں بہت سی جھوٹی اور موضوع ہیں، پیغمبر خدا ﷺ نے فرما دیا تھا کہ میرے بعد بات بنانے والے بہت ہوں گے اور حضرت صادقؑ سے روایت ہے کہ ہم میں سے ہر ایک امام کے اوپر جھوٹ لگانے والے ہوں گے۔ اور یہ بھی آپ نے فرمایا کہ ہم اہل بیت سچے ہیں مگر جھوٹ بولنے والوں اور جھوٹ لگانے

❶ وعلی کل واحد فوجه الحاجة الى هذا العلم استنباط الاحكام الواجب علينا او كفاية موقوف في ازماننا او مطلقا على النظر في الاحاديث لوضوح عدم كفاية غير ها وغناه عنها فلا بد من معرفة المعتبر منها الذي يجوز الاستنباط منه والعمل عليه حيث تعرف ان جميعها ليست كذلك ولا ريب في حصول هذه المعرفة بالمراجعة الى علم الرجال وهذا مما لانزاع فيه. (توضيح المقال صفحہ ۳)

❷ واربعا ان من المعلوم الوارد على طبقة اخبار مستفيضة ان في رواياتنا كانت جملة من الاخبار الموضوعية ففي النبوي المعروف ستكثر بعد القالة على و في المروى عن الصادق ان لكل رجل منا رجلا يكذب عليه و في الآخر عنه انا اهل البيت صادقون لا تخلو من كذاب يكذب علينا فيسقط صدقنا بكذبه و في الآخران المغيرة بن سعيدوس في كتب احاديث ابى احاديث لم يحدث بها ابى فاتقوا الله ولا تقبلوا علينا ما خالف قول ربنا و سنة نبينا و عن يونس انه قال و افيت العراق فوجدت فيها قطع من اصحاب ابى جعفر و اصحاب ابى عبدالله متواخرين فسمعت منهم و اخذت كتبهم و عرضتهم من بعدى على ابى الحسن بن الرضا فانكر منها احاديث كثيرة ان تكون من اصحاب ابى عبدالله و قال ان ابا الخطاب كذب على ابى ابى عبدالله لعن الله على ابا الخطاب و كذلك اصحاب ابى الخطاب يد لسون من هذه الاحاديث الى يومنا هذا في كتب اصحاب ابى عبدالله فلا تقبلوا علينا خلاف القرآن و في جملة من الاخبار العلاجية ان ما خالف القرآن و في بعضها ما خالفه و خالف السنة انى ما قلته و في الآخر الا مريضب مخالفه وجه الجد ارالى غير ذلك من الاخبار الواردة في هذا المضممار فنقول ان اخراج الموضوعة عمافى ايدينا من الاخبار غير معلوم و ادعاءه كماياتى غير مسموع فى العمل بالجميع من غير تميز الموضوع عن غيره بالمقدور قبيح بل منتهى عنه بهذا الاخبار. ۱۲ (توضيح المقال صفحہ ۴)

والوں سے جو ہم پر جھوٹ لگاتے ہیں، خالی نہیں ہیں اور ہماری سچائی اس کے جھوٹ سے ساقط ہو جاتی ہے۔ اور مغیرہ بن سعید نے میرے والد بزرگوار کے اصحاب کی کتابوں میں ایسی جھوٹی حدیثیں ملا دیں جن کو کبھی میرے والد نے بیان نہیں کیا تھا۔ پس خدا سے ڈرو اور جو قول ہمارا خدا کے کلام اور نبی کی سنت کے خلاف پاؤا سے مت مانو۔ اور یونس سے روایت ہے کہ میں نے عراق میں امام باقر اور امام جعفر صادق کے اصحاب کو پایا اور ان سے حدیثیں سنیں اور ان کی کتابوں کو لیا اور اس کے بعد حضرت امام موسیٰ رضا کے روبرو پیش کیا، آپ نے بہت سی حدیثوں سے انکار فرمایا اور کہا کہ ابوالخطاب نے امام جعفر صادق پر بہت جھوٹ لگایا ہے، خدا اس پر لعنت کرے اور اسی طرح ابوالخطاب کے رفقاء حدیثوں سے اب تک فریب دیتے ہیں اور امام جعفر صادق کی کتابوں میں ملا دیتے ہیں، پس جو کچھ قرآن کے خلاف ہو اسے ہماری طرف سے نہ سمجھو اور نہ اسے قبول کرو اور جو چیز قرآن اور سنت کے مخالف ہو اسے دیوار پر مارو۔

مؤلف کتاب اسے نقل کر کے فرماتے ہیں کہ موضوع حدیثوں کا ہونا تو ہماری کتابوں میں اس سے پایا جاتا ہے اور یہ بات کہ ان کتابوں میں سے موضوع حدیثیں نکال دی گئی ہیں، معلوم نہیں ہوتا اور اس کا دعویٰ کرنا قابل سماعت نہیں ہے، پس بغیر تمیز کرنے موضوع حدیث کے صحیح احادیث سے سب پر عمل کرنا نہ صرف فتیح ہے بلکہ ممنوع ہے۔

راویوں کے حالات دریافت کرنا اور علم الرجال سے واقف ہونا، اس لیے ضروری ہے کہ اکثر ^① یا تمام حدیثوں میں احتمال وضع موجود ہے گو یہ احتمال بعض حدیثوں میں قرآن خارجیہ کے سبب سے بہت کم ہے لیکن اس احتمال کے دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تمام حدیثوں میں رفع شک کے لیے اس علم کی طرف رجوع کیا جائے۔

راویوں کے حالات دریافت کرنے اور علم الرجال سے واقف ہونے کے لیے مؤلف

① ان احتمال الوضع قائم فی اکثر الاخبار و جمیعہا وان ضعف فی بعض القرائن خارجیة فلا بد من

الرجوع فی الجمیع۔ ۱۲ توضیح المقال صفحہ ۴۔

موصوف نے جہاں اور بہت سی دلیلیں بیان کی ہیں وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ • اگلے اور پچھلے علماء کی سیرت سے پایا جاتا ہے کہ وہ رجال پر کتابیں لکھتے تھے اور اس کی تدوین و تنقیح کرتے تھے اور ان کتابوں حاصل کرتے اور اپنے مطالعے میں رکھتے تھے اور راویوں کے حالات

① ومنها ان سيرة العلماء قديما وحديثا على تدوين كتب الرجال و تنقيحها و تحصيلها باشتراء و استكتاب و على مطالعتها و الرجوع اليها في معرفة احوال الرواة و العمل بهافي الاعتداء برجال و الطعن في آخرين و التوقف في طائفة ثالثة حتى ان كثير امنهم كانت له مهارة في هذا العلم كالصدوق و المفيد و الطوسي و غيره هم من مشائخ الحديث بل ربما امكن ان يقال اهتمام المتقدمين فيه كان از يد من المتأخرين و اى عاقل يرضى بكون ذلك كله لغوا مكر وها او حراما فليس الاللافتقار اليه بل ربما يظهر من عدم ارتكابهم مثل ما ذكر بالنسبة الى سائر ما يتوقف عليه الفقه ان الافتقار اليه اشد و اعظم و لعله كذلك بعد سهولة اكثر ذلك في حقهم و في زمانهم دون الرجال كيف و به يعرف ما هو الحجة في حقهم عن غير ها و منه يحصل الاطمنان او الظن المستقر بما استفيد من الاحكام عن الاخبار و حيث ان المفضل في الافتقار النافي له على الاطلاق شاذ نادر بل غير معلوم القائل ظهر ان الافتقار على الاطلاق و بتقرير آخر ان ما سمعت منهم خصوصا بعد ملاحظة ما في كتب الاصول من الاتفاق على اشتراط في الاجتهاد يكشف قطعيا عن بنائهم على الافتقار اليه و اشتراطه في الاستنباط و عن رضا المعصوم بذلك و هل ينقص هذا من الاجماع المتكررة في كلما تهم فاما مخالفته من مرفلا تقدر فيه لوضوح فساد شبهاتهم كماياتى و بسبقهم بالا جماع و السيرة و لحوقهم عنه و منها ان سيرة الرواة و المحدثين الى زمن تاليف الكتب الاربعة بل الى تاليف الثلاثة المتأخرة الوافى و الوسائل و البحار على الالتزام بذكر جميع الرجال و جميع الاسانيد حتى ان لواحد اسقطهم او بعضهم في مقام اشار اليهم في مقام آخر كما فى الفقيه و التهذيبين من التصريح بانه للتحرز عن لزوم الارسال و القطع و الرفع المنافية للاعتبار و من المعلوم ان ذلك كله لان يعرفهم الراجع الى كتبهم و يجتهد و افي احوالهم على حسب مقدوره فيميز الموثوق الجائز اخذ الرواية عن غير و الالزم اللغوية فيعلم الافتقار و الكشف عن الاشتراط كما فى ثانى تقرير الوجه السابق فلو كان بنائهم على اعتبار ما فيها من غير ملاحظة احوال الرواة للاحذ من الاصول الاربعة مائة او غيره من القرائن الاعتبار او لقطع بالصدور لكان تطويل الكتب يذکر الجميع لغوا مكر وها او محرما و قد مر بطلان نفي الافتقار فى الجملة فثبت الافتقار المطلق و يوید هذا الالتزام من تاخر بالرجوع الى الرجال و توصيف بعض الاخبار بالصحة و الوثوق و الاعتبار و تضعيف بعض آخر و عدم اكتفاء بعضهم بتوصيف غيره و ان كان باعرف منه بالرجال بل الخلاف بينهم فى كثير من التصحيحات و التضييعات و اوضح معلوم للمراجع الى كتبهم - ١٢ توضيح المقال صفحہ ٥ .

دریافت کرنے کے لیے ان کی طرف رجوع کرتے۔ تو کیا کوئی سمجھ دار آدمی اس بات کو مانے گا کہ یہ فعل ان کا لغویاً مکروہ یا حرام تھا۔ بلکہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس علم کی طرف احتیاج بہت زیادہ اور راویوں کے حالات سے واقف ہونا نہایت ضروری ہے۔ اور کیوں نہ ہو، اسی سے اطمینان یا ظن حاصل ہوتا ہے، ان احکام پر جو احادیث سے مستنبط کیے جاتے ہیں۔ اور نیز محدثین کی سیرت میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ رواۃ کا سلسلہ ہر حدیث کے متعلق بیان کرتے ہیں اور ابتدا سے تازمانہ تالیف کتب اربعہ انہوں نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ ہر حدیث کے تمام راویوں کو نام بنام بیان کریں یہاں تک کہ اگر کوئی بیچ میں سے چھوڑ دیا گیا ہو تو اس کا دوسری جگہ ذکر کر دیں تاکہ ارسال، قطع اور رفع جو صحت حدیث اور اعتبار کے منافی ہے ظاہر ہو جائے اور اس سے ان کا احترام ثابت ہو، اور یہ بات ظاہر ہے کہ یہ سب صرف اس لیے وہ کرتے تھے کہ جو ان کی کتابوں کی طرف رجوع کرے اور ان کے حالات کو اپنی مقدور کے موافق دریافت کرے تو وہ تمیز کرے کہ کون سا راوی ایسا ہے جس کی روایت لینے کے لائق ہے اور کون سا چھوڑنے کے قابل۔ اگر یہ مقصود نہ ہوتا اور راویوں کے حالات دریافت کرنے کے بعد حدیثوں کی کتابوں کی تدوین کی ضرورت نہ رہتی تو محدثین کی یہ ساری کارروائی لغو اور فضول ثابت ہوتی ہے، اور اگر رواۃ کے احوال دیکھے بغیر ان چار سو کتابوں سے جو حدیث پر لکھی گئی ہیں حدیثوں کا لینا کافی سمجھا جاتا یا ان کی صحت پر یقین ہوتا تو کتابوں میں راویوں کے ناموں کا لکھنا اور اس طرح پر کتابوں کا پڑھنا لغو اور مکروہ، بلکہ ممنوع اور حرام ہو جاتا۔

مؤلف کتاب موصوف نے ان اعتراضات کو بھی بیان کیا جو حدیث کی کتابوں کو معتبر اور ہر حدیث کو بغیر رجوع تحقیق حالات رواۃ کے قابل عمل سمجھتے ہیں اور ان کی دلیلوں کا ذکر کر کے اس کا جواب دیا ہے، منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ ❶ علم الرجال کے ضرورت اور

❶ احدها ان المعلوم بالتواتر والاخبار المحفوظة بقرائن القطع انه كان داب القدماء في مدة تزيد على

ثلاث مائة سنة ضبط الاحاديث و تدوينها في مجالس الائمة وغيرها وكانت همهم على تاليف ما يعمل

به الطائفة المحققة و عرضه على الائمة و قد استمر ذلك الى زمن تاليف الكتب الاربعة حتى

احتیاج کے منکرین یہ کہتے ہیں کہ یہ بات بتواتر اور بقرائن یقینیہ معلوم ہے کہ تین سو برس تک قدامت کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ احادیث کو جمع اور ائمہ کی مجالس میں اس کی تدوین کرنے اور جن حدیثوں پر اہل حق **۱** یعنی ہمارا فرقہ عمل کرتا اس کے ضبط کرنے میں اپنی ہمتیں صرف

﴿﴾ بقیت جملة منها بعد ذلك و هذه الاربعة منقولة من تلك الاصول المعتمدة بشهادة اربا بها الثقات و لغایت بعد تالیفہم من غیر ہامع تمکنہم منها و من تمیز ما ہوا المعتمد عن غیرہ غاية التمكن مع علمہم بعدم اعتبار الظن فی الاحکام الشرعية مع التمكن من العم والتبين والمعلوم من وثقاتہم و جلالتهم عدم التقصیر فی ذلك کیف و اهل التواریخ لایاخذون القصص من کتاب او شخص غیر معتمد مع التمكن من الاخذ عن المعتمد فماظن بهؤلاء المشائخ العظام و علی فرض اخذہم من غیر الكتب المعتمدة کیف یدلسون بل یشہدون بصحة جميع ما نقلوه و كونه حجة بينهم و بین ربہم . ۱۲ (توضیح المقال صفحہ ۷ -)

۱ و ثانیہا ان مقتضى الحكمة الربانية و شفقة الرسول و الائمة لا یضیع من فی اصلاب الرجال من الامة و یترکوا احباری یتلجؤن الی التشبث بظنون واقبة و غیر ہابل یمد لہم اصول معتبرة یعملون بہا فی الغیبة كما ہوا لواقع و المعلوم بالتبع فی احوالہم و التامل فی الاحادیث الكثيرة الدالة علی انہم امرؤ اصحابہم بكتابة ما یسمعونہ منہم تالیفہ و العمل بہ ففی الغیبة والحضور بالنص علیہا بقولہم سیاتی زمان لا یتانسون فیہ الابکتبہم و فی الاحادیث الكثيرة الدالة علی اعتبار تلك الكتب و الامر بالعمل بہا و علی انہا عرضت علی الائمة فمد حواہا و مد حواصاحبہا و قد نص المحقق بان کتاب یونس بن عبدالرحمن و کتاب الفضل بن شاذان کا ناعندہ و ذکر علماء الرجال انہما عرضا علیہم فما لظن بار باب الاربعة و قد صرح الصدوق مواضع بان کتاب محمد بن حسن الصفاء یشتمل علی مسائل و جوابات العسکری کان عندہ بخطہ الشریف و کذا کتاب عبداللہ بن علی الجلبی المعروف علی الصادق ثم رأیناہم یرجحون كثيرا حدیثا مرویافی غیر الكتاب المعروف علی الحدیث الذی فیہ و هذا لا یتجہ الابانہم جازمون بكونہ فی الاعتبار و صحة الصدور كالكتاب المعروف و یقرب من ذلك ماتری من الشیخ و غیرہ الی زمان الاصطلاح الجدید من طرح كثير من الاخبار الصحيحة بهذا الاصطلاح و العمل كثير مما هو ضعيف علیہ و كثير ما یعتمدون علی طرق ضعيفة مع تمکنہم من طرق صحيحة كما صرح بہ صاحب المنتقى و غیرہ و هذا ظاہری فی صحة تلك الاخبار بوجوه آخر و دال علی عدم العبرة بالاصطلاح الجدید و حصول العلم بقوله الثقة لیس بمنکر ولا ببدع فقد نص صاحب المدارك و غیرہ علی انه یتفق كثير اصول العلم بالوقت من اذان لثقة الضابط العارف حیث لم یکن مانع من العلم و بمثله صرح كثير من علمائنا فی مواضع كثيرة و ثالثها الوجه الكثير الاخير ﴿﴾

کرتے اور اسے ائمہ کو سناتے اور یہ عمل کتب اربعہ کی تالیف کے زمانے تک جاری رہا اور یہ چار کتابیں حدیث کی انہی اصول سے منقول ہیں اور جن کے اعتماد پر انہوں نے شہادت دی ہے اور غیر معتبر کو معتبر سے جدا کر دیا ہے اور باوجود اس بات کے جاننے کے کہ احکام شرعیہ میں ظن کا اعتبار نہیں ہے بلکہ علم اور یقین کا ہونا لازمی ہے اور باوجود معلوم ہونے ان کی وثاقت و جلالت کے کیوں کر گمان کیا جا سکتا ہے کہ ان کتب اربعہ کے جامعین احادیث صحیحہ کے جمع کرنے میں تقصیر کرتے اور جبکہ مؤرخین کسی قصے کو غیر معتبر کتاب اور غیر معتبر شخص سے اپنی تاریخ کی کتابوں میں نہیں لیتے تو ان بزرگان دین کی نسبت کیوں کر شبہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ صحیح حدیثوں کو جمع کرنے میں تقصیر کرتے اور اور در صورت فرض کرنے میں اس بات کے کہ انہوں نے غیر معتبر حدیثیں لیں کیوں کہ تالیس کرتے اور اس بات کا دعویٰ فرماتے کہ جو کچھ انہوں نے نقل کیا ہے وہ سب صحیح ہے اور وہ ان کی کتاب ان کے اور خدا کے بیچ میں حجت

﴿ من الوجوه المتقدمة للاسترا بادی و فيه التصريح بحصول القطع العادی من شهاداتهم كالعلم بان الجبل لم ينقلب ذهبا و قال انه لاتفاق الشهادات و غيره ذلك اولی من نقل ثقته واحد كالمحقق والشهيدین فتوى من فتاوى ابی حنیفة فی كتابه مع اناری حصول العلم لنا بذلك من النقل المذكور فكيف لا يحصل بشهادة الجماعة و ذكر ايضا انه لو لم یجز لنا قبول شهاداتهم فی صحة احادیث كتبهم لما جاز لنا قبولها فی مدح الرواة توثيقهم فلا یقی حدیث صحیح ولا حسن ولا موثق بل یقی جمیع اخبارنا ضعيفة واللازم باطل فكذا الملزوم والملازمة ظاهرة بل الاخبار بالعدالة شكل و اعظم و اولی بالاهتمام من الاخبار بنقل الاحادیث من الكتب المعتمدة فان ذلك امر محسوس والعدالة امر خفی عقلی یعسر الاطلاع علیه ولا مضر لهم عن هذا الالتزام عند الانصاف و ذكر ايضا ان علمائنا الاجلاء الثقات اذ جمعوا احادیث و شهدوا بثبوتها و صحتها لم یکن دون من اخبارهم بانهم سمعوا من المعصوم لظهور علمهم و صلاحهم و صدقهم و عدالتهم فی انه مع امکان العمل بالعلم لم يعملوا بغيره ففی الحقيقة هم ينقلونها عن المعصوم و قد وردت روايات كثيرة جدافی الامر بالرجوع الى الرواة الثقات معه اذا قالوا ان خبر من المعصوم و ليس هذا من القياس بل عمل بالعموم و قال ايضا انهم كانوا ثقات حين شهادتهم و جب قبولها لكونها عن محسوس و هو النقل عن الكتب المعتمدة والا كانت احادیث كتبهم ضعيفة باصطلاحهم فكيف يعملون بها- ۱۲ . (توضیح المقال صفحہ ۷-)

ہے۔ اس اعتراض اور ان دلیلوں کا یہ جواب دیا ہے کہ ان ❶ باتوں سے احادیث کا قطعی الصدور ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ کم سے کم احتمال سہو اور غفلت کا تو باقی رہتا ہے، کیونکہ حدیث کے راوی اور اصول اور جو کتابیں ان سے لی گئی ہیں ان کے مؤلف معصوم نہ تھے اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی رجال کے حال کی احتیاج باقی رہتی ہے، اس لیے کہ ان حدیثوں میں متناقض حدیثیں موجود ہیں مثل تقیہ کی حدیثوں کے اور اس لیے رجوع رجال کے حالات کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔

پھر مؤلف موصوف یہ فرماتے ہیں کہ جامعین ❷ حدیث نے یہ نہیں کہا کہ جو کچھ انہوں نے اپنی کتابوں میں جمع کیا ہے، یعنی جتنی حدیثیں اس میں لکھی ہیں وہ سب مفید علم ہیں بلکہ ان کے نزدیک صرف مفید یقین ہو یا نہ ہو۔ اور نیز جامعین حدیث سب متفق نہیں ہیں کل حدیثوں کے جمع کرنے میں، مثلاً: کلینی نے بہت سی حدیثیں چھوڑ دی ہیں ان کے بعد متاخرین نے نقل کیا ہے اور اس پر بڑھایا ہے۔ اور ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حدیثوں کے جمع کرنے میں اور اس کی تنقید اور تصحیح میں بہت زحمت اٹھاتے تھے، ایسے لوگ کیوں کر ان

❶ و نقول فی المقام الثانی اجمالاً ان ما ذکر فی هذا الوجه با جمعه غیر مفید القطع بالصدور انه لا اقل من قیام احتمال السهو و الغفلة لوضوح عدم عصمة الرواة و المؤلفین للاصول و الکتب الماخوذة منها و مع التسلیم فلا یوجب الغنی عن الرجال علی الاطلاق لوضوح وجود الاخبار المعارضة فی جملة هذه الاخبار کا خبار التقیة و من المعلوم المدلول علیہ بالاخبار العلاجیة منها و غیرها توقف تمیز الراجح المعتبر منها علی مراجعة الرجال فاین الغنی المدعی علی کل حال۔ ۱۲۔ (توضیح المقال صفحہ ۹)۔

❷ و نقول تفصیلاً و ان کان ایضاً جملیاً انا نمنع الصغری و الکبریٰ کما اشرنا الی منعہما فی الاجمال ففی الوجه الاول فی الصغری ان حصول القطع من المتن فی غایة الندرۃ کذا من الاعتقاد و علی فرضہ علی ندرۃ لا یلازم حصولہ فی غیرہ و الافتقار فی الغالب کاف بل هو المدعی و کذا من کون الراوی ثقة لمنع حصول القطع للراوی الثقة لعدم لزومہ لا فی الروایة و لا فی العمل فلعل اخذہا ممن یثق بہ تعبدنا او قلنا خاصاً او مطلقاً و لی تسلیمیہ محصولاً لا یتلزمہ لنا الاحتمال السهو و النسیان و الذہول عن القرینة او خفائہا کما اوقع فی کثیر من الرواة فروعہم بقولہ لیس کما ظننت او لیس کما تذهب او ما راک بعد الابہنا ۱۲۔ (توضیح المقال صفحہ ۹)

حدیثوں کو جو مفید علم ہوں چھوڑ دیتے جن کو ان کے بعد کے لوگوں نے جمع کیا۔ پھر صدوق کو دیکھئے کہ وہ حدیث کی تصحیح اور تضعیف اکثر اپنے شیخ ابن الولید کی تصحیح و تضعیف پر اعتماد کر کے کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کا یہ قول ہے جس حدیث کو میرے شیخ نے صحیح کہا ہے وہ میرے نزدیک بھی صحیح ہے اور جسے اس نے صحیح نہیں کہا وہ ہمارے نزدیک متروک ہے۔ بھلا خیال کرو کہ ان اخبار میں جو مفید علم ہوں دوسرے کی تصحیح و تضعیف پر اعتماد کرنے کو کیا دخل ہے اور صرف ان کے شیخ کی تصحیح و تضعیف سے کیوں کر حدیث کے صحت اور ضعف پر یقین ہو سکتا ہے اور وہ حدیثیں جو مفید علم ہوں صرف ان کے شیخ کے ضعیف کہا دینے سے کیوں کر رد کی جاسکتی ہیں۔

جناب مولانا دلدار علی صاحب نے ”صوارم“ میں اخبار و احادیث کے متعلق اپنے مذہب کا یہ اصول بیان فرمایا ہے کہ فرقہ حقہ امامیہ کا مسلک یہ ہے کہ وہ اصول اور اعتقادات میں یقین حاصل کرتے ہیں اور ظن اور تقلید کو اصول دین میں جائز نہیں رکھتے اور دلائل عقلیہ سے یقین حاصل کرنے کے بعد بجمہت مزید اطمینان اور ترقی مدارج یقین کے بطور تائید اور دیگر فوائد کے سمعیات متواترہ کو، یعنی ان اخبار کو جو لفظاً یا معنماً متواتر ہوں ذکر کرتے ہیں، گو وہ راوی فاسد العقیدہ ہو۔ اور اسی وجہ سے جناب شیخ لطائف نے راویان فاسد العقیدہ کے اخبار پر عمل کیا ہے اور خبر واحد کو گو بواسطہ ثقات مروی ہو اعتقادات میں حجت اور کافی نہیں سمجھتے اور فروع میں چند ہمارے بعض علماء نے یہ اختیار کیا ہے کہ ہر مسئلہ کا اجتماعی یا مستفاد از متواتر یا ماخوذ از کتاب و دلیل عقول ہونا ضروری ہے۔ لیکن ہمارا عمل اس پر ہے کہ اگر خبر آحاد ہو اور راوی اس کے ثقہ ہوں اور دیگر شرائط اس میں پائی جاتی ہوں تو خبر آحاد پر بھی عمل واجب ہے۔ پھر جناب موصوف نے اپنے مذہب کا یہ اصول بھی بیان فرمایا ہے کہ اگر کوئی خبر بظاہر خلاف ہو اس امر کے جس پر اجماع منعقد ہوا ہو، تو ضروری ہے وہ خبر یا ماول ہوگی یا مطروح۔ اور اسی اصول کی بنا پر وہ ان روایات کو جو زرارہ اور ہشام وغیرہ کی مذمت میں ہیں مردود اور غلط سمجھتے ہیں، جیسا کہ فرماتے ہیں:

”بلاشبہ کچھ حدیثیں ہمارے مذہب میں ایسی ہیں کہ جن سے ایسے بزرگوں کا

مقدوح ہونا معلوم ہوتا ہے لیکن چونکہ راوی اس قسم کے اخبار کے ضعیف اور مجردین تھے اور نیز اس قسم کی حدیثیں ان حدیثوں کے معارض ہیں جو نہایت قوی ہیں اور جن پر امامیہ کا اجماع ہے، اس لیے ہمارے علماء نے اس قسم کی حدیثوں کو معرض اعتبار سے ساقط سمجھا ہے۔“

اور پھر یہ فرماتے ہیں:

”عقل اس بات پر شاہد ہے کہ باوجود اخبار جرح کے کہ جو ایسے بزرگوں کے حق میں بیان کی گئی ہیں، ہمارے علماء کے عقیدے میں جو ان بزرگوں کی جلالت و شان کے بابت تھے کچھ خلل نہ ہوا اور کسی نے باوجود مشاہدہ کثرت اختلاف کے ان کا خلاف نہ کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ان کی بزرگی اور کمال کا آفتاب ان کی نظروں میں روشن تھا، ورنہ اگر فرقہ امامیہ سو آدمیوں کو مثل ہشام وغیرہ کے ابوالخطاب کی طرح فاسد العقیدہ شمار کریں تب بھی ان کے عقائد حقہ کی بنیاد میں جو حج قاہرہ اور براہین باہرہ پر قائم ہے خلل نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ ہم امامت اور فضائل علی بن ابی طالب اور ان کی اولاد کے ثابت نہیں کرتے ہیں، مگر خدا کی کتاب سے جس کی صحت ضرورت اسلام سے ہے یا احادیث متفق علیہا سے یا عقلی دلائل سے، پس اگر ہشام اور محمد بن مسلم جیسے ہزار آدمی بالفرض ملدین اور فاسقین سے ہوں تب بھی ان کے اعتقاد میں کچھ خلل نہیں آسکتا۔“

پھر فرماتے ہیں:

”کم ہی کوئی مذہب ایسا ہوگا کہ بعض روایات بے اصل یا ماول اس مذہب میں نہ ہوں، پس دیندار دانش مندوں کو چاہیے کہ ایسی حالت میں کوئی قاعدہ اور ضابطہ رکھتے ہوں جس سے اثنائے جدال اور مخاصمہ میں باہر نہ آجائیں اور وہ قاعدہ یہ ہے کہ احتجاج اور الزام خصم پر اس بات سے کریں جو اس کے مذہب کے خلاف اس مذہب کی کتابوں میں لکھا ہو، اور اس مذہب کے راوی اور علماء

نے جو کچھ بیان کیا ہو وہ مسلم الثبوت طرفین کا ہو، یا یہ کہ اس کا ثبوت تو اتر پر کہ جس میں جھوٹ کا احتمال اہل انصاف کے نزدیک نہ پایا جائے۔“

جناب موصوف ”حسام“ میں اخبار آحاد کی نسبت فرماتے ہیں:

((خبر واحد اگر بے معارض ہم باشد ظنی ست در اصول اعتقادات بآن تمسک نباید کرد بلکه نزد محققین شیعہ امامیہ مثل ابن ادریس و شریف مرتضیٰ و اکثر قدمائے ایشاں قابل احتجاج نیست و متاخرین ایشاں ہمیں مذہب را اختیار کرده اند و هذا اخبار احاد را در دلائل نشمرده بلکه رد آنرا واجب دانسته . (خصوصاً در اعتقادات ، حسام .))

”خبر واحد اگر بے معارض کے بھی ہو تب بھی ظنی ہے، اعتقادات کے اصول میں اس سے تمسک کرنا جائز نہیں ہے بلکہ محققین شیعہ امامیہ کے نزدیک مثل ابن زہرہ اور ابن ادریس اور شریف مرتضیٰ اور اکثر قدماء کے وہ قابل احتجاج نہیں اور متاخرین نے اسی مذہب کو اختیار کیا ہے اور اسی لیے انہوں نے اخبار احاد کو دلائل میں شمار نہیں کیا ہے بلکہ اس کے رد کو ضروری سمجھا ہے خصوصاً اعتقادات میں۔“

اور ان احادیث کی تردید یا تاویل کی نسبت جو ادلہ شرعیہ کے مخالف ہوں آپ فرماتے ہیں:

((و آنچه دریں باب از ائمه دین نقل می کنند همه زور و بہتان ست و از موضوعات دروغ گویاں و یا اینکه گو فرمودہ باشند لکن واجب التاویل ست نظر باین کہ کہ معارض ست بآن چہ از ادلہ شرعیہ کہ اقوی از ان ست .)) (حسام صفحہ ۶)

”جو کچھ اس بات میں ائمہ دین سے منقول ہے وہ سب جھوٹ اور بہتان ہے اور دروغ گوؤں کے موضوعات سے ہے اور یا یہ کہ ائمہ نے فرمایا ہوگا لیکن اس کی کوئی تاویل ضرور ہوگی، اس لیے کہ یہ خبر معارض ہے ان ادلہ شرعیہ کے جو اس

سے قوی ہیں۔“

پھر صفحہ ۱۴ میں فرماتے ہیں:

((هیچک فرقه هالکه ضاله نخواهد بود که یکے از آیات و احادیث نبویه بحسب ظاهر موافق مسلک او نباشد پس اگر مجرد و جود معارض دلیل بطلان مذهب شود باید که مذهب اسلام بالمره باطل باشد و مستحق طعن و تشنیع از قبل کفار و ملاحده شود آری باوجود قوت معارض اگر کسی جانب ضعیف او اختیار نماید البتہ مورد طعن و تشنیع اور امی توان ساخت .)) (حسام صفحہ ۱۴)

”کوئی ہلاک ہونے والا اور گمراہ فرقہ ایسا نہ ہوگا کہ کوئی آیت اور حدیث نبوی ظاہراً اس کے مذہب کے موافق نہ ہو، پس اگر صرف معارض کا پایا جانا بطلان مذہب کی دلیل ہو تو لازم آتا ہے کہ مذہب اسلام بالکل باطل ہو اور ملحد و کفار کی جانب سے مستحق طعن و تشنیع ہو، اگر کوئی باوجود قوت معارض کے جانب ضعیف کو اختیار کرے تو اس کو مورد طعن و تشنیع کر سکتے ہیں۔“

پھر صفحہ ۲۵ میں فرماتے ہیں:

((بالجمله دانستی که بناء اعتقادات امامیه بر اخبارا حادنیست پس ابن بابویه در کتاب اعتقادات خود روس اعتقادات امامیه را کہ بنا بر آیات و احادیث متواترہ و اجماع اهل بیت و ادله عقلیہ بہ ثبوت پیوستہ مذکور ساختہ در کتب احادیث موافق داب محدثین اخبار احادرا بہر قسم کہ ماثور گشتہ مندرج فرمودہ و لازم نیست کہ محدثین آنچه روایت کنند مطابق آن ہم اعتقاد داشته باشند .))

”غرض کہ تم کو معلوم ہو گیا کہ امامیہ کی بنا اعتقادات اخبار آحاد پر نہیں ہے، ابن بابویہ نے اپنی کتاب ”اعتقادات“ میں اعتقادات امامیہ کے اصول کو جن کی بنا آیات و احادیث متواترہ اور اجماع اہل بیت اور ان ادلہ عقلیہ پر ہے جن کا ثبوت ہو گیا ہو، مذکور کیا ہے اور کتب احادیث میں موافق عادت محدثین کے اخبار آحاد کو جس طرح پر کہ مآثر ہوئی ہوں درج فرمایا، اور یہ امر لازمی نہیں ہے کہ محدثین جو کچھ روایات کریں اس کے موافق وہ اعتقاد بھی رکھتے ہوں۔“

پھر صفحہ ۶۲ میں فرماتے ہیں:

((بدانکہ ورود احادیث مختلفۃ الظواہر مخصوص بیہج یک از فرق اہل اسلام کہ ارباب کتب احادیث و اخبار باشند نیست و نظر بہ ہمیں علماء اہل اسلام طریق جمع بین الاحادیث المختلفۃ و وجوہ ترجیح احد الخبرین المتعارضین رابر حدیث دوم در کتب اصول وغیرہ مدون و بیان ساختہ اند پس اگر بمجر دایر ادروایات مختلفہ ابن بابویہ محل طعن و تشنیع باشد کافیہ محدثین اہل اسلام باید محل طعن و تشنیع باشند .)) (حسام)

”وارد ہونا ایسی احادیث کا جو ظاہر میں مختلف ہیں مخصوص کسی ایک فرقے اہل اسلام سے کہ جن کے پاس کتب احادیث و اخبار ہوں نہیں ہیں، اس لیے کہ علماء اسلام نے احادیث مختلفہ کا طریق جمع اور وجوہ ترجیح دو حدیثوں متعارض کو دوسری حدیث پر کتب اصول وغیرہ میں مدون اور بیان کر دیا ہے، پس اگر ابن بابویہ کا مجرد روایات مختلف کا بیان کرنا محل طعن و تشنیع ہو تو تمام محدثین اہل اسلام محل طعن و تشنیع کے ہونا چاہئیں۔“

پھر صفحہ ۳۸ میں فرماتے ہیں:

((هیچک محدثین عامہ و خاصہ التزام این ننموده که در هر کتاب حدیث آنچه روایت کند بر طبق مدلول ظاہری آن معتقد و عامل ہم باشد بلکه در صورت تعارض حدیث باادلہ شرعیہ گو آن حدیث را روایت کرده باشد بمقتضائے آن چه ازادلہ شرعیہ راجح می باشد بمقتضائے آن عمل می کند.)) (حسام)

”کسی نے محدثین میں سے عام و خاص کے یہ التزام نہیں کیا کہ جو کچھ کتب حدیث میں روایت کرے اس کے مدلول ظاہری کے مطابق معتقد اور عامل بھی ہو بلکہ در صورت تعارض حدیث کے ادلہ شرعیہ کے ساتھ گو اس کے حدیث کو خود روایت کیا ہو جو کچھ بہ مقتضائے ادلہ شرعیہ کے راجح ہو اس پر عمل کرتے ہیں۔“

جناب مولانا سید محمد مجتہد ضربت حیدر یہ میں فرماتے ہیں:

”متکلمین و مجتہدین امامیہ ❶ اصول دین میں دلائل قطعیہ پر اعتماد کرتے ہیں اور

❶ سوال اول کہ مصدرست بقول وے ازاں جملہ آنکہ حکم بموضوع بودن احادیث قدح هشامین کہ در کافی کلینی کہ یکے از اصول اربعہ شیعہ ست موجودست الخ جواب علی نہج الصواب آنکہ این سوال متبنی است بر عدم درک طریقہ انیقہ متکلمین و مجتہدین امامیہ چہ ایشان و اصول دینیہ متینیہ بر دلائل قطعیہ اعتماد می کنند و بس و ظن و تقلید رادراں جائز و سائغ نمی دانند پس در اصول دینیہ اعتماد براخبارا حاد نمی نمایند و صحاح و حسان و موثقات ضعاف دریں مادریہ یکساں ست اما در فروع دینیہ پس اعتماد شان در ضروریات دین و مذهب بر قطع ست و بس لا علی اخبار الاحاد و در غیر آن بر ظن ست نہ مطلق ظن بل ما حصل من الادلة الاربعه کتابا او سنة او اجماعا او عقلا ولا عبرة عندهم بالقیاس المنهدم الاساس ولا بمحض الراى واجتهاد الناس و در صورت تعارض ادلہ شان بر ترجیح بعض علی بعض ست و انما ترجیح و مناشی آن متکثر و منشعب بشعب کثیرہ ست کہ استقصائے آن دریں مقام منخرج کلام از مانحن فیہ ست و بالجملہ یکے از مرجحات نظر در سند و حال رجال ست پس بر تقدیر تعارض صحیح باضعیف و عدم اخبار ضعف آن بعمل اصحاب و غیرہ من القرائن بہ ترجیح صحیح علی الضعیف می پردازند و بر تقدیر عدم تعارض و وجدان خبرے ضعیف السنندا گر آن خبر منجر الضعف بعمل اصحاب باشد فلاریب فی الاعتماد علیه و عکذا

بس، ظن و تقلید اس میں روا اور جائز نہیں رکھتے اور اصول دین میں اخبار احاد پر اعتماد نہیں کرتے اور اس باب میں سب قسم کی حدیثیں صحیح ہوں یا حسن، قوی ہوں یا ضعیف برابر ہیں۔ اور فروع دین میں ان کا اعتبار ضروریات دین و مذہب کی باتوں میں یقین پر ہے اور بس، نہ اخبار آحاد پر، اور سوائے اس کے ظن پر مگر نہ مطلق ظن پر بلکہ جو چار دلیلوں میں سے کسی ایک دلیل سے وہ ظن حاصل ہوا ہو، یعنی کتاب و سنت یا اجماع یا عقل۔ اور در صورت تعارض کے صحیح کو ضعیف پر ترجیح

﴿لو حف بقرائن عاضدة لها و هم چنین اگر آن خبر مسوق باشد برائے بیان یکی از مستحباب چه مسامحه در ادله سنن شائع کما بین فی محله و اگر منجر بعمل نیست و نه مسوق برائے بیان سنن بس یا موافق اصول خواهد بود کاصل البرائة والا استصحاب والضحوی و غیره ذلك یا مخالف آن علی الاول يعتمد علیه و یحتج الیه علی الاظهر و علی الثانی حکمش آئل و راجع بتعارض خواهد بود و رجوع بمر حجات لازم و اگر اصله در دست نخواهد بود و حدیث ضعیف بلا معارض دران صورت نیز عمل بران سائغ علی کلام فیہ الحاصل قطعیت صد در هر واحد از اخبار کتب اربعه غیر مدعی و غیر ثابت و حالش نزد ایشان مثل حال اخبار صحاح سته سنیه نیست که اگر طلاق حلق بران خورد طلاقش واقع نشود قال فضل روز بهان اما صحاحنا فقد اتفق العلماء علی ان کل ما عدا من الصحاح سوی التعليقات فی الصحاح السنة لو حلف الطلاق انه من قول رسول الله او من فعله و تقریره لم يقع الطلاق و لم یحنت - انتھی و عمل فرقه حقه بر اخبار کتب خود نه برسبیل غض بصر عن المعارضات و ترجیحات می باشد بلکه بعد نقر و بحث اطراف و جوانب آن راز مزیفات و مرجحات و حال رواة ملاحظه نموده در محل اعتماد اعتماد می نمایند و در مقام جرح و طرح طرح و جرح و در جائے تاویل تاویل و لا ینحصر و جوه ترجیحهم و عملهم فی وجه و سبیل و احاطه ابن مقاصد علیه بر کسیکه در تدرج فن اجتهاد روز رابشب نیا و ده و شباب رابشئیب مبدل نساخته حیلے عسیر و لایا تیک مثل خبیر و چون راویان مثالب هشامین و من یحذ و حذو فهما مخالف اجماع فرقه حقه و معارض بروایات متواترة است لا محاله محتمل الطرح یا مائل باشد نه این که قطعاً جزماً کسے حکم بوضع و طرح آن نموده باشد کما یلمح الیه صدر کلام الفاضل المجادل و ازین معنی لازم نمی آید که جمیع مرویات رواة قدح شان مطروح گردد اگرچه داعی الی الی الوضع و باعث الی الطرح دران مفقود باشد چنانچه و جوب تاویل در بعض آیات منافی ادله قطعیه ست مثل آیته کریمه ید الله فوق ایدیهم و امثال آن مستلزم و جوب تاویل در جمیع ظواهرات نیست ۱۲.

دیتے ہیں اور تعارض نہ ہونے کی حالت میں اگر خبر ضعیف اصحاب مذہب کے عمل کے موافق ہو تو اس پر بھی اعتماد کر لیتے ہیں اور یقینی ہونا ہر ایک خبر کا اخبار کتب اربعہ سے (یعنی حدیث کی ان چار کتابوں سے جو ان کے یہاں صحاح سمجھی جاتی ہیں) نہ ثابت ہے اور نہ اس کا دعویٰ کیا گیا ہے اور ہمارے یہاں کی حدیث کی ان چار کتابوں کا حال سنیوں کی صحاح ستہ کے اخبار کے موافق نہیں ہے کہ اگر کوئی ان کی صحت پر حلف کرے تو طلاق واقع نہ ہو، اور نہ فرقہ حقہ امامیہ کا عمل اپنی حدیثوں پر معارضات اور ترجیحات سے قطع نظر کر کے ہے۔ بلکہ بعد غور اور بحث اور ملاحظہ اطراف و جوانب اور دریافت حالات راویوں کے ہے، اور ان تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد وہ اعتماد کے محل پر اعتماد کرتے ہیں اور جرح اور طرح کے مقام پر جرح و طرح کرتے ہیں اور جہاں تاویل کی ضرورت ہوتی ہے وہاں تاویل، اور ان کی ترجیح اور عمل کے وجوہ ایک راہ اور ایک سبب پر منحصر نہیں ہیں اور جو روایتیں مثل معائب ہشامین کے مخالف اجماع فرقہ اور معارض روایات متواترہ کے ہیں لامحالہ وہ محتمل الطرح یا ماؤل ہوں گی۔“

جو روایتیں قدح اور طعن میں ہشامین کے کافی میں مذکور ہیں باوجودیکہ اس کے راوی امامیہ ہیں اور کلینی نے ان سے روایتیں کی ہیں، مگر وہ روایتیں ان لوگوں کے معائب میں ہیں جن کو حضرات شیعہ بزرگان ملت اور امام کے خاص رفقاء میں سے سمجھتے ہیں، اس لیے ایسی روایتوں کو بغیر جرح و قدح کرنے، راویوں کے متروک بلکہ موضوع قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ جناب مجتہد صاحب نے عقیدہ سیزدہم کے جواب کے اخیر میں فرمایا ہے:

((ہر گاہ امامیہ باوجود عدم احتیاج بطرف وثاقت ہشام و مومن الطاق و باوجود این روایات مثالب مثل ابو الخطاب و مغیرہ و عثمان بن عیسیٰ و نظرائے ایناں ایشاں را انکاشتند دلیل قوی ست کہ ایس روایات یا موضوع اند کہ

حساد و اعدائے ہشام وغیرہ بنا بر قرب و منزلت کہ ایشاں را پیش جناب ائمہ بود بافته اندیا این کہ جناب ائمہ بنا بر صیانت نفس خود و جانہائے ایشاں مثل حضرت خضر نسبت بسفینہ در نظر مخالفین ایشاں معیوب ساخته اندو قرینہ بریں ہر دو محمل اینکہ اجل امثال چنین کساں کہ اسناد مذہب باطلہ بطرف آنها شدہ باوجود انکہ غرض ایشاں صحیح بودو لیکن عوام معنی و مراد ایشاں نفہمیدہ اند، انتہی کلامہ .)) (ضربت حیدریہ ۳۳۹)

”یہ قوی دلیل ہے اس بات کی کہ یہ روایتیں یا موضوع ہیں یا کہ ہشام وغیرہ کے حاسدوں اور دشمنوں نے بہ سبب اس قرب و منزلت کے جو کہ انہیں ائمہ کی جناب میں تھا، بنا لیا ہے یا یہ کہ جناب ائمہ نے اپنی حفاظت کے لیے ان پر یہ عیب لگا دیے ہیں جیسا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کو مخالفین کی نظر میں عیب دار کر دیا تھا۔ اور ان دونوں باتوں کا قرینہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی بہت سی مثالیں ہیں کہ باطل مذہب کی نسبت ان کی طرف ہو گئی ہے، حالانکہ ان کی غرض صحیح تھی، لیکن عوام ان کی مراد نہ سمجھ سکے۔“

اور شیخ ابو جعفر طوسی نے تہذیب میں باب الوصیت بالثلث میں فرمایا ہے:

((اذا وجدت عنہم بانہم فعلوا فعلا یخالف ما ستقر فی شریعة الاسلام فینبغی ان یحکم بطلانہا او حملہا علی وجہ فی الجملة یطابق الصحیح من الاخبار وان لم نعلمہ علی التفسیر .))

”ائمہ سے کوئی روایت ایسی بیان کی جائے کہ انہوں نے کوئی فعل کیا ہے جو مخالف ہو اس چیز کے جو شریعت اسلام میں ثابت اور مقرر ہے، پس چاہیے کہ وہ

روایت باطل سمجھی جائے یا وہ اس وجہ پر فی الجملہ محمول کی جائے جو اخبار صحیحہ کے مطابق ہوا اگرچہ اس کی تفسیر معلوم نہ ہو۔“

راویوں کے وہم اور غلطی کی نسبت باوجود ان کے ثقہ ہونے کی شیخ طوسی تہذیب میں جا بجا تصریح فرماتے ہیں، جیسا کہ باب الرجوع فی الوصیت میں کہا ہے: ((قال محمد بن الحسن ما يتضمن هذا الخبر من قوله ان اوصى به كله فهو جائز و هم من الراوى .)) اور ”كتاب الوقف“ میں لکھتے ہیں کہ: ((قال محمد بن الحسن ما تضمن هذا الخبر من قوله يعنى صاحب الدار حين ذكر ان رجلا جعل لرجل سكنى دار له فانه غلط من الراوى .)) اور اسی طرح بہت سے مواقع پر لفظ ((يجوز ان يكون الراوى وهم اور لفظ انما اشتبه الامر على فلان)) کہتے ہیں۔

کسی عالم کا مجرد قول قابلِ سند نہ ہونا بھی علمائے شیعہ تسلیم کرتے ہیں، جیسا کہ بجواب اس امر کے کہ قاضی نور اللہ شوستری نے ہارون اور مامون کو زمرہ شیعہ اثنا عشریہ میں قرار دیا ہے۔ جناب مولانا سید مجتہد صاحب ضربت حیدریہ میں فرماتے ہیں:

((اما آنچه از کلام سید نور اللہ ، نور اللہ مرقدہ مستفاد می شود کہ جناب ایشان بتشیع آنها قائل بوده اند پس اولاً آنکہ تقلید شان غیر لازم و درباب امثال این گونه امور غیر مطع فان الحق احق بالاتباع خصوصاً نظر بریں کہ ہمت جناب سید ممدوح بسوی توسیع دائرہ تشیع چنان مصروف بودہ و تکثیر سواد ایس فرقه آن چنان مطمح نظر داشتہ کہ مثل سید شریف جرجانی و علامہ دوانی راہم محاط محیط آن دائرہ گردنیدہ مانند منصور دانقی شقی رانیز دریں شان بتکلف گردانیدہ .))

”سید نور اللہ کے کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے ہارون رشید اور مامون

رشید خلفاء وقت کو شیعہ کہا ہے۔ اس میں پہلی بات یہ ہے کہ ان کی تقلید لازمی نہیں اور اس قسم کے مسائل میں ان کی اتباع ضروری نہیں ہے کیوں کہ صرف حق ہی کی اتباع اور پیروی کی جاتی ہے، اور سید نور اللہ کا شیعیت کے دائرہ میں توسیع کرنا مطمح نظر تھا، اور اسی نظریہ کے تحت انہوں نے سید شریف جرجانی اور علامہ دوانی کو بھی اسی دائرہ میں شمار کیا ہے، اور منصور دانتی شقی کو بھی کھینچ تان کر اسی دائرہ میں لے لیا ہے۔“

رسائل شیخ مرتضیٰ مطبوعہ ایران میں اختلاف اور وضع احادیث کے متعلق لکھا ہے کہ یہ کہنا شیخ کا ❶ کہ ائمہ کے اصحاب نے اصول و فروع بطریق یقین کے ان سے لیے ہیں، یہ ایک دعویٰ ہے کہ جس کا عدم ثبوت واضح ہے۔ کیوں کہ کم سے کم اس پر یہ امر شاہد ہے کہ ائمہ کے اصحاب اصول و فروع میں اختلاف رکھتے تھے، اور اسی لیے اکثر اصحاب ائمہ نے جب ان سے

❶ ثم ان ما ذکر من تمکن اصحاب الائمة من اخذ الاصول والفروع بطریق الیقین دعویٰ ممنوعہ واضحة المنع و اقل ما یشہد علیہا ما علم بالعلمین والاثار من اختلاف اصحابہم صلوات اللہ علیہم فی الاصول والفروع ولذا شکک غیرہ واحد من اصحاب الائمة الیہم اختلاف اصحابہ فاجابوہم تارة بانہم قدر القوا الاختلاف بینہم حقنالدمائہم کما فی روایۃ حریر وزارہ و ابی ایوب الجزار و اخری اجابوہم بان ذلك من جهة الکذابین کما فی روایۃ الفیض بن المختار قال قلت لابی عبد اللہ جعلنی اللہ فداک ما هذا الاختلاف الذی بین شیعتمک قال وای الاختلاف یا فیض فقلت له انی اجلس فی حلقہم بالکوفة واکا داشک فی اختلافہم فی حدیثہم حتی ارجع الی الفضل بن عمر فیوقضنی من ذلك علی ماتستریح بہ نفسی فقال اجل کما ذکرک یا فیض ان الناس قدا ولعوا بالکذب علینا کان اللہ افترض علیہم ولا یرید منہم غیرانی احدث احدہم بحدیث فلا ینخرج من عندی حتی یتاولہ عن غیر تاولہ و ذلك لانہم لا یطلبون بحدیثنا و بحسبنا ما عند اللہ تعالیٰ و کل یحب ان یدعی راسا و قریبا منہا روایۃ داوود بن سرحان واستثناء القمیین کثیر من رجال نوادر الحکمة معروف و قصۃ ابن ابی العوجاء انه قال عند قتله قدوست فی کتبکم اربعۃ آلاف حدیث مذکورۃ فی الرجال و کذا ما ذکرہ یونس بن عبد الرحمن من انه اخذ احادیث کثیرۃ من اصحاب الصادقین ثم عرضہا علی ابی الحسن الرضا فانکر منہا احادیث کثیرۃ الی غیر ذلك مما یشہد بخلاف ما ذکرہ۔ ۱۲۔

(فوائد الاصول المعروف بحجیۃ الظن المشہور بالرسائل للشیخ المرتضیٰ الانصاری التستری صفحہ

ان کے اصحاب کے اختلاف کی شکایت کی تو ائمہ نے کبھی ان کو یہ جواب دیا کہ ہم نے خود یہ اختلاف ان میں ڈالا ہے تاکہ ہم اپنی جان بچائیں جیسا کہ حریز اور زرارہ اور ابو ایوب جزار کی روایت میں آیا ہے اور کبھی یہ جواب دیا کہ یہ اختلاف دروغ گوؤں کی وجہ سے ہے جیسا کہ فیض بن مختار کی روایت میں ہے کہ میں نے امام جعفر صادق سے عرض کیا کہ خدا مجھے آپ پر فدا کرے، اس اختلاف کا جو آپ کے شیعوں میں ہے کیا سبب ہے؟ آپ نے فرمایا کہ کون سا اختلاف؟ فیض کہتے ہیں کہ میں نے آپ سے عرض کیا کہ میں کوفہ کے محدثین کے حلقے میں بیٹھتا ہوں تو مجھے ان کے اختلاف احادیث میں شک ہوتا ہے، پھر میں فضل بن عمر کے پاس آتا ہوں تو وہ مجھے اس امر سے آگاہ کرتے ہیں جس سے میرا نفس اطمینان پا جاتا ہے، آپ نے فرمایا: ہاں جیسا تم کہتے ہو بات یوں ہی ہے، لوگوں نے ہم پر جھوٹ بولنے کی بہت زیادتی کر رکھی ہے، گویا خدا نے جھوٹ کو ان پر فرض کر دیا ہے اور ان سے سوائے جھوٹ کے اور کچھ نہیں چاہتا۔ جس کسی سے ایک حدیث بیان کرتا ہوں تو وہ میرے پاس سے جدا بھی نہیں ہوتا کہ اس کی تاویل اصل تاویل کے علاوہ گڑھ لیتا ہے۔ اور یہ بات اس وجہ سے ہے کہ لوگوں کو ہماری حدیث اور ہماری محبت سے اللہ مطلوب نہیں ہے بلکہ ہر ایک کی یہ خواہش ہے کہ وہی رئیس ہو کر پکارا جائے۔ اور اسی کے قریب داؤد بن سرحان کی روایت ہے۔ اور نوادر حکمت کے رجال میں سے بہت سے لوگوں کو قہمیں کا استثنا کرنا معروف ہے۔ اور ابن ابی العوجاء کا قصہ یہ ہے کہ اس نے اپنے قتل ہونے کے وقت کہا کہ میں نے تمہاری کتابوں میں چار ہزار حدیثیں ملا دی ہیں، جو رجال میں مذکور ہیں۔ اور ایسے ہی یہ ہے کہ یونس بن عبدالرحمن ذکر کرتے ہیں کہ میں نے اصحاب صادقین میں سے بہت سی حدیثیں لی ہیں اور پھر ان کو ابو الحسن امام رضا کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے بہت سی حدیثوں سے انکار کیا، اور سوا اس کے اور بہت سے شواہد ہیں جو شیخ کے اس ذکر کرنے کے خلاف ہیں۔

اس کتاب میں جہاں اثبات حجیت خبر واحد میں عقلی دلائل کا بیان ہے، کتابوں کے لکھے ہوئے پر بغیر سماعت کے بھروسہ نہ کرنے اور نیز احادیث کے بنانے، وضع کرنے اور جھوٹی

حدیثوں کو کتابوں میں لکھ دینے کی نسبت لکھا ہے کہ اس میں شک نہیں کہ جو شخص احوال

① وهو ان لاشك للمتابع في احوال الرواة المذكورة في تراجمهم في كون اكثر الاخبار بل جلها الاشذرو ندر صادرة عن الائمة و هذا يظهر بعد التأمل في كيفية اهتمام ارباب امكتب من مشائخ الثلاثة و من تقدمهم في تنقيح ما ادعوه في كتبهم و عدم الاكتفاء باخذ الرواية من كتاب و ايداعها في تصانيفهم حذرا من كون ذلك الكتاب مدسو سافيه من بعض الكذابين فقد حكى عن احمد بن محمد بن عيسى انه جاء الى الحسن بن و شاد طلب منه ان يخرج اليه كتابا لعلاء بن ذرين و كتابا لابان عثمان الاحمر فلما اخرجهما قال احب ان سمعها قال ماعجبك اذهب فاكتبهما فقال له رحمك الله ما عليك اذهب فاكتبهما و اسمع من بعد فقلت له لا امن من الحدثان فقال لو علمت ان الحديث يكون له هذا الطلب لاستكثرت منه فاني قد ادركت في هذا المسجد مائة شيخ كل يقول حدثني جعفر بن محمد و عن محمد و يه بن نوح انه وقع وعنده و فاتر فيه احاديث ابن سنان فقال ان تكتبوا ذلك فاني كتبت عن محمد بن سنان و لكن لا روى لكم عنه شيئا فانه قال قبل موته كلها حدثكم فليس بسماع ولا برواية و انما وجدته فانظر كيف احاطوا في الرواية عمن لم يسمع من الثقات و انما وجد في الكتب و كفاك شاهد ان على بن الحسن بن فضال لم يرو كتب ابيه الحسن عنه مع مقابلتها عليه و انما يرويه عن اخويه احمد و محمد عن ابيه و اعتذر عن ذلك بانه يوم مقابلته الحديث مع ابيه كان صغير السن ليس له كثير معرفة بالروايات فقرأ ما على اخويه ثانيا و الحاصل ان الظاهر الحصار مدار هم على ايداع ما سمعوه من صاحب الكتاب او ممن سمعه منه فلم يكونوا يودعون الاما سمعوا و لوبو سائط من صاحب الكتاب و لو كان معلوم الانتساب مع اطمينانهم بالسائط و شدة و ثوقهم بهم حتى انهم ربما كانوا يتبعونهم في تصحيح الحديث و رده كما اتفق للصدوق بالنسبة الى شيخه ابن الوليد و ربما كانوا لا يثقون بمن يوجد فيه قدح بعيد المدخلية في الصدق و لذا حكى عن جماعة منهم التحرز عن الرواية عمن يروى من الضعفاء و يعتمد المراسيل و ان كان ثقته في نفسه كما اتفق بالنسبة الى البرقي هل يتحرزون عن الرواية عمن يعمل بالقياس مع ان عمله لا دخل له بروايته كما اتفق بالنسبة الى الاسكافي حيث ذكر في ترجمته انه كان يرى القياس فترك رواياته لا جل ذلك و كانوا يتوقفون في روايات من كان على الحق فعدل عنده و ان كانت كتبه و رواياته حال الاستقامة حتى اذن لهم الامام او ثابته كما سئلوا العسكري عن كتب فضال و قالوا ان بيوتنا منها ملاء فاذن لهم و سئلوا الشيخ ابالقاسم بن روح عن كتب ابن غدا فرالتى صنفها قبل الارتداد عن مذهب الشيعة حتى اذن بهم الشيخ في العمل بها و الحاصل ان الامارات الكاشفة عن اهتمام اصحابنا في تنقيح الاخبار في ازمنة المتاخرة عن زمان الرضا اكثر من ان يحصى و يظهر للمتابع و الداعي الى شدة الاهتمام مضافا الى كون تلك الروايات اساس الدين و بها قوام شريعة سيد المرسلين عليه السلام ولهذا قال الامام في شان جماعة من الرواة لولا هولاء لاندرست آثار النبوة و ان الناس لا يرضون بنقل ما يوثق به في كتبهم المؤلفة لرجوع من ياتي اليها في امور الدين على ما اخبرهم الامام بانه ياتي على الناس زمان هرج لا يانسون الا بكتبهم ⇐ ⇐ ⇐

روایت مذکورہ کا تتبع کرے تو وہ اکثر اخبار بلکہ کل کو سوائے شاذ و نادر کے ائمہ سے صادر ہونا نہ پائے گا، اور یہ بات اس وقت معلوم ہوگی جب کہ اخبار کے ہم تک پہنچنے اور ارباب کتب، یعنی مشائخ ثلاثہ اور جوان سے پہلے ہیں ان کے اہتمام کی کیفیت میں تامل کرے کہ جو کچھ انہوں نے اپنی کتب میں لکھا ہے اس کی کیا کچھ تنقیح کی ہے اور صرف کتاب سے دیکھ کر روایت کے لینے پر اکتفا نہیں کیا اور نہ اسے اپنی تصانیف میں داخل کیا اس خوف سے کہ اس کتاب میں بعض کذاب لوگوں نے کچھ ملا دیا ہو۔ احمد بن محمد بن عیسیٰ کی یہ حکایت ہے کہ وہ حسن بن شاد کے پاس آئے اور ان سے علاء بن ذرین اور ابان بن عثمان بن احمر کی کتابیں طلب کیں، جب حسن نکال کر لائے تو احمد نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ ان کا سماع کروں تو حسن نے جواب دیا کہ تمہیں ایسی جلدی کیا ہے ان کو لے جاؤ اور لکھ لو۔ اور پھر یہ کہا کہ خدا تم پر رحم کرے تم ان کو لے جاؤ اور لکھو اور جو شخص میرے بعد ہو اس سے پڑھ لینا۔ احمد نے کہا: میں نے ان سے کہا یہ جھوٹ سے مامون نہیں ہیں، حسن نے کہا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ حدیث کی ایسی طلب ہوگی تو میں بہت سی حاصل کر لیتا۔ میں نے اسی مسجد میں سو شخصوں کو دیکھا ہے کہ وہ سب یہ کہتے تھے کہ مجھ سے جعفر بن محمد نے یہ حدیث بیان کی ہے۔ اور حمد و یہ ایوب بن نوح سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے پاس کئی دفتر آئے جن میں ابن سنان کی حدیثیں تھیں۔ ایوب نے کہا کہ اگر تم لوگ جو چاہو لکھ لو میں نے خود محمد بن سنان سے لکھی ہیں لیکن میں ان کی روایت تم سے نہ کروں گا، اس لیے کہ اس نے اپنے مرنے سے پہلے کہا تھا کہ جس قدر حدیثیں میں نے تم سے بیان کی ہیں ان میں نہ سماع ہے اور نہ روایت، بلکہ میں نے ان کو لکھا ہوا پایا تھا۔ دیکھو روایت کرنے میں اس شخص سے جس نے ثقات سے نہیں سنا بلکہ کتابوں میں لکھا پایا

﴿﴾ و علی ما ذکرہ کلینی فی دیباجة الکافی عن کون کتابہ مرجعا لجميع من یاتی بعد ذلك ماتنبهوا له ونبههم علیه الاثمة عن ان الكذابة کا نواید سون الاخبار الكذوبة فی كتب اصحاب الاثمة كما يظهر من الروایات الكثيرة منها نه عرض یونس بن عبدالرحمن علی سیدنا ابی الحسن الرضا کتب جماعة من اصحاب الباقر و الصادق فانکر منها احادیث كثيرة ان یکون من احادیث ابی عبدالله وقال ان ابا الخطاب کذب علی ابی عبدالله كذلك اصحاب ابی الخطاب یدسون الاحادیث الی یومنا هذا

کیسی احتیاط کرتے تھے۔ اور ایک شاہد تم کو یہ کافی ہے کہ علی بن حسن بن فضال اپنے باپ کی کتابوں کو اپنے باپ سے نہیں روایت کرتے باوجودیکہ انہوں نے باپ کے ساتھ مقابلہ کیا تھا، بلکہ اپنے بھائیوں احمد اور محمد سے اور وہ باپ سے روایت کرتے ہیں۔ اور علی نے اس کا یہ عذر بیان کیا کہ جس روز انہوں نے حدیث کا مقابلہ اپنے باپ کے ساتھ کیا تو وہ صغیر سن تھے، اور ان کو روایت کی معرفت اچھی طرح سے نہ تھی، اس لیے انہوں نے دوبارہ اپنے بھائیوں سے پڑھا۔ غرض کہ یہ ظاہر ہے کہ محدثین کا دار و مدار حدیث کا خود صاحب کتاب سے سننے پر ہے یا اس پر جس نے صاحب کتاب سے سنا ہو۔ پس وہ حدیث کو نہ بیان کرتے تھے مگر جب تک کہ خود نہ سنا ہوتا اگرچہ سننا صاحب کتاب سے کئی واسطوں سے ہو۔ اور نیز یہ کہ جس شخص کی نسبت سننے کی صاحب کتاب سے معلوم ہوتی تھی اس پر ان کو اطمینان اور نہایت وثوق ہوتا تھا، یہاں تک کہ ان واسطوں کا اتباع تصحیح حدیث اور تردید میں کرتے تھے جیسا کہ صدوق کو اپنے شیخ ابن ولید کے ساتھ اتفاق ہوا اور کبھی وہ ان واسطوں پر وثوق نہ کرتے تھے۔ اگر کچھ بھی قدح ان میں معلوم ہوتا اور ان کے صدق میں کچھ بھی مدخلیت قدح کو ہوتی، اسی لیے ایک جماعت محدثین سے منقول ہے کہ وہ روایت نہ کرتے تھے ایسے شخص سے جو ضعفاء سے روایت اور مرسل پر اعتماد کرتا ہو، اگرچہ وہ فی نفسہ ثقہ ہو۔ جیسے کہ برقی کی نسبت اتفاق ہوا، بلکہ ایسے شخص سے بھی روایت کرنے میں احتراز کرتے تھے جو قیاس پر عمل کرتا ہو، باوجودیکہ یہ معلوم ہے کہ عمل کو روایت میں کچھ دخل نہیں، جیسے اسکا فی نسبت اتفاق ہوا جہاں کہ اس کے ترجمے میں ذکر کیا ہے کہ وہ قیاس کو جائز سمجھتے تھے تو اس سبب سے ان کی روایات چھوڑ دی گئیں۔ اور ایسے شخصوں کی روایات میں توقف کرتے تھے جو پہلے مذہب حق پر تھے اور پھر اس سے عدول کر گئے اگرچہ ان کی روایات و کتب حالت استقامت کی ہوتیں، یہاں تک کہ ان کی اجازت امام یا نائب امام دین جیسے امام عسکری سے لوگوں نے کتب بنی فضال کا حال پوچھا اور یہ کہا کہ ہمارے گھر اس کی کتابوں سے بھرے پڑے ہیں تو انہوں نے ان کو اجازت دی، اور شیخ ابوالقاس بن روح سے کتب ابن خدافر کا حال دریافت کیا جن کو اس نے مذہب شیعہ

سے مرتد ہونے سے قبل تصنیف کیا تھا، شیخ نے ان کو اس پر عمل کرنے کی اجازت دی۔ غرض یہ ہے کہ اخیر زمانہ میں، یعنی زمانہ امام رضا علیہ السلام سے جو کچھ اہتمام ہمارے علماء نے تنقیح اخبار میں کیا ہے اس کی امارات بے تعداد ہیں اور تتبع کرنے والے کو ظاہر ہو سکتی ہیں۔ اور اس شدت کا اہتمام کا باعث یہ تھا کہ یہ روایت اساس دین اور قوام شریعت سید المرسلین ﷺ ہیں، اسی لیے امام نے ایک جماعت روایت کی شان میں کہا ہے کہ ”اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو آثار نبوت مٹ جاتے۔“ اور لوگ نہیں پسند کرتے ہیں غیر معتبر روایتوں کا لکھنا اپنی مؤلفہ کتب تواریخ میں جن میں جھوٹ واقع ہونے سے نہ دینی ضرر ہے نہ دنیوی۔ پس وہ لوگ کیسے پسند کریں گے ایسے امر کو اپنی ان کتب میں جو مؤلف ہیں امور دین میں رجوع خلأق کے واسطے۔ باوجودیکہ امام نے خبر دی ہے کہ لوگوں پر ایک زمانہ حرج کا آئے گا کہ وہ سوائے کتابوں کے اور چیز سے مانوس نہ ہوں گے۔ اور کلینی نے اپنی کتاب کافی کے دیباچہ میں ذکر کیا ہے کہ یہ میری کتاب بعد کو سب لوگوں کو مرجع ہوگی۔ محدثین نے ان کو متنبہ کیا اور محدثین کو ائمہ نے کہ کذاب لوگ اصحاب ائمہ کی کتب میں جھوٹی احادیث ملا دیں گے جیسے کہ اکثر روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے، جس میں سے ایک یہ ہے کہ یونس بن عبدالرحمن نے سیدنا ابوالحسن رضا کے سامنے اصحاب باقر و امام صادق کی کتابوں کو پیش کیا تو آپ نے ان میں سے بہت سی احادیث کا انکار کیا اور کہا کہ یہ احادیث ابو عبد اللہ کی نہیں ہیں اور فرمایا کہ ابوالخطاب نے ابو عبد اللہ پر جھوٹ لگایا، اور اسی طرح پر آج تک اصحاب ابوالخطاب ابو عبد اللہ کی کتابوں میں حدیثیں ملا دیتے ہیں۔

اور ان روایات میں سے ایک یہ ہے کہ ہشام بن حکم سے مروی ہے کہ اس نے سنا کہ ابو عبد اللہ کہتے تھے کہ مغیرہ بن سعد لعنہ اللہ جان بوجھ کر میرے باپ پر جھوٹ لگاتا ہے اور

① ومنہا ما عن ہشام بن حکم انہ سمع ابا عبد اللہ یقول کان المغیرۃ بن سعد لعنہ اللہ ویتعمد الکذب علی ابی و یاخذ کتب اصحابہ و کان اصحابہ المستترون باصحاب ابی یاخذون الکتب من اصحاب ابی فیدفونہا الی المغیرۃ لعنہ اللہ فکان یدس فیہا الکفر والزندقۃ و یسندھا الی ابی عبد اللہ الحدیث وروایۃ الفیض بن مختار المتقدمۃ فی ذیل کلام الشیخ الی غیر ذلک من الروایات فظہر مما ذکرنا ان ما علم اجملا من الاخبار الکثیرۃ من وجود الکذابین و وضع الاحادیث فیہا فہو انما کان قبل

ان کے اصحاب کی کتابیں لیتا ہے اور اس کے اصحاب میرے باپ کے اصحاب کے ساتھ لگے رہتے تھے کہ میرے باپ کے اصحاب سے کتابیں لیتے اور مغیرہ لعنہ اللہ کو دے دیتے اور وہ ان میں کفر و زندقہ ملا دیتا اور اس کو ابو عبد اللہ کی طرف منسوب کر دیتا۔ اور ایک روایت فیضان بن مختار کی ہے جو پہلے شیخ کے کلام کے ذیل میں گزر چکی ہے سوا اس کے اور بہت سی روایتیں ہیں۔ ہم نے جو کچھ ذکر کیا اس سے ظاہر ہو گیا کہ اخبار کثیرہ کا حال جو مجملاً معلوم ہوا تو کذابین اور وضع احادیث سے خالی نہ تھا۔ اور یہ امر قبل زمانہ اصحاب ائمہ کے تدوین حدیث اور رجال کے تھا اور جھوٹے اخبار کا ہونا معلوم ہونے سے کل احادیث کا قطعی الصدور یا ظنی الصدور ہونے کا جو دعویٰ ہے وہ باطل ہوتا ہے اور ہم جس کے درپے ہیں وہ نہیں باطل ہوتا، یعنی اکثر یا کثیر احادیث کے صادر ہونے کا دعویٰ علم اجمالی ہے بلکہ یہ دعویٰ بدیہی ہے۔

اختلاف اور جھوٹ اور وضع احادیث کے علاوہ تقیے کے عقدے نے حضرات امامیہ کے یہاں کی حدیثوں کو ایسی مشتبہ حالت میں کر دیا ہے کہ بجز اعتقاد محض کے عقل کو اس میں دخل نہیں ہے نہ کوئی عقلی اصول اس قسم کی حدیثوں کی تکذیب اور تصدیق کے لیے قرار دیا جاسکتا ہے، چنانچہ شیخ مرتضیٰ موصوف اپنے رسائل میں جس کا عنوان ہے: خاتمة فی التعادل والترجیح . لکھتے ہیں کہ ابن جمہور نے ^۱ غوالی اللالی میں علامہ سے روایت کی ہے کہ

◀◀◀ زمان مقابلة الحديث و تدوين على الحديث و الرجال بين اصحاب الائمة مع ان العلم لوجود الاخبار المكذوبة انما ينافي دعوى القطع بصدور الكل التي ينسب الي بعض الاخباريين او دعوى الظن بصدور جميعها ولا ينافي ذلك مانحن بصدده من دعوى العلم الاجمالي بصدور اكثرها او كثير منها بل هذه دعوى بديهية - ۱۲ (فرائد الاصول صفحہ ۹۵)

① الثانی مارواہ ابن ابی الجمہور الاحسانی فی غوالی اللالی عن العلامة مرفوعاً الی زرارة قال سئلت ابا جعفر فقلت جعلت فداک یاتی عنکم الجزان والحديثان المتعارضان فبا یہما آخذ فقال یازرارة خذ بما یقول اعدلہما عندک و اوثقہما فی نفسک فقلت انہما معاعد لان مرضیان موثقان فقال انظر ما وافق منہما العامة فاترکہ و خذ بما خالفہم فان الحق فیما خالفہم قلت ربما کا ناموافقین لہم او مخالفین فکیف اصنع قال اذن فخذ بما فیہ الحائطة و اترك الآخر قلت فانہما معاموفاقان للاحتیاط اور مخالفان لہ فیکف اصنع فقال اذن فتخیر احد یہما و تاخذ بہ و دع الاخر ۱۲۔ (رسائل شیخ

زرارہ کہتے ہیں: میں نے امام باقر سے پوچھا کہ میں آپ کے اوپر فدا ہوں آپ کی طرف سے دو خبریں اور حدیثیں متعارض اور مختلف بیان کی جاتی ہیں ہم کس کو صحیح سمجھیں اور کس پر عمل کریں؟ امام نے فرمایا کہ اے زرارہ! اس پر عمل کرو جو تمہارے اصحاب میں مشہور ہو اور شاذ و نادر کو چھوڑ دو۔ پھر میں نے پوچھا کہ یاسیدی! اگر دونوں مشہور اور ماثور ہوں تو؟ آپ نے فرمایا کہ اس حدیث کو مانو جو تمہارے نزدیک ان دونوں حدیثوں کے راویوں میں سے عادل اور ثقہ تر نے بیان کی ہو۔ تب میں نے کہا کہ اگر دونوں راوی عدل و ثقاہت میں برابر ہوں تو ہم کیا کریں؟ آپ نے فرمایا کہ یہ دیکھو کہ ان میں سے کون سی حدیث سنیوں کے موافق ہے۔ جو موافق ہے اسے چھوڑو اور جو ان کے مخالف ہو اسے صحیح سمجھو۔ کیونکہ حق ان کی مخالفت میں ہے۔ پھر میں نے پوچھا کہ اگر دونوں حدیثیں سنیوں کے موافق یا دونوں ان کے مخالف ہوں تو کیا کروں؟ فرمایا کہ جس میں احتیاط ہو اس پر عمل کرو۔ پھر میں نے پوچھا کہ اگر احتیاط میں دونوں برابر ہوں تو کیا کروں؟ فرمایا کہ اس میں تجھ کو اختیار ہے جسے چاہے لے جسے چاہے چھوڑ دے۔

اور **صدق** نے امام ابوالحسن رضا سے ایک لمبی حدیث میں روایات کیا ہے کہ مختلف

① الثالث مارواه الصدوق باسناده عن ابى الحسن الرضا فى حدیث طویل قال فىه مما ورد علیکم من حدیثین مختلفین فاعرضو هما علی کتاب الله فما كان فى کتاب الله موجودا حالا او حراما فاتبعوا ما وافق الكتاب و ما لم یکن فى الكتاب فاعرضو هما علی سنن رسول الله ﷺ فما كان فى السنة موجودا منہیا عنه نہی حرام او مامورا به عن رسول الله ﷺ امر الزام فاتبعوا ما وافق نہی النبی ﷺ وامره و ما كان فى السنة اعافه او کراهه ثم كان الخبر خلافه فذلک رخصة فى ما عافه رسول الله ﷺ او کرهه و لم یحرمه و ذلک الذی یسع الاخذ بهما جمعا او بایهما شئت و سعک الاختیار من باب التسلیم و الاتباع و الردالی رسول الله ﷺ و ما لم تجد وہ فى شئ من هذه الوجوه فردوا الینا علمه فخن اول بذلک ولا تقولوا فیها بأرائکم و علیکم بالكف و الثبوت و الواقوف و انتم طالبون باحثون حتى یا تیکم البیان من عندنا۔ والرابع ما ان رسالة القطب الراوندى بسنده الصحیح عن الصادق اذ اورد علیکم حدیثان مختلفان فاعرضو هما علی کتاب الله فما وافق کتاب الله فخذوه و ما خالف کتاب الله فذر وہ وان لم تجدو هما فى کتاب الله فاعرضوا علی اخبار العامة فما وافق اخبارهم فذروه و ما خالف اخبارهم فخذوه۔ الخامس بسنده ایضا عن الحسن السیرى قال قال ابو عبد الله ان

حدیثوں کی نسبت امام نے فرمایا کہ ان کو خدا کی کتاب سے ملاؤ جو اس کے موافق ہو اس پر عمل کرو اور اگر خدا کی کتاب میں نہ پاؤ تو سنن رسول ﷺ پر رجوع کرو۔ پس جو کچھ اس میں ممنوع ہو اسے حرام سمجھو اور جو اس کے موافق ہو اس پر عمل کرو۔

اور اسی کتاب میں ابی عمر کنانی سے ایک روایت لکھی ہے کہ حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا: اے ابو عمر! اگر میں تجھ سے کوئی بات کہوں یا کوئی فتویٰ دوں اور پھر اس کے بعد تو میرے پاس آئے اور اسی بات کو پوچھے اور میں برخلاف اس کے جو پہلے بیان کیا تھا اور مخالف اس کے جس کا فتویٰ پہلے دیا تھا تجھ سے کہوں تو تو کس پر عمل کرے گا اور کسے صحیح سمجھے گا؟ تو ابو عمر نے کہا کہ آپ کی آخر بات کو اور اخیر فتویٰ کو صحیح سمجھوں گا۔ امام نے فرمایا: ہاں یہی ٹھیک ہے اے ابو عمر! اللہ انکار کرتا ہے سوائے اس کے کہ وہ چھپ کر عبادت کیا جائے قسم ہے خدا کی!

اور علیکم حدیثان مختلفان فخذوا بما خالف القوم۔ السادس بالسند عن الحسن بن بالجهم فی حدیث قلت له یعنی العبد الصالح یروی عن ابی عبداللہ شعی و یروی عنه الرضا خلاف ذلك قبا یهما ناخذ قال خذ بما خالف القوم و ما وافق القوم فاجنبه۔ السابع بسندہ ایضا عن محمد بن عبداللہ قال قلت الرضا کیف نصنع بالخبرین المختلفین قال اذ اورد علیکم خبران مختلفان فانظروا ما خالف منہما العامة فخذوه و انظر و ما یوافق اخبارہم فذروه۔ ۱۲۔

(رسائل شیخ مرتضیٰ صفحہ ۴۳۰)

① الثامن ما عن الاحتجاج بسندہ عن سماعة بن مهران قال قلت لابی عبداللہ یرد علینا حدیثان واحد یا مرنا بالا خذبه والآخرینہا نا قال لا تعمل بواحد منہما حتی تلقی صاحبک فتسئل قلت لا بدان نعمل بواحد منہما قال خذ بما خالف العامة۔ التاسع ما عن الکافی بسندہ عن المعلی بن جنس قال قلت لابی عبداللہ اذا اجاء حدیث عن اولکم و حدیث عن آخرکم بایہما ناخذ قال خذوا به حتی یبلغکم عن الحی فان بلغکم عن الحی فخذوا بقوله قال ثم قال ابو عبداللہ انا واللہ لاندخلکم الا فیما یسعکم۔ العاشر عنہ بسندہ والی الحسن بن المختار و عن بعض اصحابنا عن ابی عبداللہ قال ارأیتک لو حدثتک بحدیث العام ثم جئت من قابل فحدثتک بخلافه بایہما کنت تاخذ قال کنت آخذ بالا خیر فقال لی رحمک اللہ تعالیٰ۔ الحادی عشر ما بسندہ الصحیح ظاہرا عن ابی عمر والکنانی عن ابی عبداللہ قال یا ابا عمرو ارأیت لو حدثتک بحدیث او فتیک بفتیا ثم جئت بعد ذلك تسئلنی عنہ فاخبرتک بخلاف ما کنت اخبرتک اور افتیک بخلاف ذلك باہیما کنت تاخذ قلت باحد ثہما و ادع الآخر قال قد اصبت یا ابا عمرو و ابی اللہ الا ان یعبد سرا امام واللہ لئن فعلتم ذلك انه لخیر لی ولکم ابی اللہ لنا فی دینہ الا التقیة۔ ۱۲ (رسائل شیخ مرتضیٰ انصاری مطبوعہ ایران صفحہ ۴۳۰)

اگر تم ایسا کرو تو یہی تمہارے اور میرے حق میں بہتر ہے۔ خدا انکار کرتا ہے ہمارے لیے اپنے دین میں مگر تقیے کو..... انتھی .

ان اقوال سے جو ہم نے حضرات امامیہ کی معتبر کتابوں اور مستند عالموں کے نقل کیے یہ بات بخوبی ثابت ہوئی ہے کہ ان کی حدیثیں مختلف اور متعارض ہیں اور لوگوں نے اماموں پر بہت تہمت کی ہے اور ان کے نام سے ہزاروں جھوٹی حدیثیں بیان کی ہیں اور ہزار ہا غلط روایتیں کتابوں میں فریب سے لکھ دی ہیں اور ان کے محقق عالموں اور مشہور محدثین نے صرف کتابوں میں لکھے ہوئے پر اعتبار نہیں کیا جب تک کہ اس کو صاف کتاب سے بواسطہ یا بالواسطہ نہیں سنا۔ اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ باوجود اس قسم کے اختلاف اور تعارض کے اور باوجود موجود ہونے ہزار ہا وضعی حدیثوں کے اور باوجود باقی ہونے احتمال غلطی اور وضع کے موجود حدیثوں میں حضرات امامیہ نے اپنے یہاں کی حدیث کی مستند اور معتبر کتابوں کو شریعت اور مذہب کی بنیاد قرار دیا ہے، اور اصول و فروع میں ان سے استناد کیا ہے اور اختلاف اور تعارض رفع کرنے کے لیے درایت کے اصول قرار دیے ہیں اور ان اصول میں سب سے عمدہ سنیوں کی مخالفت اور تقیہ ہے۔ ایسی حالت میں میں نہیں سمجھتا کہ حضرات امامیہ کو کس طرح زیبا ہوگا کہ وہ سنیوں کی کتابوں پر اعتراض کریں اور ان کو صرف اس خیال سے کہ جھوٹی حدیثیں لوگوں نے بنالی تھیں تمام حدیثوں کو غیر قابل اعتبار قرار دیں اور باوجود اس تحقیق و تنقیح کے جو راویوں کے حالات کے متعلق ہمارے محدثین نے کی ان کی مساعی جمیلہ سے قطع نظر کر کے ان کی کتابوں کو عموماً مشتبہ اور غلط قرار دیں اور صرف اس خیال سے کہ انہوں نے اپنے یہاں وضع احادیث کو تسلیم کیا ہے اور ایسی حدیثوں کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا اور اسی کی غلطی اور وضع کو ظاہر کر دیا سنیوں پر یہ اعتراض کریں کہ وہ اپنی کتابوں کو خود غیر قابل اعتبار بتاتے ہیں اور اپنے مذہب کی عمارت کو اپنے ہاتھوں سے منہدم کرتے ہیں ایسی حالت میں اور ایسے اعتراض پر بجز اس کے اور کچھ مجھ سے کہا نہیں جاتا کہ جو شخص شیش محل میں رہتا ہو اسے چاہیے کہ سنگین عمارت میں رہنے والے پتھر نہ پھینکے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب دونوں فریق کی روایتوں کا حال قریب قریب برابر ہے اور دونوں کے یہاں صحیح اور غلط، قوی اور ضعیف حدیثیں موجود ہیں اور دونوں کے یہاں تنقیح روایت اور تصحیح حدیث کے لیے درایت کے قواعد مقرر ہیں تو کوئی فریق ایک دوسرے ان حدیثوں اور روایتوں کو اپنے دعوے کے ثابت کرنے میں پیش نہیں کر سکتا، جس سے فریق مخالف کے اصول و عقائد اور مسائل اجماعی میں خلل پیدا ہو، اور اس طرح پر عمل کرنے سے گویا الزامی دلائل کے پیش کرنے کا باب بند ہو جاتا ہے۔ سنی جو حدیثیں صحابہ کے فضائل میں شیعوں کی کتابوں سے پیش کرتے ہیں ان کا وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہیں یا خلاف اجماع اور خلاف اصول مسلمہ کے ہیں، اس لیے وہ ہم پر حجت نہیں ہو سکتیں۔ اسی طرح شیعہ مطاعن صحابہ میں جو روایتیں اور حدیثیں سنیوں کی پیش کرتے ہیں وہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ یہ حدیثیں یا غلط ہیں یا ضعیف یا مخالف اجماع امت اور اصول مسلمہ کے ہیں، اس اعتراض کو ہم تسلیم کرتے اور کہتے ہیں کہ بلاشبہ اس قسم کی الزامی دلیلیں کافی نہیں ہیں اور اس سے کسی فریق کا دعویٰ بمقابل دوسرے فریق کے بلحاظ اس کے اصول کے ثابت نہیں ہوتا۔ مگر ہمارا استدلال شیعوں کی روایتوں سے نہ اس لیے ہے کہ ہم اس کو حقیقتاً اپنے دعوے کے اثبات کے لیے ضروری سمجھتے ہیں بلکہ اس قسم کا استدلال الزامی ہے کہ جس طرح وہ ہماری بعض ضعیف روایتوں سے استدلال کرتے ہیں، ہم ان کی صحیح اور قوی حدیثوں سے اسی کو باطل کرنا چاہتے ہیں اور یہ طریقہ بھی متاخرین کا ہے۔ اور انہوں نے شیعوں کے طرز پر اختیار کیا ہے۔ ورنہ ہمارے مقتدین صرف قرآن مجید اور عقل سلیم سے اپنے عقائد اور دعاوی کو ثابت کرتے آئے ہیں اور الزامی جواب سے احتراز کرتے رہے ہیں اور ہم نے اپنی اس کتاب میں گواہی جو اب دینے کا طریقہ اختیار کیا ہے، مگر صرف اس لیے کہ حضرات امامیہ یہ نہ سمجھیں کہ ان کے اعتراض خود ان کی روایتوں سے باطل نہیں ہوتے، ورنہ ہم نے قرآن مجید اور عقلی دلائل کو صحابہ کے فضائل ثابت کرنے اور ان پر جو الزام شیعوں نے لگائے ہیں ان کے دور کرنے میں مقدم سمجھا ہے اور انہیں کو جا بجا بیان کیا ہے اور ہم نہایت دعوے سے کہہ

سکتے ہیں کہ اگر الزامی جوابات کا طریق بند کر دیا جائے تو ایک لحظہ کے لیے حضراتِ امامیہ
سینوں کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں سکتے اور قرآن مجید اور عقل سلیم سے وہ اپنے دعوے کو صحابہ کے
مطالعن کے متعلق ثابت نہیں کر سکتے۔

آشانے کو شانے سے ملا دیکھ
قد میں ہمیں کچھ بلند ہوں گے
خوش بود گر محک تجربہ آید بمیاں
تاسیہ روشود ہر کہ درد غش باشد



پانچواں مقدمہ

اگرچہ اسلام میں بہت سے فرقے پیدا ہو گئے اور اصول فروغ میں باہم ان کے اختلاف ہے۔ مگر عموماً یہ اختلاف رائے اور سمجھ کی غلطی اور فلسفہ کے اسلام میں داخل ہونے اور آیات قرآنی میں تاویل کرنے پر مبنی ہے۔ کسی نے ان مختلف فرقوں میں سے صحابہ کرامؓ یا اہل بیت علیہم السلام سے مخالفت نہیں کی اور نہ ان کو مورد لعن و طعن بنایا، مگر دو فرقوں کے ایک امامیہ دوسرے خوارج۔ ان کا اختلاف صحابہ یا اہل بیت کی عداوت پر ختم ہوتا ہے اور اس کا اصلی سبب خلافت کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کو اصول دین میں داخل کرنے سے یہ دونوں فرقے جادۂ اعتدال سے متجاوز ہو گئے۔ ایک نے اہل بیت کا دامن پکڑ کر صحابہ کرامؓ کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھا۔ اور دوسرا فرقہ خوارج کا صحابہ کرامؓ کی طرف اتنا جھکا کہ اہل بیت کو ملامت کا نشانہ بنایا۔ اور ان پر لعن طعن کرنے کو عین اسلام قرار دیا۔ اسی مسئلہ خلافت کی بنیاد پر حضرات امامیہ نے صحابہ کرامؓ سے یہاں تک عداوت پیدا کی کہ ان کو اسلام اور ایمان سے بھی بے بہرہ قرار دیا، اور آپ قرآنی اور ان کے مساعی جمیلہ سے جو اسلام کے لیے کیں، چشم پوشی کی۔ اور اسی عقیدے نے ان کو ان روایتوں کے بنانے اور ماننے پر مجبور کیا جو صحابہ کے معائب اور مطاعن کے متعلق ہیں مگر ہم کو اسی کا افسوس نہیں ہے کہ اس عقیدۂ امامت نے ایک فرقے کو صحابہ کا مخالف بنا دیا بلکہ حیرت اور افسوس اس پر ہے کہ اس عقیدے نے انبیاء اور ائمہ کرام کی اولاد کو بھی طعن و ملامت سے محفوظ نہ رکھا اور حسد، بغض اور انکار امامت نے انبیاء اور اکثر خاندان اہل بیت کو اسی طرح پر قابل الزام اور مورد طعن بنا دیا، جیسا کہ صحابہ کرامؓ کو بنایا تھا، فرق اتنا ہے کہ صحابہ کرامؓ کی عداوت کا اظہار اور ان کی برائیوں کا اعلان صاف طور پر کیا جاتا ہے اور انبیاء اور خاندان اہل بیت کی نسبت ضعیف تاویلیں کی جاتی

ہیں اور ان کی عصمت اور بزرگی کا زبانی اقرار باقی ہے، ورنہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس مسئلہ امامت نے نہ انبیاء کو چھوڑا اور نہ سوائے معدودے چند ائمہ کے باقی خاندان نبوت کو طعن و ملامت سے محفوظ رکھا۔ کوئی ائمہ پر حسد کرنے کی وجہ سے مطعون بنایا گیا، کوئی انکار امامت کے سبب سے کافر ٹھہرا، کوئی دعویٰ امامت کی وجہ سے کفر و فسق کے درجے پر پہنچا غرض کہ ایک صحابی کی مخالفت کا ہم کیا افسوس کریں۔ جس طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں مسئلہ امامت کے تیروں کا سبب کونشانہ پاتے ہیں۔

گھائل تری نظر کا بنوع دگر ہر ایک

زخمی کچھ ایک بندہ در گاہ ہی نہیں

اول انبیاء کا حال سنئے کہ حضرات امامیہ کمال فخر سے کہا کرتے ہیں کہ جو عقیدہ انبیاء کی بزرگی اور فضیلت اور ان کی پاکی اور عصمت کا ہم رکھتے ہیں کوئی دوسرا فرقہ اہل اسلام کا اس میں ہمارا شریک نہیں ہے۔ اور یہ عزت خاص شیعیان پاک کو نصیب ہے کہ حضرات انبیاء کے دامن عصمت کو ہر طرح کے گناہ صغیرہ و کبیرہ اور ہر قسم کے عیب و برائی سے پاک سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ فاضل محقق نے حسام میں کہا ہے:

((تمام اہل اسلام اتفاق دارند بریں کہ درباب عصمت انبیاء

آنچه امامہ مبالغہ می دارند هیچ یک از فرق اہل اسلام آن

قدر ندارد و زیرا کہ امامیہ منفر داند باینکہ می گویند انبیاء

از اول عمر تا آخر از گناہ صغیر و کبیرہ عمدتاً و سہواً منزہ

می باشند بخلاف دیگران و قال بعض افاضلہم کہ اہتمام

شیعیان آل عباد درباب تنزیہ انبیاء و اوصیا از اول عمر تا آخر

عمر از جمیع گناہان صغیرہ و کبیرہ بحدی است کہ هیچ

فرقہ را غیر ایشان حاصل نیست حتی اینکه اجتہاد را ہم

بر زمرہ انبیاء و اوصیا جائز نمی دارند فضلاً عن وقوع

الخطافی الاجتہاد.))

”تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ عصمت انبیاء کے بارے میں شیعہ جس قدر مبالغہ سے کام لیتے ہیں اتنا مبالغہ اسلام کا کوئی دوسرا فرقہ نہیں کرتا اور صرف شیعوں کا مسلک یہ ہے کہ تمام انبیاء اول سے آخر تک ہر قسم کے گناہ صغیرہ و کبیرہ سے قصداً و سہواً ہر طرح پاک و صاف تھے اور دوسرے فرقے اس امر کے خلاف ہیں اور ان کے بعض فاضل حضرات کا بیان ہے کہ شیعان آلِ عبا نے انبیاء اور اوصیا کو ابتدائی عمر سے انتہائی عمر تک ہر قسم کے گناہ صغیرہ و کبیرہ سے اس حد تک منزہ و معصوم ثابت کرنے کا اہتمام کیا ہے کہ اتنا اہتمام کسی دوسرے فرقے نے نہیں کیا، یہاں تک کہ انبیاء و اوصیا کے لیے اجتہاد کو بھی جائز نہیں سمجھتے کیونکہ اجتہاد میں غلطی ہونے کا امکان پایا جاتا ہے۔“

مگر جب ان کے مذہب کی کتابوں کو دیکھتے اور ان کے ائمہ کی احادیث سنتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ عیب جس کو مشرک اور کافر بھی بدترین عیبوں میں سے جانتے ہیں بلکہ جس کو ملحد اور لامذہب بھی اخلاقی برائیوں بلکہ ذلیل ترین خصائل میں شمار کرتے ہیں، اسے وہ انبیاء کی طرف منسوب کرتے ہیں اور بایں دعویٰ عصمت و طہارت ان کو مرتکب کبار سمجھتے ہیں، و نعوذ باللہ من ذالک۔ چنانچہ حضرت ابوالبشر آدم علیہ السلام کی شان میں جو احادیث ائمہ کی طرف سے بیان کی ہیں وہ ذرا گوش دل سے سنیے۔

محمد بن بابویہ نے ”عیون اخبار الرضا“ میں علی بن موسیٰ رضا سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب خدا نے آدم کو مسجود ملائکہ ہونے اور جنت میں داخل ہونے کی بزرگی دی تو انہوں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ میں بزرگ ترین مخلوقات ہوں، پس اللہ جل شانہ نے ندا کی کہ اے آدم! اپنے سر کو اٹھا اور دیکھ میرے عرش کے پائے کو، پس آدم نے اپنا سر اٹھایا تو کیا دیکھا کہ لکھا ہے ((لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی ولی اللہ امیر المؤمنین و زوجته فاطمة سيدة نساء العالمین والحسن والحسين سیدا

شباب اهل الجنة)) ”یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، علی اللہ کے ولی امیر المؤمنین ہیں اور ان کی بیوی فاطمہ دنیا کی عورتوں کی سردار ہیں اور حسن و حسین اہل جنت کے جوانوں کے سردار ہیں۔“ تب حضرت آدم نے کہا کہ الہی یہ کون ہیں؟ خدا نے جواب دیا کہ یہ تیری ذریت ہیں اور تجھ سے بہتر ہیں اور تمام میری خلق سے افضل تر ہیں اور یہ نہ ہوتے تو میں نہ تجھے پیدا کرتا اور نہ جنت اور نہ دوزخ اور نہ آسمان اور نہ زمین کو، لیکن خبردار رہنا اے آدم! ان کو حسد کی نگاہ سے نہ دیکھنا اگر ایسا کیا تو میں تجھے اپنے جوار سے نکال دوں گا۔ پس دیکھا آدم نے ان کو بہ نظر حسد، پس مسلط ہوا ان پر شیطان یہاں تک کہ کھایا انہوں نے اس درخت سے کہ منع کیا تھا خدا نے اس سے۔

یہ کوئی خیال نہ کرے کہ یہی ایک حدیث حضرت ابوالبشر جدامجد کی شان میں امام علی بن موسیٰ رضا سے نقل فرمائی ہے بلکہ وہ حدیث بھی سنیے جس میں دادا کے گناہ میں دادی کو بھی شریک کیا ہے۔

”معانی الاخبار“ میں بہ سند مفصل بن عمر حضرت عمر حضرت جعفر صادق سے روایت ہے کہ جب آدم و حوا علیہما السلام نے عرش پر آنحضرت ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور فاطمہ اور حسنین کا نام نور سے لکھا ہوا دیکھا تو کہا کہ اے پروردگار! ہمارے کیا بزرگ ہیں ان کا مرتبہ اور کیسے محبوب ہیں یہ لوگ تیرے۔ تب خدا نے فرمایا کہ اگر یہ نہ ہوتے تو میں تم کو پیدا نہ کرتا، یہ لوگ میرے علم کا خزانہ اور میرے اسرار کے امانت دار ہیں، اے آدم و حوا ڈرتے رہنا کہ ان کو بہ نظر حسد نہ دیکھنا اور ان کے مرتبے اور ان کی منزلت کی تمنا نہ کرنا، نہ میری نافرمانی اور عصیان میں داخل ہو گے اور تب تم دونوں ظالموں میں ہو جاؤ گے۔ پس شیطان نے ان دونوں کو وسوسہ دیا اور فریب میں لایا کہ آخر انہوں نے بہ نظر حسد ان پختن کی طرف دیکھا، اس لیے آدم و حوا دونوں معزول ہو گئے۔

جناب اجتہاد مآب مولوی دلدار علی صاحب حسام میں بجواب مولانا وسیدنا شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ کے اس حدیث کی نسبت دو جواب دیتے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ یہ حدیث

احادیث صحاح سے نہیں ہے کہ اس پر اعتقاد کرنا اور اس کی تصحیح کرنا ضروریات دین سے ہو۔ دوسرے یہ کہ حسد دو قسم پر ہے ایک بمعنی غبطہ اور دوسرے بمعنی استدعاء زوال نعمت۔ اول مباح ہے اور دوسرا مذموم۔ پس کیوں آدم کا حسد اول قسم پر محمول نہ کیا جائے اور حسد کی اس تقسیم پر ہی حضرت قبلہ و کعبہ نے کفایت نہیں فرمائی بلکہ بخاری کی ایک حدیث کو نقل کر کے سنیوں کا منہ بھی بند کرنا چاہا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

((اما حدیث حسد حضرت آدم کہ در کتب امامیہ مروی گشتہ و اسباب تشنیع ناصب عداوت عترت طاہرہ بر شیعیان اہل بیت گردیدہ پس از جملہ احادیث صحاح نیست۔ تا اعتقاد کردن بآن و تصحیح نمودن آن از جملہ ضروریات نزد امامیہ باشد۔ و ایضاً گویا بگوش این ناصب عداوت عترت نرسیدہ کہ حسد برد و قسم ست یکی بمعنی غبط ست۔ و دوم حسد بمعنی استدعاء زوال نعمت۔ اول مباح ست و دوم مذموم، و می دانم کہ اگر بمجر دادعائے این تقسیم اکتفا نمایم ناصب عترت طاہرہ تکذہب خواهد نمود و لہذا بذکر یک حدیث صحاح ایشان کہ دلالت صریح دار و بر آنچه ادعا نمودہ ام پرواز و دهن اور ایاین تقریب می دوزم کہ گفتہ اند دهن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ۔ (ویساغ بعد ذلك ان يقال فی حقہ فبہت الذی کفر کانہ التقمہ الحجر) و آن این ست کہ بخاری روایت نمودہ از ابوہریرہ قال لا حسد الا فی اثین رجل اتاه الله القرآن فهو يتلوه آناء

اللیل والنهار فسمعه جار له فقال لیتنی اوتیت مثل ما اوتی فلان فعملت مثل ما یعمل ورجل اتاه الله ما لا فهو ینفقه

فی حقہ فقال رجل لیتنی اوتیت مثل ما اوتی فلان فعملت
 مثل ما یعمل وبتفاوت یسیر قریب ایس مضمون حدیث
 دیگرست کہ آن را بخاری و مسلم و ترمذی روایت کردہ اند
 پس چرا جائز نباشد کہ حسد حضرت آدم ازین قبیل بودہ
 باشد و چگونه چنین نباشد و حال این کہ مفضل بن عمر کہ
 ناصبی آن را مذکور ساختہ متضمن کلمہ و حملہا علی تمنی
 منزلتہم است در قوت تفسیر معنی حسدست لیکن چون
 غبطہ ہر چند مباح ست اما بنظر علو منزلت و شرف مرتبت
 جناب عترت سید المرسلین غبط ایشاں از قبیل ترک اولی
 ست لهذا حق سبحان تعالیٰ علی حسب جری العادۃ الالہیہ
 حضرت آدم را معاتب ساختہ و ایضاً حسد بمجرد این کہ
 بمقتضائے بشریت عارض و ما دامیکہ بمقتضائے آن کار کند
 آدمی گنہ گار براں نمی شود، چنانچہ درین معنی احادیث
 ازائمه عترت ماثور گشتہ و ایضاً معلوم ست کہ حضرت آدم
 متمسک گر ویدہ بکلماتیکہ تفسیر آن بنا بر احادیث بسیار با
 سماء آل عباس شدہ پس باین قرینہ بدین حسند بمعنی غبطہ کہ
 از قبیل ترک اولی بودہ .))

”آدم کا حسد کرنا جو شیعہ کتابوں میں درج ہے اور سنیوں نے اس حدیث کو
 آدم علیہ السلام سے شیعوں کا عداوت رکھنا سبب بتایا ہے تو یہ حدیث احادیث صحاح
 نہیں ہے کہ اس پر لازماً عقیدہ رکھا جائے اور اس کی صحت کو ضروریات دین
 گردانا شیعوں کے لیے لازمی نہیں ہے۔ اور شیعوں کے دشمن سنیوں کے کان
 میں یہ بھنک تک نہیں پڑی کہ حسد کی دو قسموں سے ایک غبطہ و رشک ہے اور دوسرا

حسد، جس کے معنی ہیں زوال نعمت کی استدعا کرنا، پہلا یعنی رشک کرنا مباح ہے اور دوسرا یعنی حسد کرنا مذموم اور فتنج ہے، اور میں جانتا ہوں کہ اگر اسی تقسیم پر اکتفا کروں تو سنیوں کی تکذیب ہو جاتی ہے، اس کے ماسوا ان کی صحاح میں کی ایک حدیث لکھنا چاہتا ہوں تا کہ سنیوں کے منہ بند کردوں جیسا کہ مقولہ ہے ”کتے کا منہ ایک نوالہ سے بند کرنا اچھا ہے“ اور یہ حدیث بخاری میں ابو ہریرہ کی زبانی درج ہے اور اسی حدیث کے مضمون کے موافق دوسری احادیث بھی بخاری، مسلم و ترمذی میں موجود ہیں، اس لیے کس طرح ممکن ہے کہ حضرت آدم کا حسد اس قسم کا نہ ہو، اور پھر حالت یہ مفضل بن عمر سنی نے اس واقعہ کو آدم کے منزلت کی تمنا کے برابر قرار دیا ہے اور تفسیر اس کی حسد ہے، اگرچہ رشک کرنا مباح ہے اور رسول اللہ کی عمرت کا مرتبہ بلند ہے، اس لیے ان پر رشک کرنا ترک اولیٰ سے ہے، اور اسی لیے اللہ نے آدم کو معتوب کیا اور چونکہ حسد کرنا انسان کی عادت ہے اور جب تک آدمی اس کے موافق کام نہ کرے گناہ گار نہیں ہوتا، جیسا کہ اس بارے میں ائمہ کی احادیث موجود ہیں اور یہ امر بھی معلوم ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے جو کلمات کہے ان کی تفسیر اسمائے آل عبا کی احادیث میں بہ کثرت موجود ہے، اس لحاظ سے بھی یہ حسد غبطہ کے معنی میں ترک اولیٰ کے قبیل سے ہوگا۔“

مگر حضرت قبلہ کی اس تقریر سے وہ داغ جو ان کے بزرگوں نے حضرت ابوالبشر پر لگایا ہے وہ دور نہیں ہوا، اس لیے کہ اگر اس حدیث کے صحاح میں نہ ہونے سے یہ مراد ہے کہ وہ صحاح اربعہ، یعنی کلینی، و تہذیب، و استبصار، و من لا یحضرہ الفقہ میں نہیں ہے تو اس سے عدم صحت لازم نہیں آتی۔ صدہا حدیثیں ہیں جو سوا ان چار کتابوں کے دوسری کتابوں میں منقول ہیں اور جن کو حضرات امامیہ صحیح سمجھتے ہیں۔ اور اگر مراد یہ ہے کہ راوی اس کا ضعیف ہے یا سلسلہ روایت میں کوئی نقص ہے تو اس کا بیان فرمانا تھا، مگر حضرت بیان فرماتے تو کیا فرماتے؟ اس لیے کہ یہ حدیث عیون اور معانی الاخبار سی معتمد کتابوں میں ہے جس کے مؤلف کی سچائی

اور صداقت اس کے لقب سے ظاہر ہے، ((فانہ صدوق)) اور وہ خود صحاح اربعہ میں سے ایک کتاب کا مصنف ہے اور پھر اس حدیث کو بہ سند صحیح ائمہ معصومین سے روایت کیا ہے، ایسی حدیث کی صحت کا انکار کرنا جو متصل بہ امام معصوم ہو اور اس کے راویوں میں سے کوئی مجروح و مقدوح نہ ہو غالباً قابل تسلیم نہ ہوگا اور خود قبلہ و کعبہ نے اسی کتاب حسام اور دیگر کتابوں میں بہت سی حدیثیں عیون اور معانی الاخبار سے نقل کی ہیں اور ان کو اپنے دعویٰ کی تائید میں پیش کیا ہے، ایسی حالت میں بغیر کسی اور قسم کے ثبوت کے یہ کہہ کر کہ ایس حدیث از جملہ احادیث صحاح نیست پیچھا چھڑانا اگر جائز ہو تو پھر سنیوں کی کسی خبر کو جو مطاعن صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق ہو باوجود راویوں کے ضعف کے ثبوت پیش کرنا درست نہ ہوگا۔ مگر صاحب استقصاء الانحام نے اس حدیث کی صحت کو قبول کیا ہے اور قبلہ و کعبہ کے کلام کی توجیہ ان لفظوں سے فرمائی ہے:

((غرض آنجناب از انکار معدود بودن این حدیث در احادیث صحاح آنست کہ این حدیث از جملہ احادیث قطعیه الصدور نیست الی قولہ کی مراد آن جناب یعنی صحت بمعنی قطعیه الصدور است زیرا کہ ازاں مفہوم می شود کہ اگر این حدیث از جملہ احادیث صحیحہ می بود اعتقاد کردن بآن از جملہ ضروریات می بود پر ظاہر است کہ این لازم نمی آید مگر بعد صحت قطعیه الصدور .))

”مولوی صاحب کا اس حدیث سے انکار بایں الفاظ کہ یہ حدیث صحاح کی نہیں ہے، ان کے اس مقصد کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ حدیث قطعیه الصدور احادیث میں سے نہیں ہے اور صحت و صحیح ہونے کے معنی یہی ہیں کہ اس کا صدور قطعیه نہیں ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ حدیث صحیح حدیثوں میں سے ہوتی تو اس کے مطابق اعتقاد کرنا ضروریات سے ہوتا، اور یہ اس وقت لازم آتا جب کوئی

حدیث قطعی حدیث کا حکم رکھتی ہو۔“

مگر مولوی حامد حسین صاحب اس توجیہ سے قبلہ و کعبہ کے جواب کو صحیح ثابت نہ کر سکے بلکہ ہمارے دعوے کے معین اور مؤید ہو گئے، اس لیے کہ وہ فرماتے ہیں: ((اگر ایسے حدیث از جملہ احادیث صحیحہ می بود اعتقاد کردن با آن از جملہ ضروریات می بود و پر ظاہرست کہ این لازم نمی آید مگر بعد صحت بمعنی قطعیت الصدور)) ہم اس جواب کو تسلیم کرتے ہیں، بشرطیکہ ایسے قاعدے کہ وہ ہمارے یہاں کی حدیثوں کی نسبت بھی خیال رکھیں نہ یہ کہ ہمارے یہاں کی ضعیف بلکہ موضوع حدیثوں سے استدلال کریں اور انہیں ہمارے مقابلے میں پیش فرمائیں اور اپنے یہاں کی صحیح حدیثوں کو بھی قطعیت الصدور یعنی یقینی نہ ہونے کی وجہ سے قابل حجت نہ سمجھیں۔ مگر ہم اس حدیث کو اور روایتوں سے جن کی صحت اور اعتماد میں کچھ اعتراض نہیں کیا گیا، ثابت کرتے ہیں۔ تفسیر امام حسن عسکری میں بذیل آیت ﴿وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ (سورہ البقرہ: ۳۵) کے لکھا ہے کہ مراد درخت سے علم محمد ﷺ اور آل محمد ﷺ تھا، کہ حق تعالیٰ نے انہیں کے ساتھ مخصوص کیا تھا اسی کو آدم نے کھایا اور بہشت سے نکالے گئے۔ اس مضمون کو ملا باقر مجلسی کی زبان سے سینے جس کو وہ حیات القلوب میں فرماتے ہیں:

((در تفسیر امام حسن عسکری مذکورست کہ چوں حق تعالیٰ ابلیس را لعنت کرد بابا کردن او و گرامی داشت ملائکہ را بہ سجده کردن ایشان آدم ﷺ را امر کرد کہ آدم و حواری بہشت برند و فرمود کہ یا آدم ساکن شو تو و جفت تو در بہشت و کلار رغداً حیث شئتما و بخورید از بہشت کشادہ و گوہر جا کہ خواہید بے تعبے ولا تقربا هذه الشجرة و نزدیک مشوید این درخت را کہ درخت علم محمد ﷺ و

آل محمد ﷺ ست کہ خلقِ تعالیٰ ایشان را منع کرد از آن کہ نزدیک آن درخت شوند کہ مخصوص محمد ﷺ و آل محمد ﷺ ست و کسے با امرِ خدا نمی خورد از آن درخت مگر ایشان الی قولہ و حق تعالیٰ فرمود کہ نزدیک این درخت مروید کہ خواهید طلب کنید درجہ محمد ﷺ و آل محمد ﷺ و فضیلت ایشان زیرا کہ خدا ایشان را مخصوص گردانیدہ است باین درجہ از سائر خلق و این درختیست کہ ہر کہ ازین درخت بخورد باذنِ خدائے تعالیٰ الہام کردہ می شود علمِ اولین و آخرین را بے آنکہ از کسی بیا موزد و ہر کہ بے رخصتِ خدا بخورد از مرادِ خود نا امید می شود و نافرمانی پروردگار کردہ است فتکونا من الظالمین پس خواہد شوید اوستم گاران بنا فرمانی شما و طلب کردن شما درجہ را کہ اختیار کردہ است خدا بآن درجہ غیر شما ہر گاہ قصد کنید آن درخت را بغير حکمِ خدا الی قولہ پس بایں سبب فریب خورد آدم و غلط کرد و از آن درخت خورد پیش رسید بایشان آنچه خداوند در قرآن ذکر کردہ است

فاز لهما الشيطان عنها فاخرجهما مما كانا فيه .))

”تفسیر امام حسن عسکری میں ہے کہ انکار کرنے کی وجہ سے اللہ نے شیطان پر لعنت کی اور آدم کو چونکہ فرشتوں نے سجدہ کیا، اس لیے انہیں معزز بنایا اور آدم و حوا کو جنت دیتے ہوئے کہا کہ اے آدم! تم اپنی بیوی کے ساتھ جنت میں رہو اور اس وسیع جنت میں بغير کسی تکلیف کے جو چاہو کھاؤ اور اس درخت کے قریب نہ جانا جو علم محمد ﷺ اور آل محمد ﷺ کا درخت ہے اور اللہ نے اس درخت کے

قریب جانے سے منع کیا کیونکہ وہ محمد ﷺ اور آل محمد ﷺ کے ساتھ مخصوص ہے اور ان آدم و حوا کے سوا کسی اور نے اس درخت سے نہیں کھایا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس درخت کے قریب نہ جانا، یعنی آل محمد ﷺ کے درجہ و فضیلت کی طلب نہ کرنا کیونکہ بہ نسبت دیگر مخلوق کے یہ ان کے ساتھ مخصوص ہے، اور اس درخت کی حالت یہ ہے کہ جو کوئی اس درخت سے کھالے تو اسے اللہ کے اذن و اجازت سے اولین و آخرین کا علم ہو جاتا ہے اور وہ کسی کے سکھائے بغیر سب کچھ خود ہی سیکھ لیتا ہے اور جو شخص اللہ کی اجازت کے بغیر اس میں سے کھائے وہ نامراد و ناامید ہو جاتا ہے اور اسی نافرمانی احکام الہی کی وجہ سے اللہ نے کہا کہ اپنی نافرمانی اور اس سبب سے کہ تم نے اس درجے کے حصول کا ارادہ کیا جو تمہارے مرتبے سے بلند ہے۔ اور جب کہ آدم علیہ السلام و حوا نے اللہ کے حکم کے بغیر اس درخت کا ارادہ کیا تو قریب خوردہ آدم علیہ السلام نے غلطی کی اور اس درخت میں سے کھایا تو اللہ نے انہیں جنت سے نکال دیا۔“

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ درخت جس کے کھانے سے آدم و حوا منع کیے گئے تھے وہ درخت علم محمد ﷺ اور آل محمد کا تھا جس کے کھانے سے علم اولین و آخرین بغیر سکھائے آجاتا ہے، اور اسی درخت کے کھانے سے آدم و حوا جنت سے نکالے گئے، مگر حدیث سے اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ شیطان کے بہکانے سے آدم و حوا نے اسے کھایا تھا اور اس کے سبب سے وہ مصیبت میں گرفتار ہوئے۔ مگر دوسری حدیث سے جس کو بہ سند معتبر حضرت امام علی نقی سے نقل کیا ہے ثابت ہوتا ہے کہ وہ درخت حسد کا تھا کہ جس کے کھانے سے خدا تعالیٰ نے منع کیا تھا، مگر انہوں نے عمداً اسے کھایا، یعنی ائمہ پر حسد کیا۔ کما یقول المجلسی فی حیات القلوب کہ:

((بسنند معتبر از حضرت امام علی نقی منقول است کہ در

ختیکہ آدم و زوجه اش رانہی کرداز خوردن ازاں درخت

حسد بود و حق تعالیٰ عہد کر د بسوئے آدم و حوا کہ نظر
نکنند بسوئی کہ حق تعالیٰ آنہاں رابرايشان و بر جمیع
خلائق فضیلت دادہ ست بدیدہ حسد و نیافت حق تعالیٰ از
ودرین باب عزم و اہتمام .))

”معتبر اسناد کے ذریعہ امام علی نقی کی زبانی بیان کیا ہے کہ آدم و حوا کو جس درخت
کے کھانے سے منع کیا گیا وہ حسد کا درخت تھا اور اللہ نے آدم و حوا سے کہہ دیا تھا
کہ اس کی جانب نگاہ تک نہ کریں کیوں کہ آل محمد ﷺ کو تمام مخلوقات پر
فضیلت دی ہے کہ کوئی ان پر حسد نہ کرے اور اللہ نے آدم و حوا میں تعمیل حکم کا
عزم و اہتمام بھی نہیں دیکھا۔“ (ترجمہ اردو حیات القلوب جلد ۱ صفحہ ۹۲ لکھنؤ)

اس حدیث سے بھی ثابت نہیں ہوا کہ حضرت آدم نے شیطان کی بہکانے سے حسد کے
درخت سے کھایا، یعنی ائمہ کو حسد کی نگاہ سے دیکھا اور حکم الہی کو نہ مانا بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ
آدم و حوا نے کچھ حکم ماننے کا ارادہ اور اہتمام بھی نہ کیا۔ یعنی خدا کے حکم کی بھی پروا نہ کی جیسا
کہ ان لفظوں سے ثابت ہوتا ہے: ((نیافت حق تعالیٰ از ودرین باب عزم و
اہتمام)) ”یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم میں حکم الہی کی تعمیل کا اہتمام و ارادہ بھی نہ پایا۔“

شاید کسی کے خیال میں یہ آئے کہ حضرت آدم خدا کے حکم کو بھول گئے اور نسیان کی حالت
میں خلاف حکم الہی کر بیٹھے، جیسا کہ بعض مفسرین امامیہ نے لکھا ہے کہ نسیان کی حالت میں
حضرت آدم ﷺ اس فعل کے مرتکب ہوئے۔ اس لیے کہ بہ سند معتبر جو حضرت امام محمد باقر
سے منقول ہے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدم خدا کے حکم کو نہ بھولے تھے اور باوجود حکم خدا کے
وہ مرتکب منہی عنہ کے ہوئے۔ کما یقول المجلسی فی حیات القلوب .

((بسنند معتبر مروی ست کہ از امام محمد باقر پر سید نداز
تفسیر قول خدا ”فنیسی و لم نجدله عزما“ کہ جمعے تفسیر
کردہ اند کہ حضرت آدم فراموش کردنہی خدا، حضرت

فرمود کہ فراموش نہ کردہ بودو حال آنکہ در وقت وسوسہ کردن شیطان نہی خدا را بیاد ایشان آوردومی گفت کہ خدا شمارا برائے ایس نہی کردہ است کہ ملک نبا شیدہ و در بہشت ہمیشہ نبا شید ، پس نسیان درینجا بمعنی ترک ست بمعنی ترک کرد امر خدا را .))

”معتبر روایت ہے کہ امام محمد باقر سے لوگوں نے ﴿فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا﴾ کی بابت دریافت کیا کہ لوگ اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کی ممانعت کو آدم فراموش کر گئے؟ اس کے جواب میں امام باقر نے کہا کہ انہوں نے فراموش نہیں کیا اور وہ کیسے بھول سکتے تھے حالانکہ وسوسہ ڈالتے وقت شیطان نے اللہ کی ممانعت انہیں یاد دلائی اور کہا کہ اللہ نے آپ کو اس درخت کے قریب جانے سے اس لیے منع کیا ہے تاکہ آپ کہیں فرشتہ نہ بن جائیں اور ہمیشہ ہمیشہ جنت میں نہ رہیں، اس لیے نسیان کے معنی اس مقام میں چھوڑ دینے کے ہیں، یعنی آدم نے احکام الہی کو چھوڑا دیا۔“

(ترجمہ اردو حیات القلوب جلد ۱ صفحہ ۹۲ طہ پبلشنگ سینٹر لکھنؤ)

اس سے ثابت ہوا کہ دیدہ و دانستہ آدم نے خدا کے حکم کو نہ مانا اور باوجودیکہ شیطان نے خدا کے حکم کی یاد بھی دلائی مگر انہوں نے خیال نہ کیا اور کیوں کر خیال کرتے، اس لیے کہ ائمہ کا مرتبہ دیکھ کر عیاذ باللہ وہ جوش حسد کا ہوا تھا کہ وہ دین و دنیا سب بھول گئے تھے اور ان کے درجے اور مرتبے کی تمنا اور خواہش نے ان کو نعوذ باللہ ایسا بے اختیار اور بے قابو کر دیا تھا کہ وہ کچھ اس کا عزم اور اس کا اہتمام بھی کرنا نہ چاہتے تھے۔ چنانچہ حضرت جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث سے اس کا حال سنئے کہ جب جاہ اور آل محمد ﷺ کے درجے کی تمنا نے ان کو حسد کرنے پر مجبور کیا، ملا باقر مجلسی ”حیات القلوب“ میں بہ سند معتبر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث نقل کرتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے نچتین پاک اور باقی

ائمہ کی روحوں کو سب سے زیادہ بلند درجہ دیا اور ان کو تمام زمین و آسمان پر پیش کیا اور کہا کہ یہ میرے دوست، ولی اور خلق پر حجت ہیں، جو کوئی ان کے درجے کا دعویٰ کرے اس پر ایسا عذاب کروں گا کہ جو اور کسی خلق پر نہ کیا ہو اور مشرکین کے ساتھ اسے جہنم میں ڈال دوں گا اور جو ان کی ولایت اور امامت کا اقرار کرے اسے بہشت میں جگہ دوں گا، پس ان کی ولایت ایک امانت ہے خلق پر، پس تم میں سے کون اس کو لیتا ہے، تمام آسمان اور زمین اور پہاڑوں نے اس سے انکار کیا اور اپنے پروردگار کی عظمت سے ڈرے، جب خدا نے آدم و حوا کو بہشت میں جگہ دی اور انہوں نے پنچتن پاک اور دیگر ائمہ کے درجے کو دیکھا تو پوچھا کہ خدایا یہ درجہ کس کے لیے ہے؟ خدا نے فرمایا کہ ساق عرق پر نظر کر..... جب آدم و حوا علیہما السلام نے عرش کی طرف دیکھا تو محمد ﷺ اور علی و فاطمہ و حسن و حسین رضی اللہ عنہم جمعین اور ائمہ کے نام دیکھے تو بہت تعجب سے کہا کہ خدایا یہ تیرے بہت ہی محبوب ہیں اور تیرے نزدیک بڑے ہی بزرگ اور شریف ہیں، خدا نے فرمایا کہ حسد کی آنکھ سے ان کو نہ دیکھنا، اور ان کے اس درجے کی جو میرے نزدیک ہے اس کی آرزو نہ کرنا، اور جو یہ مرتبہ بزرگی اور کرامت کا میں نے انہیں دیا ہے اس کے متمنی نہ ہونا اگر ایسا کیا تو میری نافرمانی کرو گے اور ستم گار اور ظالموں میں داخل ہو گے۔ آدم و حوا نے پوچھا الہی کون ہیں ستم گار اور ظالم؟ فرمایا کہ وہ جو ان کی منزلت کا ناحق دعویٰ کریں۔ تب آدم و حوا نے کہا کہ پروردگار ان ظالموں کو جو جگہ تو نے جہنم میں دی ہے وہ بھی ہمیں دکھا، حق تعالیٰ نے دوزخ کو حکم دیا اور جو کچھ انواع و اقسام کے عذاب اور مصیبت ظالموں کے لیے مقرر کیے گئے تھے وہ سب ان پر دوزخ نے ظاہر کیے کہ پائیں ترین درجات جہنم میں ان کی جگہ ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ جہنم سے نکلیں مگر پھر جہنم ان کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور ہر چند ان کے پوست پختہ و سوختہ ہو جاتے ہیں، پھر دوسرے پوست بدل دیے جاتے ہیں تا کہ عذاب سے نجات نہ ملے۔ یہ سب دکھا کر اور یہ سب کچھ فرما کر خدا نے کہا کہ اے آدم و حوا! میرے ان نوروں اور حجتوں کو، یعنی پنچتن پاک اور اماموں کو حسد کی نظر سے نہ دیکھنا ورنہ اپنے جوار سے نکال دوں گا اور تم کو خوار کروں گا، پس وسوسہ دلایا ان کو شیطان نے اور ان

کی منزلت کی آرزو کرنے پر آمادہ کیا، چنانچہ آدم و حوا نے ان کو حسد کی آنکھ سے دیکھا اور اس سبب سے خدا نے ان کو ان پر چھوڑ دیا اور اپنی توفیق اور یاری ان سے اٹھالی۔“

(ترجمہ اردو حیات القلوب جلد ۱ صفحہ ۹۴-۹۵-۹۶)

یہی مختصر مضمون اس طویل حدیث کا ہے جو ہم حاشیہ ❶ میں نقل کرتے ہیں۔ کہاں ہے چشمِ بینا کہ اس حدیث کو دیکھے اور کہاں ہے گوشِ شنوا جو اس روایت کو سنے، کہاں ہے دلِ بینا کہ

❶ و بسند معتبر دیگر از آنحضرت منقول ست کہ حق تعالیٰ خلق کرد روحها پیش از بد نہابد و ہزار سال پس گرانید بلند تر و شریف تر از ہمہ روحها روح محمد ﷺ و علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ و امامان بعد ازین شان صلوة اللہ علیہم اجمعین را پس عرض نمود ارواح ایشاں را بر آسما نہا و زمینہا و کوہها پس نور ایشاں ہمہ را فر و گرفت پس حق تعالیٰ فرمود باسما نہا و زمین و کوہها کہ ایہاں دوستان و اولیا و حجتہا من اند بر خلق من و پیشوایان خلائق من اند فریدم مخلوقے را کہ دوست تر دارم از ایشاں از برائے ایشاں و ہر کہ ایشاں را دوست دارد آفریدہ ام بہشت خود را برائے او و ہر کہ مخالفت و دشمنی کند بایشاں آفریدہ ام آتش جہنم را برائے او پس ہر کہ دعویٰ کند منزلتے را کہ ایشاں نزد من دار ندو محلے کہ ایشاں از عظمت من دارند عذاب کنم اور اعذابے کہ عذاب نکر دہ باشم باں احدے از عالمیاں را و اور ابانہا کہ شرک بمن آورده اند پائیں ترین در کھای جہنم جاہم و ہر کہ اقرار بولایت و امامت ایشاں بکند و ادعا نکند منزلت ایشاں را نزد من و مکان ایشاں را از عظمت من جادہم اور ابایشاں در باغہای بہشت خود و از برائے ایشاں باشد در بہشت آنچه خواہند نزد من و مباح گردانم از برائے ایشاں کرامت خود را و در جوار خود ایشاں را جا دہم و شفیع گردانیم ایشاں را در گناہ گاراں از بند گان و کنیزان من پس ولایت ایشاں امانتی ست نزد خلق من پس کدام یک از شما برمی دار دایں امانت را سنگینہائے آن و دعویٰ می کند آن مرتبہ را کہ ازوست و از برگزید ہائے خلق من ست پس ابا کردند آسمانہا و زمینہا و کوہها از اینکہ این امانت را بردار ند و تر سید نداز عظمت پروردگار خود کہ چنین منزلتے را بنا حق دعویٰ کنند و چنین محل بزرگی برای خود آرزو کنند پس چون حق تعالیٰ آدم و حوا را در بہشت ساکن گردانید گفت بخورید ازین بہشت بسیار و گواہر جا کہ خواہید و نزدیک این درخت مروید یعنی درخت گندم پس خواہید بود از ستم گاراں پس نظر کردند بسوئے منزلت محمد ﷺ و علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ و امامان بعد از ایشاں پس منزلتہائے ایشاں را در بہشت بہترین منزلتہا یافتند پس گفتند پروردگارا این منزلت از برائے کیست حق تعالیٰ فرمود کہ بلند کنید سرہای خود را بسوئے ساق عرش من پس سر بالا کردند و دیدند نام محمد ﷺ و علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ و امامان بعد ازین شان صلوات اللہ علیہم

اس کے مضمون پر غور کریں کہ باوجودیکہ حق تعالیٰ نے آدم و حوا کو پختن پاک اور ائمہ اطہار کی منزلت اور درجے کی خواہش کرنے کے برے نتیجوں سے آگاہ کیا اور باوجودیکہ اس مرتبے کے چاہنے والوں اور اسی عزت کی آرزو کرنے والوں کے لیے جو عذاب مقرر فرمائے ہیں وہ سب ان کو دکھلا دیے اور کوئی دقیقہ اور کوئی درجہ نصیحت کا باقی نہ رکھا، مگر آدم و حوا علیہما السلام نے کچھ نہ سنا اور حسد کرنے سے باز نہ آئے اور باوجود ایسی روایت کے جس سے حضرت آدم و حوا علیہما السلام کا ایسے گناہ کبیرہ کا مرتکب ہونا ثابت ہوتا ہے جس کی سزا مشرکین کے ساتھ پائیں ترین درجات جہنم میں جلنا تھا۔ حضرات شیعہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انبیاء معصوم اور گناہان صغیرہ و کبیرہ سے محفوظ ہیں اور نہ صرف ایسے دعوے پر قناعت کرتے ہیں بلکہ فرماتے ہیں کہ ((در باب

راکہ برساق عرش نوشته بود بنوری از نوار خداوند جبار پس گفتند پروردگار را چه بسیار گرامی اند اهل این منزلت بر تو و چه بسیار محبوبند نزد تو و چه بسیار شریف و بزرگ اند در درگاه تو پس خدا فرمود کہ اگر ایشان نمی بودند من شماہارا خلق نمی کردم ایشان خزینہ داران علم مند و امینان مند بر رازہای من زنہار کہ نظر مکنید بسوی ایشان بدیدہ حسد و آرزو مکنید منزلت ایشان رانزو من و محل ایشان از کرامت من پس باین سبب داخل خواهید شد در نہی و نافرمانی من پس از ستم گاران خواهید بود گفتند پروردگار را کیستند ستم گاران و ظالمان فرمود کہ آنها کہ ادعائے منزلت ایشان می کنند بنا حق گفتند پروردگار پس بنما منزلہائے ظالمان ایشان را در آتش جہنم تا بہ بینم منزلہائے آنہارا چنانچہ منزلہائے آن بزرگواران را در بہشت دیدیم پس حق تعالیٰ امر کرد آتش را کہ ظاہر گردانید جمیع آنچه در آن بود از انواع شد تہاد و عذا بہاد فرمود کہ جای ظالمان ایشان کہ ادعای منزلت بنما یند در پائیں درکات این جہنم ست ہر چند ارادہ کنند کہ بریوں آیند از جہنم بر گردانند ایشان را بسوئے آن و ہرچہ پختہ و سوختہ شود پوستہای ایشان بدل کنند ایشان را پوستہای غیر آنها کہ تابچشد عذاب راے آدم و اے حوا نظر نکنید بسوی نور ہنا و حجتہای من بدیدہ حسد پس شمارا پائیں می فرستم از جوار خود و بر شمامی فرستم خواری خود را پس و سوسہ کرد ایشان را شیطان تا ظاہر گرداند برائے ایشان آنچه پوشیدہ بود از ایشان از عورتہای ایشان و گفت نہی نکرده است شمارا پروردگار شما از این درخت مگر برائے اینکہ نخواست کہ شما در ملک باشید یا ہمیشہ در بہشت باشید و سو گند یاد کرد کہ من از خیر خواہا نشمامی پس ایشان را فریب داد و بریں داشت کہ آرزوے منزلت آنها بکنید پس نظر کردند بسوئے ایشان بدیدئہ حسد پس باین سبب خدا ایشان را بخود گزاشت و یاری و توفیق خود را از ایشان برداشت۔ (حیات القلوب جلد اول مطبوعہ مطبع نول کشور لکھنؤ صفحہ ۴۹ - ۵۰)

عصمت انبیاء آنچه امامیہ مبالغہ می دارند هیچ یک از فرق اسلام آن قدر ندارد.)) اگر عصمت اسی کا نام ہے اور وہ مبالغہ جو ان کی عصمت کے باب میں امامیہ کرتے ہیں یہی ہے وہ تو ایسے دعوے میں سچے اور اپنے قول میں صادق ہیں۔ خدا نہ کرے کہ بچارے سنی انبیاء کی عصمت کے ایسے حامی ہوں اور ان کی عصمت کے حمایت کے پردے میں ان کو ائمہ کا حاسد اور پائیں ترین درجات جہنم کا مستحق ٹھہرائیں۔

ایک اور حدیث سنیں جس سے پوری تصدیق اور تائید آدم و حوا علیہما السلام کے حسد کرنے کی ہوتی ہے اور جس سے تمام مختلف اقوال کا جو کہ بہ نسبت اس درخت کے ہیں جسے آدم نے کھایا آخری اور قطعی فیصلہ بقول امام ہوتا ہے۔ ملا باقر مجلسی حیات القلوب میں فرماتے ہیں:

((بسنند معتبر منقول ست کہ ابو صلت ہروی از امام رضا پر سید کہ یا ابن رسول اللہ مرا خبردہ ازاں درختے کہ آدم و حوا ازاں درخت خوردچہ درخت بود بدرستیکہ مردم اختلاف کردند بعضے روایت کردند کہ آن گندم بود بعضے روایت کردند کہ آن درخت حسد بود، فرمود کہ ہمہ حق ست ابو صلت گنت چگونہ ہمہ حق ست باین ہمہ اختلاف، فرمود کہ اے ابو صلت درخت بہشت انواع میوہا برمی دارد پس آن درخت گندم بود و دران انگور ہم بود و آنها مثل درختان دنیا نیستند و بدرستیکہ چون خدا گرامی داشت و ملائکہ اور اسجدہ کردند اور اداخل بہشت گردانید در خاطر خود گزرانید کہ ایا خلق کردہ ست خدا بشر یکے بہتر از من باشد، چون خدا دانست کہ چہ در خاطر او گزشت ندا کرد اورا کہ سر بلند کن اے آدم و نظر کن بسوی ساق عرش من چون آدم سر بلند کرد دید کہ در ساق عرش نوشتہ ست

کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی بن ابی طالب امیر
المومنین وزوجہ فاطمہ سیدۃ نساء العلمین و الحسن و
الحسین سید اشباب اہل الجنۃ آدم گفت پروردگار کیستند
انہا حق تعالی فرمود کہ ایہا ذریت تو اندوایشان بہتر انداز
توواز جمیع آفریدہای من و اگرایشان نمی بودند نہ تر خلق
میکردم نہ بہشت و دوزخ و نہ آسما و زمین پس۔ زنہار نظر
حسد بسوی ایشان مکن کہ ترا از جوار خود بیرون کنم پس
نظر کرد بسوی آنہا بدیدہ حسد و آرزوی منزلت ایشان کرد
پس مسلط شد شیطان براوتا خورداز میوہ کہ اورازان نہی
کردہ بودند و مسلط شد برحواتا نظر کرد بسوی فاطمہ
بدیدہ حسد تا خوردازان درخت چنانچہ آدم خورد پس خدا
ایشان را از بہشت بیرون کردواز جوار خود بز میں
(فرستاد .) (ترجمہ اردو حیات القلوب جلد ۱ صفحہ ۹۷)

”مستند روایت ہے کہ ابوصلت ہروی نے امام رضا سے پوچھا اے ابن رسول!
بتائیے کہ جو درخت آدم و حوا نے کھایا وہ کیا تھا؟ اس میں لوگوں کا باہمی اختلاف
ہے بعض اسے گیہوں اور بعض حسد کا درخت کہتے ہیں، جواب دیا یہ سب درست
ہے، ابوصلت نے عرض کیا کہ اس اختلاف کے باوجود یہ سب درست کیسے ہو سکتا
ہے؟ فرمایا اے ابوصلت! جنت کا درخت متفرق پھل لاتا ہے وہ درخت اگرچہ
گندم کا تھا لیکن اس میں انگور بھی لگتے تھے اور جنت کے درخت دنیاوی درختوں
کی طرح نہیں ہیں، آدم کو اللہ نے معزز بنایا فرشتوں نے انہیں سجدہ کیا اور وہ
جنت میں رہتے تھے انہیں خیال آیا کہ اللہ نے مجھے سے بہتر بھی کسی آدمی کو پیدا
کیا ہے؟ اللہ نے ان کے دل کا خیال معلوم کرتے ہوئے حکم دیا کہ اے آدم!

سراونچا کرو اور ہمارے عرش کے پایہ کو دیکھو، چنانچہ آدم نے سراٹھا کر دیکھا کہ پایہ عرش پر یہ لکھا تھا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی امیر المؤمنین، حضرت فاطمہ، سردار خواتین اور حسن و حسین اہل جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں۔ یہ دیکھ کر آدم نے پوچھا: اے اللہ! یہ کون ہیں؟ اللہ نے کہا یہ تمہاری اولاد ہیں اور یہ تم سے اور میری دیگر مخلوق سے بھی بہتر ہیں، اگر یہ نہ ہوتے تو میں تمہیں، جنت، دوزخ، اور زمین و آسمان پیدا نہ کرتا، یہ یاد رکھو بھول کر بھی ان پر حسد نہ کرنا ورنہ تمہیں اپنے پاس سے نکال دوں گا۔ غرض کہ آدم نے ان کی قدر و منزلت کو حسد کی نگاہ سے دیکھا اور شیطان نے مسلط ہو کر حوا کو حضرت فاطمہ پر حسد کی آنکھ سے دیکھنے پر ورغلا یا اور شیطان نے بھی حسد کا وہی درخت کھایا جو آدم نے کھایا تھا جس کی سزا میں اللہ نے ان کو جنت سے نکالا اور اپنے پاس سے دور کر کے زمین پر بھیج دیا۔“

اس حدیث کے جواب میں جناب قبلہ و کعبہ جو یہ فرماتے ہیں کہ حسد یہاں غبط کے معنی میں ہے اور ایسا حسد مذموم نہیں ہے، مگر خود جناب والا اس پر یقین نہیں فرماتے، اس لیے فرماتے ہیں کہ ((چرا جائز نباشد کہ حسد آدم ازیں قبیل بودہ باشد و چگونہ چنیں نباشد)) ”کس طرح جائز نہ ہوگا کہ آدم نے اسی طرح کا حسد کیا اور کیوں ایسا نہ ہو۔“ اور اگر حضرت کو یقین بھی ہو کہ یہ تاویل درست ہے تو حدیث کے الفاظ اور اس کا مضمون اس کی تائید نہیں کرتے اور حضرت آدم کا حسد غبطہ نہیں سمجھا جاسکتا بلکہ وہی حسد ہے جو مذموم ہے، اس لیے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے ڈرایا تھا اور ائمہ کی منزلت کی آرزو کرنے پر موردِ عتاب بلکہ ستم گاروں اور ظالموں میں شمار ہونے کا خوف دلایا تھا، مگر پھر بھی آدم نے حسد کیا اور اسی کی سزا پائی۔ کیا قبلہ و کعبہ نے اس وعید کا خیال نہیں فرمایا جو حق تعالیٰ کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے ((فایاک ان تنظر الیہم بعین الحسد فاخر جتک عن جواری والقیافتدخلا من ذلک فی نہی و عصیانی فتکونا من

الظالمین)) ”خبرداران کو حسد کی نگاہ سے مت دیکھنا ورنہ میں تم کو اپنے پڑوس سے نکال دوں گا تو میری نافرمانی کے مرتکب ہو کر ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔“ اور کیا قبلہ و کعبہ نے اس کا بھی لحاظ نہیں فرمایا کہ وہ گناہ جس کے کرنے پر ایسی بھاری سزا کا خوف ان کو دلایا گیا تھا، ان سے سرزد ہوا اور اس کی سزا انہوں نے پائی اور جنت سے نکالے گئے جیسا کہ ان لفظوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ((فنظر الیہم بعین الحسد و تمنی منزلتہم فسلط علیہم الشیطان فنظر الیہم بعین الحسد فخذ لا لذلک)) ”ان کو حسد کی نگاہ سے دیکھا اور ان کے مرتبے کی آرزو کی تو شیطان ان پر مسلط ہو گیا اور حسد کی نگاہ سے دیکھنے کی وجہ سے وہ ذلیل ہوئے۔“ اگر ان کا حسد مباح اور غبطہ تھا تو خدا کا ظالم ہونا ثابت ہوا (و نعوذ باللہ من ذلک) کہ ایک فعل مباح پر جو آدم سے سرزد ہوا ان کو اپنے قرب و جوار سے جدا کر کے بہشت سے نکال کر اپنی وعید کو پورا کیا۔

اس کی تائید ایک اور حدیث سے ہوتی ہے جس کی صحت کا کوئی انکار نہیں کر سکتا اور جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے آدم سے محمد ﷺ اور ائمہ اطہار کی ولایت کا عہد لینا چاہا، مگر انہوں نے نہ کیا بلکہ ان کا ارادہ بھی نہ تھا۔ چنانچہ ابن بابویہ ”علل الشرائع“ کے باب ایک سو ایک میں تحریر فرماتے ہیں:

((العلة التي من اجلها سمى اولو العزم اولى العزم حدثنا ابى عن سعد بن عبد الله بن احمد بن محمد بن عيسى بن على ابن الحكم عن مفضل بن صالح عن جابر بن يزيد عن ابى جعفر فى قول الله عز وجل ولقد عهدنا الى آدم من قبل فنى ولم نجد له عزمًا قال عهد اليه فى محمد والائمة من بعده فترك ولم يكن له عزم فيهم انه هكذا وانما سمى اولو العزم لانهم عهد اليهم محمد واله واوصيا من بعده والمهدى وسيرته فاجمع عزمهم ان ذلك كل والاقرار به))

”اولوالعزم حضرات کو اولوالعزم کہنے کی وجہ امام باقر سے مروی ہے کہ امام نے اللہ تعالیٰ کے قول ﴿وَلَقَدْ عٰهَدْنَا اِلٰى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا﴾ کے بارے میں فرمایا کہ محمد ﷺ اور آپ کے بعد ائمہ کے بارے میں ان (آدم علیہ السلام) سے عہد لیا گیا تھا جس کو انہوں نے چھوڑ دیا ان کا اس سلسلے میں کوئی ارادہ بھی نہ تھا کہ یہ ایسا ہے ان کو ”اولوالعزم“ اس لیے کہتے ہیں کہ ان سے محمد ﷺ اور ان کے بعد اوصیا، مہدی اور ان کی سیرت کا عہد لیا گیا تھا اور ان سب باتوں کا اقرار کرایا گیا تھا۔“ (علل الشرائع صفحہ ۹۲ مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ)

پس جب کہ اس قسم کی حدیثیں انبیاء علیہم السلام کی شان میں حضرات امامیہ کی معتبر کتابوں میں موجود ہیں اور اس پر بھی وہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے معتقد ہیں اور ان حدیثوں کو غیر قطعی الصدور فرماتے ہیں یا ان میں تاویل کرتے ہیں تو یہ انصاف نہیں ہے کہ ہمارے یہاں کی ان چند بے سرو پا حدیثوں سے استدلال کریں جن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمعین کی فضیلت میں فرق آتا ہو۔ اور کیوں ہمارے جوابات اور تاویلات کو جو بہ نسبت ان کے جوابات و تاویلات کے زیادہ قوی اور زیادہ مدلل ہیں ایسی حدیثوں کے متعلق تسلیم نہ کریں۔ مگر بات یہ کہ حضرات امامیہ کو امامت کے مسئلے کی عظمت بڑھانے کے خیال نے مجبور کیا کہ ایسی حدیثیں بیان کریں جس سے امامت مثل نبوت کے سمجھی جائے، خواہ اس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کافر ٹھہریں، خواہ انبیاء علیہم السلام مورد طعن و ملامت سمجھے جائیں۔

انبیاء علیہم السلام کے متعلق اور روایتوں کا ذکر کرنا اس موقع پر میں چھوڑتا ہوں اور خاندان اہل بیت پر جو کچھ اس مسئلے امامت کی بدولت الزام لگائے گئے ہیں انہیں بطور نمونہ کے بیان کرتا ہوں۔

یہ بات معتقدات امامیہ میں سے ہے کہ جو کوئی مدعی یا منکر امامت ہے وہ کافر ہے، اگرچہ علوی یا فاطمی ہو، فقط انکار امامت اس کے کفر کے لیے کافی ہے۔ مگر تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد بنی فاطمہ میں سے کوئی امام ایسا نہیں ہوا جس

کے زمانے میں ان کے بھائیوں اور رشتہ داروں میں سے کسی نہ کسی نے امامت کا دعویٰ نہ کیا ہو یا امامت کو کسی ایک پر منحصر سمجھا ہو اور باہم امام کے اور مدعیان امامت کے کچھ نہ کچھ جھگڑا نہ ہوا ہو، چنانچہ شروع سے، یعنی حضرت امام زین العابدین کے وقت سے اس بات کو ہم ثابت کرتے ہیں۔

امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت امام زین العابدین امام مانے جاتے ہیں مگر محمد بن حنفیہ نے جو حضرت امام زین العابدین کے چچا تھے خود اپنے آپ کو مستحق امامت قرار دیا اور حضرت امام زین العابدین سے کہا کہ بہ نسبت تمہارے میں زیادہ امامت کا استحقاق رکھتا ہوں تم مجھ سے اس بات میں جھگڑا نہ کرو اور مجھے وصی اور امام سمجھو۔ اس قصے کو جو امام زین العابدین رضی اللہ عنہ اور محمد بن حنفیہ کے باہم ہوا ”کتاب الحجۃ“ اصول کافی میں اس طور پر بیان کیا ہے:

((عن ابی جعفر قال لما قتل الحسین ارسل محمد بن الحنفیة الی علی بن الحسین فخلابه فقال له یا بن اخی قد علمت ان رسول اللہ ﷺ دفع الوصیة والامامة من بعده الی امیر المومنین ثم الی الحسن ثم الی الحسین و قد قتل ابوک و صلی علیہ روحہ و لم یوص وانی عمک و صنو ابیک و و لا دتی من علی فی سنی و قدیمی احق بها منک فی حادثک فلا تنازعنی فی الوصیة والامامة ولا تحاجنی))

”امام باقر سے مروی ہے کہ آپ نے کہا کہ جب امام حسین مقتول ہو چکے تو محمد بن حنفیہ نے ایک شخص کو بھیج کر امام زین العابدین کو بلوایا اور ان سے خلوت میں یہ گفتگو کی کہ اے میرے بھتیجے! تم کو معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وصیت و امامت کو اپنے بعد امیر المومنین کو دیا تھا اور آپ کے بعد امام حسن کو اور ان کے بعد امام حسین، کو اور اب تمہارے باپ مقتول ہو چکے، خدا ان سے راضی ہو اور

ان کی روح پر رحمت بھیجے اور انہوں نے کسی شخص خاص کو وصیت نہ فرمائی میں تمہارا چچا ہوں اور تمہارے باپ کے برابر ہوں اور میرا پیدا ہونا بھی علی سے ہے، پس بہ سبب میرے سن و سال اور ان امور کے جو مجھ سے پیشتر ہوئے ہیں جیسے جنگِ جمل و صفین میں شجاعتیں اور تجربہ کاری کے میں تم سے بوجہ تمہاری نئی عمر ہونے کے امامت کے لیے اولیٰ ہوں تو تم مجھ سے وصی و امام ہونے میں مباحثہ مت کرو۔“

((فقال له على بن الحسين يا عم اتق الله ولا تدع ماليس لك بحق انى اعظك ان تكون من الجاهلين ان ابى ياعم صلوة الله عليه اوصى الى قبل ان يتوجه الى العراق و عهدا لى قبل ان يستشهد بساعة وهذا سلاح رسول الله صلى الله عليه واله عندى فلا تتعرض لهذا فانى اخاف عليك نقص العمر و تشتت الحال ان الله جعل الوصية والامامة فى عقب الحسين فاذا ردت ان تعلم ذلك فانطلق بنا الى الحجر الاسود حتى نتحاكموا اليه ونساله عن ذلك قال ابو جعفر و كان الكلام بينهما بمكة))

”یعنی ان سے علی بن حسین علیہ السلام نے فرمایا کہ اے میرے چچا! خدا کے عذاب سے ڈرو اور اپنے لیے ایسی چیز کو دعویٰ مت کرو جس کا تمہیں حق نہیں ہے میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ تم جاہلوں میں سے نہ ہو جاؤ، اے میرے چچا! میرے باپ صلوات اللہ علیہ نے عراق جانے سے پہلے مجھے وصیت کی تھی (یہ اشارہ ہے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو کتب سپرد کرنے اور سفارش کرنے کا، چنانچہ باپ سرسٹھ میں گزر چکا) اور راہِ خدا میں مقتول ہونے سے ایک ساعت قبل وصیت کی تھی اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہتھیار میرے پاس ہیں جو ان کی نشانی ہے، پس تم اس امر کی

طرف توجہ مت کرو، مجھے خوف ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری عمر میں کمی کر دے اور تمہاری حالت کو آخرت میں یا دنیا میں بوجہ مشکل مسائل کے جواب سے عاجز رہنے کے پریشان کر دے، اللہ تعالیٰ نے وصی اور امام ہونا اولاد حسین علیہ السلام میں رکھا ہے (یہ اشارہ آیت اولوالارحام سورہ احزاب کی طرف ہے جس کا بیان حدیث دوم باب چونسٹھ میں ہو چکا) اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تم کو اطمینان ہو جائے تو ہمارے ساتھ حجر اسود کے پاس چلو ہم اس کے سامنے اپنا قصہ بیان کریں اور جو کچھ تم نزاع کرتے ہو اس کا سوال اس سے کریں۔ امام محمد باقر کہتے ہیں کہ یہ گفتگو ان دونوں میں مکہ میں ہوئی تھی۔“

((فانطلقا حتی اتیا الحجر الاسود فقال علی بن الحسین لمحمد بن الحنفیة ابدانت فابتهل الی اللہ عزوجل فسالہ ان ینطق لك الحجر فابتهل محمد فی الدعاء وسال اللہ ثم دعا الحجر فلم یجبہ فقال علی بن الحسین یا عم لو کنت وصیا واما ما لاجابک فقال له محمد فادع اللہ انت یا بن اخی وسالہ فدعا اللہ علی بن الحسین لما اراد ثم قال اسالك بالذی جعل فیک میثاق الانبیاء و میثاق الاوصیاء و میثاق الناس اجمعین لما اخبرتنا من الوصی والامام بعد الحسین بن علی قال فتحرك الحجر حتی کاد ان یزول عن موضعه ثم انطقه اللہ بلسان عربی مبین یقال اللهم ان الوصیة والامامة بعد الحسین بن علی وفاطمة بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ لك قال فانصرف محمد بن علی وهو يتولى علی بن الحسین))

”یعنی دونوں صاحب چل کر حجر اسود کے پاس آئے (ظاہر یہ ہے کہ یہ معاملہ

رات کو ہوا ہوگا تا کہ مخالف مطلع نہ ہوں، اور بعض کا محمد بن حنفیہ کی طرف سے یہ عذر کرنا کہ یہ معارضہ حق ظاہر ہونے کے لیے تھا کچھ ٹھیک نہیں، بقریٰ نے اس کے کہ انہوں نے خلوت میں بھی معارضہ کیا تھا، چنانچہ پہلے بیان ہوا) پس علی بن الحسین نے محمد بن حنفیہ سے کہا کہ تم ابتدا کرو کہ دعویٰ بزرگ تری کرتے ہو، خدا کے سامنے تضرع کرو اور اس سے یہ درخواست کرو کہ تمہارے لیے حجر اسود کو گویا کرے، پھر حجر سے دریافت کرنا۔ محمد بن حنفیہ نے دعا تضرع کر کے خدائے تعالیٰ سے اپنے مطلب کی استدعا کی اس کے بعد حجر کو پکارا تو اس نے کچھ جواب نہ دیا، علی بن حسین نے کہا کہ اے چچا! اگر تم وصی اور امام ہوتے تو تم کو یہ جواب دیتا۔ محمد بن حنفیہ نے ان سے کہا کہ اے بھتیجے! تم بھی خدا سے دعا کرو اور اس سے سوال کرو، پھر علی بن حسین نے جو چاہا خدا سے دعا کی اور حجر سے کہا کہ میں تجھ کو اس ذات کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ جس نے تجھ میں رسولوں کے پیمانے رکھے ہیں جنہوں نے نبوت کے بعد رسالت کو پایا کہ اگر استطاعت رکھیں گے تو ہر سال تیرے پاس آئیں گے تا کہ لوگ مسائل دین کو ان سے لیں اور پیروی ظن کی نہ کریں، اور بعد انبیاء کے ان کے اوصیاء کے پیمانے تجھ میں رکھے ہیں اور اگر استطاعت رکھیں تو ہر سال تیرے پاس آئیں اور تمام لوگوں کے پیمانے کو تجھ میں رکھا ہے کہ جب کبھی مدت العمر میں استطاعت ہو تو ایک بار تیرے پاس آئیں اور مسائل دین کو حاصل کریں اور جو لوگ نہ آئے ہوں ان کو خبر کر دیں تا کہ کوئی احکام الہی میں ظن کی پیروی نہ کریں۔ تو اور کچھ کام مت کر مگر یہ ہم کو بتلا کہ بعد حسین بن علی رضی اللہ عنہ کے وصی اور امام کون ہے۔ امام باقر کہتے ہیں کہ حجر نے حرکت کی اور قریب تھا کہ اپنی جگہ سے نکل پڑے بعد اس کے اس کو اللہ تعالیٰ نے فصیح عربی زبان میں اس طرح گویا کیا کہ وصی و امام ہونا بعد حسین بن علی و پسر فاطمہ بنت رسول اللہ ﷺ کے تمہارے لیے ہے۔ امام باقر کہتے ہیں کہ پھر محمد

بن علی علیہ السلام چلے آئے اور علی بن حسین علیہ السلام کو اپنا امام سمجھتے رہے۔“

(اصول کافی صفحہ ۲۱۸ مطبوعہ لکھنؤ، شانی جلد ۲ صفحہ ۳۱۲ ترجمہ اردو اصول کافی مطبوعہ کراچی)

اس حدیث سے اور کچھ نہیں تو یہ بات بخوبی ثابت ہو گئی کہ محمد بن حنفیہ نے امامت کا دعویٰ کیا تھا اور مجرد دعویٰ کرنا ان کی تکفیر کے لیے کافی ہے۔ اگر بعد اس کے انہوں نے امام زین العابدین کو امام سمجھا تو گویا وہ کفر سے تائب ہوئے مگر تھوڑے دن تک ان کے مرتد رہنے میں تو شک و شبہ نہیں۔

اب زید شہید رضی اللہ عنہ کا حال سنئے۔ ”کتاب الحجہ اصول کافی مسمیٰ بالصافی“ تصنیف ملا خلیل مطبوعہ نولکشور صفحہ ۲۲ میں ابو جعفر محمد بن نعمان احوال بیان کرتے ہیں کہ حضرت زید بن علی بن الحسین رضی اللہ عنہ نے انہیں بلایا اور اس وقت حضرت زید چھپے ہوئے تھے، میں ان کے پاس گیا تب حضرت نے مجھ سے کہا کہ اگر کوئی ہم میں سے خروج کرے تو تم اس کے ساتھ خروج کرو گے؟ میں نے کہا کہ اگر تمہارے باپ یعنی حضرت امام زین العابدین یا تمہارے بھائی امام محمد باقر خروج کریں تو میں ان کا ساتھ دوں گا۔ تب زید شہید نے فرمایا کہ میں ہشام بن عبد الملک خلیفہ بنی امیہ پر خروج کرنا چاہتا ہوں تم میرا ساتھ دو۔ میں نے جواب دیا میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا، اور اس کا سبب یہ ہے کہ اگر دنیا میں امام ”مفترض الطاعۃ“ موجود ہے تو جو شخص کہ تمہارے ساتھ نہ دے ناجی ہے اور جو تمہارے ساتھ خروج کرے وہ ہلاک ہونے والوں میں سے ہے۔ ملا خلیل اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں: ((بنا بر این شق ظاہر ست فسق زید و تابعان او در ان خروج کہ مبنی ست بر مذهب ظاہر الفساد او کہ با داطمی بودن اجتہاد و خروج بہ سیف را شرط امامت می شمردہ .)) غرض کہ حضرت زید شہید کا فاسق ہونا اور ان کا ہشام بن عبد الملک پر خروج کرنا حضرات شیعہ کے پیشواؤں کے نزدیک ایسا گناہ تھا کہ وہ خود ہلاک ہونے والوں میں داخل ہیں اور جس کسی نے ان کا ساتھ دیا اور جو لوگ ان کے ساتھ شہید ہوئے وہ از روئے مذہب اہل تشیع کے اور بہ موجب اس روایت کے

گناہ گار اور ہلاک ہونے والوں میں سمجھے جاتے ہیں۔ اور اس کا سبب صرف یہی ہے کہ حضرت زید نے خروج کیا اور امامت کا دعویٰ فرمایا اور وہ درحقیقت امام معصوم مفترض الطاعت نہ تھے اور ان کا مذہب بھی از روئے اہل تشیع کے فاسد تھا کہ وہ صرف فاطمی ہونا امامت کی شرط نہ مانتے تھے بلکہ اس کے ساتھ اجتہاد اور جہاد کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔

غرض کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرات شیعہ حضرت امام زین العابدین کے اس فرزند کو جس نے بنی امیہ پر خروج کیا اور جس نے شہادت کا درجہ پایا کس منہ سے فاسق اور بوجہ دعویٰ امامت کے کافر سمجھتے ہیں اور امامت کے اصول کو بہ نسبت زید شہید کے زیادہ سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اگر درحقیقت امامت کو تسلیم کرنا ضروری ہے کہ یہ وہ شرائط ہیں جس کو حضرت زید شہید نہیں سمجھے تھے، اور یہ وہ اصول ہیں جو حضرت امام زین العابدین نے اپنے فرزند دل بند زید کو نہیں بتائے تھے اور اسی لیے احوال کا جواب سن کر حضرت زید شہید متعجب ہوئے اور کہنے لگے کہ اے ابو جعفر! میرے باپ کو مجھ سے ایسی محبت تھی کہ میں ان کے ساتھ کھانے پر بیٹھتا تو وہ گرم لقمے کو ٹھنڈا کر کے مجھے کھلاتے تا کہ گرم لقمے سے مجھے تکلیف نہ ہو تو کیا مجھے وہ دوزخ کی آگ سے نہ ڈراتے اور جن چیزوں میں آخرت کی نجات ہے اس کی تجھے خبر کرتے اور مجھ سے نہ کہتے! گویا اس کہنے سے حضرت زید شہید نے احوال کی تکذیب کی اور امامت کے ان اصول کو جسے شیعہ مانتے ہیں باطل ٹھہرایا۔

اب ذرا احوال کا جواب سنئے کہ وہ زید شہید کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اس لیے آپ کے باپ نے آپ کو خبر نہیں دی کہ انہوں نے خوف کیا ہوگا کہ اگر تم ان کی بات کو نہ مانو گے تو داخل جہنم ہو گے اور مجھ سے کہا کہ اگر میں اسے نہ مانوں تو انہیں میرے دوزخ میں جانے کی کیا پروا ہے۔ کافی کی اس روایت کو دیکھ کر جو معتبر ترین کتب احادیث شیعہ سے ہے اور جس کی صحت کا درجہ خدا کی کتاب سے کم نہیں ہے دیکھ کر ہر شخص متعجب ہوگا کہ امام نے اپنے ایک بیٹے کو تو امام بنایا اور اپنا وصی کیا اور اس کو معصوم اور مفترض الطاعت قرار دیا اور غیروں کو اس کی اطاعت کی ترغیب دی اور امامت کے اصول سمجھائے اور دوسرے بیٹے کو نہ صرف ان چیزوں

سے محروم رکھا اور وراثت سے خارج کیا بلکہ امامت کی حقیقت بھی نہ بتلائی اور نہ جس کو وصی قرار دیا تھا اور جو ان کے بعد امام ہونے والا تھا اس کی کیفیت سے آگاہ کیا بلکہ ان کو غفلت میں رکھا اور گمراہی کی راہ پر چلنے کے لیے کوئی روک نہ رکھی جس کے سبب سے ایک بھائی نے دوسرے بھائی کے حقوق کو نہ پہچانا، اس کے حقوق کا خیال نہ رکھا بلکہ خود اس کا مدعی ہوا اور امامت کا دعویٰ کر کے نہ صرف انکار امامت کی وجہ سے بلکہ امامت کے دعوے کے سبب کافر اور مخلدنی النار ہونے کا مستحق ٹھہرایا، اور باوجود اس کے کہ ایسی روایتوں کی تصدیق کرتے ہیں اور ان اصولوں کو مانتے ہیں اور ائمہ کے حقیقی بھائیوں کو اصول امامت سے بے خبر سمجھتے ہیں اور امام کو اپنے بیٹوں سے بھی گویا ایک نوع تقیہ باز قرار دیتے ہیں۔ اور پھر صحابہ رضی اللہ عنہم پر صرف خلافت کی وجہ سے اعتراض کرتے ہیں اور ان کو منکر نص امامت کہتے ہیں، جبکہ حضرت امام زین العابدین نے اپنے فرزند دل بند نور نظر پارہ جگر زید شہید کو امامت کی حقیقت نہ بتائی اور اس کے اصول نہ سمجھائے اور ان کے بعد جو امام ہونے والا تھا اس کی اطاعت کے لیے ہدایت نہ فرمائی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے امامت کا دعویٰ کیا اور خروج فرمایا اور شہید ہوئے جسے موافق اصول شیعوں کے کہنا چاہیے کہ ہلاک ہوئے یا خودکشی کی۔ تو ایسے فرقے سے کیا تعجب ہے کہ وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو انکار خلافت کی وجہ سے کافر اور مرتد کہیں۔

کوئی یہ خیال نہ کرے کہ یہ اعتقاد صرف ابو جعفر احوال کا تھا اور اسی کے نزدیک حضرت زید شہید فاسق تھے بلکہ یہی خیال حضرت امام جعفر صادق کا تھا، اس لیے کہ جب احوال نے حضرت زید سے ملنے اور اس طور گفتگو کرنے کا ذکر امام جعفر صادق سے کیا تو انہوں نے اس کی بہت تعریف کی اور فرمایا کہ تم نے خوب ہی زید کو پکڑا اور آگے پیچھے اور اوپر نیچے کہیں بھی کوئی راہ ان کے نکلنے کی نہ چھوڑی۔ اس سے ظاہر ہے کہ امام جعفر صادق کے نزدیک بھی زید شہید کا خروج ناجائز تھا اور ان کے ساتھی ہلاک ہونے والے اور مستحق دوزخ تھے۔ (نعوذ باللہ من ذلك) جیسا کہ شرح اصول کافی مسمیٰ بالصافی کی کتاب الحجۃ میں ملا خلیل کافی کی حدیث کے ترجمے میں فرماتے ہیں کہ احوال کہتے ہیں:

((پس حج کردم پس حکایت کردم امام جعفر صادق رابسخن زید و آنچه گفته اورا، پس گفت مرا گرفتگی اورا از پیش اوواز پس اوواز جانب دست راست اوواز جانب دست چپ اوواز بالائے سر اوواز یر قد مہای اوونگذاشتی برائے اوراھے کہ بآن راه رود.))

”پھر میں نے حج کیا اور امام جعفر صادق سے زید شہید ابن امام زین العابدین کا ماجرا اور ان کا جواب و سوال کہا، اس پر امام جعفر صادق نے مجھ سے فرمایا کہ تم نے اسے آگے پیچھے، دائیں بائیں اور اونچے سے اس طرح جکڑا کہ اس کے نکلنے کی کوئی راہ نہ چھوڑ۔“

یہ گفتگو جو حضرت زید شہید اور احوال کے درمیان ہوئی یہ اس زمانے کی ہے جب ان کے والد بزرگوار حضرت امام زین العابدین اور ان کے بھائی حضرت امام محمد باقر وفات پا چکے تھے اور امام جعفر صادق ان کے بھیجتے امامت پر تھے۔ اس لیے کہ ملا خلیل کافی میں لکھتے ہیں:

((احول ذکر امام محمد جعفر صادق نکر دو بفرض پدر و برادر اکتفا کرد برای تقیہ و خوف افشاچہ بر امام رفتہ گرفت گیرے نیست و خروج زید در صدر و بست و یک ہجری و وہ و انتقال امام محمد باقر از دار دنیا در صد و چہار دہ ہجری بودہ.))

”ابو جعفر احوال نے صرف والد و برادر کے الفاظ ادا کیے ہیں افشائے راز کے خوف اور تقیہ کے بہ سبب امام محمد جعفر صادق کا ذکر نہیں کیا، کیوں کہ گزشتہ امام پر کسی قسم کی گرفت ناجائز ہے۔ زید شہید نے ۱۲۱ میں خروج کیا ہے اور امام محمد باقر نے ۱۱۴ء میں انتقال فرمایا ہے۔“

اس سے تو صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ امام جعفر صادق کی امامت کے منکر تھے لیکن

ایک دوسری روایت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت زید شہید اپنے بھائی امام محمد باقر کی بھی امامت کے منکر تھے اور نہ صرف منکر تھے بلکہ جو شرائط امام میں ان کے نزدیک ہونی چاہئیں وہ ان میں نہ تھیں اور اس امر کو کچھ انہوں نے پوشیدہ نہ رکھا تھا بلکہ خود امام محمد باقر نے خفا ہو کر ان کا امامت کی قابلیت نہ رکھنا ان کے منہ پر کہہ دیا تھا، جیسا کہ کافی میں لکھا ہے کہ حضرت زید شہید اپنے بھائی امام محمد باقر کے پاس آئے اور ان کے پاس چند خطوط کوفیوں کے تھے جس میں لکھا تھا کہ آپ کوفہ کو آئیے، آپ کے لیے لشکر جمع ہے اور بنی امیہ پر خروج کیجیے۔ حضرت امام محمد باقر نے کہا کہ یہ خطوط ابتدا میں کوفیوں کی طرف سے ہمارے حق کی پہچان کے، اور ہماری قرابت کی جو رسول اللہ سے ہے اور ہماری دوستی اور اطاعت کے فرض ہونے کی جیسا کہ وہ خدا کی کتاب میں پاتے ہیں۔ پھر یہ بھی امام باقر نے فرمایا کہ پیغمبر کے تمام رشتہ داروں میں سے امام مفترض الطاعت ایک ہی ہوتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ صبر و تقیہ کا حکم دیتا ہے ان کو اس زمانے میں جب کہ ظالموں کا تسلط ہو اور امام حسین کے بعد سے تا امام مہدی آخر الزمان تمام امام مامور بہ صبر ہیں اور خدا نے ان کے لیے ایک وقت مقرر کیا ہے اور مہدی موعود کے زمانے تک صبر لازم ہے۔

((پس باید کہ سبک عقل نکند البتہ ترا آں جمعے کہ یقین بر بوبیت رب العالمین ندارند و بدرستی کہ ایشاں اصلا فائده نمی رسانند در دفع از تو عذابی را از جانب اللہ تعالیٰ کہ در قیامت باشند برائے اینکہ اگر امام نبودی چرا خروج کردی، پس پیش از وقت کارے رامکن و پیش گیری مکن در حکم بچیزے اللہ تعالیٰ را کہ عاجز کند ترا محنت پس بیندازد ترا.))

”تمہاری عقل کو وہ لوگ مار رہے ہیں جو اللہ کی ربوبیت کا یقین نہیں رکھتے اور یہ لوگ روز محشر اللہ کا عذاب تم سے دور نہ کر سکیں گے اور تمہیں مطلق فائدہ نہ پہنچا

سکیں گے اور جب کہ تم امام ہی نہیں ہو تو تم نے خروج کیوں کیا۔ قبل از وقت کوئی کام نہ کرو اور اللہ نے جن چیزوں میں عاجز بنایا ہے ان میں پیش قدمی نہ کرو اور محنت و کوشش کر کے خود کو پست نہ بناؤ۔“

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت امام باقر حضرت زید کے ارادہ کو نہ صرف برا سمجھتے تھے بلکہ اسے عذاب الہی جانتے تھے اور امام نہ ہونے کی حالت میں ان کے خروج کو قیامت کے دن مستحق ذلت اور سزا سمجھتے تھے اور نہ صرف سمجھتے تھے بلکہ انہوں نے صاف صاف اپنے بھائی زید سے کہہ بھی دیا، یہ سن کر حضرت زید غضب ناک ہوئے اور اپنے بھائی سے کہنے لگے کہ تم امام نہیں ہو بلکہ میں امام ہوں۔ کیونکہ تلوار لے کر خروج کرنا امامت کی شرطوں میں سے ایک شرط ہے جو مجھ میں ہے نہ کہ تم میں۔ اور امام وہ نہیں ہے جو گھر میں بیٹھا رہے اور اپنے اوپر پردے لٹکائے رکھے اور جہاد سے بچتا رہے، بلکہ امام وہ ہے کہ جو اپنے ملک کو ضرر سے بچائے اور خدا کی راہ میں جہاد کرے، چنانچہ کافی کے الفاظ یہ ہیں ((فغضب زید عند ذلك ثم قال ليس الامام من جلس في بيته وارخ سترة و تبطاً عن الجهاد و لكن الامام من منع حوضه و جاهد في سبيل الله حق جهاده و رفع عن رعيته و ذب عن حریمه .))

اور ملا خلیل جو اس کی شرح میں فرماتے ہیں اس کے یہ الفاظ ہیں:
 ((پس غضب ناک شد زید نزد آں اما باینکہ تو امام نیستی و من امامم بعد ازاں برائے این کہ خروج بہ سیف یکے از شروط امامت است آن در مت ست نہ در تو۔ گفت نیست امام از جمله ما اهل بیت رسول کسیکہ نشستہ خانہ خود و آویخت پردہ خود را و کارہ شد از جہاد و امر بترک جہاد کرد و لیکن امام از ما کسی ست کہ نگہداری کرد از ضرر مملکت خود را و جہاد کرد در راہ اللہ تعالیٰ و دفع کرد

ضررا از رعیت خود دوراند ضررا از نگاہ داشتن خود .))
 غرضیکہ زید نے امام محمد باقر پر غصہ کرتے ہوئے کہا کہ سنو، تم امام نہیں ہو بلکہ
 میں امام ہوں کیوں کہ تلوار لے کر خروج کرنا امامت کی ایک شرط ہے جو مجھ
 میں ہے تم میں نہیں، نیز کہا: وہ شخص ہم اہل بیت میں سے امام نہیں ہو سکتا جو
 اپنے گھر میں پردے میں بیٹھا رہے اور جہاد ترک کرتے ہوئے دوسروں کو بھی
 ترک جہاد کا حکم دے، ہم میں سے امام وہ شخص ہے جو اپنے ملک کو نقصانات
 سے محفوظ رکھے، اللہ کی راہ میں جہاد کرے اور رعایا سے ضرر دور کرنے کو پیش
 نظر رکھے۔“

اس پر امام باقر نے فرمایا کہ اے میرے بھائی! کیا تم اپنے علم یقینی سے اس بات کو
 جانتے ہو کہ تم میں امامت کے وہ خواص ہیں جس کو تم نے اپنے نفس سے منسوب کیا ہے۔ اگر
 ہے تو خدا کی کتاب یا سنت پیغمبر سے اس کو پیش کرو، یا پچھلے زمانے میں کوئی امام ایسا گزرا ہو
 کہ اس کی صفات تمہارے موافق ہوں اور یہ کہ جب تک تلوار لے کر اس نے خروج نہ کیا ہو تو
 وہ امام نہ ہو اور اس حالت میں زمانہ امام سے خالی رہا ہو اگر خروج بالسیف امام کے لیے
 ضروری ہے تو لازم آتا ہے کہ امام زین العابدین امام نہ ہوں یا اوائل رسالت میں جب کہ
 پیغمبر خدا ﷺ مامور بہ جہاد نہ تھے اور غار میں پوشیدہ ہوئے تھے رسول نہ ہوں۔ چنانچہ شرح
 کافی کی اصل عبارت یہ ہے:

((پس گفت امام محمد باقر ایامی شناسی بعلم یقینی اے
 برادر من از خودت چیزے را آنچہ نسبت دادی نفس
 خود را بوی آنکہ خواص امام باشد پس آوری برای چیز
 گواہی یقینی را از کتاب اللہ تعالیٰ در ایام گزشتہ کسے را امام
 کردہ باشد کہ صفات او موافق صفات تو باشد مثل آنکہ
 جہل با حکام الہی داشتہ باشند و اجتہاد، و مثل آنکہ

مادامیکہ خروج بہ سیف نکرده باشد امام نبا شدوز مانہ
 خالی از امام باشد و چون خروج کند امام شود پس لازم آید
 کہ علی بن الحسین امام نبا نشدو ایضا رسول علیہ السلام
 در اوائل رسالت ماموبجہاد نبوددر غار پناہ شد امام نبا
 شد۔ وایضا مملکت کل روی زمین ست و جہاد کل از
 رسول واقع نشد و امثال اینہاں در انبیای سابق واصیای
 ایشان بسیارست چہ بدرستیکہ اللہ تعالیٰ حلال کردہ جنس
 حلال راو حرام کردہ جنس حرام راو در محکمت کتاب
 خود لازم کردہ لازمی چند راوزدہ مثلے چند را برائے ائمہ
 حق وائمہ باطل و طریقت خود کردہ درائمہ حق و باطل
 طریقتے چند راونگردانیدہ امامے را کہ ایستادہ ست با مارت
 اللہ تعالیٰ در شبہ در آنچه نہی از اختلاف و پیروی ظن
 هست چہ در ان صریح ست در اینکہ مجتہد امام نیست تا
 مبادا کہ سبقت گیرد بر اللہ تعالیٰ بکارے پیش ازاں جائے تا آن
 کار باجہاد کندر راہ او پیش از حلول اہل آن
 جہاد..... انتہی)) (شرح اصول کافی صفحہ ۴۳۹-۴۵۰)

”پھر امام محمد باقر نے کہا کہ اے بھائی! کیا تم اپنے علم یقینی سے یہ بات جانتے ہو
 کہ تم میں امامت کی وہ خصوصیات ہیں جو تمہاری ذات میں موجود ہیں بصورت
 اثبات اپنے اس حق کے ثبوت میں حکم قرآن یا سنت نبوی یا کوئی ایسا واقعہ پیش کرو
 کہ اللہ نے گزشتہ زمانے میں تمہارے مماثل صفات والے کو امام بنایا ہو، مثلاً: یہ
 کہ احکام الہی سے ناواقف ہونے کے باوجود وہ خود اجتہاد کرتا ہو اور یا یہ کہ جب
 تک اس نے تلوار لے کر خروج نہ کیا ہو وہ امام نہ مانا گیا ہو اور زمانہ امامت سے

خالی رہا ہو اور جب یہ شخص کرے تو امام ثابت ہو جائے۔ اس نظریے کے تحت تو یہ لازم آتا ہے کہ علی بن حسین، یعنی امام زین العابدین امام نہ تھے اور رسول خدا ﷺ جو ابتدائی رسالت کے زمانے مامور بہ جہاد نہ تھے بلکہ غار حرا میں چھپے ہوئے تھے امام نہ تھے اور یاد رکھو کہ امام کی ملکیت کل روی زمین ہے اور رسول نے پورا جہاد نہیں کیا، اس قسم کی دوسری مثالیں گزشتہ انبیاء اور اوصیاء کی بہ کثرت موجود ہیں۔ اور اللہ نے جنس حلال کو حلال اور حرام کو حرام کر کے قرآن کریم میں محکم فرمایا اور ائمہ حق و باطل کی مثالیں دی ہیں اور ان کے طریقے بیان کیے ہیں اور اللہ نے اپنی نگرانی میں امام کو اپنی امارت دی ہے، اور یاد رکھو کہ مجتہد اس وقت امام نہیں بن سکتا ہے جبکہ اللہ اس سے پہلے کچھ کام نہ کرا لے اور پھر وہ راہِ الہی میں کوشش کرے۔“

پھر اور بہت سی باتوں اور بہت سی نصیحتوں کے بعد امام باقر نے فرمایا کہ کیا تم ابو بکر و عمرو عثمان رضی اللہ عنہم کے طریقوں کی تجدید کرنا چاہتے ہو جنہوں نے رسول خدا ﷺ کی مخالفت کی اور اپنی رائے اور اجتہاد کے تابع ہوئے اور خلافت کا دعویٰ کیا بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی دلیل خدا کی جانب سے یا کوئی وصیت رسول کی طرف سے ہوتی، اور پھر فرمایا کہ اے میرے بھائی! میں خدا سے تجھے پناہ دلاتا ہوں کہ تو کناسہ میں سولی دیا جائے، چنانچہ اصل عبارت کافی کی یہ ہے: ((اتریدیا اخی ان تحیی ملة قوم قد کفر و ابایات اللہ و عصوا رسوله و اتبعوا ہوائہم بغیر ہدی من اللہ و ادعو الخلافة بلا برہان من اللہ و لا ہدی من رسول اللہ اعینک باللہ یا اخی ان تکون ہذا المصلوب بالکناسۃ ثم رفضت عیناہ و سالت دموعہ ثم قال اللہ بیننا و بین من ہتک سترتنا و جحدنا حقنا و افشی سترتنا و نسبنا الی غیر جدنا و قال فینا مالہ نقلہ فی انفسنا)) اور اس کا ترجمہ ملا خلیل صاحب یہ فرماتے ہیں:

((ایامی خواہی کی تجدید کنی طریقت جمعے را کہ منکر

شدند آیات محکمت اللہ تعالیٰ را کہ در انہائی از اختلاف و پیروی ظن ہست مراد ابوبکر و عمر و عثمان و سائر ائمہ ضلالت ست کہ مخالفت رسول اور او تابع شدند رایہای واجتہادات خود رایہ راہنمائی از جانب اللہ تعالیٰ و دعویٰ کردند خلافت رسول رایہ برہانے از جانب اللہ تعالیٰ ونہ وصیتے از جانب رسول او پناہ می دہم تر اباللہ تعالیٰ اے برادر م از اینکہ واقع در روزگار امام محمد باقر نمی شود چہ در روزگار امامت امام جعفر صادق شد بعد ازاں اشک داد چشم امام محمد باقر و جاری شد اشکهای او بعد ازاں گفت اللہ تعالیٰ قاضی ست میان او و میان جمے کہ دریدند پردہ مارا۔ بیان شرک ائمہ ضلالت و جمے کہ برارہ ایشان می رونده باشند و منکر دانستہ شدند حق مارا کہ اطاعت باشند خواه در امر بہ صبر و تقیہ و خواه در غیر آن و فاش کردند راز مارا کہ دعویٰ امامت باشد و نسبت دادند مارا بغیر مرتبہ بزرگی ما باین معنی کہ باعث این شدند کہ در سال صد و چہل ہجری اظہار دولت حق نشود چنانچہ می آید در حدیث اول باب ہشتاد و یکم و گفتند در ما چیزے را کہ نگفتیم در خود اشارت باین ست کہ خیال ایشان این است کہ ما با وجود افشای سرارادہ خروج داریم و این باعث آزار مامی شود و حال آنکہ ما ارادہ آن نداریم تا وقت ظہور مہدی موعود۔))

”کیا تمہاری خواہش یہ ہے کہ تم ان لوگوں کی ملت کی تجدید کرو جو آیات الہی کے

منکر ہیں اور اپنے خیال و ظن سے آیت الہی کو کام میں لاتے ہیں، یعنی ابوبکر، عمر، عثمان اور دیگر ائمہ ضلالت و گمراہ جنہوں نے رسول کی مخالفت کی اور اپنی رایوں کی پیروی کی اور بغیر اجازت الہی خود ہی اجتہاد کیا اور اللہ کی دلیل کے بغیر خلافت رسول کے مدعی ہو گئے جبکہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے خلیفہ بنانے کی کوئی وصیت نہیں کی، اے بھائی! اللہ سے پناہ مانگو، جبکہ امام محمد باقر نہ ہوں گے اور امام جعفر صادق امام ہوں گے اس کے بعد امام محمد باقر نے روتے ہوئے کہا ہمارے اور ان کے درمیان اللہ فیصلہ کرے گا جنہوں نے ہماری پردہ دری کی اور ائمہ گمراہی و شرک کے پیشرو ہیں اور ہمارے حقوق کا انکار کرتے ہیں ہر حال میں خواہ صبر ہو یا تقیہ ہو۔ آہ! انہوں نے ہمارا راز فاش کر دیا اور خود امامت کے مدعی بن بیٹھے اور مرتبہ بزرگی حاصل کیے بغیر ہم کو بزرگی سے علیحدہ کرنا چاہتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ سن ۱۴۰ میں حق کی حکومت نہ ہوگی، جیسا کہ حدیث اول کے باب ۸۱ میں ہے اور ہمارے متعلق ایسی باتیں کہیں جو ہم نے نہیں کہی تھیں، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا خیال ہے کہ افشائے راز کے باوجود ہمارا ارادہ خروج کا ہے جو ہمارے آزار کا سبب بھی ہے، حالانکہ امام مہدی کے ظہور تک ہمارا خروج کا ارادہ نہیں ہے۔“

یہ کہہ کر امام محمد باقر کی آنکھوں سے پانی جاری ہونے لگا اور فرمانے لگے کہ خدا فیصلہ کرنے والا ہے ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان جنہوں نے ہماری پردہ دری کی اور ہمارے حق و اطاعت جو ان پر فرض ہیں اس کے منکر ہیں یا صبر و تقیہ جس کا حکم ہے اس کے سبب سے ہم پر انکار کرتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت اس بات کا ہوگا کہ حضرت زید شہید مدعی امامت تھے اور امام محمد باقر اپنے بھائی زید کو دعویٰ امامت اور خروج بالسیف کے سبب سے قیامت کے دن مستحق عذاب الہی جانتے تھے اور انہیں ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے طریقوں کی تجدید کرنے والا اور منجملہ ائمہ ضلالت سمجھتے تھے۔

اب یہ امر دیکھنا ہے کہ حضرات علمائے امامیہ حضرت زید شہید کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے ہیں اور اس دعویٰ امامت کی نسبت جو انہوں نے کیا تھا کیا فرماتے ہیں، اور باوجود اس دعویٰ کے ان کو فسق اور کفر سے کیوں کر بچاتے ہیں۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ عموماً حضرات شیعہ کا اعتقاد حضرت زید شہید کی نسبت اچھا ہے اور ان کو حضرت امام باقر کے بعد افضل اور صاحب ورع و عبادت سمجھتے ہیں اور دعویٰ امامت کی نسبت فرماتے ہیں کہ انہوں نے اپنے لیے نہیں کیا بلکہ وہ اپنے بھائی امام محمد باقر ہی کو امام سمجھتے تھے اور ان کا خروج اپنی امامت کے لیے نہ تھا بلکہ اس کا سبب ہی دوسرا تھا۔ جناب مولانا مولوی دلدار علی صاحب تحفہ اثنا عشریہ کے جواب میں جس میں زید شہید کے دعویٰ امامت کا ذکر ہے، فرماتے ہیں:

((شیخ مفید در ارشاد خود می فرماید کہ زید بن علی بعد امام باقر افضل برادران و صاحب ورع و عبادت و فقاہت بودہ و بہ سخاوت و شجاعت موصوف و خروج بہ شمشیر نمودہ و امر بہ معروف و نہی از منکر کرد و طلب خون جناب سید الشهداء می نمود، و بسیارے از شیعیان اعتقاد با امامت او داشتند و نشا این اعتقاد آنها این بود کہ چون دیدند کہ او خروج بہ شمشیر نمود و دعویٰ می کرد بطرف الرضاء من آل محمد گمان کردند کہ مراد او ازین صرف نفس خودست و چنین نبود چہ عارف بود باین کہ منصب امامت حق برادر بزرگوار او جناب امام محمد باقر است و او وصیت کردہ بود در آخر وقت بہ حضرت صادق و سبب خروج او این بود کہ روزے پیش ہشام بن عبدالملک کہ خلیفہ وقت بود رفت، خلیفہ امر نمود باہل شام کی در مجلس او حاضر بودند کہ چنان در مجلس تنگی نمائید کہ

زید تا پیش خلیفہ نرسد زید گفت کہ هیچ يك از بندگان خدا فوق این نیست کہ وصیت بہ تقوی نماید و من ترا وصیت می کنم بہ پرهیز گاری ، ہشام گفت کہ تو خود را از اہل خلافت می پنداری و حالانکہ تو ازام ولدی ، زید گفت مادر جناب حضرت اسمعیل ام ولد بودو حال اینکہ مرتبہ نبوت نزدیک خدا فوق تر از مرتبہ خلافت ست ، و چون ہشام زید را از لشکر خود بیرون کرد زید در کوفہ آمدہ خروج نمود و مردمان بسیار باو بیعت کردند و آخر نقض بیعت نمودند و اوشہید شد ، چون خبر شہادت اور بجناب صادق رسید بسیار غمگین و ملول گردید و کسانیکہ بازید شہید شدہ بودند لك دینار بورثہ آنها حضرت صادق از مال خود تقسیم نمود۔ انتہی۔ و چون عبدالکاذب الغادر میان ہشام بن الحکم و ہشام بن عبدالملک امتیاز ننمودہ این مناظرہ را بر مناظرہ امامت رجما بالغیب حمل نمودہ.....)) انتہی .

”شیخ مفید کا ارشاد ہے کہ امام محمد باقر کے بعد زید بن علی اپنے بھائیوں کی بہ نسبت صاحب تقویٰ و عبادت تھے، بڑے سخی اور بہادر تھے، شمشیر بہ کف ہو کر خروج کیا امر معروف اور نہی منکر کرتے تھے اور حضرت سید الشہداء کا خون بہا مانگتے تھے، اکثر شیعہ ان کی امامت کے معتقد ہیں اور اس اعتقاد کا منشا و مطلب یہ تھا کہ جب انہوں نے زید شہید کو تلوار لیے خروج کرتے اور آل محمد کی جانب سے امامت کا مدعی دیکھا تو سمجھے کہ اس سے ان کا صرف نفس مراد ہے حالانکہ وہ نفس پرور نہ تھے، بلکہ اس امر کے اقراری تھے کہ امامت کا حق ان کے بڑے بھائی امام محمد باقر کو ہے جو مرتے وقت اپنے بیٹے محمد صادق کی امامت کی وصیت کر گئے تھے،

زید کے خروج کرنے کا سبب یہ ہے کہ وہ ایک دن خلیفہ وقت ہشام بن عبد الملک کے پاس گئے اور خلیفہ نے شامیوں کو حکم دیا کہ اس طرح مجلس میں تنگی پیدا کریں اور جمع ہو جائیں کہ زید اس کے پاس نہ پہنچنے پائیں، اس پر زید نے کہا کہ کوئی بندہ خدا ایسا نہیں ہے جو خوف الہی کا حکم دے اور اے خلیفہ! میں تمہیں پرہیز گاری کا حکم دیتا ہوں، خلیفہ نے جواباً کہا: اے زید! تم اپنے کو خلافت کا اہل سمجھتے ہو حالانکہ تم لونڈی زادہ ہو۔ اس پر زید نے کہا کہ حضرت اسمعیل کی جانب میں تو لونڈی زادہ ہوں اور حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک خلافت کی بہ نسبت نبوت کا درجہ بلند ہے، پھر جب ہشام نے اپنے لشکر سے زید کو باہر نکال دیا تو زید نے کوفہ میں آکر خروج کیا، اکثر لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی مگر آخر میں بیعت توڑ دی اور پھر زید شہید ہو گئے، جب ان کی شہادت کی اطلاع امام جعفر صادق کو ملی تو وہ سخت غمگین اور ملول ہوئے اور جو لوگ زید کے ساتھ شہید ہوئے تھے ان کے ورثا کو ایک لاکھ اشرفیاں امام صادق نے اپنی دولت میں سے تقسیم کیں اور چونکہ عبد الکاذب بے وفانے ہشام بن حکم اور ہشام بن عبد الملک میں کوئی فرق و امتیاز نہیں برتا، اس لیے مناظرہ کو مناظرہ امامت کی حیثیت سے بغیر علم و واقفیت کے محمول کیا ہے۔“

اگرچہ جناب قبلہ و کعبہ نے حضرت زید شہید کو کفر سے بچانے کے لیے بہت کوشش کی مگر وہ اس بات کو ثابت کرنے میں کامیاب نہ ہوئے کہ حضرت زید شہید نے امامت کا دعویٰ نہ کیا تھا اور نہ اس امر کے ثبوت پیش کرنے میں کہ حضرت زید شہید اور امام محمد باقر کو امام سمجھتے تھے، بلکہ ان روایتوں کے دیکھنے کے بعد جو ہم نے اصول کافی سے اوپر نقل کی ہیں قبلہ کعبہ کی تحریر پر ((الغریق یتشبث بکل حشیش)) ”ڈوبنے والا تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔“ صادق آتا ہے اور حضرت کا باوجود فائز ہونے درجہ امامت پر منکر امامت نہ سمجھنا ایک ایسا قول ہے جو ان تاریخی واقعات سے جو پایہ ثبوت پر پہنچے ہوئے ہیں مطابق نہیں ہو سکتا۔ اور ایک زید شہید

پر کیا منحصر ہے کون سا امام ہے جس کی اولاد نے اپنے لیے امامت کا دعویٰ نہیں کیا۔ چنانچہ زید شہید کے بعد ان کے بیٹے یحییٰ نے اور امام موسیٰ کاظم کے بعد ان کے فرزند ابراہیم اور جعفر نے اور حسن بن حسن ثنی اور ان کے بیٹے عبداللہ اور ان کے فرزند محمد ملقب بہ نفس زکیہ اور ابراہیم بن عبداللہ اوزکریا ابن محمد باقر اور محمد بن عبداللہ بن الحسین بن الحسن اور محمد بن القاسم بن الحسن اور یحییٰ بن عمر وغیرہ نے ائمہ کرام کی اولاد میں سے امامت کا دعویٰ کیا اور اکثر نے خروج فرمایا اور شہید ہوئے۔

کیا ان تاریخی واقعات کی تکذیب ہو سکتی ہے بلکہ وہ اختلاف جو امامت کے مسئلے کی وجہ سے پڑا اور جس کے سبب سے شیعوں کے بہت سے فرقے ہو گئے وہ سب اس بات پر شاہد ہیں کہ ائمہ علیہم السلام کی اولاد نے کبھی امامت کو اصول دین سے نہیں سمجھا اور نہ منکر امامت کو مثل منکر نبوت کے خیال کیا۔ اگر ائمہ کرام کی اولاد کا یہ عقیدہ ہوتا کہ امامت مثل نبوت کے ہے اور ہر امام نے اپنے بعد ایک ہی کو اپنی اولاد میں سے امام بنایا اور اسی کے لیے امامت کی وصیت فرمائی اور ہر ایک امام اپنی اولاد کو اس وصیت سے اطلاع دیتا رہتا اور منکر امامت کو مثل منکر نبوت کے کا فر ٹھہراتا تو کیا ممکن تھا کہ ائمہ کرام کی اولاد اطہار اپنے باپ کی وصیت نہ مانتی اور امام برحق کو امام برحق نہ سمجھتی اور خود امامت کا دعویٰ کرتی۔ وہ اختلاف جو امامت کے مسئلے سے شیعوں میں ہوا ہے اور جس سے بہت سے فرقے اس مذہب میں پیدا ہو گئے ہیں نہ ہوتا اور نہ یہ مختلف فرقے پیدا ہوتے؛ حالانکہ اختلاف کی یہ کیفیت ہے کہ ایک فرقہ یہ کہتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے بعد ان کے بیٹے محمد بن حنفیہ امام ہیں اور یہ کیسا نیہ فرقہ ہے۔ پھر محمد بن حنفیہ کے بارے میں اختلاف ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ ان کا انتقال ہی نہیں ہوا اور بعض ان کے انتقال کے قائل ہیں، مگر یہ کہتے ہیں کہ امامت ان کے بیٹے ابو ہاشم کو منتقل ہوئی۔ اور جو دادا نے فرمایا ہے کہ تم میں سے ساتواں امام قائم ہے اور وہ صاحب توریت کے ہم نام ہوگا۔

غرض کہ اس طرح اس مسئلہ امامت میں صرف اس وجہ سے اختلاف ہے کہ کسی امام

کی اولاد نے بالاتفاق کسی خاص امام کی امامت پر اتفاق اور امامت کے دعوے سے احتراز نہیں کیا۔ صرف حضرات اثنا عشری حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لے کر حضرت امام مہدی علیہ السلام تک بارہ اماموں کے معتقد ہیں اور ان کے عقیدے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ باقی اور امام زادے جنہوں نے امامت کا دعویٰ کیا یا امام برحق کو امام نہیں مانا وہ سب کے سب نعوذ باللہ کافر اور مخلد فی النار ہیں۔



ضمیمہ مسئلہ امامت

(از..... شیخ محمد فراست)

گزشتہ صفحات میں مولف آیاتِ بینات رحمۃ اللہ علیہ نے ثابت کیا ہے کہ شیعوں کے خود ساختہ عقیدہ امامت ((منصوص من اللہ و مفترض الطاعة)) سے خود خاندانِ رسالت کے افراد بھی بے خبر تھے اور انہوں نے ہمیشہ اپنے قول و عمل سے ان نظریوں کو غلط ثابت کیا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے بطور ثبات اصول کافی مطبوعہ نولکشور لکھنؤ کے باب ۷۹ صفحہ ۲۱۸ سے اس مکالمے کو پیش کیا ہے جو واقعہ کربلا کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرزند محمد حنفیہؓ اور ان کے بھتیجے حضرت علی بن حسین (زین العابدینؓ) کے بیچ مسئلہ امامت پر مکہ میں ہوا تھا۔ اس مکالمے سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ محمد حنفیہؓ امامت کی حقیقت سے بالکل بے خبر تھے، انہیں یہ تک نہیں معلوم تھا کہ وصیت اور امامت کو اللہ نے اولادِ حسین میں قرار دیا ہے۔

قاضی نور اللہ شوستری نے ”مجالس المؤمنین“ میں ”کتاب الخراج“ کے حوالہ سے اس واقعہ کی یہ تاویل کی ہے:

”چونکہ چند افراد نے حضرت محمد بن حنفیہؓ کو امام سمجھنا شروع کر دیا تھا، اس لیے انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ اس معاملے کا فیصلہ برسر عام کرا دیا جائے تاکہ کوئی شخص گمراہی میں مبتلا نہ ہو سکے۔“

(ترجمہ اردو مجالس المؤمنین صفحہ ۴۷۰ ناشر اکبر حسین جیواتی ٹرسٹ، کراچی)

قاضی کی یہ تاویل نہ صرف یہ کہ خلاف واقعہ اور رکیک ہے بلکہ تعجب خیز بھی ہے جو ان جیسے فاضل کو زیب نہیں دیتی۔ ارے جناب! اس روایت میں اس طرح کی کسی تاویل کی

گنجائش ہی کہاں ہے، اس تاویل کا جواب تو خود روایت میں موجود ہے کہ یہ گفتگو چچا اور بھتیجے کے درمیان تنہائی میں ہوئی تھی جہاں بھتیجے صاحبِ امامت کے مسئلہ میں اپنے چچا کے عقائد کی اصلاح فرما رہے تھے، وہاں دوسرے افراد کہاں موجود تھے؟ دورانِ گفتگو جب چچا نے بھتیجے سے کہا کہ:

((انا عمك و صنوا بيك و و لادتي من على عليه السلام فى سنى و قديمى احق بهامك فى حدائك فلا تنازعنى فى الوصية والامامة ولا تحاجنى فقال له على بن الحسين عليه السلام يا عم اتق الله ولا تدعى ما ليس لك بحق انى اعطك ان تكون من الجاهلين .)) (الحجة صفحہ ۳۱۴)

”میں تمہارا چچا ہوں تمہارے باپ کا بھائی ہوں اور علی کا بیٹا، بلحاظ عمر تم سے بڑا ہوں، پس امر وصیت اور امر امامت میں مجھ سے جھگڑا نہ کرو۔ تو حضرت علی بن الحسین نے فرمایا: اے چچا! اللہ سے ڈرو اور اس چیز کا دعویٰ نہ کرو جس کے تم حق دار نہیں ہو، میں نصیحت کرتا ہوں کہ تم جاہلوں میں سے نہ بنو۔“

روایت کے آخر میں یہ بھی ہے کہ حجر اسود کی گواہی سے محمد حنفیہ عقیدہ امامت کے قائل ہو گئے تھے، مگر اس ضمیمہ سے کچھ فرق نہیں پڑتا، کیونکہ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ محمد حنفیہ نہ تو خود کو معصوم مانتے تھے نہ مفترض الطاعة اور نہ اولادِ حسین رضی اللہ عنہم میں ہونے کے دعوے دار تھے، پھر بھی دعوے دارِ امامت تھے، اس کا صاف اور سیدھا مطلب یہ ہے کہ وہ ان تمام شرائط سے بے خبر تھے جو شیعوں نے امامت کے لیے ضروری قرار دی ہیں۔

بہ فرضِ محال اس روایت کے برخلاف مان بھی لیا جائے کہ اس گفتگو کی وجہ وہی تھی جو قاضی نور اللہ شوستری نے بیان کی ہے تو اس بات سے یہ بھی تو ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک شیعوں کے ذہن میں عقیدہ امامت کا کوئی واضح تصور موجود نہیں تھا۔ (اور یہی حقیقت ہے) اسی لیے وہ بہت جلد فتنوں میں مبتلا ہو کر گروہ در گروہ بٹ جاتے تھے۔ جیسے کہ حضرت

حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جو لوگ خفیہ طور پر عقیدہ امامت کی تبلیغ کرتے تھے ان کے چند فرقے ہو گئے۔ ایک گروہ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما دونوں کی امامت کا منکر ہو گیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر حضرت حسن کی مصالحت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے ساتھ جائز تھی تو یزید بن معاویہ کے مقابلہ میں حضرت حسین کا خروج ناجائز تھا، اور اگر حضرت حسین کا خروج جائز تھا تو حضرت حسن رضی اللہ عنہما کی مصالحت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ناجائز تھی۔ تیسری صدی ہجرت کے مشہور شیعہ عالم ابو محمد حسن بن موسیٰ نوہجنتی اپنے رسالہ ”فرق الشیعۃ“ میں لکھتے ہیں:

((پس درکار آن دودر گماں شدند، واز امامت آناں باز
گشتند و در گفتار باتودہ مردم داستاں گردیدند.))

(فرق الشیعہ صفحہ ۴۷)

”یہ لوگ ان دونوں بزرگوں کے متضاد طرز عمل سے بدگمان ہو گئے اور ان دونوں کی امامت سے پھر گئے اور عقیدے میں عام لوگوں کے ساتھ ہم داستاں ہو گئے۔“
دوسرے گروہ نے محمد بن علی (ابن حنفیہ) کی امامت کا علم بلند کیا۔ تیسرا گروہ، ان لوگوں کا تھا جو امام زین العابدین کی امامت کا قائل تھا اور یہ چند اشخاص تھے۔ رجال کشی میں امام صادق سے نقل کیا ہے:

((ابی عبداللہ قال ارتد الناس بعد قتل الحسين الاثلاثۃ ابو
خالد الکابلی و یحییٰ بن ام الطویل و جبیر بن مطعم، ثم ان
الناس لحقوا و کثروا))

”قتل حسین علیہ السلام کے بعد سب لوگ مرتد ہو گئے سوائے تین آدمیوں کے، یعنی ابو خالد کابلی، یحییٰ بن ام الطویل اور جبیر بن مطعم، بعد میں لوگ آملے اور زیادہ ہو گئے۔“

چوتھا گروہ: ان لوگوں کا تھا جو اس کے قائل تھے کہ حسین رضی اللہ عنہ کے بعد امامت ختم ہو گئی،

امام بس یہی تین تھے۔ حضرت علی، حضرت حسن، اور حضرت حسین (رضی اللہ عنہم) جمعاً یہ لوگ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بعد کسی کی امامت کے قائل نہیں تھے۔ (فرق الشیعہ، صفحہ ۸۲)

پانچواں گروہ: ان لوگوں کا تھا جو یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ امامت صرف اولادِ حسین رضی اللہ عنہ کا حق نہیں بلکہ حسن و حسین رضی اللہ عنہما دونوں کی اولاد میں جو بھی امامت کے لیے کھڑا ہو جائے اور لوگوں کو اپنی طرف اعلانیہ دعوت دے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرح امام واجب الطاعت ہے، جو شخص اس سے سرتابی کرے یا اس کے مقابلے میں لوگوں کو اپنی امامت کی دعوت دے وہ کافر ہے۔ اسی طرح حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کی اولاد میں جو شخص امامت کا دعویٰ کرے مگر دروازہ بند کر کے بیٹھ رہے وہ اور اس کے تمام پیروکار مشرک و کافر ہیں۔

(فرق الشیعہ، صفحہ ۸۵)

ان حالات کا علی بن حسین رضی اللہ عنہ (زین العابدین) نے بہ چشمِ خود مشاہدہ کیا ہوگا، اس لیے عقل کا تقاضا تو یہ تھا کہ دین کے اتنے اہم اور ضروری عقیدے کی وضاحت عیدین، حج یا کسی اور بڑے مجمع میں فرمادیتے تاکہ عوام الناس ان کے چچا (محمد بن حنیفہ) کی طرح اس عقیدے سے بے خبر نہ رہتے۔ اور اگر مجمع عام میں اعلان کرنے سے کوئی مصلحت مانع تھی تو بنو ہاشم یا اولادِ حسین رضی اللہ عنہ کے سامنے ہی اس مسئلہ پر روشنی ڈال دیتے اور ان تمام نصوص کو عام کر دیتے جن میں رسول خدا ﷺ نے اماموں کی نام بہ نام تصریح فرمائی تھی، یا پھر مومنین کرام کو زمرہ کی اس تختی کی ہی زیارت کرا دیتے جسے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجا تھا اور جس میں سارے ائمہ کے نام درج تھے۔ اس تختی کا قصہ جو کہ اصول کافی مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۳۰۲ء کے صفحہ ۳۴۳-۳۴۴ پر درج ہے۔ وہ اس طرح ہے:

((عن ابی بصیر عن ابی عبداللہ علیہ السلام قال: قال الجابر

بن عبداللہ الانصاری ان لی الیک حاجة فمتی یخف علیک

ان اخلوبک فاسئلك عنہا، فقال له جابر: ای الاوقات

احبیته، فخلا بہ فی بعض الايام فقال له: یا جابر اخبرنی عن

اللوح الذى رأيت فى يدامى فاطمة عليها السلام بنت رسول الله ﷺ وما اخبرتك به امى فى ذلك اللوح مكتوب؟ فقال جابر اشهد بالله انى دخلت على امك فاطمة عليها السلام فى حياة رسول الله ﷺ فهنيتها بولادة الحسين ورايت فى يدها لوحاً اخضر ظننت انه من زمرد ورأيت فيه كتاباً ابيض شبه لون الشمس فقلت لها بابى وامى يا بنت رسول الله ﷺ ما هذا اللوح؟ فقالت هذا اللوح اهداه الله الى رسول الله ﷺ فيه اسم ابى و اسم على و اسم ابنى و اسم الاوصياء من ولدى و اعطانيه ابى ليبشرنى بذلك فقال جابر: فاعطنيه امك فاطمة عليها السلام فقرأته و استنسخته فقال له ابى فهل لك يا جابر ان تعرضه على قال نعم فمشى معه ابى الى منزل جابر فاخرج صحيفة من رق فقال يا جابر انظر فى كتابك لاقرأ (انا) عليك فنظر جابر فى نسخته فقرأ ابى فما خالف حرف حرفاً، فقال يا جابر فاشهد بالله انى هكذا رأيت فى اللوح مكتوباً.))

(الثانى ترجمہ اصول کافی جلد ۳ مطبوعہ کراچی صفحہ ۱۶۵-۱۶۶-۱۶۷)

”ابو بصیر نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ میرے پدر بزرگوار نے جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میری ایک ضرورت ہے آپ کب ہم سے تنہائی میں مل سکتے ہیں تاکہ میں وہ بات آپ سے پوچھ لوں؟ جابر نے کہا جو وقت آپ چاہیں، چنانچہ ایک دن ان سے تنہائی میں ملاقات کی۔ آپ نے فرمایا: اے جابر! مجھے اس لوح کے متعلق بتاؤ جسے آپ نے میری جدہ ماجدہ حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ ﷺ کے پاس دیکھا تھا، انہوں نے اس

لوح میں کیا لکھا ہوا بتایا تھا، جابر نے کہا: میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں حیات رسول ﷺ میں آپ کی والدہ ماجدہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور امام حسین رضی اللہ عنہ کی ولادت کی مبارک باد دینے، میں نے ان کے ہاتھ میں ایک سبز لوح دیکھی، میرے گمان میں وہ زمرہ کی تھی اور اس پر سورج کی طرح روشن ایک تحریر تھی، میں نے کہا اے بنت رسول! یہ لوح کیا ہے؟ فرمایا: یہ اللہ نے اپنے رسول کے پاس بھیجی ہے اس میں میرے باپ کا نام ہے علی کا نام ہے، میرے دونوں بیٹے اور ان اوصیاء کے نام ہیں جو میرے فرزند کی نسل سے ہوں گے، آنحضرت ﷺ نے مجھے عطا فرمائی ہے تاکہ میں اسے دیکھ کر خوش ہو جاؤ۔ جابر نے کہا کہ آپ کی ماں فاطمہ نے وہ تختی مجھے دی میں نے اسے پڑھا اور لکھ لیا۔ میرے والد نے فرمایا: اے جابر! کیا تم وہ تحریر مجھے دکھا سکتے ہوں، انہوں نے کہا: جی ہاں، میرے والد جابر کے ساتھ ان کے گھر تک گئے، جابر نے وہ صحیفہ پوست پر لکھا ہوا نکالا، حضرت نے فرمایا میں تمہیں پڑھ کر سناتا ہوں تم اپنی تحریر سے مقابلہ کرتے جاؤ، میرے والد نے پڑھا تو کوئی ایک حرف بھی بدلا ہوا نہ تھا، جابر رضی اللہ عنہ نے کہا میں گواہی دیتا ہوں خدا کے سامنے کہ میں نے اس لوح میں یہی لکھا ہوا دیکھا تھا۔“

اس روایت میں آگے زمرہ کی اس تختی کی پوری عبارت درج ہے جس میں بارہ اماموں کو نام بنام ان کے اوصاف کے ساتھ نام زد کیا گیا ہے۔ اگر اس مکالمہ سے حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہما (زین العابدین) کا مقصد دوسرے لوگوں کو گمراہی سے بچانا تھا (جیسا کہ قاضی صاحب نے دعویٰ کیا ہے) تو پھر اس کے لیے مندرجہ بالا طریقے ہی مناسب تھے نہ کہ اپنے چچا سے تنہائی میں گفتگو کرنا۔

شیعوں کو گمراہی اور فرقہ بندی سے بچانے کے لیے اگر حضرت علی بن حسین عقیدہ امامت کا بہ بانگ دہل اعلان فرمادیتے تو اعلیٰ کلمۃ الحق کا فریضہ بھی ادا ہو جاتا اور کم از کم شیعوں میں وہ اختلافات تو رونما نہ ہوتے جو کہ عقیدہ امامت کے متعلق بعد کے زمانوں میں

پیدا ہوتے رہے اور جس کے نتیجے میں ہر امام کی وفات کے بعد نئے نئے فرقے وجود میں آتے رہے اور امام زادے ایک دوسرے کو گمراہ اور بے دین قرار دیتے رہے۔

صاحب آیاتِ بینات رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری مثال میں اصول کافی مطبوعہ لکھنؤ کتاب الحجہ صفحہ ۱۰۰ سے وہ گفتگو نقل کی ہے جو کہ سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پوتے سیدنا حضرت زین العابدینؑ کے بیٹے حضرت زید شہیدؑ اور امام جعفر صادقؑ کے ایک خاص شاگرد ابو جعفر احوں محمد بن نعمان کے درمیان عقیدہ امامت پر اس زمانے میں ہوئی تھی، جب حضرت زید شہیدؑ بن زین العابدینؑ نے اموی خلیفہ ہشام بن عبد الملک بن مروان کے خلاف خروج کیا تھا، ابو جعفر احوں نے جب ان کے سامنے عقیدہ امامت کے کچھ اصول بیان کیے تو انہوں نے ان کو جھٹلاتے ہوئے فرمایا:

((قال فقال لی یا ابا جعفر کنت اجلس مع ابی علی الخوان
فیلقمنی الضعة السمینة ویردلی اللقمة الحارة حتی شفقة
علی ولم یشفق علی من حر النار؟ اذا اخبرک بالدين ولم
یخبرنی به؟)) (الثانی ترجمہ اصولی کافی جلد ۲ مطبوعہ کراچی، کتاب الحجہ صفحہ ۱۸، ۱۹)

” (احول کہتا ہے) انہوں نے مجھ سے کہا اے ابو جعفر! تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ جب میں اپنے باپ کے ساتھ کھانا کھانے کے لیے دسترخوان پر بیٹھتا تھا تو وہ لقمے میرے منہ میں دیتے تھے اور عمدہ گوشت کی بوٹیاں مجھے کھلاتے تھے اور گرم لقموں کو پھونک کر ٹھنڈا کرتے تھے تا کہ گرم نہ کھاؤں..... یہ شفقت تھی میرے حال پر، تو جب کھانے کی گرمی میرے لیے برداشت نہ کرتے تھے تو کیا دوزخ میں جانا میرے لیے برداشت کر لیتے؟ بایں طور کی دین کی تجھ کو خبر دی اور مجھ کو خبر نہ دی؟“

① حضرت زید شہیدؑ نے امام محمد باقرؑ اور جعفر صادقؑ کے منع کرنے کے باوجود ۲۲ ہجری میں خلیفہ اموی ہشام بن عبد الملک بن مروان کے خلاف چالیس ہزار کے لشکر کے ساتھ خروج کیا تھا، شیعہ سپیہ میں سے تیس ہزار افراد نے عین موقع پر ان سے اس لیے بے وفائی کی تھی کہ حضرت زید شہیدؑ بن زین العابدینؑ شیخین رضی اللہ عنہما کو محبوب رکھتے تھے۔

مندرجہ بالا سطور میں حضرت زید شہیدؒ نے خود اقرار کیا ہے کہ ان کے والد بزرگوار سید الساجدین حضرت زین العابدینؑ نے انہیں عقیدہٴ امامت کی تعلیم نہیں دی تھی۔ اسی بات سے معمولی عقل و فہم والا آدمی بھی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ عقیدہٴ امامت کا دین اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے، اگر یہ دین کا کوئی اصول عقیدہ ہوتا تو حضرت زین العابدینؑ اپنے بیٹے کو اس کی تعلیم ضرور دیتے۔ مومنین کرام میں سے کیا کوئی شخص گھڑی بھر کو بھی اس بات کا تصور کر سکتا ہے کہ جو لوگ ہدایت کرنے اور گمراہی سے بچانے پر مامور تھے، وہ کیا اپنے ہی بیٹے کو اتنے اہم اور ضروری عقیدے کی تعلیم نہ دے کر گمراہی میں مبتلا کرنے کا گناہ اپنے سر لے سکتے تھے؟ کیا یہ بات تعجب خیز نہیں ہے کہ حضرت زین العابدینؑ اپنے چچا کے عقائد کی تو اصلاح فرمادیں اور اپنے فرزند کو اس عقیدے کی خبر بھی نہ ہونے دیں۔

ناظرین کرام! اب ہم اس سے بھی زیادہ تعجب خیز اور حیرت انگیز روایت اصول کافی مطبوعہ نولکشور لکھنؤ کے صفحہ ۲۸۸ سے نقل کرتے ہیں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی سگی چچی علیؑ بن ابی طالب کی والدہ محترمہ حضرت فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہا بھی عقیدہٴ امامت سے بے خبر تھیں۔

ذیل میں اس روایت کا ضروری حصہ نقل کیا جاتا ہے:

((فلما فرغن من غسلها و کفنها دخل ﷺ فحمل جنازتها علی عاتقہ فلم یزل تحت جنازتها حتی اوردھا قبر و وضعھا و دخل القبر فاضطجع فیہ ثم قام فاخذھا علی یدیه حتی و وضعھا فی القبر ثم انکب علیھا طویلا یناجیھا و یقول لھا ابنک ابنک (ابنک) ثم خرج و سوی علیھا ثم انکب علی قبرھا فسمعوه یقول لا الہ الا اللہ اللہم انی استودعھا ایاک ثم انصرف فقال له المسلمون: انارأیناک فعلت اشیاء لم تفعلھا قبل الیوم فقال الیوم فقدت برابی طالب ان کانت لیکون

عندها الشی فی فتوثرنی به علی نفسها و ولدها وانی ذکر القیامة
و ان الناس یحشرون عراة فقالت واسواتاه فضمنت لها ان
فضمنت لها ان یبعثها الله کاسیة و ذكرت ضغطة القبر فقالت
و اضعفاء فضمنت لما ان یکفیها الله ذالک فکفتها بقمیصی
واضطجعت فی قبرها لذالک وانکبیت علیها فلقتها ما تسئل
عنه فانها سئلت عن ربها فقالت و سئلت عن رسولها
فاجابت و سئلت عن ولیها و امامها فارتج علیها فقلت ابنک
ابنک (ابنک) . (.....))

(الثانی ترجمہ اصول کافی جلد ۳ مطبوعہ کراچی، کتاب الحجہ صفحہ ۳۱-۳۲)

”جب وہ غسل سے فارغ ہوئیں تو حضرت آئے اور جنازہ اپنے کندھے پر
اٹھایا، آپ برابر جنازہ اٹھائے چلے جا رہے تھے یہاں تک کہ قبر کے پاس لائے
اور اسے رکھ دیا اور خود قبر میں داخل ہوئے اور اس میں لیٹے، پھر میت کو اپنے
کاندھوں پر اٹھایا اور قبر میں رکھا، پھر اس پر جھک کر دیر تک کچھ کہتے رہے، پھر
فرمایا: تمہارا بیٹا، تمہارا بیٹا، تمہارا بیٹا، پھر قبر سے نکل آئے اور قبر بند کر دی، پھر قبر
پر جھکے اور فرمایا: لا الہ الا اللہ، خدا وندا، ان کو میں نے تیرے سپرد کیا، پھر لوٹ
آئے، مسلمانوں نے کہا: آج آپ نے وہ کام کیا جو اس سے پہلے نہیں کیا تھا؟
فرمایا: آج میں نے ابوطالب کی نیکی کو گم کر دیا ہے اگر ان کے پاس کوئی چیز ہوتی
تھی تو مجھے اپنے اوپر اور اپنی اولاد پر ترجیح دیتی تھیں، میں نے ان سے ذکر کیا کہ
قیامت کے دن لوگ برہنہ محشور ہوں گے، انہوں نے کہا: ہائے رسوائی میں
ضامن ہوا اس کا کہ خدا ان کو آسیہ کی طرح محشور کرے گا، اور میں نے قبر کی تنگی کا
ذکر کیا تو انہوں نے کہا ہائے ضعیفی، میں ضامن ہوا اس کا کہ اللہ اس سے بچائے
گا، پس میں نے ان کو اپنی قمیض کا کفن دیا اور ان کی قبر میں لیٹا اور ان کی قبر پر

جھک کر تلقین کی ان سوالات کے جوابات کی جو ان سے پوچھے گئے، ان سے سوال کیا گیا رب کے متعلق انہوں نے جواب دیا، پھر سوال رسول کے متعلق کیا، انہوں نے جواب دیا، پھر سوال کیا ولی اور امام کے متعلق اس پر وہ خاموش ہوئیں، میں نے کہا وہ آپ کا بیٹا، آپ کا بیٹا ہے۔“

امام جعفر صادق کی اس روایت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی والدہ محترمہ نے اللہ اور رسول سے متعلق سوالوں کے جواب تو دے دیے، لیکن جب ولی اور امام کے متعلق سوال ہوا تو وہ خاموش ہو گئیں، جس پر رسول اللہ ﷺ کو انہیں بتانا پڑا کہ تمہارا بیٹا تمہارا بیٹا۔

ہو سکتا ہے کہ مومنین کرام میں کوئی یہ جواب دے کہ اس وقت تک رسول اللہ ﷺ نے عقیدہ امامت کی تبلیغ نہیں فرمائی تھی، تو پھر سوال یہ پیدا ہوگا کہ نعوذ باللہ غلطی کس سے ہو گئی؟ رسول اللہ ﷺ سے یا فرشتوں سے کہ جس عقیدے کی تعلیم ہی نہیں دی گئی تھی اس کے جواب کی انہیں زحمت کیوں دی گئی؟

اب تصویر کا ایک رخ تو وہ ہے جو کہ مندرجہ بالا سطور میں بیان ہوا ہے جس کے مطابق خود اہل بیت کرام اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی والدہ محترمہ تک کو اس عقیدہ امامت کی معرفت نہیں حاصل تھی۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس عقیدے کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے ورنہ یہ حضرات اس سے ضرور واقف ہوتے۔

دوسرا رخ یہ ہے کہ شیعوں نے اس عقیدہ کو توحید، رسالت و قیامت کی طرح اصول دین میں شامل کر کے نجات اخروی کے لیے اس عہدے پر فائز اماموں کی معرفت کو ضروری قرار دیا ہے۔ چنانچہ اصول کافی صفحہ ۱۰ ”باب معرفت الامام و الردالیہ“ میں امام باقرؑ یا جعفر صادقؑ سے روایت ہے:

((الحسین عن معلى عن الحسن بن علی عن احمد بن عائذ

عن ابیه عن ابن اذنیہ قال حدثنا غیر واحد عن احدہما علیہما

السلام انه قال یا یكون العبد مومنا حتی يعرف الله ورسوله

والائمة كلهم وامام زمانه و یرد الیه ویسلم له ، ثم قال کیف
 یعرف الاخر و هو یجهل الاول .)) (الثانی ترجمہ اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۳۰)
 ”ابن اذنیہ سے مروی ہے کہ ایک سے زیادہ لوگوں نے امام محمد باقر علیہ السلام یا
 امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: کوئی بندہ مومن نہیں
 ہو سکتا جب تک کہ اللہ اور اس کے رسول اور تمام ائمہ کو نہ پہچانے اور اپنے امام
 زمانہ کو بھی، اور اپنے معاملات ان کی طرف رجوع کرے اور اپنے کو ان کے سپرد
 کرے، پھر فرمایا: جو اول سے جاہل ہے وہ آخر کو کیا جانے گا۔“



امامت کیا ہے؟

شیعہ نبوت کی طرح امامت کو بھی آسمانی عہدہ مانتے ہیں اور امامت کے لیے ان تمام خصوصیات کے قائل ہیں جو کہ خاصہ نبوت ہیں، یعنی امام نبیوں کی طرح معصوم ہوتا ہے، اس کا تقرر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اس کی اطاعت بھی نبی کی اطاعت کی طرح غیر مشروط فرض ہوتی ہے، اس پر وحی کا نزول ہوتا ہے، اس کو حلال و حرام کا اختیار ہوتا ہے، اسے ((ما کان و ما یکون)) کا علم حاصل ہوتا ہے، حدیہ کہ امام کا مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے برابر اور تمام نبیوں سے بڑا ہوتا ہے۔ اس لیے امامت کا عقیدہ ہی شیعوں کا وہ اصل الاصول ہے جو انہیں سوادِ اعظم سے علیحدہ کرتا ہے۔

ہم ذیل میں چند ایسی روایتیں اور علمائے شیعہ کے اقوال نقل کر رہے ہیں جن سے شیعہ مذہب میں امامت کی اہمیت اور ائمہ کے مقام و مرتبہ پر روشنی پڑتی ہے۔

علامہ مجلسی ”بحار الانوار“ جلد ۲۶ صفحہ ۲۸۱ پر امام جعفر صادق سے روایت نقل کرتے ہیں:

((عن ابی بصیر عن ابی عبداللہ علیہ السلام قال ما من نبی ولا من رسول ارسل الا بولا یتنا و فضیلتنا علی من سوانا .))
 ”ابو بصیر نے امام جعفر صادق سے روایت کی ہے کہ اس وقت تک کسی نبی کو نہ نبی بنایا گیا نہ کسی رسول کو رسول، جب تک کہ اس نے ہماری ولایت اور سب پر فضیلت کا اقرار نہیں کیا۔“

”بحار الانوار“ کی ”کتاب الامامة“ کے ایک باب کا عنوان ہے:

((تفضیلہم علیہم السلام علیہ الانبیاء و علی جمیع الخلق و اخذ میثاقہم عنہم و عن الملائکة و عن سائر الخلق و ان

اولوالعزم انما صاروا اولی العزم بحبہم صلوات اللہ علیہم .))
 ”یعنی ائمہ علیہم السلام تمام انبیاء سے اور تمام مخلوق سے افضل ہیں، ائمہ کے بارے میں انبیاء کرام سے، ملائکہ سے اور ساری مخلوق سے عہد لیا گیا، اولوالعزم انبیاء کرام صرف ائمہ کے ساتھ محبت رکھنے کی وجہ سے اولوالعزم بنے تھے۔“
 علامہ مجلسی اس بات میں روایات کا ڈھیر لگانے کے بعد ”عقائد صدوق“ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

((اعلم ان ما ذکرہ رحمة اللہ من فضل نبینا وائمتنا صلوات اللہ علیہم علی جمیع المخلوقات و کون ائمتنا علیہم السلام افضل من سائر الانبیاء و هو الذی لا یرتاب فیہ من تتبع اخبارہم علیہم السلام علی وجہ الاذعان والیقین والایخبار فی ذالک اکثر من ان یحصی .))

”معلوم ہو کہ صدوق نے جو ذکر کیا ہے ہمارے نبی اور ائمہ صلوات اللہ علیہم تمام مخلوقات پر فضیلت رکھتے ہیں اور یہ کہ ائمہ علیہم السلام تمام انبیاء سے افضل ہیں، یہ ایسا عقیدہ ہے کہ اذعان و یقین کے ساتھ اخبار کا تتبع کرنے والا کوئی بھی شخص اس میں شک و شبہ کا شکار نہیں ہو سکتا اور اس بارے میں روایات شمار سے باہر ہیں۔“

اصول کافی میں ایک باب کا عنوان ہے ”ان الائمة علیہم السلام محدثون مفہومون“ میں امام جعفر صادق سے نقل کیا ہے:

((عن محمد بن مسلم قال: سمعت ابا عبد اللہ علیہ السلام یقول: الائمة بمنزلة رسول اللہ ﷺ لانہم لیسوا بانبیاء ولا یحل لہم من النساء ما یحل للنبی ﷺ فاما ما خلا ذالک فہم

فیه بمنزلة رسول الله ﷺ .))

”محمد بن مسلم کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ائمہ رسول اللہ ﷺ کے ہم مرتبہ ہیں، مگر وہ نبی نہیں، جتنی عورتیں نبی کے لیے حلال تھیں اتنی ان کے لیے حلال نہیں، اس کے سوا باقی تمام باتوں میں وہ آنحضرت ﷺ کے ہم مرتبہ ہیں۔“

ملا باقر مجلسی امام جعفر صادق کے اس قوال کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((بیان: يدل ظاهرا على اشتراكهم مع النبي صلى الله عليه

وآله في سائر الخصائص سوا ما ذكر .)) (بحار الانوار صفحہ ۵۰ جلد ۲۷)

”امام کا یہ قول ظاہر دلالت کرتا ہے کہ ائمہ، نبی کریم ﷺ کی تمام خصوصیتوں میں آپ ﷺ کے شریک ہیں مگر یہ کہ ان کو چار سے زیادہ بیویاں حلال نہیں۔“

ملا باقر مجلسی بحار الانوار ”کتاب الامامت، باب انہم محدثون مفہومون“

میں ائمہ کی مختلف روایات ذکر کرنے کے بعد روایات ۴۵ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

((بیان استنباط الفرق بين النبي والامام من تلك الاخبار

لا يخلو من اشكال وكذا جمع بينهما مشكل جدا،

وبالجملة لا بدلنا من الاذعان بعدم كونهم عليهم السلام

انبياء و بانهم اشرف و افضل من غير نبينا ﷺ من الانبياء

والاوصياء ولا نعرف جهة اتصافهم بالنبوة الا رعاية جلاله

خاتم الانبياء، ولا يصل عقولنا الى فرق بين النبوة والامامة

وما دلت عليه الاخبار فقد عرفته .)) (بحار الانوار صفحہ ۸۲ جلد ۲۶)

”ان احادیث میں نبی اور امام کے درمیان فرق کا استنباط کرنا مشکل ہے، اسی

طرح ان احادیث کے درمیان جمع کرنا بھی نہایت مشکل ہے..... مختصر یہ کہ یہ

یقین لازم ہے کہ امام، نبی نہیں ہوتے اور یہ بھی کہ وہ آنحضرت ﷺ کے علاوہ

دیگر تمام انبیاء، اوصیاء سے اشرف و افضل ہیں، ہمیں ان کے موصوف بالنبوة نہ ہونے کی کوئی وجہ معلوم نہیں سوائے اس کے کہ خاتم الانبیاء کی جلالت کی رعایت ہو۔ اور ہماری عقلوں کو نبوت اور امامت کے درمیان واضح فرق تک رسائی حاصل نہیں ہو سکتی، اخبار سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ تم جان ہی چکے ہو۔“

تعجب ہے کہ علامہ کی سمجھ میں اتنی سی بات نہیں آئی کہ جب شیعوں کے عقیدے کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت سے بڑا منصب (منصب امامت و ولایت) امامت کے نام سے عطا کر دیا تو پھر اب انہیں موصوف بالنبوة ہونے کی ضرورت کیا رہی؟ کیا کسی آئی، جی پولیس کو دروغہ کے عہدے اور نام کی ضرورت ہوتی ہے؟

شیعہ مذہب کی ایسی ہی روایات کی روشنی میں جناب ملا باقر مجلسی نے یہ فتویٰ صادر فرمایا:

((امامت بالالتراز رتبہ پیغمبر است .)) (حیات القلوب جلد ۳ صفحہ ۱۰)

”امامت کا درجہ نبوت سے بالاتر ہے۔“

اس مضمون کو بیسویں صدی کے سب سے بڑے شیعہ رہنما آیت اللہ العظمیٰ جناب روح اللہ خمینی نے اپنی کتاب ”الحکومة الاسلامیة“ میں ان لفظوں میں ادا کیا ہے:

((وان من ضروریات مذہبنا ان لائمتنا مقاماً لا یبلغه ملك

مقرب ولا نبی مرسل .)) (الحکومة الاسلامیة، صفحہ ۵۲)

”یہ عقیدہ ہمارے مذہب کی ضروریات میں داخل ہے کہ ہمارے ائمہ کو وہ مقام و

مرتبہ حاصل ہے کہ وہاں تک نہ کوئی مقرب فرشتہ پہنچ سکتا ہے نہ کوئی نبی مرسل۔“

ہم کتب شیعہ سے ایسی بیسیوں روایات نقل کر سکتے تھے (بقول علامہ مجلسی ایسی روایات

بے شمار ہیں) جن سے امامت کا مرتبہ نبوت کے مرتبے سے بڑا ثابت ہوتا ہے، لیکن موقع کی

نزاکت کا لحاظ کرتے ہوئے انہی چند روایات پر اکتفا کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا روایات کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ منصب نبوت جو کہ امامت سے چھوٹا

آسمانی منصب ہے اب زیادہ ترقی یافتہ شکل میں امامت کے عنوان سے جاری و ساری ہے۔

اس طرح رسالت محمدیؐ کی بذات خود کوئی قدر و قیمت نہیں رہ جاتی اور نہ وہ مقصود بالذات ہے، بلکہ وہ مقدمہ ہے امامتِ ائمہ کا، اس لیے وہ مقصود بالعرض ہے۔

یہ صرف ہمارا ہی خیال نہیں ہے، امامت کے اس تصور سے غیر مسلم علماء نے بھی یہی مطلب اخذ کیا ہے۔ چنانچہ محقق آئیونوف (W Ivonow) نے لکھا ہے کہ ”امامت کی روشنی کا دنیا میں جاری و ساری رہنا نبوت کو ذیلی مقام عطا کرتا ہے۔“

H.A.R. GIBBS AND J.H.K RAMER SHORT OR ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM LEIDEN 195 P.248.

امامت کے بارے میں فلپ۔ کے۔ ہٹی رقم طراز ہے کہ ”بانی اسلام نے وحی، یعنی قرآن کو انسان اور خدا کے درمیان واسطہ قرار دیا تھا، لیکن شیعوں نے اس واسطہ کو ایک انسان، یعنی امام کی شکل دے دی، میں اللہ پر ایمان لایا، اور میں قرآن پر ایمان لایا جو غیر مخلوق ہے، کے ساتھ شیعوں نے یہ اضافہ کر دیا کہ ”میں امام پر ایمان لایا جسے خدا نے انتخاب کیا ہے اور جو خدائی صفات میں شریک ہے اور نجات دہندہ ہے۔“

PHILLIP. K.HITTI HISTORY OF THE ARABS LONDON 1973 P248.

ناظرین کرام! آپ نے عقیدہ امامت سے پیدا شدہ نتائج سے متعلق غیر مسلم دانشوروں کی رائے ملاحظہ فرمائی، یہ بات صرف ان دو مثالوں پر منحصر نہیں ہے بلکہ جب بھی مذہب اسلام کا کوئی طالب علم غیر جانبداری سے اماموں کے مرتبہ اور ان کے اختیارات کے متعلق شیعہ عقائد پر سنجیدگی سے غور کرے گا تو وہ اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ گوشیعہ لفظاً تو ختم نبوت کا اقرار کرتے ہیں مگر انہوں نے اس سے بھی بڑا آسمانی عہدہ ”امامت“ کے نام سے جاری کر کے ختم نبوت کے عقیدے کو بے معنی بنا دیا ہے۔



امامت اور قرآن

ہم ذکر کر چکے ہیں کہ شیعہ توحید اور رسالت و قیامت کی طرح امامت کو بھی اصولِ دین میں شمار کرتے ہیں، اس لیے امامت پر اعتقاد کے بغیر نجاتِ اخروی کے لیے توحید، رسالت و قیامت پر ایمان کو نا کافی سمجھتے ہیں۔ لہذا اصولی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح توحید و رسالت اور قیامت کے ثبوت کے لیے قرآن کریم میں واضح شہادتیں موجود ہیں اور اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کا بیسیوں آیات قرآنی میں حکم نازل ہوا ہے، نیز یہ کہ جس طرح توحید و رسالت کے لیے قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ اور مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ ﷺ جیسی واضح آیات نازل ہوئی ہیں، جن سے کوئی دوسرا مطلب اخذ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح قرآن کریم میں امامت اور ائمہ کے مرتبہ کا بیان اور ان کی غیر مشروط اطاعت کا حکم بھی صاف و صریح انداز میں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ ان کی شانِ عالی تو یہ بیان ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو انہی کی وجہ سے پیدا کیا ہے ❶ انہی کی محبت کے سبب انبیائے کرام کے درجات بلند ہوئے ہیں اور ان کے مرتبہ میں شک کرنے کی وجہ سے انبیائے کرام پر مصیبتیں نازل ہوئیں ❷ انہی کے طفیل انبیاء کرام کی دعائیں قبول ہوئیں ❸ اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کی ہدایت کی ذمہ داری انہی کے سپرد کر دی۔ نیز یہ کہ پچھلی تمام کتب سماوی میں ان کے مقام و مرتبہ کا ذکر موجود ہے۔ اس لیے عقل کا تقاضا تو یہ ہے کہ جن ائمہ کو اللہ تعالیٰ نے خصوصیت سے اس امت کی ہدایت کے واسطے مامور کیا ہے اور جس کتاب مقدس میں اس امت کی ہدایت کے واسطے احکامات نازل فرمائے ہیں اس میں ائمہ کا ذکر اور عقیدہ امامت کی تبلیغ و تشہیر زیادہ صاف و صریح اور پر زور طریقہ پر ہونا چاہیے۔

قرآن کریم میں ایک دو جگہ نہیں بارہ جگہ لفظ امام کا استعمال ہوا ہے مگر کسی جگہ بھی شیعوں کے مفروضہ معنی نہیں بنتے۔ قرآن مجید میں لفظ امام مطلق پیشوا کے معنی میں ہے، خواہ اچھا ہو یا برا۔ نبیوں پر بھی یہ لفظ بولا گیا ہے اور کافروں بدکاروں پر بھی۔ ہم اپنی تنگ دامانی کا لحاظ کرتے ہوئے صریح پانچ آیات نقل کرتے ہیں: ❶

پہلی آیت:

﴿وَقَاتِلُوا أَيْتَةَ الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُونَ﴾

(سورہ توبہ: ۱۲)

”اے مسلمانو! کفر کے اماموں سے قتال کرو ان کا معاہدہ اب باقی نہیں ہے تاکہ وہ اپنی شرارتوں سے باز آجائیں۔“

فائدہ:..... اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کافروں کے سرداروں کو امام فرمایا بوجہ اس کے کہ وہ کافروں کے پیشوا تھے، کافر لوگ ان کا اتباع کرتے تھے۔

دوسری آیت:

﴿وَمِنْ قَبْلِهِ كَتَبَ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً﴾ (سورہ ہود: ۱۷)

”قرآن شریف سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب (یعنی توریت) امام اور رحمت تھی۔“

فائدہ:..... اس آیت میں خدا تعالیٰ نے کتاب کو امام فرمایا، اس لیے کہ وہ لوگوں کی پیشوا ہیں اور لوگ ان کا اتباع کرتے ہیں۔

تیسری آیت:

﴿وَجَعَلْنَاهُمْ آيَةً يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ﴾ (سورہ قصص: ۴۸)

”اور بنا دیا ہم نے ان کو امام کہ بلا تے تھے وہ دوزخ کی طرف۔“

فائدہ:..... دیکھئے اس آیت میں امام کو کیسے برے معنی میں استعمال کیا ہے، اس آیت

❶ تفصیل کے لیے دیکھئے تفسیر آیاتِ امامت، از امام اہل سنت مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی۔

میں فرعون والوں کو امام فرمایا۔

چوتھی آیت:

﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ آيَةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ﴾ (سورہ السجدة : ۲۴)

”اور بنایا ہم نے ان سے امام کہ ہدایت کرتے تھے ہمارے حکم سے، جب کہ انہوں نے صبر کیا اور وہ لوگ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے۔“

فائدہ:..... اس آیت میں بنی اسرائیل کا تذکرہ ہے۔ اس آیت میں امام بہ معنی نبی ہے، اس لیے خدا کے حکم سے ہدایت کرنا نبیوں ہی کا کام ہے، اور آگے چل کر ان پر وحی نازل کرنے کا بھی تذکرہ ہے۔ اس سے بھی امامت کا بمعنی نبوت ہونا ظاہر ہے۔

پانچویں آیت:

﴿يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ﴾ (سورہ بنی اسرائیل : ۷۱)

”جس دن ہم بلائیں گے ہر گروہ کو اس کے امام کے ساتھ۔“

فائدہ:..... اس آیت میں امام سے مراد پیغمبر ہیں، کیونکہ قیامت کے دن ہر امت اپنے پیغمبر کے ساتھ بلائی جائے گی، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں فرمایا:

﴿وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَسُولٌ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ (سورہ یونس : ۴۷)

”اور ہر امت کے لیے ایک رسول ہے، پھر جب ان کا رسول آجائے گا تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔“

مذکورہ آیت قرآنی میں شیعوں کی مفروضہ امامت کی کوئی واضح تصویر تو درکنار اس کی دھندلی سی جھلک تک نظر نہیں آتی اور جہاں تک ائمہ کی مشروط اطاعت کے واجب ہونے کا سوال ہے تو قرآن کریم میں اللہ ورسول کی اطاعت کے حکم میں بیسیوں آیات میں صرف دو

آیات ہیں جن میں اللہ ورسول کی اطاعت کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت کا مشروط حکم دیا گیا ہے:

پہلی آیت:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَ أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾

(سورۃ النساء: ۵۹)

”اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اولی الامر (یعنی صاحبانِ حکومت) کی جو تم میں سے ہوں، پھر اگر تم (یعنی رعیت اور صاحبانِ حکومت) آپس میں اختلاف کرو کسی بات میں تو اس کو رجوع کرو اللہ کی اور رسول کی طرف اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ اور روزِ آخرت پر، یہ بہتر ہے اور بہت خوب ہے باعتبار انجام کے۔“

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ اور رسول کی اطاعت ہر حال میں واجب ہے اور اس سے کسی بات میں نزاع کرنا حرام ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت کی ایک ہی چیز ہے، لفظ تو دو ہیں مگر مصداق ایک ہے، چنانچہ اسی سورت میں آگے چل کر فرمایا ﴿مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾ ”جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے یقیناً اللہ کی اطاعت کی۔“ ان دونوں اطاعتوں کا متحد ہونا محض اس سبب سے ہے کہ رسول معصوم ہوتے ہیں ان سے خلاف حکم الہی کوئی بات صادر ہی نہیں ہو سکتی۔

دوسری بات اس آیت سے یہ معلوم ہوئی کہ اولی الامر کی اطاعت ہر حال میں واجب نہیں، اگر ان کا کوئی حکم خلاف قرآن و سنت ہو تو اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔

شیعہ اس آیت میں اُولی الْأَمْرِ (صاحبانِ حکومت) سے اپنے ائمہ مراد لیتے ہیں جو کسی بھی طرح صحیح نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ آیت میں اولی الامر سے اختلاف کی شکل میں مومنین کو

اللہ ورسول کی طرف رجوع کا حکم ہے۔ ظاہر ہے کہ شیعہ ائمہ کو معصوم مانتے ہیں اور ان سے کسی بھی طرح کے اختلاف کو حرام سمجھتے ہیں، اس لیے وہ مراد ہو ہی نہیں سکتے..... حقیقت یہ ہے کہ اولی الامر میں مسلمانوں کے وہ تمام لوگ شامل ہیں جن کی اطاعت کی جاتی ہے، خلیفہ وقت، سردارانِ فوج، علماء و فقہاء، یہ سب اولی الامر میں داخل ہیں۔ ایک اور آیت میں بھی اولی الامر کی طرف رجوع کرنے کا حکم خدا نے دیا ہے وہ آیت بھی اسی سورت میں زیر بحث آیت کے بعد ہے:

﴿وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوْ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى
الرَّسُولِ وَالْإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ
مِنْهُمْ﴾ (سورة النساء: ۸۳)

”اور جب ان کے پاس کوئی خبر امن یا خوف کی آتی ہے تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں، اور اگر وہ اس کو رسول اور اپنے اولی الامر کی طرف رجوع کرتے، تو جو لوگ ان میں سے قوت استنباط رکھتے ہیں وہ اس کو سمجھ لیتے۔“

اس آیت میں اولی الامر کی طرف کسی شرعی معاملہ میں رجوع کرنے کا حکم نہیں، بلکہ امن یا خوف کی خبر کے متعلق مخصوص حکم دیا گیا ہے۔ شرعی معاملات میں خصوصاً بوقت نزاع صرف اللہ اور رسول کی طرف رجوع کا حکم ہے۔ اس معاملے میں قرآن مجید کی کسی آیت سے کوئی خفیف اشارہ بھی شیعوں کے موافق نہیں مل سکتا اور ملے بھی تو کیسے! کیونکہ اس میں تو بقول علمائے شیعہ کے تحریف ہو گئی ہے۔^① چنانچہ صافی میں تفسیر عیاشی سے منقول ہے، امام محمد باقر نے فرمایا:

((لولا انه زيد في القرآن ونقص ما خفي حقنا على ذي

حجی))

① شیعوں نے تحریف قرآن اور بطن قرآن کے سہارے سے عقیدہ امامت کو ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے جس

سے ان کی مجبوری اور لاچاری کا اندازہ ہوتا ہے۔

”اگر قرآن میں بڑھایا نہ گیا ہوتا اور گھٹایا نہ گیا ہوتا تو ہمارا حق کسی عقلمند پر پوشیدہ نہ ہوتا۔“

امام معصوم کے قول کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن میں تحریف ہوگئی ہے، اس لیے مسئلہ امامت و ولایت اس سے ثابت نہیں ہو سکتا۔



امامت قرنِ اولیٰ میں

قرآن کریم کے بعد اب ہم قرنِ اولیٰ میں سب سے پہلے اس گروہ پر نظر ڈالتے ہیں جسے رسول اکرم ﷺ کی صحبت کا شرف حاصل تھا اور جس کا تزکیہ نفس خود اس ہادی مرسل نے کیا تھا جس کی اس صفت کو قرآن کریم نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝﴾ (سورہ آل عمران: ۱۶۴)

”بلاشبہ اللہ نے مومنوں پر بڑا ہی احسان کیا جب کہ ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو خدا کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کی برائی سے پاک کرتا ہے اور کتاب سکھاتا ہے اور کام کی بات سکھاتا ہے اگرچہ اس سے پہلے وہ گمراہی میں تھے۔“

شاگردانِ رسول کے اس مقدس گروہ میں تقریباً ساڑھے سات ہزار ایسے نفوسِ قدسیہ ہیں جن سے حدیث کا خزانہ مالا مال ہے، مگر اتنے بڑے جم غفیر میں ایک شخص بھی شیعوں کی مفروضہ امامت کی روایت نہیں کرتا اور نہ ہی ابو الائمہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کبھی خود کو امام معصوم و مفترض الطاعة کی حیثیت سے پیش کیا اور نہ ہی کبھی کسی واضح اشارے سے اپنے لیے کسی ایسے مقام و مرتبہ کا دعویٰ کیا جس سے ان کا مرتبہ تمام رسولوں سے بلند اور رسول اکرم ﷺ کے برابر ثابت ہو، بلکہ انہوں نے تو ہر موقع پر رسول اکرم ﷺ کے ایک جاں نثار اور مخلص شاگرد کی حیثیت ہی سے خود کو پیش کیا ہے۔ چنانچہ رسول اکرم ﷺ سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا رشتہ مانگتے وقت فرماتے ہیں:

((وان الله هداني بك و على يدك و استنقذني مما كان عليه

آبائي و اعمامي من الحيرة والشرك .))

”اللہ نے مجھے آپ کے ذریعہ، آپ کے ہاتھ پر ہدایت دی اور مجھے گمراہی اور

شُرک سے چھڑالیا جس پر میرے باپ اور چچا تھے۔“ (کشف الغمۃ جلد: ۱، صفحہ ۴۸۰)

اب باقی رہے اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم جمعین تو حضرت زید شہید کا واقعہ آپ پڑھ ہی چکے ہیں کہ جب ابو جعفر احول نے ان سے امامت پر بحث کی تو انہوں نے اس کو جھٹلاتے ہوئے کس قدر مدلل انداز میں اس عقیدے کی تردید کر دی اس طرح محمد بن حنفیہؒ اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی والدہ محترمہ بھی اس عقیدے سے بے خبر تھیں۔ نیز یہ کہ اولاد حسن رضی اللہ عنہ، تو ہمیشہ اپنے طرز عمل سے اس عقیدے کو بے بنیاد ثابت ہی کرتی رہی۔

تعب تو یہ ہے کہ ابو جعفر احول امام زادے سے امامت کے اس قدر باریک مسائل پر تو بحث کر رہا تھا، مگر اسے یہ تک نہیں معلوم تھا کہ امام جعفر صادق کے بعد امام کون ہوگا، چنانچہ اس نے اور ہشام بن سالم وغیرہ نے حضرت امام جعفر صادقؑ کے انتقال کے بعد مرجیہ، قدریہ، معتزلہ یا خوارج ہو جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس وقت تک مسئلہ امامت کے موجدین اس کے نوک پلک درست نہیں کر پائے تھے اور زمرہ کی تختی والی روایت یا ان روایتوں کی تصنیف نہیں ہوئی تھی جن میں رسول اللہ ﷺ کے اماموں کے لیے نام بنام نص فرمانے کا ذکر ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے: اصول کافی مطبوعہ نولکشور صفحہ ۲۲۰-۲۲۱ یا الشافی ترجمہ اصول کافی کتاب الحجہ صفحہ ۳۲۱ جلد ۲)

ناظرین کرام! آخر میں ان بزرگانِ اہل بیت کے واقعات میں اس عقیدے کا جائزہ لینا بھی مناسب ہوگا جن کو شیعہ امام (معصوم و مفترض الطاعتہ) مانتے ہیں اور جن کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ ان کا مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے برابر اور تمام نبیوں سے بلند ہے، نیز یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کی راہنمائی انہی بزرگوں کے سپرد کر دی ہے۔

ان بزرگوں کے حالات کے متعلق جب ہم کتب شیعہ سے رجوع کرتے ہیں تو معلوم

ہوتا ہے کہ یہ حضرات تمام عمر تقیہ کی چادر اوڑھے رہے اور انہیں کبھی یہ جرأت ہی نہیں ہوئی کہ اعلانیہ اس عقیدے کا اظہار کر سکتے وہ اپنی اس خاص حیثیت کو سوائے چند مخصوص لوگوں کے پوری امت محمدیہ سے چھپائے رہے اور نہ صرف یہ کہ دین کے اتنے ضروری عقیدے کو (جس کی تبلیغ نہایت ضروری تھی) چھپاتے رہے بلکہ اپنے مریدوں کو بھی اس کے چھپانے کی تاکید کرتے رہے اور اگر کبھی کسی نے ان کی امامت کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے صاف صاف اپنے امام مفترض الطاعة ہونے سے انکار کر دیا۔

چنانچہ اصول کافی مطبوعہ نولکشور، کتاب الحجۃ صفحہ ۱۴۲ پر سعید سے روایت ہے:

((عن سعید السمان قال: كنت عند ابي عبد الله عليه السلام اذ دخل عليه رجلان من الزيدية فقالا له افیکم امام مفترض الطاعة قال، فقال لا قال، فقال له: قد اخبرنا عنك الثقات انك تفتى و تقر و تقول به و نسئهم لك فلان و فلان و هم اصحاب و رع و تشمیر و هم ممن لا یکذب فغضب ابو عبد الله عليه السلام فقال ما امرتهم بهذا، فلما رأيا الغضب فی وجهه خرجا فقال لی اتعرف هذین؟ قلت: نعم هما من اهل سوقنا و هما من الزيدية و هما یزعمان ان سیف رسول الله ﷺ عند عبد الله بن الحسن فقال کذبا لعنهما الله والله مارأه عبد الله بن الحسن بعینه و لا بو احدة من عینه و لا رآه ابو ه .)) (الثانی ترجمہ اصول کافی، ج ۲، کتاب الحجۃ، ص: ۱۱۵)

”سعید سمان سے روایت ہے کہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا کہ زید یہ فرقہ کے دو آدمی آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ کیا تم میں کوئی امام مفترض الطاعة ہے؟ حضرت نے (مصلحت وقت پر نظر رکھ کر) کہا کوئی نہیں، انہوں نے کہا: ہمیں معتبر لوگوں سے خبر ملی ہے کہ آپ فتوے دیتے ہیں

اقرار کرتے ہیں اور قائل ہیں، اگر کہو تو ہم ان گواہوں کے نام بتادیں، وہ فلاں فلاں ہیں جو جھوٹ بولنے والے نہیں اور صاحب زہد و ورع ہیں۔ حضرت کو غصہ آیا اور فرمایا: میں نے ان کو ایسا کہنے کا حکم نہیں دیا۔ جب ان دونوں نے آپ کو غضب ناک دیکھا تو وہاں سے چل دیے۔ حضرت نے مجھ سے کہا کیا تم ان دونوں کو جانتے ہو؟ میں نے کہا: ہاں، یہ ہمارے بازار کے رہنے والے ہیں اور زید یہ فرقی کے ہیں، وہ گمان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی تلوار عبد اللہ بن حسن (ابن امام حسن) کے پاس تھی، فرمایا: وہ دونوں جھوٹے ہیں خدا کی ان پر لعنت ہو، نہ عبد اللہ بن حسن نے اس کو اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھا نہ ایک آنکھ سے (آخر عمر میں ان کی ایک آنکھ جاتی رہی تھی) اور نہ ان کے باپ (حسن ثنی) نے دیکھا تھا۔“

روایت میں آگے جو کچھ بیان ہوا ہے اس کا حاصل ہی ہے کہ ان لوگوں کے جانے کے بعد امام جعفر صادقؑ نے ان پر لعنت بھیجنے کے ساتھ ساتھ اپنی امامت کا گن گان بھی شروع کر دیا اور رسول اللہ ﷺ کی تلوار، زرہ، خود، مغفر، علم، عصائے موسیٰ اور خاتم سلیمان وغیرہ امامت کی نشانیوں کے اپنے پاس ہونے کا دعویٰ فرمانے لگے۔

اس روایت کے مطابق امام جعفر صادقؑ نے اپنے امام مفترض الطاعة ہونے سے

① امام جعفر صادقؑ (متوفی ۱۵ شوال ۱۴۸ھ) بڑے متقی پرہیزگار اور صاحب علم بزرگ تھے، علماء اہل بیت میں ان کا خصوصی مقام تھا، امام ابوحنیفہؒ کو ان سے اور ان کے والد بزرگوار امام محمد باقرؑ (متوفی ۷ ذی الحجہ ۱۱۴ھ) سے استفادہ کا شرف حاصل تھا، یہ حضرات مدینہ منورہ میں رہتے تھے اور موجدین مذہب امامیہ ان کے نام سے روایتیں ڈھال کر ان سادہ لوح افراد میں بڑی خاموشی سے پھیلا دیتے تھے جنہیں وہ حب آل محمد کے نام پر اپنے دام فریب میں پھنسا لیتے تھے، ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دیتے کہ امام کا حکم ہے یہ عقائد مخالفین کے سامنے ہرگز نہ ظاہر کیے جائیں عنقریب ہمارا قائم ظاہر ہوگا تو ان کا اعلانیہ اظہار ہوگا۔ امام کو جب کبھی ان کی حرکتوں کا علم ہوتا تو وہ ان پر لعنتیں بھیجتے اور اپنی بے تعلقی کا اظہار فرماتے مگر یہ چالاک لوگ اپنے ہم خیال لوگوں سے کہتے یہ امام کا تقیہ ہے ان کی اور ہماری بقا اسی میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل بیت کرام کا احترام، ان سے محبت نیز انہیں علمائے نیکوکار ماننے والے سواد اعظم کی تعداد ہمیشہ لاکھوں کروڑوں میں رہی لیکن زیر زمین سازشی تحریک کے سبب اس مخصوص نظریے کے ماننے والے ⇐ ⇐ ⇐

صاف انکار کر دیا اور ان دونوں سانکوں سے یہ بھی فرما دیا کہ میں نے کسی کو یہ حکم نہیں دیا۔ یہ کیسے امام مفترض الطاعتہ تھے جو اعلانیہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔ کیا کبھی رسول خدا ﷺ نے بھی اپنی رسالت انکار کیا تھا؟ یا کبھی مشرکین کے خوف سے بتوں کی تعریف کی تھی؟

امام جعفر صادقؑ کے کردار (Character) کی یہ تصویر کسی بھی طرح ان کے نانا جان کے کردار سے میل نہیں کھاتی کہ وہ تو دعوت اسلام کے ابتدائی دنوں میں بھی اپنی جان عزیز کی پروا کیے بغیر مکہ کی گلی کو چوں اور بازاروں میں بہ بانگ دہل اعلان حق کرتے تھے۔ کیا کسی رہبر کے لیے اس سے بڑی گالی ہو سکتی ہے کہ وہ حق کو چھپاتا ہے اور باطل کا اظہار کرتا ہے۔ ناظرین کرم!! حسب روایات شیعہ یہ تو معلوم ہو گیا کہ ائمہ اپنی امامت سے انکار کرتے تھے، اب یہ کہ اپنے مریدین کو بھی اشاعت امامت سے روکتے تھے اس کے واسطے بھی چند روایتیں ملاحظہ ہوں:

((عن سلیمان بن خالد قال: قال ابو عبد الله عليه السلام: يا سليمان! انکم علی دین من کتمہ اعزہ الله و من اذاعہ اذله الله .))
 ”امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: اے سلیمان! تم اس دین پر ہو کہ جس نے چھپایا خدا نے اسے عزت دی اور جس نے ظاہر کیا اللہ نے اسے ذلیل کیا۔“

(شانی ترجمہ اصول کافی جلد: ۴ صفحہ ۱۴۷)

◀◀◀ قرنِ اولیٰ میں بھی انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے۔ چنانچہ اصول کافی مطبوعہ نولکشور لکھنؤ کے صفحہ ۴۹۷ پر ہے:
 ((عن حمرا بن اعین قال قلت لابی جعفر علیہ السلام جعلت فداک ما اقلنا لو اجتمعنا علی شاة ما افینناہ؟)) ”حمرا بن اعین کہتا ہے کہ میں نے امام محمد بن باقر سے کہا کہ ہماری جماعت کتنی قلیل ہے کہ اگر دستر خوان پر ایک بکری کھانے بیٹھیں تو اسے تمام نہ کر سکیں۔“ (شانی ترجمہ اصول کافی جلد: ۴ صفحہ: ۱۷۷)..... ((قال واللہ یاسدیر لو کان لی شیعة بعدد هذه الجداء ما وسعنی القعود ونزلنا وصلینا، فلما فرغنا من الصلاة عطفت علی الجداء فعددتها فاذا هی سبعة عشر))..... امام جعفر صادق نے فرمایا..... اے سدیر خدا کی قسم! اگر میرے شیعہ بقدر ان بکریوں کے ہوتے تو میں خروج کرتا۔ سدیر کہتا ہے ہم وہاں اترے اور نماز پڑھی اس کے بعد میں نے ان بکریوں کا شمار کیا تو ان کی تعداد سترہ تھی۔ (ایضاً صفحہ ۱۷۶)

ليس من احتمال امرنا التصديق له والقبول والقبول فقط ،
 ((عن عبد الاعلى قال سمعت ابا عبد الله عليه السلام يقول انه
 من احتما ب امرنا ستره و صيانتته من غير اهله فاذا عرفتم
 من عبد اذاعة فامشوا اليه وردوه عنها فان قبل منكم والا
 فتحملوه عليه بمن يثقل عليه ويسمع منه فان الرجل منكم
 يطلب الحاجة فيلطف فيها حتى تقضى له فالطفوا في حاجتى
 كما تطفون في حوائجكم فان هو قبل منكم والا فادفونوا
 كلامه تحت اقدامكم ولا تقولوا انه يقول ويقوله فان ذلك
 يحمل على و عليكم يحمل على و عليكم .))

”عبدالاعلیٰ کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے سنا کہ ہمارے امر امامت کو اختیار کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کی تصدیق کی جائے اور فقط قبول کر لیا جائے، بلکہ چاہیے یہ کہ نا اہلوں (مخالفوں) سے ہمارے معاملہ کو پوشیدہ رکھا جائے اور ہماری احادیث ان سے بیان نہ کی جائیں..... جب تمہیں ایسا آدمی معلوم ہو جو اشاعت امر امامت کرتا ہے تو اس کے پاس جاؤ اور اسے روکو، اگر وہ مان جائے تو بہتر ہے، ورنہ ایسے شخص کو اس کے پاس لاؤ جس کی بات اس کے لیے وزنی ہو اور وہ اس کی بات کان لگا کر سنے بعض لوگ تم سے طلب حاجت کرتے ہیں تم ان کی ضرورت پوری کرتے رہو تو وہ تم پر مہربان ہوتے ہیں، پس میری ضرورت کے لیے تم ان پر اسی طرح مہربانی کرو جیسے اپنی ضرورتوں کے لیے ان پر مہربانی کرتے ہو، پس اگر تدبیر سے مان جائے تو بہتر ورنہ تم اس کے کلام کو اپنے پیروں سے کچل دو۔ یعنی کسی سے یہ نہ کہو کہ وہ ایسا کہتا ہے اس میں میرے اور تمہارے دونوں کے

لیے آسانی ہے۔“ (ثانی ترجمہ اصول کافی جلد ۴: صفحہ ۱۴۸)

((عن عبدالله بن سلیمان عن ابی عبدالله علیہ السلام قال:
قال لی مازال سرنا مکتوماً حتی صار فی ید (ی) ولد کیسان
فتحدثوا به فی الطریق وقری السواد))

”امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمارا معاملہ پوشیدگی کے ساتھ رہا لیکن
اہل مکہ و فریب نے شیعیت کو لیا تو گلی کو چوں میں اور گاؤں گاؤں اعلان کر دیا۔
ولد کیسان سے مراد بعض لوگوں نے اولاد مختار علیہ الرحمہ لی ہے، جنہوں نے
شیعیت کا بانگ دہل اعلان کیا۔“ (الثانی ترجمہ اصول کافی جلد ۴: صفحہ ۱۴۹)

((قال ابو عبدالله علیہ السلام یا معلی اکتُم امرنا ولا تذعه
فانه من کتم امرنا ولم یذعه اعزه الله به فی الدنيا و جعله نورا
بین عینیہ فی الآخرة یقوده الی الجنة، یا معلی من اذاع امرنا
یقوده الی الجنة، یا معلی من اذاع امرنا ولم یکتمه اذله الله
به فی الدنيا و نزع النور من بین عینیہ فی الدنيا و نزع النور من
بین عینیہ فی الآخرة و جعله ظلماً تقوده الی النار.))

”امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: اے معلیٰ! ہمارے امر (امامت) کو چھپاؤ
اور ظاہر نہ کرو، جو ہمارے امر کو چھپائے گا اور ظاہر نہ کرے گا تو اللہ اس کو دنیا میں
عزت دے گا اور آخرت میں اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایک نور ہوگا جو
اسے جنت کی طرف لے جائے گا اور اے معلیٰ! جو ہمارے امر کو ظاہر کرے گا
چھپائے گا نہیں تو خدا اسے دنیا میں ذلیل کرے گا اور آخرت میں اس کی دونوں
آنکھوں کے بیچ سے نور کو کھینچ لے گا، اور تاریکی اسے کھینچ کر دوزخ کی طرف

لے جائے گی۔“ (الثانی ترجمہ اصول کافی جلد ۴: صفحہ ۱۵۰)

ان روایتوں سے صاف ظاہر ہے کہ ائمہ کی طرف سے عقیدہ امامت کو چھپانے کی سخت تاکید ہوتی تھی اور وہ ہمیشہ پوشیدہ بھی رہا مگر جب کیسانیوں نے شیعیت اختیار کی تو انہوں نے مشہور کر دیا اور ان کی یہ حرکت ائمہ کو بہت ناگوار گزری۔

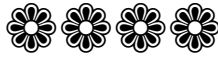
اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو عقیدہ شیعوں کے اصول دین میں شامل ہے جس عقیدے پر نجات اخروی کا دار و مدار ہے، جس پر ایمان لانے والا مومن اور انکار کرنے والا کافر قرار پاتا ہے، جس کے بغیر توحید، رسالت، قیامت پر ایمان کی کوئی وقعت نہیں، اس کو اس قدر چھپانے کی تاکید کیوں؟

کوئی معشوق ہے اس پردہ نگار میں

اس کا جواب بالکل سیدھا اور صاف ہے کہ جس عقیدے کا وجود نہ قرآن میں نہ حدیث میں، نہ اصحاب رسول جس سے واقف، نہ اہل بیت کو جس کی خبر اور جن لوگوں کو امام مفترض الطاعت ثابت کرنے کے لیے روایات کے ڈھیر لگائے جا رہے ہوں وہ بھی اپنے امام مفترض الطاعت ہونے سے انکار کرتے ہوں تو ایسے غیر اسلامی عقیدے کی اشاعت چھپا کر ہی ہو سکتی ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ دین جناب رسول اللہ ﷺ لائے تھے وہ ہرگز چھپانے کے لیے نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ﴾ (سورہ التوبہ: ۳۳).... اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ جو دین ایسا ہے کہ اس کو چھپانے کا حکم ہے اس کے ظاہر کرنے والے کو خدا ذلیل کرتا ہے وہ دین جناب محمد رسول ﷺ کا لایا ہوا نہیں ہو سکتا۔

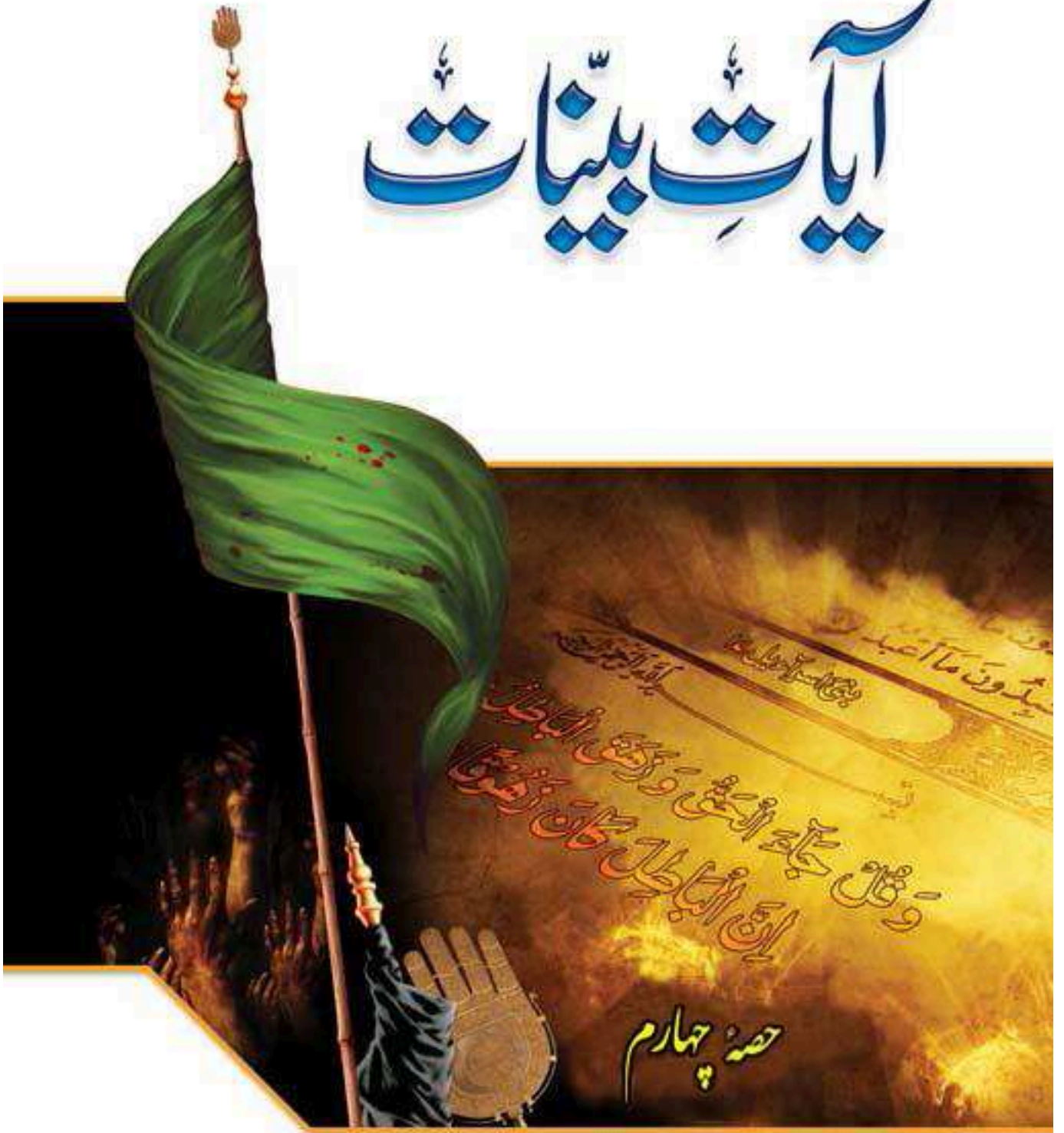
ناظرین کرام! اس مضمون میں امام کی صفات اور ان کے مقام و مرتبہ نیز ان کے اختیارات کے بارے میں مستند ترین شیعہ کتب کی روایت اور ان کے معتبر علماء کے اقوال، نیز

غیر مسلم علماء کے بیانات کی روشنی میں بہت مختصر سا جائزہ لیا گیا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ موجدین مذہب شیعہ نے نبوت سے بھی بلند آسمانی منصب امامت کے نام سے قیامت تک جاری و ساری کر کے رسالت محمدیؐ کو ثانوی درجہ دے دیا ہے، جس کے نتیجے میں اقراری طور پر نہ سہی، مگر معنأً عقیدہ ختم نبوت کا انکار لازم آتا ہے اور اس عقیدہ کے مضرات کے عملی نمونے شیعوں کی احادیث، تفسیرات، افعال و اعمال، کردار و گفتار، نظم و نثر اور روز مرہ کی مذہبی تقریبات، غرض ہر مقام پر صاف دیکھے جاسکتے ہیں، مگر اس کے لیے غیر متعصب ذہن اور چشم بینا کی ضرورت ہے۔



وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاقُونَ

آيَاتِ بَيِّنَاتٍ



نواب محسن الملک سید محمد ہمدی علی خان

بحث فدک

- اب ہم فدک کی اصل بحث شروع کرتے ہیں اور اس میں ان باتوں کو بیان کریں گے:
- ۱- فدک کی حقیقت اور اس کے حدود و آمدنی۔
 - ۲- فدک کیوں کر آنحضرت ﷺ کے قبضے میں آیا۔
 - ۳- فے کے معنی اور اس کا مصرف۔
 - ۴- فدک پیغمبر خدا ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ فرمایا تھا یا نہیں۔
 - ۵- سیدۃ النساء فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا نے فدک کے ہبہ کا دعویٰ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے کیا تھا یا نہیں۔
 - ۶- میراث کے دعوے کی حقیقت۔



فدک کی حقیقت، اس کی حدود اور آمدنی

قاموس میں لکھا ہے کہ فدک ایک گاؤں ہے خیبر میں۔ اور مصباح اللغات میں لکھا ہے کہ وہ ایک بلدہ (شہر) ہے جو مدینے سے دو روز کی راہ پر ہے اور خیبر سے ایک منزل۔ اور لسان العرب میں ہے کہ فدک ایک گاؤں ہے حجاز میں۔ اور ازہری کہتے ہیں کہ وہ ایک گاؤں ہے خیبر میں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ وہ حجاز کے ایک طرف میں واقع ہے، اس میں چشمے تھے اور کھجور کے درخت، اور خدا نے پیغمبر ﷺ پر فے کیا تھا۔ اور مرصدا الاطلاع علی اسماء الامکنة و البقاع مطبوعہ جرمنی کی جلد دوم صفحہ ۳۳۷ میں ہے کہ فدک ایک گاؤں ہے حجاز میں مدینے سے دو یا تین دن کے فاصلے پر واقع ہے اور اسے خدا نے اپنے رسول کو فے کیا تھا، اس لیے کہ مصلحاً حاصل ہوا تھا، اس میں چشمے تھے اور کھجور کے درخت۔ اور معجم البلدان یا قوت حموی میں ہے کہ فدک ایک گاؤں ہے حجاز میں مدینے سے دو دن کی راہ پر، اور بعض روایت میں تین دن کی راہ پر، اور یہ گاؤں ہجرت کے ساتویں سال صلیحاً نصف پر آنحضرت ﷺ کے ہاتھ آیا تھا۔ اور اس میں بہت سے چشمے پانی کے اور خر مے کے درخت تھے۔ فتح الباری شرح صحیح بخاری کی جلد ششم صفحہ ۱۴۰ میں لکھا ہے کہ فدک ایک قصبے کا نام ہے اس میں اور مدینے میں تین دن کا فاصلہ ہے۔ قاضی نور اللہ شوستری ”احقاق الحق“ میں فرماتے ہیں کہ صاحب ”ابطال الباطل“ کا یہ کہنا ہے کہ فدک خیبر کے گاؤں میں سے ایک گاؤں تھا، جھوٹ ہے، اس لیے کہ صاحب جامع اصول نے مالک بن اوس سے روایت کی ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے جو جتیں بیان کیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے لیے صفایا بنی نظیر اور خیبر اور فدک کا ثلث تھا۔ اور جناب مولانا سید دلدار علی صاحب ”عماد الاسلام“ کے دسویں باب کی فصل اول میں شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید معتزلی سے نقل کر کے فدک کی حقیقت وہی

بیان فرماتے ہیں جو قاضی صاحب نے بیان کی ہے۔

فدک کے حدود جو کچھ حضرات شیعہ نے بیان کیے ہیں اور ان کی حد بندی کا قصہ انہوں نے نقل کیا ہے، وہ یہ ہے: ملا باقر مجلسی بحار الانوار کی آٹھویں جلد کتاب الفتن صفحہ ۱۰۱ میں فدک کی حد بندی کی نسبت بہ سند عبد اللہ بن سنان حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے یہ بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ”رسول اللہ ﷺ فاطمہ کے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ جبرئیل آئے اور کہا: اے محمد! اٹھو خدائے تبارک و تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ آپ کے لیے اپنے پروں سے فدک کی حد بندی کر دوں۔ آپ جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور تھوڑی دیر میں لوٹ آئے اور حضرت سیدہ کے پوچھنے پر آپ نے فرمایا کہ جبرئیل علیہ السلام نے میرے لیے اپنے پروں سے فدک کی حد بندی کر دی ہے۔“

ہم کو افسوس ہے کہ کوئی روایت حضرات امامیہ نے کسی امام کی طرف سے ایسی بیان نہیں فرمائی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے اپنے پروں سے جو حدود فدک مقرر کیے تھے وہ اسی قریے یا بلد کے تھے جو ایک گاؤں مدینے سے دو دن یا تین دن کی راہ پر ہے۔ یا وہ حدود مقرر کیے تھے جن کا ذکر حضرت امام موسیٰ کاظم کی روایت میں ہے جس کی ایک حد عدن، دوسری سمرقند، تیسری افریقہ اور چوتھی سمندر جو آرمینیا سے ملا ہوا ہے تھی، اور جس کی نسبت ہارون رشید نے کہا تھا کہ یہ تو سب دنیا ہے اور وہ یہ روایت ہے جسے ہم بیان کرتے ہیں:

بحار الانوار صفحہ ۱۰۱ کتاب الفتن مطبوعہ ایران میں مناقب ابن شہر آشوب سے ملا باقر مجلسی نے نقل کیا ہے کہ ہارون رشید نے حضرت امام موسیٰ کاظم سے کہا کہ آپ فدک لے لیجیے! حضرت نے انکار کیا، اور جب کبھی ہارون رشید ان سے فدک کے لیے کہتا تو وہ انکار ہی کرتے۔ آخر جب اس نے بہت اصرار کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں اسے نہ لوں گا، جب تک مع اپنے حدود کے نہ دیا جائے۔ ہارون رشید نے کہا اچھا اس کے حدود بتلاؤ۔ امام نے فرمایا کہ اگر میں نے اس کے حدود بتائے تو تم ہرگز نہ دو گے، ہارون رشید نے کہا قسم ہے تمہارے نانا کی! ضرور دوں گا۔ تب امام نے کہا کہ پہلی حد اس کی عدن ہے، یہ سن کر ہارون رشید کا چہرہ

متغیر ہو گیا، پھر امام نے کہا کہ دوسری حد اس کی سمرقند ہے، یہ سن کر ہارون رشید کا چہرہ متممانے لگا، پھر امام نے کہا کہ تیسری حد اس کی افریقہ ہے یہ سن کر ہارون رشید کا چہرہ سیاہ ہو گیا، پھر امام نے فرمایا کہ چوتھی حد اس کی سمندر کا کنارہ ہے جو آرمینیا سے ملا ہوا ہے۔ تب ہارون رشید نے کہا کہ آپ نے ہمارے لیے تو کچھ بھی نہ چھوڑا۔ امام نے کہا کہ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اگر میں فدک کے حدود بتاؤں گا تو تم کبھی نہ دو گے۔ اسی پر ہارون رشید نے امام کے قتل کا ارادہ کر لیا۔

اس روایت کو لکھ کر پھر ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں کہ ابن اسباط کی روایت میں پہلی حد اس کی عریش مصر، دوسری دومتہ الجندل اور تیسری احد اور چوتھی سمندر بیان کی تھی۔ اس پر ہارون رشید نے کہا کہ یہ سب دنیا ہے۔ اس پر امام نے کہا کہ یہ سب یہودیوں کے قبضے میں ابوہالہ کے مرنے کے بعد تھی، پس اسے خدا اور رسول نے اپنے لیے بغیر جنگ و جدال کے کر لیا اور خدا نے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ یہ حضرت فاطمہ کو دے دو۔

ملا باقر مجلسی فرماتے ہیں کہ یہ دونوں حد بندیاں جو بیان کی گئیں اس کے خلاف ہیں جو لغت نویسوں نے بیان کی ہیں، اور پھر اس کا جواب ملا صاحب یہ دیتے ہیں کہ شاید مراد امام کی یہ ہے کہ یہ سب فدک کے حکم میں داخل ہیں اور گویا دعویٰ ان سب پر تھا اور فدک کا نام صرف مثلاً اور تغلیباً تھا۔

یہ روایت حدود فدک کے متعلق جو حضرات شیعہ بیان کرتے ہیں اسے ہم نے اس لیے یہاں بیان کیا کہ گویا فدک اور خلافت کو مرادف سمجھتے ہیں، یعنی جہاں تک مسلمانوں کا قبضہ تھا وہ فدک کے حکم میں داخل تھا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اسی کا مطالبہ فرماتی تھیں۔ مگر فدک جیسا کہ ہم اپنی روایتوں سے اوپر بیان کر چکے ایک موضع ہے اور اس کے حدود جس طرح سب گاؤں کے معین اور معلوم ہوتے ہیں سب جانتے تھے، پیغمبر خدا ﷺ نے اس کا انتظام انہی لوگوں کے سپرد کر دیا تھا جن سے صلحاً لیا گیا تھا اور یہ قرار پایا تھا کہ جو کچھ پیدا ہو اس میں سے نصف وہ لوگ لیا کریں اور نصف آنحضرت ﷺ کو دے دیا کریں، چنانچہ اس کے مطابق

ہر سال پیغمبر خدا ﷺ کی طرف سے کچھ لوگ جاتے اور تخمینہ کر کے آنحضرت ﷺ کا نصف حصہ لے آتے، اور جو غلہ وہاں سے آتا اسے حضرت اپنے اہل و عیال کے لیے رکھ کر باقی مسلمانوں کو تقسیم کر دیتے۔

مگر حضرات شیعہ فرماتے ہیں کہ اس کی آمدنی ہر سال چوبیس ہزار دینار تھی، جیسا کہ ملا باقر مجلسی ”حیات القلوب“ میں لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اہل فدک کے ساتھ معاہدہ کر لیا تھا کہ وہ ہر سال چوبیس ہزار دینار دیا کریں جو کہ اس زمانے کے حساب سے تقریباً تین ہزار چھ سو تومان (سکہ ایرانی) ہوتے ہیں۔ اور صاحب ”تشئید المطاعن“ کہتے ہیں کہ بہ حساب ہندوستان کے ایک لاکھ بیس ہزار روپیہ اس کا ہوتا ہے۔ اور صاحب ”تشئید المطاعن“ نے لکھا ہے کہ ابوداؤد اپنی سنن میں لکھتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ جب خلیفہ ہوئے تو اس وقت فدک کی آمدنی چالیس ہزار دینار تھی۔



فدک آنحضرت ﷺ کے قبضے میں کیسے آیا

فتح الباری کی جلد ششم صفحہ ۱۳۹ میں لکھا ہے کہ تمام اصحاب مغازی نے فدک کے آنحضرت ﷺ کے قبضے میں آنے کا قصہ بیان کیا ہے کہ فدک کے باشندے یہودی تھے۔ جب خیبر فتح ہو گیا تو ان لوگوں نے آنحضرت ﷺ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ ہمیں امن دیں ہم شہر کو چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ اور ابوداؤد نے زہری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ خیبر کے کچھ باقی لوگ قلعہ بند ہو گئے تھے انہوں نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ آپ ہمارا خون معاف کر دیجیے اور ہمیں چلے جانے کی اجازت دے دیجیے، آپ نے ایسا ہی کیا اس کو اہل فدک نے سنا اور انہوں نے بھی ایسا ہی معاملہ کیا۔ اور ابوداؤد نے ابن شہاب سے روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ بقیہ اہل خیبر کا محاصرہ کر رہے تھے کہ اس اثنا میں فدک والوں سے اور چند معین گاؤں سے صلح ہو گئی۔ تفسیر کبیر صفحہ ۲۷۱ مطبوعہ مصر میں آیت ﴿مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْهُمْ﴾ (سورہ حشر: ۶)..... ”جو ہاتھ لگائے اللہ اپنے رسول کو۔“ کی شان نزول میں لکھا ہے کہ یہ آیت فدک کے متعلق ہے، اس لیے کہ فدک کے باشندے جلاوطن کر دیے گئے تھے اور ان کے سب گاؤں اور مال بغیر لڑائی کے رسول اللہ ﷺ کے قبضے میں آ گئے تھے اور فدک ہی کے غلے میں سے آنحضرت ﷺ اپنا اور اپنے عیال کا خرچ نکال کر باقی کو ہتھیاروں وغیرہ میں خرچ کر دیا کرتے تھے۔

امام ابوالعباس احمد بن یحییٰ بلاذری فتوح البلدان میں لکھتے ہیں کہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے ابن شہاب سے اور انہوں نے مالک بن اوس سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر بن

الخطاب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ کے تین صفایا تھے (صفایا اس مال اور چیز کو کہتے ہیں جو امام غنیمت میں سے اپنے لیے علیحدہ کرے) اول بنی نضیر کا مال، دوسرے خیبر اور تیسرے فدک۔ بنو نضیر کے مال آنحضرت ﷺ نے اپنی ضرورتوں کے لیے روک لیے تھے۔ اور فدک مسافروں کے لیے تھا اور خیبر کے تین حصے کر کے دو مسلمانوں کو تقسیم کر دیے تھے اور ایک حصہ اپنے لیے اور اپنے اہل کے لیے روک لیا تھا۔ آنحضرت ﷺ کے اہل کے خرچ سے جو بچ جاتا وہ فقراءِ مہاجرین کو دے دیا جاتا تھا۔ (دیکھو فتوح البلدان صفحہ ۲۰ مطبوعہ جرمنی)

اسی کتاب میں یہ بھی روایت ہے کہ لوگوں نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ خیبر سے مراجعت فرماتے ہوئے محیصہ بن مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کو اہل فدک کے پاس دعوتِ اسلام کرنے کو بھیجا اور ان کا رئیس ایک شخص یہودی بہ نام یوشع بن نون تھا، یہودیوں نے نصف حصہ زمین پر رسول اللہ ﷺ سے صلح کر لی مسلمانوں نے سواروں سے اس قسم کا حملہ نہیں کیا تھا، اس لیے یہ حصہ خالص رسول اللہ ﷺ کا تھا جو مسافر آپ کے پاس آمد و رفت رکھتے تھے۔ ان کے خرچ میں یہ آمدنی آیا کرتی تھی۔ اس کے باشندے وہیں فدک میں رہا کیے یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اور انہوں نے حجاز سے یہودیوں کو نکال دیا۔ ابو الہیثم مالک بن تہان رضی اللہ عنہ، سہیل بن ابی خثیمہ رضی اللہ عنہ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ انصاریوں کو فدک میں بھیجا، انہوں نے اس کی نصف زمین کی منصفانہ قیمت مقرر کر کے یہود کو دے دی اور ملک شام کی طرف ان کو نکال دیا۔ (دیکھو فتوح البلدان صفحہ ۲۹ مطبوعہ جرمنی)

اس کے قریب قریب تاریخ طبری اور تاریخ کامل ابن اثیر میں بھی لکھا ہے جس کی اصل

عبارتیں ہم حاشیہ پر نقل کرتے ہیں۔ ❶

❶ خلاصہ تاریخ طبری یہ ہے: حاضر رسول اللہ ﷺ اہل خیبر فی حصینہم الوطیح والسالام حتی اذا ایقنوا بالہلکة سالوہ ان یسیر ہم و یحقن لہم دمائہم ففعل و کان رسول اللہ ﷺ قد حاز الاموال کلہا الشف و نطاح و الکتیبۃ و جمیع حصونہم الا ماکان من ذینک الحصین فلما سمع بہم اہل فدک قد صنعوا ما صنعوا بعثوا الی رسول اللہ ﷺ یسئلونہ ان یسیر ہم دیحقن و ماتہم لہم و یخلوا لہم الاموال ففعل و کان فی من مشی بینہم و بین رسول اللہ ﷺ فی ذلک محیصۃ بن مسعود

قاضی نور اللہ شوستری صاحب ”احقاق الحق“ نے بحوالہ معجم البلدان مؤلفہ یا قوت حموی شافعی کے لکھا ہے کہ فدک کو اللہ تعالیٰ نے سن سات ہجرت میں اپنے رسول پر صلح کے طور پر کیا تھا۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ جب آپ خیبر میں نازل ہوئے اور اس کے قلعوں کو فتح کیا اور اس میں کوئی نہ رہا صرف ایک تہائی لوگ رہ گئے اور ان پر حصار کی سختی ہوئی تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس آدمی بھیج کر پوچھا کہ ان کے جلاوطن ہونے پر ان کو اجازت دے دیں، آپ نے اس کو منظور کر لیا۔ پھر یہ خبر اہل فدک کو پہنچی تو انہوں نے آپ کی خدمت میں قاصد بھیج کر دریافت کیا کہ ہم سے نصف اموال اور ثمار (پھلوں) پر صلح کر لیں، آپ نے اس کو بھی منظور کر لیا تو یہ ہے وہ صورت جس پر گھوڑوں شتروں کی دوڑ نہیں ہوئی، اس لیے یہ خالص رسول اللہ ﷺ کی ہوئی۔

اور بحار الانوار میں بروایت امام جعفر صادق فدک کے آنحضرت ﷺ کے قبضے میں آنے کی کیفیت اس طرح پر لکھی ہے کہ ایک جہاد میں رسول اللہ ﷺ تشریف لے گئے، جب آپ اس سے لوٹے اور راستے میں کسی جگہ ٹھہرے اور دوسرے لوگ بھی آپ کے ساتھ تھے کہ آپ کے پاس جبریل علیہ السلام آپ کے ساتھ تھے اور آپ کے لیے زمین ایسی لپٹ گئی

﴿﴾ و اخو بنی حارثة فلما نزل اهل خيبر على ذلك سالوا رسول الله ان يعاملهم بالاموال على النصف و قالوا نحن اعلم بها منكم و امر لها فصا لحهم رسول الله ﷺ على النصف اعنى انا اذا شئنا نخر حكم و اخر جناكم و صالحه اهل فدك على مثل ذلك فكانت خيبر فينا للمسلمين و كانت فدك خالصة لرسول الله ﷺ انتھی۔

اور تاریخ کامل ابن اثیر جلد دوم صفحہ ۱۰۸ میں ہے: لما انصرف رسول الله ﷺ خيبر بعث محيصة بن مسعود الى اهل فدك يدعوهم الى الاسلام و رئيسهم يومئذ يوشع بن نون اليهود فصا لحوا رسول الله ﷺ على نصف الارض فقبل منهم ذلك و كان نصف فدك خالصا لرسول الله ﷺ لانه لم يوجف المسلمون عليه بخيل ولا ركاب يصرف ما ياتيها منها على ابناء السبيل و لم يزل اهلها بها حتى استخلف عمر بن الخطاب رضى الله عنه و اجلى يهود الى الحجاز فبعث ابا الهيثم بن تيهان و سهل بن ابى خيثمة و زيد بن ثابت فقوموا النصف تربتها بقيمة عدل فدفعها الى اليهود و اجلاهم الى الشام و لم يزل رسول الله ﷺ اوابوبكر و عمر و عثمان و على رضى الله عنهم يصنعون صنع رسول الله ﷺ بعد و فاته فلما ولى معاوية الخلافة اقطعها مروان بن الحكم فوهبها مروان ابنه عبد الملك انتھی۔

جیسے کپڑا لپیٹ لیتے ہیں، یہاں تک کہ فدک پر پہنچے، جب اہل فدک نے گھوڑوں کا آنا سنا تو ان کو یہ خیال ہوا کہ ان کا کوئی دشمن چڑھ آیا انہوں نے شہر کے دروازے بند کر دیے، شہر سے باہر ایک گھر میں ایک بڑھیا رہتی تھی اس کو دروازوں کی کنجیاں دے کر خود پہاڑوں پر جا چڑھے، جبرئیل علیہ السلام بڑھیا کے پاس آئے اور اس سے کنجیاں لے کر شہر کے دروازے کھولے، پیغمبر ﷺ نے اس کے گھر گھر میں دورہ کیا۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا اے محمد! یہ وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے خاص کر آپ کو دیا ہے نہ اور لوگوں کو۔ یہی معنی ہیں اس قول خداوندی کے ﴿مَا آفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ... الخ﴾ (سورہ حشر: ۶)..... پھر جبرئیل علیہ السلام نے دروازے بند کر دیے اور کنجیاں آپ کو دے دیں اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو اپنے سیف کے غلاف میں رکھ لیا اور وہ غلاف آپ کی کجاوے میں متعلق تھا، پھر آپ سوار ہوئے اور زمین آپ کے لیے لپیٹ دی گئی کہ آپ قافلے میں پہنچ گئے اور لوگ اس وقت تک اپنے مقاموں پر بیٹھے ہوئے تھے، متفرق نہ ہوئے تھے، اور نہ کہیں گئے تھے کہ اتنے میں آپ نے فرمایا کہ ہم فدک گئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے مجھے ہی غنیمت میں اس کو دیا ہے۔ منافقین نے ایک دوسرے کی طرف اشارہ کیا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ یہ کنجیاں ہیں فدک کی اور ان کو اپنے غلاف سیف سے نکال کر دکھلا دیں۔ پھر لوگ سوار ہوئے اور جب مدینے میں پہنچے تو آپ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور فرمایا کہ اے بیٹی! تیرے باپ کو اللہ تعالیٰ نے غنیمت میں فدک دیا ہے اور وہ تیرے باپ ہی کے لیے خاص ہے نہ اور مسلمانوں کے لیے، میں اس میں جو چاہوں کروں..... الخ۔

(ترجمہ اردو حیات القلوب جلد ۲ صفحہ ۳۴۷-۳۴۸ پر بھی یہ روایت موجود ہے)

ملا باقر مجلسی تفسیر فرات بن ابراہیم سے روایت مذکورہ بالا سے بھی بڑھ کر ایک عجیب و غریب روایت نقل کرتے ہیں جو ان کے مذاق کے بالکل مطابق ہے اور جس میں ان کو گویا اس بات کا دکھانا ہے کہ فدک بہد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اور بعض سرداران فدک کے قتل کے بعد پیغمبر خدا ﷺ کے قبضے میں آیا تھا اور اس سے ضمناً فدک پر جناب امیر کا حق ثابت کرنا منظور ہے، وہ روایت یہ ہے کہ زین بن محمد بن جعفر علوی نے محمد بن مروان سے اور اس

نے عبید بن جحیٰ سے اور اس نے محمد بن علی بن الحسین علیہ السلام سے یہ روایت کی ہے:

”جبرئیل پیغمبر خدا ﷺ کے پاس آئے اور آنحضرت ﷺ نے اپنے ہتھیار لگائے اور اپنی سواری پر زین کسا اور علی علیہ السلام نے بھی اپنے ہتھیار لگائے اور زین کسا، پھر دونوں آدھی رات کو اس طرف چلے جسے کوئی نہیں جانتا تھا اور جہاں خدا نے ان کو لے جانے کا ارادہ کیا تھا، یہاں تک کہ وہ فدک میں پہنچے اس وقت آپ سے علی علیہ السلام نے عرض کیا کہ میں آپ کو اٹھا کر لے چلوں گا۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں میں تم کو لے چلوں گا۔ پس آپ نے علی علیہ السلام کو اپنے بازو پر اٹھا لیا اور لے چلے یہاں تک کہ قلعہ فدک کی شہر پناہ پر پہنچ گئے اور وہاں سے علی علیہ السلام قلعہ میں داخل ہوئے اور ان کے پاس آنحضرت ﷺ کی تلوار تھی، وہاں جا کر علی علیہ السلام نے اذان دی، اور تکبیر کہی کہ قلعہ والے اس آواز کو سن کر گھبرائے ہوئے دروازے پر نکل آئے اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئے، پھر ان کے سامنے آنحضرت ﷺ آگے اور علی علیہ السلام بھی ان کی طرف پہنچ گئے، پھر علی نے اٹھارہ آدمی ان کے سرداروں اور بزرگوں میں سے قتل کیے اور باقیوں نے اپنے آپ کو حوالے کر دیا۔ اور آنحضرت ﷺ نے ان کے بچوں کو اپنے آگے کر لیا اور جوانوں میں سے بچے ان کے مال و اسباب کو ان کی گردنوں پر رکھ کر مدینے کو لے گئے۔ پس کسی اور کو سوائے آنحضرت ﷺ کے فدک کے لینے میں تکلیف نہیں کرنی پڑی، اس لیے فدک آپ کے اور آپ کی ذریت کے لیے مخصوص ہوا اور مسلمانوں کا اس میں کوئی حصہ نہ ہوا۔

(بحار الانوار، کتاب الفتن صفحہ ۹۰)

غرض کہ یہ امر بین الفریقین مسلم ہے کہ فدک ان اموال میں سے ہے جس کو فے کہتے ہیں، ان لیے ہم فے کے معنی اور اس کا مصرف بیان کرتے ہیں۔



فے کے معنی اور ان کا مصرف

لسان العرب میں ہے کہ ❶ فے اس غنیمت اور خراج کو کہتے ہیں جو مسلمانوں کو کفار کے اموال سے بے جنگ و جہاد کے حاصل ہوئی ہو۔ اصل میں فے کے معنی رجوع کے ہیں، گویا اصل میں مسلمانوں ہی کا تھا انہی کی طرف لوٹ آیا۔ اور اسی وجہ سے فے اس سایہ کو کہتے ہیں، جو زوال کے بعد ہوتا ہے کیونکہ وہ مغرب کی جانب سے مشرق کی جانب لوٹ جاتا ہے۔

یہ فے کا لفظ قرآن مجید سے لیا گیا ہے اور یہ کہ وہ کس سے مخصوص ہے اور اس کا مصرف کیا ہے، آیت مفصلہ ذیل میں جو سورہ حشر میں واقع ہے مذکور ہے۔ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَمَا آفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْهُمْ فَبَأِ أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ وَلَكِنَّ اللَّهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهُ عَلَى مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ مَا آفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ﴾

(سورہ الحشر: ۶، ۷)

”جو ہاتھ لگایا اللہ نے اپنے رسول کو ان سے سو تم نے نہیں دوڑائے اس پر گھوڑے نہ اونٹ مسلط کر دیتا ہے، اپنے رسول کو جس پر چاہے اور اللہ سب چیز کر سکتا ہے جو ہاتھ لگائے اللہ اپنے رسول کو بستیوں والوں سے سوا اللہ کے واسطے اور رسول کے اور ناطے والوں کے اور یتیموں کے اور محتاجوں کے اور مسافر کے۔“

❶ اصل عبارت یہ ہے: الفء الغنیمۃ و الخراج و هو ما حصل للمسلمین من اموال الکفار من غیر حرب ولا جہاد و اصل القی الرجوع کا نہ کان فی الاصل لهم فرجع اليهم و منه قيل الظل الذی یكون بعد الزوال فی لانه یرجع من جانب الغرب الی جانب الشرق۔ ۱۲

تفسیر کبیر کی جلد ششم مطبوعہ مصر کے صفحہ ۲۷۱ میں اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ مبرد کا قول ہے کہ فاء یفیء جب بولا جاتا ہے کہ جب کوئی چیز لوٹے۔ اور جب خدا کسی چیز کو لوٹا دے تو آفاء اللہ بولتے ہیں۔ ازہری کا قول ہے کہ فے ان مالوں کو کہتے ہیں جو بغیر لڑائی کے خدا مخالفین سے مسلمانوں کو دلواتا ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہیں یا مخالفین اپنے وطنوں سے نکل جائیں اور ان کو مسلمانوں کے لیے چھوڑ جائیں، یا جزیہ پر صلح کر لیں جس کو ہر شخص کی طرف سے ادا کیا کریں، یا علاوہ جزیہ کے اور کوئی چیز خونریزی کے فدیہ میں ملے جیسے کہ بنو نضیر نے آنحضرت ﷺ سے صلح کے وقت کیا تھا کہ ہر تین آدمی ایک اونٹ کو علاوہ ہتھیاروں کے اور جس چیز سے چاہیں بھر لیں اور باقی ماندہ چھوڑ جائیں، پس یہ باقی ماندہ مال فے ہے۔ یہی وہ مال تھا جس کو خدا نے کفار سے مسلمانوں کی طرف پھیر دیا۔ اور منہم کی ضمیر یہود اور بنو نضیر کی طرف پھرتی ہے۔ ((فما او جفتم وجف الفرس البعیر یجف و جفا و وجیفا)) سے ہے۔ وجف کے معنی تیز روی کے ہیں۔ جب کوئی شخص کسی کو تیز روی پر مادہ کرے تب ”او جف صاحبہ“ کہا جاتا ہے۔ اور علیہ کی ضمیر ما آفاء اللہ کی طرف راجع ہے اور من خیل و لارکاب، رکاب اونٹ کی سواری کو کہتے ہیں۔ عرب کے لوگ اونٹ ہی کے سوار کو راکب کہتے ہیں، اور گھوڑے کے سوار کو فارس۔ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی تھی کہ جیسے آپ نے مال غنیمت کو لوگوں میں تقسیم کر دیا ہے، ایسے ہی مال فے کو بھی تقسیم کر دیجیے، اس پر خدا تعالیٰ نے ان دونوں چیزوں میں فرق بیان کر دیا کہ مال غنیمت وہ ہے جس کے حاصل کرنے میں تم نے محنت برداشت کی ہو اور گھوڑوں اور اونٹوں سے اس پر حملہ کیا ہو۔ اور فے اس کے خلاف ہے، اس کے حاصل کرنے میں تم کو کچھ تھکان نہیں ہوئی، اس لیے یہ رسول اللہ ﷺ کی سپردگی میں رہے گا، وہ جہاں چاہیں اس کو صرف کریں۔

اسی آیت کی تفسیر میں امام رازی لکھتے ہیں کہ اگر یہ آیت بنو نضیر کے اموال کے متعلق ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے اموال لڑائی کے بعد ضبط کیے گئے تھے، اس لیے چاہیے

کہ وہ مالِ غنیمت ہوں نہ منجملہ مالِ فے کے۔ اور اس کا وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ مفسرین نے دو وجہ بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ آیت بنی نضیر کی بستیوں کے متعلق نہیں ہے بلکہ فدک کے متعلق ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ اگرچہ بنی نضیر کے اموال کے متعلق ہے، مگر جب ان سے لڑائی ہوئی تھی تب مسلمانوں کے پاس گھوڑوں اور اونٹوں کا کچھ سامان نہ تھا اور نہ کچھ ایسی مسافت قطع کرنی پڑی تھی وہ لوگ مدینے سے صرف دو میل پر تھے، مسلمان وہاں سے پیادہ پاؤں وہاں چلے گئے، صرف رسول اللہ ﷺ اونٹ پر سوار تھے اور لڑائی بھی بہت خفیف سی ہوئی تھی اور گھوڑے اور اونٹ تو بالکل موجود ہی نہ تھے، اس لیے خدا تعالیٰ نے ان چیزوں کے حاصل ہونے کو ویسا ہی قرار دیا جیسے بغیر لڑائی کے حاصل ہوتے ہیں۔ اور یہ مال آنحضرت ﷺ کے لیے خاص کر دیا۔ اس کے بعد ایک روایت میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان مالوں کو مہاجرین میں تقسیم کر دیا تھا، انصار میں سے صرف تین آدمیوں کو دیا تھا جو حاجت مند تھے ابودجانہ، اور سہل بن حنیف، اور حارث بن صمہ رضی اللہ عنہم۔

ان اموال کے متعلق جو رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں آئے اور آپ کے بعد خلفاء اور ائمہ اس پر متصرف ہوئے ضروری ہے کہ ان کے اقسام اور حقیقت اور مصرف کا بیان ذرا تفصیل سے کیا جائے تاکہ معلوم ہو کہ فے جسے کہتے ہیں اس میں اور دیگر اقسام میں مثل غنیمت وغیرہ کے کیا فرق ہے اور ان اموال پر رسول خدا ﷺ یا خلفاء اور ائمہ کا تصرف مالکانہ تھا یا متولیانہ، چنانچہ اسے ہم بیان کرتے ہیں۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اکثر صدقہ اور صدقات کا لفظ قرآن مجید اور احادیث میں آیا ہے اس کے دو معنی ہیں۔ ایک عام اور ایک خاص۔ کبھی وہ اپنے عام معنی میں ان اموال پر بولا جاتا ہے جو مسلمانوں کے مصالح اور انتظام لشکر اور دیگر کاموں میں صرف کرنے کے لیے حاصل کیے جاتے ہیں اور ان معنی میں صدقہ، زکوٰۃ اور اموال لا وارث اور خمس غنیمت، خراج اور فے وغیرہ سب کو شامل ہے۔ اور کبھی مخصوص معنی میں اس کا استعمال ہوتا ہے، اور اس سے مراد صرف زکوٰۃ اور صدقہ اصطلاحی، یعنی خیرات ہوتی ہے، اور وہ صدقہ جو اہل بیت رسول اللہ

پر حرام ہے وہ صدقہ مخصوص ہے، یعنی زکوٰۃ اور خیرات۔

جو مال آنحضرت ﷺ کے قبضے میں آتا اس کی تین قسمیں تھیں۔ زکوٰۃ، غنیمت، فے، زکوٰۃ پر صدقہ کا اطلاق ہوتا ہے اور اس کا ذکر سورہ توبہ میں ہے، اسی میں زکوٰۃ کا مصرف بیان کیا گیا ہے۔ غنیمت اس مال کو کہتے ہیں جو لڑائی میں ہاتھ آئے اور اس کو بعض انفال بھی کہتے ہیں، اور اس کا ذکر سورہ انفال میں آیا ہے۔

زکوٰۃ کے مصرف کے متعلق خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ وَالْعَمِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغُرَمِيِّنَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝﴾ (سورہ توبہ: ۶۰)

”زکوٰۃ جو ہے سو وہ حق ہے مفلسوں کا اور محتاجوں کا اور زکوٰۃ کے کام پر جانے والوں کا جن کا دل پر چانا منظور ہے اور گردنوں کے چھڑانے میں اور جو تاوان بھریں اور اللہ کے راستے میں اور راہ کے مسافر کو ٹھہرایا ہوا ہے اللہ کا۔“

یعنی صدقات کے مستحق صرف یہ لوگ ہیں فقیر، یعنی وہ محتاج جو سوال نہ کرتے ہوں، اور مسکین، یعنی وہ محتاج جو بھیک مانگتے ہوں اور وہ لوگ جو تحصیل زکوٰۃ کے لیے مقرر ہوں اور وہ لوگ جن سے جہاد میں مدد مل سکتی ہو، اور ان کی تالیف قلوب منظور ہو، اور غلاموں کے آزاد کرنے اور قرض داروں کے قرض چکانے اور خدا کی راہ میں مثل جہاد وغیرہ کے صرف کیا جائے اور مسافروں کو دیا جائے۔ پیغمبر خدا ﷺ پر صدقات کی تقسیم میں بعض منافقوں نے اعتراض کیا تھا کہ پیغمبر دولت مندوں سے مال لیتے ہیں اور اپنے اقارب اور اہل مودت کو اپنی مرضی کے موافق دیتے ہیں اور عدل کی رعایت نہیں کرتے۔ اس لیے خدا نے اس آیت میں صدقات کا مصرف بیان کر دیا کہ رسول کو اس سے کچھ تعلق نہیں ہے، نہ وہ اپنے لیے اس میں سے کچھ حصہ لیتے ہیں نہ اس میں سے کوئی حصہ آپ کے اقارب اور عزیزوں کے لیے دیا جاتا ہے، پیغمبر صرف اس کے امین اور خازن ہیں اور خدا کے حکم کے بہ موجب اس کی تقسیم کرنے

والے۔ ((فكان عليه الصلوة والسلام يقول ما اعطيكم شيئاً ولا امنعكم انما ان خازن اضع حيث امرت)) کہ میں تمہیں نہ کچھ دیتا ہوں اور نہ روکتا ہوں، میں صرف خزانچی ہوں جہاں حکم ہوتا ہے وہاں خرچ کرتا ہوں۔

غنیمت کے متعلق سورہ انفال کے شروع میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ قُلِ الْأَنْفَالُ لِلَّهِ وَالرَّسُولِ فَأَتَقُوا اللَّهَ وَاصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾

(سورہ انفال: ۱)

”یعنی پوچھتے ہیں تجھ سے اے محمد! مال غنیمت کی نسبت کہہ دے ان سے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کا ہے، سو ڈرو اللہ سے آپس میں جھگڑا نہ کرو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم ایمان والے ہو۔“

یہ آیت بدر کی لڑائی میں جو غنیمت ہاتھ آئی تھی اس کے متعلق نازل ہوئی۔ چونکہ یہ پہلی لڑائی تھی اور پہلی ہی غنیمت، جو مسلمانوں کو ہاتھ لگی تھی، اس لیے اس کی نسبت کچھ جھگڑا پیدا ہوا۔ اور جیسا کہ ”معالم التنزیل“ وغیرہ میں بیان کیا گیا ہے جھگڑے کا سبب یہ تھا کہ زمانہ جاہلیت میں غنیمت کے مال کا یہ دستور تھا کہ تقسیم ہونے سے پہلے سردار لشکر جو چاہتا تھا اول اپنے لیے پسند کر لیتا اور اسی پسند کی ہوئی چیز کو صفی کہتے (جس کی نسبت صفایا کا لفظ مستعمل ہے اور جا بجا اس بحث میں آیا ہے) اور تقسیم کے وقت چوتھا، یعنی چہارم حصہ سردار کو دیا جاتا تھا باقی جو رہتا وہ لڑنے والوں اور فتح کرنے والوں میں تقسیم ہوتا۔ اور کوئی چیز خاص کسی شخص کے ہاتھ آتی تو وہ اس کو اپنی ملکیت سمجھتا۔ اور اس طور پر زبردست اور تو نگر لوگ غریبوں پر ظلم کرتے اور عمدہ اور اچھا مال خود لے لیتے، مال غنیمت کی نسبت بھی انہیں خیالات سے کچھ جھگڑا پیدا ہوا اور چونکہ اس وقت تک مسلمانوں کے لیے غنیمت کے مال کی نسبت کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا، اس لیے لوگوں نے آپ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ چوتھا اور صفی (یعنی جو مال پسند آئے) غنیمت میں سے لے لیں اور باقی چھوڑ دیں تاکہ ہم آپس میں تقسیم کر لیں۔ اس پر خدا

نے یہ حکم بھیجا کہ مالِ غنیمت کسی کی ملکیت نہیں ہے بلکہ خدا اور خدا کے رسول کی ملکیت ہے اس پر کچھ جھگڑا نہ کرو۔

واضح ہو کہ اللہ و الرسول سے یہ مدعا نہیں ہے کہ خدا کے لیے نصف حصہ ہو اور نصف حصہ رسول کے لیے، بلکہ اس سے مراد ہے کہ وہ خدا کا مال ہے اور رسول اس کا امین اور تقسیم کرنے والا ہے۔ رسول کا نام لینے سے یہ مدعا نہیں ہے کہ رسول کی ذاتی ملکیت اور خانگی مالیت ہے، بلکہ اس طرح کے کلام سے صرف خدا ہی کی ملکیت مراد ہوتی ہے اور خدا کی ملکیت قرار دینے سے یہ مطلب ہے کہ کوئی خاص شخص اس پر دعویٰ نہیں کر سکتا بلکہ خدا جس طرح پر حکم دے گا اسی طرح پر کیا جائے گا۔ پھر اسی صورت کی بیالیسویں آیت میں یہ حکم ﴿وَأَعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ﴾ (سورۃ الانفال: ۴۱) کہ مالِ غنیمت میں سے خمس خدا اور خدا کے رسول کے لیے ہے جو قرابت مندوں اور غریبوں اور یتیموں اور مسافروں کی مدد پہنچانے اور ان کی حاجت بر لانے کے لیے رہے گا، اور چار خمس ان لوگوں میں جوڑتے تھے یا لڑائی کے متعلق کاموں میں مصروف تھے، تقسیم کیا جائے گا۔

الفاظ ﴿وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ﴾ سے صاف اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ خمس غنیمت مثل ایامِ جاہلیت کے بحیثیت لشکر کی سرداری کے آپ کی ذاتِ خاص کے لیے خدا نے مقرر نہیں کیا بلکہ جاہلیت کی رسم کو مٹا کر خمس اس لیے مقرر کیا کہ وہ آپ کی اور آپ کے رشتہ داروں کی ذاتی ضرورت میں خرچ ہو اور جو کچھ بچے وہ یتیموں، مسکینوں اور مسافروں میں تقسیم کیا جائے۔ اور اس میں خدا کو اس بات کا ظاہر کرنا منظور تھا کہ اس نے اپنے رسول کو صرف حفاظتِ اسلام اور صیانتِ مسلمین اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے کفار سے مقابلہ اور مقاتلہ کرنے کا حکم دیا ہے، ورنہ اس کا رسول ملک گیری اور حصولِ سلطنت اور مال و متاع لینے اور حبِ جاہ کے لیے خیال سے بری اور پاک ہے، اور اسی لیے مثل ایامِ جاہلیت یا دنیا کے عام سردارانِ لشکر کے نہ غنیمت میں اپنی ذاتِ خاص کے لیے وہ کوئی حصہ لیتا

ہے اور نہ اس سے کوئی خانگی جائیداد اور ذاتی ملکیت پیدا کرنی اسے منظور ہے، بلکہ جو حصہ غنیمت میں سے نکالا گیا ہے اس میں یتامی، مساکین، ابن سبیل (مسافر) اور ذوالقربیٰ سب شریک ہیں اور انہیں کی اعانت اور خبر گیری اور رفع ضروریات کے لیے وہ اس کے تصرف میں بطور امین اور خازن کے رکھا گیا ہے۔ اور یہ وہ امر ہے کہ جس کو دیکھ کر دشمن سا دشمن اسلام کا بھی کسی قسم کا نفسانیت یا حب جاہ اور حصول ملکیت کا ذرا سا بھی الزام رسول پر نہیں لگا سکتا اور یقین کر سکتا ہے کہ اسلام خدا کا سچا مذہب ہے اور اس کے احکام کسی کی ذاتی آسائش اور آرام کے لیے نہیں ہیں اگرچہ وہ خدا کا پیغمبر ہی کیوں نہ ہو اور جو کچھ اس کے نام سے مقرر کیا گیا ہے وہ بھی اس لیے کہ اپنی اور اپنے رشتہ داروں کی معمولی ضرورت پوری کرنے کے بعد وہ یتیموں، غریبوں اور مسافروں کی خبر گیری میں خرچ کرے، اور اپنے واسطے کچھ نہ رکھے۔ اور یہی وہ بات ہے جو آپ کی سیرت، عادت اور عمل سے ظاہر ہے کہ جو کچھ خمس میں آتا ہے اور اپنے اہل و عیال کے معمولی مصارف کے بعد سب کو آپ خدا کی راہ میں خرچ کر دیا کرتے اور کل کے لیے کچھ نہ رکھتے اور اگر کچھ رہ جاتا تو جب تک خدا کی راہ میں وہ خرچ نہ ہو جاتا آپ کو چین نہ آتا۔ ((والله يعلم حیث یجعل رسالتہ .))

تفسیر صافی میں ہے کہ ((قل الانفال للہ والرسول مختصة بہما یضعانہا حیث شاء)) کہ یہ مال غنیمت خدا اور خدا کے رسول کے ساتھ مخصوص ہے کہ جہاں وہ چاہیں اسے صرف کریں۔ تہذیب میں امام باقر اور امام جعفر صادق سے بیان کیا گیا ہے کہ فے اور انفال اس مال کو کہتے ہیں جو بغیر خون ریزی کے صلحاً حاصل ہوا ہو۔ اور فے و انفال ایک ہی چیز ہے۔ فے کے متعلق جو آیتیں ہیں وہ سورہ حشر میں بیان کی گئیں ہیں۔ پہلی آیت یہ ہے:

﴿وَمَا آفَاءَ اللَّهِ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْهُمْ فَبَأْ أُوجِفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ وَلَكِنَّ اللَّهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهُ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝﴾ (سورہ حشر: ۶)

”جو کچھ خدا اپنے رسول پر فے کرتا ہے، یعنی کفار کا مال اسے دلاتا ہے اس میں تقسیم نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ تم اونٹ اور گھوڑوں پر سوار ہو کر جنگ کے لیے نہیں گئے اور تم کو لڑائی نہیں کرنی پڑی، اس لیے اس میں مثل غنیمت کے مال کی تقسیم نہیں ہو سکتی۔“

اس کے بعد دوسری آیت میں فے کی تقسیم کا بیان ہے اور وہ یہ ہے:

﴿مَا آفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي

الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَأَبْنِ السَّبِيلِ﴾ (سورہ حشر: ۷)

”کہ جو فے رسول خدا کو حاصل ہو وہ خدا اور اس کے پیغمبر اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے کام میں لانے کے لیے ہے۔“

فے کی نسبت بحث طلب امر یہ ہے کہ آیا وہ مال آنحضرت ﷺ کی ملک تھا اور وہ آپ کا ذاتی اور خانگی مال سمجھا جاتا یا وہ آپ کے اختیار میں تھا کہ خدا کے حکم کے مطابق اس کو کام میں لاتے اور جیسی مصلحت ہوتی مسلمانوں کے فائدے اور دیگر ضروریات شرعی میں خرچ کرتے۔ جو بات آپ کی عادت اور خصلت سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ تصرف تو کر سکتے تھے، لیکن بالامر، یعنی جہاں خدا کا حکم ہوتا تھا وہیں صرف فرماتے، ملک و خود مختار نہ تھے کہ جسے جی چاہتا دے دیتے اور جسے نہ چاہتا نہ دیتے۔ بلکہ اس میں ایسا تصرف کرتے تھے جس طرح غلام مامور ہوتا ہے کہ جہاں اس کے مولیٰ کا حکم ہو وہاں صرف کرے۔ اور اس کی تشریح خود آپ نے فرمادی ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا خدا کی قسم! نہ میں اپنی طرف سے کسی کو دیتا ہوں اور نہ منع کرتا ہوں میں تو ایک تقسیم کرنے والا ہوں جہاں مجھے حکم ہوتا ہے دیتا ہوں اور جہاں نہیں ہوتا نہیں دیتا۔ اور جس طرح آپ فے کے مال کو صرف فرماتے اس سے بھی یہی بات نکلتی ہے، اس لیے کہ جو کچھ ان زمینوں سے آتا جو فے تھیں اس میں سے آپ اپنی ذات خاص کے لیے اور اپنے اہل و عیال کے لیے ایک سال کے خرچ کے لائق لیتے اور باقی سوار یوں اور سامان لشکر کی تیاری میں صرف فرماتے۔ غرض کہ فے پر آپ کا

تصرف متولیانہ تھانہ کہ مالکانہ۔ اور خدا کا یہ فرمانا کہ یہ رسول کے لیے ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ اس میں کسی دوسرے کا ساتھیوں میں سے حصہ نہیں ہو سکتا اور نہ غنیمت کے مال کی طرح اس کی تقسیم ہو سکتی ہے وہ رسول کے قبضے میں رہے گا کہ اس کو اسلام کی ضرورتوں اور لشکر کے کاموں اور اقارب اور یتامی اور مساکین اور محتاجین کے حاجت براری میں صرف کرے، اور چونکہ آپ کو کفار سے لڑنے اور صلح کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی اور اس کے انتظام کے لیے مصارف کی بھی حاجت ہوتی تھی اور غنیمت کے مال میں سے چارخمس لشکریوں پر تقسیم ہو جاتے تھے، اور خمس جو باقی رہتا وہ دیگر حوائج ضروری کے لیے کافی نہ ہوتا، اس لیے وہ مال جو بلا لڑائی دشمنوں سے ہاتھ آتا خاص آپ کے اختیار میں رکھا گیا کہ وہ ملکی ضرورتوں میں کام آئے۔

تفسیر صافی میں حضرت امام جعفر صادق سے منقول ہے کہ ”انفال اور نے میں وہ مال داخل ہیں جو بغیر لڑائی کے دارالحرب سے حاصل ہوں اور زمین جس کے رہنے والے نکال دیے گئے ہوں اور بغیر جنگ کے ہاتھ آئی ہو اور زمین اور جنگل اور بادشاہوں کی جاگیریں اور لاوارث کا مالیہ سب نے میں داخل ہیں، اور وہ خدا اور اس کے رسول کا ہے اور رسول کے بعد جو اس کا قائم مقام ہو اس کا ہے۔“ اس حدیث سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نے ذاتی اور خانگی ملکیت نہیں تھی بلکہ خاص اہتمام میں رسول کے مصالح ملکی کے مصرف کے لیے رکھی گئی تھی۔ اور اسی واسطے وہ بعد آنحضرت ﷺ کے اس کے اختیار میں ہوا جو آپ کا قائم مقام ہوا، ورنہ جو الفاظ ((هِيَ لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِمَنْ قَامَ مَقَامَهُ بَعْدَهُ)) کے حضرت امام جعفر صادق نے فرمائے بے معنی ہوئے جاتے ہیں اور اصل حدیث کے الفاظ جو صافی میں منقول ہیں وہ یہ ہیں: ((وَفِي الْجَامِعِ عَنِ الصَّادِقِ الْإِنْفَالِ كُلِّ مَا أَخَذَ مِنْ دَارِ الْحَرْبِ بَغَيْرِ قِتَالٍ وَكُلِّ أَرْضٍ أَنْجَلَى أَهْلِهَا عَنْهَا بَغَيْرِ قِتَالٍ وَسَمَاهَا الْفُقَهَاءُ فَيْئًا وَالْأَرْضُونَ الْمَوَاتِ وَالْأَجَامِ وَبَطُونَ وَالْأَوْدِيَةَ وَقَطَائِعِ الْمَمْلُوكِ وَمِيرَاثِ مَنْ لَا وَارْثَ لَهُ وَهِيَ لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِمَنْ قَامَ مَقَامَ بَعْدَهُ)) اور پھر دوسری حدیث اس میں کافی سے منقول ہے کہ امام جعفر صادق فرماتے ہیں:

((الانفال مالم یوجف علیہ بخیل و لارکاب او قوم صولحوا او قوم اعطوا بایدیہم و کل ارض خربة و بطون الاوحیة فهو لرسول اللہ و هو للامام من بعدہ یضعہ حیث یشاء)) کہ انفال وہ مال ہے جو بغیر لڑائی کے حاصل ہوا ہو یا صلح سے یا لوگوں کے اپنے آپ سے یا زمین غیر آباد اور جنگل سے وہ خدا کے رسول کا ہے اور بعد ان کے امام کا کہ جیسا مناسب جانے خرچ کرے۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ انفال اور فے صرف متولیانہ پیغمبر کے اور ان کے بعد امام کے اختیار میں ہوتا، ورنہ حضرت امام جعفر صادق جو بقول شیعوں کے پیغمبر خدا ﷺ کے ترکے میں تقسیم میراث کے معتقد ہوں گے، یہ نہ فرماتے کہ انفال اور فے بعد رسول کے امام کا ہوتا ہے کیوں کہ امام کا لفظ خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بحیثیت قائم مقامی رسول وہ مال امام تک پہنچتا ہے نہ کہ بحیثیت ترکہ اور میراث کے اور یہ بات تمام دنیا میں جاری ہے کہ شہنشاہ سے لے کر ایک چھوٹے رئیس تک جو صاحب ملک و ریاست ہو وہ دو حیثیتیں رکھتا ہے، ایک ذاتی اور خانگی دوسری سلطنتی اور ریاستی۔ پہلی حیثیت کے لحاظ سے جو جائیداد ان کے قبضے میں ہوتی ہے وہ ان کا ذاتی مال ہوتا ہے، اور دوسری حیثیت سے جو جائیداد، خزانہ، خراج اور دیگر قسم کی تمام آمدنی ہوتی ہے وہ سلطنت اور ریاست کے متعلق سمجھی جاتی ہے اور اس کے بیت المال میں داخل کی جاتی ہے، جسے اس زمانے میں اسٹیٹ پراپرٹی اور پبلک ٹریزری کہتے ہیں۔ پہلے مال میں میراث باضابطہ جاری ہوتی ہے اور دوسرے مال پر اس کے قائم مقام کا قبضہ ہوتا ہے اور وہ مطابق اصول معینہ اور قواعد مقررہ اور احکام جاریہ کے تصرف کرتا ہے۔

آیت ﴿وَأَعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ﴾ میں جہاں خمس کے مصرف کا بیان ہے وہاں صاحب تفسیر صافی یہ لکھتے ہیں: ((و فی الکافی عن الرضا انه سئل عن هذه الایة فقیل له فما کان اللہ فلمن هو فقال لرسول اللہ وما کان لرسول اللہ فهو للامام)) کہ حضرت امام موسیٰ علیہ السلام سے کسی نے پوچھا کہ آیت ﴿أَنَّ لِلَّهِ خُبُسَهُ وَ لِلرَّسُولِ﴾ میں جو حصہ خدا کا ہے وہ کس کا ہے، آپ نے فرمایا وہ رسول کے لیے ہے اور جو

رسول کے لیے وہ امام کے واسطے ہے۔ اس سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مال ذاتی اور خانگی رسول کا نہیں تھا اور نہ بحیثیت وراثت تقسیم ہو سکتا تھا بلکہ وہ امام کو پہنچتا ہے کیونکہ امام رسول کا قائم مقام ہوتا ہے۔ اور تفسیر قمری میں اسی سے بیان کیا گیا ہے کہ ((سہم اللہ الرسول یرثہ الامام)) یعنی خدا اور رسول کے حصے کا وارث امام ہوتا ہے اور امام کے لیے ہونے کا سبب یہ ہے کہ جو باتیں پیغمبر کو کرنی پڑتی تھیں، یعنی مسلمانوں کی مدد اور قضاء دیون اور فراہمی سامان لشکر و مصارف حج و جہاد وہ سب امام کو کرنی پڑتی ہیں: ((كما قال القمى والخمس يقسم على ستة اسهم سهم الله و سهم لرسول الله وسهم للامام فسهم الله وسهم الرسول يرثه الامام فيكون للامام ثلثة اسهم من ستة و ثلثة اسهم لايتام ال الرسول و مساكنهم و ابناء سبيلهم وانما صارت للامام و حده من الخمس ثلاثة اسهم لان الله تعالى قدالزمه بما الزم النبى من مائة المسلمين و قضاء ديونهم و حلهم فى الحج و الجهاد.))

تفسیر ”منہج الصادقین“ میں ذیل آیت ﴿مَا آفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ﴾ کے لکھا ہے کہ فی اس مال کو کہتے ہیں جو کفار سے مسلمانوں کے ہاتھ آئے بغیر لڑائی کے اور سواروں نے اس پر حملہ نہ کیا ہو، اور یہ مال پیغمبر کے لیے ہوتا ہے ان کی زندگی میں اور بعد ان کے اس آدمی کے اختیار میں جو ائمہ دین سے ان کے قائم مقام ہو اور ان کو اختیار ہے کہ جس کو چاہیں دیں اور جس کام میں مناسب جانیں خرچ کریں، اور یہ قول امیر المؤمنین کا ہے۔ چنانچہ اس کے الفاظ یہ ہیں:

((سوم فے است (یعنی منجملہ اموالیکہ ائمہ و ولایة دراں تصرف دارند) و آن مالے ست کہ کہ از کفار بہ مسلمانان منتقل شود بدون قتل و ایجاف خیل و رکاب و آن رسول رابا شد در حیات وی و بعد از وی کسے را کہ قائم مقام وی باشد

از ائمه دینو ایشاں بھر کس کہ خواہند دہند و بھر چہ صلاح
 باشد صرف نمایند و این قول امیر المومنین است صلوة اللہ
 و سلامہ علیہ .))

اور یہ قول جو جناب امیر المومنین کا صاحب تفسیر منہج الصادقین نے نقل کیا ہے یہ بھی صاف
 صاف اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ فے کے مال پر رسول کا تصرف متولیانہ تھا نہ کہ مالکانہ۔ اور آپ
 کے بعد اس کی تقسیم میراث کے طور پر نہیں ہو سکتی تھی بلکہ وہ آپ کے قائم مقام اور امام وقت کے
 اختیار میں رہتا تھا، اور صاحب ”تفسیر منہج الصادقین“ نے اسی کے آگے یہ لکھا ہے:

((ابن عباس و عمر و فقہای مابراوند کہ مستحقان فے و

خمس بنو ہاشم انداز فرزندان ابو طالب و عباس۔))

”ہمارے فقہاء اور ابن عباس و ابن عمر کا متفقہ بیان ہے کہ بنو ہاشم، یعنی فرزندان

ابو طالب و عباس رضی اللہ عنہما نے اور خمس کے حق دار ہیں۔“

اور اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ فقہائے امامیہ نے رسول کا یا امام کا ذاتی مال نہیں
 سمجھتے تھے بلکہ وہ اس کا مستحق تمام بنی ہشام کو سمجھتے ہیں جس سے مراد اولاد ابو طالب اور اولاد
 عباس ہے نہ کہ صرف بنی فاطمہ علیہا السلام۔ قطع نظر روایتوں اور اقوال اور حدیثوں کے خود قرآن
 مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ فے کا مال کسی کی ذاتی ملکیت اور خانگی جائیداد نہیں ہو سکتا، اس لیے
 کہ آیت ﴿مَا آفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَى﴾ میں جو یہ حکم دیا گیا ہے کہ فے
 خدا، رسول، یتامی، مساکین اور مسافرین کے لیے ہے ان میں یتامی اور مساکین
 اور ابن سبیل کا شریک کرنا اس لیے ہے کہ یہ مال ذاتی ملکیت نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کی خبر
 گیری کے لیے ہے۔ اور یہ مثل اس کے ہے کہ بادشاہ اپنے کسی صوبے کے حاکم کو آمدنی پر
 اختیار دے اور اس کے مصارف بتا دے۔ بلاشبہ اس حاکم کو اختیار ہوتا ہے کہ جو کچھ اس کی
 ذات کے لیے مقرر ہے وہ اس میں سے نکال کر باقی آمدنی کو اپنی رائے اور صوابدید کے
 مطابق ان مصارف میں صرف کرے جو اس کے بادشاہ نے بتا دیے ہیں نہ یہ کہ اس کے

اختیار میں ملک کی آمدنی دینے سے یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی جائیداد سمجھے اور بلا پابندی احکام بادشاہ کے جہاں چاہے خرچ کرے اور اسے بطور میراث کے اپنے وارثوں پر تقسیم ہونے کے لیے چھوڑ جائے۔ اسی طرح نے کو خدا نے پیغمبر ﷺ کے اختیار میں دیا اور اس کے مصارف بتا دیے کہ اپنی ذاتی ضرورتوں میں صرف کرنے کے بعد جو کچھ بچے وہ رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے کام میں خرچ کریں۔ اگر یہ منظور نہ ہوتا اور مالکانہ قبضہ مراد ہوتا تو صرف لفظ للرسول کا ارشاد ہوتا اور یتامیٰ اور مساکین اور ابن سبیل اس کے شریک نہ کیے جاتے۔ اور اسی امر کو خدا نے آگے چل کر زیادہ صراحت سے بیان کر دیا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

﴿ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ ﴾ (سورہ حشر: ۶)

”تا کہ نہ آئے لینے دینے میں دولت مندوں کے تم میں سے۔“

کہ یہ حکم ہم نے اس لیے دیا ہے کہ مال نے مال داروں ہی کے ساتھ مخصوص نہ ہو جائے کہ دست بدست ان میں پھرتا رہے۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ مال ذاتی ملکیت کسی کا ہو جائے اور ”أَبَا عَن جَدِّ“ ایک دوسرے کو پہنچتا رہے۔ چنانچہ تفسیر ”منہج الصادقین“ میں اسی آیت کے ذیل میں لکھا ہے:

((حق سبحان آن را یعنی فے را خاصہ پیغمبر گردانید و

قسمت آنرا بر وجهیکہ مذکور شد مقرر ساخت و فرمود کہ

بریں طریق کہ حکم فے نمودیم کیلا یکون تانبا شد آن فے

دولة آن چیزے کہ متداول باشد دست بدست گرداں بین

الاغنیاء منکم میان توانگراں از شما کہ بآن مکاثرت کنید و

بقوت و غلبہ زیادہ از حق خود بردارید و فقراء را اندک دھید

یا محروم سازید چنانکہ در زمانہ جاہلیت بود.))

”اللہ نے مال نے رسول اللہ ﷺ کے لیے خاص کر کے اس کی تقسیم مذکور مقرر

کردی اور حکم دیا کہ یہ مال نے دولت کی مانند دوسروں کے ہاتھوں اس طرح گردش نہ کرے کہ دولت مندوں کو زیادہ اس لیے ملے کہ وہ اکثریت تعدادی و قوت کے پیش نظر اپنے حق سے زیادہ لے لیں اور فقیروں کو تھوڑا دیں یا ان کو بالکل محروم کر دیں اور وہی مثال قائم ہو جائے جو زمانہ جاہلیت میں تھی۔“
اس کے بعد مفسر موصوف لکھتے ہیں:

((خطاب باہل ایمان است غیر از پیغمبر و اہل بیت و صلوة لله علیہم اجمعین .))

”پیغمبر و اہل بیت کے سوا صرف تمام مسلمانوں کو خطاب ہے۔“

لیکن اس قول کی کوئی سند نہیں ہے اور نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ مال پیغمبر یا اہل بیت میں سے کسی کا ذاتی ہے کہ اس میں ترکہ و میراث جاری ہو سکے، اور ہمارے قول کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے جو علم الہدیٰ کا تفسیر ”منہج الصادقین“ میں نقل کیا گیا ہے کہ ذوی القربیٰ سے بھی مراد امام ہے نہ کہ عام قرابت دار، اس لیے کہ امام پیغمبر کا قائم مقام ہوتا ہے اور فی اس کے اختیار میں ہونا چاہیے، جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

((از علم الہدیٰ نقل است کہ ذوی القربیٰ کہ بصورت مفرد واقع شدہ دلالت می کند بر آنکہ مراد از امام است کہ قائم مقام پیغمبر است چہ اگر مراد جمع می بود ذوی القربیٰ واقع می شد .))

”علم الہدیٰ سے منقول ہے کہ ذوی القربیٰ کا لفظ چونکہ مفرد آیا ہے، اس لیے اس سے امام مراد ہے جو رسول اللہ کے قائم مقام ہیں اور اگر امام مراد نہ ہوتے بلکہ دوسرے تمام لوگ مقصود ہوتے تو ذوی القربیٰ کا لفظ جمع ہوتا۔“

اور صاحب ”مجمع البیان“ اپنی تفسیر میں آیت ﴿كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ﴾ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

((الدولة اسم للشی الذی یتدا وله القوم بینہم یکون لہذا مراء
ای لثلا یکون لافنی متدا ولا بین الروساء منکم یعمل فیہ کما
کان یعمل فی الجاہلیة ، وهذا خطاب للمومنین دون اهل
بیتہ علیہم السلام و فی هذه الایة اشارة الی ان تدبیر الامة
مفوض الی النبی والی الائمة القائمین مقامہ ولهذا قسم
رسول اللہ اموال خبیر ومن علیہم فی رقابہم واجلی بنی
النضیر و بنی قینقاع واعطاهم شیئا من المال و قتل رجال بنی
قریظة و سبى ذرا ربہم و نسائہم و قسم اموالہم علی
المہاجرین و من علی اهل مکة))

”دولت اس چیز کو کہتے ہیں جسے لوگ آپس میں لیتے دیتے ہوں کبھی ان کی اور
کبھی ان کی ہوئے، یعنی نے صرف تمہارے امیروں کے درمیان نہ گھومتی رہے
کہ اس میں جاہلیت والا دستور جاری ہو، یہ صرف مسلمانوں کو خطاب ہے نہ کہ
اہل بیت کو۔ اس آیت میں اشارہ ہے اس امر کا کہ امت کی تدبیر نبی اور ائمہ کے
جو نبی کے قائم مقام ہیں سپرد ہے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے اموال خبیر کو
تقسیم کیا اور ان کی جانوں کے باب میں ان پر احسان کیا اور بنو نضیر اور بنو قینقاع
کو کچھ مال دے کر جلا وطن کیا اور بنو قریظہ کے لوگوں کو قتل کیا اور ان کے بچوں اور
عورتوں کو قید کیا اور ان کے اموال کو مہاجرین پر تقسیم کیا اور اہل مکہ پر احسان
فرمایا۔“

ان اقوال مذکورہ بالا سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ نے کا مال غنیمت کا مال سے
صرف اس بات میں فرض رکھتا ہے کہ اس میں کسی دوسرے کا حصہ غنیمت کے مال کی طرح
نہیں ہوتا، اور وہ رسول خدا ﷺ کے اختیار میں رکھا گیا تھا تا کہ آپ اس پر متولیاً نہ قابض
رہیں اور خدا کی مرضی اور حکم کے مطابق اسے کام میں لائیں۔ آپ کے بعد خلیفہ وقت اور امام

زماں کے قبضے اور اختیار میں دیا گیا تا کہ وہ بھی انہیں مصارف میں اسے صرف کریں، جس میں رسول خدا ﷺ صرف فرمایا کرتے تھے۔ اور اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فے کے مال میں بہ سبب اس کے کہ وہ ذاتی ملکیت آپ کی نہ تھی میراث جاری نہیں ہو سکتی تھی اور چونکہ فدک اموال فے میں سے تھا، اس لیے اگر آنحضرت ﷺ کے متروکہ میں بالفرض میراث بھی جاری ہوتی اور میراث کے حکم عام سے آپ کی ذات مبارک مستثنیٰ بھی نہ ہوتی، تاہم فدک ذاتی ملکیت نہ ہونے کی وجہ سے تقسیم اور اجراء احکام میراث سے مستثنیٰ رہتا۔

اس سے بعض دور اندیش امامیہ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دعویٰ فدک کو میراث پر محدود رکھنا مناسب نہ جان کے اس کا ہبہ کیا جانا اور فاطمہ کا دعویٰ ہبہ کرنا پیش کیا حالانکہ آنحضرت ﷺ کا فدک پر فقط متولیٰ نہ قابض ہونا نہ کہ مالکانہ خود ہبہ کو باطل کرتا ہے کیونکہ ہبہ بغیر قبضہ مالکانہ ممکن نہیں ہے، مگر ہم اس سے قطع نظر کر کے دیکھتے ہیں اور اسے ایسی تاریخ سلسلے سے بیان کرنا مناسب جانتے ہیں جس سے معلوم ہو کہ حضرات امامیہ کے متقدمین اور متاخرین علماء نے اس کی نسبت سنیوں کی روایتوں سے کیا کیا ثبوت پیش کیا ہے۔



بحث متعلق ہبہ فدک

اس کے متعلق جو کچھ شیعوں کے ان بزرگوں نے لکھا ہو جن کا زمانہ ائمہ کرام کے قریب تھا وہ ہماری نظر سے نہیں گزرا مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ زیادہ مفصل نہ ہوگا، ہم کو جہاں تک علم ہے سب سے اول کتاب جس میں یہ بحث تفصیلاً بیان کی گئی ہے وہ ثانی ہے، جسے جناب سید مرتضیٰ ملقب بہ علم الہدیٰ^۱ نے قاضی عبدالجبار کی کتاب مغنی کے جواب میں لکھا ہے۔ یہ کتاب غالباً چوتھی صدی کے اخیر یا پانچویں صدی کے شروع میں تالیف ہوئی ہے، اس لیے کہ اس کے مؤلف ۳۵۵ء میں پیدا ہوئے اور ۴۳۳ء یا ۴۳۶ء میں انتقال فرمایا ۱۳۰۱ء میں یہ کتاب ایران میں چھاپی گئی اور اس کی نسبت یہ لکھا گیا ((وہو کتاب لم یات بمثلہ احد من الانام فی سالف الشہور والاعوام ولا یاتون ابدًا ولو کان بعضهم بعض ظہیر الان اجدادہ الطاہرین کانوالہ فی نصرۃ لہم ہادیا و مویدا ونصیرا)) کہ یہ ایسی بے مثال کتاب ہے جس کے مانند گزشتہ زمانے میں کوئی نہ لکھ سکا اور نہ آئندہ لکھ سکے گا، اس لیے کہ اس کی تصنیف میں ائمہ کرام مصنف کے اجداد کی تائید اور مدد تھی۔

۱ الشریف المرتضیٰ کا پورا نام علی بن حسین بن موسیٰ الموسویٰ ہے، اپنے لقب علم الہدیٰ اور سید المرتضیٰ سے زیادہ مشہور ہیں، یہ شریف رضی جامع نبح البلاغہ کے بڑے بھائی تھے۔ ۳۵۵ء میں پیدا ہوئے دونوں بھائی شیخ مفید کے شاگرد تھے۔ خوانساری ان کے بارے میں لکھتا ہے کہ شریف المرتضیٰ علم وفہم وکلام و شعر کے اعتبار سے اپنے زمانے میں یکتا وجیہ اور عزت والے تھے، جہاں تک ان کی تصانیف کا تعلق ہے وہ سب کش سب اصول و تاسیس کا درجہ رکھتی ہیں، اس سے پہلے ان کی کوئی نظیر نہیں بطور مثال کتاب الثانی امامت میں ایک ایسی کتاب ہے جس کی کوئی نظیر نہیں، میں کہتا ہوں یہ کتاب اپنے نام کی طرح کافی و ثانی ہے۔ (روضات الجنات جلد ۴ صفحہ ۱۲۹۵ء اور مابعد کے صفحات) مذہب شیعہ کے ایک رکن اور اس کے بانیوں میں سے ہیں، ۴۳۶ء میں وفات پائی۔ (شیخ محمد فراست)

اسی کتاب شافی کے مضامین کو بہ ترتیب جدید شیخ الطائفہ ابو جعفر طوسی نے لکھا اور اس کا نام تلخیص شافی رکھا۔ یہ کتاب جیسا کہ خود مؤلف نے خاتمہ پر لکھا ہے ۴۳۲ء میں لکھی گئی۔ اس کی تعریف میں یہ بھی لکھا گیا ہے: ((وہو کاصلہ لم یات مصنف ولا مؤلف بمثلہ علی رد العلماء العامة العیاء)) یہ بھی اپنی اصل کی طرح بے مثل ہے کسی مصنف اور مؤلف نے ایسی کتاب کو چشم علمائے اہل سنت کی رد میں نہیں لکھی۔

اس کے بعد کتاب ”کشف الحق ونہج الصدق“ لکھی گئی جو تصنیف ہے لسان المتکلمین، سلطان الحکماء المتاخرین علامہ جلال الدین ابو المنصور حسن بن یوسف بن علی مطہر حلی کہ جن کی نسبت قاضی نور اللہ شوستری اپنی کتاب ”احقاق الحق“ میں فرماتے ہیں کہ اس کتاب کے مصنف نے سلطان غیاث الدین اولجا توی خدا بندہ کے سامنے علماء اہل سنت سے جو مختلف شہروں سے جمع کیے گئے تھے، مناظرہ کیا اور بدلائل عقلیہ اور براہین نقلیہ ان کے مذہب کا بطلان اور مذہب امامیہ کی حقیقت اس طور پر ثابت کی کہ علماء اہل سنت تمنا کرنے لگے کہ کاش! وہ پتھر یا درخت ہو جاتے۔ اور اس کے بعد علامہ ممدوح نے کتاب ”کشف الحق ونہج الصدق بالصواب“ تصنیف کی۔ اور سلطان مع امراء اور بہت بڑے گروہ علماء اور اکابر کے شیعہ ہو گیا۔ اور باوجودیکہ اس زمانہ میں علماء اہل سنت میں سے بڑے نامی لوگ موجود تھے جیسے کہ قطب الدین شیرازی اور عمر کاتب قزوینی اور مولیٰ نظام الدین مگر کسی نے اس کتاب کا جواب لکھنے کی جرأت نہ کی۔ یہ کتاب غالباً ساتویں صدی کے اخیر میں لکھی گئی ہے۔ اس کے مصنف ۶۴۸ء ہجری میں پیدا ہوئے اور ۷۲۴ء ہجری میں وفات پائی۔

ساتویں صدی میں ایک اور کتاب لکھی گئی جس کا نام ”طوائف فی معرفت مذاہب الطوائف“ ہے۔ جس کے مصنف ثقۃ الاسلام علی بن طاؤس حلی ہیں۔ جناب ممدوح ۵۸۰ء میں پیدا ہوئے اور ۶۶۰ء میں انہوں نے وفات پائی۔ علامہ موصوف نے اس کتاب کو تفتیۃً ایک ذمی کے نام سے لکھا ہے اور اس کا نام عبدالحمود قرار دیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں ایک تمہید اس ذمی کی طرف سے لکھی ہے کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا مذہبوں کا اختلاف سن

کر ارادہ کیا کہ مذہبی عقائد کی حقیقت دریافت کروں۔ سب سے اول میں نے دین محمدی کی تحقیق شروع کی مگر ان میں اکثر کو مالکی، حنفی، شافعی اور حنبلی مذہب پر پا کر متعجب ہوا کہ یہ لوگ نہ نبی کے زمانے میں تھے نہ ان کے اصحاب اور نہ عقائد میں باہم متفق۔ پھر کیسے وہ اپنے عقائد مذہب کو سب سے اچھا سمجھتے ہیں۔ پھر شیعوں کا ذکر لکھا ہے کہ وہ اپنے مذہب کو اماموں اور پیغمبروں کی اولاد سے منسوب کرتے ہیں۔ پھر میں نے مذاہب اربعہ کے علماء سے مذہبی عقائد کی تحقیق کی اور ان سے سوالات کیے مگر معلوم ہوا کہ حق پر نہیں ہیں اور ان کے مذہب کی برائی انہی کی کتابوں سے ثابت کی۔ گویا اس پیرائے میں علامہ ممدوح نے اپنے مذہبی عقائد کی سچائی ظاہر کی ہے۔ اور اس کتاب میں بحث فدک کو بہت تفصیل سے اور نہایت فصیح و بلیغ تقریر میں ادا کیا ہے اس کی خوبی اور قدر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جناب مولانا دلدار علی صاحب نے اپنی مشہور کتاب ”عماد الاسلام“ میں بہت بڑا حصہ ان کی تقریر کا بحث فدک میں نقل کیا ہے۔

اس کے بعد قاضی نور اللہ شوستری نے نہایت مشہور کتابیں اس فن میں تالیف کیں ان میں سے ”احقاق الحق“ نہایت مبسوط اور مشہور کتاب ہے جو جواب میں ابطال الباطل کے جس کو علامہ روز بہان نے ”کشف الحق“ کے جواب میں لکھا تھا۔ قاضی صاحب نے تصنیف فرمایا ہے۔

گیارہویں صدی میں جناب ملا باقر مجلسی نے جن کا خطاب ”محمی طبقہ سید البشر فی رأس مائة الحادی عشر“ ہے، بہت کتابیں لکھیں جن میں سے ایک بحار الانوار ہے جو روایتوں اور واقعات کا گویا ایک دریا ہے، اس کو آٹھویں جلد کتاب الفتن میں ایک خاص باب فدک کی بحث میں ہے جس کا عنوان ہے ((باب نزول الآیات فی امر فدک و قصۃ جوامع الاحتجاج فیہ)) اور اسی کا خلاصہ بزبان فارسی ”حق الیقین“ اور ”حیات القلوب“ میں جناب ممدوح نے لکھا ہے۔

تیرہویں صدی میں ایک نیا دور شروع ہوا اور ہندوستان میں شیعہ سنی کے باہم مناظرہ کا غلغلہ بلند ہوا ”تحفہ اثنا عشریہ“ کے شائع ہونے کے بعد علماء شیعہ نے اس فن میں اپنی علمیت اور

قابلیت کے خوب جوہر دکھائے اور دہلی اور لکھنؤ کے علماء و مجتہدین شیعہ نے بڑی بڑی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے ”عماد الاسلام“ مولانا مولوی دلدار علی صاحب کی نہایت مبسوط و مشروح کتاب عربی زبان میں ہے اور جس میں جناب ممدوح نے امام رازی کی نہایت المعقول کا جواب دیا ہے، اس میں فدک کی بحث نہایت تفصیل سے لکھی ہے۔ اس کے بعض تحفہ اثنا عشریہ کے جوابات میں ”تشئید المطاعن“ مولوی پر محمد قلی صاحب کی اور ”طعن الرماح“ جناب مجتہد سید محمد صاحب کی ان کتابوں میں ہیں جن پر حضرات امامیہ کو بہت ناز ہے اور جو کچھ اس میں لکھا ہے اس کی نسبت یہ اعتقاد ہے کہ اس کا جواب ہی نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ منشی سبحان علی خان صاحب اپنے بعض رسائل میں فرماتے ہیں:

((از آنجا کہ مجتہد العصر و الزمان سمی رسول اللہ الی کافۃ الانس و الجن اعنی مولانا و مقتدانا السید محمد مدظلہ الصمد در کتاب معدوم النظیر موسوم بطعن الرماح ایس معضلہ دل روز مخالفین رابچنا بیان کافی و وافی ایضاح فرمودہ اند کہ بالا تراز اں بلکہ مماثل آن از حد قدرت بشری بیرون ست ایں فاقد الادراک استیعاب دلائل اثبات غصب حق بضعہ رسول اللہ برہماں کتاب مستطاب حوالہ نمودہ بر تقریری آخر کہ خالی از تجددی نیست از ماجری فیہا ابطال خلافت اول و ثانی می سازد.))

”منجملہ ان کے مجتہد العصر و الزمان، یعنی مولانا مقتدانا سید محمد صاحب مدظلہ نے اپنی بے نظیر کتاب ”طعن الرماح“ میں مخالفین کے اس دل روز گرہ کو ایسے کافی اور شافی بیان ذریعہ وضاحت سے بیان فرما دیا ہے کہ اس سے بہتر بلکہ اس کے مثل بھی انسانی طاقت سے باہر ہے۔ جگر گوشہ رسول کے حق کے غصب کے سلسلے میں ایسے ثبوت اور دلائل کو بیان فرمایا ہے جو تجدیدی کارنامہ سے خالی نہیں اور

اس سے اول اور ثانی (ابوبکر و عمر کی) خلافت بھی باطل ہو جاتی ہے۔“

اس کے سوا ایران میں بھی چند کتابیں بالفصل ایسی طبع ہوئیں جن میں فدک کی بحث تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ منجملہ ان کے ایک کتاب ”بحر الجواہر“ ہے جس کے مصنف سید محمد باقر بن سید محمد موسوی ہیں جو فتح علی شاہ قاجار کے زمانے میں تھے۔ دوسری کتاب ”کفایۃ الموحدین فی عقائد الدین“ اسماعیل بن احمد علوی طبرسی کی تصنیف ہے جس کی جلد خاص امامت کی بحث میں ہے۔ تیسری کتاب ”لمعة البیضاء فی شرح خطبة الزہرا“ ہے، جس کے ۴۷۰ صفحے مطبوعہ ہیں اور ان میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے خطبہ کا جو فدک کے متعلق ہے بیان ہے مع ان روایات اور مباحث کے جو اس مسئلے سے تعلق رکھتی ہیں چوتھی کتاب جلد چہارم از کتاب دوم ”ناسخ التواریخ“ ہے، جس میں مقرب الخاقان مرزا محمد تقی لسان الملک مصنف ناسخ التواریخ نے خاص حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حال لکھا ہے جس میں فدک کی بحث نہایت تفصیل سے لکھی ہے۔ اس کے سوا، فارسی اور اردو میں رسالے لکھے گئے ہیں ان میں صرف ”طعن الرماح“ کی خوشہ چینی کی گئی ہے اور اسی کے اقوال اور مضامین الٹ پھیر کے بیان کیے گئے ہیں۔

ان کتابوں میں جن کے نام ہم نے اوپر ذکر کیے ہیں کتاب ”کشف الحق“ میں میراث کے دعویٰ کا اول ذکر کیا گیا ہے اور ہبہ کا اس کے بعد، اور اس سے یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ اس کے مصنف میراث کے دعویٰ کو ہبہ پر غالباً مقدم سمجھتے ہیں۔ اور فدک کی بحث میں پہلا امر تصفیہ طلب یہ ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اول میراث کا دعویٰ کیا تھا یا ہبہ کا۔ عموماً علماء امامیہ فرماتے ہیں کہ حضرت سیدۃ النساء نے فدک کے متعلق دو دعوے کیے تھے، اول یہ کہ پیغمبر خدا ﷺ نے فدک انہیں ہبہ کر دیا تھا اور وہ اس پر متصرف اور قابض تھیں۔ جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تب انہوں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے وکیل کو فدک سے نکال دیا اور اپنا قبضہ کر لیا۔ یہ سن کر وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئیں اور یہ دعویٰ کیا کہ فدک مجھے ہبہ کیا گیا تھا اور میں اس پر قابض تھی تم نے کیوں میرا قبضہ اٹھا دیا۔ اس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

نے ان سے شہادت طلب کی، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حسنین اور ام ایمن کو شہادت میں پیش کیا اور ان سب نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دعوے کی تائید میں گواہی دی، مگر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر کہ شہادت کا نصاب پورا نہیں ہے ان کی گواہی کو رد کر دیا اور فدک انہیں واپس نہ کیا اس پر وہ خفا ہو گئیں اور اس کے میراث کا دعویٰ کیا۔ اس لیے سب سے پہلے اس بحث میں یہ امر قابلِ تصفیہ ہے کہ کون سا دعویٰ مقدم تھا۔ چنانچہ عماد الاسلام کے دسویں باب کے چوتھے فائدے کے چوتھے مسئلے میں جناب مولانا دلدار علی صاحب نے اسی کی نسبت خاص بحث فرمائی ہے:

((كما يقول المسئلة الرابعة ان فاطمة هل ادعت اميراث اولاد
ثم ادعت النحلة او بالعكس و يستفاد من كلام اكثر العامة ان
دعوى النحلة ظهرت منها بعد دعوى الميراث وقالت
الامامية بالعكس .))

”یعنی چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ آیا فاطمہ رضی اللہ عنہا نے پہلے میراث کا دعویٰ کیا، پھر ہبہ کا یا بالعکس اور اہل سنت کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہبہ کا دعویٰ میراث کے بعد پیش کیا گیا اور امامیہ اس کے برعکس کہتے ہیں۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ضمناً مجتہد صاحب اس بات کو اپنے ناظرین کے ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں کہ ہبہ کا دعویٰ اہل سنت کے نزدیک بھی صحیح ہے۔ مگر یہ دعویٰ میراث کے دعوے کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کیا تھا۔ حالانکہ اہل سنت کے نزدیک کسی معتبر اور صحیح روایت سے ہبہ کا دعویٰ ثابت ہی نہیں اور اہل سنت اس بات کو مانتے ہی نہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ہبہ کا دعویٰ کیا تھا۔ اس لیے جو عمارت اس روایت کی بنیاد پر حضرات امامیہ نے کھڑی کی ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے شہادت طلب کی گئی اور انہوں نے حضرت علی اور حسنین رضی اللہ عنہما اور ام ایمنؓ کو شہادت میں پیش کیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسے نہ مانا اور یہ عذر کر کے کہ از روئے احکام شریعت کے شہادت کافی نہیں ہے، فاطمہ کے دعوے کو رد کر دیا۔ اور پھر اس پر

بہت طرح سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر ملامت کی ہے اور ان کا ظلم و ستم ثابت کیا ہے اور سنیوں کے نزدیک فاطمہ، علی اور حسنین رضی اللہ عنہم کو جھوٹا اور خود غرض اور اپنے جلب منفعت کے واسطے جھوٹا دعویٰ اور جھوٹی شہادت دینے والا قرار دیا ہے، وہ سب منہدم ہو جاتی ہے۔ جب نفس دعویٰ کی نسبت کوئی صحیح روایت سنیوں کے یہاں ہے ہی نہیں تو جو کچھ زور قلم اس باب میں حضرات علماء امامیہ نے دکھایا ہے اس پر ((ثبت الجدار ثم انقش)) کی مثل صادق آتی ہے اور تمام وہ فصیح و بلیغ تقریریں اور وہ پر جوش اور زبردست تحریریں جو اس باب میں کی ہیں ہبَاءَ مَنشُورًا ہو جاتی ہیں اسی واسطے جناب مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب نے دعوے میراث کا جواب دینے کے بعد اپنی مشہور کتاب ”تحفہ اثنا عشریہ“ میں فرمایا ہے: ولله درہ و علی اللہ اجرہ:

((درینجا فائدہ عظیمہ باید دانست کہ شیعہ در اول درباب مطاعن ابوبکر منع میراث می نوشتند و چون از عمل ائمہ معصومین و از روی روایات ایس حضرات عدم توریث پیغمبر ثابت شد از دعوی انتقال نموده دعوی دیگر تراشیدندہ و طعن دیگر بر آور دند کہ آن طعن سیز دہم ست کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ فدک را بفاطمہ نداد حالانکہ پیغمبر برائے او ہبہ نموده بود و دعوی فاطمہ را مسموع ننمو دوازوی گواہ و شاہد طلب یدالی قوله جواب ازین طعن آنکہ دعوی ہبہ از حضرت زہرا رضی اللہ عنہا و شہادت دادن حضرت علی رضی اللہ عنہ و ام ایمن یا حسنین رضی اللہ عنہم علی اختلاف الروایات در کتب اہل سنت اصلاً موجود نیست محض از مفتریات شیعہ است و در مقام الزام اہل سنت آوردن و جواب آن طلب یدان کمال سفاهت ست .))

”یہاں ایک بڑی بات یاد رکھنی چاہیے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پر طعنہ زنی کے لیے شیعوں نے پہلی بات یہ گڑھی ہے کہ انہوں نے وراثت نبی کی ممانعت لکھی ہے اور جب کہ ائمہ معصومین کے عمل اور ان بزرگوں کی روایات سے رسول اللہ کا ورثہ نہ ہونا ثابت ہو تو شیعوں نے اس کے بجائے دوسرا دعویٰ تراش کر طعن و تنبیح دینا شروع کی جسے تیرہواں طعن کہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے باغ فدک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو نہیں دیا، حالانکہ بقول شیعہ رسول اللہ ﷺ نے یہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیہہ کر دیا تھا آخر کار حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مطالبہ باغ فدک قبول نہیں کیا بلکہ ان سے گواہ طلب کیے، شیعوں کے اس طعنہ کا جواب یہ ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا دعویٰ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ و ام ایمنؓ یا حضرت حسنین رضی اللہ عنہما کا گواہی دینا جس کی شیعوں میں مختلف روایات ہیں یہ سب کچھ اہل سنت کی کتابوں میں سرے سے موجود ہی نہیں بلکہ یہ سب شیعوں کی افترا پردازی ہے اور سنیوں پر اس قسم کا الزام دینا اور پھر ان سے جواب مانگنا مکمل نادانی ہے۔“

ہم اس بحث کی نسبت زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتے بجز اس کے کہ خود علماء شیعہ نے تسلیم کیا ہے کہ بعض روایات سے پایا جاتا ہے کہ ارث کا دعویٰ ہیہہ پر مقدم تھا، جیسا کہ ”لمعة البيضاء في شرح خطبة الزهراء“ مطبوعہ ایران کے صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے:

((ومافی بعض الروایات انما ادعت الارث اولاً ثم ادعت النحلة فذلك علی تقدیر الصحة انما هو بلحظ انها فی محل ارثها لا محالة فلما القوا الشبهة بنقل الروایة ادعت ما هو الواقع من حقيقة النحلة .))

”یعنی بعض روایات میں جو آیا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اول ارث کا دعویٰ کیا، پھر ہیہہ کا پس بشرط صحیح ہونے اس کے وہ اس لحاظ سے ہے کہ بوجہ میراث

کے وہ ہر طرح سے ان کی مستحق تھیں جب اس میں ایک روایت نقل کر کے شبہ ڈال دیا تو جو اصلی بات تھی اور حقیقی واقعہ تھا، یعنی ہبہ اس کا دعویٰ کیا۔“

مگر چونکہ علماء امامیہ نے ہبہ کے دعوے کو اکثر پہلے بیان کیا ہے اور ارث کے دعوے کو اس کے بعد اس لیے ہم بھی ترتیب اختیار کرتے ہیں کیونکہ تقدیم و تاخیر سے نفس مطلب پر زیادہ اثر نہیں ہوتا، خصوصاً اس وقت جبکہ ہبہ کا دعویٰ فی نفسہ ہمارے نزدیک پیش ہی نہ ہوا ہو۔



فدک پیغمبر خدا ﷺ نے

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کیا تھا یا نہیں؟

چونکہ حضرات امامیہ اس بات کے مدعی ہیں کہ فدک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کیا گیا تھا اور اسی بنا پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جبکہ وہ غصب کر لیا گیا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے دعویٰ کیا، اس لیے بارثبوت ان کے ذمے ہے کہ وہ اہل سنت کی معتبر روایتوں سے ان دونوں دعوؤں کو ثابت کریں۔ اگر وہ اسے ثابت کر سکیں تو ہمارے ذمے ہے کہ اس بنا پر جو کچھ اعتراضات وہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر لگاتے ہیں اور اس کے متعلق جو باتیں پیش آئیں ان سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو الزام دیتے ہیں، ان کے جوابات دیں۔ لیکن اگر وہ اپنا دعویٰ ثابت ہی نہ کر سکیں تو ہمیں ضروری نہیں کہ بر بنا فرض و تسلیم کے ان لغو و بیہودہ الزامات کا جواب دیں اور تردید شہادت کے متعلق فضول بحث کریں۔ اس لیے ہم ایک تفصیلی نظر ان تمام کتابوں پر کرتے ہیں جن کے نام اوپر بیان کیے گئے اور اپنے ناظرین کو دکھاتے ہیں کہ کیا ثبوت ان کی طرف سے ان دونوں دعوؤں کے متعلق پیش کیا گیا ہے اور کس قسم کی روایتیں کس قسم کی کتابوں سے اپنے دعویٰ کی تائید میں انہوں نے بیان فرمائی ہیں۔

شافی میں فدک کے ہبہ کیے جانے کے متعلق کوئی حدیث یا روایت سنیوں کی کتابوں سے پیش نہیں کی گئی، بلکہ قاضی عبدالجبار نے اپنی کتاب مغنی میں جو یہ لکھا تھا کہ شیعہ کہتے ہیں کہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے کہ جب آیت ﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ﴾ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک ہبہ فرمایا، پھر عمر بن عبدالعزیز نے اولاد فاطمہ پر اسے واپس کیا۔ اسی روایت پر کفایت فرمائی ہے اور شیعوں کے اس قول کو نقل کر کے

قاضی عبدالجبار نے لکھا تھا کہ جو شیعہ اس باب میں روایت پیش کرتے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ اس کی تردید میں ہبہ فدک کے متعلق کوئی تائیدی روایت پیش نہیں کی۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علم الہدیٰ کے نزدیک سوائے اس روایت کے جو ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے نام سے شیعوں میں مشہور ہوئی تھی کوئی صحیح روایت سنیوں کو معتبر کتابوں میں انہوں نے نہیں پائی ورنہ اسے پیش فرماتے۔ تخلص شافی میں بھی کوئی دوسری روایت ہبہ فدک کی تائید میں پیش نہیں کی گئی۔

علامہ مطہر حلی کی کتاب ”کشف الحق و نہج الصدق“ میں کوئی صحیح سند ہبہ کے متعلق نظر نہیں آئی۔ طرائف میں ایک روایت بشر بن الولید اور واقدی اور بشر بن غیاث سے لکھی ہے:

((روی غیر واحد منهم بشر بن الولید والواقدی و بشر بن غیاث فی احادیث یرفعونها الی محمد نبیہم انہ لما فتح خیبر اصطفی لنفسہ قری من قری الیہود فنزل جبریل بھذہ الآیة و آت ذالقربی حقہ فقال محمد ﷺ من ذالقربی و ما حقہ قال فاطمة فدفعها الیہا فدک ثم اعطاها العوالی بعد ذلک فاستغلثها حتی تو فی ابوہا محمد ﷺ .))

(دیکھو طرائف صفحہ ۶۸ مطبوعہ بمبئی)

”کہ ان لوگوں نے یہ حدیث اپنے پیغمبر سے بیان کی ہے کہ جب خیبر فتح ہوا تو آپ نے منجملہ یہود کے دیہات کے ایک گاؤں اپنے لیے علیحدہ کر لیا، پھر جبریل علیہ السلام یہ آیت لائے کہ اپنے ذوی القربی کو ان کا حق دو، اس پر آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ ذوی القربی کون ہیں اور ان کا حق کیا ہے؟ جبریل علیہ السلام نے کہا کہ ذوی القربی فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں، اس پر آپ نے فدک انہیں دے دیا اور پھر عوالی، یعنی چند باغات اور عطا کیے کہ اس کا غلہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا لیا کرتیں اپنے باپ

محمد ﷺ کی وفات تک۔“

اس کے علاوہ اسی کتاب میں ایک اور روایت سید الحفظ بن مردویہ کی روایت کی ہے جیسا کہ فرماتے ہیں:

((ومن طریف منا قضاتہم مارو وہم فی کتبہم الصحیحۃ عندہم رجالہم عن مشائخہم حتی استندہ عن سید الحفظ ابن مردویہ قال اخبرنا محی السنۃ ابو الفتح عبدوس بن عبد اللہ الہمدانی اجازۃ قال حدثنا القاضی ابو نصر شعیب بن علی قال حدثنا موسیٰ بن سعید قال حدثنا الولید بن علی قال حدثنا عباد بن یعقوب قال حدثنا علی بن عباس عن فضیل عن عطیۃ عن ابی سعید قال لما نزلت ایتہ و ات ذالقربی حقہ دعا رسول اللہ الفاطمۃ فاعطاها فذک .))

کہ سنیوں کے عجیب مناقضات میں سے وہ روایت ہے جس کو انہوں نے اپنی معتبر اور صحیح کتابوں میں اپنے مشائخ سے روایت کی ہے اور اسے سید الحفظ ابن مردویہ باسناد مذکورہ بالا یوں لکھتے ہیں کہ ابوسعید سے منقول ہے کہ جب یہ آیت ﴿وَاتِذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ﴾ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلایا اور فدک انہیں دے دیا۔“

”بحار الانوار“ کی کتاب ”باب نزول الآیات فی امر فدک“ میں ملا باقر مجلسی آیت ﴿وَاتِذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ﴾ کی شان نزول میں فرماتے ہیں ((رواہ کثیر من المفسرین ووردت بہ الاخبار من طرق الخاصة والعامة)) کہ آیت کے شان نزول میں بہت سی روایتیں بہت سے اہل سنت و شیعہ کے مفسرین نے بیان کی ہیں۔ اور اس کے بعد لکھتے ہیں ((قال الشیخ الطبرسی قیل ان المراد قرابة الرسول)) کہ شیخ طبرسی کہتے ہیں کہ اس آیت میں ذالقربی کا لفظ ہے اس سے مراد قرابت رسول ہے، پھر انہی سے ایک روایت نقل کرتے ہیں:

((اخبِرنا السید مہدی بن نزار الحسنی باسناد ذکرہ عن ابی سعید الخدری قال لما نزلت قوله وات ذا القربی حقه اعطی رسول اللہ ﷺ فاطمة فدک قال عبدالرحمن بن صالح کتب المامون الی عبید اللہ بن موسیٰ یسئلہ عن قصة فدک فکتب الیہ عبید اللہ بهذا الحدیث رواہ عن الفضیل بن مرزوق عن عطیة فرد المامون فدک علی ولد فاطمة .)) انتهى .

”کہ ہم کو خبر دی سید مہدی بن نزار حسنی نے ان اسناد سے جسے انہوں نے بیان کیا ہے ابو سعید خدری سے کہ وہ کہتے ہیں کہ جب آیت ﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ﴾ نازل ہوئی تو پیغمبر خدا ﷺ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلا کر فدک عطا کر دیا۔ اور عبدالرحمن بن صالح کہتے ہیں کہ خلیفہ مامون نے عبید اللہ بن موسیٰ سے لکھ کر فدک کا قصہ دریافت کیا، عبید اللہ نے ان کے جواب میں اس حدیث کو لکھ کر بھیجا اور اسے روایت کیا ہے۔ فضیل بن مرزوق نے عطیہ سے اس پر مامون نے فدک اولاد فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا۔“

اس روایت میں ملا باقر مجلسی نے اسناد کو ترک کر دیا ہے، مگر علامہ طبرسی نے آیت ﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ﴾ کی تفسیر میں جو سورہ بنی اسرائیل میں واقع ہے اس اسناد کا اس طرح پر ذکر کیا ہے:

((اخبِرنا ❶ السید ابو حمید مہدی بن نزار الحسنی قرأة قال حدثنا الحاکم ابو القاسم بن عبد اللہ الحسکانی قال حدثنا الحاکم الوالد ابو محمد قال حدثنا عمر بن احمد بن عثمان بغداد

❶ اس روایت کے راویوں میں اور منج الصادقین کے راویوں میں کچھ نام میں فرق ہے ہم نے جیسا لکھا پایا ویسا ہی لکھ دیا ہے اور اپنی طرف سے کچھ دست اندازی تصحیح میں نہیں کی۔ ۱۲۔

شفہاها قال اخبرني عمر بن الحسين بن علي بن مالك قال
 حدثنا جعفر بن محمد الا حمصي قال حدثنا حسن بن
 حسين قال حدثنا ابو معمر بن سعيد جيشم و ابو علي
 القاسم الكندي و يحيى بن يعلى و علي بن مسهر عن فضيل
 بن مردوق عن عطية الكوفى عن ابى سعيد الخدرى قال لما
 نزلت قوله وات ذى القربى حقه..... الخ))

اور اسی روایت کو اسی آیت کی.....

((ونيز سعيد ابو حميد مهدي بن نزار الحسنى از حاكم ابو
 القاسم عبدالله الحسكاني نقل مى كند كه در بغداد حاكم ابو
 محمد از عمر بن احمد بن عثمان بمن حديث كرد كه عمر
 بن حسين بن مالك گفت كه جعفر بن محمد الاحمصى بمن
 گفت كه حسن بن حسين مرا حديث كرد از ابو معمر بن
 سعيد و علي بن سعيد خدرى كه گفتند چون آيت و آت ذى
 القربى نازل شد حضرت رسالت باغ فدك رابفاطمه عطا
 فرموده..... الخ.))

”سعيد ابو حميد مهدي نے حاكم ابو القاسم عبدالله کی زبانی بیان کیا کہ بغداد میں
 حاكم ابو محمد نے عمر بن احمد بن عثمان کے ذریعہ سے مجھ سے کہا جسے ابو العمر بن
 سعيد و علی بن سعيد خدری نے ظاہر کیا جب ﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَى﴾ کی آیت نازل
 ہوئی تو رسول اللہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو باغ فدک عنایت فرما دیا۔“

دوسری روایت ملا باقر مجلسی نے یہ لکھی ہے:

((محمد بن العباس عن علي بن العباس المقانعى عن ابى
 كريب عن معاوية عن فضيل بن مردوق عن عطية عن ابى

سعید الخدری قال لما نزلت وات ذی القربی حقہ دعا
رسول اللہ ﷺ فاطمة .))

واعطاها فذك

تیسری روایت سید ابن طاؤس کی کتاب سعد السعود سے نقل کرتے ہیں:

((روی سید ابن طاؤس فی کتاب سعد السعود من تفسیر
محمد بن العباس بن علی بن مروان قال روی حدیث فذك
فی تفسیر قوله تعالى وات ذی القربی حقہ عن عشرين طريقا
فمنها مارواه عن محمد بن طريقا فمنها ماروا عن محمد بن
محمد بن سليمان الاعبدي و هيثم بن خلف الدوري و
عبدالله بن سليمان بن الاشعث و محمد بن القاسم بن زكريا
قالوا حدثنا عباد بن يعقوب قال اخبرنا علي بن عباس و
حدثنا جعفر بن محمد الحسيني عن علي بن منذر الطريقي
عن علي بن عباس عن فضيل بن مر ذوق عن عطية العوفی
عن ابي سعيد الخدری قال لما نزلت وات ذی القربی حقہ
دعا رسول اللہ ﷺ فاطمة و اعطاها فذك .))

”کہا سید ابن طاؤس نے کتاب سعد السعود میں تفسیر محمد بن عباس بن علی بن
مروان سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ حدیث ہبہ فذك کی آیت ﴿وَآتِ ذَا
الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ﴾ کی تفسیر میں بیس طریقوں سے مروی ہے، ان میں سے ایک وہ
حدیث ہے جو محمد بن سلیمان اعبدی نے اور ہیشم بن خلف دوری نے اور عبد اللہ
بن سلیمان بن اشعث نے اور محمد بن قاسم بن زکریا نے روایت کی ہے کہ یہ لوگ
کہتے ہیں کہ ہم سے روایت کی ہے عباد بن یعقوب نے اور انہوں نے علی بن
عباس سے، اور نیز روایت کی ہے جعفر بن محمد حسینی نے علی بن منذر طریقی سے،

انہوں نے علی بن عابس سے انہوں نے فضیل بن مرزوق سے انہوں نے عطیہ عوفی سے اور انہوں نے ابی سعید خدری سے کہ جب آیت ﴿وَإِذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهٗ﴾ نازل ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلا کر فدک دے دیا۔“
 قاضی نور اللہ شوستری نے اپنی کتاب ”احقاق الحق“ میں بھی اسی روایت کو نقل کیا ہے اور فرمایا ہے ((روی الواقدی وغيره من نقله الاخبار عندهم و ذکره فی الاخبار الصحیحة عندهم ان النبی لما افتح خیبرا صطفیٰ قری من قری الیہود..... الخ .))

عماد الاسلام میں ایک روایت تو متعلق ہبہ کے وہی نقل کی ہے جو طرائف میں مذکور ہے، یعنی سید الحفاظ ابن مردویہ سے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

((فاقول یدل علی ثبوت ذلك (اعطاها النبی فدک فاطمة) مارواه سید الحفاظ ابن مردویہ قال اخبرنا محی السنة ابو الفتح عبدوس بن عبد اللہ الهمدانی اجازة قال حدثنا القاضی ابو نصر شعیب بن علی قال حدثنا موسیٰ بن سعید قال حدثنا الولید بن علی قال حدثنا عباد بن یعقوب قال حدثنا علی بن عابس عن فضیل عن عطیة عن ابی سعید قال لما نزلت وات ذی القربیٰ حقه دعا رسول اللہ ﷺ فاطمة فاعطاها فدک .))

دوسری روایت کنز العمال شیخ علی متقی سے بیان کی ہے، جیسا کہ فرماتے ہیں:

((و مافی کنزل العمال للشیخ علی المتقی فی صلة الرحم من کتاب الاخلاق عن ابی سعید قال لما نزلت وات ذی القربیٰ حقه قال النبی یا فاطمة لك فدک ، رواه الحاکم فی تاریخه و قال تفرد به ابراہیم بن محمد بن میمون عن علی

بن عباس بن النجار))

”یعنی کنز العمال میں شیخ علی متقی نے باب صلۃ الرحم میں ابوسعید سے یہ روایت کی ہے کہ جب آیت ﴿وَإِذِذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّتْ﴾ نازل ہوئی تو پیغمبر خدا ﷺ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ اے فاطمہ! فدک تمہارے لیے ہے۔ اور اسے روایت کیا ہے حاکم نے اپنی تاریخ میں اور کہا ہے کہ اسے صرف ابراہیم بن محمد بن میمون نے علی بن عباس بن نجار سے روایت کیا ہے۔

اور تیسری روایت اسی کتاب میں تفسیر درمنثور سیوطی سے نقل کی ہے:

((وفی الدر المنثور للسیوطی فی تفسیر قوله تعالیٰ وات ذی

القربی حقه دعا رسول اللہ ﷺ فاطمة فاعطاها فدک .))

اور اسی کتاب میں چوتھی روایت ”معارض النبوت“ سے بیان کی ہے، جیسا کہ فرماتے ہیں:

((و مافی معارج النبوة الشهیر بسیر مولانا الهروی فی وقائع

السنة السابعة بعد واضع خیبر بهذه العبارة .))

((در مقصد اقصیٰ مذکورست کہ بعضے گویند کہ حضرت

رسول اللہ ﷺ بسوی خیبر امیر المومنین علی را فرستادو

مصالحة بردست امیر واقع شدبر ان نهج کہ حضرت امیر

قصد خون ایشان نکند و حوائط خواص از آن رسول باشد

پس جبریل فرود آمد و گفت کہ حق تعالیٰ می فرماید کہ حق

خویشان بدہ، رسول گفت کہ خویش من کیستندو حق

ایشان چیست، جبریل گفت فاطمه است حوائط فدک رابا و

ده و آنچه از خدا و رسول اوست در فدک ہم باوبده پیغمبر

فاطمه رابخواندو برای وی حجتی نوشت و آن وثیقه بوده

کہ بعد از وفات رسول پیش ابوبکر آوردو گفت این کتاب

رسول خداست برای من و حسن و حسین .))

”مقصد اقصیٰ میں تحریر ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خیبر کی جانب روانہ کیا اور وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس بات پر مصالحت ہو گئی کہ آپ ان خیبر والوں کا خون نہ بہائیں بلکہ وہاں کے خاص باغ رسول اللہ ﷺ کو نذر کیے جائیں اور اس نوبت پر جبرئیل علیہ السلام نے آکر کہا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ آپ اپنے عزیزوں کے حقوق ادا کریں، رسول اللہ ﷺ نے پوچھا میرے عزیز کون ہیں اور ان کے کیا حقوق ہیں؟ جبرئیل علیہ السلام نے جواباً کہا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو آپ باغ فدک دے دیں جو کچھ ان کا حصہ اللہ اور رسول کا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلوا کر بطور سند باغ فدک انہیں دے دیا اور رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد خلیفہ وقت ابو بکر کے پاس حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے یہ وثیقہ دکھا کر کہا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا حکم میرے اور حسین کے لیے ہے۔“

ان چاروں روایتوں کو نقل کرنے کے بعد آپ فرماتے ہیں:

((و قال السيد المرتضى في الشافى و قدروى من طريقة مختلفة غير طريق ابى سعيد الذى ذكره صاحب الكتاب انه لما نزل قوله تعالى و ات ذى القربى حقه دعا النبى فاطمة فاعطاها فذك و اذا كان ذلك مرويا فلا معنى لدفعه بغير حجة..... انتهى))

”یعنی سید مرتضیٰ شافى میں کہتے ہیں کہ سوائے ابوسعید کے جس کا ذکر صاحب کتاب نے کیا ہے اور بھی کئی مختلف طریقوں سے یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ جب آیت ﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَى﴾ نازل ہوئی تو پیغمبر خدا ﷺ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلایا اور فدک انہیں دے دیا، اور جب کہ یہ روایت مروی ہے، پھر بغیر دلیل

کے اس کو نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ فقط۔

لیکن نہ جناب مولانا دلدار علی صاحب نے اپنی کتاب ”عماد الاسلام“ میں اور نہ جناب سید مرتضیٰ نے اپنی کتاب ”شافی“ میں ان روایتوں کو بیان کیا کہ وہ کون سے طریق مختلف غیر طویق ابی سعید کے ہیں جن میں یہ روایت مذکور ہے۔ ایسے موقع پر فقط مجمل کہہ دینا کہ اور بھی بہت سی روایتوں میں یہ منقول ہے کافی اور شافی نہیں ہے۔ خصوصاً جبکہ قاضی عبدالجبار نے اپنی کتاب مغنی میں اس روایت کو شیعوں کی طرف سے بایں الفاظ ذکر کیا تھا ((قالوا قدروی عن ابی سعید الخدری)) کہ شیعہ ایسا کہتے ہیں کہ ابوسعید خدری سے ایسی روایت ہے اور اس کی نسبت اپنے جواب میں یہ لکھا تھا ((الجواب عن ذلك ان اکثر ما یردون فی هذا الباب غیر صحیح)) کہ شیعوں کے قول کا جواب یہ ہے کہ جو کچھ وہ اس بات میں روایت کرتے ہیں اکثر غلط ہے۔

آگے چل کر قاضی عبدالجبار نے صاف لکھ دیا تھا وان صح عقد الهبة ❶ کہ اگر عقد ہبہ صحیح بھی ہو تو فدک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے قبضے میں ہونا چاہیے تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی عبدالجبار اس روایت پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ اسی حالت میں جناب علم الہدیٰ کا بالا جماع یہ کہہ دینا کہ اور بہت سے طریقوں سے بھی یہ روایت ثابت ہے، قابل تسلیم اور ان

❶ اصل عبارت یہ ہے: قال صاحب الكتاب شبهة لهم اخرى واحد امام طعنوا به وعظموا القول في امر فدك قالوا قدروی عن ابی سعید الخدری انه قال لما نزلت و ات ذا القربی حقه اعطی رسول الله فاطمة فدك ثم فعل عمر بن عبدالعزیز ذلك ورده علی ولدھا قالو اولاشك ان ابابكر غصبھا ان لم یصح كل الذی روی فی هذا الباب و قد كان الاجمل ان یمنعهم التكرم مما ارتكبوا فضلا عن الدین ثم ذكر انها استشهدت امیر المؤمنین و ام ایمن فلم تقبل شهادت هما هذا مع تركه ازواج النبی فی حجرهن ولم یجعلھا صدقة و صدقهن فی ان ذلك لهن و لم یصدقھا ثم قال الجواب عن ذلك ان اكثر ما یردون فی هذا الباب غیر صحیح و لساننكر صحة ما روی من ادعائها فدك فاما انه كا فی یدھا فغیر مسلم بل لو كان فی یدھا لكان الظاهر انه لها فاذا كان فی جملة التركة فالظاهر انه میراث وان صح عقد الهبة وهذا هو الظاهر لان التسليم لو كان وقع یظھر ان كان فی یدھا فكان ذلك كافی فی الاستحقاق ۱۲

کے دعوے کے ثبوت کے لیے کافی تھا۔ ان کو چاہیے تھا کہ ان طرقِ مختلفہ سے جس کا انہوں نے بالاجمال دعویٰ کیا تھا اس روایت کو ثابت کرتے اور ان تمام روایتوں کو بیان کر کے اپنے دعوے کی تائید فرماتے۔

”طعن الرماح“ میں جناب مجتہد سید محمد صاحب درمنثور سیوطی اور کنز العمال شیخ علی متقی اور سید الحفظ ابن مردویہ کے علاوہ صاحب تاریخ آل عباس سے فدک کے ہبہ کیے جانے کا ذکر کرتے ہیں: ((کما یقول روی السیوطی فی تفسیر الدر المنثور فی ذیل تفسیر قوله تعالیٰ وات ذا القربی حقه اخرج البزار و ابو یعلی و ابن ابی حاتم و ابن مردویہ عن ابی سعید الخدری قال لما نزلت هذه الایة وات ذا القربی حقه دعا رسول الله ﷺ فاطمة فاعطاها فدک .))

((وایں روایت صریح ست در آنکہ ہر گاہ آیة وات ذا القربی حقه یعنی عطا نما صاحب قرابت راحق او نازل گردید آن جناب فاطمہ را طلب فرمودہ فدک را بآن حضرت عطا فرمود۔ شیخ علی متقی در کتاب کنز العمال در باب صلہ رحم از ابو سعید روایت کردہ قال لما نزلت وات ذا القربی حقه قال النبی یا فاطمة لك فدک۔ و سید الحفظ ابن مردویہ در کتاب خود مسند ابو سعید روایت سابقہ رانقل کردہ و نیز صاحب روضة الصفا و معارج النبوة از مقصد اقصی روایت اعطاء فدک و نوشتن و ثیقہ رانقل کردہ چنانچہ آنفا عبارت آن بمعرض بیان در آمد و عقل ہیچ عاقل باور نمی کند کہ با وصف اعطاء فدک و ہبہ آن و نوشتن و ثیقہ برائے آن از زمان فتح خیبر تا ہنگام وفات سرور کائنات اقباض آن بوقوع نہ پیوستہ باشد بلکہ لفظ اعطاء نیز براں

دلالت دارد کمالاً یخفی۔ و صاحب تاریخ آل عباس کہ از معتمدین اہل سنت ست در تاریخ مذکور علی ما نقل عنہ نوشتہ کہ بعد از آنکہ جماعتے از اولاد حسنین نزد مامون دعوی فدک کردند مامون جمع نمود و صدکس از علماء حجاز و عراق و غیر ایشان را و تاکید کرد کہ کتمان صواب ننمودہ از متابعت حق و راستی سر نہ پیچند پس ایشان روایت و اقدی و بشر بن الولید و غیرہ نقل کردند کہ بعد از فتح خیبر جبریل عَلَيْهِ السَّلَام بآیة وات ذا القربی حقہ نازل شد پس رسول خدا گفت کیست ذا القربی و چیست حق او جبریل گفت فاطمہ است و فدک حق اوست پس رسول خدا فدک را بانحضرت داد۔))

”اور یہ روایت بالکل صاف ظاہر ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ رشتہ دار کو اس کا حق دے دیجیے تو رسول اللہ ﷺ نے فاطمہ کو بلا کر باغ فدک انہیں دے دیا۔ شیخ علی متقی نے اپنی کتاب کنز العمال میں بروایت ابو سعید رضی اللہ عنہ لکھا ہے کہ اس آیت کے نزول پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اے فاطمہ! باغ فدک تمہارے لیے ہے۔ ”روضۃ الصفاد معارج“ کے مصنف نے بھی باغ فدک دینا اور وثیقہ لکھنا نقل کیا ہے۔ کسی عقلمند کی عقل باور نہیں کرتی کہ فتح خیبر کے بعد سے رسول اللہ ﷺ کے پردہ کرنے تک باوجودیکہ رسول اللہ ﷺ نے باغ فدک دیا ہو اور وثیقہ لکھ دیا ہو اس پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا قبضہ نہیں ہوا اور رسول اللہ ﷺ کے دینے کے وہی معنی ظاہر ہیں جسے ہر ایک جانتا ہے کہ ان کو بھی اسی مال سے کفالت ہوتی رہی۔ صاحب تاریخ آل عباس جو زبردست سنی ہیں، انہوں نے اپنی اس تاریخ میں لکھا ہے کہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی اولاد نے جب مامون رشید خلیفہ وقت سے باغ فدک کا مطالبہ کیا تو مامون نے دو سو علماء حجاز و عراق و غیرہ

کے جمع کر کے تاکید کی کہ آپ لوگ امر حق اور صحیح بات کو پوشیدہ نہ رکھیں اور صداقت و متابعت احکام شریعت سے انحراف نہ کریں۔ چنانچہ ان تمام علماء نے واقدی اور بشر بن ولید وغیرہ کی روایات بیان کیں کہ فتح خیبر کے بعد جبریلؑ آیت ذَا الْقُرْبَى لے کر آئے تو رسول اللہ ﷺ نے پوچھا رشتہ دار کون ہے اور اس کا حق کیا ہے؟ جبریلؑ نے کہا فاطمہ رشتہ دار ہیں اور فدک ان کا حق ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فدک انہیں دے دیا۔“

صاحب ”تشیید المطاعن“ جناب مفتی محمد قلی کنٹوری نے بھی کوئی نئی روایت روایات مذکورہ بالا کے علاوہ پیش نہیں کی۔

”کفایۃ موسوم الولاية“ کی جلد دوم میں صفحہ ۳۷۸ سے صفحہ ۳۸۰ بہت تفصیل سے فدک کی بحث لکھی ہے اور یہ آیت ﴿وَإِذِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّ﴾ کی نسبت صفحہ ۳۶۰ میں یہ لکھا ہے:

((از برائے احدے از امت شبه نبود در آنکہ فدک خالص بود از برائے رسول خدا ﷺ و احدے را در آن حقے نبود از امت ، و اخبار طرفین از خاصه و عامه ناطق باین امرست و نیز ظاهر آیه وات ذا القربى حقه به تصدیق کثیرے از علماء و مفسرین و روایات عامه آنکہ رسول خدا ﷺ آنرا نحلہ و عطیہ داد بحضرت فاطمہ چون ثعلبی و جوہری و یاقوت حموی صاحب کتاب معجم البلدان و شہرستانی و صاحب تاریخ آل عباس و واقدی و بشر بن الولید و عبدالرحمن بن صالح و عمر بن شبہ و ابن حجر در صواعق و ابن ابی الحدید و ابو ہلال عسکری در کتاب اخبار الاوائل و حاکم ابو القاسم الحسکانی و حاکم ابو محمد و او احمد بن عثمان بغدادی

و قاضی عبداللہ بن موسیٰ انہ لما نزلت آیة ﴿وَإِذَا الْقُرْبَىٰ
حَقَّ﴾ اعطی رسول اللہ فاطمة فذک فقط .))

”کسی امتی کو شک و شبہ نہیں کہ باغ فدک رسول اللہ ﷺ کے لیے مخصوص تھا، اور اس میں کسی امتی کا کوئی حق نہ تھا اور عام و خاص (شیعہ و سنی) لوگ بھی یہی کہتے ہیں۔ نیز آیت کی ظاہری تفسیر اکثر علماء و مفسرین نے یہی کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بطور عطیہ سرفراز فرمایا تھا۔ جیسے ثعلبی اور قاضی بن عبداللہ موسیٰ وغیرہ۔“

اس میں مؤلف نے روایت ہبہ فدک اور دعویٰ فدک کو مختلط کر دیا ہے اور ان کی روایتوں اور اقوال کو نقل نہیں کیا ہے، مگر سوائے ثعلبی کے کسی جدید راوی کا ذکر جن کا ذکر اوپر ہو چکا نام بھی نہیں لیا اور ثعلبی کی روایت اس کتاب کے صفحہ ۳۵۸ میں بایں الفاظ بیان کی گئی ہے
کما فیہ:

((و ثعلبی کہ ازا عاظم مفسرین ایشاں ست بسند خود از
سدی و دیلمی روایت کرده ست کہ حضرت علی ابن
الحسین بہ یکی از اهل شام فرمود آیا قرآن خوانده گفت
بلے ، فرمود در سورہ بنی اسرائیل این آیة خوانده کہ وات ذا
القربی حقه ، آن شخص عرض کرد مگر شما آیة ذی القربی
کہ حق سبحان اللہ تعالیٰ امر فرمودہ کہ حق آنہارا برسانند
فرمود بلے .))

”ثعلبی سنیوں کا زبردست مفسر ہے اس نے سدی و دیلمی کے ذریعہ سے روایت
کی ہے کہ علی بن حسین (امام زین العابدین) نے ایک شامی سے پوچھا کیا تم
نے قرآن پڑھا ہے؟ اس نے جواب دیا: جی ہاں، اس پر فرمایا کہ سورہ بنی
اسرائیل میں یہ آیت پڑھی ہے کہ رشتہ داروں کو ان کا حق دے دو؟ اس پر اس

شامی نے کہا مگر آپ کو اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کے حقوق ادا کر دیں؟ اس پر امام نے جواب دیا: ہاں۔“

ان کتابوں کے علاوہ ایک اور کتاب ایران میں بالفعل چھپی ہے اور اس کا نام ”غایۃ المرام و حجة الخصام فی تعیین الامام من طریق الخاص والعام“ ہے، اس کے مصنف سید ہاشم معروف بہ علامہ ہیں اور ان کی نسبت صاحب الحدائق شیخ یوسف بحرانی نے اپنی کتاب مسمی ”بلو لوة البحرین“ میں لکھا ہے: ((السید المذكور فاضلا محدثا جامعا متتبع الاخبار بما لم يسبق اليه سابق سوى الشيخ المجلسي و كانت وفاته للسنة السابعة بعد المائة والالف و صنف كتابا عديدا تشهد بشدة تتبعه و الطلعة)) یعنی سید موصوف بڑے فاضل، محدث، جامع اور ایسے حاوی احادیث و اخبار پر ہیں کہ مثل ان کے اگلے لوگوں میں سے سوائے ملا باقر مجلسی کے کوئی نہیں ہوا اور ان کی بہت تصنیفات ہیں جن سے ان کی علمیت اور واقفیت ثابت ہوتی ہے۔

سید موصوف نے غایۃ المرام امامت کے ثابت کرنے میں لکھی ہے اور اس میں تمام آیت قرآنی کو جمع کر دیا ہے اور ہر آیت کے متعلق جتنی روایتیں اور حدیثیں ہیں، خواہ اہل سنت کی ہوں، خواہ شیعوں کی ان سب کو نقل کیا ہے اور انہوں نے اس کتاب کے دیباچہ میں ان تمام کتابوں کے نام لکھے ہیں جن سے انہوں نے روایتیں نقل کی ہیں۔ اور بلاشبہ یہ کتاب ایسی جامع ہے کہ خود ان کے مؤلف کی غزرت علم اور کمال واقفیت کی شاہد ہے، اس کتاب کے مقصد دوم کے سترہویں اور اٹھارہویں باب میں آیت ﴿وَإِذِ الْقُرْبَىٰ حَقَّةٌ﴾ کے متعلق جتنی حدیثیں اور روایتیں فریقین کی ہیں وہ نقل کی ہیں مگر باوجود اس جامعیت کے سوائے ایک روایت ثعلبی کے کوئی دوسری روایت انہوں نے سنیوں کی طرف سے بیان نہیں کی۔ البتہ گیارہ حدیثیں شیعوں کو نقل کی ہیں۔ چنانچہ اس کے صفحہ ۳۲۳ میں یہ لکھا ہے:

((الباب السابع عشر قوله تعالى و ات ذالقربى حقه

والمسکین الایة من طریق العامة وفيه حديث واحد الثعلبي
 فى تفسيره فى هذه الایة قال عنى بذلك قرابة رسول الله ﷺ
 ثم قال الثعلبي روى عن السدى عن ابى الديلمى قال قال
 على بن الحسين لرجل من اهل الشام اقرأت القرآن قال نعم
 قال فما قرأت فى بنى اسرائيل وات ذا القربى حقه وانكم
 القرابة التى امر الله تعالى ان يوتى حقه قال نعم فقط .))

اس کا ترجمہ جو کفایہ میں بہ زبان فارسی ہے وہ ابھی ہم اوپر لکھ چکے، اس کے بعد وہ لکھتے
 ہیں: ((الباب الثامن عشر فى قوله تعالى وات ذا القربى حقه والمسکین
 الایة من طریق الخامسة وفيه احد عشر حديثا)) کہ امامیہ کے طریق سے اس
 آیت کے متعلق گیارہ حدیثیں ہیں۔ اور اس میں عطیہ عوفی کی وہ روایتیں بھی منقول ہیں جن کو
 بعض سنیوں کی کتابوں سے علماء امامیہ نے نقل کیا ہے، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔
 چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

((الثامن العیاشی باسناده من عطیہ العوفی قال لما فتح
 رسول الله خيبر وافاء الله عليه فدكا وانزل الله عليه وات ذا
 القربى حقه قال يا فاطمة لك فدكا۔ التاسع العیاشی باسناده
 عن عبدالرحمن بن صالح كتب المامون الى عبدالله بن
 موسى العبسى يسئله عن قصة فدك فكتب اليه عبدالله بن
 موسى بهذا الحديث ، العاشر العیاشی باسناده عن فضيل بن
 مردوق عن عطية ان المومون رد فدكا على ولد فاطمة .))

منشی سبحان علی خاں صاحب نے جو فن ادب میں مشہور ہیں، ایک کتاب امامت میں لکھی
 ہے اس کے دوسرے حصے کے صفحہ ۷۴ میں فدک کی بحث ہے مگر اس میں خاں صاحب نے
 صرف ”طعن الرماح“ کی خوشہ چینی کی ہے اور نئی عبارت میں اس کے مضمون کو الٹ پھیر کے

بیان کیا ہے، جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

((ایس فاقد الادراک استیعاب دلائل اثبات حق بضعه رسول
برہماں کتاب مستطاب (طعن الرماح) حوالہ نمودہ بہ
تقریرے آخر کہ خالی از تجددے نیست از ماجری فیہا
ابطال خلافت خلیفہ اول و ثانی کہ بانی مبانی این اعتدا
مشارالیہ است می ساز فقط .))

اس میں کوئی نئی روایت منقول نہیں ہے جو قابل نقل ہو۔

ہم نے جو کچھ اوپر بیان کیا اس سے اس کتاب کے ناظرین کو معلوم ہوگا کہ چوتھی صدی
سے لے کر تیرہویں صدی تک جتنی مشہور کتابیں شیعہوں کی اس بحث کے متعلق تھیں، اس سب
سے ہم نے ان روایتوں کو جو متعلق بہہ فدک ہماری کتابوں سے انہوں نے نقل کی تھیں، بلفظ
لکھ دیا اور اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ اور بھی بہت سی کتابیں ہوں گی جو ہمیں نہیں مل سکیں مگر ایسے
مشہور اور نامور عالموں نے جیسا کہ جناب علم الہدیٰ اور علامہ حلی اور سید ابن طاووس اور ملا باقر
مجلسی اور قاضی نور اللہ شوستری اور مولانا دلدار علی اور مجتہد سید محمد اور مولانا محمد قلی صاحب تھے۔
غالباً ان کے مطالعے سے کوئی اور روایت نہ گئی ہوگی خصوصاً مجتہدین لکھنؤ سے۔ اس لیے ہم کو
اس یقین کرنے کی وجہ ہے کہ جو کچھ انہوں نے پیش کیا ہے، اس سے زیادہ ان کے پاس نہ
تھا۔ اب ہم اس بات کو دکھاتے ہیں کہ یہ ثبوت نہ عقلاً و نقلاً شہادت میں داخل کرنے کے لائق
ہے اور نہ وہ فی نفسہ کوئی ثبوت ہے۔ اس لیے کہ ان تمام روایتوں کا سلسلہ اس راوی پر ختم ہوتا
ہے، جو نہ صرف غیر معتبر اور غیر ثقہ تھا، بلکہ کاذب اور شیعہ تھا۔ ایک ہی شخص اس تمام پردہ
زنگاری میں چھپا ہوا ہے، جس کے مختلف رنگ دوسروں نے لیے ہیں اور ایک ہی گندلا چشمہ
ہے جس سے یہ سب نہریں نکلی ہیں۔ اور ایک ہی کذب کی جڑ ہے جہاں سے ساری شاخیں
پھوٹی ہیں۔ اور ہم یقین کرتے ہیں کہ علماء شیعہ جن کو ان روایتوں پر بہت کچھ ناز ہے اور
جنہوں نے اس کی بنیاد پر ایک بہت بڑی عمارت قائم کی ہے اور جس کی بنا پر بہت بڑے

الزام حضراتِ شیخین رضی اللہ عنہم پر لگائے ہیں اور بہت دردناک تقریروں میں ان کا ظلم و ستم ظاہر کیا ہے اور جناب سیدۃ النساء فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے دعوے ہبہ کے رد کرنے پر بہت کچھ دھوکے میں ڈالنے والی باتیں بنائی ہیں، اسے پیش کیے ہوئے ثبوت کی حقیقت فاش ہونے پر جیسا کہ اب ہم اسے فاش کرتے ہیں حیران اور ششدر ہو جائیں گے اور وہ الفاظ جو جناب قاضی نور اللہ شوستری نے ”کشف الحق“ کے شائع ہونے کے بعد سنیوں کی نسبت فرمائے تھے، وہ اپنے اوپر صادق سمجھیں گے ((ان یتمنون ان یکونوا جمادا او شجرا ویبھتون کانہم انقموا حجرا)) یعنی تمنا کریں گے کہ کاش! وہ پتھر یا درخت ہو جائیں اور ایسے مبہوت ہو جائیں گے گویا ان پر پتھر پڑ گئے ہیں۔

علماء امامیہ کی مذکورہ بالا کتابوں میں سے جو حدیثیں اور روایتیں پیش کی گئی ہیں جن کو وہ سنیوں کی روایت کہتے ہیں، ان کی تکرار اور نقل در نقل کو حذف کر کے دو قسم کی مفصلۃ الذیل روایتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک وہ جن میں پوری تفصیل راویوں کی لکھی گئی ہے۔ دوسری وہ جس میں یا صرف منقول عنہ کتاب کا نام ہے، یا بجائے پوری سند بیان کرنے کے صرف کچھ راویوں کے نام لکھ دیے ہیں۔ اول قسم میں چار اور دوسری قسم میں پانچ روایتیں ہیں اول قسم کی روایتیں یہ ہیں:

ایک ❶ روایت وہ ہے جو طرائف میں سید الحفاظ ابن مردویہ سے نقل کی گئی ہے جس کو عماد الاسلام اور دوسری کتابوں میں بھی نقل کیا ہے، اس کے بیان کرنے والے راوی حسب ذیل ہیں۔ اول محی السنۃ ابوالفتح عبدوس بن عبداللہ ہمدانی، دوسرے قاضی ابونصر شعیب بن علی تیسرے موسیٰ بن سعید، چوتھے ولید بن علی، پانچویں عباد بن یعقوب، چھٹے علی بن عباس، ساتویں فضیل، آٹھویں عطیہ اور نویں ابوسعید جن پر روایت کا سلسلہ ختم ہوتا ہے۔

ایک ❷ روایت وہ جو بحار الانوار میں بحذف اسانید اور تفسیر مجمع البیان طبری میں بہ تفصیل اسناد بیان کی گئی ہے اور اس کے راوی یہ ہیں اول سید ابو حمید مہدی بن نزار حسینی

دوسرے حاکم بن ابوالقاسم بن عبدالحسکانی، تیسرے حاکم الوالد ابو محمد، چوتھے عمر بن احمد بن عثمان، پانچویں عمر بن حسین ابن علی بن مالک، چھٹے جعفر بن محمد حمصی، ساتویں حسن بن حسین، آٹھویں ابو معمر بن سعید، نویں ابو علی بن قاسم کنڈی، دسویں یحییٰ بن یعلیٰ، گیارہویں علی بن مسہر، بارہویں فضل بن مرذوق، تیرہویں عطیہ عوفی اور چودھویں ابوسعید خدری۔

تیسری ❶ وہ روایت جس کو بحار الانوار میں سید ابن طاؤس کی کتاب ”سعد السعود“ سے نقل کیا ہے اور انہوں نے تفسیر محمد بن عباس بن علی بن مروان سے نقل کیا ہے، اس کے راوی اول محمد بن سلیمان اعبدی ہیں، دوسرے ہشام بن خلف دوری، تیسرے عبداللہ بن سلیمان بن اشعث، چوتھے محمد بن قاسم زکریا، پانچویں عباد بن یعقوب، چھٹے علی بن عابس (یہ حقیقت میں علی بن عباس ہیں) ساتویں جعفر بن محمد حسینی، آٹھویں علی بن منظر طریفی، نویں فضیل بن مرذوق، دسویں عطیہ عوفی اور گیارہویں ابوسعید خدری۔

چوتھی ❷ وہ روایت جو ملا باقر مجلسی نے بحار الانوار میں لکھی ہے۔ اس کے اول راوی محمد بن عباس ہیں، دوسرے علی بن عباس مقالعی، تیسرے ابو کریب، چوتھے معاویہ، پانچویں فضیل بن مرذوق، چھٹے عطیہ اور ساتویں ابوسعید خدری۔

پہلی ❸ وہ روایت جو کنز العمال سے عماد الاسلام میں نقل کی ہے۔ اسے حاکم کی تاریخ سے لیا ہے اور اس میں اور راویوں کے نام منقول ہیں ایک ابراہیم بن محمد بن میمون، دوسرے علی بن عابس بن النجار۔ ان راویوں نے اپنی سند کا سلسلہ ابوسعید تک پہنچایا ہے۔

دوسری ❹ وہ روایت جو عماد الاسلام وغیرہ میں درمنثور سیوطی سے بلا حوالہ سند نقل کی ہے اور طعن الرماح میں اس پر اتنا اور بڑھایا ہے کہ بزار، ابو یعلیٰ، ابن حاتم اور ابن مردویہ نے اپنے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

تیسری ❺ جو بحار الانوار وغیرہ میں لکھی ہے کہ عبدالرحمن بن صالح کہتے ہیں کہ مامون

❶ دیکھو صفحہ ۱۹ اس کتاب کا ۱۲۔

❷ دیکھو اس کتاب کا صفحہ ۹-۱۲

❸ دیکھو صفحہ ۱۵-۱۲

❹ دیکھو صفحہ ۹-۱۲

❺ ایضاً۔

نے عبید اللہ بن موسیٰ سے فدک کا حال تحریراً دریافت کیا تو انہوں نے اسی حدیث کو حسن کا ذکر مہدی بن نزار حسینی نے کیا ہے لکھ بھیجا اور اس کو فضیل بن مرزوق نے عطیہ سے روایت کیا ہے۔ اس میں دو نام مذکور ہیں ایک فضیل بن مرزوق - دوسرے عطیہ۔

چوتھی ❶ وہ روایت ہے جو طرائف میں بشر بن الولید، واقدی اور بشر بن غیاث سے بیان کی ہے جس میں سلسلہ اسناد محذوف ہے۔ اسی کو بحوالہ واقدی قاضی نور اللہ شوستری نے ”احقاق الحق“ میں نقل کیا ہے۔

پانچویں ❷ وہ روایت ہے جو معارج النبوت اور مقصد اقصیٰ سے عماد الاسلام وغیرہ میں نقل کی گئی ہے۔

یہ ہے کل مایہ ناز علمائے امامیہ کا۔ اور یہ ہے مجموعہ ان تمام روایتوں کا جسے وہ بہت بڑے زور و شور سے سنیوں کے مقابلے میں ہبہ فدک کو ثابت کرنے کے لیے پیش کرتے ہیں۔ اور چونکہ روایتیں مختلف طور سے اور مختلف موقع پر بحث فدک میں بیان کی جاتی ہیں اور بے چارے ناواقف سنی انہیں دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں، اور یہ سمجھ کر کہ یہ روایتیں تو ہماری ہی کتابوں سے نقل کی گئی ہیں۔ اور غالباً صحیح ہوں گی، حیران رہ جاتے ہیں اور اکثر لوگوں کو خلیجان اور اپنے عقائد میں شبہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ مگر اب کہ ہم نے ان سب کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے اس سے دیکھنے والوں کو معلوم ہو سکے گا کہ ان تمام روایتوں کا سلسلہ ابوسعید پر ختم ہوتا ہے اور ابوسعید سے عطیہ نے اور عطیہ سے فضیل بن مرزوق نے آگے چلایا ہے اور انہی سے اس روایت کا سلسلہ آئندہ بڑھا ہے۔ غرض کہ جو کچھ پھل پھول اس میں لگائے گئے ہیں اس کی جڑ ابوسعید ہیں۔ مگر ابوسعید کے نام میں ایک عجیب دھوکہ دیا گیا ہے۔ جس سے ناظرین کو شبہ ہوتا ہے کہ یہ ابو سعید، ابوسعید خدری ہیں، جو صحابی تھے۔ حالانکہ یہ ابوسعید خدری نہیں ہیں بلکہ یہ وہ ابوسعید ہے جو کلبی کے خطاب سے مشہور اور صاحب تفسیر ہیں ان کے بہت سے نام اور مختلف کنیتیں ہیں۔ اور اسی سبب سے لوگوں کو اکثر ان کے نام میں دھوکہ ہو جاتا ہے۔ کبھی ان کا نام محمد بن

سائب کلبی سے لیا جاتا ہے۔ اور کبھی حماد بن سائب کلبی کہہ کر پکارے جاتے ہیں۔ اور ان کی تین کنیتیں ہیں، ایک ابو نصر اور دوسری ابو ہشام اور تیسری ابو سعید، اور انہیں سے عطیہ عنفی روایت کرتے ہیں، اور چونکہ عطیہ عنفی شیعہ تھے، وہ اسی قسم کی حدیثوں کو اپنے شیخ ابو سعید کلبی سے اس طور پر روایت کرتے ہیں کہ جس سے دھوکہ ہو کہ یہ ابو سعید خدری صحابی سے روایت ہے کیونکہ وہ حدیثاً یا قال ابو سعید کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں، کلبی یا اور ان کا مشہور نام نہیں لیتے تا کہ لوگوں کو شبہ ہو کہ یہ روایت جس سے یہ روایت کرتے ہیں۔ اور وہ ابو سعید کلبی سے ہے نہ کہ ابو سعید خدری سے نمایاں ہو جائے پہلے ہم عطیہ کا حال اور پھر ابو سعید کلبی کا حال اسماء الرجال کی کتابوں سے بیان کرتے ہیں اور اس پردے کو جو ایک مدت دراز سے ان روایتوں پر پڑا ہوا تھا اٹھاتے ہیں۔

عطیہ: جنہوں نے اس روایت کو ابو سعید سے بیان کیا ہے، ان کی نسبت تقریب میں جو اسماء الرجال کی معتبر کتاب ہے لکھا ہے کہ وہ روایت میں خطا بھی کرتے تھے اور تدلیس بھی فرماتے تھے اور شیعہ بھی تھے۔ ((کما یقول عطیة بن سعد الکوفی یخطی کثیر او کان شیعیا مدلسا.))

اول تو ان کی روایت بہ سبب اس کے کہ وہ بہت کثیر الخطا تھے، یقین کے قابل نہیں، دوسرے بوجہ تدلیس کے پایہ اعتبار سے ساقط ہے اور تیسرے بلحاظ شیعہ ہونے کے یہ روایت شیعوں کی ہے نہ کہ سنیوں کی۔

روایت میں خطا کرنا اور شیعہ ہونا، یہ دو چیزیں محتاج بیان نہیں ہیں۔ مگر تدلیس کیا چیز ہے اور راوی میں یہ عیب کس درجے کا خیال کیا جاتا ہے، البتہ قابل بیان ہے۔ تا کہ ناظرین اس روایت کی صحت کا صرف ایک تدلیس کے سبب سے اندازہ کر سکیں۔ ابن جوزی تدلیس کو روایت میں اس قدر قبیح اور شنیع سمجھتے تھے کہ وہ تلپیس ابلیس میں لکھتے ہیں:

((ومن تلپیس ابلیس علی علماء المحدثین رواية الحدیث

الموضوع من غیر ان یبنوا انہ موضوع و هذا خیانة منهم علی

الشرع و مقصود ہم تنفیق احادیثم و کثرة روایا تہم و قد قال النبی من روی عنی حدیثا یری انه کذب فهو احد الکاذبین و من هذا الفن تدلیسہم فی الروایة فتارة یقول احدہم فلان عن فلان او قال فلان عن فلان یوہم انه سمع منه و لم یسمع وهذا قبیح لانه یجعل المنقطع فی مرتبة المتصل)) انتھی

”یعنی محدثین کو تدلیس حدیث موضوع کو روایت کرنے میں یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ وہ یہ بیان نہیں کرتے کہ یہ حدیث موضوع ہے، حالانکہ یہ بات اس کی شرع میں خیانت ہے اور ان کا اپنی احادیث کا جاری کرنا اور کثرت سے روایات کا ہونا مقصود ہوتا ہے اور پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص میری طرف سے کوئی حدیث روایت کرے اور وہ یہ جانتا ہو کہ وہ حدیث جھوٹی ہے تو وہ خود بھی جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا ہے۔ اور فن حدیث میں روایت کی تدلیس یہ ہے کہ راوی یہ کہے کہ فلاں نے فلاں سے فلاں نے کہا فلاں سے، جس سے یہ وہم دلاتا ہے کہ فلاں نے فلاں سے سنا ہے حالانکہ نہیں سنا تو یہ بہت بری بات ہے، اس لیے کہ راوی حدیث منقطع کو (جس کا راوی بیچ میں سے چھوٹا ہو) متصل کے (جس کے راوی برابر مسلسل ہوں) برابر کرنا چاہتا ہے..... انتھی“

اور میزان الاعتدال میں ان کی نسبت لکھا ہے:

((عطیة بن سعد العوفی الکوفی تابعی شہیر ضعیف قال سالم المرادی کان عطیة یتشیع و قال احمد ضعیف الحدیث و کان ہیثم یتکلم فی عطیة و روی ابن المدائنی عن یحییٰ قال عطیة و ابو ہارون و بشیر بن حرب عندی سواء و قال احمد بلغنی ان عطیة کان یاتی الکلبی فیأخذ عنہ التفسیر کان یکتبه بابی سعید فیقول قال ابو سعید قلت یعنی یوہم انه

الخدري و قال النسائي و جماعة ضعيف .))

”یعنی عطیہ بن سعد عوفی کوئی تابعی مشہور ضعیف ہے اور ابو حاتم کہتے ہیں کہ ان کی حدیث ضعیف ہے، سالم مرادی کہتے ہیں کہ عطیہ شیعہ تھا، امام احمد کہتے ہیں کہ وہ ضعیف الحدیث ہے، یثم کو عطیہ میں کلام ہے اور ابن مدینی نے یحییٰ سے روایت کی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ عطیہ اور ابو ہارون اور بشر بن حرب میرے نزدیک برابر ہیں، امام احمد کہتے ہیں کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ عطیہ کلبی کے پاس آتے اور ان سے تفسیر لیتے اور اسے ابو سعید کے نام سے لکھ دیتے اور یوں کہتے کہ ابو سعید نے ایسا کہا ہے، ذہبی کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان کا مقصود یہ ہوتا کہ لوگ یہ سمجھیں کہ یہ ابو سعید خدری ہیں، اور نسائی اور ایک جماعت نے ان کو ضعیف کہا ہے۔“

اور سخاوی نے رسالہ منظومہ جزری میں جو اصول حدیث میں باب من له اسماء مختلفه و نعوت متعدده میں جہاں کلبی کا ذکر لکھا ہے وہاں یہ بیان کیا ہے ((وہو ابو سعید الذی روی عنہ عطیة العوفی موہما انہ الخدري)) کہ یہی کلبی ابو سعید کی کنیت سے بھی پکارے جاتے ہیں اور عطیہ عوفی ان سے جو روایت کرتے ہیں وہ اسی کنیت سے، یعنی قال ابو سعید کہہ کر روایت کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو یہ خیال ہو کہ یہ ابو سعید خدری ہیں۔

اس حقیقت سے جو ہم نے عطیہ کی بیان کی مثل آفتاب روز روشن کے یہ بات کھل گئی کہ یہ روایت ابو سعید خدری سے جو صحابی رسول تھے، نہیں ہے بلکہ ابو سعید کلبی سے ہے جو مفسر تھے۔

اب ہم ابو سعید کلبی کا حال ظاہر کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ حضرت جن پر ان تمام روایتوں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے جھوٹے، حدیثوں کے بنانے والے اور شیعہ تھے۔ ان کی نسبت امام سخاوی نے شرح رسالہ منظومہ جزری میں اس بات میں جس کا ذکر اوپر ہوا، یہ لکھا

ہے کہ ان لوگوں میں سے جن کے مختلف نام اور متعدد کنیتیں اور لقب ہیں ایک محمد بن سائب کلبی مفسر ہیں، انہی کی کنیت ابو نضر ہے اور اس کنیت سے ابن اسحاق ان سے روایت کرتے ہیں۔ اور انہی کا نام حماد بن سائب ہے اور ابو اسامہ اسی نام سے ان سے روایت کرتے ہیں۔ اور انہی کی کنیت ابو سعید ہے اور اسی کنیت سے عطیہ عوفی ان سے روایت کرتے ہیں تاکہ لوگوں کہ شبہ میں ڈالیں کہ یہ ابو سعید خدری ہیں اور انہی کی کنیت ابو ہشام بھی ہے اور اس کنیت سے قاسم بن الولید ان سے روایت کرتے ہیں۔ اصل الفاظ شرح مذکور کے یہ ہیں:

((ان من امثلة (ای من له اسماء مختلفة و نعوت متعددة)

محمد بن سائب الكلبی المفسر هو ابو النضر الذی روی عنه

ابن اسحاق و هو حماد بن السائب روی عنه ابو اسامہ و هو

ابو سعید الذی روی عنه عطیہ الکوفی موہما انه الخدری

و هو ابو ہشام روی عنه القاسم بن الولید .))

اور تقریب میں ان کی نسبت یہ لکھا ہے:

((محمد بن السائب بن بشیر الكلبی ابو النضر الكوفی

النسابة المفسر منهم بالكذب و رمی بالرفض من السادسة

مات سنة مائة وست اربعین .))

”کہ محمد بن سائب کلبی نسبت جاننے والے اور تفسیر لکھنے والے جھوٹ اور رفض

سے متہم ہیں۔“

اور میزان الاعتدال میں ان کی نسبت لکھا ہے:

((محمد بن السائب الكلبی ابو النضر الكوفی المفسر

النسابة الاخباری قال الثوری اتقوا الكلبی فقیل انك تروی

عنه قال انا اعرف صدقه من كذبه قال البخاری ابو النضر

الكلبی تركه یحییٰ و ابن مہدی ثم قال البخاری قال علی

حدثنا يحيى عن سفیان قال لى الكلبى كلما حدثك عن ابى صالح فهو كذب و قال يزيد بن زريع حدثنا الكلبى و كان سبائيا قال ابو معاوية قال الاعمش اتق هذه السبائية فانى ادركت الناس وانما يسمونهم الكذابين و قال ابن حبان كان الكلبى سبائيا من اولئك الذين يقولون ان عليا لم يمت و انه راجع الى الدنيا و يملاءه عدلا كما ملئت جورا و ان راو اسحابة قالوا امير المؤمنين فيها و عن ابى عونة سمعت الكلبى يقول كان جبريل يملى الوحي النبى ﷺ فلما دخل النبى ﷺ الخلاء جعل يملى على على و قال احمد بن زهير قلت لا حمد بن حنبل يحل النظر فى تفسير الكلبى قال لا ، و قال الجوز جاني وغيره كذاب و قال الدار القطنى و جماعة متروك و قال ابن حبان و ضوع الكذب فيه اظهر من ان يحتاج الى الاعراف و فى و صفه يروى عن ابى صالح عن ابن عباس التفسير و ابو صالح لم ير ابن عباس ولا سمع الكلبى من ابى صالح فلما احتيج اليه اخرجت له الارض فلاذ كبدها لا يحل ذكره فى الكتب فكيف الاحتجاج به .))

”کہ محمد بن سائب کلبی جن کی کنیت ابو النضر ہے وہ کوئی ہیں اور مفسر اور نسب جاننے والے اخباری ہیں۔ امام ثورمى ان کی نسبت کہتے ہیں کہ کلبی سے بچنا چاہیے اس پر ان سے کسی نے کہا کہ آپ تو خود ان سے روایت کرتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ میں اس کے جھوٹ کو اس کے سچ سے جدا کرنا جانتا ہوں اور بخاری نے کہا ہے کہ یحییٰ اور ابن مہدی نے اس کی روایت قابل ترک بتلائی

ہے اور بخاری نے یہ بھی کہا ہے کہ علی نے یحییٰ سے اور انہوں نے سفیان سے بیان کیا ہے کہ ابوصالح سے جو میں تم سے روایت کروں وہ جھوٹی ہے۔ اور یزید بن زریع نے کلبی سے روایت کی ہے کہ وہ عبداللہ بن سبا کے فرقے کا تھا، اور ابومعاویہ کہتے ہیں کہ اعمش نے کہا ہے کہ اس سبا سے فرقے سے بچنا چاہیے کیونکہ وہ کذاب ہوتے ہیں اور ابن حبان نے کہا ہے کہ کلبی سبائی تھا، یعنی ان لوگوں میں سے جو کہتے ہیں کہ علی کرم اللہ وجہہ نہیں مرے اور پھر وہ دنیا کی طرف رجعت کریں گے اور اسے انصاف سے اسی طرح بھر دیں گے جیسے کہ وہ ظلم سے بھری ہوئی تھی اور جب کہ وہ بادل کو دیکھتے تو کہتے کہ امیر المؤمنین اسی میں ہیں۔ اور ابی عوانہ سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے خود کلبی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جبرئیل علیہ السلام پیغمبر خدا ﷺ پر وحی بیان کرتے اور ایسا اتفاق ہوتا کہ آپ رفع حاجت کے لیے بیت الخلاء جاتے تو جبرئیل علیہ السلام علی رضی اللہ عنہ پر اس وحی کو املا کرتے، یعنی ان سے کہتے۔ اور احمد بن زہیر کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبل سے پوچھا کہ کلبی کی تفسیر کا دیکھنا درست ہے؟ انہوں نے کہا نہیں، اور جوز جانی وغیرہ نے کہا ہے کہ کلبی بڑا جھوٹا ہے اور دارقطنی اور ایک جماعت نے کہا کہ وہ متروک ہے، یعنی اس کی روایت لینے کے لائق نہیں ہے، اور ابن حبان کہتے ہیں کہ اس کا جھوٹ ایسا ظاہر ہے کہ بیان کرنے کی حاجت نہیں۔ اور ان حضرات کے صفات میں سے یہ صفت بھی بیان کی گئی ہے کہ وہ تفسیر کو ابوصالح سے اور ابوصالح کی روایت ابن عباس سے بیان کرتے ہیں حالانکہ نہ ابوصالح نے ابن عباس کو دیکھا ہے نہ کلبی نے ایک حرف ابوصالح سے سنا مگر جب ان کو تفسیر میں کچھ بیان کرنے کی حاجت ہوتی تو اپنے دل سے نکال لیتے، ایسے کا ذکر کرنا کتاب میں جائز نہیں ہے نہ کہ اس سے سند لینا۔“

اور تذکرۃ الحفاظ میں ذہبی نے ان کے فرزند ارجمند ہشام بن کلبی کا جہاں بیان لکھا ہے وہاں ان کے پدر بزرگوار، یعنی محمد بن سائب کلبی کو رافضی لکھا ہے اور ان کے فرزند کو اس قسم کے متروکین میں سے کہ جس کو حفاظ حدیث میں داخل بھی نہیں کیا، جیسا کہ وہ کہتے ہیں: ((ہشام بن کلبی الحافظ احد المتروکین لیس بثقة فلہذا لم ادخلہ بین حفاظ الحدیث وهو ابو المنذر ہشام بن محمد السائب الکوفی الرافضی النسابة)) اور یاقوت حموی نے معجم الادبا میں جہاں محمد بن جریر طبری کی کتابوں کا ذکر کیا ہے، لکھا ہے: ((ولم يتعرض ای الطبری تفسیر غیر موثوق بہ فانہ لم یدخل فی کتابہ شیئاً عن کتاب محمد بن السائب الکلبی ولا مقاتل بن سلیمان ولا محمد بن عمر الواقدی لانہم عنده اظناہ)) کہ طبری نے غیر معتبر

① اور ان دونوں باپ بیٹوں کی نسبت انساب سمعانی مؤلف ابوسعید عبدالکریم ابن محمد المروزی الشافعی میں یہ لکھا ہے:

وابوالنضر محمد بن السائب ابن بشر بن عمر و ابن الحارث بن عبدالعزى بن امرى القیس بن عامر بن النعمان ابن عامر بن عبدود بن کنانہ بن عوف بن عذرہ بن زید اللات بن افیدہ ابن ثورین کلب صاحب التفسیر من اهل الکوفہ یروی عنہ الشوری و محمد بن اسحاق و یقولان ثنا ابو النضر حتی لا یعرف و هو الذی عطیہ العوفی ابا سعید فکان یقول حدثنی ابو سعید یرید بہ الکلبی فیتوہمون انہ ارادہ بہ ابا سعید الخدری و کان الکلبی یقول اسبابا من اصحاب عبداللہ بن سبا من اولئک الذین یقولون ان علیا لم یمت و انہ راجع الی الدنیا قبل قیام الساعة فیملأ ہاعد الا کما ملئت جورا و ان راود اسحابة قالوا امیر المومنین فیہا فاحذمنہم و قال: و من قوم اذ اذ کروا علیا۔ یصلون الصلوة علی السحاب مات الکلبی ۱۰۴۶ء وابنہ ابو المنذر ہشام بن محمد سائب بن بشیر الکلبی من اهل الکوفہ صاحب النسب یروی عن ابیہ و معروف مولی سلیمان الغرائب و العجائب والاخبار التي الاصول لہاروی عنہ شباب العصفری وابنہ العباس بن ہشام و محمد بن سعید کاتب الواقدی و علی بن حرب الموصلی و عبداللہ بن الضحاک الہداوی و ابو الاشعث احمد ابن المقدم العجلی و کان غالباً فی التشیع اخبارہ فی الاغلوطات اشہر من ان یحتاج الی الاعراف فی وصفہا و کان ہشام بن الکلبی یقول حفظت مالہ یحفظ احد و نسیت مالہ ینسہ احد کان لی عم یعاتبنی علی حفظ القرآن فدخلت بیتا و حلفت ان لا اخرج منہ حتی احفظ القرآن محفظة فی ثلاثة ايام و نظرت فی المرأة و قبضت علی ئحسیتی لاخذ مادون القبضة فاخذت مافوق القبضة قال عبداللہ بن احمد بن حنبل سمعت ابی یقول ہشام بن محمد بن السائب الکلبی من یحدث عنہ انما هو صاحب سمر و نسب و ظننت ان احدا یحدث عنہ مات سنة

تفسیر اپنی تفسیر کی کتاب میں بیان نہیں کی اور اسی لیے کتاب میں کچھ بھی محمد بن سائب کلبی اور مقاتل بن سلیمان اور محمد بن عمر واقدی کی کتابوں سے نہیں لیا۔ کیونکہ یہ لوگ ان کے نزدیک مشکوکیں میں سے ہیں۔ اور محمد طاہر گجراتی نے ”تذکرۃ الموضوعات“ میں کلبی کی نسبت لکھا ہے: ((قد قال احمد فی تفسیر الکلبی من اولہ الی آخرہ کذب لایجعل النظر فیہ .))

یہ حالت ہے ابو سعید کلبی کی، جو محققین کے اقوال سے ہم نے بیان کی ہے۔ بلحاظ عقائد کے عبداللہ بن سبا کے فرقے میں سے ہیں اور رجعت کے قائل اور جناب امیر کے بادلوں میں چھپے ہونے کے معتقد اور بلحاظ صدق کے ایسے اعلیٰ درجے پر ہیں کہ جن کو نہ دیکھا اور جن سے نہ کچھ سنا ان سے برابر روایت کرتے ہیں، اور جس موقع پر جو چاہا اسے اپنے دل سے گڑھ کر بیان کر دیتے ہیں۔ اور اعتبار کی یہ کیفیت ہے کہ معتبر اور محقق تفسیر لکھنے والے مثل طبری کے اپنی کتاب میں ان کی کسی روایت کا نقل کرنا بھی جائز نہیں سمجھتے اور یہی ہیں واضح یا ناقل حدیث ہبہ فدک کے جسے عطیہ نے کہہ وہ بھی مدلس اور شیعہ تھے، اپنے مذہبی عقائد کی حمایت کے لیے ان سے روایت کیا ہے اور ان کے دیگر نام اور کینٹین چھوڑ کر حدیث ابو سعید کہہ کر لوگوں کو اس شبہ میں ڈالا کہ یہ ابو سعید خدری ہوں گے۔

اس بات کا ثبوت کہ ابو سعید جن پر روایت کا سلسلہ ان حدیثوں کا ختم ہوتا ہے ابو سعید خدری نہیں ہیں۔ صرف خیالی نہیں ہے بلکہ اس کا ثبوت متقدمین کی تحریروں اور روایتوں سے بھی ملتا ہے۔ مثلاً: کنز العمال میں جو روایت حاکم کی تاریخ سے منقول ہے اور عماد الاسلام وغیرہ میں بیان کیا ہے اور سید الحفاظ ابن مردویہ کی روایت جو طرائف اور عماد الاسلام وغیرہ میں منقول ہے اور درمنثور سیوطی، بزار، ابویعلیٰ اور ابن ابی حاتم کی روایتوں میں صرف ابو سعید سے لکھا ہے خدری کا لفظ اس کے آگے نہیں ہے، یہ لفظ اسی وہم کے سبب سے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا پیچھے بڑھایا گیا ہے۔

اگرچہ عطیہ اور کلبی کے حالات بیان کرنے کے بعد ہبہ فدک کی روایت کا غلط اور جھوٹا

ہونا ثابت ہو گیا اور ثابت بھی اس طور پر کہ اس میں کچھ شبہ نہیں رہا اور اس بات کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ اور راویوں سے بحث کی جائے مگر ہم روایت اور راویوں سے بھی بحث کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ یہ سارے سلسلے متروکین، مجہولین، کاذبین اور رافضین سے کم و بیش بھرے ہوئے ہیں اور جن کو دیکھیے اس میں کچھ نہ کچھ تشیع یا تدریس یا مجہولیت کی بو آتی ہے۔

پہلی روایت جو طرائف کی سید الحفاظ ابن مردویہ سے ہم نے نقل کی اس کے آخری راوی ابو سعید ہیں اور جس نے ان سے روایت کی ہے، یعنی عطیہ ان کا حال تو معلوم ہو گیا اب فضیل کا حال سنیے جنہوں نے عطیہ سے روایت کی ہے، ان کی نسبت تقریب میں لکھا ہے الفضیل بن مرزوق الکوفی رمی بالتشیع کہ فضیل بن مرزوق تشیع کے سبب سے چھوڑ دیے گئے ہیں۔ اور تہذیب التہذیب میں لکھا ہے: ((الفضیل بن مرزوق الکوفی قال ابن معین شدید التشیع قال ابو حاتم صادق و ہم کثیرا)) کہ فضیل بن مرزوق کوفی کی نسبت ابن معین نے کہا ہے کہ بڑے کٹر شیعہ تھے اور ابو حاتم نے کہا ہے کہ سچے تھے مگر وہم بہت کرتے تھے۔ اور تہذیب میں ان کی نسبت لکھا ہے: بکتب حدیثہ ولا یحتج بہ و قال النسائی ضعیف کہ ان کی حدیث لکھی جائے مگر قابل حجت نہیں ہے اور نسائی کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہیں۔ اور میزان الاعتدال میں ہے:

((وقال ابو عبد الله الحاکم فضیل بن مرزوق لیس من شرط الصحیح عیب علی مسلم اخراجہ فی الصحیح و قال ابن حبان منکر الحدیث جدا کان ممن یخطی علی الثقات ویروی عن عطیة الموضوعات قلت عطیة اضعف منه قال ابن عدی انه اذا وافق الثقات یحتج بہ وروی احمد بن ابی خیثمة عن ابی معین ضعیف .))

”یعنی ابو عبد اللہ حاکم کہتے ہیں کہ فضیل بن مرزوق میں شرط صحت نہیں ہے اور حاکم نے امام مسلم پر اس امر سے عیب لگایا ہے کہ انہوں نے اسے ثقہ لوگوں میں

شمار کیا ہے۔ اور ابن حبان کہتے ہیں کہ فضیل بہت ہی منکر الحدیث ہے اور ثقات پر خطا لگایا کرتے تھے اور عطیہ سے موضوعات روایت کرتے ہیں۔ ذہبی کہتے ہیں کہ عطیہ تو ان سے بھی زیادہ ضعیف ہیں۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ فضیل جب ثقات کی موافقت کریں تو ان سے احتجاج کیا جائے اور احمد بن حنبلہ نے ابن معین سے ان کا ضعیف ہونا روایت کیا ہے۔“

اور فضیل بن مرزوق سے اس خبر کو علی بن عباس نے روایت کیا ہے۔ ان کا حال سنئے:

”میزان الاعتدال“ میں ہے:

((علی بن عباس الارزق الاسدی الکوفی عن العلاء بن المسیب و ابن ابی سلیم و غیر ہماروی ابن عباس عن ابی معین لیس بشیء وقال الجوزجانی و النسائی و الازدی ضعیف وقال ابن حبان فحش خطاء فاستحق الترك قال القاسم بن زکریا ثنا عباد بن یعقوب ثنا علی بن عباس عن فضیل بن مرزوق عن عطیة عن ابی سعید قال لمانزلت و ات ذا القربی حقہ دعا رسول اللہ فاطمة فاعطاها فدک قلت هذا باطل ولو کان دفع ذلك لما جاءت فاطمة تطلب شیئاً هو فی حوزها و ملکها و فیہ غیر علی من الضعفاء.....))

”کہ علی بن عباس ارزق اسدی کوفی علاء بن مسیب اور ابن ابی سلیم وغیرہما سے روایت کرتے ہیں، اور ابن عباس نے ابن معین سے بیان کیا ہے کہ یہ کچھ نہیں ہیں اور جوزجانی، نسائی اور ازدی ان کو ضعیف کہتے ہیں۔ اور ابن حبان کہتے ہیں کہ یہ ایسی خطائیں فاحش کرتے تھے جس سے چھوٹ دینے کے مستحق ہوئے۔“

قاسم بن زکریا نے کہا کہ عباد بن یعقوب نے ہم سے بیان کیا اور ان سے علی بن عباس نے اور ان سے فضیل بن مرزوق نے اور اس سے عطیہ نے اور اس سے

ابوسعید نے کہ جب آیت ﴿وَإِذَا الْقُرْبَىٰ﴾ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلا کر فدک دے دیا۔ ذہبی کہتے ہیں کہ یہ حدیث باطل ہے اگر آپ فدک دے دیتے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پھر کچھ طلب نہ فرماتیں، اس لیے کہ فدک آپ کی ملک اور قبضے میں ہوتا، اور اس حدیث میں سواعلیٰ بن عباس کے اور بھی ضعیف راوی ہیں۔“

علی بن عباس سے عباد بن یعقوب روایت کرتے ہیں، ان حضرت کا حال معلوم کیجیے۔ تقریب میں یہ لکھا ہے: ((عباد بن یعقوب الرواجنی بتخفيف الواو بالجيم المسكورة والنون الخفيفة ابو سعيد الكوفي صدوق رافضی حدیثہ فی البخاری مقرون بالغ ابن حبان فقال يستحق الترك .)) یعنی عباد بن یعقوب رافضی تھے ان کی حدیث بخاری میں ہے جس کی نسبت ابن حبان نے نہایت مبالغہ کر کے کہا ہے کہ وہ چھوڑ دینے کے لائق ہے۔ اور معنی مؤلفہ صاحب مجمع البحار میں ہے: ((ابن یعقوب الرواجنی صدوق رافضی حدیثہ فی البخاری مقرون فقیل علیہ ہو يستحق الترك .)) اور تہذیب التہذیب میں ہے: ((عباد بن یعقوب الاسدی ابو سعید الرواجنی احد رؤس الشيعة..... قال ابن عدی فیہ فلوروی احادیث منكرة فی فضائل اهل بیت و قال صالح بن محمد یثتم عثمان .)) کہ عباد بن یعقوب شیعہ کے بڑے لوگوں میں سے ہیں۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ ان میں تشیع کا غلو تھا، فضائل اہل بیت میں بہت سی منکر حدیثیں روایت کرتے ہیں، اور صالح بن محمد کہتے ہیں کہ یہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو برا کہا کرتے تھے۔ اور میزان الاعتدال میں ہے:

((عباد بن یعقوب الاسدی الرواجنی الكوفي من غلاة الشيعة ورؤس البدع لكنه صادق فی الحدیث عن شريك والولید بن ابی ثور و خلق و عنه البخاری حدیثا فی الصحيح

قمر و نابا خرو قال ابن خزيمة حدثنا الثقة في رواية والتمهم في دينه عباد وروى عبدان الاهوازي عن الثقة ان عباد بن يعقوب كان يشتم السلف و قال ابن عدى يروى احاديث في الفضائل انكرت عليه و قال صالح جزره كان عباد بن يعقوب يشتم عثمان و سمعته يقول الله اعدل من ان يدخل طلحة والزبير الجنة قاتلا عليا بعد ان بايعاه و كان داعية الى الرفض و مع ذلك يروى المناكير عن المشاهير فاستحق

الترك و قال الدارقطني عباد بن يعقوب شيعى صدوق .))
 ”يعنى عباد بن يعقوب اسدى رواجى كوفى غالبا شيعه اور بدعتيوں كے رئيسوں ميں سے هيں ليكن حديث ميں صادق هيں، شريك اور وليد بن ابى ثور اور بهت سى خلق سے روايت كرتے هيں۔ اور ان سے بخارى نے ايك حديث جو دوسرے راوى سے مقرون ہے روايت كى ہے، اور ابن خزيمة كہتے هيں كہ ايسا شخص جو روايت ميں ثقہ اور دين ميں مہتم ہو كر ہم سے حديث بيان كرتا ہے وہ عباد ہے اور عبدان اهوازى نے ثقہ سے روايت كى ہے كہ يہ سلف كو گالياں ديا كرتے تھے اور ابن عدى كہتے هيں كہ يہ فضائل ميں منكر احاديث روايت كرتے هيں اور صالح جزره كہتے هيں كہ عباد عثمان غنى رضى اللہ عنہ كو گالياں ديتا تھا اور ميں نے اس كو يہ بھى كہتے سنا كہ اللہ تعالى اس امر سے زيادہ عادل ہے كہ طلحہ رضى اللہ عنہ اور زبير رضى اللہ عنہ كو جنت ميں داخل كرے كيونكہ انہوں نے حضرت على رضى اللہ عنہ سے بيعت كرنے كے بعد قتال كيا اور يہ رفض كى طرف لوگوں كو بلايا كرتا تھا، اور باوجود اس كے مشاہير سے منكر احاديث روايت كرتا ہے، اس ليے مستحق ترك ہوا۔ دارقطنى كہتے هيں كہ عباد پكا شيعہ ہے۔“

اس روايت كے سلسلے ميں جن لوگوں كے نام اسماء الرجال كى ان كتابوں ميں ہم كو ملے

جو ہمارے پاس ہیں ان میں پانچ نام پائے گئے ہیں اور خدا کے فضل سے پانچوں شیعہ نکلے، یعنی (۱) عماد بن یعقوب (۲) علی بن عباس (۳) فضیل (۴) عطیہ (۵) ابوسعید۔ اور ان سب کے بزرگ جو اس روایت کے بانی ہیں وہ ابوسعید کلبی ہیں جن کا درجہ تشیع سے بھی بالاتر ہے، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موت کے بھی قائل نہیں بلکہ ان کی رجعت کے معتقد ہیں۔

دوسری روایت جو بحار الانوار میں بحذف اسانید اور تفسیر مجمع البیان طبرسی میں بہ تفصیل اسناد سید ابو حمید مہدی ابن نزار حسینی سے شروع اور ابوسعید خدری پر منتهی ہوتی ہے، اس کے اخیر تین راوی فضیل بن مرزوق، عطیہ عوفی اور ابوسعید کلبی ہیں، جن کو غلطی سے یاد ہو کے سے ابو سعید خدری سمجھا ہے، باقی اس سلسلے میں ایک یحییٰ بن علی ہیں ان کی نسبت تقریب میں ہے: ((یحییٰ بن یعلیٰ الاسلمی کوفی شیعہ ضعیف من التاسعة .)) اور تہذیب التہذیب میں ہے: ((یحییٰ بن یعلیٰ الاسلمی ابو زکریا الکوفی القطرافی عن یونس بن خباب والاعمش وعنه جندل ابن والق و قتیبة قال ابن معین لیس بشیء و قال ابو حاتم ضعیف الحدیث .)) کہ یحییٰ بن یعلیٰ شیعہ ضعیف ہیں اور ابن معین کہتے ہیں کہ کچھ نہیں ہیں اور ابو حاتم کہتے ہیں کہ ضعیف الحدیث ہیں۔ باقی راویوں کی حقیقت نہ موجودہ کتابوں میں نکلی اور نہ ان کے تحقیق کی ضرورت ہے، اس لیے کہ بالفرض اگر وہ صدوق اور سنی ثقہ بھی ہوں، تاہم سلسلہ روایت ان تین پر ختم ہوتا ہے جو شیعہ اور مدلس ہیں اور اخیر کے راوی جو بانی حدیث ہیں اور جن کو ابوسعید خدری غلطی یاد ہو کہ سے لکھا ہے، وہ کاذب، واضح حدیث اور شیعہ غالی ہیں، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ سوائے اس کے یہ روایت جو بحار الانوار میں لکھی ہے اس میں کسی کتاب کا حوالہ نہیں کہ جس کی طرف رجوع کیا جائے، کیا تعجب ہے بلکہ گمان غالب ہے کہ یہ روایت شیعوں کی ہی ہو اور ملا باقر مجلسی نے یا صاحب مجمع البیان نے اپنے یہاں کی کتابوں سے نقل کیا ہو۔

تیسری روایت جسے بحار الانوار میں سید ابن طاووس کی کتاب سعد السعود سے نقل کیا ہے

اور انہوں نے تفسیر محمد بن عباس بن علی بن مروان سے اس روایت کو لیا ہے۔ اس کی نسبت اول تو یہ دیکھنا ہے کہ محمد بن عباس بن علی بن مروان کون بزرگ ہیں۔ ”منتھی المقال فی اسماء الرجال“^① کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ علماء اور مفسرین شیعہ میں سے ہیں جیسا کہ ان کے ترجمہ کتاب مذکور میں لکھا ہے: ((محمد بن عباس بن علی بن مروان بن الماہیار ابو عبد اللہ البزاز المعروف بابن الحجاج ثقة فی اصحابنا عین سدید کثیر الحدیث له کتاب المقنع فی الفقہ کتاب الدوا جن کتاب منازل من القرآن فی اهل البيت و قال جماعة من اصحابنا انه کتاب لم یصنف فی معناه مثله و قيل انه الف ورق جش صه الا ذکر کتابین الاولین و فی ست اجبرنا بکتبه و روایاته جماعة من اصحابنا عن ابی محمد بن ہارون بن موسی التلعکبری عنه اقول فی مشکا ابن عباس بن علی بن مروان الثقة عنه التلعکبری .)) ” کہ محمد بن عباس ثقہ ہیں اور ہمارے اصحاب میں سے ہیں، نہایت کثرت سے حدیثیں روایت کرتے ہیں اور بہت سی کتابیں ان کی تصنیف میں سے ہیں، ان میں سے ایک تفسیر میں ان آیات قرآنی کے ہے جو اہل بیت کی شان میں نازل ہوئیں اور جس کی نسبت ہمارے بہت سے عالموں نے کہا ہے کہ اس قسم کی کتاب اس باب میں کبھی تصنیف نہیں ہوئی اور اس کے ہزار ورق ہیں۔“ اس لیے اس کتاب میں لکھا ہونا تو صرف شیعوں کو مقبول ہوگا نہ کہ سنیوں کو۔ اور ان حضرات نے اپنی تفسیر میں یہ لکھا نہیں کہ اس روایت کو سنیوں کی کتاب سے لیا ہے یا شیعوں کی۔ مگر یہ بھی وہی روایت ہے جسے ہم اوپر بیان کر چکے، اس لیے کہ اس میں دو طریقوں سے اس روایت کو بیان کیا ہے۔ ایک تو محمد بن محمد اور پیشم بن خلف اور عبد اللہ بن سلیمان اور محمد بن قاسم سے، کہ یہ چاروں کہتے ہیں حدثنا عباد بن یعقوب کہ یہ حدیث ان کو عباد بن یعقوب سے پہنچی اور

① یہ کتاب اسماء الرجال میں شیعوں کے یہاں نہایت معتمد ہے اور اس درجے کی ہے جیسے کہ میزان الاعتدال سنیوں کے یہاں۔ ۱۲ منہ۔

عباد بن یعقوب کو علی بن عباس سے، (جس کو غلطی سے عباس لکھا ہے) اور دوسرا سلسلہ یہ ہے کہ جعفر بن محمد حسینی روایت کرتے ہیں علی بن منذر طریقی سے اور وہ روایت کرتے ہیں علی بن عباس سے۔ پس یہ دونوں سلسلے علی بن عباس پر ختم ہوتے ہیں اور علی بن عباس کا سلسلہ ختم ہوتا ہے فضیل پر، اور ان کا عطیہ پر، اور ان کا ابو سعید پر۔ اور ان تینوں کا حال بخوبی معلوم ہو چکا ہے۔

ان سے ایک سلسلہ جو علی بن منذر طریقی سے چلا ہے، اس کی کیفیت یہ ہے کہ علی بن منذر اگرچہ صدوق ہیں مگر شیعہ ہیں جیسا کہ تقریب میں لکھا ہے: ((علی بن منذر الطریقی بفتح المهملة و کسر الراء بعدھا تختانیة ساکنة ثم قاف الکوفی صدوق یتشیع)) اور میزان الاعتدال میں ذہبی ان کی نسبت لکھتے ہیں: ((قال النسائی شیعی محض ثقة .)) اور جب کہ علی بن منذر شیعہ تھے تو ان کی ایسی روایت پر جو ان کے عقائد کی تائید کرنے والی ہو، جو کچھ اعتبار ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اور علی بن منذر طریقی سے اس روایت کو جعفر بن محمد حسینی نے روایت کیا ہے اور یہ نہ صرف معمولی شیعہ ہیں بلکہ نہایت صدوق اور ثقہ من مشائخ الاجازة شیعوں کے ہیں، جیسا کہ منتهی المقال میں جو اسماء الرجال میں شیعوں کی نہایت معتبر کتاب ہے، ان کی نسبت لکھا ہے: ((جعفر بن محمد بن ابراهیم الحسینی الموسوی المصری یروی عنه التلعکبری وکان سماعه عنه سنة اربعین و ثلاث مائة بمصر وله منه اجازة وزاد فی بعض النسخ ابو القاسم فی الاول فانظر انه یکنی به وکناه به الشیخ ایضا فی محمد بن ابی عمیر و عبر عنه ابن شریف الصالح و فی عبدالله احمد بن نهیک ایضا کو نه من مشائخ الاجازة و ذلك مارة الوثاقه .)) یعنی جعفر بن محمد بن ابراهیم حسینی موسوی مصری، ان سے تلعکبری روایت کرتے ہیں اور تلعکبری نے ان سے مصر میں سن ۳۴۰ء میں حدیث کی سماعت کی ہے اور ان کو ان سے اجازت بھی حاصل ہے۔ اور یہ مشائخ اجازہ میں سے ہیں اور یہ ثقہ ہونے کی علامت ہے، اور عبداللہ بن احمد بن نہیک کے بارے میں لکھا ہے: ((الشیخ الصدوق ثقة)) اور انہیں کے تذکرے میں لکھا ہے: ((اخبرنا

القاضی ابو الحسن محمد بن عثمان بن الحسن قال اشتملت اجازة
ابی القاسم جعفر بن محمد بن ابراهیم الموسوی)) انتهى .))

دوسرے سلسلے میں ایک راوی محمد بن قاسم زکریا ہیں، ان کی نسبت تقریب میں لکھا ہے:
((محمد بن القاسم الاسدی الکوفی شامی الاصل لقبه كاذب .)) یعنی
یہ حضرت جھوٹوں میں داخل ہیں۔ اور رجعت پر ایمان لانے والے ہیں، اس سے بڑھ کر ان
کے تشیع کی اور کیا دلیل ہوگی: ((كما قال فی میزان الاعتدال محمد بن القاسم
بن زکریا المجازی الکوفی عن علی بن منذر الطریقی وجماعة تکلم
فیہ و قیل کان یومن بالرجعة و قعد حدث بکتاب النہی عن حسین بن
نصر بن مزاحم ولم یکن له فیہ سماع و مات سنة ست و عشرين و
ثلاث مائة .)) یعنی میزان الاعتدال میں کہا ہے کہ میں بن قاسم بن زکریا مجازی کوفی ہیں جو
علی بن منذر طریقی سے روایت کرتے ہیں اور ایک جماعت نے ان کے سلسلے میں کلام کیا ہے
اور یہ کہا ہے کہ یہ رجعت پر ایمان رکھتے تھے اور کتاب النہی میں حسین بن نصر بن مزاحم سے
انہوں نے روایت کی ہے حالانکہ ان سے سنا بھی نہیں۔ سن ۳۲۶ء میں انتقال ہوا۔

اور ایک راوی اس میں محمد بن سلیمان ہیں یہ وضع حدیث میں متہم ہیں اور میزان الاعتدال
میں ان کی نسبت لکھا ہے: ((محمد بن محمد بن سلیمان عن الطبرانی مخبر
موضوع الہم بہ .)) اور ایک راوی عبداللہ بن سلیمان بن اشعث ہیں ان کی نسبت میزان
الاعتدال میں لکھا ہے کہ یہ اول میں منسوب بہ ناصبیت تھے، اس لیے یہ بغداد سے نکال دیے گئے
مگر پھر علی بن عیسیٰ کے زمانے میں واپس آئے اور اس داغ کے مٹانے کے لیے اپنے خیال سے
بنابنا کرفضائل کی حدیثیں بیان کیں اور ان میں سے ایک شیخ بن گئے۔ الفاظ میزان کے یہ ہیں:

((عبدالله بن سلیمان بن اشعث السجستانی ابوبکر الحافظ

الثقة صاحب التصانیف وثقه الدار قطنی فقال ثقة الا انه کثیر

الخطاء فی الکلام علی الحدیث و ذکرہ ابن عدی و قال لولا

ماشرطنا والا لماذکرته الی قوله سمعت ابا داؤد یقول ابنی
عبدالله کذاب قال ابن سعد کفانا ما قال ابوہ فیہ ثم قال ابن
عدی سمعت موسیٰ بن القاسم یقول حدثنی ابوبکر سمعت
ابراہیم الاصبہانی یقول ابوبکر بن ابی داؤد کذاب قال ابن
عدی کان فی الابتداء نسب الی شیئی من النصب فنفاء ابن
الفراط من بغداد فردہ علی بن عیسیٰ فحدث و اظهر فضائل من
تخیل فصار شیخا منهم .))

”عبداللہ بن سلیمان بن اشعث سجستانی ابوبکر حافظ ثقہ اور صاحب تصانیف ہیں
دارقطنی نے ان کو ثقہ بتایا ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ کلام میں غلطی بھی کرتے
تھے، ابن عدی کہتے ہیں کہ میں نے ابوداؤد سے سنا وہ کہتے تھے کہ میرا لڑکا
عبداللہ جھوٹا ہے۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ ان کے باپ کی بات ہمارے لیے کافی
ہے، پھر ابن عدی کہتے ہیں کہ میں نے موسیٰ بن قاسم کو کہتے ہوئے سنا کہ مجھ سے
ابوبکر نے بیان کیا کہ میں نے ابراہیم اصبہانی سے سنا وہ کہتے ہیں کہ ابوداؤد جھوٹا
ہے، ابن عدی کہتے ہیں کہ وہ ابتدا میں ناصبیت کی طرف مائل تھے۔ ابن فراط
نے ان کو بغداد سے نکال دیا لیکن علی بن عیسیٰ نے ان کو واپس بلا لیا اور یہ اپنی
طرف سے فضائل کی حدیثیں بیان کرنے لگے اور ان کے شیخ بن گئے۔“

یہ حال تو ہے ان دو طریقوں کا جو سید ابن طاؤس نے تفسیر محمد بن عباس سے نقل کی ہے
اور لکھا ہے کہ بیس طریقوں سے یہ حدیث منقول ہے، غالباً یہی کیفیت باقی سلسلوں کی بھی
ہوگی، بشرطیکہ کوئی اور سلسلے نام کے لیے بھی بیان کیے گئے ہوں، ہم کو تو ملا باقر مجلسی کی عادت
سے یقین نہیں آتا کہ کوئی اور سلسلہ بھی بیان کیا ہوگا۔ کیونکہ اگر بیان کیا گیا ہوتا تو وہ اپنی
کتاب بحار الانوار میں جو ایک دریائے ناپیدا کنار ہے، لکھنے سے دریغ نہ فرماتے، بلکہ ضرور
لکھتے تا کہ دیکھنے والوں کو روایت کی عظمت معلوم ہو۔

چوتھی روایت جو ملا باقر مجلسی نے بحار الانوار میں لکھی ہے اس کے اول راوی محمد بن عباس ہیں، دوسرے علی بن عباس مقاضی، تیسرے ابو کریب، چوتھے معاویہ بن ہشام، پانچویں فضیل بن مرزوق، چھٹے عطیہ اور ساتویں ابوسعید خدری ہیں۔

یہ سلسلہ بھی فضیل بن مرزوق، عطیہ اور ابوسعید پر منتهی ہوتا ہے۔ اس لیے ہم اس روایت کو بھی اگرچہ اس کے درمیانی راوی دوسرے ہیں، دوسری روایت نہیں خیال کرتے اور کیوں کر خیال کریں جب کہ آخری راوی تو وہی فضیل، عطیہ اور ابوسعید ہیں۔ ان میں سے ایک درمیانی راوی ابو کریب ہیں وہ بھی مجاہیل سے ہیں، جیسا کہ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے: ((ابو کریب الاسدی قال ابو حاتم مجہول .))

قسم اول: جس میں چار روایتیں تھیں ان کا حال ہم بیان کر چکے، اور یہ بات ہم نے صاف صاف دکھادی کہ یہ ایک ہی روایت ہے جس کے آخری راوی شیعہ ہیں، دوسری قسم کی روایتوں کا بھی یہی حال ہے۔

کنز العمال سے جو روایت عماد الاسلام میں نقل کی ہے وہ صرف یہ ہے کہ عن ابی سعید، نہ لفظ خدری کا ابوسعید کے آگے ہے اور نہ اسناد کا سلسلہ اس میں مذکور ہے، اور صاحب کنز العمال نے اس کو حاکم کی تاریخ سے لیا ہے۔ اور حاکم نے اس کی نسبت کہا ہے کہ اس روایت کو صرف ابراہیم بن محمد بن میمون نے علی بن عابس سے بیان کیا ہے۔ یہ روایت بھی مثل دوسری روایتوں کے تعجب خیز اور نفرت انگیز ہے، اس لیے کہ اول تو حاکم خود مائل بہ تشیع تھے بلکہ اس سے بھی کسی قدر بڑھے ہوئے اور ان کی کتابوں میں موضوع حدیثیں منقول ہیں۔ اور رافضی خبیث کے الفاظ بھی ان کی نسبت استعمال کیے گئے ہیں جیسا کہ تذکرۃ الحفاظ ذہبی میں لکھا ہے:

((قال الخطیب ابوبکر ابو عبد اللہ الحاکم کان ثقة یمیل الی

التشیع فحدثنی ابراہیم بن محمد المودی و کان صالحا

عالمًا قال جمع الحاکم احادیث و زعم انها صحاح علی

شرط البخاری و مسلم منها حدیث الطیر و من کنت مولاه

فعلى مولاه فانكرها عليه اصحاب الحديث ولم يلتفتوا الى قوله ولا ريب ان فى المستدرک احاديث كثيرة ليست على شرط الصحة بل فيه احاديث موضوعه شان المستدرک باخراجها فيه قال ابن طاهر سالت ابا اسمعيل الانصارى عن الحاكم فقال ثقة فى الحديث رافضى خبيث ثم قال ابن طاهر كان شديد التعصب للشيعة فى الباطن .))

”خطیب کہتے ہیں کہ ابوبکر عبداللہ حاکم ثقہ تھے لیکن شیعیت کی طرف مائل تھے۔ ابراہیم بن محمد مودى کہتے ہیں کہ وہ ایک صالح عالم تھے انہوں نے کہا کہ حاکم نے کچھ حدیثیں جمع کیں اور یہ خیال کیا کہ یہ بخاری اور مسلم کی شرط پر صحیح ہیں ان میں سے حدیث طیر اور من کنت مولاه فعلى مولاه بھی ہے، لیکن اصحاب حدیث اس کا انکار کرتے ہیں اور اس کی طرف دھیان نہیں دیتے، اس میں کوئی شک نہیں کہہ مستدرک میں بہت سی حدیثیں ہیں جو صحیح نہیں بلکہ موضوع ہیں۔ ابن طاہر کہتے ہیں کہ میں نے ابواسمعیل انصاری سے حاکم کے بارے میں پوچھا تو کہا کہ حدیث میں ثقہ ہیں لیکن خبیث رافضی ہیں، آگے کہا کہ بہت متعصب شیعہ ہیں۔“

اور انہوں نے جو ابراہیم بن محمد بن میمون سے روایت کی ہے وہ خود ان کے تشیع کو ثابت کرتی ہے۔ اس لیے کہ ان کی نسبت ”منتھی المقال فى اسماء الرجال“ میں جو کہ شیعوں کی معتمد کتاب ہے لکھا ہے کہ ابراہیم بن محمد بن میمون کو میزان الاعتدال میں اجلاء شیعہ سے لکھا ہے: ((کما قال و من کتاب میزان الاعتدال انه من اجلاء الشيعة روى عن على بن عابس انتهى ، ولعله ابن میمون الانى .)) اور پھر دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: ((ابراہیم بن میمون الکوفى صدوق و یاتى فى ترجمة عبدالله بن مسکان ان ابراهیم هذا حمل جواب مسائل عبدالله عن ابى عبدالله فيظهر ان الامام كان يعتمد فهو معتمد عليه وفاقا

” یعنی ابراہیم بن میمون کو فی سچے ہیں یہ ائمہ کے پاس آمد و رفت رکھتے تھے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام ان پر اعتماد کرتے تھے اور یہ امام کے معتمد تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ معمولی شیعہ نہ تھے بلکہ امام جعفر صادق کے معتمد علیہ تھے۔ ان حضرت نے روایت کی ہے علی بن عباس سے جو حقیقت میں علی بن عباس ہیں اور علی بن عباس کا حال ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ((انہ کان من الضعفاء المتروکین .)) کہ یہ ضعیف اور متروک لوگوں میں سے ہیں اور ان حضرات کا سلسلہ ابوسعید تک پہنچتا ہے اور خیریت سے اس میں ابو سعید کا لفظ بھی نہیں ہے جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ ابوسعید، ابوسعید خدری نہیں ہیں، بلکہ وہی ابوسعید کلبی ہیں۔

دوسری وہ روایت ہے جو عماد الاسلام میں تفسیر درمنثور سیوطی سے اور طعن الرماح میں تفسیر مذکور اور نیز بزار، ابویعلیٰ، ابن حاتم اور ابن مردویہ سے بحوالہ سند نقل کیا ہے، اور لکھا ہے کہ ابو سعید خدری سے یہ روایت منقول ہے۔ اس روایت کا سلسلہ اگرچہ منقول نہیں ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہی روایت ہے جو سید الحفاظ ابن مردویہ سے اوپر نقل ہو چکی۔ اور مولوی حیدر علی صاحب مرحوم نے اپنی ایک تالیف میں اس کی اسناد بیان کی ہیں اور وہ یہ ہیں: ((حدثنا عباد بن يعقوب حدثنا ابو يحيى التيمي حدثنا فضيل بن مرزوق عن عطية عن ابي سعيد .)) اس میں بھی ابی سعید کے آگے لفظ خدری نہیں ہے۔ اور جس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے جو اوپر ہم لکھ چکے کہ یہ ابوسعید کلبی ہیں اور عطیہ انہیں سے روایت کرتے ہیں اور سوائے ابویحییٰ تیمی سب راوی اس کے شیعہ ہیں، جن کی تفصیلی کیفیت اوپر بیان ہو چکی۔ اور ابویحییٰ تیمی کی نسبت تہذیب میں لکھا ہے: ((ضعفه ابو حاتم .)) کہ یہ بھی ضعفاء میں سے ہیں۔ غرض کہ یہ روایت بھی کوئی نئی روایت نہیں ہے بلکہ وہی ابوسعید کلبی کی روایت ہے۔

تیسری روایت وہ ہے جو بحار الانوار وغیرہ میں لکھی ہے کہ عبدالرحمن بن صالح کہتے ہیں کہ مامون کے پوچھنے پر ہبہ فدک کے متعلق عبید اللہ بن موسیٰ نے وہ حدیث لکھ کر بھیجی جس کو فضیل بن مرزوق نے عطیہ سے روایت کیا ہے۔ یہ روایت سر تا پا شیعوں کی روایت ہے، ابتدا

بھی اس کی شیعہ سے اور انتہا بھی اس کی شیعہ پر ہوتی ہے۔ اس لیے کہ روایت عبدالرحمن بن صالح سے بیان کی گئی ہے، اس کی نسبت میزان الاعتدال ذہبی میں لکھا ہے: ((عبدالرحمن بن صالح الازدی ابو محمد الکوفی کان شیعیا وقال ابو داؤد الف کتاب فی مثالب الصحابة رجل سوء وقال ابن عدی احترق بالتشیع مات سنة خمس و ثلاث و مأتین .)) اور تقریب میں ان کی نسبت لکھا ہے: ((عبدالرحمن بن صالح الازدی الکوفی نزیل بغداد صدوق یتشیع وقال ابو داؤد وضع مثالب فی الصحابة .)) کہ یہ حضرات شیعہ تھے اور نہ صرف معمول شیعہ بلکہ تشیع میں غرق تھے یہاں تک کہ صحابہ کے معائب اور مطاعن میں ایک کتاب بھی تصنیف کی۔ پھر ان سے کیا تعجب ہے کہ وہ ایسی روایت نقل کریں۔ اور بالفرض اگر یہ سنی بھی ہوتے تو چونکہ جس قصے کو یہ بیان کرتے ہیں بشرط صحت اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مامون کو جو جواب عبید اللہ بن موسیٰ نے لکھا اس میں وہی روایت بیان کی جو فضیل بن مرزوق اور عطیہ سے منقول ہے اور ان حضرت کا حال ہم اوپر تفصیل سے بیان کر چکے، اس لیے وہ روایت قابل سند نہیں ہے۔

چوتھی وہ روایت ہے جو طرائف اور احقاق الحق میں واقدی اور بشر بن الولید اور بشر بن غیاث سے سلسلہ اسناد کے بغیر منقول ہے۔ غالباً یہ بھی وہی ابوسعید، عطیہ اور فضیل کی روایت ہوگی۔ اور چونکہ اسے واقدی اور بشر بن غیاث سے طرائف اور احقاق الحق میں بیان کیا ہے، اس لیے اس کی طرف توجہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ واقدی ان بزرگوار مصنفوں میں سے ہیں کہ ان کی کتابیں نہ صرف ضعیف روایتوں بلکہ موضوع، غلط اور جھوٹی خبروں سے بھری ہوئی ہیں۔ اور ان کے غیر معتبر ہونے پر اکثر محققین اور علماء کا اتفاق ہے۔ اور بشر بن غیاث کی شان واقدی سے بھی بڑھی ہوئی ہے، یہاں تک کہ ان کو محققین نے زندیق تک کا خطاب دیا ہے۔

اوّل واقدی کا حال سنئے۔ ان کی نسبت تقریب میں لکھا ہے: ((عمر بن واقدی

المدنی القاضی نزیل البغداد متروک مع سعة علمه)) کہ وہ باوجود بہت بڑے عالم ہونے کے متروک ہیں۔ اور تذکرۃ الحفاظ میں ذہبی ان کی نسبت لکھتے ہیں: ((محمد بن عمر الواقدی الاسلامی الحافظ البحر لم اسق ترجمته ههنا لا تفاقهم علی ترک حدیثه وهو من اوعیة العلم لکنه لا یتقن الحدیث و هو رأس فی المغازی والسیر ویروی من کل ضرب .)) یعنی واقدی بڑے حافظ ہیں میں ان کے ترجمے کو یہاں اس لیے نہیں لکھتا کہ محدثین نے ان کے متروک الحدیث ہونے پر اتفاق کیا ہے، اگرچہ یہ زبردست عالم ہیں لیکن حدیث میں احتیاط نہیں کرتے، مغازی اور سیر خوب جانتے ہیں، مگر ہر طرح کی سچی اور جھوٹی روایت کرتے ہیں۔ اور تہذیب التہذیب میں بھی ان کی یہی صفت لکھی ہے اور پھر لکھا ہے ((قال البخاری متروک)) اور تہذیب میں ہے: ((وقال احمد هو کذاب و قال ابن معین هو ضعیف .)) اور میزان الاعتدال میں ان کی نسبت لکھا ہے:

((محمد بن عمر الواقدی الاسلامی صاحب التصانیف واحد اوعیة العلم علی ضعفه وحسبک ان ابن ماجة لا یجسر ان یسمیه قال احمد بن حنبل هو کذاب یقلب الاحادیث یلقى حدیث ابن اخی الزهری علی معمر و نحوذا و قال ابن معین لیس بثقة و قال مرة یکتب حدیثه و قال البخاری و ابو حاتم متروک و قال ابو حاتم ایضا و النسائی یضع الحدیث و قال ابن عدی احادیثه غیر محفوظة والبلاء منه و قال ابو غالب بن بنت معاویة بن عمر و سمعت ابن المدینی یقول الواقدی یضع الحدیث قال ابوداؤد بلغنی ان علی بن المدینی قال کان الواقدی یروی ثلاثین الف حدیث غریب قال المغیرة بن محمد المہلبی سمعت ابن المدینی یقول الہیثم ابن عدی

او ثق عندی من الواقدی لا ارضاه فی الحدیث ولا فی
الانساب ولا فی شیئی قلت وقد سبق جملة من اخبار
الواقدی وجوده وغیره ذلك فی تاریخى الكبير و مات وهو
على القضاء سنة سبع و مأتین فی ذی الحجة و
استقر الاجماع على و من الواقدی .))

”محمد بن عمر واقدی صاحب تصانیف اور بڑے علم والے ہیں لیکن ضعیف ہیں،
اور یہ بات ان کے ضعف کے لیے کافی ہے کہ ابن ماجہ ان کو قابل ذکر ہی نہیں
سمجھتے احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ یہ کذاب ہے، حدیثوں کو الٹ پلٹ کیا کرتا تھا۔
ابن معین کہتے ہیں یہ ثقہ نہیں ہیں لیکن ان کی حدیث لکھی جاسکتی ہے، بخاری اور
ابو حاتم کہتے ہیں کہ یہ متروک ہے، نیز ابو حاتم اور نسائی کہتے ہیں کہ واقدی
حدیث گھڑا کرتا تھا، اور ابن عدی کہتے ہیں کہ ان کی حدیثیں غیر محفوظ ہیں۔ ابو
غالب کہتے ہیں کہ میں نے ابن مدینی کو کہتے ہوئے سنا کہ واقدی حدیثیں گھڑا
کرتے تھے، ابوداؤد کہتے ہیں کہ مجھے خبر ملی کہ علی بن مدینی کہتے ہیں کہ واقدی
تین ہزار غریب حدیثیں روایت کرتے ہیں، مغیرہ بن محمد مہلمی کہتے ہیں کہ میں
نے سنا ابن مدینی کہتے تھے کہ پشم بن عدی میرے نزدیک واقدی سے زیادہ
بھروسے مند ہے، میں نہ تو اس کی حدیثیں پسند کرتا ہوں نہ نسب کی خبروں کو نہ ہی
اس کی کسی چیز کو۔ منصب قضا پر رہتے ہوئے ذی الحجہ ۲۰۷ میں انتقال ہوا۔
واقدی کے ضعف پر اجماع ہو چکا ہے۔“

ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گو وہ بہت بڑے عالم تھے اور بڑے صاحب تصنیف،
مگر بالکل نامعتبر یہاں تک کہ ان کے ضعیف اور متروک الحدیث ہونے پر سب متفق ہیں اور
اس سے زیادہ اور کیا عیب ہو سکتا ہے کہ حدیث بنایا کرتے تھے اور تیس ہزار غریب حدیثیں ان
سے منقول ہیں۔ ان کی روایت کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ معتبر مفسرین ان کی

روایت کے نقل کرنے سے بھی پرہیز کیا کرتے تھے جیسا کہ تفسیر طبری کی نسبت ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ اس کے مفسر نے کلبی اور واقدی سے کچھ بھی اپنی تفسیر میں نہیں لیا ہے، اس لیے کہ یہ لوگ ضعیف اور غیر معتبر تھے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ واقدی کی نسبت بعض نے بیان کیا ہے کہ اس کے نام سے جو کتابیں مشہور ہیں وہ دراصل ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ ابو اسحاق مدنی کی ہیں جو کہ شیعہ مصنفین میں سے ہیں، ان کی کتابوں کو واقدی نے نقل کیا اور اپنے نام سے مشہور کیا۔ اس لیے ان کی کتابوں کو درحقیقت شیعوں کی کتابیں سمجھنا چاہیے، جیسا کہ منتہی المقال فی اسماء الرجال میں جو شیعوں کی معتبر کتابوں میں سے ہے ابراہیم بن محمد کے ترجمے کے ذیل میں لکھا ہے:

((کما یقول ابرہیم بن محمد بن ابی یحییٰ ابو اسحاق مولیٰ
اسلم مدنی روی عن ابی جعفر و ابی عبداللہ و کان خصیصا
والعامۃ لہذہ العلة تضعفہ و حکى بعض اصحابنا عن بعض
المخالفین ان کتب الواقدی سائرہا انما ہى کتب ابراہیم بن
محمد بن ابی یحییٰ نقلہا الواقدی و ادعاہا و فی فہرست
الشیخ و ابن محمد بن یحییٰ ابو اسحاق مولیٰ اسلم مدنی
روی عن ابی جعفر و ابی عبداللہ و کان خاصا بحدیثنا و
العامۃ تضعفہ لذلك ذکر یعقوب بن سفیان فی تاریخہ فی
اسباب تضعیفہ عن بعض الناس انہ سمعہ ینال من الاولین
ذکر بعض ثقال العامۃ ان کتب الواقدی سائرہا انما ہى کتب
ابراہیم بن محمد بن یحییٰ نقلہا الواقدی و ادعاہا و ذکر
بعض اصحابنا ان لہ کتابا مبوبافی الحلال و الحرام عن ابی
عبداللہ الحسین بن محمد الازدی الی قولہ وما مر من ان
العامۃ تضعفہ لذلك و یشہد لہ مامن صاحب میزان الاعتدال

وہو کذاب رافضی.)) (دیکھو منتهی المقال صفحہ ۲۵ مطبوعہ ایران)

”جیسا کہ ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ ابواسحاق مولیٰ اسلم مدنی کہتے ہیں کہ اس نے ابو جعفر اور ابو عبد اللہ سے روایت کیا ہے اور یہ شیعہ تھا اور سنی اسی وجہ سے اس کو ضعیف کہتے ہیں ہمارے بعض اصحاب بعض سنیوں سے نقل کرتے ہیں کہ واقدی کی ساری کتابیں ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ کی ہیں، واقدی نے ان کو نقل کیا اور اپنی ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ اور فہرست شیخ میں ہے اور ابن محمد بن یحییٰ ابواسحاق مولیٰ اسلم مدنی کہتے ہیں کہ اس نے ابو جعفر اور ابو عبد اللہ سے روایت کیا ہے اور یہ شیعہ تھا۔ سنی اسی وجہ سے اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ یعقوب بن سفیان اپنی تاریخ میں اس کے ضعیف ہونے کے اسباب بعض ثقہ سنیوں سے بیان کیے ہیں کہ واقدی کی ساری کتابیں دراصل ابراہیم بن محمد بن یحییٰ کی ہیں جن کو واقدی نے نقل کیا اور اپنی طرف منسوب کر لیا۔ بعض ہمارے اصحاب کہتے ہیں کہ واقدی کی ایک مبوب کتاب حلال حرام کے سلسلے میں ہے جسے ابو عبد اللہ حسین بن محمد ازدی سے روایت کیا ہے اور یہ بات گزر چکی کہ سنی ان کو ضعیف کہتے ہیں اور اس کی شہادت یہ ہے کہ میزان الاعتدال والے کہتے ہیں کہ یہ رافضی اور جھوٹا ہے۔“

ایسے وضاع کی روایت ثبوت میں پیش کرنا اور اس سے ایسے معرکہ الآراء بحثوں میں استدلال کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کوئی صحیح روایت اس باب میں حضرات امامیہ کو نہیں ملی اور ملے کیوں جب کہ اس کا وجود ہی نہ تھا اور نہ ہے۔ اور جب کہ واقدی کی کتابوں کی نسبت یہ مانا جائے کہ اس نے ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ کی کتابوں کو نقل کر کے اپنے نام مشہور کیا تو پھر کیا شبہ باقی رہتا ہے کہ یہ کتابیں اصل میں شیعوں کی ہیں۔

بشر بن غیاث کا بھی حال سن لیجیے میزان الاعتدال میں ان کی نسبت لکھا ہے:

((بشر بن غیاث المریسی مبتدع ضال لاینبغی ان یروی عنہ
وقال ابونضر ہاشم بن القاسم کان والد بشر المریسی

یہودیاً قصاباً سباغافى سريقة نصر بن مالك و قال
 المرموزى سمعت ابا عبدالله ذكر بشرا فقال كان ابوه يهوديا
 وكان بشر يستغيث فى مجلس ابى يوسف فقال له ابو يوسف
 لاتنتهى او تفسد خشبة يعنى تصلب و قال قتيبة بن سعيد
 بشر المريسي كافر و قال الخطيب حكى عنه اقوال شنيعة
 اساء اهل العلم قولهم فيه و كفره اكثرهم لا جملها قال
 ابو زرعة الرازى بشر المريسي زنديق .))

”بشر بن غياث مریسی بدعتی گمراہ ہے، اس لائق نہیں کہ اس سے روایت کی
 جائے۔ ابونضر ہاشم بن قاسم کہتے ہیں کہ اس کا باپ یہودی قصاب رنگریز تھا،
 نضر بن مالک کے بازار میں رہتا تھا، اور مرموزی کہتے ہیں کہ میں نے ابو عبد اللہ
 سے سنا ہے کہ وہ یہ کہتے تھے کہ بشر قاضی ابو یوسف کی مجلس میں استغاثہ کر رہا تھا
 کہ قاضی صاحب نے کہا تو باز نہ آئے گا کیا سولی کو خراب کیا چاہتا ہے، یعنی سولی
 دے دیں گے اگر تو باز نہ آئے گا۔ اور قتیبہ بن سعید کا قول ہے کہ یہ کافر تھا،
 خطیب کہتے ہیں کہ اس سے برے اقوال منقول ہیں جن کی وجہ سے علماء نے اس
 کو کافر کہا ہے اور ابو زرعة رازی کہتے ہیں کہ یہ زندیق تھا۔“

پانچویں روایت معارج النبوت کی ہے جو عماد الاسلام میں نقل کی گئی ہے۔ اس روایت
 سے استدلال کرنے پر ہم کو تعجب ہے کہ جناب مجتہد امام مولانا سید دلدار علی صاحب جیسے محقق
 اور تبحر عالم اسے سند میں پیش کرتے ہیں۔ معارج النبوت کا حال فارسی پڑھنے والے طالب
 علم جانتے ہیں کہ مولود کے رسولوں سے بڑھ کر علماء کے نزدیک اس کی قدر و قیمت نہیں ہے،
 وہ ایک شاعرانہ منشیانہ تحریر کے لیے عمدہ نمونہ ہے، لیکن بلحاظ صحت کے کچھ بھی اس کی وقعت
 نہیں ہے۔ یہ اس قسم کے مؤرخین میں سے ہیں کہ اپنے تنور گرم کرنے کے لیے جو خشک وتر
 ایندھن ان کو ملا اس کو کام میں لائے اور سامعین کے متعجب، مسرور اور محظوظ کرنے کے لیے

اسے عمدہ الفاظ میں بیان کیا، مگر اس کو آج تک کسی نے اس قابل نہیں سمجھا ہے کہ اس سے کوئی سند پیش کی جائے۔ نہ ہی سوائے مولود کے رسولوں کے کسی بحث میں آج تک اس سے کوئی سند پیش کی گئی، لہذا اس میں مرقوم ہونے پر اس روایت سے یا اور کسی روایت سے استدلال کرنا علماء کی شان سے نہایت ہی بعید ہے۔ اور بالفرض اگر وہ اور اس کا مصنف معتبر و معتمد ہوتے تو اس روایت سے استدلال کرنا اور بھی بعید تھا کیونکہ خود اس میں اس روایت کے غیر صحیح اور ناقابل اعتبار ہونے کی طرف کئی وجوہ سے اشارہ موجود ہے۔

وجہ اول:

صاحب معارج نے واقعات کا التزام رکھنے کے باوجود اس روایت ہبہ کو واقعہ نہیں قرار دیا، بلکہ اس روایت کے قبل کی روایت کو جو اس روایت کے منافی ہے، واقعہ قرار دیا ہے۔

وجہ دوم:

صاحب معارج نے اس روایت کو وضعاً مؤخر اور اس کے منافی روایت کو وضعاً مقدم کیا ہے۔

وجہ سوم:

اس روایت کو بغیر حوالہ نقل کیا ہے اور اس کے منافی روایت کو بحوالہ مقصد اقصیٰ لکھا ہے۔

وجہ چہارم:

اس روایت کو بغیر عنوان واقعہ و بدون حوالہ بعضے گویند کے لفظ سے نقل کیا ہے۔ جو مجروح یا مجہول سے منقول ہونے پر دال ہے اور اس کے منافی روایت کو بعنوان واقعہ و بحوالہ لکھا ہے، جو صحیح و قابل اعتبار ہونے پر دال ہے۔ پس بخوبی واضح ہو گیا کہ صاحب معارج نے اس روایت ہبہ کے غیر صحیح و ناقابل اعتبار ہونے کی طرف بوجہ اشارہ کر دیا ہے۔ لہذا معارج مع اپنے مصنف کے معتبر و معتمد ہونے کی تقدیر پر بھی اس میں موجود ہونے پر اس روایت سے جو استدلال کیا گیا ہے وہ اس قابل نہیں ہے کہ ہم اس کی نسبت کچھ بھی لکھیں بجز اس کے کہ اس کو علماء کی شان سے بعید سمجھیں۔

ہم نے تمام روایتوں کی حقیقت بیان کر دی اور سب راویوں کا حال لکھ دیا اور شافی کے

تصنیف ہونے کے زمانے سے اب تک جس کو نو سو برس ہوئے جتنی روایتیں بہہ کی تائید میں پیش کی گئی تھی ان سب کو دکھا دیا اور یہ مثل کہ ہر گاہ دم برداشتم مادہ برآمدن (جب بھی دم اٹھائی مادہ نظر آیا) روایتوں پر ثابت کر دی، اس لیے کہ ان تمام روایتوں کا سلسلہ ابوسعید کلبی تک پہنچتا ہے، اور اس کی روایت ان عیبوں کے سبب سے جو اس میں تھے ہرگز قابل لحاظ نہیں۔ اور باوجود اس کے کہ یہ ایک ہی ماخذ سے لی گئی ہے ہم کو تعجب ہوتا ہے کہ کیونکہ سید مرتضیٰ علم الہدیٰ اور جناب مولانا دلدار علی صاحب جیسے محققین اور کالمین نے یہ کہنے کی جرأت کی:

((قد روی من طریق مختلفة غير طريق ابى سعيد الذى ذكره صاحب الكتاب انه لما نزل قوله تعالى وات ذا القربى حقه دعا النبى فاطمة فاعطاها فذك و اذا كان ذلك مرويا فلا معنى لدفعه بغير حجة .))

”یعنی ابوسعید کے واسطے کے علاوہ اور بھی مختلف واسطوں سے یہ روایت ہے کہ جب آیت ﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ﴾ نازل ہوئی تو نبی ﷺ نے فاطمہ کو بلایا اور فدک ان کے حوالہ کر دیا، جب یہ بات منقول ہے تو بغیر دلیل کے اسے دینے کے کوئی معنی نہیں رہتے۔“

کیا یہ بات تعجب انگیز نہیں ہے۔ سید مرتضیٰ ایک طریقے سے بھی اس روایت کو بیان نہ فرمائیں اور صرف اس روایت کو جواباً عن جَدِّ شیعوں میں مشہور تھی اور جس کا ذکر قاضی عبدالجبار نے اپنی کتاب معنی میں کیا تھا کہ شیعہ ایسا کہتے ہیں، کافی سمجھ کر اپنی طرف سے صرف یہ لکھ دیں کہ اور مختلف طریقوں سے بھی یہ روایت منقول ہے۔ اور پھر کیا اس سے کم یہ بات تعجب کرنے والی ہے کہ علم الہدیٰ کے زمانے سے لے کر اب تک باوجودیکہ ہزاروں عالم اس مدت میں گزرے اور سیکڑوں کتابیں اس بحث میں لکھی گئیں اور بڑے بڑے دعوے کیے گئے اور نہایت فصیح و بلیغ اور درد انگیز تقریروں میں یہ دعویٰ بیان کیا گیا اور علمائے شیعہ نے سنیوں کی ساری کتابیں چھان ڈالیں، نہ متن چھوڑا، نہ حاشیہ، نہ حدیث کی کتابیں باقی رکھیں

نہ تاریخ کی، مگر ایک صحیح روایت بھی اس دعوے کے ثبوت میں اہل سنت کی کتابوں سے پیش نہ کر سکے اور یہ تمنا اپنے ساتھ قبر میں لے گئے۔ اور اگر یہ نامور علماء اور یہ مشہور متکلمین جن کے علم و فضل کا غلغلہ آسمان تک پہنچا اور جنہوں نے اپنے گروہ میں سنیوں پر فتح و ظفر حاصل کرنے کی خوب شہرت پائی، بجائے فصیح و بلیغ تقریریں کرنے اور زور قلم دکھانے کے ایک صحیح روایت پیش کر دیتے تو غلط بنیاد پر ایک مبسوط کتاب لکھنے سے اور ہزار قوت بیانیہ ظاہر کرنے سے زیادہ بہتر اور زیادہ مناسب اور زیادہ موذوں ہوتا۔ مگر ایسا نہ کرنے سے خود انہوں نے دنیا پر ثابت کر دیا کہ کوئی روایت ایسی موجود ہی نہیں ہے جسے وہ اہل سنت کے مقابلے میں صحیح اور قابل اعتبار قرار دے کر پیش کر سکتے۔ شافی، کشف الحق، طرائف، بحار الانوار، عماد الاسلام، طعن الرماح اور تشنید المطاعن کے مشہور اور نامور مصنفین سوا اس کے اور کچھ نہ کر سکے کہ فضیل بن مرزوق اور عطیہ نے جو وضعی اور جھوٹی روایت کلبی سے پائی تھی اور آئندہ مشہور کی تھی اسی کو پیش کرتے اور اسی سے استدلال کرتے۔ اور ہم نہ صرف پچھلے لوگوں پر کسی حدیث صحیح کے پیش نہ کرنے کا الزام دیتے ہیں بلکہ اب بھی ہم تحدی کرتے ہیں اور ہندوستان، ایران، لکھنؤ اور طہران بلکہ تمام دنیا کے شیعوں کو مقابلے پر بلا تے اور کہتے ہیں کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اب بھی کوئی ایک صحیح روایت جس کے بانی اور راوی شیعہ نہ ہوں اہل سنت کی کتاب سے پیش کرو:

﴿فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَ

الْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۝﴾ (سورۃ البقرہ: ۲۴)

”پھر اگر نہ کرو اور البتہ نہ کرو گے تو بچو آگ سے جس کا ایندھن ہیں آدمی اور پتھر

تیار ہے منکروں کے واسطے۔“

چونکہ اب ہم اچھی طرح ان روایتوں کی تکذیب اور تردید کر چکے جو ہماری کتابوں سے شیعوں نے پیش کی تھیں، اب ہم اس تناقض اور اختلاف کو دکھاتے ہیں جو خود شیعوں کی روایتوں میں ہے اور جس سے ان کا دعویٰ خود ان کے یہاں کی روایتوں سے ثابت نہیں ہوتا۔



تناقض اور اختلاف شیعوں کی ان احادیث
اور اخبار میں جو اس باب میں بیان کی گئی ہیں کہ

پیغمبر خدا ﷺ نے

فدک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دیا تھا

ہبہ فدک کے متعلق اول ہم امامیہ کی ان حدیثوں کو بیان کرتے ہیں جس میں فدک کے
دیے جانے کا ذکر ہے، اس کے بعد اس کا تناقض اور اختلاف بیان کریں گے۔ بحار الانوار
میں روایت ہے:

((فیما احتج الرضاء فی فضل العترة الطاهرة قال والآية
الخامسة قال الله عز وجل وات ذا القربى حقه، خصوصية
خصهم العزيز الجبار بها واصطفاهم على الامة فلما نزلت
هذه الاية على رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ادعو
الى فاطمه رضی اللہ عنہا فدعيت له فقال يا فاطمة! قالت لبيك يا رسول
الله! فقال فدك هي ممالم يوجف عليه بخيل ولا ركاب وهي
لى خاصة دون المسلمين وقد جعلتها لك لما امرنى الله به
فخذبها ولولدك .))

(بحار الانوار کتاب الفتن باب نزول الايات فی امر فدک صفحہ ۸۹ مطبوعہ ایران، از عیون الاخبار)

”عترت طاہرہ کی فضیلت میں امام رضا نے آیت ﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ﴾ کو دلیل بنایا ہے کہ یہ ان کی خصوصیت ہے اللہ تعالیٰ نے امت میں اس
کے لیے ان کا انتخاب فرمایا: جب یہ آیت ﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ﴾ نازل

ہوئی تو پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا کہ فاطمہ کو بلاؤ وہ بلائی گئیں، آپ نے کہا کہ اے فاطمہ! فدک ان میں سے ہے جن پر لشکر نے چڑھائی نہیں کی اور وہ خاص میرا ہے۔ مسلمانوں کا اس میں کچھ نہیں ہے اور میں وہ تمہیں دیتا ہوں، اس لیے کہ مجھے خدا نے یہ حکم دیا ہے، پس اسے تم اپنے اور اپنی اولاد کے لیے لے لو۔“

دوسری روایت جو تفسیر علی بن ابراہیم قمی میں امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے یہ ہے:

((روى عن ابى عبد الله ان رسول الله خرج فى بعض الطريق فيينا رسول الله ﷺ يطعم و الناس معه اذا اتاه جبريل ﷺ فقال يا محمد قم فاركب فقام النبى فركب جبريل معه فطويت له الارض كطى الثوب حتى التهى الى فدى فلما سمع اهل فدى..... وقع الخيل فظنوا ان عدوهم قد جاء وهم تغلقوا ابواب المدينة و دفعوا المفاتيح الى عجزو لهم خارج من المدينة ابرؤس الجبال فاتى جبريل العجزو حتى اخذ المفاتيح ثم فتح ابواب المدينة و دار النبى فى بيوتها و قراتها فقال جبريل ﷺ يا محمد! هذا ما خصك الله به و اعطاكه دون الناس وهو قوله تعالى ما آفاه الله على رسول من اهل القرى فله و الرسول و لذى القربى و ذلك قوله فما او جفتم عليه من خيل و لاركاب و لكن الله يسلط على من يشاء و لم يعرف المسلمون و لم يطووها و لكن الله آفائها على رسوله و طرف به جبريل ﷺ فى دورها و حيطانها و فلق الباب و دفع المفاتيح اليه فجعلها رسول الله فى غلاف سيفه و هو معلق بالرحل ثم ركب و طويت به الارض كطى الثوب فاتاهم رسول الله و هم على مجالسهم و لم يتفرقوا و لم يبرحوا

فقال رسول الله ﷺ قد انتهيت الى فديك واني قد افائها الله على فغمز المنافقون بعضهم بعضا فقال رسول الله هذه مفاتيح فديك ثم اخرج من غلاف سيفه ثم ركب رسول وركب معه الناس فلما دخل المدينة دخل على فاطمة رضي الله عنها فقال يا بنية ان الله فداها علي ابنيك بفديك و اختصه بها فهي لي خاصة دون المؤمنين افعل بها ماشاء وانه قد كان لا مك خديجة علي ابنيك مهروان اباك قد جعلها بذلك وانحلتك هالك ولولديك بعدك فدعا باديم و دعا علي بن طالب فقال اكتب لفاطمة فديك نحلة من رسول الله فشهد علي ذلك علي بن ابي طالب و مولى لرسول الله وام ايمن فقال رسول الله ان ام ايمن امرأة من اهل الجنة و جاء اهل فديك الي النبي فقاطعهم علي اربعة وعشرين الف دينار في كل سنة .))

”امام جعفر صادق سے مروی ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ جب ایک غزوے سے لوٹے اور راہ میں اپنے ہمراہیوں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے کہ جبرئیل عليه السلام نازل ہوئے اور کہا کہ اے محمد! اٹھو اور سوار ہو، حضرت سوار ہوئے جبرئیل عليه السلام آپ کے ساتھ تھے۔ زمین آپ کے واسطے ایسی لپیٹ دی گئی جس طرح کپڑا لپیٹا جاتا ہے جس سے فوراً آنحضرت ﷺ فدیک میں پہنچ گئے اہل فدیک نے ڈر کر دروازے بند کر لیے اور کنجیاں ایک بڑھیا کو دے دیں، جبرئیل عليه السلام نے اس سے کنجیاں لے کر شہر کے دروازے کھولے اور آنحضرت ﷺ نے اندر داخل ہو کر گھر اور امکانات وغیرہ دیکھے اس وقت جبرئیل عليه السلام نے کہا: ((یا محمد هذا ما خصك الله به و اعطاكاه دون الناس .)) یہ وہ ہے جسے خدا

نے آپ کے لیے مخصوص کیا اور آپ کو عطا فرمایا ہے اور کوئی مسلمان اس میں آپ کا شریک نہیں، پھر جبرئیل علیہ السلام نے شہر کے دروازے بند کر دیے اور کنجیاں آپ کے حوالے کیں، جب آپ مدینے میں داخل ہوئے تو فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور کہا کہ اے میری بیٹی! خدا نے فدک مجھے دیا ہے اور میں اختیار رکھتا ہوں کہ جو چاہوں کروں، دیکھو یہ تمہاری ماں خدیجہ کا مہر تمہارے باپ پر واجب الادا ہے، اس لیے میں تمہیں اور بعد تمہارے تمہاری اولاد کو فدک دیتا ہوں۔ پھر حضرت علیؑ کو بلا کر کہا کہ یہ ہبہ نامہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لیے لکھ دو۔ چنانچہ یہ ہبہ نامہ علیؑ نے آنحضرت ﷺ کی طرف سے لکھا اور اس پر حضرت علیؑ اور ام ایمنؓ کو گواہی لکھی گئی۔ پھر اہل فدک آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور ان کو چوبیس

ہزار دینار سالانہ پر اس کا اجارہ دے دیا گیا۔“ (بحار الانوار مطبوعہ ایران صفحہ ۹۰)

تیسری روایت میں اس امر کے بیان کرنے بعد کہ فدک کس طرح آنحضرت ﷺ

کے قبضے میں آیا لکھا ہے:

((فَنَزَلَ وَأْتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ قَالَ وَمَا هُوَ قَالَ اعْطِ فَاطِمَةَ فَدَكَ وَهِيَ مِنْ مِيرَاثِهَا مِنْ أُمِّهَا خَدِيجَةَ فَحَمَلَ إِلَيْهَا النَّبِيُّ ﷺ مَا أَخَذَ مِنْهُ وَأَخْبَرَهَا بِالْأَيَّةِ فَقَالَتْ لَسْتُ أَحْدِثُ فِيهَا حَدَثًا وَانْتَ حَيٌّ أَنْتَ أَوْلَىٰ بِي مِنْ نَفْسِي وَمَالِي لَكَ فَقَالَ أَكْرَهُ أَنْ يَجْعَلُوهَا عَلَيْكَ سَبَةً فَيَمْنَعُوكَ أَيَّاهَا مِنْ بَعْدِي فَقَالَتْ الْفَدْ فِيهَا أَمْرٌ فَجَمَعَ النَّاسَ إِلَىٰ مَنْزِلِهَا وَأَخْبَرَ هُمْ أَنَّ هَذَا الْمَالُ لِفَاطِمَةَ كَذَلِكَ وَيَأْخُذُ مِنْهُ قَوْلُهَا فَلَمَّا دَنَا وَفَاتَهُ دَفَعَهُ إِلَيْهَا.....)) (بحار الانوار..... از مناقب ابن شہر آشوب)

”آیت ﴿وَأْتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ﴾ نازل ہوئی تو آپ نے پوچھا وہ کیا ہے؟

اس وقت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک دے دیجیے کہ وہ ان کی

ماں خدیجہ اور ان کی بہن ہالہ بنت ابی ہالہ کی میراث میں سے ہے، پھر آپ نے جو کچھ اس میں سے مال لیا تھا اس کو لے کر فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا اور اس آیت کی خبر کی، فاطمہ نے جواب دیا کہ میں آپ کی زندگی میں کوئی نئی کارروائی نہیں کروں گی، بلکہ آپ کو میری جان و مال کا اختیار ہے، آپ نے فرمایا کہ مجھے اس امر کا خوف ہے کہ لوگ تم پر عار رکھ کر اس کو میرے بعد تم سے چھین لیں اور تم کو نہ دیں، فاطمہ نے کہا تو آپ اپنا حکم جو کرنا چاہیں کریں، آپ نے لوگوں کو ان کے گھر میں بلا کر سب سے کہہ دیا کہ یہ مال فاطمہ کا ہے اور پھر اس کی اس میں تفریق کر دی اور ہر سال ایسا ہی کرتے کہ فاطمہ کی روزی کے بہ قدر لے لیتے، اور جب آپ کی وفات قریب پہنچی تو آپ نے فدک بالکل ان کو دے دیا۔“

(ترجمہ اردو حیات القلوب صفحہ ۶۶۶، ۶۶۷، طبع لکھنؤ)

اور چوتھی روایت یہ ہے:

((لما نزل اللہ تعالیٰ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٖ وَالْمَسْكِيْنَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَا جَبْرِیْلُ عَلَیْكَ السَّلَامُ قَدْ عَرَفْتَ الْمَسْكِيْنَ فَمَنْ ذُو الْقُرْبٰی قَالَ هُمْ اَقَارِبُكَ فِدْعَا حَسَنًا وَّ حَسِيْنَا وَّ فَاطِمَةَ عَلِيْهِمُ السَّلَامُ فَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْ رَبِّيْ اَمَرَنِيْ اَنْ اَعْطِيْكُمْ مَا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰی قَالَ اَعْطَيْتُكُمْ فِدْكَ .))

”جب آیت ﴿وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٖ﴾ نازل ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا کہ مساکین تو میں جانتا ہوں ذوی القربی کون ہیں؟ جبریل نے کہا وہ آپ کے رشتہ دار ہیں تب آپ نے حسن و حسین علیہما السلام اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلا کر کہا کہ خدا مجھے حکم دیتا ہے کہ جو خدا نے مجھے فے عطا کیا ہے اور جو میرے ساتھ مخصوص ہے وہ تمہیں دوں، اس لیے میں تمہیں فدک دیتا ہوں۔“

(بحار الانوار از تفسیر عیاشی صفحہ ۱۹)

عبداللہ بن سنان نے امام جعفر صادق سے ایک بڑی لمبی روایت کی ہے جس کو ہم مفصل دعویٰ فدک میں نقل کریں گے اس میں جہاں حضرت ام ایمنؓ کی شہادت بیان کی گئی ہے، اس میں یہ لکھا ہے کہ جب آپ کو جبرئیل علیہ السلام فدک کے حدود بتانے کے لیے لے گئے اور واپس تشریف لائے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ آپ کہاں تشریف لے گئے تھے؟ آپ نے فرمایا کہ جبرئیل علیہ السلام مجھے فدک کے حدود بتانے کے لیے گئے تھے۔ اس پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ((یا ابی انی اخاف العیلة و الحاجة من بعدک فصدق بھا علی فقال ہی صدقة علیک فقبضتها.)) کہا: ”اے میرے باپ! میں آپ کے بعد افلاس اور محتاجی سے ڈرتی ہوں، فدک مجھے دے دیجیے۔“ آپ نے فرمایا اچھا یہ تمہارے اوپر صدقہ ہے، یعنی تمہارے لیے عطیہ ہے۔ پس فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس پر قبضہ کر لیا۔ پھر آنحضرت ﷺ نے حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا اور علی سے کہا کہ تم اس پر گواہ رہو۔

(بحار الانوار کتاب الاختصاص صفحہ ۱۰۱)

یہ روایتیں جو اوپر ہم نے بیان کیں، کچھ جزئی اور غیر ضروری باتوں ہی میں باہم مختلف نہیں ہیں بلکہ ان کا مخالف ان اہم امور میں جو نفس واقعہ پر مؤثر ہیں اور ان کے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واضعین روایت نے ہر موقع اور ہر محل کے واسطے اور ہر اعتراض کے دفع کرنے کے خیال سے یہ روایتیں بنائی ہیں مگر ان کی کثرت ہی نے تناقض پیدا کر دیا کہ اس کا دفع کرنا مشکل ہے۔

چنانچہ پہلی روایت میں جو کہ بحوالہ عیون الاخبار بحار الانوار سے ہم نے نقل کیا ہے، یہ بیان کیا گیا ہے کہ آیت نازل ہونے پر پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلاؤ اور وہ بلائی گئیں۔ اور دوسری روایت میں جو بحوالہ تفسیر متی بحار الانوار سے ہم نے نقل کی ہے یہ ہے کہ جب آپ فدک کی کنجیاں لے کر مدینہ میں داخل ہوئے تو خود فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور کہا کہ تمہاری ماں کے مہر میں جو مجھ پر واجب الادا ہے تمہیں اور تمہاری اولاد کو فدک دیتا ہوں۔

نیز پہلی روایت میں یہ ہے کہ آپ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ مجھے خدا نے یہ حکم دیا ہے کہ تم کو فدک دے دوں۔ اور دوسری روایت میں یہ ہے کہ فدک خدا نے مجھے دیا ہے اور

میرے لیے مخصوص کر دیا ہے اور میں اختیار رکھتا ہوں کہ جو چاہوں کروں اور اختیار کی وجہ سے آپ نے کہا کہ تمہاری ماں کے مہر میں اسے دیتا ہوں۔

تیسری روایت میں جو بحوالہ مناقب ابن شہر آشوب ہم نے بحار الانوار سے نقل کی ہے یہ ہے کہ آیت مذکورہ کے نازل ہونے پر آپ نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ حق ذوی القربیٰ کیا ہے؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک دے دیجیے کہ وہ ان کی ماں خدیجہ اور ان کی بہن ہند بنت ابی ہالہ کی میراث میں سے ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں کی میراث میں فدک فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دیا گیا۔ اور دوسری روایت میں لکھا ہے کہ ماں کے مہر میں دیا گیا۔ غالباً جبرئیل علیہ السلام نے میراث اور مہر کو ایک تصور کیا ہوگا، یا ان سے سہو ہو گیا ہوگا۔ اس کے سوا یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ فدک کی آمدنی چوبیس ہزار دینار سالانہ بتائی گئی ہے اور حضرت خدیجہ کے مہر کی تعداد کا یہاں کچھ ذکر نہیں۔ شاید چوبیس ہزار دینار سالانہ کی آمدنی کی جاگیر ہی مہر میں قرار پائی ہوگی؟

پھر اسی تیسری روایت میں یہ ہے کہ جب آپ نے فدک فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دینا چاہا تو انہوں نے عرض کیا کہ میں آپ کی زندگی میں کوئی نئی کارروائی نہیں کرنا چاہتی، آپ کو میری جان و مال کا اختیار ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ شاید میرے بعد لوگ تم کو نہ دیں، تب فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ بہت اچھا، جو آپ کرنا چاہتے ہیں کیجیے، اس پر آپ نے لوگوں کو ان کے گھر میں بلا کر سب سے کہہ دیا کہ یہ مال فاطمہ رضی اللہ عنہا کا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے لوگوں کو آنحضرت ﷺ نے جمع کر کے فدک کے دینے کا اعلان فرمایا تھا۔ مگر تعجب ہے کہ حضرات شیعہ ان روایتوں میں جن میں یہ ذکر ہے کہ جب فاطمہ رضی اللہ عنہا سے شہادت طلب کی گئی، یہ لکھتے ہیں کہ آپ نے ام ایمن، علی مرتضیٰ اور حسین رضی اللہ عنہم میں پیش کیا اور کسی دوسرے مرد کو شہادت میں پیش نہ کیا۔ اگر واقعی یہ واقعہ بہت سے لوگوں کے سامنے ہوا تھا تو بہت سے گواہ اس وقت زندہ اور موجود ہوں گے، پھر طلب کرنے کے وقت ان میں سے دو چار کے نام اگر لیے جاتے اور وہ آکر شہادت دیتے تو یا فدک فاطمہ رضی اللہ عنہا کو مل جاتا یا ان کی حجت

ابوبکر رضی اللہ عنہ پر تمام ہو جاتی۔ کیونکہ وہ تو جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے نصاب شہادت کی تکمیل چاہتے تھے، پھر وہ تکمیل کیوں نہ کر دی گئی۔ اس تیسری روایت سے ایک اور بات ثابت ہوتی ہے جو اس معاملے میں نہایت اہم ہے، وہ یہ کہ فدک ہبہ کے بعد آنحضرت ﷺ کے قبضے میں رہا اس کا کل انتظام آپ ہی فرماتے تھے اور اس کی آمدنی آپ ہی جس مصرف میں چاہتے تھے صرف کرتے تھے اور حضرت سیدہ کو اس کی آمدنی سے فقط بقدر قوت آپ ہی دیتے تھے۔ پس ہبہ بغیر قبضہ ہوا، لہذا اس ہبہ سے فدک حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا ملک نہیں ہو سکتا۔ اور جس روایت میں بعد ہبہ فدک پر حضرت سیدہ کا قبضہ ہونا اور انہی کا وکیل اس پر مامور ہونا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اس وکیل کو نکال دینا مذکور ہے، وہ روایت اس روایت سے باطل ہو گئی۔ اور اسی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر بلا کر کہہ دیا کہ یہ مال فاطمہ رضی اللہ عنہا کا ہے، اور دوسری روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے ہبہ نامہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نام لکھا تھا اور اس پر شہادت حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ام ایمن رضی اللہ عنہا کی کرائی تھی۔

تعب ہے کہ اس خیال سے کہ آئندہ لوگوں کو موقع فاطمہ رضی اللہ عنہا کے محروم کرنے کا باقی نہ رہے، یہاں تک تو آپ نے دور اندیشی فرمائی کہ لوگوں کو بلایا اور ان کو بتایا کہ یہ مال فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دیا جاتا ہے مگر ہبہ نامہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لکھوایا اور صرف ام ایمن کی گواہی کرائی ان لوگوں میں سے جو بلائے گئے تھے کسی کی گواہی نہ لکھوائی، حالانکہ ان میں سے دو چار کی گواہی کرانا زیادہ مناسب اور زیادہ ضروری تھا تا کہ شہادت پر بقول شیعوں کے جو اعتراض ہو اوہ نہ ہوتا اور غیروں کی گواہی سن کر شیخین رضی اللہ عنہم کو بھی دعویٰ تسلیم ہی کرنا پڑتا۔

گو اس تیسری روایت میں یہ ذکر ہے کہ وفات کے وقت آنحضرت ﷺ نے فدک فاطمہ رضی اللہ عنہا کو واپس کر دیا، مگر پھر اس کی کوئی تفصیل نہیں بیان کی گئی کہ کس طرح واپس کیا اور کیونکر فاطمہ رضی اللہ عنہا کو قبضہ کرایا۔ اب اس امر کا ثبوت پیش کرنا شیعوں پر ہے کہ فدک پر فاطمہ رضی اللہ عنہا کے قبضہ کرانے کی کارروائی کس وقت، کیسے اور کن کے سامنے ہوئی۔

چوتھی حدیث دیگر احادیث کے بالکل متناقض ہے، اس لیے کہ اور حدیثوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جب ذوی القربی کے معنی آپ نے جبریل علیہ السلام سے پوچھے تو جبریل علیہ السلام نے خدا کی طرف سے بالتخصیص حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نام لیا۔ اور اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کا نام ہی نہیں لیا بلکہ اس قدر تخصیص ظاہر کر دی کہ مراد اس سے آپ ہی کے رشتہ دار ہیں، یعنی امت کے اقارب مراد نہیں۔ اور یہ امر کہ وہ اقارب کون ہیں اور کن کوان کا حق دینا چاہیے؟ پیغمبر خدا ﷺ پر چھوڑ دیا گیا اور آپ کے عدل نے یہی تقاضا کیا کہ جو کچھ ہے اور سب اقارب کو چھوڑ کر حسنین اور فاطمہ رضی اللہ عنہم ہی کو دے دیں۔ اور حدیثوں میں تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تخصیص کا یہ جواب ہو سکتا تھا کہ آنحضرت ﷺ نے یہ تخصیص نہیں کی بلکہ خدا ہی نے ایسا حکم دیا اور آپ صرف اس کی تعمیل کرنے والے تھے۔ مگر اس حدیث میں تو تخصیص آنحضرت ﷺ نے فرمائی اس کا جواب کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس واسطے کہ آپ کی شان سے بعید ہے کہ عدل نہ فرمائیں اور تمام اقارب میں سے صرف اپنے نواسوں اور ایک بیٹی کو منتخب کر لیں اور معاذ اللہ اس طور پر دوسرے کے حقوق تلف کیے جائیں۔ معلوم نہیں کہ حضرات امامیہ پیغمبر خدا ﷺ کے اس داغ کو جو ان کے اس قول اور خیال سے لگتا ہے کیوں کر دور کر سکیں گے۔ اور اگر کوئی یہ سوال کرے کہ کیا پیغمبر ﷺ کے عدل اور انصاف اور بے طرف داری اور بے غرضی کی یہی شان تھی کہ وہ اوروں کو چھوڑ کر تین رشتہ داروں کو صرف اس لیے کہ انہیں زیادہ چاہتے تھے چن لیں اور جو کچھ اس وقت ان کو ملا وہ سب کا سب انہی کو دے دیں۔ معلوم نہیں حضرات امامیہ اس کا کیا جواب دیں گے، ہمارے تو رونگٹے اس سے کھڑے ہو جاتے ہیں اور پیغمبر ﷺ کی شان میں اسے نہایت بے ادبی اور گستاخی بلکہ ان پر ایک قسم کا اعتراض سمجھتے ہیں۔ (نعوذ باللہ من هذا) اس کے سوا اکثر روایتوں میں جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی شہادت طلب کرنے پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حسنین رضی اللہ عنہما کو بھی پیش کیا اور انہوں نے بھی گواہی دی، اس کا بھی بطلان ثابت ہوتا ہے، اس لیے کہ اس حدیث کی رو سے تو فقط فاطمہ رضی اللہ عنہا دعویٰ کرنے والی نہیں ہو سکتی تھیں بلکہ حسنین رضی اللہ عنہما کو بھی مدعیوں میں شریک

ہونا چاہیے تھا پھر وہ کیوں کر مدعی ہو کر گواہوں میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔

پانچویں روایت سے تو سارا بنا بنایا گھر ہی شیعوں کا گر جاتا ہے اور سارا تانا بانا ان کا ٹوٹ جاتا ہے، اس لیے کہ جو شہادت ام ایمنؓ کی اس میں بیان کی گئی ہے، اس میں یہ لکھا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اے میرے باپ میں آپ کے بعد افلاس اور احتیاج سے ڈرتی ہوں، فدک مجھے عطا کر دیجیے؟ آپ نے فرمایا: اچھا یہ تم پر صدقہ، یعنی عطا ہے۔ اس پر پیغمبر خدا ﷺ نے کہا کہ اے ام ایمن! اور اے علی! تم اس پر گواہ رہنا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے خود فدک کی درخواست کی اور آپ کے بعد مفلسی کا خوف بتا کر آپ سے فدک مانگا اور ان کے مانگنے پر آنحضرت ﷺ نے فدک ان کو دے دیا۔ اس روایت سے آیت ﴿وَإِذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهٗ﴾ کا فدک کے بارے میں نازل ہونا اور جبرئیل علیہ السلام سے ذوی القربیٰ کے معنی پوچھ کر بحکم آیت ﴿وَإِذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهٗ﴾ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک ہبہ کر دینا باطل ہو گیا۔ اور وہ روایتیں بھی جن میں یہ بیان ہے کہ فدک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ان کی ماں کے مہر یا میراث میں دیا گیا تھا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی روایتوں کے ہوتے ہوئے حضرات امامیہ کس طرح فدک کے ہبہ کو ثابت کر سکتے ہیں اور کس منہ سے باوجود ان تناقض روایتوں کے ہبہ فدک کا نام زبان پر لاتے ہیں۔

ان تناقض اور مختلف روایتوں کے علاوہ ایک اور روایت کافی میں جعفر صادق سے منقول ہے جس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذوی القربیٰ سے مراد علی رضی اللہ عنہ تھے اور حق ان کا وہ وصیت تھی جو ان کو کی گئی۔ اور نیز اسم اکبر اور میراث علم اور آثار علم نبوت جو ان کو دیے گئے تھے۔ یہ حدیث کافی باب شصت و چہارم کتاب الحجۃ میں منقول ہے۔ یہ حدیث بہت بڑی ہے جس میں اس بات کا بیان ہے کہ رسول خدا ﷺ ہمیشہ فضائل اہل بیت اطہار فرماتے تھے اور جو کچھ قرآن میں ان کی نسبت بیان ہوا ہے اسے ظاہر کرتے تھے۔

آپ نے آیت ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾ (سورہ احزاب: ۳۳) ”اللہ یہی چاہتا ہے کہ دور کرے تم سے گندی باتیں اے گھر

والو! اور سٹھرا کرے تم کو ایک سٹھرائی سے۔“ کا بیان کیا اور پھر فرمایا کہ خدا کہتا ہے:

﴿وَأَعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ خُمْسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي

الْقُرْبَىٰ﴾ (سورۃ انفال: ۴۱)

”اور جان رکھو کہ جو غنیمت لاؤ کچھ چیز ہو اللہ کے واسطے اس میں سے پانچواں حصہ ہے اور رسول و قرابت والے کے لیے۔“

اس کے بعد آپ نے فرمایا جس کو بالفاظ ذیل کافی میں بیان کیا ہے: ((ثم قال جل ذكره وات ذا القربى حقه فكان على و كان حقه الوصية التي جعلت له والاسم الاكبر وميراث العلم واثار علم النبوة.)) اور اس کا ترجمہ صافی شرح اصول کافی میں ان لفظوں سے کیا ہے:

((بعد ازاں گفت جل ذكره در سورہ بنی اسرائیل بدہ صاحب نزدیک تر راحق او پس حاضر شد علی رضی اللہ عنہ برائے اخذ حق خود و بود حق او وصیتی از رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گردانیدہ شد برائے او بمعنی انکہ آن حق باور سانیدہ شد و اسم اکبر و میراث علم و آثار علم نبوت.))

”اس کے بعد اللہ نے سورۃ بنی اسرائیل میں کہا ہے کہ پاس والے دوست کو اس کا حق دیجیے۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنا حق لینے آئے اور ان کا حق وہ وصیت تھی جس سے انہیں موسوم کیا گیا تھا، یعنی ان کا حق جو اسم اکبر اور میراث علم اور آثار علم نبوت تھا وہ ان کو دے دیا گیا۔“

اگر یہ حدیث صحیح ہے تو اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق ادا کرنے کے لیے نازل ہوئی، اور ذوی القربی سے بھی وہی مراد ہیں اور اس صورت میں وہ روایتیں باطل ہوتی ہیں جن میں یہ ذکر ہے کہ یہ آیت فدک کے دینے کے لیے نازل ہوئی۔ شاید حضرات شیعہ یہ فرمائیں کہ دونوں روایتیں صحیح ہیں اور ذوی القربی سے فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی

مراد ہیں اور ان کا حق فدک ہے، اور جناب امیر المومنین بھی مقصود ہیں اور ان کا حق وصیت اور میراث علم اور اسم اکبر تھا، مگر یہ کہنا صحیح نہ ہوگا۔ اس لیے کہ اور روایتوں سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ ذوی القربی اور حق ذوی القربی کی حقیقت سے ناواقف تھے اور اس لیے آپ نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا اور جبرئیل علیہ السلام نے بحکم خدا بتایا کہ اس سے مراد فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حق سے مراد فدک ہے۔ دونوں روایتیں کسی طرح سے مطابق نہیں ہو سکتیں۔ اس حدیث کو تفسیر صافی میں ذیل آیت سورہ بنی اسرائیل میں بھی نقل کیا ہے اور چونکہ صاحب تفسیر کو خیال گزرا کہ یہ روایتیں متناقض ہیں، اس لیے بطور دفع دخل مقدر یہ فرمایا کہ ((اقول تنافی بین ہذا الحدیث و بین الاحادیث السابقة و لا بینہما و بین تفسیر العامة كما يظهر للمتدبر العارف بمخاطبات القرآن و معنی الحقوق و من الذی له الحق و من الذی لا حق له والحمد لله .)) کہ کچھ اختلاف اس حدیث میں اور پچھلی حدیثوں میں نہیں ہے اور نہ ان حدیثوں میں اور سنیوں کی تفسیر میں اختلاف ہے، جیسا کہ غور کرنے والے اور مخاطبات قرآن اور معنی حقوق اور مستحق اور غیر مستحق کے جاننے والے پر ظاہر ہے۔ مگر وجہ عدم اختلاف کچھ بیان نہ کی، الحمد للہ کہہ کر ساکت ہو گئے اور متدبر اور عارف بالقرآن کے رائے پر رفع تناقض کو چھوڑ دیا، مگر متدبر اور عارف بمعنی القرآن کے نزدیک جو کچھ ظاہر ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ ساری روایتیں غلط اور یہ تمام باتیں بنائی ہوئی ہیں اور خلاف سوق فرمان کے ہیں۔

چونکہ ہم شیعہوں کی روایتیں بیان کر کے اس بات کو ثابت کر چکے ہیں کہ ان روایتوں میں باہم ایسا اور اتنا تناقض ہے کہ ایک پر بھی یقین کرنا ناممکن ہے، اس لیے اب ہم اس بات کو دکھاتے ہیں کہ جو شخص سوق اور مخاطبات قرآنی پر غور کرے گا اور جس کو یہ علم ہوگا کہ یہ آیت مکی ہے نہ کہ مدنی، وہ ان بیانات کو جو حضرات امامیہ نے اس آیت کے متعلق کیے ہیں ایک طرح کی تحریف معنوی سمجھے گا۔



آیت ﴿وَإِذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّ﴾ کا موقع نزول اور طرز بیان پر غور کرنے سے ہبہ فدک کا ثابت نہ ہونا

جو روایتیں ہبہ فدک کے متعلق حضرات امامیہ کے یہاں منقول تھیں ان کو نقل کر کے ہم نے ثابت کر دیا کہ ان میں ایسا اور اتنا تناقض ہے کہ از روئے اصول شہادت کے وہ قابل اعتبار نہیں ہیں، اب ہم اس بات کو دکھاتے ہیں کہ آیت ﴿وَإِذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّ﴾ مندرجہ ذیل وجہوں سے شیعوں کے دعوے کے مفید یا اس سے متعلق نہیں ہے۔

وجہ اول:

یہ آیت دو جگہ قرآن مجید میں آئی ہے، ایک سورہ بنی اسرائیل میں اور دوسرے سورہ روم میں۔ اور یہ دونوں سورتیں مکی ہیں اور مکے میں فدک کہاں تھا۔ فدک تو ہجرت کے ساتویں سال آنحضرت ﷺ کے قبضے میں آیا تھا۔

تحفہ اثنا عشریہ کے باب دوم میں کیدسی و دوم کے ذکر میں حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے لکھا ہے:

((جمع کثیر از علماء ایشان سعی بلیغ نمودہ اندو در کتب احادیث کہ شہرت ندارندو نسخ آن کتب متعدد بدست نمی آید اکاذیب موضوعہ کہ مؤید مذهب شیعہ مبطل مذهب سنیاں باشد الحاق نمایند۔ چنانچہ قصہ فدک در بعض تفاسیر داخل نمودہ اند و سیاق حدیث چینی روایت کردہ اند کہ ((ولما نزلت وات ذا القربی حقه دعا رسول اللہ فاطمة واعطاها فدک)) امام بحکم آنکہ دروغ گورا حافظہ نمی

باشد بیاد شاں نماند کہ این آیة مکی است و در مکہ فدک
کجا بود .))

”ان کے اکثر و بیشتر علماء نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ غیر مشہور احادیث کی کتابوں میں اور ان کتابوں میں جو نایاب ہیں وہ جھوٹی اور من گھڑت احادیث شامل کر دیں جو سنیوں کے مذہب کو باطل ٹھہرائیں اور مذہب شیعہ کی تائید کریں، جیسا کہ باغ فدک کا قصہ جسے بعض تفاسیر میں داخل و شامل کر دیا ہے اور پھر احادیث کا سیاق و سلسلہ یوں روایت کرتے ہیں کہ جب رشتہ داروں کو حق ادا کرنے کی آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلا کر باغ فدک انہیں دے دیا اور چونکہ جھوٹے کو یاد نہیں رہتا ہے، اس لیے شیعوں کو یاد نہیں رہا کہ یہ آیت مکے میں نازل ہوئی اور باغ فدک مکے میں نہیں تھا، اور وہ اس آیت کے نازل ہوتے ہی باغ فدک کا دینا لکھ گئے۔“

اور اس کے حاشیہ پر تفسیر مجمع البیان سے نقل کیا ہے:

((السورة الروم مكية الا قوله تعالى ف سبحن الله حين تمسون
و حين تصبحون .))

”یعنی سورہ روم مکی ہے سوائے اللہ تعالیٰ کے قول ف سبحن الخ کے۔“

اس کے جواب میں ”تقلیب المکائد“ کے اندر مولانا محمد قلی صاحب فرماتے ہیں کہ مجمع البیان میں بہت سے قول اہل سنت کے بھی بطریق نقل و حکایت کے مسطور (لکھے) ہیں اور یہ بھی کہ مکی کا اطلاق اس سورت پر باعتبار اکثر آیات کے ہے اور اس کی نظیر قرآن میں بہت ہے۔ اور نیز یہ ممکن ہے کہ آیت دو مرتبہ نازل ہوئی ہو۔ پہلی مرتبہ مکے میں اور دوسری مرتبہ مدینے میں، جیسا کہ فخر الدین رازی نے سورہ فاتحہ کے شان نزول میں کہا ہے۔ اور یہ بھی کہ مکی اسے کہتے ہیں جو مکے میں نازل ہوئی ہو، عام اس سے کہ قبل ہجرت کے ہو یا بعد ہجرت کے۔ فتح مکہ کے سال میں یا حجۃ الوداع کے سال میں اور پھر یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم ان سب

باتوں سے درگزر کریں تو ممکن ہے کہ یہ جواب دیا جائے کہ اگرچہ فدک مکے میں نہ تھا لیکن چونکہ خدائے تعالیٰ کو اپنے علم ازلی سے معلوم تھا کہ پیغمبر خدا ﷺ کو ہجرت کے بعد مدینے میں اور فتح خیبر کے بعد جو امیر المؤمنین علی بن ابی طالب کے ہاتھ سے ہوگی فدک ملے گا، اس کا حکم پہلے ہی نازل کر دیا اور نزول حکم میں کسی ایسی چیز کا ذکر کرنا جو آئندہ زمانے میں آئے گی اس کے وقوع سے قبل کچھ حرج نہیں ہے۔ اور اس کی بہت سی مثالیں ہیں، جیسا کہ تفسیر کبیر ﴿وَمَا جَعَلْنَا الرُّءُيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ﴾ (سورہ بنی اسرائیل: ۶۰) ”اور وہ خواب جو تجھ کو دکھایا ہم نے سو جانچنے کو لوگوں کے۔“ کی تفسیر میں امام رازی لکھتے ہیں کہ پیغمبر خدا ﷺ نے بنو امیہ کو خواب میں اس طور پر دیکھا تھا کہ بندر آپ کے منبر پر اچھلتے کودتے ہیں۔ اور پھر فخر الدین رازی کہتے ہیں کہ یہ قول ابن عباس کا ہے مگر مشکل اس میں یہ ہے کہ یہ آیت تو مکئی ہے اور مکے میں منبر نہ تھا۔ اور پھر اس کا جواب اس طور پر دیتے ہیں کہ ممکن ہے کہ یہ جواب دیا جائے کہ یہ کچھ بعید نہیں ہے کہ مکے میں ان کو دکھایا جائے کہ مدینے میں منبر قائم ہوگا۔

چونکہ ضروری بات بحث کے قابل صاحب ”تغلیب المکائد“ کا آخری جواب ہے، اسی لیے اسی کے الفاظ ہم یہاں نقل کرتے ہیں باقی کل تقریر جسے دیکھنی ہو وہ صفحہ ۲۳۷ کیدسی و دوم ”تغلیب المکائد“ مطبوعہ مطبع اردو اخبار دہلی کو ملاحظہ کرے۔

((واگرازیں ہمہ مراتب تنزل کنیم پس ممکن است کہ جواب دادہ شود کہ اگرچہ فدک در مکہ نبود لیکن چون حق تعالیٰ شانہ بعلم ازلی می دانست کہ رسول خدا را بعد از ہجرت بہ مدینہ و فتح جنگ خیبر از دست حق پرست امیر المؤمنین علی بن ابی طالب فدک بدست خواهد آمد حکم آن از پیشتر نازل کردہ و در نزول حکم امرے کہ در استقبال خواهد آمد از وقوع آن مما نعستے نیست و امثال آن بسیار

ست و فخر الدین رازی در تفسیر کبیر در تفسیر قوله تعالیٰ ﴿وما جعلنا الرؤیا التي ارینک الا فتنة للناس﴾ گفته القول الثالث فی الرؤیا قال سعید ابن المسیب رأى رسول الله بنى امية ينزلون على منبره تعداد القردة فسائه ذلك وهذا قول ابن عباس رضي الله عنه فى رواية والاشكال فيه ان هذه الاية مكية وماكان لرسول الله به مكة منبر قال ويمكن ان يجاب عنه بانه لا يبعدان يرى بمكة ان له بالمدينة منبر يتدا ولولنه بنى امية .))

”اگر ان تمام واقعات سے ہم تھوڑی دیر کے لیے پہلو تہی کریں تو ممکن ہے شیعہ یہی جواب دیں کہ باغ فدک تو مکہ میں نہ تھا لیکن اللہ کو معلوم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ میں ہجرت کے (ساتویں سال) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں جنگ خیبر میں فتح ہوگی اور باغ فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ آئے گا تو ان تمام واقعات کے رونما ہونے سے پہلے ہی آیت مذکورہ نازل فرمادی اور نزول حکم میں اس امر کا ذکر جو زمانہ مابعد میں ہوگا بیان کر دینا ممنوع نہیں ہے اور اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ جیسا کہ تفسیر کبیر میں فخر الدین رازی نے بھی لکھا ہے کہ سعید بن مسیب کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو امیہ کو اپنے منبر پر بندروں کی طرح اچھلتے کودتے دیکھا تو آپ کو یہ برا لگا۔ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے، لیکن اس میں یہ اشکال ہے کہ یہ آیت تو مکی ہے اور مکے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منبر تھا ہی نہیں، اس کا یہ جواب دینا ممکن ہے کہ کچھ بعید نہیں ہے کہ مکے میں ان کو یہ دکھایا جائے کہ مدینے میں منبر قائم ہوگا۔“

یہ کہنا کہ مجمع البیان میں بہت سے اقوال اہل سنت کے بھی بطریق نقل و حکایت کے لکھے ہوئے ہیں، کافی جواب نہیں ہے۔ کم سے کم اپنے ہی یہاں کی روایتوں سے اس کو ثابت

کرنا تھا کہ یہ سورت مکی نہیں، بلکہ مدنی ہے۔ نہ یہ جواب کافی ہے کہ مکی کا اطلاق اس سورت پر باعتبار اکثر آیات کے ہے تا وقتیکہ اس کا ثبوت نہ دیا جائے کہ کون سی آیتیں اس میں مکی ہیں اور کون سی مدنی۔

یہ فرمانا کہ ممکن ہے کہ یہ آیت دو مرتبہ نازل ہوئی ہو، مرتبہ اول مکے میں اور مرتبہ دوم مدینے میں، تعجب انگیز ہے، اس لیے کہ دو مرتبہ تو یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ ایک سورہ روم میں اور دوسری سورہ بنی اسرائیل میں، اور خیر سے دونوں مکی ہیں۔ اس لیے یہ فرمانا تھا کہ ممکن ہے یہ آیت تین مرتبہ نازل ہوئی ہو۔

اور یہ فرمانا کہ مکی اسے کہتے ہیں جو مکے میں نازل ہوئی ہو، عام اس سے قبل کہ ہجرت کے ہو یا بعد ہجرت کے فتح مکہ کے سال میں ہو یا حجۃ الوداع میں، کچھ مفید مطلب نہیں ہے۔ اس لیے کہ مکے میں فدک فاطمہ رضی اللہ عنہا کو نہیں دیا گیا، بلکہ مدینے میں اور فدک کے فوراً قبضے میں آنے کے بعد۔ اس لیے کہ ان سب جوابوں سے بہتر بظاہر صاحب ”تقلیب المکائد“ کو یہی جواب معلوم ہوا جو اخیر میں فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ یہ جواب دیا جائے کہ اگرچہ فدک مکے میں نہ تھا لیکن موافق علم ازلی کے واقع ہونے سے پہلے خدا نے حکم دے دیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ جب فدک تمہارے قبضے میں آئے تو اسے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دے دینا۔ مگر اس سے بھی مطلب حاصل نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ جو روایتیں حضرات شیعہ نے فدک دینے کی بیان کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی اسی وقت آپ نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ ذوی القربیٰ کون ہیں اور ان کا حق کیا ہے؟ بلکہ احادیث صاف اس بات پر دلالت ہیں کہ یہ آیت فتح خیبر اور فدک قبضے میں آنے کے بعد نازل ہوئی ہے نہ کہ اس سے پہلے، جیسا کہ تفسیر صافی میں اسی آیت کے ذیل میں لکھا ہے:

((وفی الکافی عن الکاظم فی حدیث له مع المہدی ان اللہ

تعالیٰ لما فتح علی نبیہ فدک و ما والاہا لم یرجف علیہ بخیل

ورکاب فانزل اللہ علی نبیہ وات ذا القربیٰ حقہ ولم یدر

رسول اللہ ﷺ من ہم فراجع فی ذلک جبرئیل ؑ وراجع
 جبرائیل ربہ فاوحی اللہ الیہ ان ادفع فذک الی فاطمة (رضی اللہ عنہا) ((
 ”یعنی امام موسیٰ کاظم سے یہ روایت منقول ہے کہ جب فذک فتح ہوا بغیر لڑائی
 کے تو خدا نے پیغمبر پر یہ آیت نازل کی کہ ﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ﴾ اور پیغمبر
 خدا ﷺ نہیں جانتے تھے کہ وہ اقارب کون ہیں؟ تب آپ نے جبرئیل علیہ السلام
 سے پوچھا اور جبرئیل علیہ السلام نے خدا سے تو اللہ نے وحی بھیجی کہ فذک فاطمہ رضی اللہ عنہا کو
 دے دو۔“

اس حدیث سے اور دیگر حدیثیں جو عیون اخبار رضا وغیرہ میں منقول ہیں یہی ثابت ہوتا
 ہے کہ فذک کے قبضے میں آنے کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ اس سے صاف ”تقلیب
 المکائد“ کا فرمانا کہ فذک کے قبضے میں آنے سے پہلے بطور پیش بندی کے یہ آیت مکے
 میں نازل ہوئی ہوگی، احادیث ائمہ کی تکذیب کرتا ہے۔
 غرضیکہ کسی طرح بات بنائے نہیں بنتی اور یہ مصنوعی روایت کسی پہلو سے صحیح نہیں ہو سکتی،
 اور مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کا یہ فرمانا کہ ((بحکم آنکہ دروغ را حافظ نمی
 باشد)) صادق آتا ہے۔

وجہ دوم:

یہ کہ خطاب ﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ﴾ اگرچہ آنحضرت ﷺ کی طرف ہے مگر
 سیاق قرآنی صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ خطاب عام ہے تمام امت سے۔ صرف
 آپ کی ذات مبارک پر مخصوص نہیں۔ اس لیے کہ یہ آیت جو سورۃ بنی اسرائیل میں ہے اس میں
 توحید، احسان، صلہ رحمی اور مکارم اخلاق کا بیان ہے اور آیات ماقبل و مابعد سے معلوم ہوتا ہے
 کہ اس میں تخصیص نہیں ہے بلکہ تعمیم ہے۔ چنانچہ آیات ماقبل و مابعد یہ ہیں:

﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبُلُغَنَّ
 عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَيْهِمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ

لَهَا قَوْلًا كَرِيمًا ۝ وَ اخْفِضْ لَهَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ
 رَبِّ ارْحَمْهَا كَمَا رَّبَّيْنِي صَغِيرًا ۝ رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ إِنَّ
 تَكُونُوا صَالِحِينَ فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَّابِينَ غَفُورًا ۝ وَأَتِ ذَا الْقُرْبَى حَقَّهُ وَ
 الْمَسْكِينِ وَ ابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ۝ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا
 إِخْوَانَ الشَّيْطَانِ وَ كَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا ۝ وَ إِمَّا تُعْرِضَنَّ
 عَنْهُمْ ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَبِّكَ تَرْجُوهَا فَقُلْ لَهُمْ قَوْلًا مَّيْسُورًا ۝ وَ
 لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَ لَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعَدَ
 مَلُومًا مَّحْسُورًا ۝ إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَ يَقْدِرُ إِنَّهُ كَانَ
 بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا ۝ ﴿الاسراء: ٢٣ تا ٣٠﴾

اب ان آیات کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے:

”تیرے رب نے یہ حکم دیا ہے کہ اس کے سوا تم کسی کی عبادت مت کرو اور ماں
 باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو اگر تیرے سامنے ایک یا دونوں بوڑھے ہو جائیں
 تو نہ کہہ ان سے ہوں، اور نہ ان کو جھڑک اور کہہ ان سے ادب کی بات، اور جھکا
 ان کے سامنے بازو عاجزانہ اور نیاز مندانہ اور یہ دعا مانگ کہ اے رب! ان پر رحم
 کر جس طرح کہ انہوں نے مجھے بچپن میں پرورش کیا۔ تمہارا رب جانتا ہے جو
 تمہارے دلوں میں ہے اگر تم نیک ہو تو وہ توبہ کرنے والوں کو بخشتا ہے۔ اور دے
 قرابت والے کا اس کا حق اور محتاج کو اور مسافر کو اور مت اڑا فضول خرچی میں،
 فضول خرچ بھائی ہیں شیطان کے، اور شیطان اپنے رب کا ناشکر ہے، اور اگر کبھی
 تو ان سے تغافل کرے بوجہ چاہنے اپنے رب کی رحمت کے جس کی تجھے امید
 ہے تو ان سے بات نرمی ہی کی کہہ دے اور مت باندھ لے اپنے ہاتھ گردن میں
 (یہ کنایہ ہے بالکل خرچ نہ کرنے سے) اور نہ بالکل فراخ دستی کر کہ بیٹھ رہے
 ملامت زدہ اور پشیمان۔ تیرا رب تو جسے چاہتا ہے رزق خوب سا دیتا ہے اور جس

کو چاہتا ہے کم دیتا ہے کیونکہ وہ اپنے بندوں کے حال سے خبردار ہے۔“

ان آیتوں سے پہلے بھی وہ آیتیں ہیں جن میں شرک اور معاصی سے ممانعت اور توحید اور عبادت کا حکم کیا گیا ہے، جیسا کہ فرمایا ہے: ﴿لَا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَتَقْعَدَ مَذْمُومًا مَّخْذُومًا﴾ کہ خداوند تعالیٰ کے ساتھ کسی خدا کو مت ملاؤ کہ ملامت زدہ اور پشیمان ہو کر بیٹھ رہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اول خداوند تعالیٰ نے شرک اور معاصی کی برائیاں بیان کیں اور اس کے بعد توحید اور عبادت ارشاد کیا اور اس کے بعد احسان، تبرع، صلہ رحم اور مکارم اخلاق کا ذکر فرمایا۔ پس گویا اس صورت میں جو یہ آیتیں ہیں وہ توحید، عبادت، صلہ رحمی، مکارم اخلاق، سلوک، احسان اور ادائے حقوق کے بیان میں ہیں اور یہ وہ چیزیں ہیں کہ دراصل امت کی ہدایت اور عمل کے لیے بیان کی گئی ہیں اور گویا وہ ایک قانون ہے جس میں انسانی اخلاقی صفات کا بیان اور اس پر عمل کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ سب آیتیں تو عام ہوں اور ان کا خطاب امت کی طرف ہو اور ایک آیت یعنی ﴿وَاتِ ذَا الْقُرْبَىٰ﴾ صرف آنحضرت ﷺ سے مخصوص ہو اور پھر وجہ خصوصیت بھی کوئی موجود نہ ہو۔ مجمع البیان طبرسی میں بھی ان آیتوں کے معنی میں علامہ طبرسی فرماتے ہیں: ((كما تقدم النهي عن الشرك و المعاصي عقبه سبحانه بالامر بالتوحيد و الطاعات فقال سبحانه و قضی ربك الا تعبدوا الا اياه)) اور پھر ﴿وَاتِ ذَا الْقُرْبَىٰ﴾ کی آیت سے لے کر تا آیت ﴿إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا﴾ جو پانچ آیتیں ہیں ان کی تفسیر میں علامہ موصوف فرماتے ہیں:

((ثم حث سبحانه نبیه علی ایتاه الحقوق لمن يستحقها
وعلى كيفية الانفاق فقال وات ذا القربى حقه معناه وات
القربات حقوقهم التي اوجبها الله لهم فى اموالكم))

”یعنی خدا تعالیٰ نے اول شرک و معاصی سے ممانعت کی اس کے بعد توحید و عبادت کا حکم بیان فرمایا، پھر اپنے پیغمبر کو ان لوگوں کے حقوق کو جو اس کے مستحق

ہیں دینے اور خرچ کرنے کے طریقوں پر آگاہ کیا اور فرمایا کہ ذوی القربیٰ کو ان کا حق عطا کر، یعنی رشتہ داروں کو ان کے حقوق جو خدا نے ان کے لیے تمہارے مالوں میں مقرر کیے ہیں عطا کر۔“

پس ان سب آیتوں کے دیکھنے اور سیاق قرآنی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کوئی موقع کسی خاص بات میں پیغمبر ﷺ کی تخصیص کا نہیں ہے۔ اور اگر خاص آیت ﴿وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی﴾ کی پیغمبر کے ساتھ تخصیص کی جائے تو سارا کلام مہمل اور بے معنی ہو جاتا ہے۔ حضرات امامیہ کو آیت ﴿وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّہُ﴾ میں صرف ایک بات سے اس کو موقع ملا کہ اس آیت کے حکم کو آنحضرت ﷺ سے مخصوص خیال کریں اور وہ یہ ہے کہ اس آیت میں خطاب بصیغہ واحد ہے لیکن علم معانی و بیان کے جاننے والے بیک طرف، معمولی سمجھ کے آدمی اور قرآن کے ترجمہ جاننے والے بھی اس بات کو سمجھتے ہیں کہ قرآن مجید کا طرز بیان ایسا واقع ہوا ہے کہ اکثر خطاب خاص آنحضرت ﷺ کی طرف ہوتا ہے مگر درحقیقت مراد اس سے امت ہوتی ہے، بہت دور جانے اور قرآن کے دوسرے مقامات دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، اسی رکوع میں جو طرز بیان خدا کا ہے اس سے اس کا ثبوت ہوتا ہے، جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے: ﴿لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ الْہَا اٰخَرَ فَتَقْعَدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا﴾ ”کہ خدا کے ساتھ دوسرے کو معبود نہ بنا نہیں تو ذلیل اور عاجز ہو جائے گا۔“ کیا ایک لحظ کے لیے بھی کوئی مسلمان سمجھ سکتا ہے کہ یہ خطاب خاص آنحضرت ﷺ کی طرف ہے اور اسی لیے مفسرین شیعہ نے بھی اس خطاب کو عام مانا ہے، جیسا کہ علامہ طبرسی فرماتے ہیں، ((ان الخطاب للنبی والمراد امتہ)) کہ یہ خطاب پیغمبر خدا ﷺ سے ہے اور مراد امت ہے اس آیت کے سوا یہ آیت بھی اسی رکوع میں ہے: ﴿اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْکِبَرَ اَحَدُہُمَا اَوْ کُلُّہُمَا فَلَا تَقُلْ لَّہُمَا اَفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْہُمَا وَاَقُلْ لَّہُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا﴾ ”کہ اگر پہنچ جائیں تیرے سامنے بڑھاپے کو ماں باپ میں سے ایک یا دونوں تو ان سے اُف کر کے بات نہ کر، اور نہ ہی ان کو جھڑکی دے اور ان سے ادب کی بات کر۔“ کیا کوئی نادان اس خطاب کو

آنحضرت ﷺ کی طرف سمجھے گا جبکہ آنحضرت ﷺ کی شان اس سے اعلیٰ وارفع تھی کہ آپ کو ایسی برائی سے بچانے کی نصیحت کی جاتی۔ آپ کے والدین چھٹ پن ہی میں گزر گئے تھے اور ان کے مرنے کے چالیس برس بعد خدا کا کلام نازل ہوا تھا، تو صاف ظاہر ہے کہ یہ خطاب بھی امت کی طرف ہے۔ اور اس کے سوا اور روایتیں جو بیان کی گئی ہیں، مثلاً ((لا تبذر تبذیرا ولا تجعل یدک مغلولۃ الی عنقک ولا تبسطھا کل البسط)) ”کہ اسراف نہ کرو اور اپنے ہاتھوں کو باندھ نہ لو، یعنی بخل نہ کرو اور نہ زیادہ فضول خرچی ہو۔“ ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جو آنحضرتؐ سے مخصوص ہو۔ باوجودیکہ یہ سب خطاب بصیغہ واحد آنحضرت ﷺ کی طرف کیے گئے ہیں اور ان میں کوئی موقع اور محل شیعوں کو بھی انکار کا نہیں ہے۔

پس ان تمام آیتوں سے صرف ایک آیت کو مخصوص کرنا آنحضرت ﷺ سے بغیر کسی مرجح اور نخص وجہ کے قابل مضحکہ ہے، خصوصاً جبکہ ﴿وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی﴾ کہ پہلی آیت کو دیکھا جائے جس میں والدین کے ساتھ احسان کرنے کا حکم ہے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک مسلسل بیان اس کا ہے جو ہدایت انسان کو اخلاق، احسان، صلہ رحم اور ادائے حقوق اور متعلق کی گئی ہے، اس میں اول بیان کیا کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرنی چاہیے، اس کے بعد بتایا کہ ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا لازم ہے، اس کے بعد فرمایا کہ قرابت داروں، مسکینوں اور مسافروں کے حق ادا کرنے چاہئیں اور پھر اسی کے ساتھ اعتدال کی بھی ہدایت فرمائی کہ نہ ایسی بخشش ہو کہ اسراف کے درجے پر پہنچ جائے اور نہ ایسا بخل کہ آدمی اپنے ہاتھ باندھ لے۔ اور پھر اس کے ساتھ یہ بھی کہ اگر اتنی استطاعت نہ ہو کہ ان کے ساتھ کچھ سلوک کیا جاسکے تو ان سے اخلاق اور نرمی سے بات چیت کرنی چاہیے، جیسا کہ فرمایا ہے: ﴿فَقُلْ لَهُمْ قَوْلًا مَّيْسُورًا﴾ اگر آیت ﴿وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی﴾ میں خدا کی مراد یہ ہوتی کہ فدک فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا جائے تو معلوم نہیں کہ ﴿وَلَا تَبْذِرْ تَبْذِيرًا﴾ کیوں کہا جاتا اور پھر تذبذبی برائی اور اس کا خوف بھی نہایت سخت لفظوں میں کہ ﴿اِنَّ الْمُبْذِرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّيْطٰنِ﴾ کیوں دلایا جاتا اور یہ کیوں کہا جاتا کہ اگر تمہارے پاس دینے کو نہ ہو تو

ان سے وعدہ ہی کر لو کہ جب خدا تم کو دے گا تو تم ان سے سلوک کرو گے۔ اگر کوئی اس آیت کو ہبہ فدک کے متعلق سمجھے تو آیت ﴿وَأَمَّا تَعْرِضْنَ عَنْهُمْ ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِّن رَّبِّكَ تَرْجُوهَا فَقُلْ لَهُمْ قَوْلًا مَّيْسُورًا﴾ اس موقع پر مہمل ہوئی جاتی ہے۔ مفسرین شیعہ نے بھی اس آیت کے وہی معنی لکھے ہیں جس سے ہمارے قول کی تصدیق ہوتی ہے۔ صاحب مجمع البیان طبری فرماتے ہیں:

((و اما تعرضن عنهم ای وان تعرض عن هؤلاء الذين امرتك بآداء حقوقهم عن مسألتهم اياك لانك لاتجد ذلك حباء منهم ابتغاء رحمة من ربك ترجوها ای لتبتغي الفضل من الله والسعة التي يمكنك معها البذل بامل تلك السعة و ذلك الفضل ﴿فقل لهم قولاً ميسوراً﴾ ای عدھم عدة حسنة و قل لهم قولاً سهلاً لينا يتيسر عليك و روى ان النبي ﷺ كان لما نزلت هذه الآية اذا سئل ولم يكن عنده ما يعطى قال يرزقنا الله و اياكم من فضله))

”یعنی اگر ان لوگوں کے حقوق ادا کرنے اور ان کے دینے سے تم مجبور ہو اور ان کے سوال پورا کرنے کے لیے تمہارے پاس کچھ نہ ہو اور شرم کے مارے ان سے اعراض کرو تو تمہیں چاہیے کہ خدا کے فضل پر امید رکھ کر وعدہ کرو اور اچھے لفظوں میں ان سے کہہ دو کہ جب خدا تمہیں دے گا تو تم ان کے ساتھ سلوک کرو گے۔ اور پیغمبر خدا ﷺ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد یہی کیا کرتے کہ جب آپ سے سوال کیا جاتا اور آپ کے پاس کچھ دینے کو نہ ہوتا تو یہ فرماتے کہ اللہ اپنے فضل سے ہم کو اور تم کو رزق دے۔“

یہ بیان تو سورہ بنی اسرائیل کا کیا گیا۔ اب سورہ روم پر غور کرنا چاہیے کہ وہاں یہ آیت کس موقع پر آئی ہے۔ آیات ما قبل و ما بعد یہ ہیں:

﴿وَإِذَا أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوا بِهَا وَإِنْ تُصِيبُهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ

أَيْدِيهِمْ إِذَا هُمْ يَقْنَطُونَ ۝ أَوْلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ
يَشَاءُ وَيَقْدِرُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ فَاتِ ذَا الْقُرْبَىٰ
حَقَّهُ وَالْمُسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ ذَلِكَ خَيْرٌ لِلَّذِينَ يُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ
وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ (الروم: ۳۶ تا ۳۸)

”یعنی جب لوگوں کو ہم رحمت پہنچاتے ہیں تو وہ اس سے خوش ہو جاتے ہیں اور
اگر ان کے اعمال کے سبب ان کو کوئی برائی پہنچتی ہے تو وہ ناامید ہو جاتے ہیں، کیا
وہ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے روزی فراخ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا
ہے کم دیتا ہے۔ اس میں نشانیاں ہیں ایمان والوں کے لیے۔ پس دے رشتہ دار
کو اس کا حق اور مسکین و مسافر کو۔ یہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی رضا
مندی چاہتے ہیں اور یہی لوگ مراد کو پہنچنے والے ہیں۔“

اس میں بھی تخصیص باطل ہوتی ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے اسے اس طرح پر شروع کیا ہے
کہ اللہ کو اختیار ہے جسے چاہے روزی فراخ دے اور جس پر چاہے تنگ کر دے۔ یہ مضمون عام
ہے اسی پر آگے چل کر تفریح کی ہے اور فرمایا ہے کہ اے پیغمبر! تو قرابتوں، مسکینوں اور
مسافروں کو ان کا حق دیتا رہ۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں تعمیم مراد ہے، خصوصاً
اس آیت کے اخیر لفظوں سے تو تعمیم میں کوئی شک ہی نہیں رہتا اور وہ الفاظ یہ ہیں:

﴿ذَلِكَ خَيْرٌ لِلَّذِينَ يُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝﴾

”کہ یہ بات بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو خدا کی رضا مندی چاہتے ہیں اور
وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔“

یہ ارشاد اسی وقت یا موقع اور بر محل صحیح ہو سکتا ہے جبکہ حکم عام ہو اور خطاب مومنین سے
ہو۔ ورنہ قرآن جو ایک فصیح و بلیغ کلام ہے مہمل سمجھا جائے گا۔ اس لیے کہ آنحضرت ﷺ
کی نسبت تو یہ گمان ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ ان حقوق کے دینے میں تامل فرماتے یا ان کو اس حکم پر
عمل کرنے کے لیے ترغیب و ترہیب کی ضرورت ہوتی اور ﴿ذَلِكَ خَيْرٌ لِلَّذِينَ يُرِيدُونَ

وَجَّةَ اللَّهِ وَوَالِيكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٥﴾ کہنے کی خدا کو کیا ضرورت پڑتی۔ یہ اسی وقت با موقع سمجھا جاسکتا ہے جبکہ خطاب عام مومنین کی طرف سمجھا جائے کہ امت ہی کے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو پورے طور پر حقوق ادا کرنے کے لیے ترغیب و ترہیب کی ضرورت ہوتی ہے اور ذاتی اغراض اور شخصی محبت کو دخل نہ دینے کے لیے اس قسم کے بیان سے ان کو نصیحت کی جاتی ہے۔ پس جو شخص ذرا بھی قرآن کو غور سے دیکھے گا اور اس آیت کے ما تقدم اور ما تاخر (آگے پیچھے) اور طرز بیان اور سیاق عبارت پر نظر کرے گا وہ ذرا شبہ نہیں کر سکتا کہ قربیٰ سے عام رشتہ دار مراد ہیں۔ کما قيل انه خطاب له و لغيره والمراد بالقربى قرابة الرجل وهو امر بصلة الرحم بالمال .

وجہ سوم:

یہ کہ اگر شیعوں کے خیال کے موافق تسلیم کیا جائے کہ آیت ﴿وَإِذَا الْقُرْبَىٰ﴾ میں ذَا الْقُرْبَىٰ سے مراد فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حقہ سے مراد فدک ہے تو ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت کے حکم کی پوری تعمیل یا تو آنحضرت ﷺ نے معاذ اللہ خود نہیں کی یا خدا نے نہیں کرائی، اس لیے کہ اس آیت میں تین لوگوں کے حق ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، (۱) ذوی القربیٰ (۲) مسکین، (۳) مسافر۔ ذوی القربیٰ کی نسبت تو شیعوں نے یہ بات بنائی کہ آپ ﷺ اس کے معنی نہیں سمجھے اور جبرئیل علیہ السلام نے بتایا کہ ذوی القربیٰ فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں اور ان کا حق بھی دریافت کر لیا اور ادا بھی کر دیا گیا، مگر باقی اشخاص ویسے ہی محروم چھوڑ دیے گئے۔ پھر ذوی القربیٰ کا لفظ تو عام ہے اور سب رشتہ داروں کو مشتمل ہے اور تخصیص کر دی گئی صرف ایک کی؟

سوائے اس کے ذوی القربیٰ کا لفظ قرآن مجید میں اسی آیت میں نہیں آیا بلکہ تیرہ جگہ متعدد آیتوں اور مختلف سورتوں میں آیا ہے اور ایسے موقع پر آیا ہے جہاں ادائے حقوق کی ہدایت اور اس کی ترغیب ہے، اور اکثر اس کے ساتھ دیگر اشخاص مساکین اور ابن السبیل وغیرہ شریک ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں جہاں ایسے موقع پر یہ لفظ آیا ہے وہاں مراد ان سب کے ساتھ نیکی کرنا..... اور ان کی خبر لینا اور ان کی مدد کرنا ہے۔ مثلاً: سورہ بقرہ

میں خدائے تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَ
بِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَقُولُوا
لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا
مِّنْكُمْ وَأَنتُمْ مُّعْرِضُونَ﴾ (سورة البقره: ۸۳)

”یعنی جب کہ عہد لیا ہم نے بنی اسرائیل سے کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا
اور ماں باپ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور غریبوں کے ساتھ سلوک کرنا اور لوگوں
سے اچھی بات کہنا اور نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا، پھر تم پھر گئے اس عہد سے مگر تم
میں سے چند لوگ، اور اب بھی تم اعراض کرتے ہو۔“

اس آیت میں بیان ہے کہ بنی اسرائیل سے ہم نے ان باتوں کا عہد لیا تھا کہ خدا کے سوا
عبادت نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ نیکی، رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھلائی، اور
سب سے اچھی بات کرنا۔ مگر انہوں نے اس عہد کو توڑ ڈالا۔ چونکہ بنی اسرائیل نے اس عہد کو
توڑ دیا تھا، اس لیے خداوند تعالیٰ نے اس موقع پر اس کا ذکر اس لیے کیا کہ آنحضرت ﷺ
کی امت کو تنبیہ ہو کہ وہ ایسا نہ کرے۔ اور پھر اسی کی تشریح اور تصریح سورہ بنی اسرائیل میں
کر دی، یعنی بتا دیا کہ جن باتوں کا بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا تھا وہ انہی کے ساتھ مخصوص
نہ تھیں بلکہ حسن اخلاق اور حسن معاشرت اور حسن معاملے کے لیے یہ باتیں ہر انسان پر
لازم ہیں اور ان کا کرنا ضروری ہے اور انہی باتوں کو آنحضرت ﷺ کو مخاطب کر کے آپ
کی امت کو بتایا اور ان لفظوں سے ﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ
إِحْسَانًا... الخ﴾ فرمایا کہ خدا نے تمہارے اوپر لازم اور واجب کر دیا ہے کہ اس کے سوا
دوسرے کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ احسان اور ذوی القربیٰ اور مسکین اور ابنِ
السَّبِيلِ (مسافر) کا حق ادا کرو۔“ گویا یہ آیتیں انہیں آیتوں کا صاف صاف بیان ہیں
جو سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل پر واجب کی گئی تھیں، وہاں ﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي

اِسْرَآئِیْلَ ﴿ فرمایا اور یہاں وَقَضَى رَبُّكَ جِس کے معنی قریب قریب ایک ہوتے ہیں، یعنی ان باتوں کا کرنا واجب کر دیا گیا، پھر وہاں فرمایا ﴿لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ﴾ اور یہاں ارشاد کیا ﴿أَنْ لَا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ﴾ پھر وہاں تو فرمایا تھا ﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ یہاں بھی وہی فرمایا ﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ اور اس کی اور بھی زیادہ تشریح کر دی اور احسان کا ادنیٰ درجہ تک بھی بیان کر دیا کہ ان سے اف تک نہ کہو۔ پھر وہاں بیان فرمایا: ﴿ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ﴾ یہاں فرمایا ﴿وَاتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمَسْكِينِ وَالْإِنْسَانَ﴾ اور پھر اعتدال کی بھی یہاں نصیحت فرمائی کہ ﴿وَلَا تَبْذُرْ تَبْذِيرًا... الخ﴾ اور پھر وہاں فرمایا ﴿وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ اور یہاں فرمایا ﴿فَقُلْ لَهُمْ قَوْلًا مَّيْسُورًا﴾ پس دیکھو کیسا مسلسل اور مرتب بیان ان دونوں آیتوں کا ہے۔ اور سورہ بنی اسرائیل کی آیتیں کیسی تشریح انہیں احکام کی ہیں جو بنی اسرائیل کو دیے گئے تھے۔

ذَوِي الْقُرْبَىٰ كَالْفَرْسِ فِي بَقْرَةَ فِي آيَةٍ فِي آيَاتِهِ وَأَيْتُهُ هِيَ: ﴿لَيْسَ الْبِرُّ أَنْ تُولُوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَالْإِنْسَانَ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ﴾

”یعنی یہ نیکی نہیں ہے کہ تم مشرق و مغرب کی طرف منہ کر لو بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ اور آخرت پر اور فرشتوں اور کتاب اللہ اور پیغمبروں پر ایمان لائے، اور خدا کی محبت میں مال رشتہ داروں، یتیموں، غریبوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو اور غلاموں کے آزاد کرنے میں دے۔“

اس میں بھی بر اور احسان کا اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے اور گویا یہ بھی دوسرے لفظوں میں انہیں احکام کا تذکرہ ہے جو سورہ بنی اسرائیل میں بیان کیے گئے ہیں کہ نیکی یہی نہیں ہے اپنے منہ پورب اور پچھم کی طرف کرو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ خدا اور قیامت، فرشتوں، کتاب اور

پیغمبروں پر ایمان لاؤ اور خدا کی محبت میں اپنا مال ذوی القربیٰ، یتیموں اور مساکین اور ابن سبیل اور سائلین کے دینے اور غلاموں کے آزاد کرانے میں صرف کرو۔

سورہ نساء میں بھی ذوی القربیٰ کا لفظ اسی موقع پر آیا ہے: کما قال تعالیٰ ﴿وَأَعْلَمُوا أَنبَاءَ غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ خُسُفَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ... الخ﴾ کہ جو کچھ غنیمت میں تمہارے ہاتھ آئے اس کا پانچواں حصہ خدا اور رسول اور ذوی القربیٰ اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافرین کے لیے ہے۔ اس آیت پر اگر حضرات امامیہ غور فرمائیں تو ان کو اس کہنے میں کہ آیت ﴿وَأَتِ ذَا الْقُرْبَىٰ﴾ مدینے میں خیبر کے فتح ہونے کے بعد نازل ہوئی بہت مشکل پیش آئے گی بلکہ ان کا سارا عنکبوتی گھر برباد ہو جائے گا۔ اس لیے کہ کوئی اس باب میں شبہ نہیں کر سکتا کہ آیت ﴿وَأَعْلَمُوا أَنبَاءَ غَنِمْتُمْ﴾ فتح خیبر سے پہلے نازل ہوئی ہے، اس لیے کہ غنیمت کا مال خیبر کے فتح ہونے سے پہلے آیا کرتا تھا اور اس کی تقسیم ہوا کرتی تھی اور اس آیت ﴿وَأَعْلَمُوا أَنبَاءَ غَنِمْتُمْ﴾ میں اس کی تفصیل یہی ہے۔ پس جنگ بدر سے لے کر خیبر کے فتح ہونے تک پیغمبر خدا ﷺ آیت ﴿وَأَعْلَمُوا أَنبَاءَ غَنِمْتُمْ﴾ کے مطابق غنیمت کے حصے میں سے اقارب، مساکین اور مسافرین کو ان کے حقوق دیا کرتے تھے اور دینا ہو نہیں سکتا جب تک معلوم نہ ہو کہ اقارب اور مساکین وغیرہ کون ہیں۔ معلوم نہیں تو خیبر فتح ہونے اور فدک ملنے کے بعد آنحضرت ﷺ کو جبرئیل علیہ السلام سے ذوی القربیٰ اور حقہ کے معنی دریافت کرنے کی کیا ضرورت ہوئی؟ اگر ضرورت ہوتی تو اس آیت ﴿وَأَعْلَمُوا أَنبَاءَ غَنِمْتُمْ﴾ کے نازل ہونے کے وقت ہو سکتی تھی تا کہ غنیمت کی تقسیم میں غلطی نہ ہو۔ اور اگر تسلیم کیا جائے کہ آیت ﴿وَأَتِ ذَا الْقُرْبَىٰ﴾ میں مراد ذوی القربیٰ سے صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں تو آیت ﴿وَأَعْلَمُوا أَنبَاءَ غَنِمْتُمْ﴾ میں بھی جو لفظ ذی القربیٰ کا آیا ہے اس سے بھی مراد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہوں گی، اور خمس بھی صرف انہیں کا حق ہوگا، اور بجز ان کی اولاد کے تمام بنی ہاشم خمس سے محروم ہوں گے ((ولم یقل بہ احد)) یہ خود مذہب شیعہ کے خلاف ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں خمس میں سے

نصف امام وقت کا اور باقی نصف یتیموں، مسکینوں اور ابن سبیل کا ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت کی تفسیر میں مجمع البیان طبرسی میں لکھا ہے:

((اختلف العلماء فى كيفية قسمة الخمس و من يستحقه على اقوال احدها ما ذهب اليه اصحابنا و هو ان الخمس يقسم على ستة اسهم فسهم لله و سهم للرسول و هذان السهمان مع سهم ذى القربى للامام القائم مقام الرسول و سهم لیتامى آل محمد و سهم عساكينهم و سهم لابناء سبيلهم لا يشركهم فى ذلك غيرهم لان الله سبحانه حرم عليهم الصدقات لكونها اوساخ الناس و عوضهم من ذلك الخمس روى ذلك الطبرى عن على بن الحسين زين العابدين و محمد بن على الباقر، و اختلف فى ذوى القربى فقيل هم بنى هاشم خاصة من ولد عبد المطلب لان هاشم لم يعقب الا منه عن ابن عباس و مجاهد و اليه ذهب اصحابنا.))

”یعنی تقسیم خمس کی کیفیت میں علماء کا اختلاف ہے اور ان لوگوں میں کہ کون کون مستحق ہیں۔ ہمارے علماء کا مذہب یہ ہے کہ خمس کے چھ حصے کیے جائیں گے۔ ایک حصہ اللہ کا اور ایک حصہ رسول کا اور یہ دونوں حصے مع ایک حصہ ذوی القربیٰ کے امام کا ہے جو رسول کے قائم مقام ہے اور ایک حصہ آل محمد کے یتیموں کا اور ایک انہی کے مساکین کا اور ایک انہی کے مسافرین کا، آل محمد کا کوئی شریک اس میں نہیں ہوتا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے صدقات کو بوجہ لوگوں کے میل ہونے کے آل محمد پر حرام کر دیا ہے اور اس کے عوض میں ان کو خمس دیا ہے۔ طبرسی نے امام زین العابدین اور امام باقر سے یہ روایت کی دوسرا اختلاف ذوی القربیٰ میں ہے کہ ان سے کون مراد ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد خاص بنی ہاشم اور اولاد

عبدالمطلب ہیں کیونکہ ہاشم کی نسل عبدالمطلب ہی سے چلی ہے۔ یہ مروی ہے
ابن عباس اور مجاہد سے، اور یہی مذہب ہے ہمارے علماء کا۔“

اور تفسیر قمی میں ہے:

((فمن الغنمية يخرج الخمس و يقسم على ستة اسهم سهم
لله و سهم لرسول الله و سهم للامام فسهم الله و سهم
الرسول يرثه الامام فيكون للامام ثلاثة اسهم من ستة و ثلاثة
اسهم لايتام ال الرسول و مساكينهم و ابناء سبيلهم .))
”غنیمت میں سے خمس نکلے گا اور چھ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا ایک حصہ اللہ کا
اور ایک حصہ اللہ کے رسول کا اور ایک حصہ امام کا۔ اللہ اور اس کے حصہ کا امام ہی
وارث ہوگا تو امام کے چھ میں سے تین حصے ہوں گے اور تین حصے آل رسول کے
یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہوں گے۔“

غرض کسی پہلو یہ بات ٹھیک نہیں بیٹھتی کہ ذوی القربیٰ کے معنی پیغمبر نہ جانتے ہوں، اور
ان اقارب کو جن کا حق دینا چاہیے آپ نہ پہچانتے ہوں اور باوجود نازل ہونے متعدد آیات
کے جو ذوی القربیٰ کے احسان کے متعلق ہیں پیغمبر خدا ﷺ آیت ﴿وَإِذَا الْقُرْبَىٰ﴾
کے نازل ہونے پر جبرئیل امین علیہ السلام سے پوچھنے پر مجبور ہوئے ہوں اور خدا نے فرمایا ہو کہ
ذوی القربیٰ سے مراد فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں اور فدک جس کی آمدنی سالانہ چالیس یا ستر ہزار دینار
تھی، ان کو دے کر پیغمبر خدا ﷺ ادائے حقوق سے سبکدوش ہو گئے ہوں، اور باقی تمام رشتہ
داروں اور مسکینوں اور مسافروں کو محروم چھوڑ دیا ہو۔

((و كيف يجوز لا حد من المسلمين ان يتكلم بمثل هذا
ويبدل كلام الله من تلقاء نفسه و يحرفه عن موضعه
سبحانك هذا بهتان عظيم .))



کیا یہ بات قیاس میں آسکتی ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے
 ”فدک“ جس کی آمدنی چوبیس ہزار دینار کہی جاتی ہے
 حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا ہو؟

روایتوں اور حکایتوں کو ایک طرف رکھ کر اور ان کے تناقض و باہمی اختلاف سے بھی قطع
 نظر کر کے اس بحث کو عقل کی آنکھ سے دیکھنا اور ایک منصف غیر متعصب آدمی کی طرح اس پر
 غور کرنا چاہیے تاکہ معلوم ہو کہ آیا اسی زمانے میں جب کہ پیغمبر خدا ﷺ فدک حضرت
 فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کیا غنیمت یا فے یا خراج یا اور کسی قسم کی آمدنی ایسی کافی و وافی تھی کہ جس
 سے اخراجات جو اس وقت اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کی حفاظت اور کفار کے حملوں سے
 بچانے اور ان پر جہاد کرنے اور وفود، یعنی ایلچیوں اور مہمانوں کے ٹھہرانے اور تحفے و ہدایا
 دینے کے لیے ضروری تھے، بغیر کسی وقت کے ادا ہو سکتے۔ اور موجودہ حالت اس زمانے کی
 ایسی تھی کہ پیغمبر خدا ﷺ چوبیس ہزار یا ستر ہزار دینار کی سالانہ آمدنی کی جاگیر اپنی بیٹی کو بخش دیتے۔
 اور کیا آنحضرت ﷺ کی سیرت اور عادت ایسی تھی کہ مہاجرین، انصار اور عامہ مسلمین کا
 خیال نہ کر کے اور ان کو تنگی اور افلاس میں چھوڑ کر جو کچھ آپ کے حصے میں آیا تھا (بشرطیکہ
 ہم اس کو آپ کا ذاتی حصہ سمجھیں) وہ اپنے رشتہ داروں میں سے کسی ایک چہیتے رشتہ دار کو
 دے دیتے۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ ان باتوں پر خیال کرنے سے ایک لحظہ کے لیے بھی کوئی آدمی ہبہ کی
 روایت کو صحیح نہ سمجھے گا اور نہ پیغمبر خدا ﷺ کی شان، خصلت، سیرت کے مطابق پائے گا۔
 اس لیے کہ فدک ہجرت کے ساتویں برس آنحضرت ﷺ کے قبضے میں آیا تھا اور وہ زمانہ

نہایت عسرت اور تنگی کا تھا، حضرت کی خودیہ حالت تھی کہ فاقے پر فاقے کرتے اور بھوک کی تکلیف سے دو دو دن تک شکم مبارک پر پتھر باندھ کے اور اہل بیت کا یہ حال تھا کہ نان جویں کو محتاج تھے اور ضروری حاجتوں کے پورا کرنے کے لیے بھی کچھ سرمایہ نہ رکھتے تھے، مہاجرین گھر بار چھوڑے ہوئے مدینے میں دوسروں کے یہاں پڑے ہوئے تھے اور وہ اپنے اوپر تنگی اٹھا کر اور ایثار علی النفس کر کے ان کی مدد کرتے تھے، اور حالت اسلام کی یہ تھی کہ چاروں طرف سے دشمنوں کا ہجوم تھا اور ہر جانب سے حملہ اور لڑائی کا اندیشہ، ہر روز جہاد کی ضرورت پیش آتی اور ہر وقت دشمنوں کا کھٹکا لگا رہتا۔ اسلام کے لشکر کی تیاری اور ان کے لیے آلات حرب و ضرب تیار کرنے کے لیے پیغمبر خدا ﷺ کو ہر دم فکر لگی رہتی، وفود، ایچی اور قاصد چاروں طرف سے چلے آتے اور ان کی مہمان داری ان کی حالت کے مطابق کرنی پڑتی اور نیز تحفے و ہدایا جو وہ لاتے اس کے موافق انہیں آپ کو بھی دینا پڑتے اور ان اخراجات کے لیے مسلمانوں سے مدد لینے کی ضرورت ہوتی اور اسی کام میں اعانت کرنے کے لیے خدا کی طرف سے رغبت دلانے والی آیتیں نازل ہوتی رہتیں، اور مسلمان جو کچھ استطاعت رکھتے تھے وہ اپنے حوصلے اور استطاعت کے موافق مال سے اثاث البیت سے کپڑے سے غلے سے غرض کہ ہر طرح سے مدد کرتے یہاں تک کہ جو مفلس اور فقیر تھے وہ بھی بوقت ضرورت اپنے اوپر فاقہ کرتے اور جو کچھ ان کے پاس کھانے کو ہوتا وہ فی سبیل اللہ آنحضرت ﷺ کے سامنے لا کر رکھ دیتے۔

تو کیا ایسی تنگی کے زمانے میں کسی معمولی آدمی سے بھی جو کسی گروہ کی سرداری کا دعویٰ کرتا ہو، یا کسی قسم کی اولوالعزمی کے خیال رکھتا ہو اور اپنے گروہ کی حفاظت کا ذمہ دار ہو یہ توقع ہو سکتی ہے کہ جو کچھ اسے ملے وہ بجائے اس کے کہ ان اغراض و مقاصد میں کام میں لائے جو اس کے پیش نظر ہوں اپنے رشتہ داروں کو دے دے، اور پھر رشتہ داروں میں بھی سب کے ساتھ انصاف نہ کرے بلکہ سب کے حقوق تلف اور ضائع کر کے صرف اپنے ایک چہیتے فرزند کو دے دے؟ تو کیا ایسے شخص کو دنیاوی لحاظ سے بھی کوئی سرداری کے قابل سمجھے گا یا اس کے لشکری اسے سردار مانیں گے؟ یا کچھ بھی ایسے شخص کی عزت ان کے دل میں ہوگی۔ یا سوائے

خود غرضی اور نفس پروری کے کوئی دوسرا خیال اس کی نسبت کیا جائے گا۔ چہ جائے اس کے کہ ایسی ذات پاک کی نسبت یہ امر منسوب کیا جائے جو دین کا پیشوا اور تمام دنیا کا سردار اور سارے خلق میں برگزیدہ اور خدا کا پیارا ہو اور جس کو خدا نے اخلاقی مکارم کی تکمیل کے لیے بھیجا ہو۔ اور جس نے خود غرضی اور نفس پروری کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا ہو، اور جس نے ہمیشہ ایثار علی النفس پر خود عمل کیا ہو اور اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو ہر حالت اور ہر موقع پر اسی بات کی نصیحت کی ہو، اور ان سے ہمیشہ اس کی تکمیل کرائی ہو، اور جس کے عزیز اور رشتہ دار بھی ایسے ہوں جن کے زہد اور پرہیزگاری اور ترک دنیا پر خداوند تعالیٰ نے خوشنودی اور رضا مندی فرمائی ہو اور جو فیض و سخاوت اور دوسروں کے آرام دینے کو اپنے اوپر مقدم رکھتے ہوں۔ اور جو دنیا کے تعلقات سے نفرت رکھنے اور دنیا سے بے تعلق رہنے میں زمین پر انسانوں میں ضرب المثل اور آسمانوں میں خدا کے فرشتوں کے سامنے ممدوح اور بے غرضی اور نفس کشی میں ساری دنیا کے لیے ایک نمونہ ہوں۔ کیا ایسے شخص کی نسبت کوئی یہ خیال کر سکتا ہے کہ وہ سب کا خیال چھوڑ کر جو کچھ ملے وہ اپنے ایک عزیز کو دے دے۔ اور کیا اس کے عزیزوں سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ سب کو عسرت و تنگی کی حالت میں چھوڑ کر جو کچھ اس کے باپ کا حصہ ہو اسے تنہا اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے لینا پسند کرے۔ ہرگز ہرگز نہیں!

در حقیقت اگر ہبہ فدک کی روایت صحیح مانی جائے اور فدک کا خراج چوبیس یا ستر ہزار دینار تسلیم کیا جائے تو منکرین نبوت کو آپ کی نبوت میں شکوک پیدا کرنے کا اچھا موقع ملے گا اور دشمنوں کے ہاتھ میں گویا یہ ایک عمدہ ہتھیار دینا ہوگا، حضرات امامیہ اہل بیت رضی اللہ عنہم کی محبت میں گویا ایسے مستغرق ہوں کہ ان کو اس قسم کی باتوں کے برے نتائج سمجھ میں نہ آئیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اوپر الزام لگانے کے لیے جیسی روایتیں چاہیں بنا کر پیش کریں، مگر ہمارے تو روٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہم تو اس قسم کے خیال سے جس سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ذرا بھی داغ آئے لاکھوں کوس بھاگتے ہیں۔

اب ہم اس کو ثابت کرتے ہیں کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تنگی اور افلاس کا تھا اور جہاد

کے لیے کافی سامان مہیا نہ تھا اور نہایت تکلیف اور تنگی سے جہاد کا سامان جمع کیا جاتا تھا۔ چنانچہ خود شیعوں ۱ کے یہاں سے اس کا ثبوت ہوتا ہے اور ان کی توراتخ میں لکھا ہے کہ آخری غزوہ پیغمبر خدا ﷺ کے غزوات کا تبوک ہے، جو سن ۹ھ میں ہوا۔ اس وقت ایسی تنگی اور مصیبت مسلمانوں پر تھی کہ اس غزوہ کا نام جیش العسرہ ہو گیا۔ اور خدا کی طرف سے آیات ترغیب و ترہیب نازل ہونے لگیں اور مسلمان جو ایمان میں صادق تھے مدد کرنے لگے، چنانچہ جب یہ آیت ﴿إِنْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝﴾ (سورہ توبہ ۴۱)..... ”نکلو ہلکے اور بوجھل، اور لڑو اللہ کی راہ میں اپنے مال سے اور جان سے، یہ بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم کو سمجھ ہے۔“ نازل ہوئی اور آنحضرت ﷺ نے جہاد کی تحریص کی اور جان و مال سے مدد دینے کی ترغیب شروع کی تو مدینے میں ایک ہلچل مچ گئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دو سو اونٹ اور دو سو اوقیہ چاندی کے شام کی تجارت کے لیے جمع کیے تھے وہ سب آنحضرت ﷺ کے سامنے تجمیز

۱ یہ مضمون اگرچہ اکثر کتابوں میں ہے مگر ہم نے اس کو ناسخ التوراتخ سے جو ابھی حال میں ایران میں چھپی ہے اور جس کا مصنف شیعوں کا بڑا عالم ہے لیا ہے، چنانچہ اصل عبارت اس کی منتخباً یہ ہے ذکر غزوہ تبوک۔ وایس لشکر را جیس العسر و گفتند چہ در تخطی و سختی زحمت فراوان دیدند بالجملہ این غزوہ واپسین غزوات رسول خدا ﷺ ست، مع القصة رسول خدا ﷺ فرمودہا اے مردم دنیا باختر آن مقدار ندارد کہ سر انگشت خویش را بآب زنہ و آلائش آن ربا تمامت اور یا بمیزان بری لا جرم دولتے بزرگ را بہر چیزے اندک از دست مگرارید و در کار جہاد سبک خیز و استوار باشید چنانچہ خدا فرماید ﴿إِنْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا الْآیۃ﴾ مع القصة چون پیغمبر لختے بتحریر جہاد سخن کردور مردم مدینہ جنبش پدید گشت لا جرم عثمان بن عفان کہ این وقت دو صد شتر و دو صد اوقیہ سیم از بہر تجارت شام ساز کردہ بود بتمامت بحضرت رسول آور دو برائے تجہیز لشکر پیش داشت پیغمبر فرمود لا یضر عثمان ما عمل بعد هذا و بروایتی سی صد شتر با سازو برگ و ہزار مثقال زر سرخ حاضر کرد پیغمبر فرمود اللهم ارض عن عثمان فانی منہ راض، و نیز گفتہ اند کہ از سی ہزار تن لشکر کہ سفر تبوک کردہ دو بہرہ را عثمان تجہیز داد..... عمر بن خطاب گوئد کہ من باخود اند یشدم کہ امروز از ابو بکر سبق گیرم و یک نیمہ مال خود را بحضرت رسول ﷺ بردم تا کار لشکر بسازد فرمود یا ابن الخطاب از بہر اہل خود چہ ذخیرہ نہادہ عرض کردم ہم بدین مقدار برائے اہل خویش گراشتہ ام، این ہنگامہ ابو بکر برسید و اندوختہ خویش را بتمامت پیش داشت۔

لشکر کے لیے حاضر کر دیے جس پر پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا کہ اس کے بعد عثمان جو بھی کام کریں گے انہیں کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ تین سواونٹ مع سامان کے اور ہزار مثقال زرسرخ پیش کیا اس پر پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا ((اللہم ارض عن عثمان فانی عنہ راض)) کہ اے اللہ! تو عثمان سے راضی ہو جا کیونکہ میں عثمان سے راضی ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آدھا مال اپنا آنحضرت ﷺ کے سامنے پیش کیا۔ آپ نے پوچھا کہ تم نے اپنے اہل و عیال کے لیے کیا چھوڑا ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اتنا ہی ان کے لیے چھوڑ دیا ہے، پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے اور کل مال و متاع اپنا پیغمبر خدا ﷺ کے سامنے رکھ دیا۔ آپ نے پوچھا کہ اپنے اہل و عیال کے لیے کیا رکھا ہے؟^① جواب میں عرض کیا: ((اذ دخرت اللہ ورسولہ .)) یعنی خدا اور رسول کو ان کے

① پیغمبر فرمود برائے اہل خود چہ نہادۂ عرض کرد اذ دخرت اللہ ورسولہ یعنی خدا و رسول را از بہر ایشاں ذخیرہ نہادم، عمر گفت اے ابوبکر ہیچ گاہ بر تو بیشی نتوائم گرفت..... عبدالرحمن بن عوف چہل اوقیہ زرو بروایتے چہار ہزار درہم آور دو گفت مراہشت ہزار درہم بود یک نیمہ رابقرض پروردگار خویش دادم و نیم دیگر را از بہر عیال خود گذاشتم..... بالجملۃ عباس بن عبدالمطلب و طلحہ بن عبیداللہ و سعد بن عبادہ و محمد بن سلمہ ہر یکے مبلغے حاضر کردند و عاصم بن عدی انصاری صدوسق خرما از بہر تجهیز لشکر بذل کرد، ابو عقیل انصاری نیم صاع خرما یا ساعے آور دو گفت دوش تابامد ادبار یسمان آب کشیدم و دو روز مزدور مردم بودہ ام دو صاع خرما مرا اجرت دادہ اند یکے را برائے عیال نہادم و آن کشیدم و دو روز مزدور مردم بودہ ام دو صاع خرما مرا اجرت دادہ اند یکے را برائے عیال نہادم و آن دیگر را از بہر ساز ابطال آوردم پیغمبر فرمود تا آن صاع را بر فراز دیگر صدقات نثر کردہ اند منافقان بر قلت صدقہ او عیب گرفتند و اخذ آن رانا ستودہ شمردند و گفتند این صدقہ از بہر آن آورد کہ از اموال صدقات چیزے بستاند خدا این آیت فرستاد الذین یلمزون المطوعین..... الخ۔ ایس ہنگام سالم بن عمیر و عتبہ بن زید الحارثی و ابو لیلی، و عبدالرحمن بن کعب مازنی و عمر بن غعمہ اسلمی و سلمہ بن صخر از نبی زریق و عرباض بن ساریہ اسلمی و عبداللہ و بروایتے مغفل بن یسار یا مہدی بن عبدالرحمن و نیز گفتہ اند عمر و بن الحمام بن الجموع و بروایتے صخر بن خنسا گفتند یا رسول اللہ ﷺ لیس بنا قوۃ ان نخرج معک مار ابضاعتے وعدتے نیست کہ باتو تو انیم کوچ داد از ہر قوتے و ثروتے دست ماتھی است۔ (ناسخ التواترین جلد اول کتاب دوم صفحہ ۲۲۱ مطبوعہ ایران ۱۳۰۰ء)

لیے چھوڑا ہے۔ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے چالیس اوقیہ، اور ایک روایت میں چار ہزار درہم پیش کیے اور عرض کیا کہ میرے پاس آٹھ ہزار درہم تھے۔ آدھا خدا کو قرض دیا اور آدھا اپنے اہل و عیال کے لیے چھوڑا۔ اسی طرح حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ اور طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہما اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما اور محمد بن سلمہ رضی اللہ عنہ نے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق رقم پیش کی اور چونکہ ضرورت شدید تھی اور جہاد کے سامان جمع کرنے کے لیے آنحضرت ﷺ کو نہایت فکر تھی، اس لیے جن مسلمانوں کے پاس روپیہ تھا نہ مال و متاع، انہوں نے کھانے کا سامان جو کچھ مل سکا وہی پیش کر دیا۔ چنانچہ عاصم بن عدی انصاری رضی اللہ عنہ نے سو سق خرمے لشکر کے سامان کے لیے پیش کیے۔ اور ابو عقیل انصاری رضی اللہ عنہ نے آدھا صاع، یعنی سوا سیر یا ایک صاع، یعنی ڈھائی سیر چھوہارے حاضر کیے۔ اور کہا کہ کل صبح تک میں نے پانی بھرا اور دو دن مزدوری کی اس میں مجھے دو صاع ۱۰ خرما، یعنی پانچ سیر چھوہارے ملے ہیں ایک اپنے عیال کے لیے رکھا ہے اور دوسرا آپ کے سامنے حاضر کیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اس کے پیش کیے ہوئے خرمے کو سب کے مال کے اوپر رکھیں اس پر منافقوں نے بہ نظر حقارت اس کے صدقے کو دیکھا اور اس کی کمی پر عیب لگایا اس پر یہ آیت نازل ہوئی ﴿الَّذِينَ يَلْمِزُونَ الْمُطَّوِّعِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فِي الصَّدَقَاتِ وَالَّذِينَ لَا يَجِدُونَ إِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُونَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللَّهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (سورة التوبه: ۷۹).....

”کہ وہ جو طعن کرتے ہیں دل کھول کر خیرات کرنے والے مسلمانوں کو اور ان پر جو نہیں رکھتے مگر اپنی محنت کا، پھر ان پر ٹھٹھے کرتے ہیں اللہ نے ان سے ٹھٹھا کیا ہے اور ان کو دکھ کی مار ہے۔“ اور آخر کار یہاں تک نوبت پہنچی کہ عورتوں نے اپنا زیور اتار اتار کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بھیجا اور بعض لوگ ایسے بھی رہ گئے جن کے پاس نہ مال تھا نہ اثاثا البیت، اور لشکر کے ساتھ جانے کے لیے سواری تک نہ تھی، چنانچہ ان میں سے سالم بن عمیر و عتبہ بن زید و ابو لیلیٰ و عمر بن عنمہ اسلمی اور عبداللہ بن مغفل وغیرہ تھے جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں

حاضر ہوئے اور کہا کہ یا رسول اللہ! ((لیس بناقوة ان نخرج معک)) کہ نہ ہمارے پاس کچھ سرمایہ ہے نہ کچھ سامان کہ آپ کے ساتھ ہم چل سکیں، ہر طرح کی قوت و ثروت سے ہمارا ہاتھ خالی ہے، ہمیں کچھ سواری عنایت فرمائیے تاکہ ہم ہمراہ ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ جو کچھ تم چاہتے ہو وہ میرے پاس نہیں ہے۔ یعنی بوجہ تنگی اور کمی سامان کے کوئی زائد سواری نہیں تھی جو آپ ان کو دیتے۔ چنانچہ یہ لوگ یہ جواب سن کر روتے ہوئے باہر نکلے اور بکائین کی جماعت سے ملقب ہوئے۔ اور یہ آیت:

۱ کنون مار امر کے بذل فرما کہ پیادہ گائیم فرمود آنچه شما طلب می کنید بدست نیست ایشان از نزد پیغمبر بیرون شدند و گریاں بودند ازین ره به جماعت بکائین ملقب گشتند و این آیت مبارکہ در صفت ایشان آمد و لا علی الذی اذا ما اتوک لتحملهم الخ بالجمله این یا مین بن عمر و کعب نضری ابو لیلی و ابو معقل را دیدار کرد و شترے بدیشاں دادتا بنو بت برنشیند و از بہر زاد صاعے خرما عطا کرد مع القصه رسول خدا طریق تبوک پیش داشت و لشکر کوچ دادند و در ہیچ سفر چندین سختی و صعوبت بر مسلمانان نرفت چہ پیشتر لشکریاں ہر وہ تن یک شتر بر زیادت نہ داشتند و آن را بنوبت برمی نشستند و چنداں از زاد و توشہ تھی و ست بودند کہ ہر روز دو کس یک خرما قوت می ساختند یک لختی می مکید و یک نیمہ را از بہر صاحب خود می گزاشت و از قلت بضاعت بدین قدر قناعت می کردند و طے مسافت می نمودند مقرر ست کہ دہ تن از مسلمین از قفای رسول خدا ﷺ بیرون شدند و ایشان را یک شتر بود کہ ہر ساعت یک تن برمی نشست و کان زاد ہم الشعیر المسوس و التمر الزئید و الاہالة السخنة و زاد ایشان جو کرم زدہ و تمر خوشیدہ و چربش بدبوئے شدہ بود و چند تن از ایشان را تمر نیز نبود و دفع جوع را بدین گونه میدادند فاذا بلغ الجوع من احدہم اخذ التمرۃ فلا کھا حتی یجد طعمھا ثم یعطیھا صاحبہ فیمصھا ثم یشرب علیھا جرعة من ماء کذلک حتی یاتی علی آخرہم فلا یقی من التمرۃ الا النواة یعنی چون بشدت گرسنہ و جوعان می شدند یک تن از ایشان تمرہ برمی گرفت و اندک می مکید بدان اندازہ کہ ادراک طعم آن می کرد پس بریق خویش می گزاشت تا او نیز اندکے می مکید و جرعه آب درمی کشید، بدینگونہ ہر یک از ان تمرہی می گرفتند چند انکہ حسنوی آن بجا بماند دیگر آنکہ باحدت ہواد سورت گرما آب و ر منازل ایشان نایاب بود چند انکہ با این ہمہ قلت راحلہ شتر خویش می کشتند و رطوبات احشاوا معان آن را بجائے آب می نوشیدند ازین رو این لشکر را جیش العسرہ می نامیدند کہ ملاقات سہ عسرت شگرف ہمی کردند خداوند یزدان می فرماید ﴿لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبَ فَرِيقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ إِنَّهُ بِهِمْ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾

﴿وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا آتَوْكَ لِتَحِبَّهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْبَبْتُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَاعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنْفِقُونَ ۝
 إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ وَهُمْ أَغْنِيَاءُ رَضُوا بِأَنْ
 يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطَبَعَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝﴾

(سورہ توبہ: ۹۲، ۹۳)

”اور نہ ان پر کہ جب تیرے پاس آئے تاکہ ان کو سواری دے تو نے کہا کہ میرے پاس سواری نہیں جو تم کو دوں وہ اٹے پھرے اور ان کی آنکھوں سے بہتے ہیں آنسو اس غم سے کہ ان کے پاس نہیں جو خرچ کریں راہ الزام کی ان پر ہے جو رخصت مانگتے ہیں تجھ سے اور مال دار ہیں خوش لگا کر رہ جائیں ساتھ کچھلی عورتوں کے اور مہر کی اللہ نے ان کے دلوں پر سو وہ نہیں جانتے۔“

آخر ابن یامین نے ابولیلی اور ابو مغفل کو ایک اونٹ دیا تاکہ باری باری وہ اس پر بیٹھیں اور ان کو زادراہ کے لیے ایک صاع یعنی ڈھائی سیر خرما بھی دیے۔ غرض کہ اس طرح پر سامان جمع کیا گیا اور لوگوں نے مدد کی۔ اس پر بھی منجملہ تیس ہزار آدمی کے صرف ایک ہزار آدمیوں کے پاس سواری تھی باقی سب پیادہ۔ غرض اس بیان سے یہ ہے کہ آخری غزوہ آنحضرت ﷺ کا ایسی تکلیف کا تھا اور اخیر زمانے میں آپ پر اور آپ کے لشکر پر ایسی تنگی اور تکلیف تھی کہ لوگ سیر سیر بھر خرما تجھیز لشکر کے لیے پیش کرتے اور وہ قبول کیا جاتا اور باوجود ہر طرح مدد اور اعانت کے کافی سامان مہیا نہ ہو سکتا وہ لوگ بوجہ سواری نہ ملنے کے لشکر کے ساتھ نہ جا سکتے اور بے استطاعتی سے مایوس ہو کر روتے رہ جاتے اور آنحضرت ﷺ بھی کسی قسم کی مدد سواری وغیرہ سے نہ کر سکتے۔

پھر پیغمبر خدا کی یہ حالت تھی کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ۱ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے اور آنحضرت ﷺ کی اس کوٹھڑی کو دیکھا جس میں آپ کا سامان رہتا تھا تو سوائے ڈھائی سیر جو

کے اور چند باغت کی ہوئی کھالوں کے کچھ نہ دیکھا۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: اے ابن خطاب! تم کیا دیکھتے ہو؟ تو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ خدا کے رسول ہیں اور یہ کل خزانہ آپ کا ہے حالانکہ قیصر و کسریٰ اور روم فارس کے لوگ کیسی زندگی بسر کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

﴿وَمَا هَذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهُوٌ وَ لَعِبٌ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِیَ

الْحَيَاةُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝﴾ (سورہ عنکبوت: ۶۴)

”کہ دنیا کا جینا تو یہی ہے جی بہلانا اور کھیلنا اور پچھلا گھر جو ہے سو یہی ہے جینا

اگر یہ سمجھ رکھتے ہوں۔“

یہ نہ خیال کیا جائے کہ آپ پر مصارف کی تنگی ابتدائے زمانے میں تھی اور اخیر میں غنائم اور فے وغیرہ کی آمدنی سے کچھ تکلیف کم ہوگئی ہوگی بلکہ اخیر وقت تک عسرت کا وہی حال رہا اور اگرچہ کسی قدر غنائم اور فے آنے لگے تھے لیکن اخراجات اس قدر بڑھ گئے تھے کہ کسی طرح پورے نہ ہوتے تھے اور شب و روز آنحضرت ﷺ کو تکلیف اٹھانا پڑتی تھی، چنانچہ اس کے ثبوت میں ہم ایک روایت کافی کی پیش کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ حجۃ الوداع کے بعد جو آپ کی زندگی کا آخری سال ہے، آپ کی مالی حالت کیسی تھی۔ کتاب مذکور کے جز سوم کتاب الحجہ کے باب شصت و چہارم میں جس کا عنوان ((ما نص الله ورسوله على الاثمة واحدا واحدا)) ہے ایک طویل حدیث امام جعفر صادق سے درج ہے ❶ جس میں یہ لکھا ہے کہ جب رسول خدا ﷺ حجۃ الوداع سے لوٹے اور مدینے میں داخل ہوئے تو انصار آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! خداوند تعالیٰ نے ہم کو یہ عزت بخشی کہ آپ ہمارے یہاں تشریف لائے اور آپ نے آنے سے ہم کو مشرف کیا اور آپ کی بدولت خدا

❶ اصل عبارت یہ ہے: فلما رجع رسول الله من حجة الوداع الى قوله فلما قدم المدينة اتته الانصار فقالوا يا رسول الله ان الله شرفنا بك و بنزولك فقد فرج الله صديقنا و كبت عدونا و قد تاتيك وفود فلاتجد ما تعطيههم فيشمت بك العدو فتجب ان تاخذ ثلث اموالنا حتى اذا اقدم اليك وفد فوجدت ما تعطيههم فلم يرد رسول الله شيئا و كان ينتظر مايا تيه من ربه فنزل عليه جبرئيل و قال قل لاسئلكم عليه اجرا الا المودة في القربى الخ كافي كتاب الحجۃ۔

نے ہمارے دوستوں کو خوش اور ہمارے دشمنوں کو ذلیل کیا۔ آپ کے پاس باہر سے ایچی آتے ہیں اور آپ کے پاس اتنا بھی نہیں ہوتا کہ آپ ان کو کچھ عطا فرمائیں، اس پر آپ کے دشمن ہنستے ہیں اور شہامت کرتے ہیں، اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ آپ ایک تہائی مال ہمارا قبول فرمائیے تاکہ آپ اسے ایچیوں کی مدارات اور دعوت اور تحفہ و ہدایا میں خرچ کریں۔ آپ نے یہ سن کر انتظار فرمایا اور جبریل امین علیہ السلام یہ آیت لائے ﴿قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى﴾ (سورۃ الشوری: ۲۳) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قریب زمانہ وفات تک آپ کو استطاعت معمولی مصارف کے ادا کرنے کی بھی نہ تھی۔ تو کیوں کر سمجھ میں آسکتا ہے کہ ایسی تنگی کے زمانے میں اور ایسی تکلیف کے وقت میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فے کے مال میں سے ایک بڑی جاگیر جس کی آمدنی ستر ہزار دینار کی ہو وہ اپنی بیٹی کو بخش دیں، اور ان تکلیف کا کچھ لحاظ نہ کریں۔

اگر حضرات شیعہ یہ کہیں کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے آئندہ کے خیال سے یہ جاگیر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بخش دی تھی، مگر آمدنی آپ ہی صرف فرماتے تھے اور خود حضرت سیدہ قوت مالا یموت کے بقدر لے کر سب فی سبیل اللہ خرچ کر دیا کرتی تھیں۔ مگر یہ جواب قابل اطمینان نہ ہوگا، اس لیے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر منظور نہ تھا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس سے متمتع ہوں یا فراغ حاصل کریں تو ضرورت ہی کیا تھی کہ نام کے لیے جاگیر ان کے نام کر دیتے اور آئندہ کے خیال سے اپنے اس عمل سے ایک ایسا نمونہ قائم کرتے جو بظاہر نبوت کی شان کے خلاف تھا اور نیز آئندہ کے خیال سے ستر ہزار دینار کی جاگیر دینے کا آپ کو خیال کیوں ہوتا جب کہ خداوند تعالیٰ نے آپ سے فرمایا ہو، جیسا کہ خود شیعوں کی روایت سے ظاہر ہے:

((یا أحمد ان احببت ان تكون اورع الناس فازهد فی الدنيا

وارغب فی الاخرة وخذ من الدنيا خفا من الطعام والشراب

واللباس ولا تدخر لغد و اجعل نومك صلوة وطعامك

الجوع و قال الله يا أحمد ان المحبة للفقراء والتقرب اليهم

قال يا رب و من الفقراء قال رضوا بالقليل و صبروا على
الجوع و شكروا على الرخاء و لم يشكوا جوعهم و لا
ظمائهم .))

”اے احمد! اگر تم چاہتے ہو کہ لوگوں میں سے زیادہ متقی ہو تو دنیا کو چھوڑو اور
آخرت کی رغبت کرو اور طعام، پانی و لباس دنیا کی اشیاء سے کم حاصل کرو اور کل
کے لیے نہ جمع کرو، اپنی نیند کو نماز کرو اور بھوک کو اپنا طعام۔ اور کہا اللہ تعالیٰ نے
کہ اے احمد! فقراء سے محبت اور ان سے قربت حاصل کرو، آپ نے عرض کیا کہ
فقراء کون لوگ ہیں؟ فرمایا: وہ ہیں جو تھوڑی شے پر راضی ہوں اور بھوک پر صبر
کریں اور فراخی میں شکر کریں اور اپنی بھوک پیاس کی شکایت نہ کریں۔“

(ناخ التواریخ کتاب اول از کتاب دو صفحہ ۷۴۲)

اور نیز ”من لا يحضره الفقيه“ میں منجملہ ان وصایا کے جو آپ نے حضرت علی رضی اللہ
کو کی تھیں، ایک یہ بھی وصیت لکھی ہے:

((يا على ثلاث من حقائق الايمان الاتفاق من الاقتتار

وانصافك الناس من نفسك و بذل العلم من المتعلم .))

”اے علی! ایمان کی حقیقتیں تین ہیں محتاجی میں بھی خرچ کرنا، لوگوں کے ساتھ

انصاف کرنا اور علم سیکھانا۔“

اور نیز یہ بھی حدیث کہ آپ نے فرمایا:

((تكون امتي في الدنيا على ثلاثة اطباق اما اطباق امام الطبق

الاول فلا يحبون جمع المال و ادكاره و لا يسعون في افتناءه

واحتكاره و انما رضوا من الدنيا سد جرمه و ستر عورة

و غناهم فيها ما بلغ بهم الاخرة فاولئك الامنون الذين لا

خوف عليهم و لا هم يحزنون .))

”یعنی میری امت دنیا میں تین قسم کی ہوگی اول وہ کہ جمع مال اور ثروت کو پسند نہ کریں گے اور دنیا کی اشیاء سے صرف بھوک روکنے اور عورت چھپانے کے بقدر کفایت کریں گے، اور دولت عقبیٰ کو شرط غنا جانیں گے، یہی لوگ ایمان والے ہیں، جن پر نہ کچھ خوف اور نہ غم ہوگا۔“

اگر بالفرض ہم ان باتوں میں سے کسی بات کو خیال میں نہ لائیں اور یہ سمجھ کر کہ رسول خدا ﷺ نے آئندہ کا خیال فرما کر اور خلفاء کے ظلم و ستم سے جس کا علم ان کو شیعوں کے قول کے موافق تھا، اندیشہ کر کے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک دے دیا ہو اور اس سے گویہ مقصود نہ ہو کہ وہ خود اپنی ذات میں اسے صرف کریں بلکہ آپ کو اطمینان تھا کہ وہ سب خدا کی راہ میں خرچ کر دیا کریں گی، مگر عزت اور حرمت قائم رکھنے کے لیے فدک کا دینا مصلحتاً مناسب جانا ہو۔ مگر سیرت نبوی اس خیال کو ہمارے دل میں آنے نہیں دیتی۔ اس لیے کہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کے برتاؤ اپنے عزیزوں کے ساتھ کیا تھا اور ان کے لیے کچھ آئندہ کی فکر نہیں فرماتے تھے، اور کسی خیال سے بھی زہد، توکل اور ایثار علی النفس کے سوائے کچھ ان کے واسطے جمع نہ کرتے تھے تو ہمارے خیال میں کسی طرح نہیں آتا کہ آپ نے کسی لحاظ سے بھی ایسی بڑی جاگیر اپنی بیٹی کو عطا کر دی ہو۔ جب ہم آپ کی سیرت پر غور کرتے ہیں تو آپ کی ساری زندگی میں ہم یہی دیکھتے ہیں کہ آپ نے توکل اور ایثار علی النفس کو خود اپنی ذات سے ایک عمدہ نمونہ قائم کیا اور اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں کو بھی اس کا عمدہ سبق سکھلایا، اگر خمس ملا تو اس میں سے صرف بقدر قوت لایموت کے اپنے اور اپنے عزیزوں کے لیے لے کر باقی سب خدا کی راہ میں صرف کر دیا اور ملکی مصالح اور جہاد کی ضرورتوں میں صرف فرمایا، اگر فے میں سے بڑی آمدنی کی جائیداد ہاتھ آئی تو وہ بھی اپنے ہی پیاروں کو دے دی اور ایسے وقت میں جب کہ مصیبت اور تنگی چاروں طرف سے مسلمانوں کو گھیرے ہوئے تھی اور ہر جانب سے الجوع الجوع (بھوک بھوک) کی صدا آرہی تھی۔ ایک طرف تو مسلمان بنا سواری کے پیادہ پاجہاد کو چلے جا رہے تھے، دوسری جانب سے اصحاب صفہ، فقرا اور مساکین پر دو دروز کے فاقے

ہو رہے تھے۔ ان کے بدن پر کپڑا تھا کہ ستر عورت کرتے، اور نہ ان کے پاس ہتھیار تھے کہ جہاد میں شریک ہوتے۔ ایسی حالت میں پیغمبر خدا ﷺ اور پیغمبر بھی ایسے پیغمبر جو دنیا کو ترک دنیا کی تعلیم دے رہے ہوں، اور ایثار علی النفس کا سبق خلق خدا کو سکھا رہے ہوں، اس فکر میں کہ ان کے رشتہ داروں کو آئندہ تکلیف نہ ہو اور ان کے لیے بچے ان کے بعد تکلیف نہ اٹھائیں اور اس خیال سے ستر ہزار دینار کی جاگیر ان کے لیے علیحدہ کریں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ باتیں آپ کی سیرت مبارکہ سے کیوں کر مطابق ہوں گی اور نبوت کی شان اس سے کیوں کر ظاہر ہوگی اور دنیا آپ کی نبوت کا عمدہ اثر کیوں کر پڑے گا۔

اب رہا یہ امر کہ آیا سیرت نبوی وہی تھی جس کا ہم نے نقشہ کھینچا ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے کہ شیعوں اور سنیوں کی کتابیں اس سے بھری پڑی ہیں، اور کوئی بات اس کے خلاف معلوم نہیں ہوتی۔ چنانچہ اور باتوں کو جانے دو وہ معاملہ جو خود حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے پیش آیا اسی سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، چنانچہ اس کی تصدیق میں ہم چند روایتیں لکھتے ہیں۔

۱۔ کتاب قرب الاسناد میں امام جعفر صادق سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: جناب امیر المؤمنین اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پیغمبر خدا ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ گھر کی خدمت باہم ان میں تقسیم کر دی جائے۔ آپ نے گھر کے اندر کام حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے اور باہر کا جناب امیر کے متعلق کیا فقط۔ اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ گھر اور باہر کا کام خود دونوں حضرات کرتے تھے، کوئی خادم یا خادمہ بہت دنوں تک مدد دینے کے لیے بھی نہ تھے۔

۲۔ راوی کہتے ہیں کہ بیان کیا مجھ سے علی بن محمد بن حسن قزوینی المعروف بابن مقبرہ نے کہ انہوں نے کہا کہ بیان کیا مجھ سے محمد بن عبد اللہ حضرمی نے انہوں نے جندل بن واثق سے انہوں نے عمر بن عمر مازنی سے انہوں نے عبادہ کلینی سے انہوں نے حضرت جعفر بن محمد سے انہوں نے اپنے والد سے انہوں نے حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہ سے انہوں نے فاطمہ صغریٰ سے انہوں نے حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ سے انہوں نے اپنے بھائی

حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے، آپ کا بیان ہے کہ میں نے اپنی والدہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو دیکھا کہ وہ ہر شب جمعہ محراب عبادت میں کھڑی ہو جاتیں اور مسلسل رکوع و سجود میں مشغول رہتیں یہاں تک کہ سپیدہ سحر نمودار ہو جاتا اور میں نے سنا وہ نام بنام مومنین و مومنات کے لیے دعا فرماتیں اور ان کے لیے بہت بہت دعا کرتیں، مگر اپنے لیے کوئی دعا نہ کرتیں، ایک مرتبہ میں نے عرض کیا مادرِ گرامی جس طرح آپ دوسروں کے لیے دعا فرماتی ہیں اپنے لیے کیوں نہیں کرتیں؟ تو انہوں نے فرمایا: پہلے پڑوسی پھر اپنا گھر۔

(ترجمہ علل الشرائع صفحہ ۱۳۷ مترجم مولوی حسین امداد صاحب ناشر نظامی پریس لکھنؤ ۲۰۰۳ء)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کو ایثار علی النفس کا درجہ یہاں تک حاصل تھا کہ اپنے کام پر ہمسایہ کے کام کو مقدم سمجھتی تھیں اور ان کو اپنے اوپر ترجیح دیتی تھیں۔

۳۔ راوی کہتے ہیں کہ بیان لیا مجھ سے احمد بن حسن قطان نے انہوں نے کہا کہ بیان کیا مجھ سے ابوسعید حسن بن علی سکری نے انہوں نے کہا کہ بیان کیا مجھ سے حکم بن اسلم نے انہوں نے کہا کہ بیان کیا مجھ سے ابن علبہ نے روایت کرتے ہوئے حریری سے انہوں نے ابی ورد بن تمامہ سے اور انہوں نے حضرت علی علیہ السلام سے روایت کی کہ آپ نے بنی سعد کے ایک شخص سے فرمایا میں تمہیں اپنا اور فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہما کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ میرے گھر میں تھیں، وہ گھر کا سارا کام خود کرتی تھیں، آپ نے پانی کے گھڑے اتنے اٹھائے کہ سینہ مبارک پر اس کے نشان پڑ گئے، یہاں تک چکی پیسی کہ آپ کے دست ہائے مبارک کی کھال سخت ہو گئی، اور یہاں تک گھر میں جھاڑودی کہ آپ کے کپڑے غبار آلود ہو جاتے اور کھانا پکانے کے لیے اس قدر آگ پھونک پھونک کر روشن کی کہ دھوئیں سے کپڑے کالے پڑ گئے۔ ان سب باتوں کی وجہ سے ان کی صحت کو شدید ضرر پہنچا تو میں نے کہا کہ آپ اپنے پدر بزرگوار کے پاس جائیں اور ایک خادمہ کی درخواست کریں تاکہ ان کاموں کی تکلیف سے

نجات مل جائے۔ چنانچہ میرے کہنے پر وہ نبی ﷺ کے پاس گئیں تو دیکھا کہ آپ سے کچھ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں، فاطمہ کو ان لوگوں کے سامنے کچھ کہتے ہوئے شرم آئی اور واپس آ گئیں۔ نبی ﷺ سمجھ گئے کہ یہ ضرور کسی کام سے آئی تھیں۔ دوسرے دن آپ ہمارے گھر تشریف لائے اور فرمایا: اے فاطمہ! تم کل محمد کے پاس کسی کام سے آئی تھیں؟ میں نے عرض کیا میں بتاؤں یہ کیوں گئی تھیں۔ مشکلیں بھرتے بھرتے ان کے سینے پر داغ اور چکی چلاتے چلاتے ہاتھوں میں آبلے پڑ گئے، پھر اتنی جھاڑو دی کہ کپڑے غبار آلود ہو گئے اور ہانڈی کے نیچے اتنی مرتبہ پھونک پھونک کر آگ جلائی کہ ان کے کپڑے کالے ہو گئے، تو میں نے کہا تھا کہ آپ اپنے پدر بزرگوار کے پاس جائیں اور ان سے ایک خادمہ کی درخواست کریں تاکہ تمہیں ان زحمتوں سے نجات مل جائے۔ آپ نے فرمایا کہ پھر میں تم کو ایسی چیز کیوں نہ بتا دوں جو تمہارے لیے خادمہ سے بھی بہتر ہو، ایسا کرو کہ جب تم لوگ سونے لگو تو تینتیس (۳۳) مرتبہ سبحان اللہ، تینتیس (۳۳) مرتبہ الحمد للہ اور چونتیس (۳۴) مرتبہ اللہ اکبر کہہ لیا کرو۔ یہ سن کر حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے عرض کیا میں اللہ اور اس کے رسول کے فرمان پر راضی و خوش ہوں، میں اللہ اور اس کے فرمان پر راضی و خوش ہوں، میں اللہ اور اس کے رسول کے فرمان پر راضی و خوش ہوں۔

(اردو ترجمہ علل الشرائع صفحہ ۲۸۸-۲۸۹ از شیخ صدوق ناشر نظامی پریس لکھنؤ)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ باوجود اس محبت کے جو انہیں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ تھی اور باوجود دیکھنے اس تکلیف اور محنت کے جو انہیں گھر کے کام کاج کرنے میں ہوتی تھی، نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان غریبوں اور مسکینوں کو چھوڑ کر اپنے اہل و عیال کے لیے آسائش کا سامان مہیا کریں اور ایسے وقت میں جب کہ اور بہت سے ضروری کام درپیش تھے اور مسلمان مفلس و محتاج۔ تو آپ اپنی بیٹی کو ایک خادم دیتے شان نبوت یہی تھی، اور رسالت کی تصدیق اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کی عظمت اور آل رسول کے مکارم اخلاق کا

ثبوت انہیں باتوں سے ہوتا ہے۔

۴۔ کتاب عیون الاخبار میں حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اسماء بنت عمیس کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ پیغمبر خدا ﷺ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے اور ان کی گردن میں ایک گلو بند سونے کا دیکھا جسے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فے میں سے ان کے لیے خریدا تھا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اے فاطمہ! کیا لوگ نہ کہیں گے کہ فاطمہ محمد کی بیٹی جبارہ یعنی مغرور امیروں کا ساز یور پہنتی ہے؟ یہ سنتے ہی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اسی وقت اسے توڑ دیا اور بیچ ڈالا، اور اس سے ایک غلام خرید کر اسے آزاد کر دیا۔ اس بات سے آنحضرت ﷺ نہایت خوش ہوئے۔

۵۔ کافی میں زرارہ امام باقر سے روایت کرتے ہیں کہ پیغمبر خدا ﷺ کی عادت تھی کہ جب آپ سفر کا ارادہ کرتے تو اپنے ہر ایک گھر والے سے رخصت ہوتے مگر سب سے آخر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو الوداع کہتے اور انہیں کے گھر سے سفر کو تشریف لے جاتے اور جب سفر سے واپس آتے تو پہلے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دیکھنے کو تشریف لاتے۔ ایک وقت ایسا ہوا کہ پیغمبر ﷺ کسی سفر پر گئے اور جناب امیر نے فے سے کچھ حصہ پایا اور اسے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا اور پھر خود پیغمبر خدا ﷺ سے جا ملے۔ جناب امیر کی غیبت میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے دو کنگن چاندی کے بنائے اور ایک پردہ اپنے دروازے پر لٹکایا۔ جب پیغمبر خدا ﷺ پھر مدینے میں واپس تشریف لائے اور مسجد سے اپنی عادت کے موافق سیدھے فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں آئے، فاطمہ رضی اللہ عنہا خوش خوش آپ کی طرف دوڑیں، رسول خدا ﷺ نے جوں ہی آپ کے ہاتھ میں وہ کنگن دیکھے اور دروازے کے پردے پر نظر کی ویسے ہی بغیر اس کے کہ بیٹھیں واپس تشریف لے گئے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اسے دیکھ کر رونے لگیں اور سوچا کہ ان چیزوں سے پہلے تو رسول اللہ ﷺ کی یہ عادت نہ تھی، اس لیے فوراً پردے کو دروازے سے اتار لیا اور دونوں کنگن ہاتھ سے نکال لیے اور حسنین رضی اللہ عنہما کو بلا کر ایک کے ہاتھ میں کنگن اور

دوسرے کے ہاتھ میں پردہ دیا اور فرمایا کہ اسے پیغمبر خدا ﷺ کی خدمت میں لے جاؤ اور بعد سلام کے میری طرف سے عرض کرو کہ آپ کے پیچھے ان چیزوں کے سوا ہم نے کچھ نہیں بنایا ہے، اب یہ آپ کی خدمت میں حاضر ہیں جو چاہیں کیجیے۔ جب حسنین رضی اللہ عنہما ان چیزوں کو لے کر پہنچے اور اپنی ماں کا پیغام ادا کیا تو آپ ﷺ نے دونوں کے منہ چومے اور زانوئے مبارک پر بٹھالیا اور حکم دیا کہ دونوں کنگن چاندی کے توڑ دیے جائیں اور پھر اہل صفہ کو جو منجملہ مہاجرین کے تھے اور مسجد نبوی کے حجرے میں مسکینیت اور گھر نہ ہونے کی وجہ سے پڑے رہتے تھے بلایا اور ان پر وہ چاندی کے ٹکڑے تقسیم کر دیے۔ پھر انہیں اصحاب صفہ میں سے ایک آدمی کو کہ ننگا تھا جس کے پاس کوئی کپڑا بدن چھپانے کے لیے بھی نہ تھا، آگے بلایا اور اس دروازے کے پردے میں سے ایک ٹکڑا پھاڑ کر اسے دے دیا اور اسی طرح ہر ایک کو تھوڑا تھوڑا کمر اور ستر عورت کے اندازہ سے ایک ایک پارچہ اس پردے کا عنایت کیا، اور پھر آپ نے فرمایا کہ خدا رحمت بھیجے فاطمہ رضی اللہ عنہا پر اور ان کو حلہائے جنت عطا کرے بعوض اس بخشش کے جو انہوں نے کی اور بعوض اس پردے کے جس سے چند مسلمانوں کی ستر پوشی ہوئی اور جنت کا زیور پہنائے بعوض ان کنگنوں کے جو انہوں نے غرباء میں تقسیم کیے۔

جس طرح پر پیغمبر خدا ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خادمہ کے مانگنے کے بدلے تسبیح سکھائی اور اسے دنیاوی آرام کا نعم البدل بتایا، یہی معاملہ آپ نے اپنے دوسرے عزیز جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی کیا اور اس کا قصہ یہ ہے کہ جس دن خیبر فتح ہوا حضرت جعفر بن ابی طالب جو مکے سے حبشہ کو ہجرت کر گئے تھے آئے اور یہ ایک عمدہ اتفاق تھا کہ ان کا آنا اور خیبر کا فتح ہونا ایک ہی دن ہوا۔ جب پیغمبر خدا ﷺ کو خیبر کی فتح اور اسی کے ساتھ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے آنے کا مشردہ معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ان دونوں خوشیوں میں سے کس کو ترجیح دوں۔ جعفر کے آنے کو یا خیبر کے فتح ہونے کو۔ جب جعفر آپ کے پاس پہنچے تو آپ نے اٹھ کر ان کو گلے لگا لیا اور ان کی آنکھوں کو چوما اور فرمایا کہ اے جعفر!

کیا تمہیں کچھ نہ دوں اور کیا میں تمہیں کچھ عطا نہ کروں؟ جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا: ضرور، یا رسول اللہ! اس پر لوگوں نے گمان کیا کہ آپ ان کو سونا چاندی دیں گے اور لوگ مشتاق ہوئے کہ دیکھیں کہ آپ کیا عطا فرماتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ اے جعفر! میں تم کو ایسی نماز نہ سکھلاؤں کہ اگر تم اسے پڑھ لو اور گوتم جہاد سے بھی بھاگ گئے ہو اور مثل سمندر کے جھاگ کے گناہ ہوں، تب بھی وہ اس کے پڑھنے سے بخش دیے جائیں۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ہاں۔ اس پر آپ ﷺ نے ان کو وہ نماز سکھائی جو جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی نماز سے مشہور ہے۔ اس میں چار رکعتیں ہیں دو دو سلاموں سے، جس کی پہلی رکعت میں الحمد کے بعد سورہ زلزال اور دوسری میں الحمد کے بعد والعیاذات تیسری میں سورہ نصر اور چوتھی میں قُلْ هُوَ اللَّهُ اور بعد قراءت کے ہر رکعت میں پندرہ مرتبہ سبحان اللہ، الحمد لله، لا اله الا الله اور اللہ اکبر۔ اور ہر رکوع میں اور سجدہ سے سر اٹھانے کے بعد اسی کو دس مرتبہ پڑھنے کا ارشاد ہے۔

پس کیا کوئی انصاف پسند آدمی آنحضرت ﷺ کے اس برتاؤ کو جو آپ کا اپنے عزیزوں کے ساتھ تھا دیکھ کر ایک لحظہ کے لیے بھی یہ خیال کر سکے گا کہ وہ پاک رسول ﷺ جو دو چاندی کے کنگن اپنی بیٹی کے ہاتھ میں دیکھ کر ان کے پاس سے چلے آئیں اور اس کا دیکھنا گوارا نہ کریں۔ اور وہ دنیا سے نفرت کرنے والا پیغمبر جو اپنے جگر گوشہ کے دروازے پر ایک پردے کا پڑا ہونا دیکھ نہ سکے اور اسے ناپسند کرے اور وہ زہد و توکل اور ایثار علی النفس کی تعلیم دینے والا باپ جو اپنی بیٹی کے پانی بھرنے کے داغ سینہ پر دیکھ کر اور اس کے مبارک اور پیارے ہاتھ چمکی کے پینے سے خستہ دیکھنے پر بھی ایک خادمہ سے مدد نہ کرے اور اپنے بھائی جعفر رضی اللہ عنہ کے حبشہ سے واپس آنے پر خیبر کی فتح سے کم خوش نہ ہو اور اس خوشی میں بجائے درہم و دینار دینے کے انہیں خاص نماز کی تعلیم دیں اور اسی کو وہ تمام دنیا کی دولت سے بڑھ کر سمجھے۔ اور وہ نبی اپنی اولاد کی بزرگی، عزت اور فضیلت کے سامان اسی بات میں دیکھے اور ان کو دنیاوی تکالیف سے روحانی آسائش اور وجدانی اطمینان حاصل کرنے کے لیے عبادت اور تسبیح سکھائے اور اسی کو تمام رنجوں اور مصیبتوں کا نعم البدل سمجھے، اور جو کچھ اسے ملے وہ فقراء

اور مساکین اور خدا کی راہ اور اعلاء کلمۃ اللہ اور ادائے فرائض جہاد وغیرہ میں صرف کرے۔ اس کی نسبت کوئی یہ گمان کر سکے گا یا اس کی ایسی پاک ذات سے اس بات کی امید ہوگی کہ وہ ایک ایسی بڑی جاگیر جس کی آمدنی ستر ہزار دینار کی ہو وہ اپنی بیٹی کو بخش دے اور سب کو ان کے حقوق سے محروم کر دے لا واللہ ، لا واللہ لا ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ ان هذا الا افک مبین .

چونکہ آیت ﴿وَإِذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّ﴾ کے متعلق ہم پوری بحث کر چکے، اس لیے اب ہم اس سے بحث کرتے ہیں کہ آیا فدک حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے قبضے میں تھا اور بعد وفات آنحضرتؐ کے وہ غصب کر لیا گیا اور حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا نے اس کا دعویٰ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے کیا اور ان سے شہادت مانگی گئی اور وہ رد کی گئی اور فدک ان کو واپس نہ دیا گیا۔ اس کے متعلق حضرات امامیہ کیا ثبوت ہمارے یہاں کی روایتوں سے پیش کرتے ہیں اور خود ان کے یہاں اس کے متعلق کیا روایتیں بیان کی گئی ہیں۔



کیا فدک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے قبضے میں تھا؟

علمائے امامیہ اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ نے فدک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کیا تو اس کا ہبہ نامہ بھی لکھ دیا اور قبضہ بھی کرادیا۔ کوئی روایت جس سے ثابت ہو کہ درحقیقت فدک پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا قبضہ تھا، سنیوں کی کتابوں سے پیش نہیں کی گئی، مجرد دعویٰ ہی کیا گیا ہے۔ جناب علم الہدیٰ سید مرتضیٰ شافی میں فرماتے ہیں کہ صاحب کتاب، یعنی قاضی عبدالجبار جو اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ فدک حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کے قبضے میں تھا ہم اس کے انکار پر کوئی حجت نہیں دیکھتے۔ اور گوجیسا وہ کہتے ہیں یہ ٹھیک ہے کہ اگر فدک آپ کے قبضے میں ہوتا تو وہ انہیں کا سمجھا جاتا۔ لیکن یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ وہ ان کے قبضے سے نہیں نکال لیا گیا اور جب کہ یہ بات طرق مختلفہ سے ثابت ہے کہ آیت ﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ﴾ کے نازل ہونے پر پیغمبر خدا ﷺ نے آپ کو فدک دے دیا تو بغیر حجت کے اس کے آپ کے قبضے میں ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا۔ مگر کوئی ثبوت اس بات کا کہ درحقیقت فدک پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا قبضہ تھا اور ان کی طرف سے کوئی وکیل انتظام کے لیے مامور تھا اور اس کی آمدنی آپ کے پاس آتی تھی ہمارے یہاں کی کتابوں سے پیش نہیں کیا۔

جناب مولانا دلدار علی صاحب نے بھی سوائے قیاسی دلیل کے کوئی روایت عماد الاسلام میں بیان نہیں فرمائی، جو کچھ انہوں نے ارشاد فرمایا وہ یہ ہے:

((المسئلة الثانية ان فدك كانت في يد فاطمة يدل عليه اطباق

الامامية ورواياتهم كما مرت وايضا يدل عليه انك قد عرفت

ان روایات العامة والامامية تدل ان النبي كان مامورا باعطاء فاطمة فدك و كان واجبا عليه ان يرفع يده عنها و يجعلها تحت يد فاطمة و عقد الهبة بدون تسليم فدك لها لا يصح ولا يخرج رسول الله عما في ذمته من اداء امر الله تعالى لان الهبة وايضا يدل عليه ما مر من عبارة علمائهم المسطور في الطرائف وايضا يدل على كون فدك في يد فاطمة انه استشهد ابوبكر فاطمة على ما ادعته من النحلة فلولم يكن في يدها لكان الاستشهاد عبثا لانه معلوم ان الهبة بدون القبض كلاهبة فح كان كافيا لابي بكر ان يقول انك و ان كنت صادقة في ذلك لكنك تعلمين ان الهبة بدون القبض لا تفيد بل كان هذا اولي لان في الاستشهاد من بنت رسول الله ورد شهادة امرأتين من اهل الجنة قباحة لا يقدر احد على اخفائها.))

”دوسرا مسئلہ اس بیان میں ہے کہ فدک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے قبضے میں تھا اور اس پر تمام امامیہ متفق اور ان کی روایتیں اس پر شاہد ہیں اور نیز یہ بات بھی اس پر دلالت کرتی ہے کہ سنیوں اور شیعوں کی روایت سے یہ معلوم ہو چکا کہ پیغمبر ﷺ مامور تھے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک عطا کریں اور ان پر واجب تھا کہ اپنا قبضہ اٹھا کر اسے فاطمہ کے قبضے میں دے دیں کیونکہ عقد ہبہ بغیر اس کے کہ فدک فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا جائے پورا نہیں ہو سکتا تھا اور نہ پیغمبر خدا تعالیٰ حکم الہی سے بغیر اس کے سبکدوش ہو سکتے تھے۔ اس لیے کہ ہبہ بغیر قبض و تسلیم کے مثل ہبہ نہ کرنے کے ہے۔ اور سوا اس کے اس بات کے ثبوت میں وہ بھی ہے جو سنیوں کے علماء کی عبارت سے طرائف میں بیان کیا گیا ہے۔ اور نیز قبضہ فدک کی یہ بھی دلیل ہے کہ ابوبکر نے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے شہادت مانگی، اگر

فدک آپ کے قبضے میں نہ ہوتا تو شہادت کا طلب کرنا عبث ہوتا، اس لیے کہ یہ بات معلوم ہے کہ ہبہ بغیر قبضہ کا عدم ہے اور ایسی حالت میں ابو بکر کا یہ کہہ دینا کافی تھا کہ آپ اپنے دعوے میں سچی ہیں، مگر اتنا تو آپ بھی جانتی ہیں کہ ہبہ بغیر قبضہ کے مفید نہیں، اور یہ کہنا بہ نسبت طلب اور رد کرنے شہادت کے بہتر تھا، فقط۔“

اس میں جناب مجتہد صاحب نے کچھ اشارہ طرائف کی طرف کیا ہے مگر وہ کتاب بھی اس وقت ہمارے سامنے ہے اس میں کوئی روایت بھی ہمارے یہاں کی منقول نہیں ہے جس سے فدک پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے قبضہ ہونے کا ثبوت ہوتا ہو۔ اگر کوئی روایت اس میں ہوتی تو ہم ضرور جہاں طرائف کی روایتوں کا ذکر ہے، وہاں اسے بیان کرتے۔ اگر کسی کو شک ہو تو طرائف دیکھے اور کوئی ایک روایت بھی اس میں سے اس کے متعلق پیش کرے۔

حضرت مجتہد صاحب قبلہ کا کسی روایت کا نقل نہ کرنا خود ظاہر کرتا ہے کہ کوئی روایت قبضہ فدک کے متعلق انہوں نے نہیں پائی، اگر جھوٹی سچی قوی یا ضعیف اصلی یا وضعی کوئی بھی روایت وہ پاتے تو اسے نقل کرنے سے نہ چھوڑتے۔ رہا یہ قیاس آپ کا کہ اگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا قبضہ نہ کر دیا ہوتا تو عقد ہبہ کیوں کر پورا ہوتا، کیونکہ بغیر قبضے کے ہبہ کا ہونا نہ ہونا برابر ہے، اس بنیاد پر تھا آیت ﴿وَإِذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّتْ﴾ کے نازل ہونے پر فدک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا گیا، مگر جب ہم نے اس بنیاد ہی کا باطل ہونا ثابت کر دیا تو جو کچھ آپ نے یہ قیاس لگایا تھا وہ بھی باطل ہو گیا اور قبضہ کا نہ ہونا اس وجہ سے ہمارے بیان کا مؤند ہوا، اس لیے کہ اگر حقیقت میں آپ نے فدک ہبہ کر دیا ہوتا تو ضرور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس پر قابض ہوتیں اور قبضہ ایک ایسی جاگیر پر جس کی آمدنی چالیس یا ستر ہزار دینار کی ہو اور تین چار برس تک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس پر قابض رہی ہوں اور ان کے کارندے اس پر مامور ہوں اور جاگیر کی آمدنی اور غلہ ان کے پاس آتا رہا ہو ایسا معاملہ نہ تھا کہ وہ پوشیدہ رہتا یا کسی کے چھپائے چھپ سکتا۔ بلکہ شہادت وغیرہ پیش کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہ ہوتی، اگر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے شہادت طلب فرمائی ہوتی تو اس کا یہ جواب کافی تھا کہ القبض دلیل

الملك (قبضہ ملکیت کی دلیل ہے) اور اسی کو آپ مہاجرین و انصار کے سامنے نہایت مدلل طور پر بیان فرما سکتی تھیں کہ خلیفہ وقت کا ظلم و ستم میرے اوپر دیکھو کہ کل تک جس جاگیر پر میرا قبضہ تھا اور جس کا محاصل میرے پاس آتا تھا اسے انہوں نے غصب کر لیا اور میرا قبضہ اٹھا دیا اور مجھ سے شہادت مانگتے ہیں، کیا قبضے سے بڑھ کر کوئی شہادت ہو سکتی ہے، اور کیا میرا قبضہ کوئی پوشیدہ امر تھا۔ کیا آپ کے اس ارشاد سے صحابہ رضی اللہ عنہم جمعین پر کوئی اثر نہ ہوتا اور وہ خلیفہ وقت کے حکم کو ظالمانہ اور جاہلانہ نہ سمجھتے۔ اور بالفرض ان سب نے ستانے پر ہی کمر باندھی تھی اور سب یہ ظلم کرنے پر آمادہ اور شریک تھے تو آپ کی حجت تو ختم ہو جاتی، جب کہ ایسی بڑی شہادت کے ہوتے ہوئے آپ نے پیش نہیں فرمائی اور قبضے پر زور نہیں دیا اور اپنے تصرف کا اظہار نہیں فرمایا تو یہ امر خود اس بات کے لیے کافی ہے کہ حقیقت میں فدک پر آپ کا قبضہ ہوا ہی نہیں تھا اور جب قبضہ نہ تھا تو ہبہ کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔



آیا فدک کے ہبہ کا دعویٰ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے کیا یا نہیں؟

جتنی کتابیں امامیہ کی ہم نے اوپر بیان کی ہیں ان سب پر ہم ایک نظر ڈالتے ہیں کہ ان میں اس دعوے کے متعلق حضرات امامیہ نے کیا ثبوت پیش کیا ہے۔

شانی میں بجواب معنی کے جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مضمون زیادہ تر یہ ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا فدک کے دعوے میں حق پر تھیں اور ان کا مانع اور شہادت کا طلب کرنے والا خطا پر۔ کیونکہ بوجہ معصومہ ہونے کے آپ شہادت کی محتاج نہ تھیں، محض آپ کا دعویٰ ہی کافی تھا۔ اور پھر آپ کی عصمت پر قرآنی شہادت آیت ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾ سے پیش کی ہے اور خزیمہ ذوالشہادتین کا قصہ نقل کر کے بہت پر زور تقریر میں اس بات کو بیان کیا ہے کہ کیا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ان سے بھی کم تھیں اور کیا سوائے حق کہنے کے دوسرا شبہ ان کی طرف ہو سکتا تھا مگر کوئی صحیح روایت جس سے ثابت ہوتا کہ آپ نے فدک کے ہبہ کا دعویٰ کیا اور اس پر شہادت طلب کی گئی پیش نہیں فرمائی۔ البتہ دو بے سرو پا روایتیں پیش کی ہیں مگر ان کی نسبت بھی یہ نہیں لکھا کہ وہ کس کتاب سے انہوں نے لی ہیں بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ روایتیں خود شیعوں کی ہیں۔

چنانچہ پہلی روایت جو صفحہ ۲۳۵ شانی مطبوعہ ایران میں درج ہے، یہ ہے:

((وقد روی ان ابابکر لما شهد لها امیر المومنین کتب بتسلیم فدک الیہا فاعترض عمر قضیتہ فخرق ما کتبہ روی ابراهیم ابن محمد الثقفی عن ابراهیم بن میمون قال حدثنا عیسیٰ بن

عبداللہ بن محمد بن عمر بن علی بن ابی طالب عن ابیہ عن
 جدہ علی قال جاءت فاطمة الى ابی بکر و قال ان ابی
 اعطانی فذک و علی یشہد و ام ایمن قال ما کنت لتقولی الا
 الحق نعم قد اعطیتک آباہا و دعا بصحيفة من اديم فکتب لها
 فیہا فخرجت فلقيت عمر قال من این جئت یا فاطمة قالت
 من عند ابی بکر اخبرته ان رسول الله اعطانی فذکا و علی
 بشہد و ام ایمن فاعطانیہا و کتبہا لی فاخذ عمر منها الكتاب
 ثم رجع الى ابی بکر فقال اعطیت فاطمة فذکا و کتب بہا لها
 قال نعم قال عمر علی یجرالی نفعه و ام ایمن امرأة و بصق
 فی الصحيفة و محاہا، و قدروی هذا المعنی من وجوه
 مختلفة من اراد الوقوف علیہا و استقصائہا اخذها من
 مواضعها و لیس لهم ان یقولوا انها اخبار احاد ان كانت
 كذلك فاقبل احوالہا ان یوجب الظن و یمنع من القطع علی
 خلاف معناها ۱۲ شافی))

”مروی ہے کہ جب امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کی گواہی دی تو ابو بکرؓ
 نے ان کو فدک دینے کو لکھ دیا اور عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے حکم پر اعتراض کر کے اسے
 پھاڑ ڈالا۔ چنانچہ ابراہیم بن محمد ثقفی نے روایت کی ہے ابراہیم بن میمون سے اور
 اس نے عیسیٰ بن عبداللہ بن عمر بن علی بن ابی طالب اور عیسیٰ نے اپنے باپ
 عبداللہ سے اور عبداللہ نے اپنے باپ محمد سے اور محمد نے اپنے دادا علی بن ابی
 طالب سے کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ابو بکر کے پاس آئیں اور فرمایا کہ میرے باپ نے
 مجھے فدک دیا تھا اور اس کے گواہ علی اور ام ایمن ہیں۔ ابو بکر نے کہا کہ آپ بھی تو
 سچ ہی فرماتی ہیں اچھا اس کو میں آپ کو دیتا ہوں، اور پھر ایک چمڑے کا کاغذ منگا

کر اس پر لکھ دیا، وہاں سے فاطمہ رضی اللہ عنہا نکلیں تو عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی، عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ کہاں سے آرہی ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس سے، میں نے ان سے یہ کہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فدک دے دیا تھا، علی اور ام ایمن اس کے گواہ ہیں تو ابو بکر نے فدک مجھے دے دیا اور وثیقہ لکھ دیا، عمر اس وثیقہ کو لے کر ابو بکر کے پاس لوٹ آئے اور کہا کہ تم نے فاطمہ کو فدک دے کر وثیقہ بھی لکھ دیا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں، عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: علی رضی اللہ عنہ تو اپنے ہی لیے چاہتے ہیں اور ام ایمن صرف ایک عورت ہے اور وثیقہ پر تھوک کر اسے مٹا دیا..... یہ روایت مختلف طور پر مروی ہے جو شخص معلوم کرنا چاہے وہ کتابوں میں دیکھے۔ اہل سنت یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ اخبار احاد ہے، اور اگر ہو بھی تو کم سے کم اس کا حال یہ تو ہوگا کہ ظن کی موجب ہوگی اور اپنے خلاف مضمون کے یقینی ہونے کی مانع ہوگی.....“ انتہی

دوسری روایت عمر بن عبدالعزیز کی رد فدک کے متعلق ہے، جیسا کہ فرماتے ہیں:

((وقد روی محمد بن زکریا الغلابی عن شیوخہ عن ابی المقدم ہشام بن زیاد مولیٰ آل عثمان قال لما ولی عمر بن عبدالعزیز فرد فدک علی ولد فاطمة وکتب الی والیہ علی المدینة ابی بکر و عمر بن حزم یامرہ بذلك فکتب الیہ ان فاطمة قد ولدت فی آل عثمان وآل فلان وآل فلان فکتب الیہ اما بعد فانی لو کنت کتبت الیک امرک ان تذبح شاة لسالتنی جماء او قرناء او کتبت الیک ان تذبح بقرة لسالتنی مالونہا فاذا ورد علیک کتابی هذا فاقسمها بین ولد فاطمة من علی ، قال ابو المقدم فنقمت بنو امیة ذلك علی عمر بن عبدالعزیز و عاتبوه فیہ و قالوا له هجنت فعل الشیخین و خرج الیہ عمر

بن عبس فی جماعة من اهل الكوفة فلما عاتبوه على فعله قال انکم جهلتم و علمت و نسیتم و ذكرت ان ابابکر محمد بن عمر و بن حزم حدثنی عن ابیه عن جدہ ان رسول اللہ ﷺ قال فاطمة بضعة منی لیسخطنی ما ما یستخطها و یرضنی ما یرضیها وان فذک كانت صافیة علی عهد ابی بکر و عمر ثم صار امرها الی مروان فوهبها لابی عبدالعزیز فورثتها انا و اخوتی فسألتم ان یرضونی حصتهم منها فممنهم من باعنی و منهم من وهب لی حتی استحقها فرأیت ان اردھا علی ولد فاطمة فقالوا ان ابیت الھذا فامسك الاصل واقسم الغلة ففعل - ۱۲ .)) (شافی صفحہ ۲۳۶)

”محمد بن زکریا غلابی اپنے شیوخ سے روایت کرتے ہیں اور ان کے شیوخ ابوالمقدام ہشام بن زیاد مولیٰ آل عثمان سے، کہ ہشام کہتے ہیں: جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو انہوں نے آل فاطمہؓ پر فدک واپس کر دیا اور ابو بکر عمر و بن حزم والی مدینہ کو یہ لکھ بھیجا کہ اگر میں تجھ کو یہ لکھوں کہ ایک بکری ذبح کرنا تو تو پوچھے گا کہ منڈی ہو یا سینگ دار، یا یہ لکھوں کہ ایک گائے ذبح کرنا تو تو اس کا رنگ دریافت کرے گا۔ جب یہ میرا پروانہ تیرے پاس پہنچے تو فدک کو اولاد فاطمہ رضی اللہ عنہا و علی رضی اللہ عنہ پر تقسیم کر دے۔ ابوالمقدام کہتے ہیں کہ بنو امیہ نے اس امر سے عمر بن عبدالعزیز پر نہایت شور مچایا اور کہا کہ تم نے شیخین رضی اللہ عنہم کے فعل کی حقارت کی اور عمر بن عبس ایک لشکر کوفہ کالے کران پر چڑھ آیا، جب لوگوں نے بہت غوغا کیا تو عمر بن عبدالعزیز نے کہا کہ تم لوگ کچھ نہیں جانتے اور میں جانتا ہوں، تم کو یاد نہیں مجھے یاد ہے، مجھ سے ابو بکر محمد بن عمر و بن حزم نے اپنے باپ سے اور ان کے باپ نے ان کے دادا سے یہ حدیث بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا ہے کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا میری جگر پارہ ہے جس سے اس کو رنج پہنچے اس سے مجھ کو پہنچتا ہے اور جس شے سے وہ خوش ہوں اس سے میں خوش ہوتا ہوں اور فدک ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کسی کا نہ تھا، پھر مروان اس کا مالک ہوا اور اس نے اس کو میرے باپ عبدالعزیزؓ کو ہبہ کر دیا، پھر اس کے وارث میں اور میرے بھائی ہوئے، میں نے ان سے یہ درخواست کی کہ وہ اپنا حصہ میرے ہاتھ فروخت کر دیں، ان میں سے بعض نے میرے ہاتھ فروخت کر دیا اور بعض نے مجھے ہبہ کر دیا یہاں تک کہ میں سب کا مالک ہو گیا۔ اب میں نے بہتری یہ دیکھی کہ میں اس کو اولاد فاطمہ رضی اللہ عنہا پر واپس کر دوں، اس پر لوگوں نے کہا کہ اگر تم نے یہ کیا ہے تو اس کی اصل اپنے قبضے میں رہنے دو اور غلے کو تقسیم کرادو، تو عمر بن عبدالعزیزؓ نے یوں ہی کر دیا۔“

صاحب تخلص شافی نے بھی انہی دونوں روایتوں کو بیان کیا ہے، مگر انہوں نے بھی منقول عنہ کتاب کا حوالہ نہیں دیا، جس سے معلوم ہو کہ انہوں نے سنیوں کی کسی کتاب سے نقل کیا ہے۔ اور ان دونوں روایتوں کے نقل کرنے کے بعد بلا حوالہ سند مامون کا قصہ کہ انہوں نے فدک آل فاطمہ کو واپس کیا لکھا ہے:

((كما قال و مما يدل على صحة دعويها النحل و ان ذلك كان معروفا شائعا ما كان من عمر بن عبدالعزیز من رد فدك على و لدها لما تبين ان الحق كان معها و كذلك فعل المامون فانه نصيب لها و كيلا و كيلا لابي بكر و جس للقضاء و حكم لها بذلك و لولم يكن الامر معروفا معلوما كما فعلوا ذلك مع موضعهم من الخلافة و سلطانهم الذي ارادوا حفظ قلوب الرعية و ان لا يفعلوها يوى الى تنفيرهم و ليس لاحدهم ان ينكر ذلك يدفعه لان الامر فى ذلك اظهر

من ان یخفی .))

”کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دعویٰ ہبہ کی صحت پر دلالت کرنے والی باتوں میں سے ایک عمر بن عبدالعزیز کا قصہ ہے کہ انہوں نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد کو فدک واپس کر دیا جب کہ ان پر یہ ثابت ہو گیا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا حق پر تھیں۔ اور اسی طرح مامون نے کیا کہ انہوں نے ایک مجلس قائم کی اور اس میں ابوبکر و فاطمہ رضی اللہ عنہا دونوں کی طرف سے وکیل مقرر کیے اور خود فیصلہ کیا اور فدک آل فاطمہ رضی اللہ عنہا کو واپس کر دیا، اگر یہ بات کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فدک کا دعویٰ کیا ہے مشہور اور معلوم نہ ہوتی تو باوجود خلیفہ ہونے اور صاحب سلطنت ہونے کے وہ کبھی ایسا نہ کرتے، کیونکہ خیال رعایا کے دلوں کا ان کو کرنا ضروری تھا اور ایسی بات جس سے وہ شور مچائیں کبھی نہ کرتے، اگر ان کے نزدیک وہ بات حق نہ ہوتی، اور اس بات کا تو کوئی انکار کر ہی نہیں سکتا، کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ چھپائے چھپ نہیں سکتی۔“

(دیکھو صفحہ ۲۰۹ مطبوعہ ایران)

علامہ حلی نے کتاب ”کشف الحق“ میں ایک روایت واقدی کی لکھی ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

((وروی الواقدی وغیرہ من نقلة الاخبار عندہم و ذکر وہ فی الاخبار الصحیحة ان النبی لما افتتح خیبر اصطفی قری من قری الیہود فنزل جبرئیل بہذہ الآیة وات ذا القربی حقہ فقال محمد و من ذوی القربی وما حقہ قال فاطمة فدفع الیہا فدک والعوالی فاستغلتها حتی توفی ابوہا علیہ الصلوٰة والسلام فلما بویع ابوبکر منعہا و کلمتہ فی ردہا الیہا و قالت انہما لی فابی و دفعہا الیہا فقال ابوبکر فلا امنعک مادفع الیک ابوک فارادان یکتب لہا کتابا فاستوقفہ عمر بن الخطاب و

قال انها امرأة قطالبا بالبينه على ما ادعت فامرها ابوبكر فجاءت
بام ايمن و اسماء بنت عميس مع على فشهد و ابذلك فكتب
لها ابوبكر فبلغ ذلك عمر فاخذ الصحيفة فمحاها فحلفت ان
لا تكلمها و ماتت وهي ساخطة عليهما .))

”واقدي اور دوسرے ناقلین اخبار اہل سنت نے روایت اور اخبار صحیحہ میں ذکر کیا ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے جب خیبر کو فتح کیا تو ایک گاؤں یہود کے دیہات سے اپنے لیے خاص کر لیا اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بحکم خدا دے دیا۔ (جتنا حصہ فدک کے متعلق تھا وہ اوپر ہم نقل کر چکے) آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد جب ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے فدک سے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو روکا، اس پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس کی واپسی کا دعویٰ کیا اور کہا کہ یہ میرا ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کی واپسی سے انکار کیا، پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا جو آپ کے باپ نے آپ کو دیا ہے اسے میں نہیں روک سکتا اور ارادہ کیا کہ ان کو اس کے متعلق سند لکھ دیں مگر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ان کو اس سے روکا اور کہا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ایک عورت ہیں جس بات کا وہ دعویٰ کرتی ہیں، اس کے لیے ان سے شہادت مانگنی چاہیے اس پر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے شہادت پیش کرنے کا حکم دیا تب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ام ایمن رضی اللہ عنہا اور اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کو مع علی رضی اللہ عنہ کے لائیں اور ان سب نے شہادت دی، تب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سند لکھ دی مگر جب یہ خبر عمر کو پہنچی تو انہوں نے اس کاغذ کو لے کر مٹا دیا، اس پر جناب سیدہ رضی اللہ عنہا نے قسم کھائی کہ ان دونوں سے بات نہ کریں گیں اور ہمیشہ ان سے ناراض رہیں۔“ (احقاق الحق صفحہ ۱۴۸)

دوسری روایت مامون کی لکھی ہے جس میں کتاب یا سند کا حوالہ نہیں، اور وہ یہ ہے:

((جمع المامون الف نفس من الفقهاء و تناظروا وادی بحثهم

الی رد فدك على العلوبين من ولدها فرد عليهم .))

”کہ مامون نے ہزار فقہوں کو جمع کیا اور فدک کے متعلق مباحثہ کرایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فدک فاطمہ رضی اللہ عنہا کا ثابت ہوا اور مامون نے اسے فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد کو واپس کر دیا۔“

تیسری روایت متعلق قصہ عمر بن عبدالعزیز کے ابوہلال عسکری کی کتاب اخبار الاوائل سے بیان کی ہے اور وہ یہ ہے: ❶ ابوہلال عسکری نے کتاب ”اخبار الاوائل“ میں ذکر کیا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز اول ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے فدک فاطمہ رضی اللہ عنہا کے وارثوں کو واپس کیا۔ علامہ فضل بن روز بہان نے اپنی کتاب ”ابطال الباطل“ میں جو ”کشف الحق“ کے جواب میں لکھی ہے ان بے بنیاد قصوں کی نسبت یہ جواب دیا ہے: ((واما دعویٰ فاطمة رَضِيَ اللهُ عَنْهَا فلم يصح في الصحاح ويذكرونها نقلة الاخبار من ارباب التواريخ و مجرد نقلهم لا يصير سببا للقدح في الخلفاء .)) ”کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا دعویٰ کرنا صحاح میں ثابت نہیں ہے اور جو کچھ اہل تواریخ اور ناقلان اخبار ذکر کرتے ہیں فقط ان کے غلط سلف نقل کر دینے سے خلفاء پر الزام عائد نہیں ہو سکتا۔ اس کے جواب میں قاضی نور اللہ شوستری نے ”احقاق الحق“ میں کوئی مستند روایت پیش نہیں کی اور دو بے پروا قول نقل کیے ہیں، ایک معجم البلدان سے کہ اس میں فدک کے ذکر میں یہ لکھا ہے: ((وهي التي قالت فاطمة رَضِيَ اللهُ عَنْهَا ان رسول الله نحلها فقال ابو بكر اريد بذلك شهود او لها قصة)) کہ فدک وہی ہے جس کے لیے فاطمہ رضی اللہ عنہا نے دعویٰ کیا تھا

❶ و ذکر ابوہلال العسکری فی کتاب اخبار الاوائل ان اول من رد فدک علی ورثة فاطمة عمر بن عبدالعزیز و کان معاویہ قطعها لمروان بن الحکم و عمر بن عثمان و یزید ابنہ ثلاثا ثم غصبت فردھا علیہم المہدی ثم غصبت فردھا علیہم المامون ثم قال عن ابی ہلال ثم غصبت فردھا علیہم الواصل ثم غصبت فردھا علیہم المستنصر المعتمد ثم غصبت فردھا المعتضد ثم غصبت فردھا الراضی مع ان ابابکر اعطی جابر بن عبد اللہ عطیة ادعاها علی رسول الہ من غیر بینة و حضر جابر بن عبد اللہ و ذکر ان النبی ﷺ وعده ان بحثوا له ثلاث حیثات من مال البحرین فاعطاها ذلك و لم يطالبه البینة مع ان العدة لا یجب الوفاء یها والہبة للولد مع التصرف توجب التملیک فاقبل المراتب انه کان تجری فاطمة مجراهما۔ ۱۲۔ (احقاق الحق صفحہ ۱۴۸)۔

کہ پیغمبر خدا ﷺ نے انہیں ہبہ کر دیا ہے اور جس پر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ اس کے لیے شہادت چاہیے اور اس کا ایک قصہ ہے۔ دوسرے عمر بن عبدالعزیز اور مامون کے رد فدک کا قصہ۔ مگر اس میں بھی کسی منقول عنہ کتاب یا سند کا ذکر نہیں کیا، مجملاً یوں لکھا ہے کہ ❶ جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو انہوں نے عامل مدینہ کو فدک کے واپس کرنے کو اولاد فاطمہ رضی اللہ عنہا پر لکھ بھیجا۔ پھر فدک عمر بن عبدالعزیز کی خلافت کے زمانے میں اولاد فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہی قبضے میں رہا، جب یزید بن عبدالملک خلیفہ ہوا تو اس نے پھر لے لیا اور پھر بنو امیہ ہی کے قبضے میں رہا یہاں تک کہ ابو العباس سفاح خلیفہ ہوا کہ اس نے حسن بن حسن بن علی بن ابی طالب کو دے دیا اور وہی اس کے منتظم رہے اور علویوں میں اس کو تقسیم کرتے رہے۔ جب منصور خلیفہ ہوا اور اس پر اولاد حسن نے خروج کیا تو اس نے ان سے پھر لے لیا۔ پھر جب مہدی بن منصور خلیفہ ہوا تو اس نے اس کو ان پر واپس کر دیا، پھر اس کو موسیٰ ہادی نے لے لیا اور جو اس کے بعد خلیفہ ہوئے زمانہ مامون تک اسی طرح رہا۔ پھر مامون کے پاس اولاد علی نے آکر اس کا مطالبہ کیا تو اس نے حکم دیا کہ یہ ایک وثیقہ پر لکھ دیا جائے اور وہ لکھ کر مامون کو سنا دیا گیا۔ وعبل شاعر کھڑا ہوا اور اس نے یہ شعر پڑھا: ((اصبح وجہ الزمان الخ)) یعنی آج زمانہ بہت خوش ہے کہ مامون نے بنی ہاشم کو فدک دے دیا۔ اور فدک کے باب میں بہت سا اختلاف پیغمبر خدا ﷺ کی وفات کے بعد راویوں کی وجہ سے ہوا ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی خواہش

❶ لما ولی عمر بن عبدالعزیز الخلافة كتب الی عامه بالمدينة یامر برد فدک الی ولد فاطمة رضی اللہ عنہا فكانت فی ایدیہم ایام عمر بن عبدالعزیز فلما ولی یزید بن عبدالملک قبضها فلم یزل فی ایدی بنی امیة حتی ولی ابو العباس السفاح الخلافة فدفعها الی الحسن بن الحسن بن علی بن ابی طالب فكان هو القیم علیها یفرقها فی بنی علی بن ابی طالب فلما ولی منصور و خرج علیہ بنو الحسن قبضها عنہم فلما ولی المہدی بن المنصور الخلافة اعاده علیہم ثم قبضها موسیٰ الہادی و من بعده الی ایام المامون فجاء بنو علی فطالبها فامر ان یسجل لهم بها فکتب السجل و قرأ علی المامون فقام و عبلی و انشد شعراً: صبح وجہ الزمان قد ضحکا برد مامون ہاشما فدکا۔ وفی فدک اختلاف کثیر فی امرها بعد النبی ﷺ من رواة اخبروها بحسب الالهواء و شدة۔ انتہی۔

کے موافق روایت کرتا ہے۔ مجسم البلدان کی روایات یہاں تک تھی۔

اور ایک روایت شیخ جلال الدین سیوطی کی ”تاریخ الخلفاء“ سے لکھی ہے، جس میں عمر بن عبدالعزیز کے رد فدک کا مختصراً بیان ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ ❶ یہ امر خلاف ہے اس روایت کے بھی جو شیخ جلال الدین سیوطی شافعی نے تاریخ الخلفاء میں لکھی ہے کہ ابوبکر و عمر کے زمانہ میں فدک ویسا ہی رہا، پھر اس میں مروان نے قطع و برید کی۔ اور عمر بن عبدالعزیز نے فدک بنی ہاشم کو لوٹا دیا اور یہ بھی مروی ہے کہ اولاد فاطمہ کو لوٹا دیا۔ ❷

اور سوائے اس روایت کے اگرچہ اور کوئی سند جناب قاضی نور اللہ نے پیش نہیں کی مگر اجمالاً ایک مقام پر لکھا ہے کہ اور بھی بہت سے طریقوں سے ہبہ کے دعوے کے روایتیں بیان کی گئی ہیں ((کما قال واما دعوی النحلة فقد مر نقلا عن کتاب المعجم و قدروی من عدة طرق من طریق غیرها ایضاً.)) (احقاق الحق صفحہ ۱۱۲)

اور دوسرے مقام پر فرمایا کہ ❸ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا دعویٰ فدک کا ایسا مشہور ہے کہ کتب صحاح میں اس کی صحت کے طلب کی ضرورت نہیں کیوں کہ اس کی خبر تمام علماء، جہلاء اور عوام خواص سب کو معلوم ہے اور اب سے پانچ سو برس پہلے بعض حکماء شعراء نے بھی اس کو مثل میں بیان کیا ہے:

❶ کما قال وایضاً یناقض ذلك مارواه الشيخ جلال الدین السیوطی الشافعی فی تاریخ الخلفاء من ان فدک کان بعد ذلك حیوة ابی بکر ثم عمر اقتطعها مروان عمر بن عبدالعزیز قد رد وفد کا الی بنی ہاشم، وروی ایضاً انه ردھا الی اولاد فاطمة۔ انتھی۔ (احقاق الحق صفحہ ۱۱۲۔)

❷ قاضی نور اللہ شوستری نے اوپر کی روایت غلط بیان کی ہے بلکہ تاریخ الخلفاء میں عمر بن عبدالعزیز کا بیان درج ہے کہ رسالت مآب ﷺ کی وفات کے بعد باغ فدک حضرات شیخین کی نگرانی میں رہا اور لوگوں کو گواہ رہنا کہ جس طرح اس باغ کی ملکیت رسول اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں تھی اب بھی اسی طرح جمہور مسلمانوں کی ملکیت رہے گی۔ مترجم تاریخ الخلفاء..... (اقبال احمد)

❸ واما دعوی فاطمة فدک کا اشہر من ان یطلب صحتها فی کتب الصحاح اذ قد عم خبرها العلماء و الجہال والسادة والاتباع والرؤس والا ذناب و قد مثل به مثل ذلك بخمس مائة سنة بعض حکماء الشعراء بقوله: ملک بخششا یندہ در حرماں میمون خدمتت چوں خلافت ے علی بودہ ست و ے زہرا فدک۔ واما ذکرہ من ان مجرد نقل اهل التواریخ لایصیر حجة و سبباً للقدح فی الخلفاء ⇐⇐⇐

ملک بخشائیندہ درحرمان میمون خدمت

چوں خلافت بے علی بودست بے زہرا فدک

مجیب نے جو یہ ذکر کیا ہے کہ صرف ارباب تواریخ کا نقل کر دینا قدح خلفاء کے لیے کافی نہیں، تو اس میں یہ بات ہے کہ اگر کتب تواریخ میں وہ امور نقلی ہیں جو اور کتابوں سے بھی ثابت ہوتے ہیں تو وہ ضرور صحیح ثابت ہوں گے اور اصول میں یہ مقرر ہو چکا ہے کہ نقلیات میں ایک شخص عادل کی خبر کافی ہوتی ہے اور اگر شہرت اور تواتر معنوی کی حد کو پہنچ جائے تو تعدیل کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ مصنف حلی نے یہاں صرف واقدی ہی کی روایت سے تمسک نہیں کیا بلکہ اور راویوں کی بھی تصریح کی ہے اور ان اخبار کا بھی اشارہ کیا ہے جو خصم کے نزدیک صحیح مانے گئے ہیں اور اس کی تائید اس مناظرے سے کی ہے جو ایام مامون میں اس بارہ میں ہزار فقہاء کے سامنے ہوا تھا اور ان دو حدیثوں سے جو سید الحفاظ اور صدر الائمہ اہل سنت سے مروی ہیں اس کی تکمیل کی ہے، مصنف حلی کے ذمے اسی قدر ہے کہ نقل کی تصحیح کر دیں اگر خصم انکار کرے، ورنہ خصم کو چاہیے کہ اپنے انکار سے باز آئے.....“ انتہی

﴿﴾ ﴿﴾ ﴿﴾ ففیہ ان ما اشتمل علیہ کتب التواریخ من جملة العلوم النقلیة فیثبت بما ثبت به غیرہ من الامور النقلیة وقد تقرر فی الاصول ان خبر العدل الواحد فی النقلیات فیثبت به واذا بلغ الی حد الشهرة والتواتر المعنوی استغنی عن التعدیل والمصنف لم يتمسک ههنا بمجرد رواية الواقدی بل صرح بغيره اشار لی کثرة الاخبار المحکوم علیها الصتحة عند الخصم وایده بما روی من مناظرة الف نفس من الفقهاء ایام المومن فی ذلك واکمله بالحديثین المرویین عن سید الحفاظ اهل السنة و صدرائمتهم و لیس علیہ الاتصیح النقلان انکر الناصب و جوده و الا فلیترك شغبه و حجوده۔ انتہی۔ کلام سید الحفاظ کی روایت کا جو احقاق الحق میں ذکر کیا ہے وہ متعلق دعویٰ فدک کے نہیں ہے، بلکہ ہبہ فدک کے ہے جسے ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں اور صدر الائمہ کی روایت بھی دعویٰ ہبہ سے غیر متعلق ہے، چنانچہ یہ دونوں روایتیں جو کشف الحق میں بیان کی گئیں ہیں یہ ہیں: و قدروی سید الحفاظ ابن مردویہ باسناده الی ابی سعید قال لما نزلت وات ذا القربی حقه دعا رسول اللہ ﷺ فاعطاها فدک، و قدروی صدر الائمة اخطب خوارزم الموفق بن احمد المکی قال و مما سمعت فی معاویہ باسنادی عن ابن عباس قال قال رسول اللہ ﷺ یا علی ان اللہ زوجک فاطمة و جعل صداقها الارض فمن مشی علیها مبغضا لہامشی حراما۔ احقاق الحق صفحہ ۱۴۸ منہ۔

اگرچہ اس میں قاضی نور اللہ شوستری صاحب فرماتے ہیں کہ مصنف نے اور روایتوں کا بھی حوالہ دیا ہے، مگر ہمیں تو کوئی روایت کتاب ”کشف الحق“ میں نہیں ملی، سوائے ان کے جن کو ہم نے نقل کیا ہے۔ اور نہ قاضی صاحب نے اپنی ”احقاق الحق“ میں سوائے مجرد دعویٰ شہرت کے کوئی روایت یا کوئی سند پیش فرمائی ہے۔ دونوں کتابیں ایران کے چھاپے کی موجود ہیں جو کوئی چاہے دیکھ لے۔

طرائف میں بھی اگرچہ جناب ثقہ الاسلام علی بن طاووس حلی نے بہت کچھ قلم کا زور دکھایا اور بہت کچھ زبان درازی فرمائی ہے مگر کوئی صحیح روایت اور کوئی معتبر سند آپ نے بھی دعویٰ ہبہ فدک کے متعلق پیش نہیں فرمائی ہے ان کی طرائف مطبوعہ بمبئی میں صفحہ ۶۷ سے تا صفحہ ۸۰ فدک کا بیان ہے، مگر اس میں متعلق اس دعویٰ کے ماسوائے قصہ مامون اور عمر بن عبدالعزیز کی حکایت کے ایک روایت بھی درج نہیں ہے جس میں یہ لکھا ہو کہ حضرت سیدہ نے فدک کا دعویٰ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے کیا اور انہوں نے شہادت طلب کی اور اسے رد کیا، صرف معمولی سب و شتم پر کفایت کی ہے اور عوام کے دلوں میں شبہ پیدا کرنے کے لیے قوت بیانیہ کا زور دکھایا ہے کہ باوجودیکہ فاطمہ رضی اللہ عنہا معصوم تھیں اور باوجودیکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شہادت دی اور حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا نے بھی تصدیق کی مگر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان سب کو جھوٹا قرار دیا اور ان کے دعویٰ کی نسبت یہ خیال کیا کہ وہ اپنے نفع حاصل کرنے کے لیے حقوق مسلمین کا غصب کرنا چاہتی ہیں تاکہ ان باتوں کو سن کر لوگ پریشان ہوں اور ان کے دلوں میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی طرف سے شبہ پیدا ہو۔ مگر جب کہ نہ دعویٰ ہبہ کا پیش ہوا، نہ شہادت مانگی گئی نہ اس کی تردید ہوئی۔ بلکہ یہ سب جھوٹی باتیں اور بنائی ہوئی کہانیاں ہیں اور جن علماء اہل سنت نے اس کا جواب دیا ہے وہ محض علی سبیل التسلیم والفرض ہے۔ تو یہ ساری خوش تقریریں لغو اور فضول ہیں۔ ان کا کام تھا کہ اول بنیاد ثابت کرتے اور کوئی ایک بھی صحیح روایت متعلق اس دعویٰ کے ہمارے یہاں سے پیش فرماتے، پھر جو دل چاہتا وہ لکھتے اور جو کچھ قلم کا زور دکھانا تھا وہ دکھاتے..... بے بنیاد بات اور جھوٹے قصے یہ ساری لن ترانیاں ہنسنے

کے قابل ہیں۔

ان کی کتاب طرائف میں جو روایت متعلق قصہ مامون کے ہے، اسے وہ یوں لکھتے ہیں کہ عجیب و غریب ماجرا یہ ہے کہ باوجودیکہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ ﷺ کی بزرگی اور جلالت و طہارت کا اقبال کرتے بھی تھے مگر ان پر طرح طرح کے ظلم و ستم کیے اور ان کی اور ان کے باپ کی حرمت کو پامال کیا۔ اور باوجودیکہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا زنان اہل جنت کی سیدہ ہونے کی تصدیق کرتے تھے، مگر ان کو ایذا دی اور طرح طرح سے ستایا۔ چنانچہ اہل توارخ نے ایک طویل رسالہ میں جو مامون خلیفہ عباسی کے حکم سے موسم حج میں لکھا اور پڑھا گیا تھا، اس کا بیان کیا ہے۔ صاحب تاریخ عباسی نے اسے لکھا ہے۔ اور رومی فقیہ صاحب تاریخ نے بھی ان حوادث میں جو ۲۱۲ء میں ہوئے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور اس کا قصہ یہ ہے کہ اولاد حسنین رضی اللہ عنہما نے اپنے قبضے کا مرافعہ خلیفہ مامون کے سامنے اس دعوے سے پیش کیا کہ فدک اور عوالی ان کی والدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد نبی ﷺ کا تھا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان کے قبضے سے ان کو ناحق لے لیا۔ اب ہم اپنا انصاف اور ظلم کا انکشاف چاہتے ہیں۔ اسی پر مامون نے علماء حجاز و عراق کے دو سو علماء کو جمع کیا اور نہایت تاکید کی کہ ادائے امانت اور اتباع صدق کریں اور ورثہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جو قضیہ پیش کیا تھا ان سے بیان کی اور پوچھا کہ تمہارے نزدیک اس باب میں کوئی حدیث صحیح ہے۔ اور اسی باب میں بہت سے لوگوں نے بشر بن الولید اور واقدی اور بشر بن غیاث سے حدیثیں روایت کی ہیں کہ یہ سب ان احادیث کو اپنے نبی محمد ﷺ تک پہنچاتے ہیں کہ جب خیبر فتح ہو گیا تو آپ نے یہود کے گاؤں میں سے ایک گاؤں اپنے لیے خاص کر لیا۔ پھر جبریل علیہ السلام نازل ہوئے اور یہ آیت لائے ﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ﴾ آپ نے پوچھا کہ ذی القربى کون لوگ ہیں اور ان کا حق کیا ہے؟ جبریل نے کہا کہ فاطمہ ہیں، پھر آپ نے فدک ان کو دے دیا، اس کے بعد پھر عوالی ان کو دیا، اور یہ مستقل طور پر فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس رہے۔ یہاں تک کہ ان کے والد بزرگوار محمد ﷺ نے وفات پائی۔ جب ابو بکر سے بیعت ہوئی تو انہوں نے کہا کہ میں اس شے کو جسے تمہارے باپ نے تم کو دی ہے روک

نہیں سکتا۔ اور یہ چاہا کہ ان کو ایک وثیقہ لکھ دیں کہ ابو بکر کو عمر بن خطاب نے ہوشیار کیا اور کہا کہ یہ ایک عورت ہیں ان سے گواہ طلب کرو۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ گواہ لاؤ۔ تو فاطمہ رضی اللہ عنہا ام ایمن اور اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہما کو مع علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے گواہ لائیں۔ پھر یہ خبر عمر کو پہنچی تو وہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس ماجرے کو ان سے کہا کہ ان سب نے گواہی ان کے دعوے کی دی اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لیے ایک وثیقہ لکھ دیا۔ عمر نے وہ وثیقہ لے لیا اور کہا کہ فاطمہ ایک عورت ہیں اور علی اس کے شوہر ہیں اپنا نفع چاہتے ہیں اور شہادت دو عورتوں کی بے مرد کی درست نہیں ہوتی۔ ابو بکر نے اس خبر کو فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہلا بھیجا۔ آپ نے قسم کھا کر فرمایا کہ خدا وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ ان لوگوں نے شہادت حق کی ادا کی تھی۔ پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ شاید آپ سچی ہوں لیکن اور گواہ لے آؤ جو اپنا نفع نہ چاہتا ہو۔ انہوں نے کہا کہ تم نے میرے باپ رسول اللہ ﷺ سے یہ نہیں سنا کہ فرماتے تھے کہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا اور ام ایمن رضی اللہ عنہما اہل جنت سے ہیں، دونوں نے کہا کہ ہاں، آپ نے کہا کہ جو عورتیں اہل جنت سے ہوں وہ باطل گواہی دے سکتی ہیں۔ پھر آپ خفا ہوتی ہوئی گھر لوٹ آئیں۔ اور اپنے باپ سے پکار کر کہتی تھیں کہ میرے باپ نے مجھ کو یہ خبر دی ہے کہ سب سے اول میں ان سے ملوں گی۔ قسم ہے خدا کی کہ میں اس کی شکایت ان سے کروں گی۔ پھر وہ مریض ہو گئیں اور علی رضی اللہ عنہ کو وصیت کی کہ ابو بکر اور عمران کی نماز نہ پڑھیں۔ اور آپ نے ان دونوں کو چھوڑ دیا اور ان سے بات نہ کرتی تھیں، حتیٰ کہ آپ کا انتقال ہو گیا اور علی و عباس رضی اللہ عنہما نے آپ کو رات میں دفن کیا۔ پس مامون نے اسی مجلس میں اسی دن اولاد فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک دے دیا۔ پھر دوسرے دن ایک ہزار علماء و فقہاء کو بلایا اور ان سے صورت حال بیان کی اور ان کو اللہ کا خوف دلایا اور ان سب نے آپس میں مناظرہ کیا۔ پھر ان کے دو فریق ہوئے۔ ایک فریق ان میں یہ کہتا تھا کہ ہمارے نزدیک شوہر اپنا نفع چاہتا ہے تو اس کی شہادت قبول نہیں ہو سکتی، لیکن ہم خیال کرتے ہیں کہ حلف فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ان کے دعویٰ کو ثابت کر دیا تھا مع دو عورتوں کی شہادت کے..... اور ایک فریق یہ کہتا تھا کہ ہم یمن و شہادت پر حکم لازم نہیں سمجھتے

لیکن زوج کی شہادت جائز ہے۔ اور ہم اس کو اپنا نفع چاہنے والا نہیں خیال کرتے اور ان کی شہادت دو عورتوں کی شہادت پر فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دعوے کو ثابت کرتی ہے۔ غرض ان دونوں فریق کا باوجود اختلاف کے اس امر پر اتفاق تھا کہ فدک و عوالی کا استحقاق فاطمہ رضی اللہ عنہا کا تھا۔ اس کے بعد مامون نے ان سے فضائل علی رضی اللہ عنہ کو دریافت کیا۔ تو انہوں نے یہاں طرفہ جلیل بیان کیا ہے جو رسالہ مامون میں مذکور ہے۔ اور پھر ان سے فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حال دریافت کیا تو انہوں نے ان کے باپ سے ان کے بہت سے فضائل بیان کیے، پھر ام ایمن رضی اللہ عنہا اور اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہما کا حال دریافت کیا تو انہوں نے اپنے نبی محمد ﷺ سے روایت کی کہ یہ دونوں اہل جنت سے ہیں۔ مامون نے کہا: کیا یہ ہو سکتا ہے کہ یہ کہا جائے یا اعتقاد کیا جائے کہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ باوجود ورع و زہد کے فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لیے جھوٹی گواہی دیں، حالانکہ خدا و رسول ﷺ ان کے فضائل بیان کرتے ہیں۔ یا یہ ہو سکتا ہے کہ ان کے علم و فضل کا اعتقاد رکھ کر یہ کہا جائے کہ وہ ایسی شہادت دینے کو تیار ہو جائیں جس کا خود حکم نہ جانتے ہوں اور کیا یہ جائز ہو سکتا ہے کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا باوجود عصمت و عبادت اور نساء عالمین و نساء اہل جنت کے سیدہ ہونے کے جس کی تم روایت کرتے ہو ایسی شے طلب کریں جو ان کی نہ ہو اور تمام مسلمانوں پر ظلم پسند کریں اور اس پر لا الہ الا ھو کی قسم کھائیں۔ یا یہ جائز ہے کہ ام ایمن رضی اللہ عنہا اور اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہما جھوٹی گواہی دیں، حالانکہ وہ اہل جنت سے ہوں۔

بے شک فاطمہ رضی اللہ عنہا پر طعن کرنا کتاب اللہ پر طعن کرنا ہے اور دین میں الحاد ہے، کبھی ہو نہیں سکتا کہ یہ بات اس طرح ہوئی ہو۔ پھر مامون نے ان سے معارضہ اس حدیث سے کیا جسے انہوں نے روایت کیا ہے کہ علی بن ابی طالب نے بعد وفات آنحضرت ﷺ کے منادی کرائی کہ جس کسی کا رسول اللہ ﷺ پر قرضہ ہو یا کوئی وعدہ تو وہ میرے پاس آئے تو بہت سے لوگ آپ کے پاس آئے اور انہوں نے جو بیان کیا آپ نے بے گواہ طلب کیے ان کو دے دیا۔ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی اس قسم کی منادی کرائی تو جریر بن عبد اللہ نے آ کر پیغمبر ﷺ پر ایک وعدہ کا دعویٰ کیا اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بے گواہی کے اس کو دے دیا۔ اور پھر جابر بن عبد اللہ

نے آکر دعویٰ کیا کہ ان سے پیغمبر ﷺ نے وعدہ کیا تھا کہ ان کو مالِ بحرین میں سے ایک تہائی دیں گے جب بحرین کا مال آپ کی وفات کے بعد آیا تو ان کو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ایک تہائی مال دے دیا۔ ان دونوں نے دعویٰ بے گواہ کے کیا تھا۔ عبدالمحمود کہتے ہیں..... کہ اس حدیث کو حمیدی نے الجمع بین الصحیحین افراد مسلم کی نویں حدیث مسند جابر میں ذکر کیا ہے۔ اور یہ کہ جابر نے کہا کہ میں نے جو ان کا شمار کیا تو پانچ سو تھے، تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جابر سے کہا کہ اتنے ہی اور لے لو۔ عبدالمحمود کہتے ہیں کہ رسالہ مامون میں لکھا ہے کہ اس حدیث سے مامون نے نہایت تعجب کیا اور کہا کہ کیا فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ان کے گواہ جریر اور جابر پسران عبد اللہ کے برابر بھی نہ تھے؟ پھر مامون نے اس رسالہ کے لکھے جانے کی نہایت تاکید کی اور یہ کہ موسم حج میں سارے لوگوں کے سامنے پڑھا جائے۔ اور فدک و عوالی کو محمد بن یحییٰ الحسین بن علی بن الحسین بن علی بن الحسن بن علی بن ابی طالب کے قبضے میں کر دیا کہ اس میں وہ کاروبار کرتے اور ورثہ فاطمہ رضی اللہ عنہا پر تقسیم کر دیتے۔

عمر بن عبدالعزیز کا قصہ رد فدک کا ابو ہلال عسکری کی کتاب ”اخبار الاوائل“ سے اسی طرح پر لکھا ہے، جیسا کہ ”کشف الحق“ میں لکھا ہے۔

بحار الانوار میں بھی کوئی معتبر روایت دعویٰ ہبہ فدک کے متعلق ہمارے یہاں کی کتابوں سے پیش نہیں کی گئی۔

عماد الاسلام میں جناب مولانا دلدار علی صاحب نے بھی کوئی روایت باسناد صحیح اس دعویٰ کے ثبوت میں پیش نہیں فرمائی۔ آپ نے جو کچھ عماد الاسلام میں ارشاد فرمایا ہے اس میں ایک روایت تو وہ ہے جس میں مامون کے مباحثہ اور فدک کے رد کا قصہ ہے، اور اسے آپ نے طرائف سے بعینہ نقل فرمایا ہے، جیسا کہ خود چوتھے فائدے کے پہلے مسئلے میں لکھتے ہیں:

((وقال السيد علي بن طاووس في اطرائف و من الطرائف

(العجیبة .))

اور پھر آگے چل کر صواعقِ محرقہ اور جواہرِ العقدین سے ایک روایت حافظ ابن شبہ کی نقل کرتے اور فرماتے ہیں کہ تیسرا مسئلہ اس بیان میں ہے کہ آیا فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ۱ ہبہ کا دعویٰ کیا یا نہیں۔ اور اس دعویٰ کی صحت اس سے ہوتی ہے کہ صواعقِ محرقہ کے دوسرے باب اور اسی کتاب کے دوسرے حصے کے ساتویں ادب اور پندرہویں ذکر میں اور نیز سید سہمودی کی جواہرِ العقدین میں یہ روایت لکھی ہے کہ حافظ ابن شبہ نمیر بن حسان سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے زید بن علی سے جو امام باقر کے بھائی تھے بارادہ تہجین و تذلیل ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پوچھا کہ کیا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فدک چھین لیا تھا، تو حضرت نے جواب دیا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ ایک نرم دل آدمی تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی چیز میں رسول خدا ﷺ کے کچھ تغیر و تبدل کریں۔ ان کے پاس حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فدک مجھے دے دیا ہے۔ ابو بکر نے کہا کہ کیا اس پر تمہاری پاس کوئی گواہ ہے؟ وہ علی رضی اللہ عنہ کو لائیں، انہوں نے شہادت دی، پھر ام ایمن کو انہوں نے پیش کیا، انہوں نے اول تو یہ کہا کہ کیا تم اس بات کی

۱ اصل عبارت یہ ہے: المسئلة الثالثة هل فاطمة ادعت الخلة ام لا، يدل على صحة وقوع تلك الدعوى ما في الباب الثاني من الصواعق المحرقة و في الادب السابع من الذكر الخامس عشر من القسم الثاني و من جواهر العقدین للسید سہمودی اخرج الحافظ ابن شبہ عن النمیر بن الحسان قال قلت لزید بن علی هو اخو الباقر و انا ارید ان اہجن امر ابی بکر ان ابا بکر انتزع من فاطمة رضی اللہ عنہا فدک فقال ان ابا بکر کان رجلا رحیما و کان یکره ان ینزع شیئا ترکه رسول اللہ ﷺ فاتته فاطمة فقالت ان رسول اللہ اعطانی فدک فقال هل لك علی هذا بینة فجاءت بعلی فشہد لہا ثم جاءت بام ایمن فقالت ایس تشهدانی من اهل الجنة قال بلی قالت فاشہد ان النبی اعطاها فدک فقال ابو بکر لرجل و امرأة تستحقینہا الی آخر القصة۔ و فی الفصل الخامس من الباب الاول من کتاب الصواعق المحرقة و دعواہا انہ نحلہا قد کالم یات بینة الی بعلی و ام ایمن فلم یکمل نصاب البینة علی ان فی قبول شہادة الزوج لزوجته خلافا بین العلماء و عدم حکمہ بشاہد و یمین اما لعلہ لکونہ ممن لا یراہ کالکثیرین من العلماء و انہا لم تطلب الحلف مع من شہد لہما و زعمہم ان الحسن و الحسین و ام کلثوم شہدوا لہا باطل علی ان شہادة الفرع و الصغیرة غیر مقبولة۔ و فی المقصد الرابع من المرصد الرابع من المواقف السادس من شرح المواقف فان۔ قیل ادعت فاطمة انہ ﷺ نحلہا فدکا و شہد علی و الحسن و الحسین و ام کلثوم و الصحیح ام ایمن فرد ابو بکر شہادتهم، قلنا اما الحسن و الحسین و ام کلثوم فلقد صورہما نصاب البینة۔ ۱۲ اعماد الاسلام

گواہی نہیں دیتے کہ میں اہل جنت سے ہوں۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا بے شک۔ تب انہوں نے کہا کہ میں گواہی دیتی ہوں کہ فدک پیغمبر خدا ﷺ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو عطا کیا تھا۔ اس پر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کیا ایک مرد اور عورت کی گواہی سے دعویٰ ثابت ہو سکتا ہے..... الیٰ آخر القصة .

اس کے آگے کا پورا قصہ بیان نہیں کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ زید بن علی نے کہا کہ قسم ہے خدا کی کہ اگر یہ معاملہ میرے سامنے پیش ہوتا تو میں بھی اس میں وہی حکم دیتا جو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے دیا تھا۔ اور صواعق محرقہ کے باب کی پانچویں فصل میں یہ لکھا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا دعویٰ کہ آنحضرت ﷺ نے فدک ان کو بخش دیا تھا، ثابت نہیں ہوا اس لیے کہ سوائے علی رضی اللہ عنہ اور ام ایمن کے وہ اس پر اور کوئی گواہ نہیں لائیں اور نصاب شہادت پورا نہیں ہوا۔ سوا اس کے علماء میں اختلاف ہے کہ زوج کی شہادت زوجہ کے لیے قبول ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اور یہ گمان ان کا کہ حسنین اور ام کلثوم نے شہادت دی باطل ہے۔ سوا اس کے فرع کی شہادت اور نابالغ کی گواہی غیر مقبول ہے۔ اور شرح مواقف کے چوتھے مقصد میں یہ لکھا ہے کہ اگر یہ بات کہی جائے کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ہبہ فدک کا دعویٰ کیا اور علی و حسنین اور ام کلثوم رضی اللہ عنہم نے اور صحیح یہ ہے ام ایمن رضی اللہ عنہا نے شہادت دی اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اسے رد کیا تو اس کا جواب ہم یہ دیں گے کہ شہادت کا نصاب پورا نہیں ہوا..... انتھی

جناب مولانا دلدار علی صاحب نے اس کے سوا اور کچھ نہیں لکھا۔ اور چونکہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے یہ دلیل بھی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کی تھی کہ فدک میرے قبضے میں تھا۔ امید ہوتی تھی کہ اس کے متعلق جناب ممدوح عماد الاسلام جیسی مبسوط اور مشہور کتاب میں کوئی سند ہمارے یہاں سے پیش کریں گے مگر جو کچھ انہوں نے بیان فرمایا اس سے ثابت ہو گیا کہ اس باب میں کوئی ضعیف حدیث اور غیر معتبر روایت نام کے واسطے بھی انہوں نے نہیں پائی۔

عماد الاسلام کے بعد طعن الرماح جناب سید محمد صاحب قبلہ کی ایک ایسی کتاب ہے جس

کی نسبت خیال گزر سکتا ہے کہ اس میں ضرور دعویٰ ہبہ فدک کے ثبوت میں کوئی صحیح روایت درج ہوگی۔ مگر افسوس ہے کہ متوقعین کی یہ توقع بھی اس کے دیکھنے سے ناامیدی میں بدل گئی۔ جناب ممدوح نے سوائے اعادہ ان تاریخی اخبار کے جو ان کے متقدمین اور والد ماجد نے لکھے ہیں یا حوالہ دینے بعض اس قسم کی روایتوں اور اقوال کے کوئی ایک خبر یا ایک روایت بھی بہ اسناد صحیح ایسی پیش نہیں فرمائی جس سے اس دعوے کا ثبوت ہوتا۔ اور جس کی وجہ سے یہ کتاب بقول ان کے ہم مشربوں کے لاجواب سمجھی جاتی۔ بحر حال جناب ممدوح نے طعن الرماح میں جن اقوال اور روایات کو اپنے متقدمین کی کتابوں سے نقل کیا ہے اور جو تازہ اقوال خود پیش کیے ہیں، ان میں سے ایک روایت تو نمیر بن حسان کی ہے، جس میں حضرت زید سے فدک کے متعلق سوال کرنے کا ذکر ہے، جیسا کہ وہ فرماتے ہیں:

((ابن حجر درباب ثانی صواعق محرقہ و سید سہمودی در جواهر العقدین از حافظ ابن شبہ روایت کردہ واللفظ للاحیر عن النمیر بن حسان قال قلت لزید بن علی و انا ارید ان اہجن ابا بکر..... الخ.))

”ابن حجر نے صواعق محرقہ کے دوسرے باب میں اور سید سہمودی نے جواهر العقدین میں حافظ ابن شبہ سے نمیر بن حسان کی زبانی یہ روایت کی ہے کہ میں نے زید بن علی سے کہا کہ میرا ارادہ ہے کہ ابوبکر کو میں معتوب بناؤں۔“ اور ان الفاظ کے لکھنے کے بعد جو عماد الاسلام میں مذکور ہیں، آپ فرماتے ہیں:

((ایس روایت صریح ست دریں کہ جناب سیدہ نزدابی بکر آمدہ دعویٰ ہبہ فرمودہ و او گواہ و شاہد طلب نمود و جناب باب مدینة العلم و نفس رسول و ام ایمن کہ بنا بر حدیث متفق علیہ نبوی مبشر بہشت و بد و ابوبکر نیز بآن اقرار نمود ادائے شہادت کردند پس او قبول نہ کرد و گفت از گواہی يك

مرد و یک زن ثبوت حق نمی شود.....)) انتھی
 ”یہ روایت بالکل صریح ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ابو بکرؓ کے پاس موہو بہ
 باغ فدک کا دعویٰ کیا اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نے گواہ و شہادت طلب کیے اور حضرت
 علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا جو بنا بر حدیث نبوی جنتی تھے، انہوں نے
 شہادت دی مگر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یہ شہادت قبول نہیں کی اور فرمایا کہ ایک مرد اور
 ایک عورت کی گواہی سے حق ثابت نہیں ہوتا۔“

دوسری روایت ابو بکر جوہری کی جناب مجتہد صاحب نے ”شرح نہج البلاغۃ ابن
 ابی الحدید“ سے نقل کی ہے اور فرمایا ہے:

((وایضا ابو بکر جوہری کہ کنیت شریفش شاہد عدل
 نصب و تسنن اوست روایت کردہ قالت فاطمة رَضِيَ اللهُ عَنْهَا ان رسول
 ايمن تشهد ان رسول الله اعطاني فدك فقال لها يا بنت رسول
 الله والله ما خلق الله خلقا احب الى من رسول الله ابيك
 ولوددت ان السماء تقع على الارض يوم مات ابوك الى ان
 قال ان هذا المالم يكن للنبي انما كان مال من اموال
 المسلمين يحمل به الرجال و ينفقه في سبيل الله فلما تو في
 رسول الله وليته كما كان يوليه قالت والله لا كلمتك ابدأ قال
 لا هجرتك ابدأ قالت والله لا ادعون الله عليك قال والله لا
 دعوت الله لك فلما حضرتها الوفاة اوصت ان لا يصلى
 عليها فدفنت ليلا .)) انتھی علی ممانقلہ ابن ابی الحدید .

”نیز ابو بکر جوہری نے جن کی کنیت ان کے سنی اور ناصبی ہونے کی دلیل ہے،
 روایت کیا ہے کہ، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ام ایمن گواہی دیتی ہیں کہ
 رسول اللہ ﷺ نے فدک مجھے دیا تھا تو ابو بکر نے ان سے کہا کہ اے بنت

رسول اللہ! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اللہ کی کوئی مخلوق میرے نزدیک تمہارے باپ رسول اللہ ﷺ سے زیادہ محبوب نہیں ہے اور میں چاہتا ہوں کہ جس روز تمہارے باپ نے انتقال فرمایا کہ آسمان زمین پر گر پڑے۔ یہاں تک کہ ابو بکرؓ نے کہا کہ یہ مال خاص پیغمبر ﷺ کا نہ تھا بلکہ مسلمانوں کا ہے، آپ اس مال سے لوگوں کو جہاد کا سامان دیتے اور راہِ خدا میں صرف فرماتے، اب رسول اللہ ﷺ نے وفات پائی تو میں بھی اس میں اسی طرح کروں گا جس طرح آپ کرتے تھے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: قسم ہے اللہ کی! میں تم سے کبھی بات نہ کروں گی، ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں کبھی تم کو نہ چھوڑوں گا۔ فاطمہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اللہ سے تمہارے لیے بددعا کروں گی، ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ قسم ہے خدا کی! میں تمہارے لیے دعا کروں گا۔ جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات قریب پہنچی تو انہوں نے وصیت فرمائی کہ ابو بکر ان کی نماز نہ پڑھیں اس لیے وہ شب میں دفن کر دی گئیں.....“ انتہی

تیسرے مجتہد صاحب نے عمر بن عبدالعزیز کے ردِ فدک کا ذکر ابو ہلال عسکری کی کتاب ”اخبار الاوائل“ اور یاقوت حموی کی کتاب ”معجم البلدان“ اور ابن ابی الحدید کی ”شرح نہج البلاغہ“ سے کیا ہے اور اس میں انہی باتوں کو نقل فرمایا ہے جن کو ان کے والد ماجد نے عماد الاسلام میں اور قاضی نور اللہ شوستری نے بیان فرمایا ہے۔

چوتھے خلیفہ مامون کی مجلس قائم کرنے اور فدک واپس دینے کی روایت جو طرائف میں منقول ہے اور طرائف سے عماد الاسلام میں نقل کی گئی، پھر نقل درنقل کی ہے، صرف یہ تصرف کیا ہے کہ بجائے عربی عبارت کے اس کا ترجمہ فارسی میں کر دیا ہے۔

پانچویں وہ روایت ”معارض النبوت“ کی جناب مجتہد صاحب نے نقل کی ہے جو عماد الاسلام میں بیان کی گئی ہے جس میں ذکر ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے فدک کی سند حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو لکھ دی تھی اور یہ وہی وثیقہ تھا کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد حضرت

فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا اور اسے یوں لکھا ہے: ((وایضا در روضۃ الصفا وہم در کتاب ”معارض النبوت“ کہ مشہور بسیر ملا معین ہروی است از مقصد اقصیٰ نقل کردہ کہ بعضے می گوید..... الخ)) باقی عبارت وہی ہے جو عماد الاسلام سے آیت ﴿وَإِذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّہ﴾ کی بحث میں ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔

چھٹے المال والنخل شہرستانی کا بھی حوالہ ہے کہ شہرستانی در ملل و نحل گفتہ ((الخلافا الثالث فی امر فذک والتوارث عن النبی و دعویٰ فاطمة رَضِيَ اللهُ عَنْهَا علی نبینا و علیہا السلام وراثہ تارۃ و تملیکا اخری حتی دفعت عن ذلک بالروایۃ المشہورۃ عن النبی نحن سائر الانبیاء لانورث ماتر کناہ صدقۃ)) کہ تیسرا خلاف فدک کے معاملے میں ہے اور پیغمبر خدا ﷺ کی وراثت میں اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دعویٰ کی نسبت کہ کبھی وراثتاً کیا اور کبھی ملکیت کا، اور اس سے وہ محروم کر دی گئیں اس حدیث کی بنیاد پر کہ پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا: ”ہم گروہ پیغمبروں کے ہیں ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا جو ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہے۔“

ساتویں مواقف اور شرح مواقف کا اس دعوے کی تائید میں حوالے دیا ہے اور جو کچھ ”عماد الاسلام“ میں لکھا تھا اسے نقل کر دیا ہے۔

آٹھویں امام رازی کی ”نہایت العقول“ کی سند پیش کی ہے اور ”عماد الاسلام“ سے جو کہ ”نہایت العقول“ کے جواب میں لکھی گئی ہے عبارت نقل کی ہے، وهو ہذہ:

((الفائدة الرابعة فيما يتعلق بنحلة النبی قال الرازی مجیباً عما ذکر من قبل الامامية ثانياً منعها فدکا بانہ لو وجب علیہ تصدیقہا فی ہذہ الدعویٰ لکان ذلک المال ما یذکرونہ من وجوب عصمتہا و قد سبق الکلام علیہ اولالبینۃ لکن البینۃ الرعیۃ ما کانت حاصلۃ لا یقال فیلزم ان تكون طالبة عن ذلک

من غیر بینة و ذلك لا یلیق بها لانا نقول لعلها کانت تذهب
الی ان الحکم بالشاهد الواحد والیمین جائز کما ذهب الیه
بعضہم وان ابا بکر ما کان یذهب الی ذلك .))
”چوتھا فائدہ آنحضرت ﷺ کے ہبہ کرنے بیان میں ہے۔ امام رازی اس
سوال کے جواب میں جو امامیہ کی طرف سے بیان کیا جاتا تھا کہتے ہیں کہ دوسری
یہ ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک سے روکا گیا اور یہ اس طرح ہے کہ اگر
حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اس دعوے میں تصدیق ابو بکر رضی اللہ عنہ پر واجب ہوتی تو یا اس
خیال سے جیسا کہ شیعہ کہتے ہیں کہ آپ معصومہ تھیں اور عصمت کے متعلق ہم
پہلے لکھ چکے ہیں، یا اس خیال سے کہ شہادت گزار لیکن شرعی شہادت حاصل نہ
ہوئی۔ اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آپ بغیر شاہد کے طلب کرتی تھیں، کیونکہ یہ آپ
کی شان کے لائق نہیں ہے۔ اس لیے کہ شاید آپ کی رائے یہ ہو کہ ایک گواہ اور
قسم پر حکم دینا کافی ہے، جیسا کہ بعضوں کی رائے ہے اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کی یہ رائے
نہ تھی۔“

”تشیید المطاعن“ میں جناب مولانا سید محمد قلی کثوری صاحب نے تحفہ اثنا عشریہ
کے جواب میں پچیس کتابوں سے اس سند کے پیش کرنے کا دعویٰ کیا ہے، چنانچہ وہ فرماتے
ہیں:

((اما آنچه گفته جواب ازیں طعن آنکہ دعویٰ ہبہ از حضرت
زہرا و شہادت دادن حضرت علی و ام ایمن یا حسنین علی
اختلاف الروایات در کتب اہل سنت اصلا موجود نیست از
مفتریات شیعہ است در مقام الزام اہل سنت آوردن و جواب
آن طلب یدن کمال سفاهت است ، پس مردود ست بانکہ
انکار وجود این دعویٰ و شہادت در کتب اہل سنت ناشی

از کمال عناد و عصیت ست زیرا کہ این دعویٰ در کتب کثیرہ از کتب معتمدہ و اسفار معتبر ایشان مذکورست مثل تصانیف عمر بن شبہ۔ و مجد مؤرخ و ابوبکر جوہری۔ و مغنی قاضی القضاة، و ملل و نحل شہرستانی۔ و کتاب الموافقة ابن سمان۔ و معجم البلدان یا قوت حموی۔ و محلی ابن حزم۔ و نہایۃ العقول۔ و تفسیر کبیر مسمی بمفاتیح الغیب۔ و ریاض النضرۃ۔ و کتاب الاکتفا۔ و فصل الخطاب۔ و مواقف۔ و شرح مواقف و جواهر العقیدین۔ و وفاء الوفا۔ و خلاصۃ الوفاہرسہ از سید سہمودی۔ و حاشیۃ صلاح الدین رومی بر شرح عقائد نسفی از تفتازانی۔ و صواعق محرقة۔ و براہین قاطعۃ۔ و مقصد اقصیٰ۔ و معارج النبوة۔ و حبیب السیر۔ و رضة الصفا۔ و در بسیارے ازین کتب وقوع این شہادت ہم بریں دعویٰ مذکورست۔ ((

”صاحب تحفہ اثنا عشریہ نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا دعویٰ باغ فدک اور حضرت علی رضی اللہ عنہ و ام ایمن یا حسنین رضی اللہ عنہم کا گواہی دینا کہ یہ باغ رسول اللہ ﷺ نے ہبہ فرمایا تھا، یہ دعویٰ سنیوں کی کتابوں میں بالکل موجود نہیں اور یہ سب شیعوں کی من گھڑت ہے اور اسے اہل سنت کے خلاف لانا اور ان پر الزام قائم کر کے ان سے جواب طلب کرنا یہ شیعوں کی مکمل بے وقوفی و نادانی ہے۔ مشارالیه محدث دہلوی شاہ عبدالعزیزؒ کا یہ قول نا قابل قبول ہے اور سنیوں کی کتابوں میں اس دعویٰ و شہادت کا انکار صرف دشمنی و تعصب کی وجہ سے ہے۔ حالانکہ یہ دعویٰ اہل سنت کی اکثر معتبر کتابوں اور تاریخوں میں موجود ہے۔ جیسے مذکورہ کتابوں میں، اور ان بیشتر کتابوں میں یہ دعویٰ اور اس کی شہادت تحریر ہے۔“

یہ لکھ کر پھر اپنے دعوے کے ثبوت میں ہر ایک کتاب کی عبارت لکھی ہے۔ اگرچہ صاحب ”تشئید المطاعن“ نے پچیس کتابوں کے نام لکھ دیے ہیں مگر حقیقت میں ان میں سے کسی ایک کتاب میں بھی ایک روایت ایسی نہیں ہے جو صحیح ہو اور بسلسلہ اسناد بیان کی گئی ہو۔ اس میں اکثر کتابیں تو وہی ہیں جن کا ذکر ”عماد الاسلام“ اور ”طعن الرماح“ میں ہے۔ اور وہی عبارتیں ہیں جو ان میں نقل کی گئی ہیں اور بعض کتابیں جن کا ذکر ان میں نہیں ہے۔ ان میں نہ کسی روایت کا بیان ہے نہ سوائے نام گنانے کے اس سے کچھ حاصل ہے۔ چنانچہ عمر بن شبہ میں سے خود ان کی کسی تصنیف کا نام نہیں لکھا ہے، نہ اس میں سے کوئی عبارت نقل کی ہے۔ بلکہ ”جو اهر العقدین“ میں جو روایت حافظ عمر بن شبہ سے منقول ہے اسی کو آپ نے لکھا ہے۔ اور سید نور الدین سہودی کی کتاب ”وفاء الوفا باخبار دارالمصطفیٰ“ سے اسے نقل کیا ہے جیسا کہ ”تشئید المطاعن“ صفحہ ۱۳۰ اور ۲۳۱ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ وہ روایت ہے جس میں حضرت زید شہید سے فدک کے متعلق سوال کرنے کا ذکر ہے۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید میں ابو بکر جوہری سے بھی وہی روایت زید بن علی کی منقول ہے۔ اور مجد مؤرخ کی تصنیف کا جو ذکر ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ ان کی کسی خاص کتاب کا نہ آپ نے نام لکھا ہے نہ اس سے عبارت نقل کی ہے۔ بلکہ کتاب ”وفاء الوفا باخبار دارالمصطفیٰ“ میں جو سید نور الدین سہودی کی تصنیف ہے، اس سے یہ نقل کیا ہے۔

((ذکر المجد فی ترجمة فدک ما تقتضی ان الذی دفعه

عمرالی علی و عباس و وقعت الخومة فیہ هو فدک فانه قال

فیہا وہی التی كانت فاطمة رضی اللہ عنہا ادعت ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اعطاها فقال ابو بکر ارید بذلك شہودا شہد لها علی فطلب

لہا شاہد آخر فشہدت لہا ام ایمن فقال علمت یا بضعة

رسول اللہ انه لا یجوز الا بشہادة رجل و امرأتین فانصرفت

ثم ادی اجتهاد عمرالی ردھا لما ولی و فتحت الفتوح و کان

على يقول ان النبي جعلها في حياته لفاطمة رضي الله عنها و كان العباس يابى ذلك فكانا يختصمان الى عمر فيابى ان يحكم بينهما يقول انتها عرف بشانكما .))

”یعنی مجد نے ترجمہ فدک میں بیان کیا ہے کہ مراد فدک سے وہی ہے جس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی وعباس رضی اللہ عنہما کو دیا اور جس میں ان دونوں کا جھگڑا ہوا تھا، اس لیے کہ مجد نے فدک کا حال یہ بیان کیا ہے کہ فدک وہ ہے جس کا دعویٰ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیا تھا اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ میرے سامنے اس کے گواہ پیش کرو۔ اول حضرت علی رضی اللہ عنہ نے گواہی دی، پھر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دوسرا گواہ طلب کیا تو ام ایمن رضی اللہ عنہا نے گواہی دی۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے جگر پارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم جانتی ہو کہ ایک مرد اور ایک عورت کی گواہی سے حق ثابت نہیں ہوتا اس کے لیے ایک مرد اور دو عورتیں ہونا چاہیے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا یہ سن کر چلی گئیں۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا اور فتوحات بہت ہونے لگیں تو ان کی رائے اس کے لوٹا دینے کے لیے قرار پائی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ تو یہ کہتے تھے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنی حیات میں فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا تھا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ اس سے انکار کرتے تھے، پھر دونوں حضرات نے اس جھگڑے کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے ان میں کچھ حکم کرنے سے انکار کیا اور یہ کہا کہ تم دونوں اپنے معاملات آپ ہی خود جانتے ہو۔“

اور کتاب ”الموافقہ ابن سمان“ کا اگرچہ نام لکھا ہے، مگر اس کی عبارت خواجہ محمد پارسا کی فصل الخطاب سے نقل کی ہے اور وہ یہ ہے:

((وقال ای ابن سمان فی کتاب الموافقة فی ذکر فاطمة رضي الله عنها

و ابی بکر جاء ت فاطمة رضي الله عنها الی ابی بکر فقال اعطني فدک

فان رسول الله ﷺ و هبها لى فقال صدقت يابنت رسول الله
ولكنى رأيت رسول الله يقسمها فيعطى الفقراء و المساكين
و ابن السبيل بعدان يعطيكم منها قوتكم فما تصنعين بها
قالت افعل فيها كما كان يفعل ابى رسول الله ﷺ .))

”یعنی ابن سمان نے کتاب الموافقة میں جہاں فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا
ہے یہ کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آ کر یہ کہا
کہ مجھے فدک دے دو کہ وہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے ہبہ کر دیا تھا۔ ابو بکر رضی اللہ
نے جواب دیا کہ اے دختر رسول! تم سچ کہتی ہو لیکن میں نے رسول اللہ ﷺ
کو اس میں سے تقسیم کرتے ہوئے اور فقراء، مساکین اور مسافر کو دیتے ہوئے
دیکھا ہے اور پہلے اس میں سے تمہاری قوت (روزینہ) دے دیا کرتے تھے، تو تم
اس کو کیا کرو گی۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ میں بھی اس میں وہی کام کروں گی جو
میرے باپ رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے۔“

اور حاشیہ صلاح الدین رومی سے جو شرح عقائد پر ہے یہ عبارت نقل کی ہے: ((ومن
منع الارث و فذك بالنحلة وقع بين فاطمة رَضِيَ اللهُ عَنْهَا و ابى بكر بغض و
تشاجر ولم تتكلم مع مدة حياتها .)) اور تفسیر کبیر سے یہ پیش کیا ہے کہ امام فخر
الدین رازی لکھتے ہیں:

((فلما مات ﷺ ادعت فاطمة رَضِيَ اللهُ عَنْهَا انه ﷺ كان نحلها فذك
فقال ابو بكر انت اعز الناس على فقراء و احبهم الى غنى
لكنى الاعرف صحة قولك و لا يجوز ان احكم بذلك فشهد
لها ايمن و مولى رسول الله فطلب منها ابو بكر الشاهد الذى
يجوز قبول شهادته فى الشرع فلم يكن فاجرى ابو بكر ذلك
على ما كان يجريه رسول الله ﷺ وينفق منه على ما كان ينفق

علیہ رسول اللہ و يجعل ما يبقى فى السلاح و الكراع .))
 ”یعنی جب آنحضرت ﷺ نے انتقال فرمایا تو فاطمہ رضی اللہ عنہا نے یہ دعویٰ کیا کہ
 آپ نے فدک مجھے دے دیا تھا۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ فقر و مسکنت کو تمہارے
 لیے میں سب سے زیادہ ناپسند کرتا ہوں اور غنا و تو نگری کو تمہارے لیے سب سے
 زیادہ چاہتا ہوں لیکن آپ کے قول کی صحت کو میں نہیں جانتا اور نہ مجھے یہ جائز
 ہے کہ میں اس طرح پر کوئی حکم دے سکوں، پھر ام ایمن رضی اللہ عنہا اور ایک غلام رسول
 اللہ ﷺ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دعوے کی گواہی دی تو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان
 سے اور گواہ طلب کیے جس کی شہادت شرع میں قبول ہو سکے تو اور گواہ نہ ملا، تو
 انہوں نے فدک کے باب میں وہی حکم جاری رکھا جو رسول اللہ ﷺ اس میں
 رکھا کرتے تھے اور انہی لوگوں پر خرچ کرتے جن پر رسول اللہ ﷺ خرچ کیا
 کرتے تھے اور جو کچھ بچتا اس کو سلاح و ہتھیار وغیرہ میں خرچ کرتے۔“

اور ابراہیم بن عبد اللہ یمنی شافعی کی ”کتاب الاکتفاء“ سے وہی روایت زید بن علی کی نقل
 کی ہے جو ابن شبہ سے دوسری کتابوں میں نقل کی گئی ہے۔

اور ابن حزم اندلسی کی کتاب محلی سے یہ روایت نقل کی ہے: ((روى ان على بن
 ابى طالب شهد لفاطمة عند ابى بكر الصديق رَضِيَ اللهُ عَنْهُ و معه ام ايمن فقال
 ابوبكر لو شهد معك رجل او امرأة اخرى لقضيت بها بذلك)) اور رياض
 النضرہ سے محب طبری کی یہ روایت نقل کی ہے: ((وعن عبد الله بن ابى بكر بن عمر
 ابن حزم عن ابىه قال جاءت فاطمة رَضِيَ اللهُ عَنْهَا الى ابى بكر فقالت اعطني
 فدك فان رسول الله وهبها لى قال صدقت يا بنت رسول الله ولكنى
 رأيت رسول الله يقسمها فيعطى الفقراء والمساكين وابن السبيل بعد
 ان يعطىكم منها قوتكم فما تصنعين بها..... الخ .)) اور اس کے بعد اسی کتاب
 سے زید بن علی رضی اللہ عنہ کا وہ قول نقل کیا ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا۔ اور طبقات کبریٰ سے بھی ایک

روایت نقل کی ہے اور وہ یہ ہے:

((اخبّرنا محمد بن عمر ثنا هشام بن سعد عن زید بن اسلم
عن ابیہ قالت (فاطمة) جائتني ام ایمن فاخبرتنی انه اعطانی
فدکا))

”کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ام ایمن میرے پاس
آئیں اور انہوں نے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے مجھے فدک عطا کیا ہے۔“

ان کی کتابوں کے سوا ”لمعة البيضاء“ اور ”بحر الجواهر“ اور ”ناسخ
التواریخ“ اور ”کفایة الموحدين“ میں کوئی اور روایت منقول نہیں ہے جسے ہم بیان
کریں حالانکہ ان کتابوں میں فدک کی بحث نہایت تفصیل سے لکھی ہے۔

الحاصل! جو روایتیں اور اقوال ہم نے اوپر بیان کیے اور جن کے سوا ہم نے کوئی اور قول
اس دعوے کے ثبوت میں نہیں پایا اگرچہ تجزیہ کی جائیں تو وہ تین قسم کی معلوم ہوتی ہیں۔ ایک
وہ جن میں راویوں کے نام منقول ہیں، جیسا کہ روایت اور خبر کا قاعدہ ہے۔ دوسرے وہ کہ جن
میں تاریخی واقعات کے طور پر بلا سند اس دعویٰ کا ذکر ہے، جیسا کہ مورخین کا قاعدہ ہے۔
تیسرے وہ کہ ضمناً کسی اعتراض کے جواب میں یا کسی بیان کے ذیل میں اس دعویٰ کا ذکر کیا
گیا ہے۔ مگر جیسا کہ ہم اس کتاب کے چوتھے مقدمے میں بیان کر چکے ہیں ایسے معاملات کی
شہادت میں وہی روایت پیش کی جاسکتی ہے جو بقاعدہ احادیث اور اخبار کے بیان کی گئی ہو اور
جس کی صحت بعد تنقیح اور رعایت ان اصول کے جو اخبار کی صحت کے لیے فریقین میں قرار
دیے گئے ہیں پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہو۔ مگر وہ اقوال اور قصے جو بغیر سند کسی روایت کے تاریخ کی
کتابوں یا دوسری تصنیفات میں لکھے گئے ہوں جن کا نہ ماخذ معلوم ہونہ جس کی سند بیان کی گئی
ہو، اس قابل نہیں ہوتے کہ ایسے مباحث میں ان پر کچھ بھی توجہ کی جائے گو وہ کتابیں کیسے ہی
نامور اور مشہور شخص کی تصنیفات سے ہوں۔ اس لیے کہ جو واقعہ تیرہ سو برس پہلے گزرا ہو اس کی
صحت قیاس سے تو ہو نہیں سکتی نہ کسی کا مجرد قول اس پر یقین کرنے کے لیے کافی ہے۔ وہ تواز

قسم اخبار ہے اور خبر میں جھوٹ اور سچ دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے سچ ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے بیان کرنے والوں کا سلسلہ بیان کرے اور وہ سلسلہ اس حد تک پہنچ جائے جس پر وہ سلسلہ ختم ہوتا ہے اور جس سے روایت یا سماعت اپنی بیان کی ہو۔ اور پھر یہ بھی شرط ہے کہ راوی بھی ایسے ہوں جن پر بھروسہ ہو اور جن کی سچائی اور دیانت داری پر اطمینان۔ اگر ایسا سلسلہ موجود بھی ہو مگر راوی ایسے ہوں کہ جن کے حالات سے کچھ اچھی طرح آگاہی نہ ہو یا ایسے ہوں کہ جو مسائل مذہبی میں مختلف تھے اور جن پر یہ شبہ ہو کہ اپنے مذہب کی حمایت میں انہوں نے کوئی روایت پیش کر دی ہوگی یا ایسے راوی ہوں جن کی طبیعت شکی اور وہمی تھی یا حافظہ کے ضعیف یا مجہول ہوں تو ان کی روایتیں پایہ اعتبار سے ساقط ہیں۔ اور اگر ان میں کوئی راوی ایسا ہو جو جھوٹا یا حدیثوں کا بنانے والا بیان کیا گیا ہو تو اس کی روایت تو جھوٹی ہی سمجھی جائے گی۔ اور جس خبر میں روایت کا سلسلہ متصل نہ ہو بلکہ منقطع ہو تو وہ روایت شہادت سے خارج کرنے کے لائق ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ مشہور اور نامور علمائے امامیہ نے جو روایتیں اور اقوال دعویٰ ہبہ کے ثبوت میں پیش کیے ہیں اور جن سے اپنی تصنیفات کا حجم بڑھایا ہے اس میں ایک روایت بھی قسم اول کی نہیں پیش کرنے کے لائق ہے اور نہ سماعت اور قبول کے قابل۔



اب ہم ان اقوال اور روایات سے بحث کرتے ہیں جو اوپر بیان کیے گئے ہیں

ان روایات اور اقوال میں سے وہ روایتیں جن میں کچھ بھی راویوں کے نام بیان کیے گئے ہیں اور جن کو ہم نے قسم اول میں داخل کیا ہے، چھ میں:

ایک وہ روایت ہے ^① جو شافی میں بیان کی گئی ہے اور جس کو ابراہیم بن محمد ثقفی نے ابراہیم بن میمون سے اور انہوں نے عیسیٰ بن عبداللہ بن محمد بن عمر بن علی بن ابی طالب سے اور انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے اپنے دادا سے اور انہوں نے اپنے پردادا سے نقل کی ہے جس میں یہ بیان کیا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ہبہ کا دعویٰ کیا اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں سند بھی لکھ دی، مگر عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسے چاک کر دیا۔

دوسری ^② جو شافی میں عمر بن عبدالعزیز کے رد فدک کے متعلق بیان کی ہے جسے محمد بن زکریا غلابی نے اپنے شیوخ سے اور انہوں نے ابوالمقدام ہشام بن زیاد سے روایت کیا ہے۔ تیسری ^③ وہ روایت ہے جو طرائف میں واقدی، بشر بن غیاث اور بشر بن ولید سے بیان کی گئی ہے جس میں خلیفہ مامون کے مجلس قائم کرنے اور فدک آل فاطمہ پر واپس کرنے کا بیان ہے۔

چوتھی ^④ وہ روایت جو ”جواہر العقدین سید سہمدی“ اور ”صواعق محرقة“ کے باب دوم

① یہ روایت پہلے گزر چکی ہے۔

② ملاحظہ ہو سابقاً

③ یہ روایت اسی کتاب میں پہلے گزر چکی ہے۔

④ پہلی روایت ملاحظہ ہو جو گزر چکی ہے۔

اور کتاب ”وفاء الوفا باخبار دارالمصطفیٰ“ اور کتاب ”خلاصة الوفا“ اور کتاب ”ریاض النضرة“ محب طبری اور شرح ”نهج البلاغة“ ابن ابی الحدید سے بیان کی گئی ہے اور جس کو حافظ ابن شبہ نے روایت کیا ہے اور جس میں زید بن علی سے فدک کے متعلق سوال کرنے اور ان کے جواب کا ذکر ہے۔

پانچویں ❶ وہ روایت ”ریاض النضرة“ کی ہے جو عبداللہ بن ابی بکر بن عمرو بن حزم نے اپنے باپ سے روایت کی ہے اور جس کو صاحب ”تشئید المطاعن“ نے نقل کیا ہے جس میں یہ بیان ہے کہ حضرت سیدہ نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ پیغمبر خدا ﷺ نے ان کو فدک عطا کیا تھا۔

چھٹی ❷ وہ روایت ہے جو ”تشئید المطاعن“ میں طبقات کبریٰ سے نقل کی ہے اور جسے محمد بن عمرو ہشام بن سعد سے، انہوں نے زید بن اسلم سے اور انہوں نے اپنے باپ سے بیان کی ہے، جس میں یہ بیان ہے کہ جناب سیدہ رضی اللہ عنہا مع امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئیں اور اول اپنے میراث کا اور آخر میں ہبہ کا دعویٰ کیا اور فرمایا کہ ام ایمن رضی اللہ عنہا نے مجھ سے کہا تھا کہ رسول خدا ﷺ نے فدک مجھے عطا فرمایا ہے۔

یہ چھ روایتیں ہیں جو بعد حذف و تکرار اور نقل در نقل کے شیعوں کی کتابوں میں بیان کی گئی ہیں اور جن میں مسلسل یا منقطع سلسلہ راویوں کا بیان کیا گیا ہے۔ اب ہم ہر ایک روایت کی حقیقت بیان کرتے ہیں کہ وہ کہاں تک اعتبار کے لائق ہے، اور اس بات کو دکھاتے ہیں کہ ان میں سے ایک روایت بھی ایسی نہیں ہے جو ذرا بھی توجہ کے لائق ہو یا جس کے جھوٹ ہونے میں کچھ بھی شبہ ہو۔

پہلی روایت کی نسبت اول تو یہی معلوم نہیں کہ ثنابی میں کس کتاب سے نقل کیا ہے اور یہ روایت سنیوں کی ہے یا شیعوں کی۔ لیکن اگر فرض کیا جائے کہ یہ سنیوں کی کسی کتاب سے لی گئی

❶ یہ روایت پہلے گزر چکی ہے۔

❷ اسی کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔

ہے، تب بھی بلحاظ راویوں کے اعتبار کے لائق نہیں ہے۔ بلکہ شیعوں کی روایت ہے۔ اس لیے کہ ابراہیم بن محمد ثقفی مجہولین سے ہیں اور ان کی کوئی حدیث صحیح نہیں ہے۔ میزان الاعتدال میں ان کی نسبت لکھا ہے: ((ابراہیم بن محمد الثقفی قال ابن ابی حاتم ہو مجہول وقال البخاری لم یصح حدیثہ .))

انہوں نے ابراہیم بن میمون سے روایت کی ہے اور ابراہیم بن میمون کا حال ہم ذکر ہے۔ فدک اور شان نزول آیت ﴿وَإِذْ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ﴾ میں جہاں ”کنز العمال“ کی روایت سے جو ”عماد الاسلام“ میں ہے بحث کی ہے لکھ چکے ہیں کہ وہ اجلائے شیعہ سے ہیں اور ”منتہی المقال فی اسماء الرجال“ میں جو شیعوں کی معتبر کتاب ہے ان کی نسبت لکھا ہے کہ وہ امام جعفر صادق کے معتمد علیہ تھے اور سب متفق ہیں کہ وہ قابل اعتماد ہیں۔

ابراہیم بن میمون نے عیسیٰ بن عبداللہ بن محمد بن عمرو بن علی بن ابی طالب سے روایت کی ہے۔ عیسیٰ بن عبداللہ کی نسبت میزان الاعتدال میں ہے: ((قال الدار قطنی متروک الحدیث و قال ابن حبان یروی عن آباء ہ اشیاء موضوعۃ .)) ”دارقطنی کہتے ہیں کہ وہ متروک الحدیث ہے اور ابن حبان کہتے ہیں کہ وہ اپنے باپ دادا سے موضوع احادیث روایت کرتا ہے۔“ پس کیا اس میں شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ روایت شیعوں کی نہیں ہے یا کوئی بھی اسے سنیوں کی روایت کہہ سکتا ہے جس کے راوی باقرار علماء امامیہ اجلائے شیعہ سے ہوں اور جن کی نسبت ان کی اسماء الرجال کی کتاب میں لکھا ہے: ((وہو معتمد علیہ وفاقا للجمع .))

دوسری روایت جو شافی میں منقول ہے اس کے اول راوی محمد بن زکریا غلابی ہیں اور یہ ضعیف اور حدیث کے وضع کرنے والوں میں سے ہیں، جیسا کہ ”میزان الاعتدال“ میں ان کی نسبت لکھا ہے: ((وہو ضعیف و قال الدار قطنی یضع الحدیث .))

اور انہوں نے ابوالمقدام ہشام بن زیاد سے روایت کی ہے جن کی نسبت میزان الاعتدال میں لکھا ہے: ((ہشام بن زیاد ابوالمقدام الصری ضعفہ احمد

وغیرہ قال النسائی متروک و قال ابن حبان یروی الموضوعات عن الثقات و قال ابوداؤد کان غیر ثقہ و قال البخاری یتکلمون فیہ .)) ”امام احمد وغیرہ نے ان کو ضعیفوں میں لکھا ہے اور نسائی نے کہا یہ متروک الحدیث ہیں اور ابن حبان کہتے ہیں کہ یہ موضوع حدیثیں ثقات کے نام سے روایت کرتے ہیں اور ابوداؤد کہتے ہیں کہ یہ ثقہ نہیں ہیں اور بخاری نے کہا کہ لوگ ان پر کلام کرتے ہیں۔“ انتھی .

جب ایسے ضیف اور متروک الحدیث بلکہ حدیث بنا کے ثقات کی طرف منسوب کرنے والے راوی ہوں تو اس حدیث کے جھوٹ اور غیر صحیح ہونے کی بالفرض اگر کوئی تصریح نہ کرے، تاہم اس کی صحت کیوں کر مانی جاسکتی ہے اور ان کی خبر کسی طرح شہادت میں پیش ہو سکتی ہے۔ اور اگر یہ روایت ثابت بھی ہوتی اور صحیح بھی تب بھی اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ہبہ فدک کا دعویٰ کیا تھا۔ البتہ یہ ضمناً نکلتا ہے کہ جو کچھ شیخین رضی اللہ عنہما نے کیا وہ ٹھیک نہ تھا۔ اور اسی وجہ سے شافی نے اس روایت کو کچھ بہت قوی دلیلوں میں سے ثبوت میں دعویٰ ہبہ فدک کے خیال نہیں کیا ہے۔ اس لیے قاضی عبدالجبار نے معنی میں لکھا تھا کہ ❶ عمر بن عبدالعزیز کا فعل، یعنی فدک آل فاطمہ رضی اللہ عنہا پر رد کرنا ہبہ فدک کے دعوے کو ثابت نہیں کرتا، یعنی ہبہ کے طور پر رد کیا ہو بلکہ انہوں نے وہی عمل کیا جو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کیا تھا کہ حضرت امیر المومنین کے ہاتھ میں دے دیا تھا تا کہ وہ اس کے غلے کو اسی موقع پر صرف کریں جہاں پیغمبر خدا ﷺ صرف فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ ایسا ہی ایک مدت تک جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے کیا پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے اخیر سال

❶ اصل عبارت یہ ہے: فاما فعل عمر بن عبدالعزیز فلم یثبت انه رده علی سبیل الخل بل عمل فی ذلك ما فعله عمر بن الخطاب بان اقره فی یدا امیر المومنین لیصرف غلاتها فی الموضوع الذی کان یجعلها رسول اللہ ﷺ فیہ فقام بذلك ملدہ ثم ردها الی عمر فی آخر سنیه و كذلك فعل عمر بن عبدالعزیز ولو ثبت انه فعل بخلاف ما فعله السلف لکان هو المحجوع بقولهم و فعلهم واحد ما یقوی ما ذکرناہ ان الامر لما انتھی الی امیر المومنین ترک فدک علی ما کانت ولم یجعلها میراثا لفاطمہ۔ ۱۲

میں واپس لے لیا۔ اسی طرح سے عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی کیا۔ اور اگر ثابت بھی ہو کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے خلاف سلف کے کیا تو ان کا فعل قابلِ سند نہ ہوگا۔ اس کے جواب میں جناب علم الہدیٰ شافی میں لکھتے ہیں کہ ❶ اول تو ہم عمر بن عبدالعزیزؒ کے فعل پر کسی طرح سے بھی حجت نہیں کرتے، کیونکہ ان کا فعل کچھ حجت نہیں ہے..... اور اگر ہم اس قسم کی باتوں سے احتجاج کریں اور اس طرح کی جتیں اور دلیلیں لائیں تو ہم مامون کے فعل کو بھی پیش کر سکتے ہیں کیونکہ خلیفہ مامون نے بھی ایک مجلس قائم کر کے اور مباحثہ کرا کے فدک کو واپس کیا تھا۔ سوائے اس کے صاحبِ معنی عمر بن عبدالعزیزؒ کے اس فعل کا انکار کرتے ہیں جو کہ اہل نقل میں بلا اختلاف معروف و مشہور ہے، فقط۔ اور اس پر انہوں نے روایت محمد بن زکریا غلابی کی پیش کی ہے جس سے ہم بحث کر رہے ہیں۔

عمر بن عبدالعزیزؒ کے اسی قصے کو ابو ہلال عسکری کی کتاب ”اخبار الاوائل“ اور یاقوت حموی کی ”معجم البلدان“ اور ابن ابی الحدید کی ”شرح نہج البلاغۃ“ سے ”طعن الرماح“ اور ”تشئید المطاعن“ میں بھی نقل کیا ہے۔ اور ان تمام روایتوں کا ما حاصل صرف یہ ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے فدک آلِ فاطمہ کو واپس کر دیا، اس سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فدک کے ہبہ کا دعویٰ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے کیا تھا۔ اس لیے یہ جتنی روایتیں پیش کی گئی ہیں وہ کچھ بھی مطلب کے لیے مفید نہیں ہیں بلکہ بر خلاف اس کے جیسا کہ مولانا شاہ عبدالعزیزؒ صاحب نے مشکوٰۃ سے بروایت ابوداؤد لکھا ہے۔

❶ فاما انكاره ان يكون عمر بن عبدالعزیز رد فدكا على وجه النحل ثم ادعاه انه فعل في ذلك بمثل ما فعله عمر بن الخطاب من اقرار هافى يد امير المؤمنين ليصرف غلاتها في جهاتها فاول ما فيه انا لا نحتج عليه بفعل عمر بن عبدالعزیز على وجه وقع لانه فعله ليس بحجة ولو اردنا الاحتجاج بهذا الجنس من الحجج لذكرنا فعل المامون فانه رد فدك بعد ان جلس مجلساً مشهوراً حكم فيه بين خصمين نصبيهما احدهما لفاطمة والآخر لابي بكر وردها بعد قيام الحجة و وضوح الامرو مع ذلك انه انكر من فعل عمر بن عبدالعزیز ما هو معروف مشهور بلا خلاف بين اهل انقل فيه و قد روى محمد بن زكريا يا الغلابى عن شيوخه عن المقدم هشام بن زياد۔ ۱۲ (شافى صفحه ۲۳۶)

عمر بن عبدالعزیز کا آل مروان کو جمع کر کے یہ کہنا ثابت ہوتا ہے کہ جس امر سے رسول اللہ ﷺ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو منع کیا تھا میں کب اس کا مستحق ہو سکتا ہوں، اس لیے میں تم کو گواہ کرتا ہوں کہ میں اس کو اسی حال پر لوٹاتا ہوں جس حال پر کہ وہ رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں تھا۔ چنانچہ اصل روایت اس کے متعلق تحفہ میں منقول ہے۔ من شاہ فلیر جمع الیہ .

تیسری روایت جو طرائف میں واقدی اور بشر بن غیاث اور بشر بن الولید سے نقل کی گئی ہے اور جس میں خلیفہ مامون کے مجلس قائم کرنے اور فدک کے مقدمے میں بحث کرنے اور آخر کار ایک رسالہ لکھ کر موسم حج میں شائع کرنے کا ذکر ہے، وہ بھی سراپا جھوٹی اور شیعوں کی بنائی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ اس کے راوی واقدی اور بشر بن غیاث ہیں جن میں سے ہر ایک کا حال ہم اوپر آیت ﴿وَإِذَآ الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ﴾ کی بحث میں لکھ چکے ہیں کہ واقدی کذابین اور واضعین حدیث میں سے ہیں اور بشر بن غیاث زنادقہ میں سے۔

اور اسی روایت کو ”عماد الاسلام“ میں مولانا دلدار علی صاحب نے طرائف سے نقل کیا ہے اور مجتہد سید محمد صاحب نے ”طعن الرماح“ میں اس کا ترجمہ لکھا ہے۔ اور ان دونوں مجتہدوں پر افسوس ہے کہ ایسے کاذبین اور واضعین حدیث اور زندیقین کی روایتیں پیش کر کے اپنے دعوے کو ثابت کرنا چاہتے ہیں اور ان کی روایتوں کو اہل سنت کی اخبار صحاح میں بیان کرتے ہیں۔ اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ کوئی صحیح روایت تو دعویٰ ہبہ کے متعلق ہے نہیں، اس لیے اس قسم کی جھوٹی اور بنائی ہوئی باتوں کو جو جھوٹوں اور حدیث کے بنانے والوں کو زندیقوں نے اسلام میں رخنہ ڈالنے کے لیے مشہور کر رکھی تھیں طرح طرح سے پیش کرتے ہیں۔ کبھی کچھ سند کا حوالہ دے کر، کبھی کسی کتاب کا نام لے کر اور کبھی کسی تاریخ سے نقل فرما کر۔ مگر ان کا جھوٹ کسی طرح چھپ نہیں سکتا اور جس رنگ میں وہ اسے دکھائیں اصلی جلوہ نظر آجاتا ہے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من آں جلوۂ قدمی شناسم

چوتھی روایت وہ ہے جو ”جوہر العقدین“ سید سہمودی وغیرہ سے نقل کی گئی ہے۔ اور جسے حافظ عمر بن شبہ نے نمیر بن حسان سے روایت کیا ہے، یہ روایت پوری ”عماد الاسلام“ سے ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔ اس میں دو راویوں کے نام لکھے ہیں، ایک عمر بن شبہ دوسرے نمیر بن حسان۔ باقی راویوں کے نام مذکور نہیں ہیں۔ دیگر راویوں کے نام یا سید سہمودی نے چھوڑ دیے ہوں یا حضرات مجتہدین نے نقل کرنے میں تخفیف فرمائی ہو۔ مگر پتہ چلانے سے معلوم ہوا کہ اس روایت کا اصلی ماخذ ابن ابی الحدید کی شرح ”نہج البلاغہ“ ہے اور ابن ابی الحدید نے اسے ابوبکر احمد بن عبدالعزیز جوہری کی کتاب سقیفہ وفدک سے نقل کیا ہے اور وہ اصلی روایت یہ ہے: ((قال ابوبکر اخبرنا ابوزید قال ثنا محمد بن عبدالله بن الزبير قال ثنا فضيل بن مردوق قال ثنا البختری (غالباً نمیر ہوگا) بن حسان قال قلت لزيد بن علي وانا ارید ان اهجن امر ابی بکر ان ابا بکر انتزع فداك من فاطمة رَضِيَ اللهُ عَنْهَا فقال ان ابا بکر الخ)) باقی عبارت وہ ہے جو عماد الاسلام میں نقل کی گئی ہے اور جس کے آخری الفاظ جو انہوں نے چھوڑ دیے تھے اسے ہم نے اس کے بعد نقل کر دیے ہیں۔ اس روایت میں اتنی باتیں غور طلب ہیں۔

اول تو ابن ابی الحدید اس کے ناقل ہیں اور وہ خود معتزلی اور شیعہ ہیں، گوشیعوں نے ان کو علمائے اہل سنت سے بیان کیا ہے اور غرض اس سے یہ ہے کہ لوگوں کو دھوکہ ہو اور انہیں علمائے اہل سنت سے سمجھ کر ان کی بیان کی ہوئی روایتوں سے لوگ شبہ میں پڑیں، مگر ان کا معتزلی ہونا تو ایسا کھلا ہوا ہے کہ اس سے کوئی انکار ہی نہیں کر سکتا اور ان کے شیعہ ہونے یا کم سے کم شیعوں کے سے عقائد رکھنے پر ان کی کتاب شرح ”نہج البلاغہ“ شاہد ہے۔

دوسرے اس روایت کو ابن ابی الحدید نے ابوبکر احمد بن عبدالعزیز جوہری کی کتاب سقیفہ وفدک سے نقل کیا ہے۔ اور یہ کتاب کہ آیا ابوبکر جوہری کی ہے یا نہیں، یا کوئی کتاب اس نام

کی ہے بھی یا نہیں، خود معرض بحث میں ہے اور سوائے ابن ابی الحدید کے کسی اور مشہور عالم نے نہ اس کا ذکر کیا ہے نہ کسی مشہور کتاب میں اس سے کچھ لیا گیا ہے۔ اس لیے ایسی گم نام کتاب کی روایت کب قابل اعتنا اور لائق توجہ ہو سکتی ہے۔ ہم کو اس روایت کے پیش کرنے پر نہایت تعجب آتا ہے، کیونکہ مولانا دلدار علی صاحب نے ”محجاج السالکین“ کی روایت پیش کرنے سے مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب مرحوم پر نہایت غصہ ظاہر فرمایا تھا اور لکھا تھا:

((تا حال نام ایس کتاب بگوش کسے از شیعیان نرسیدہ و بکتاب مجہول کہ مصنف آن نیز مجہول است احتجاج و استدلال نتوان نمود چہ مستبعد است کہ نام کتاب را خودش بدروغ ساخته باشد پس در مقابلہ آن اگر کسے بگوید کہ در اعوجاج الہالکین شخصے از مردم بخارا نوشہ کہ ابوبکر اعتراف بکفر خود کردمی توان گفت و بالفرض اگر کتابے مسمی باین اسم از کتب شیعہ بودہ باشد و این روایت در ان مندرج پس از کجا معلوم شد کہ نقل از کتب اہل سنت نکرده باشد و این ناصب خواجہ اونادیدہ یادیدہ و دانستہ عذر و فریب تاسیا بامامیہ الغادرین ننمودہ باشند.....)) انتھی

(صوارم صفحہ ۵۲)

”اب تک اس کتاب کے نام سے کسی شیعہ کے کان واقف نہیں اور ایک مجہول کتاب سے جس کا مصنف بھی غیر معروف ہے کسی قسم کا استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ اور عین ممکن ہے کہ جھوٹ موٹ ایک کتاب کا نام گھڑ لیا ہو۔ اس دروغ ساختہ کے مقابلہ میں اگر کوئی کہے کہ ”اعوجاج الہالکین“ میں ایک بخاری نے لکھا ہے کہ ابوبکر نے اپنے کافر ہونے کا خود اقرار کیا ہے، تو ایسا کہا جاسکتا ہے۔ اور اگر بفرض محال ”محجاج السالکین“ نامی کوئی کتاب شیعوں کی ہو

اور اس میں یہ روایت بھی موجود ہو تب بھی یہ کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ اسے
سنیوں کی کتاب سے نقل کیا گیا ہے، اور ان کے سردار نے نادیدہ یا دانستہ شیعوں
پر فریب کا الزام نہ لگایا ہو۔“

اور سید محمد صاحب نے ”طعن الرماح“ میں خطبہ بنت ابی جہل کی روایت کی نسبت سید
مرتضیٰ علم الہدیٰ کے کلام کو نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں: ((ہذہ الخبر باطل موضوع
غیر معروف ولا ثابت عند اهل النقل وانما ذکرہ الکرسی طاعنابہ
علی امیر المومنین و معارضابذکرہ لبعض شیعة من الاخبار فی
اعدائہ وھیہات ان یشبہ الحق بالباطل . و بعد ازاں کلامے کہ فرمودہ
است محصل آن این ست کہ امری دیگر درین روایت نبودہ باشد پس
ہمیں راوی آن کرابیسی است و او معلن بعد اوت اهل بیت و ناصبی
شیعی بودہ کافی ست در توهین و تکذیب آن .)) (طعن الرماح صفحہ ۳۹)
ہم امید کرتے ہیں کہ حضرات شیعہ جو کچھ ان دو مجتہدوں نے فرمایا اسی کو ہماری طرف
سے سمجھیں گے اور بہ تبدیل الفاظ ہمارے اس کہنے کو گوش دل سے سن کر اسے تسلیم کریں گے
اور ایسی روایتوں کے جھوٹے ہونے میں شبہ نہ فرمائیں۔

تیسرے ابو بکر جوہری نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے یہ روایت ابو زید سے لی ہے اور ابو
زید کنیت ہے عمر بن شبہ کی، جیسا کہ تقریب میں بیان کیا گیا ہے: ((عمر بن شبہ بن
عبیدہ بن زید النمیری ابو زید .)) اور وہ عمر بن شبہ معتبرین سے ہیں، مگر اس کا کیا
ثبوت ہے کہ حقیقت میں ابو بکر جوہری نے جو روایت ان سے بیان کی ہے اور ابو بکر جوہری
کے نام سے جو کچھ ابن ابی الحدید نے لکھا ہے وہ جعل سے خالی ہے۔ ذہبیؒ کی ”تذکرۃ الحفاظ“
میں جہاں عمر بن شبہ بن عبیدہ سے روایت سننے والوں کا نام ہے وہاں ابو بکر جوہری کا نام ہم
ان مشاہیر میں سے نہیں پاتے جنہوں نے عمر بن شبہ سے سنا تھا، جیسا کہ ”تذکرۃ الحفاظ“ میں
ذہبی لکھتے ہیں: ((عمر بن شبہ بن عبیدہ الحافظ العلامة الاخباری ابو زید

النمیری البصری صاحب التصانیف عن یوسف بن عطیة الی قوله وعند ابن ماجة و ابن صاعد والمحاملی و محمد بن احمد الاثرم و محمد بن مخلد و خلق.) اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر جوہری نے گو حافظ عمر بن شبہ سے سنا ہو مگر وہ مشاہیر میں سے نہیں ہیں اور اسی لیے ابوبکر جوہری کا مستقل ترجمہ اور ان کا حال ہم نے کسی کتاب میں نہیں دیکھا۔ البتہ ابوالفرج اصفہانی مصنف کتاب ”اللاغانی“ نے جوہری سے روایتیں کی ہیں، اور اس میں جوہری کی روایتیں عمر بن شبہ بلکہ صرف انہیں سے پائی جاتی ہیں، مگر ان کو مشاہیر محدثین اور ائمہ میں سے کہنا سراسر غلط ہے۔ ابوالفرج اصفہانی شیعہ تھا اور علمائے شیعہ نے باوجود زید یہ ہونے کے اسے علماء شیعہ میں شمار کیا ہے، جیسا کہ مرزا محمد باقر قرین حاجی زین العابدین موسوی نے جن کو ”زبدۃ المجتہدین“ اور ”حجتہ الاسلام والمسلمین“ کہا گیا ہے اپنی کتاب ”روضات الجنات فی احوال العلماء و السادات“ کے صفحہ ۴۷۸ مطبوعہ ایران ۱۳۰۷ء میں اس طور پر لکھا ہے:

((علی بن الحسین ابو الفرج اصفہانی صاحب کتاب الاغانی ذکرہ مولانا العلامة الحلی فی خلاصة فی القسم الثانی فقال انه شیعى زیدی واورده صاحب الامائل ایضا فی اعد علماء الشیعة وکان عالما روى عن کثیر من العلماء و کان شیعیا خبیر ابا لاغانی والآثار والاحادیث المشہورة و المغازی انتھی وکان اشتہار شیعہ بین جماعۃ من اصحابنا من جہتہ مدناة مذهب الشیعة مع الزیدیہ و مشارکتہما فی القول بان الامامة غیر خارجة عن الفاطمیة .))

”صاحب کتاب الاغانی ابوالفرج اصفہانی کے بارے میں علامہ حلّی نے خلاصہ کی قسم ثانی میں ذکر کیا ہے کہ وہ زیدی شیعہ ہیں اور صاحب ”الامائل“ نے بھی ان کو علمائے شیعہ میں شمار کیا ہے۔ یہ عالم تھے اور بہت سے علماء سے روایت کی ہے

اور یہ شیعہ تھے غنا، آثار، احادیث مشہورہ اور مغازی کی اچھی معلومات رکھتے تھے، شیعوں میں زید یہ ہونے کے باوجود مذہب شیعہ سے قربت کے لیے مشہور تھے اور اس سلسلہ میں ان کے ہم عقیدہ تھے کہ امامت فاطمیوں سے باہر نہیں ہے۔“

چوتھے ابوزید نے اسے محمد بن عبداللہ بن زبیر سے روایت کیا ہے اور یہ حضرت شیعہ تھے۔ جیسا کہ میزان الاعتدال میں لکھا ہے: ((محمد بن عبداللہ بن الزبیر قال العجلی کوفی ثقة یتشیع وقال ابو حاتم له اوہام .)) اور انہوں نے فضیل بن مرزوق سے روایت کی ہے، اور فضیل بن مرزوق کا حال ہم بحث آیت ﴿وَإِذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّ﴾ میں مفصل لکھ چکے ہیں کہ وہ پکے شیعہ تھے، اور انہوں نے نمیر بن حسان سے روایت کی ہے مگر اس میں غلطی معلوم ہوتی ہے، خواہ وہ چھاپے کی ہو یا نقل کی۔ اس لیے کہ ”عماد الاسلام“ اور ”طعن الرماح“ میں ان کا نام نمیر بن حسان لکھا ہے اور شرح ”نہج البلاغہ“ ابن ابی الحدید میں البختری بن حسان۔ مگر ہم کو ان دونوں ناموں میں سے کوئی نام تقریب اور تہذیب اور تہذیب اور تذبذب اور میزان الاعتدال میں نہیں ملا۔ بہر حال اگر اور تمام راوی ثقہ اور صدوق بھی ہوتے مگر جب کہ اس روایت میں فضیل بن مرزوق داخل ہیں تو یہ روایت بجز اس کے کہ شیعوں کی سمجھی جائے اور کچھ خیال نہیں کی جاسکتی۔ اگر سارے سلسلہ میں ایک راوی بھی جھوٹا اور متہم اور مخالف العقیدہ ہو تو ساری روایت باطل اور جھوٹی سمجھی جاتی ہے اور علاوہ اس کے اخیر راوی اس کے خواہ نمیر بن حسان ہوں یا بختری بن حسان، خود ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صاحب بڑے کٹر شیعہ اور دشمن صحابہ رضی اللہ عنہم تھے، اس لیے وہ خود فرماتے ہیں کہ میں نے زید بن علی سے پوچھا کہ میری خواہش یہ تھی کہ اس سے ابو بکر رضی اللہ عنہ کے فعل پر عیب لگاؤں اور اس کی برائی کروں۔ اس لیے کہ اس نے ابجن کا لفظ استعمال کیا ہے اور تبجین کے معنی منتہی الارب میں ہیں ((زشت و عیب ناک گردانیدن .)) اور قاموس میں ہے: ((الہجئة من الکلام ما یعیبه والہجین اللئیم والتهجین التقبیح .))

پانچویں روایت جو ”تشئید المطاعن“ میں ”ریاض النضرۃ“ سے نقل کی ہے۔ اس کے راوی عبداللہ بن ابوبکر بن عمرو بن حزم ہیں۔ اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے اس میں اس روایت کا نہ سر ہے نہ دم۔ اس لیے کہ یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن ابی بکر کے باپ نے کس سے اس روایت کو سنا ہے، جب تک کہ پوری روایت اور تمام راوی بیان نہ کیے جائیں اور اس قسم کی روایتوں پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔

چھٹی وہ روایت ہے جو ”تشئید المطاعن“ میں طبقات کبریٰ سے نقل کی ہے۔ اس کے راوی محمد بن عمر ہیں اور انہوں نے ہشام بن سعد سے اور ہشام بن سعد نے زید بن اسلم سے اور انہوں نے اپنے باپ سے اس روایت کو بیان کیا ہے۔ اس میں راوی اول محمد بن عمر ہیں اور یہ وہ ہیں جو واقدی کے نام سے مشہور ہیں، اس لیے کہ یہی ہشام بن سعد ہیں اور ہشام بن سعد زین بن اسلم سے اور انہوں نے اپنے باپ سے اس روایت کو بیان کیا ہے۔ جیسا کہ ”میزان الاعتدال“ میں لکھا ہے اور واقدی کا حال اور ان کے تمام صفات ہم اوپر آیت ﴿وَاتِذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهٗ﴾ کی بحث میں مفصل لکھ چکے ہیں کہ وہ حدیثوں کے بنانے والوں میں سے ہیں اور کسی بات میں ان کی کوئی روایت حدیث یا انساب یا کسی چیز میں بھی قابل اعتبار نہیں ہے۔ اور ایسے متروک الحدیث ہیں کہ تذکرۃ الحفاظ میں ذہبی نے ان کی نسبت ((لم اسق ترجمته هنا لا تفاقهم على ترك حدیث)) کہہ کر ان کا ترجمہ نہیں لکھا ہے۔ دوسرے راوی ہشام بن سعد ہیں ان کی نسبت میزان الاعتدال میں لکھا ہے: ((كان يحيى بن القطان لا يحدث عنه و قال النسائي ضعيف .)) اور تقریب میں لکھا ہے: ((له اوهام ورمى بالتشيع .)) اور تہذیب میں ہے: ((قال ابو حاتم يكتب حديثه ولا يحتج به .))

قسم اول کی روایتوں کا حال اب ہم بیان کر چکے اور ان کے راویوں کا غیر معتبر اور جھوٹا ہونا ثابت کر دیا۔ اور اس لیے ان روایتوں پر وہ مقولہ صادق آتا ہے جو مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب نے فرمایا ہے کہ ((خبر غیر صحیح چون گوز شتر است .)) اب باقی

رہیں اور اقسام کی روایتیں ان کی نسبت اگرچہ ہم کو زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہم بہ تفصیل اس کتاب کے چوتھے مقدمے میں بیان کر چکے ہیں کہ ایسے واقعات کے متعلق کسی کی رائے یا کسی کا قیاس یا کسی کا بیان اس واقعہ کی صحت اور تصدیق کے لیے کافی نہیں ہے گو اس کا بیان کرنے والا کسی فن کا امام ہو اور گو وہ بڑا مشہور عالم اور کسی خاص علم میں بڑا ماہر اور نامی ہو۔ ان واقعات کی تصدیق کے لیے روایت متصل السند اور صحیح السند ہونی چاہیے۔ اگر ہزار عالم غلطی یا بے خبری یا ناواقفیت یا بے خیال سے کسی واقعہ کا اس طور پر ذکر کریں کہ اس واقعہ کی تصدیق بظاہر پائی جاتی ہو تو واقعہ کی تصدیق کے لیے کچھ مفید نہیں ہے۔ اس سے زیادہ نہیں کہ یہ خیال کیا جائے کہ اس عالم نے اس خبر کی تحقیق اور تنقیح نہیں کی اور بغیر غور و تحقیق کے اسے لکھ دیا۔ خصوصاً متکلمین کہ جو اعتراضوں کا جواب دینے میں بہت کچھ رائے اور قیاس کو دخل دیتے ہیں اور جواب دینے کے خیال میں پڑ جاتے ہیں اور علی سبیل التسلیم والفرض جواب دینے لگتے ہیں جس سے مخالفین کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ روایت صحیح ہے اور ایسے شبہ کو دھوکہ دینے کے لیے پر زور تقریروں میں ظاہر کرتے ہیں۔ یہی حال ان اقوال کا ہے جو علمائے امامیہ نے اس باب میں نقل کیے ہیں۔ اور نہ ہونا مسلسل روایت کا اس کے عدم صحت کے ثبوت میں کافی ہے۔ مگر ہم اپنی کتاب کے ناظرین کے اطمینان کے لیے ان اقوال سے بھی بحث کرتے ہیں تاکہ یہ ناقلین کی بے اعتباری یا ان کی عدم واقفیت یا ان کا فن حدیث سے ماہر نہ ہونا معلوم ہو جائے کہ یہی وجوہ ہیں جن سے اس قسم کی روایتیں کتابوں میں درج ہو گئیں اور علمائے امامیہ کو عوام کو مغالطہ میں ڈالنے کا موقع ملا۔

اس قسم کی روایتیں شافی سے لے کر ”طعن الرماح“ کے زمانے تک جو کچھ بیان کی گئی ہیں وہ اوپر ہم نقل کر چکے۔ اب ہم ان کا مختصر حال لکھتے ہیں، وہ روایتیں یہ ہیں:

۱۔ واقدی کی روایت جو علامہ حلی نے کتاب ”کشف الحق“ میں نقل کی ہے اور جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دعوے پر انہیں سند لکھ دینے کا ارادہ کیا مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ مانع ہوئے۔

۲۔ معجم البلدان کی روایت جس کو ”احقاق الحق“ میں بیان کیا ہے اور جس میں خلیفہ عمر بن عبدالعزیز اور مامون کے رد فدک کا حال ہے۔

۳۔ روایت جلال الدین سیوطی کی ”تاریخ الخلفاء“ کی ہے جو ”احقاق الحق“ میں نقل کی گئی ہے اور جس میں عمر بن عبدالعزیز کے رد فدک کا ذکر ہے۔

۴۔ ابوبکر جوہری کی روایت شرح ”نہج البلاغہ“ سے جس میں یہ لکھا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ام ایمن رضی اللہ عنہا گواہی دیتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فدک عطا کیا تھا۔

۵۔ صواعق محرقة کی متعلق دعویٰ ہبہ کے ہے جس کو ”عماد الاسلام“ اور ”طعن الرماح“ اور ”تشہید المطاعن“ میں نقل کیا ہے۔

۶۔ ملل و نحل شہرستانی، مواقف، شرح مواقف، نہایت العقول اور تفسیر کبیر کی روایت ہے جس میں دعویٰ ہبہ کا بیان ہے۔

۷۔ ”معارج النبوت“ ”در مقصد اقصیٰ“ ”حبیب السیر“ اور ”روضۃ الصفا“ کی روایت ہے۔

اب ان روایتوں کا حال سننے کے واقدی کی روایت محتاج بیان نہیں، واقدی کا حال اس تفصیل سے ہم لکھ چکے ہیں کہ ہر شخص اس کی روایت کو جھوٹی سمجھے گا اور اس روایت کے پیش کرنے والے پر تعجب کرے گا۔

معجم البلدان کی روایت جس میں عمر بن عبدالعزیز اور مامون کے رد فدک کا ذکر ہے اس کی پوری بحث ہم طرائف کی روایت میں کر چکے ہیں اور مامون کے رد فدک کی حقیقت ہم نے تفصیل سے اس طرح پر بیان کر دی ہے کہ اس کے غلط ہونے میں یقیناً کسی کو شبہ نہ رہے گا۔

شیخ جلال الدین سیوطی کی تاریخ الخلفاء میں متعلق فدک صرف ایک روایت ہے، احوال عمر بن عبدالعزیز میں حاصل اس کا یہ ہے کہ مغیرہ کا بیان ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے بنی مروان سے کہا کہ فدک آنحضرت ﷺ کا تھا، اس سے بنی ہاشم کے بچوں کی اور بیواؤں کی اعانت

کرتے تھے۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فدک مانگا تھا آنحضرت ﷺ نے نہیں دیا۔ اسی طرح ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں رہا، مروان نے اس کو جاگیر بنا لیا، پس تم لوگ گواہ رہو کہ میں فدک کو اس طرح کرتا ہوں، جیسا کہ زمانہ نبوت ﷺ میں تھا۔ انتہی ملخصاً۔ ❶

چونکہ تاریخ الخلفاء میں سوائے اس ایک روایت کے اور کوئی روایت فدک کے متعلق نہیں ہے، اور یہ روایت صریح بتا رہی ہے کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فدک مانگا تھا آنحضرت ﷺ نے نہیں دیا۔ فدک کی آمدنی آنحضرت ﷺ جس مصرف میں صرف فرماتے تھے شیخین رضی اللہ عنہما بھی اسی مصرف میں اسے خرچ کرتے تھے جس سے ہبہ فدک و دعویٰ ہبہ فدک بیخ و بن سے منہدم ہو گیا۔ لہذا ہبہ فدک یا دعویٰ ہبہ فدک پر تاریخ الخلفاء سے سند پیش کرنے کی نسبت سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ یہ ارباب علم بلکہ اصحاب حیا کی شان سے بعید ہے۔ علاوہ اس کے تاریخ الخلفاء میں بیان حال یا غیر صحیح روایت نہ لکھنے کا التزام نہیں ہے، لہذا بجز ناقد بصیر اہل حق کے دوسرا کوئی اس سے استدلال نہیں کر سکتا ہے۔

ابوبکر جوہری کی روایت جو شرح ”نہج البلاغہ“ سے ”طعن الرماح“ میں نقل کی ہے، اس میں جناب مجتہد صاحب نے راوی کا نام چھوڑ دیا ہے تاکہ دیکھنے والے کو کوئی موقع روایت کی اصلیت دریافت کرنے کا نہ ملے۔ مگر اصل کتاب یعنی شرح ”نہج البلاغہ“ پر رجوع کرنے سے معلوم ہوا کہ اس کے راوی ہشام بن محمد کلبی ہیں اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے، جیسا کہ شرح ”نہج البلاغہ“ جلد دوم مطبوعہ ایران کے صفحہ ۲۹۵ میں اصل روایت یوں لکھی ہے: ((قال ابوبکر وروی ہشام بن محمد عن ابیہ قال قالت فاطمة لابی بکر

❶ اصل الفاظ روایت یہ ہیں: وعن مغيرة قال جمع عمر حين استخلف بنی مروان فقال ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كانت له فدك ينفق منها ويعول منها على صغيرة بنی هاشم ويزوج منها ايمهم و ان فاطمة سالتہ ان يجعلها لها فابى فكانت كذلك حيوة ابى بكر ثم عمر ثم قطعها مروان ثم صارت لعمر بن عبدالعزيز فرأيت امرا منعه رسول الله ﷺ فاطمة فليس لى بحق و انى اشهد كم انى قدرتها على ما كانت على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم - ۱۲ -

(تاریخ الخلفاء صفحہ ۵۷ مطبوعہ مطبع محمدی لاہور ۱۳۰۴ھ ہجری)

ان ام ایمن تشهد..... الخ)) (باقی عبارت وہ ہے جو طعن الرماح سے اوپر ہم نقل کر چکے ہیں) اور ہشام بن محمد کلبی کے خطاب سے مشہور ہیں اور ان کے باپ بھی اس لقب سے معروف۔ اور یہ باپ بیٹے نہایت کٹر شیعہ اور جھوٹے اور غیر مستند تھے، چنانچہ ان کے باپ کا حال جو ابو ہشام کلبی کے نام سے بھی مشہور ہیں بحث آیت ﴿وَإِذِذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّتْ﴾ میں اوپر ہم لکھ چکے ہیں، ان کی روایتوں کا پیش کرنا۔ اگر زرارہ احوال کی روایتیں سنیوں پر حجت ہو سکتی ہیں تو ہشام بن محمد کلبی اور ابو ہشام محمد بن السائب کلبی، یعنی ان باپ بیٹوں کی روایتیں بھی ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں۔

”صواعق محرقة“ کی ایک روایت تو وہ بیان کی گئی ہے جس میں زید بن علی سے سوال کرنے اور ان کے جواب دینے کا ذکر ہے، اس کی حقیقت ہم اوپر بیان کر چکے۔ دوسرے ایک مقام پر انہوں نے ہبہ کے دعویٰ کا یہ جواب دیا ہے کہ نصاب شہادت نہیں تھا۔ اس میں صاحب صواعق محرقة نے ہبہ کے دعوے کی روایت سے بحث نہیں کی، صرف علی التسلیم و الفرض اس کا جواب دیا ہے اور یہ عادت متکلمین کی ہے۔ اس میں انہوں نے یہ بیان نہیں کیا کہ یہ روایت صحیح ہے جس طرح پر کہ انہوں نے اس کی تکذیب بھی نہیں کی۔ غایت مافی الباب یہ ہے کہ انہوں نے اس روایت کی اصلیت نہیں تحقیق کی اور اس طور پر جواب دیا ہے جس سے ضمناً اس دعوے کے پیش کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے اور یہ امر اس بات کو ثابت نہیں کرتا کہ وہ روایت فی نفسہ صحیح ہو۔ روایت کی تصحیح تو روایت کے بیان اور راویوں کی تنقیح پر منحصر ہے اور ہم اوپر نہایت مدلل طور پر اصل روایت کی تکذیب ثابت کر چکے۔

ملل و نخل شہرستانی اور مواقف کے قولوں کو نقل کرنے سے سوائے کتاب کے حجم بڑھانے کے اور کچھ فائدہ نہیں۔ اس لیے کہ ممل و نخل شہرستانی نے کسی روایت کا بیان نہیں کیا، صرف یہ دو لفظ لکھے ہیں کہ تیسرا خلاف امر فدک میں ہے اور پیغمبر خدا ﷺ کے ارث میں اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دعویٰ کی نسبت کہ کبھی وراثتاً کیا اور کبھی ملکیت کا۔ پس یہ دو لفظ کہ ((تسارۃ وراثۃ و تملیکا اخری۔)) کچھ اصل روایت کو ثابت نہیں کرتے۔ بلکہ غور کرنے سے

تملیکا اخری کے الفاظ بھی مشتبہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ اگر خلاف تھا تو تو ریث میں، یعنی اس مسئلہ میں کہ آیا پیغمبر خدا ﷺ کے متروکہ میں میراث جاری ہو سکتی ہے یا نہیں، یہ مسئلہ مختلف فیہ نہیں تھا کہ کوئی شخص اپنی ملکیت پر قابض رہ سکتا ہے یا نہیں، اس لیے اس موقع پر یہ الفاظ دعوے فاطمہ رضی اللہ عنہا وراثتاً و تملیکاً اخری مہمل اور بے معنی ہیں۔ سوائے اس کے جو دلیل بیان کی ہے: ((حتی دفعت عن ذلك بالرواية المشهورة)) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دعویٰ کے نہ سنے جانے کی حدیث نحن معاشر الانبياء ہے اور یہ متعلق بمیراث ہے نہ کہ متعلق بھبہ و تملیک۔ تملیکاً اخری کے دعوے کے ثابت کرنے کے لیے یہ بھی لکھنا ضروری تھا کہ اس وجہ سے یہ دعویٰ نہ سنا گیا کہ شہادت پوری نہیں ہوئی۔

بہر حال ہر ایک غور کرنے والا سمجھ سکتا ہے کہ یہ الفاظ ہی مہمل اور بے معنی ہیں۔ بنا بریں ملل و نخل کے لکھنے والے شہرستانی بزرگوں میں سے ہیں جو خود عقائد میں متہم ہیں، جیسا کہ ابن تیمیہ نے ”منہاج السنۃ“ میں لکھا ہے:

((بل یمیل الشہرستانی کثیراً الی اشیاء من امور ہم بل یذکر
 احیاناً اشیاء من کلام الاسما علیہ منہم بوجہ ولہذا التہمة
 بعض الناس بانہ من الاسما علیہ و قد یقل ہو مع الشیعة
 بوجہ و مع اصحاب الاشعری بوجہ وبالجملة فالشہرستانی
 یظہر الميل الی الشیعة ولا یحتج بہ الامن ہو جاہل و ان هذا
 الرجل الشہرستانی کان لہ بالشیعة المام واتصال وانہ دخل
 فی اہوائہم بما ذکرہ فی هذا الكتاب یعنی الملل والنحل))
 ”یعنی شہرستانی اکثر شیعوں کی باتوں کی طرف میل کیا کرتا ہے بلکہ کبھی شیعوں کے
 فرقہ اسماعیلیہ باطنیہ کا کلام ذکر کرتا ہے، پھر اسی کی توجیہ بیان کرتا ہے اس سے
 بعض لوگوں نے اس کو اسماعیلیوں میں متہم کیا ہے۔ اور کبھی لوگ یہ بھی کہتے ہیں

کہ وہ ایک طرح شیعوں کے ساتھ ہے اور ایک طرح سے اہل سنت کے ہم خیال ہے۔ غرض کہ شہرستانی کا میل شیعوں کی طرف ظاہر ہوتا ہے اور اس سے جاہل شخص ہی احتجاج کر سکتا ہے۔ اس شہرستانی کو شیعوں کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے اور ان کے خیالات فاسدہ میں سرشار۔“

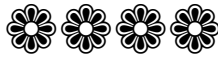
مواقف اور شرح مواقف کے قول جو نقل کیے گئے ہیں وہ خود اس قول کی تضعیف کرتے ہیں، اس لیے کہ اس نے فان قیل کے لفظوں سے شروع کیا ہے اور طالب علم تک اس بات کو جانتے ہیں کہ یہ لفظ قول ضعیف کے ذکر میں استعمال کیا جاتا ہے اور بالفرض والتقدیر اور علی سبیل التسلیم جواب دینے کے مقام میں۔ علاوہ بریں صاحب مواقف اور اس کے شارح بلاشبہ علمائے متکلمین اہل سنت سے ہیں مگر حدیث و خبر میں صرف ان کا قول قابل سند نہیں ہے۔ غایت مافی الباب ان عالموں کا درجہ سنیوں میں ایسا سمجھ لینا چاہیے، جیسا کہ خواجہ نصیر الدین طوسی کا شیعوں میں ہے۔ صرف خواجہ نصیر الدین طوسی کی روایتوں اور حدیثوں کو کوئی عالم علمائے شیعہ میں سے مستند اور قابل استدلال نہیں مانے گا جب تک کہ وہ حدیث نقل نہ کرے یا کسی حدیث صحیح پر ان کا قول مبنی نہ ہو۔ گو وہ کیسے ہی فلسفی، معقولی اور متکلم تھے۔ اور شارح مواقف کا کہنا کہ والصحیح ام ایمن اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ وہ اس حدیث کی تصدیق کرتے ہیں بلکہ اس بات پر دال ہے کہ صحیح یہ ہے کہ اس جھوٹی روایت کے بنانے والے کا لفظ ام کلثوم نہیں ہے بلکہ اس ذات والا صفات کا لفظ بجائے ام کلثوم کے ام یمن رضی اللہ عنہا ہے نہ کہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا، اس لیے کہ انہوں نے ام کلثوم کے بعد یہ کہا کہ والصحیح ام ایمن رضی اللہ عنہا۔ اور اس سے ایک بات اور معلوم ہوتی ہے جس سے ہمارے قول کی تائید ہوتی ہے کہ صاحب مواقف کو اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ علماء نے ام ایمن کا نام لکھا ہے، یا ام کلثوم کا اور غلطی سے وہ ام کلثوم لکھ گئے۔ اور چونکہ شارح مواقف اول شیعہ تھے اور بعد اسی کے سنی ہوئے اس لیے ان کو ان روایات پر خوب اطلاع تھی ان کو یہ غلطی بادی النظر میں معلوم ہو گئی اور اس کی اصلاح کر دی۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انہوں نے کل روایت کی صحت ثابت

کی اور اگر وہ اپنے نزدیک اس روایت کو صحیح سمجھ کر بھی بیان کرتے اور تسلیم کیا جائے کہ انہوں نے اسی لیے بیان کیا ہے تو وہ ان کا خیال ہے اور اس کا جواب صاف ہے کہ وہ خیال ان کا غلط تھا، اس لیے کہ یہ چیزیں قیاسی نہیں ہیں بلکہ خبر سے متعلق ہیں اور خبر کے لیے اس کی تصدیق ضروری ہے۔ واذ لیس فلیس .

امام رازی کی نہایت العقول اور تفسیر کبیر سے بھی روایت کی صحت ثابت نہیں ہوتی، اس لیے کہ اس میں بھی امام رازی نے جواب اعتراض کا دیا ہے اور تنقیح اصل دعوے کی نہیں کی اور نہ تصحیح اس بات کی کہ روایت جس میں ذکر ہبہ کا ہے شیعوں کی ہے یا سنیوں کی۔ اور اس طرح کے جواب دینے سے کسی عالم کے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ روایت فی نفسہ صحیح اور ثابت ہو اور یہی سبب ہے کہ انہوں نے اپنی تفسیر میں بھی جس کا حوالہ ”طعن الرماح“ اور ”تشہید المطاعن“ میں دیا ہے، بحث روایت سے نہیں کی اور اس کی تنقیح و تصحیح کی طرف متوجہ نہیں ہوئے اور اس کا سبب یہ کہ وہ معقولی اور فلسفی تھے اور ایسے مباحث میں معقولی متکلمین کسی طرح نفس مطلب پر رجوع کرتے اور اعتراض کو مانا ہوا تسلیم کر کے اس کا جواب دیتے ہیں، وہ ان محدثین اور محققین میں سے نہیں ہیں جن کا قول اخبار اور احادیث میں سند ہو اور خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ضمناً ان کے جواب دینے سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس روایت کی تکذیب پر متوجہ نہیں ہوئے۔ اور ہم از روئے اصول مقررہ فریقین کے یہ بات اوپر بیان کر چکے ہیں کہ اخبار و احادیث میں کسی کا قول معتبر نہیں ہے گو وہ کیسا ہی مشہور عالم اور مصنف اور محدث ہی کیوں نہ ہو، بلکہ اصل خبر اور نفس روایت دیکھنے کے لائق ہوتی ہے اور جن راویوں سے وہ بیان کی گئی ہے ان کے حالات کی تنقیح لازم ہے۔ اگر راوی ثقہ و معتبر ہوں اور ان پر کوئی الزام نہ لگایا گیا ہو وہ البتہ لائق لحاظ کے ہیں۔ اور پھر اس میں یہ بھی دیکھنا ہے کہ وہ خبر آحاد میں سے ہے یا مشہور، اور دوسرے صحیح اخبار اور مستند روایتوں کے متناقض ہے کہ نہیں، اور یہ کام محققین اور اہل فن کا ہے، اس لیے چند عالموں کی کتابوں میں سے چند عبارتیں نقل کر دینے سے مدعا ثابت نہیں ہوتا۔

اگر کوئی حضرات امامیہ سے یہ کہے کہ ایسے مشہور عالموں کی روایتوں کے نہ ماننے سے جو کہ ائمہ اہل سنت سمجھے جاتے ہیں باب مناظرہ ہی بند ہو جاتا ہے اور صرف یہ جواب کہ وہ حدیث میں ماہر اور نقاد نہ تھے یا باوجود محدث ہونے کے ان سے خطا ہو گئی یا انہوں نے غلط اور ضعیف روایات کو تسلیم کر لیا، اسے چاہیے کہ اس کتاب کا چوتھا مقدمہ غور سے پڑھے کہ اس سے اس کو اس قسم کے خیالات کا کافی اور تسلی بخش جواب ملے گا۔

جو شہادت ہمارے یہاں کتابوں سے حضرات امامیہ نے اس بات کے ثابت کرنے کے لیے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے فدک کے ہبہ کا دعویٰ کیا تھا پیش کی تھی اس کی حقیقت کہ وہ کہاں تک قابل ماننے کے ہے بہ تفصیل ہم نے بیان کر دی۔ اب ہم اس بات کو دکھاتے ہیں کہ خود شیعوں کی روایتیں اس دعوے کے متعلق ایسی متناقض اور مختلف ہیں کہ ان کا باہمی تناقض اور اختلاف ان کے دعوے کو باطل کرتا ہے۔



تناقض اور اختلاف جو شیعوں کی ان روایتوں میں ہے جس میں ہبہ فدک کے دعویٰ کا ذکر کیا گیا ہے

تناقض ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اول ہم شیعوں کی روایتیں جو دعویٰ ہبہ فدک کے متعلق ہیں، بیان کریں، پھر ان کا تناقض دکھائیں۔ مفصلہ ذیل روایتیں شیعوں نے اس کے متعلق بیان کی ہیں۔

۱:..... احتجاج طبرسی ۱^۱ قدیم مطبوعہ ایران صفحہ ۵۲ ذیل عنوان احتجاج امیر

۱ اصل عبارت یہ ہے: عن حماد بن عثمان عن ابی عبد اللہ قال لما بویع ابوبکر و استقام له الامر علی جمیع المهاجرین و الانصار بعث الی فدک من اخرج و کیل فاطمة بنت رسول اللہ ﷺ منها فجاءت فاطمة الی ابی بکر ثم قالت لم تمنعنی میراثی من ابی رسول اللہ ﷺ و اخرجت و کیلی من فدک و قد جعلها لی رسول اللہ ﷺ بامر اللہ تعالیٰ فقال ہاتی علی ذلک بہ شہود فجاءت بام ایمن فقالت لا شہدیا ابا بکر حتی احتج علیک بما قال رسول اللہ ﷺ انشدک باللہ الست تعلم ان رسول اللہ ﷺ قال ام ایمن امرأة من اهل الجنة فقال بلی قالت فاشهد ان اللہ عزوجل او حلی الی رسول اللہ ﷺ فات ذا القربی حقہ فجعل فدک لفاطمة بامر اللہ فجاء علی فشهد بمثل ذلک فکتب لها کتابا فدفعہ الیہا فدخل عمر الکتاب من فاطمة رضی اللہ عنہا فنفل فیہ ففرقه فخرجت فاطمة رضی اللہ عنہا تبکی فلما کان بعد ذلک جاء علی الی ابی بکر و هو فی المسجد و حوله المهاجرین و الانصار فقال یا ابا بکر لما منعت فاطمة رضی اللہ عنہا میراثها من رسول اللہ و قد ملکته فی حیوة رسول اللہ ﷺ فقال ابوبکر هذا فئی للمسلمین فان اقامت شہودا ان رسول اللہ ﷺ جعله لها و الا فلا حق لها فیہ فقال امیر المؤمنین یا ابا بکر تحکم فینا بخلاف حکم اللہ فی المسلمین فقال لا قال فان کان فی ید المسلمین شیء یملکونه ثم ادعیت انا فیہ من تسئل البینة قال ایاک اسئل البینة قال فما بال فاطمة سلتها البینة علی ما فی یدها و قد ملکته فی حیوة رسول اللہ ﷺ و بعد و لم تسئل المسلمین البینة علی ما ادعوها مشہودا کما سئلتنی علی ما دعیت علیہم فسکت ابوبکر فقال عمر یا علی و عنا من کلامک فانا لا نقوی علی حجتک فان اتیت بشہود عدول و الا فئی للمسلمین لا حق لک و لا لفاطمة رضی اللہ عنہا فیہ قال فدمدم الناس و انکر بعضهم بعضا و قالوا صدق واللہ علی و رجع علی الی منزلة قال دخلت فاطمة رضی اللہ عنہا المسجد و طاقت بقرا بیہا و ہی تقول: قد کان بعد ابناء بنشبة الخ ۱۲۔

(احتجاج طبرسی جلد ۱ صفحہ ۲۳۵-۲۳۴ مطبوعہ ایران ۱۴۲۴ء)

المومنین علی ، ابی بکر و عمر لما منع فاطمة الزهرا فذك بالكتاب
والسنة میں بسند حماد بن عثمان امام جعفر صادق سے روایت ہے کہ جب ابو بکر خلیفہ ہوئے اور
تمام مہاجرین و انصار پر پورے طور پر ان کی حکومت قائم ہو گئی تو انہوں نے فدک اپنا آدمی
بھیجا اور اس سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے وکیل کو نکال دیا تب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ابو بکر کے
پاس آئیں اور فرمایا کیوں تم مجھے باپ کی میراث سے محروم کرتے ہو اور کیوں میرے وکیل کو
فدک سے نکال دیا؟ اس پر انہوں نے ان سے گواہ مانگے۔ اور اسی روایت میں بعد بیان
شہادت کے لکھا ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو سند لکھ دی اور عمر رضی اللہ عنہ نے اسے چاک کر
دیا اور فاطمہ رضی اللہ عنہا روتی ہوئی چلی گئیں ((فلما كان بعد ذلك جاء علي الى ابى
بكر و هو فى المسجد و حوله المهاجرون و الانصار .)) اس کے بعد حضرت
علی ، ابو بکر رضی اللہ عنہما کے پاس آئے اور ان کے پاس مسجد میں مہاجرین و انصار جمع تھے اور
علی رضی اللہ عنہ نے آ کر کہا کہ کیوں تم فاطمہ رضی اللہ عنہا کو پیغمبر کی میراث سے منع کرتے ہو حالانکہ وہ
آنحضرت ﷺ کی زندگی میں اس کی مالک تھیں، ابو بکر نے کہا: یہ مال مسلمانوں کا ہے، اگر
وہ گواہ پیش کریں تو ان کو ملے گا ورنہ ان کا حق نہیں، اس پر امیر المومنین نے فرمایا کہ اے
ابو بکر! کیا تم ہمارے حق میں خدا کے حکم کے خلاف فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں تو آپ
نے کہا کہ اگر کوئی چیز مسلمانوں کے قبضے میں ہو اور وہ اس کے مالک ہوں اور میں اس پر دعویٰ
کروں تو تم کس سے گواہ مانگو گے؟ انہوں نے کہا تم سے، کہا یہ کیا سبب ہے کہ تم فاطمہ سے گواہ
مانگتے ہو اس چیز کے متعلق جو ان کے قبضے میں ہے، اور جس کو وہ پیغمبر خدا ﷺ کی زندگی
میں اور اس کے بعد مالک تھیں، اور مسلمانوں سے تم گواہ نہیں مانگتے کہ وہ اس کا دعویٰ کرتے
ہیں۔ یہ سن کر ابو بکر چپ ہو رہے۔ تب عمر نے کہا کہ اے علی! یہ باتیں جانے دو کہ ہم تمہاری
حجتوں پر غالب نہیں آسکتے۔ اگر تم گواہ عادل پیش کرو گے تو خیر، ورنہ یہ مال مسلمانوں کا ہے،
نہ تمہارا حق ہے نہ فاطمہ کا۔ پھر آخر اسی قسم کی چند اور باتوں کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ یہ حالت
دیکھ کر لوگ غصے میں آئے اور بعض نے اس بات کو بہت برا جانا اور کہا: واللہ! علی سچ کہتے

ہیں۔ علی رضی اللہ عنہ اپنے گھر چلے آئے اور فاطمہ رضی اللہ عنہا مسجد نبوی میں تشریف لے گئیں اور اپنے آپ کو باپ کی قبر پر گرا دیا اور یہ اشعار پڑھنے لگیں: ((قد كان بعدك انباء هنبثة الخ)) اس کے بعد اس روایت میں یہ بیان ہے کہ ابو بکر و عمر نے یہ حالت دیکھ کر اور آئندہ کا خوف کر کے ارادہ کیا کہ علی کو قتل کرادیں۔ اور اس کے لیے خالد کو تجویز کیا، اس کا بیان ہم اپنے موقع پر کریں گے۔

۲:..... "علل الشرائع والاحکام" ❶ تالیف شیخ ابو جعفر محمد بن علی بن الحسن بن موسیٰ بن بابویہ قمی کی بات صد و پنجاہ و یکم مطبوعہ ایران صفحہ ۸۶ میں ایک حدیث علی بن ابراہیم نے اپنے باپ سے اور انہوں نے ابن عمیر سے اور انہوں نے ایک اور راوی سے امام جعفر صادق کی یہ بیان کی ہے کہ آپ نے فرمایا: جب ابو بکر نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک سے روکا اور ان کے وکیل کونکال دیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ مسجد میں آئے اور ابو بکر وہاں بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے گرد مہاجرین و انصار جمع تھے تو آپ نے فرمایا: اے ابو بکر! تم نے کیوں فاطمہ رضی اللہ عنہا کو روکا اس چیز سے جو رسول اللہ ﷺ نے ان کو دی تھی اور ان کا وکیل اس پر برسوں سے قابض تھا۔ ابو بکر نے کہا کہ یہ مال مسلمانوں کے لیے ہے، اگر وہ شاہد عادل لائیں تو خیر ورنہ فاطمہ کا اس میں کچھ حق نہیں ہے۔ علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا ہمارے لیے برخلاف اس کے حکم دو گے جو اور مسلمانوں کے لیے تم حکم دیتے ہو؟ تو انہوں نے کہا کہ نہیں، تب آپ نے فرمایا کہ اگر کوئی چیز مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور میں دعویٰ کروں تو تم کس سے گواہ مانگو گے،

❶ قال حدثنا علی بن ابراہیم عن ابیہ عن ابن ابی عمیر عن ذکرہ عن ابی عبد اللہ قال لما منع ابو بکر فاطمة فدکا و اخرج و کیلھا جاء امیر المؤمنین الی المسجد و ابو بکر جالس و حولہ الہماجر و الانصار فقال یا ابا بکر کم منعت فاطمة ما جعلہ رسول اللہ لھا و و کیلھا فیہ منذ سنین فقال ابو بکر ہذا فعی للمسلمین فان اتت بشہود عدول و الا فلا حق لھا فیہ قال یا ابا بکر اتحکم فینا بخلاف ما تحکم فی المسلمین قال لا قال اخبرنی لو کان فی ید المسلمین شیء فادعیت انا فیہ فممن کنت تسئل البینة قال یا کنت اسئل، قال فاذا کان فی یدی شیء فادعی فیہ المسلمون تسئلنی فیہ البینة قال فسکت ابو بکر و قال عمر ہذا فعی للمسلمین و لسنا فی خصوصتک فی شیء قال فبکی الناس و تفرقوا و مدموا ۱۲۔ (علل الشرائع)

ابوبکر نے کہا تم سے۔ علی نے کہا کہ جو چیز میرے ہاتھ میں ہو اور مسلمان اس پر دعویٰ کریں تو تم مجھ سے گواہ مانگو گے! ابوبکر یہ سن کر چپ ہو رہے، عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ مال مسلمانوں کا ہے اور ہم تمہارے جھگڑے کی باتیں نہیں سنتے، پھر اس پر اور باتیں ان کے آپس میں ہوئیں جسے سن کر لوگ رونے لگے اور بصلاح عمر کے ابوبکر نے علی کے قتل کا ارادہ کیا جس کی تفصیل اس روایت میں ہے اور اس کو ہم اپنے موقع پر بیان کریں گے۔

(یہ روایت ترجمہ اردو علل الشرائح صفحہ ۱۴۵-۱۴۶ مطبوعہ لکھنؤ پر بھی موجود ہے)

۳:..... روایت یہ کہ ❶ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس گئیں اور ان سے فدک کا مطالبہ کیا اور بہت سی بحثوں کے بعد ابوبکر قائل ہوئے اور فدک کی سند فاطمہ کے لیے لکھ دی، حضرت علی اور ام ایمن رضی اللہ عنہما کی اس پر گواہی ہوئی، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس سند کو لے کر باہر نکلیں عمر ان کو ملے اور پوچھا کہ آپ کہاں سے آئی ہیں؟ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا ابوبکر کے پاس سے اور سند لکھ دینے کا بھی ذکر کیا، عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ذرا مجھے دکھائیے۔ آپ نے وہ کاغذ عمر رضی اللہ عنہ کو دے دیا، عمر نے اس پر تھوک دیا اور اس کو مٹا دیا۔ پھر علی فاطمہ کو ملے اور پوچھا کہ اے بنت رسول اللہ! کیوں تم غصے میں ہو؟ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ جو کچھ عمر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔ تب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ((مارکبوا منی و من ابیک اعظم من هذا)) کہ ان لوگوں نے میرے حق میں اور تمہارے باپ کے حق میں اس سے بڑھ کر دوسری بات نہیں کی..... الیٰ اخر القصہ۔ (بحار الانوار صفحہ ۹۶ از مصباح الانوار)

۴:..... بحار الانوار کتاب الفتن مطبوعہ ایران صفحہ ۱۰۱ میں کتاب الاختصاص سے بسند

❶ اصل عبارت یہ ہے: عن ابی جعفر قال دخلت فاطمة بنت محمد ﷺ علی ابی بکر فسأله فدک قال النبی ﷺ لا پورث فقالت قال اللہ تعالیٰ وورث سلیمان داؤد فلما حاجته امر ان یکتب لها وشهد علی بن ابی طالب و ام ایمن فخرجت فاطمة ﷺ فاستقبلها عمر فقال من این جئت یا بنت رسول اللہ ﷺ قالت من عند ابی بکر من شان فدک قد کتب لی بها فقال عمر ہاتی الكتاب فاعطه فبصق فیہ و محاه عجل اللہ جزاء فاستقبلها علی فقال مالک یا بنت رسول اللہ ﷺ فذکرت لما صنع عمر فقال مارکبوا منی و من ابیک اعظم من هذا۔ ۱۲ (بحار الانوار)

عبداللہ بن سنان ۱ کے امام کے امام جعفر صادق سے روایت ہے کہ جب پیغمبر خاتم النبیین نے وفات

۱ عن عبداللہ بن سنان عن ابی عبداللہ قال لما قبض رسول اللہ ﷺ و جلس ابو بکر مجلسہ بعث الی وکیل فاطمة فاخرجہ من فدک فاتتہ فاطمة فقالت یا ابا بکر ادعیت انک خلیفۃ ابی و جلست مجلسہ دانت بعثت الی وکیلی فاخرجتہ من فدک و قد تعلم ان رسول اللہ ﷺ صدق بہا علی و ان لی بذلک شہودا فقال ان النبی ﷺ لا یورث لا یورث فرجعت الی علی فاخبرته فقال ارجعی الیہ قولی زعمت ان النبی لا یورث وورث سلیمان داؤد وورث یحییٰ زکریا و کیف لا ارث انا ابی فقال عمر انت معملۃ قالت و ان کنت معملۃ فانما علمنی ابن عمی فقال ابو بکر فان عائشۃ تشہد و عمر انہما سمعا رسول اللہ ﷺ و هو یقول ان النبی لا یورث فقالت هذا اول شہادۃ زور شہد بہ فی الاسلام ثم قالت فان فدک انما ہی صدق بہا علی رسول اللہ ﷺ ولی بذلک بینۃ فقال لہا ہلمی ببینتک قال فجاءت بام ایمن و علی فقال ابو بکر یا ام ایمن انک سمعت من رسول اللہ ﷺ یقول فی فاطمۃ فقالت سمعتہ رسول اللہ ﷺ یقول ان فاطمۃ سیدۃ نساء اهل الجنة ثم قالت ام ایمن فمن کانت سیدۃ نساء اهل الجنة تدعی مالیس لہا وانا امرأۃ من اهل الجنة ما کنت لاشہد بما لم اکن سمعت من رسول اللہ ﷺ فقال عمر دعینا یا ام ایمن من ہذہ القصص بای شئی تشہدین فقالت کنت جالسة فی بیت فاطمۃ و رسول اللہ ﷺ جالس حتی نزل علیہ جبرئیل فقال یا محمد قم فان اللہ تبارک و تعالیٰ امرنی ان اخط لك فدکا بجناحی فقام رسول اللہ ﷺ مع جبرئیل فمالبت ان رجیع فقالت فاطمۃ یا ابی این ذہبت فقال خط جبرئیل لی فدکا بجناحیہ و حدلی حدودہا فقالت یا ابت انی اخاف العیلة والحاجة من بعدک فصدق بہا علی فقال ہی صدقة علیک فقہضتہا قالت نعم فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا ام ایمن اشہدی ویا علی اشہد ثم خرجت و حملہا علی اتان علیہ کساء حمل فداء بہا اربعین صباحا فی بیوت المهاجرین ولا انصار والحسن والحسین معها وہی تقول یا معشر المهاجرین والانصار نصروا اللہ ابنة نبیکم وقد بايعتم رسول اللہ ﷺ یوم بايعتموه ان تمنعوه وذریۃ ممانعون منه انفسکم وذراریکم ففوا الرسول ﷺ ببيعتمکم قال فما اعاننا احد ولا اجابہا والا نصرہا قالت فانتهیت الی معاذ بن جبل فقالت یا معاذ بن جبل انی قد جئتک مستنصرة وقد بايعت رسول اللہ ﷺ علی ان تنصروه وذریۃ و تمنعہ ممانع ذریتک و ان ابا بکر قد غصبت علی فدک و اخرج و کیلیی منها قال فمعی غیری قالت لا ما اجابنی احد قال فاین ابغ من نصرک قال فخرجت من عندنا ودخل ابنہ فقال ماجاء ابنة محمد الیک قال جاءت تطلب نصرتی علی ابی بکر فانه اخذ منها فدکا قال فما اجبتہا بہ قال قلت وما یبلغ من نصرتی انا و حدی قال فایبت ان تنصرہا قال نعم قال فای شئی قالت لك قال قلت لی واللہ لا نازعنک الفصیح من راسی حتی ارد علی رسول اللہ ﷺ اذا لم تجب ابنة محمد ﷺ قال و خرجت فاطمۃ وہی تقوی واللہ لا اکلمک کلمۃ حتی اجتمع انا وانت عند رسول اللہ ﷺ ثم انصرفت، فقال علی رضی اللہ عنہ لہا ایتہا ابا بکر وحده فانه ارق من الاخر وقولی ادعیت مجلس ابی وانک خلیفۃ و جلست مجلسہ ولو کانت فدک ثم استوہبتہا منک لوجب ردہا علی فلما اتتہ وقالت لہ ذلك قال <<<

پائی اور ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کے وکیل کو فدک سے نکال دیا۔ تب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آئی اور کہا کہ تم دعویٰ کرتے ہو کہ میرے باپ کے خلیفہ ہو، اور ان کے مقام پر بیٹھے ہو، تم نے اس بات کے جاننے کے باوجود کہ رسول اللہ ﷺ مجھے فدک دے گئے تھے میرے وکیل کو نکال دیا حالانکہ اس کے میرے پاس گواہ موجود ہیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پیغمبر خدا ﷺ کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ یہ سن کر حضرت فاطمہ علی کے پاس گئیں اور ان سے یہ سب حال کہا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو صلاح دی کہ تم پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ پیغمبر خدا ﷺ کا کوئی وارث نہیں ہوتا، حالانکہ سلیمان داؤد کے اور یحییٰ زکریا کے وارث ہوئے، تو میں اپنے باپ کی وارث کیوں نہیں ہو سکتی؟ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم سکھلائی گئی ہو؟ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: گو میں سکھلائی گئی ہوں مگر کس نے مجھے سکھلایا ہے؟ میرے ابن عم علی نے، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ عائشہ اور عمر دونوں گواہی دیتے ہیں کہ انہوں نے پیغمبر خدا ﷺ سے سنا ہے کہ النسبی لایورث، فاطمہ نے کہا کہ یہ پہلی جھوٹی شہادت ہے جو اسلام میں دی گئی۔ تب حضرت فاطمہ نے فرمایا کہ فدک پیغمبر خدا ﷺ نے مجھے عطا فرمایا ہے اور میں اس پر گواہ بھی رکھتی ہوں تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اچھا گواہی پیش کرو تو وہ ام ایمن رضی اللہ عنہا اور علی رضی اللہ عنہ کو لائیں۔ ابوبکر نے کہا کہ اے ام ایمن! کیا تم نے پیغمبر خدا ﷺ سے سنا ہے جو فاطمہ کہتی ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں، میں نے سنا ہے اور کیا تم نے نہیں سنا کہ پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سیدہ زنان جنت ہیں تو کیا جو سیدہ نساء اہل جنت ہو وہ اس چیز کا دعویٰ کرے گی جو اس کی نہ ہو؟ اور میں ایک عورت اہل جنت سے ہوں، کیا میں وہ گواہی دوں گی جو میں نے پیغمبر ﷺ سے نہ سنا ہو؟ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا یہ باتیں چھوڑ اور کہو کہ کیا تم

﴿﴾ صدقت قال فدعا بكتاب فكتبه لها برد فدك فخرجت والكتاب معها فلقبها عمر فقال يا بنت محمد ﷺ ما هذا الكتاب الذي معك؟ فقالت كتاب لي ابوبكر و فدك فقال هلميه الي فابت ان تدفعه اليه فرسها برجله و كانت حاملة بابن اسمه المحسن فاسقطت المحسن من بطنها ثم لطمها فكاني انظر الي قرط كان في اذنها حين نقضها ثم اخذ الكتاب فخرقه فمضت و مكثت خمسة و سبعين يوما مريضة مما ضربها عمر ثم قبضت - ۱۲ (بحار الانوار)

گواہی دیتی ہو، تو ام ایمن رضی اللہ عنہا نے کہا کہ میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں بیٹھی ہوئی تھی اور آنحضرت ﷺ بھی وہاں تشریف فرما تھے کہ اتنے میں جبرئیل علیہ السلام آئے اور کہا: اے محمد! اٹھو! تا کہ بموجب حکم خدا کے میں فدک کی حد بندی اپنے پروں سے کر دوں۔ آپ اٹھے اور جبرئیل علیہ السلام آپ کے ہمراہ ہوئے، کچھ دیر نہ ہوئی تھی کہ آپ واپس تشریف لائے۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ آپ کہاں تشریف لے گئے تھے؟ آپ نے فرمایا کہ جبرئیل علیہ السلام نے فدک کے حدود بتائے اور اس پر خط کھینچ دیا، تب حضرت فاطمہ نے فرمایا: ((یا ابت انی اخاف العیلة والحاجة من بعدك فصدق بها علی فقال هی صدقة علیک فقبضتھا.)) کہ اے میرے باپ میں افلاس اور محتاجی سے آپ کے بعد ڈرتی ہوں، یہ فدک مجھے دے دیجیے۔ آپ نے فرمایا: اچھا یہ تمہارے لیے عطیہ ہے اور فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس پر قبضہ کر لیا۔ پھر آنحضرت ﷺ نے ام ایمن رضی اللہ عنہا اور علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم اس پر گواہ رہو۔ اسی روایت میں پھر یہ ذکر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فاطمہ کو سوار کرا کے چالیس دن رات مہاجرین و انصار کے گھر پھرے اور کسی نے ہمدردی نہ کی اور پھر معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے پاس آئیں اور ان سے مدد چاہی، انہوں نے بھی انکار کیا اور کہا کہ میں تنہا ہوں، پس فاطمہ ان سے خفا ہو کر چلی آئیں..... الی آخر القصة.

۵:..... ملا باقر مجلسی نے کتاب بحار الانوار میں ایک روایت بحوالہ کشکول علامہ کے مفضل

بن عمر ❶ سے نقل کی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میرے آقا امام جعفر صادق نے فرمایا کہ جب

❶ روی العلامة فی کشکولہا المنسوب الیہ عن المفضل بن عمر قال قال مولای جعفر صادق لما ولی ابوبکر ابن ابی قحافة قال له عمر ان الناس عبید هذه الدنيا لا یریدون غیرها فامنع عن علی واهل بیته الخمس والفی و فدکان شیعتہ اذا علموا ذلك ترکوا علیا علیہ السلام واقبلوا الیک رغبة فی الدنيا وایثار اما ومحاماة علیہا ففعل ابوبکر ذلك و صرف عنهم جمیع ذلك فلما قال ابوبکر بن ابی قحافة منادیا من كان له عند رسول الله ﷺ دین او عدة فلیا تنی حتی اقضیه و الجزل جابر بن عبد الله و الحجر بن عبد الله البجلی قال علی لفاطمة صیری الی ابی بکر واذ کر به فدکا فصارت فاطمة الیه و ذكرت له فد کا مع الخمس و الفی فقال ہاتی بینة یا بنت رسول الله ﷺ فقالت اما فدک فان الله عزوجل انزل علی نبیہ قرآنا یامر فیہ بان یوتینی و ولدی حقی قال الله تعالیٰ وات ذا القربی حقه فکنت انا <<<

ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آدمی دنیا کے دلدادہ ہیں، اس لیے علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت سے خمس اور فدی اور فدک کو روک دو کیونکہ ان کے یار یہ امر جان جائیں گے تو علی رضی اللہ عنہ کو چھوڑ دیں گے اور دنیا لینے کی غرض سے ہماری طرف رجوع کریں گے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا۔ پھر جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ منادی کرائی کہ جس کسی کا رسول اللہ ﷺ پر قرض ہو یا کوئی وعدہ ہو تو وہ میرے پاس آئے کہ میں اس کو ادا کروں گا۔ اور جابر اور جریر بچی کا وعدہ پورا

﴿ وولدی اقرب الخائق الی رسول اللہ ﷺ فححلنی وولدی فدکا فلما تلا علیہ جبرئیل المسکین و ابن السبیل قال رسول اللہ ﷺ ما حق المسکین و ابن السبیل فانزل اللہ تعالیٰ واعلموا انما غنمتم من شئی الخ فقسم الخمس علی خمسة اقسام فقال ما افاء اللہ علی رسولہ من اهل اقری فللہ والرسول ولذی القربی والیتامی والمساکین و ابن السبیل کیلا یكون دولة بین الاغنیاء منکم فما للہ فهو لرسولہ وما لرسول اللہ فهو لذی القربی ونحن ذوی القربی قال اللہ تعالیٰ قل لا اسئلكم علیہ اجر الا المودة فی القربی فنظر ابوبکر بن ابی قحافة الی عمر ابن الخطاب و قال ما تقول فقال عمر و من الیتامی و المساکین و ابناء السبیل فقالت فاطمة الیتامی الذین یاتمون باللہ ورسولہ و بذی القربی و المساکین الذین اسکنوا معہم فی الدنیا و الاخرة و ابن السبیل الذی یسلك مسلکہم قال عمر فاذا الخمس و الفئی کلہ لکم ولمو الیکم ولا شیاعکم فقالت فاطمة اما فدک فاوجبہا اللہ لی و لولدی دون موالینا و شیعتنا و اما الخمس فقسمة اللہ لنا ولموا لینا و اشیا عنا کما فقرأ فی کتاب اللہ قال عمر فما السائر المهاجرین و الانصار التابعین باحسان قالت فاطمة ان کانوا موالینا و من اشیا عنا فلہم الصدقات التی قسمہا اللہ و اوجبہا فی کتابہ فقال عزوجل انما الصدقات للفقراء و المساکین و العاملين علیہا و المؤلفة قلوبہم و فی الرقاب الی آخر القصة قال عمر فدک خاصة و الفئی لکم و لا لیائکم ما احسب اصحاب محمد یرضون بهذا قالت فاطمة فان اللہ عزوجل رضی بذلک ورسولہ رضی بہ قسم علی الموالات و المتبعة لا علی المعادة و المخالفة و من عادانا فقد عاد اللہ و من خالفنا فقد خالف اللہ و من خالف اللہ فقد استوجب من اللہ العذاب الالیم و العقاب الشدید فی الدنیا و الاخرة فقال عمر ہاتی ببینة یا بنت محمد ﷺ علی ما تدعین فقالت فاطمة قد صدقتم جابر بن عبد اللہ و جریر بن عبد اللہ و لم تسئلوا ہما البینة و بینتی فی کتاب اللہ فقال عمران جابرا و جریرا ذکرنا امر اہینا و انت تدعین امر عظیما یقع بہ الردة من المهاجرین و الانصار فقالت ان المهاجرین برسول اللہ و اهل بیت رسول اللہ ہاجرنا الی دینہ و الانصار بالایمان باللہ ورسولہ و بذی القربی احسانا فلا ہجرة الا لینا و لانصرۃ الامنا و لا اتباع باحسان الابنا و من ارتد عنا فالی الجاہلیة فقال لہا عمر و عینا من ابا طیلک و احضرینا من یشہد لک بما تقولین فبعث الی علی و الحسن و الحسین و ام ایمن و اسماء بنت عمیس و كانت تحت ابی بکر بن ابی قحافة فاقبلوا الی ابی بکر و شہد و الہا بجمیع ما قالت و ادعته فقال اما علی فزوجہا و اما الحسن و الحسین ابناہا و ام ایمن فمولا تہا و اما اسماء بنت

بھی کیا۔ تو علی رضی اللہ عنہ نے فاطمہ سے کہا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر فدک کا ذکر کرو، فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ان سے فدک اور فے اور خمس کا ذکر کیا، ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ گواہ لاؤ۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ فدک کو تو خداوند تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے کہ اس کو مجھے اور میری اولاد کو دے دو، یعنی یہ آیت ﴿وَإِذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّةٌ﴾ میں اور میری اولاد رسول اللہ کی سب سے زیادہ اقرب تھے تو آپ نے مجھے اور میری اولاد کو فدک عطا کر دیا تھا۔ جبرئیل علیہ السلام نے پھر اس کے بعد مسکین اور ابن سبیل کو پڑھا تو آپ نے پوچھا کہ مسکین اور ابن سبیل کا کیا حق ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ﴿وَاعْلَمُوا أَنبَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ﴾ نازل کی، پھر خمس کے پانچ حصے لیے اور فرمایا کہ ﴿مَا آفَاءَ لِلَّهِ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ... الخ﴾ جو اللہ کے لیے ہے وہ اس کے رسول کا ہے اور جو رسول کے لیے ہے وہ ہم قرابت داروں کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ﴾ ابو بکر نے عمر رضی اللہ عنہما کی طرف دیکھا اور کہا کہ تم کیا کہتے ہو۔ عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یتیم اور مسکین اور ابن سبیل کون لوگ ہیں؟ فاطمہ نے کہا یتیم وہ لوگ ہیں جو اللہ اور رسول اور ذوی القربیٰ سے یتیم ہوں اور

﴿عمیس فقد کانت تحت جعفر بن ابی طالب فہی تشهد لبنی ہاشم و قد کانت تخدم فاطمہ و کل ہولاء بجزون الی انفسہم فقال علی اما فاطمة فبضعة من رسول اللہ ﷺ و من اذاها فقد اذی رسول اللہ ﷺ و من کذبها فقد کذب رسول اللہ و اما الحسن والحسین فانبا رسول اللہ و سیدا شباب اهل الجنة من کذب فقد کذب رسول اللہ اذ کان اهل الجنة صادقین و امام انا فقد قال رسول اللہ ﷺ انت منی و انا منک وانت اخی فی الدنیا و لآخرة الراد علیک هو الراد علی من اطاعک فقد اطاعنی و من عصاک فقد عصانی و اما ام ایمن فقد شهد لها رسول اللہ ﷺ بالجنة و دعا لاسماء بنت عمیس و ذریتها فقال عمر اتم کما و صفتہم بہ لانفسکم و لکن شهادة الجار الی نفسه لا تقبل فقال علی اذا کنا نحن کما تعرفون و لاتنکرون و شهادتنا لا نفسنا لا تقبل و شهادة رسول اللہ لا تقبل فانا لله و انا الیہ راجعون اذا او عینا لانفسنا تسأ لنا البینة فما من معین یعیین و قد وثبت علی سلطان علی سلطان اللہ و سلطان رسولہ فاخر جتموه من بیته الی بیت غیرہ من غیر بینة الاحجة و سيعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔ ثم قال لفاطمة انصر فی حتی یحکم اللہ بیننا و هو خیر الحاکمین۔ ۱۲

مسکین وہ ہیں جو ان کے ساتھ دنیا اور آخرت میں رہے ہوں، اور ابن سبیل وہ ہے جو ان کا طریق چلتا ہو۔ عمر نے کہا تو خمس اور فے سب تمہارا اور تمہارے احباب اور شیعوں کا ہوا، فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ فدک تو اللہ نے میرے اور میرے بچوں کے لیے کر دیا ہے، اس میں احباب اور شیعوں کا کچھ نہیں، اور خمس کو ہم میں اور ہمارے احباب میں تقسیم کیا ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اور تمام مہاجرین اور انصار و تابعین باحسان کے لیے کیا ہوگا؟ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اگر وہ ہمارے احباب میں سے ہیں تو ان کے لیے وہ صدقات ہیں جن کی خدا نے تقسیم کی ہے، یعنی اس آیت میں ﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ وَالْعَمِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمَوْلَّاتِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ﴾ عمر نے کہا کہ فدک تو تمہارا خاص ہوا اور فے تمہارا اور تمہارے احباب کا ہوا، میں نہیں سمجھتا کہ اصحاب محمد ﷺ اس سے راضی ہو جائیں گے، فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اللہ اور رسول تو اس پر راضی ہو چکے اور محبت اور متابعت ہی پر اس کی تقسیم کی ہے نہ عداوت اور مخالفت پر۔ وہ ہم سے عداوت کرتا ہے جو ہمارا مخالف ہے، وہ خدا کا مخالف ہے اور جو خدا کا مخالف ہے تو وہ خدا کی طرف سے عذاب الیم کا دنیا اور آخرت میں مستحق ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم جس کا دعویٰ کرتی ہو اس کے گواہ لاؤ۔ فاطمہ نے کہا کہ تم نے جابر اور جریر کی تصدیق کی اور ان سے گواہ نہ طلب کیے اور میرا گواہ کتاب اللہ ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جابر اور جریر نے تھوڑی سی شے کا ذکر کیا تھا اور تم تو بہت بڑا دعویٰ پیش کرتی ہو جس سے مہاجرین اور انصار مرتد ہو جائیں گے، فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ جو مہاجر رسول اللہ اور آپ کے اہل بیت کے ساتھ ہیں تو انہوں نے تو ان کے دین کی طرف ہجرت کی ہے، اور انصار وہ ہیں جو اللہ اور رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور ذوی القربی کے ساتھ احسان کریں تو ہجرت بھی ہمارے لیے ہوئی اور نصرت بھی، اور اتباع باحسان بھی ہمارے نہیں ہو سکتا۔ اور جو ہم سے مرتد ہو جائے تو وہ جاہلیت میں جا ملے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ فضول باتیں چھوڑو اور گواہ لاؤ۔ فاطمہ نے علی و حسنین و ام ایمن و اسماء کو بلوا بھیجا، ان سب نے آپ کے دعوے کی پوری پوری گواہی دی۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ علی رضی اللہ عنہ، فاطمہ رضی اللہ عنہا کے زوج ہیں اور حسنین بیٹے ہیں اور ام ایمن ان کی

محب اور اسماء پہلے جعفر بن ابی طالب کی بیوی تھیں تو وہ تو بنی ہاشم ہی کی گواہی دیں گی اور اب فاطمہ کی خدمت کرتی ہیں، اور یہ سب اپنا نفع چاہتے ہیں، علی نے کہا کہ فاطمہ تو ایک جزء رسول اللہ ﷺ ہیں جو ان کو ایذا دے گا وہ رسول اللہ کو ایذا دیتا ہے اور جو ان کی تکذیب کرتا ہے وہ رسول اللہ کی تکذیب کرتا ہے۔ اور حسنین رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کے نواسے ہیں اور جو انان جنت کے سردار ہیں جو ان کی تکذیب کرتا ہے وہ رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کرتا ہے، کیونکہ اہل جنت صادق ہوتے ہیں اور میری شان میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے ہوں اور تو میرا دنیا و آخرت میں بھائی ہے، جو تجھ پر رد کرتا ہے وہ مجھ پر رد کرتا ہے اور جو تیری اطاعت کرتا ہے وہ میری اطاعت کرتا ہے، اور جو تیری نافرمانی کرتا ہے، وہ میری نافرمانی کرتا ہے۔ اور ام ایمن رضی اللہ عنہا کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے جنت کی گواہی دی ہے اور اسماء رضی اللہ عنہا اور اس کی اولاد کے لیے آپ نے دعا دی ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جو تعریف تم کرتے ہو تم ویسے ہی ہو لیکن جار کی شہادت مقبول نہیں ہوتی۔ علی نے کہا کہ جب ہم ایسے ہیں جیسا تم جانتے ہو اور انکار نہیں کرتے اور پھر ہماری شہادت ہمارے لیے مقبول نہیں اور نہ رسول اللہ ﷺ کی شہادت مقبول ہے تو ((انا لله وانا اليه راجعون)) ہم نے اپنے لیے دعویٰ کیا تو تم ہم سے گواہ مانگتے ہو اور ہمارا کوئی معین نہیں کہ وہ گواہی دے اور تم لوگوں نے اللہ کے سلطان پر جسارت کی اور اس کو اس کے گھر سے غیر کے گھر کی طرف بے گواہ و حجت کے نکالا:

﴿وسيعلم الذين ظلموا اى منقلب ينقلبون﴾ پھر فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ چلو خدا ہی ہمارا فیصلہ کرے گا۔ ((وہو خیر الحاکمین)) (بحار الانوار صفحہ ۱۰۲، ۱۰۱)

۶..... احتجاج طبری اور شیعوں کی دوسری کتابوں میں ایک خطبہ لکھا ہے جو خطبہ فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کے نام سے مشہور ہے اور جس میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت فاطمہ کو جب خبر ہوئی کہ ابو بکر نے فدک سے محروم کرنے کا ارادہ کر لیا ہے تو وہ مسجد نبوی میں ابو بکر کے پاس آئیں اور بہت بڑا فصیح و بلیغ خطبہ ارشاد کیا، جس میں ان کے ظلموں کی شکایت کی اور آیات قرآنی اور دیگر حجتوں سے ابو بکر کی ملامت کی اور اپنے حق ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ سعی کا اٹھانہ رکھا۔

اس خطبہ کو چونکہ بہت بڑا ہے ہم آئندہ موقع پر بیان کریں گے، مگر اس میں کچھ ذکر بہہ فدک کا یا اپنے قبضہ کا اس پر نہیں فرمایا، جو کچھ فرمایا وہ میراث کے متعلق ہے، جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ اس تقریر میں آپ نے فرمایا: ((انتم الآن تزعمون ان الارث لنا افحکم الجاهلیة تبغون یا ابن ابی قحافة فی کتاب اللہ ترث اباک ولارث ابی لقد جنئت شیئا فریا افعلی عمد ترکتم کتاب اللہ ونبذتموه وراء ظهرکم اذ یقول وورث سلیمان داؤد..... الخ)) کہ تم گمان کرتے ہو کہ ہم کو میراث نہیں مل سکتی کیا جاہلیت کا حکم چلاتے ہو؟ اے ابو بکر! کیا خدا کی کتاب میں یہ ہے کہ تم اپنے باپ کے وارث ہو اور مجھے میرے باپ کی میراث نہ ملے؟ کیا جان بوجھ کر تم نے خدا کی کتاب کو چھوڑ دیا اور اسے پس پشت پھینک دیا، خدا تو صاف فرماتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام وارث ہوئے اپنے باپ داؤد علیہ السلام کے، اور زکریا نے خدا سے دعا کی کہ الہی مجھے اولاد دے جو میری اور آل یعقوب علیہ السلام کی وارث ہو، باوجود اس کے تم سمجھتے ہو کہ نہ میرا کچھ حق ہے نہ مجھے باپ کی میراث مل سکتی ہے، خیر خدا تم سے سمجھے اور قیامت کے دن تم کو معلوم ہو جائے گا۔

۷:..... بحار الانوار کے صفحہ ۱۰۴ میں لکھا ہے کہ روایت کی گئی ہے کہ ۱۰ فاطمہ، ابو بکر رضی اللہ عنہما کے پاس آئیں اور پوچھا کہ تمہارا وارث کون ہوگا؟ انہوں نے کہا کہ میری اہل اور اولاد۔ آپ نے فرمایا کہ پھر میں کیوں اپنے باپ کی وارث نہ ہوں؟ تب انہوں نے جواب دیا کہ پیغمبر کا کوئی وارث نہیں ہوتا، لیکن میں اسی کام میں صرف کروں گا جس میں پیغمبر خدا ﷺ خرچ کرتے تھے اور انہیں دوں گا جن کو پیغمبر خدا ﷺ دیا کرتے تھے۔ تب آپ نے فرمایا کہ قسم ہے خدا کی جب تک میں زندہ رہوں گی ایک بات بھی تم سے نہ کروں گی، اور پھر جب تک زندہ رہیں انہوں نے ابو بکر رضی اللہ عنہ سے بات چیت نہ کی۔

۱۰ وروی ان فاطمة جاءت الی ابی بکر بعد وفاة رسول اللہ ﷺ فقالت یا ابا بکر من یرثک اذا مت قال اہلی وولدی قالت فما لی لارث رسول اللہ ﷺ فقال ان النبی لایورث ولكن انفق علی من کان ینفق علیہ رسول اللہ ﷺ واعطی ماکان یعطیہ، قالت واللہ لا کلمک بکلمة ما حییت فما کلمتہ حتی

۸:..... بحار الانوار میں لکھا ہے کہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ❶ فاطمہ رضی اللہ عنہا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئیں اور میراث کا مطالبہ کیا، ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پیغمبروں کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ تو آپ علی رضی اللہ عنہ کے پاس واپس تشریف لائیں، علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پھر واپس لوٹ کر جاؤ اور کہو کہ پھر سلیمان داؤد کے کیوں وارث ہوئے، زکریا نے کیوں کہا کہ خدایا مجھے ایک ولی دے کہ جو میرا اور آل یعقوب علیہم السلام کا وارث ہو، مگر انہوں نے نہ سنا۔

۹:..... بحار الانوار میں جابر بن عبد اللہ انصاری نے امام باقر سے روایت کی ہے کہ ❷ علی رضی اللہ عنہ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ جاؤ اور اپنے باپ کی میراث کا مطالبہ کرو، اس پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئیں اور کہا کہ میرے باپ کی میراث مجھے دو۔ انہوں نے جواب دیا کہ پیغمبر کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ تب آپ نے فرمایا: کیا سلیمان علیہ السلام اور داؤد علیہم السلام کے وارث نہیں ہوئے اس پر ابو بکر خفا ہوئے اور کہا کہ پیغمبر کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ تب فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ کیا زکریا علیہ السلام نے یہ نہیں کہا ﴿فَهَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا ۝ يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ﴾ اس پر بھی انہوں نے یہی جواب دیا کہ ((ان النبی لا یورث)) پھر فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ کیا خدا نے نہیں کہا ہے کہ ﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثِيَيْنِ﴾ اس پر بھی انہوں نے یہی کہا کہ: النبی لا یورث۔

❶ وقيل جاءت فاطمة الى ابى بكر فقالت اعطني ميراثي من رسول الله ﷺ قال ان الانبياء لا تورث ما تركوه فهو صدقة فرجعت الى علي ﷺ فقال راجعي فقولی ما شان سليمان ورث داؤد و قال زكريا فهب لي من لدنك وليا يرثني ويرث من آل يعقوب فابوا و ابى ۱۲ بحار الانوار صفحہ ۱۰۴۔

❷ وعن جابر بن عبد الله الانصاري عن ابى جعفر ان ابا بكر قال فاطمة النبی لا یورث قالت قدورت سليمان داؤد قال زكريا فهب لي من لدنك وليا يرثني ويرث من آل يعقوب فنحن اقر ب الى النبی ﷺ من زكريا الى يعقوب و عن جعفر قال قال علي فاطمة انطلقی فاطلبی ميراثك من ابيك رسول الله ﷺ فجاءت الى ابى بكر فقالت اعطني ميراثي من ابى رسول الله ﷺ قال النبی لا یورث فقالت الم يرث سليمان داؤد فغضب و قال النبی لا یورث يقالت الم يقل زكريا فهب لي من لدنك وليا يرثني ويرث من آل يعقوب فقال النبی لا یورث فقالت الم يقل يوصيكم الله في اولادكم فللذكر مثل حظ الانثيين فقال النبی لا یورث۔ ۱۲ (بحار الانوار صفحہ ۱۰۴)

۱۰:..... بحار الانوار میں لکھا ہے کہا ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ ❶ پیغمبر کی وفات کے بعد فاطمہ فدک مانگنے کے لیے آئیں۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ تم سوائے سچ کے کچھ نہ کہو گی، لیکن گواہ لاؤ اس پر وہ علی رضی اللہ عنہ کو لے گئیں اور انہوں نے گواہی دی، پھر ام ایمن رضی اللہ عنہا کو لے گئیں، انہوں نے بھی شہادت دی، اس پر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایک مرد عورت اور لاؤ تو میں فدک کی سند لکھ دوں۔

۱۱:..... احتجاج طبرسی صفحہ ۵۳ مطبوعہ تہران قدیم اور احتجاج طبرسی جلد ۱ صفحہ ۲۲۳ مطبوعہ ایران ۱۴۲۲ء میں لکھا ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس بات کی اطلاع ہوئی کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک سے محروم کر دیا تب آپ نے ان کو یہ خط لکھا:

((شقوا متلاطمات امواج الفتن بحیازیم سفن النجاة و حطوا
تیجان اهل الفخر بجمع اهل الغدرو استضاؤ بنور الانوار،
اقتسمو امواریت الطاهرات الابرار، واحتقبوا ثقل الاوزار،
بغصبهم نحلة النبی المختار، فکانی بکم تردد ونفی
العمی، كما یتردد البعیر فی الطاحونة، اما والله لو اذن لی
بما لیس لکم به علم لحصدت رؤسکم عن اجسادکم کحب
الحصید بقواضب من حدید، ولقلعب من جماجم
شجعانکم ما اقرح به آماقکم وأوهش به محالکم، فانی منذ
عرفت مردی العساکر، ومفنی الجحافل ومبید خضر ائکم،
ومحمد ضوضائکم، وجزار الدواین اذ انتم فی بیوتکم
معتکفون وانی لصاحبکم بالامسس لعمرابی لعن تحبوا ان

❶ وعن ابی سعید الخدری قال لما قبض رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم جاءت فاطمة علیها السلام تطلب فدکا فقال ابو بکر انی لا علم ان شاء الله انک لن تقولی الا حقا ولكن هاتی بیئتک فجاءت بعلی تشهد ثم جاءت بام ایمن فشهدت فقال امرأة اخری اور جلا فکتبت لك بها ۱۲.

تكون فينا الخلافة والنبوة، وانتم تذكرون احقاد بدر و
 ثارات احد، اما والله لو قلت ما سبق من الله فيكم لتداخلت
 اضلاعكم في اجوافكم كتداخل اسنان دوارة الرحي فان
 نطقت تقولون حسد، وان سكت فيقال ان ابن ابى طالب
 جزع من الموت، هيهات هيهات، الساعة يقال لى هذا؟ وانا
 لمميت المائت وخواض المنايا فى جوف ليل حالك، حامل
 سيفين الثقيلين، والرمحين الطويلين، ومنكس الروايات فى
 غط مط الغمرات، مفرج الكربات عن وجه خير البريات،
 ايهنو افوالله، لا بن ابى طالب انس بالموت من الطفل الى
 محالب امه هبلتكم الهوابل لوبحت بما انزل الله سبحانه فى
 كتابه فيكم لا اضطربتم اضطراب الارشية فى الطوى البعيدة،
 ولخرجتم من بيوتكم هاربين وعلى وجوهكم مائمين،
 ولكنى اهون وجدى حتى القى ربي بيد جذاء صفراء من
 لذاتكم خلوا من طحناتكم، فما مثل دنياكم عندى الا كمثل
 غيم علا فاستعلى ثم استغلظ فاستوى، ثم تمزق فانجلى،
 رويداً فعن قليل ينجلى لكم القسطل وتجنون ثمر فعلكم
 مرا، و تحصدون غرس ايديكم ذعافاً ممقراً وسما قاتلاً و
 كفى بالله حكيماً، وبرسول الله خصيماً، وبالقيامة موقفاً،
 فلا بعد الله فيها سواكم، ولا اتعس فيها غيركم، والسلام
 على من اتبع الهدى.))

”یعنی پہلے تو تم فتنوں سے بچے اور فخر و غرور کو چھوڑ دیا اور نور نبوت کی روشنی میں
 آئے لیکن بالآخر تم نے اہل بیت پاک کی میراث لوٹ لی اور رسول اللہ ﷺ کا

عطیہ چھین کر بارگناہ سر پر لیا، میں دیکھ رہا ہوں کہ تم گمراہی میں اس طرح ٹکراتے پھر رہے ہو جس طرح اونٹ چکی میں پھرتا ہے، خدا کی قسم! اگر مجھ کو اجازت ہوتی تو میں تلوار سے تمہارے سر اس طرح اڑا دیتا جس طرح کھیتی کاٹ کر ڈھیر کر دیتے ہیں، اور تمہارے بہادروں کو اس طرح قتل کرتا کہ تمہاری آنکھیں پھوٹ جاتیں اور تمہارے گھر وحشت ناک ہو جاتے، تم ابتدا سے مجھ کو جانتے ہو کہ میں نے فوجیں غارت کر دی ہیں، لشکروں کو تباہ کر دیا ہے، تمہاری سرسبز زمینیں تباہ کر دی ہیں، تمہارے ہنگاموں کو دبا دیا ہے، تمہارے بہادروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ اس وقت تم اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے تھے، کل تم نے مجھ کو اپنا سردار مان لیا تھا، لیکن قسم ہے کہ تم نے دل سے کبھی نہیں چاہا کہ ہمارے گھر میں خلافت اور نبوت دونوں رہنے پائیں، کیونکہ تم کو بدر کے کینے اور احد کے خون بہا کبھی نہیں بھولے، بخدا اگر میں خدا کے فیصلے کو جو تمہارے متعلق وہ کر چکا ہے ظاہر کر دوں تو تمہاری ہڈیاں پسلیاں اس طرح آپس میں ٹکرا جائیں جس طرح چکی کے دونوں پاٹوں کے دندانے مل جاتے ہیں، میں کچھ کہتا ہوں تو تم کہتے ہو کہ حسد سے کہتا ہوں اور چپ رہتا ہوں تو لوگ کہتے ہیں کہ ابوطالب کا بیٹا موت سے ڈر گیا۔ افسوس صد افسوس! میں خود موت ہوں اور میری نسبت یہ کہا جاتا ہے، میں مرگ گمشدہ ہوں، میں اندھیری راتوں میں معرکوں میں گھس جانے والا ہوں، میں تیغ و سنان کا حامل ہوں، میں لڑائی کے ہنگاموں میں نیزوں کو ٹکرا کر توڑ دیتا ہوں، میں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے سے مشکلیں ہٹا دی ہیں، ذرا ٹھہرو! خدا کی قسم! ابوطالب کا بیٹا موت سے اس قدر مانوس ہے جتنا بچہ ماں کی چھاتی سے۔ تم پر موت آئے خدا نے جو کچھ تمہاری شان میں کہا ہے اگر میں ظاہر کر دوں تو تم رسی کی طرح بل کھاؤ اور گھر چھوڑ کر بھاگو، ادھر ادھر ٹکراتے پھرو، لیکن میں اپنے جوش کو دباتا ہوں اس وقت تک کہ اپنے خدا سے اسے حال میں ملوں کہ میرے

ہاتھ دنیا کی لذتوں سے (جس کو تم محبوب رکھتے ہو) خالی ہوں، کیونکہ تمہاری دنیا میرے نزدیک گویا ایک ابر ہے جو بلند ہوا پھر دلدار ہو کر ہر طرف چھا گیا، پھر پھٹ کر نکل گیا۔ ذرا ٹھہر جاؤ تھوڑی دیر میں غبار صاف ہو جائے گا اور تم اپنے کیے کا پھل پاؤ گے جو تلخ ہوگا، یا اپنے ہاتھوں کی بوئی ہوئی کھیتی کا ٹو گے جو سم قاتل ہوگی۔ اور کافی ہے اللہ کا حاکم ہونا اور رسول اللہ ﷺ کا مدعی ہونا اور میدان قیامت کا عدالت گاہ ہونا، خدا اس دن کسی کو تمہارے سوا اپنی رحمت سے دور نہ رکھے، اور تمہارے سوا کسی کو ہلاک نہ کرے، اور جو ہدایت کے پیچھے چلے اس پر سلام ہو..... اتنی“

۱۲:..... بحر الجواہر مصنفہ سید محمد باقر بن سید محمد مطبوعہ ایران صفحہ ۳۲۳ میں جعفر جعفی سے

یہ روایت ہے کہ ❶ ابو بکر نے اشجع بن مزاحم کو جو ایک شجاع آدمی تھا اور اس کا بھائی علی رضی اللہ عنہ کے

❶ اصل عبارت یہ ہے: از جابر جعفی مروی است کہ ابو بکر صدقات دہات مدینہ و فدک را غصب نموده بو و سائر اطراف نواحی مدینہ را در عہدہ اشجع بن مزاحم ثقفی نموده و او مردے بود دلیر و با علی رضی اللہ عنہ دشمن بعلت آنکہ برادر او در جنگ ہوازن بدست آنحضرت کشتہ شدہ بود و چون بیرون آمد اول، محلے را کہ دست تعدی برا و کشود مزرعہ بود از اہل بیت مسمیٰ بانقیہ اہل مزرعہ رسولے نزد آنحضرت فرستادند کیفیت را علام نمودند، آنحضرت رضی اللہ عنہ عمامہ سیاہ ہے بر سر بست و دو شمشیر بر میان بست و بر اسپ صحاب سوار شد و اسپ دیگر را بیدک کشید و حسنین رضی اللہ عنہما و عمار و فضل بن عباس و عبداللہ جعفر و عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما را بہمراہ برد و چون ماں مزرعہ رسید در مسجد فضا فرود آمد و امام حسین را بطلب اشجع فرستاد و چون نزد او رفت فرمود جب امیر المومنین ابن ملعون گفت کیست امیر المومنین فرمود علی گفت بلکہ ابو بکر است کہ در مدینہ و اگراردہ اورا، باز حضرت فرمود جب علیا، گفت من سلطانم و اورعیت و احتیاج بمن دار دائو بیاید، حضرت امام حسین برگشت و کیفیت را عرض کرد فرمود بعمار تو برو اورا برفق و مدارا بیار، پس عمار رفت و گفت مرحبا یا اخاتقیف چہ چیز ترا بران داشتہ کہ با امیر المومنین بد سلوکی کنی و چیزیکہ در تصرف اوست بگیری حال بیا و غدر خود بگوفحش بسیار بعمار داد و عمار ہم شدید الغضب بود دست بہ شمشیر برد کسے آمد بنزد آنحضرت کہ در باب عمار را کہ الحال اورا پارہ پارہ می کنند پس آنحضرت اہل بیتی کہ بہمراہ آوردہ بودند فرستاد و فرمود متر سید و اورا کشاں کشاں بنزد من آرید پس ایشاں آمدند و اورا کشاں کشاں آوردند آنحضرت فرمود و اگر آرید اورا و تعجیل مکنید ⇐⇐⇐

ہاتھ سے قتل ہوا تھا فدک اور مدینہ کی دیگر املاک پر اپنی طرف سے متولی کیا۔ اس نے اہل بیت کی املاک کو ضبط کر لیا اور ان کی رعایا پر ظلم شروع کیا۔ ان لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خبر دی اور اس کے ظلم و ستم کا استغاثہ کیا۔ یہ سنتے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ بجلت سوار ہوئے اور عمامہ سیاہ سر

﴿﴾ کہ بتیز مغزی حجت خدا تمام نشود بعد ازاں فرمود وای بر تو بچہ متمسک اموال اہل بیت را حلال دانستہ و چہ حجت ترا بجرأت انداختہ براین کہ گردہ آن ملعون گفت تو نیز بچہ حجت قتل مردم را بر خود حلال کردہ، و من رضاء صاحب خود را دوست تر دارم از موافقت باتو۔ حضرت فرمود بلے تقصیرے بر خود سراغ ندارم مگر کشتن برادرت و آن بگفتہ رسول خدا بود چیزے نبود کہ تلافی خواہد خدا ترا ہلاک کند و صورت راقبیح گرداند۔ اشجع گفت بلکہ خدا ترا ہلاک کند و عمرت راقطع نماید کہ پیوستہ با خلفاء حسد می ورزی و آن ترا بہلاکت می کشاند و بمراد خود آخر نخواہی رسید پس فضل بغضب در آمد و شمشیر خود را بر او را حوالہ نمود و در او را ابادست راست او انداخت پس اصحاب او کہ سی نفر بودند و ہمہ از شجاعان بر فضل هجوم آوردند و امیر المومنین دست بذوالفقار بردہ چون برق ذوالفقار برق چشم آنحضرت دید ندزہرہ ایشاں آب شدہ و براق خود را ریختند و گفتند الطاعة الطاعة فرمود وای بر شما سیراین صاحب کو چک خود را ببرد نزد آن صاحب بزرگ خود کہ مثل شما کسی نیستند کہ کشتن شما خواہی نخواہی داشته باشد پس رفتند بمدینہ و سر رفیق خود را پیش ابوبکر انداختند پس او مردم را طلبید و ترغیب نمود کہ بروند بسر آنحضرت و خون اشجع را بخوانند مردم سکوت کردند گفت شما چرا گنگ شدہ ایایا پیرو خذف گردیدہ اید حجاج بن صخر گفت بسم اللہ تو پیشوائے مائی پیش برو تا ما از عقب تو بیائیم و اگر بیائی مجموع قشون را ذبح کند و نحر نماید مثل نحر کردن شتران، دیگرے گفت می خواہی کہ باستراحت در خانہ بنشیننی و مارا بفرستی نزد جرار اعظم کہ مردم را شمشیر خود می رباید بخدا ملاقات عزرائیل بر ما آسان تر است از ملاقات او، پس ابوبکر نفرین کرد بر ایشاں را و بعمر شوری نمود او گفت خالد را بفرست پس خالد را گفت تو سیف اللہ هستی جمعیت خوے بردار و برو علی کہ شیر درندہ مارا کشتہ و می خواہد کہ تفرقہ در میان امت بیندازد اولا اور ابطریق خوش مستمال نمودہ تایباید و بخانہ خود بنشیند کہ ما از تقصیر او گذاشتیم والا اور ابا سیری بیار پس خالد باپا نصد سوار از شجاعان مکمل و مسلح روانہ شد فضل بن عباس چون گرد لشکر را دید عرض کرد، یا امیر المومنین لشکر آمد حضرت فرمود تشویش مکن و آسان بگیر اینہارا کہ اگر ہمہ بزرگان قریش قبائل ہوازن جمع شوند و حشے از برائے من حاصل نشودا نگاہ برخاست و جلو اسپ را گرفته خواہید بر پشت خود بر روئے زمین بقصد اہانت و بے التفاتی و بر نخاست تا پواز سم اسپاں بلند شد و ایشاں رسیدند انگاہ بر خاست چون خالد را دید فرمود یا ابا سلیمان چہ چیز ترا پورده است باین سمت گفت کسی مرا فرستادہ کہ تو بہتر از من میدانی فرمود حال بگو گفت عالمی و محتاج بتعلیم نیستی گفت ایس چہ عمل است کہ از تو صادر شدہ و این چہ عداوتے است کہ از تو ظاہر گردید ا ﴿﴾ ﴿﴾ ﴿﴾

پر رکھا اور دو تلواریں باندھیں، امام حسین رضی اللہ عنہ، عمار اور عبداللہ پسران حضرت عباس اور عبداللہ بن جعفر کو ہمراہ لیا اور اس گاؤں کے پاس جو مسجد تھی وہاں ٹھہرے، اور امام حسین رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ ابوبکر کے متولی کو بلا لاؤ۔ آپ گئے اور اس سے کہا کہ امیر المومنین تجھے بلاتے ہیں، اس نے کہا کہ کون امیر المومنین؟ آپ نے فرمایا کہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، اس نے جواب دیا

﴿﴾ ﴿﴾ ﴿﴾ گر تو این مرد یعنی ابوبکر را خوش نداری ابا تو چنیں نیست و ترا دوست می دار دو ولایت اور نگیں نباشد برخواطر تو کہ بعد از اسلام و ہجرت دیگر نزاعے باقی نماندہ بگذار مردم را بحال خود می خواهند گمراہ نشوند یارستگار نو عبث باعث تفرقہ میان امت مشو آتش خاموش شدہ رامیفر وز کہ اگر چنیں کردی عاقبت خوشی نخواهد داشت آنحضرت فرمود تہدید کی مرابخود و پسر ابوقحافہ مگر نمی دانی کہ از سخنان تو داد با مثال من تہدیدے واقع نمی شود وا گزار این لاف و گزاف را مطلبے کہ داری بگو گفت بمن گفته اند کہ اگر برگشتی ازین اطویق در پیش ما عزیز و مکرم خواهی بود وا گر برنہ گشتی ترا با سیری بیرم نزدا و حضرت فرمودای کنیز زادہ تومی توانی حق و باطل را ازیک دیگر فرق کنی و می توانی مثل منی را اسیر وار بیری اے پسر مرتد از اسلام وائے بر تو مراہمگماں مالک بن نویرہ کردہ کہ رفتی و اور اکشتی وزن اور امتصرف شدی اے خالد باین عقل سبک و رای خالی از شہرم آمدہ بامن معارضہ کنی بخدا قسم اگر شمشیر خود را بکشم بر تو و ایناں کہ ہمراہ تو اندسیر می کنم از گوشت بدن شما ہرچہ در صحرا از کفتا رو گرگ باشد و اے بتومن آن عیستم کہ تو در قیقت مرا تو انید کشیدو من قاتل خود را می شناسم و از خدا آرزومی کنم صبح و شام کہ مرگ مرا ازین زحمت روزگار نجات و ہدوا گر بخواہم حالادرزیرد یوار ہمیں مسجد ترا خواہم کشت خالد بغضب در آمدو گفت تہدید و عید تو مثل غریدن شیرمی ماند و در سوراخ خود حزیدن و گریختن مثل روباہ چہ بسیار بزبان تعدی می کنی و فعلت مطابق قولت نیست، حضرت گفت ہر گاہ عقیدہ تو این ست پس بایست تا بفعل ہم برسی و شمشیر ذوالفقار از غلاف کشیدہ براو حوالہ نمود خالد ہمیں کہ برق چشم آنحضرت و برق ذوالفقار را مشاہدہ نمود مرگ معائنہ دید گفت یا ابا الحسن برائے این نیامدہ بودم پس آنحضرت پشت ذوالفقار ابرو فرود آور دواز اسپ در غلطید و قاعدہ آنحضرت نبود کہ شمشیر را فرو آوردی دوبارہ دوبارہ برگرداند مبادا کہ اور ابترس و جبن حمل نمایند، اصحاب خالد ازین کار آنحضرت هول غریبی و ترس عجیبے بہم رسانیدند، پس آنحضرت بایشان خطاب نمود کہ چرا حمایت سید و بزرگ خود نمی کنید واللہ اگر من سردار شما بودم حال سرہائے شمارامی کندم و بر من آسان تر بود از آنکہ دانہ گندم را از خوشہ بچیتد و باین رشادت مال خدا و رسول و مسلمانان را می بلید۔ پس مثنی بن الصباح کہ عاقل کاملے بود از اصحاب خالد گفت واللہ ما بعداوت و دشمنی نیامدہ ایم یا آن نبود کہ ترانشناسیم بلکہ کو چک و بزرگ مامی دانیم کہ توئی شیر خدا در زمین و شمشیر انتقام او بر معاندین لیکن ماما موریم و بجبر ﴿﴾ ﴿﴾ ﴿﴾

کہ امیر المؤمنین تو ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں جو خلیفہ ہیں، اس پر امام حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اچھا علی بن ابی طالبؑ بلا تے ہیں ان کے پاس چلو، اس پر اشجع نے کہا کہ میں سلطان ہوں اور علی رضی اللہ عنہ عوام میں سے ہیں اور ان کو مجھ سے کام ہے تو خود ان کو میرے پاس آنا چاہیے۔ اس پر امام حسین رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ افسوس ہو تجھ پر کیا میرے والد جیسا عوام میں سے ہو اور تو سلطان، اس نے کہا کہ ہاں بے شک۔ تمہارے باپ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی، مگر بجز واکراہ۔ اور ہم نے ان کی بیعت خوشی سے کی ہے۔ یہ سن کر امام حسین رضی اللہ عنہ واپس آئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر دی، تب آپ عمار رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ تم اس کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم مثل خانہ کعبہ کے ہیں کہ اس کے پاس لوگ آتے ہیں نہ یہ کہ وہ لوگوں کے پاس جائے۔ عمار رضی اللہ عنہ اشجع کے پاس گئے اور اس سے سخت گفتگو کی، یہاں تک کہ نوبت اس کی پہنچی کہ عمار رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ تلوار کی طرف بڑھایا۔ اس کی خبر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو

↳↳↳ مارا فرستادہ اندو مامور معذور است خدا تلف کند اورا کہ مارا فرستاد، پس آنحضرت شرم کرد از سخن آن مردور ورا از ایشاں گردانید و با خالد شوخی و مزاح می نمود بعلت صدمہ والے کہ باور سیدہ از ضرب پشت شمشیر واوھیچ جواب نمی دادانگاہ فرمود وای برتو اے خالد چہ بسیار مطیع و فرمانبردار گناہگاران و عہد شکنان گردیدہ مگر نقل روز غدیر کیایت نکردترا بحق آن کسی کہ دانہ راشگافتنہ اگر آنچه بخیال تو پسر ابو قحافہ و پسر خطاب رسیدہ چیزے را اظہار می گردید واز شماشمہ ازاں بظہور می رسید اول کسیکہ باین شمشیر کشتہ می شدتو وایشاں می بودیدو آنچه مقدر الہی بود بعمل می آید و مشیت آن بدبخت ترافاسد ملی کندو تو ہم دانستہ چشم از حق می پوشی و حال آمدہ کہ با این کثافت مرا اسیر وار بیری بعد از آنچه بچشم خود دیدی و تجربہا کر دی چنان می دانی کہ آنچه رفیق در وقتیکہ ترامی فرستاد بتو گفت و باہم شوری و صلاح گردید بر من مخفی و پوشیدہ است چنان و چنان گفتند و تومی گفتی کہ این ہمان ابو الحسن است کہ عمر بن عبدو دراکشت و مرحب رباد و نیم کرد ودر خیبر را، او جواب بتو گفت تو ہمیں نقلہائے گزشتہ اورامی کنی آنہا از برکت دعائے پیغمبر بود و حال پیغمبر از دنیا رفتہ و آنہارا نمی تو اند کرد پس بترس اے خالد از خدا و رفیق خیانت کاراں مباش، خالد گفت یا ابا الحسن واللہ می دانم کہ چی می گوئی و طائفہ عرب و عامہ مردم از تورو گردان نشدہ اند مگر بمحبت دین آباء واجداد خود از قدیم واز عداوت اینکہ سرہائے ایشاں را انداختہ بودی و میل با ابو بکر بہم نرسانید ند مگر بعلت اطمینان پاس و سطوت او و نرمی طبیعت او و زیادہ بر حق ایشاں دادن۔ ۱۲۔

پہنچی، آپ نے اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ اشجع کو جا کر پکڑ لاؤ، اس پر آپ کے اہل بیت جو آپ کے ہمراہ تھے گئے اور اشجع سے کہا کہ آج تو علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے اور اسے پکڑ لائے، اسے دیکھ کر آپ نے فرمایا کہ کیا سبب ہے کہ تو نے اہل بیت کا مال لے لیا اور اس پر اپنا قبضہ کیا۔ اس نے جواب دیا کہ کیا سبب ہے کہ تم نے آدمیوں کا خون بہایا۔ اور میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فرمان و مرضی کو تمہاری موافقت اور اتباع سے بہتر جانتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ میں کوئی اپنا گناہ نہیں سمجھتا سوائے اس کے کہ میں نے تیرے بھائی کو مارا ہے، اور وہ باعث انتقام نہیں ہو سکتا، خدا تجھے ذلیل کرے۔ اس نے بھی ایسا ہی سخت جواب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیا اور کہا کہ خلفاء کے حسد میں تم ہلاک ہو گے۔ اس پر فضل کو غصہ آیا اور اس کا سر اڑا دیا، اس پر اشجع کے ہمراہیوں نے فضل پر حملہ کیا۔ یہ دیکھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ذوالفقار میان سے نکال لی۔ جب اشجع کے ہمراہیوں نے علی رضی اللہ عنہ کی چمکتی ہوئی آنکھیں اور ذوالفقار کی چمک دیکھی تو اپنے ہتھیار پھینک دیے اور کہا کہ ہم اطاعت کرتے ہیں۔ علی رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ اس اپنے چھوٹے صاحب کا سر اپنے بڑے صاحب کے پاس لے جاؤ، چنانچہ اس کے ہمراہی اشجع کا سر لے گئے اور اس کو ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سامنے ڈال دیا۔ یہ حالت دیکھ کر تمام مہاجرین و انصار جمع ہوئے، اس وقت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تمہارے بھائی ثقفی نے خدا اور اس کے رسول کے خلیفہ کی اطاعت کی اور میں نے اسے صدقاتِ مدینہ پر متولی کیا اور اب علی رضی اللہ عنہ نے اسے اس بری طرح سے مارا اور مثلہ کیا، اب چاہیے کہ جو تم میں سے شجاع ہیں وہ جائیں اور اس کا تدارک کریں۔ سب اسے سن کر سکتے میں رہ گئے اور نقش بردیوار ہو گئے، ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کیا تم لوگ زبان نہیں رکھتے اور کچھ بولتے نہیں؟ اس پر ایک اعرابی نے کہا کہ اگر تم چلتے ہو تو ہم بھی چلتے ہیں، اور دوسرے نے کہا کہ ملک الموت کا دیکھنا بہتر ہے علی کے دیکھنے سے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم علی رضی اللہ عنہ سے ڈرتے ہو اور مجھے ایسا جواب دیتے ہو۔ اس پر عمر رضی اللہ عنہ متوجہ ہوئے اور کہا کہ یہ کام سوائے خالد کے کسی سے نہیں ہو سکتا۔ تب ابو بکر رضی اللہ عنہ نے خالد سے کہا کہ یا ابا سلیمان تم سیف اللہ ہو خدا کی تلوار، تم ایک فوج لے کر جاؤ کہ علی نے

ہماری رفقا میں سے ایک ایسے شخص کو جو شجاعت میں بے نظیر ہے قتل کیا ہے، علی کو لے آؤ۔ اور کہو کہ اگر تم چلتے ہو تو تمہاری خطا معاف ہوگی اور اگر وہ لڑائی پر آمادہ ہوں تو ان کو زندہ پکڑ کر لے آؤ، یہ سن کر خالد پانچ سو مردان کا رزار لے کر روانہ ہوئے۔ فضل نے ان کو آتا دیکھ کر علی رضی اللہ عنہ کو خبر کی۔ آپ نے فرمایا کہ تمام صناید قریش اور سوران ہوازن جمع ہوں تب بھی میں ان سے نہیں ڈرتا، خالد وہاں پہنچے اور علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ یہ کیا سخت حرکت تھی جو تم نے کی اور کیوں بجھی ہوئی آگ کو مشتعل کیا؟ آپ نے فرمایا کہ تم مجھے اپنی شجاعت اور ابو بکر رضی اللہ عنہ سے ڈراتے ہو اور مجھے مالک نویرہ جانتے ہو کہ جس کو تم نے مارا اور اس کی بی بی کو اپنے نکاح میں لائے۔ میں اپنے قاتل کو خود جانتا ہوں اور شہادت کی امید رکھتا ہوں، اگر میں چاہوں تو تمہیں ابھی اس مسجد کے صحن میں مار کر گرا دوں۔ اس پر خالد غصہ میں آئے، اور آپ نے ذوالفقار نکالی جب خالد نے آپ کی آنکھ اور ذوالفقار کی چمک دیکھی تو گڑ گڑانے لگے، حضرت نے تلوار کا قبضہ خالد کی پشت پر مارا کہ وہ زمین پر گر گئے۔ یہ حالت دیکھ کر ابن صباح نے کہ ایک عاقل مرد تھا کہا کہ بخدا اے علی! ہم براہِ عداوت نہیں آئے، تم شیر خدا اور شمشیر غضب الہی ہو ہم سب آپ کے خادم ہیں، اس پر حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ نرم پڑے اور خالد سے مزاح کرنے لگے، خالد درد کمر سے بے خود تھے، آپ نے فرمایا: اے خالد! تعجب ہے کہ غدیر خم کا معاملہ تمہاری یاد سے جاتا رہا اور بہت جلد تم نے ناکشیں اور خائنین کی بیعت کر لی اور اب چاہتے ہو کہ مجھے قید کر کے لے جاؤ، کیا تم حالتِ عمر بن عبدود اور مرحب اور جنگ خیبر کی بھول گئے؟ اس پر خالد نے کہا کہ جو آپ فرماتے ہیں وہ میں جانتا ہوں لیکن عرب نے آپ کو آپ کی تلوار کے خوف سے چھوڑ دیا ہے اور ہم نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت صرف ان کی نرمی اور زائد از استحقاق مال ملنے کی امید پر کی ہے۔

ان روایتوں میں جو تناقض اور اختلاف ہے وہ ایسا صریح اور صاف ہے کہ اس میں تاویل کی کچھ گنجائش نہیں ہے، اور یہ ناممکن ہے کہ کل روایات متناقضہ کی صحت تسلیم کی جائے اور تسلیم صحت کے بعد دعویٰ ہبہ کا زبان پر لایا جائے۔ ہم ان اختلافات میں سے بعض ضروری

اور ظاہری اختلاف اب بیان کرتے ہیں۔

پہلی روایت جو احتجاج طبرسی سے ہم نے نقل کی ہے اس میں یہ لکھا ہے کہ جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا وکیل فدک سے نکال دیا گیا تو وہ خود حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئیں اور ان سے سوال کیا کہ کیوں میرے باپ کی میراث سے مجھے محروم کرتے ہو؟ اور دوسری روایت میں جو علل الشرائع سے ہم نے لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کے وکیل کو فدک سے نکال دیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ مسجد میں آئے اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیوں تم نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کے وکیل کو فدک سے نکال دیا؟ علل الشرائع کی روایت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے وکیل فدک کے نکالے جانے کے بعد حضرت علی، ابو بکر رضی اللہ عنہما کے پاس آئے، اور احتجاج طبرسی کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ان کے پاس آئیں۔

شاید حضرات امامیہ اس کا یہ جواب دیں کہ ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہما آئے اور دوسری مرتبہ خود حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں۔ مگر چھٹی روایت سے جو احتجاج طبرسی کی ہم نے نقل کی ہے جس میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مشہور خطبہ کا ذکر ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس سے لوٹیں اور گھر پہنچیں تو وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے ان کا انتظار کر رہے تھے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے پہنچتے ہی ان پر غصہ کرنا شروع کیا اور نہایت درد انگیز اور غضب آمیز الفاظ میں فرمایا:

((یا ابن ابی طالب، اشتملت شملة الجنین، وقعدت حجرة

الضنین، نقضت قادمة الاجدل، فکانک ریش الاعزل، هذا

ابن ابی قحافة یتزنی نحلة ابی وبلغة ابنی افترست

الذئاب وافترشت التراب الخ.))

”اے ابوطالب کے بیٹے! پیٹ کے بچے کی طرح تم پردہ نشیں ہو گئے ہو، اور

مایوس اور ڈر پوکوں کے مانند گھر میں بھاگ آئے ہو۔ باوجودیکہ دنیا کے

بہادروں کو تم خاک پر سلا چکے ہو اور اب نامردوں کے پیچھے بیٹھ گئے ہو، ابو قحافہ کے فرزند نے میرے باپ کا دیا ہوا (فدک) مجھ سے چھین لیا ہے اور میرے بچوں کا ارزوقہ روکے ہوئے ہے اور تم اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتے۔
وغیرہ وغیرہ۔“

(احتجاج طبرسی جلد ۱ صفحہ ۲۸۰ مطبوعہ ایران: ۵۱۲۲۳۔ احتجاج طبرسی صفحہ ۶۵)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے گھر میں سے قدم بھی باہر نہ نکالا تھا اور اس معاملہ میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس جانا اور ان سے مطالبہ کرنا اور ان کو ملامت کرنا بیک طرف فاطمہ رضی اللہ عنہا کی کچھ بھی مدد نہ کی تھی۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لے گئے ہوتے اور مہاجرین و انصار کے سامنے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کیا ہوتا اور فدک سے وکیل سے نکال دینے پر انہیں قائل معقول کیا ہوتا تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا باوجود عصمت و طہارت کے اپنے خاوند سے اور خاوند بھی کیسے جو سید الاولیاء سند الاصفیاء، قاتل الکفرۃ، دافع الفجرۃ تھے، کیوں ایسے درشت اور سخت کلمے فرماتیں اور ان کے گھر میں چھپ رہنے اور باہر نہ نکلنے پر ملامت کرتیں؟

چوتھی روایت جو بحوالہ ”کتاب الاختصاص بحار الانوار“ سے ہم نے نقل کی ہے اس میں ایک ایسی بات لکھی ہے جو دونوں روایات بالا کی تردید کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ جب ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دعوے کی نسبت یہ کہا کہ پیغمبر خدا ﷺ کا کوئی وارث نہیں ہوتا تو اسے سن کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا علی رضی اللہ عنہ کے پاس گئیں اور ان سے یہ سب حال کہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو یہ صلاح دی کہ تم پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ تم یہ سمجھے ہو کہ پیغمبر خدا ﷺ کا کوئی وارث نہیں ہوتا حالانکہ سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام کے اور یحییٰ علیہ السلام زکریا علیہ السلام کے وارث ہوئے، پھر میں کیوں اپنے باپ کی وارث نہ ہوں۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ سکھلائی ہوئی بات ہے، اس پر آپ نے جواب دیا کہ گو میں سکھلائی گئی ہوں مگر کس نے مجھے سکھلایا میرے ابن عم علی رضی اللہ عنہ نے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ خود اس معاملے میں ابو بکر رضی اللہ عنہ سے مطالبہ اور مقابلہ کرنے کے لیے تشریف نہیں لے گئے۔ اور نہ حضرت

فاطمہ رضی اللہ عنہا کے خیال میں یہ حجت آئی تھی کہ سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام کے اور یحییٰ علیہ السلام زکریا علیہ السلام کے وارث ہوئے، اور نہ اپنی طرف سے یہ دلیل انہوں نے پیش کی بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرمانے اور بتانے اور سکھلانے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا دوبارہ دعویٰ کرنے کے لیے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئی تھیں۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ خود تشریف لے گئے ہوتے یا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنی طرف سے یہ حجت پیش کی ہوتی جیسا کہ آپ کے خطبہ سے پایا جاتا ہے جس کو ہم نے چوتھی روایت میں احتجاج طبرسی سے نقل کیا ہے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بھیجنے اور اس حجت کے سکھلانے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا اس اختلاف کے بعد بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جانا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس اور ان کا اس باب میں بحث کرنا کوئی مان سکتا ہے؟

گیارہویں روایت جو ہم نے احتجاج طبرسی سے نقل کی ہے اس میں یہ لکھا ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس بات کی اطلاع ہوئی کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک سے محروم کر دیا تو آپ بہت غصہ میں آئے اور ایک بہت سخت خط ابوبکر رضی اللہ عنہ کو لکھا جس کا آغاز ان الفاظ سے ہے ((شقوا ملامت امواج الفتن)) اور جس میں کوئی دقیقہ اپنی مردانگی اور شجاعت کے اظہار اور مہاجرین و انصار کی گمراہی و ضلال کا باقی نہیں رکھا اور اس عذاب سے جو ان کے لیے خدا نے مقرر کیا ہے بیان کرنے سے بھی تامل نہیں فرمایا۔ اگر درحقیقت حضرت علی رضی اللہ عنہ بذات خود ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے ہوتے اور جو کہنا تھا وہ ان سے کہہ آئے ہوتے تو پھر اس خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہاں شاید یہ کہا جائے کہ آپ نے اول بالمشافہ (آمنے سامنے) گفتگو کی، پھر یہ خط لکھا تا کہ رکارڈ یعنی دفتر میں ایک تحریری سند صحابہ رضی اللہ عنہم کے ملامت کی موجود رہے۔ یا اول یہ خط لکھا ہو اور بعد اس کے جا کر بالمشافہ گفتگو فرمائی ہو۔ مگر پہلی بات تو اس روایت سے ثابت نہیں ہوتی، اس لیے کہ اس روایت میں یہ لکھا ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس بات کی اطلاع ہوئی کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک سے محروم کر دیا تب آپ نے یہ خط لکھا۔ اور دوسری بات کہ اس خط کے لکھنے کے بعد تشریف لے گئے ہوں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے اس غصہ سے جو آپ کے گھر میں بیٹھ رہنے اور

مدد نہ کرنے پر فرمایا صحیح نہیں معلوم ہوتی، اس لیے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ، ایسا سخت خط لکھ چکے تھے اور غاصبین فدک کو ظالم اور مفسد ٹھہرا چکے تھے اور جو سزا خدا نے ان کے لیے رکھی ہے اسے بھی ایک طرح سے بیان کر دیا تھا، اور اگر وصیت پیغمبر مانع نہ ہوتی تو ان کے سراڑا دینے کی دھمکی بھی دے دی تھی، تو کیوں کر ممکن تھا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کی مدد نہ کرنے اور مثل جنین کے خانہ نشین ہو جانے پر غصہ فرمائیں اور ایسے کلمات سخت سے آپ کو خطاب کریں۔

پھر چوتھی روایت کے دیکھنے سے ایک اور تناقض اور مخالف پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس روایت میں یہ لکھا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ کے فرمانے سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آیت ﴿وَوَرِثَ سُلَيْمَانَ دَاوُدَ﴾ سے حجت کرنے کے لیے ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئیں اور اس پر بھی جب ابو بکر رضی اللہ عنہ نے شہادت طلب کی تو فاطمہ رضی اللہ عنہا ام ایمن رضی اللہ عنہا اور علی رضی اللہ عنہ کو لے گئیں اور گو کہ علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کا، کہ کیا انہوں نے دی، کچھ ذکر نہیں ہے، مگر ام ایمن رضی اللہ عنہا کی شہادت روکی گئی۔ اور عمر رضی اللہ عنہ نے ام ایمن رضی اللہ عنہا سے یہ کہا کہ تم ایک عورت ہو اور ایک عورت کی گواہی کافی نہیں اور علی رضی اللہ عنہ اپنا فائدہ چاہتے ہیں، اس پر فاطمہ رضی اللہ عنہا کھڑی ہو گئیں اور خفا ہو کر ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے شہادت دینے کے لیے آئے تھے۔ اگر یہ سچ ہے تو اس کا سبب نہیں معلوم ہوتا کہ اسی وقت جو نہایت موقع اور وقت بحث و گفتگو کا تھا علی رضی اللہ عنہ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ سے جو کہنا تھا کیوں نہ کہا اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خفا دیکھ کر بھی کچھ ہاشمی جلال نہ دکھایا۔ اور گھر جا کر خط لکھا، یا دوسرے وقت آ کر ابو بکر رضی اللہ عنہ سے بحث کی۔

اتنا تو بہر حال اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شہادت پیش کرنے کے وقت تک حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زبان مبارک سے کچھ نہیں فرمایا تھا اور نہایت صبر و تحمل سے واقعات کے دیکھنے اور سکوت کرنے کو اختیار کیا تھا۔ مگر اسی روایت میں پھر یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ چالیس دن تک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو سوار کرا کے مہاجرین و انصار کے گھر گھر لیے پھرے اور فاطمہ رضی اللہ عنہا ایک ایک سے فریاد اور استغاثہ کرتی رہیں، یہاں تک کہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے دو بدو گفتگو ہوئی اور ان سے خفا ہو کر فاطمہ رضی اللہ عنہا چلی آئیں۔ اس واقعہ کے بعد جس میں اس

روایت کے موافق کم سے کم چالیس دن گزرے ہوں گے، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ تم تنہا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ کیونکہ وہ دوسروں کی بہ نسبت زیادہ نرم دل ہیں اور یوں کہو کہ اگر فدک تمہارا ہی ہوتا تب بھی اس کا دینا میرے مانگنے پر تم پر واجب ہے۔ چنانچہ اس کے موافق فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں اور یہی بات کہی، اس پر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ سچ فرماتی ہیں کاغذ منگا کر رد فدک کی سند لکھ دی جسے راہ میں عمر رضی اللہ عنہ نے چھین کر چاک کر دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی دفعہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تعلیم سے ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس نہیں گئی تھیں بلکہ دو مرتبہ، پہلے ﴿وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ﴾ کی حجت پیش کرنے کے لیے، دوسرے فدک کو بہ نرمی ابو بکر رضی اللہ عنہ سے مانگنے کے لیے۔ اور دوسری مرتبہ جہاں تک ابو بکر رضی اللہ عنہ سے تعلق تھا اس روایت کے موافق وہ کامیاب بھی ہوئیں۔ پس یہ روایت صاف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کبھی خود ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس جانے اور ان سے بحث کرنے یا ان کو ملامت فرمانے کا ارادہ نہیں کیا، بلکہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو سکھا کر بھیج دینے ہی پر کفایت فرمائی، اور اگر وہ شہادت کے لیے فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ تشریف لے بھی گئے تھے تو اس وقت کچھ ارشاد نہیں فرمایا اور سکوت ہی اختیار کیا۔

پھر اسی چوتھی روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شہادت کے رد ہونے کے بعد چالیس دن تک فاطمہ رضی اللہ عنہا کو مہاجرین و انصار کے یہاں لیے لیے پھرے، اس زمانے میں کوئی اور دوسری کارروائی آپ نے نہیں فرمائی اور جب معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے گفتگو کر کے اور ان سے خفا ہو کر فاطمہ رضی اللہ عنہا چلی آئیں تب پھر آپ نے انہیں ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا اور وہاں فاطمہ رضی اللہ عنہا کی یہ حالت ہوئی کہ عمر رضی اللہ عنہ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کی لکھی ہوئی سند چاک کر دی اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کے شکم مبارک پر (نعوذ باللہ) منہ لات ماری، جس سے محسن سقط ہو گئے اور اس کے بعد پچھتر دن تک فاطمہ رضی اللہ عنہا بیمار رہیں اور اس کے بعد وفات فرما گئیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ بعد معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو گفتگو کے اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دوبارہ تعلیم پا کر ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس جانے کا کوئی موقع باقی نہ رہا تھا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے وکیل کو فدک سے نکالے جانے کی خبر

سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ ابو بکر کے پاس جاتے اور ان سے سوال و جواب کرتے، کیونکہ اس وقت تو حالت پہلے سے بدتر ہو گئی تھی اور ایک تازہ مصیبت پیش آ گئی تھی جس کے سامنے فدک کا غضب کچھ حقیقت ہی نہیں رکھتا۔ یعنی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر عمر رضی اللہ عنہ کے وہ ظلم و ستم ہونا کہ جسے دیکھ کر کسی آدمی کی غیرت و حمیت گوارہ نہیں کر سکتی کہ اسے برداشت کرے، اور ایسے دردناک اور نفرت انگیز و ذلیل کن ظلم کو دیکھتا رہے اور اس کا بدلہ نہ لے۔ یہ وقت دردناک اور نفرت انگیز اور ذلیل کن ظلم کو دیکھتا رہے اور اس کا بدلہ نہ لے۔ یہ وقت وہ تھا کہ شیر خدا جوش میں آتے اور ذوالفقار علی نیام سے نکال لیتے اور بنت رسول پر جو ظلم و ستم ہوا تھا اس کا بدلہ عمر رضی اللہ عنہ سے لیتے۔ تعجب ہے کہ ایسے سخت واقعہ پر شیر خدا صبر فرمائیں اور بنت رسول کی یہ ذلت اپنی آنکھ سے دیکھیں اور کوئی بات تک زبان سے نہ نکالیں۔ تو ان کے صبر و استقلال سے جس کا ثبوت شیعوں کے خیال کے مطابق اس سے زیادہ نہ ہوگا، کون امید اور خیال کر سکتا ہے کہ وہ ایک وکیل کے نکال دینے پر غصہ میں آتے اور سوال و جواب کرنے کے لیے مہاجرین و انصار کے مجمع میں جاتے اور ابو بکر رضی اللہ عنہ سے مقابلہ کرتے یا ان کو ایسا سخت خط لکھتے اور ان کو ظالم و غاصب بتاتے۔

اس روایت کو بارہویں روایت سے ملا کر دیکھنے سے غالباً ہر شخص کو ایک حیرت ہوگی اور سوائے اس کے کہ اماموں کے اسرار اور ان کے بھید ہم لوگوں کی سمجھ سے باہر ہیں کوئی بات زبان سے نہ نکل سکے گی، نہ کوئی وجہ سمجھ میں آئے گی کہ کبھی تو شیر خدا ذرا سی بات پر ایسے غضب ناک ہو جائیں کہ سراڑانے میں بھی دریغ نہ کریں اور کبھی ایسا سکوت اختیار کریں کہ بڑے سے بڑے صدمہ پر بھی جس کا بدلہ لینا شرعاً و عقلاً جائز بلکہ واجب ہو زبان تک نہ ہلائیں، شاید مظہر العجائب و الغرائب کی شان یہی ہے کہ ایسی عجیب باتیں سرزد ہوں جو انسانی فہم سے باہر اور طاقت بشری سے خارج ہوں۔

اس چوتھی روایت میں یہ ذکر ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے سند لے کر عمر رضی اللہ عنہ نے چاک کر دی اور طمانچے لگائے اور لاتیں ماریں یہاں تک کہ حمل ساقط ہو گیا مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ

نے اف تک نہ کی۔ اور بارہویں روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اطلاع ہوئی کہ اشجع بن مزاحم نے جسے ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فدک کے انتظام کے لیے مقرر کیا تھا رعایا پر ظلم شروع کیا ہے تو آپ کو تاب نہ رہی، اس خبر کو سنتے ہی عزیز و اقارب و خدام و ملازمین کو لے کر موقع پر پہنچے اور اشجع کو پکڑ بلوایا اور گھر کیاں سنائیں اور اسی پر کفایت نہ کی بلکہ اس کا سراڑا دیا اور اس وقت ایسے جوش میں تھے کہ آپ کی آنکھیں ایسی چمکتی اور آپ کی ذوالفقار ایسی دکتی تھی کہ سب تھر تھرانے لگے اور اشجع کے قتل کے بعد خالد ان کے پاس آئے تو آپ نے ان سے غصہ میں فرمایا کہ کیا تم مجھے بھی مالک بن نویرہ جانتے ہو اور اس پر جب خالد غصہ میں آئے تو آپ نے ذوالفقار نکالی جس کی چمک دیکھ کر وہ گڑ گڑانے لگے اور آپ نے تلوار کے قبضہ کو خالد کی پشت پر مارا کہ وہ زمین پر گر گئے۔ اس روایت سے شان حیدری ثابت ہوتی ہے اور اسد اللہی کا جلوہ نظر آتا ہے اور زمین و آسمان سے آپ کی شجاعت و حمیت پر مرحبا اور تحسین کی آوازیں آتی ہیں اور ((لافتی الاعلیٰ لا سیف الا ذوالفقار .)) کا غلغلہ ہر شجر و حجر کی زبان سے سنائی پڑتا ہے۔ مگر یہ تمام حالت حیرت و تعجب سے بدل جاتی ہے جبکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ اسد اللہی شان اس وقت کیوں نہ دکھائی گئی جب کہ عمر رضی اللہ عنہ نے جو بقول شیعوں کے ایک نامرد اور ذلیل اور کم رتبہ آدمی تھے بنت رسول کو صدمہ پہنچایا، ان کو طمانچے لگائے، ان کو لاتیں ماریں اور ان کا حمل گرایا۔ اس موقع پر کیوں ذوالفقار علی نیام میں رکھ لی گئی اور کیوں حیدری صولت اور غضنفری ہیبت پر صبر و شکیبائی غالب آگئی۔ حالانکہ شرعاً و عقلاً یہ موقع نہ صبر کا تھا نہ تحمل کا تھا بلکہ ﴿وَالسِّنِّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحِ قِصَاصٌ﴾ کے موافق کم سے کم اس کا بدلہ عمر رضی اللہ عنہ کو دینا تھا تا کہ بنت رسول کی ذلت کا مزہ وہ چکھتے اور اس ظلم و ستم کی سزا خدا کے شیر کے ہاتھ سے پاتے۔

افسوس ہے کہ ان روایتوں سے حضرات شیعہ کا یہ مطلب تو حاصل نہ ہوا کہ جو الزام اپنے غلط خیال اور فساد عقیدت کے موافق صحابہ رضی اللہ عنہم پر اور حضرات شیخین رضی اللہ عنہما پر لگانا چاہتے تھے وہ ثابت ہو بلکہ ان جھوٹی اور وضعی روایتوں سے اہل بیت کرام اور خاندان نبوت پر ایسے جھوٹے

داغ لگا دیے گئے اور وہ باتیں جن سے ان کی شان ارفع و اعلیٰ تھی بلکہ جن کے خدام اور نام لیوا بھی اس سے مبرا اور منزہ تھے ان کی طرف منسوب کر دی گئیں، اور مخالفین اسلام کے لیے ایک ایسا مجموعہ تیار کر دیا گیا کہ جس کے دیکھنے سے نہ صرف ان کو تعجب اور حیرت ہو بلکہ نفس اسلام پر وہ شک اور بانی اسلام اور اس کے خاندان کے چلن پر شبہ کرنے لگیں۔ افسوس ایسی محبت پر!

﴿تَكَادُ السَّمُوتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا﴾

چوتھی روایت میں جو کتاب ”الاختصاص“ سے بیان کی گئی ہے یہ لکھا ہے کہ اس کے بعد علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو چالیس دن تک مہاجرین و انصار کے گھر گھر لیے پھرے لیکن کسی نے مدد نہ کی۔ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے دو بدو گفتگو ہوئی اور وہ ان سے خفا ہو کر چلی آئیں تو علی المرتضیٰ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نرم دل ہیں ان سے جا کر فدک مانگو کہ وہ اپنا ہی سمجھ کر دے دیں۔ چنانچہ وہ گئیں اور ان کے اس طرح پر مانگنے سے ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فدک کی سند لکھ دی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر کچھ سوال و جواب نہ ہوا تھا بلکہ ہنسی خوشی سے صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مانگنے پر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے انہیں سند لکھ دی تھی، لیکن تیسری روایت میں جو بحوالہ مصباح الانوار بحار الانوار سے نقل کی گئی ہے اس میں فدک کے سند لکھ دینے کا بیان دوسرا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ابو بکر رضی اللہ عنہ

﴿وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ﴾ کی حجت پیش ہونے پر قائل ہوئے اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دلائل سن کر مجبوراً تب فدک کی سند فاطمہ رضی اللہ عنہا کو لکھ دی اور اس پر علیؑ اور ام ایمن رضی اللہ عنہا کی گواہی بھی ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سند لکھنے کا سبب ابو بکر رضی اللہ عنہ کا فاطمہ رضی اللہ عنہا کی حجتوں سے قائل ہو جانا تھا۔ اور نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا تنہا تشریف نہ لے گئی تھیں بلکہ علیؑ اور ام ایمن رضی اللہ عنہا بھی ان کے ساتھ تھے، ورنہ ان کی گواہی اس سند پر جو ابو بکرؓ نے لکھی کیوں کر ہوتی اور پھر اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ راہ میں عمرؓ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ملے اور ان سے پوچھا کہ آپ کہاں سے آتی ہیں انہوں نے کہا کہ ابو بکرؓ کے پاس سے آتی ہوں اور انہوں نے مجھے سند بھی فدک کی لکھ دی ہے۔ عمرؓ نے کہا کہ اسے ذرا مجھے دکھائیے، آپ نے دے دی، عمر رضی اللہ عنہ

نے پوچھا کہ آپ اس وقت اتنی خفا کیوں ہیں؟ تب انہوں نے بیان کیا کہ عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ کیا کیا، اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ((مارکبوا منی و من ابیک اعظم من هذا فمرضت .)) کہ ان لوگوں نے اس سے بڑھ کر میرے اور تمہارے باپ کے حق میں اور دوسری بات نہیں کی اور پھر بیمار ہو گئیں۔

اس میں ایک تعجب انگیز بات تو یہ ہے کہ سند لکھنے کے وقت تو علی رضی اللہ عنہ اور ام ایمن رضی اللہ عنہا موجود تھے، پھر وہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ گھر تک کیوں نہیں آئے۔ کیا وہ وہاں رہ گئے یا اور کہیں چلے گئے اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کو تنہا روانہ کر دیا۔ دوسری اس میں یہ ذکر نہیں ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو طمانچے مارے اور لائیں لگائیں اور محسن سقط ہو گئے۔ کیونکہ علی رضی اللہ عنہ نے صرف ان کو غصہ میں پایا اور مار کبوا منی و من ابیک اعظم من هذا کہہ کر چپ ہو گئے۔ اس سے تکذیب اس ظلم و ستم کی ہوتی ہے جو فاطمہ رضی اللہ عنہا کی نسبت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے بیان کیا گیا ہے۔

چھٹی روایت جو احتجاج طبرسی سے ہم نے نقل کی ہے وہ سب سے زیادہ اہم اور قابل غور ہے اور اس سے ہبہ فدک کے دعوے کی تکذیب ایسی ثابت ہوتی ہے کہ بغیر اس کے کہ خود اس روایت کو جھوٹا کہا جائے اور یہ خطبہ وضعی قرار دیا جائے دوسرا کوئی جواب بن نہیں پڑتا، اور اسی واسطے علماء امامیہ کو اس میں بہت دقت پیش آئی ہے اور نہایت حیران و ششدر ہو کر اس کے متعلق ایسی باتیں بنائی ہیں کہ جن کو کوئی شخص مان نہیں سکتا۔ اس روایت کی تکذیب تو علمائے امامیہ کو نہیں سکتے، اس لیے اول تو وہ نہایت صحیح روایتوں میں سے ہے، دوسرے اس روایت کی بنیاد پر بہت بڑی عمارت صحابہ رضی اللہ عنہم کے ظلم و ستم کی کھڑی ہے، وہ اس روایت کے غیر معتبر کہنے سے سب ڈھ جاتی ہے۔

خطبہ کی صحت اور عظمت جو شیعوں کے نزدیک ہے وہ اس سے ثابت ہوتی ہے کہ علمائے امامیہ نے اس کی صحت کی نسبت بہت سے دعوے کیے ہیں اور نہ صرف اپنی روایتوں سے اسے بیان کیا ہے بلکہ سنیوں کی کتابوں سے بھی اس کے ثابت کرنے کی بہت کوشش کی ہے۔ ملا باقر

مجلسی اس کی نسبت فرماتے ہیں: ((اعلم ان هذه الخطبة من الخطب المشهورة التي روتها الخاصة والعامة باسانيد متظافرة.)) کہ اسے سمجھ لو یہ خطبہ مشہور ترین خطبوں میں سے ہے جسے شیعہ اور سنی دونوں نے معتبر اسناد سے بیان کیا ہے۔ اور کتاب ”لمعة البيضاء في شرح خطبة الزهراء“ میں جو خاص اسی خطبہ کی شرح کے لیے لکھی گئی ہے اور ایران میں چھپی ہے اس کے صفحہ ۱۲۸ میں لکھا ہے:

((والاحتجاج المشهور كالنور على السطور المسطور في كتاب مسطور في رق منشور المعروف بخطبة تظلم الزهراء التي مقصودنا من هذا الكتاب شرحها وكل ما ذكر الى هنا كان مقدمة بالنسبة اليها ونحن نشرع الان في ايراد تلك الخطبة الشريفة المشتملة على الايات و البيئات والبراهين الساطعات و الحجج الواضحات والدلائل القاطعات الى قوله وبالجملة لا اشكال ولا شبهة في كون الخطبة من فاطمة الزهراء وان مشائخ ال ابى طالب كانوا يروونهم عن ابائهم ويعلمونها ابنائهم ومشائخ الشيعة كانوا يتدارسونها بينهم ويتداولونها بايديهم والسنتهم.))

”مجملاً ان حجّتوں کے جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کیں ایک وہ مشہور حجت ہے کہ گویا وہ طور کی روشنی ہے اور لوح محفوظ میں لکھا ہے، یعنی وہ خطبہ جو ظلم زہراء کے نام سے مشہور ہے اور جس کی شرح ہم اس کتاب میں لکھنا چاہتے ہیں۔ اور وہ خطبہ مشتمل ہے کھلی نشانیوں، روشن دلیلوں، واضح حجّتوں اور قطعی برہانوں پر۔ اور جس کی صحت میں کچھ بھی شبہ نہیں ہے اور بزرگان آل ابی طالب ہمیشہ اسے اپنے آباء اجداد سے روایت کرتے ہیں اور اپنی اولاد کو سکھاتے چلے آئے ہیں اور مشائخ شیعہ کے درس میں وہ رہا ہے اور ہمیشہ وہ اسے اپنے

ہاتھوں اور زبانوں میں رکھتے چلے آئے ہیں۔“

جب کہ یہ خطبہ شیعوں کے نزدیک ایسا صحیح ہے اور ((کالنور علی السطور)) سمجھا جاتا ہے تو جو کچھ اس سے ثابت ہو کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس میں یہ بیان کیا اور فلاں چیز کا دعویٰ فرمایا اسی کو شیعوں کے عقیدے کے موافق سمجھنا اور جس کا اس میں ذکر نہ ہو اس کو غلط جاننا چاہیے۔ اس لیے ہم اس کتاب کے ناظرین سے خصوصاً علمائے امامیہ سے امید کرتے ہیں کہ اس پر غور فرمائیں کہ سارے خطبہ میں کہیں اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہو کہ تم نے فدک مجھ سے چھین لیا، یا میرے باپ نے مجھے وہ ہبہ کیا تھا، یا وہ میرے قبضہ میں تھا۔ نہ صراحئاً نہ اشارتاً ہبہ کا نام اس میں آیا ہے۔ جو کچھ اس میں بیان کیا گیا ہے وہ صرف میراث کے متعلق ہے اور جو کچھ جو ظلم و ستم کا استغاثہ کیا ہے وہ اسی بات پر ہے کہ تر کہ نبوی نہیں دیا گیا اور جو دلیلیں اور حجیتیں اس میں حضرت سیدۃ النساء نے بیان کی ہیں مثل ﴿وَوَرِثَ سُلَيْمَانَ دَاوُدَ﴾ وغیرہ کے وہ سب متعلق میراث کے ہیں، اگر فدک درحقیقت پیغمبر خدا ﷺ نے آپ کو ہبہ کیا ہوتا اور وہ آپ کے قبضہ میں ہوتا اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ کا قبضہ اٹھا کر اس پر اپنا قبضہ کر لیا ہوتا تو کیا ممکن تھا کہ اس میں اس کا کچھ بھی ذکر نہ کیا جاتا اور ایسی بڑی بات جو صراحئاً شرع اور عقل اور قانون اور عام برتاؤ کے خلاف تھی، یعنی کسی چیز کو کسی کے قبضہ سے لے لینا خلیفہ وقت سے واقع ہوتی اس کا اظہار مہاجرین و انصار اور اصحاب نبوی کے سامنے نہ کیا جاتا۔

یہ خطبہ جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا طول میں دو جز سے کم نہیں ہے اور فصاحت اور بلاغت میں ہم پلہ قرآن سمجھا گیا ہے۔ اور اصحاب ظلم و ستم کا گویا وہ پورا نقشہ ہے اور اس وقت یہ فرمایا گیا ہے جب کہ تمام مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم اور اصحاب نبوی ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس موجود تھے، اور ایسے درد انگیز لفظوں میں بیان کیا گیا ہے کہ سننے والے رونے اور چیخنے لگے تھے، تو کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایسے موقع اور محل پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ایسی چیز کو بیان نہ فرمائیں جو سب سے زیادہ ضروری اور سب سے بڑھ کر ان کی مظلومیت اور خلیفہ وقت کے ظلم

کو ثابت کرنے والی تھی۔

چونکہ یہ ایک بہت بڑی بات تھی کہ ایسے موقع پر اس خطبہ میں ہبہ کا ذکر نہ کیا گیا، اس لیے علمائے امامیہ کی توجہ اس طرف مائل ہوئی اور انہوں نے بھی اس امر کو ضروری سمجھ کر اس کے جواب کی فکر کی اور بفحوائسے ”الغریق یتثبت بکل حشیش“ جو کچھ اس کے جواب میں کیا وہ سراسر لغو اور بالکل بیہودہ ہے جسے کوئی بھی نہیں مان سکتا۔ ملا باقر مجلسی بحار الانوار میں اسی خطبہ کی شرح میں ایک مقام پر فرماتے ہیں:

((اعلم انه قد وردت الروایات المتظافرة كما ستعرف فی انها ادعت فدکا كانت نحلة لها من رسول الله ﷺ فلعل عدم تعرضها فی هذه الخطبة لتسلك الدعوى لياسها عن قبولهم اياها اذا كانت الخطبة بعد ما رد ابو بكر شهادة امير المؤمنين و من شهد معه وقد كانت المنافقون الحاضرون معتقدين بصدقه فتمسك بحديث الميراث لكونه من ضروريات الدين .))

”یعنی روایت مستندہ جیسا کہ تم کو عنقریب معلوم ہوگا اس باب میں وارد ہوئی ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فدک کے ہبہ ہونے کا رسول اللہ ﷺ کی طرف سے دعویٰ کیا تھا، پس آپ کا اس خطبہ میں دعویٰ ہبہ فدک سے تعرض نہ کرنا شاید اس خیال سے ہوگا کہ آپ دعوے کے قبول ہونے سے مایوس ہو گئی ہوں گی، اس لیے کہ یہ خطبہ بعد رد کر دینے ابو بکر رضی اللہ عنہ کی شہادت امیر المؤمنین کو مع اور شاہدوں کے ہوا تھا اور جو منافق اس وقت موجود تھے وہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے صدق کے معتقد تھے، اس لیے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حدیث میراث سے تمسک کیا کیونکہ یہ ضروریات دین سے ہے۔“

یہ جواب جیسا کہ اس کے لفظوں سے ظاہر ہے ایسا ہے کہ خود جواب لکھنے والے اور ان کے ہم مذہب اسے دل سے قبول نہ کرتے ہوں گے اور جو روایتیں ہم اوپر نقل کر چکے اکثر ان

میں سے اس جواب کی غلطی ظاہر کرتے ہیں۔ اس جواب میں جو یہ لکھا ہے کہ یہ خطبہ حضرت سیدہ نے اس وقت بیان کیا جب امیر المؤمنین اور دیگر گواہوں کی شہادت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے رد کر دی تھی، یہ صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اس خطبہ کی روایت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ بعد تردید شہادت کے یہ خطبہ بیان کیا گیا ہو بلکہ جو روایت احتجاج طبرسی سے ہم نے بیان کی اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:

((روی عبداللہ الحسن باسناده عن آبائه انه لما اجتمع ابوبکر رضی اللہ عنہ علی منع فاطمة فدک و بلغهار ذلك لات خمارها..... الخ))

”کہ جب ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ارادہ کر لیا کہ فدک سے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو محروم کریں اور یہ خبر فاطمہ رضی اللہ عنہا کو پہنچی تو انہوں نے اوڑھنی اوڑھی، چادر لپیٹی اور اپنے نوکروں اور قوم کی عورتوں کو ساتھ لے کر ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئیں۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس یہ تشریف لانا اول ہی مرتبہ ہوا تھا اور اس کا باعث صرف اس خبر کا پہنچنا تھا جو ان کو ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ارادے کی پہنچی کہ وہ فدک نہیں دینا چاہتے، یا اس پر تصرف رکھنے سے مانع آتے ہیں۔ اور چونکہ اس روایت میں اس بات کی تصریح نہیں ہے کہ یہ خبر کیوں کر پہنچی، اس لیے ظاہر ہے کہ جواب میں جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ بعد تردید شہادت کے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا تشریف لے گئیں صرف قیاسی ہے۔ مگر یہ قیاس صحیح نہیں معلوم ہوتا، اس لیے کہ الفاظ بلغھا ذلك یعنی ”جب یہ خبر فاطمہ رضی اللہ عنہا کو پہنچی“ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اس سے پیشتر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کچھ خبر نہ تھی اور یہ ظاہر ہے کہ علی رضی اللہ عنہ اور ام ایمن رضی اللہ عنہا وغیرہ کی شہادت بغیر ان کی اطلاع کے بلکہ بغیر ان کی طلب کے نہیں ہوئی۔ جیسا کہ دوسری روایت میں ہم نے احتجاج طبرسی سے نقل کی ہے بیان کیا گیا ہے کہ پیغمبر ﷺ کی وفات کے بعد فاطمہ رضی اللہ عنہا فدک مانگنے کے لیے ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئیں انہوں نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ تم سوائے سچ کے کچھ نہ کہو گی،

لیکن گواہ لاؤ۔ اس پر وہ علی کو لے گئیں اور پھر ام ایمن رضی اللہ عنہا کو۔ اور چوتھی روایت سے جو ہم نے کتاب الاختصاص سے بحوالہ بحار الانوار نقل کی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اول حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ابو بکرؓ کے پاس آئیں اور میراث کا مطالبہ کیا اور جب ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یہ جواب دیا کہ پیغمبروں کا کوئی وارث نہیں ہوتا تو آپ علی رضی اللہ عنہ کے پاس واپس تشریف لائیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پھر لوٹ جاؤ اور کہو کہ سلیمان داؤد کے کیوں وارث ہوئے؟ اور اسی کتاب ”الاختصاص“ کی روایت میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خبر ہوئی کہ ان کے وکیل کو فدک سے نکال دیا تب وہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئیں اور ان سے کہا کہ تم نے میرے وکیل کو نکال دیا حالانکہ اس پر میرے گواہ موجود ہیں۔ پس یہ سب روایتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا جانا ایک مرتبہ بلکہ دو مرتبہ اس کے پہلے ہوا ہوگا۔ اور اس میں تو کچھ شبہ ہی نہیں کہ شہادت خود انہوں نے پیش کی اور ان کے سامنے ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اسے رد کیا اور اس پر وہ خفا بھی ہوئیں، یہی وقت تھا کہ جو کچھ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فرمانا تھا فرماتیں اور جو کچھ ملامت کرنی تھی وہ شیخین رضی اللہ عنہما اور اصحاب پر کرتیں۔ اس واقعہ کی نسبت جو ان کے سامنے ہوا ہو کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی خبر فاطمہ رضی اللہ عنہا کو پہنچی اور وہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس گئیں اور یہ خطبہ بیان فرمایا۔ یہ تو اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ شہادت بغیر ان کی اطلاع کے یا ان کے پیچھے ہوئی ہوتی اور ان کی غیبت میں ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اسے رد کیا ہوتا، اور پھر اس کی خبر کسی نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دی ہوتی اور اسے سن کر انہیں جوش آیا ہوتا اور وہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئی ہوتیں اور یہ خطبہ بیان کیا ہوتا۔ واذ لیس فلیس .

علاوہ اس کے تیسری روایت جو مصباح الانوار سے ہم نے بیان کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس گئیں اور ان سے فدک کا مطالبہ کیا اور بہت سی حجتوں کے بعد ابو بکر رضی اللہ عنہ نے قائل ہو کر فدک کی سند لکھ دی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ام ایمن رضی اللہ عنہا کی اس پر گواہی بھی ہوئی مگر جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا باہر تشریف لائیں تو عمر رضی اللہ عنہ نے اسے چاک کر دیا۔ اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک معاملہ کا تعلق حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ

سے تھا وہ حسب مرضی جناب سیدہ کے طے ہو گیا تھا اور انہوں نے سند بھی لکھ کر آپ کے حوالہ کر دی تھی جو کچھ ظلم ہوا وہ عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے ہوا۔ ایسی حالت میں قیاس کا تقاضا ہے کہ اگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو شکایت ہوتی تو وہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لائیں اور فرمائیں کہ تم نے میری ججیتیں سن کر میرے دعوے کو تسلیم کیا اور مجھے سند بھی لکھ دی مگر تمہارے رفیق نے اسے چاک کر دیا۔ غرض کہ جو کچھ شکایت وہ کرتیں عمر رضی اللہ عنہ کی کرتیں اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نہ سنتے تو صحابہ رضی اللہ عنہم سے شکایت کرتیں اور ان سے فرمائیں کہ دیکھو جن کو تم نے خلیفہ کیا ہے اور جو مسلمانوں کے سردار بنے ہیں ان کی یہ حالت ہے کہ ابھی مجھے فدک کی سند لکھ دی اور ان کے رفیق نے اسے پھاڑ ڈالا اور اب یہ اس کے ساتھ ہو گئے اور اس کے کیے کو تسلیم کر لیا، یہ کیسا ظلم ہے اور یہ کیسے خلیفہ ہیں۔ اگر ایسا فرمائیں تو ضرور اصحاب نبی کو جوش آتا اور ابو بکر رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرتے اور عمر رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہتے۔ اور اگر ایسا سب نہ کرتے تو کم سے کم وہ لوگ جو رفقائے علی رضی اللہ عنہ سے تھے اور ظاہراً باطناً اہل بیت کے طرف دار، ان کو موقع ملتا اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تائید میں بہت کچھ کہتے اور ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ پر ملامت کرتے۔ یہ باتیں جو قرین قیاس ہیں وہ تو چھوڑ دی گئیں اور ہوا تو یہ ہوا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس گئیں اور ان سے حجت کی تو صرف میراث کی، اور دلیل پیش کی تو صرف ترکہ کے متعلق۔ ان واقعات میں سے کسی واقعہ کا ذکر نہ کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا جانا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس بعد تردید شہادت یا بعد تحریر سند یا بعد کسی قسم کی اطلاع کے جو ان کو اول سے ملی ہو نہ تھا۔ بلکہ پہلی ہی خبر جب ان کو ملی تو وہ غصہ میں آئیں اور نہایت غیظ و غضب کی حالت میں مع خدام اور زنان بنی ہاشم کے تشریف لے گئیں اور صرف میراث کے نہ دینے پر جو کچھ فرمانا تھا فرمایا۔

علاوہ اس کے پانچویں روایت جو مفضل بن عمر نے امام جعفر صادق سے بیان کی ہے اور جسے ہم بحار الانوار سے نقل کر چکے ہیں، ملا باقر مجلسی کے جواب کو بالکل باطل کرتی ہے۔ اس لیے کہ اس میں فاطمہ رضی اللہ عنہا کا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس جانا اپنی مرضی سے بیان نہیں کیا گیا بلکہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرمانے سے تھا۔ کیونکہ اس روایت میں لکھا ہے کہ جب ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یہ منادی کرائی کہ جس کسی کا رسول اللہ ﷺ پر قرض ہو یا کوئی وعدہ، تو وہ میرے پاس آئے کہ میں اس کو ادا کروں گا اور جابر رضی اللہ عنہ اور جریر بجلی رضی اللہ عنہ کا وعدہ پورا بھی کیا۔ تو علی رضی اللہ عنہ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر فدک کا ذکر کرو، فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ان سے فدک، خمس اور فے کا ذکر کیا، ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ گواہ لاؤ اس پر، اول تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بہت سی دلیلیں پیش کیں اور قرآن کی آیتیں اپنے دعوے کی تصدیق میں بیان فرمائیں مگر جب عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ فضول باتیں چھوڑو اور گواہ لاؤ۔ اس پر آپ نے علیؑ اور حسنین رضی اللہ عنہما، ام ایمن رضی اللہ عنہا اور اسماء کو بلوا بھیجا اور ان سب نے آپ کے دعوے کی پوری پوری گواہی دی۔ جب وہ شہادتیں رد کی گئیں تو اس وقت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ایک جز رسول ہیں جو ان کو ایذا دے گا وہ رسول اللہ ﷺ کو ایذا دیتا ہے اور جو ان کی تکذیب کرتا ہے وہ رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کرتا ہے۔ اس پر عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جو تم اپنی تعریف کرتے ہو تم ویسے ہی ہو لیکن ان لوگوں کی شہادت جس میں ان کا فائدہ ہو مقبول نہیں، تو علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جب ہم ایسے ہیں جیسا تم جانتے ہو اور انکار نہیں کرتے اور پھر ہماری شہادت ہمارے لیے مقبول نہیں تو ((انا لله وانا اليه راجعون)) اور پھر اسی پر قناعت نہیں فرمائی بلکہ جناب امیر نے ان کو برا بھلا بھی کہا اور یہ فرمایا کہ تم پر قناعت نہیں، خدا اور اس کے رسول کی سلطنت پر جسٹ کی اور اسے اس کے گھر سے غیر کے گھر کی طرف بے گواہ و حجت کے نکال دیا، قریب ہے کہ ظالموں کو اپنے ظلم کا بدلہ معلوم ہو جائے گا اور یہ آیت پڑھی ﴿وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ﴾ پھر فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ چلو خدا ہی ہمارا فیصلہ کرے گا۔ ﴿وَهُوَ خَيْرُ الْحَكِيمِينَ﴾

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ واقعہ گزرا وہ جناب امیر رضی اللہ عنہ اور حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کے سامنے گزرا، دونوں سے ججیتیں ہوئیں، دونوں نے قرآنی دلائل پیش کیے اور دونوں نے جو کچھ کہنا تھا کہا، جب ان کا دعویٰ نہ سنا گیا اور ان کی دلیلیں رد کر دی گئیں اور ان

کی شہادتیں جھٹلائی گئیں تو خود جناب امیر رضی اللہ عنہ نے جناب سیدہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ چلو خدا ہی ہمارا فیصلہ کرے گا، وہو خیر الحاکمین۔ تو اس کے بعد کون سا موقع باقی رہا تھا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا دوبارہ یا سہ بارہ تشریف لائیں اور میراث کے دعوے پر دلائل پیش فرمائیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو برا بھلا کہتیں۔ اور کیوں کر یہ بات سچ ہو سکتی ہے کہ جب ان کو خبر ہوئی کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فدک سے ان کو محروم کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ تب وہ تشریف لائیں اور خطبہ میں بیان کیا جو کچھ بیان کرنا تھا وہ روایت مذکورہ بالا سے ظاہر ہے کہ جناب سیدہ کے مواجہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کر چکے تھے اور ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کو ظالم اور خدا و رسول کی سلطنت کا غصب کرنے والا اعلیٰ رؤس الاشہاد کر چکے تھے، اس جلسہ میں کون سی بات تھی جو اٹھا رکھی گئی تھی جس کے لیے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو تکلیف فرمانے اور ایسے طویل اور فصیح و بلیغ خطبہ کے بیان کرنے کی ضرورت باقی رہ گئی تھی۔

پانچویں روایت ”کتاب الاختصاص“ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تین مرتبہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس گئیں، اول مرتبہ تو یہ خبر پا کر کہ ان کا وکیل فدک سے نکال دیا گیا۔ دوسری مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرمانے سے آیت ﴿وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ﴾ کی حجت پیش کرنے کے لیے اور تیسری مرتبہ پھر حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے کہنے پر کہ جب ابو بکر رضی اللہ عنہ تنہا ہوں تب جاؤ کہ وہ دوسرے کی نسبت زیادہ نرم دل ہیں۔ پس جو کچھ حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کو فرمانا تھا وہ انہیں تین موقعوں میں سے کسی موقع پر فرمانا چاہیے تھا، مگر پہلی مرتبہ تو اس خطبہ کا ارشاد فرمانا ثابت ہی نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کا یہ جواب کہ پیغمبر خدا ﷺ کا کوئی وارث نہیں ہوتا سن کر خود حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کے خیال میں نہیں آیا کہ اس کا کیا جواب دیں بلکہ وہ سیدھی جناب امیر رضی اللہ عنہ کے پاس چلی آئیں اور ان سے سارا حال کہا اور انہوں نے فرمایا کہ تم جاؤ اور ﴿وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ﴾ کی دلیل پیش کرو۔ تو یہ دلیل جس کا خطبہ میں ذکر ہے ابتدائی تقریر میں بیان کیا جانا اس کا ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ یہ دلیل حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے خیال مبارک میں نہ آئی تھی بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سکھائی تھی اور ان کی تعلیم کے موافق

آپ دوبارہ تشریف لے گئی تھیں۔ دوسری دفعہ بھی اس خطبہ کا بیان فرمانا بعید از قیاس ہے، اس لیے کہ اس وقت اور اسی جلسہ میں ﴿وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُودَ﴾ کے پیش کرنے کے ابو بکر رضی اللہ عنہ نے شہادت مانگی اور حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا نے علی اور ام ایمن رضی اللہ عنہما کو بلا کر شہادت دلانی اور جو کچھ اس کے بعد ہوا وہ سب مقابلہ میں حضرت امیر رضی اللہ عنہ اور جناب سیدہ رضی اللہ عنہما کے ہوا۔ اور اخیر میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا عمر رضی اللہ عنہ کے اس کہنے پر کہ ایک عورت کی گواہی مقبول نہیں ہو سکتی اور وہ شہادت سے اپنا نفع چاہتے ہیں غصہ میں آ کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور یہ کہہ کر ((اللہم انہما ظلما ابنة نبيك صلى الله عليه وآله حقهما فاشدد و طأتك عليهما ثم خرجت)) کہ الہی ان دونوں تیرے نبی کی بیٹی پر ظلم کیا اور اس کا حق چھین لیا تو ان پر اپنا سخت عذاب نازل کر اور پھر چلی گئیں۔ اگر خطبہ بیان فرمانے کے لیے اس کے بعد تشریف لانا بیان کیا جائے تو وہ ہو نہیں سکتا، اس لیے کہ اسی روایت میں یہ لکھا ہے کہ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ چالیس روز تک مہاجرین و انصار کے گھر گھر فاطمہ رضی اللہ عنہا کو لیے پھرے اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے گفتگو بھی ہوئی اور جب کسی نے مدد نہ کی، تب علی رضی اللہ عنہ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ تم ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ جب کہ وہ تنہا ہوں، اور یہ گویا تیسرا موقع تھا جب کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس گئیں۔ اس میں اس فصیح و بلیغ خطبہ کے بیان کرنے کا کوئی محل ہی نہ تھا، اس لیے اس موقع پر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی مرضی کے موافق سند لکھ دی تھی اور اس کے بعد چوتھا موقع جانے اور اس فصیح و بلیغ خطبہ کے پڑھنے کا باقی ہی نہ رہا تھا۔ اس لیے کہ جناب سیدہ رضی اللہ عنہا اس ضرب شدید کی وجہ سے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے ماری تھی اور جس سے حمل ساقط ہو گیا ایسی بیمار ہو گئیں کہ اس میں انتقال فرمایا۔

غرض کہ جو شخص ذرا بھی غور سے ان روایتوں کو دیکھے اور ایک کو دوسرے سے ملائے اسے اس بات کے تصفیہ کرنے میں کچھ بھی شبہ نہیں رہ سکتا کہ ہبہ کا دعویٰ چونکہ اسی خطبہ میں بیان نہیں کیا گیا، اس لیے وہ دعویٰ جھوٹا ہے، اس لیے کہ حضرات امامیہ اس خطبہ کے جھوٹا ہونے کا اقرار نہ کریں گے۔ اور جب اس خطبہ کو جھوٹا نہ مانیں تو ہبہ کے دعوے کے غلط ہونے

میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

ملا باقر مجلسی اس اشکال کے جواب میں کہ ہبہ کا ذکر اس خطبہ میں کیوں نہیں ہوا یہ بھی فرماتے ہیں کہ جو منافق حاضر تھے وہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے صدق کے معتقد تھے، اس لیے فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حدیث میراث سے تمسک کیا، کیوں کہ یہ ضروریات دین سے تھا۔ یہ جواب بھی حیرت انگیز ہے، اس لیے کہ اگر حدیث میراث سے تمسک کرنا صرف اس لیے تھا کہ وہ ضروریات دین سے تھا اور سامعین پر اس کا اثر ہوتا تو ہبہ کا دعویٰ اس سے زیادہ اہم اور ”القبض دلیل المملک“ کی دلیل حدیث میراث سے کچھ کم ضروریات دین سے نہ تھی بلکہ میراث کے دعوے پر تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کو موقع بھی ملا کہ پیغمبر خدا ﷺ کے قول کی سند پر میراث کے عام حکم سے ترکہ نبوی کو مستثنیٰ کر دیا اور جو منافق حاضر تھے اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کے صدق کے معتقد، انہوں نے اس روایت میں انہیں سچا جان کر ان کی کارروائی کو جائز قرار دیا، لیکن اگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہبہ کا دعویٰ فرماتیں اور ”القبض دلیل المملک“ کے موافق اپنے قبضہ سے فدک کی ملکیت پر دلیل پیش کرتیں تو اس کا کوئی جواب ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا اور سامعین ان کے ظلم و ستم کے قائل ہو جاتے، اور حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کے دعوے کی تصدیق کرتے اور سب چلا اٹھتے اور پکارنے لگتے کہ ”القبض دلیل المملک“ ضروریات دین سے ہے اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کا قبضہ اٹھا دینا اور ان کے وکیل کو نکال دینا صریح ظلم ہے اور اگر وہ اپنے نفاق اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ شریک ہونے کی وجہ سے بظاہر ایسا نہ کرتے تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ظلم و ستم کی حجت تو پوری ہو جاتی۔

وہ واقعہ جو اس خطبے کے ارشاد فرمانے اور گھر میں واپس جانے کے بعد واقع ہوا وہ ایسا عجیب اور حیرت انگیز ہے جس کا اثر نہ صرف فدک کے دعوے پر پڑتا ہے بلکہ اصل اصول شیعہوں کے مذہب کا درہم برہم ہو جاتا ہے، یعنی جناب امیر رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عصمت کے دعوے پر بہت کچھ مؤثر ہوتا ہے۔ اور اسی سبب سے حضرات شیعہ اس میں ایسے حیران ہیں کہ نہ کچھ اس کا جواب بن سکتا ہے نہ کوئی بات اپنے اصول کے قائم رکھنے کے لیے

ان کے خیال میں آتی ہے۔ اور وہ واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا یہ خطبہ ارشاد فرما کر مایوس ہوئیں تو ان پر ایسا رنج و غم طاری ہوا کہ وہ سیدھی اپنے باپ کی قبر پر تشریف لے گئیں اور وہاں جا کر بہت کچھ بیان کیا، درد انگیز اشعار پڑھے اور بہت روئیں۔ اور پھر وہاں سے گھر کو لوٹیں، حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ ان کے انتظار میں بیٹھے تھے، آتے ہی آپ نے جناب امیر سے یہ خطاب کیا کہ جس طرح بچہ ماں کے پیٹ میں پوشیدہ ہوتا ہے اسی طرح تم پردہ نشین ہو گئے اور مثل ڈرے ہوئے تہمت زدوں کے گھر میں چھپ رہے ہو اور بعد اس کے کہ زمانہ کے شجاعوں کو ہلاک کیا، ان کی کثرت کی پروانہ کی اور ان کی شوکت کو خاک میں ملایا اب ان نامردوں اور ذلیلوں سے مغلوب ہو گئے ہو۔ ابو قحافہ کا بیٹا ظلم و جبر سے میرے باپ کی بخشی ہوئی چیز اور میرے بیٹوں کی معاش مجھ سے چھینے لیتا ہے، اور باواز بلند مجھ سے جھگڑا کرتا ہے، انصار میری مدد نہیں کرتے اور مہاجرین نے اپنے آپ کو علیحدہ کر لیا ہے اور تمام آدمیوں نے آنکھیں بند کر لی ہیں نہ ان کا کوئی دفع کرنے والا ہے، نہ میرا مددگار خشم ناک میں باہر آگئی اور غم ناک واپس آئی تم نے اپنے کو ذلیل کیا، بھیڑیے پھاڑتے ہیں اور تم اپنی جگہ سے ہلتے نہیں، کاش! اس ذلت خواری سے پہلے میں مر گئی ہوتی۔ افسوس میرے حال پر جس پر مجھے بھروسا تھا، وہ دنیا سے چل بسا، اور میرا مددگار سست ہو گیا، اس کا شکو اپنے آپ سے کرتی ہوں اور میری فریاد سے ہے۔ فقط!

آپ کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے کچھ بھی آپ کی مدد نہیں فرمائی اور اس تمام مصیبت کے وقت میں آپ گھر میں چھپے بیٹھے رہے جو کچھ کیا وہ حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا نے خود ہی کیا، وہی دعویٰ کرنے کے لیے تشریف لے گئیں، انہی نے سوال و جواب کیے، اپنی نے جو کچھ سنانا تھا سنایا، اور جو کچھ کہنا تھا کہا۔ اور جیسا کہ فرماتی ہیں خشم ناک باہر گئیں اور غمگین واپس آئیں اور جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو مثل جنین پردہ نشین کر لیا اور اپنے آپ کو ذلیل بنا لیا، بھیڑیوں نے پچھاڑا اور شیر خدا اپنی جگہ سے نہ ہلے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس طرح پر علیحدہ رہنے سے جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کو وہ صدمہ پہنچا کہ جس پر

فرمانے لگیں کہ کاش! اس ذلت و خواری سے پہلے میں مر گئی ہوتی۔ اور اس حالت پر اپنے باپ کو یاد کرنے لگیں اور اپنا رنج اس طور پر ظاہر کیا کہ جس پر بھروسہ تھا وہ دنیا سے چل بسا، اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے مدد نہ کرنے اور اس کارروائی میں کچھ حصہ نہ لینے پر یہ صدمہ ہوا کہ آخر ان سے رہا نہ گیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت یہ کلمہ زبان سے نکل ہی گیا کہ میرا مددگار سست ہو گیا، میں اس کا شکوہ اپنے باپ سے کرتی ہوں۔

جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کی اس درد انگیز تقریر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ روایتیں جن میں بیان کیا گیا ہے کہ جناب امیر فدک کے معاملہ میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ان سے مباحثہ کیا اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کے وکیل کے نکال دینے پر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بہت کچھ برا بھلا کہا اور نہایت قوی دلیلوں سے ان کا ظلم و ستم ثابت کیا، وہ سب جھوٹی ہیں۔ خصوصاً وہ روایتیں جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مواجہہ میں جناب امیر رضی اللہ عنہ اور شیخین رضی اللہ عنہم سے مباحثہ کیا اور ملامت کی اور جب انہوں نے کچھ نہ سنا تو یہ کہہ کر خدا تمہیں اس کا بدلہ دے گا اور آیت ﴿سَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ﴾ سنا کر رنج و غصہ میں اٹھ کر چلے آئے، جھوٹی اور بے بنیاد ہیں۔ اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسا کیا ہوتا اور ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ سے ججیت کی ہوتی تو کیوں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی مجلس سے واپس آ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اپنا رنج و غصہ ظاہر کرتیں اور باوجود عصمت و طہارت کے وہ کلمات ارشاد فرماتیں جن کا معمولی آدمیوں کی زبان سے نکلنا بھی متانت، ادب اور صبر کے خلاف ہے۔ کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ان کوششوں کا جو انہوں نے فدک کے معاملہ میں کیا اور ان تقریروں کا اور ان لاجواب مباحثوں کا جو انہوں نے ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ سے کیے، اگر سچ مانے جائیں یہی نتیجہ ہوتا ہے کہ حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا گھر میں آ کر ایسے وقت میں جب کہ کوئی سوائے علی رضی اللہ عنہ کے سننے والا نہ ہو، ان سے یہ فرماتیں:

((مانند جنین در رحم پرده نشین شدہ مثل خائبان در خانہ

گریختہ و بعد ازاں کہ شجاعان دھر را بر خاکِ هلاک افگندی

مغلوب این نامرداں گردیدہ اینک پسر ابو قحافہ بظلم و جبر
 بخشیدہ پدر مراد معیشت فرزند انم را از من می گیرد و
 انصار مرایاری نمی کنند و مهاجران خود را بہ پناہ کشیدہ
 اند، نہ دافعے دارم و نہ یاوری و نہ شافعے، خشم ناک بیرون
 رقتم و غم ناک گر گشتم خود را ذلیل کر دی، گرگاں می
 درند و می برند و تواز جائے خود حرکت نہ کنی، کاش پیش
 ازین مذلت و خواری مرده بودم.))

”پیٹ میں بچہ کی طرح تم پردہ نشین ہو گئے اور مایوسوں کی مانند گھر میں بھاگ
 آئے ہو، حالانکہ تم نے زمانے کے بہادروں کو برسرِ خاک ہلاک کیا، اور اب ان
 نامردوں سے ڈر گئے ہو، ابو قحافہ کا چھٹکوا ظلم و ستم کے ذریعہ میرے باپ کی بخشی
 ہوئی روزی میرے بچوں سے چھین رہا ہے، کوئی انصاری میری امداد نہیں کر رہا
 ہے اور مہاجرین خود ہی پناہ مانگ رہے ہیں، اس وقت کوئی نہیں جو مدافعت
 کرے یا میری مدد و سفارش کرے، میں غصہ سے باہر گئی تھی اور وہاں سے مغموم
 لوٹی، تم نے خود کو ذلیل کیا۔ بھیڑیے پھاڑ کھائیں اور تمہاری حالت یہ ہے کہ اپنی
 جگہ سے ٹس سے مس نہیں کرتے، کاش! اس ذلت و خواری سے پہلے میں مر گئی
 ہوتی۔“

اگرچہ در صورت اس کے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ فدک کے معاملہ میں سوال و جواب کرنے
 کے لیے تشریف لے گئے ہوتے، یہ خطاب اور یہ ارشاد حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کا تعجب انگیز ہے اور
 جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا آپ نے غصہ اور رنج میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے وہ فرمایا جو صحیح نہیں
 تھا یا جناب امیر رضی اللہ عنہ کی کوششیں آپ کے نزدیک کافی نہ تھیں۔ مگر جناب امیر رضی اللہ عنہ کا جواب
 اس سے بڑھ کر حیرت انگیز ہے، اس لیے کہ در صورت صحیح ہونے ان روایتوں کے جن میں
 حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جانے کا ذکر ہے، آپ کو اس طرح سے جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کو تسلی دینی تھی

کہ تم اس وقت غصہ اور رنج میں واقعات کا خیال نہیں کرتیں اور میری کوشش کی کافی قدر نہیں کرتیں، میں نے کون سا دقیقہ اٹھا رکھا ہے اور کون سی کوشش جو مجھے کرنی تھی وہ باقی ہے۔ تمہارے وکیل کے لیے نکال دینے کی خبر سنتے ہیں، میں ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور بین المہاجرین والانصار ان سے لڑا اور تمام حجیتیں ان کے سامنے پیش کیں اور ہر طرح سے انہیں قائل کیا۔ اور پھر کیا یہ بات تم بھول گئیں کہ آپ کے سامنے شہادت دینے کے بعد میں نے ان سے کیسی مدلل گفتگو کی اور جب انہوں نے نہ سنا تو میں نے برملا انہیں ظالم اور گناہ گار ٹھہرایا، اور خدا کے عذاب سے بھی انہیں ڈرایا اور تمہیں اپنے ساتھ لے کر اپنے گھر چلا آیا۔ اس سے زیادہ اور میں کیا کر سکتا تھا۔ مگر بجائے اس کے کہ ان واقعات کو یاد دلاتے فرمایا تو یہ فرمایا کہ صبر کرو، تمہارا اور تمہاری روزی کا خدا ضامن ہے، اور خداوند تعالیٰ نے تمہارے لیے جو آخرت میں مہیا کیا ہے وہ اس سے بہتر ہے جو ان بد بختوں نے تم سے چھین لیا ہے۔

اب سنیے کہ اس کا جواب حضرات شیعہ کیا دیتے ہیں اور اس مشکل سے نکلنے میں کیسے کچھ ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ ملا باقر مجلسی بحار الانوار کتاب الفتن صفحہ ۱۲۳ میں فرماتے ہیں: ❶
اب ہم اس مشکل کو دفع کرتے ہیں جو غالباً لوگوں کے دلوں میں اس سوال و جواب کے سننے

❶ اصل عبارت یہ ہے: ولندفع الاشكال الذي قلما يحظر بالبال عند سماع هذا الجواب والسؤال وهوان اعتراض فاطمة رضي الله عنها على امير المؤمنين في ترك التعرض للخلافة و عدم نصرتها و تخطئته فيهما مع علمها بامامته و وجوب اتباعه و عصمته و انه لم يقل شيئا الا بامرہ تعالى و وصية الرسول الله عليه وآله وسلم مما ينافي عصمتها و جلالها۔ فاقول يمن الجواب عنه بان هذه الكلمات صدرت منه لبعض المصالح ولم تكن واقعا منكرة لما فعله بل كانت راضية وانما كانت غرضها ان يتبين للناس قبح اعمالهم و شناعة العالهم وان سكوته ليس لرضاء بما اتوا به و مثل هذا كثيرا ما يقع في العادات والمحاورات كما ان ملكا يعاتب بعض خواصه في امر بعض الرعايا مع علمه ببرأته من جنايتهم ليظهر لهم علم جرمهم وانه مما استوجب به اخص الناس بالملك عنه المعاتبة و نظير ذلك ما فعله موسى عليه السلام لما رجع الى قومه غضبان اسفا من القائه الالواح و اخذه برأس اخيه يجره اليه ولم يكن غرضها انكار على هارون بل اراد بذلك ان يعرف القوم عظم جفائيتهم و شدة جرمهم كما مر الكلام فيه و امام حملة على ان شدة الغضب والانف والغيظ مملتها على ذلك مع علمها بحقيقة ما ارتكبه فلا ينفذ في دفع الفساد وينافى عصمتها و جلالتها التي عجزت عن ادراكها احلام العباد۔ ۱۲ (بحار الانوار صفحہ ۱۲۳)

سے پیدا ہوتی ہوگی اور وہ یہ ہے کہ اعتراض فرمانا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا جناب امیر رضی اللہ عنہ پر کہ انہوں نے ان کی مدد نہ کی اور حضرت سیدہ رضی اللہ عنہ کا جناب امیر رضی اللہ عنہ کو خطا وار ٹھہرانا باوجود اس بات کے جاننے کے کہ وہ امام ہیں اور واجب الاتباع، معصوم اور باوجود اس بات کے سمجھنے کے کہ انہوں نے کوئی کام نہیں کیا الا حکم خدا اور مطابق وصیت رسول کے جو حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کی عصمت و بزرگی کے خلاف ہے۔ یہ فرما کر ملا صاحب یہ جواب دیتے ہیں ((یمكن ان یجاب عنہ)) کہ ممکن ہے کہ اس کا یوں جواب دیا جائے۔ جواب کے آغاز سے پہلے ہی جو الفاظ ملا صاحب نے بیان فرمائے ہیں وہ خود اس بات کو بتاتے ہیں کہ خود ملا صاحب اس جواب کو قابل تسلی و تشفی نہیں سمجھتے، پھر اس جواب کی تشریح فرماتے ہیں: ((بأن هذه الكلمات صدرت منها لبعض المصالح..... الخ)) یعنی یہ باتیں جو آپ نے بیان فرمائیں وہ صرف بعض مصلحتوں کی وجہ سے تھیں، ورنہ حقیقت میں کچھ آپ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے کاموں سے خفا نہ تھیں بلکہ راضی تھیں اور اس کہنے سے غرض آپ کی صرف یہ تھی کہ لوگوں کو صحابہ کے اعمال کی قباحت اور ان کے افعال کی شناخت معلوم ہو جائے اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کا سکوت اس لیے نہ تھا کہ آپ لوگوں کی باتوں کو پسند کرتے ہوں یا اس سے راضی ہوں۔ اور اس طرح کی باتیں مصلحتاً کہنا عادات اور محاورات میں درست ہیں، جیسا کہ کوئی بادشاہ کسی اپنے بعض خواص پر کسی معاملہ میں جو رعیت سے سرزد ہوا ہو عتاب کرے گو وہ جانتا ہو کہ وہ خواص اس گناہ سے بری ہے، مگر اس عتاب سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ گناہ گار رعیت کے جرم کی عظمت لوگوں کو معلوم ہو جائے اور اس کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فعل ہے کہ جب وہ اپنی قوم کی طرف غصہ میں لوٹے اور تختیاں پھینک دیں اور اپنے بھائی کی داڑھی پکڑ کر اپنی طرف کھینچی اس سے کچھ غرض ان کی ہارون علیہ السلام پر عتاب ظاہر کرنا نہیں تھا بلکہ لوگوں کو بتانا کہ وہ سمجھ جائیں کہ ان کی خطا کیسی عظیم ہے اور ان کا جرم کیسا شدید ہے۔ آپ کا غصہ اور رنج کی شدت میں جناب امیر علیہ السلام کی کارروائی کی حقیقت سے خوب واقف تھیں، کچھ آپ کی عصمت اور عظمت کے خلاف نہیں ہے جس کے ادراک سے بندوں کے ذہن عاجز ہیں۔

اسی جواب کو ”حق الیقین“ میں ان لفظوں سے بیان کیا ہے:

((مؤلف گوید کہ دریں مقام تحقیق بعضی از امور ضرور است، اول دفع شبہ چند کہ ممکن است در خاطر خطور کند۔ اگر کسی گوید کہ اعتراض فاطمہ رضی اللہ عنہا بر حضرت امیر رضی اللہ عنہ باوجود عصمت ہر دوچہ صورت دارد، جواب گوئیم کہ این معارضہ محمول بر مصلحت ست از برائے آنکہ مردم دانند کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ ترک خلافت بر ضائے خود نہ کردہ بغصب فدک راضی نبودہ و در قرآن بسیارے از معاملات با حضرت رسول شدہ و غرض تہدید و تادیب دیگران ست و ازیں قبیل است آنچه از حضرت موسیٰ رضی اللہ عنہ صادر شد در وقتیکہ بسوئے قوم برگشت و ایشان عبادت گوشالہ کردہ بودند از انداختن الواح و سروریش ہارون را گرفتہ بہ پیش کشیدند با آنکہ می آنکہ می دانست کہ ہارون تفصیر اندارد تا آنکہ بر قوم ظاہر شود شناخت عمل ایشان، و مانند عتابے کہ حق تعالیٰ بہ حضرت عیسیٰ رضی اللہ عنہ خواہد کرد کہ ایا تو گفتی بمردم کہ مرا و مادر مرا خدا بدانند با آنکہ میدانند کہ اونگفتہ است و مثل این بسیارست .))

”مؤلف کا بیان ہے کہ یہاں چند باتوں کی تحقیق ضروری ہے، اول یہ کہ ان شکوک و شبہات کو دور کیا جائے جن کا دلوں میں آنا ممکن ہے۔ اگر کوئی اعتراض کرے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جناب علی رضی اللہ عنہ کی عصمت کی پردہ دری کی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد دراصل مصلحت کی وجہ سے تھا

تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی رضا سے منصبِ خلافت ترک نہیں کیا اور باغِ فدک کے غصب کرنے پر راضی نہ تھے، جیسا کہ قرآن کریم میں اکثر معاملات رسول خدا ﷺ کی بابت ہیں جن کی غرض دوسرے لوگوں کی تہدید و تنبیہ ہے، اور اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ہے کہ جب وہ اپنی قوم کے پاس لوٹے تو قوم کو ایک بچھڑے کو پوجتے دیکھا اور جو تختیاں ان کے پاس تھیں وہ پھینک دیں اور ہارون علیہ السلام کے سر کے بال پکڑ کر ان کو اپنی طرف گھسیٹا، حالانکہ حضرت ہارون علیہ السلام پیغمبر بابت خود انہیں علم تھا کہ اس میں ہارون کی کوئی غلطی نہیں ہے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ کام صرف اس لیے تھا تا کہ قوم کو ان کی بد عملی کب رائیاں معلوم ہو جائیں، اور اللہ کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا عتاب کرتے ہوئے یہ کہنا کہ کیا تم نے کہا تھا کہ مجھے اور میری والدہ کو خدا کہا جائے، حالانکہ اللہ جانتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خود کو یا والدہ کو خدا نہیں کہلوایا اور اس قسم کی اکثر مثالیں ہیں۔“

اور صاحب ”لمعة البيضاء“ بھی قریب قریب اسی کی تاویل کرتے ہیں:

((كما يقول وما فعلت بالنسبة الى و على تلك الجرأة
والجسارة مع علمها بانه امام مفترض الطاعة ولا يليق بمثله
هذه المخاطبة من مثلها الا لا بداء شناعة ما فعله ابوبكر من
تلك الفعلة الفظيعة على الامة اثبات كفر العمرين كما فعل
موسىٰ ﷺ باخيه من الاخذ بلحيته وضرب على راسه حتى
يعلم القوم شناعة عبادة العجل . (صفحة ۳۹۳)

اور صاحب ”ناسخ التواريخ“ اس سوال و جواب کے متعلق یہ فرماتے ہیں:

((مكشوف بادكه اسرار اهل بيت مستورست از مدركات

امثال ما مردم، بلکه مقداد ﷺ و ابوذر ﷺ و سلمان ﷺ

بامنزلت بیرون ادب گام نزنند و در سعید اے خاطر تمنائے ابن طلب نہ کنند۔ وقتی نمی دانم کجادیده ام کہ سلماندر خدمت امیر المومنین از غضب خلافت و تقاعد آنحضرت ضحیرتے کرد علی رضی اللہ عنہ فرمودہاں اسے سلمان رضی اللہ عنہ می خواہی از اسرار اہل بیت آگاہی بدست کنی بدیہی است کہ بیرون اہل بیت کنی بدیہی است کہ بیرون اہل بیت آفریدہ را توانائے حمل این بارگراں نیست هماناں فاطمہ رضی اللہ عنہا کو محدثہ بود و بحکم احادیث صحیحہ بعلم ماکان وما یکون عالم بود لا جرم ازاں پیش کہ رسول خدا وداع جہاں گوید و حوادث ہائلہ نازل گردداز مخالف امت در امر خلافت و ضبط فدک و دعوای آگاہی دشت و بحکم عصمت کی تشریف موهوبہ یزدانی است جز بحکم خدا و رضائے علی رضی اللہ عنہ مرتضیٰ سخن نمی فرمود سخن او سخن عمل عمران بود و کلمہ او ودیعه خدا وند رحمن ، و مناعت محل او از ملکوت و ملک رفیع تر بود تا بعوالی وفدک چہ رسد و چہ بسیار وقت حسنین را گرسنہ می خوابانید و بلغہ یک شبہ ایشان را بسائلے می رسانید مملکت دنیا در چشم او باپزد بابی بمیزان نمی رفت فدک دعوالی چیست و حاصل کدام است اگر کوئی این خطاب و خطبہ چہ بود و این ہمہ فزع و شکوہ چہ واجب می نمود پس در حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ اظہار جسارت کرد و معذرت جس تن باجلباب عصمت بینونت داشت ، پاسخ این سخن را بدین گونه ساختگی کنیم

کہ اسرار اہل بیت مستورست یہ سرحی کہ مسطور افتاد
والا آنکہ گوئیم بحکم مدرکات عقول ناقصہ خود
آنحضرت ہمی خواست کہ ظالم را از عادل و حق را از
باطل باز نماید تا آنکہ خمیر مایہ فطرت ایشان از ترشحات
زلال ولایت بہرہ یافتہ از طریق ضلالت و غوایت باز
شوند و بہ شاہرہ شریعت و ہدایت روند .)) انتہی

” واضح ہو کہ اہل بیت کے اسرار ہم جیسے لوگوں کی سمجھ سے پوشیدہ ہیں اور مقدار
اور ابوذر اور سلمان رضی اللہ عنہما نے بھی حد ادب سے باہر قدم نہیں رکھا، حالانکہ
سلمان رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے اہل بیت کہا ہے اور ان میں سے کسی نے
اہل بیت کے برابر ہونے کی تمنا نہیں کی۔ میں نے کہیں دیکھا ہے کہ ایک مرتبہ
سلمان فارسیؓ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر غصبِ خلافت اور
آپ کے پیچھے رہ جانے پر کدورت کا اظہار کیا، جس پر حضرت علیؓ نے کہا کہ اے سلمان!
کیا تم اہل بیت کے اسرار سے واقفیت پیدا کرنا چاہتے ہو؟ اور واقعہ یہ ہے کہ اہل
بیت کے سوائے کسی دوسرے کو اس بوجھ کے اٹھانے کی قوت نہیں ہے۔ اور
احادیث کے بموجب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی کیفیت یہ ہے کہ جو کچھ عالم میں ہوا
یا آئندہ ہوگا وہ سب سے واقف تھیں، انہیں رسول اللہ ﷺ کی نگاہوں سے
پردہ پوشی اور مصائب کا نزول، خلافت کے بارے میں لوگوں کا اختلاف اور باغ
فدک کے سوائے حضرت علیؓ سے کوئی بات نہ کہتی تھیں، ان کی بات عمل کے مانند
تھی کہ فدک کے معاملہ میں کیا ہوگا۔ انہوں نے اکثر اوقات حسنین رضی اللہ عنہما کو بھوکا
رکھ کر سلا یا اور فقیروں کے سوال پورے کیے دنیاوی مملکت ان کی نظر میں مکھی کے
پر کے برابر بھی نہ تھی، فدک اور اس کے ملحقات اور مالیہ وغیرہ ان کی نظروں میں
واقع نہ تھا۔ اور اگر کہو کہ یہ گفتگو وغیرہ اور گلہ شکوہ کیوں کیا اور حضرت علیؓ سے ایسی

جسارت اور ان کی معذرت خواہی کیوں ہوئی تو اس بات کو اس طرح ختم کرتا ہوں کہ اہل بیت کے اسرار پس پردہ ہیں، جن میں سے بعض لکھے گئے ہیں ورنہ ہم تو یہی کہتے ہیں اور ہماری ناقص عقل میں یہی آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا منشا ہی یہ تھا کہ ظالم کو منصف سے اور حق کو باطل سے اس طرح جدا کریں کہ لوگوں کی فطرت زلال اور ولایت سے بہرہ ور ہو اور گمراہی و کجی سے نکل کر شاہراہ شریعت و ہدایت پر گامزن ہو۔“ (ناسخ التواریخ، صفحہ ۹۱)

ہم اگرچہ ان جوابات کی نسبت کچھ بیان کرنے کی ضرورت نہیں دیکھتے، اس لیے کہ ہر ایک سمجھ دار آدمی خود ان جوابات سے اس کی وقعت کا اندازہ کر سکے گا اور اسے یقین ہو جائے گا کہ بجز اس کے کہ یہ معاملات اسرار امامت سے سمجھے جائیں انسانی فہم سے خارج ہیں، مگر مختصراً کچھ کہنا مناسب سمجھتے ہیں۔

بحار الانوار میں جو جواب ملا باقر مجلسی نے دیا ہے کہ مصلحتاً حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا نے حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے ایسی باتیں فرمائیں اور غرض آپ کی صرف یہ تھی کہ لوگوں کو صحابہ رضی اللہ عنہم کے اعمال کی قباحت اور ان کے افعال کی شناعیت ظاہر ہو جائے۔ غالباً ہر شخص اس جواب کو تعجب اور تاسف کی نگاہ سے دیکھے اور سمجھ لے گا کہ جب کچھ جواب نہ بنا تو بہ مجبوری بہ فحوائے ((الغریق یتشبت بكل حشیش)) یہ سمجھ کر کہ کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی چاہیے ملا صاحب نے جو دل میں آیا وہ لکھ دیا مگر اتنا خیال نہ فرمایا کہ یہ باتیں جو حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا نے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے فرمائیں وہ گھر میں کہی تھیں، جہاں سوائے آپ کے یا گھر کے لوگوں کے کوئی غیر نہ تھا جن کو سنانا منظور ہو اور غیروں کے سنانے کے لیے کوئی موقع بھی باقی نہ تھا۔ اس لیے کہ نہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے کوئی دقیقہ ملامت اور الزام کا صحابہ رضی اللہ عنہم پر اٹھا رکھا تھا اور نہ بین المہاجرین والانصار ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ظلم و ستم کی کوئی بات باقی رکھی تھی اور نہ جناب فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے فصیح و بلیغ خطبہ میں ان کی نسبت جو کچھ کہنا تھا، اس میں سے کچھ اٹھا رکھا تھا، کافر، مرتد اور جہنمی ہونا تک تو ان کا علی رؤس الاشہاد بیان فرما دیا تھا۔ وہ کون

سی بات باقی رہ گئی تھی جسے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر رکھ کر سنائیں۔

ہاں ملا صاحب اگر یہ فرماتے تو ممکن تھا کہ آسمان کے فرشتے ہمدردی کرنے اور تسلی دینے کے لیے آپ کی دولت سرائے میں آئے تھے، ان کو صحابہ رضی اللہ عنہم کا کفر و نفاق اور ان کے جو روتعدی سنائی منظور ہوگی۔ ان کے سنانے کے لیے غالباً حضرت معصومہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضرت امیر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے یہ خطاب فرمایا ہوگا اور حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مثال جو ملا صاحب نے دی ہے وہ بھی اپنے دل کے خوش کرنے کے لیے بیان فرمائی ہے ورنہ اس کو اس سے کیا نسبت۔ اول تو یہ بات تسلیم نہیں کی گئی کہ حضرت ہارون علیہ السلام پر عتاب لوگوں کے دکھانے کے لیے کیا گیا تھا۔ سوائے اس کے جو کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا وہ علی رؤس الاشہاد تھا نہ کہ گھر میں بیٹھ کر اور تنہائی میں، جہاں کوئی دیکھنے والا سوائے فرشتوں کے کوئی نہ ہو۔ علاوہ بریں جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اس خطاب کو جو حضرت سیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کیا اپنے ہی نسبت خیال کیا تھا نہ جیسا کہ ملا صاحب سمجھتے ہیں اسی مصلحت پر مبنی خیال فرمایا تھا، اس لیے کہ اس کے جواب میں جو آپ نے فرمایا اس کے الفاظ یہ ہیں: ((فقال لها امیر المومنین لاویل لك بل الویل لشانك ثم نهنہنی عن وجدك یابنت الصفوۃ وبقیة النبوة فما غنیت عن دینی والا اخطات مقدوری فان كنت تریدین البلغة فرزقك مضمون و كفیلك مامون وما اعدلك افضل مما قطع عنك فاحتسبی اللہ فقالت حسبی اللہ و امسكت.)) اس کا ترجمہ فارسی میں فاضل مجلسی ”حق الیقین“ میں اس طرح سے کرتے ہیں:

((جناب امیر در جواب ارشاد فرمودند کہ صبر کن و آتش و در افرو نشان اے دختر برگزیدہ عالمیاں و اے باقی ماندہ ذریت پیغمبر، من سستی در امر دین خود نہ کردم و آنچه جانب خدامامور بودم بعمل آوردم و آنچه مقدور بوداز طلب حق خود دران تقصیر نہ کردم و روزی ترا و اولاد ترا

خدا ضامن است۔))

”حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے کہنے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہی جواب دیا کہ صبر کرو اور غصہ کی آگ فرو کرو، اے دو جہاں کے برگزیدہ نبی کی بیٹی اور اے اولاد پیغمبر ﷺ کو باقی رکھنے والی ماں! سنو، میں نے مذہبی امور میں خود سستی نہیں کی بلکہ خدا کے حکم کے موافق عمل پیرا ہوں اور میں نے حتی المقدور اپنے حق کی طلب میں کوئی کوتاہی نہیں کی تمہاری اور تمہاری اولاد کی معیشت و روزی کا اللہ ضامن و کفیل ہے۔“

اس جواب سے کون شخص سمجھ سکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے اس خطاب کو اپنی ذات پر محمول نہیں فرمایا تھا اور ان کے غصہ کو اپنی نسبت خیال نہیں کیا تھا! ورنہ آپ کیوں یہ فرماتے کہ میں نے کچھ کوتاہی نہیں کی اور جہاں تک مجھ سے ہو سکتا تھا اس میں دریغ نہیں کیا۔ بلکہ اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ ضمناً حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کو ان کی غلطی پر آگاہ کرنا منظور تھا اور یہ کہنا کہ آپ غلطی پر ہیں کیوں آپ مجھ پر خفا ہوتی ہیں اور کیوں مجھے ایسی سخت و سست باتیں کہتی ہیں اور کیوں مجھے مثل جنین کے پردہ نشین ٹھہراتی ہیں، میں نے آپ کی مدد میں کوتاہی نہیں کی، میں نے آپ کے دعوے کی تائید کی، آپ کے سامنے صحابہ سے جھگڑا کیا، اور جہاں تک ممکن تھا ان کو ملامت کی، ان کا ظلم و ستم ثابت کیا۔ اور چونکہ یہ سب باتیں میں نے آپ کے سامنے کیں، پھر بھی آپ مجھ پر خفا ہوتی ہیں اور مجھے بزدل اور خائف ٹھہراتی ہیں، یہ آپ کی شان سے بعید ہے۔ اور چونکہ یہ وہ باتیں ہیں جو شیعوں کی روایتوں میں بہ تفصیل منقول ہیں اس سے وہ حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کی عصمت میں خلل پیدا کرتے ہیں اور بہ مقتضائے بشریت آپ کو بے جا غصہ کرنے والا قرار دیتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ حضرات شیعہ مجبور ہیں اور بے بنیاد اور غلط بات کے ثابت کرنے میں رقص الجمل فرماتے ہیں۔ ہر موقع کے لیے انہوں نے ایک روایت بنائی ہے اور ہر اعتراض کے لیے ان حضرات نے اپنے نزدیک ایک جواب گھڑا اور جھوٹ کو سچ کرنا چاہا۔

کاش! وہ ایک ہی بات اور ایک ہی روایت پر قائم رہتے تو اتنی دقت پیش نہ آتی اور ایسی فضیحت نہ ہوتی، مگر کثرتِ روایات اور اختلافِ اقوال نے ہم کو جواب دینے کی محنت سے بچا لیا، اور اس تناقض اور اختلاف نے جو ان روایتوں اور بیانیوں میں ہے ان کے دعوے کو ایسا باطل کر دیا کہ نہ کسی عدالت میں ان کے دعوے کی ڈگری ہو سکتی ہے، نہ غلط بیانی اور جھوٹی شہادت پیش کرنے سے وہ الزام سے بچ سکتے ہیں۔

تمت بالخیر



